9

مرقاۃ المفاتیح

شرح اردو

مشکوٰۃ المصابیح

للعلامہ الشیخ القاری علی بن سلطان محمد القاری

مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم

مکتبہ رحمانیہ

مرقاة المفاتيح اردو

للعلامة الشیخ القاری علی بن سلطان محمد القاری ہجری ۱۰۱۴

شرح

مشکوٰة المصابیح

للامام العلامة محمد بن عبد الله الخطیب التبریزی المتوفی ۷۴۱

مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم

جلد نہم

مکتبہ رحمانیہ

اقرا سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون: 042-37224228-37355743

MAKTABA-E-REHMANIA

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

MAKTABA-E-REHMANIA

مکتبہ رحمانیہ

نام کتاب: .... مرقاۃ المفاتیح اردو (جلد نہم)

مترجم: .... مولانا راؤ محمد ندیم

ناشر: .... مکتبہ رحمانیہ

مطبع: .... لٹل سٹار پرنٹرز لاہور

استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔

بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ ان شاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لیے ہم بے حد شکر گزار ہوں گے۔ (ادارہ)

فہرست

الموضوع

بَابُ الضِّحْکِ

ہنسنے کا بیان

''اصول'' میں لفظ ''الضحک'' حرف اول کے کسرہ اور حرف ثانی کے سکون کے ساتھ ہے۔

لفظ ''الضحک'' کو دو طریقے سے پڑھا جاتا ہے:

بروزن سجن۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: ضحک ضحکا بالفتح وبالکسر وبکسرتین ککتف

اس سے اسم فاعل کا صیغہ ''ضاحک'' آتا ہے۔

مصنف علیہ الرحمہ نے ''باب الضحک'' میں ضحک کو اعم معنی میں لیا ہے، لہٰذا تبسم بھی اس میں شامل ہو جائے گا۔ وگرنہ تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اکثر ضحک تو ''تبسم'' ہی ہوتا تھا۔ یا ضحک کے جواز پر استدلال کرنا چاہتے ہیں کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ سے ضحک ثابت ہے۔

تبسم وضحک کے جواز پر تفسیر بغوی میں مذکور تفسیر سے اشکال ہوتا ہے۔ وہ یوں کہ اس آیت کریمہ: ﴿لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾ [الکھف: ٤٩] کی تفسیر عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں مروی ہے کہ صغیرہ سے مراد ''تبسم'' اور کبیرہ سے مراد ''ضحک'' ہے۔ تو اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہاں اس سے مراد کفار کا مؤمنین کے ساتھ، یا فجار کا علماء صالحین کے ساتھ ٹھٹھا کرنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خبر دی ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ﴾ [المطففین: ٢٩]

الفصل الاوّل:

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا مسکرانا

٤٧٤٥: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسْتَجْمِعاً ضَاحِكًا حَتّٰى اَرٰى مِنْهُ لَهَوَاتِهِ اِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ١٠/ ٥٠٤ الحدیث رقم ٦٠٨٩ ومسلم فی ٤/ ١٩٢٥ واحمد فی المسند ٤/ ٣٥٩۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا زیادہ ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا کہ یہاں تک کہ

میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلق یا کوّے کو دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عموماً مسکرایا کرتے تھے۔ (بخاری)

تشریح: قوله: ما رأيت النبي ﷺ مستجمعا ضاحكًا: اى ما ابصرته حال كونه مستجمعًا من جهة الضحك۔

لهواته: لام اور ہاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ "لهاة" کی جمع ہے "لهاة"، حلق کے کوّے کو کہتے ہیں۔

مستجمعًا: صاحب مصباح لکھتے ہیں: "**استجمعت** شرائط الامامة و "**اجتمعت**" دونوں "**خصلت**" کے معنی میں ہیں چنانچہ دونوں فعل لازم ہیں مفعول مقدر ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔

صاحب مغرب لکھتے ہیں: **استجمع السيل اجتمع من كل موضع، واستجمعت للمرء أموره اجتمع له ما يحبه**، یہ لازم ہے جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اور عرب کا یہ قول: **استجمع الفرس جريًا**، اس میں "جريًا"، منصوب علی التمیز ہے۔ البتہ فقہاء کا قول "**مستجمعًا شرائط الجمعة**"، ثابت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

"**ضاحكا**": منصوب بر بناء تمیز ہے باوجودیکہ مشتق ہے۔ چنانچہ اس کا تمیز ہونا عرب کے اس قول کے قبیل سے ہے: **لله دره فارسا** اور معنی یہ ہوگا: **ما رأيته يضحك تاما مقبلا بكليته على الضحك۔**

قوله: انما كان يتبسم:

یہ فرمانا غالب احوال کے اعتبار سے ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار ضحک بھی فرماتے تھے لیکن ان کا ضحک حد مذکورہ بالا سے متجاوز نہیں ہوتا تھا۔ اور اعراب سابق امام طیبیؒ کے کلام کا زبدہ ہے اور ابن الملک کا رجحان اس طرف ہے کہ ضاحکًا حال ہے۔ أي: **ما رأيته مستجمعا لضحكه في حال ضحكه، أي لم أره يضحك ضحكا تاما بجميع فمه۔** اھ۔ یہ کلام شارح کے ماقبل کلام سے ماخوذ ہے: گویا کہ حضرت عائشہؓ یوں فرمانا چاہتی ہیں۔ **مستجمعًا ضحكًا۔**

تخریج: احمد، ترمذی اور حاکم نے جابر بن سمرۃ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: **أنه ﷺ كان لا يضحك الا تبسما** (راوی) نے تبسم کو ضحک کے قبیل سے قرار دیتے ہوئے، تبسم کا ضحک سے استثناء کیا ہے۔ تبسم اور ضحک میں وہی نسبت ہے، جو "سِنة" کو "نوم" سے ہے۔ اسی قبیل سے یہ آیت کریمہ ہے: ﴿**فتبسم ضاحكًا**﴾ [النمل: ۱۹] **أي شارعًا في الضحك.**

نبی علیہ السلام کی مسکراہٹ

۴۷۴۶: وَعَنْ جَرِيْرٍ قَالَ مَا حَجَبَنِىَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُنْذُ اَسْلَمْتُ وَلَا رَاٰنِىْ اِلَّا تَبَسَّمَ۔

(متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۰/۵۰۴ الحديث رقم ۶۰۸۹ ومسلم في ۴/۱۹۲۵ واحمد في المسند ۴/۳۵۹۔

ترجمہ: حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب سے میں مسلمان ہوا ہوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں روکا اور جب بھی مجھے دیکھتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله ما حجبني:

"مجھ کو منع نہیں کیا" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

① آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی مجھ کو اپنے پاس آنے سے روکا نہیں میں جس وقت چاہتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ چاہے کوئی خصوصی مجلس ہی کیوں نہ ہوتی بشرطیکہ مردانہ مجلس ہوتی' چاہے آپ اپنے گھر میں ہوتے۔

② ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز مانگی ہو، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے دینے سے انکار کیا ہو، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب بھی مانگا، جو بھی مانگا وہ مجھ کو عطا ہوا۔

ولا رآني کے بعد "منذ أسلمت" محذوف ہے' چونکہ بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ دلالت اول کی وجہ ثانی سے حذف کر دیا جاتا ہے۔ اس کی تائید ترمذی کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: ماحجبني رسول الله ﷺ ولا رآني منذ أسلمت الا تبسم، کہ "منذ" کا تعلق دونوں افعال کے ساتھ ہے أسلمت کے ساتھ بھی اور رأیت کے ساتھ بھی، البتہ "الا" کا تعلق دوسرے فعل کے ساتھ ہے۔ ترمذی کی ایک حدیث میں "الا ضحك" کے الفاظ ہیں۔ یہاں ضحک سے مراد تبسم ہے۔ تبسم فرمانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق میں سے تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کا حضرت جریرؓ کو دیکھ کر انبساط فرمانا ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ یہ خوبرو تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ان جريرا يوسف هذه الأمة "بلاشبہ جریر اس امت کے یوسف ہیں"۔

زمانہ جاہلیت کی باتوں پر مسکرانا

۴۷۴۷: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُوْمُ مِنْ مُصَلَّاهُ الَّذِيْ يُصَلِّيْ فِيْهِ الصُّبْحَ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَإِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ قَامَ وَكَانُوْا يَتَحَدَّثُوْنَ فَيَاْخُذُوْنَ فِيْ اَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ فَيَضْحَكُوْنَ وَيَتَبَسَّمُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

(رواه مسلم وفي رواية للترمذي يتناشدون الشعر)

أخرجه مسلم في ٤/ ١٨١٠ الحديث رقم ٢٣٢٢، والترمذي في السنن ٥/ ١٢٨ الحديث رقم ٢٨٥٠۔

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ آپ مصلّی پر فجر کی نماز ادا فرما لیتے تو اس وقت تک وہاں سے نہ اٹھتے جب تک سورج نہ نکل آتا جب سورج نکل آتا تو آپ اشراق کی نماز ادا فرماتے یا گھر میں تشریف لے جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے اور اس دوران میں صحابہ کرامؓ زمانہ جاہلیت کی باتوں کا تذکرہ کرتے اور ہنستے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ساتھ مسکراتے تھے۔ یہ مسلم کی روایت ہے اور ترمذی کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ اشعار سننے میں مشغول رہتے۔

تشریح: قوله: كان رسول الله ﷺ لا يقوم:

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح کی نماز کے بعد ذکر کرنا، اور اسی جگہ ٹھہرے رہنا جب تک کہ عذر نہ ہو

مستحب ہے۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں: سلف صالحین اس سنت کا خصوصیت کے ساتھ اہتمام کرتے تھے وہ اس دوران ذکر ودعا پر اقتصار کرتے تھے یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جاتا۔

قولہ: وكانوا يتحدثون:

یہ سلسلہ گفتگو کس وقت ہوا کرتا تھا؟ اس میں تین احتمال ہیں: ① صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ ہنسنا مسکرانا نماز فجر کے بعد سے طلوع شمس تک کے درمیانی عرصہ میں بھی ہوتا تھا۔ یہی ظاہر ہے۔ ② اس وقت کے علاوہ میں کیا کرتے تھے۔ ③ یہ مطلق تھا' کسی خاص وقت کے ساتھ مقید نہیں تھا۔ (یعنی کبھی فجر کے بعد سے لے کر طلوع شمس کے درمیانی وقت میں اور کبھی دیگر اوقات میں۔)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زمانہ جاہلیت کی باتیں کرنا بھی جائز ہے، اور (حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے) ہنسنا مسکرانا بھی جائز ہے۔ ان قصوں میں سے ایک قصہ یہ ہے کہ ایک شخص بولا کہ اس طرح تو کسی بھی شخص کو اس کے بت نے نفع نہیں پہنچایا ہوگا جس طرح مجھے میرے بت نے نفع پہنچایا۔ سامعین بولے وہ کیسے؟ وہ شخص بولا کہ میں نے وہ بت حیس سے تیار کیا تھا۔ قحط کے زمانے میں' میں وقتاً فوقتاً اس کو کھایا کرتا تھا۔ دوسرا بولا میں نے دیکھا کہ دو لومڑیاں آئیں اور میرے بت کے سر پر چڑھ کر پیشاب کر دیا تو میں بولا: "أرب يبول الثعلبان برأسه" کہ کیا وہ رب ہے کہ اس کے سر پر لومڑی پیشاب کر رہی ہے۔ چنانچہ یارسول اللہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لے آیا۔

شمائل میں آتا ہے: **عن جابر بن سمرة، قال: جالست النبي ﷺ أكثر من مائة مرة، وكان أصحابه يتناشدون الشعر. ويتذاكرون أشياء من أمر الجاهلية وهو ساكت، وربما يتبسم معهم.** اور یہ بات محتاج بیان نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی مجلس مبارکہ میں توحید ترغیب وترھیب کے مضامین پر مشتمل اعلیٰ درجہ ہی کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ خود رسول اللہ ابن رواحہ کا یہ شعر مثال دیتے ہوئے فرماتے تھے: **ستبدي لك الأيام ما كنت جاهلا۔ ويأتيك بالأخبار من لم تزود** اور اسی طرح لبید کے اس شعر کے بارے میں فرماتے تھے:

ان أصدق كلمة قالها الشاعر كلمة لبيد: ألا كل شيئي ماخلا الله باطل وكل نعيم لامحالة زائل۔

اس شعر میں نعمتوں سے مراد دنیاوی نعمتیں ہیں اور اس کا قرینہ اگلا شعر ہے: **نعيمك في الدنيا غرور وحسرة وعيشك في الدنيا محال وباطل۔** کسی شیخ کے لطائف میں یہ واقعہ منقول ہے کہ انہوں نے نماز کے بعد قرآن کریم کے وظیفہ کی تلاوت فرمائی' اس کے بعد ان کے ساتھیوں میں سے کسی ایک نے شعر پڑھا وہ رو پڑے اور وجد میں آ گئے' جب وہ سنبھلے تو بولے: کیا تم لوگ عوام کو ملامت کرتے ہو وہ کہتے ہیں فلاں ملحد ہے' فلاں زندیق ہے' میں نے قرآن کی اتنی تلاوت کی' میری آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ نکلا' اور جب میں نے یہ شعر کو سنا تو قریب تھا کہ میں دیوانہ ہو جاتا۔ میں کہتا ہوں یہ "سماع" کا باب کھولنے والی بات ہے' اور ایسی بات کی طرف مفضی ہے جو محل نزاع ہے' اور شیخ کے دونوں احوال میں فرق کی حکمت کے بیان کی محتاج ہے۔ یہ بسط کلام کی مقتضی ہے' ہم اس سے زیادہ اہم مقصودی بات کا بیان شروع کرنا چاہتے ہیں لہٰذا ہم اس بحث سے اعراض کرتے ہیں۔

الفصل الثانی:

سب سے زیادہ تبسم والے

۴۷۴۸: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ الْحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ قَالَ مَارَاَيْتُ اَحَدًا اَكْثَرَ تَبَسُّماً مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥/٦١ الحديث رقم ٣٦٤١، واحمد فی المسند ٣٦٤١۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن حارث بن جزء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر تبسم والا کوئی نہیں دیکھا۔ (ترمذی)

الفصل الثالث:

جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم ہنستے بھی تھے

۴۷۴۹: وَعَنْ قَتَادَةَ قَالَ سُئِلَ ابْنُ عُمَرَ هَلْ كَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضْحَكُوْنَ قَالَ نَعَمْ وَالْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِهِمْ اَعْظَمُ مِنَ الْجَبَلِ وَقَالَ بِلَالُ بْنُ سَعْدٍ اَدْرَكْتُهُمْ يَشْتَدُّوْنَ بَيْنَ الْاَغْرَاضِ وَيَضْحَكُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ فَاِذَا كَانَ اللَّيْلُ كَانُوْا رُهْبَانًا۔ (رواه فی شرح السنة)

أخرجه البغوی فی شرح السنن ١٢/٣١٨ الحديث رقم ٣٣٥١۔

ترجمہ: حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب بھی ہنستے تھے؟ انہوں نے کہا جی ہاں! حالانکہ ایمان ان کے دلوں میں پہاڑ سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔ حضرت بلال بن سعد تابعی کہتے ہیں کہ میں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس حال میں پایا کہ وہ تیروں کے نشانوں کے درمیان دوڑتے اور ایک دوسرے کی بات پر ہنستے مگر جب رات چھا جاتی تو بے رغبت اور راہب بن جاتے۔ (شرح السنۃ)

راوی حدیث:

بلال بن سعد تابعی۔ مؤلف علیہ الرحمہ نے ان کا اسم گرامی "الاکمال" میں ذکر نہیں فرمایا۔ اھ

تشریح: قوله: قال: نعم 'ولایمان فی قلوبهم اعظم من الجبل:

"والایمان فی قلوبهم" الخ یہ جملہ محل حال میں ہے' اور تقدیری عبارت یوں ہے: نعم یضحکون 'والحال أن عظمة الایمان وجلالته ...... ضحک میں تو کیا حد درجہ وقار رکھتے تھے' اور آداب شرعیہ کے قواعد پر ثابت قدم تھے۔ مکارم اخلاق کی رعایت میں وہ انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے ہاں وہ ہنسا کرتے تھے' لیکن وہ اتنا نہیں ہنستے تھے کہ ان کے دل مردہ ہو جائیں' اور کثرت ضحک کی وجہ سے ان کے ایمان متزلزل ہو جائیں۔ جیسا کہ مروی ہے کہ بہت زیادہ ہنسنا دلوں کو مردہ کر دیتا ہے۔

یشتدون: دال کی تشدید کے ساتھ۔ شدّ سے مأخوذ ہے۔ أی یعدون و یحرون۔

الأغراض: جمع ہے غرض، کی بمعنی و بروزن ہدف' یہاں جمع سے مراد "مافوق الواحد" ہے تا کہ یہ روایت موافق ہو جائے "نہایۃ" میں مروی عقبہ بن عامر کی اس حدیث کے: تخلف بین ھذین الغرضین وأنت شیخ کبیر۔

رھبنا: راء کے ضمہ کے ساتھ راہب کی جمع ہے۔ جیسے راکب اور رکبان۔ کبھی اس کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے، اس وقت اس کی جمع رھابین آتی ہے۔ چنانچہ نہایۃ میں ہے: الرھبان من ترك الدنیا وزھدفیھا وتخلی عنھا وعزل عن أھلھا وتعمد مشاقھا۔ (انتھی)

یضحك بعضھم الی بعض: جار مجرور کے بارے میں کئی احتمال ہیں: ◼ اس کا متعلق محذوف ہے جو حال واقع ہو رہا ہے۔ ای متوجھا وملتفیا الیه لا معرضا و مائلا عنه۔ ◼ الی "مع" کے معنی میں ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں: ﴿ولا تأکلوا أموالھم الی أموالھم﴾ [النساء: ۲] ، نیز اس آیت میں: ﴿الی المرافق﴾ [المائدۃ: ٦] منقول ہے۔ ◼ یضحك میں صفت تضمین ہے، انبساط کے معنی کو متضمن ہے۔ ◼ امام طیبیؒ فرماتے ہیں یضحك میں صنعت تضمین ہے، سخریہ کے معنی کو متضمن ہے۔ اس وجہ سے "الی" کے ساتھ تعدیہ ہوا ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿واذا خلوا الی شیاطینھم﴾ [البقرۃ: ١٤] امام طیبیؒ کا یہ قول دو وجہ سے عجیب وغریب ہے۔ اول تو یہ کہ سخریۃ "مِن" کے واسطے سے متعدی ہوتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿فیسخرون منھم سخر اللّٰہ منھم﴾ [التوبۃ: ۷۹] ہاں البتہ اس آیت: [ان الذین أجر مواکانوا من الذین آمنوا یضحکون﴾ [المطففین: ۲۹] "ضحک" سخریہ کے معنی کو متضمن ہے۔ دوم یہ کہ اس ارشاد گرامی: [واذا خلا بعضھم الی بعض﴾ [البقرۃ: ۷٦] میں "ضحک") سخریہ کے معنی کو متضمن نہیں ہے' بلکہ یہ بات نہ لفظاً درست ہے اور نہ دو تاویلیں ہیں: ایک یہ کہ "الی" بمعنی "مع" ہے' جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿من أنصاری الی اللّٰہ﴾ [آل عمران: ۵۲] اور دوسری تاویل یہ ہے کہ (اس میں) تضمن انضمام یا انتہاء کے معنی کی ہے۔ حاصل معنی یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دن کے اوقات یوں تھے اور ان کی مجالس ابرار تھیں'

صحابی رضی اللہ عنہ کی کہانی قرآن کی زبانی:

صحابہ کرامؓ کی زندگیاں کیسی تھیں؟ قرآن کریم کی یہ آیات اس کی جھلک پیش کرتی ہیں:

① ﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْأَبْصَارُ﴾ [النور: ۳۷]

② ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ [السجدۃ: ١٦]

③ ملا علی قاریؒ صحابہ کی بابت فرماتے ہیں: (جس کو مرتبہ نے نظم میں پرویا ہے کیا شانِ صحابہ عرض کروں؟ کیا شان صحابہ رکھتے تھے: ﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ [الذاریات: ۱۷۔۱۸]

ظاہر کی آنکھ سے ہنستے تھے باطن کی آنکھ سے روتے تھے

از رُوئے بدن وہ فرشی تھے، ارواح کی رُو سے عرشی تھے

ظاہر میں تو یوں لگتا تھا مخلوق میں گھل مل رہتے ہیں
ہر قلب وقالب پر لحہ خالق کے سنگ سنگ رہتے تھے۔
وہ قریب وبعید کے سب لوگوں سے قرب کا رشتہ رکھتے تھے
ہر اندر سے وہ اپنے کو مانند پر دیسی رکھتے تھے
باطن میں سب حضرات کے ہی تجرید بھی تھی تفرید بھی تھی
وہ لباس ہدید سے عاری تھے پر شان زالی رکھتے تھے
بوسیدہ کپڑوں میں بھی شان شاہاں وہ رکھتے تھے۔
فقر وغربت بس اتنی تھی کہ کمال فقر وہ رکھتے تھے
اس حال میں بھی سبحان اللہ! کہ شان غنا وہ رکھتے تھے

بَابُ الْاَسَامِیْ

اسماء کا بیان

أسامي: یاء کی تشدید وتخفیف ہر دو کے ساتھ مروی ہے۔ ''اسم'' کی مندرجہ ذیل جموع مستعمل ہیں:

۱ اسماء: بروزن افعال۔ ۲ أسامیّ: بروزن أفاعیل۔ ۳ أسام: بروزن أفاعل۔

عرضِ مرتب:

اگلی بحث مرتب کی کاوش ہے۔ (انتھی) کیسے نام رکھے جائیں؟

۱ ہر وہ نام جس میں اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کو لفظ ''عبد'' کے ساتھ ملا کر بنایا جائے، اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ (ملاحظہ فرمائیے حدیث: ۴۷۸۲)

۲ انبیاء کے ناموں میں سے کوئی نام رکھا جائے۔ (از فوائد حدیث: ۴۷۸۲)

۳ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ناموں میں سے ہو۔

فوائد ❂ جب صحابہ یا صحابیات کے ناموں پر نام رکھے جائیں، تو معنی کی تحقیق کوئی لازمی نہیں۔ ان ناموں کے صحیح ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ صحابہ نے ان ناموں کو رکھا اور نبی اکرم نے ان ناموں کو نہیں بدلا، اس لئے کہ آپ ﷺ جب بھی کسی کا غیر مناسب نام دیکھتے، تو اس کو بدل دیا کرتے تھے۔ لہٰذا صحابہؓ کرام کے ناموں کے صحیح ہونے کی سب سے بڑی دلیل اللہ کے نبی ﷺ کا ان کے ناموں کو برقرار رکھنا ہے۔

۴ سلف صالحین کے ناموں میں سے ہو۔

۵ بامعنی اور اچھے معنی والے نام رکھے جائیں۔ مثلاً حارث، ہمام۔ (از فوائد حدیث: ۴۷۸۲)

۶ برے نام کو تبدیل کر دینا چاہئے۔ (نووی۔ از فوائد حدیث: ۴۷۵۸۔۴۷۷۴)

۷ از روئے حدیث مندرجہ ذیل نام رکھنا مکروہ (تنزیہی) ہے۔ (از فوائد حدیث: ۴۸۵۳،۵۳)

۱ رباح۔ ۲ یسار۔ ۳ نافع۔ ۴ یعلی۔ ۵ برکۃ ۶ أفلح ۷ نجیح۔

۸ واضح رہے کہ مذکورہ بالا کراہت کا تعلق محض انہی ناموں سے نہیں ہے، بلکہ اور دوسرے نام جو بیان کردہ الفاظ کے ہم معنی ہوں یا ان جیسے ہوں ان کا بھی یہی حکم ہے۔ اس طرح کے نام رکھنے کی ممانعت کے سبب کا بیان، آگے آئے گا۔ (ملاحظہ ہو

حدیث:۴۷۵۴،۴۷۵۳،۴۷۵۰

ایسا نام نہیں رکھنا چاہئے:

(الف) جس کے لفظی مفہوم سے نفس کی تعریف ظاہر ہو۔ کیونکہ اس سے نفس میں بڑائی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً برّۃ۔

(ب): جو فرشتوں میں سے کسی فرشتے کا نام ہو۔ مثلاً جبرائیل۔ سموا بأسماء الأنبياء ولا تسموا بأسماء الملائكة."انبیاء کے ناموں پر نام رکھو، فرشتوں کے ناموں پر نام مت رکھو"۔

(ج): جس میں ایسا وصف پایا جاتا ہو جو اللہ جل شانہ کے ساتھ مخصوص ہو۔ جیسے شہنشاہ۔ یہ وصف ایسا ہے کہ اس وصف میں کسی مخلوق کے شریک ہونے کا وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا۔

(د): جس کے معنی اچھے نہ ہوں۔ (از فوائد حدیث:۴۷۷۴۔۴۷۸۲) عاص، عاصي، عاصية (نافرمان، سرکش، متکبر) حرب، مرّة، حزن، غراب، حباب، شهاب، عتله، اسود (کالا) اجدع.

(ھ) جو اسماء الٰہیہ میں سے ہو۔ (از فوائد حدیث:۴۷۷۶)۔ عزیز، حمید، کریم۔

(و) جو زمانہ جاہلیت کا ہو۔ کلب، کلیب، حمار، عبد شمس. وغیرہ

طبرانی حضرت بریرہ سے نقل کرتے ہیں: أنه ﷺ نهى أن يسمى كلب أو كليب.

(ز) جو ذومعنی ہو، بایں طور

ابو الحكم:

(ح) جس نام میں اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کے علاوہ کسی اور نام کو لفظ عبد کے ساتھ استعمال کیا گیا ہو۔ مثلاً عبدالعامر، عبدالمصطفیٰ۔

☆ عرب کا دستور تھا کہ وہ اپنے نام سے عدول کر کے کنیت استعمال کیا کرتے تھے۔ ان کے ہاں کنیت میں توقیر وتعظیم کا پہلو ہوا کرتا تھا الّا یہ کہ کنیت کا کوئی حصہ ہو کہ جس سے "مدعوبہ" کو تکلیف پہنچی ہو۔ بخلاف اسم مجرد کے۔ علمائے عربیت فرماتے ہیں: علم مدح وذم کے معنی کی طرف مشعر ہو تو لقب ہے، اگر (مدح وذم کے معنی کی طرف مشعر) نہ ہو تو اگر اب یا ابن سے شروع ہوتا ہے تو وہ علم "کنیت" ہے وگرنہ وہ اسم سے ہے۔ (حدیث:۴۷۵۰) "کنیت" کی اس سے زیادہ جامع تعریف یہ ہے:

- کنیت بھی کسی وصف وصفت کی طرف منسوب کر کے مقرر کی جاتی ہے۔ ابوالحکم، ابوالفضل، ابوالخیر، ابوالمعالی۔
- کنیت کبھی کسی خاص رشتہ کی طرف نسبت کر کے مقرر کی جاتی ہے۔ أبو سلمة، أبو شريح.
- کنیت کبھی کسی ایسی خاص چیز کی طرف نسبت کر کے مقرر کی جاتی ہے، جس کے ساتھ انتہائی اختلاط وربط ہو۔ جیسا کہ ابو ہریرہ۔ کہ نبی ﷺ نے دیکھا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس ایک بلی ہوتی ہے تو انہوں نے ان کی کنیت یہی مقرر فرمادی۔
- کنیت کبھی محض نام کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ جیسا کہ ابوبکر، ابوعمرو۔
- بعض حیوانات کی اجناس کے لئے بھی کنیت ~~استعمال~~ کی جاتی ہے۔ (القاموس الوحید)

الفصل الاول:

میری کنیت نہ رکھو

۴۷۵۰: عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي السُّوْقِ فَقَالَ رَجُلٌ يَا اَبَا الْقَاسِمِ فَالْتَفَتَ اِلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّمَا دَعَوْتُ هٰذَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمُّوْا بِاِسْمِيْ وَلَا تَكْتَنُوْا بِكُنْيَتِيْ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٣٩٩/٤ الحديث رقم ٢١٢٠ ومسلم في٣/١٦٨٢ الحديث رقم ٢١٣١ و ابوداؤد في السنن٥/٢٤٩ الحديث رقم٤٩٦٥ والترمذي في٥/١٢٥، الحديث رقم ٢٨٤١ و ابن ماجه في٢/١٢٣٠ الحديث رقم ٣٧٣٥، والدارمي في ٢/٣٧٩ الحديث رقم ٢٣٩٣، واحمد في المسند ٣/١٧٠۔

ترجمه: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بازار میں تھے کہ ایک شخص نے یہ کہہ کر آواز دی یا ابا القاسم! تو آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ کہنے لگا میں نے اس شخص کو آواز دی ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے نام پر نام تو رکھو مگر میری کنیت نہ رکھو۔ (بخاری)

تشریح: لا تکتنوا: از باب افتعال ہے۔ باب سمع اور باب تفعیل سے بھی مستعمل ہے۔

ایک نسخہ میں لا تکنوا، از باب افتعال کے بجائے باب تفعیل سے ہے یعنی تاء کے ضمہ اور نون کی تشدید کے ساتھ ہے۔

ایک اور نسخہ میں مجرد سے حرف اول کے فتحہ اور ثانی کے سکون کے ساتھ ہے۔ یہ تمام لغات ثابت ہیں ابن عباس سے منقول طبرانی کی ایک روایت میں ولا تکنوا ہے۔

قوله: سموا باسمي: اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں "محمد" رکھنا جائز تھا' اور آپ کے اس دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد بھی جائز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں یہ نام رکھنے میں کوئی حرج اس لئے نہیں تھا کہ وہ موجب التباس نہیں تھا' چونکہ صحابہ کرام کو نبی کریم کا نام مبارک لے کر پکارنے کی ممانعت تھی' چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ [النور:٦٣] اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جو تعلیم عقلی دی ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے اللہ جل شانہ نے اپنے کلام میں "یا ایها النبی" جیسے الفاظ سے مخاطب فرمایا ہے' بخلاف دوسرے انبیاء کے کہ ان کو ان کے ناموں سے پکارا ہے۔ یا آدمؑ یا ابراہیمؑ یا موسیٰ' یا عیسیٰ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام گرامی محمد، کنیت ابوالقاسم، اور لقب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت اپنی اولاد میں سے سب سے بڑے بیٹے کے نام (قاسم) پر تھی۔ تفصیلی بحث ان شاء اللہ حدیث: ۴۷۷۲ آئے گی۔

میرے نام پر نام تو رکھو

۴۷۵۱: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَمُّوْا بِاِسْمِيْ وَلَا تَكْتَنُوْا بِكُنْيَتِيْ فَاِنِّيْ اِنَّمَا

جُعِلْتُ قَاسِماً أَقْسِمُ بَيْنَكُمْ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ٦/٢١٧ الحديث رقم ٣١١٤ و مسلم في ٣/١٦٨٣ الحديث رقم (٣-٢١٣٣) والترمذي في السنن ٥/١٢٥ الحديث رقم ٢٨٤٢ و ابن ماجه في ٢/١٢٣٠ الحديث رقم ٣٧٣٦، واحمد في المسند ٣/٣٦٩۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میرے نام پر نام رکھا کرو لیکن میری کنیت پر کنیت مقرر نہ کرو کیونکہ مجھے قاسم بنایا گیا ہے۔ میں تمہارے درمیان تقسیم کرتا ہوں۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: ولا تکتنوا بکنیتی: رسول اللہ کو کنیت کے ساتھ پکارا جانا آپ کی تعظیم کے پیش نظر تھا' چنانچہ اس میں کوئی بھی آپؐ کا شریک نہ ہو۔ پس اس بات کو مکروہ سمجھا جائے گا کہ کوئی شخص اپنی کنیت آپؐ کی کنیت پر رکھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ [النور: ٦٣] اس معنی کو اگلے جملہ میں بیان فرمایا ہے۔

فاني انما جعلت قاسم ای جعلنی الله جامع کی روایت میں ''انا بعثت قاسما'' آیا ہے۔

لأقسم بینکم کا مطلب: چونکہ '' أقسم '' کا مفعول بہ محذوف ہے، اس لئے علماء نے ''شيء مقسوم'' کے بارے میں سیر حاصل مباحث کی ہیں۔ ان مباحث کو تلخیص کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

① میں علم وغنیمت وغیرہ تقسیم کرتا ہوں۔

② صالحین کو بشارت اور طالحین کو نذارت تقسیم کرتا ہوں۔

③ درجات ودرکات تقسیم کرتا ہوں۔

یہ سب ہی مراد ہیں' سب کے مراد ہونے میں کوئی مانع نہیں' جیسا کہ اس پر حذف مفعول دلالت کر رہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ صفت چونکہ تمہارے اندر موجود نہیں، صرف لفظ کی حد تک ظاہری اشتراک ہے۔ حاصل یہ کہ میں محض اس سبب سے ابوالقاسم نہیں ہوں، کہ میرے بیٹے کا نام ''قاسم'' ہے۔ بلکہ مجھ میں ''قاسمیت'' کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے، بایں طور کہ مجھ کو دینی و دنیاوی امور و دولت کا تقسیم کنندہ قرار دیا گیا ہے، لہٰذا جب میں نہ تو ذات کے اعتبار سے اور نہ اسماء وصفات کے اعتبار سے تم میں سے کسی بھی شخص کی مانند ہوں، تو تم لوگوں کو میری کنیت پر اپنی کنیت مقرر نہیں کرنی چاہئے۔

اس اعتبار سے ''ابوالقاسم'' صوفیہ کے قول ''ابوالوقت'' کی نظیر ہے۔ ''ابوالوقت'' کا مطلب ہوتا ہے: صاحب الوقت وملازمہ الذی لاینفك عنه۔ چنانچہ ''ابوالقاسم'' کا مطلب ہوگا صاحب هذا الوصف۔

(واضح رہے، کہ اس صورت میں ابو کے معنی باپ کے نہیں ہوں گے، بلکہ اس وصف کے معنی ہوں گے،) جیسا کہ کسی شخص کو ''ابوفضل'' کہا جائے، اگرچہ فضل نام کی اس کی کوئی اولاد ہی نہ ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ کنیت ایک قسم، کا لقب محمود ہے۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ نام

۴۷۵۲: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اَحَبَّ اَسْمَاءِ كُمْ إِلَى اللّٰهِ

عَبْدُ اللّٰهِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱۶۸۲/۳ الحدیث رقم (۲۱۳۲-۱۲) و ابوداؤد فی السنن ۲۳۶/۵ الحدیث رقم ۴۹۴۹، والترمذی فی ۱۲۱/۵ الحدیث رقم ۲۸۳۳ وابن ماجه فی ۱۲۲۹/۲ الحدیث رقم ۳۷۲۸، والدارمی فی ۳۸۰/۲ الحدیث رقم ۲۱۹۵، واحمد فی المسند ۳۴۵/۴۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے ہاں سب سے زیادہ پسندیدہ تمہارے ناموں میں سے عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے:

امام حاکم نے ''الکنی'' میں اور امام طبرانی نے ابوزہیر ثقفی سے مرفوعاً روایت کیا ہے: اذا سمیتم فعبدوا۔ أی: انسبوا عبودیتهم الی اسماء الله.

■ عبدالرحیم اور عبدالملک، وغیرہ نام رکھنے چاہئیں۔ ■ عبد الحارث، عبد الغنی، وغیرہ کی طرح کے نام رکھنا جائز نہیں۔ ■ لوگوں میں ذائع شائع ناموں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

'' أسمائکم '' کی اضافت سے پتہ چلتا ہے، کہ اللہ عزوجل کے نزدیک انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں۔ پھر تمہارے (رکھے ہوئے) ناموں میں سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔ لہٰذا نام ''محمد'' بھی ان ناموں میں سے ہے، جو نام اللہ کو سب ناموں میں سب سے زیادہ پسند ہیں۔ وگرنہ اتنی بات تو بہر حال ہے، ان ناموں (عبداللہ اور عبدالرحمٰن) کا درجہ نام محمد کے مساوی ہے یا اسم محمد ان دونوں ناموں سے زیادہ محبوب ہے مطلقاً یا من وجہ۔ واللہ أعلم۔

افلح و یسار ناموں سے ممانعت فرمائی

۴۷۵۳: وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُسَمِّيَنَّ غُلَامَكَ يَسَارًا وَّلَا رَبَاحًا وَلَا نَجِيْحًا وَّلَا اَفْلَحَ فَاِنَّكَ تَقُوْلُ اَثَمَّ هُوَ فَلَا يَكُوْنُ فَيَقُوْلُ لَا۔ (رواہ مسلم وفی روایة له قال لَا تُسَمِّ غُلَامَكَ رَبَاحًا وَلَا يَسَارًا وَلَا اَفْلَحَ وَلَا نَافِعًا)۔

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱۶۸۵/۳ الحدیث رقم (۲۱۳۶-۱۰) و ابوداؤد فی السنن ۲۴۳/۵ الحدیث رقم ۴۹۵۸، والترمذی فی ۱۲۲/۵ الحدیث رقم ۲۸۳۶ و ابن ماجه فی ۱۲۲۹/۲ الحدیث رقم ۳۷۳۰، والدارمی فی ۳۸۱/۲ الحدیث رقم ۲۶۹۶، واحمد فی المسند ۷/۵۔

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم ہرگز اپنے غلام کا نام یسار' رباح' نجیح اور افلح نہ رکھو کیونکہ جب تم پوچھو گے مثلاً افلح اس جگہ ہے اور وہ وہاں نہیں ہوگا تو وہ جواب میں کہے گا نہیں۔ یعنی وہ یہاں نہیں ہے۔ (مسلم) اور مسلم ہی کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے غلام کا نام رباح' یسار' افلح

اور نافع نہ رکھو۔

تشریح: لا تسمین: اگر چہ صیغہ خاص ہے، مگر مراد عام ہے۔

غلام: صبی (بچہ) عبد (بندہ، غلام)۔

یسار: یسر سے ماخوذ ہے، یسر ضد ہے عسر کی۔ منصرف ہے۔ چونکہ یاء اصلی ہے۔

رباح: راء کے فتحہ کے ساتھ ربح سے ماخوذ ہے۔ ربح ضد ہے خسارۃ کی۔

نجیحا: نجح سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنی ہے ظفر۔

افلح: فلاح سے ماخوذ ہے۔ غیر منصرف ہے۔ اس کا معنی ہے فوز۔

ثم: ثائے مثلثہ کے فتحہ اور میم کی تشدید کے ساتھ۔ اور حرف استفہام مقدر ہے۔ أی أهناك۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس طرح کے نام رکھنا ممنوع ہے۔

مندرجہ بالا نام رکھنے کی ممانعت کا سبب:

قولہ: فیقول عبارت میں کئی احتمال ہیں: لیس هناك یسار۔ لا رباح عند نا لا نجیح هناك۔ لا أفلح موجود چنانچہ از روئے شگون یہ کوئی اچھی بات نہیں' یا شناعت جواب کی وجہ سے یہ نام رکھنا مکروہ ہیں۔ شرح السنہ میں لکھتے ہیں: لوگ اس کے طرح کے ناموں میں الفاظ و معنی کی نیک فالی کو مدنظر رکھتے ہیں، بسا اوقات معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے، کہ نیک فالی کا پہلو جاتا رہتا ہے، اور بد فالی و شناعت کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی کا نام رباح ہے۔ کوئی پوچھتا ہے۔ رباح ہے؟ گھر والے جواب دیتے ہیں، گھر میں رباح نہیں ہے، (تو اگر چہ اس صورت میں متعین ذات مراد ہے، مگر لفظ "یسار" کے حقیقی معنی کے اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا، کہ گھر میں فراخی و تونگری نہیں ہے۔) وہ اس کی نفی سے بدفالی ہے' اور دل ہی دل میں یسر سے ناامید ہو جائیں گے چنانچہ لوگوں کو اس سبب سے روکا گیا جو سوءِ ظن لاتا ہو اور خیر سے مایوسی پیدا کرتا ہو۔ حمید بن نجویہ فرماتے ہیں: جب کسی شخص کو خود یا اس کے اہل خانہ میں سے کسی شخص کو ان اسماء کی طرف سے آزمائش کا سامنا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ نام تبدیل کر دے۔ اگر اس نے نام تبدیل نہیں کیا اور کسی وقت اس سے پوچھا گیا کہ یہاں (مثلاً) یسار ہے یا برکہ ہے۔ چونکہ ادب یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہاں یسر و برکت ہی ہے۔ الحمد للہ۔ اور قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان امور سے نواز دے' اور یوں نہ کہا جائے کہ وہ یہاں نہیں ہے' اور نہ یوں کہا جائے کہ وہ یہاں سے نکل گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

نافع وغیرہ ناموں کی اباحت

۴۷۵۴: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَرَادَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَنْهٰى اَنْ يُّسَمّٰى بِيَعْلٰى وَبِبَرَكَةَ وَبِاَفْلَحَ وَبِيَسَارٍ وَبِنَافِعٍ وَبِنَحْوِ ذٰلِكَ ثُمَّ رَاَيْتُهُ سَكَتَ بَعْدُ عَنْهَا ثُمَّ قُبِضَ وَلَمْ يَنْهَ عَنْ ذٰلِكَ۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱۶۸۶/۳ الحديث رقم (۱۳-۲۱۳۸) و ابوداؤد في السنن ۲۴۴/۵ الحديث رقم

۴۹۶۰، والترمذی فی ۲۲/۵ الحدیث رقم ۲۸۳۶ و ابن ماجه فی ۱۲۲۹/۲ الحدیث رقم ۳۷۲۹۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یعلی، برکۃ، افلح، یسار، نافع اور اسی طرح کے دیگر اسماء رکھنے کو منع فرمانے کا ارادہ کیا مگر پھر ان سے خاموشی اختیار کی پھر آپ کی وفات ہوگئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نہ روکا۔

(مسلم)

تشریح: **یعلی:** کے فتحہ کے ساتھ 'علی کا مضارع ہے۔

برکة: غیر منصرف ہے۔

بعد: مبنی علی الضم ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہے: **بعد ارادة النهي عن التسمية بما ذكر.**

وبنحو ذلك: اس قبیل کے بعض اسماء کا ذکر ما قبل میں گذر چکا ہے۔

حدیث کا مطلب:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا تھا، کہ لوگوں کو یعلی، برکت، افلح، یسار، نافع اور اس طرح کے دوسرے نام رکھنے سے منع فرمادیں، لیکن اس ارادہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت اختیار فرمایا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ اور ان ناموں کو رکھنے سے منع نہیں فرمایا۔

تعارض:

① حضرت جابر فرماتے ہیں: **أراد النبي ﷺ أن ينهى أن يسمى بيعلى وببركة وبأفلح وبيسار وبنافع وبنحو ذلك ثم رأيته سكت بعد عنها ثم قبض ولم ينه عن ذلك.** (رواہ مسلم)

② حضرت سمرہ بن جندب کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **لا تسمين غلامك يسارا ولا رباحا ولا نجيحا ولا أفلح، فانك تقول أثم هو؟ فلا يكون، فيقول: لا.**

③ مسلم شریف کی ایک اور حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا تسم غلامك رباحا و لا يسارا ولا افلح ولا نافعا.**

④ ابوداؤد اور ابن ماجہ حضرت سمرۃ سے نقل کرتے ہیں: **انه ﷺ نهى أن يسمى أربعة اسماء: أفلح ويسارا ونافعا ورباحا۔**

⑤ طبرانی سند حسن کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود سے نقل کرتے ہیں: **انه ﷺ نهى أن يسمى الرجل حربا أو وليدا أو امرأة أو الحكم أو أبا الحكم أو افلح أو نجيحا أو يسارا۔**

⑥ امام طبرانیؒ نے حضرت بریدہؓ سے روایت نقل کی ہے: **انه ﷺ نهى أن يسمى كلب أو كليب۔**

شرح تعارض:

پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان ناموں اور ان جیسے دوسرے ناموں سے منع کرنے کا

صرف ارادہ فرمایا، منع نہیں فرمایا تھا۔

قیامت کے دن بدترین نام

۴۷۵۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَخْنَی الْاَسْمَاءِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عِنْدَ اللّٰهِ رَجُلٌ یُسَمّٰی مَلِكَ الْاَمْلَاكِ (رواه البخاری وفی روایة مسلم) قَالَ اَغْیَظُ رَجُلٍ عَلَی اللّٰهِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَاَخْبَثُهٗ رَجُلٌ كَانَ یُسَمّٰی مَلِكَ الْاَمْلَاكِ لَامَلِكَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (بخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۰/ ۵۸۱ الحديث رقم ۶۲۰۶ و مسلم في ۳/ ۱۶۸۸ الحديث رقم (۲۰-۲۱۴۳) و ابوداؤد في السنن ۵/ ۲۴۵ الحديث رقم ۴۹۶۱، والترمذي في ۵/ ۱۲۳ الحديث رقم ۲۸۳۷، واحمد في المسند ۲/ ۳۱۵

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن سب سے بدترین ناموں والوں میں سے وہ شخص ہوگا جس کو لوگ شہنشاہ کہتے ہیں۔ (بخاری) اور مسلم کی روایت اس طرح ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے ہاں سب سے خبیث ترین وہ شخص ہوگا جس کو لوگ شہنشاہ کہتے ہیں حالانکہ اللہ کے سوا کوئی شہنشاہ نہیں۔

تشریح: أخنی: خائے معجمہ ساکن ہے اور اس کے بعد نون ہے۔ بمعنی اُقبح۔ اور ''اخنع'' بھی مروی ہے۔

یسمی: تسمیة سے مشتق ہے۔ سید جمال الدین نے اس کی تصریح کی ہے۔ اور یہی ضبط تصحیح شدہ نسخوں کے مطابق ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ مصابیح کے اکثر نسخوں میں صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ میں نے کتاب مسلم کے اصل تصحیح شدہ نسخہ میں بھی اسی طرح دیکھا ہے۔ اور ایک نسخہ میں صیغہ معروف کے ساتھ تائے فوقیہ کے فتحہ اور میم کی تشدید کے ساتھ از باب تفعل ''تسمی'' مصدر سے ہے۔

الأملاك: مَلِك، کی جمع ہے، اس کی جمع ملوک بھی آتی ہے۔ (قاموس) ''ملک'' مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

دوسری، تیسری چوتھی، پانچویں اور چھٹی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان ناموں سے منع فرمایا تھا۔

رفع تعارض:

اس تعارض کے متعدد جواب ہیں:

① امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ گویا حضرت جابر نے ممانعت کی علامتوں کو دیکھا اور وہ چیز سنی جو ممانعت کی طرف اشارہ کرتی ہے چونکہ انہوں نے ممانعت کا حکم صریح طور سے نہیں سنا تھا اس لئے اس مسئلہ کو انہوں نے مذکورہ اسلوب میں بیان کیا لیکن یہ ممانعت چونکہ حضرت سمرہ کی پچھلی حدیث سے ثابت ہے اور ضابطہ ہے: **شهادت الاثبات أثبت** ۔ اس لئے یہی کہا جائے گا کہ ممانعت ثابت ہے۔

میرے نزدیک ایک اور تاویل ہے وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ اس ممانعت کو نہی تحریمی کے طور پر نافذ کرنے کا تھا لیکن

اس کے بعد آپ ﷺ نے امت کے حق میں آسانی ونرمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے سکوت فرمایا کیونکہ ناموں کا مسئلہ ایسا ہے کہ اچھے وبرے ناموں میں فرق وامتیاز نہیں۔ لہٰذا کہا جائے گا کہ نہی منفی کا تعلق نہی تحریمی سے ہے اور نہی مثبت کا تعلق نہی تنزیہی سے ہے۔ پس مذکورہ طرح کے نام رکھنا مکروہ تنزیہی ہے مکروہ تحریمی نہیں ہے۔

تعارض کے جواب کا حاصل' پہلے جواب کا حاصل:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت نافی ممانعت ہے، اور حضرت سمرہ بن جندب وغیرہ کی روایات مثبت ممانعت ہیں اور تعارض کے وقت نافی پر مثبت کو ترجیح دیتے ہیں، لہٰذا حضرت جابر کی روایت کو ترجیح حاصل ہوگی۔

دوسرے جواب کا حاصل:

حضرت جابرؓ کی روایت مثبت ممانعت ہے، وہ تحریم پر محمول ہے۔ اور حضرت سمرہ بن جندب وغیرہ کی روایات نافی ممانعت ہیں، وہ تنزیہہ پر محمول ہیں۔

قولہ: أغيض رجل على الله : أغيظ: اسم تفضیل کا صیغہ ہے، مبنی للمفعول ہے۔ **أي: اكثر من يغضب عليه ويعاقب.** یہاں یہ تاویل کی جائے گی' چونکہ غیظ' انتقام سے عاجز شخص کے غصہ وغضب کو کہتے ہیں۔ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حق میں مستحیل ہے' لہٰذا یہ کنایہ ہے اس اسم کی شدت کراہت سے' یا اس کی عقوبت سے مجاز ہے اس کا مضاف الیہ اگرچہ مفرد ہے۔ مگر معنوی اعتبار سے جمع ہے۔ **ای: أشد اصحاب الأسماء الكريهة عقوبة.** "علی اللہ": یہاں مضاف محذوف ہے۔ **ای بناء على حكمه۔**

قولہ: يسمي تمام "اصول" میں از باب تفعیل، تسمیہ مصدر سے صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ علامہ ابن حجرؒ کے کلام سے اس کا صیغہ معروف کے ساتھ ہونا مفہوم ہوتا ہے، ان کی عبارت ملاحظہ ہو: **أي: يسمي نفسه بذلك فيرضى أن اسمه على ذلك.**

قولہ: لا ملك الا الله :اى لا سلطان الا الله ۔

یہ جملہ مستانفہ ہے' تحریم تسمیہ کی علت کا بیان ہے۔ یہ جملہ واضح کر رہا ہے کہ بادشاہ حقیقی بس اللہ ہی ہے۔ اور غیر اللہ کی ملکیت مستعار ہے۔ بس جو شخص یہ نام رکھے گا اس نے اللہ تعالیٰ سے اللہ کی رداء وکبریائی میں جھگڑا کیا' حالانکہ اللہ تعالیٰ حدیث قدسی میں فرماتا ہے: **الكبرياء ردائي 'والعظمة ازاري 'فمن نازعني فيها قصمته** ۔ بس جب بندہ اللہ کا بندہ کہلانے میں استنکاف محسوس کرتا ہے تو سرعام رسوائی کو وہ اپنے اوپر مسلط کر لیتا ہے۔

جامع صغیر میں ہے کہ اس حدیث کو شیخین' ابوداؤد اور ترمذی نے ان الفاظ میں روایت کیا ہے:

أخنع الأسماء عند الله يوم القيامة رجل يسمى ملك الأملاك لا مالك الا الله. (انتہیٰ) اس کے ظاہر کا تقاضا ہے کہ "املاک" ملک بالکسر کی جمع ہے۔ چنانچہ اس معنی میں ہو تو تب بھی مذموم ہے

❁ مسلم کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: **أخنع اسم عند الله ......**

أخنع: أوضع، أذل با عتبار مسماہ۔ (یعنی اسم کو أخنی و أخنع فرمانا باعتبار مسمّٰی کے ہے۔)
شیخ محی الدین فرماتے ہیں: احمد بن حنبلؒ نے ابوعمرو سے اخنع کے (معنی کے) بارے میں پوچھا۔ انہوں نے فرمایا: أوضع۔ چنانچہ معنی یہ ہوگا: اشد ذلا وضغا را یوم القیامۃ۔

❁ ملك الاملاك، میں ایک احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ۔ اس کو مالک پڑھا جائے جیسا کہ ﴿ملك یوم الدین﴾ [الفاتحۃ ۔۴] میں۔ اتفاق ہے کہ رسم الخط بغیر الف کے ہے، (اگرچہ قراءت متواترہ مالك یوم الدین ہے۔) واللہ اعلم۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس حدیث میں کلام کو مجازی معنی پر محمول کرنا ضروری ہے چونکہ یوم قیامت کے ساتھ مقید کرنا باوجودیکہ دُنیا میں بھی اس کا حکم یہی ہے اشارہ ہے اس پر مترتب ہونے والے مسبّب یعنی انزال ہوان وحلول عقاب کی طرف۔

أخنی الاسماء یوم القیامۃ عند اللہ رجل الخ کی ترکیب:

أخنی: مبتدا ہے۔ الاسماء: مضاف الیہ ہے۔ ''رجل'' خبر ہے چونکہ مبتدا خبر میں مطابقت نہیں، لہٰذا تاویل ضروری ہے۔ چنانچہ ''رجل'' کی دو ترکیبیں کی گی ہیں:

Ⅰ رجل: مضاف الیہ ہے اور مضاف مقدر ہے۔ اصل یوں ہے: اسم رجل. Ⅱ ''اسم'' بول کر مجازاً ''مسمی'' مراد ہے۔ أی: أخنی الرجال یوم القیامۃ عند اللہ رجل. لہٰذا رجل، خبر ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿سبح اسم ربك الاعلی﴾ اس آیت میں مبالغہ ہے، بایں طور کہ جب اللہ جل شانہ کا اسم گرامی مقدس عمالا یلیق بذاتہ ہے، تو اللہ جل شانہ کی ذات گرامی تو بطریق اولیٰ مقدس عمالایلیق بذاتہ ہوگی۔ اور یہاں حدیث باب میں اسم محکوم علیہ بالصغار والھوان ہے، تو ''مسمّٰی'' کا کیا حال ہوگا؟ جب اسم کا یہ حکم ہے۔ تو مسمّٰی کا حکم کیا ہوگا؟ اور یہ (وعید) اس صورت میں ہے، کہ جب مسمّٰی، اس نام پر راضی ہو۔ اس نام کو مستقل طور پر برقرار رکھے اور تبدیل نہ کرتا ہو۔ یہ تاویل ماقبل تاویل کے مقابلہ میں ابلغ و اولیٰ ہے، چونکہ یہ تأویل: ''أغیظ رجل'' والی روایت کے موافق ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: ای أکبر منا یغضب علیہ غضبا، یہ اسم تفضیل مبنی للمفعول ہے۔ جس طرح کہ ''الوم'' ہے اور مفرد کی طرف اضافت کرنا جنس واستغراق کے لئے ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہاں لفظ علی أغیظ، کا صلہ نہیں ہے (چونکہ معنوی طور پر درست نہیں ہے۔)، جیسا کہ کہا جاتا ہے: اغتاظ علی صاحبہ وتغیظ علیہ، چونکہ معنی اس سے میل نہیں کھاتا، لیکن بیان ہے، گویا جب یہ کہا گیا: أغیظ رجل تو پوچھا گیا: علی من؟ تو جواب میں ارشاد فرمایا: علی اللہ. جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿هیت لك﴾ [یوسف۔۲۳] کہ یہاں ''لك'' اسم صوت کا بیان ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں تقدیر ایسی ہونی چاہئے جو تغیر کا فائدہ دے تا کہ دفع فساد ہو بلکہ انہوں نے جو تقدیر اختیار کی ہے اس میں شر ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظیر یہ پیش کر دہ آیت نہیں ہے۔، اس کی نظیر میرے پاس یہ ہے کہ اصل لغت میں لفظ غیظ علی کے صلہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے، بخلاف ھیت کے، چونکہ وہ تو سرے سے ہی غیر متعدی ہے، بلکہ اس کے معنی ہیں: قبل وبادر أو تھیأت، بہردو توجیہہ یہ کلمہ اسم فعل ہے مبنی علی الفتح ہے۔ جمہور قراء کے نزدیک '' این '' کی طرح۔ اور لام برائے تبیین ہے۔ جیسا کہ ''سقیاً لك'' میں ہے۔ لہٰذا وہی تاویل اولیٰ ہے، جو ہم نے ماقبل میں ذکر کی۔

صاحب النہایہ کا کہنا ہے، کہ یہ کلام مجاز پر محمول ہے' ظاہر سے معدول ہے، چونکہ غیظ، ایک ایسی صفت ہے جو مخلوق کو غضب کے وقت لاحق ہوتی ہے، اور اللہ جل شانہ اس اسم سے منزہ ومبرا ہیں، یہ اس کے مسمیٰ کی عقوبت سے کنایہ ہے. أي انه أشد أصحاب هذه الأسماء عقوبة عند الله سبحانه.

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: غیظ وغضب اعراض نفسانیہ میں سے ہیں، ان کی ایک ابتداء ہوتی ہے، اور ایک انتہاء ہوتی ہے۔ جب ان اعراض سے اللہ جل شانہ کو موصوف مانا جاتا ہے، تو اس وقت ان اعراض کو ان کے غایت والے معنی پر محمول کرنا متعین ہوتا ہے، چنانچہ یہاں انتقام مراد ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ان کے ابتدائی معانی یعنی تغییر نفسانی پر محمول نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ اس تقریر کی بناء پر یہاں "علی" وجوب کے معنی میں ہے، أي: واجب علی الله تعالیٰ علی سبیل الوعید أن یغیظ علیه وینکل به، ویعذبه أشد العذاب.

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں یہ صاحب النہایہ کے کلام کی غایت ہے۔ اور غایت یہ ہے کہ انہوں نے اتنی بات اضافی فرمائی کہ "علی" وجوب کے لئے ہے، اس مقام پر یہ معنی مراد لینا صحیح نہیں چونکہ اللہ تعالیٰ پر لذاتہ کوئی بھی شئی واجب نہیں ہے۔ انہی امور کا وقوع واجب جن امور کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حتمی طور پر خبر دی ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ ان الله لایغفر أن یشرك به﴾ پس کہا جائے گا کہ کفار کے لئے وقوع عذاب واجب ہے وگرنہ اللہ تعالیٰ کے اخبار میں تخلف واقع ہوگا پس یہ واجب لغیرہ ہے۔ یہ بات اس مقام پر درست نہیں ہے' چونکہ شرک کے علاوہ امور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہیں۔ پس یہ کہنا صحیح نہیں کہ علی سبیل الوعید اللہ پر عذاب دینا واجب ہے۔ فتدبر و تامل لئلا تقع فی الخلل والخطر ۔ میں نے اس مسئلہ کی وضاحت اپنے رسالہ "القول السدیدی فی خلف الوعید" میں کی ہے۔۔

ملك الاملاك کا مطلب:

اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ حقیقی بادشاہت ایک ایسا وصف ہے۔ جو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، اس وصف میں کوئی شریک تو کیا ہوگا، شراکت کا وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا کوئی بھی شخص نہ صرف یہ نام نہ رکھے، بلکہ اس جیسا کوئی بھی نام نہ رکھے، خواہ وہ نام کسی بھی زبان کا ہو، عربی ہو، خواہ فارسی ہو، خواہ کوئی اور ہو۔ چنانچہ کوئی بھی شخص اس قسم کے اسماء پر کسی بھی مخلوق کا نام نہ رکھے۔

ملك الاملاك کے ہم معنی چند الفاظ کا بیان:

① شرح مسلم میں امام نوویؒ "ملك الأملاك" کے تحت لکھتے ہیں: ابن أبی شیبہ کی روایت میں لامالك الا الله کا اضافہ ہے، سفیان " ملك الاملاك" کی وضاحت میں فرماتے ہیں، اس کا مطلب ہے شہنشاہ یعنی عجمیوں کی زبان میں "شاہ شاہان"۔

② قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: ایک روایت میں "شاہ شاہ" آیا ہے۔ اور بعض لوگوں کا زعم ہے، کہ درست لفظ "شاہ شاہان" ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اسی طرح ہے چونکہ اضافت کے معنی اسی صورت میں متحقق ہوسکتے ہیں۔ یا مضاف مقدر مانا

جائے اور یوں کہا جائے: شاہ کل۔ قاضیؒ فرماتے ہیں پس جو روایت میں آیا ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا' چونکہ کلام عجم مضاف اور مضاف الیہ میں تقدیم و تاخیر پر مبنی ہے اور یہ بات صرف شاہنشاہ میں درست ہو سکتی ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں پس اعتبار بدل جائے گا اور معنی ہو گا ''شاہان راشاہ''۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں تحقیقی بات وہی ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ لہٰذا راء کی زیادتی کی ضرورت نہیں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ شاہ ملوک' شاہان السلوک' اور قاضی القضاۃ بھی اسی قبیل سے ہے۔

۳ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''ملک شاہ'' بھی اسی سے ملحق ہے۔

۴ بعض حضرات نے ''ملك الأملاك'' میں تاویل کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص اپنا یا کسی کا نام اللہ تعالیٰ کے اسماء پر رکھے: مثلاً الرحمٰن، الجبار، العزیز وغیرہ۔

شرح السنہ میں فرماتے ہیں کہ سفیان کا کلام اشبہ ہے' اور ہر ایک کی توجیہ ہوتی ہے۔

لفظ شہنشاہ کی لغوی تحقیق:

اس لفظ کو شہنشاہ، اور شاہنشاہ دونوں طرح پڑھا جاتا ہے۔ پہلا تلفظ معروف و مشہور ہے۔ بہر تقدیر یہ عجمی زبان کا لفظ ہے۔ مرکب اضافی ہے، اس کا معنی ہے ''بادشاہوں کا بادشاہ''۔ شاہ، فارسی زبان کا لفظ ہے، مذکر ہے۔ اس کی جمع ''شاہان'' آتی ہے۔ ''شاہ'' میں تخفیف کر کے ''شہ'' بھی بولا جاتا ہے۔ لفظ شہنشاہ/ شاہنشاہ، اپنی اصل کے اعتبار سے شاہ شاہان تھا۔ شاہ مضاف، شاہان مضاف الیہ پھر مضاف الیہ کو مضاف پر مقدم کر دیا گیا، چنانچہ ''شاہانِ شاہ'' ہو گیا۔ پھر تخفیف کی غرض سے الف کو حذف کر دیا گیا، اور ہاء کو فتحہ دے دیا گیا، تو شہنشاہ ہو گیا۔ شہنشاہ کے معنی کی عربی وضاحت ''سلطان السلاطین'' کے ساتھ کی جاتی ہے۔

برہ نام کو بدل دیا

۴۷۵۶: وَعَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ اَبِیْ سَلَمَةَ قَالَتْ سُمِّيْتُ بَرَّةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَهْلِ الْبِرِّ مِنْكُمْ سَمُّوْهَا زَيْنَبَ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه البخاري في صحيحه ۵۷۵/۱۰ الحديث رقم ۶۱۹۲ و مسلم في ۱۶۸۷/۳ الحديث رقم (۱۹-۲۱۴۲) و ابوداؤد في السنن ۲۳۹/۵ الحديث رقم ۴۹۵۳ و ابن ماجه في ۱۲۳۰/۲ الحديث رقم ۳۷۳۲، والدارمي في ۳۸۱/۲ الحديث رقم ۲۶۹۸

ترجمہ: حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میرا نام برہ یعنی نیکوکار رکھا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے نفس کی تعریف نہ کرو' تم میں جو شخص نیکوکار ہے اس کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اس کا نام زینب رکھو۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

زینب بنت ابی سلمہ۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا جو ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے ہیں یہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہیں ان کا نام بھی

''برہ'' تھا۔ آنحضور ﷺ نے بدل کر ''زینب'' رکھ دیا ملک ''حبشہ'' میں پیدا ہوئیں۔ عبداللہ بن زمعہ کی زوجیت میں رہیں۔ اپنے زمانہ کی عورتوں میں سب سے زیادہ فقیہ ہیں۔ ان سے ایک جماعت نے حدیث کی روایت کی۔ واقعہ ''حرہ'' کے بعد ان کی وفات ہوئی۔ ''برۃ'' بائے موحدہ کے فتحہ اور رائے مہملہ کی تشدید کے ساتھ ہے۔ ''برۃ'' بارۃ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔

تشریح: سمیت: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

برۃ: بائے موحدہ کے فتحہ اور رائے مشددۃ کے ساتھ۔

''بارۃ'': اسم مبالغہ ہے بطور وصف کے یا مصدر کے۔

برّ: اسم لکل فعل مرضی (ہر پسندیدہ کام)

لفظ ''زینب'' کی لغوی تحقیق صاحب قاموس نے یوں ذکر کی ہے:

- زنب، بروزن'' فرح '' بمعنی سمن (موٹاپا) ہے اور'' ازنب'' سمین (موٹا)۔ لفظ زینب بھی اسی سے ماخوذ ہے، بطور اخبار کے یا تفاؤل کے۔
- زبانا العقرب (بچھو کا ڈنک) سے مشتق ہے۔
- زیب سے مشتق ہے'' زیب'' ایک خوشبودار خوش منظر درخت ہے۔
- اصل میں'' زین أب'' تھا۔ (ہمزہ کو حذف کر دیا اور ہمزہ کی حرکت ماقبل نون کو دے دی)

الجامع الصغیر میں منقول ہے: كان ﷺ يلاعب زينب بنت أم سلمة و يقول: ياوزينب يا زوينب ۔مرارا۔ رواه الضياء عن أنس۔

۴۷۵۷: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَتْ جُوَيْرِيَةُ اِسْمُهَا بَرَّةَ فَحَوَّلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْمَهَا جُوَيْرِيَةَ وَكَانَ يَكْرَهُ اَنْ يُقَالَ خَرَجَ مِنْ عِنْدِ بَرَّةَ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱۶۸۷/۳ الحدیث رقم (۱۶-۲۱٤۰)، واحمد فی المسند ۳۱٦/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ایک زوجہ مطہرہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا نام برہ تھا تو آپ ﷺ نے ان کا نام جویریہ رکھ دیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو یہ پسند نہ تھا کہ کوئی یوں کہے کہ آپ برہ کے پاس سے نکلے ہیں۔

(مسلم)

تشریح: فحول رسول الله ﷺ اسمها جويرية:

جويرية: جیم کے ضمہ کے ساتھ'' جارية '' کی تصغیر ہے

لفظ جویریہ میں دو ترکیبی احتمال ہیں:

- منصوب بنزع الخافض ہے۔ أی: الی جويرية.
- حول، بمعنی ''صيّر'' کا مفعول بہ دوم ہے۔

''كان يكره'' کی ضمیر کا مرجع: اس کے مرجع کے بارے میں دو احتمال ہیں:

- حضرت محمد ﷺ ہیں۔
- حضرت عبداللہ ابن عباس ہیں۔

تعارض:

① وعن زینب بنت ابی سلمة قالت سمّیت برة فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لا تزکوا انفسکم اللّٰہ اعلم باهل البرّ منکم سموها زینبَ.

② وعن ابن عبّاس قال کانت جویریة اسمها برّة فحوّل رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیه وسلّم اسمها جویریّة وکان یکره ان یُقال خرج من عند برّة.

تشریح تعارض:

حضرت زینب کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے "برۃ" کا نام بدلنے کا سبب "تزکیہ نفس کا اندیشہ" تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ برہ نام بدلنے کا باعث "تطیر" (بدفالی) کا اندیشہ تھا۔

رفع تعارض:

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

① ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ اسباب کے درمیان کوئی مزاحمت نہیں ہوا کرتی ایک چیز کے دو مختلف سبب ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جن دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ دونوں مذکورہ ممانعت کا سبب بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں ہو سکتا ہے کہ زینب کے خاندان وقبیلہ کے لوگوں سے معلوم کرنے کے بعد یہ واضح ہوا ہوگا کہ انہوں نے زینب رضی اللہ عنہا کا نام واقعتا ان کے نفس کی تعریف اور مدح وثنا کے قصد سے رکھا تھا جب کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے حق میں اس ممانعت کا سبب (آنحضرت ﷺ برہ کے پاس سے نکلے) کہے جانے کی ناپسندیدگی کو قرار دیا اور یہ بات تھی کہ ازواج مطہرات کے پاس آنحضرت ﷺ کے جانے آنے کے بارے میں عام طور پر اسی طرح کہا جاتا تھا کہ آنحضرت ﷺ فلاں زوجہ مطہرہ کے پاس تشریف لے گئے ہیں یا آنحضرت ﷺ فلاں زوجہ مطہرہ کے ہاں سے نکلے ہیں۔

عاصیہ نام تبدیل فرمادیا

۴۷۵۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ بِنْتًا کَانَتْ لِعُمَرَ یُقَالُ لَهَا عَاصِیَةُ فَسَمَّاهَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ جَمِیْلَةَ۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۳/۱۶۸۷ الحدیث رقم (۱۵-۲۱۳۹) وابوداوٗد فی السنن ۵/۲۳۸ الحدیث رقم ۴۹۵۲، والترمذی فی السنن ۵/ ۱۲۰ الحدیث رقم ۲۸۳۸ و ابن ماجه فی ۲/ ۱۲۳۰ الحدیث رقم ۳۷۳۳، والدارمی فی ۲/ ۳۸۱ الحدیث رقم ۲۶۹۷۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک بیٹی تھی جس کو عاصیہ کہا جاتا تھا چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام جمیلہ رکھا۔ (مسلم)

تشریح: اس لفظ کے مادہ اشتقاق میں دو قول ہیں۔ شاید کہ ان کا یہ نام زمانہ جاہلیت میں تھا۔

◼ یہ عیص سے مشتق ہے۔ عیص کا معنی ہے گنجان درخت عیص کا اطلاق درخت کے اُگنے کی جگہ پر بھی ہوتا ہے۔

① قاموس کی عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، چونکہ انہوں نے یہ کلمہ "معتل العین" میں ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں: **الأعياص من قريش، أولاد أمية بن عبد الشمس الاكبر وهم العاص وأبو العاص والعيص، وأبو العيص اھ**۔ اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے کا نام "عیص" تھا۔ وہ بھی اسی سے ماُ خوذ ہے۔ یاء کو الف سے بدل دیا گیا تو عاص ہو گیا۔ عاص اور ابو العاص بھی اسی سے ماُ خوذ ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ عاصیۃ عاص کا مؤنث ہے نہ کہ عاصی کی تانیث، عیص سے ماخوذ ہے نا کہ عصیان سے، لیکن چونکہ اشتباہ لفظ لازم آتا ہے اور متبادر الی الذھن بھی یہی معنی ہیں اسی لئے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کا نام بدل دیا۔

② عاص، "عصیان" سے ماخوذ ہے عاصی کا مخفف ہے۔ صاحب "الفائق" فرماتے ہیں: اس نام کو آپ نے ناپسندیدہ قرار دیا۔ اس لئے (یہ نام لفظی مفہوم کے اعتبار سے عصیان وسرکشی، عدم اطاعت اور نافرمانی پر دلالت کرتا ہے جب کہ) مؤمن کا شعار اطاعت وفرمانبرداری ہے اس لئے کسی مؤمن کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ عاص یا عاصیہ نام رکھے۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کا دستور تھا، کہ وہ اپنے بچوں کے نام عاصی یا عاصیہ رکھتے تھے۔ وہ ایسے ناموں سے گزر کرتے تھے جو قبول نقائص اور رضا بر ظلم کے معنی پر دلالت کرتے ہوں اسلام نے ان ناموں کو ناپسندیدہ قرار دیا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: بظاہر متضاد نام رکھنا چاہئے تھا۔ عاصیۃ، کی ضد مطیعۃ ہے، لہٰذا ان کا نام مطیعۃ، رکھا جاتا، لیکن چونکہ مطیعۃ، نام میں بھی دو خرابیاں تھیں، اس لئے یہ نام نہیں رکھا۔ پہلی خرابی تزکیہ نفس تھی اور دوسری خرابی بد فالی تھی۔ لہٰذا "جمیلہ" نام رکھا۔ چونکہ ایک اعتبار سے یہ بھی عاصیۃ، کا متضاد تھا۔ بایں طور کہ **الجميل لا يصدر منه الا الجميل و البر**۔

ملا علی قاریؒ، طیبیؒ کی بات پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اولاً نام بدلتے وقت یہ کوئی ضروری نہیں کہ متضاد نام رکھا جائے۔ (لہٰذا کوئی بھی مناسب نام رکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا واقعہ میں اس بات کی رعایت کا ہونا کوئی ضروری نہ تھا۔)

ثانیاً: "عاصیہ" کا مقابل "مطیعہ" ہے، جیسا کہ ہم نے ماقبل میں بیان کیا ہے۔ لہٰذا یہ "جمیلۃ" بظاہر حسنۃ کے معنی میں ہے۔ **التي لا يصدر منها الا الجميل و البر** کے اگر یہ معنی مراد ہوں، تو اس میں بھی وہی دونوں خرابیاں موجود ہیں۔ جو مطیعۃ، میں تھیں۔ واللہ اعلم۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبیح نام کو بدل ڈالنا مستحب ہے، جس طرح کے مکروہ نام کو اچھے نام سے بدلنا مستحب ہے۔

منذر نام تجویز فرمایا

۴۷۵۹: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ اُتِيَ بِالْمُنْذِرِ بْنِ اَبِيْ اُسَيْدٍ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ وُلِدَ فَوَضَعَهٗ عَلٰى فَخِذِهٖ فَقَالَ مَا اسْمُهٗ قَالَ فُلَانٌ قَالَ لَا وَلٰكِنْ اِسْمُهُ الْمُنْذِرُ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۰/۵۷۵ الحديث رقم ٦١٩١ و مسلم في ۳/١٦٩٢ الحديث رقم (۲۹-۲۱٤۹)

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ منذر بن ابی اسید کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیدائش کے بعد لایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی ران پر رکھا اور دریافت فرمایا کہ اس کا نام کیا ہے؟ لانے والے نے بتلایا کہ اس کا فلاں نام ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ اس کا یہ نام مناسب نہیں بلکہ اس کا نام منذر ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: لفخذ: فاء کے فتحہ اور خائے معجمہ کے سکون کے ساتھ' صاحب قاموس لکھتے ہیں: الفخذ ککتف مابین الساق والورك مؤنث کا لفخذ ویکسر۔

قال فلان : وہ نام کیا تھا؟ یہ نہیں پتہ چل سکا۔

قال: لا، لکن اسمه المنذر:

عرضِ مرتب:

فوقانی متن میں عبارت اسی طرح ہے' البتہ تحتانی متن میں ''لا'' موجود نہیں ہے' چنانچہ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ایک نسخہ میں ''لکن'' ہے۔ اس کی اصل تقدیری عبارت یوں ہے: لا أرضى بذلك لكن اسمه المنذر.

امام طیبیؒ نے تقدیری عبارت یہ ذکر کی ہے: لا أرضى بما سمّيتموه، ولكن أرضى له أن يكون اسمه المنذر

''المنذر'': ذال معجمہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

منذر نام رکھنے کی وجہ:

ہوسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک فالی کے طور پر رکھا ہو، اور قرآن کریم کی اس آیت کریمہ میں موجود ''تفقہ فی الدین'' کا مفہوم پیش نظر ہو: ﴿لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾ [التوبة:۱۲۲]

موہم الفاظ میں احتیاط

۴۷۶۰: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ عَبْدِيْ وَاَمَتِيْ كُلُّكُمْ عَبِيْدُ اللّٰهِ وَكُلُّ نِسَآءِكُمْ اِمَاءُ اللّٰهِ وَلٰكِنْ لِيَقُلْ غُلَامِيْ وَجَارِيَتِيْ وَفَتَايَ وَفَتَاتِيْ وَلَا يَقُلِ الْعَبْدُ رَبِّيْ وَلٰكِنْ لِيَقُلْ سَيِّدِيْ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِيَقُلْ سَيِّدِيْ وَمَوْلَايَ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَا يَقُلِ الْعَبْدُ لِسَيِّدِهٖ مَوْلَايَ فَاِنَّ مَوْلٰكُمُ اللّٰهُ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه البخاري في صحيحه ۵/۱۷۷ الحديث رقم ۲۵۵۲ و مسلم في ٤/١٧٦٤ الحديث رقم (۱۵-۲۲٤۹)

وابوداؤد في السنن ۵/۲۵٦ الحديث رقم ٤٩٧٥، واحمد في المسند ۲/٤٩٦۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں کوئی شخص اپنے غلام ولونڈی کو اس طرح کہہ کر مت بلائے عبدی، امتی، تم تمام اللہ تعالیٰ کے بندے اور تمہاری بیویاں اللہ تعالیٰ کی بندیاں ہیں بلکہ تمہیں اس طرح

کہنا چاہیے غلامی وجاریتی وفتای وفتاتی۔ اسی طرح غلام اپنے آقا سے خطاب کے وقت اس طرح نہ کہے ربی بلکہ کہے سیدی اور ایک روایت میں اس طرح ہے سیدی ومولای کہنا چاہیے اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا کو میرا مولا نہ کہے کیونکہ تمہارا مولا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ (مسلم)

تشریح: **لا یقولن احدکم عبدی و امتی:** یعنی نہ یا عبدی یا امتی کہہ کر پکارے اور نہ ''عبدی فلان' امتی فلانۃ'' کہے۔

لفظ عبد ایک خاص مفہوم کا حامل ہے اور اسلامی عقیدے کے مطابق انسان اللہ تعالیٰ ہی کا عبد بندہ ہے اور ہو سکتا ہے' ایک دوسرے انسان کا بندہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ''عبد'' عبادت کرنے والے کو کہتے ہیں اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہو سکتی ہے۔ کسی مخلوق کی نہیں اس اعتبار سے اگر کوئی انسان' کسی دوسرے انسان کو عبدی یعنی اپنا بندہ کہتا ہے تو وہ حقیقت عبدیت میں شرک کا مرتکب ہو رہا ہے یا شرک کا مرتکب نہ سہی ارتکاب شرک کے گمان کا سبب بن رہا ہے لہٰذا آپ ﷺ نے اس لفظ کو استعمال کرنے سے منع فرمایا۔

قاموس کے مطابق ''امۃ'' کے معنی مملوکہ کے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ کسی بھی انسان کی حقیقی ملکیت صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

عبد اور امۃ کے الفاظ کے استعمال کی اس ممانعت کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ اپنے غرور و تکبر کے اظہار اور باندی کو حقیر و ذلیل جاننے کے طور پر ہو۔ ورنہ غلام و باندی پر لفظ عبد اور امۃ کا اطلاق خود قرآن و حدیث میں منقول ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ﴾ اور ﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ﴾ اس طرح بہت سی احادیث میں بھی غلام اور باندی کو لفظ عبد اور امۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مولا: کے متعدد معانی آتے ہیں: ① متصرف ② ناصر و معین ③ غلام ④ آقا۔

کلکم عبید اللہ: جملہ مستانفہ تعلیلیہ ہے۔ معنوی اعتبار یوں ہے: **کل رجالکم عبید اللہ** ۔ اس کا قرینہ اگلا جملہ: ''**کل نسائکم اماء اللہ**'' ہے۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ پہلے میں عموم ہو بطریق تغلیب' اور دوسرا تخصیص بعد از تعمیم کی قبیل سے ہو۔ توجیہ سابق کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے: ﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ﴾ [النور: ۳۲]

فتای و فتاتی: واؤ بمعنی ''او'' ہے۔

ربی: منادیٰ ہے' یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔

ولکن لیقل غلامی و جاریتی و فتای و فتاتی:

اس جملہ میں ان الفاظ کا بیان ہے جن الفاظ کے ذریعہ غلام و باندی کو یاد اور مخاطب کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ''غلام'' کے معنی لڑکے کے ہیں۔ جاریہ کے معنی لڑکی کے ہیں۔ ''فتی'' کے معنی جوان مرد۔ ''فتاۃ'' کے معنی جوان عورت کے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان الفاظ کے استعمال میں نہ صرف یہ کہ مفہوم کے اعتبار سے کوئی غیر موزونیت نہیں ہے بلکہ ان الفاظ کے ذریعہ ایک طرح سے غلام و باندی کے تئیں شفقت و محبت اور یگانگت و رواداری کے جذبات کا بھی اظہار ہوتا ہے'

رہی یہ بات کہ جب فتی اور فتاۃ جوان مرد اور جوان عورت کو کہتے ہیں تو ان الفاظ کا اطلاق ان غلام اور باندی پر کیسے ہوگا جو عمر رسیدہ اور بوڑھے ہوں؟ جواب: یہ فرمانا ''باعتبار ماکان کے ہے۔ کہ غلام اور باندی' خواہ وہ کتنے ہی بوڑھے ہوں' عام طور پر ان کے آقا اور مالک ان کے ساتھ چھوٹوں اور جوانوں ہی کا سا معاملہ رکھتے تھے اور ان کے بڑھاپے کا وہ لحاظ احترام نہیں کرتے تھے جو ان کی عمر کے دوسرے لوگوں یعنی آزاد بوڑھیوں کا ہوتا تھا۔ خدمت گاری اور کام کاج کے سلسلے میں چونکہ بوڑھے غلام و باندی بھی جوانوں جیسی مستعدی اور چستی رکھتے تھے اس لئے ان کو بھی فتی اور فتاۃ کہا جاتا تھا۔

اس ارشادِ گرامی میں مالکوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے غلام و باندی کو ناشائستہ اور غیر موزوں الفاظ کے ذریعہ مخاطب نہ کریں۔ یہ واضح کرنا ہے کہ اگر اپنے غلام اور باندی کو ایسے الفاظ کے ذریعہ مخاطب کرنا ہی ہو جو ان کی حیثیت ورتبہ کو واضح کرسکیں تو اس مقصد کے لئے عبد اور امۃ سے بہتر مذکورہ الفاظ ہیں۔

ولا یقل العبد ربی:

کوئی غلام و باندی اپنے آقا کو پکارتے وقت یا اس کے بارے میں کوئی خبر دیتے وقت ربی (میرا رب) نہ کہے کیوں کہ اگرچہ رب کے معنی تربیت و پرورش کرنے والے کے ہیں اور ظاہری مفہوم کے اعتبار سے ایک آقا کو اپنے غلام و باندی کا تربیت و پرورش کرنے والا کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ربوبیت علی الاطلاق ایک ایسی خاص صفت ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے لہٰذا کسی انسان کو ''رب'' کہنا شرک کے گمان کا باعث ہے۔

ولکن لیقل سیدی: یہ ظاہر ہے کہ مالک کو اپنے غلام باندی پر سیادت وفضیلت اور امارت وریاست حاصل ہوتی ہے اس اعتبار سے غلام و باندی کا اپنے مالک کو یا سیدی (یعنی اے میرے سردار یا اے میرے آقا) کہہ کر مخاطب کرنا موزوں و مناسب ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے شوہر کو بھی ''سید'' کہا جاتا ہے۔

وفی روایۃ: لا یقل العبد لسیدہ مولای:

ابھی اوپر گزرا کہ غلام و باندی اپنے مالک کو مولی کہیں یہاں فرمایا گیا ہے کہ کوئی غلام و باندی اپنے مالک کو مولی نہ کہے ان دونوں روایتوں کے درمیان پائے جانے والے ظاہری تضاد کو اس تاویل کے ذریعہ دور کیا جاتا ہے کہ مولی کے کئی معنی آتے ہیں۔ جیسے متصرف' منتظم' ناصر اور معین وغیرہ چنانچہ غلام و باندی کو اپنے مالک کے تئیں ''مولی'' کا لفظ استعمال کرنے کی اجازت و جواز کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ وہ اس کے معنی وہ مراد نہ لیں جو حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں جیسے ناصر و معین ہاں جس معنی کا اطلاق بندوں کی ذات پر بھی ہوسکتا ہے جیسے متصرف' منتظم تو ان معنی کو مراد لیتے ہوئے مالک کے لئے لفظ مولی کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولی کا اطلاق '' معتق '' اور '' معتق '' پر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ بخاریؒ کی روایت میں بحوالہ انسؓ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے مولی القوم من انفسھم ہے طبرانی کی روایت میں حضرت سہل بن حنیف سے مروی ہے: مولی الرجل اخوہ۔

مالک کو ''مولی'' کہنے کی ممانعت وعدم جواز کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ اس کے وہ معنی مراد لئے جائیں جو حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں جیسے ناصر اور معین وغیرہ کیونکہ ان کے معنی کے اعتبار سے مولی کے حقیقی معنی صرف حق تعالیٰ

ہے جیسا کہ یہ فرمایا گیا: [نعم المولى ونعم النصير] اس کی روشنی میں دونوں روایتوں کے درمیان کوئی تضاد باقی نہیں رہا حاصل یہ کہ

ورنہ تو غلام اور باندیوں کے لئے "عبد" اور امۃ کا لفظ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے:

① ﴿والصالحين من عبادكم وامائكم﴾ [النور۔ ۳۲]

② ﴿عبدا مملوكا لا يقدر على شيء﴾

③ ﴿اذكرني عند ربك﴾ [یوسف]

④ ﴿ألفيا سيدها لدى الباب﴾ غلاموں اور باندیوں کے مالک بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتلا و امتحان میں ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وجعلنا بعضكم لبعض فتنة﴾[الفرقان۔ ۲۰] اسی طرح اللہ جل شانہ اپنے انبیاء و اولیاء کا امتحان بھی لیتا ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی آزمائش ہوئی کہ ان کو غلام بنالیا گیا۔

(کذا فی شرح السنۃ)

شرح مسلم للنووی میں لکھتے ہیں: علماء فرماتے ہیں، کہ یہ بات مکروہ ہے کہ مملوک اپنے مالک کو "ربی" کہے۔ چونکہ اس میں باری تعالیٰ کے ساتھ مشارکت کا ابہام پایا جاتا ہے۔ اور یہ جو حدیث میں گم شدہ جانور کے بارے میں آتا ہے: حتى يلقاها ربها، تو یہ غیر مکلّف کے لئے استعمال ہوا ہے، چنانچہ یہ دار اور مال کی طرح ہے، اور "رب الدار والمال" کہنے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔ اور جہاں تک بات ہے کہ یوسف علیہ السلام کے ان دو اقوال کی: ﴿اذكرني عند ربك﴾ [یوسف: ۴۲] ﴿انه ربي أحسن مثوى﴾ [یوسف: ۲۳] کی تو اس کے دو جواب ہیں: پہلا جواب یہ ہے کہ انہوں نے ایسے کلمات کے ذریعہ خطاب کیا، کہ جن کو وہ جانتے تھے، اور ضرورت کی بناء پر ایسا کرنا جائز ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ ہماری شریعت میں یہ حکم منسوخ ہے۔ اھ

﴿انه ربي أحسن مثوى﴾ کا اظہر جواب یہ ہے کہ یہ ضمیر اللہ جل شانہ کی طرف راجع ہے۔ أي انه خالقي أحسن منزلتي ومأواي بأن عطف عليّ القلوب فلا أعصيه. اور ﴿اذكرني عند ربك﴾ کا مطلب یہ ہے، اذكر حالي عند الملك كي يخصلني۔ ﴿فانساه الشيطن ذكر ربه﴾ کا مطلب یہ ہے: أنسى يوسف ذكر الله حتى استعان بغيره. اس کی تائید اس حدیث مبارکہ سے بھی ہوتی ہے: رحم الله أخي يوسف لو لم يقل اذكرني عند ربك لما لبث في السجن سبعا بعد الخمس. (كذا في تفسير البيضاوي)

ابو سعید قرشیؒ فرماتے ہیں: جب (یوسف) صاحب بجن سے یہ کہا: ﴿اذكرني عند ربك﴾ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے، اور عرض کیا: الله يقرئك السلام ويقول: من حببك الى أبيك من بين اخوتك؟ ومن قيض لك السيارة لتخليصك؟ ومن طرح في قلب من اشتراك من مودتك حتى قال: ﴿أكرمي مثواه﴾ [یوسف: ۲۱] ومن صرف عنك وبال المعصية؟

اللہ جل شانہ فرماتے ہیں: میں ہی وہ ذات ہوں کہ جس نے ان تمام مواقع پر تیری حفاظت کی، کیا تم کو یہ خوف ہونے لگا

کہ میں تمہیں جیل خانہ میں بھول جاؤں گا، حتی کہ تو نے میرے غیر سے مدد چاہی؟ اور کہا: ﴿اذكرني عند ربك﴾ کیا تیرا رب تیرے قریب نہیں ہے؟ اور کیا تیرا رب صاحب السجن سے تجھے چھٹکارا دلانے پر قادر نہیں ہے؟ تم ضرور بضرور چند سال قید خانہ میں رہوگے، یہ سن کر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: وربی عنی براض؟ تو جبرائیل نے فرمایا: ہاں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: تو تب مجھے پرواہ نہیں، اگرچہ قیامت تک ہی قید خانہ میں کیوں نہ رہنا پڑے۔ (کذا فی حقائق السلمی)

انگور کو کرم نہ کہو

۴۷۶۱: وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاتَقُوْلُوْا الْكَرْمُ فَإِنَّ الْكَرَمَ قَلْبُ الْمُؤْمِنِ۔

(رواہ مسلم)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۰/۵۶۶ الحديث رقم ۶۱۸۳ و مسلم في ٤/۱۷۶۳ الحديث رقم (۷-۷ ٤ ۲ ۲) و ابو داؤد في السنن ۵/۲۵۵ الحديث رقم ٤۹۷٤ والدارمي في ۲/۳۸۲ الحديث رقم ۲۷۰۰ واحمد في المسند ۲/۳۱۶۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (انگور کو) کرم نہ کہو کیونکہ کرم مؤمن کا دل ہے (مسلم)

تشریح: قوله: لاتقولوا الكرم: اصل عبارت یوں ہے: لاتقولوا للعنب الكرم۔

الکرم: راء کے سکون اور فتحہ کے ساتھ۔ بعض نسخوں میں فتحہ کے ساتھ ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: راء کی حرکت کے ساتھ ہے۔ لوم کی ضد ہے۔ کہتے ہیں: أرض كرم. اى طيبة كرم، عنب (انگور) کو بھی کہتے ہیں۔ کریمان: حج و جہاد یہ بھی اسی سے مأخوذ ہے: خير الناس مؤمن كريمين. حدیث میں آتا ہے: لا تسموا العنب الكرم فان الكرم الرجل المسلم. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی غرض یہ نہ تھی کہ انگور کو "کرم" نہ کہا جائے۔

لفظ کرم، راء کے فتحہ اور سکون کے ساتھ بمعنی کریم آتا ہے۔ اور وصف بالعدل کے طریقے پر "عدل" و "ضیف" کی طرح استعمال ہوتا ہے۔ واحد، تثنیہ، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ شرح مسلم میں امام نوویؒ لکھتے ہیں: اہل لغت کہتے ہیں: رجل كرم وامرأة كرم، ورجلان كرم ونسوة كرم، ورجال كرم۔ ان تمام مثالوں میں لفظ "کرم" کے راء کو ساکن و مفتوح دونوں طرح پڑھنا درست ہے بمعنی کریم، وصف بالمصدر ہے۔ "عدل" اور "ضیف" کی طرح۔

کریمتیہ: صاحب النہایہ لکھتے ہیں: اى جارحتيه الكريمتين على. وكل شيء يكرم عليك فهو كريمك وكريمتك. صاحب قاموس لکھتے ہیں: الكريمان الحج والجهاد ومنه خير الناس مؤمن بين كريمين، او معناه بين فرسين يغزو عليهما، او بعيران يستقي عليهما، وأبوان كريمان مؤمنان، وكريمتك ابنتك وكل جارحة شريفة كالأذن، والكريمتان: العينان اھ فتامل. ایک شارح فرماتے ہیں کہ اہل عرب انگور کو کرم کہا کرتے تھے، کیونکہ انگور سے شراب بنتی ہے۔ اور ان کا کہنا تھا کہ شراب پینے سے آدمی میں جود و کرم کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

شاعر کے اس مصرع میں اسی طرف اشارہ ہے۔

ع فیا ابنة الکرم لا بل یا ابنة الکرم

چنانچہ جب شریعت مطہرہ نے شراب کو حرام قرار دیا، تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خمر کی تحقیر، اور حرمت کی تاکید کی خاطر انگور کو "کرم" کہنے سے منع فرما دیا۔ اور بتلا دیا کہ مؤمن کا قلب ہی اس قابل ہے کہ اس کو کرم کہا جائے، جو تقوی کا معدن ومنبع ہے۔ جب کہ شراب عقل کو خراب کرتی ہے۔ رائے کو فاسد کرتی ہے۔ مال کا ضیاع ہے۔ اور ناجائز مصرف میں استعمال ہے۔

صاحب الفائق لکھتے ہیں کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام انتہائی لطیف پیرائے میں درحقیقت اس مفہوم کو دل ودماغ پر نقش کرنا چاہتے تھے: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [الحجرات:١٣] کہ عنب کو کرم کہنے سے روکا جائے، بلکہ اصل غرض یہ تھی، کہ غیرت اسلامی کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اس نام پر دوسری چیزوں کے نام رکھے، ہونا یہ چاہیے کہ مسلمان اس صفت کو اختیار کرے۔ چہ جائیکہ تم کرم، کسی غیر مسلم کا نام رکھو۔ گویا کہ آپ فرمانا یہ چاہتے تھے، کرم تم اپنا نام نہیں رکھتے، تو نہ رکھو۔ لیکن کسی چیز کا نام کرم مت رکھو۔

قولہ: فان الکرم: یعنی لفظ "کرم" سے مشتق اسم کا مستحق مسلمان ہی ہے۔

۴۷۶۲: وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُ عَنْ وَائِلِ ابْنِ حَجَرٍ قَالَ لَا تَقُوْلُوْا الْكَرْمَ وَلٰكِنْ قُوْلُوْا الْعِنَبُ وَالْحَبَلَةَ۔

أخرجه مسلم فی ٤/١٧٦٤ الحديث رقم (١٢-٢٢٤٨)۔

ترجمہ: اور مسلم ہی کی ایک حدیث میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے یوں منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انگور کے درخت کو کرم نہ کہو بلکہ عنب اور حبلہ کہو۔

تشریح: عنب، کا اطلاق انگور پر بھی ہوتا ہے، اور اس کی بیل پر بھی۔ یہاں بیل مراد ہے۔

حبلة: حاء مہملہ اور بائے موحدہ دونوں کے فتحہ کے ساتھ باء کو ساکن بھی پڑھا جاتا ہے، انگور کی بیل۔

زمانہ کی رسوائی......! مت کہو

۴۷۶۳: اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُسَمُّوْا الْعِنَبَ الْكَرْمَ وَلَا تَقُوْلُوْا يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ١٠/٥٦٤ الحديث رقم ٦١٨٢ و مسلم فی ٤/١٧٦٣ الحديث رقم (٤-٢٢٤٦)، واحمد فی المسند ٢/٢٥٩۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انگور کو کرم نہ کہو اور نہ اس طرح کہو۔ اے زمانہ کی رسوائی! کیونکہ اس میں شبہ نہیں کہ زمانہ اللہ تعالیٰ کے اختیار وقبضہ میں ہے۔ (بخاری)

تشریح: **قولہ: ولا تقولوا یا خیبة الدهر**:

عرضِ مرتب:

اس کی تشریح کتاب الایمان میں ملاحظہ فرمائیں، مفصل بیان کی جاچکی ہے۔

تخریج: جامع صغیر میں لکھتے ہیں، کہ اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے۔

زمانے کو برامت کہو

۴۷۶۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَا يَسُبُّ اَحَدُكُمُ الدَّهْرَ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ۔

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ٤/١٧٦٣ الحدیث رقم (٦-٢٢٤٧) و ابوداوٗد فی السنن ٥/٤٢٣ الحدیث رقم ٥٢٧٤، واحمد فی المسند ٢/٢٧٢۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم زمانے کو برامت کہو کیونکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی زمانہ کو الٹ پلٹ کرنے والا ہے۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث کی شرح کتاب الایمان میں بہت تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے۔

خبثِ نفسی نہ کہو

۴۷۶۵: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَقُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ خَبُثَتْ نَفْسِيْ وَلٰكِنْ لِيَقُلْ لَقِسَتْ نَفْسِيْ (متفق علیه وذکر حدیث ابی هریرة) يُؤْذِيْنِيْ ابْنُ اٰدَمَ فِيْ بَابِ الْاِيْمَانِ۔

أخرجه البخاری فی صحیحه ١٠/٥٦٣ الحدیث رقم ٦١٧٩ و مسلم فی ٤/١٧٦٢ الحدیث رقم (٢-٢٢٤٦) و ابوداوٗد فی السنن ٥/٢٥٨ الحدیث رقم ٤٩٧٨، واحمد فی المسند ٦/٢٨١۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہ تم اس طرح مت کہو (خبثت نفسی) بلکہ کہے میرا دل پریشان ہے (بخاری و مسلم) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت يُؤْذِيْنِيْ ابْنُ اٰدَمَ باب الایمان میں ذکر ہو چکی ہے۔

تشریح: خبثت: خائے معجمہ کے فتحہ بائے موحدہ کے ضمہ، ثائے مثلثہ کے فتحہ اور تائے ساکنہ کے ساتھ۔

لقست: لام کے فتحہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ، ای غثیت. صاحب النہایہ لکھتے ہیں: '' لقس '' کے معنی '' غثیان '' ہیں۔ '' خبثت '' کہنے کو منع فرمایا تا کہ خبث وخبثت جیسے الفاظ کے استعمال سے مسلمان بچا رہے۔ ان میں اشتراک معنوی ہے نیز ذہن معنی قبیح کی طرف متبادر ہوتا ہے۔ ایک شارح فرماتے ہیں '' لقست '' کسرہ کے ساتھ اور '' خبثت '' بمعنی غثیت ('' لقست '' اور '' خبثت '' دونوں ہم معنی ہیں۔) عرب ان دونوں الفاظ کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ مؤمن اپنے نفس کے لئے کوئی بری مثال پیش کرے اور اپنے نفس کی طرف خبث کی نسبت کرے، چونکہ خبث کا اطلاق جس طرح خباثت نفس اور سوائے خلق پر ہوتا ہے اسی طرح غثیان نفس پر بھی ہوتا ہے

اور اسی وجہ سے سستی وتہاون کے باعث نماز ادا نہ کرنے والے شخص پر خبث کا اطلاق کرتے ہوئے فرمایا: اصبح خبیث النفس کسلانا" یہ فرمانا بطور مذمت وزجر کے تھا

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ خبث کی شناعت کی وجہ سے لفظ خبث کے استعمال کو شارع علیہ السلام نے ناپسند فرمایا اور اپنی امت کو الفاظ کے استعمال کے بارے میں یہ ادب ارشاد فرمایا کہ بہترین وخوبصورت الفاظ کا استعمال کیا جائے۔ قبیح الفاظ کا استعمال ترک کیا جائے۔ اگر یہ کہا جائے کہ نماز سے غافل پڑے سوئے ہوئے شخص کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد تو ہے: خبیث النفس کسلان۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شارعؑ نے یہاں یہ صفت مسلمان کے بارے میں ارشاد نہیں فرمائی بلکہ) یہ صفت اس کے غیر کے بارے میں اور ایک مذموم الحال مبہم شخص کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے۔ تو ربشتیؒ فرماتے ہیں سنن میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے مسلمان پر لعنت بھیجنے کے بارے میں بہت سخت ممانعت فرمائی ہے دوسری طرف آپ کے یہ ارشادات گرامی بھی ہیں): لعن الله من تولى غير مواليه ولعن الله من سرق منار الأرض اور اس جیسی کئی مثالیں ہیں کہ جن سے وعید وزجر مقصود ہے نا کہ کسی متعین مسلم پر لعنت کرنا مقصود ہے۔ جو ایک نامناسب بات ہے۔

الفصل الثانی:

ابوالحکم کے لقب کو استعمال کرنے کی ممانعت

۴۷۶۶: عَنْ شُرَيْحِ بْنِ هَانِيءٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهٗ لَمَّا وَفَدَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَ قَوْمِهٖ سَمِعَهُمْ يُكَنُّوْنَهٗ بِاَبِى الْحَكَمِ فَدَعَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَكَمُ وَاِلَيْهِ الْحُكْمُ فَلِمَ تُكَنّٰى اَبَا الْحَكَمِ قَالَ اِنَّ قَوْمِىْ اِذَا اخْتَلَفُوْا فِىْ شَىْءٍ اَتَوْنِىْ فَحَكَمْتُ بَيْنَهُمْ فَرَضِىَ كِلَا الْفَرِيْقَيْنِ بِحُكْمِىْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَا اَحْسَنَ هٰذَا فَمَالَكَ مِنَ الْوَلَدِ قَالَ لِىْ شُرَيْحٌ وَمُسْلِمٌ وَعَبْدُ اللّٰهِ قَالَ فَمَنْ اَكْبَرُهُمْ قَالَ قُلْتُ شُرَيْحٌ قَالَ فَاَنْتَ اَبُوْ شُرَيْحٍ۔ (رواه ابوداؤد والنسائی)

أخرجه ابو داؤد فی السنن ٥/ ٢٤٠ الحديث رقم ٤٩٥٥، والنسائی فی ٨/ ١٢٢٦ الحديث رقم ٥٣٨٧۔

ترجمہ: حضرت شریح بن ہانی اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ جب وہ اپنی قوم کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے سنا کہ ان کی قوم ان کو ابوالحکم کی کنیت سے یاد کرتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو بلایا اور فرمایا کہ حکم تو صرف اللہ تعالیٰ ہے اور حکم اسی کی طرف سے ہے پھر تم نے اپنی کنیت ابوالحکم کیوں مقرر کی ہے؟ تو ہانی کہنے لگے جب میری قوم کے لوگ کسی معاملہ میں اختلاف کرتے ہیں تو میرے پاس آتے ہیں اور میں ان کے معاملہ میں جو فیصلہ کرتا ہوں دونوں فریق اس فیصلہ کو مان لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا یہ بہت خوب بات ہے لیکن یہ بتاؤ تمہارے کتنے بچے ہیں اور ان کے نام کیا ہیں انہوں نے کہا میرے تین بچے ہیں جن کے نام شریح، مسلم اور عبداللہ ہیں۔ آپ ﷺ نے دوبارہ استفسار فرمایا ان تینوں میں بڑا کون ہے؟ میں نے جواباً عرض کیا شریح آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تو پھر آج سے تم ابوشریح ہو۔ (نسائی)

تشریح: قوله: فلم تکنی اباالحکم: یعنی کس چیز کی وجہ سے اور انواع کنیت میں سے کس سبب سے تمہاری کنیت ابوالحکم ہے؟

قوله: ان قومی اذا اختلفوا: یہ جملہ مستانفہ تعلیلیہ ہے۔

قوله: ما احسن هذا : اسم اشارہ کے مشارالیہ میں دو احتمال ہیں: ① حکیم بالعدل ② وجہ کنیت اور یہی اولیٰ ہے۔ اور صیغہ تعجب لانا اس کے حسن کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنے کے لئے ہے۔ تکنون: حرف اول کے ضمہ اور نون کی تشدید کے ساتھ' نیز حرف اول فتحہ اور نون کی تخفیف کے ساتھ۔ ''الحکم'' حاء اور کاف دونوں فتحہ ہے' یہ حکم کا اسم مبالغہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی حکم ہے' اور حکم بھی اسی کا ہے۔ **ان الله هو الحکم:** ضمیر فاصل کا لانا اور خبر کو معرفہ لانا، حصر پر دلالت ہے، کہ یہ وصف محض اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ ''حکم'' اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے۔ شرح السنہ میں لکھتے ہیں ''حکم'' اس حاکم کو کہتے ہیں جو جب حکم صادر کردے تو اس کا حکم کبھی رد نہ ہوسکے۔ اور یہ صفت صرف اللہ ہی کے لائق ہے کوئی دوسرا اس صفت کے لائق نہیں۔

الیه الحکم کا مطلب: منه یبتداء الحکم' والیه ینتهی الحکم: ہر حکم وفیصلہ کی ابتداء وانتہاء اسی کے قبضہ واختیار میں ہے۔

له الحکم والیه ترجعون: حقیقی حکم اللہ ہی کا ہے، ہر شئے اسی کی طرف راجع ہے۔

لا راد لحکمه: اس کے حکم وفیصلہ کو کوئی رد نہیں کرسکتا۔ **ولا یخلوا حکمه عن حکمته.** اس کا کوئی بھی حکم وفیصلہ اس کی حکمت سے خالی نہیں۔

قوله: قال لی شریح: ازروئے عقل تقاضہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلے سب سے بڑے پھر اس سے چھوٹے کا ذکر کیا ہوگا' لیکن واؤ چونکہ مطلق جمع پر دلالت کرتی ہے' اس لئے مدعٰی کے سلسلہ میں صریح نہیں ہے۔

قوله: ومن اکبرهم: شرح السنہ میں لکھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اولیٰ یہ کہ آدمی اپنے سب سے بڑے بیٹے کے نام پر اپنی کنیت رکھے' اگر بیٹا نہ ہو تو اپنی سب سے بڑی بیٹی کے نام پر رکھے' اور یہی ترتیب عورت کے لئے ہے کہ وہ اپنی کنیت اپنے بڑے بیٹے کے نام پر رکھے' اگر اس کا بیٹا نہ ہو تو اپنی بڑی بیٹی کے نام پر رکھے۔

قلت شریح: شریح خبر ہے اور مبتدا محذوف ہے :ای اکبرهم شریح۔

قال فانت ابو شریح: یعنی ان کے بڑے بیٹے کی رعایت سے ان کی کنیت مقرر فرمائی۔ چنانچہ وہ بیٹا رسول اللہ کی برکت سے بڑے رتبہ کو پہنچا اور بہت ہی صاحب فضل ہوا۔ اس کا شمار حضرت علیؓ کے جلیل القدر اصحاب میں ہوا۔ صحابہؓ کے زمانہ میں مفتی تھے' اور بعض مسائل میں صحابہ پر اشکال بھی کرتے تھے۔ حضرت علیؓ نے ان کو قاضی مقرر فرمایا تھا۔ حضرت حسنؓ کی شہادت حضرت علی کے حق میں قبول کرنے کے سلسلہ میں حضرت علیؓ سے اختلاف فرمایا تھا۔ یہ قصہ مشہور ومعروف ہے۔ ہمارے بعض علماء فرماتے ہیں۔ وہ تابعی کہ جس کا فتویٰ صحابہ کے زمانہ میں ظاہر ہو جیسا کہ شریحؒ' تو تابعی بعض کے نزدیک صحابہ کی مانند ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے مصنفؒ ان کا ذکر فصل صحابہ میں کیا ہے' یا اس وجہ سے کہ یہ مخضرمین میں سے تھے' جیسا کہ ابن عبدالبر نے ''الاستیعاب'' میں کہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

فقال: ما أحسن هذا : لیکن چونکہ اس میں ایہام تھا' جیسا کہ ماقبل کلام میں گذرا' اس لئے آپ نے مناسب المرام کنیت رکھنے کا ارادہ کرتے ہوئے فرمایا: اذا کان الامر کذلك فما لك من الولد۔ مظہر نے عجیب وغریب کلام کیا ہے کہ مابرائے تعجب ہے۔ یعنی لوگوں کے درمیان فیصلہ کی بات ہے لیکن یہ کنیت اچھی نہیں ہے۔ امام طیبیؒ ان کی اتباع کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ولما لم یطابق جواب ألی تشریح قال له ﷺ علی ألطف وجه أرشقه رداعلیه ذلك ما أحسن هذا لكن ابن ذلك من هذا فأ عدل عنده الی هو یلیق بحا لك من التكنی بالأبناء .وهو من باب الرجوع والتبنئه علی مأولی به والیق بحاله۔

ابوالحکم کنیت مقرر کرنے کی ممانعت:

اس کنیت میں دراصل ابہام ہے وہ یہ کہ غیر اللہ پر جب ابوالحکم کا اطلاق ہوتا ہے تو اس سے فی الجملہ اللہ کے وصف میں اشتراک کا وہم ہوتا ہے' اگرچہ اللہ تعالیٰ لم یلد ولم یولد ذات ہے' اس پر ''ابوالحکم'' کا اطلاق نہیں ہوتا لہٰذا جب غیر اللہ کو ابوالحکم کہا جائے گا' تو اللہ کی طرف ابوّت و بنوّت کی نسبت کا وہم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام عمرو بن ہشام کی کنیت ابوالحکم کی جگہ ''ابوالجہل'' مقرر فرمائی۔

اجدع شیطان کا نام ہے

۴۷۶۷: وَعَنْ مَسْرُوْقٍ قَالَ لَقِيْتُ عُمَرَ فَقَالَ مَنْ اَنْتَ قُلْتُ مَسْرُوْقُ بْنُ الْاَجْدَعِ قَالَ عُمَرُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْاَ جْدَعُ شَيْطَانٌ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجة)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ۵/ ۲۴۳ الحدیث رقم ۴۹۵۷، وابن ماجه فی ۲/ ۱۲۲۹ الحدیث رقم ۳۷۳۱، واحمد فی المسند ۱/ ۳۱۔

ترجمہ: حضرت مسروقؒ کہتے ہیں کہ جب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملا تو انہوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ میں نے عرض کیا کہ میں اجدع کا بیٹا مسروق ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میرے باپ کا نام اجدع سن کر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ اجدع ایک شیطان کا نام ہے۔ (ابوداؤد' ابن ماجہ)

تشریح: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ استعارہ ہے ''اجدع'' کا معنی ہے ''مقطوع الأطراف'' ''مقطوع الجہ'' شخص کے لئے استعارۃً مستعمل ہے۔ (انتھی)

قوله: الأجدع شیطان: فرمانے کی غرض:

① حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت مسروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھنا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ ارشاد نقل کرنا گویا تفریح طبع کے طور پر تھا۔

② اس طرف اشارہ کرنا مقصود تھا' کہ ان کا یہ نام بدل دو۔ اگر تمہارے والد حیات ہوں تو اور اگر وہ وفات پا چکے ہیں تو ان کو ابومسروق کہا جائے گا۔

④ یہ بتلانا مقصود تھا کہ چونکہ اس لفظ کے معنی مناسب نہیں ہیں، لہٰذا تم میں سے کوئی شخص کہیں ایسا نہ کرے کہ اپنی اولاد کا نام اجدع رکھ لے اور اس والد کی کنیت "ابوالا جدع" پڑ جائے۔ واللہ اعلم۔

تخریج: اس روایت کو احمد اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔

قیامت کے دن باپ کے نام سے آواز دی جائے گی

۴۷۶۸: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تُدْعَوْنَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ بِاَسْمَائِكُمْ وَاَسْمَآءِ اٰبَائِكُمْ فَاَحْسِنُوْا اَسْمَائَكُمْ (رواہ احمد وابو داؤد)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ۵/۲۳۶ الحدیث رقم ۴۹۴۸، والدارمی فی ۲/۳۸۰ الحدیث رقم ۲۶۹۴، واحمد فی المسند ۵/۱۹۴۔

ترجمہ: حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن تمہیں تمہارے اور تمہارے باپ کے نام سے پکارا جائے گا۔ پس تم اپنے اچھے نام رکھو۔ (احمد وابوداؤد)

تشریح: تدعون: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ ای تنادون أوتسمون۔ اور الجامع کی روایت میں "انکم تدعون" کے الفاظ ہیں۔

فاحسنوا: صیغہ خاص ہے، مراد عام ہے، لہٰذا والدین کو چاہئے کہ وہ اپنے بچوں کا اچھا نام رکھیں۔

عرضِ مرتب:

اس حدیث میں "احسنوا اسمائکم" کی حکمتوں میں سے ایک حکمت کا بیان ہے، کہ قیامت کے دن سارے، جہاں والوں کی موجودگی میں اللہ کے دربار میں حاضری ہوگی، لہٰذا اپنی اولاد کا اچھا نام رکھو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام وکنیت جمع نہ کرو

۴۷۶۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی اَنْ یَّجْمَعَ اَحَدٌ بَیْنَ اِسْمِهٖ وَکُنْیَتِهٖ وَیُسَمّٰی مُحَمَّدًا اَبَا الْقَاسِمِ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۵/۱۴۴ الحدیث رقم ۲۸۴۱، واحمد فی المسند ۲/۴۳۳۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور کنیت کو ایک ساتھ اختیار کرے مثلاً جس شخص کا نام محمد ہو اس کو ابوالقاسم بھی کہا جائے۔ (ترمذی)

عرضِ مرتب:

اس حدیث پر تفصیلی کلام حدیث: ۴۷۷۴ کے تحت آئے گا۔

تشریح: اس حدیث کی عبارت میں نسخوں کا اختلاف ہے۔ بعض نسخوں میں ''**یسمی محمد أبا القاسم**'' ہے۔ یعنی ''**یسمی**'' صیغہ مجہول کے ساتھ، ''**محمد**'' مرفوع نائب فاعل، ''**أباالقاسم**'' منصوب مفعول بہ ہے۔ اس کی تائید ان بعض نسخوں سے ہو رہی ہے جن میں یوں ہے: **نهى أن يجمع بين اسمه** ' کہ بصیغہ مجہول مروی ہے' اور لفظ 'احد' بھی موجود نہیں ہے۔

بعض نسخوں میں ''**یسمی محمدا أباالقاسم**'' ہے۔ ''**یسمی**'' صیغہ معروف کے ساتھ، ''**محمداً**'' منصوب مفعول بہ ہے۔ گویا اصل تقدیری عبارت باعتبار معنی یوں ہے: **یسمی أحد محمدا أبا القاسم**۔ یہ بالکل ظاہر ہے اور ماقبل کے مطابق ہے امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''**محمد** '' مرفوع ہے' یہ مفعول تھا اس کو فاعل کے قائم مقام کیا گیا ہے۔ جامع الترمذی اور شرح السنہ میں نیز مصابیح کے اکثر نسخوں میں اسی طرح ہے۔ معنوی اعتبار سے عبارت یوں ہے: **یسمی المسمی بمحمد أبا القاسم**۔ جامع الاصول میں اور مصابیح کے بعض نسخوں میں ''محمداً'' نصب کے ساتھ ہے' چنانچہ فعل بصیغہ معروف ہوگا۔ (انتھی)

یہ بات مخفی نہیں کہ بصیغہ معروف ہونے کی صورت میں یاء کے ساتھ ہوگا اور نصب ظاہر ہوگا' بخلاف مجہول ہونے کی صورت میں ' چونکہ اس کا نصب الف پر مقدر ہوگا۔ پھر پہلی صورت میں تقدیری عبارت یوں ہوگی: **و أن یسمی احد محمد أبا القاسم** ہے۔ اس کی تحقیق ماقبل میں گذر چکی ہے'

نام وکنیت میں سے ایک چیز

۴۷۷۰: **وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا سَمَّيْتُمْ بِاسْمِيْ فَلَا تَكْتَنُوْ بِكُنْيَتِيْ** (رواه الترمذي هذا حديث غريب وفي رواية وابى داود) **قَالَ مَنْ تَسَمّٰى بِاسْمِيْ فَلَا يَكْتَنِ بِكُنْيَتِيْ وَمَنْ تَكَنّٰى بِكُنْيَتِيْ فَلَا يَتَسَمَّ بِاسْمِيْ**۔

أخرجه ابوداوٗد في السنن ٥/٢٤٩ الحديث رقم ٤٩٦٦، والترمذي في ٥/١٢٤ الحديث رقم ٢٨٤٢، واحمد في المسند ٣/٣٦٩۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم میرے نام پر اپنا نام محمد رکھو تو میری کنیت پر کنیت مقرر نہ کرو۔ ترمذی ابن ماجہ کی روایت ہے۔ ترمذی نے اسے غریب کہا ابوداؤد کی روایت اس طرح ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص میرے نام پر نام رکھے تو وہ میری کنیت مقرر نہ کرے اور جو شخص میری کنیت پر کنیت مقرر کرے تو وہ میرے نام پر نام نہ رکھے۔

عرضِ مرتب:

اس حدیث پر کلام حدیث: ۴۷۷۲ کے تحت آئے گا۔

نام وکنیت دونوں کی اباحت

۴۷۷۱: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ امْرَاءَ ةً قَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي وَلَدْتُ غُلَامًا فَسَمَّيْتُهُ مُحَمَّدًا وَكَنَّيْتُهُ اَبَا الْقَاسِمِ فَذُكِرَ لِيْ اَنَّكَ تَكْرَهُ ذٰلِكَ فَقَالَ مَاالَّذِيْ اَحَلَّ اِسْمِيْ وَحَرَّمَ كُنْيَتِيْ اَوْمَا الَّذِيْ حَرَّمَ كُنْيَتِيْ وَاَحَلَّ اِسْمِيْ۔ (رواہ ابو داؤد وقال محی السنة غریب)

أخرجه ابو داؤد فی السنن ۵/ ۲۵۱ الحدیث رقم ۴۹۶۸، والترمذی فی ۵/ ۱۲۵ الحدیث رقم ۲۸۴۳۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے اور میں نے اس کا نام محمد اور کنیت ابوالقاسم رکھی ہے۔ لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پسند نہیں فرماتے (یعنی نام اور کنیت کو ایک ساتھ اختیار کرنے کو حرام قرار دیا ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسی کیا چیز ہے جس نے میرے نام پر نام رکھنے کو حلال و جائز رکھا ہو اور میری کنیت پر کنیت مقرر کرنے کو حرام دیا ہے یا اس طرح فرمایا۔ ایسی کیا چیز ہے جس نے کنیت پر کنیت کو تو حرام قرار دیا اور میرے نام پر نام کو حلال لکھا ہے۔ ابوداؤد، شرح السنۃ نے اس کو غریب کہا ہے۔

عرضِ مرتب:

اس حدیث پر تفصیلی کلام اگلی حدیث کے تحت آئے گا۔

تشریح: فذکر : بصیغۂ مجہول ہے۔ تکرہ ذلک: یہاں کراہت سے مراد کراہت تحریمی ہے جیسا کہ جواب اس پر دلالت کر رہا ہے۔

ما الذی أحل اسمی وحرم کنیتی: یہ استفہام انکاری ہے۔

أو ما الذی أحل:

اس حدیث سے صراحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور کنیت کو ایک ساتھ اختیار کرنے کی ممانعت بطریق تحریم نہیں ہے بلکہ مکروہ تنزیہی کے طور پر ہے۔

"أو ما......" کے ذریعہ سے راوی نے جیسا کہ ماقبل میں گذرا۔ اپنے شک کو ظاہر کیا ہے۔ (کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا تو پہلے نام کی حلت اور بعد میں کنیت کی حرمت کو ذکر کیا یا پہلے کنیت کی حرمت کو اور بعد میں نام کی حلت کو ذکر فرمایا۔ تاہم دونوں صورتوں میں معنی و مطلب ایک ہی ہیں' مفہوم و مقصد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔)

وفات کے بعد نام وکنیت کی اجازت

۴۷۷۲: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَنَفِيَّةِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرَاَيْتَ اِنْ وُلِدَلِيْ بَعْدَكَ وَلَدًا اُسَمِّيْهِ بِاِسْمِكَ وَاُكَنِّيْهِ بِكُنْيَتِكَ قَالَ نَعَمْ۔ (رواہ ابو داؤد)

أخرجه ابو داؤد فی السنن ۵/ ۲۵۰ الحدیث رقم ۴۹۶۷، والترمذی فی ۵/ ۱۲۵ الحدیث رقم ۲۸۴۳، واحمد

فی المسند ۱/۹۵۔

ترجمہ: حضرت محمد بن حنفیہؒ اپنے والد ماجد حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اگر میرے ہاں آپ ﷺ کی وفات کے بعد کوئی بچہ پیدا ہو تو کیا میں اس کا نام آپ ﷺ کے نام پر اور اس کی کنیت آپ ﷺ کی کنیت پر رکھ سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! (ابوداؤد)

تشریح: چھٹا مذہب یہ ہے کہ محمد نام رکھنا مطلقاً ممنوع ہے' اس سلسلہ میں حدیث مروی ہے۔ میں (ملا قاری) کہتا ہوں کہ حدیث میں نام محمد رکھنے کی ممانعت پر دلالت نہیں ہے، البتہ اتنی بات ضرور ہے، کہ جس کا نام محمد ہو، اس کے ساتھ اچھے طریقہ سے پیش آنا چاہیے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل روایات اس بارے میں بالکل صریح ہیں:

امام بزار ابو رافع سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں: **اذا سمیتم محمدا فلا تضربوہ ولا تحرموہ۔** خطیب، حضرت علی سے مرفوعاً روایت نقل کرتے ہیں: **اذا سمیتم الولد محمدا: فأکرموہ وأوسعوا له فی المجلس' ولا تقبحوا له وجھا** اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نام محمد رکھنے کی جو ممانعت ہے، سو اس کا پس منظر یہ ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو سنا جو محمد بن یزید بن خطاب کو یہ کہہ رہا تھا: **فعل اللہ بك یا محمد**، تو حضرت عمر فاروق نے اس شخص کو بلایا اور فرمایا: **أری أن رسول اللہ ﷺ یست بك، واللہ لا تدعی محمدا ما بقیت**، اور اس بچہ کا نام عبدالرحمٰن رکھ دیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے حضرت عمر فاروق نے اہل کوفہ کی طرف خط لکھا، **لا تسموا أحدًا باسم النبی ﷺ**۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ نہی مطلقاً لذاتہ نہ تھی، بلکہ مقید تھی جس کا سبب نام محمد کے مسمّٰی کی توہین سے حضور اقدس کے نام نامی کی توہین کا پہلو تھا۔ اس حیثیت سے کہ اسم محمد میں دونوں شریک ہیں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس کلام کا زیادہ تر حصہ شیخ محی الدین نووی کے کلام سے ماخوذ ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ انبیاء کے ناموں پر نام رکھنے کے جواز پر اجماع ہے' البتہ حضرت عمر بن خطاب سے اس مسئلہ میں اختلاف مروی ہے جیسا کہ ہم ماقبل میں ذکر کر چکے ہیں۔ میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں اور اس سلسلہ میں جو درست بات ہے میں وہ بیان کر چکا ہوں۔ (امام طیبیؒ نے) فرمایا: امام مالک نے فرشتوں والے نام رکھنے کو ناپسند سمجھا ہے' مثلاً جبریل میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو امام بخاری نے تاریخ میں عبداللہ بن جرار سے نقل کی ہے: **سموا بأسماء الأنبیاء ولا تسموا بأسماء الملائکة۔**

یہی بات ابوالقاسم کنیت مقرر کرنے کی ہے۔ سو اس کا جواب تو یہ ہے کہ اگر معنی مخصوص مراد نہ ہوں بلکہ علمیت مقصود ہو یا کسی شخص کے بیٹے کا نام واقعی قاسم ہو تو ممانعت نہیں۔

دوسرا مذہب یہ ہے کہ ابتداء میں ممانعت تھی پھر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا اب ہر شخص کے لیے اپنی کنیت ابوالقاسم رکھنا مباح ہے خواہ اس کا نام محمد ہو یا کچھ اور ہو۔ اور اس کی علت تخاطب میں التباس تھا' جیسا کہ حدیث انس اس پر دلالت کر رہی ہے۔ میں (ملا قاری) کہتا ہوں نسخ کا دعویٰ ممنوع ہے چونکہ یہ منسوخ نہیں ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے۔ کہ (یہ ممانعت آنحضرت ﷺ کی وفات سے پہلے تک کیلئے تھی۔ وفات کے بعد یہ ممانعت ختم ہوگئی، چونکہ) یہ ممانعت معلول بالعلۃ تھی، انتفاء علت کے باعث حکم بھی منتفی ہوگیا۔ علت اشتباہ تھی، امام مالک کا یہی مذہب ہے۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں جمہور سلف اور فقہاء امصار بھی یہی

فرماتے ہیں۔

تیسرا مذہب یہ ہے کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہے۔ یہ نہی تحریمی نہ تھی بلکہ نہی تنزیہی تھی، کہ یہ خلاف ادب ہے۔ امام جریر کا مذہب یہی ہے۔ چوتھا مذہب یہ ہے کہ نہی بصورت جمع ہے' اگر کوئی شخص کنیت یہ رکھے اور ان دونوں ناموں میں سے کوئی بھی نام نہ رکھے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کی دلیل حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے۔ اور اس کی نظیر عرب کا یہ قول ہے: اشرب اللبن ولا تأکل السمك ۔ ای حين شربته چنانچہ نہیم ان دونوں کی جمع کرنے کی صورت سے تعلق رکھتی ہے۔ سلف کی ایک جماعت کا مذہب یہی تھا۔ میں (ملاعلی قاری) کہتا ہوں کہ یہ نظیر لفظی ہے نا کہ معنوی۔ چونکہ اطباء کے قول کے مطابق دودھ پینا اور مچھلی کھانا ان دونوں کاموں کو جمع کرنا مضر ہے' اور جہاں تک بات ہے یہاں تو ضرور فقط کنیت رکھنے میں ہے۔ خواہ اشتراک نام پایا جائے یا نا پایا جائے۔ لہٰذا نظیر حقیقی یہ مثال ہے: خالط الناس ولا تؤذ۔ پانچواں مذہب یہ ہے کہ ابوالقاسم کنیت رکھنے کی ممانعت تو مطلق ہے' البتہ مراد مقید ہے۔ اور وہ ہے قاسم نام رکھنے کی ممانعت مروان بن حکم کو جب یہ حدیث پہنچی تو انہوں نے اپنے بیٹے کا نام تبدیل کر کے عبدالملک رکھ دیا۔ اس کا نام قاسم تھا' اور اسی طرح انصار کے بارے میں مروی ہے۔ میں (ملا قاری) کہتا ہوں کہ بظاہر مروان نے اپنے بیٹے قاسم کا نام اس وقت تبدیل کیا تھا جب انہیں ابو قاسم کنیت مقرر کرنے کی ممانعت والی پہنچی تھی' انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں ان کی کنیت (ابوالقاسم) نہ پڑ جائے اور وہ ایک امر محظور کے مرتکب ہو جائیں چنانچہ اس متوقع محظور سے بچنے کی خاطر انہوں نے نام تبدیل کر دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوحمزہ

۴۷۷۳: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَنَّانِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَقْلَةٍ كُنْتُ اَجْتَنِيْهَا۔

(رواه الترمذی وقال هذا حديث لا نعرفه من هذا الوجه وفی المصابيح صححه)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥/ ٦٤٠ الحديث رقم ٣٨٣٠، واحمد فی المسند ٣/ ١٢٧۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری کنیت اس سبزی کے نام پر مقرر کی تھی جس کو میں چنا کرتا تھا (یعنی ابوحمزہ رکھ دی۔) اس روایت کو ترمذی نے اسی سند سے نقل کیا اور کہا یہ روایت اور کسی سند سے منقول نہیں ہے۔ مگر مصابیح میں اس کو صحیح کہا گیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم برے نام بدل دیتے

۴۷۷۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُغَيِّرُ الْاِسْمَ الْقَبِيْحَ۔

(رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥/ ١٢٤ الحديث رقم ٢٨٣٩۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برے نام کو بدل دیا کرتے تھے۔ (ترمذی)

تشریح: نامناسب نام کو بدل کر بالکل متضاد نام رکھ دیتے، جیسے ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص کا نام

اسود (کالا) تھا، آنحضرت ﷺ نے اس کا نام بدل دیا اور فرمایا، کہ آج سے تیرا نام ابیض (یعنی گورا) ہے۔

اصرم نام بدل دیا

۴۷۷۵: وَعَنْ بَشِيْرِ بْنِ مَيْمُوْنٍ عَنْ عَمِّهٖ اُسَامَةَ بْنِ اَخْدَرِيٍّ رَجُلًا يُقَالُ لَهٗ اَصْرَمُ كَانَ فِي النَّفَرِ الَّذِيْ اَتَوْرَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اسْمُكَ قَالَ اَصْرَمُ قَالَ بَلْ اَنْتَ زُرْعَةُ. (رواه ابوداؤد)

أخرجه ابو داؤد في السنن ٥/ ٢٣٩ الحديث رقم ٤٩٥٤۔

ترجمہ: حضرت بشیر بن میمون اپنے چچا حضرت اسامہ بن اخدری رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک جماعت حاضر ہوئی تو اس میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس کو اصرم کہتے تھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا نام زرعہ ہے۔ اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

بشیر بن میمون ۔ یہ "بشیر بن میمون" ہیں طبقۂ تابعین سے تعلق رکھتے ہیں اپنے چچا "اسامہ بن اخدری" سے روایت کرتے ہیں اور ان سے "بشر ابن مفضل" وغیرہ نے روایات کی ہیں۔ صدوق (سچے) مانے جاتے ہیں۔

"اخدری" میں ہمزہ مفتوح ہے خائے معجمہ ساکن، دال مہملہ مفتوح، راء مہملہ مکسور اور یائے مشددہ ہے مؤلف علیہ الرحمہ نے "الاکمال" میں ان کا نام گرامی ذکر نہیں کیا۔ کہا گیا ہے کہ ان کے صحابی ہونے اور ان کی حدیث کی اسناد متکلم فیہ ہیں۔ ان سے صرف ایک حدیث مروی ہے جو ناموں کی تبدیلی کے بارے میں ہے۔

عرضِ مرتب:

مرقات کے فوقانی متن میں "بشیر" ہے اور تحتانی متن میں "بشر" ہے "الاکمال" میں فوقانی متن کے موافق ہے۔ اھ

أخدری: ہمزہ کے فتحہ، خائے معجمہ کے سکون، دال مہملہ کے فتحہ، راء کے کسرہ، اور یائے مشددہ کے ساتھ، مؤلف نے ان کا نام ذکر نہیں کیا۔ بعض حضرات کا کہنا ہے، کہ ان کی صحابیت اور ان کی حدیث دونوں متکلم فیہ ہیں، ان سے ایک ہی حدیث مروی ہے۔ جو تغییر الاسماء سے تعلق رکھتی ہے۔

تشریح: اصرم، صرم سے مأخوذ ہے۔ جس کے معنی قطع کرنا' (کاٹنا گفتگو بند کرنا) ہیں ان معنی کی مناسبت سے آپ ﷺ نے "اصرم" نام کو ناپسند فرمایا اور اس کے بجائے مذکورہ نام رکھ دیا یہ لفظ زراعت سے ماخوذ ہے اور اپنے معنی کے اعتبار سے مستحسن لفظ ہے۔

۴۷۷۶: وَقَالَ وَغَيَّرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْمَ الْعَاصِ وَعَزِيْزٍ وَعَتَلَةَ وَشَيْطَانٍ وَالْحَكَمِ وَغُرَابٍ وَحُبَابٍ وَشِهَابٍ وَقَالَ تَرَكْتُ اَسَانِيْدَهَا لِلْاِخْتِصَارِ۔

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٥/٢٤٣ الحدیث رقم ٤٩٥٦۔

ترجمہ: انہوں نے یہ بھی نقل کیا کہ آپ ﷺ نے ان ناموں کو بدل دیا تھا۔ عاص، عزیز، عتلہ، شیطان، حکم، غراب، حباب، شہاب، وغیرہ۔ ان کو بلا اسناد اختصار کے پیش نظر ذکر کیا ہے۔

تشریح: قوله: وقال ترکت أسانیدها للاختصار:

ترکت أسانیدها للاختصار: ممکن ہے کہ یہ جملہ مستانفہ تعلیلیہ ہو' اور "قال کا اعادہ طول فصل کی وجہ سے فرمایا ہو۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "وقال ترکت اسانید ها" اس کا عطف "قال" پر ہے' یہ قول ابوداؤد سے نچلے راوی کا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ابوداؤد نے کئی احادیث اپنی سند متصل کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے نقل کی ہیں جن میں ہے کہ افراد کے ناموں کو نبی کریمؐ نے تبدیل فرمادیا تھا۔ پھر ابوداؤد نے "وغیرہ" کا عطف معنی کے اعتبار سے کلام مذکور پر فرمایا' اور کہا: **ما ذکرته من التغیر ور دفی أحادیث متفرقة مسندة انی ترکت اسانیدها اختصار ا۔ کذا فی شرح السنة۔** اور سنن ابي داؤد میں ہے: **قال ابو داؤد سلیمان بن الأشعث وغیر النبی ﷺ غیر اسم العاص۔** اور شاید کہ یہ کاتب کا سہو ہے۔ اھ۔ کلام الطیبیؒ فتامل۔

"قال" کی ضمیر کے مرجع میں دو احتمال ہیں:

أول: اس کا مرجع ابوداؤد ہیں۔

ثانی: اس کا مرجع ابوداؤد کے کوئی راوی ہیں۔

"العاص": اس کی مکمل تحقیق حدیث: ۴۷۵۸ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

عزیز: چونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم پاک ہے اس لئے عبدالعزیز نام رکھنا مناسب ہے چونکہ عبد موصوف ہے ذل وخضوع سے' اور عزت تو اللہ ہی کے لئے ہے۔ (یعنی لیکن صرف "عزیز" نام غیر موزوں ہے۔) یہ لفظ غلبہ وقوت عزت اور زور آوری پر دلالت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان ہے جب کہ بندے کی شان ذلت وانکساری' خضوع اور فروتنی ہے۔) اسی طرح "حمید" نام رکھنا بھی غیر مناسب ہے کیونکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات میں سے ایک اسم ہے اور بطریق مبالغہ اس کی ایک صفت ہے اس اعتبار سے کسی شخص کا نام "عبدالحمید" موزوں ہے "کریم" وغیرہ کو بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

عتلة: عین' تاء اور لام تینوں کے فتحہ کے ساتھ' "عتلہ" نام کو بھی آپ ﷺ نے اس لئے ناپسند فرمایا کہ اس میں غلظت و شدت (سختی) کے معنی ہیں یہ عتلہ سے ماخوذ ہے' یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب سختی کے ساتھ کھینچا جائے۔ جب کہ مؤمن کو نرم پہلو کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے۔ بعض کا کہنا ہے: **العتلة عمود حدید یهدم به الحیطان حدیدة کبیرة یقلع بها الحجر والشجر۔** (لوہے کا گرز جس سے دیوار گرائی جائے) اور بعض کا کہنا ہے: **حدیدة** (گدالہ)۔

شیطان: شیطان نام رکھنا نہ صرف اس ذات کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا ہے جو تمام برائیوں کی جڑ ہے بلکہ اس کے لفظی مفہوم کے اعتبار سے بھی نہایت غیر موزوں ~~ہے کیونکہ~~ جو بھی شخص اس نام کے آدمی کو دیکھے گا وہ بدفالی وبدشگونی لے گا' نیز

از روئے لغت لفظ شیطان ''شیط'' سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں جل جانا ہلاک ہو جانا صاحب قاموس فرماتے ہیں ایک قول کے مطابق ''شیطان'' بھی اسی سے ماخوذ ہے یا ''شطن'' سے نکلا ہے چنانچہ قاموس میں ہے کہ الشاطن کا معنی ہے الخبیث' اور شیطان تو معروف ہی ہے۔ ہر سرکش' نافرمان ومتکبر کو شیطان کہا جاتا ہے خواہ انسانوں میں سے ہو' یا جنوں میں سے ہو' خواہ کوئی چوپایہ ہو اور سانپ۔ شیطین وتشیطن: شیطانی فعل کرنا' اور شرح السنہ میں ہے کہ چونکہ شیطان ''شطن'' سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں خیر سے دور ہونا۔

حکم: ماقبل میں گذرا کہ نبی کریمؐ نے ''ابوالحکم'' نام کو بدل دیا تھا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''حکم'' نام رکھنا تو بطریق اولی ممنوع ہوگا۔

عرضِ مرتب:

اس کی مکمل تحقیق حدیث: ۴۷۶۶ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

غراب: غراب نام کی ناپسندیدگی کی وجہ: اس کے معنی دوری کے ہیں' ثانی: غراب کوے کو کہتے ہیں جو جانوروں میں پلید جانور ہے وہ مردار اور نجاست کھاتا ہے ثالث: ایک شارح فرماتے ہیں کو اشرعاً مذموم پرندہ ہے، رابع: یہ کہ غروب سے مشتق ہے جو تفاءل کے اعتبار سے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ نبی کریمؐ اچھا نام اور نیک شگون پسند فرماتے تھے جیسا کہ ماقبل میں گذرا۔

حباب: حاء کے ضمہ اور باء موحدہ کے ساتھ۔ یہ نام اس اعتبار سے غیر موزوں ہے کہ یہ شیطان کا نام ہے اور سانپ کو یا سانپ کی کسی خاص نوع کو بھی حباب کہتے ہیں۔

''شہاب'': شین معجمہ کے کسرہ کے ساتھ' آگ کے شعلہ کو کہتے ہیں اور آگ کفار کے لئے عقاب ہے' اور اس لئے بھی کہ ''شہاب'' فرشتے شیطانوں پر مارتے ہیں (اس مناسبت سے شہاب نام رکھنا غیر پسندیدہ ہے) البتہ اگر ''شہاب'' کی اضافت ''دین'' کی طرف کی جائے یعنی ''شہاب الدین'' نام رکھا جائے تو اس میں کوئی کراہت نہیں ہوگی۔

زعموا برا سہارا نام ہے

۴۷۷۷: وَعَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ لِاَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ اَوْ قَالَ اَبُوْعَبْدِ اللّٰہِ لِاَبِیْ مَسْعُوْدٍ مَا سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْ زَعَمُوْا قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ بِئْسَ مَطِیَّۃُ الرَّجُلِ۔ (رواہ ابوداؤد وقال ان اباعبد اللّٰہ حذیفۃ)

أخرجه البغوی فی شرح السنة ۱۲/ ۳۶۱ الحدیث رقم ۳۳۹۲، وأحمد فی المسند ۴/ ۱۱۹۔

ترجمہ: حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے یا حضرت ابوعبداللہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لفظ زعموا کے متعلق کچھ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ مرد کی بری سواری ہے۔ ابوداؤد نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ ابوعبداللہ سے مراد حذیفہ بن یمان ہیں۔

تشریح: قوله: قال لأبي عبد الله: ابوعبداللہ حضرت حذیفہؓ کی کنیت ہے محدثین کی اصطلاح میں ابوعبداللہ جس وقت مطلق بولا جائے اس سے حذیفہ مراد ہوتے ہیں۔ قال لأبي عبد الله أوقال أبو عبد لله لأبي مسعود: ان سے روایت کرنے والے راوی کو شک ہے۔ قوله: ماسعت رسول الله ﷺ يقول في زعموا: اى في شان هذه الكلمة أوفي حق هذ اللفظ۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: قوله: في زعموا أي في شان زعموا وأمره اى هل كان يرضى به فعلا أم لم يرض۔ یہ تاویل کرنا ضروری ہے تاکہ یہ (حدیث) اسماء شنیعہ کے تغیر کے باب میں داخل ہو سکے اور چونکہ آپ اس بات کو پسند نہیں فرماتے تھے اس لئے فرمایا: بئس مطية الرجل......

مطية: میم کے فتحہ، طاء مہملہ کے کسرہ اور یائے تحتانیہ کی تشدید کے ساتھ بمعنی مرکوب (سواری)۔ اس کو فارسی میں "بارگیر" کہتے ہیں۔

عرضِ مرتب:

بظاہر یہ لفظ بار "گیر" ہے۔......................

ما سمعت: "ما" کی ترکیب کے بارے میں دو احتمال ہیں:

① "ما" استفہامیہ ہے بمعنی: اى شيء، أي: أى شيء سمعته؟۔

② "ما" استفہامیہ مقدر ہے: أي: أما سمعته الخ؟ یعنی کیا تم نے نبی کریمؐ کو ایسے لوگوں پر طعن کرتے ہوئے اور مذمت کرتے ہوئے نہیں سنا جو لوگ "زعموا" کا استعمال کرتے تھے اور بلا تحقیق وایقان کے محض ظن وگمان کی بناء پر اس لفظ کا سہارا لیتے ہوئے لوگوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

بئس مطية الرجل: یہ جملہ محل نصب میں يقول کا مفعول بہ ہے۔ مخصوص بالذم کو مشہور و معلوم ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔ أي: بئس مطية الرجل زعموا۔

مطية اگر منصوب مروی ہو تو اس صورت میں بئس میں ضمیر ہوگی جو "زعموا" کی طرف راجع ہوگی اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ قائل جب ہر بات سے عاجز آ جاتا ہے تو اپنی جان چھڑانے کے لئے اور اپنی بات سے عہدہ برآں ہونے کے لئے اس لفظ کا سہارا لیتا ہے۔ اس مقام پر اس لفظ کا اشتقاق بہت ہی خوبصورت ہے چونکہ اس سے تشبیہ دی ہے اس کلام کو نقل و نشر کرنے میں بڑی تیزی سے لپکا جاتا ہے اور اس کی تحقیق میں توقف نہیں ہوتا۔

لفظ "مطية" کے بارے میں لغویین کی آراء:

صاحب قاموس لکھتے ہیں: مطا: جد في السير، وأسرع، والمطية: التي تمطوا في سيرها.

صاحب النہایہ لکھتے ہیں: أن معناه أن الرجل: والفتح الظن. اھ

حدیث کی باب سے مناسبت: ہر امر مذموم کو بدل ڈالنا چاہئے، خواہ وہ امر مذموم کوئی بات ہو یا نام ہو، چنانچہ اگلی حدیث کا حاصل بھی یہی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ ایسی بات زبان پر نہ لائی جائے کہ جو تحقیقی نہ ہو، یا اس کا قائل معلوم

نہ ہو۔ مزید یہ کہ اس کو تکیہ کلام نہ بنایا جائے۔ کیونکہ اس لفظ کو بنیاد بنا کر عام طور پر وہ بات کہی یا نقل کی جاتی ہے جس کا کوئی ثبوت نہ ہو یا سند نہ ہو۔ ایسی بات کی حیثیت محض ایک ''حکایت'' کی سی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اس طرح کی باتیں معاشرے میں بے بنیاد جھوٹی باتیں عام ہونے کا سبب بنتی ہے۔

اس حدیث میں اس بات کو مبالغہ کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کی باتیں نقل کرنے سے احتراز و اجتناب کرنا چاہئے تاکہ کذب کا ارتکاب نہ ہو۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے: کفی بالمرء کذبا أن یحدث بکل ما سمع. چونکہ آدمی جب یہ بات کہنے کی پاداش میں مذموم ہے: زعموا أن الامر کذا و کذا 'کہ اس نے بات کی اسناد لوگوں کی طرف کی ہے' اس بات کو اپنی طرف سے بیان نہیں کیا' اور نہ اس کو اس کا یقین ہے' بلکہ زعم کے طور پر بیان کی جو کہ ادعاء و افتراء ہے' جیسا کہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿زَعَمَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا﴾ [التغابن: ۷] تو اس صورت میں مذموم کیوں کر نہ ٹھہرے گا کہ جب وہ لوگوں کی طرف بات کی نسبت علی وجہ التحقیق کرے گا یا اپنی طرف منسوب کی بغیر اسناد کے حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اس لفظ اور اس اضافت کو بدل دینا چاہئے۔ لہٰذا آدمی تحقیقی بات کرے، بھلی بات کرے یا خاموش رہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے فرمایا: من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الآخر فلیقل خیرا أو لیصمت.

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: بس مطیۃ الرجل کا مطلب یہ ہے کہ ضروری ہے کہ آدمی بکثرت ایسا کلام نہ کرے: زعم فلان وفلان کیت و کیت 'اور جھوٹ کو اپنے مسلمان بھائی کی طرف منسوب نہ کرے۔

ہاں اگر اس کو اس بات کا یقین ہو کہ فلاں شخص نے واقعتاً دروغ گوئی کی ہے اور یہ کہ اس شخص کی دروغ گوئی کے نقصان و اثرات سے دوسروں کو بچانا ضروری ہے تاکہ کوئی دھوکا نہ کھا جائے تو اس مصلحت کے پیش نظر کسی کی طرف زعم و گمان کی نسبت کرنا جائز ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿زَعَمَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا﴾ [التغابن: ۷] اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿بل زعمتم أن لن نجعل لکم موعدا﴾ [الکھف۔ ۴۸] اور ایک تیسرے مقام پر فرمایا: ﴿أین شرکائی الذین زعمتم﴾ [القصص: ٦٢] انتھی۔

تخریج: الجامع الصغیر کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''بئس مطیۃ الرجل زعموا''. اس حدیث کو احمد اور ابوداؤد نے حضرت حذیفہؓ سے نقل کیا ہے۔

ماشاء اللہ، ماشاء فلان مت کہو

۴۷۷۸: وَعَنْ حُذَیْفَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَقُوْلُوْا مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشَآءَ فُلَانٌ۔

(رواہ احمد و ابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٥/٢٥٩ الحدیث رقم ٤٩٨٠، واحمد فی المسند ٥/٣٨٤۔

ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ماشاء اللہ وشاء فلان مت کہو بلکہ اس طرح کہو ماشاء اللہ ثم شاء فلان۔ (تاکہ مشیت میں شرکت لازم نہ آئے) یہ احمد، ابوداؤد کی روایت ہے۔

تشریح: قوله: ما شاء الله و شاء فلان: یہاں عبارت مقدر ہے: فهو كائن يا كان.

قوله: ما شاء الله ثم شاء فلان: یہاں "ماشاءاللہ کے بعد" "کان" عبارت مقدر ہے:

ممانعت کا سبب یہ ہے کہ (اس تعبیر سے) "اللہ" اور "عبد" کے درمیان تسویہ لازم آتا ہے، چونکہ "واؤ" جمع اور اشتراک کیلئے آتا ہے۔

ولكن قولوا: ما شاء الله ثم شاء فلان: یہ کہنا جائز ہے چونکہ "ثم" تراخی کیلئے آتا ہے۔ ہم نے "ثم شاء فلان" سے پہلے "کان" مقدر مانا تا کہ اشتراک فی الحکم کا وہم دور ہو جائے اگر چہ تراخی سے ہی ہو۔ تامل فرمالیجئے چونکہ یہ مسلک بہت ہی دقیق ہے اور اس قابل ہے کہ اس بارے میں تحقیق سے کام لیا جائے۔ اس صورت میں

"ثم شاء فلان" یہ جملہ مستانفہ ہے یا اس کا عطف پچھلے جملے پر ہو رہا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور "ثم" تراخی اخبار کے لئے ہے۔

شرح السنہ میں لکھتے ہیں: واؤ جمع اور تشریک کیلئے ہے لہٰذا ایک مشیت پر دوسری مشیت کا عطف ممنوع قرار پایا۔ اور حکم یہ دیا گیا کہ اللہ کی مشیت کو مقدم کرو اور غیر اللہ کی مشیت کو "حرف" ثم کے واسطہ سے مؤخر کرو۔ چنانچہ "ثم" لایا گیا جو "تراخی" کیلئے ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس مقام پر "ثم" تراخي في الزمان اور تراخي في المرتبه دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ازلی ہے، اور غیر اللہ کی مشیت حادث ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وما تشاؤون الا أن يشاء الله﴾ [التکویر۔۲۹] اللہ کی مشیت واقع ہو کر رہتی ہے۔ اور بندہ کی مشیت اکثر دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ لہٰذا "چہ نسبت عالم خاک را بعالم پاک"۔

۴۷۷۹: وَفِيْ رِوَايَةٍ مُنْقَطِعًا قَالَ لَا تَقُوْلُوْا مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ مُحَمَّدٌ وَقُوْلُوْا مَاشَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ۔

(رواه في شرح السنة)

أخرجه البغوي في شرح السنة ۱۲/۳۶۱، والدارمي ۲/۳۸۲ الحديث رقم ۲۶۹۹، واحمد في المسند ۴/۲۸۹۔

ترجمہ: ایک منقطع روایت ہے کہ: لَا تَقُوْلُوْا مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ مُحَمَّدٌ بلکہ صرف اس طرح کہو ماشاءاللہ، جو اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ (شرح السنۃ)

تشریح: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہاں ایک اشکال ہوتا ہے، وہ یہ کہ "ما شاء الله ثم شاء فلان" کی رخصت تو دی گئی ہے لیکن "ما شاء الله ثم شاء محمد" کہنے کی رخصت دینے کے بجائے "ما شاء الله وحده" کہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (امام طیبیؒ فرماتے ہیں:) میں کہتا ہوں اس کے دو جواب ہیں:

① ما شاء الله و شاء محمد کہنے میں اپنی تعظیم و شہرت کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ یہ حکم اپنے آپ کو مظنہ تہمت سے بچانے کیلئے دیا، چونکہ

② آنحضرت ﷺ تو موحدین کے سرخیل ہیں آپؐ کی مشیت تو اللہ کی مشیت میں مغمور ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہاں یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، چونکہ "فلان" کے عموم میں آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی بھی شامل ہے۔لہٰذا ما شاء الله ثم شاء فلان کہنا درست ہے۔

ما شاء الله وشاء محمد کے بارے میں طیبی کا پہلا جواب خطا فاحش ہے۔ چونکہ "ما شاء الله وشاء محمد" کہنے میں مذکورہ بالامظنہ تہمت نہیں بلکہ شرک جلی ہے،اور دوسرا جواب نفس الامر کے اعتبار سے درست ہے۔لیکن یہاں پر واؤ لانا مفید جواز نہیں ہے۔چونکہ مشیت تو تمام مخلوق کی اللہ ہی کی مشیت میں مغمور و مضمحل ہے۔علاوہ ازیں یہ کہ "ما شاء الله ثم شاء فلان" فقط بیان رخصت ہے۔اگر "قولوا:ما شاء الله ثم شاء محمد" ارشاد فرماتے تو یہ امر برائے وجوب یا ندب ہوتا،حالانکہ ایسا نہیں ہے۔مزید یہ کہ "فلان" کی مشیت جزوی ہے۔اس کو مشیت کلی پر حمل کرنا درست نہیں۔جیسا کہ سابقہ کلام میں ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

منافق کو سیّد کہنے سے اللہ ناراض ہوتے ہیں

۴۷۸۰: وَعَنْهُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَقُوْلُوْا لِلْمُنَافِقِ سَيِّدٌ فَإِنَّهُ إِنْ يَّكُ سَيِّدًا فَقَدْ أَسْخَطْتُمْ رَبَّكُمْ۔ (رواہ ابو داؤد)

أخرجه ابو داؤد في السنن ۵/ ۲۵۷ الحديث رقم ۴۹۷۷، واحمد في المسند ۵/ ۳۴۶۔

ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ جناب رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کسی منافق کو سید (سردار) نہ کہو اگر وہ تمہارے ہاں سردار ہے تو تم نے اپنے رب کو ناراض کیا۔(ابوداؤد)

تشریح: قوله: وعنه: ضمیر مجرور کا مرجع "حذیفہ" ہے۔بعض حواشی میں عن بریدة مذکور ہے لیکن اس کی کوئی صحیح وجہ مجھ پر ظاہر نہیں ہوئی۔

"فانه": اس ضمیر کے بارے میں دو احتمال ہیں: ① یہ ضمیر شان ہے۔ ② یہ ضمیر "منافق" کی طرف راجع ہے۔

لا تقولوا للمنافق سيد: اس کا "مفہوم مخالف" یہ بتاتا ہے کہ مؤمن کو "سید" کہنا جائز ہے۔مگر یہ مفہوم مخالف اس حدیث کے معارض ہے جس کو احمد اور حاکم نے عبداللہ بن شخیر سے مرفوعاً روایت کیا ہے: السید اللہ۔ چونکہ حقیقی سرداری تو اللہ جل شانہ ہی کو حاصل ہے اس کے علاوہ وہ سب کے سب اس کے مملوک ہیں۔

(رواه احمد والحاكم عن عبد الله بن الشخير مرفوعا)

قوله: فانه ان يك سيدا أسخطتم ربكم:

اس ٹکڑے کی شرح سے پہلے لفظ "سید" کے معانی کو جانیں۔عربی میں لفظ "سید" متعدد معانی کیلئے مستعمل ہے۔

کہ کسی منافق کو یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا کہ اس کو کوئی مسلمان، "سردار" یا "آقا" کہے۔اگر کوئی منافق واقعۃً سردار ہو بایں طور کہ وہ اپنی قوم کا سربراہ ہو یا کسی غلام باندی اور مال و جائیداد کا مالک ہو اور تم نے اس کو سید کہا تو تم نے اپنے پروردگار کو ناراض کیا' چونکہ اس کو سید کہنا اس کی تعظیم ہے' حالانکہ یہ شخص ان لوگوں میں سے ہے جو تعظیم کے مستحق نہیں۔اور اگر صورت یہ ہو کہ وہ

واقعتاً کسی بھی طرح کی سیادت وسرداری رکھتا ہی نہ ہو تو اس کو سید کہنا اور بھی برا ہوگا کیونکہ اس کے باوجود اس کو سید کہنے والا نہ صرف مذکورہ حکم کی خلاف ورزی بلکہ جھوٹ اور نفاق کا بھی مرتکب ہوگا۔ ''النہایہ'' میں فرماتے ہیں: فانه ان كان سيد كم وهو منافق فحالكم دون حاله والله لايرضى لكم ذلك۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر منافق تمہارا سردار ہوگا تو تم پر اس کی طاعت واجب ہوگی پس جب تم اس کی طاعت کروگے تو تم نے اپنے رب کو ناراض کر دیا' دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ منافق کو سید مت کہو' چونکہ اگر تم نے اس کو سید کہا تو تم نے اپنے رب کو ناراض کر دیا۔ پس یہاں ''کون'' کو موضع ''قول'' میں ذکر فرمایا ہے۔

فرماتے ہیں اسی حکم میں لوگوں کا غیر ملت کے لوگوں حکما واطباء کو ''مولانا'' کہنا ہے' کہ وہ بھی اسی نہی اور وعید کے حکم میں ہے' بلکہ ان کو مولانا کہنا اور بھی شدید ہے' چونکہ قرآن حکیم میں مولانا کا لفظ آیا ہے سید کا لفظ نہیں آیا۔ میں (ملا قاری) کہتا ہوں کہ جب اس سے تعظیم مراد ہو تو اس کے عدم جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے' اور جب اس سے مولی کا کوئی معنی مراد ہو جن کا ذکر ماقبل میں گذر چکا ہے تو کوئی بعید نہیں کہ جائز ہو خصوصاً ضرورت وحاجت کے وقت۔ اور خلاصی کی صورت یہ ہے کہ بطور توریہ ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں مولیٰ کا اطلاق غیر اللہ پر کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے: ﴿فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ﴾ [الأحزاب:٥] اى فى المسلمين وموالیکم فی غیر هم۔ حاصل یہ ہے کہ علی الاطلاق مولیٰ اور سید اللہ جل شانہ ہی ہے اور غیر اللہ پر اس کے اطلاق کا جواز شانہ ہی ہے' اور غیر اللہ پر مولیٰ کے اطلاق کے بارے میں کوئی نہی وارد نہیں ہوئی ہے' لہٰذا ''اصل اباحت ہے'' کہ قاعدہ کی رو سے جائز ہے' اور یہ مسلمانوں کے درمیان متعارف ہے' اور جس کو مسلمان مستحسن سمجھیں وہ عند اللہ مستحسن ہے۔ اس حدیث کو حاکم اور بیہقی نے حضرت بریدہ سے یوں روایت کیا ہے: اذا قال الرجل للمنافق :یا سید! فقد أغضب ربه۔ اور شاید یہی منشا ہے محشی کی غلطی کا جس کا ذکر آغاز حدیث میں گذرا۔

الفصل الثالث:

حزن نام نہ بدلنے کا خمیازہ

۴۷۸۱: عَنْ عَبْدِ الْحَمِيْدِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ شَيْبَةَ قَالَ جَلَسْتُ اِلٰى سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ فَحَدَّثَنِيْ اَنَّ جَدَّهٗ حَزْنًا قَدِمَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اسْمُكَ قَالَ اِسْمِيْ حَزْنٌ قَالَ بَلْ اَنْتَ سَهْلٌ قَالَ مَا اَنَا بِمُغَيِّرٍ اسْمًا سَمَّانِيْهِ اَبِيْ قَالَ ابْنُ الْمُسَيَّبِ فَمَا زَالَتْ فِيْنَا الْحُزُوْنَةُ بَعْدُ۔ (رواه البخاری)

٤٧٨١: أخرجه البخاری فی صحیحه ١٠/٥٧٥ الحدیث رقم ٦١٩٣ و ابوداوٗد فی السنن ٥/٢٤١ الحدیث رقم ٤٩٥٦، واحمد فی المسند ٥/٤٣٣۔

ترجمہ: حضرت عبدالحمید بن جبیر بن شیبہؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت سعید بن المسیب کے پاس موجود تھا کہ انہوں نے یہ روایت بیان کی کہ میرے دادا جن کا نام حزن تھا وہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی خدمت میں آئے تو آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ان کا نام دریافت کیا تو انہوں نے حزن بتایا۔ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا حزن اچھا نام نہیں ہے بلکہ میں تمہارا نام سہل رکھتا ہوں۔ میرے دادا نے

کہا کہ میرے باپ نے میرا جو نام رکھا ہے میں اس کو بدل نہیں سکتا۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے اب تک ہمارے خاندان میں ہمیشہ سختی رہی۔ (بخاری ومسلم)

راوی حدیث:

عبدالحمید بن جبیر۔ پورا نام عبدالحمید بن جبیر جحی ہے۔ اپنی پھوپھی صفیہ رضی اللہ عنہا اور ابن مسیّبؒ سے روایت کرتے ہیں اوران سے ابن جریج اور ابن عیینہ نے روایت کی۔

تشریح: حزن: حاء کے فتحہ اور زاء کے سکون کے ساتھ۔

حزن'' سخت اور دشوار گزار زمین کو کہتے ہیں ''سہل'' حزن کی ضد ہے۔ حالانکہ مروی ہے: **ان الله تعالى يحب السهل الطليق**۔ کہ اللہ تعالیٰ سہل وطلیق شخص کو محبوب رکھتا ہے' جیسا کہ بیہقی وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اسی سے نبی کریمؐ کا یہ ارشاد گرامی ہے: **اللهم لاسهل الاما جعلة سهلا" وأنت تجعل الحزن سهلا اذا شئت**۔ اور قاموس میں ہے: **الحزن ماغلظ من الأرض والسهل من الأرض ضد الحزن**۔ (یعنی ملائم اور ہموار زمین جہاں آدمی کو آرام ملے۔)

قوله: بل أنت سهل: امام طیبیؒ فرماتے ہیں یعنی یہ نام تمہارے لئے مناسب نہیں چونکہ تم حلیم اور نرم گوشہ آدمی ہو' مناسب ہے کہ تمہارا نام ''سہل'' ہو' امام طیبیؒ کی یہ بات بعید از کار ہے' چونکہ اگر وہ حلیم اور نرم گوشہ رکھنے والے ہوتے تو جانب نبوت کے ادب کی رعایت رکھتے اور ''فتوۃ'' کے اخلاق کے مقتضی پر عمل کرتے۔

قوله: قال: ما أنا بمغير اسما سمانيه أبي: ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے: **لأن السهل يؤ طا ويمتهن**۔ یعنی میں اپنا نام نہیں بدلوں گا چونکہ ''سہل'' کو روندا جاتا ہے اور اس کی اہانت کی جاتی ہے یعنی پاؤں سے اس کو روندا جاتا ہے۔

قوله: فما زالت فينا الحزونه: الحزونة کا معنیٰ ہے **صعوبة الخلق** (على ماذكره السيوطي) ''بعد'' (اس کا مضاف الیہ محذوف معنوی ہے۔) **اى بعد اباء ابى اسم الهل من النبى** ﷺ۔ سعید ابن میسّب کے دادا نے چونکہ آنحضرت ﷺ کے رکھے ہوئے نام کو اختیار نہیں کیا چنانچہ ان کے گھر والے ہمیشہ سختی حالات کا شکار رہنے لگے اور مسلسل کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے رہے۔

رہی یہ بات کہ حزن رضی اللہ عنہ کو آنحضرت ﷺ کی بات کا انکار کرنے کی جرأت کیونکر ہوئی تو اول اس کو شیطان کا وسوسہ کہا جا سکتا ہے جس میں وہ مبتلا ہو گئے دوسرے یہ کہ قیاس میں تلبیس ابلیس کا شکار ہو گئے' چنانچہ اس بات کو بھی فراموش کر دیا: **من تواضع لله رفعه الله**۔ اور یہ کہ **المرٔ عند الامتحان يكرم أويهان**۔ حاصل یہی ہے جو ماقبل میں گزر چکا ہے کہ نام آسمانوں سے اترتے ہیں۔

عرضِ مرتب:

صاحب مظاہر حق نے ایک اور وجہ بھی ذکر کی ہے جو حسب ذیل ہے: مذکورہ واقعہ ابتداء ہجرت کا ہے جب کہ وہ نئے نئے

ہجرت کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور اس وقت تک تعلیم و تربیت کے فقدان کی وجہ سے وہ صدق ایمان سلامتی طبع اور تہذیب و اخلاق سے مشرف نہ ہوئے تھے لہٰذا اس پر شیطان کا داؤ کارگر ہو گیا اور وہ آنحضرت ﷺ کے تجویز کردہ نام کو اختیار نہ کر سکے۔

انبیاء علیہم السلام کے ناموں پر نام رکھو

۴۷۸۲: وَعَنْ اَبِیْ وَهْبِ الْجُشَمِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَسَمَّوْا بِاَسْمَآءِ الْاَنْبِيَاءِ وَاَحَبُّ الْاَسْمَآءِ اِلَى اللّٰهِ عَبْدُاللّٰهِ وَعَبْدُالرَّحْمٰنِ وَاَصْدَقُهَا حَارِثٌ وَهُمَامٌ وَاَقْبَحُهَا حَرْبٌ وَمُرَّةٌ۔ (رواه ابو داؤد)

أخرجه ابوداؤد في السنن ٥/٢٣٧ الحديث رقم ٤٩٥٠، واحمد في المسند ٤/٣٤٥۔

ترجمہ: حضرت ابو وہب جشمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انبیاء کے ناموں پر اپنے نام رکھو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین نام عبداللہ اور عبدالرحمان ہیں نیز زیادہ سچے نام حارث اور ہمام ہیں اور سب سے برے نام حرب اور مرہ ہیں۔ (ابوداؤد)

عرضِ مرتب:

''حارث'': اس کا معنی ہے ''کاسب'' ان کو زیادہ سچے نام قرار دیا چونکہ۔

تشریح: ''همام'': یہ ''هم يهم'' سے ماخوذ ہے

کوئی بھی انسان کسب وہم سے خالی نہیں ہوتا (یعنی دنیا میں ہر شخص کسب و کمائی میں مشغول ہوتا ہے اور اسی طرح ''ہمام'' ہے کہ ہر شخص کوئی نہ کوئی قصد و ارادہ میں رہتا ہے۔)

''حرب'': اس کی وجہ قباحت یہ ہے کہ حرب میں بدفالی و بدشگونی ہوتی ہے اور اس نام کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے چونکہ حرب نام ہی قتل و ضرب اور اذیت کا ہے۔

مرۃ: اس کا معنی ہے تلخ، کڑوا اس کی وجہ قباحت یہ ہے کہ کڑوے کو ہر شخص ناپسند کرتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ''ابو مرۃ'' ابلیس کی کنیت ہے۔

بَابُ الْبَيَانِ وَالشِّعْرِ

بیان وشعر کا بیان

الفصل الاول:

بیان بھی ایک قسم کا جادو ہے

۴۷۸۳: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَدِمَ رَجُلَانِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَخَطَبَا فَعَجِبَ النَّاسُ لِبَيَانِهِمَا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۲۳۷/۱۰ الحديث رقم ۵۷٦۷ و ابوداوٗد فی السنن ۲۷۷/۵ الحديث رقم ۵۰۱۱، والترمذی فی ۳۲۹/٤ الحديث رقم ۲۰۲۸ و مالك فی ۹۸۱/۲ الحديث رقم ۷، واحمد فی المسند ۲٦۳/٤۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مشرق کی جانب سے دو شخص آئے اور ہر دو نے اپنی مدح میں خطبہ دیا تو لوگوں کو ان کی فصاحت بیانی پر تعجب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بعض بیان جادو ہوتے ہیں یعنی بہت جلد طبائع پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ (بخاری)

تشریح: ''شعر'' کے معنی دانائی اور زیرکی کے ہیں اور شاعر کے معنی ہیں دانا وزیرک۔ عام اصلاح میں شعر موزوں اور مقفّٰی (منظوم) کلام کو کہتے ہیں جو بقصد وارادہ موزوں ومقفّٰی کیا گیا ہو۔ اس اعتبار سے قرآن وحدیث میں جو مقفّٰی عبارتیں ہیں ان پر شعر کا اطلاق نہیں ہوسکتا کیونکہ ان عبارتوں کا مقفّٰی ہونا نہ تو قصد وارادہ کے تحت ہے اور نہ مقصود بالذات ہے۔

اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ ارشادِ گرامی بیان کی تعریف میں فرمایا یا اس کی مذمت میں؟ ان اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے زیادہ صحیح بات یہ نکلتی ہے کہ اس ارشاد گرامی سے بیان کی تعریف و مذمت دونوں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بعض بیان دلوں کو مائل ومنحرف کرنے اور اپنا جواب پیش کرنے سے معذور رکھتے ہیں سحر کی مانند تاثیر رکھتا ہے اور یہ محمود و مستحسن ہے بشرطیکہ اس بیان کا تعلق سچائی کو ظاہر کرنے اور سچائی کو ثابت کرنے سے ہو اور اگر اس کا تعلق باطل وفاسد امور سے ہو تو پھر وہی بیان مذموم ہوگا جیسا کہ ایک حدیث میں شعر کے بارے میں فرمایا گیا

ہے: الشعر ھو کلام فحسنہ حسن وقبیحہ قبیح یعنی شعر کلام ہی تو ہے (چنانچہ اچھے اور برے کلام کی طرح) اچھا شعر اچھا کہلائے گا اور برا شعر برا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''من'' ''تبعیضیہ'' ہے۔ یہ کلام تشبیہ پر محمول ہے۔ اس کا حق یہ تھا کہ یوں فرمایا جاتا: ان بعض البیان کالسحر ۔ کلام میں قلب واقع ہوگیا مبتدا کو خبر بنانے میں مبالغہ ہے، بایں طور کہ فرع کو اصل اور اصل کو فرع بنایا۔ اور وجہ تشبیہ تغیر ہے کہ ارادۂ مدح وذم کے تغیر سے دل متغیر جاتا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام مالک، احمد، ابوداؤد اور ترمذیؒ نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور امام احمد، اور ابوداؤد نے ابن عباسؓ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

ان من البیان لسحرا و ان من الشعر حکما.

بعض شعر حکمت ہیں

۴۷۸۴: وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِكْمَةً۔

(رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٥٣٧ الحديث رقم٦١٤٥ و ابوداؤد في السنن ٥/٢٧٦ الحديث رقم ٥٠١٠، والترمذي في٥/١٢٦ الحديث رقم ٢٨٤٤ و ابن ماجه ٢/١٢٣٥ الحديث رقم ٣٧٥٥، والدارمي في ٢/٣٨٣ الحديث رقم ٢٧٠٤، واحمد في المسند ٥/١٢٥۔

ترجمہ: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بعض شعر حکمت والے ہوتے ہیں۔

(بخاری)

تشریح: اس حدیث کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں:

① سارے ہی شعر برے نہیں ہوتے، بلکہ بعض اشعار میں حق بات اور حکمت کا بیان ہوتا ہے۔ یا ایسے قول صادق کا بیان ہوتا ہے جو حق کے مطابق ہوتا ہے۔

② حکمت کے اصل معنی ہیں روکنا، لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ بعض اشعار نافع ہوتے ہیں، جہالت اور بے وقوفی سے روکنے والے ہوتے ہیں، مثلاً وہ اشعار جو مواعظ پر ایسی امثال پر مشتمل ہوں کہ جو لوگوں کیلئے نافع ہوں۔ چونکہ شعر کلام ہے اچھا شعر اچھا ہے۔ برا شعر برا ہے۔

تکلف سے گفتگو کرنے والا ہلاک ہوا

۴۷۸۵: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ قَالَهَا ثَلٰثًا۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢٠٥٥ الحديث رقم ٢٦٧٠۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تکلف سے گفتگو کرنے والے ہلاک ہو گئے۔ آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہ بات دہرائی۔ (مسلم)

تشریح: "المتنطعون": باب تفعل سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "متنطع" نطع سے مشتق ہے "نطع" غار کو کہتے ہیں، (اور تالو کے اگلے حصے کو بھی نطع کہتے ہیں۔ از مرتب) اور "متنطع" اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو اقصی حلق سے کلام کرتا ہے۔ اھ۔

تنطع في الكلام: گہرائی اور فصاحت سے بولنا۔ **تنطع في الشيء:** غلو اور تکلف کرنا۔ **تنطع في عمله:** اپنے کام میں ماہر ہونا۔ قولہ: قالها ثلاثا: نبی کریمؐ نے یہ بات تین بار ارشاد فرمائی' امت کو ڈرانے کے لئے' اور اس کی آفات پر متنبہ کرنے کے لئے' اور تیقظ پر ابھار کے لئے' اس کے ورے غور کرنے کے لئے' اور اس کلمہ کے نیچے کتنی ساری مصیبتیں ہیں جو صاحب زبان اور متکلفین کی طرف لوٹتی ہیں۔

"متنطعون" کے متعدد معانی بیان کئے گئے ہیں: ① بتکلف فصاحت کے ساتھ کلام کرنے والے۔ ② آواز کو اقصی حلق سے نکالنے والے۔ ③ چرب زبان، فضول باتوں میں غلو کرنے والے۔ چنانچہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں: اراد بهم المتعمقين الغالين في خوضهم فيما (لا يعنيهم من الكلام)۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس قسم کا وہ کلام مذموم ہے کہ جس میں اصل مقصود لفظ کی رعایت ہو، اور معنی تابع ہو۔ اگر اس کے برعکس معاملہ ہو تو وہ مذموم نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ چنانچہ کلام اللہ اور کلام رسول اسی قبیل سے ہے۔ اگر کلام میں اس خوبی کا لحاظ رکھا جائے، تو کلام بلندیوں کی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔ اللہ جل شانہ ہدہد کے کلام کی حکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ﴾ [النمل۔۲۲] صاحب کشاف لکھتے ہیں: یہ کلام کی اس جنس سے ہے جس کو "بدیع" کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ کلام کے ان محاسن میں سے ہے جن کا تعلق لفظ کے ساتھ ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ مطبوع ہو کر آئے۔ ایسے صیغہ کے ساتھ آئے کہ جس میں جو ہر کلام کے ساتھ صحت معنی اور سداد بھی ہو، اور یہاں جو کلام ہے وہ زائد علی الصحت ہے چنانچہ لفظاً و معنیً ہر اعتبار سے حسین و بدیع ہے۔ دیکھیں کہ اگر "نبأ" کی جگہ لفظاً "خبر" ہوتا تو معنی تب بھی صحیح تھے، اور جو لفظ یہاں استعمال ہوا ہے وہ اصح ہے چونکہ "نبأ" کے معنی میں ایک ایسی زیادتی ہے کہ وصف الحال اس کے مطابق ہے۔ صاحب دلائل النبوۃ ابو الحسن ہرویؒ فرماتے ہیں: واضح رہے کہ "تلاؤم" تلاؤم حروف تلاؤم حرکات وسکنات اور تلاؤم معنی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اور جب یہ تمام صفات جمع ہو جاتی ہیں تو کلام انتہائی شیریں ہو جاتا ہے۔ اور اگر یوں ہو کہ بعض صفات پائی جائیں، اور بعض صفات نہ پائی جائیں تو کلام "درجۂ عدوبۃ" سے اتر جاتا ہے۔ اور جب بھی صیغہ زیادہ ہوتے ہیں تو کلام تعسف کے بہت قریب ہو جاتا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد اور امام ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

۴۷۸۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصْدَقُ كَلِمَةٍ قَالَهَا الشَّاعِرُ كَلِمَةُ لَبِيْدٍ اَلَا كُلُّ شَیْءٍ مَّا خَلَا اللّٰهِ بَاطِلٌ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٥٣٧ الحديث رقم ٦١٤٧ و مسلم في ٤/١٧٦٨ الحديث رقم (٢-٢٢٥٦)

والترمذی فی السنن ۵/ ۱۲۸ الحدیث رقم ۲۸۴۹ و ابن ماجہ ۲/ ۱۲۳۵، الحدیث رقم ۳۷۵۷۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی شاعر نے جو سچی بات کہی ان میں سب سے زیادہ سچی بات وہ ہے جو لبید شاعر نے کہی: اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَّا خَلَا اللّٰهِ بَاطِلٌ اللہ تعالیٰ کے سواء ہر چیز فانی ہے۔
(بخاری، مسلم)

تشریح: قولہ: أصدق کلمۃ: سے مراد "جملہ" ہے۔

قالها الشاعر: سے مراد جنس شعراء ہے۔ شمائل کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: اشعر کلمة تکلمت بها العرب. یہاں "اشعر" سے مراد ہے عمدہ خوبصورت ہے۔ (کہا جاتا ہے: هذا البیت اشعر من هذا ۔ یہ شعر اس سے اچھا ہے ۔ازمرتب بحوالہ مصباح)

امام نوویؒ فرماتے ہیں: باطل سے مراد ہے: الفانی المضمحل (معدوم' نیست ونابود) اور یہ حدیث صحابی رسول حضرت لبیدؓ کی منقبت پر مشتمل ہے۔۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اصدق ہونا اس وجہ سے ہے کہ " أصدق الکلام " (یعنی ارشاد باری تعالیٰ) کے موافق ہے: ﴿کل من علیها فان﴾ [الرحمن۔۲۶]

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں: یہ شعر اس آیت کریمہ کے زیادہ موافق ہونے کی وجہ سے "اصدق" ہے:

[کل شیء هالك الا وجهه]

میں نے اس کی تشریح 'حزب الفتح' کی شرح میں شیخ کے قول: استغفر الله مما سوی' اور بعض عارفین کے اس قول: لیس فی الدار غیر دیار ' اور ایک اور قائل کے قول: سوی الله والله مافی الوجود کے تحت کی ہے۔ اور میں نے توحید کے معنی کی وضاحت کی ہے۔

عرضِ مرتب:

اس کا دوسرا مصرع یہ ہے:

وکل نعیم لا محالة زائل

اور بلاشک وشبہ ہر نعمت زائل ہونے والی ہے۔

شعر کی تخریج:

بخاری شریف میں صرف پہلا مصرع مروی ہے جسے امام بخاری نے "باب ایام الجاهلیه" میں صفحہ ۵۳۱ اور "کتاب الآداب صفحہ ۹۰۸" باب ما یجوز من الشعر والرجز "میں اور "کتاب الرقاق "صفحہ ۹۶۰ میں روایت فرمایا ہے۔ دوسرا مصرع جو ہم نے اس کے بعد لکھ دیا ہے سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے شعر حضرت لبید بن ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے جو ان کے ایک قصیدہ کا جزو ہے جو دس/ ۱۰ اشعار پر مشتمل ہے۔

حالات زندگی: حضرت لبید بن ربیعہ عامری بہت بڑے شاعر تھے فصاحت اور بلاغت میں اُن کا بہت بڑا مقام ہے۔ "سبعہ معلقہ" میں چوتھے نمبر پر جو قصیدہ ہے۔ وہ اُن ہی کا ہے بہت بڑے گھوڑ سوار تھے اور حکمت اور دانش کی باتیں ان کے

ذہن پر وارد ہوتی تھیں۔ کنیت ''ابوقیل'' تھی انہوں نے اپنا یہ شعر ''الا کل شیء ما خلا اللّٰہ باطل'' (خبردار! ہر چیز اللہ کے علاوہ فنا ہونے والی ہے) زمانہ اسلام سے پہلے جاہلیت میں کہا تھا۔

فتح الباری میں لکھا ہے کہ بعد میں وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ خلافت عثمانی کے دور میں کوفے میں وفات پائی۔ ان کی عمر ایک سو پچاس (۱۵۰) سال ہوئی اور اس سے زیادہ عمر کا بھی قول ہے۔ صاحب مشکوۃ نے ان کی عمر ۱۴۰ سال بتائی ہے، اور لکھا ہے کہ ایک قول یہ ہے کہ ایک سوستاون (۱۵۷) سال کی عمر میں ان کی وفات ہوئی بہر حال طویل عمر پائی۔

وفد بنی کلاب کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا (ان کی ایک فضیلت یہ ہے کہ) قبول اسلام کے بعد شعر کہنا بالکل چھوڑ دیا (اور فرمایا: یکفینی القرآن۔ ''مجھے قرآن کافی ہے۔'')۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اُن کے اشعار کے بارے میں ان سے گفتگو کی تو فرمایا کہ مجھے اللہ نے شعر کے بدلے میں سورہ بقرہ دیدی ہے۔ اب شعر کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت نے شعر گوئی کی طرف سے دل پھیر دیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ شعرائے عرب نے جو شعر کہے ہیں ان میں سے سب سے زیادہ سچا شعر لبید کا ہی ہے۔ روایت سے ظاہر ہے کہ حضورؐ نے حضرت لبیدؓ کے اس شعر کو بہت پسند فرمایا، اور کلام عرب میں اس کو سب سے زیادہ سچا کلام قرار دیا۔

یہاں علماء نے اشکال ظاہر کیا ہے کہ ہر چیز کو باطل یعنی فنا ہونے والی کیوں بتایا جب کہ جنت دوزخ اور ان میں مستقل طور پر داخل ہونے والے ہمیشہ رہیں گے اور دوزخ کا عذاب اور جنت کی نعمتیں بھی ہمیشہ رہیں گی اس اشکال کے دو جواب دیئے گئے ہیں۔ ایک جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود اور دوام دونوں ذاتی اور حقیقی ہیں، کسی کے وجود دینے سے اس کا وجود نہیں ہے کسی کے باقی رکھنے سے اسی کی بقاء نہیں ہے، رہا مخلوق کا وجود و دوام تو چونکہ اللہ تعالیٰ کے حقیقی اور ذاتی وجود کے سامنے کسی کی کوئی حیثیت نہیں، اور اس کا وجود مجازی ہے اور جب تک جس کو بقا ہے اللہ تعالیٰ کے باقی رکھنے سے ہے۔ اس لئے مخلوق کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کی ہر چیز فانی ہے یعنی اس کا وجود حقیقی اور ذاتی نہیں ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ شاعر نے جو یہ کہا ہے کہ اللہ کے سوا سب باطل بمعنی فانی ہے اسکا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی ذات اور اس کی صفات ذاتیہ اور فعلیہ جن میں رحمت و عذاب بھی ہے، باقی رہے گی، اور ان کے مظاہر بھی باقی رہیں گے، جو جنت اور دوزخ کی صورت میں ہوں گے۔

شعر کا دوسرا مصرع:

ع و کل نعیم لا محالۃ زائل

''اور ہر نعمت بلا شک وشبہ زائل ہونے والی ہے''

اس پر بھی یہی اشکال ہوتا ہے کہ جنت کی نعمتیں تو ابدی ہیں اور دوامی ہیں، پھر یہ کیسے کہا کہ ہر نعمت کو زوال ضروری ہے؟ اس اشکال کے بھی دو جواب دیئے گئے ہیں:

اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ یہ شعر زمانہ جاہلیت میں کہا تھا، جب شاعر جنت و دوزخ کا عقیدہ نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے اس وقت جو سمجھ میں آیا، کہہ دیا۔ حضور اقدس ﷺ سے پہلے مصرع کی تعریف منقول ہے۔ دوسرے مصرع کی تعریف فرمانا منقول نہیں

ہے۔

اس کا دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ اس سے دنیاوی نعمتیں مراد ہیں، جو سب ختم ہو جائیں گی۔ ان نعمتوں پر بھروسہ کرنا بیوقوفی ہے' البتہ ایمان اور اعمال صالحہ باقیات صالحات ہیں جو آخرت میں کام آنے والی نعمتیں ہیں، اگر چہ انکا حصول دنیا میں ہوتا ہے۔
(ماخوذ از فتح الباری وعمدۃ القاری وحاشیہ بخاری، ٩٦٠، جلدا)

ان اشعار کی یہ تشریح ''انعام الباری'' ص ٩٧-٩٩ سے، معمولی سی تبدیلی کے ساتھ لی گئی ہے۔ اھ۔

ان کا یہ مکمل کلام یوں ہے: وکل نعیم لامحالة زائل

نعیمك في الدنيا غرور وحسرة
وعيشك في الدنيا محال وباطل

تخریج: اس حدیث کو امام ابن ماجہؒ نے بھی ذکر کیا ہے۔

امیہ بن صلت کے اشعار کا سننا

٤٧٨٧: وَعَنْ عَمْرِوبْنِ الشَّرِيْدِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ رَدِفْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ هَلْ مَعَكَ مِنْ شِعْرِ اُمَيَّةَ بْنِ اَبِي الصَّلْتِ شَيْءٌ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ هِيْهِ فَاَنْشَدْتُّهٗ بَيْتًا فَقَالَ هِيْهِ ثُمَّ اَنْشَدْتُّهٗ فَقَالَ هِيْهِ حَتّٰى اَنْشَدْتُّهٗ مِائَةَ بَيْتٍ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١٧٦٧/٤ الحديث رقم (١-٢٢٥٥) و ابن ماجه في السنن ١٢٣٦/٢ الحديث رقم ٣٧٥٨، واحمد في المسند ٣٩٠/٤۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن شرید اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار ہوا تو آپ ﷺ نے مجھ سے دریافت فرمایا: کیا تمہیں امیہ بن صلت کا کچھ کلام یاد ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: پڑھو۔ آپ ﷺ کو میں نے ایک شعر پڑھ کر سنایا آپ ﷺ نے فرمایا اور سناؤ میں نے پھر سنایا' آپ ﷺ نے فرمایا اور سناؤ یہاں تک کہ میں نے اس کے ایک سو اشعار سنائے۔ (مسلم)

تشریح: ''ردفت'': دال کے کسرہ کے ساتھ۔ شمائل کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: کنت ردیفه یوما. یہ الفاظ ان کے کمال قرب پر دلالت کر رہے ہیں' اور ان کے کمال حفظ کی طرف اشارہ ہے۔

من شعر: ''من'' بیانیہ ہے۔ شیء: مبین ہے۔ ''اُمیۃ'' تصغیر کے ساتھ۔ ''صلت'' میں پہلے فتحہ اور پھر سکون ہے۔

هیه: دونوں هاء مکسور ہیں اور یائے تحتانیہ ساکن ہے۔ أی هات. ابن الملکؒ فرماتے ہیں: هیه بمعنی ''ایه'' ہے، ہمزہ مکسورہ کو هاء سے بدل دیا گیا ہے۔ یہ اسم فعل بمعنی امر ہے، تکلم کے معنی میں ہے۔ اس کلمہ کو منون پڑھا جاتا ہے کبھی کسرہ کے ساتھ اور کبھی فتحہ کے ساتھ۔ ای حدث حدیثا.

صاحب النہایہ فرماتے ہیں: آپ کسی شخص سے کہتے ہیں: ایه' بغیر تنوین کے کہیں گے تو اس کا مطلب ہوگا کہ آپ اس

سے وہ بات اور سننا چاہتے ہیں جو آپ دونوں کے درمیان معروف ہے۔اور اگر آپ تنوین کے ساتھ کہیں گے تو اس کا مطلب ہوگا کہ آپ سے کوئی ایسی بات سننا چاہتے ہیں جو آپ دونوں کے درمیان نہیں ہے۔اور یہ تنوین تنکیر کے لئے ہے۔

امیہ بن صلت کا تعارف: امیہ بن ابی الصلت بھی عرب کا ایک مشہور اور باکمال شاعر تھا۔اس کا تعلق قبیلہ ثقیف سے تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے عہد جاہلیت میں اہل کتاب سے دین سیکھا تھا اور دینداری کی باتیں کرتا تھا' حشر و نشر اور قیامت کے دن پر بھی عقیدہ رکھتا تھا اور اس کے اشعار علم و حکمت اور پند و نصائح سے پُر ہوتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا تھا: امن شعرہ و کفر قلبه (یعنی اس کے اشعار سے ایمان چھلکتا ہے اگرچہ اس کا دل کفر میں مبتلا رہا) اس کا ایک خاص مشغلہ یہ تھا کہ آسمانی کتب کا علم رکھنے والوں کے پاس آنا جانا رکھتا اور ان سے ان بشارتوں اور پیشینگوئیوں کے بارے میں دریافت کرتا رہتا جو آسمانی کتابوں پر نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت سے متعلق مذکورہ تھیں۔اس کا گمان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں میں جن نبی ﷺ آخر الزمان ﷺ کی بعثت کی خبر دی ہے وہ میں ہوں اور ایک نہ ایک دن مجھے نبوت کے خلعت فاخرہ سے نوازا جائے گا۔لیکن جب آسمانی کتب کے عالموں نے اس کو بتایا کہ وہ نبی قریش میں سے ہوں گے اور اس کو آنحضرت ﷺ کی صفات تفصیل سے معلوم ہوئیں تو وہ اپنے عقائد و نظریات سے ایک دم پھر گیا اور حسد و عناد کی راہ پر چل کر کہنے لگا کہ مجھے اس نبی ﷺ پر ہرگز ایمان نہ لانا چاہئے جس کا تعلق قبیلہ ثقیف سے نہ ہو۔

ابن جوزیؒ نے کتاب وفا میں یہ لکھا ہے کہ امیہ بن ابی الصلت ابتداء میں تو نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت کا انتظار بڑی شدت سے کرتا تھا اور آنحضرت ﷺ کی نبوت کی جو علامتیں اور اوصاف سنتا تھا ان کی بنا پر یہ آرزو رکھتا تھا کہ کاش میں ان کا زمانہ پاؤں اور ان کی خدمت و مدد کروں مگر آنحضرت ﷺ کا جب نور نبوت آشکارا ہوا تو اپنی باتوں سے پھر گیا اور بغض و عناد اور سخاوت و سختی کی راہ اختیار کر لی۔ (انتھی کلام المرتب)

بہرحال مذکورہ بالا حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ علم و حکمت اور پند و نصائح کی باتوں پر مشتمل اشعار سننا مستحب ہے اگرچہ ان اشعار کو کہنے والا کوئی کافر و فاسق ہی کیوں نہ ہو۔

یہ حدیث مبارکہ درحقیقت اس کے بالکل موافق ہے: الحکمة ضالة المؤمن.

رِجز کا زبان پر لانا

۴۷۸۸: وَعَنْ جُنْدُبٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ فِيْ بَعْضِ الْمَشَاهِدِ وَقَدْ دَمِيَتْ اِصْبَعُهٗ فَقَالَ هَلْ اَنْتِ اِلَّا اِصْبَعٌ دَمِيْتِ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا لَقِيْتِ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ١٩/٦ الحديث رقم ٢٨٠٢ و مسلم فی ١٤٢١/٣ الحديث رقم (١١٢-١٧٩٦)، واحمد فی المسند ٣١٢/٤۔

ترجمہ: حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی انگلی مبارک سے کسی معرکہ میں خون بہنے لگا تو آپ ﷺ نے فرمایا تو تو ایک انگلی ہی ہے جو کہ خون آلود ہوئی ہے اور یہ تکلیف تجھے اللہ تعالیٰ کی راہ میں پیش آئی ہے۔

(بخاری، مسلم)

تشریح: ''دمیت'': دال مہملہ کے فتحہ کے ساتھ۔ ''اصبعه'': ''اصول'' میں یہ لفظ ہمزہ کے کسرہ اور بائے موحدہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

صاحب قاموس لکھتے ہیں: **اصبع مثلث الهمزة ومع كل حركة مثلث الباء: تسع لغات، والعاشر اصبوع، بالضم۔**

شمائل کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: **أصاب حجر أصبع النبی ﷺ فدميت.**

قوله: فقال هل انت الا اصبع دميت:

استفہام نفی کے معنی میں ہے۔ ''دمیت'' یہ جملہ محل رفع میں ''اصبع'' کی صفت ہے۔ **مستثنیٰ منه أعم** ہے أی: **ما انت یا اصبع موصوفة بشیء من الاشياء الا بأن دميت**۔ گویا کہ جب انگلی زخمی ہوگئی اور درد کرنے لگی تو نبی کریمؐ نے اس کو استعارہ کے طور پر خطاب فرمایا' یا اس کو تسلی دینے کے لئے حقیقتاً ارشاد فرمایا اور مطلب یہ ہے کہ پرواہ نہ کر' چونکہ نہ تو ہلاک ہوئی ہے اور نہ کٹی ہے' سوائے اس کے کہ تو لہولہان ہوئی ہے اور یہ رائیگاں نہیں جائے گا' بلکہ یہ اللہ کے راستہ میں اور اس کی خوشنودی و رضا میں تھا جیسا کہ اگلے کلام ''**وفی سبیل الله مالقيت**'' سے مستفاد ہو رہا ہے۔

قوله: وفی سبیل الله ما لقیت: ''ما'' موصولہ ہے۔ **ای الذی لقیته هو فی سبیل الله لافی سبیل غیر فلا یکون ضائعا فافرحی به** ۔ یعنی تمہیں جو کچھ تکلیف پہنچی ہے یہ اللہ کی راہ میں پہنچی ہے کسی اور کسی راہ میں نہیں پہنچی۔ لہٰذا یہ بے کار نہیں جائے گا' بس تو اس پر خوش ہو جا۔ اور بقول بعض ''ما'' نافیہ ہے۔ **ای مالقيت شيئاً** پہنچنے والی تکلیف کو حقیر سمجھتے ہوئے فرمایا۔ میں کہتا ہوں یہ تحصیل حاصل ہے' چونکہ یہ مطلب تو پہلے مصع سے مفہوم ہو رہا ہے' علاوہ وہ ازیں اس کا اطلاق بھی موہم خلل ہے۔ امام سیوطی فرماتے ہیں: روایت کی رو سے ''دمیت'' اور ''لقیت'' میں تاء پر کسرہ ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو شعر کے مخصوص وزن سے بچانے کیلئے یہ کہہ دیا کہ تاء ساکن ہے حالانکہ یہ بھی بحر کامل میں سے ہے۔

اے حسانؓ! مشرکین کی ہجو کرو

۴۷۸۹: وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ يَوْمَ قُرَيْظَةَ لِحَسَّانِ بْنِ ثَابِتٍ اُهْجُ الْمُشْرِكِيْنَ فَاِنَّ جِبْرِيْلَ مَعَكَ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لِحَسَّانٍ اَجِبْ عَنِّىْ اَللّٰهُمَّ اَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٦/ ٣٠٤ الحديث رقم ٣٢١٢ و مسلم فی ٤/ ١٩٣٣ الحديث رقم (٥١-٢٤٨٥)۔

ترجمہ: حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریظہ کے دن حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم مشرکین کی ہجو کرو بلاشبہ' حضرت جبرئیل علیہ السلام تمہارے معاون ہیں۔ یعنی القاء و الہام سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسان کو فرماتے میری طرف سے تم مشرکین کی بات کا جواب دو اور پھر یوں دعا فرماتے۔ اے اللہ! ان کی جبرائیل امین

کے ذریعے مدد فرما۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: قولہ: اهج المشركين: "اهج" هجو سے امر کا صیغہ ہے۔ ہجو کرنے کا یہ حکم ابتداءً ہوا اور یہ بھی ممکن ہے کہ جواباً ہو۔

قولہ: فان جبریل معك: واضح رہے کہ حدیث کا یہاں تک کا مضمون حضرت براء سے "متفق علیہ" طور پر مروی ہے اور اگلا مضمون حضرت ابو ہریرہؓ سے "متفق علیہ" طور پر مروی ہے۔ جیسا کہ یہ بات آگے آ رہی ہے۔

"جبریل": اس میں چار قراءت متواترہ ہیں۔ جو ہم ماقبل میں ذکر چکے ہیں۔

القدس: دال کے ضمہ نیز سکون کے ساتھ۔ روح القدس سے مراد روح الامین حضرت جبرئیلؑ ہیں۔ ان کو "روح" کہنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ انبیاء کرام کے پاس وہ چیز لاتے تھے جس میں دلوں کی حیات ہوتی تھی۔ پس وہ حیات قلب کے لئے ایسے تھے کہ جیسے روح حیات جسد کے لئے مبدا ہے۔ "قدس" روح کے عیوب سے طاہر و منزہ ہیں۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ "قدس" بمعنی "مقدس" ہے۔ اور "مقدس" اللہ تعالیٰ ہے پس اس کی طرف "روح" کی اضافت "اضافت تشریفی" ہے۔ اور ان کے تائید کا مطلب یہ ہے کہ یہ حضرت حسان کی مدد کریں گے جواب دینے میں اور ان پر حق وصواب کا الہام فرمائیں گے۔ مروی ہے کہ حضور ﷺ کی دعا کے بعد حضرت جبرائیلؑ نے ۱۹۰ اشعار میں حضرت حسانؓ کی خصوصی مدد و نصرت فرمائی۔

تخریج: اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائیؒ نے بھی حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔

میرک شارح اس سلسلے میں تحقیقی بات لکھتے ہوئے فرماتے ہیں: مؤلفؒ نے جس طرح یہ حدیث ذکر کی ہے اس کے ظاہر سے یوں لگتا ہے کہ "وكان رسول ﷺ يقول لحسان...... حضرت براء کی حدیث میں آیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ صحیحین سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کا اتنا حصہ: اهج المشركين فان جبريل معك. حضرت براءؓ سے متفق علیہ طور پر مروی ہے۔ اس سے اگلا حصہ صرف حضرت ابو ہریرہؓ سے متفق علیہ طور پر مروی ہے۔

ہجویہ اشعار تیر سے زیادہ سخت

۴۷۹۰: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اهْجُوْا قُرَيْشًا فَاِنَّهٗ اَشَدُّ عَلَيْهِمْ مِنْ رَشْقِ النَّبْلِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فى صحيحه ٤/١٩٣٥ الحديث رقم (١٥٧-٢٤٩٠)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم قریش کی ہجو کرو اور وہ ان کے لئے تیر مارنے سے زیادہ سخت ہے۔ (مسلم)

تشریح: رَشق: راء کے فتحہ، شین معجمہ کے سکون اور قاف کے ساتھ (تیر مارنا۔)

رِشق: راء کے کسرہ شین معجمہ کے سکون اور قاف کے ساتھ (تیراندازی کا ایک راؤنڈ، تیر پھینکنے کا آلہ)

نبل: نون کے فتحہ بائے موحدہ کے سکون اور لام کے ساتھ۔ تیر۔

جب تم اللہ اور رسول کا دفاع کرتے ہو تو روح القدس تمہارے معاون

۴۷۹۱: وَعَنْهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لِحَسَّانٍ اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ لَايَزَالُ يُؤَيِّدُكَ مَا نَافَحْتَ عَنِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَقَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ هَجَاهُمْ حَسَّانٌ فَشَفٰى وَاشْتَفٰى۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/١٩٣٥ الحديث رقم (١٥٧-٢٤٩٠)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہوئے سنا کہ جب تک تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے دفاع کرتے ہو تو روح القدس تمہاری معاونت کرتے ہیں اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ حسان نے ان کی ہجو کر کے شفا دی اور شفا پائی۔ یعنی سکون واطمینان کا سامان مہیا کیا۔ (مسلم)

تشریح: یؤیدك: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ، اس ہمزہ کو واؤ سے بدل کر پڑھنا بھی جائز ہے۔

نافحت: صاحب النہایہ لکھتے ہیں: المنافحة، المدافعة والمضاربة "مدافعت" کا معنی ہے (دفاع کرنا۔ حمایت کرنا مدد کرنا' مزاحمت کرنا)

("مضاربت" کا معنی ہے کسی کے ساتھ مار پیٹ کرنا' مار پیٹ میں مقابلہ کرنا۔ مارنے میں بڑھ جانا' ایک دوسرے پر تلوار مارنا)

یہاں "منافحة" سے مراد مشرکین کی ہجو اور ان کے اشعار کا مقابلہ ہے۔ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ مشرکین کی ہجو میں جو شعر کہتے ہو تو حضرت جبرائیل علیہ السلام تم پر ہجو کے مضامین کا القاء کرتے ہیں' برخلاف دیگر شعراء کے کہ وہ کلام گھڑتے ہیں۔ کہ وہ خواہشات نفسانی کی اتباع کرتے ہیں۔ ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں۔ ان کے ذہن میں آنے والا کلام شیطان کا القاء کردہ ہوتا ہے۔

قوله: فشفى واشتفى: اس جملے کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں:

1. مسلمانوں کو شفا دی اور خود بھی شفاء پائی۔
2. تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ممکن ہے کہ واشتفى، شفى کی تاکید ہو۔ یعنی انہوں نے کفار کی ہجو کا جواب ہجو سے دے کر مسلمانوں کے دل ٹھنڈے کر دیئے۔

کہیں شیطان تمہیں اپنا وکیل نہ بنا لے

۴۷۹۲: وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْقُلُ التُّرَابَ يَوْمَ الْخَنْدَقِ حَتّٰى اغْبَرَّ بَطْنُهٗ يَقُوْلُ

وَاللّٰهِ لَوْلَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا ☆ وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا
فَاَنْزِلَن سَكِيْنَةً عَلَيْنَا ☆ وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَّاقَيْنَا
اِنَّ الْاُوْلٰى قَدْبَغُوْا عَلَيْنَا ☆ اِذَا اَرَادُوْا فِتْنَةً اَبَيْنَا
يَرْفَعُ بِهَا صَوْتَهٗ اَبَيْنَا اَبَيْنَا۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۷/۳۹۹ الحدیث رقم ٤١٠٤ ومسلم فی۳/۱٤۳۰الحدیث رقم (۱۲۵-۱۸۰۳) واحمد فی المسند ٤/۳۰۲۔

ترجمہ:حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق کے دن خندق سے مٹی منتقل کر رہے تھے یہاں تک کہ آپ کا پیٹ مبارک بھی مٹی سے آلودہ ہوگیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم زبان سے یہ الفاظ فرماتے جا رہے تھے۔ اگر اللہ ہدایت نہ دیتا تو ہم ہدایت نہ پاتے اور نہ ہم صدقہ کرتے اور نہ ہم نماز پڑھتے اے اللہ! اپنا سکینہ ہم پر نازل فرما اور اگر دشمن سے ہمارا سامنا ہو تو ہمیں ثابت قدم رکھنا یقیناً پہلوں یعنی کفار نے ہم پر سرکشی کی ہے اور انہوں نے جب ہمیں فتنے میں ڈالنا چاہا تو ہم نے اس سے انکار کر دیا اور یہ لفظ (ابینا) بار بار اور بلند آواز سے فرماتے۔ (بخاری، مسلم)

وَاللّٰهِ لَوْلَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا ☆ وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا
فَاَنْزِلَن سَكِيْنَةً عَلَيْنَا ☆ وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَّاقَيْنَا
اِنَّ الْاُوْلٰى قَدْبَغُوْا عَلَيْنَا ☆ اِذَا اَرَادُوْا فِتْنَةً اَبَيْنَا

تشریح: **یقول**: اس جملہ کی ترکیب میں تین احتمال ہیں:

- یہ جملہ مستانفہ ہے۔ - یہ جملہ بدل ہے، اور مبدل منہ "ینقل" ہے۔ - **ینقل** کی ضمیر سے حال ہے۔

واللہ: یہ واؤ قسمیہ ہے۔

لو لا اللّٰہ: یہ عبارت حذف مضاف کے ساتھ ہے۔ **ای لو لا هداية اللّٰه . أو لو لا فضله بأ ن هدانا**

واضح رہے کہ یہ تمام اشعار مختلف آیات سے مقتبس ہیں۔

والله لو لا الله ما اهتدينا:

مذکورہ بالا شعر اس آیت کریمہ سے مقتبس ہے: ﴿وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ﴾ [الاعراف:٤٣]

فانزلن سكينة علينا:

یہ مصرع اللہ جل شانہ کے اس ارشاد گرامی سے اقتباس ہے: ﴿فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الفتح:٢٦]

وثبت الأ قدام ان لاقينا:

یہ اللہ جل شانہ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے: ﴿وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة۔٢٥٠]

اصل زندگی آخرت کی ہے

۴۷۹۳: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ جَعَلَ الْمُهَاجِرُوْنَ وَالْاَنْصَارُ يَحْفِرُوْنَ الْخَنْدَقَ وَيَنْقُلُوْنَ التُّرَابَ وَ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا يَقُوْلُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يُجِيْبُهُمْ اَللّٰهُمَّ لَاعَيْشَ اِلَّاعَيْشُ الْاٰخِرَةِ فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَةِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤٦/٦ الحديث رقم ٢٨٣٥ و مسلم في ١٤٣٢/٣ الحديث رقم (١٣٠-١٨٠٥) واحمد في المسند ١٧٢/٣۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مہاجرین وانصار خندق کھود رہے تھے اور اس کی مٹی کو منتقل کر رہے تھے اور زبان پر یہ کلمات تھے: نَحْنُ الَّذِيْنَ یعنی ہم ہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جہاد پر بیعت کی ہے اور یہ اس وقت تک کے لئے ہے جب تک ہم زندہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جواب دیتے ہوئے فرماتے اے اللہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے پس تو انصار مہاجرین کی بخشش فرما۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: **قوله: ان الأولى قد بغوا علينا: الأولى**:

الف مقصورہ کے ساتھ ہے ''اولاء'' میں ایک لغت ہے۔ اس میں اشارہ ہے اہل مکہ اور ان احزاب کی طرف جو اہل مکہ کے ہم خیال تھے۔ **قد بغوا علينا**: یعنی انہوں نے تکبیر کیا' تجبیر کیا' اور ہم پر ظلم وزیادتی کی' اور اس کا سبب اگلے جملہ میں بیان فرمایا گیا ہے اور ''فتنہ'' سے یہاں یہ تمام معانی مراد لئے جا سکتے ہیں: ① شرک' ② قتل ③ لوٹ مار ④ ہمیں گمراہ کرنا ⑤ ہمیں وہ اپنی ملت میں لوٹانا چاہتے ہیں۔ اس مصرع میں اللہ جل شانہ کے اس فرمان گرامی کی طرف اشارہ ہے: ﴿اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ﴾ [الممتحنة:٢]

قوله: يرفع بها صوته أبينا أبينا: اى فائلا أبينا أبينا۔

اس کو مکرر ارشاد فرمانا تاکید تلذذ کے لئے تھا' اور دوسرے مسلمانوں کو اور کافروں کو سنانے کے لئے تھا۔ امام طیبی فرماتے ہیں ''بها'' کی ضمیر ''ابیات'' کی طرف راجع ہے۔ اور ''أبينا أبينا'' حال ہے۔ **اى خصوصا أبينا أبينا**۔ اور ایک احتمال یہ ہے کہ مفعول مطلق ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''بها'' کی ضمیر مبہم ہو' اور ''انبیاء'' اس کی تفسیر ہو۔ جیسا کہ یہ ارشاد گرامی: ﴿كبرت كلمة تخرج من أفواههم﴾ [الكهف-٥]

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا ☆ عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

''ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک جہاد کرتے رہنے کے لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی ہے''۔

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس رجز کے جواب میں یہ دعا فرماتے جاتے تھے کہ اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے تو انصار و مہاجرین کو بخش دے''۔ (بخاری و مسلم)

الخندق بایعو: مبایعۃ مصدر سے فعل ماضی کا صیغہ ہے۔

بقینا: قاف کے کسرہ کے ساتھ ای ماعشنا۔

فاغفر: استر کے معنی کو متضمن ہے۔

الآخرۃ: ھائے ساکنہ برائے وقف، کے ساتھ ہے۔ایک نسخہ میں تائے مکسورہ کے ساتھ ہے۔

الانصار: ایک نسخہ میں "للانصار" ہے، اس صورت میں نقل حرکت کے ساتھ پڑھا جائے گا، تا کہ وزن سلامت رہے۔

المھاجرۃ: کے آخر میں تاء برائے جمع ہے۔"مہاجرہ" سے مراد مہاجرین کی جماعت ہے۔

یقول النبی ﷺ: جملہ مستانفہ ہے۔سوال مقدر یہ تھا: فما کان یقول؟

وھو یجیب: قول اور مقولہ کے درمیان واقع یہ جملہ حالیہ معترضہ ہے۔

اشعار کی تشریح:

آنحضرت ﷺ گویا ان دعائیہ الفاظ کے ذریعہ صحابہؓ کو تسلی دیتے تھے کہ تمہیں اس موقع پر جو محنت ومشقت برداشت کرنا پڑ رہی ہے اور تم جن سخت حالات سے دوچار ہو ان پر صبر کرو اللہ تعالیٰ کا انعام تمہارے لئے مقدر ہے اور اس دنیا میں تمہیں راحت و سکون ملے یا نہ ملے لیکن آخرت کی زندگی میں تمہیں اپنی اس محنت ومشقت کے عوض بے شمار انعامات ملیں گے نیز اصل انعامات آخرت ہی کے ہیں بایں طور کہ زندگی بس آخرت ہی کی زندگی ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے جب کہ اس دنیا کی کیا راحت و کیا مصیبت سب کو آخر کار معدوم ہو جانا ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: [﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ [آل عمران ۱۸۵]

اول تو سردی کا موسم، پھر بھوک پیاس سے دوچار اور اوپر سے سنگلاخ زمین کا کھودنا بڑا سخت مرحلہ تھا، مگر اس موقع پر بڑے صبر وضبط کے ساتھ حضرات صحابہ، سرور دو عالم ﷺ کے ساتھ خندق کھودنے میں لگے ہوئے تھے، اس موقع پر ان کی محنت ومشقت اور بھوک کی حالت کو دیکھ کر حضور اقدس ﷺ یہ پڑھتے تھے۔اے اللہ! بلا شبہ زندگی بس آخرت ہی کی ہے، پس تو بخش دے انصار اور مہاجرین کو اس شعر کے پڑھنے کا مقصد یہ تھا کہ حضرات صحابہؓ چند روز تکلیف کی وجہ سے بددل نہ ہوں اور آخرت کی کامیابی کو سامنے رکھ کر کام کرتے رہیں اور اللہ پاک کی رحمت اور مغفرت کے امیدوار رہیں، جب حضور ﷺ اوپر والا شعر پڑھتے تو حضرات انصار ومہاجرینؓ اس کے جواب میں یہ پڑھتے:

نحن الذین بایعوا محمدا
علی الجھاد ما بقینا أبدا

"ہم ہیں جنہوں نے بیعت کی ہے محمد سے کہ جب تک ہم زندہ رہیں ہمیشہ جہاد کرتے رہیں گے۔"

حضرات صحابہ حضورؐ سے وہ شعر سن کر اس کے جواب میں بار بار اپنے مومن اور مجاہد ہونے کا اعلان کرتے تھے، اور ظاہر کرتے تھے کہ یہ بات نہیں ہے کہ صرف اس وقت ہم دشمنوں سے دفاع اور ان سے جنگ کیلئے تیار ہیں، بلکہ عمر بھر ہمیشہ جہاد کرتے رہیں گے۔اسلام قبول کر کے ہم اسلام کی بقاء اور احیاء کیلئے جہاد کرنے پر مضبوط ارادوں اور عزم محکم کے ساتھ تیار ہیں،

یہ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ پہلے مذکورہ بالا شعر پڑھتے تھے پھر اس کے جواب میں حضرات صحابہ شعر پڑھتے تھے۔ لیکن ان کی دوسری روایت میں ہے کہ حضرات مہاجرین اور انصار مدینہ منورہ کے گرد خندق کھود رہے تھے اور اپنی کمروں پر مٹی ڈھو رہے تھے۔ اور یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:

نحن الذین بایعوا محمدا
علی الجهاد ما بقینا أبدا

اور حضور اقدس ان کے جواب میں یہ فرماتے تھے:

اللهم لا عیش الا عیش الآخرة
فاغفر الأنصار والمهاجرة

''اے اللہ بے شک بات یہ ہے کہ کوئی چیز نہیں سوائے آخرت کی زندگی کے پس تو برکت فرما دے مہاجرین میں اور انصار میں۔''

درحقیقت یہ کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ طرفین سے جواب اور جواب الجواب میں شعر پڑھے جا رہے تھے اور برابر عمل جاری تھا اس لئے یہ کہنا بھی درست ہے کہ حضور اقدس نے اُن کے جواب میں پڑھا اور یہ بھی درست ہے کہ حضرات صحابہؓ نے آپؐ کے جواب میں پڑھا۔ حضور اقدس کبھی '' ان العیش عیش الآخرة ''فرماتے اور کبھی '' لا خیر الا خیر الاخرة'' فرماتے تھے۔

اس طرح بعض نسخوں میں ہے کہ حضرات صحابہؓ کے شعر ''نحن الذین'' کے دوسرے مصرع میں ''علی الجهاد'' کے بجائے ''علی الاسلام'' وارد ہوا ہے، ہوسکتا ہے کہ حضرات صحابہؓ نے کبھی یہ کہا ہو اور کبھی وہ کہا ہو اور رواۃ کی یادداشت کا اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔

خراب اشعار کی مذمت

۴۷۹۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَاَنْ یَمْتَلِیَٔ جَوْفُ رَجُلٍ قَیْحًا یَرِیْهُ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ یَمْتَلِیَٔ شِعْرًا۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰/۵۴۸ الحدیث رقم ۶۱۵۵ ومسلم فی ۴/۱۷۶۹ الحدیث رقم (۷-۲۲۵۷) وابوداؤد فی السنن ۵/۲۷۶ الحدیث رقم ۵۰۰۹، والترمذی فی ۵/۱۲۹ الحدیث رقم ۲۸۵۱ و ابن ماجه فی ۲/۱۲۳۶ الحدیث رقم ۳۷۵۹، والدارمی فی ۲/۳۸۴ الحدیث رقم ۲۷۰۵، واحمد فی المسند ۱/۱۷۵۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ کسی آدمی کے پیٹ کا پیپ سے بھر جانا جس سے ہو گندا ہو جائے وہ اس سے بہتر ہے کہ اس کا پیٹ شعروں سے بھرا ہوا ہو۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: اگر یہ زئة سے مشتق ہو تو مطلب ہوگا پھیپھڑوں کی بیماری۔

یریه: پہلی باء کے فتحہ راء کے کسرہ اور ~~دوسری باء کے~~ سکون کے ساتھ۔ ''وزی'' سے ماخوذ ہے۔ پیٹ کی ایک بیماری ہے جو پیٹ کو خراب کر دیتی ہے مطلب یہ ہے کہ یہ اشعار انسان کے پیٹ کو گلا دے اور خراب کر دے۔ بعض نے یوں کہا ہے کہ

پیپ اس کے پھیپھڑوں تک پہنچ جائے اور ان کو خراب کر دے۔

قیحا: تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ''قیح'' سے مراد پیپ، خون اور نجاست ہے۔

یریه: یہ جملہ محل نصب میں ''قیحًا'' کی صفت ہے۔

شرح مسلم میں ہے کہ علماء فرماتے ہیں اس حدیث کے ذریعہ ایسی شاعری کی مذمت کی گئی ہے جو انسان پر اس قدر غالب آ جائے کہ انسان تلاوت قرآن وغیرہ علوم شرعیہ اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہو جائے یہ اشعار مذموم ہیں۔ خواہ وہ اشعار کسی بھی طرح کے ہوں وگرنہ تو تھوڑے سے اشعار کا یاد کرنا مضر نہیں، چونکہ اس سے اس کا سینہ شعروں سے بھرا ہوا نہیں ہوگا۔

بعض حضرات کا کہنا ہے اس حدیث میں مذکورہ مذمت ایک خاص فرد کے بارے میں ہے، جیسا کہ فصل ثالث میں آ رہا ہے۔ امام سیوطی فرماتے ہیں: کہا گیا ہے کہ یہ مذمت ان اشعار سے متعلق ہے جو آنحضرت ﷺ کی ہجو پر مشتمل ہوں۔ جیسا کہ ایک روایت میں آتا ہے: **شعرا هجیت به.**

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں بظاہر یہ مذمت مطلقًا ہے۔ اشعار مذمومہ میں ایسے اشعار تو سر فہرست داخل ہیں۔ اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر خصوصی طور پر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار قبیح ترین ہیں۔ یا یہ بتانا مقصود ہے کہ شعر مذموم ہے۔ چونکہ بعض مرتبہ یہ چیز نبی کی ہجو تک پہنچا دیتی ہے۔ وگرنہ امتلاء کی قید لگانے کی ضرورت نہیں، چونکہ شعر کی یہ نوع، ہجو پر مشتمل ہر وہ شعر مذموم ہے جو کسی افتراء یا کسی بھی مسلمان کی ہجو پر مشتمل ہو۔ خواہ سینہ بھرا ہو یا نہ ہو۔

تخریج: امام میرک نے ذکر کیا ہے، اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

جامع صغیر کو میں اس حدیث کا احمد، شیخین اور اصحاب کتب اربعہ سے مروی ہونا مذکور ہے۔

الفصل الثانی:

مؤمن کا زبان سے جہاد

۴۷۹۵: عَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّهٗ قَالَ لِلنَّبِيِّ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَدْ اَنْزَلَ فِي الشِّعْرِ مَا اَنْزَلَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ يُجَاهِدُ بِسَيْفِهٖ وَلِسَانِهٖ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَكَاَنَّمَا تَرْمُوْنَهُمْ بِهٖ نَضْحَ النَّبْلِ (رواه فی شرح السنة وفی الاستیعاب الابن عبدالبر انه) **قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَاذَا تَرٰی فِي الشِّعْرِ؟ فَقَالَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ يُجَاهِدُ بِسَيْفِهٖ وَلِسَانِهٖ۔**

أخرجه البغوی فی شرح السنة ۱۲/۳۷۸ الحدیث رقم ۳۴۰۹، واحمد فی المسند ۳/۴۵٦۔

ترجمہ: حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اشعار سے متعلق وہ آیات اتاریں جو اتاریں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن اپنی تلوار اور زبان دونوں سے ہی جہاد کرتا ہے مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کی قبضہ قدرت میں میری جان ہے! گویا تم ان اشعار سے کفار کو تیروں سے مارتے ہو۔ یہ شرح

خیال ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ مؤمن اپنی تلوار اور زبان سے جنگ کرتا ہے۔

تشریح: قوله: عن كعب بن مالك: واضح ہے کہ بعض نسخوں میں "عن أبيه" لکھا ہوا ہے' یہ خطأ فاحش ہے۔ ابن عبدالبر اپنی کتاب ''الاستیعاب'' میں ابن سیرین سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

کہ تین حضرات شعراء اسلام (میں ممتاز اور برتر حیثیت رکھتے) تھے: ❶ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ ❷ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ❸ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ! حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے اشعار خصوصیت سے ایسے مضامین پر مشتمل ہوتے تھے جو کفار و مشرکین کو جنگ و جہاد کے خوف میں مبتلا کرتے تھے ابن سیرین فرماتے ہیں' ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ ''دوس'' نے کعب بن مالک کے اشعار سے خوف زدہ ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔

قوله: لكأنما ترمونهم به نضح النبل: لام زائدہ ہے' تاکید قسم کے لئے لایا گیا ہے۔ اور معنوی اعتبار سے تقدیری عبارت یوں ہے: **والذی نفسی بیده انما ترمو نهم۔**

"به" ضمیر مجرور کا مرجع شعر بھی ہوسکتا ہے اور ''لسان'' بھی۔

نضح النبل: منصوب ہے، معنوی اعتبار سے تقدیری عبارت گویا یوں ہے: نضحا مثل نضح النبل! اور امام طیبیؒ لکھتے ہیں: ای کنضح النبل۔ (یعنی حرف جر مقدر ہے۔) اس لئے کہ "کان زید الاسد" کی اصل "ان زیدا کا لاسد" ہے۔ اہتمام کے پیش نظر حرف تشبیہ کو مقدم کردیا گیا۔ اور فصل اس پر دلالت کررہا ہے قاضیؒ فرماتے ہیں۔ "نضح النبل" یہ مستعار ہے نضح الماء سے' اور مطلب یہ ہے: أن هجاء هم يؤثر فيهم تاثير النبل' وقام قيام الرمي في النكاية بهم۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں آنحضرتؐ کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ شعر کی مذمت علی الاطلاق نہیں ہے' یہ مذمت ان ''هائمین'' کی ہے جو گمراہی کی وادیوں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ جہاں تک بات ہے مؤمن کی سو وہ اس حکم سے خارج ہے چونکہ کفار کے مقابلہ میں کی جانے والی دو تیاریوں لسان و سنان میں سے ایک تیاری یہی ہے' بلکہ یہ اس سے بڑھ کر ہے۔

جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا: **فان أشد عليهم من رشق النبل۔**

شاعر بھی اسی طرف اشارہ کررہا ہے۔

جراحات السنان لها التئام ☆ ولا يلتام ماجرح اللسان

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے شعر و شاعری کی مذمت میں قرآن کریم کی یہ آیت: ﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ﴾ [الشعراء۔ ۲۲٤] نازل فرمائی اور کعب بن مالک نے جب یہ سنی تو وہ شعر کہنے سے رک گئے۔ چنانچہ اس پر نبی کریمؐ نے ان سے یہ بات ارشاد فرمائی۔ (جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شعراء اپنے اشعار کے ذریعہ خدا اور خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر کفار کا شعری مقابلہ کرتے ہیں اور ان کی ہجو کا جواب ہجو سے دے کر گویا دین اسلام کی تائید کرتے ہیں وہ دراصل جہاد کرنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ لہٰذا تمہیں اطمینان رکھنا چاہئے کہ نہ تمہارے اشعار اس آیت کی روشنی میں قابل مذمت ہیں اور نہ تم ان شعراء میں داخل ہو جن کی برائی ظاہر کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی گئی ہے۔)

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں: شرح السنہ میں اس حدیث کو صحیحین کی سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ البتہ احمد بن منصور

''عالم ثبت'' ہیں۔ ''استیعاب'' کی روایت کو احمد اور طبرانی نے کعب بن مالک سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً نقل کیا ہے:
يجاهد بسيفه و لسانه.

فحش گوئی نفاق کا شعبہ ہے

۴۷۹۶: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْحَيَاءُ وَالْعِیُّ شُعْبَتَانِ مِنَ الْاِيْمَانِ وَالْبَذَاءُ وَالْبَيَانُ شُعْبَتَانِ مِنَ النِّفَاقِ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۴/۳۲۹ الحديث رقم ۲۰۲۷، واحمد فی المسند ۵/۲۶۹۔

ترجمہ: حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ حیا اور زبان کو قابو میں رکھنا ایمان کی دو شعبے ہیں اور فحش گوئی اور بکواس نفاق کی دو شعبے ہیں۔ (ترمذی)

تشریح: **العی:** عین مہملہ کے کسرہ اور یائے تحتیہ مشددہ کے ساتھ اس کا معنی ہے کلام میں عاجز آ جانا۔
البذاء: بائے موحدہ کے فتحہ اور ذال معجمہ کے ساتھ فحش کلام یا خلاف حیاء امور۔

قوله: الحياء والعی شعبتان من الايمان:

چونکہ ایمان مؤمن کو حیاء پر ابھارتا ہے پس اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتے ہوئے قبیح کاموں کو چھوڑ دیتا ہے۔ اور ایمان ہی وہ چیز ہے جو مؤمن کو کلام کے بارے میں جری ہونے سے روکتا ہے زبان کی لغزش کے خوف سے۔ چنانچہ یہ دونوں ایمان کے شعبوں میں سے ہیں۔ اور حاصل یہ ہے کہ ایمان نہ صرف ان دونوں صفات بلکہ ہر معروف و احسان کی جائے پیدائش ہے۔

عرضِ مرتب:

قوله: الحياء والعی شعبتان من الايمان: اس کی مزید تشریح حدیث ۵۰۷۲ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

قوله: والبذاء والبيان شعبتان من النفاق: البیان: **الفصاحة الزائدة عن مقدار حاجة الانسان من التعمق فی النطق واظهار التفاصح للتقدم علی الأعيان۔** قاضیؒ فرماتے ہیں: ایمان ابھارتا ہے حیاء پر اور کلام میں احتیاط سے کام لینے پر چنانچہ ان دونوں کو ایمان میں سے شمار کیا گیا اور ان دونوں کے مخالف کو ''نفاق'' میں سے شمار کیا گیا۔ لہٰذا اس بناء پر یہاں ''عی'' سے مراد ہے جو بات میں تامل کرنے اور وبال تحریر کے سبب ہو نہ کہ زبان کے کسی خلل کی وجہ سے۔ اور ''بیان'' سے مراد وہ بیان ہے جس کا سبب اجزاء جراءت طغیان کی عدم پرواہ اور زور و بہتان سے لاپرواہی ہو۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ومن الناس من يعجبك قوله فی الحيوٰة الدنيا ويشهد اللّٰه علی ما فی قلبه وهو ألد الخصام﴾ [البقرۃ۔۲۰۴] اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: **حسن غريب لانعرفه الامن حديث محمد بن مطرف اهـ۔**

قیامت میں مُنہ پھٹ ومتکبر مجھ سے دُور

۴۷۹۷: وَعَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَحَبَّكُمْ اِلَيَّ وَاَقْرَبَكُمْ مِنِّي يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَحَاسِنُكُمْ اَخْلَاقًا وَاِنَّ اَبْغَضَكُمْ اِلَيَّ وَاَبْعَدَكُمْ مِنِّي اَسَاوِيْكُمْ اَخْلَاقًا الثَّرْثَارُوْنَ الْمُتَشَدِّقُوْنَ الْمُتَفَيْهِقُوْنَ۔ (رواه البيهقي في شعب الايمان)

أخرجه احمد في المسند ٤/١٩٣، والبيهقي في شعب الايمان ٤/٢٥٠ الحديث رقم ٤٩٦٩۔

ترجمہ: حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے سب سے زیادہ میرے ہاں پسندیدہ اور قیامت میں سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جو تم میں اخلاق کے اعتبار سے اچھے ہیں اور تم میں سب سے زیادہ میرے ہاں مبغوض اور مجھ سے نہایت دور وہ لوگ ہوں گے جو برے اخلاق والے مُنہ پھٹ اور فراخ گو اور متکبر ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم ثرثارون اور متشدقون کو تو جانتے ہیں؟ المتفیہقون کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا اس سے مراد متکبر لوگ ہیں۔ یہ بیہقی کی روایت ہے۔

تشریح: قوله: ان احبكم الي واقربكم مني يوم القيامة، أحاسنكم أخلاقا:

عرضِ مرتب:

اس کی تشریح حدیث ۴۷۰۵ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

قوله: ان ابغضكم الي وأبعدكم مني مساويكم اخلاقا: "اخلاقا": تمیز ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اور جمع کا صیغہ اس لئے ارشاد فرمایا کہ انواع مراد ہیں۔ یا جمع کے مقابلہ میں جمع کی رعایت کے پیش نظر لایا گیا ہے۔

"مساوی": (میم کے فتحہ اور واؤ کے کسرہ کے ساتھ بروزن مسائل) "مسوأ" میم کے فتحہ اور واؤ کے ساتھ۔ کی جمع ہے۔ جیسا کہ محاسن، "محسن" کی جمع ہے۔

"مساوی" میں صیغہ کے اعتبار سے دو احتمال ہیں:

1 مصدر ہے، وصف کے معنی پر محمول ہے۔ 2 اسم مکان ہے۔ أي: محال سوء الأخلاق۔

بعض روایات میں "مساویکم" کے بجائے "اساویکم" ہے۔ أساوی، "اسوأ" کی جمع ہے۔ جیسا کہ احاسن، "احسن" کی جمع ہے۔ مصابیح کے اصل نسخہ میں بھی یوں ہی ہے۔

الثرثارون: یہ بدل ہے "مساویکم اخلاقا" سے۔ اس ترکیب کے مطابق مطلب یہ ہوگا کہ یہ اوصاف بدترین اخلاق ہیں۔ چونکہ "مبدل" بمنزلہ تمہید وتوطیۂ ہوتا ہے۔ اور دوسرا ترکیبی احتمال یہ ہے کہ یہ مرفوع علی الذم ہے۔ کہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اس صورت میں یہ مذمت انتہائی شنیع وبلیغ ہو جائے گی۔ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: ثرثارون، ثرثرۃ سے مشتق ہے۔ اس کے معنی ہیں: کثرت کلام وتردیدہ۔ چنانچہ "ثرثارون" کا مطلب ہے وہ لوگ جو بکثرت بتکلف اور حد سے بڑھا ہوا فضول کلام کرنے والے ہیں۔ (یعنی واہی تباہی بک بک کرنے والے)

"المتشدقون": اس کے تین معنی ذکر کیئے ہیں:

- غیرمحتاط کلام کرنے والے
- باچھیں موڑ کر لوگوں سے ٹھٹھا اور مذاق کرنے والے۔
- باچھیں موڑ کر بتکلف کلام کرنے والے۔ یہ "شدق" سے مأخوذ ہے۔ "شدق" کا معنی ہے جانب الفم (باچھ جبڑا) کشادہ ذہن ہونا۔ (چوڑی باچھوں والا ہونا، بڑے جبڑے والا ہوتا)۔

" المتفیہقون": فہق سے مشتق ہے۔ بھر جانا، کشادہ ہونا۔

عرضِ مرتب:

صاحب" المعجم الوسیط" لکھتے ہیں: فهق الاناء والحوض ـَ، فهقا و فهقا، اتنا بھرنا کہ بہہ پڑے۔ أفهق الاناء وغیرہ: بھرنا۔ تفهق الشیء: کھلا ہونا کشادہ ہونا۔ تفهق فلان فی الکلام: کھل کر اچھا کلام کرنا۔ تفیہق فی کلامه: بڑھا چڑھا کر بات کرنا۔ تفیہق فی مشیه: اترا کر چلنا۔ یقال: هو یتفیہق لاعینا بمال غیرہ. ہمارے سامنے کسی کے مال پر فخر کرتا ہے۔ هو متفهق، الفهبق من کل شیء، کشادہ، مفازة فیهق: لق ودق صحراء۔ الفهقه: گردن کی ہڈی کا سرے ملا ہوا مہرہ۔ ج: فیهاق. اھ۔

۴۷۹۸ : وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ نَحْوَهُ عَنْ جَابِرٍ وَفِي رِوَايَةٍ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ عَلِمْنَا الثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشَدِّقُوْنَ فَمَا الْمُتَفَيْهِقُوْنَ قَالَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ۔

أخرجه الترمذي في السنن ٤/٣٢٥ الحديث رقم ٢٠١٨۔

اور اسی طرح کی روایت ترمذی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی ہے۔

قوله: وروى الترمذي نحوه عن جابر:

واضح رہے کہ ترمذی کی حدیث جو جابر سے مروی ہے ابوثعلبہ کی حدیث کے ہم معنی ضرور ہے، ہم لفظ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ترمذی کی روایت

میں: مساویکم أخلاقا کے الفاظ نہیں بلکہ "أبعد کم منی مجلسا یوم القیامة الثر ثارون" الخ کے الفاظ ہیں۔ (میرک)

قوله: قد علمنا الثرثارون والمتشدقون فما المتفیہقون:

عرضِ مرتب:

اس کی تشریح کیلئے پچھلی حدیث ملاحظہ فرمائیے۔

قوله: قال: المتکبرون:

یعنی وہ لوگ جو اپنے کاموں اور اپنی باتوں میں بڑائی، بزرگی، عظمت و غرور کا اظہار کرتے ہیں۔

زبان سے کھانے والوں کا خروج

۴۷۹۹: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَخْرُجَ قَوْمٌ يَاكُلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ كَمَا تَاْكُلُ الْبَقَرَةُ بِاَلْسِنَتِهَا۔ (رواه احمد)

أخرجه احمد في المسند ۱/۱۸۴۔

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ ایسے لوگ نہ نکلیں جو اپنی زبانوں سے اس طرح کھائیں گے جس طرح کہ گائے اپنی زبان سے کھاتی ہے۔ (احمد)

تشریح: البقرۃ: پہلے تینوں حرفوں پر فتحہ ہے۔ (بوزن رقبة)۔ اور ایک نسخہ میں "الباقرۃ" ہے۔ اس کا معنی ہے گایوں کا ریوڑ۔

امام میرک فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ شرح السنہ میں بھی ذکر کیا ہے۔

تورپشتی فرماتے ہیں: معنی کو سمجھانے کے لئے ایک مثال بیان فرمائی ہے۔ گائے کی یہ حالت ایک جیتی جاگتی زندہ حقیقت ہے۔ جس کا مشاہدہ شب و روز ہم اپنی زندگیوں میں کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسی حقیقت "اوقع في النفس" ہوتی ہے۔ مشاہداتی بات ہے کہ تمام جانور سبزہ اور چارہ اپنے دانتوں سے کھاتے ہیں۔ مگر گائے اپنی زبان سے کھاتی ہے۔

اللہ کی نگاہ میں ناپسندیدہ شخص

۴۸۰۰: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ الْبَلِيْغَ مِنَ الرِّجَالِ الَّذِيْ يَتَخَلَّلُ بِلِسَانِهٖ كَمَا يَتَخَلَّلُ الْبَقَرَةُ بِلِسَانِهَا۔ (رواه الترمذی و ابو داؤد وقال هذا حديث غريب)

أخرجه ابو داؤد في السنن ۵/۲۷۴ الحديث رقم ۵۰۰۵، والترمذی في ۵/۱۲۹ الحديث رقم ۲۸۵۳، واحمد في المسند ۲/۱۸۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ شخص سخت ناپسندیدہ ہے جو کلام و بیان میں حد سے زیادہ فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کرے اس طرح کہ وہ اپنی زبان کو اس طرح لپیٹ لپیٹ کر باتیں کرے جس طرح گائیں اپنے چارے کو لپیٹ لپیٹ کر جلدی جلدی اپنی زبان کے ذریعہ کھاتی ہیں۔ اس روایت کو ترمذی اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے نیز ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله: ان الله يبغض البليغ من الرجال: "من الرجال" کی قید (احترازی نہیں ہے بلکہ) غالبی ہے۔ کہ یہ صفت عام طور پر مردوں میں پائی جاتی ہے۔

الذی: "البلیغ" کی صفت ہے۔

یتخلل بلسانہ: کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں:

① اس کا پہلا مطلب پچھلی حدیث میں بیان ہو چکا ہے۔
② وہ شخص جو اپنی فصاحت و بلاغت کا بھرپور اظہار کرنے کیلئے اپنی زبان کو اپنے ہونٹوں پر گھمائے۔

لہٰذا اچھا کلام وہی ہے جو:

۱ بقدر ضرورت ہو۔ ۲ سیدھا سادہ ہو۔ ۳ متکلم کی باطن کی کیفیت کے ہم آہنگ ہو۔ ۴ شریعت کے مطابق ہو۔

قولہ: کما یتخلل الباقرۃ بلسانہا: الباقرۃ: سے مراد "بقرۃ" ہے۔ گویا کہ یہاں تاء اس بناء پر داخل کی گئی ہے کہ وہ جنس کا اک فرد ہے۔ جیسا کہ بقرۃ اور بقر میں نسبت ہے۔ اس کا تاء کے ساتھ استعمال قلیل ہے۔

قاضیؒ نے تقریباً وہی فرمائی ہے جو "یتخلل لسانہ" کے تحت دیگر شراح کے حوالہ سے پچھلی حدیث میں گزری۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: شبہ ادارۃ لسانہ حول الأسنان والفم حال المتکلم تفاصحا بما تفعل البقرۃ بلسانہا، والباقرۃ جماعۃ البقرۃ. النہایہ میں لکھتے ہیں: ھو الذی یتشدق فی الکلام، ویفخم بہ لسانہ، ویلفہ کما تلف البقرۃ بلسانہا لفا۔ اھ۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ امام حاکم اپنی تاریخ کی کتاب میں حضرت ابو ہریرہؓ کے حوالہ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں: ان اللہ یبغض کل عالم بالدنیا جاھل بالآخرۃ.

قینچیوں سے ہونٹ کاٹے جانے والے خطباء

۴۸۰۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَرْتُ لَيْلَةَ اُسْرِیَ بِیْ بِقَوْمٍ تُقْرَضُ شِفَاهُهُمْ بِمَقَارِيْضَ مِنَ النَّارِ فَقُلْتُ يَاجِبْرَئِيْلُ مَنْ هٰؤُلَاءِ قَالَ هٰؤُلَاءِ خُطَبَاءُ اُمَّتِكَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ مَالَا يَفْعَلُوْنَ۔ (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

أحمد فی المسند ۳/۱۸۰۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس رات مجھے معراج کرائی گئی میرا گزر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے ہونٹ قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے میں نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو انہوں نے کہا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے وہ خطباء ہیں جو کہ وہ بات کہتے ہیں جو نہیں کرتے۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا اور کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: تقرض: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ بمعنی تقطع

شفاھم: حرف اول کے کسرہ کے ساتھ یہ شفۃ، ۔ (حرف اول کے فتحہ کے ساتھ) کی جمع ہے۔

مقاریض: مقراض کی جمع ہے۔ بمعنی قینچی۔

قولہ: مررت لیلۃ اسری بی بقوم تقرض شفاھھم بمقاریض من النار: "لیلۃ": ظرف زمان، جملہ کی طرف

مضاف ہونے کی وجہ سے مبنی علی الفتح ہے۔ایک نسخہ میں " لیلة "تنوین کے ساتھ ہے،اس صورت میں أسری بی، پورا جملہ محلاً منصوب ہوکر"لیلة" کی صفت ہےاور ضمیر عائد محذوف ہے۔ اور تقدیری عبارت یوں ہوگی:أی:لیلة اسری بی فیها.

بقوم:مررت کے متعلق ہے۔

هؤلاء:اسم اشارہ ہے۔یہاں اسم اشارہ لانا برائے تحقیر ہے۔اسی وجہ سے اس کا اعادہ کیا گیا۔

خطباء أمتك سے مراد:

اس سے مراد وہ علماء،واعظین اور شعراء ہیں جو اس آیت:﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ [الصف:۳] کا مصداق ہیں۔ایک دوسری آیت میں اس طرح کے لوگوں کی مذمت میں یہ الفاظ آئے ہیں:﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ [البقرة:٤٤]

زبان آوری کا ایک غلط مقصد

۴۸۰۲:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَعَلَّمَ صَرْفَ الْكَلَامِ لِيَسْبِيَ بِهِ قُلُوْبَ الرِّجَالِ اَوِ النَّاسِ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صَرْفًا وَّلَا عَدْلًا۔ (رواه ابوداؤد)

أخرجه ابو داؤد في السنن ٥/ ٢٧٤ الحديث رقم ٥٠٠٦۔

ترجمہ:حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:جس نے کلام میں ہیر پھیر اس لیے سیکھا تا کہ اس سے لوگوں کے دلوں کو یا مردوں کے دلوں کو قابو میں رکھے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے فرائض ونوافل کو قبول نہ فرمائے گا۔(ابوداؤد)

تشریح: صرف:اس کے معنی ہیں: فضل (اس کے تین معنی ہیں:۱:اقتصار سے زائد۔۲:وہ احسان جو ابتداءً بلا علت ہو۔۳: شئے کا بقیہ) یعنی کلام کو مختلف صورتوں میں پیش کرنا یا زیادہ باتیں بنانا اور کلام میں اپنی مرضی سے تصرف کرنا۔صاحب النہایہ لکھتے ہیں:صرف کے معنی ہیں:توبہ یا نافلہ۔اور عدل کے معنی ہیں:فدیہ یا فریضہ۔

ليسبي به:بائے موحدہ کے کسرہ کے ساتھ۔اور ضمیر مجرور"صرف الکلام" کی طرف عائد ہے۔

قلوب الرجال أو الناس :أو:راوی کے شک کے ظاہر کرتا ہے۔

امام ترمذیؒ،ابن عمرؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:من تعلم علما لغير الله فليتبوأ مقعده من النار.

مذکورہ وعید کا تعلق اس شخص سے ہے جو چرب زبانی کرے ضرورت سے زیادہ باتیں بنائے اپنے مقصد کو اس طرح گھما پھرا کر بیان کرے کہ حقیقت ظاہر نہ ہو سکے یا اپنے کلام کو ضرورت سے زیادہ فصاحت وبلاغت نیز مبالغہ آرائی کے ساتھ آراستہ و مزین کرے اور ان چیزوں کا مقصد محض یہ ہو کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی باتوں سے اثر قبول کر کے اس کے مقصد کو پورا کریں۔

اختصار میں خیر ہے

۴۸۰۳: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّهٗ قَالَ یَوْمًا وَقَامَ رَجُلٌ فَاَکْثَرَ الْقَوْلَ فَقَالَ عَمْرٌو لَوْ قَصَدَ فِیْ قَوْلِهٖ لَکَانَ خَیْرًا لَّهٗ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَقَدْ رَاَیْتُ اَوْ اُمِرْتُ اَنْ اَتَجَوَّزَ فِی الْقَوْلِ فَاِنَّ الْجَوَازَ هُوَ خَیْرٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ۵/۲۷۶ الحدیث رقم ۵۰۰۸۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے بہت زیادہ باتیں کیں حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر یہ شخص اپنی بات میں میانہ روی اختیار کرتا تو اس کے لئے زیادہ اچھا تھا اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا میں مناسب سمجھتا ہوں یا مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں بات کو مختصر کیا کروں اس لیے کہ اختصار میں ہی خیر ہے۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله:فان الجواز هو خير:"جواز": جیم کے فتحہ کے ساتھ: قدر کفایت پر اکتفاء کرنا۔

"قصد": تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر وہ کلام میں راہ مستقیم پر گامزن رہتا۔"قصد" کا معنی ہے افراط وتفریط کے درمیان کی راہ۔

قوله: فقال عمرو :مشکوۃ کے تمام نسخوں میں اسی طرح ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: سنن ابی داؤد اور مصابیح کے بعض نسخوں میں اسی طرح ہے۔یہ الفاظ طول کلام کے سبب مکرر نقل کئے گئے ہیں۔"ولو قصد فی قوله:لکان خیرًا له"مقولہ ہے: "قال یوما" کا اور "قام رجل"حال ہے(اوراس سے پہلے"قد"مقدر ہے)۔ظاہر ہے کہ حال کی وجہ سے قول ومقول کے درمیان خاصا فرق ہوگیا اس لئے فقال عمرو! دوبارہ کہہ کر گویا قول کا اعادہ کیا۔اوراس کی نظیر حماسی کا یہ قول ہے:

وان امرءًا دامت مواثیق عهده
علی مثل هذا انه لکریم

"لکریم" پہلے "ان" کی خبر ہے۔"انه" کا اعادہ طول کلام کی وجہ سے ہے۔

قوله:لقدر رأیت أوأمرت أن تجوز فی القول:

"رأیت": یہ بمعنی "علمت" ہے۔

"او" :راوی کو شک ہے(کہ ان دونوں میں سے کیا الفاظ ارشاد فرماتے تھے)"أن أتجوز فی القول" کا مطلب یہ ہے کہ میں بات جلدی مکمل کروں اور سامع کی مشقت کم کردوں۔یہ ماخوذ ہے:تجوز فی صلاته ای خففو (نماز میں اختصار کرنا) سے۔اھ۔ایک شارح فرماتے ہیں کہ "تجوز فی القول"اور"الجواز" ان دونوں کا مطلب ہے:الاقتصار (اکتفاء کرنا)۔

اسنادی حیثیت: میرکؒ فرماتے ہیں: اس سند میں محمد بن اسماعیل بن عباس، اپنے والد سے حدیث نقل کررہے ہیں۔ یہ

دونوں متکلم فیہ ہیں۔

تخریج: جامع صغیر میں یہ الفاظ آئے ہیں:

لقد أمرت ان اتجوز في القول، فان الجواز في القول وهو خير. رواه ابو داود والبيهقي عن عمرو بن العاص.

بعض کلام وبالِ جان ہے

۴۸۰۴: وَعَنْ صَخْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا وَاِنَّ مِنَ الْعِلْمِ جَهْلًا وَّاِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حُكْمًا وَاِنَّ مِنَ الْقَوْلِ عَيَالًا۔ (رواه ابو داؤد)

أخرجه ابو داؤد في السنن ٥/٢٧٨ الحديث رقم ٥٠١٢۔

ترجمہ: حضرت صخر بن عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے اور وہ صخر کے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بعض بیان جادو ہیں یعنی جادو کی طرح ہیں اور بعض علم جہالت ہیں اور کچھ شعر حکمت ہیں اور کچھ کلام وبال جان ہیں۔ (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

صخر بن عبداللہ۔ یہ صخر بن عبداللہ بن بریدہ ہیں' یہ تابعی ہیں۔ یہ اپنے والد اپنے دادا اور عکرمہ سے روایت کرتے ہیں۔ ان سے حجاج بن حسان اور عبداللہ بن ثابت نے روایت حدیث کی ہے۔

تشریح: قوله: ان من البيان سحرا: اس جملہ پر کلام ماقبل میں گزر چکا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے حدیث: ۴۷۸۳۔

قوله: ان من الشعر حكما:

"حکما" حرف اول کے ضمہ اور ثانی کے سکون کے ساتھ' یہ حکمت کا ہم معنی ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿و آتيناه الحكم صبيا﴾ [مریم۔۱۲] مفسرین نے "الحکم" کی تفسیر "حکمت" کے ساتھ کی ہے۔

قوله: وان من العلم جهلا: اس جملہ کی تشریح' کتاب العلم کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

قوله: وان من القول عيالا:

عیال: حرف اول کے کسرہ کے ساتھ (بروزن رجال) ابوداؤد کے علاوہ کی روایت میں "عیلا"۔ حرف اول کے فتحہ' اور ثانی کے سکون کے ساتھ۔ آیا۔ یعنی بعض قول وکلام متکلم پر بوجھ اور وبال ہوتے ہیں' یا سامع پر' اس وجہ سے کہ اس کو اس بات کا (پہلے سے) علم ہوتا ہے' یا وہ جاہل ہوتا ہے (اس لئے) اس کو سمجھ نہیں پاتا) صاحب النہایہ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بات اور اپنا کلام ایسے شخص کے سامنے پیش کرنا جس کو اس کی نہ خواہش ہو اور نہ اس کو اس سے سروکار ہو۔

قولہ:ان من القول عیالا: کے متعلق دو مطالب بیان کئے گئے ہیں:

① کسی شخص نے کوئی ایسی بات کہی جس کی وجہ سے وہ خود کسی آفت میں مبتلا ہو گیا یا جس شخص نے اس بات کو سنا وہ کسی ملال و دل برداشتگی میں مبتلا ہو گیا بایں طور کہ اگر وہ سننے والا جاہل تھا تو وہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور اگر عالم تھا تو اس کے لئے لا حاصل تھا۔

② یا وہ کوئی ایسی بات ہے جس کو سننے والا پسند نہیں کرتا اور اس بات کی وجہ سے اس کو رنج و ملال ہوتا ہے تو ان صورتوں میں یہی کہا جائے گا کہ کہنے والے کا وہ قول و کلام وبال و ملال کا ذریعہ بن گیا ہے۔

اسنادی حیثیت:

امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کی سند میں ابو عبیدہ یحی بن واضح الانصاری ہے۔ ابن معین نے ان کی توثیق کی ہے۔ ابو حاتم فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ان کو ضعفاء میں داخل کیا ہے۔ اور ابو حاتمؒ فرماتے ہیں: تحول من هناك۔ اھ۔ اس سلسلہ میں ابو حاتم کو وہم ہوا ہے بلکہ امام بخاریؒ نے ان کی احادیث کو حجت مانا ہے۔

الفصل الثالث:

ایک فرض، رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دفاع

۴۸۰۵: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضَعُ لِحَسَّانَ مِنْبَرًا فِي الْمَسْجِدِ يَقُوْمُ عَلَيْهِ قَائِمًا يُفَاخِرُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْ يُنَافِحُ وَيَقُوْلُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُؤَيِّدُ حَسَّانَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ مَانَا فَحَ اَوْ فَاخَرَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ۔

أخرجه ابوداؤد في السنن ٥/ ٢٨٠ الحديث رقم ٥٠١٥، والترمذي في ٥/ ١٢٦ الحديث رقم ٢٨٤٦، واحمد في المسند ٦/ ٧٢۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ حضرت حسان کے لئے مسجد میں منبر رکھواتے اور حسان اس پر کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے فخریہ اشعار کہتے یا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دفاع کرتے اور رسول اللہ ﷺ فرماتے کہ اللہ تعالیٰ حسان کی جبرئیل امین سے مدد فرماتے ہیں جب تک کہ وہ اس کے رسول ﷺ کی طرف سے دفاع کرتے ہیں۔ (بخاری)

تشریح: **قولہ:یقوم علیہ قائما:**

"قائما" قیاماً کے معنی میں ہے۔ چنانچہ "مفصل" میں لکھتے ہیں: کبھی مصدر اسم فاعل کے وزن پر بھی آتا ہے، جیسے قمت قائما۔

قولہ:یفاخر عن رسول اللہ ؐ أو ینافح:

أو ينافح: "او" برائے شک ہے۔ برائے تنویع بھی ہو سکتا ہے۔ شمائل کی روایت کے الفاظ "اوقال" ای الراوی سے پہلے معنی کی تائید ہو رہی ہے۔ اور ایک نسخہ میں "اوقالت" ہے۔ "ینافح" کے معنی کی وضاحت حدیث: ۴۷۹۱ کے تحت گزر چکی ہے۔

قوله: ان الله يؤيد حسان بروح القدس ما نافح أو فاخر عن رسول الله ﷺ:

"حسان": شمائل کے بعض نسخوں میں "حسانا" ہے۔

القدس: کی وضاحت حدیث: ۴۷۸۹ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

ما نافح أو فاخر: اور شمائل میں یوں ہے: ماينا فح أو يفاخر۔ "ما" بمعنی "مادام" ہے۔

اے انجشہ! شیشے کی بوتلیں مت توڑو

۴۸۰۶: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَادٍ يُقَالُ لَهٗ اَنْجَشَةُ وَكَانَ حَسَنَ الصَّوْتِ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُوَيْدَكَ يَا اَنْجَشَةُ لَا تَكْسِرِ الْقَوَارِيْرَ قَالَ قَتَادَةُ يَعْنِيْ ضَعْفَةَ النِّسَآءِ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۰/۵۹٤ الحديث رقم ٦٢١١ و مسلم في صحيحه ١٨١٢/٤ والدارمي في ٣٨٢/٢ الحديث رقم ٢٧٠١، واحمد في المسند ٢٧٠١۔

ترجمہ: انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک حدی خواں تھا جس کو انجشہ کہا جاتا تھا جو کہ بہت خوبصورت آواز والا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: اے انجشہ! اونٹوں کو ذرا آہستہ چلنے دو اور شیشے کی بوتلوں کو مت توڑو۔ قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد عورتیں تھیں۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: كان النبي ﷺ حاد يقال له انجشة:

حاد: اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ یہ ماخوذ ہے حدا الابل وبها، حدوا وحداء زجرها وساقها سے اس کا معنی ہے اونٹ کو ہانکنا اور "حدی" کے ذریعہ چلنے پر اکسانا۔ (ذکرہ صاحب القاموس)

اساس البلاغہ میں لکھتے ہیں: حدا بها اذا عنى بها (کسی بات سے کسی چیز کا قصد و ارادہ کرنا)۔

انجشة: ہمزہ کے فتحہ، نون کے سکون، جیم اور شین معجمہ دونوں کے فتحہ کے ساتھ (بروزن حنظله)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے۔ [علی ما فی قاموس]

امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انجشہ کی کنیت "ابو ماریۃ" تھی۔ حبشی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے۔

"حدی" کے بارے میں مظاہر حق" میں لکھتے ہیں: "حدی" صراح کے مطابق اس بلند آواز گانے کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ اونٹوں کو ہانکا جاتا ہے۔ لغت کی بعض دوسری کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ حدی عرب شتربانوں کے نغمہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ عرب میں دستور ہے کہ شتربان اونٹ ہانکنے والا جب یہ دیکھتا ہے کہ اس کا اونٹ تھک گیا ہے یا اس کی چال سست ہوگئی ہے تو وہ بلند آواز اور خوش گوئی کے ساتھ گانے لگتا ہے اس گانے کی آواز گویا اونٹ میں چستی و گرمی پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ تیز رفتاری

کے ساتھ چلنے لگتا ہے کتابوں میں لکھا ہے کہ حدی جوگانے ہی کی ایک قسم ہے مباح ہے اور اس کے بارے میں علماء میں سے کسی کا کوئی اختلافی قول نہیں ہے۔اھ۔

"قوارير": قارورة کی جمع ہے جس کا معنی "زجاجة" (شیشہ کا ٹکڑا شیشہ کا برتن) ہے عورتوں کو شیشہ سے تعبیر کیا گیا ہے' چونکہ عورتوں میں رقت ولطافت ہوتی ہے اور فطری طور پر کمزور ہوتی ہیں۔

اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے بدن میں جو فطری نزاکت وکمزوری ہوتی ہے اس کی بنا پر اونٹوں کا تیز چلنا اور ہچکولے لگنا ان کے سخت تعب وتکلیف کا موجب بن جاتا ہے لہٰذا آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنے شتربان انجشہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اونٹ کو اتنی تیزی کے ساتھ نہ بھگاؤ کہ اس پر سوار عورتیں ہچکولے کھانے لگیں اور اس کی وجہ سے ان کو تکلیف وپریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔میں (ملاعلی قاری) کہتا ہوں یہی معنی زیادہ واضح ہیں۔چونکہ یہ معنی شفقت ورحمت سے ناشی ہیں' جب کہ ذیل مے معنی میں سوءِ ظن ہے' جو منصب نبوت کے شایانِ شان نہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس ارشاد گرامی کے ذریعہ لوگوں کے دل کی کمزوری ونرمی کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا یعنی آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے انجشہ رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی کہ اس طرح حدی خوانی نہ کرو جس سے عورتوں کے دل کمزور متاثر ہو جائیں اور تمہارے گانے کی وجہ سے ان کے ذہن ودماغ اور جذبات میں ہلچل پیدا ہو جائے اور وہ کسی برے خیال میں مبتلا ہو جائیں کیونکہ گانے کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ طبیعت کو بھڑکاتا ہے اور جذبات میں ہلچل مچا دیتا ہے۔اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ کسی برے خیال کا پیدا ہو جانا اور طبیعت ودل کا کسی وسوسے میں مبتلا ہو جانا ایک طبعی چیز ہے جو کسی انسان کے اختیار کی پابند نہیں ہے لہٰذا آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس کو مناسب سمجھا کہ احتیاط کی راہ ظاہر فرما دیں کہ بہر صورت احتیاط کی راہ اختیار کرنا ہی بہتر اور اولیٰ ہے۔

قوله: قال قتادة یعنی **بالقوارير ضعفة النساء: ضعفة النساء:** میں اضافة الصفة الى الموصوف ہے۔ (اصل کے اعتبار سے" النساء الضعفة "تھا)۔

قوله: رويدك يا انجشة لاتكسر القوارير: "رويدك": مصدر ہے: منصوب ہے چونکہ مفعول مطلق ہے۔فعل ناصب مقدر ہے'اور کاف محل جر میں ہے۔رویدك معنوی اعتبار سے" أمهل امهالك "کی طرح ہے۔اسی قبیل سے یہ آیت ہے: ﴿امهلهم رويدا﴾ [الطلاق-۱۷] بعض حضرات کا کہنا ہے کہ"رويد" اسم فعل ہے'اور کاف حرف خطاب ہے۔

"لا تكسر": جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔

اچھا شعر اچھا کلام، بُرا شعر بُرا کلام

۴۸۰۷: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ ذُكِرَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشِّعْرُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ كَلَامٌ فَحَسَنُهُ حَسَنٌ وَقَبِيْحُهُ قَبِيْحٌ۔ (رواه الدار قطني)

أخرجه الدارقطني في السنن ٤/١٥٥ الحديث رقم ٢/من باب الخبر الواحد يوجب العمل۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اشعار کا تذکرہ کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کلام ہے چنانچہ اچھا شعر اچھا کلام ہے اور برا شعر برا کلام ہے۔

۴۸۰۸: وَرَوَی الشَّافِعِیُّ عَنْ عُرْوَۃَ مُرْسَلاً۔

اس روایت کو شافعی نے عروہ سے بطریق ارسال نقل کیا۔

تشریح: حدیث اگرچہ مرسل ہے مگر کوئی حرج کی کوئی بات نہیں، چونکہ جمہور کے نزدیک مرسل بھی حجت ہے۔ رہی بات امام شافعیؒ کی تو ان کے ہاں بھی مرسل حجت ہے بشرط اعتضاد، اور ماقبل میں یہ روایت متعدد اسانید کے ساتھ گزر چکی ہے۔

اِس شیطان کو پکڑ لو

۴۸۰۹: وَ عَنِ اَبِیْ سَعِیْدِ نِالْخُدْرِیِّ قَالَ بَیْنَا نَحْنُ نَسِیْرُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالْعَرْجِ اِعْرَضَ شَاعِرٌ یُنْشِدُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خُذُوْا الشَّیْطَانَ اَوْ اَمْسِکُوْا الشَّیْطَانَ لَاَنْ یَمْتَلِیءُ جَوْفُ رَجُلٍ قَیْحًا خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ اَنْ یَّمْتَلِیءَ شِعْرًا۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ٤/١٧٦٩ الحدیث رقم (٩-٢٢٥٩) واحمد فی المسند ٣/٨۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم مقام عرج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کر رہے تھے تو جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شیطان کو پکڑ لو یا یہ فرمایا اس شیطان کو تھام لو۔ کسی آدمی کے پیٹ کا پیپ سے بھرا ہوا ہونا اس سے بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرا ہوا ہو۔ (مسلم)

تشریح: بالعرج: امام نوویؒ فرماتے ہیں: "عرج" عین مہملہ کے فتحہ' راء کے سکون اور جیم کے ساتھ ہے۔ مدینہ سے تقریباً ۷۸ میل کے فاصلہ پر واقع بہت بڑی بستی ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: عرج۔ فتحہ کے ساتھ۔ (نام کی بہت سی جگہیں ہیں۔) یمن کا شہر ہے' حجاز کی ایک وادی کا نام بھی عرج ہے۔ بلاد ہذیل میں اک جگہ "عرج" کے نام سے موسوم ہے' اور مکہ کے راستے میں واقع ایک منزل کا نام عرج ہے۔

ینشد: از باب افعال ہے۔

قولہ: خذوالیشطان أو أمسکوا الشیطان: راوی کو شک ہے کہ کیا الفاظ ارشاد فرماتے تھے۔

شاعر کو شیطان کہنے کی وجہ:

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو دیکھا کہ وہ شعر پڑھنے میں بری طرح مشغول ہے یہاں تک کہ اس کو وہاں موجود مسلمانوں کی طرف بھی کوئی التفات نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں سے صرف نظر کیے ہوئے بے محابا چلا جا رہا ہے اور اس کو شوق شعر و شاعری نے اس درجہ بے باک بنا دیا ہے کہ وہ انسانی اور اخلاقی تقاضوں اور آداب زندگی تک کو فراموش کر بیٹھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے رگ و پے میں صرف شعر و شاعری ہی سرایت کیے ہوئے ہے اور وہ پرلے درجے کا بے حیا و بے ادب بن گیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو شیطان فرمایا (جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ یہ شخص

رحمت الٰہی اور قرب خداوندی سے بعد اختیار کیے ہوئے ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے صورتِ حال کا صدور محض اس لئے ہوا کہ وہ اپنی شعروشاعری کے غرور ونخوت میں مبتلا تھا اس لئے آپ ﷺ نے شعر کی مذمت کی۔)

گانا دِل میں نفاق پیدا کرتا ہے

۴۸۱۰: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْغِنَآءُ یُنْبِتُ النِّفَاقَ فِی الْقَلْبِ کَمَا یُنْبِتُ الْمَاءُ الزَّرْعَ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٤/ ٢٧٩ الحديث رقم ٥١٠٠۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گانا دل میں اس طرح نفاق کو پیدا کرتا ہے جس طرح پانی کھیتی کو اگاتا ہے۔ اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور دیلمی نے اس روایت کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے کہ غنا اور لہو دل میں نفاق کو اس طرح پیدا کرتے ہیں جس طرح پانی گھاس کو اگاتا ہے ۔مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بلاشبہ قرآن اور ذکر دل میں ایمان کو اس طرح پیدا کرتے ہیں جیسے پانی نباتات کو اگاتا ہے۔ (بیہقی، دیلمی)

تشریح: الغناء: غین معجمہ کے کسرہ اور مدّ کے ساتھ۔ بمعنی "تغنّی"۔

راگ اور گانا انسان میں نفاق کے پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے یہ آدمی کو نفاق تک لے جاتا ہے۔ لہٰذا گانا نفاق کی جڑ اور نفاق کا شعبہ ہے۔ جیسا کہ ایک اور جگہ فرمایا: البذاء والبیان شعبتان من النفاق. (دیکھئے حدیث: ۴۷۹۶)

شرح السنہ میں لکھتے ہیں: کہا گیا ہے الغناء رقیة الزنا (گانا زنا کا منتر ہے۔) امام شافعیؒ فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص غناء پر مداومت کرتا ہے، اور اس کے پاس گانے والوں کا سرعام تانتا لگا رہتا ہے، تو یہ سفاہت ہے، اس کے باعث یہ انسان مردود الشہادۃ ہو جائے گا، اور اگر ایسا کم کرتا ہے تو "مردود الشہادۃ" نہیں ہوگا۔

امام نوویؒ "روضہ" میں فرماتے ہیں کہ محض آواز کے ساتھ گانا مکروہ ہے اور اسکا سننا بھی مکروہ ہے' اجنبی عورت سے سننا سخت مکروہ ہے' اور آلات موسیقی جیسے عود (سارنگی) و طنبور (ستار) صنج (جھانجھ) اور گانے بجانے کے دیگر آلات کے ساتھ گانا شرابیوں کا شعار ہے حرام ہے اور اسی طرح تمام "اوتار" بھی حرام ہیں۔ اسکا سننا بھی حرام ہے۔ بانسری کے بارے میں دو قول ہیں: امام نوویؒ نے اس کی حرمت کو راجح قرار دیا ہے' اور غزالی نے اس کو جائز بتلایا ہے۔ اور یہی بات اقرب ہے۔ بانسری سے مراد صرف "نزکل" کی بانسری نہیں ہے بلکہ "مزمار عراقی" بھی اسی حکم میں ہے' اور جس کے ذریعہ اور تار بجائے جاتے ہیں وہ بھی بلا خلاف حرام ہیں۔ مزید فرماتے ہیں کہ اصح یا صحیح یہ ہے کہ بانسری حرام ہے' یہ اس مزمارہ (بانسری) کو بھی شامل ہے جس کو "شبابہ" کہا جاتا ہے۔ ابوالقاسم دولقیؒ نے بانسری کی حرمت پر ایک کتاب لکھی ہے جو بڑی عمدہ اور قیمتی مباحث پر مشتمل ہے' اس کتاب میں انہوں نے بانسری کی حرمت پر دلالت میں بہت مبالغہ کیا ہے۔

تخریج: اس روایت کو ابن ابی الدنیا نے ابن مسعود سے "ذم الملاہی" میں نقل کیا ہے۔ لیکن اس روایت میں "الزرع"

کے بجائے "البقل" کے الفاظ ہیں۔

بانسری کی آواز سے کانوں میں اُنگلیاں

۴۸۱۱: وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ كُنْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ فِي طَرِيْقٍ فَسَمِعَ مِزْمَارًا فَوَضَعَ اِصْبَعَيْهِ فِي اُذُنَيْهِ وَنَاءَ عَنِ الطَّرِيْقِ اِلَى الْجَانِبِ الْاٰخِرِ ثُمَّ قَالَ لِيْ بَعْدَ اَنْ بَعُدَ يَا نَافِعُ هَلْ تَسْمَعُ شَيْئًا قُلْتُ لَا فَرَفَعَ اِصْبَعَيْهِ مِنْ اُذُنَيْهِ قَالَ كُنْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمِعَ صَوْتَ يَرَاعٍ فَصَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُ قَالَ نَافِعٌ وَكُنْتُ اِذْ ذَاكَ صَغِيْرًا۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

أخرجه ابو داؤد في السنن ٥/ ٢٢٢ الحديث رقم ٤٩٢٤۔

ترجمہ: حضرت نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابن عمر ؓ کے ساتھ سفر میں تھا تو آپ نے باجے کی آواز سن کر کانوں میں انگلیاں ڈال لیں اور راستہ سے دوسری جانب ہٹ گئے پھر دور نکل جانے کے بعد فرمایا اے نافع! کیا تم کوئی چیز سن رہے ہو؟ میں نے کہا نہیں۔ تو انہوں نے اپنی دونوں انگلیاں اپنے دونوں کانوں سے نکال دیں اور پھر فرمانے لگے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جا رہا تھا کہ آپ ﷺ نے بانسری کی آواز سنی تو آپ ﷺ نے اسی طرح کیا جیسے میں نے کیا۔ نافع کہتے ہیں کہ میں اس وقت چھوٹا سا تھا۔ (احمد وابوداؤد)

تشریح: ناء: الف کے بعد ہمزہ ہے۔ ای بعد.

ان بعد: پہلے حرف پر فتحہ اور ثانی پر ضمہ ہے۔

یراع: یاء کے فتحہ کے ساتھ۔

قوله: فسمع صوت يراع فصنع مثل ماصنعت:

"یراع": یاء کے فتحہ کے ساتھ "قصب" (نرکل) فصنع مثل ماصنعت: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ① انہوں نے فقط کانوں میں انگلیاں ڈال لیں تھیں، جس طرح کے میں نے بھی کیا۔ ② انہوں نے بالکل اسی طرح کیا تھا کہ جس طرح میں نے کیا راستہ سے ہٹنا، یہ سوال وجواب وغیرہ۔

قال كنت مع رسول: جملہ مستانفہ بیانیہ بھی ہے، اور تعلیلیہ بھی ہے۔

حضرت نافعؒ نے اس روایت کے آخر میں جو یہ واضح کیا ہے کہ میں نے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے وہ اس وقت کا ہے جب میں بہت چھوٹا تھا اس سے ان کا مقصد اس بات کو واضح کرنا تھا کہ اس وقت چونکہ میں چھوٹی عمر کا تھا اور شرعی طور پر مکلف نہیں تھا اس لئے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس آواز کو سننے سے مجھ کو منع نہیں کیا اگر میں شرعی طور پر مکلف ہوتا تو وہ یقیناً مجھ کو یہ ہدایت کرتے کہ ان کی طرح میں بھی اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لوں۔ کسی کو یہ وہم نہ ہونا چاہئے کہ اس آواز میں کراہت تنزیہی تھی اس لئے انہوں نے مجھے اس آواز سے سننے سے منع نہیں کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس آواز کو سننا مکروہ تحریمی تھا اور مجھے منع نہ کرنے کا تعلق میرے غیر مکلف ہونے سے تھا۔

رہی یہ بات کہ جب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں تھیں تو راستہ چھوڑ دینے کی کیا ضرورت تھی تو اس کا تعلق کمال تقویٰ اور ورع سے تھا یعنی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے احتیاط وتقویٰ کا تقاضا یہی سمجھا کہ اس راستہ سے ہی ہٹ جائیں ورنہ اگر اس راستہ کو چھوڑ دینا بھی شرعی طور پر ضروری ہوتا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما یقیناً حضرت نافع کو بھی وہ راستہ چھوڑ دینے کا حکم دیتے۔

شرح السنہ میں لکھتے ہیں کہ مزامیر' ملاہی اور معازف کی حرمت پر سب کا اتفاق ہے۔ ابن عمرؓ نے جو آواز سنی تھی وہ چرواہوں کی سیٹی کی آواز تھی۔ حدیث میں اس کا ذکر بھی آیا ہے۔ وگرنہ صرف کان بند کرنے پر اکتفاء نہ کرتے بلکہ رروز جر بھی فرماتے' بعض علماء نے چرواہوں کی سیٹی کے سلسلہ میں رخصت دی ہے۔ اھ۔ اور شاید کہ وہ بانسری بجانے والا اہل ذمہ میں سے کوئی یہودی تھا' یا نظروں سے کہیں اوجھل تھا۔ فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے کہ لہو ولعب کی چیزوں یعنی ساز اور باجوں کو سننا حرام اور سخت گناہ ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

استماع الملاهي معصية' والجلوس عليها فسق' والتلذذبها من الكفر

''باجوں کا سننا گناہ ہے اس پر بیٹھنا فسق ہے اور اس سے لذت وحظ حاصل کرنا کفریات میں سے ہے''۔

انہوں نے یہ بات بطور تشدید کے فرمائی۔

ہاں اگر کسی شخص کے کان میں باجے کی آواز ناگہانی طور پر آجائے تو اس صورت میں کوئی گناہ نہیں۔ لیکن اس پر واجب ہوگا کہ وہ اس بات کی پوری کوشش کرے کہ وہ اس آواز کو سن نہ سکے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باجے کی آواز سے بچنے کے لئے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لی تھیں۔ عرب کے ان اشعار کو پڑھنا جن میں فسق' شراب اور غلام کا ذکر ہو مکروہ ہے چونکہ یہ ذکر فواحش ہے۔

بَابُ حِفْظِ اللِّسَانِ وَالْغِيْبَةِ وَالشَّتْمِ

زبان کی حفاظت' غیبت اور برا کہنے کا بیان

''حفظ اللسان'': میں مصدر کی اضافت اپنے مفعول کی طرف ہے۔ اور مطلب ہے زبان کو لا یعنی کلام سے محفوظ رکھنا۔

''غیبة'' اور ''شتم'' کا عطف ''حفظ'' پر ہے۔ یہ عطف تخصیص بعد از تعمیم کے قبیل سے ہے۔

''غیبت'' کی اصطلاحی تعریف: أن تذكر أخاك بما يكره في الغيبة.

کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کے متعلق ایسی باتیں کرنا کہ جس کو اگر وہ سنے تو ناپسند کرے''۔ بشرطیکہ وہ بات اس میں موجود بھی ہو' اگر وہ بات اس میں موجود نہ ہو تو یہ ''بہتان'' ہے۔

''شتم'' کے معنی ہیں: السب واللعن. (گالی دینا' سخت گالی دینا' لعنت کرنا' رسوا کرنا) اس کا تعلق حاضر و غائب، زندہ مردہ سب سے ہے۔

الفصل الاول:

دو چیزوں کی ضمانت پر جنت

۴۸۱۲: عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَّضْمَنْ لِيْ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ اَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ۔ (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۱/ ۳۰۸ الحديث رقم ٦٤٧٤۔

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص مجھے دو چیزوں کی ضمانت دے میں اس کے لئے جنت کی ضمانت دیتا ہوں ایک وہ چیز جو اس کے جبڑوں کے درمیان ہے اور ایک وہ چیز جو اس کی ٹانگوں کے درمیان ہے۔ (بخاری)

تشریح: من يضمن: ''يضمن'' مجزوم ہے ''من'' جازمہ شرطیہ ہے۔

لحييه: لام کے فتحہ کے ساتھ'' لحي'' کا تثنیہ ہے۔ منبت الاسنان. اور امام طیبیؒ لکھتے ہیں: ''لحية'' بفتح اللام تثنية لحي' وهما العظمان اللذان ينبت عليهما الاسنان علوا وسفلا۔ (اوپر نیچے کے دونوں جبڑے) أضمن له

الجنة: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ① جنت کی ضمانت سے مراد جنت میں دخولِ اولیٰ کی ضمانت ہے۔ ② جنت کے درجاتِ عالیہ کی ضمانت مراد ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں بعض علماء سے اس کا مطلب یہ منقول ہے کہ جو شخص مجھے اپنی زبان کی حفاظت کی ضمانت دے گا کہ وہ زبان کو شر کے لئے استعمال نہیں کرے گا' اور لایعنی اور مضر و موجب فسق و کفر باتوں سے بچائے گا اور اپنی شرم گاہ کو حفاظت کرنے کی ضمانت دے گا میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

وفی الباب: ① اس حدیث کو احمد اور حاکم نے ابوموسیٰ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

"من حفظ ما بين فقميه ورجليه دخل الجنة".

الفقم: بالضم والفتح. اللحى. (على ما في النهاية.)

② ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے ابوہریرہؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے، الفاظ یہ ہیں:

"من وقاه الله شر ما بين لحييه وشر ما بين رجليه دخل الجنة".

③ بیہقی میں انس سے ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے: "من وقى شر لقلقه وقبقبه وذبذبه فقد وجبت له الجنة".

اللقلق: اللسان (زبان)' القبقب: البطن (پیٹ)

الذبذب: الذكر (مرد کا عضو تناسل)۔ (كذا في مختصر النهاية للسيوطي)

رضا کا ایک کلمہ بھی بخشش کے لئے کافی ہے

۴۸۱۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللّٰهِ لَايُلْقِيْ لَهَا بَالًا يَرْفَعُ اللّٰهُ بِمَا دَرَجَاتٍ وَاِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللّٰهِ لَا يُلْقِيْ لَهَا بَالًا يَهْوِيْ بِهَا فِيْ جَهَنَّمَ (رواه البخاري وفي رواية لهما) يَهْوِيْ بِهَا فِي النَّارِ اَبْعَدَ مَابَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔

أخرجه البخاري في صحيحه ٣٠٨/١١ الحديث رقم٦٤٧٧ و مسلم في ٢٢٩٠/٤ الحديث رقم (٥٠-٢٩٨٨)، والترمذي في السنن ٤٨٤/٤ الحديث رقم ٢٣١٩ و ابن ماجه في ١٣١٢/٢ الحديث رقم ٣٩٦٩ و مالك في الموطا ٩٨٥/٢ الحديث رقم ٥، واحمد في المسند ٤٦٩/٣۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ انسان بعض اوقات اللہ کی رضا مندی کا کوئی ایسا کلمہ کہہ دیتا ہے جس کا قطعاً اسے خیال بھی نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے درجات بلند کر دیتے ہیں اور بعض اوقات بندہ اللہ کی ناراضگی کا ایسا کلمہ زبان سے نکال دیتا ہے جس کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں ہوتا اور اس کی وجہ سے وہ دوزخ میں اتنا دور جا گرتا ہے جتنا مشرق و مغرب کا فاصلہ ہے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: قوله: من رضوان الله: "من" بیانیہ ہے۔ (جار مجرور اپنے متعلق سے مل کر) حال ہے کلمہ ہے۔ ای من

کلام فیہ ضاہ۔ رضوان: راء پر ضمہ و کسرہ دونوں جائز ہیں۔

لا یلقی: یاء کے ضمہ اور قاف کے سکرہ کے ساتھ ہے اور بعض نسخوں میں یاء اور قاف کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ای لا یری

یرفع اللّٰہ بھا: یہ جملہ مستانفہ ہے۔ موجب کا بیان ہے گویا کہ قائل کا کہنا یوں تھا: **ماذا یستحق بعد؟** تو اس کو جواب دیا گیا: **یرفع اللّٰہ بھما درجات** اور بعض نسخوں میں یاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں معنی یوں ہوگا: **ای لایجد لھا عظمۃ عندہ ولا یلتفت عاقبتھا عندربہ۔**

لا یلقی لھا بالا: یہ جملہ حال ہے" یتکلم" کی ضمیر سے **ای یستمع الیھا ولا یجعل قلبہ نحوھا** ۔ اھ۔ اس حدیث میں اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ بات کرتے وقت آدمی تدبر و تفکر سے کام لے۔ اور شرح المشارق میں ہے کہ یہ دونوں کے فتحہ کے ساتھ اور "البال" کے رفع کے ساتھ ہے۔ پس اس صورت میں "البال" یہاں "الحال" کے معنی میں ہے اور ظاہر یہ ہے کہ مصابیح میں بھی اسی طرح ہے۔ چونکہ اس کے شارح زین العرب فرماتے ہیں: یعنی اس کو اس میں کوئی حرج و تعب لاحق نہیں ہوتا اولاً اور نہ اس کا دل اپنی کہی ہوئی بات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یا یہ عرب کے قول: **"لیس ھذا من بالی أو مما أبالیہ"** سے ماخوذ ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ بندہ کسی کلمہ حق کا تکلم کرتا ہے پس اس کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہو جاتی ہے اور کبھی کسی بری بات کا تکلم کرتا ہے اور اس کو یہ علم نہیں ہوتا کہ یہ کلمہ ایسا ہوگا حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ گناہ عظیم ہوتا ہے۔ پس اس شخص کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگلے جملہ **(وان العبد لیتکلم بالکلمۃ من سخط اللّٰہ)** کا مطلب یہی ہے۔ **یھوی بھا**: واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ **ای نحوض ویقع و یسقط۔**

یھوی بھا فی النار أبعد: أی ھویا أبعد من البعد الذی بینھما امام طیبیؒ فرماتے ہیں: بظاہر یہ مصدر محذوف کی صفت ہے **أی ھو یا بلیغا بعید المبتدأ والمنتھی۔**

اس ارشادِ گرامی کا حاصل اس بات پر متنبہ کرتا ہے کہ زبان پر ہر وقت قابو رکھو اور اس کے معاملہ کو کم اہم نہ سمجھو

تخریج: بخاری کی روایت ہے امام احمدؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ دوسری روایت کا شیخین سے مروی ہونا سید جمال الدین نے ذکر کیا ہے۔

جامع صغیر کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: **"وان العبد لیتکلم بالکلمۃ ما یتبین فیھا یزل بھا فی النار أبعد ما بین المشرق والمغرب". رواہ احمد والشیخان عنہ۔**

مسلمان کا قتل

۴۸۱۴: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ١١٠/١ الحديث رقم ٤٨ و مسلم في ٨١/١ الحديث رقم (١١٦-٦٤)، والترمذي في السنن ٣١١/٤ الحديث رقم ١٩٨٣، والنسائي في ١٢١/٧ الحديث رقم ٤١٠٥ و ابن ماجه في

۱۲۹۹/۲ الحدیث رقم ۳۹۳۹، واحمد فی المسند ۱/ ۳۸۵۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس کو قتل کرنا کفر ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: سباب: سین کے کسرہ کے ساتھ یہاں مصدر کی اضافت اپنے مفعول کی طرف ہے۔ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: السب: الشتم.

یقال: سبه یسبه سبا و سبابا.

الفسوق: اکملؒ فرماتے ہیں: لغوی اعتبار سے "خروج" کے ہم معنی اور ہم وزن ہے۔ اور شرعی اعتبار سے " الخروج عن الطاعة " کو کہتے ہیں۔

اس حدیث کے مطلب میں شراح کا شدید اختلاف ہے۔

① مسلمان کے ساتھ قتال کرنا اس کے مسلمان ہونے کی وجہ سے، کفر ہے۔ ملا علی قاریؒ نے اس جواب کو دور از کار قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں اس بات کا ضروریاتِ دین میں سے ہونا معلوم ہی ہے۔ اس بات کو بیان کرنے کی قطعاً کوئی حاجت نہیں تھی۔

② کسی مسلمان کے قتل کرنے کو کفر کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی مسلمان اگر کسی مسلمان کو قتل کر دے تو وہ کافر ہو جاتا ہے بلکہ ارشاد کا مقصد اس بات کو نہایت سختی و شدت کے ساتھ بیان کرنا ہے کہ مسلمان کا ناحق خون بہانا انتہائی سنگین جرم ہے اور جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو قتل کرتا ہے وہ اپنے اسلام کے کامل ہونے کی نفی کرتا ہے۔ گویا یہاں "کفر" سے مراد کمالِ اسلام کی نفی ہے امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس کا وہی مطلب ہے جو اس حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے: المسلم من سلم المسلمون یعنی کامل مسلمان وہی ہے جس سے مسلمان محفوظ و مامون رہیں یہ بات طے ہے کہ یہاں "المسلم" سے مراد کامل مسلمان ہے' کہ اس کا ایمان اس کو حسب استطاعت حقوق کی ادائیگی کراتا ہے' پس اس حدیث میں کفر کی طرف نسبت اس کے ایمان کے نقص کی طرف تغلیظاً اشارہ ہے۔ اھ۔ یہ ان کا وہم ہے کہ انہوں نے اس اضافت کو باب اضافۃ المصدر الی فاعلہ سے سمجھ لیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے' جیسا کہ ہم ماقبل میں بیان کر چکے ہیں۔ چونکہ مسلمان کو گالی دینا اور اس سے قتال کرنا' دونوں کفر ہیں' خواہ وہ کامل الایمان ہو یا نہ ہو۔

شرح السنہ میں لکھتے ہیں: (وہ مسلمان یقیناً کافر ہو جائے گا) جو کسی مسلمان کا خون بہانا بغیر کسی تاویل کے مباح سمجھے' اور اسلام کو اس کے لئے "عاصم" نہ سمجھے' تو یہ ارتداد و کفر ہے۔ چنانچہ "النہایۃ" میں لکھتے ہیں: السب الشتم 'یقال : سبه یسبه سبا وسبابا۔

تخریج:

① اس حدیث کو احمد، ترمذیؒ، نسائی اور ابن ماجہؒ نے ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے۔

② [illegible]

۳ طبرانی نے عبداللہ بن مغفل اور عمرو بن نعمان بن مقرن سے نقل کیا ہے۔

۴ دارقطنی نے افراد میں حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے۔

۵ طبرانی کی ابن مسعودؓ سے مروی ایک روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے: وحرمة ماله کحرمة دمه.

مسلمان کو یا کافر......! کہنے کا وبال

۴۸۱۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا رَجُلٍ قَالَ لِاَخِيْهِ كَافِرٌ فَقَدْ بَاءَ بِهَا اَحَدُهُمَا۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٥١٤ الحديث رقم ٦١٠٤ و مسلم في ١/٧٩ الحديث رقم (١١١-٦٠) ومالك في الموطأ ٢/٩٨٤ الحديث رقم ١ من كتاب الكلام، واحمد في المسند ٢/٤٧۔ الجامع الصغير ١/٥٤ الحديث رقم ٧٧٦۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے کسی مسلمان کو کہا اے کافر! تو وہ کفران دونوں میں سے ایک کی طرف لوٹے گا۔ (بخاری)

تشریح: قوله: قال لأخيه كافر:

"کافر": کی ترکیب میں دو احتمالات ہیں:

۱ مبنی علی الضم ہے، چونکہ منادی ہے۔ حرف نداء محذوف ہے۔ (ذکرہ میرک)۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں حرف نداء صراحتاً مذکور ہے۔

۲ بعض نسخوں میں یہ لفظ تنوین کے ساتھ ہے۔ اس کے مطابق "انت" یا "هو" مبتداء محذوف کی خبر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ایک شخص نے جو خود مسلمان ہے کسی دوسرے مسلمان کو کافر کہا تو اس کی دو ہی صورتیں ہوں گی ایک تو یہ کہ کہنے والے نے سچ کہا ہو ظاہر ہے کہ اس صورت میں کلمہ کفر کا مستحق وہی شخص ہوگا جس کو کافر کہا گیا ہے اور جو حقیقتاً کافر ہے دوسرے یہ کہ کہنے والے نے جھوٹ کہا ہو یعنی اس نے جس شخص کو کافر کہا ہے وہ حقیقت میں مسلمان ہے اور اس کی طرف کفر کی نسبت سراسر جھوٹ ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ کہنے والا خود کافر ہو گیا تو اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے ایمان کو کفر سمجھا اور دین اسلام کو باطل جانا۔

اس حدیث کے سلسلے میں امام نوویؒ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ مذکورہ حدیث کو بعض علماء نے مشکلات میں شمار کیا ہے کیونکہ اس ارشاد گرامی کا جو بظاہر مفہوم ہے اس کو حقیقی مراد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بایں وجہ کہ اہل حق کا مسلک یہ ہے کہ کوئی مسلمان خواہ کتنا ہی بڑا گناہ کیوں نہ کرے جیسے قتل اور زنا وغیرہ اور خواہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہنے کا ہی مرتکب کیوں نہ ہو بشرطیکہ وہ دین اسلام کے باطل ہونے کا عقیدہ نہ رکھے تو اس کی طرف کفر کی نسبت نہ کی جائے (جب کہ مذکورہ حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ثابت کرتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو کافر کہے اور حقیقت میں کافر نہ ہو تو کہنے والا خود کافر ہو

جائے گا)۔ چنانچہ اسی وجہ سے اس ارشادگرامی کی مختلف تاویلیں کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا محمول وہ شخص ہے جو نہ صرف یہ کہ کسی مسلمان کو کافر کہے۔ بلکہ کسی مسلمان کی طرف کفر کی نسبت کرنے کو حلال و جائز بھی سمجھے اس صورت میں "باء بہا" کے معنی یہ ہوں گے کہ کفر خود اس شخص کی طرف تکفیر کی معصیت لوٹتی ہے۔ یعنی جو شخص کسی مسلمان کو کافر کہے گا تو اس کا یہ کہنا اس مسلمان کو تو کوئی نقصان پہنچائے گا نہیں البتہ مسلمان کو کافر کہنے کے گناہ میں خود مبتلا ہوگا اور تیسرے یہ کہ اس ارشادگرامی کا محمول خوارج ہیں۔ جو مؤمنوں کو کافر کہتے ہیں لیکن یہ تیسری تاویل بہت ضعیف ہے کیونکہ اس تاویل کا مطلب یہ ہوگا کہ خوارج کو کافر قرار دیا جائے جب کہ اکثر علماء امت کے نزدیک زیادہ صحیح اور قابل قبول قول یہ ہے کہ خوارج فرقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ گمراہ بے شک ہیں جیسا کہ اہل بدعت۔ مگر ان کو کافر نہیں کہنا چاہیے۔ اگرچہ ملا علی قاری نے وضاحت کی ہے کہ اس تاویل کو ان کے حق میں ضعیف نہیں کہا جائے گا۔ جو نہ صرف اہل سنت والجماعت بلکہ اکثر اونچے درجہ صحابہ کرام تک کے بارے میں نعوذ باللہ کفر کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

تخریج: جامع صغیر میں ہے" اذا قال الرجل لأخيه:يا كافر فقد باء بها أحدهما،" اس کو بخاری نے ابوہریرہ سے نقل کیا ہے۔ احمد اور بخاری نے ابن عمر سے بھی نقل کیا ہے۔

غیر مستحق کو فسق کی تہمت سے خود فاسق ہو جاتا ہے

۴۸۱۶: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَرْمِیْ رَجُلٌ رَجُلًا بِالْفُسُوْقِ وَلَا یَرْمِیْہِ بِالْکُفْرِ اِلَّا ارْتَدَّتْ عَلَیْہِ اِنْ لَّمْ یَکُنْ صَاحِبُہٗ کَذَالِکَ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٤٦٤ الحديث رقم ٦٠٤٥، واحمد في المسند ٥/١٨١۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی دوسرے پر فسق و کفر کی تہمت لگاتا ہے تو اگر دوسرا ایسا نہ ہو تو وہ کفر اسی کی طرف لوٹتا ہے۔ (بخاری)

تشریح: اِلَّا ارْتَدَّتْ : کا مطلب یہ ہے کہ فسق یا کفر کی نسبت پر مشتمل وہ جملہ قائل کی طرف یا ان دونوں میں سے کسی ایک طرف کی لوٹتا ہے۔ اگلے جملہ (ان لم يكن صاحبه كذلك) کی روشنی میں واضح ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کو فاسق کہو اور نہ اس کی طرف کفر کی نسبت کرو۔ کیونکہ اگر کسی شخص نے کسی ایسے مسلمان کو فاسق کہا جو حقیقت میں فاسق نہیں تو وہ کہنے والا خود فاسق ہوگا اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی ایسے شخص کو کافر کہا جو حقیقت میں کافر نہیں ہے۔ بلکہ مؤمن ہے تو وہ کہنے والا خود کافر ہو جائے گا جیسا کہ پچھلی حدیث کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔

۴۸۱۷: وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ مَنْ دَعَا رَجُلًا بِالْکُفْرِ اَوْ قَالَ عَدُوَّ اللّٰہِ وَلَیْسَ کَذَالِکَ اِلَّا حَارَ عَلَیْہِ۔

(متفق علیہ)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٧٩ الحديث رقم (١١٢-٦١) واحمد في المسند ٥/١٦٦۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے کسی سے کہا اے کافر یا اے اللہ

کے دشمن حالانکہ وہ شخص اس طرح نہ تھا تو اسی کی طرف لوٹ آئے گا۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: قال: عدو الله: منصوب علی النداء ہے۔ ایک نسخہ میں "عدو اللہ ہے۔ ای هو أوأنت عدوا لله۔

قوله: وليس كذلك: یہ جملہ حالیہ ہے۔ ای والحال انه ليس مثل ماذكر من كونه كافراً و عدو الله۔

حار: حائے مہملہ اور راء کے ساتھ 'ای رجع اليه مانسب اليه۔ (كذا في النهاية)

"الا حار عليه" کی ترکیب میں دو احتمال ہیں:

① امام طیبیؒ فرماتے ہیں مستثنیٰ منہ محذوف ہے جو جواب شرط پر دلالت کر رہا ہے۔ ای: من دعا رجلا بالكفر باطلا فلا يلحقه من قوله ذلك شيء الا الرجوع عليه.

② "من" استفہامیہ ہے۔ استفہام انکاری کے معنیٰ میں ہے۔ ای: ما يفعل أحد هذه الفعلة في حالة من الأحوال الا في هذه الحالة.

عرضِ مرتب:

اس حدیث کی تشریح کیلئے حدیث: ۴۸۱۴ کو پیش نظر رکھئے۔

گالی کا وبال ابتداء والے پر

۴۸۱۸۔۴۸۱۹: وَعَنْ اَنَسٍ وَاَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْتَبَّانِ مَا قَالَا فَعَلَى الْبَادِيْ مَالَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/ ٢٠٠٠ الحديث رقم (٦٨-٢٥٨٧) و ابوداوٗد في السنن ٤/ ٢٧٣ الحديث رقم ٤٨٩٤، واحمد في المسند ٢/ ٢٣٥۔ أخرجه مسلم في صحيحه ٤/ ٢٠٠٥ الحديث رقم (٨٤-٢٥٩٧)، والترمذي في السنن ٤/ ٣٢٥ الحديث رقم ٢٠١٩، واحمد في المسند ٢/ ٣٣٧۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو دو شخص آپس میں گالم گلوچ کرتے ہیں اس کا وبال ابتداء کرنے والے پر ہے جب تک کہ مظلوم زیادتی نہ کرے۔ (بخاری)

تشریح: المستبان: بائے موحدہ کی تشدید کے ساتھ 'باب تفاعل سے اسم فاعل کا تثنیہ ہے۔ مبتدا ہے۔ اس کی خبر "ما قالا" ہے (اور "ما قالا" سے پہلے مضاف محذوف ہے۔) ای اثم قولهما۔ "البادی" ھمزہ کے ساتھ 'بمعنی 'مبتدی'۔

فعلی: فاء اس وجہ سے لائی گئی ہے کہ "ما" شرطیہ ہے یا اس وجہ سے کہ "ما" موصولہ متضمن شرط ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں ممکن ہے کہ "ما" شرطیہ ہو اور فعل البادیء اس کی جزاء ہو۔ یا "ما" موصولہ ہو تو "فعلی البادی" اس کی خبر ہو اور جملہ مسببہ ہو۔

مطلب یہ ہے کہ اگر دو شخص آپس میں گالم گلوچ کرنے لگیں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگیں اور ایک دوسرے کے حق میں بدکلامی و سخت گوئی کریں تو اس ساری گالم گلوچ اور برا بھلا کہنے کا گناہ ان دونوں میں سے اس شخص پر ہوگا جس نے گالم گلوچ کی ابتداء کی ہوگی۔

گالم گلوچ کی ابتدا کرنے والے کو اپنی گالم گلوچ کا گناہ تو ہوگا ہی دوسرے شخص کی گالم گلوچ کا گناہ بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا:

- دو سبب ہے: وہ اس مخاصمت کا سبب بنا ہے۔
- اس نے گالم گلوچ کی ابتداء کر کے گویا دوسرے شخص پر ظلم کیا ہے اور اس اعتبار سے وہ ظالم کہلائے گا اور دوسرا شخص مظلوم۔

لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ ثانی جواب دینے میں زیادتی نہ کرے۔ اگر ثانی حد سے تجاوز کر گیا بایں طور کہ اس کی گالی گلوچ اول کی گالم گلوچ سے بڑھ گئی یا اول نے جو ایذا پہنچائی تھی اس کے جواب میں ثانی نے اس سے بھی زیادہ ایذا پہنچا دی تو اس صورت میں اول کی بہ نسبت ثانی پر زیادہ گناہ ہوگا بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ جب ثانی تجاوز کرے گا تو گناہ فقط اول پر نہیں رہے گا بلکہ ثانی بھی اس تعدی اور زیادتی کی وجہ سے گنہگار ہوگا ساری بات کا حاصل یہ ہے کہ اس کا مدار تجاوز پر ہے۔

''شرح السنہ'' میں ہے: من أربی الربوا من یسب سبتین بسبّۃٍ۔

تخریج: الجامع الصغیر میں یہ الفاظ مروی ہیں: المستبان ما قالا فعلی البادی منهما حتی یعتدی المظلوم (فرماتے ہیں) اس حدیث کو احمد، مسلم، ابوداؤد اور ترمذیؒ نے حضرت انسؓ کا ذکر کئے بغیر صرف حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

احمد نے ایک روایت میں اور امام بخاریؒ نے ''الادب'' میں عیاض بن حمار سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

المستبان شیطانان یتھا تران ویتکاذبان.(التهاتر: التعالج فی القول ایک دوسرے پر جھوٹا دعویٰ کرنا' ایک دوسرے کے خلاف شہادتیں')

صدیق کو لعن طعن جچتی نہیں

۴۸۲۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَا يَنْبَغِیْ لِصَدِّيْقٍ اَنْ يَكُوْنَ لَعَّانًا۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ٤/٢٠٠٦ الحدیث رقم (٨٥-٢٥٩٨) واحمد فی المسند ٦/٤٤٨۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ صدیق کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ لعن طعن کرنے والا ہو۔ (مسلم)

تشریح: الصدیق: صاد مہملہ کے کسرہ، دال مہملہ کے تشدید کی ساتھ بروزن مسکین ''صدیق'' مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ سچا۔

''صدیق'' اس شخص کو کہتے ہیں جس کے قول و فعل کے درمیان کوئی تضاد نہ ہو بلکہ پوری یکسانیت و مطابقت ہو۔

صوفیاء کے ہاں صدیقیت ایک مقام ہے جس کا درجہ مقام نبوت کے بعد سب سے اعلیٰ ہے

جیسا کہ قرآن کریم کی آیت: ﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ج﴾ سے مفہوم ہوتا ہے۔

یہاں صدیق سے مراد "مؤمن" ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ﴾ [الحدید۔۱۹] اسکی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے: لا ینبغی للمؤمن ان یکون لعانا. (یہ روایت، حدیث:۴۸۴۸ کے تحت آئے گی)۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص صدق و راستی کے وصف سے مزین ہو اور ایسے اونچے مقام پر پہنچ چکا ہو جو مقام نبوت کے بعد سب سے اعلیٰ ہے اور اس اعتبار سے اس کے مرتبہ کو مرتبہ نبوت سے سب سے قریبی نسبت حاصل ہے تو اس کی شان یہ نہیں ہونی چاہئے کہ وہ دوسروں پر لعنت کرتا رہے اور نہ مقام صدیقیت کا مقتضاء ہو سکتا ہے کیونکہ کسی کو لعنت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو رحمت خداوندی اور بارگاہِ الوہیت سے محروم اور بعید قرار دے دیا جائے جب کہ تمام انبیاء کا مقصد ہی یہ رہا ہے کہ وہ مخلوق خدا کو رحمت خداوندی سے بہرہ یاب کریں اور جو بارگاہِ الوہیت سے دور ہو چکے ہیں ان کو قریب تر لائیں۔

اہلسنّت والجماعت کا پسندیدہ شیوہ یہ ہے کہ لعن طعن کو ترک کیا جائے اور کسی بھی شخص کو لعنت نہ کی جائے اگرچہ وہ اس لعنت کا مستحق ہی کیوں نہ ہو کیونکہ جو شخص اپنے قول و فعل کے ذریعہ خدا کے نزدیک خود ملعون قرار دیا جا چکا ہے اس پر لعنت کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔ لہٰذا کسی ایسے شخص پر لعنت کرنا اپنی زبان کو خواہ مخواہ آلود کرنا ہے۔ اس کی لعنت میں اپنا وقت صرف کرنا اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے اور یہ کہ اس پر لعن طعن کر کے گویا اپنی جماعت حقہ کے شیوہ و معمول کے برخلاف عمل کرنا ہے۔ البتہ اس کافر پر لعنت کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے جس کے بارے میں مخبر صادق کی خبر یا اپنا علم و یقین یہ ہو کہ وہ کفر ہی کی حالت میں مرا ہے۔

لعنت کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کو بھلائی سے بالکل محروم اور رحمتِ خداوندی سے کلیتہً دور قرار دینا اس کو اللہ تعالیٰ کے فضل لا انتہا ہی سے مطلق ناامید کر دینا۔ ایسی لعنت صرف کافروں کے لئے مخصوص ہے۔ دوسری قسم کی لعنت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کو رضائے حق اور قرب خداوندی کے مقام سے دور محروم قرار دیا جائے جو ترک اولیٰ و احوط کا مرتکب ہو چنانچہ بعض اعمال و اوراد کو ترک کرنے کے سلسلے میں جو لعنت ملامت منقول ہے اور جو بعض صحابہؓ وغیرہ سے بھی نقل کی گئی ہے اس کا تعلق اسی دوسری قسم سے ہے۔

"لعان": یہ مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں "بہت زیادہ لعنت کرنے والا" حدیث میں یہ لفظ صیغہ مبالغہ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ تھوڑی بہت لعنت کرنے سے بھی اجتناب نادر الوقوع ہے۔ چنانچہ ابن الملک نے لکھا ہے کہ اس ارشاد گرامی میں "لعان" بصیغہ مبالغہ ذکر ہونا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ لعنت کرنے کی جو برائی اس حدیث سے واضح ہوتی ہے کہ وہ اس شخص کے حق میں نہیں ہے جس سے ایک دو مرتبہ لعنت کا صدور ہو جائے۔

لعان سفارشی نہ بن سکے گا

۴۸۲۱: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللَّعَّانِیْنَ لَایَکُوْنُوْنَ شُھَدَآءَ وَلَا شُفَعَاءَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ٤/٢٠٢٤ الحديث رقم (١٣٩-٢٦٢٣) و ابو داوٗد فی السنن ٥/٢٦٠ الحديث رقم ٤٩٨٣ و مالك فی الموطأ ٢/٩٨٤ الحديث رقم ٢ من كتاب الكلام واحمد فی المسند ٢/٣٤٢۔

ترجمہ: حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو بہت زیادہ لعنت کیا کرتے ہیں وہ قیامت کے دن گواہ اور سفارشی بننے سے محروم رہیں گے۔ (مسلم)

تشریح: "یوم القیامة" یہ دونوں کے لئے ظرف ہے۔

قیامت کے دن امت محمدیہ کے لوگ پچھلی امتوں پر گواہ کی حیثیت سے پیش کئے جائیں گے چنانچہ یہ گواہی دیں گے کہ ان کے رسولوں اور پیغمبروں نے اللہ تعالیٰ کے احکام ان تک پہنچائے تھے اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ [البقرة۔١٤٢]

"اور اسی طرح ہم نے تمہیں برگزیدہ امت بنایا تا کہ تم اور لوگوں پر گواہ ہو"۔

قیامت کے دن ایسے گواہ بننے کا اعزاز انہیں بخشا جائے گا جو دوسروں پر لعنت کیا کرتے ہیں وہ قیامت کے دن درجہ شفاعت سے محروم کر دیئے جائیں گے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "وسط" سے مراد "عدل" ہے اور لعنت عدالت کو سلب کر لیتی ہے۔

اس طرح نہ کہا جائے لوگ ہلاک ہو گئے

۴۸۲۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَالَ الرَّجُلُ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَكُهُمْ ۔ (رواه مسلم)

أخرجه البخاری فی صحيحه ١٠/٤٧٤ الحديث رقم ٦٠٥٨ و مسلم فی ٤/٢٠١١ الحديث رقم (١٠٠-٢٦٢٥) و ابو داوٗد فی السنن ٥/١٩٠ الحديث رقم ٤٧٨٢، والترمذی فی السنن ٤/٣٢٨ الحديث رقم ٢٠٢٥ و مالك فی الموطأ ٢/٩٩١ الحديث رقم ٢١ من كتاب الكلام، واحمد فی المسند ٢/٤٩٥۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اس طرح کہا لوگ ہلاک ہو گئے تو وہ ان میں سب سے بڑھ کر ہلاک ہونے والا ہے۔ (مسلم)

تشریح: قوله: فهو أهلكهم: کاف کے ضمہ کے ساتھ ہے اور فتحہ بھی دیا جاتا ہے۔ چنانچہ "النھایة" میں ہے: کہ یہ کاف کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ فتحہ کے ساتھ ہو تو فعل ماضی ہوگا اور ضمہ کے ساتھ ہوگا تو صیغۂ افعل ہوگا۔ دونوں میں معنوی فرق آگے آئے گا۔

کسی کی طرف اُخروی ہلاکت کی نسبت نہ کرو۔ لوگوں کو ایسے عقائد و اعمال میں مبتلا دیکھنا جو دین و شریعت کے خلاف ہوں تو ان کی اس حالت پر حسرت و افسوس کا ہونا اور غم خواری کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری امر بھی ہے اور اخوت اسلامی کا تقاضا بھی اگر وہ شخص اسی حسرت و افسوس اور غم خواری کے جذبات کے تحت ان لوگوں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ لوگ تو ہلاک ہو

گئے یعنی ان لوگوں نے ایسے عقائد و اعمال کو اختیار کر لیا ہے جو ان کو دوزخ کی آگ میں دھکیل کر رہیں گے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اس شخص کا یہ کہنا دراصل ان لوگوں کے تئیں ہمدردی وغم خواری کا مظہر ہوگا اور اس کا مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ وہ شخص ان لوگوں کے برے احوال سے دل شکستہ ہے اور اس کا قلبی جذبہ یہ ہے کہ کاش وہ لوگ اس حالت میں مبتلا ہو کر اخروی ہلاکت وتباہی کے راستہ کو اختیار نہ کرتے اور جب وہ اس راہ پر پڑ گئے ہیں تو اے کاش اب بھی ان کو ہدایت نصیب ہو جائے اور وہ ابدی ہلاکت وتباہی کے خوف سے راہ راست پر لگ جائیں۔

اگر کوئی شخص محض عیب جوئی حقارت اور ان لوگوں کو رحمت خداوندی سے مایوس کرنے کے لئے اس طرح کے الفاظ زبان سے نکالے تو یہ سخت برا ہوگا۔ اس طرح کہنے والا شخص خود سب سے زیادہ ہلاکت وتباہی میں پڑے گا کیونکہ اس کے ان الفاظ سے یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے نفس کی برائی اور اپنے اعمال کے غرور وتکبر میں مبتلا ہو گیا ہے دوسرے لوگوں کو چشم حقارت سے دیکھتا ہے اور ان کو حق تعالیٰ کی رحمت سے ناامید کرتا ہے۔ یہ مطلب اس صورت میں ہوگا جب کہ لفظ اهلکم کاف کے پیش کے ساتھ یعنی بصیغہ تفضیل ہو۔

اگر یہ لفظ کاف کے زبر کے ساتھ یعنی بصیغہ ماضی ہو جیسا کہ بعض روایتوں میں نقل کیا گیا ہے تو اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ "اس طرح کہنے والا ان کو ہلاک و برباد کر دیتا ہے" اور مطلب یہ ہوگا کہ جب کوئی شخص اپنے مشاہدہ کے مطابق بدعملیوں میں مبتلا لوگوں کے بارے میں اپنی زبان سے یہ الفاظ نکالتا ہے کہ وہ لوگ تو ہلاک و برباد ہو گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ رحمت خداوندی سے مایوس ہو کر ترک طاعت وعبادت اور ارتکاب معصیت وگناہ میں اور زیادہ مشغول ومنہمک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح کے الفاظ ان گنہگاروں کو شکستہ دل ناامید اور بے شوق بنا دیتے ہیں جو اپنی بدعملیوں کی وجہ سے گویا دنیا ہی میں خدا کے قہر وجلال میں گرفتار ہوئے ہیں

اسی لئے شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ جو لوگ بدعملیوں کی راہ اختیار کئے ہوئے ہوں اور معصیت کے اندھیروں نے جن کو گھیر رکھا ہو انہیں نہایت نرمی اور شفقت ومحبت کے ساتھ تذکیر ونصیحت کی جانی چاہئے اور ان پر سختی کرنا ان سے سخت گوئی وترش روئی سے پیش آنا ان کے بارے میں دل شکستگی اور مایوسی کے الفاظ اپنی زبان سے نکالنا ان کے حق میں سخت برا بن جاتا ہے۔ وہ ضد اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے راہ راست پر آنے کے بجائے اور زیادہ گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص ان کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کرتا ہے اور انہیں ہلاکت وبربادی کی خبر دیتا ہے وہ گویا انہیں ہلاکت وبربادی میں ڈالنے کا خود موجب بنتا ہے۔

اس اعتبار سے کہا جائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ ارشاد گرامی اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ گنہگار لوگوں کو بھی مغفرت کی بشارت دینا چاہئے۔ ان کے قلب وذہن کو دین وایمان پر پختہ کرنا چاہئے اور انہیں رحمت خداوندی کا امیدوار وطلبگار بنانا چاہئے۔

دو منہ والا بدترین شخص ہے

۴۸۲۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ذَا الْوَجْهَيْنِ الَّذِىْ يَاْتِىْ هٰٓؤُلَآءِ بِوَجْهٍ وَهٰٓؤُلَآءِ بِوَجْهٍ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۰/۴۷۲ الحديث رقم ۶۰۵۶ و مسلم في ۱/۱۰۱ الحديث رقم (۱۶۹-۱۰۵) و ابوداوٗد في السنن ۵/۱۹۰ الحديث رقم ۴۸۷۱، والترمذي في ۴/۳۲۹ الحديث رقم ۲۰۲۶، واحمد في المسند ۵/۳۸۲۔

ترجمه: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم قیامت کے دن بدترین لوگوں میں اسی شخص کو پاؤ گے جو دو منہ رکھتا ہے جو ایک گروہ کے پاس ایک چہرے سے اور دوسری جماعت کے پاس دوسرے چہرے سے جاتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

تخریج: حدیث باب دراصل مختصر ہے، اس حدیث کو احمد اور شیخین نے روایت کیا ہے اور مکمل حدیث یوں ہے:

تشریح: تجدون الناس معادن، خيارهم في الجاهلية خيارهم في الاسلام اذا فقهوا، وتجدون خير الناس في هذا الشأن اشدهم لهل كراهية قبل ان يقع فيه، وتجدون شر الناس يوم القيامة عند الله ذا الوجهين.

چغل خور جنت میں نہ جائے گا

۴۸۲۴: وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ۔

(متفق عليه وفي رواية مسلم نمام)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۰/۵۰۷ الحديث رقم ۶۰۹۴ و مسلم في ۴/۲۰۱۳ الحديث رقم (۱۰۵-۲۶۰۷) وابوداوٗد في السنن ۵/۲۶۴ الحديث رقم ۴۹۸۹، والترمذي في ۴/۳۰۶ الحديث رقم ۵۹۷۱، والدارمي في ۲/۳۸۸ الحديث رقم ۲۷۱۵ و مالك في الموطأ ۲/۹۸۹ الحديث رقم ۱۵، واحمد في المسند ۱/۳۹۳۔

ترجمه: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

تشریح: قتات: قاف کے فتحہ پہلی تاء کی تشدید کے ساتھ۔ بمعنی "نمام"۔ "نمیمہ" کی تعریف یہ ہے: نقل الكلام على وجه الفساد

ابن الملکؒ فرماتے ہیں یہ (مذمت) اس صورت میں ہے کہ جب یہ اصلاح کے لئے نہ ہو پس اگر یہ صلاح کی غرض سے ہو تو جائز، چونکہ اس صورت میں (قتات نہیں بلکہ) مصلح ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا خَيْرَ فِىْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾

[النساء: ۱۱٤] ؟؟ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: ''قتات'' اور'' نمام ''ہم معنی ہیں۔ عرب کہتے ہیں: قت الحدیث اذا ذروہ وھیاہ وسواہ (بات بڑھا چڑھا کر مزین کر کے بیان کرنا۔) بعض حضرات'' نمام'' اور'' قتات'' میں یہ فرق بیان کرتے ہیں: النمام: ھو الذی یکون مع القوم یتحدث فیھم وعلیھم. (لوگوں کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرنا اور پھر چغلی کھانا۔) والقتات: ھو الذی یتسمع علی القوم وھم لا یعلمون ثم ینم: (لوگوں کی لاعلمی میں ان کی باتیں سن کر چغلی کھانا۔)

سچ کا طلبگار صدیقین میں لکھا جاتا ہے

۴۸۲۵: وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَیْکُمْ بِالصِّدْقِ فَاِنَّ الصِّدْقَ یَھْدِیْ اِلَی الْبِرِّ وَاِنَّ الْبِرَّ یَھْدِیْ اِلَی الْجَنَّۃِ وَمَا یَزَالُ الرَّجُلُ یُصَدِّقُ وَیَتَحَرّٰی الصِّدْقَ حَتّٰی یُکْتَبَ عِنْدَ اللّٰہِ صِدِّیْقًا وَاِیَّاکُمْ وَالْکِذْبَ فَاِنَّ الْکِذْبَ یَھْدِیْ اِلَی الْفُجُوْرِ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ یَھْدِیْ اِلَی النَّارِ وَمَا یَزَالُ الرَّجُلُ یُکَذِّبُ وَیَتَحَرّٰی الْکِذْبَ حَتّٰی یُکْتَبَ عِنْدَ اللّٰہِ کَذَّابًا (متفق علیہ وفی روایۃ لمسلم) قَالَ اِنَّ الصِّدْقَ بِرٌّ وَّاِنَّ الْبِرَّ یَھْدِیْ اِلَی الْجَنَّۃِ وَاِنَّ الْکِذْبَ فُجُوْرٌ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ یَھْدِیْ اِلَی النَّارِ۔

أخرجه البخاری فی صحیحه ۵/۲۹۹ الحدیث رقم ۲۶۹۲ و مسلم فی ٤/۲۰۱۱ الحدیث رقم (۱۰۱۔۲٦۰۵) واحمد فی المسند ٦/٤۰۳۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سچ کو لازم پکڑو۔ کیونکہ سچ نیکی کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے اور نیکی جنت میں لے جانے والی ہے جب آدمی ہمیشہ سچ بولتا ہے اور سچائی کا متلاشی رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ صدیقین میں لکھ دیا جاتا ہے اور جھوٹ سے گریز کرو۔ کیونکہ جھوٹ برائی ہے اور برائی دوزخ کی طرف لے جانے والی ہے انسان جھوٹ بولتا رہتا اور اس کا متلاشی وطلبگار رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کذابین میں لکھا جاتا ہے۔ (بخاری، مسلم) مسلم کی روایت میں الفاظ اس طرح ہیں کہ سچائی نیکی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جانے والی ہے اور جھوٹ برائی ہے اور برائی دوزخ کی طرف لے جانے والی ہے۔

تشریح: قولہ: علیکم بالصدق: ای الزموا الصدق۔ ''صدق'' کی تعریف یہ ہے: ھو الاخبار علی وفق مافی الواقع۔

البر: باء کے کسرہ کے ساتھ۔

الکذب: کاف کے فتحہ اور ذال کے کسرہ کے ساتھ۔ ایک نسخہ میں کاف کے کسرہ اور ذال کے سکون کے ساتھ ہے۔ پہلا (ضبط) اصح ہے۔

''صدیق'': صاد کے کسرہ اور دال مشدد کے ساتھ ای مبالغ فی الصدق۔ قاموس میں لکھتے ہیں: الصدیق من یتکرر منہ الصدق حتی یستحق اسم المبالغۃ فی الصدق۔

الفجور: فاء کے ضمہ کے ساتھ۔

صاحب قاموس لکھتے ہیں: فجر فسق، و کذب و کذب وعصی وخالف.

قوله: حتی یکتب ای یثبت ۔اور بعض کا کہنا ہے کہ کتابت سے مراد یہ ہے کہ اس پر یہ حکم لگادیا جاتا ہے اور ملأ اعلی میں اس کا اظہار کردیا جاتا ہے اور زمین میں اس بات کا القاء کردیا جاتا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: و معنی یکتب هنا یحکم له بذلك ویستحق الوصف بمنزله الصدیقین وثوا بهم أوصفة الكذا بین وعقابهم ۔المراد اظهار ذلك للمخلوقین 'واما بان یکتب اسمه بخط المصنفین حتی یوضع له القبول أو البغضاء بقدرة الله سبحانه وتعالیٰ۔

مطلب: اس کو وصف صدیقیت کا حامل اور مقام صدیقیت پر فائز قرار دیا جاتا ہے اور اس اونچے درجے کے وصف و مقام کے اجر وثواب کا مستحق گردانا جاتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ملأ اعلیٰ کے پاس جس کتاب میں تمام بندوں کے اعمال لکھے ہوئے ہیں اس میں مذکورہ شخص کا نام "صدیق" لکھا جاتا ہے دنیا میں لوگ ایسے شخص کو اپنی کتابوں اور قلم پاروں میں صدیق کے نام سے لکھتے اور یاد کرتے ہیں۔ اس صورت میں اس ارشاد کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں میں انتہائی معزز ومکرم ظاہر کیا جاتا ہے لوگوں کے دلوں پر اس شخص کا لقب "صدیق" القا کیا جاتا ہے اور ان کی زبانوں پر اس کے اس لقب و صفت کو جاری کردیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کو سچا وصادق سمجھتے ہیں اور اس کی سچائی وصداقت میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ اس مفہوم کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔

"جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور نیک اعمال کئے اللہ تعالیٰ ان کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈالے گا"۔

کہ جھوٹ بولنے والے شخص کے بارے میں یہ فیصلہ دیا جاتا ہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور اس کے لئے وہ سزا مقرر کردی جاتی ہے جو جھوٹوں کے لئے مخصوص ہے

اس شخص کے بارے میں لوگوں کی نظروں اور دلوں میں یہ بات ظاہر وراسخ کردی جاتی ہے کہ یہ شخص انتہائی ناقابل اعتبار ہے اس طرح گویا اس کو جھوٹا مشہور کردیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص لوگوں کی نظروں سے گرجاتا ہے اور ہر شخص اس سے بغض ونفرت کرنے لگتا ہے۔

تخریج: الجامع الصغیر کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

ان الصدق یهدی الی البر وان البر یهدی الی الجنة وان الرجل لیصدق حتی یکتب عند الله صدیقا وان الکذب یهدی الی الفجور وان الفجور لهدی الی النار، وان الرجل لیکذب حتی یکتب عند الله کذابا. اور اس کو شیخین نے ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔

خیر کی بات کرنے والا جھوٹا نہیں

۴۸۲۶: وَعَنْ اُمِّ كُلْثُوْمٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِىْ يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ وَيَقُوْلُ خَيْرًا اَوْ يَنْمِىْ خَيْرًا۔ (متفق علیه)

أخرجه مسلم فی صحیحه ٢٢٩٧/٤ الحدیث رقم (٦٩-٢٠٠٢) و ابوداوٗد فی السنن ١٥٤/٥ الحدیث رقم ٤٨٠٣، والترمذی فی ٥١٨/٤ الحدیث رقم ٢٣٩٣ و ابن ماجه فی ١٢٣٢/٢ الحدیث رقم ٣٧٤٢، واحمد فی المسند ٦/٥۔

ترجمہ: حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شخص جھوٹا نہیں جو لوگوں کے درمیان صلح کرائے اور خیر کی بات کرے اور بھلائی کی بات دوسروں تک پہنچائے۔ (بخاری و مسلم)

راویٔ حدیث:

امّ کلثوم بنت عقبہ ۔ یہ ام کلثوم ہیں عقبہ بن ابی معیط کی بیٹی ہیں۔ مکہ ہی میں اسلام لا چکی تھیں۔ اور پیادہ پا ہجرت کی اور بیعت کی۔ مکہ میں ان کے شوہر نہ تھے۔ جب یہ مدینہ پہنچیں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کر لیا۔ وہ غزوہ موتہ میں شہید ہو گئے۔ اس کے بعد ان سے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ نے نکاح کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے ان کو طلاق دے دی۔ چنانچہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کیا۔ ان سے ان کے یہاں دو لڑکے ابراہیم اور حمید تولید ہوئے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ انتقال ہو گیا تو ان سے عمرو بن العاص نے نکاح کر لیا۔ ان کے نکاح میں ایک ماہ رہی ہوں گی کہ خود ام کلثوم انتقال ہو گیا۔ یہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی اخیافی (ماں شریک) بہن ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے حمید وغیرہ نے روایت کی۔

کلثوم میں کاف مضموم ہے۔ لام ساکن اور ثائے مثلثہ مضموم ہے۔ صاحب "مغنی" نے اس کی تصریح کی ہے اور ایک نسخہ میں فتحہ کے ساتھ ہے اور قاموس میں ہے کہ کلثوم "زنبور" کی طرح ہے اھ۔ اس کا تقاضا ہے کہ فتحہ ہی پڑھنا چاہیے۔

تشریح: کذاب: بروزن فعال، برائے نسبت ہے بمعنی " ذی کذب " جیسا کہ " لبان " اور " تمار " جیسا کہ اس آیت کریمہ میں (موجود لفظ "ظلام" کے بارے میں) کہا گیا ہے: ﴿وما ربك بظلام للعبيد﴾[فصلت : ۴۶] " ظلام " ذی ظلم کے معنی میں ہے۔ مبالغہ کی نفی سے اصل فعل کی نفی لازم نہیں آتی۔

ینمی: صاحب النہایہ لکھتے ہیں: **نميت الحديث و أنميته اذا بلغته على وجه الا صلاح وطلبا للخير 'فاذا بلغته على وجه الافساد والنميمة قلت نميته بالتشديد۔**

علماء میں سے ابو عبیدہ اور ابن قتیبہ وغیرہ کی یہی رائے ہے۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں "خیرا" یہ تاکید کے لئے ہے اور اس میں تجرید مراد ہے۔ حربی کا کہنا ہے کہ " نمی " تشدید کے ساتھ ہے۔ اکثر محدثین تخفیف کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ یہ درست نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لحن نہیں کرتے تھے۔

قائلین تخفیف پر لازم ہے کہ وہ تخفیف کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں ''خیر'' کو مرفوع پڑھیں۔ صاحب النہایہ نے اس کا رد کیا ہے وہ فرماتے ہیں، جیسا کہ ''قال'' کی وجہ سے منصوب ہوتا ہے اسی طرح سے ''نما'' کی وجہ سے بھی منصوب پڑھیں گے۔ ان کے زعم کے مطابق یہ دونوں لازم ہیں۔ اور ''نمی ''متعدی ہی ہے۔ کہا جاتا ہے: نميت الحديث اى رفعته أبلغته.اھ۔

صاحب قاموس لکھتے ہیں: نما ينموا (نموّا) زاد كنطى ينمى نمياء أنمي ونمي الحديث: ارتفع ونميته ونميته رفعته وعزوته. وأنماه أذاعه على وجه النميمة.

ليس الكذاب کی ترکیب:

۱ الكذاب: اسم ''ليس ''ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

۲ الكذاب: ایک نسخہ میں منصوب ہے۔ اس صورت میں خبر ليس ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ از روئے درایت یہی وجہ اعراب زیادہ ظاہر ہے۔ چونکہ'' الكذاب" محكوم به ہے۔ اور'' الذى يصلح بين الناس "محكوم عليه ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے اگر کوئی شخص ایسی بات کہے جو واقعہ کے اعتبار سے صحیح نہ ہو بلکہ جھوٹ ہو تو اس شخص کو جھوٹا نہیں کہیں گے (اور اس پر جھوٹ کا گناہ نہیں ہوگا) لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ بات ایسی ہو جو خیر و بھلائی ہی پر مشتمل ہو نہ کہ کسی برائی (جیسے شرک و فسق وغیرہ کی حامل ہو) مثلاً دو مسلمان زید اور بکر (اگر آپس میں کوئی مخاصمت رکھتے ہوں یا ان دونوں کے درمیان کوئی فتنہ و فساد ہو گیا ہو) تو اس صورت میں اگر کوئی تیسرا شخص (ان دونوں کی باہمی مخاصمت ختم کرانے اور) ان کے درمیان صلح و صفائی کرانے (کے مقصد) کے لئے دونوں میں سے ہر ایک کے پاس جا کر یوں کہے کہ اس دوسرے نے تمہیں سلام کہا ہے وہ تمہاری تعریف کر رہا ہے اور تمہارے بارے میں کہہ رہا تھا کہ میں اس سے محبت رکھتا ہوں اور حقیقت میں نہ تو اس نے سلام کہا ہو نہ اس کی تعریف کی اور نہ یہ کہا کہ میں اس سے محبت رکھتا ہوں۔

تخریج: جامع کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

ليس الكذاب بالذى يصلح بين الناس فينمي خيرا ويقول خيرا.

اس حدیث کو احمد، شیخین، ابوداؤد اور ترمذی نے ام کلثوم بنت عقبۃ سے، اور طبرانی نے شداد بن اوس سے نقل کیا ہے۔

منہ پر تعریف کرنے والوں کے منہ پر خاک

۴۸۲۷: وَعَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْاَسْوَدِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَاَيْتُمُ الْمَدَّاحِيْنَ فَاحْثُوْا فِيْ وُجُوْهِهِمُ التُّرَابَ۔ (رواه مسلم)

أخرجه البخارى فى صحيحه ٥٥٢/١٠ الحديث رقم ٦١٦٢ و مسلم فى ٢٢٩٦/٤ الحديث رقم (٦٥-٣٠٠٠) وابوداوٗد فى السنن ١٥٤/٥ الحديث رقم ٤٨٠٥ و ابن ماجه فى ١٢٣٢/٢ الحديث رقم ٣٧٤٤ واحمد فى المسند ٤٧/٥۔

ترجمہ: حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ منہ پر تعریف کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے منہ پر مٹی ڈال دو۔ (مسلم)

تشریح: قوله: اذا رأيتم المداحين فاحثوا في وجوههم:

''مداحوں'' سے مراد مدحت میں مبالغہ کرنے والے ہیں جو کسی لالچ میں آ کر تمہاری تعریف کریں، خواہ وہ تعریف نظم میں کریں، خواہ کلام نثر کی صورت میں کریں۔ اس جملہ کے متعدد مطالب بیان کیے گئے ہیں: ◼ کہا گیا ہے کہ اس حدیث کے ظاہر پر عمل پیرا ہوتے ہوئے، مٹی و مدح خوان کے منہ پر پھینک دو۔ ◼ بعض کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو مال دو، چونکہ مال حقیر ہے مٹی کی طرح عزت کے مقابلہ میں، **اى اطوهم اياه واقطعو ابه السنتهم لئلا يهجوكم۔** ◼ بعض کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو تھوڑا سا دے دو، قلت کو تراب کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ ◼ بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ''مداح کو ناکام و نامراد کیا جائے، اور اس کو اس کی ثناخوانی کے سبب کچھ نہ دیا جائے۔ اس سے مقصود مادح کو زجر کرنا ہے، اور مدحت کرنے سے روکنے پر ابھارنا ہے۔ چونکہ مدحت ممدوح کو مغرور متکبر بنا دیتی ہے۔ خطابی فرماتے ہیں ''مداحون'' وہ لوگ ہیں جو عوام کی تعریف بنالیں، اور ممدوح سے مال کھانے کے لئے اس کو پونجی بنالیں۔ چنانچہ جو شخص کسی شخص کی تعریف اس کے کسی اچھے کام اور اچھی بات پر کرتا ہے، اور وہ تعریف اس ممدوح کے لئے اس طرح کے مزید کام کرنے کی ترغیب دلاتی ہے اور لوگوں کو اس ممدوح کی اقتداء پر ابھارتی ہے تو یہ شخص ''مداح'' نہیں ہے۔

شرح السنہ میں لکھا ہے کہ حضرت مقداد نے حدیث کے ظاہر پر عمل کیا کہ مٹھی میں مٹی لے کر مادح کے منہ پر دے ماری۔ اس حدیث کا مطلب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ خسران و حرمان پر محمول ہے۔ یعنی جو تمہاری مدح و ثناء کرے تو اس کو مت دو اور اس کو محروم کر دو، ''تراب'' کنایہ ہے ''حرمان'' سے۔ جیسا کہ عرب کے اس قول میں ہے: **مافى يده غير التراب** اور جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: **اذا جاء ك يطلب ثمن الكلب فاملأ كفه ترابا۔** فی الجملہ کسی شخص کی مدح و ثناء مکروہ ہے، چونکہ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ مادح جھوٹ سے بچ پائے۔ اور ممدوح عجب و خود پسندی سے بچ پائے۔

فاحثوا: ہمزہ وصل اور ثائے مثلثہ کے ضمہ کے ساتھ۔ ای ارموا۔

في وجوههم: اور ایک نسخہ میں ''**في افواههم**'' ہے۔

① اس حدیث کو امام احمد نے اپنی مسند میں، امام بخاری نے ''ادب'' میں، اور امام ابوداؤد و ترمذی نے حضرت مقداد سے نقل کیا ہے۔

② طبرانی اور بیہقی نے ابن عمر سے نقل کیا ہے۔

③ امام حاکم نے الکنیٰ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

④ الجامع الصغیر میں ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے: **احثوا التراب في وجوه المداحين** اور لکھا ہے کہ اس روایت کو امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ اور ابن عدی نے ''**الكامل**'' میں اور ابونعیم نے ''**الحلية**'' میں ابن عمر سے نقل کیا ہے۔ ابن ماجہ میں مروی مقداد رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: **احثوا في افواه المداحين**

التراب. اس روایت کو اسی طرح ابن حبان نے ابن عمرؓ اور ابن عساکر نے عبادہ ابن صامت سے نقل کیا ہے۔

منہ پر تعریف گردن کاٹنا ہے

۴۸۲۸: وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَةَ قَالَ اَثْنٰی رَجُلٌ عَلٰی رَجُلٍ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ وَیْلَكَ قَطَعْتَ عُنُقَ اَخِیْكَ ثَلَاثًا مَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَادِحًا لَا مُحَالَةَ فَلْیَقُلْ اَحْسِبُ فُلَانًا وَاللّٰهُ حَسِیْبُهٗ اِنْ کَانَ یُرٰی اَنَّهٗ کَذٰلِكَ وَلَا یُزَکِّیْ عَلَی اللّٰهِ اَحَدًا۔ (متفق علیه)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢٠٠١ الحديث رقم (٧٠-٢٥٨٩) و ابوداؤد في السنن ٥/١٩١ الحديث رقم ٤٨٧٤، والترمذي في ٤/٢٩٠ الحديث رقم ١٩٣٤، والدارمي في ٢/١٣٨٧ الحديث رقم ٢٧١٤ و مالك في الموطأ ٢/٩٨٧ الحديث رقم ١٠ من كتاب الكلام، واحمد في المسند ٢/٣٨٤۔

ترجمہ: حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی کی تعریف کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا افسوس کہ تو نے اپنے بھائی کی گردن کاٹ ڈالی اور یہ بات آپ نے تین دفعہ فرمائی۔ اگر تم میں سے کوئی کسی کی تعریف کرنا ہی چاہتا ہو تو وہ اس طرح کہے میرا گمان اس کے متعلق یہ ہے بشرطیکہ اسے ایسا ہی جانتا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کسی کی پاکیزگی قطعی انداز سے بیان نہ کرے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: ویلك: بمعنی "الھلاك" ای ھلکت ھلا کا و اھلکت اھلا کا۔ ایک نسخہ میں "ویحك" ہے۔

عنق: تمام تصحیح شدہ نسخوں اور اصول معتمدہ میں یہ لفظ عین کے ضمہ اور نون کے ساتھ ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں:

العنق: بالضم وبضمتین و کامیر و صرد: الجید ویؤنث. اس کی جمع "اعناق" آتی ہے۔

محالة: میم کے فتحہ کے ساتھ بمعنی "البتة: اور ایک نسخہ میں میم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

صاحب قاموس لکھتے ہیں: لا محالة منه، بالفتح ہے۔ بمعنی لا بد، اور "محال" ضمہ کے ساتھ ہو تو "کلام معدول" کو کہتے ہیں۔ صاحب الصحاح فرماتے ہیں: لا محالة بالضم بمعنی لا بد' ای لا فراق و بالفتح بمعنی "لا احتیال"

احسب: سین مہملہ کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ بمعنی أظنه۔

یری: یاء کے ضمہ کے ساتھ ہے بمعنی یظن۔ اور ایک نسخہ میں یاء کے فتحہ کے ساتھ ہے، بمعنی یعلم.

اشرفؒ فرماتے ہیں: "واللہ حسیبه" جملہ معترضہ ہے۔ "ان کان یری" یہ "احسب فلانا" کے متعلق ہے۔ "ولا یزکی علی اللہ أحدا" مجزوم نہیں ہے البتہ اس کا عطف "فلیقل" پر ہے۔ (انتھی) اس پر اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ "لا یزکی"، یاء کے اثبات کے ساتھ ہے۔ پس یہاں اس تاویل کی احتیاج ہوگی کہ خبر بمعنی نہی ہے۔ ای: ولا یکن منکم التزکیة علی اللہ بعض لوگوں نے اس کی ترکیب نہایت عجیب کی ہے کہ "لا یزکی" کا عطف "یری" پر ہے۔ اور یہی درست ہے۔ امام طیبیؒ کا کلام بھی کچھ اسی طرح عجیب وغریب سا ہے، وہ فرماتے ہیں: "ان کان یری" یہ جملہ شرطیہ "فلیقل" کی ضمیر سے حال ہے۔ اور "علی اللہ" کا "علی" وجوب کیلئے ہے۔ واللہ اعلم۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: دونوں کی وجہ اشتراک "ہلاکت" ہے لیکن یہ دین میں ہلاکت ہے اور کبھی دنیاوی اعتبار سے بھی ہلاکت ہو جاتی ہے۔(یعنی جو شخص کسی کی تعریف کرتا ہے تو وہ (ممدوح اپنی تعریف سن کر غرور وتکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے یہ اس ممدوح کو دینی اور اخروی طور پر ہلاکت میں ڈال دیتا ہے جب کہ یہ تعریف بسا اوقات دنیاوی طور پر بھی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے جیسے کوئی شخص اپنی تعریف سن کر اتنا زیادہ مغرور ہو جائے کہ کسی کا ناحق خون کر ڈالے اور پھر عدالت کی طرف سے سزائے موت کا مستوجب ہو کر خود اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔)

اگر تم کسی شخص کے اندر کوئی ایسا وصف دیکھو کہ جس کی وجہ سے وہ قابل تعریف ہو مثلاً کوئی شخص بہت زیادہ نیک وصالح ہو اور تم اس کی تعریف کرنا ہی چاہتے ہو تو اس صورت میں بھی یہ ضروری ہے کہ تم بس اپنے گمان کی حد تک اس کی تعریف کرو اس کے بارے میں جزم ویقین کے ساتھ فیصلہ نہ کرو بلکہ یوں کہو کہ میں فلاں شخص کو ایسا سمجھتا ہوں یا فلاں شخص کے بارے میں میرا یہ گمان ہے

قولہ: ولا یزکر علی اللہ أحد: اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی شخص کا حقیقی حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا (جس شخص کو بظاہر نیک واچھا سمجھا جارہا ہے ہو سکتا ہے کہ اس کے باطنی احوال اس درجہ کے نہ ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھا ہو۔لہٰذا جو شخص قابل تعریف ہو اس کی تعریف میں احتیاط کی راہ اختیار کرنی چاہئے اس کے بارے میں بالکل آخری فیصلہ نہ کرنا چاہئے کہ یہ شخص یقیناً اچھا اور نیک اور خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے)

فوائد ۞ ہاں ان لوگوں کا معاملہ دوسرا ہے جن کو احادیث میں صراحت کے ساتھ قابل تعریف قرار دیا گیا ہے اور جن کے بارے میں ثابت ہو چکا ہے کہ وہ خدا کے نزدیک یقیناً پسندیدہ ہیں جیسے عشرہ مبشرہ وغیرہ انکے علاوہ کسی اور شخص کے بارے میں اس جزم ویقین کا اظہار نہ کیا جائے کہ فلاں شخص خدا کے نزدیک اچھا ہے۔

غیبت و بہتان کا فرق

۴۸۲۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْغِیْبَةُ قَالُوْا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ ذِکْرُكَ اَخَاكَ بِمَا یَکْرَهُ قِیْلَ اَفَرَاَیْتَ اِنْ کَانَ فِیْ اَخِیْ مَا اَقُوْلُ قَالَ اِنْ کَانَ فِیْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَاِنْ لَّمْ یَکُنْ فِیْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ بَهَتَّهٗ (رواہ مسلم وفی روایة) اِذَا قُلْتَ لِاَخِیْكَ مَا فِیْهِ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَاِذَا قُلْتَ مَا لَیْسَ فِیْهِ فَقَدْ بَهَتَّهٗ۔

أخرجه البخاری فی صحیحه ۴۵۲/۱۰ الحدیث رقم ۶۰۳۲ و مسلم فی ۲۰۰۲/۴ الحدیث رقم (۷۳-۵۹۱)وابو داود فی السنن ۱۴۴/۵ الحدیث رقم ۴۷۹۲، والترمذی فی السنن ۳۱۶/۴ الحدیث رقم ۱۹۹۶ و مالك فی الموطأ ۹۰۳/۲ الحدیث رقم ۴ من کتاب حسن الخلق۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے) فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ غیبت کیا چیز ہے؟ انہوں نے عرض کیا اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا

اپنے مسلمان بھائی کو ایسے انداز سے ذکر کرنا جسے وہ ناپسند کرے۔ عرض کیا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر وہ عیب جو تم نے بیان کیا تیرے بھائی میں تو اس صورت میں تم نے اس کی غیبت کی ہے اور اگر وہ عیب اس میں پایا نہیں جاتا ہے تو تو نے اس پر بہتان باندھا۔ یہ مسلم کی روایت ہے ایک روایت میں اس طرح ہے کہ اگر تم نے اپنے بھائی کا وہ عیب بیان کیا جو اس میں پایا جاتا ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر تم نے وہ عیب بیان کیا جو اس میں نہ ہو تو اس پر تم نے بہتان تراشی کی۔

تشریح: الغیبة: غین معجمہ کے کسرہ کے ساتھ۔

ذکرك: الفاظ اگرچہ خاص ہیں مگر خطاب عام ہے۔

بهته: ہائے مخففہ اور تاء کی تشدید کے ساتھ، واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔

غیبت کا معنی ہے پیٹھ پیچھے کسی کا کوئی عیب بیان کرنا امام نوویؒ فرماتے ہیں: غیب ''افتح القبائح'' ہے۔ یہ گناہ لوگوں میں بہت زیادہ پھیلا ہوا ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو اس برائی سے بچے ہوئے ہیں۔ عام طور پر ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں غیبت کرتا نظر آتا ہے۔ (لہٰذا ضروری ہے کہ اس بات میں کچھ تفصیل بیان کر دی جائے۔)

(جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے) غیبت اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی ایسے شخص کے بارے میں جو موجود نہ ہو اس طرح کا ذکر کرے جس سے اس کو کوئی عیب ظاہر ہو اور وہ اس عیب کے ذکر کئے جانے کو ناپسند کرے۔ اس عیب کا تعلق خواہ اس کے بدن سے ہو خواہ اس کے دین سے ہو یا دنیا سے' خواہ اس کے نفس سے خواہ اخلاق وافعال سے ہو یا اس کے مال واسباب سے ہو یا اولاد سے' خواہ اس کے ماں باپ سے ہو یا بیوی خادم وغیرہ سے' خواہ اس کے لباس وغیرہ سے ہو یا رفتار وگفتار سے' خواہ اس کے حرکات وسکنات سے ہو (یا عادات واطوار سے) خواہ اس کی کشادہ روئی سے ہو یا ترش روئی سے اور خواہ اس کی تند خوئی و سخت گوئی سے ہو (یا نرم خوئی اور خاموشی سے) اور یا ان چیزوں کے علاوہ کسی بھی ایسی چیز سے ہو جو اس کے متعلق ہو سکتی ہے' نیز اس عیب کے ساتھ اس کا ذکر کرنا خواہ الفاظ کے ذریعہ ہو یا اشارہ وکنایہ اور رمز کے ذریعہ اور اشارہ وکنایہ بھی خواہ لفظ وبیان کے ذریعہ ہو یا ہاتھ' آنکھ' ابرو اور سر وغیرہ کے ذریعہ۔

اس سلسلہ میں یہ قاعدہ کلیہ ذہن میں رہنا چاہئے کہ اگر کسی شخص کا کوئی عیب اس کی عدم موجودگی میں بیان کیا جائے جو دوسروں کی نظروں میں اپنے ایک مسلمان بھائی کی حیثیت وشخصیت کو گھٹاتا ہے تو یہ غیبت ہے اور حرام ہے اور اگر کسی کے منہ پر اس کے کسی عیب کو اس طرح بیان کیا جائے جس سے اس کو ناگواری اور دل شکنی ہو تو یہ ایک طرح کی بے حیائی' سنگدلی اور ایذاء رسانی ہے کہ یہ اور بھی سخت گناہ ہے۔

قوله: وفی روایة: اس عبارت سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ یہ روایت بھی مسلم کی ہے۔ سیدؒ کی توضیح کے مطابق یہ روایت ''شرح السنۃ'' کی ہے۔ امام میرکؒ فرماتے ہیں: یہ روایت صحیحین میں سے کسی ایک میں بھی نہیں ہے، بلکہ صاحب المصابیح نے ''شرح السنۃ'' میں اپنی سند کے ساتھ ابو ہریرہؓ سے نقل کی ہے۔ اھ۔

یہ عبارت درحقیقت صاحب مصابیح پر اعتراض ہے کہ انہوں نے اس روایت کو صحاح میں ذکر کیا ہے۔ اس اعتراض کا

جواب بار ہا دیا جا چکا ہے کہ یہ التزام اصول میں ہے نا کہ متعضدات فصول میں۔

قبیلہ کا بدترین آدمی

۴۸۳۰: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَجُلاً اِسْتَاْذَنَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِئْذَنُوْا لَهٗ فَبِئْسَ اَخُو الْعَشِيْرَةِ فَلَمَّا جَلَسَ تَطَلَّقَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ وَجْهِهٖ وَانْبَسَطَ اِلَيْهِ فَلَمَّا انْطَلَقَ الرَّجُلُ قَالَتْ عَائِشَةُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قُلْتَ لَهٗ كَذَا وَكَذَا ثُمَّ تَطَلَّقْتَ فِيْ وَجْهِهٖ وَانْبَسَطْتَ اِلَيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَتٰى عَاهَدْتِّنِيْ فَحَاشًا اِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَنْ تَرَكَهُ النَّاسُ اتِّقَاءَ شَرِّهٖ وَفِيْ رِوَايَةٍ اِتِّقَاءَ فُحْشِهٖ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ١٠/٤٨٦ الحدیث رقم ٦٠٦٩ و مسلم فی ٤/٢٢٩١ الحدیث رقم (٥٢-٢٩٩٠)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے اجازت دے دو۔ یہ شخص قبیلے کا بدترین آدمی ہے۔ جب وہ بیٹھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے خندہ پیشانی سے ملے اور نرمی سے پیش آئے۔ جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے تو اس کے متعلق یہ یہ فرمایا پھر اس کے ساتھ یوں خندہ پیشانی اور کشادہ روئی سے پیش آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے مجھے فحش گو کب پایا؟ اللہ تعالیٰ کے ہاں بدترین درجے والا وہ شخص ہوگا جس کے شر سے حفاظت کی خاطر لوگ اس سے فرار اختیار کریں اور ایک روایت میں ہے کہ اس کی فحش گوئی سے بچنے کے لئے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: قوله: فبس أخو العشيرة: بخاری کی ایک روایت میں بغیر شک کے یہ الفاظ آئے ہیں: بئس أخوا العشيرة، وبئس ابن العشيرة.

شمائل کی روایت میں شک کے ساتھ یہ الفاظ آئے ہیں: بئس ابن العشيرة او اخو العشيرة. منکدر کے تمام اصحاب نے یہ روایت بغیر شک کے بیان کی ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ سفیان کو شک ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''العشيرة'' کا مطلب ہے ''القبيلة اى بئس هذا الرجل من العشيرة'' جیسا کہ عرب سے تعلق رکھنے والے کہا جاتا ہے: یا أخا العرب

قوله: قلت له كذا و كذا: شمائل کی روایت میں ''قلت له ماقلت'' کے الفاظ ہیں۔ اور یہ الفاظ بھی ہیں: ألنت له القول' فحاشا: ''ذو فحش'' کے معنی میں ہے۔ اى قائلا للفحش۔ فحش کے اصل معنی ہیں: زيادة الشي على مقداره اور فحش کے عام معنی ہیں: مجاوزة الحد قولا و فعلا۔ (قول و فعل میں حد سے تجاوز کرنا)

حدیث میں جس شخص کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے کہا گیا ہے کہ یہ عیینہ فزاری تھا۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ نوفل بن مخرمہ تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ متعدد واقعات پیش آئے ہوں۔ اس سے روایت میں تطبیق ہو جائے گی۔

عرضِ مرتب:

صاحب مظاہر نے اس کے سلسلہ میں کچھ تفصیل ذکر کی ہے جو حسب ذیل ہے: یہ شخص اپنی سنگدلی بد خلقی اور سخت مزاجی کے اعتبار سے بہت ہی مشہور تھا اور اپنی قوم کا سردار بھی تھا اس کا شمار مؤلفۃ القلوب میں ہوتا تھا تا کہ اس کو اسلام پر قائم و ثابت قدم رکھا جا سکے اگر چہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں اس کے دین و بیان میں نقصان و اضمحلال کا اظہار ہونے لگا تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد دین و ایمان سے پوری طرح منحرف ہو کر مرتد ہو گیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کو گرفتار کر لیا پھر اس نے دوبارہ ایمان قبول کیا اور اسلام کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس آدمی کا نام عیینہ بن حصن تھا۔ یہ اس وقت مسلمان نہیں ہوا تھا اگر چہ اسلام کا اظہار کرتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں جو الفاظ فرمائے اس کا مقصد اس کے احوال کو منکشف کرنا تھا تا کہ لوگ اس کو جان لیں اور باواقف لوگ اس کے فریب سے کسی فتنہ و فساد میں مبتلا نہ ہو سکیں۔ (لہٰذا اس کو غیبت نہیں کہا جائے گا۔) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اور بعد میں اس کی (دینی) حالت اس کے ضعف ایمان پر دلالت کرتی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے بارے میں یہ فرمانا: بئس اخو العشیرۃ‘ سے آپ کی نبوت کی نشانیوں میں سے تھا‘ چونکہ بعد میں اسی وصف کے مطابق ظہور ہوا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کشادہ روئی اور خندہ پیشانی سے ملنا اور مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کرنا اس کی تالیف قلب کی خاطر تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس شخص کی مدارت کرنا جائز ہے جس کی فحش گوئی‘ بد خلقی اور اس کے ضرر کا خوف ہو نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی فاسق کی غیبت کرنا جائز ہے۔

قاضی حسین کی اتباع کرتے ہوئے لکھتے ہیں: مدارات اور مداہنت کے درمیان فرق یہ ہے کہ مدارات تو اس کو کہتے ہیں کہ کسی شخص کی دنیا یا دین اور یا دونوں کی اصلاح کے لئے اس پر دنیا کی چیز کو خرچ کیا جائے اور یہ مباح ہے بلکہ بسا اوقات مستحسن ہوتی ہے۔ مداہنت اس کو کہتے ہیں کہ کسی کی اصلاح دنیا کے لئے اس پر دین کو قربان کیا جائے۔ (انتھی) یہ فائدہ جلیلہ ہے۔ مدارات اور مداہنت کے درمیان اس فرق کو یاد رکھنا چاہئے اور اس کی محافظ کرنی چاہئے کیوں کہ اکثر لوگ اس سے غافل ہیں اور ان دونوں کے مابین فرق سے جاہل ہیں۔

قولہ: متی عاھدتنی فحاشا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد دراصل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خیال کو صحیح کرنے کے لئے تھا گویا اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں مختلف رویہ اختیار فرمایا جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہیں تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مذمت فرمائی اور جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا تو اس کے ساتھ ملاطفت و یگانگت کا برتاؤ کیا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدم موجودگی میں اس کو برا کہا تو اس کی موجودگی میں بھی اس کو برا کہتے اور اس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے جو کسی برے آدمی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

قولہ: ان شر الناس عند اللہ منزلۃ یوم القیامۃ من ترکۃ الناس اتقاء شرہ وفی روایۃ اتقاء فحشہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ارشاد فرمایا اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں:

ایک تو یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کے ذریعہ واضح فرمایا کہ میں نے اس شخص کے منہ پر اس کو اس لئے برا نہیں کہا

کہ میں سخت گو قرار نہ پا سکوں اور میرا شمار ان لوگوں میں نہ ہونے لگے جن کی سخت اور کڑوی باتوں کی وجہ سے لوگ ان سے ملنا جلنا چھوڑ دینے کو کہتے ہیں۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ان الفاظ کے ذریعہ گویا ظاہر فرمایا کہ وہ شخص چونکہ بہت شریر اور بد باطن تھا۔ لہٰذا میں نے اس کی بد باطنی کی وجہ سے اس سے اجتناب کیا اور اس کے منہ پر اس کو برا نہیں کہا اور حقیقت میں برا شخص وہی ہے جس کی برائی سے بچنے کے لئے لوگ اس سے اجتناب کریں اور اس کے عیوب سے بھی اسے آگاہ نہ کریں۔

تخریج: الجامع الصغیر کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: ان شر الناس منزلة عند الله يوم القيامة من ترك اتقاء فحشه. اس حدیث کو شیخین، ابوداؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔

اوسط میں طبرانی نے حضرت انس سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں: من يخاف الناس شره.

اعلانیہ گناہ والوں کی معافی نہیں

۴۸۳۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ اُمَّتِیْ مُعَافًا اِلَّا الْمُجَاهِرُوْنَ وَاِنَّ مِنَ الْمَجَانَةِ اَنْ يَّعْمَلَ الرَّجُلُ بِاللَّيْلِ عَمَلاً ثُمَّ يُصْبِحُ وَقَدْ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَيَقُوْلُ يَافُلَانُ عَمِلْتُ الْبَارِحَةَ كَذَا وَكَذَا وَقَدْ بَاتَ يَسْتُرُهُ رَبُّهُ وَيُصْبِحُ يَكْشِفُ سِتْرَ اللّٰهِ عَنْهُ۔

(متفق عليه وذكر حديث ابی هريرة من كان يؤمن بالله فی باب ضيافة)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٣١٥ الحديث رقم ١٩٩٣ و ابن ماجه فی ١٩/١ الحديث رقم ٥١، والبغوی فی شرح السنة ٨٢/١٣ الحديث رقم ٣٥٠٢۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری تمام امت کو معاف کر دیا جائے گا سوائے ان لوگوں کے جو علانیہ گناہ کا ارتکاب کرنے والے ہیں اور علانیہ گناہ سے یہ بھی ہے کہ رات کو کسی نے عمل کیا پھر صبح کی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈال دیا تھا وہ لوگوں سے کہتا پھرتا ہے اے فلان! میں نے گزشتہ رات یہ یہ کیا۔ صبح کے وقت وہ اپنے پروردگار کے پردہ کو چاک کر دیتا ہے۔ (بخاری، مسلم)۔ روایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ باب الضیافہ میں گزر چکی ہے۔

تشریح: قوله: كل امتی معافا الا المجاهرون: "معافاً": عافا يعافی معافاة سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ اکثر نسخوں اور اصول معتمدہ میں یہ لفظ یوں ہی ہے۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں فرماتے ہیں: اکثر نسخوں میں اور اصول معتمدہ میں "معافاة" کا لفظ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مصابیح کے نسخوں میں "معافی" بغیر ھاء کے آیا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ رسم الخط میں اس الف کو بصورت یاء لکھا جائے۔ اس صورت میں یہ لفظ "کل" کے مطابق ہو جائے گا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے: كلكم راع وكلكم مسؤل عن رعيته.

الا المجاهرون: مشکوۃ کے تمام نسخوں میں یہ لفظ مرفوع ہے۔ تورپشتیؒ فرماتے ہیں: مصابیح کے نسخوں میں'' المجاهرون'' مرفوع لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ اس لفظ کو منصوب علی الاستثناء ہونا چاہئے۔

اشرفؒ فرماتے ہیں:'' المجاهرون'' کا مستثنیٰ منہ ''معافی'' ہے، یہ نفی کے معنی میں ہے۔ ای: کل امتی لا ذنب علیهم الا المجاهرون.

حافظ ابوموسیٰ نے اپنے مجموعہ ''المغیث'' میں ''الا المجاهرین'' اصل کے مطابق نصب کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ النہایہ میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یوں کہنا زیادہ واضح ہے: کل أمتی یترکون عن الغیبة الا المجاهرون جیسا کہ مروی ہے: من القی جلباب الحیاء فلا غیبة له۔

''عفو'' ترک کے معنی میں ہے۔ اور اس میں نفی کے معنی ہیں، جیسا کہ اللہ جل شانہ کے اس فرمان: [ویابی اللّٰه الا ان یتم نوره۔] میں ہے۔[التوبۃ:۳۲] المجاهرون الذین جاهر وابمعاصیهم وأظهر وها و کشفوا ما ستر الله علیهم منها فیتحدثون۔

کہا جاتا ہے: جهر و جاهر أجهر (یہ تینوں ہم معنی ہیں۔)

المجانة: میم کے فتحہ اور جیم مخففہ کے ساتھ، مجن یمجن، از باب نصر کا مصدر ہے۔

ثم یصبح: منصوب ہے اور ایک نسخہ میں مرفوع ہے۔ اس صورت میں یہ ھو مبتداء محذوف کی خبر ہوگا۔

فیقول: منصوب و مرفوع دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

وقد بات: یہ جملہ حالیہ ہے۔

ویصبح: کا اسم ضمیر سترہٗ ہے، اور یکشف: فی محل النصب خبر یصبح ہے۔

ستر: سین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ ایک نسخہ میں سین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ یہ مصدر ہے۔

ملا علی قاریؒ طیبیؒ کے کلام پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں: حدیث کا سیاق وسباق اور اس کا حقیقی مفہوم اس معنی (تقیید یا الغیبة) پر دلالت نہیں کرتا ترجمۃ الباب کا کوئی اعتبار نہیں۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اشرفؒ کا یہ قول: کل أمتی لا ذنب علیهم علی الا طلاق درست نہیں۔ اگر یہ معنی مراد لئے جائیں، تو پھر بات درست ہے: کل أمتی لا یؤاخذون أو لا یعاقبون عقابا شدید الا المجاهرون.

تخریج: الجامع الصغیر میں یہ الفاظ مذکور ہیں: کل أمتی معافی الا المجاهرون وان من الجهار ان یعمل الرجل (الحدیث)۔ لیکن اس روایت میں'' یا فلان'' کے الفاظ نہیں ہیں۔ (رواه الشیخان عنه).

اوسط میں امام طبرانیؒ نے ابوقتادہؓ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں: کل امتی معافی الا المجاهر الذی یعمل العمل باللیل فیستره ربه ثم یصبح فیقول: یا فلان انی عملت البارحة کذا وکذا فیکشف ستر اللّٰه عز وجل.

حدیث ابی ہریرۃ: مکمل حدیث یوں ہے:۔

قوله: وذکر حدیث أبی هریرة من کان یؤمن بالله فی باب الضافة:

حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کو باب الضیافۃ میں ذکر کرنے کی وجہ:

چونکہ حدیث ابو ہریرہ کا ابتدائی ٹکڑا: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه" ضیافت کے باب سے مناسبت رکھتا ہے۔لہٰذا تکرار کے خوف سے یہاں ذکر نہیں کیا۔مؤلف کا یہ اعتذار بھی درحقیقت اعتراض ہے۔

عرضِ مرتب:

حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی تشریح حدیث: ۴۲۴۲ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

الفصل الثانی:

جنت کے بالائی حصہ میں گھر والا

۴۸۳۲:عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ تَرَكَ الْكَذِبَ وَهُوَ بَاطِلٌ بُنِيَ لَهٗ فِيْ رَبَضِ الْجَنَّةِ وَمَنْ تَرَكَ الْمِرَآءَ وَهُوَ مُحِقٌّ بُنِيَ لَهٗ فِيْ وَسَطِ الْجَنَّةِ وَمَنْ حَسَّنَ خُلُقَهٗ بُنِيَ لَهٗ فِيْ اَعْلَاهَا۔

(رواه الترمذى وقال هذاحديث حسن وكذا فى شرح السنة وفى المصابيح قال غريب)

أخرجه الترمذى فى السنن ٣١٩/٤ الحديث رقم ٢٠٠٤ و ابن ماجه فى ١٤١٨/٢ الحديث رقم ٤٢٣٦، واحمد فى المسند ٢٩١/٢۔

ترجمہ:حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص جھوٹ چھوڑ دے جو کہ باطل چیز ہے اس کے لئے جنت کے کنارے گھر بنایا جائے گا اور جو صاحب حق ہونے کے باوجود لڑائی چھوڑ دے اس کا گھر جنت کے درمیان میں ہوگا اور جس نے اپنے اخلاق کو درست کر لیا اس کے لئے جنت کے بالائی حصہ میں گھر بنایا جائے گا ترمذی نے اسے روایت کر کے اسے حسن قرار دیا اور شرح السنہ میں بھی اسی طرح ہے۔صاحب مصابیح نے اسے غریب کہا۔

تشریح: قوله:من ترك الكذب وهو باطل بنى له قصر فى ربض الجنة:

"من ترك الكذب":شرط ہے۔" بنى له فى رض الجنة":جزاء ہے۔

وهو باطل:اس جملہ کی ترکیب میں دو احتمالات ہیں:

① جملہ معترضہ ہے، شرط وجزا کے درمیان واقع ہوا ہے اس جملہ کو یہاں ذکر کرنا جھوٹ سے نفرت دلانے کے لئے ہے۔

② جملہ حالیہ ہے، اگر فاعل سے حال ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا:وهو ذو باطل بمعنى صاحب بطلان۔

اگر مفعول سے حال ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا:والحال انه باطل لا مصلحة فيه من مرخصات الكذب، كما فى الحرب او اصلاح ذات البين والمعاريض۔

بنى له:صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ ای:بنى الله له قصرا۔

فى ربض الجنة:راء کے فتحہ اور بائے موحدہ کے ساتھ۔یعنی جنت کے اندر اس کے نواحی وجوانب میں۔نہ جنت کے

باہر کے اطراف میں۔

قوله:ومن ترك المراء وهو محق بني له في وسط الجنة:

المراء: میم کے کسرہ کے ساتھ، جدال

قوله:ومن حسن خلقه بني له في أعلاها:

حسن: سین مہملہ کی تشدید کے ساتھ۔

خلقه: خاء اور لام دونوں کے ضمہ کے ساتھ نیز لام کے سکون کے ساتھ۔

من حسن خلقه سے پتہ چلتا ہے کہ اخلاق کسبی چیز ہیں، اگر اصل کے اعتبار سے فطری ہیں۔ اس کی تائید ان احادیث صحیحہ سے بھی ہوتی ہے۔

۱ **اللهم حسن خلقي كما حسنت خلقي.**

۲ مسلم شریف کی ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں: **اللهم اهدني لأحسن الأخلاق لا يهدي لأحسنها الا أنت.**

امام حجۃ الاسلام لکھتے ہیں: مراء: یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کلام پر اعتراض وارد کرے بایں طور کہ یا تو اس کے الفاظ میں خلل ونقصان کو ظاہر کرے یا اس کے مضمون و معنی میں غلطی نکالے اور یا متکلم کے مقصد و مراد کو نادرست قرار دے۔ اور ترک مراء کا مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے کے کلام وقول پر کوئی اعتراض وارد نہ کرے۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ جب وہ کوئی کلام و بات سنے تو اگر وہ حق ہو تو اس کی تصدیق کرے اور اگر وہ باطل و بے بنیاد ہو اور اس کا تعلق کسی دینی معاملہ سے نہ ہو تو اس سے سکوت اختیار کرلے۔

تخریج: اس حدیث پر امام ترمذیؒ کا مکمل نقد یوں ہے: **قال: هذا حديث حسن، لا يعرف الا من حديث مسلمة بن وردان.** امام میرکؒ بحوالہ "**التصحيح**" فرماتے ہیں: مسلمہ متکلم فیہ راوی ہیں، لیکن امام ترمذیؒ نے ان کی احادیث کو حسن قرار دیا ہے۔ اس حدیث کے کئی شواہد ہیں۔ اھ۔ قصہ مختصر یہ حدیث "حسن لذاتہ" ہے یا "حسن لغیرہ" ہے۔ صاحب شرح السنہ نے بھی اس حدیث کو "حسن" قرار دیا ہے۔

مصابیح میں لکھتے ہیں: یہ حدیث اسناد کے اعتبار سے غریب ہے۔ بایں ہمہ حسن کے منافی نہیں۔ جیسا کہ ہم ماقبل میں یہ بات بتا چکے ہیں۔

زیادہ جنت ودوزخ میں لے جانے والی اشیاء

۴۸۳۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَتَدْرُوْنَ مَا اَكْثَرُ مَا یُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّةَ تَقْوَی اللّٰهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ اَتَدْرُوْنَ مَا اَكْثَرُ مَا یُدْخِلُ النَّاسَ النَّارَ الْاَجْوَفَانِ الْفَمُ وَالْفَرْجُ۔

(رواه الترمذي وابن ماجة)

أخرجه الترمذي في السنن ٢٨٤/٤ الحديث رقم ٢٣١٩ و ابن ماجه في ١٣١٢/٢ الحديث رقم ٣٩٦٩ و

مالك في الموطأ ٢/٩٨٥ الحديث رقم ٥من كتاب الكلام ، والبغوي في شرح السنة ٣١٤/١٤ الحديث رقم؛٢١٢٤ واحمد في المسند ٤٦٩/٣۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ لوگوں کو کونسی چیز جنت میں زیادہ لے جائے گی؟ ① اللہ تعالیٰ کا خوف۔ ② اچھا اخلاق، اور کیا تم جانتے ہو کہ کون سی چیز لوگوں کو زیادہ دوزخ میں لے جائے گی؟ ① منہ۔ ② شرمگاہ۔ جو کہ دونوں خالی چیزیں ہیں۔ (ترمذی وابن ماجہ)

تشریح: قوله: تقوى الله:

تقویٰ کا سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ شرک سے اجتناب کیا جائے۔ اور سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ دل میں اللہ کے علاوہ اور کسی کا خیال نہ آئے۔

قوله: حسن الخلق : حسن خلق سے مراد مخلوق خدا کے ساتھ خوش خلقی اختیار کرنا ہے، جس کا سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کسی مخلوق کو کوئی تکلیف وایذاء نہ پہنچائی جائے۔ اور سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان اس شخص کے ساتھ بھی بھلائی کرے جس نے اس کے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔

طیبیؒ یہ کہتے ہیں، کہ تقویٰ کے ذریعے تو اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ خالق کے ساتھ حسن معاملہ کرے بایں طور کہ ہر اس چیز سے اجتناب کرے جس سے اس نے منع کیا ہے۔ اور ہر اس چیز پر عمل کرے جس کا اس نے حکم دیا ہے۔ اور حسن خلق کے ذریعے اس طرف اشاہ کیا گیا ہے کہ مخلوق خدا کے ساتھ حسن معاملہ کرے، یعنی خوش خلقی اختیار کرے یہ دونوں خصلتیں دخول جنت کا سبب ہیں، اور اس کے برعکس دونوں خصلتیں دخول جہنم کا باعث ہیں۔ منہ اور شرمگاہ کا ذکر ماقبل مذکور دو خصلتوں کے مد مقابل کے طور پر۔ منہ (کے حکم) میں زبان بھی داخل ہے اور امور دینیہ کی حفاظت بھی شامل ہے۔ اور حلال کھانا یہ تقویٰ کی چوٹی ہے۔ اور شرم گاہ کی حفاظت، دین کے اعلیٰ مراتب میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿**والذين هم لفروجهم حافظون**﴾ [المؤمنون۔٥]

اور جو شخص زنا کو چھوڑ دے اللہ کے خوف سے، باوجود قدرت، ارتفاع موانع اور اور تیسری اسباب کے خصوصاً جب کہ شہوت بھی واقعۃً ہو تو یہ آدمی صدیقین کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى﴾ [النازعات: ٤٠] اور مامون الرشید کا اپنی بیوی زبیدہ کو طلاق دے کر امام ابی یوسف کی طرف مراجعت کرنے کا قصہ تو مشہور ہے۔

دونوں جملوں میں کثرت کا مفہوم یہ ہے کہ آخرت کی حقیقی سعادت وکامیابی کے زیادہ اسباب ان دونوں خصلتوں (تقوی اور حسن خلق) کو جمع کرنے میں ہیں۔ اور آخرت کی سرمدی شقاوت (منہ اور شرم گاہ) کے زیادہ تر اسباب ان دونوں خصلتوں کو جمع کرنے میں ہیں۔

ایک برا کلمہ ناراضگی کا باعث بن گیا

۴۸۳۴: وَعَنْ بِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنَ الْخَيْرِ مَا يَعْلَمُ مَبْلَغَهَا يَكْتُبُ اللّٰهُ لَهُ بِهَا رِضْوَانَهُ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَاهُ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنَ الشَّرِّ مَا يَعْلَمُ مَبْلَغَهَا يَكْتُبُ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْهِ سَخَطَهُ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَاهُ۔

(رواه فی شرح السنة وروی مالك والترمذی وابن ماجة نحوه)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٥/٢٦٥ الحديث رقم ٤٩٩٠، والترمذی فی ٤/٤٨٣ الحديث رقم ٢٣١٥ والدارمی فی ٢/٣٨٢ الحديث رقم ٢٧٠٢، واحمد فی المسند ٥/٥۔

ترجمہ: حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص اچھا کلمہ کہہ دیتا ہے حالانکہ اسے اس کا انجام معلوم نہیں اس کے بدلے اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنی رضا کو یوم لقاء تک کے لئے لکھ دیتا ہے اور کوئی آدمی برا کلمہ زبان سے نکالتا ہے جب کہ اسے اس کا انجام معلوم نہیں مگر اسکی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے لئے ملاقات کے دن تک ناراضگی لکھ دیتا ہے۔ شرح السنہ، امام مالک اور ترمذی، ابن ماجہ نے اس کے ہم معنی روایت کی ہے۔

تشریح: من الخیر: "من" بیانیہ ہے۔

ما یعلم مبلغها: جملہ حالیہ ہے۔ معنی کے اعتبار سے تقدیری عبارت یوں ہے: **والحال انه یظن انها یسیرة قلیلة وهی عند الله عظیمة جلیلة۔**

رضوانه: مصدر کی اضافت اپنے مفعول کی طرف ہے۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اضافت المصدر الی الفاعل ہے۔ اس کا قرینہ حدیث کا اگلا جملہ ہے۔

الی یوم: اکثر نسخوں میں "یوم" مکسور ہے۔ بعض نسخوں میں "یوم" مبنی علی الفتح ہے۔ اور بعض نسخوں میں "یوم" مکسور ومنون ہے۔

یلقاه: میں موجود ضمیروں کے مرجع میں متعدد احتمالات ہیں:

① ضمیر مفعول "یوم" کی طرف راجع ہے۔ اور ضمیر مستتر "رجل" کی طرف راجع ہے۔
② ضمیر مفعول "رجل" کی طرف عائد ہے اور ضمیر مستتر "یوم" کی طرف راجع ہے۔
③ ضمیر مفعول "اللہ" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور ضمیر مستتر "رجل" کی طرف لوٹ رہی ہے۔
④ ضمیر مفعول کا مرجع "رجل" ہے اور ضمیر مستتر کا مرجع لفظ جلالہ ہے۔

قوله: وان الرجل لیتکلم بالکلمة من الشر ما یعلم۔۔۔ الخ:

امام سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں: اس حدیث میں "کلمہ" سے مراد وہ کلمہ ہے جو سلطان کے ہاں بولا جائے۔ سلطان کے ہاں اگر کسی مظلوم کی دادرسی کیلئے آواز بلند کی جائے، تو یہ (کلمہ خیر) خدا کی خوشنودی کا باعث ہے۔ اور سلطان کے ہاں اگر کسی

شخص پر ناحق ظلم ڈھانے کیلئے آواز بلند کی جائے تو یہ (کلمہ شر) خدا کی ناراضگی کا باعث ہے۔
ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں: اس جملہ کی اس تفسیر میں مجھے کسی اختلاف کا علم نہیں ہے۔ (نقلہ السیوطی)

یکتب اللّٰہ "لہ بھا یوم یلقاہ" کی قید کا فائدہ:

"امام طیبیؒ فرماتے ہیں' اگر تو یہ کہے کہ " یکتب اللہ بھا رضوانہ" کا کیا مطلب ہے؟ اور "الی یوم یلقاہ" کی توقیت کا کیا فائدہ ہے تو میں کہتا ہوں۔

اپنی خوشنودی کو ثابت کر دیتا ہے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ایسی باتوں کی توفیق دیتا ہے جو رضا الٰہی کا موجب ہیں 'اس کو برزخ میں قبر کے عذاب سے محفوظ رکھتا ہے' اس کی قبر کو کشادہ کر دیا جاتا ہے اور اس سے کہہ دیا جاتا ہے اس طرح سو رہو جیسے دولہا سوتا ہے پھر وہ قیامت کے دن نیک بختی وسعادت کے ساتھ اٹھے گا' اس پر حق تعالیٰ کی رحمت کا سایہ ہوگا جنت میں داخل کیا جائے گا اور وہاں کی نعمتیں اس کا نصیب بنیں گی اور اللہ کی ملاقات کی سعادت سے سرفراز ہوگا! اسی طرح جس شخص کے حق میں اللہ تعالیٰ اپنی خفگی قائم کر دے اس کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوگا۔ اس جملہ کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے جو ابلیس کے بارے میں ہے: ﴿ان علیك لعنتی الی یوم الدین﴾ [ص۔۷۸] (یعنی حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ اس دن تک کیلئے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے تو اس توقیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا یا اس کی خفگی بس اسی دن تک محدود رہے گی۔ اس کے بعد منقطع ہو جائے گی! اس کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے حق میں نازل فرمائی [وَاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ] ظاہر ہے آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ابلیس لعین' اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مورد صرف قیامت کے دن تک ہی ہے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ تک اللہ تعالیٰ کی لعنت میں گرفتار رہے گا اسی طرح حدیث میں مذکورہ لوگوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی یا خفگی کا تعلق موت کے دن کے بعد بھی ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔)

تخریج: الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام مالک، احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم نے بلال بن حارثؓ سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً نقل کیا ہے:

"ان الرجل لیتکلم بالکلمة من رضوان اللّٰہ تعالٰی ما یظن ان تبلغ ما بلغت، فیکتب اللّٰہ له بھا رضوانه یوم القیامة، وان الرجل لیتکلم بالکلمة من سخط اللّٰہ ما یظن ان تبلغ ما بلغت، فیکتب اللّٰہ علیه بھا سخطه الی یوم القیامة.

"الاحیاء" میں مذکور ہے کہ علقمہ فرماتے تھے: "کتنی ہی ایسی باتیں ہیں کہ ان سے مجھے بلال بن حارثؓ کی حدیث نے روکا"۔

دوسروں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولنے والا

۴۸۳۵: وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيْلٌ لِّمَنْ يُحَدِّثُ فَيَكْذِبُ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ وَيْلٌ لَّهٗ وَيْلٌ لَّهٗ۔ (رواه احمد والترمذی وابوداؤد والدارمی)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٤/ ٢١٣ الحديث رقم ٤٨٣٢۔

ترجمہ: بہز بن حکیم اپنے والد سے اور وہ بہز کے دادا سے روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص انسانوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولے اس کے لئے تباہی ہے' تباہی ہے' تباہی ہے۔ (احمد' ترمذی' ابوداؤد' دارمی)

تشریح: ویل: اس کی دو تفسیریں کی ہیں: ا: عظیم ہلاکت۔ ۲: دوزخ کی ایک گہری وادی کا نام ہے۔

"لیضحك": از باب افعال ہے۔ "به": میں باء سببیہ ہے۔ "القوم": منصوب ہے مفعول ثانی ہے۔ تمام نسخوں میں عبارت یوں ہی ہے۔ البتہ "لیضحك" کو مجرد سے پڑھنا اور "القوم" کو اس کا فاعل بنانا بھی درست ہے۔

قوله: وَيْلٌ لِمَنْ يُحَدِّثُ فَيَكْذِبُ: لفظ "فَيَكْذِبُ" (جھوٹ بولنے) کی قید سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے ہم جلیسوں اور یار دوستوں کو خوش کرنے اور ان کو ہنسانے کے لئے ایسی بات کہے جو سچی ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مثلاً جیسا کہ حضرت عمرؓ نے اس موقع پر کیا تھا کہ جب نبی کریم ﷺ بعض امہات المؤمنین سے ناراض تھے

امام غزالیؒ فرماتے ہیں: اور اس صورت میں بھی ضروری ہے کہ یہ مزاح' رسول اللہؐ کی عادت مبارکہ والے مزاح کی طرح ہو (جو بات از راہ مزاح کہی جا رہی ہو اس میں یہ تمام پہلو موجود ہوں:) ■ وہ بات حق ہی ہو۔ ■ کسی کے دل کو ٹھیس پہنچانے والی نہ ہو۔ (۳) اس میں افراط نہ کرلے۔ (اس کو اپنی عادت نہ بنائے) پس اے سامع اگر تو اس کو کبھی کبھار ہی اختیار کرے' شاذ و نادر کرے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ لیکن یہ عظیم غلطی ہے کہ انسان مزاح کو بطور پیشہ اختیار کرے اور پھر اس پر حضور ﷺ کے فعل سے استدلال کرے۔

قوله: ويل له' ويل له

آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشاد گرامی کے آخر میں مذکورہ لفظ کو مکرر ارشاد فرمایا۔ اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں:

① اس تکرار سے تاکید مقصود تھی۔

② پہلے "ویل" کا تعلق "برزخ" سے ہے، دوسرے "ویل" کا تعلق "موقف" سے ہے، اور تیسرے "ویل" کا تعلق "نار" سے ہے۔

تخریج: اس حدیث کو نسائی اور حاکم نے بھی ذکر کیا ہے۔

آسمان و زمین کے فاصلہ سے نیچے گرنے والا

۴۸۳۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَقُوْلُ الْكَلِمَةَ لَا يَقُوْلُهَا اِلَّا لِيُضْحِكَ بِهِ النَّاسَ يَهْوِیْ بِهَا اَبْعَدَ مِمَّا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَيَزِلُّ عَنْ لِسَانِهٖ اَشَدَّ مِمَّا يَزِلُّ عَنْ قَدَمِهٖ۔ (رواه البيهقي في شعب الايمان)

أخرجه الترمذي في السنن ٤/ ٥٦٩ الحديث رقم ٢٥٠١، والدارمي في ٢/ ٣٨٧ الحديث رقم ٢٧١٣، والبيهقي في شعب الايمان ٤/ ٢٥٤ الحديث رقم ٤٩٨٣، واحمد في المسند ٢/ ١٧٧۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی شخص اس لئے بات کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو ہنسائے تو اس کی وجہ سے آسمان وزمین کے فاصلہ سے زیادہ نیچے گر جاتا ہے اور قدم کے پھسلنے سے زیادہ زبان سے پھسل جاتا ہے۔ (بیہقی، شعب الایمان)

تشریح: قوله: ان العبد ليقول الكلمة۔۔۔۔ ممابين السماء ولارض:

بها: میں باء سببیہ ہے۔

قوله: ليزل عن لسانه أشد مما يزل عن قدمه:

یعنی اگر کوئی شخص اپنے پاؤں کے پھسلنے سے منہ کے بل گر پڑے اور ضرر اٹھائے تو یہ اتنا سخت نہیں جتنا سخت وہ ضرر ہے جو زبان کے پھسلنے کی وجہ سے اٹھانا پڑتا ہے کیونکہ پاؤں کی لغزش بدن کو ضرر پہنچاتی ہے اور زبان کی لغزش دین کے نقصان میں مبتلا کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ جسمانی ضرر دینی نقصان سے ہلکا ہوتا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **وانه ليزل عنه لسانه**، یہ یکے بعد دیگرے تمثیلات ہیں۔

تخریج: امام میرکؒ "**التصحيح**" سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام احمدؒ نے اپنی مسند میں مکحول عن ابی ہریرہ سے نقل کیا ہے۔ اور صاحب المصابیح نے شرح السنہ میں یہی الفاظ یحییٰ بن ابی عبید عن ابیہ عن ابی ہریرۃ کے روایت کئے ہیں۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: الجامع الصغیر میں یہ الفاظ آئے ہیں:

"**ان العبد ليتكلم با لكلمة ما يتبين فيها يزل بها في النار ابعد ما بين المشرق والمغرب**"۔

اس حدیث کو احمد اور شیخین نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

ترمذیؒ کی ایک روایت میں اور ابن ماجہ اور حاکم کی روایت میں ان سے یہ الفاظ آئے ہیں:

"**ان الرجل ليتكلم بالكلمة لا يرى بها باسا يهوى بها سبعين خريفا في النار**"۔

امام احمد کی ابوسعید سے مروی ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

"**ان الرجل ليتكلم بالكلمة لا يريد بها بأسا ليضحك بها القوم وانه ليقع بها أبعد من السماء**"۔

خاموش نجات پا گیا

۴۸۳۷: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَمَتَ نَجَا۔

(رواه احمد والترمذی والدارمی والبیهقی فی شعب الایمان)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٢٣ الحديث رقم ٢٤٠٦، واحمد فی المسند ٥/٢٥٩۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خاموش رہنے والا نجات پا گیا۔

(احمد، ترمذی، دارمی، بیہقی)

تشریح: امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''صمت'' کا لفظ'' سکوت'' سے ابلغ ہے۔''صمت'' کی نسبت ہر چیز کی طرف درست ہے، خواہ اس میں قوت گویائی ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ جس میں قوت گویائی نہ ہو اس کو'صامت' اور''مصمت'' کہا جاتا ہے۔ اور سکوت کی نسبت ایسی ذات کی طرف ہوتی ہے جس میں قوت گویائی تو ہو لیکن فی الوقت گویا نہ ہو۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ''فصل الخطاب''،'' جوامع الکلم'' اور'' جواہر الحکم'' کا بہت واضح مصداق ہے۔ اس ارشاد گرامی میں معانی کے پوشیدہ سمندروں کی معرفت خاص خاص علماء کے علاوہ کسی کو بھی حاصل نہیں۔ زبان کے خطرات بہت زیادہ ہیں۔ اور ہر ہر خطرہ اتنا بڑا ہے، کہ کیا کہیئے۔ اس کی آفات ان گنت ہیں۔ (ان میں چند یہ ہیں:) خطا، کذب، نمیمہ، غیبت، ریاء، شہرت، نفاق، فحش گوئی، جدال، تزکیہ نفس اور باطل میں انہماک۔

انسان اپنی زبان سے جو بات نکالتا ہے اس کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔ ۱ محض نقصان، ۲ محض نفع، ۳ جس میں نفع بھی ہو اور نقصان بھی ہو ۴ وہ بات جس میں نہ نفع ہو اور نہ نقصان

قسم اول (یعنی ضرر محض) تو ایسی باتوں سے تو خاموشی ہی ضروری ہے۔ اور قسم ثالث یعنی جس میں نفع وضرر دونوں ہیں تو اس سے بھی خاموشی ہی اختیار کرنا چاہئے (کیونکہ نقصان سے بچنا فائدہ حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہوتا ہے) اور قسم رابع یعنی وہ کلام کہ جس میں نہ نفع ہو نہ نقصان تو ظاہر ہے کہ یہ فضول ہے اس میں زبان کو مشغول کرنا محض وقت ضائع کرنا ہے اور یہ خالص نقصان ہے رہی دوسری قسم یعنی وہ کلام کہ جس میں نفع ہی نفع ہو تو (اگرچہ ایسی بات وکلام میں زبان کو مشغول کرنا برائی کی بات نہیں ہے لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ) اس میں بھی ابتلائے آفت کا خطرہ ضرور ہوتا ہے بایں طور کہ ایسے کلام میں بسا اوقات دقیق قسم کے گناہ کی آمیزش ہو جاتی ہے' مثلاً ریاء وتصنع' غیبت' تزکیہ نفس اور فضول باتوں کی آمیزش ہو جاتی ہے اور اس صورت میں یہ تمیز کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ کہاں لغزش ہوگئی ہے۔ اھ۔

اس کا حاصل یہ کہ ہر زبان کی آفتیں ان گنت ہیں اس سے خلاصی خاموشی ہی میں ہے۔ کسی نے کہا ہے:

اللسان جرمه صغير وجرمه كبير وكثير۔

''زبان کا جثہ چھوٹا ہے' اور اس کے جرم بڑے اور زیادہ ہیں''۔

حصولِ نجات کی تین راہیں

۴۸۳۸: **وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ لَقِيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ مَا النَّجَاةُ فَقَالَ اَمْلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ وَابْكِ عَلٰى خَطِيْئَتِكَ۔** (رواه احمد والترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٢٣ الحديث رقم ٢٤٠٧، واحمد فی المسند ٣/٩٦۔

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے سوال کیا نجات کیسے میسر ہو سکتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ① اپنی زبان کو قابو میں رکھو، ② اپنے گھر کو لازم پکڑو، ③ اپنے گناہوں پر رویا کرو۔ (احمد' ترمذی)

تشریح: قوله: املك عليك لسانك:

مذکورہ عبارت کے سلسلے میں نسخوں کا اختلاف ہے۔ چنانچہ مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں۔

تصحیح شدہ نسخوں، اصول معتمدہ کی تصریح کے مطابق "املك" از باب افعال، فعل امر واحد مذکر کا صیغہ ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: أملكه الشيء اياه تمليكا:

■ احفظ لسانك عما ليس فيه خير. (کما قالہ شارح)

■ أمسك لسانك حافظا عليك امورك، مراعيا لأحوالك، چنانچہ اس میں ایک قسم کی تضمین ہے۔

■ لا تجره الا بما يكون لك لا عليك. اھ (النہایہ اس کا حاصل معنی ہونا مخفی نہیں۔)

میرک شاہ اپنی کتاب کے حاشیہ میں فرماتے ہیں: بظاہر ثلاثی مجرد سے ہے اور فعل متعدی ہے۔ لیکن "اصل"۔ میں صیغۂ مزید کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔ مگر یہ ضبط واضح نہیں ہے۔ تامل۔ میں (ملاعلی قاری) کہتا ہوں ممکن ہے کہ زیادت (یعنی مزید فیہ سے لانا) تعدیہ میں مبالغہ کی زیادتی کے لئے ہو۔ اھ۔ از باب ضرب فعل امر واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: ملكه يملكه ملكا مثلثة، احتواه قادرا على الا ستبداد به' و أملكه الشيء و ملكه اياه تمليكا بمعنى.

■ ایک شارح لکھتے ہیں: ای: اجعل لسانك مملوكا لك فيما عليك وباله وتبعته، فأمسكه عما يضرك واطلقه فيما ينفعك. اھ یہ معنی "املک" کو از ثلاثی مجرد ماننے کی تقدیر پر ہے۔

اس جملہ کے معنی ایک شارح نے یہ لکھے ہیں کہ اپنی زبان کو ایسی چیزوں اور باتوں سے صاف رکھو جن میں خیر و بھلائی نہیں ہے۔ لیکن اس جملہ کے زیادہ صحیح معنی یہ ہیں کہ اپنی زبان کو بند رکھو کہ گویا تم اپنے تئیں اپنے امور کی نگہداشت رکھتے ہو۔ یعنی اپنے دین کے معاملہ میں محتاط اور پرہیز گار رہو اور اپنے حالات (کوائف پر متوجہ رہو ظاہر ہے کہ جب تم اپنے معاملات میں محتاط پرہیز گار رہو گے اور اپنے احوال و کوائف پر متوجہ رہ کر اپنی برائیوں اور بھلائیوں پر نظر رکھو گے تو راہ نجات تمہارے سامنے ہوگی۔

قوله: وليسعك بيتك: "يسعك": لام کے کسرہ کے ساتھ اور ساکن پڑھنا بھی درست ہے۔ اپنے گھر سے اسی وقت باہر نکلو جب نکلنے کی ضرورت پیش آئے اور اس یکسوئی و گوشہ نشینی کی وجہ سے دل برداشتہ نہ ہو بلکہ اس کو غنیمت جانو کیونکہ یہ چیز بہت سے فتنہ و فساد اور برائیوں سے نجات پانے کا ذریعہ ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے: هذا زمان السكوت وملازمة البيوت والقناعة بالقوت الى ان تموت

طیبیؒ کہتے ہیں کہ: ليسعك بيتك میں حکم کا ظاہر مورد تو گھر ہے لیکن حقیقت میں اس حکم کا مورد مخاطب ہے گویا اس ارشاد کے ذریعہ مخاطب کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے گھر میں یکسوئی اور گوشہ نشینی اختیار کر کے مولیٰ کی عبادت میں مشغول رہو۔

قوله: وابك على خطيئتك: اپنے گناہوں پر روؤ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی سابقہ خطاؤں پر نادم ہو کر طلب مغفرت کے لئے خدا کے حضور روؤ گڑگڑاؤ اور اگر رونا نہ آئے تو کم سے کم رونے کی صورت بنالو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: بکی میں صنعت تضمین ہے۔ "بکی" ندامت کے معنی کو متضمن ہونے کی وجہ سے "علی" حرف جر کے واسطے سے متعدی ہے، لہٰذا معنی یہ ہوں گے: اندم على خطيئتك باكيا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ کا یہ جواب حکیمانہ اسلوب کے مطابق ہے، بایں طور کہ سائل کا سوال نجات کی حقیقت کے بارے میں تھا۔ لیکن جواب میں حقیقت سے اعراض کرتے ہوئے سبب کی طرف نشاندہی فرمائی۔ چونکہ اس کے سبب کا جاننا، حقیقت جاننے کے مقابلے میں اہم اور اعلیٰ ہے۔ سوال کا جواب تو بظاہر یہ بنتا تھا: **حفظ اللسان**۔ لیکن مزید تقریر واہتمام کے باعث جواب کا اسلوب تبدیل فرمادیا۔ اھ۔ ملا علی قاریؒ نے امام طیبیؒ کی بیان کردہ اس تشریح پر نقد کیا ہے اور اس کو تکلف وتعسف قرار دیا ہے۔

تخریج: ابن قانع اور طبرانی نے حارث بن ہشام کے واسطے سے حدیث بالا کا صرف ابتدائی حصہ: ''**املك عليك لسانك**'' نقل کیا ہے۔

اعضاء کی زبان سے ہر روز فریاد

۴۸۳۹: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ رَفَعَهٗ قَالَ اِذَا اَصْبَحَ ابْنُ اٰدَمَ فَاِنَّ الْاَعْضَاءَ كُلَّهَا تُكَفِّرُ اللِّسَانَ فَتَقُوْلُ اتَّقِ اللّٰهَ فِيْنَا فَاِنَّا نَحْنُ بِكَ فَاِنِ اسْتَقَمْتَ اِسْتَقَمْنَا وَاِنِ اعْوَجَجْتَ اِعْوَجَجْنَا۔ (رواه الترمذي)

أخرجه مالك في الموطأ ٢/ ٩٠٣ الحديث رقم ٣ من كتاب حسن الخلق، واحمد في المسند ١/ ٢١١۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت ہے کہ انسان جب صبح کرتا ہے تو جسم کے تمام اعضاء زبان کو عاجزانہ طور پر کہتے ہیں کہ ہمارے متعلق اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہم تیرے ساتھ ہیں اگر تو سیدھی رہی تو ہم سیدھے اگر تو ٹیڑھی ہوگی تو ہم بھی ٹیڑھے ہوجائیں گے۔ (ترمذی)

وقت کی تخصیص کی وجہ:

صبح کے وقت کے بارے میں مشہور ہے: **الصباح مفتاح باب النجاح**، زبان کی ساری آفات معاشرت اخوان کے ساتھ بندھی ہوئی ہیں، اور یہ نوبت دیگر اوقات کے مقابلہ میں دن کے وقت زیادہ پیش آتی ہے۔

قوله: فان الاعضاء كلها تكفر اللسان:

اعضاء سے کون سے اعضاء مراد ہیں؟

1. صرف وہ اعضاء مراد ہیں جن میں عصیان کی صلاحیت ہوتی ہے۔
2. مطلق اعضاء مراد ہیں، چونکہ انسان کی حرکات وسکنات کا تعلق فی الجملہ تمام اعضاء سے ہوتا ہے۔ اس کی تاکید ''کلھا'' کے لفظ سے بھی ہوتی ہے۔

لفظ تکفّر:

فائے مشددہ مکسورہ کے ساتھ 'ای **تتذلل وتتواضع**۔

صاحب النہایہ فرماتے ہیں: ''تکفیر'' (از باب تفعیل ہے) عاجزی وانکساری اختیار کرنا۔ کہ انسان جھک جائے' اور

اپنے سر کو رکوع کے لئے جھکانے کے قریب کرے، جس طرح کہ کوئی کسی کی تعظیم کے لئے کرتا ہے۔ حدیث باب مذکورہ بالا عرب کے اس قول کے قبیل سے ہے: کفر الیھودی. اذا خضع مطا طأراسه وانحنی لتعظیم صاحبه۔ (کذا قالہ شارح)

قوله: فانما نحن بك:

(جار مجرور کا تعلق محذوف سے ہے۔) ای نتعلق ونستقیم ونعوج بك۔ قوله: فان استقمت استقمنا:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں حدیثوں کے درمیان تطبیق کیا صورت ہے:

''جسم میں گوشت کا لوتھڑا ہے (جس کو دل کہا جاتا ہے) اگر وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو سارا جسم بگڑ گیا''۔

تعارض:

① انما نحن بك، فان استقمت استقمنا، وان اعوججت اعوججنا.

② ان فی الجسد لمضغة اذاصلحت صلح الجسد کله، واذا فسدت فسد الجسد کله ألا وهی القلب.

تشریح تعارض:

پہلی حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بناؤ اور بگاڑ میں اصل زبان ہے۔ جب کہ دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صلاح وفساد میں اصل کردار ''دل'' کا ہے۔ لہٰذا اصل ذمہ دار زبان ہے یا کہ دل؟

دفع تعارض:

میں (امام طیبیؒ) کہتا ہوں: زبان دل کا ترجمان ہے۔ اور اعضاء ظاہرہ میں دل کا خلیفہ بھی ہے۔ لہٰذا زبان کی طرف کسی فعل وامر کا اسناد مجازاً ہوگا۔ مثلاً یوں کہا جاتا ہے: شفی الطبیب المریض. میدانی ''المرء باصغریه'' (آدمی کی وقعت دو چھوٹی چھوٹی چیزوں یعنی دل وزبان سے وابستہ ہے) کی وضاحت میں فرماتے ہیں، کہ ''اصغرین'' سے مراد دل وزبان ہیں۔ یعنی انسان کے معانی کا قیام وتکمیل ان ہی دو چیزوں کے ذریعے ہوتا ہے۔

زہیر کہتا ہے:

وکأن تری من صامت لك معجب
زیادته او نقصه فی التکلم
لسان الفتی نصف ونصف فواده
فلم یبق الا صورة اللحم والدم

یہ بات مخفی نہ رہے کہ یوں تو سارے اعضاء کی صلاح وفساد کا دار ومدار دل پر ہے کہ اگر دل درست ہے تو تمام اعضاء اھ۔ بھی درست رہتے ہیں اور اگر دل فاسد ہو جائے تو سارے اعضاء بھی فاسد ہو جاتے ہیں: چونکہ دل اخلاق

کریمہ کی معدن ہے، جس طرح کہ یہ احوال ذمیمہ کا منبع ہے۔ اس کی نظیر وہ بادشاہ ہے کہ جس کی اطاعت کی جاتی ہے اور تبع رئیس کی ہے۔ چونکہ جس متبوع درست ہو جاتا ہے تو تابع بھی درست ہوتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ (گویا زبان ہی سارے اعضاء جسم کی سردار ہے اس اعتبار سے کہ حقیقت میں "دل" ہی جسم کا بادشاہ ہے مگر دل کا ترجمان اور خلیفہ زبان ہی ہے کہ دل جو کچھ سوچتا ہے زبان اس کو بیان کرتی ہے اور دیگر اعضاء جسم اس پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا جو حکم دل کا ہے وہی زبان کا ہے کہ جس طرح دل کے صالح و فاسد ہونے کا اثر سارے اعضاء جسم پر پڑتا ہے اس طرح زبان کا بناؤ بگاڑ بھی تمام اعضائے جسم کو بناتا اور بگاڑتا ہے۔)

تخریج: اس حدیث کو ابن خزیمہ اور بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔

اسلام کی خوبی

۴۸۴۰: وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَالَا يَعْنِيْهِ۔ (رواه مالك واحمد)

أخرجه ابن ماجه في السنن ٢/١٣١٥ الحديث رقم ٣٩٧٦۔

ترجمہ: حضرت علی بن حسینؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بندے کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی کام کو ترک کر دے۔ (مالک، احمد)

تشریح: قوله: من حسن اسلام المرتر كه مالا يعنيه:

بظاہر یہ حدیث، کلام باری تعالیٰ کی اس آیت کریمہ: ﴿**والذين هم عن اللغو معرضون**﴾ [المؤمنون:۳] سے اقتباس ہے۔

من حسن اسلام المرء:

بعض کا کہنا ہے کہ "مِن" تبعیضیہ ہے۔ اس صورت میں عبارت کی معنوی تقدیر یہ ہوگی: **من جملة محاسن اسلام الشخص و كمال ايمانه.**

اور "من" بیانیہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں عبارت کی معنوی تقدیر یوں ہوگی: **ان تر كه ما لا يعنيه هو حسن اسلام المرء و كما له فيه.** اور خبر کی تقدیم ترکیبی اعتبار سے یہ حدیث "**على التمرة مثلها زيدا**" کے قبیل سے ہے۔

تر كه مالا يعنه: کا مطلب:

"**ما لا يعنيه**" کی حقیقت:

"**ما لا يعنيه**" کی حدود:

امام غزالیؒ نے کہا ہے کہ "لایعنی" کا آخری درجہ یہ ہے کہ تم کوئی ایسی بات اپنی زبان سے نکالو کہ جس کو اپنی زبان سے نہ نکالتے تو گنہگار نہ ہوتے اور اس کی وجہ سے نہ تو تمہیں فوری طور پر کوئی نقصان پہنچتا اور نہ مآل کے اعتبار سے۔ اس کی مثال یہ

ہے کہ (فرض کرو) تم کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہو۔تم نے ان کے سامنے اپنے کسی سفر کے احوال بیان کئے اس بیان احوال کے دوران تم نے ہر اس چیز کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جو تم نے اپنے سفر کے دوران دیکھی تھی مثلاً پہاڑ عمارت وغیرہ یا جو کچھ واقعات وحادثات پیش آئے تھے ان کے بارے میں تم نے جو یہ ساری تفصیل بیان کی اور جن امور کا ذکر کیا وہ یقیناً ایسی چیزیں ہیں کہ اگر تم ان کو بیان نہ کرتے تو نہ گنہگار ہوتے اور نہ تمہیں کوئی نقصان وضرر برداشت کرنا پڑتا (جب کہ اس لمبی چوڑی تفصیل بیان کرنے کی صورت میں بہت ممکن ہے کہ کسی موقع پر تمہاری زبان نے لغزش کھائی ہو اور اس سے کوئی ایسی بات نکل گئی ہو جس سے تم گنہگار بن گئے ہو۔)

محدثین کی نگاہ میں اس حدیث کا مقام:

امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث ان احادیث میں سے ہے، جن پر اسلام کا مدار ہے۔

امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں: وہ (مدار اسلام والی احادیث) چار ہیں:

پہلی حدیث نعمان بن بشیر کی یہ حدیث ہے: **الحلال بين' والحرام بين وبينهما مشتبهات لا يعلمهن.**

دوسری حدیث یہ ہے: **من حسن اسلام المرء تركه ما لا يعنيه.**

تیسری حدیث یہ ہے: **لا يكون المؤمن مؤمنا حتى يحب لأخيه ما يحب لنفسه.**

چوتھی حدیث یہ ہے: **الأعمال بالنيات.**

اور بعض نے کہا ہے کہ تیسری حدیث یہ ہے: **ازهد في الدنيا يحبك الله . وازهد فيما في ايدى الناس يحبك الناس۔**

اس مفہوم کو امام شافعیؒ نے ان اشعار میں بیان کیا ہے:

عمدة الخير عندنا كلمات
اربع قالهن خير البرية
اتق الشبهات وازهد ودع ما
ليس يعينك واعملن بنية

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں: ان چاروں کا مدار بھی صحیح نیت پر ہے، پہلے عمل بالنیت ہے، اس کے نتیجہ میں آدمی شبہات سے بچتا ہے، اور **ترك ما لا يعنيه** پر گامزن ہوتا ہے۔ پھر اس پر زہد کا ترتب ہوتا ہے۔

بزرگوں کے بعض واقعات:

- امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں: عمر بن عبدالعزیزؒ نے ہماری طرف خط لکھا: **أما بعد! فان من أكثر ذكر الموت رضي من الدنيا باليسير، ومن عد كلامه من عمله قل كلامه فيما لا يعنيه.**
- بعض کا کہنا ہے کہ ربیع بن خثیم نے بیس سال تک کوئی دنیاوی کلام نہیں کیا، جب صبح ہوتی تو ایک کورا کاغذ اور قلم رکھ لیتے،

جب بھی جو بات زبان سے نکالتے اس کاغذ پر لکھ لیتے، اور پھر شام کے وقت اپنے نفس کا محاسبہ فرماتے۔

کسی عارف باللہ کے بارے میں مروی ہے، کہ ان کا گزر کسی تیار کمرہ کے پاس سے ہوا تو پوچھ بیٹھے کہ یہ کب سے بنا ہوا ہے؟ یہ کہہ کر وہ اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوئے، اور کہا: یا نفسی المغرورۃ تسألین عما لا یعینک. اے میرے فریب خوردہ نفس! تو ایسی چیز کے بارے میں پوچھتا ہے، کہ جس سے تجھے کوئی سروکار نہیں؟ چنانچہ اس کلام کے بدلہ میں ایک سال تک روزے رکھتے رہے۔ اھ۔

اللہ کی یاد سے خالی لمحہ کا بیان:

ایک حدیث شریف میں آتا ہے: لیس یتحسر اهل الجنة الا علی ساعة مرت بهم ولم یذکروا اللہ فیها اس حدیث کو امام طبرانی نے حضرت معاذؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ چنانچہ خوش قسمت ہے وہ آدمی کہ جس نے اپنا محاسبہ ہونے سے پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کر لیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ [الحشر: ۱۸-۱۹]

''اے ایمان والو! خدا سے ڈرتے رہو اور ہر شخص کو دیکھنا چاہیئے کہ اس نے کل (یعنی فردائے قیامت) کیلئے کیا (سامان) بھیجا ہے اور ہم پھر کہتے ہیں کہ خدا ہی سے ڈرتے رہو۔ بیشک خدا تمہارے سب اعمال سے خبردار ہے اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے ایسا کر دیا کہ خود اپنے تئیں بھول گئے یہ بدکردار لوگ ہیں۔''

۴۸۴۱ : وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ عَنْهُمَا۔

أخرجه الترمذي في السنن ٤/ ٢٨٣ الحديث رقم ٢٣١٧ و ٢٣١٨ والبيهقي في شعب الايمان ٤/ ٢٥٥ الحديث رقم ٤٩٨٧ و ٤٩٨٦۔

ترجمہ: ابن ماجہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور ترمذی، بیہقی نے دونوں سے روایت کی ہے۔

حدیث کی اسنادی حیثیت:

الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام احمد اور طبرانی نے حسین بن علیؓ سے روایت کیا ہے۔ اسی حدیث کو امام ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ امام حاکمؒ نے اس حدیث کو ''الکنیٰ'' میں ابو بکر سے نقل کیا ہے۔ شیرازی نے اس روایت کو حضرت ابوذر سے نقل کیا ہے۔ امام حاکم نے اپنی تاریخ میں حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے۔ امام طبرانیؒ نے اس روایت کو الصغیر میں زید بن ثابت سے نقل فرمایا ہے۔ ابن عساکر نے یہ حدیث حارث بن ہشام کے حوالہ سے روایت کی ہے۔ اھ۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں: من حسن اسلام المرء ترکه ما لا یعنیه اس حدیث کو ابن ماجہ اور ترمذی نے ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ اور امام ترمذی اس حدیث کی بابت فرماتے ہیں: غریب لانعرفه الا من هذا الوجه. قال: وحدثنا قتیبة،

عن مالك، عن الزهري، عن علي بن الحسين، عن النبي ﷺ :ان من حسن اسلام المرء الخ۔قال:وهكذا روى غير واحد من أصحاب الزهري عنه عن علي بن الحسين نحو حديث مالك.قال: هذا عندنا اصح من حديث ابي سلمة عن ابي هريرة اھ. کلام الترمذی. وطريقه عن ابی سلمة عن ابی هريرة جيدة.امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے شیخ جزری فرماتے ہیں حفاظ کی ایک جماعت کا کہنا ہے: الصواب انه عن علي بن الحسين عن النبي ﷺ مرسل، كذا قاله احمد وابن معين والبخاري وغيرهم. وكذا رواه مالك عن الزهري عن علي بن الحسين، ذكره المنذري۔واللہ اعلم

توضیح: مولف کو چاہئے تھا کہ حدیث کی ابتداء یا انتہاء میں ''مرسلاً'' فرماتے،اور یہ بھی ممکن ہے کہ عن ابيه ساقط ہوگیا ہو،اور یہ بھی ممکن ہے، کہ رواۃ یا مصنفین میں سے کسی سے تقدیم وتاخیر کے باعث تغیر آگیا ہو۔ یہ حدیث اصل میں حسین بن علی سے مروی ہے۔جیسا کہ ہم نے الجامع سے نقل کیا ہے۔واللہ اعلم۔

کیا معلوم کہ اس نے لایعنی بات کہی ہو

۴۸۴۲ :وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ تُوُفِّيَ رَجُلٌ مِّنَ الصَّحَابَةِ فَقَالَ رَجُلٌ اَبْشِرْ بِالْجَنَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَلَا تَدْرِيْ فَلَعَلَّهٗ تَكَلَّمَ فِيْمَا لَا يَعْنِيْهِ اَوْبَخِلَ بِمَا لَا يَنْقُصُهٗ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٤/٤٨٣ الحديث رقم ٢٣١٦۔

ترجمہ:حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک صحابیؓ فوت ہوئے تو ایک شخص نے کہا تجھے جنت مبارک ہو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں کیا معلوم کہ اس نے کوئی لایعنی بات کہی ہو یا کم نہ ہونے والی چیز میں بخل کیا ہو۔(ترمذی)

تشریح: قوله:أوتدري فلعله تكلم فيما لايعنيه:

''او لا تدری'': بعض نسخوں میں واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔یعنی واؤ عاطفہ کے ساتھ ہے'اس صورت میں لا تدری کا عطف جملہ محذوفہ پر ہوگا۔أي:تبشر ولا تدري. او أتقول هذا ولا تدري ما تقول۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ واؤ حالیہ ہے۔أي: والحال أنك لا تدري.اور ایک نسخہ میں واؤ کے سکون کے ساتھ ہے اور ایک روایت میں ایسا ہے بھی اس صورت میں ''أوْ'' عاطفہ ہے'اور یہاں بھی عطف کلام مقدر پر ہے۔ای:أتدري انه من أهلها أو لا تدري.اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں اس کا علم کس چیز سے ہو؟ یا تم نے وہ بات کیسے جان لی جو بات تیرے علاوہ لوگ نہیں جانتے۔

قوله:فلعله تكلم فيما لا يعنيه

مطلب یہ ہے کہ اس نے بے فائدہ باتیں کی ہوں جو اس کیلئے کسی طرح کا ضرر ونقصان پہنچانے کا سبب ہوں۔اور اس کے لئے نفع بخش نہ ہوں۔

قوله:بخل ما لا ينقصه:

مطلب یہ ہے کہ اس نے کسی ایسی چیز کو دینے میں بخل سے کام لیا ہو جس چیز کا دینا اور خرچ کرنا اس پر ضروری ہو۔ جیسے عبادات مالیہ (مثلاً زکوۃ کی ادائیگی) مسائل علمیہ معمولی چیز عاریۃً دینا۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے:

ان النبی ﷺ فقد کعبا فسأل عنه؟ فقالوا: مریض. فخرج یمشی حتی أتاه فلما دخل علیه قال: ابشر یا کعب! فقالت أمه: هنیئالك الجنة یا کعب! فقال: من هذه المتألية على الله؟ قال: هي أمي یا رسول الله! قال: وما يدريك يا أم كعب! لعل كعبا قال ما لا يعنيه، أو منع ما لا يعنيه.

ابن ابی الدنیا اور ابو یعلی حضرت انسؓ سے نقل کرتے ہیں:

قال: استشهد منا رجل يوم احد، فوجد على بطنه صخرة مربوطة من الجوع، فمسحت امه التراب عن وجهه وقالت: هنيئالك يا بني! الجنة فقال النبي ﷺ: ما يدريك لعله كان يتكلم فيما لا يعنيه ويمنع ما لا يضره.

ابو یعلی اور امام بیہقی رحمہ اللہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں:

قال: قتل رجل على عهد رسول الله ﷺ شهيدا، فبكت عليه امه وقالت: واشهيداه! فقال النبي ﷺ: وما يدريك انه شهيد؟ لعله كان يتكلم فيما لا يعنيه أو يبخل بما لا ينقصه.

آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ تم نے اس شخص کے جنت میں جانے کے بارے میں اس طرح کا یقین کیوں ظاہر کیا ہے؟ ہے۔ (بے شک اس شخص کی ظاہری زندگی بڑی پاکیزہ تھی اور اس کو صحابیت کی سعادت بھی حاصل ہے لیکن) ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی زبان سے کوئی لایعنی بات نکالی ہو یا بخل کیا ہو۔ جنت کی بشارت تو اس شخص کو سنائی جائے جس کا حساب وعقاب نہ ہو۔ اور جس آدمی نے لایعنی کلام کیا ہوگا، اس سے محاسبہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ کلام مباح ہی کیا ہو، لیکن مناقشہ فی الحساب تو باقی ہے، اور مناقشہ ایک طرح کا عذاب ہی ہے۔

اسنادی حیثیت: اس حدیث کے رجال صحیحین کے رجال ہیں، سوائے امام ترمذیؒ کے شیخ سلیمان بن عبدالجبار بغدادی کے، ابن حبان رحمہ اللہ نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے۔

منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے ''غریب'' بتلایا ہے اور اس حدیث کے روای ثقہ ہیں۔ (کذا فی التصحیح)

سب سے بڑا خطرہ زبان

۴۸۴۳: وَعَنْ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدُ اللّٰهِ الثَّقَفِيِّ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَخْوَفُ تَخَافُ عَلَيَّ قَالَ فَاَخَذَ بِلِسَانِ نَفْسِهِ وَقَالَ هٰذَا۔ (رواه الترمذی وصححه)

أخرجه الترمذي في السنن ٤/٥٢٤ الحديث رقم ٢٤١٠ و ابن ماجه في ٢/١٣١٤ الحديث رقم ٣٩٧٢ والدارمي في ٢/٣٨٦ الحديث رقم ٢٧١١، واحمد في المسند ٣/٤١٣۔

ترجمہ: حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! سب سے زیادہ خطرہ والی چیز کیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ میں محسوس کرتے ہیں؟ راوی کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا یہ یعنی زبان۔

(ترمذی)

ما اخوف ما تخاف علی کی ترکیب:

پہلا "ما" استفہامیہ مبتدا، "أخوف" اسم تفضیل مبنی للمفعول، خبر ہے۔ دوسرا "ما" موصولہ، عائد محذوف، مضاف الیہ۔ اس ترکیب کے اعتبار سے حدیث کی معنوی تقدیر یوں ہوگی: ای شیء أخوف أشياء تخاف منها علی.

امام طیبیؒ نے دوسرے "ما" کی ترکیب میں تین احتمال ذکر کیے ہیں:

① موصولہ۔ ② موصوفہ۔ ③ مصدریہ۔ جد جده 'جن جنونه 'خشيت خشية کی طرز پر ہے۔

بلسان: باءزائدہ برائے زیادہ تعدیہ ہے۔

قوله: قال هذا: "هذا" میں دو ترکیبی احتمال ہیں: ① مبتدا ہے۔ ② خبر ہے۔ أى: هذا أكثر خوفي عليك منه.

"احیاء" میں فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام احادیث میں اپنی امت کے بابت اندیشہ کی اسناد "زبان" کی طرف فرمائی ہے۔ چونکہ دیگر اعضاء کے مقابلہ میں زبان کا عمل سب سے عظیم ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کوئی بھی طاعت ومعصیت نہیں مگر یہ کہ اس میں زبان کا دخل ضرور ہوتا ہے۔ جس شخص نے اپنی زبان کو کھلی چھوٹ دے دی اور اس کو بے لگام کر دیا اس کو شیطان ہر میدان میں چلاتا ہے اور اس کو جہنم کے گڑھے تک لے جاتا ہے، لوگوں کو ان کی ناک کے بل جہنم میں لے جانے والی چیز زبان کی کھیتیاں ہی ہیں۔ اور اس کے شر سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے، جو اس کو شریعت کی لگام ڈال لے۔ اور اس بات کا علم کہ کسی موقع پر زبان چلانا محمود اور کس موقع پر مذموم ہے انتہائی غامض وکمیاب ہے۔ اور جس کو اس کی معرفت حاصل ہو جائے اس کے لئے مقتضی پر عمل ثقیل وعسیر ہے لیکن جس پر اللہ تعالیٰ آسان کر دے آسان ہے۔

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو نسائی وابن ماجہ نے، ابن حبان نے اپنی صحیح میں، اور حاکمؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ اور فرمایا کہ یہ صحیح الاسناد ہے۔

جھوٹ کی بدبو ایک میل تک

۴۸۴۴ : وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْهُ الْمَلَكُ مِيْلاً مِنْ نَتْنِ مَاجَآءَ بِهٖ۔ (رواه الترمذي)

أخرجه الترمذي في السنن ٤/٣٠٧ الحديث رقم ١٩٧٢۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جب کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو اس جھوٹ کی بدبو سے فرشتہ ایک میل کے فاصلہ پر چلا جاتا ہے۔ (ترمذی)

تشریح: "میلا": کی مقدار میں تین آراء ہیں: (۱) ایک تہائی فرسخ۔ (۲) زمین کا ٹکڑا۔ (۳) تا حدنگاہ۔ (ذکرہ ابن الملک)

نتن: اس کا معنی ہے "عفونة" نون کے فتحہ اور تاء کے سکون کے ساتھ: صاحب قاموس فرماتے ہیں: نتن، فرح کی ضد ہے۔ "من": سببیہ ہے۔ "به": باء برائے تعدیہ ہے۔ أی: من نتن الكذب أو جاء لعبد به. ایک نسخہ میں لفظ "عنه" مؤخر ہے۔

تخریج: الجامع الصغیر میں یہ الفاظ آئے ہیں: اذا کذب العبد کذبة الخ اس کو ترمذیؒ نے اور ابونعیم نے "الحلیة" میں ذکر کیا ہے۔

جھوٹ کی مہارت

۴۸۴۵: وَعَنْ سُفْيَانَ بْنِ اَسَدِ الْحَضْرَمِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ كَبُرَتْ خِيَانَةً اَنْ تُحَدِّثَ اَخَاكَ حَدِيْثًا هُوَ لَكَ بِهِ مُصَدِّقٌ وَاَنْتَ بِهِ كَاذِبٌ۔ (رواه ابو داؤد)

أخرجه ابو داؤد في السنن ۵/۲۵۴ الحديث رقم ۴۹۷۱۔

ترجمہ: حضرت سفیان بن اسد حضرمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے مسلمان بھائی سے کوئی بات کہو جس میں وہ تمہیں سچا خیال کرے حالانکہ تم اس سے جھوٹ بول رہے ہو۔ (ابوداؤد)

راوی حدیث:

سفیان بن اسد۔ یہ سفیان بن اسد حضرمی شامی ہیں۔ جبیر بن نفیر نے ان سے روایت کی ہے۔ اہل حمص میں ان کی حدیث مروج ہے۔ "اسد" اکثر کے نزدیک فتحہ ہمزہ اور کسرہ سین کے ساتھ ہیں اور دوسری روایت کے مطابق ضمہ ہمزہ اور فتحہ سین کے ساتھ اور تیسرے قول کے مطابق فتحہ ہمزہ اور فتحہ سین کے ساتھ بغیر یاء کے یعنی اسد سے تعلق رکھتے ہیں۔

تشریح: قوله: كبرت خيانه: "كبرت": با کے ضمہ کے ساتھ بمعنی عظمت۔

خيانة: تمیز ہے۔

تحدث أخاك: یہ جملہ بتاویل مصدر ہو کر "كبرت" کا فاعل ہے۔

"كبرت" مؤنث کا صیغہ لانے کی وجہ:

(۱) تمیز محول عن الفاعل ہے۔

(۲) فاعل "خصلة" یا "فعلة" کی تاویل میں ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ معنی کا لحاظ کیا گیا ہے۔ چونکہ تحدیث ہی نفس خیانت ہے۔ اس جملہ میں تعجب کے معنی ہیں جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے:﴿ كبر مقتا عند الله ﴾ [الصف۔۳] صاحب کشاف لکھتے ہیں: یہ افصح کلام ہے اور معنی کے اعتبار سے انتہائی بلیغ ہے۔ بایں طور کہ "کبر" میں تعجب کا بیان من غیر لفظہ ہے۔ تعجب کا مطلب ہوتا ہے، سامعین کے دلوں میں معاملہ کی عظمت لانا، چونکہ تعجب ایسی شئے خارج ہی کی وجہ سے ہوتا ہے جو اپنے نظائر و اشکال سے خارج ہو۔ چنانچہ معنی یہ ہو گئے: جناية عظيمة منك اذا حدثت أخاك المسلم.

قوله: وانت به كاذب: ایک روایت میں "له" ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یوں تو ہر حالت اور ہر موقع پر جھوٹ بولنا بہت برا ہے مگر اس صورت میں تو بہت ہی برا ہے کہ تم اپنے کسی مسلمان بھائی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤ بایں طور کہ وہ تو تمہیں سچ بولنے والا سمجھے اور تمہیں سچا مسلمان سمجھتا ہو کہ تم جھوٹ نہیں بولتے مگر تم اس سے جھوٹ بولو۔

تخریج: اس حدیث کو امام بخاریؒ نے "الادب" میں اسی راوی سے نقل کیا ہے اور امام احمد و طبرانیؒ نے نواس سے نقل کیا ہے۔

منافق کیلئے آگ کی دو زبانیں

۴۸۴۶: وَعَنْ عَمَّارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ ذَاوَجْهَيْنِ فِي الدُّنْيَا كَانَ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لِسَانَانِ مِنْ نَارٍ۔ (رواه الدارمی)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ١٩١/٥ الحديث رقم ٤٨٧٣، والدارمی فی ٤٠٥/٢ الحديث رقم ٢٧٦٤۔

ترجمہ: حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص دنیا میں دو منہ رکھتا ہے یعنی منافق ہے آخرت میں اس کی دو زبانیں آگ کی ہوں گی۔ (دارمی)

تشریح: ذووجہیں سے مراد: دورویہ اصل میں اس آدمی کو کہتے ہیں جو کسی کے حق میں مخلص نہ ہو زبان سے کچھ کہے اور دل میں کچھ رکھے جب کسی کے سامنے بات کرے تو اس طرح کرے کہ مخاطب یہ سمجھے کہ یہ میرا بڑا محب و ناصح ہے مگر جب اس کے پیٹھ پیچھے بات کرے تو اس کے علاوہ بات کرے (زبان سے ایسے الفاظ نکالے جو اس کے لئے تکلیف کا باعث ہوں۔)

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "دورویہ" اس شخص کو کہتے ہیں جو آپس میں مخاصمت رکھنے والے دو آدمیوں میں سے ہر ایک کی منہ دیکھی بات کرے ایک کے پاس جائے تو اس کی پسند کی باتیں کرے اور وہ یہ سمجھے کہ یہ میرا دوست ہے اسی طرح دوسرے کے پاس جائے تو اس کی پسند کی کہے اور وہ سمجھے کہ یہ میرا دوست ہے غرضیکہ دونوں میں سے ہر ایک کے پاس اس کی محبت ظاہر کرے اور دوسرے کی برائی کرے اسی طرح دونوں ہی اس کے بارے میں غلط فہمی کا شکار رہیں اور ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا دوست، ہمدرد اور مددگار ہے اور میرے مخالف کا دشمن و بدخواہ۔

تخریج: اس حدیث کو ابوداؤدؒ نے ان الفاظ ~~سے~~ نقل کیا ہے: من كان له وجهان الخ. امام میرکؒ، منذریؒ سے نقل

کرتے ہوئے فرماتے ہیں: حضرت عثمانؓ کی حدیث ابوداؤد نے نیز ابن حبان نے اپنی صحیح میں نقل کی ہے۔ عراقیؒ کا کہنا ہے کہ حدیث عمار: ''ومن کان له وجهان'' کو امام بخاریؒ نے کتاب ''الادب المفرد'' میں نقل کیا ہے، اور ابوداؤد نے سند حسن کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

کامل مؤمن کی چار علامات

۴۸۴۷: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا بِاللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيِّ۔

(رواه الترمذی والبيهقی فی شعب الايمان وفی اخری له ولا الفحش البذی وقال الترمذی هذا حديث غريب)

أخرجه الترمذی فی السنن ۳۰۸/۴ الحديث رقم ۱۹۷۷، واحمد فی المسند ۴۰۵/۱ والبيهقی فی الشعب ۲۹۳/۴ الحديث رقم ۵۱۴۹۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کامل مؤمن طعنہ زن اور لعنت کرنے والا، فحش گو اور زبان دراز نہیں ہوتا۔ ترمذی، بیہقی اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ نہ فحش گو اور نہ بے حیاء ہوتا ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو غریب کہا ہے۔

تشریح: ''لعان'': کی وضاحت حدیث: ۴۸۴۰ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

الفاحش: قبیح کلام کو کہتے ہیں، صاحب النہایہ لکھتے ہیں: الفاحش، فحش کام و کلام کرنے والا۔ بعض نے فاحش کے معنی ''شاتم'' بیان کئے ہیں۔ بظاہر یہاں ایسا شتم قبیح مراد ہے جس کا ذکر بھی قبیح ہو۔

البذی: اس لفظ کو دو طرح ضبط کیا ہے:

① بائے موحدہ کے فتحہ ذال معجمہ کے کسرہ اور یائے تحتیہ مشددہ کے ساتھ۔

② بائے مؤحدہ کے فتحہ، ذال معجمہ کے کسرہ، یائے تحتیہ مخففہ اور ہمزہ کے ساتھ۔

صاحب النہایہ لکھتے ہیں: البذاء — بالمد۔ فحش گوئی اور بذی اللسان ''فحش گو'' کو کہتے ہیں۔ ہمزہ کے ساتھ پڑھنا قلیل ہے۔ بعض شراح نے ''بذی'' کے معنی ''بے حیاء'' بتلائے ہیں۔

اس لغوی تحقیق کے بعد اب یہ جاننا چاہیے کہ یہاں کونسے معنی مراد ہیں۔

① فاحش سے مراد فحش کام کرنے والا ہے۔ تاکہ تکرار لازم نہ آئے۔

② فاحش کے عام معنی مراد ہیں۔

③ یہاں تخصیص بعد از تعمیم ہے، چونکہ یہ متعدی ہے، لہٰذا زیادتی اہتمام کے پیش نظر اس کو لایا گیا ہے۔

④ عطف تفسیری ہے، اور ''لا'' زائدہ ہے، اس کی تائید اگلی حدیث سے ہو رہی ہے۔

اسنادی حیثیت: میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کے رجال صحیحین کے رجال ہیں، سوائے ترمذیؒ کے شیخ محمد بن یحییٰ کے۔

ابن حبان اور دار قطنی نے ان کی توثیق کی ہے۔

تخریج: الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں: اس حدیث کو احمد نے، بخاری نے اپنی تاریخ میں، ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے اپنی مستدرک میں ذکر کیا ہے۔

مؤمن لعان نہیں ہوتا

۴۸۴۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ لَعَّانًا وَفِيْ رِوَايَةٍ لَا يَنْبَغِيْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ يَّكُوْنَ لَعَّانًا۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٣٢٥/٤ الحديث رقم ٢٠١٩، واحمد في المسند ٣٦٦/٢۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤمن لعنت کرنے والا نہیں ہوتا یہ ترمذی کی روایت ہے اور دوسری روایت میں ہے کہ مؤمن کے لئے مناسب نہیں کہ وہ لعنت کرنے والا ہو۔

اس حدیث کی وضاحت کیلئے حدیث: ۴۸۲۰ ملاحظہ فرمائیے۔

تین باتوں سے باز رہو

۴۸۴۹: وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَلَاعَنُوْا بِلَعْنَةِ اللّٰهِ وَلَا بِغَضَبِ اللّٰهِ وَلَا بِجَهَنَّمَ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَلَا بِالنَّارِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

أخرجه ابو داؤد في السنن ٢١١/٥ الحديث رقم ٤٩٠٦، والترمذي في ٣٠٨/٤ الحديث رقم ١٩٧٦، واحمد في المسند ١٥/٥۔

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگوں کو اللہ کی لعنت سے اور اللہ کے غضب (کے الفاظ) سے لعنت نہ کرو۔ اور نہ جہنم میں جانے کی بد دعا دو۔ اور ایک روایت میں ہے نہ آگ سے۔ (ترمذی ابوداؤد)

تشریح: لا تلاعنوا: ایک تاء حذف کر دی گئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یوں تو کسی صورت میں بھی کسی مسلمان کو اپنے مسلمان بھائی کے حق میں بد دعا نہ کرنی چاہئے کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن خدا کی لعنت وغیرہ جیسی چیزوں کی بد دعا کرنا تو سخت برا اور گناہ کی بات ہے چنانچہ کسی کے حق میں اس طرح بد دعا نہ کرنی چاہئے کہ تجھ پر اللہ کی لعنت ہو یا تجھ پر اللہ کا غضب ٹوٹے یا اللہ کرے تو جہنم میں جائے اور یا اللہ کرے تیرا ٹھکانہ دوزخ ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی کسی کو بھی اللہ کی دوری کی بد دعا نہ دی جائے۔ نہ صراحۃً دی جائے، مثلاً یوں کہا جائے: تجھ پر خدا کی لعنت ہو۔ نہ کنایۃً دی جائے، مثلاً یوں کہا جائے: اللہ کا غضب ہو، تو جہنم میں جائے۔ ''لا تلا عنوا'' یہ کلام مجازی معنی پر

محمول ہے، چونکہ بعض افراد میں یہ حقیقۃً ہے اور بعض افراد میں مجازاً ہے۔ اور یہ (حدیث باب) معین کے ساتھ مخصوص ہے۔ چونکہ وصف اعم کے ساتھ لعنت بھیجنا جائز ہے۔ مثلاً جیسے اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿لعنة الله على الكافرين﴾ صفت اخص کے ساتھ لعنت بھیجنا بھی جائز ہے۔ جیسے یوں کہنا: لعنة الله على اليهود اور اس کافر معین پر لعنت بھیجنا بھی جائز ہے جو حالت کفر میں مرا ہو۔ جیسا کہ فرعون اور ابوجہل وغیرہ۔

تخریج: اس حدیث کو حاکم نے بھی ذکر کیا ہے۔ البتہ ان سب کی روایت میں "ولا بالنار" کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ (علی مانی الجامع)

لعنت کرنے والے کی طرف لوٹتی ہے

۴۸۵۰ وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا لَعَنَ شَيْئًا صَعِدَتِ اللَّعْنَةُ اِلَى السَّمَآءِ فَتُغْلَقُ اَبْوَابُ السَّمَآءِ دُوْنَهَا ثُمَّ يُهْبَطُ اِلَى الْاَرْضِ فَتُغْلَقُ اَبْوَابُهَا دُوْنَهَا ثُمَّ تَاْخُذُ يَمِيْنًا وَشِمَالًا فَاِذَا لَمْ تَجِدْ مَسَاغًا رَجَعَتْ اِلَى الَّذِيْ لُعِنَ فَاِنْ كَانَ لِذٰلِكَ اَهْلًا وَاِلَّا رَجَعَتْ اِلٰى قَائِلِهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابو داؤد في السنن ٥/ ٢١١ الحديث رقم ٤٩٠٥۔

ترجمہ: حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب کوئی بندہ کسی چیز پر لعنت کرتا ہے تو وہ لعنت آسمان کی طرف جاتی ہے آسمان کے دروازے اس کے لئے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ پھر وہ زمین کی طرف لوٹتی ہے تو زمین کے دروازے بھی بند کر دیے جاتے ہیں پھر وہ دائیں، بائیں گردش کرتی ہے جب وہ کوئی ٹھکانہ نہیں پاتی تو وہ اس آدمی کی طرف لوٹتی ہے جس پر وہ کی گئی ہوتی ہے۔ اگر وہ مستحق تھا تو فبہا ورنہ لوٹ کر کہنے والے کی طرف آجاتی ہے۔ (ابوداؤد)

تشریح: صعدت: عین کے کسرہ کے ساتھ از باب سمع۔

فتغلق: اغلاق مصدر سے مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔ ثلاثی مجرد سے اس مادہ کا استعمال ہلکا پن ہے یا اغلق میں ردی لغت ہے۔ (قاموس) ہاں لام کی تشدید کے ساتھ پڑھنا جائز ہے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اسی سے ہے: ﴿وغلقت الأبواب﴾ [یوسف:۲۳] دونها: یہاں "دون" بمعنی "قدام" ہے تهبط: بائے موحدہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ بمعنی تنزل۔

مساغًا: میم کے فتحہ کیساتھ ہے۔ ساغ الشراب في الحلق، (مشروب کا با آسانی حلق میں اترنا) سے ماخوذ ہے۔

لعن: صیغہ مجہول کیساتھ ہے۔

ان كان لذلك اهلا: یہ جملہ شرطیہ ہے۔ اس کی جزاء "لحقته ونفذت فيه" محذوف ہے۔

"و الا": کی یہاں اصل تقدیری عبارت یوں ہے: ان لم يكن اهلا لها۔

ابن الملک فرماتے ہیں لعنت کا آسمانوں میں اور پھر دائیں بائیں جانا اس شخص کی مانند ہے جو بھٹک گیا ہو، اور اس کو دائیں

بائیں کہیں بھی کوئی بھی راستہ نہ ملتا ہو۔

اسنادی حیثیت: امام ابوداوُدؒ نے اس روایت پر سکوت اختیار کیا ہے۔ منذریؒ نے اس سکوت کو برقرار رکھا ہے۔ اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں۔ (نقلہ میرک عن التصحیح)

ہوا پر لعنت نہ کرو

۴۸۵۱: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلًا نَازَعَتْهُ الرِّيْحُ رِدَاءَهُ فَلَعَنَهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَلْعَنْهَا فَاِنَّهَا مَاْمُوْرَةٌ وَاِنَّهُ مَنْ لَعَنَ شَيْئًا لَيْسَ لَهُ بِاَهْلٍ رَجَعَتِ اللَّعْنَةُ عَلَيْهِ۔

(رواه الترمذی وابو داؤد)

أخرجه ابو داؤد في السنن ٥/٢١٢ الحديث رقم ٤٩٠٨، والترمذي في ٤/٣٠٩، الحديث رقم ١٩٧٨۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص کی چادر ہوا میں اڑ گئی تو اس نے ہوا پر لعنت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہوا پر لعنت نہ کرو کیونکہ وہ تو حکم کے تابع ہے اور جو شخص کسی ایسی چیز پر لعنت کرے جو اس کی مستحق نہ ہو تو وہ لعنت اسی پر لوٹ آتی ہے۔ (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: "انه": ضمیر شان ہے۔ "لیس" کی ضمیر "شیء" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ "له" کا مرجع لعنة ہے۔ "علیه" کی ضمیر "لاعن" کی طرف عائد ہے۔

قوله: فانها ما مورة:

ہوا بذاتِ خود کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور نہ کسی طرح کا تصرف کرنے کے قابل ہے وہ تو چلنے پر منجانب اللہ ماموری گئی ہے اور حق تعالیٰ نے اپنی حکمتوں اور مصالح کے تحت اس کو پیدا کیا اور چلایا ہے بس اس کا کام چلنا ہے اور وہ چلتی ہے۔ اس صورت میں اگر اس کی وجہ سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس ہوا سے دل برداشتہ ہونا اور اس کو برا بھلا کہنا نہ صرف نہایت ناموزوں بات ہے بلکہ تقاضائے عبودیت اور استقامت کے منافی بھی ہے۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔

میں صاف سینہ لے کر آنا چاہتا ہوں

۴۸۵۲: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُبَلِّغُنِيْ اَحَدٌ مِنْ اَصْحَابِيْ عَنْ اَحَدٍ شَيْئًا فَاِنِّيْ اُحِبُّ اَنْ اَخْرُجَ اِلَيْكُمْ وَاَنَا سَلِيْمُ الصَّدْرِ۔ (رواه ابوداؤد)

أخرجه ابو داؤد في السنن ٥/١٨٣ الحديث رقم ٤٨٦٠ والترمذي ٥/٦٦٧ الحديث رقم ٣٨٩٧، واحمد في المسند ١/٣٩٦۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے کسی کی طرف سے کوئی دوسرا بات نہ

پہنچائے میں چاہتا ہوں کہ میں تمہارے پاس صاف سینہ لے کر آؤں۔ (ابوداؤد)

تشریح: لا یبلغنی: کو باب افعال و تفعیل دونوں سے پڑھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مرفوع و مجزوم دونوں طرح سے منقول ہے۔ مرفوع پڑھنے کی صورت میں یہ خبر بمعنی نہی ہوگی۔

من اصحابی: ''من'' بیانیہ ہے۔ ''احد'' کا بیان ہے۔

عن احد: میں عموم ہے، صحابی اور غیر صحابی مسلمان دونوں شامل ہیں۔

شیئا: میں بھی عموم ہے۔ تمام اقوال و افعال کو شامل ہے، مثلاً یہ کہ کسی کے بارے میں یوں کہنا کہ اس نے مجھے برا بھلا کہا ہے یا تکلیف پہنچائی ہے یا اس کے بارے میں کوئی بھی ایسی بات نہ کرے کہ جس میں اس کی برائی ظاہر ہوتی ہو یا میرے نزدیک ناپسندیدہ ہو اور میں اس پر غصہ کروں۔

قولہ: وانا سلیم الصدر: یہ جملہ حالیہ ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ اس ارشاد کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے گویا اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا ہے کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ سے خوش و راضی رہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوں۔ کسی سے بھی ناراض یا ناخوش ہوتے ہوئے اس دنیا سے رخصت نہ ہوں۔

اس ارشاد گرامی میں امت کے لئے تعلیم ہے (کہ کوئی آدمی اپنے کسی بڑے مثلاً حاکم و سردار اور بزرگ و شیخ کے سامنے کسی شخص کی برائی بیان نہ کرے تا کہ بغض و عداوت اور ناراضگی و خفگی کی صورت پیدا نہ ہو۔)

اگر یہ بات سمندر میں ملائیں تو وہ متغیر ہو جائے

۴۸۵۳: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَسْبُكَ مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وَكَذَا تَعْنِي قَصِيْرَةً فَقَالَ لَقَدْ قُلْتِ كَلِمَةً لَوْ مُزِجَ بِهَا الْبَحْرُ لَمَزَجَتْهُ۔ (رواه احمد والترمذی ابو داؤد)

أخرجه ابوداوٗد في السنن ۵/۱۹۲ الحديث رقم ۴۸۷۵، والترمذی في ۴/۵۷۰ الحديث رقم ۲۵۰۲ واحمد في المسند ۶/۱۸۹۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ صفیہ کی جانب سے آپ کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ ایسی ایسی ہے یعنی پستہ قد۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو نے ایسی بات کہی ہے کہ اگر وہ سمندر میں ملا دی جائے تو وہ اسے متغیر کر دے گا۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: قولہ: حسبك من صفية كذا و كذا تعني قصيرة: مشکوۃ کے تمام نسخوں میں عبارت اسی طرح ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ مصابیح میں تحریف ہے، درست الفاظ یوں ہیں: حسبك من صفيه أنها كذا و كذا۔

تعنی قصیرۃ

''كذا كذا'' کے الفاظ کے ذریعہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے کچھ جسمانی عیب کی طرف اشارہ تھا (ان کے قد کی کوتاہی

کو کنایۃً بیان کرنا مقصود تھا)۔

جب کہ ایک شارح نے کہا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ان الفاظ ''کذا کذا'' کے ذریعہ دراصل اپنی بالشت کی طرف اشارہ کیا کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا تو گویا بالشت بھر کی ہیں۔

کہ لفظ ''کذا'' کو مکرر لانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقصد حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے اس عیب کو زبان اور اشارہ دونوں ذریعوں سے بیان کرنا تھا۔ چنانچہ ہوسکتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پہلے تو اپنی زبان سے کہا ہوگا کہ صفیہ ٹھگنی ہیں اور پھر اپنی بالشت کا اشارہ کر کے اپنی بات کو مؤکد کیا کہ وہ بہت ہی ٹھگنی ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے اپنے قول وفعل دونوں کے ذریعہ تاکید کرنا تھا۔

قولہ: لقد قلت کلمة لو مزج بها البحر لمزجته: قاضیؒ فرماتے ہیں: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مذکورہ ارشاد گرامی کے ذریعے گویا ان پر یہ واضح کیا کہ تم نے جو بات کہی ہے وہ کوئی معمولی درجہ کی نہیں ہے بلکہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے اس قدر ہیبت ناک ہے کہ اگر بالفرض اس کو کسی دریا میں ملا دیا جائے تو دریا اس کے سامنے ہیچ ہو جائے اور یہ چند الفاظ اس دریا کی وسعت وعظمت کے باوجود اس پر غالب آ جائیں اور اس کو متغیر کر دیں اور جب ان الفاظ کے مقابلہ پر دریا کا یہ حال ہے تو سوچو کہ تمہارے اعمال کا کیا حشر ہوسکتا ہے۔

تنبیہ: تورپشتیؒ فرماتے ہیں: مصابیح کی حدیث میں تحریف ہوئی ہے۔ درست الفاظ یوں ہے:

''لو مزجت بالبحر لمزجته''

امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث اسی طرح وارد ہے جس طرح مصابیح میں ہے اور یہی متن سنن ابی داوٗد کے تصحیح شدہ نسخے میں بھی موجود ہے۔ غلطی کا وقوع روایۃً نہیں درایۃً ہوا ہے' چونکہ یوں نہیں کہا جاتا: مزج بها البحر' بلکہ (یوں کہا جاتا ہے) مذجت بالبحر۔

حیاء زینت ہے

۴۸۵۴: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاكَانَ الْفُحْشُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا شَانَهٗ وَمَاكَانَ الْحَيَاءُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا زَانَهٗ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۳۰۷/۴ الحديث رقم ۱۹۷۴ و ابن ماجه فی ۱۴۰۰/۲ الحديث رقم ۴۱۸۵، واحمد فی المسند ۱۶۵/۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس چیز میں بے حیائی ہو وہ اسے عیب دار بنا دیتی ہے اور جس چیز میں حیاء ہو وہ اسے زینت دیتی ہے۔ (ترمذی)

تشریح: زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس حدیث میں ''فحش'' سے مراد ''عنف'' ہے۔ جیسا کہ عبد بن حمید اور ضیاء عن انس کی حدیث میں ہے: ما کان الرفق فی شیء الا زانه ولا نزع من شیء الا شانه۔

" فی شیء": امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کلام میں مبالغہ ہے۔ أی لو قدر أن یکون الفحش او الحیاء فی جماد لزانه او شانه، فکیف بالانسان؟ ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ "شیئ" سے مراد ایسی شیئ ہو جس میں فحش وحیا متصور ہو سکتے ہوں تو گویا کہ یوں فرمایا گیا ہے۔:ما کان فی احد.

حاصل کلام: فحش یعنی بدگوئی وسخت کلامی اور اس کے مقابلہ پر حیا یعنی نرم گوئی کی تاثیر وشان کو مبالغہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ اگر بالفرض فحش یا حیا کسی پتھر یا لکڑی میں پیدا ہو جائے تو اس کو عیب دار یا با زینت بنا دے اس سے معلوم ہوا کہ بدگوئی و سخت کلامی شخصیت میں نقص وعیب پیدا کرنے کا ذریعہ ہے جب کہ نرم گوئی وخوش کلامی شخصیت میں وقار کو ظاہر کرتی ہے۔

تخریج: امام میرکؒ کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ الجامع الصغیر کی تصریح کے مطابق اس حدیث کو امام احمد نے، امام بخاریؒ نے "الأدب" میں، اور امام ترمذی وابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔ لیکن دونوں جگہ " فی شیء " کے بعد "قط" کا اضافہ نقل کیا گیا ہے۔

کسی کو گناہ پر عار مت دلاؤ

۴۸۵۵: وَعَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ عَنْ مُعَاذٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَيَّرَ اَخَاهُ بِذَنْبٍ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى يَعْمَلَهُ يَعْنِيْ مِنْ ذَنْبٍ قَدْ تَابَ مِنْهُ۔

(رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب وليس اسناده بمتصل لان خالدا لم يدرك معاذبن جبل)

أخرجه الترمذی فی السنن ۴/۵۷۱ الحديث رقم ۲۵۰۵۔

ترجمہ: حضرت خالد بن معدانؒ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے کسی گناہ پر اپنے بھائی کو عار دلائی تو وہ اس وقت تک نہ مرے گا یہاں تک کہ وہ گناہ نہ کرلے یعنی وہ گناہ جس پر عار دلائی ہے۔ امام ترمذی نے اسے غریب کہا ہے اور سند بھی متصل نہیں کیونکہ خالد کی معاذ بن جبل سے ملاقات ثابت نہیں۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہ پانے کی وجہ:

تشریح: خالد بن معدان نے ستر صحابہ کو پایا ہے۔ ان ستر صحابہ میں معاذ شامل نہیں ہیں۔ چونکہ ان کی وفات ۱۸ھ میں ہوئی۔ وگرنہ تو صحت اتصال کیلئے "معاصرت" بھی کافی ہے۔ جب کہ امام بخاریؒ اور ان کے متبعین کے نزدیک "لقاء" بھی ضروری ہے۔

احیاء میں ایک روایت ذکر کی ہے: قال اعرابی لرسول الله ﷺ: اوصنی. فقال: علیك بتقوی الله وان امرؤ عیرك بشیء یعلمه فیك فلا تعیره بشیء تعلمه فیه یکن وباله علیه واجره لك.

امام ترمذیؒ نے اس روایت کو اگرچہ غریب کہا ہے لیکن عراقی کہتے ہیں کہ اس روایت کو احمد اور طبرانی نے جید سند کے ساتھ ابی جری ہجیمی نقل کیا ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان کا نام جابر بن سلیم تھا۔ بعض نے اس کے برعکس سلیم بن جابر بتایا ہے۔

مسلمان کو مصیبت میں دیکھ کر خوش نہ ہو

۴۸۵۶: وَعَنْ وَاثِلَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ لِاَخِيْكَ فَيَرْحَمُهُ اللّٰهُ وَيَبْتَلِيْكَ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن غريب)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/ ٥٧١ الحديث رقم ٢٥٠٦۔

ترجمہ: حضرت واثلہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے بھائی کو مصیبت میں دیکھ کر خوش نہ ہوا کرو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے اور تمہیں اس میں مبتلا کر دے۔ ترمذی نے اسے حسن غریب کہا ہے۔

تشریح: قوله: لاتظهر الشماته :"شماتت " کہتے ہیں دشمن کے غم سے خوشی کرنا۔ (ذلیل ورسوا کرنے کے لئے) فیرحمه اللّٰه دو طرح سے پڑھا گیا ہے:

- جواب نہی ہونے کی وجہ سے منصوب پڑھا گیا ہے۔
- ایک نسخہ میں مرفوع پڑھا گیا ہے۔" يبتليك" کے عطف سجع کی رعایت کے مناسب حال تو یہی ہے۔

ایک اور حدیث میں اس سے ملتا جلتا مفہوم وارد ہوا ہے:" واللّٰه لا يغفر اللّٰه لك أبدا کے قائل شخص کے جواب میں اللہ تعالیٰ اس گناہ گار شخص سے فرمائے گا۔ أدخل الجنة برحمتي، اور دوسرے سے فرمائے گا: تستطيع أن تحظر عن عبدي رحمتي.

"الاحیاء" کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: فيعافيه اللّٰه ويبتليك.

عراقیؒ کا کہنا ہے، کہ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے واثلة ابن الأسقع سے روایت کیا ہے۔ اور ابن ابی الدنیا کی روایت میں "فيرحمه اللّٰه " ہے۔

کسی کے طریقہ پر چلنا مجھے ناپسند ہے

۴۸۵۷: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ مَا اُحِبُّ اَنِّيْ حَكَيْتُ اَحَدًا وَاَنَّ لِيْ كَذَا كَذَا۔

(رواه الترمذی وصححه)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/ ٥٧ الحديث رقم ٢٥٠٣، واحمد فی المسند ٦/ ١٢٨

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں کسی کے طریقے پر چلنا ناپسند کرتا ہوں اگرچہ مجھے اتنا کچھ دیا جائے۔ ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔

تشریح: "حکیت" :"یا حکمت" بمعنی "حاکیت" ہے۔ چنانچہ النہایہ میں ہے: اى فعلت مثل فعله يقال: حكاه و حاكاه۔ (یعنی دونوں ابواب سے ایک ہی معنی میں مستعمل ہے۔) اکثر و بیشتر فعل قبیح کی نقل اتارنے کے معنی میں از باب مفاعلہ آتا ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہاں فعل حسن کی نقل اتارنے کے معنی پر محمول کیا جائے، تو مفید "مبالغہ" ہوگا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ان لی کذا و کذا، یہ جملہ حالیہ ہے۔ بطور تتمیم معنی اور مبالغہ کے ذکر کیا گیا ہے۔ أی: ما أحب أن أحاكي أحدا ولو أعطيت كذا و كذا من الدنيا. اھ۔ اس پر اشکال ہے وہ یہ کہ تمام اصول معتمدہ میں ''ان'' ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے۔ بظاہر یہ ماقبل والے ''انی'' پر عطف ہے۔ أي: اني ما أحب الجمع بين المحاكاة، وحصول كذا و كذا من الدنيا و ما فيها بسبب المحاكاة فانها امر مذموم.

تخریج: الجامع الصغیر میں یہ الفاظ آئے ہیں: ما أحب اني حكيت انسانا الخ. اس حدیث کو ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ کسی کی نقل اتارنا خواہ قولی ہو یا فعلی' حرام اور غیبت محرمہ میں داخل ہے۔ مثلاً بتکلف لنگڑا بننا' سر جھکا کر چلنا وغیرہ۔

رحمت الٰہی کو تنگ مت کرو

۴۸۵۸: وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ جَآءَ اَعْرَابِيٌّ فَاَنَاخَ رَاحِلَتَهٗ ثُمَّ عَقَلَهَا ثُمَّ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَصَلّٰى خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا سَلَّمَ اَتٰى رَاحِلَتَهٗ فَاَطْلَقَهَا ثُمَّ رَكِبَ ثُمَّ نَادٰى اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ وَمُحَمَّدًا وَلَا تُشْرِكْ فِيْ رَحْمَتِنَا اَحَدًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَقُوْلُوْنَ هُوَ اَضَلُّ اَمْ بَعِيْرُهٗ اَلَمْ تَسْمَعُوْا اِلٰى مَاقَالَ قَالُوْا بَلٰى۔

(رواه ابوداؤد و ذكر حديث ابى هريرة كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا فى باب الاعتصام فى الفصل الاول)

أخرجه ابو داؤد فى السنن ۵/۱۹۸ الحديث رقم ۴۸۸۵، واحمد فى المسند ۳۱۲/۴۔

ترجمہ: حضرت جندب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی آیا اور اس نے اونٹ بٹھایا پھر اسے باندھا پھر جناب رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں مسجد میں آ کر نماز ادا کی اس نے سلام پھیرا اور اپنی سواری کو کھولا اور اس پر سوار ہو کر چل دیا پھر اس نے یہ دعا کی اے اللہ مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرما اور ہماری رحمت میں کسی اور کو حصہ نہ دے تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ دیہاتی زیادہ بے خبر ہے یا اس کا اونٹ؟ کیا تم نے اس کی بات نہیں سنی۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کیوں نہیں! (ابوداؤد) روایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ باب الاعتصام کی فصل اول میں گزری جس کی ابتداء اس طرح ہے: كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا۔

تشریح: قوله: جاء اعرابي: ''أعرابي'': ''اعراب'' کا واحد ہے۔ عرب کا دیہاتی باشندہ أتقولون: صاحب النھایۃ لکھتے ہیں: ای أتظنون (یعنی یہاں ''قول''، ''ظن'' کے معنی میں ہے۔ أضل: بمعنی ''أجھل'' اس جملہ میں تنبیہ ہے کہ یہ شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اس کے بارے میں وہ بات کہی جائے جو آپؐ نے ارشاد فرمائی۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: أيدوردون التر ديد فى ظنكم ولا يقول ما قال الاجاهل بالله وسعة رحمة حيث يحجر الواسع۔

قوله: وذكر حديث ابوهريرة كذبا في باب الا عتصام في الفصل الاول:

حضرت ابو ہریرہ کی وہ حدیث مکمل یوں ہے: كفى بالمرء كذبا ان يحدث لكل ما سمع اور اولیٰ یہ تھا کہ یوں فرماتے: في الفصل الاول من باب الاعتصام۔ حدیث کو باب الاعتصام کے مقابلہ میں یہاں ذکر کرنا بھی مناسب تھا۔ پس یہ اعتذار جو اعتراض کو متضمن ہے خود ان ہی پر رد ہے۔

تخریج: اس حدیث کے رواۃ صحیحین کے رجال ہیں۔ سوائے ابو عبداللہ جشمی کے' جو جندب سے روایت نقل کر رہے ہیں۔ ابو داؤد کے علاوہ اور کوئی بھی ان سے روایت نہیں کرتا۔ اور نہ ان کے بارے میں کسی نے کلام کیا ہے۔

(كذا نقله ميركؒ عن التصحيح)

اس حدیث کو بخاریؒ، ابو داؤدؒ اور ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔ میرکؒ فرماتے ہیں: سب نے اس حدیث کو ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: **ان اعرابيا دخل المسجد فصلى فيه ثم دعا فقال: اللهم ارحمني ومحمدا ولا ترحم معنا أحدا، فقال النبي ﷺ: لقد تحجرت واسعا** صاحب "النہایہ" اس کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یعنی تو نے اس شے کو تنگ کر دیا جس کو اللہ نے وسیع کیا تھا۔

اس دیہاتی نے چونکہ اپنی دعا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کو مخصوص و محدود کر دیا تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے اپنے مذکورہ الفاظ کے ذریعہ گویا اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ دعا میں اپنے مطلوب کو اس طرح محدود و مخصوص نہ کرنا چاہئے۔ یعنی یہ دعا نہ مانگنی چاہئے کہ فلاں بات بس ہمارے ہی لئے ہو دوسرے کے لئے نہ ہو بلکہ اس میں تمام مؤمنین و مؤمنات کو داخل کرنا چاہئے۔

فاسق کی تعریف سے عرش کانپ اٹھتا ہے

۴۸۵۹: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا مُدِحَ الْفَاسِقُ غَضِبَ الرَّبُّ تَعَالٰى وَاهْتَزَّ لَهُ الْعَرْشُ ۔ (رواه البيهقي في شعب الايمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٤ / ٢٣٠ الحديث رقم ٤٨٨٦۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اور اس سے عرش کانپ اٹھتا ہے۔ (بیہقی)

تشریح: اپنے ظاہری مفہوم پر محمول ہے کہ جب کسی فاسق و فاجر کی تعریف کی جاتی ہے تو عرش الٰہی واقعتاً کانپنے لگتا ہے اور قریب ہوتا ہے کہ حرکت میں آجائے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے غصہ کی عظمت کے اثر کی ہیبت سے ریت کی طرح تہہ بتہہ ہو جائے۔ اور اس کی نظیر یہ فرمان جل شانہ: ﴿تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا﴾ [مریم: ۹۰۔ ۹۱] "قریب ہے کہ اس (افترا) سے آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ پارہ پارہ ہو کر گر پڑیں کہ انہوں نے خدا کے لئے بیٹا تجویز کیا۔"

امام طیبیؒ فرماتے ہیں "اہتزاز عرش" ایک امر عظیم کے وقوع سے عبارت ہے۔ یعنی ان الفاظ کے ذریعہ اس بات کو بطور کنایہ بیان کرنا مقصود ہے کہ فاسق کی تعریف وتوصیف ایک بہت ہی ہیبت ناک بات اور انتہائی سنگین برائی ہے اور اس ہیبتنا کی کی وجہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ جب کوئی شخص کسی فاسق کی تعریف میں رطب اللسان ہوتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ تعریف کرنے والا گویا ان اوامر وافعال سے راضی اور خوش ہے جو اس فاسق کی زندگی میں پائے جاتے ہیں) بلکہ عجب نہیں کہ تعریف کرنے والا کفر کی حد میں داخل ہو جائے کیونکہ فاسق کی تعریف اس کو اس مقام تک لے جا سکتی ہے۔ جہاں وہ حرام کو حلال جاننے لگے اس سے معلوم ہوا کہ بے عمل اور دنیا دار علماء گمراہی شعراء اور ریا کار دپیشہ ور قراء کی مدح وتعریف کرنا بھی اس حکم میں داخل ہے نیز اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جب فاسق کی مدح وتعریف کرنے کا یہ حال ہے تو ظالم کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہونا کسی درجہ ہیبت ناک برائی ہوگی حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ﴾ [هود: ۱۱۳] نیز اس سے بچنا اس صورت میں ممکن ہے جب کہ ان لوگوں کی صحبت وہم نشینی سے اجتناب کیا جائے۔

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے نام ایک خط:

امام زہریؒ نے جب سلاطین کے ساتھ میل ملاپ شروع کر دیا تو ان کو ان کے ایک دینی بھائی نے یہ خط لکھا:

اے ابو بکر! اللہ ہمیں اور تجھے فتنوں سے عافیت عطاء فرمائے۔ آپ ایسے حال کو پہنچ گئے ہیں کہ جس کو بھی پتہ چلے اس کو چاہئے کہ وہ آپ کیلئے دعا کرے، اور آپ کے لئے رحم مانگے، آپ بوڑھے کھوسٹ ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی آپ کو فہم عطا کی اور آپ کو اپنے نبی کی سنت سکھلائی ' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿لتبيننه للناس و لا تكتمونه﴾ [آل عمران۔۱۸۷] جان لو! آسان سے آسان کام کہ جس کا آپ نے ارتکاب کیا اور ہلکی سے ہلکی چیز جو آپ نے اٹھائی وہ یہ ہے کہ آپ نے ظالم کی وحشت سے انس پالیا ہے۔ اور گمراہی کا راستہ آسان کر لیا ہے، ایسے شخص کے قرب کے ذریعے کہ جو کوئی حق ادا نہیں کرتا، اس نے آپ کو جب سے قریب کیا کوئی باطل کام نہیں چھوڑا۔ تمہیں ایسا قطب بنا لیا ہے، کہ جس کے گرد ان کے باطل کی چکی گھومتی ہے، تمہیں ایسا پل بنا لیا ہے کہ جس کو عبور کر کے وہ اپنی بلاؤں تک پہنچ رہے ہیں۔ تمہیں ایسی سیڑھی بنا لیا ہے، کہ جس پر چڑھ کر وہ اپنی گمراہیوں تک پہنچ رہے ہیں۔ آپ کے ذریعہ سے علماء کو مشکوک کیا جا رہا ہے۔ آپ کے ذریعہ جاہلوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں ' پس وہ کس قدر تھوڑا ہے جو انہوں نے آپ کے لئے آباد کیا ہے بنسبت اس کے جو انہوں نے آپ کا خراب کیا ہے ' اور وہ کتنا زیادہ ہے جو انہوں نے آپ سے لیا بنسبت اس کے جو انہوں نے آپ کے دین میں بگاڑ پیدا کیا۔ اب اس سے مأمون نہیں رہے کہ آپ کا شمار بھی ان لوگوں میں ہو، کہ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فخلف من بعده خلف اضاعوا الصلوٰة واتبعوا الشهوات فسوف يلقون غيا﴾ [مریم۔۵۹] آپ اپنے دین کی دوا دارو کریں، آپ کے دین میں سقم داخل ہو گیا ہے، اور آپ کا توشہ کمزور پڑ گیا ہے۔ دور کا سفر آن حاضر ہوا، آسمان وزمین کی کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں۔ والسلام

مؤمن میں خیانت وجھوٹ نہیں

۴۸۶۰: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَى الْخِلَالِ كُلِّهَا اِلَّا الْخِيَانَةَ وَالْكَذِبَ۔ (رواہ احمد)

أخرجه احمد في المسند ٥/٢٥٢۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤمن تمام (اچھی) خصلتوں پر پیدا کیا گیا ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔ (احمد)

تشریح: يطبع: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ای يخلق و يجبل۔ ''خلا'' بمعنی خصال اوراسی کے وزن پر ہے۔یعنی مؤمن جھوٹ اور خیانت کے سوا ہر طرح کے تمام اخلاق ذمیمہ خصلت پر پیدا کیا جا سکتا ہے۔چونکہ کلام اسی کے بارے میں ہے۔ یا ہر طرح کی خصلت سے مراد اعم معنی ہے۔

صاحب النہایہ لکھتے ہیں: يطبع عليها اى يخلق ۔ والطباع ما ركب في الانسان من جميع الاخلاق التي لايكاد يزا ولها من الخير والشر۔ الخيانة و الكذب دونوں منصوب ہیں۔(اور ان بمعنی غیر ہے۔) ای غیرھما۔

اس ارشادگرامی کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ کامل مؤمن میں یہ دو خصلتیں نہیں ہو سکتیں بلکہ اس کے اجزاءِ ترکیبی میں صدق و امانت کے اوصاف ہوتے ہیں جو تصدیق وایمان کا تقاضا ہیں اس لئے اللہ جل شانہ نے (اس آیت) بصیغہ حضرت ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ﴾[النحل: ۱۰۵] ''جھوٹ افترا تو وہی لوگ کیا کرتے ہیں جو خدا کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے اور وہی جھوٹے ہیں۔'' ای الكاملون في الكذب أو المجبولون عليه۔ امام احمد اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: لا ايمان لمن لا أمانة له۔ پس مؤمن سے جو جھوٹ صادر ہوتی ہے وہ اس کی طبیعت کے عارضی یا اس ارشادگرامی کی مراد مؤمن کی ذات میں ان دونوں خصلتوں کی مبالغہ کے ساتھ نفی کرنا مقصود ہے (یعنی یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ مؤمن جو ایمان کے بار امانت کا حامل ہے ان دو خصلتوں میں مبتلا نہیں ہو سکتا) خیانت اور جھوٹ یہ دونوں برائیاں درحقیقت مؤمن کے منافی ہیں۔چونکہ ''ایمان'' ''امن'' سے ماخوذ ہے۔اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ تکذیب ومخالفت سے مأمون ہو۔اور دوسری وجہ یہ کہ مؤمن اللہ تعالیٰ کی امانت کا حاصل ہوتا ہے لہٰذا مناسب وضروری یہی ہے کہ وہ امین ہو نا کہ خائن۔

۴۸۶۱: وَالْبَيْهَقِيُّ وَفِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِيْ وَقَّاصٍ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٤/٢٠٧ الحديث رقم ٤٨٠٩۔

یہ روایت بیہقی نے شعب الایمان میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

قوله: والبيهقي: بعض نسخوں میں ''ورواه بيهقي'' کے الفاظ ہیں، یہ زیادہ واضح ہے۔

الجامع الصغیر کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: يطبع المؤمن على كل خلق ليس الخيانه والكذب اس روایت کو

امام بیہقی رحمہ اللہ نے شعب الایمان میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔

مؤمن جھوٹا نہیں ہوسکتا

۴۸۶۲: وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ اَنَّهُ قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا قَالَ نَعَمْ فَقِيْلَ لَهُ اَيَكُوْنُ بَخِيْلًا قَالَ نَعَمْ فَقِيْلَ لَهُ يَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ كَذَّابًا قَالَ لَا۔

(رواه مالك والبيهقي في شعب الايمان مرسلا)

أخرجه مالك في الموطأ ۲/۹۹۰ الحديث رقم ۱۹من كتاب الكلام، واحمد في المسند ۲۸۸ والبيهقي في شعب الايمان ۴۰/۲۰۷ الحديث رقم ۴۸۳۲۔

ترجمہ: حضرت صفوان بن سلیم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ کیا مؤمن بزدل ہوسکتا ہے؟ فرمایا ہاں! پھر عرض کیا گیا مؤمن کنجوس و بخیل ہوسکتا ہے؟ فرمایا: جی ہاں! پھر عرض کیا گیا مؤمن جھوٹا ہوسکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں! مالکؒ نے بیہقی سے شعب الایمان میں مرسل روایت کی ہے۔

تشریح: جبانا: جیم کے فتحہ اور بائے موحدہ کی تخفیف کے ساتھ ہے۔ یہ ''شجاع'' کا متضاد ہے۔ یعنی مؤمن جبلی طور پر اور مطلقاً بھی بزدل ہوسکتا ہے۔

قولہ: أيكون المؤمن بخيلا:

یعنی کیا مؤمن طبعی طور بخیل ہوسکتا ہے؟ جیسا کہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: [﴿وكان الانسان قتورا﴾ [الاسراء ۱۰۰] سوال کرنے کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کیا مؤمن واجبات مالیہ کی ادائیگی میں بخیل ہوسکتا ہے؟ کیونکہ وہ مال کی طرف بہت میلان رکھتا ہے۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا' ہاں ہوسکتا ہے' لیکن یہ بخل مطلق ایمان کے یا ایمان کامل کے منافی نہیں ہے۔

قولہ: أيكون المؤمن كذابا: اس سوال کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں: ① کیا مؤمن بہت جھوٹا ہوسکتا ہے؟ ② کیا مؤمن خلقت وطبع کے اعتبار سے جھوٹا ہوسکتا ہے؟

عرضِ مرتب:

اس حدیث کے تحت صاحب مظاہر حق کے ذکر کردہ کلام کا کچھ نقل کرنا یقیناً فائدہ سے خالی نہیں ہوگا چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

مؤمن کذاب: میں صیغوی اعتبار سے دو احتمال ہیں: (۱) مبالغہ کا صیغہ ہے۔ (بہت زیادہ جھوٹا) ② اسم منسوب ہے۔ ذو کذب کے معنی میں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی مؤمن کسی موقع پر بزدلی دکھا سکتا ہے اور کسی صورت میں بخیل بھی ہوسکتا ہے لیکن وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایمان کی صداقت وحقانیت کذب کے منافی ہے جو اپنی اصلی اور نفس الامر کے اعتبار سے باطل (ناحق) ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ حدیث بھی اوپر کی حدیث کی تشریح میں ذکر کردہ تاویلات پر محمول ہے۔

حدیث میں '' کذاب '' مبالغہ کے صیغہ کے ساتھ ذکر کرنا' اس امر کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اگر بتقاضائے بشریت کسی

موقع پر مؤمن سے جھوٹ سرزد ہو جائے جیسا کہ بعض صورتوں میں دنیا کی کسی ناجائز غرض کے تحت نہیں بلکہ مصالح اور حکمت عملی کے پیش نظر جھوٹ بولنا بھی ضروری ہو جاتا ہے تو ایسی صورت مستثنیٰ ہے اس کو ایمان کے منافی نہیں کہا جائے گا۔

شیطان کی ایک چال

۴۸۶۳: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَتَمَثَّلُ فِيْ صُوْرَةِ الرَّجُلِ فَيَاتِي الْقَوْمَ فَيُحَدِّثُهُمْ بِالْحَدِيْثِ مِنَ الْكَذِبِ فَيَتَفَرَّقُوْنَ فَيَقُوْلُ الرَّجُلُ مِنْهُمْ سَمِعْتُ رَجُلاً اَعْرِفُ وَجْهَهٗ وَلَا اَدْرِىْ مَا اسْمُهٗ يُحَدِّثُ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١ /٦٨ الحديث رقم (٧٣-٤٦)، واحمد في المسند ٣ /٨٩٨۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شیطان انسانی صورت میں کسی قوم کے پاس آتا ہے اور انہیں کسی جھوٹی بات کی اطلاع دیتا ہے لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ یہ بات میں نے ایسے شخص سے سنی ہے جس کی شکل پہچانتا ہوں مگر میں اس کا نام نہیں جانتا۔ (مسلم)

تشریح: ''خبر'' سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے چونکہ حدیث کی بابت جھوٹ بولنا' جھوٹ کی بدترین قسم ہے 'حتی کہ اس کو کفر شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے رئیس الشیاطین اس کا اہتمام کرتا ہے اور صورت حسیہ دھار کر آتا ہے' تاکہ اندرونی معنوی وسوسہ کو تقویت ملے۔ اس معنی کے اعتبار سے مناسب یہ تھا کہ اس حدیث کو 'باب الاعتصام' میں ذکر کیا جاتا اور کوئی بعید نہیں کہ یہاں ''خبر'' سے مراد مطلق کوئی بھی جھوٹی خبر و اطلاع ہو۔ یا ایسی خبر مراد ہو کہ جس پر فساد برپا ہوتا ہے۔ مثلاً بہتان' قذف اور جیسے دیگر امور اور شیطان سے مراد اس جنس کا ایک فرد مراد ہے! امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس میں تنبیہ ہے اس بات کی طرف کہ کوئی بھی خبر یا کوئی بھی بات کسی سے سنے تو اس وقت تک دوسروں کے سامنے نقل نہ کرے جب تک کہ یہ تحقیق نہ کر لے کہ اس بات کو بیان کرنے والا سچا ہے کہ اس کا کلام نقل کرنا جائز ہو؟ یا یہ کاذب ہے کہ جس کا کلام نقل کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ جیسا کہ مروی ہے: **كفى بالمرء كذبا أن يحدث بكل ماسمع۔**

عرضِ مرتب:

روایت اگرچہ بطریق مرفوع نقل نہیں کی گئی ہے بلکہ بطریق موقوف ہے مگر کوئی صحابی ایسی کوئی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے بغیر اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہ روایت مرفوع حدیث ہی کے حکم میں ہے۔

برے دوست سے تنہائی بہتر

۴۸۶۴: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حِطَّانَ قَالَ اَتَيْتُ اَبَا ذَرٍّ فَوَجَدْتُّهٗ فِي الْمَسْجِدِ مُحْتَبِيًا بِكِسَاءٍ اَسْوَدَ وَحْدَهٗ فَقُلْتُ يَا اَبَا ذَرٍّ مَا هٰذِهِ الْوَحْدَةُ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ

اَلْوَحْدَةُ خَيْرٌ مِّنْ جَلِيْسِ السُّوْءِ وَالْجَلِيْسُ الصَّالِحُ خَيْرٌ مِّنَ الْوَحْدَةِ وَاِمْلَاءُ الْخَيْرِ خَيْرٌ مِّنَ السُّكُوْتِ وَالسُّكُوْتُ خَيْرٌ مِّنْ اِمْلَاءِ الشَّرِّ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٤/ ٢٥٦ الحديث رقم ٤٩٩٣۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حطان کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے انہیں سیاہ چادر میں ٹیک لگائے (گوٹ مارے) ہوئے پایا۔ میں نے عرض کیا اے ابوذر! یہ تنہائی کیوں؟ انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ برے دوست سے تنہائی بہتر ہے اور اچھا دوست تنہائی سے بہتر ہے اور اچھی بات کرنا خاموشی سے بہتر ہے اور خاموشی بری بات کہنے سے بہتر ہے۔ (بیہقی)

تشریح: وحدہ: "متوحدا" یا "منفردا" کے معنی میں ہو کر حال ہے۔

ماھذہ الوحدة: یعنی یہ تنہائی کیسی؟ تنہائی سے تو وحشت ہوتی ہے۔ یوں تنہا بیٹھنے کا کیا سبب و باعث ہے؟

السوء: سین کے فتحہ اور ضمہ پر دو کے ساتھ درست ہے۔

الجامع الصغیر میں ہے کہ اس حدیث کو امام بیہقی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

خاموشی ساٹھ برس کی عبادت سے افضل

۴۸۶۵: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَقَامُ الرَّجُلِ بِالصَّمْتِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةً۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٤/ ٢٤٥ الحديث رقم ٤٩٥٣۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی کا مقام و مرتبہ جو اسے خاموشی سے ملتا ہے وہ ساٹھ برس کی عبادت سے افضل ہے۔ یہ بیہقی میں ہے۔

تشریح: "مقام" میم کے فتحہ کے ساتھ ہے اور میم کے ضمہ کے ساتھ بھی منقول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کا بری باتوں سے خاموشی اختیار کرنا اور اسی خاموشی پر مداومت و ہمیشگی کے ساتھ عمل پیرا اور ثابت قدم رہنا اس شخص کی ساٹھ سال کی عبادت سے بھی بہتر و افضل ہے جو کثرت کلام اور زبان کی بے احتیاطی میں مبتلا ہو

امام طیبیؒ نے "مقام" کی تشریح "عنداللہ" سے بیان کی ہے یعنی اللہ کے نزدیک اس کا مرتبہ۔

امام طیبیؒ اس کے افضل ہونے کی یہ دلیل بیان کی ہے کہ عبادات میں بہت سی آفات بھی پیش آتی ہیں اور جو شخص خاموشی اختیار کر لیتا ہے وہ ان آفات سے محفوظ و سلامتی میں رہتا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے: من صمت نجا۔ یعنی جو شخص چپ رہا اس نے نجات پائی۔

عرضِ مرتب:

اس موقع پر شیخ عبدالحقؒ کا کلام (بحوالہ مظاہر حق) نقل کرنا نہایت مفید ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

چپ رہنے کی وجہ سے جو درجہ حاصل ہوتا ہے کبھی وہ خدا کے نزدیک ساٹھ سال کی عبادت سے بھی افضل اور افزوں تر قرار پاتا ہے کیونکہ وہ خاموشی کہ جس کے دوران اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اس کی قدرتوں اور کائنات ومخلوقات کے تئیں اس کی حکمت آفرینی وکارسازی میں غور وفکر کو راہ ملے یا لطیفہ قلب کو ذکر خفی میں استغراق وانہماک دولت نصیب ہو اور روح و باطن کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے نور سے روشنی حاصل کرنے کا موقع ملے تو یہ فکر واستغراق اگرچہ ایک ہی لمحہ وساعت کے بقدر کیوں نہ ہو لیکن اعضا وجوارح کی اس عبادت وطاعت سے کہیں زیادہ بہتر وافضل ہے جو ذہن وفکر کے انتشار' بے حضوری قلب اور یاد الٰہی کے ساتھ غیر خاطر جمعی کے ساتھ عمل میں آئے اگرچہ وہ عبادت وطاعات سالہا سال کے بقدر ہی کیوں نہ ہو۔

تخریج وتوضیح: جامع صغیر میں ہے کہ طبرانی اور حاکم نے اس کے ہم معنی روایت حضرت عمران سے نقل کی ہے لیکن اس کے الفاظ یہ ہیں: مقام الرجل في الصف في سبيل الله .اھ۔ شاید کہ لفظ ''صمت'' میں تحریف ہوئی ہے۔ اصول کی طرف مراجعت کی جائے۔

عرضِ مرتب:

مذکورہ بالا حدیث ''جمع الفوائد'' میں مع تخریج یوں منقول ہے:

(عمران بن حصن) رفعه، مقام الرجل في الصف في سبيل الله افضل من عبادته ستين سنة. للكبير والبزار بلين. وفيه عبد الله بن صالح كاتب ليث وثقه احمد وغيره وفية رجاله ثقات. كذا في مجمع الزوائد: ٣٢٧/٥ كما رواه الحاكم وقال صحيح على شرط الخباری كذا في الترغيب: ٢٨٥/٣۔ ١ھ۔

سات زرّیں نصائح

٤٨٦٦: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ الْحَدِيْثَ بِطُوْلِهٖ اِلٰى اَنْ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوْصِنِیْ قَالَ وَاُوْصِيْكَ بِتَقْوَى اللّٰهِ فَاِنَّهٗ اَزْيَنُ لِاَمْرِكَ كُلِّهٖ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ عَلَيْكَ بِتِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ وَذِكْرِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَاِنَّهٗ ذِكْرٌ لَّكَ فِی السَّمَاءِ وَنُوْرٌ لَّكَ فِی الْاَرْضِ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ عَلَيْكَ بِطُوْلِ الصَّمْتِ فَاِنَّهٗ مَطْرَدَةٌ لِّلشَّيْطَانِ لَكَ عَلٰى اَمْرِ دِيْنِكَ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ اِيَّاكَ وَكَثْرَةَ الضِّحْكِ فَاِنَّهٗ يُمِيْتُ الْقَلْبَ وَيَذْهَبُ بِنُوْرِ الْوَجْهِ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ قُلِ الْحَقَّ وَاِنْ كَانَ مُرًّا قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ لَا تَخَفْ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ لِيَحْجُزْكَ عَنِ النَّاسِ مَاتَعْلَمُ مِنْ نَّفْسِكَ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٢٤٢/٤ الحديث رقم ٤٩٤٢۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس کے بعد انہوں نے طویل روایت بیان کی یہاں تک کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے وصیت فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

① میں تجھے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ یہ تیرے تمام امور کے لئے بہترین زینت ہے۔ میں نے عرض کیا اس پر اضافہ فرمائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ② تلاوتِ قرآن اور ذکر اللہ کو لازم پکڑ دو وہ تیرا آسمانوں میں تذکرہ اور زمین میں نور ہے میں نے عرض کیا اس میں اضافہ فرمائیں۔ ③ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا طویل خاموشی اختیار کرو۔ یہ تیرے امور دین میں تیری معاون اور شیطان کو بھگانے کا باعث ہے۔ میں نے اضافہ کا کہا تو فرمایا ④ اپنے آپ کو کثرت ضحک (بہت زیادہ ہنسنے) سے بچا کر رکھ کیونکہ یہ دل کو مردہ بنا دیتا ہے اور چہرے کے نور کو دور کر دیتا ہے۔ میں نے عرض کیا اور فرمائیں۔ فرمایا ⑤ حق بات کہو خواہ وہ کڑوی ہو۔ میں نے اضافہ طلب کیا تو فرمایا: ⑥ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کرو۔ میں نے عرض کیا مزید اضافہ فرمائیں فرمایا: ⑦ تمہیں اپنے عیوب کا علم دوسروں کے عیوب سے مانع بنا دے۔ (بیہقی)

تشریح: قوله: أوصيك بتقوى الله فانه أزين لامرك كله: یہ وہ صفت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اولین کو بھی فرمائی اور آخرین کو بھی فرمائی۔ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا﴾ [النساء: ۱۳۱] ”اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے اور جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی ان کو بھی اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو بھی ہم نے حکم تاکید کیا ہے کہ خدا سے ڈرتے رہو اور اگر کفر کرو گے تو (سمجھ رکھو کہ) جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے اور خدا بے پروا اور سزاوار حمد و ثنا ہے“۔

ہر ایک کام اور ہر بھلی بات جو محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور اس کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے صادر و سرزد ہو ذکر اللہ میں داخل ہے اگر اس جملہ وَعَلَيْكَ بِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ وَذِكْرِ اللّٰهِ یعنی سب ذکروں میں افضل لا الہ الا اللہ ہے تو کہا جائے گا کہ مذکورہ جملہ اس اسلوب بیان کا مظہر ہے کہ جس میں کوئی بات پہلے عمومی طور پر ذکر کی جاتی ہے اور پھر کسی ایسے جز کو خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے جو تمام اجزاء سے زیادہ شرف و فضیلت رکھتا ہو۔

(اس جملہ) ”کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرو“۔ کے ذریعہ گویا یہ تلقین فرمائی گئی کہ خدا کے دین کو سربلند کرنے کا جو فریضہ تم پر عائد ہوتا ہے۔ اگر اس کی انجام دہی میں تمہیں دنیا والوں سے پوری طرح منہ موڑنا پڑے تو اس میں بھی کوئی ہچکچاہٹ نہ دکھاؤ اور اس بات کو ضروری سمجھو کہ تمہیں دنیا والوں کی مذمت اور تعریف سے بالکل بے پرواہ ہو کر ہر حالت میں حق و صداقت پر اور خدا کی اطاعت پر ثابت قدم رہنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴾ یعنی اور دنیا والوں سے منہ موڑ کر صرف اللہ کی رضا و خوشنودی کی طرف رجوع کرو۔

قوله: ليجزك عن الناس ماتعلم من نفسك: ليجزك: لام مکسور، یاء مفتوح، حائے مہملہ ساکن، جیم مضموم اور زاء ساکن ہے۔ من نفسك: (جار مجرور کے درمیان مضاف محذوف ہے۔) اى من عيوب نفسك۔

دیلمیؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے:

طوبٰى لمن شغله عيبه عن عيوب الناس

''مبارک باد کے قابل ہے وہ شخص جس کو اس کا عیب لوگوں کی عیب گیری سے باز رکھے''۔

ترازو میں بھاری وزن والی عادات

۴۸۶۷: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا اَبَاذَرٍّ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى خَصْلَتَيْنِ هُمَا اَخَفُّ عَلَى الظَّهْرِ وَاَثْقَلُ فِي الْمِيْزَانِ قَالَ قُلْتُ بَلٰى قَالَ طُوْلُ الصَّمْتِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا عَمِلَ الْخَلَائِقُ بِمِثْلِهِمَا۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٤/ ٢٤٢ الحديث رقم ٤٩٤١۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوذر رضی اللہ عنہ کیا میں تمہیں دو ایسی عادات نہ بتاؤں جو پیٹھ پر ہلکی اور ترازو میں بھاری ہیں؟ میں نے عرض کیا ضرور فرمائیں' فرمایا: ① طویل خاموشی۔ ② اچھے اخلاق مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! مخلوق نے ان جیسے عمل نہ کیے ہوں گے۔ (بیہقی)

تشریح: قوله: عن رسول الله: بعض نسخوں میں (عن رسول اللہ ﷺ کی بجائے) ان رسول اللہ ﷺ کے الفاظ ہیں۔

قوله: هما أخف علي الظهر: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: شیء معقول کو حسی شیء سے تشبیہ دی ہے۔ اور وجہ تشبیہ ''سہولت'' ہے۔ جیسا کہ اس حدیث میں ہے: کلمتان خفيفتان عل اللسان ثقيلتان في الميزان.

عرضِ مرتب:

اس حدیث کے تحت صاحب مظاہر حق نے بہت پیارا کلام کیا ہے جو پیش خدمت ہے۔ لکھتے ہیں:: چپ رہنا اور خوش خلقی اختیار کرنا یہ دونوں خصلتیں اس اعتبار سے بہت آسان اور ہلکی ہیں کہ خاموش رہنے میں کوئی محنت و مشقت برداشت کرنا نہیں پڑتی' بلکہ ایک طرح سے راحت ہی ملتی ہے کیونکہ زبان ہلانے اور الفاظ کو ترتیب دے کر جملے ادا کرنے میں ظاہر و باطن کی مشقت اٹھانا پڑتی ہے۔ اسی پر خوش خلقی کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نرم خوئی اور خوش مزاجی اور خندہ روئی میں راحت و سکون اور آسانی و نرمی حاصل ہوتی ہے' بخلاف سخت خوئی' تندمزاجی اور جدال و نزاع کے کہ ان میں سراسر محنت و مشقت ہے۔ اھ۔

بمثلها: باء زائدہ ہے۔ ای ما عمل الخلائق عملين مثل عملهما۔ یا ''عمل'' بمعنی ''اتی'' ہے۔ ای ما أتوا بمثلهما من الأعمال

میرکؒ منذری سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں اس حدیث کو ابن ابی الدنیا، بزار، طبرانی اور ابو یعلی نے ثقہ راویوں سے روایت کیا ہے۔ بیہقی اور ابوالشیخ ابن حبان نے اس کو ابودرداء سے ان الفاظ کیساتھ روایت کیا ہے:

قال: قال رسول الله ﷺ: الا انبئك بأمرين خفيف امرهما عظيم اجرهما، لم تلق الله عز وجل بمثلها: طول الصمت وحسن الخلق.

اس حدیث کو ابن ابی الدنیا صفوان بن سلیم سے مرسلاً روایت کرتے ہیں:

قال:قال رسول الله ﷺ:الا أخبركم بايسر العبادة واهو نها على البدن؟ الصمت وحسن الخلق.

لعنت وصدیقیت جمع نہیں ہو سکتے

۴۸۶۸:وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَرَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاَبِيْ بَكْرٍ وَهُوَ يَلْعَنُ بَعْضَ رَقِيْقِهٖ فَالْتَفَتَ اِلَيْهِ فَقَالَ لَعَّانِيْنَ وَصِدِّيْقِيْنَ كَلَّاوَرَبِّ الْكَعْبَةِ فَاَعْتَقَ اَبُوْبَكْرٍ يَوْمَئِذٍ بَعْضَ رَقِيْقِهٖ ثُمَّ جَآءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَا اَعُوْدُ۔ (رواه البيهقي الاحاديث الخمسة في شعب الايمان)

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ٤/٤٩٤ الحديث رقم ٥١٥٤۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس سے.....گزرے جب کہ وہ اپنے ایک غلام کو لعنت کر رہے تھے۔آپ ﷺ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کیا تم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو لعنت کرنے والے بھی ہوں اور صدیق بھی ہوں؟ رب کعبہ کی قسم! ہرگز ایسا نہیں۔حضرت ابوبکرؓ نے اس دن اپنے کئی غلام آزاد کر دیئے پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا آئندہ ایسا نہ کروں گا۔یہ پانچوں روایات بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کی ہیں۔

تشریح: قوله:فالتفت اليه:بعض نسخوں میں''فالتفت''کے بعد''النبی ﷺ ''کا اضافہ بھی ہے۔ای فالتفت النبی ﷺ ابی أبی بکر۔غائب کی ان دونوں ضمیروں کا مرجع اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ای فالتفت أبوبکر الی النبی ﷺ۔

قوله:لعانين وصديقين:صدر کلام میں ہمزہ استفہامیہ مقدر ہے۔ أی:هل رأيت لعانين وصديقين؟

یعنی کیا تم نے کبھی بھی کوئی ایسا شخص دیکھا کہ جس میں بیک وقت یہ دونوں صفتیں (یعنی لعانیت اور صدیقیت) پائی جاتی ہوں اور عطف تغایر صفت کیلئے ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ جمع کا صیغہ لانا صدیق کی تعظیم کے پیش نظر ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں:ای:هل رأيت صديقا يكون لعانا؟ كلا والله لا تتراء ى ناراهما.لہٰذا واؤ جمع کیلئے ہے۔یعنی دونوں صفات کبھی بھی جمع نہیں ہو سکتیں۔اس اعتبار سے یہ کلام تعجب پر محمول ہے۔

تخریج: اس حدیث کو ابن ابی الدنیا نے''خاموشی کا بیان''میں ذکر کیا ہے۔ابن ابی الدنیا کے شیخ بشار بن موسیٰ الخفاف ہیں۔جمہور نے ان کی تضعیف کی ہے۔احمدؒ ان کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔(ذکرہ العراقی)

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا زبان نے مجھے مقامات ہلاکت میں ڈالا

۴۸۶۹:وَعَنْ اَسْلَمَ قَالَ اِنَّ عُمَرَ دَخَلَ يَوْماً عَلٰى اَبِيْ بَكْرٍ اِلصِّدِّيْقِ وَهُوَ يَجْبِذُ لِسَانَهٗ فَقَالَ عُمَرُ مَهْ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ فَقَالَ لَهٗ اَبُوْبَكْرٍ اِنَّ هٰذَا اَوْرَدَنِيَ الْمَوَارِدَ۔ (رواه مالك)

أخرجه مالك في الموطأ ٢/ ٩٨٨ الحديث رقم ١٢۔

ترجمہ: حضرت اسلمؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو وہ اپنی زبان کو کھینچ رہے تھے' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے۔ ٹھہریئے! اس پر حضرت ابوبکر کہنے لگے اس نے مجھے ہلاکت کے مقامات میں ڈالا ہے۔ (مالک)

تشریح: یجبذ: اس لفظ کے بارے میں لغویین کی آراء مختلف ہیں:

- في المغرب: الجبذ بمعنٰى الجذب، وكلاهما من باب ضرب.
- قال الطيبيؒ: وفي النهاية: الجبذ لغة في الجذب، وقيل هو بمقلوب منه.اھ۔
- وفي القاموس: الجبذ الجذب وليس مقلوبه، بل لغة صحيحة و وهم الجوهري وغيره.

مه: میم کے فتحہ اور ہاء کے کسرہ کے ساتھ اسم فعل ہے بمعنی اكفف غفر الله لك: یہ جملہ دعائیہ ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اخبار ہو۔ اور انہوں نے ان کے بارے میں یہ بات سنی ہو۔

هذا: اس کا مشار الیہ "لسان" ہے' اور یہاں اسم اشارہ برائے تعظیم یا برائے تحقیر ہے۔

تخریج: اس حدیث کو ابن ابی الدنیا نے بھی ذکر کیا ہے۔

بیہقی کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

قال: ان هذا اوردني شر الموارد ان رسول الله ﷺ قال: ليس شيء من الجسد الا يشكوا الى الله ذرب اللسان على حدته. (كذا نقله ميرك عن المنذري)

عراقیؒ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ذکر کئے ہیں:

اطلع على ابي بكر وهو يمد لسانه فقال: ما تصنع يا خليفة الله ؟فقال ان هذا أوردني الموارد، ان رسول الله ﷺ قال: ليس شيء من الجسد الا يشكوا الى الله اللسان على حدته.

اس حدیث کو ابن ابی الدنیا نے "الصمت" میں، ابویعلی نے اپنی مسند میں' دارقطنیؒ نے "العلل" میں اور بیہقی نے "الشعب" میں اسلم مولیٰ عمر کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ دارقطنی کا کہنا ہے کہ دراوردی کا اس حدیث کو مرفوع کہنا وہم ہے۔ اور فرمایا: قیس بن ابی حازم عن ابی بکر کے طریق میں کوئی علت نہیں ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ آثار میں ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بات چیت سے روکنے کیلئے اپنے منہ میں کنکر رکھا کرتے تھے اور اپنی زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے تھے: هذا الذي أوردني الموارد.

چھ چیزوں کی ضمانت پر جنت کی بشارت

۴۸۷۰: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِضْمَنُوْا لِي سِتًّا مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَضْمَنْ لَكُمُ الْجَنَّةَ اُصْدُقُوْا اِذَا حَدَّثْتُمْ وَاَوْفُوْا اِذَا وَعَدْتُّمْ وَاَدُّوْا اِذَا ائْتُمِنْتُمْ وَاحْفَظُوْا فُرُوْجَكُمْ

وَغُضُّوْا اَبْصَارَكُمْ وَكُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ۔

أخرجه احمد في المسند ۱/۲۵۷، والبيهقي في شعب الايمان ۳۲۰/٤ الحديث رقم ۵۲۵٦، والترمذي في ۲۸۳/٤ الحديث رقم ۱۹۱۹۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنے نفس کی طرف سے چھ چیزوں کی ضمانت دو میں تمہیں جنت کی بشارت دیتا ہوں: ① بات کے وقت سچ بولو۔ ② وعدہ وفا کرو۔ ③ امانت میں خیانت نہ کرو۔ ④ شرمگاہوں کی حفاظت کرو۔ ⑤ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھو۔ ⑥ اپنے ہاتھوں کو (حرام چیزوں سے) روکو۔ (احمد، بیہقی)

تشریح: قولہ: اضمنوا الی ستاً من انفسکم: اضمنوا : میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

اصدقوا: دال کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

ائتنم: بصیغہ مجہول ہے۔ غضوا: غین کے ضمہ اور فاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں: عبادہ کی حدیث کو احمد، ابن ابی الدنیا، ابن حبان نے اپنی صحیحین میں، علاوہ ازیں حاکم اور بیہقی نے بھی ذکر کیا ہے۔ ان سب نے یہ روایت مطلب بن عبداللہ بن حطب سے ذکر کی ہے اور امام حاکم نے اس کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے۔ منذری کا کہنا ہے کہ مطلب نے عبادہ سے سماع نہیں کیا ہے۔

اور الجامع الصغیر میں یہ الفاظ آئے ہیں:

اضمنوا لی ست خصال أضمن لكم الجنة: لا تظالموا عند قسمة مواريثكم، وانصفوا الناس من انفسكم، ولا تجنوا عند قتال عدوكم، ولا تغلوا غنائمكم، وامنعوا ظالمكم من مظلومكم.

اس کو طبرانیؒ نے ابی امامہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اھ۔

اللہ تعالیٰ کے بہترین وبدترین بندے

۴۸۷۱-۴۸۷۲ : وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ غَنْمٍ وَاَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خِيَارُ عِبَادِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ اِذَا رُؤُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ وَشِرَارُ عِبَادِ اللّٰهِ الْمَشَّاؤُوْنَ بِالنَّمِيْمَةِ الْمُفَرِّقُوْنَ بَيْنَ الْاَحِبَّةِ الْبَاغُوْنَ الْبُرَاءَ الْعَنَتَ ۔ (رواهما احمد والبيهقي في شعب الايمان)

أخرجه احمد في المسند ۲۲۷/٤، والبيهقي في الشعب ٤۹٤/۷ الحديث رقم ۱۱۱۰۸ وعن اسماء اخرجه احمد في المسند ٤۵٦/٦۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمن بن غنم رضی اللہ عنہ اور اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے بہترین بندے وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آئے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بدترین بندے وہ ہیں جو چغل خور، دوستوں

کے درمیان جدائی ڈالنے والے اور پاک لوگوں میں عیب کے متلاشی ہیں۔ (احمد، بیہقی، شعب الایمان)

تشریح: راؤوا ذکر اللّٰہ :دونوں فعل صیغہ مجہول کے ساتھ ہیں۔

المشاؤون: مبالغہ کا صیغہ ہے۔نسبت کے لئے آیا ہے۔

الباغون: ای الطالبون' امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ کہا جاتا ہے: **بغیت فلانا خیراء وبغیتك الشی طلبته لك وبغیت للشی طلبته** اھ۔اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ مفعول ثانی ہے۔

البراء: بائے موحدہ کے فتحہ اور راء کے ساتھ،مصدر ہے،''بریٔ'' کے معنی میں ہے۔''زید عدل'' کے قبیل سے ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں:''انت بریٔ۔ جمع بریئوون ہے'اوران اسماء کے اوزان پر بھی آتی ہے:فقھاء 'کرام 'اشراف أنصاء رجال کہاجاتا ہے: أنا براء منه، واحد تثنیہ،جمع مؤنث، مذکر سب کیلئے یکساں طور پر مستعمل ہے۔

ایک صحیح نسخہ میں بائے موحدہ کے ضمہ کے ساتھ''براء'' ہے۔یہ''بریٔ'' کی جمع ہے۔اور ایک نسخہ میں بائے موحدہ کے ضمہ راء اور ہمزہ ممدودہ کے ساتھ ہے۔امام نوویؒ شرح میں فرماتے ہیں یہ بروزن ''فضلاء'' ہے، بریٔ کی جمع ہے۔اھ۔

العنت : عین مہملہ کے فتحہ اور نون کے ساتھ مشقت،فساد،ہلاکت،گناہ،غلط،زنا۔''عنت'' کا اطلاق ان تمام معانی پر ہوتا ہے۔حدیث باب ان تمام معانی کو محتمل ہے۔اس کی تائید ان نسخوں سے ہوتی ہے جن میں لفظ'' براء'' باء کے ضمہ کے ساتھ آیا ہے۔

البراء العنت:امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ دونوں اسم ''الباغون'' کیلئے مفعول ہیں۔

اذا رؤوا ذکر اللّٰہ کا مطلب: ای تذکر برؤیتهم ذکر اللّٰہ ۔اس میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے: المؤمن مرآۃ القلوب۔

(۲۔۳)امام طیبیؒ نے اس کے دو مطلب بیان کئے ہیں:

(الف) خدا کے وہ نیک وصالح اور عبادت گزار بندے جو اللہ رب العزت کے ساتھ اپنے کمال تعلق واختصاص کی بنا پر ایسے درجے پر فائز ہوجاتے ہیں کہ ان کے احوال وکردار'عادت واطوار اور حرکات وسکنات پر انوار وآثار الٰہی ہویدا ہوتے ہیں اور ان کے چہرے پر عبادت گزاری اور اتباع دین وشریعت کی وہ علامتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ جب ان کے جمال پر نظر پڑتی ہے تو بے ساختہ خدا یاد آجاتا ہے۔

(ب) خدا کے ایسے نیک وصالح بندوں کو دیکھتے ہی ذکر الٰہی میں لگ جاتا ہے جیسا کہ ابن اثیر نے ''النهایه'' میں عمران بن حصین سے روایت کیا ہے: قال:قال رسول اللّٰہ ﷺ :النظر عَلٰی وَجْهِ عَلِيّ عِبَادَةٌ یعنی یعنی علی رضی اللہ عنہ کے چہرہ پر نظر کرنا عبادت ہے۔میں کہتا ہوں اس حدیث کو طبرانی اور حاکم نے ابو مسعود اور عمران بن حصین سے یوں روایت کیا ہے: النظر الی علیّ عبادۃٌ اور اس کی نظر وہ روایت ہے جو ابو الشیخ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً نقل کی ہے: النظر الی الکعبة عبادة نیز منقول ہے کہ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ گھر سے نکلتے تھے اور لوگوں کی نظر ان کے چہرۂ پُر نور پر پڑتی تھی تو لوگوں کی زبان پر یہ الفاظ آجاتے:لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ~~مَا اکرم~~ هٰذَا الْفَتٰی۔مَا اشجع هٰذَا الْفَتٰی' مَا اَعْلَمَ هٰذَا الْفَتٰی' مَا

احلم هٰذَا الْفَتٰى تو گویا لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھنا کلمہ توحید پر ابھارتا تھا۔

تخریج: الجامع الصغیر میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

خيار كم الذى اذا رؤوا ذكر الله بهم' وشرارهم المشاؤون بالنميمة، المفرقون بين الأحبة، الباغون البراء العنت رواه البيهقي عن ابن عمر.

نیز الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو احمد نے عبدالرحمٰن بن غنم سے اور طبرانی نے عبادہ بن صامت سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

خيار امتى الذين اذا رؤوا ذكر الله، وشرار امتي المشاؤون بالنميمة' المفرقون بين الاحبة 'الباغون البرا العنت.

غیبت کرنے والوں کو فوری تنبیہ

۴۸۷۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلَيْنِ صَلَّيَا صَلٰوةَ الظُّهْرِ اَوِ الْعَصْرِ وَكَانَا صَائِمَيْنِ فَلَمَّا قَضَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّلٰوةَ قَالَ اَعِيْدُوْا وُضُوْءَ كُمَا وَصَلٰوتَكُمَا وَامْضِيَا فِيْ صَوْمِكُمَا وَاقْضِيَاهُ يَوْماً اٰخَرَ قَالَا لِمَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اغْتَبْتُمْ فُلَانًا۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٣٠٣/٥ الحديث رقم ٦٧٢٩۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ دو آدمیوں نے نماز ظہر یا عصر ادا کی وہ دونوں حالت روزہ میں تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز مکمل فرمائی تو فرمایا اپنا وضو اور نماز لوٹاؤ اور روزہ جاری رکھو اور دوسرے دن اس کی قضاء کرو عرض کیا یا رسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے فلاں کی غیبت کی ہے۔ (بیہقی)

تشریح: وكان صائمين: اس کا عطف ہو رہا ہے (صليا صلاة الظهر پر) یا یہ حال ہے۔

اعيدا: مصنف کے پیش نظر نسخہ میں "اعيدوا" ہے۔ چنانچہ ملا علیؒ فرماتے ہیں بصیغہ جمع لانا اس بنیاد پر ہے کہ جمع کے اقل افراد دو ہیں اس کا قرینہ مابعد کلام ہے۔

امضيا: ہمزہ وصلی اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ۔ ای انفذا فی صومکما۔ یعنی دونوں اپنا روزہ مکمل کرو۔ یہ مضٰی فی امرہ سے ماخوذ ہے جس کا معنی آتا ہے: نفذ فيه ولم يتوقف۔

نماز وروزہ کی قضاء کا سبب:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: روزہ کی قضاء کی علت یہ حکم قرآنی ہے: ﴿اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا﴾ [الحجرات: ١٢] اور نماز کی قضاء کی علت یہ ہے کہ وہ حالِ نجاست ہے، بایں طور کہ اس نے اپنے بھائی کا خون پیا اور گوشت کھایا ہے۔ اھ۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ طاعت سے پہلے معصیت کا ارتکاب کرنے کے باعث طاعت کے کمال میں نقص آ جاتا ہے۔ جیسا کہ ''سیئہ'' کے بعد ''حسنہ'' کی بجا آوری سے ''سیئہ'' زائل ہو جاتی ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ [ھود: ۱۱٤] اس آیت کا شانِ نزول یہ تھا کہ ایک صاحب کسی اجنبیہ کا بوسہ لینے کے مرتکب ہوئے تھے۔

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیبت وضواور روزے کو توڑ دیتی ہے

علماء نے کہا ہے کہ یہ حدیث دراصل غیبت کی شدید مذمت اور غیبت کرنے والے کے حق میں سخت ترین زجروتنبیہ کے طور پر ارشاد ہوئی ہے اور بعض مرتبہ عبادت کو کلی طور پر لے جاتی ہے' کہ صاحب غیبت کو اس کی نفلی عبادت دی جاتی ہے' اور غیبت کرنے والا بغیر صوم وصلوۃ کے رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ان دونوں کے نماز کے اعادہ اور روزہ کی قضا کا حکم فرمایا۔ یہ حکم فتوئ خاصہ کے قبیل سے ہے نا کہ احکام عامہ کے قبیل سے۔ مسند فردوس دیلمی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعا مروی ہے: الغيبة تنقض الوضوء والصلاة۔ قوله: قالا لم يا رسول الله: اور ایک نسخہ میں'' فقالا'' ہے ورنہ حقیقت میں غیبت سے روزہ اور وضو ٹوٹتا نہیں تاہم غیبت کی وجہ سے عبادات کا کمال وثواب ضرور کھویا جاتا ہے۔ سفیان ثوریؒ کے نزدیک غیبت' مفسد روزہ ہے۔ بہرحال حدیث سے یہ بات یقیناً واضح ہوتی ہے کہ غیبت کی قباحت و برائی بہت زیادہ ہے اور احتیاط وتقویٰ کا تقاضا یہی ہے کہ اگر غیبت صادر ہو جائے تو وضو کی تجدید کرنا بہتر ہے) نیز روزہ دار کو چاہئے کہ غیبت سے پوری طرح اجتناب کرے۔

عرضِ مرتب:

مشہور ہے کہ روزے نہیں کاٹے جائیں گے، یعنی روزوں کی قرقی نہ ہوگی۔ یہ بات غلط ہے۔ مسلم شریف میں ایک حدیث آئی ہے، اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ روزے بھی قرقی ہوں گے۔ وہ حدیث یہ ہے: ان رسول الله ﷺ قال: أتدرون مالمفلس قالو المفلس فينا من لا درهم له ولا متاع فقال ان من امتی من يأتي يوم القيامة صلاة وصيام وزكوٰة وياقي قد شتم هذا وقذف هذا وأكل مال هذا وسفك دم هذا وضرب هذا، فيعطى هذا من حسناته وهذا من حسناته فان فنيت حسناته قبل أن ليقضى ما عليه أخذ من خطاياهم فطرحت عليه ثم طرح في النار.

(مسلم شریف جلد دوم)

اس سے معلوم ہوا کہ نمازوں کی طرح روزے بھی کاٹے جائیں گے۔ جس نے یہ مطلب لیا ہے کہ روزے نہیں کاٹے جائیں گے وہ غلط سمجھا۔

غیبت کرنے والے کو توبہ کی توفیق نہیں ملتی

۴۸۷۴۔۴۸۷۵: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَجَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْغِيْبَةُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَيْفَ الْغِيْبَةُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَزْنِیْ فَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَفِیْ رِوَايَةٍ فَيَتُوْبُ فَيَغْفِرُ اللّٰهُ لَهٗ وَاِنَّ صَاحِبَ الْغِيْبَةِ لَا يُغْفَرُلَهٗ حَتّٰى يَغْفِرَهَا

لَهُ صَاحِبُهٗ۔ (رواه البيهقي الاحاديث الثلثة في شعب الايمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٥/٣٠٦ الحديث رقم ٦٧٤١۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غیبت زنا سے بدتر ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! غیبت زنا سے کیوں بدتر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زنا کرنے والے کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول کر لیتا ہے ایک روایت میں اس طرح ہے کہ وہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دیتا ہے اور غیبت کرنے والے کو اس وقت تک معاف نہیں کیا جاتا یہاں تک کہ جس کی غیبت کی ہے وہ معاف نہ کرے۔

(ان تینوں روایتوں کو بیہقی رحمہ اللہ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے)

تشریح: قوله: قالوا و كيف الغيبة أشد من الزنا؟ ممکن ہے کہ یہ سوال چند صحابہ کرام نے پوچھا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں (یعنی ابوسعید و حضرت جابرؓ) نے پوچھا ہو (اس کا کُل جمع ۲ افراد ہوتے ہیں' اس کا اعتبار کرتے ہوئے جمع کی ضمیر استعمال کی گئی ہو۔)

أشد من الزنا: مبتداء علی سبیل الحکایۃ، کیف: خبر ہے۔ ای: کیف قولك هذا؟

۴۸۷۲: وَفِیْ رِوَایَةِ اَنَسٍ قَالَ صَاحِبُ الزِّنَا یَتُوْبُ وَصَاحِبُ الْغِیْبَةِ لَیْسَ لَهٗ تَوْبَةٌ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٥/٣٠٦ الحديث رقم ٦٧٤٢۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صاحب زنا تو توبہ کر سکتا ہے مگر صاحب غیبت کو توفیق توبہ نہیں۔

اس کے متعدد مطالب بیان کیے گئے ہیں:

اول: جو شخص زنا میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ توبہ کرے گا (برخلاف مرتکب غیبت کے)۔

ثانی: جو شخص زنا میں مبتلا ہوتا ہے اس کے دل پر خدا کا خوف طاری ہو جاتا ہے اور اس تصور سے لرزنے لگتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مواخذہ کر لیا تو نجات کا راستہ نہیں ملے گا اس لئے وہ اپنے اس فعل شنیع پر نادم و شرمسار ہو کر توبہ کرتا ہے جب کہ غیبت اگرچہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے گناہ کی چیز ہے مگر غیبت کرنے والا اس کو ایک ہلکی چیز سمجھتا ہے کیونکہ جب کوئی برائی عام ہو جاتی ہے تو اس کی قباحت دل سے نکل جاتی ہے اور لوگ اس میں مبتلا ہو جانے کی برائی کو محسوس نہیں کرتے۔

ثالث: غیبت کرنے والا توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ بذات خود نہیں بلکہ اس کی توبہ کا صحیح و مقبول ہونا اس شخص کی طرف سے معاف کر دیئے جانے پر موقوف ہوتا ہے جس کی اس نے غیبت کی ہے (چنانچہ اوپر کی حدیث کے ان الفاظ: ''ان صاحب الغيبة لا تغفر له حتى يغفر هاله صاحبه'' سے یہی واضح ہوتا ہے۔ اور زنا کار کی معافی کا معاملہ بہر حال اللہ ہی کے اختیار میں ہے اس کو معاف کرنے میں کسی کا کوئی دخل نہیں ہے)۔

تخریج: امام میرکؒ منذریؒ سے نقل کرتے ہیں: ابوسعید اور جابر کی روایت کو ابن ابی الدنیا نے ''كتاب الغيبة'' میں اور طبرانی نے ''الاوسط'' میں ذکر کیا ہے۔ انسؓ کی حدیث کو امام بیہقی رحمہ اللہ نے ایک بے نام راوی سے نقل کیا ہے اور سفیان بن عیینہ سے بھی نقل کیا ہے لیکن مرفوعاً نقل نہیں کیا۔ اور یہی ''اشبہ'' ہے۔

غیبت سے توبہ کس طرح ہو......؟

۴۸۷۷: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ كَفَّارَةِ الْغِيْبَةِ اَنْ تَسْتَغْفِرَ لِمَنِ اغْتَبْتَهٗ تَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَاوَلَهٗ۔ (رواه البيهقي في الدعوات الكبير وقال في هذا الاسناد ضعف)

أخرجه البيهقي في الدعوات الكبير۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ جس کی غیبت کی اس کے لیے بخشش کی دعایوں کی جائے اے اللہ! ہمیں اور اسے بخش دے۔ بیہقی نے اس کو دعوات کبیر میں ذکر کر کے کہا کہ اس کی سند میں ضعف ہے۔

تشریح: **قولہ: تقول اللھم اغفر لنا:** ''تقول'' والے جملہ کی ترکیب میں تین احتمال ہیں: ■ یہ جملہ بدل ہے۔ ■ بیان ہے۔ ■ حال ہے۔

ان تستغفر: اگرچہ صیغہ خطاب کا ہے مگر مراد عام ہے۔

صاحب مظاہر لکھتے ہیں: دعاو مغفرت کے الفاظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غیبت کرنے والا پہلے خود اپنے حق میں مغفرت کی دعا کرے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ استغفار کرنے والے کے بارے میں حق تعالیٰ کا وعدہ یہ ہے کہ اس کی دعاو مغفرت کو قبول کیا جائے گا۔ لہٰذا غیبت کرنے والا جب پہلے خود اپنے حق میں استغفار کرے گا تو اس کے نتیجہ میں وہ اس معصیت سے پاک ہو جائے گا۔ پس دوسرے کے حق میں بھی اس کی دعا مغفرت قبول ہوگی۔

"اغفر لنا": میں جمع متکلم کی ضمیر لائی گئی ہے جب غیبت کا صدور کئی افراد سے ہوا ہو تو سب اس طرح دعا مانگیں۔

اگر غیبت کرنے والا ایک شخص ہو تو پھر "اغفرلی" کے الفاظ استعمال ہوں گے یا یہ مراد ہے کہ استغفار کرنے والا اپنی دعائے مغفرت میں تمام مسلمانوں کو شامل کرے اس صورت میں اس دعا کے معنی یہ ہوں گے کہ اے اللہ ہم سب مسلمانوں کو اور خاص طور پر اس شخص کو کہ جس کی میں نے غیبت کی ہے بخش دے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغفرت کی دعا کرنا اس صورت سے متعلق ہے جبکہ اس کی غیبت کی خبر اس شخص کو نہ پہنچی ہو جس کی غیبت کی گئی ہے اور اگر یہ صورت ہو تو جس شخص کی غیبت کی گئی ہے اس کو معلوم ہو گیا ہو کہ فلاں شخص نے میری غیبت کی ہے تو غیبت کرنے والے کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس شخص سے اپنے آپ کو معاف کرائے بایں طور کہ پہلے اس کو یہ بتائے کہ میں نے تمہاری غیبت میں اس طرح کہا ہے اور پھر اس سے اپنے آپ کو معاف کرائے اور اگر غیبت کرنے والا کسی مجبوری اور عذر کی بنا پر ایسا نہ کر سکے تو پھر یہ ارادہ رکھے کہ جب بھی ہو سکے گا۔ اس سے اپنے آپ کو معاف کراؤں گا۔ چنانچہ اس کے بعد جب بھی وہ اپنے آپ کو اس سے معاف کرالے گا اس ذمہ داری سے بری ہو جائے گا اور اس غیبت کے سلسلہ میں اس پر کوئی حق و مواخذہ باقی نہیں رہ جائے گا' ہاں اگر وہ اپنے آپ کو معاف کرانے سے عاجز رہا۔ بایں سبب کہ جس شخص کی اس نے غیبت کی ہے وہ مثلاً مر گیا ہے یا غائب ہے۔ (مثلاً اتنی دور رہائش پذیر ہے کہ اس سے ملاقات کا کوئی امکان نہیں ہے تو اس صورت میں اس کیلئے

ضروری ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت و بخشش کا طلب گار ہو اور اس کے فضل و کرم سے یہ امید رکھے کہ وہ اس شخص کو اس کے تئیں راضی کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ جواد کریم رؤف و رحیم ہے۔

فقیہ ابولیث فرماتے ہیں کہ علماء نے غیبت کرنے والے کی توبہ کے بارے میں کلام کیا ہے کہ آیا اس کے لئے یہ جائز ہے یا نہیں کہ اس نے جس شخص کی غیبت کی ہے اس سے معاف کرائے بغیر توبہ کرے چنانچہ بعض علماء نے اس کو جائز کہا ہے بعض نے اس کو نا جائز کہا ہے ہمارے نزدیک اس کی دو صورتیں ہیں:

اوّل: اگر اس کی غیبت کی خبر اس شخص کو پہنچ گئی ہے کہ جس کی اس نے غیبت کی ہے تو اس کی توبہ بس یہی ہے کہ وہ اس سے معاف کرائے۔

ثانی: اگر اس شخص کو اس غیبت کی خبر پہنچی ہے تو اس صورت میں وہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت و بخشش کی دعا مانگے اور دل میں یہ عہد کر لے کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ (انتهى)

قوله: وقال: في هذا الاسناد ضعف:

بیہقی رحمہ اللہ نے اس روایت کو گویا ضعیف قرار دیا ہے لیکن اس کا ضعیف ہونا حدیث کے اصل مفہوم پر اثر انداز نہیں ہوتا کیونکہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث سے بھی استدلال کرنا کافی ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ پھر میں نے دیکھا کہ جامع صغیر میں بھی اس طرح کی ایک حدیث منقول ہے جس سے اس روایت کو تقویت پہنچتی ہے۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں: **كفارة من اغتبت ان تستغفر له** یعنی غیبت کرنے کا کفارہ یہ ہے کہ اس شخص کے حق میں مغفرت کی دعا کی جائے جس کی غیبت کی گئی ہے۔ اس حدیث کو ابن ابی الدنیا نے اپنی کتاب (بیان الصمت) ''خاموشی کا بیان'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

بَابُ الوَعَد

وعدہ کا بیان

''وَعْدٌ'' کے معنی ہیں قول وقرار کرنا' وعدہ کرنا یعنی کسی سے مثلاً یہ کہنا کہ تمہارا فلاں کام کر دوں گا یا تمہارے پاس آؤں گا اور یا تمہارے ساتھ کھانا کھاؤں گا' ''وعد'' خیر اور شر دونوں سے متعلق جملوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس جملہ میں خیر اور شر کا لفظ مذکور ہو جیسے کہا جاتا ہے: وعدته خيرا يا وعدته شرا ۔ اگر خیر یا شر کا لفظ مذکور نہ ہو تو خیر میں ''وعد'' کا لفظ استعمال کیا جائے گا اور شر میں ''وعید'' اور ''ایعاد'' کا لفظ۔

کسی کہنے والے کا یہ قول بھی اسی قبیل سے ہے

وانی وان اوعدته أو وعدته ☆ لمخلف ميعادي ومنجز موعدی

وعدہ کے احکام:

ایفاء عہد اور وعدہ وفا کرنا انسانیت کا مظہر اور اسلامی اخلاق و آداب کا ایک بنیادی تقاضا ہے' جب کہ بد عہدی و وعدہ خلافی ایک بہت بڑا عیب ہے۔ جو شخص اپنا عہد پورا نہ کرے اور اپنا وعدہ وفا نہ کرے وہ اسلام اور معاشرہ دونوں کی نظروں میں سخت ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ دین اسلام سے پہلے بھی تمام ادیان میں وعدے کو پورا کرنے کا حکم تھا اور سارے رسول و پیغمبر ایفاء وعدہ کی محافظت کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مدح و تعریف میں یوں فرمایا ہے:

﴿وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى﴾ [النجم:۳۷]

نیز ہمارے نبی آنحضرت ﷺ کے جد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مدحت میں اللہ عزوجل فرماتا ہے: ﴿إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ﴾ [مریم:۵۴] کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کسی آدمی سے کسی جگہ کا کوئی وعدہ کیا تھا' مگر وہ شخص لوٹ کر نہ آیا۔ آپ علیہ السلام وہیں ٹھہرے رہے حتیٰ کہ پورا سال گزر گیا۔ اھ۔ (ماخوذ از فوائد حدیث:۴۸۰]

اس قدر طویل انتظار فرمانا یہ محض اللہ تعالیٰ کی عطاء کردہ قوت و طاقت ہی سے تھا۔

وعدہ بہر صورت پورا کرنا چاہیے خواہ اس کے لئے کتنی ہی زحمت کیوں نہ برداشت کرنا پڑے۔

ایفاء وعدہ واجب ہے یا مستحب؟ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات مجمع علیہ ہے کہ جو شخص کسی انسان کی شیئی کے بارے میں

کوئی ایسا وعدہ کرے جو ممنوع نہ ہو تو اس وعدہ کو پورا کرنا چاہئے۔

ائمہ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا واجب ہے یا مستحب؟ چنانچہ جمہور علماء بشمول امام ابوحنیفہ اور امام شافعیؒ کا قول یہ ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا مستحب ہے وعدہ نہ کرنا افضل ہے اور پورا نہ کرنا سخت مکروہ ہے۔ البتہ گناہ نہیں۔ اور اگر دوسرے کو اذیت پہنچانا مقصود تھا گناہ بھی ہوگا۔

ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا واجب ہے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ بھی اسی جماعت میں شامل ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس میں تفصیل ہے۔

اول (مذہب) کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو "احیاء" میں مروی ہے: قال كان ﷺ اذا أوعدو اقال عسى۔ کہ آپ ﷺ جب کسی سے کوئی وعدہ فرماتے تو لفظ "عسی" فرماتے تھے۔ منقول ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا معمول تھا جب کوئی وعدہ کرتے تو "ان شاءاللہ" کہہ لیتے تھے اور یہی اولیٰ ہے۔ جب وعدہ بھرپور طریقہ سے کرے تو چاہے کہ ضرور پورا کرے الا کہ وعدہ پورا کرنا متعذر ہو اور اگر وعدہ کرتے وقت کسی شخص کا عزم وعدہ پورا نہ کرنے کا تھا تو یہ نفاق ہے (انتھی) اس ساری بحث سے اس بات کو تائید حاصل ہوتی ہے کہ وعدہ مطلق ہو یعنی عسی اور مشیت وغیرہ جیسے الفاظ کے ساتھ مقید نہ ہو جو جزم وعدہ پر دلالت کرتے ہوئے ہوں تو وعدہ وفاء کرنا واجب ہے پس ان کا "وهو الاولى" کہنا محل بحث ہے جیسا کہ مخفی نہیں۔

اگر کوئی شخص وعدہ کو پورا کرنے کی نیت رکھنے کے باوجود اس وعدہ کو پورا نہ کر سکے تو وہ گنہگار نہیں ہوتا اشرفؒ (حدیث ۸۱۔۴۸ کی تشریح میں) فرماتے ہیں: نیت صالحہ پر آدمی کو ثبات سے نوازا جاتا ہے اگرچہ اس کا اقتران نہ پایا جائے جس کی نیت کی گئی تھی اور تخلف ہو جائے۔ اھ۔ اس سے یہ بات بھی مفہوم ہو رہی ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی وعدہ کیا اور نیت یہ رکھی کہ اس وعدہ کو پورا نہیں کروں گا تو وہ گنہگار ہوگا خواہ اس وعدے کو پورا کرے یا پورا نہ کرے (کیونکہ یہ زبان سے وعدہ کرنا اور دل میں اس کے خلاف کرنے کا ارادہ رکھنا) منافقین کی خصلت ہے۔

بغیر کسی وجہ کے اور بلا کسی امر مانع کے وعدہ خلافی کرنا حرام ہے مجمع البحار میں لکھا ہے کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ممنوع کام کا وعدہ کرے تو اس وعدہ کو پورا نہیں کرنا چاہئے۔

بچے سے بھی وعدہ کریں تو پورا کریں۔ (ملاحظہ ہو حدیث: ۸۲۔۴۸]

مثلاً دو آدمیوں نے اپنے آپس میں ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ ہم دونوں فلاں جگہ فلاں وقت ایک دوسرے سے ملیں گے اس وعدہ کے مطابق ان دونوں میں۔ سے کوئی ایک مقررہ جگہ پر پہنچ کر دوسرے آدمی کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ نماز کا وقت ہو گیا تو اب مزید انتظار نہ کرے اور نماز کے لئے چلا جائے۔ یہ وعدہ خلاف نہیں کہلائے گا اور اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا کیونکہ نماز کے لئے جانا ضرورتِ دین میں سے ہے ہاں اگر وہ نماز کا وقت آنے سے پہلے ہی وہاں سے اٹھ کر چلا جائے تو بے شک اس کو وعدہ خلاف کہا جائے گا اور وعدہ خلافی کی برائی اس کے ذمہ ہوگی اسی طرح اگر امور بدنیہ میں سے کوئی ضروری امر پیش آئے جیسے کھانے پینے کا وقت ہو گیا ہو یا پیشاب و پاخانہ کی حاجت لاحق ہو گئی ہو یا اسی طرح کا کوئی اور حقیقی عذر پیش آ گیا ہو تو اس صورت

میں بھی مزید انتظار کیے بغیر پہلے جانا جائز ہوگا۔ (ماخوذ از فوائد حدیث: ۴۸۸۳)

الفصل الاول:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس کا وعدہ ہو وہ میرے پاس آئے

۴۸۷۸: عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَمَّا مَاتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَاءَ اَبَابَكْرٍ مَالٌ مِنْ قِبَلِ الْعَلَاءِ بْنِ الْحَضْرَمِيِّ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ مَنْ كَانَ لَهٗ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَيْنٌ اَوْكَانَتْ لَهٗ قِبَلَهٗ عِدَةٌ فَلْيَاْتِنَا قَالَ جَابِرٌ فَقُلْتُ وَعَدَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّعْطِيَنِيْ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا فَبَسَطَ يَدَيْهِ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ قَالَ جَابِرٌ فَحَثّٰى لِيْ حَثْيَةً فَعَدَدْتُهَا فَاِذَا هِيَ خَمْسُ مِائَةٍ وَقَالَ خُذْ مِثْلَيْهَا۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٦/٢٦٨ الحديث رقم ٣١٦٤ و مسلم في ٤/١٨٨ الحديث رقم (٦٠-٢٣١٤)۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور حضرت ابوبکرؓ کے پاس حضرت علاء بن الحضرمی کی طرف سے مال آیا تو آپ نے اعلان فرمایا جس شخص کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرض ہو یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے وعدہ فرمایا ہو تو وہ ہمارے پاس آئے حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ فرمایا تھا کہ مجھے اتنا اور اتنا دیں گے کہ مجھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دونوں ہاتھ بھر کر دیے میں نے انہیں گنا تو وہ پانچ سو تھے۔ فرمایا اسے دوگنا اور لے لو۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: قبلة: قاف کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ' بمعنی عندہ۔

''عندہ'': عین کے کسرہ اور دال مہملہ مخففہ کے ساتھ بمعنی وعدہ۔

ان يعطيني هكذا وهكذا وهكذا: لفظ'' هكذا'' تین مرتبہ آیا ہے۔ اور ایک نسخہ میں دو بار آیا ہے۔ بظاہر پہلا راجح ہے۔ اس کی تائید اگلے جملے "فبسط يديه ثلاث مرات" سے ہوتی ہے۔

قوله: من كان له على النبيّ دين او كانت له قبله عدة: وعدہ ملحق بالدین ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے۔: العدة، دين. (رواه الطبراني في الاوسط، عن علي وابن مسعود).

ہمارے علماء میں سے اشرفؒ اور دیگر اہل علم کا کہنا ہے کہ دین میت کی ادائیگی، میت کے کیے ہوئے وعدوں کو وفا کرنا، اور یہ کہ اس معاملہ میں وارث اور اجنبی دونوں برابر ہیں۔

الفصل الثانی

وصال سے قبل تیرہ اُونٹنیوں کا وعدہ

۴۶۰۹-۲۸: وَعَنْ اَبِیْ جُحَیْفَةَ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَبْیَضَ قَدْشَابَ وَکَانَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِیٍّ یُشْبِهُهٗ وَاَمَرَ لَنَا بِثَلٰثَةَ عَشَرَ قَلُوْصاً فَذَهَبْنَا نَقْبِضُهَا فَاَتَانَا مَوْتُهٗ فَلَمْ یُعْطُوْنَا شَیْئاً فَلَمَّا قَامَ اَبُوْبَکْرٍ قَالَ مَنْ کَانَتْ لَهٗ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عِدَةٌ فَلْیَجِیْٔ فَقُمْتُ اِلَیْهِ فَاَخْبَرْتُهٗ فَاَمَرَلَنَا بِهَا۔ (رواه الترمذی)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۶/ ۵۶۴ الحدیث رقم ۳۵۴۴ و مسلم فی ۴/ ۱۸۲۲ الحدیث رقم (۲۳۴۳-۱۰۷)، والترمذی فی السنن ۵/ ۱۱۸ الحدیث رقم ۲۸۲۶۔

ترجمہ: حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سفید رنگ میں دیکھا کہ بڑھاپا آچکا تھا حضرت حسن بن علیؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم شکل تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے تیرہ اونٹنیوں کا حکم جاری فرمایا۔ ہم لینے گئے تو آپ کے وصال کی خبر ملی تو لوگوں نے ہم کو کچھ نہ دیا جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنے اور اعلان کیا کہ جس کے ساتھ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی وعدہ فرمایا ہو تو وہ آجائے میں آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اطلاع دی تو آپ نے وہ اونٹنیاں دینے کا حکم جاری فرمایا۔ (ترمذی)

تشریح: قولہ: ابیض: یعنی آپ کی رنگت گوری تھی، سرخی مائل تھی۔ اور اسی سے آپ کا یہ فرمان ہے جو عائشہ سے فرمایا تھا: یا حمیراء!

قولہ: وکان الحسن بن علی یشبہ ﷺ:

مشہور یہ ہے کہ حضرت حسنؓ کا اوپری آدھا دھڑ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھا، اور حسینؓ کے جسم کا نچلا آدھا دھڑ سرور کونین کے مشابہ تھا

عرضِ مرتب:

اس کی تفصیل حدیث: ۶۱۴۲ کے تحت ملاحظہ فرمایئے۔

قولہ: من کانت عند رسول اللہ ﷺ عدۃ فلیجیء:

حدیث جابر میں ''عدۃ'' کے ساتھ ''دین'' کا ذکر ہے جب کہ اس حدیث میں صرف ''عدۃ'' کا ذکر ہے۔ اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں: (۱) بطریق اولویت مفہوم ہو رہا ہے۔ (۲) ممکن ہے کہ راوی نے اقتصار کیا ہو، خصوصاً جب کہ ان کا کلام بھی وعدہ ہی کے بارے میں تھا۔ قولہ: وأمرنا: ای لأ جلنا أو لا عطا ئنا۔ واضح رہے کہ جامع الاصول میں "وأمرلنا" ہے۔ اور مصابیح کے تمام نسخوں میں "أمرلہ" ہے۔ پہلا ضبط زیادہ مناسب ہے، چونکہ اگلی تمام ضمیریں اسی کے مطابق ہیں۔

''قلوص'': قاف کے فتحہ اور لام کے ضمہ کے ساتھ جوان اونٹنی کو کہتے ہیں۔

وذھبنا: فعل شروع کے معنی میں ہے ای فشرعنا فی الذھاب الی انما مور لنقبض بالعطاء۔

قولہ:فلم یعطونا شیئا:

یہ ارشاد دلیل ہے کہ ہبہ، صدقہ اور عطیہ پر جب تک قبضہ نہ ہو ملکیت حاصل نہیں ہوتی۔ان چیزوں میں ملکیت قبضہ ہی سے آتی ہے۔

ملاحظہ: جامع الاصول میں فرماتے ہیں کہ ابو جحیفہ کی حدیث کا پہلا حصہ بخاری، مسلم اور ترمذی تینوں نے متفقہ طور پر روایت کیا ہے۔اور دوسرا ٹکڑا بخاری اور ترمذی دونوں نے متفقہ طور پر روایت کیا ہے۔اور آخری حصہ کہ جس میں حضرت ابوبکرؓ کی عطاء کا ذکر ہے صرف امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔(کذا قال الشیخ) اسی لئے مؤلفؒ نے حدیث کے آخر میں رواہ الترمذی فرمایا۔(قالہ میرک)

کمال وعدہ وفائی

۴۸۸۰: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِی الْحَمْسَاءِ قَالَ بَايَعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ اَنْ يُّبْعَثَ وَبَقِيَتْ لَهُ بَقِيَّةٌ فَوَعَدْتُّهُ اَنْ اٰتِيَهُ بِهَا فِیْ مَكَانِهٖ فَنَسِيْتُ فَذَكَرْتُ بَعْدَ ثَلٰثٍ فَاِذَا هُوَ فِیْ مَكَانِهٖ فَقَالَ لَقَدْ شَقَقْتَ عَلَیَّ اَنَا هٰهُنَا مُنْذُ ثَلٰثٍ اَنْتَظِرُكَ۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابو داؤد فی السنن ٥/ ٢٦٨ الحديث رقم ٤٩٩٦۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ابوحمساءؓ سے روایت ہے کہ میں نے ظہور نبوت سے پہلے آپ ﷺ سے خرید و فروخت کی۔آپ کا کچھ بقایا تھا میں نے آپ ﷺ سے وعدہ کیا کہ میں اس جگہ وہ لاتا ہوں پھر میں وہ بھول گیا تین دن کے بعد مجھے وہ یاد آیا پس آپ اس جگہ تشریف فرما تھے۔فرمایا تم نے مجھ کو مشقت میں ڈال دیا۔میں یہاں تین روز سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔(ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن ابی الحمساء۔یہ عبداللہ بن ابی الحمساء ''عامری'' ہیں۔ان کا شمار بصریوں میں ہے۔ان کی حدیث عبداللہ بن شقیق اپنے والد سے نقل کرتے ہیں اور وہ عبداللہ بن ابی الحمساء سے روایت کرتے ہیں۔''حمساء'' میں حائے مہملہ مفتوح میم ساکن سین مہملہ اور اس کے بعد الف ممدودہ ہے۔

تشریح: بایعت النبی ﷺ:

طیبیؒ فرماتے ہیں: بایعت بمعنی بعت منہ یعنی اشتریت ہے۔یہ بیع سے (ماخوذ) ہے تاکہ مبالغہ سے۔اھ۔یہ محل نظر ہے چونکہ از روئے قواعد صرف یہ درست نہیں ہے۔پس ظاہر یہ ہے کہ بیع مقابضہ و معاوضہ پر محمول ہے لہٰذا یہ باب مفاعلہ ہی سے ہے اپنی اصل پر ہے۔

قوله: أنا ههنا منذ ثلاث انتظرك:

انتظار کی وجہ:

آنحضرت ﷺ کا اتنے طویل انتظار کی اس مشقت و زحمت کو برداشت کرنا اپنی چیز کی بقیہ قیمت وصول کرنے کے لئے نہیں تھا بلکہ اس پیش نظر تھا کہ جب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بقیہ قیمت لے کر یہاں آنے کا وعدہ کیا تھا اور ان کے وعدے کے جواب میں گویا میری طرف سے بھی یہ وعدہ تھا کہ میں یہاں رہوں گا تو جب تک وہ یہاں نہ آئیں ایفاء وعدہ کی خاطر مجھے یہاں بیٹھ کر انتظار کرنا چاہئے۔

مجبوری میں وعدہ پر نہ پہنچ سکنے کا حکم

۴۸۸۱: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا وَعَدَ الرَّجُلُ اَخَاهُ وَمِنْ نِيَّتِهِ اَنْ يَفِيَ لَهُ فَلَمْ يَفِ وَلَمْ يَجِيْ لِلْمِيْعَادِ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد في السنن ٥/ ٢٦٨ الحديث رقم ٤٩٩٥، والترمذي في السنن ٥/ ٢١ الحديث رقم ٢٦٣٣۔

ترجمہ: حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کوئی اپنے بھائی سے وعدہ کرے اور وعدہ پورا کرنے کی نیت اور ارادہ بھی ہو مگر پورا نہ کر سکے تو ایسی صورت میں اس پر کوئی گناہ نہیں۔ (ابوداؤد، ترمذی)

تشریح: أن يفي: یاء کے فتحہ اور فاء کے کسرہ کے ساتھ' یہ اصل میں ''أن يوفي'' تھا۔

بچے سے بھی جھوٹ مت بولو

۴۸۸۲: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَامِرٍ قَالَ دَعَتْنِيْ اُمِّيْ يَوْمًا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاعِدٌ فِيْ بَيْتِنَا فَقَالَتْهَا تَعَالَ اُعْطِيْكَ فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَرَدْتِ اَنْ تُعْطِيَهُ قَالَ اَرَدْتُّ اَنْ اُعْطِيَهُ تَمْرًا فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَا اِنَّكِ لَوْ لَمْ تُعْطِيْهِ شَيْئًا كُتِبَتْ عَلَيْكِ كِذْبَةٌ۔

(رواہ ابوداؤد والبیهقی فی شعب الایمان)

أخرجه ابوداؤد في السنن ٥/ ٢٦٥ الحديث رقم ٤٩٩١، واحمد في المسند ٣/ ٤٤٧، والبيهقي في شعب الايمان ٤/ ٢١٠ الحديث رقم ٤٨٢٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک دن میری والدہ نے بلایا اس وقت رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے والدہ نے آواز دی آؤ میں تمہیں کچھ دوں تو نبی اکرم ﷺ نے پوچھا تم اسے کیا دینا چاہتی ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اسے کھجوریں دینے کا ارادہ کیا ہے اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا آگاہ رہو! اگر تم اسے کچھ نہ دیتی تو تمہارے نامہ اعمال میں جھوٹ لکھا جاتا۔ (ابوداؤد، بیہقی)

راوی حدیث:

عبداللہ بن عامر۔ یہ عبداللہ بن عامر بن کریز قریشی ہیں۔ یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ماموں کے بیٹے ہیں۔ اور مرقاۃ میں یوں ہے کہ یہ حضرت عثمان بن عفان کے ماموں تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر دم کیا تھتکارا اور اعوذ پڑھی جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ان کی عمر تیرہ (۱۳) سال تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بھی روایت نہیں کی' اور نہ ہی انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سن کر یاد کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو خراسان اور بصرہ کا حاکم بنا دیا تھا اور یہ وہاں برابر حاکم رہے یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے۔ پھر جب امارت کے اختیارات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف منتقل ہوئے تو ولایت خراسان وبصرہ ان کو دوبارہ دے دی گئی۔ یہ بڑے سخی' کریم' کثیر المناقب ہیں۔ انہوں نے ہی خراسان کو فتح کیا اور ''کسریٰ'' شاہ فارس کو انہی کی گورنری کے زمانہ میں قتل کیا گیا اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ انہوں نے فارس کے تمام اطراف کو اور اسی طرح عامہ خراسان' اصفہان' کرمان اور حلوان کو فتح کیا۔ انہوں نے ہی بصرہ کی نہر کھدوائی۔ ۵۹ میں وفات پائی۔

تشریح: قوله: ورسول الله ﷺ قاعد في بيتنا: یہ جملہ حالیہ ہے۔

قوله: فقالت ها تعال:

ها: اس کے بارے میں دو احتمال ہیں: ❶ برائے تنبیہ ہے۔ ❷ اسم فعل ہے بمعنی خذ. اس صورت میں تعال، اس کی تاکید ہوگا۔ ''تعال'': لام کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ آخر میں الف نہیں ہے۔

اعطيك: باثبات الياء بحذف الياء دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ ایک نسخہ میں حذف یاء کے ساتھ'' اعطك '' ہے۔ سنن ابی داؤد اور شعب الایمان کی روایت میں باثبات الیاء ہے۔

ثبوت یاء کی صورت میں دو ترکیبی احتمالات ہیں:

❶ اعطيك مرفوع ہے۔ ''انا'' مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ لہٰذا یہ جملہ مستانفہ ہوگا۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ کا فرمان: ﴿فهب لي من لدنك وليا يرثني﴾ مرفوع ہے۔

اعطيك مجزوم ہے۔ جواب امر ہونے کی وجہ سے۔ اور ''یاء'' برائے اشباع ہے، بہرحال یہ بھی ایک لغت ہے۔ کہ حالت جزمی میں حرف علت کا برقرار رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں قنبل عن ابن کثیر روایت یوں ہے: ﴿انه من يتقي ويصبر﴾ [یوسف۔ ۹۰] اس کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں ہے۔ جزری کا شعر ہے:

الا قولوا لشخص قد تقوى
على ضعفي ولم يخشن رقيبه

ایک اور شاعر کہتا ہے:

ألم ياتيك والأنباء تنمي

قوله: فقال لها رسول الله ﷺ ما أردت:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں مصابیح کے نسخوں میں " فقال لها: ما اردت ان تعطيه؟ قال: اردت ان اعطيه تمرا" کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ یہ کاتبین کا سہو ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ "ما" بمعنی "ای شیئ" ہے یعنی ای شئ نویت؟

أن تعطيه: یاء کے سکون کے ساتھ ہے چونکہ مخاطب کا صیغہ ہے اور علامت نصب حذف نون ہے سید کے اصل نسخہ میں اور بعض نسخوں میں "أن" یاء کے فتحہ کے ساتھ ہے تعطیہ یہ قلم کا سہو ہے یا لغزش ہے۔

قوله: أما انك لولم تعطيه كتبت عليك كذبة:

أما: تخفیف کے ساتھ ہے برائے تنبیہ ہے۔

لم تعطيه: یاء کے ساتھ چونکہ یہ یاء ضمیر کلمہ ہے اس کا لام کلمہ نہیں ہے معنوی اعتبار سے تقدیری عبارت یوں ہے: لولم تنوی باعطائه شيئا۔

كذبة: اس لفظ کے ضبط میں اختلاف ہے۔ چنانچہ اس کو تین طرح ضبط کیا گیا ہے:

1. کاف کے فتحہ اور ذال کے سکون کے ساتھ ہے بمعنی مرة من الكذب۔ (ایک مرتبہ کا جھوٹ)
2. بعض نسخوں میں کاف کے کسرہ اور نون کے سکون کے ساتھ۔ بمعنی نوع من الكذب۔ (ایک قسم کا جھوٹ)۔
3. بعض تصحیح شدہ نسخوں میں مصححین کے زعم کے مطابق بفتح کاف کے فتحہ اور ذال کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہ ضبط درست نہیں ہے، جیسا کہ اہل لغت اور رائمہ کا کلام ماقبل میں گذرا۔ اور ابن الملکؒ فرماتے ہیں: بفتح الكاف ثم السكون وابفتحهما مع الذال والباء الموحده۔ (انتہی) یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ کاف کے فتحہ ذال کے کسرہ اور تاء کے ساتھ یہ کلمہ لغت میں نہیں پایا جاتا۔

امام نوویؒ نے صراحت کی ہے کہ ذال دونوں جگہ ساکن ہے۔ لہٰذا ابن الملک کا کلام درایۃً وروایۃً ہر دو کے مخالف ہے۔

۴۸۸۳: وَعَنْ زَيْدِ ابْنِ اَرْقَمَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ وَعَدَ رَجُلاً فَلَمْ يَاتِ اَحَدُ هُمَا اِلٰى وَقْتِ الصَّلٰوةِ ذَهَبَ الَّذِيْ جَآءَ لِيُصَلِّيَ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ۔

رواه رزين۔

ترجمہ: "حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اگر کوئی شخص کسی آدمی سے کہیں ملنے کا وعدہ کرے اور ان دونوں میں سے کوئی ایک نماز کے وقت تک وہاں نہ پہنچے اور وہ شخص نماز پڑھنے کے لئے چلا جائے جو وہاں آ گیا تھا تو وہ گنہگار نہیں ہوگا"۔ (رزین)

تشریح: "احکام الباب" کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

بَابُ الْمِزَاحِ
خوش طبعی کا بیان

''مزاح'' کی لغوی تحقیق: قاموس سے یوں مفہوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ میم کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ مصدر ہے۔ میم کے ضمہ کے ساتھ ہو، تو مجرد میں مزح، یمزح مزحا ومزاحة ومزاحا (مذاق کرنا' دل لگی کرنا)، از باب منع کا اسم مصدر ہے۔ (جس کا معنی ہے ہنسی مذاق' دل لگی) ''مزاح'' کا معنی ہے بہت ہنسی مذاق کرنے والا' المدّح من الناس: ہنسی مذاق کرنے والے لوگ میم کے کسرہ کے ساتھ ہو، تو مزید فیہ میں مازحه ممازحة ومزاحا بمعنی دعب (ہنسی مذاق کرنا)، باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔ باب تفاعل سے بھی مستعمل ہے، تمازح یتمازح تمازحًا. (باہمی مذاق کرنا)

جوہری فرماتے ہیں کہ ''مزاح'' ضمہ کے ساتھ اسم ہے' اور کسرہ کے ساتھ ''مازحہ'' کا مصدر ہے۔ (حدیث: ۴۶۸۵)

مزاح کی تعریف: خوش طبعی اور ہنسی مذاق جس میں کسی کی دل شکنی اور ایذاء رسانی کا نہ ہو۔ جس خوش طبعی اور ہنسی مذاق کا تعلق دل شکنی اور ایذاء رسانی سے ہو اس کو ''سخریہ'' کہتے ہیں۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے: لا تمار اخاك ولا تمازحه یعنی اپنے مسلمان بھائی سے جھگڑا فساد نہ کرو اور نہ اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرو امام نووی فرماتے ہیں وہ مزاح وظرافت ممنوع ہے جس میں حد سے تجاوز کیا جائے اور اس کو عادت بنا لیا جائے حدود سے متجاوز۔

ظرافت کے نقصان:

❶ ہر وقت مزاح وظرافت میں مبتلا رہنا اور اس میں حد سے تجاوز کرنا بہت زیادہ ہنسنے اور قہقہہ لگانے کا باعث ہوتا ہے۔ ❷ قلب وذہن کو قساوت اور بے حسی میں مبتلا کر دیتا ہے ❸ ذکر الٰہی سے غافل کر دیتا ہے ❹ مہمات دین میں غور وفکر اور پیش قدمی سے باز رکھتا ہے ❺ اکثر اوقات اس کا انجام ایذا رسانی اور آپس میں بغض وعناد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ❻ جو شخص ہر وقت ہنسی مذاق کرتا رہتا ہے اس کی شخصیت بری طرح متاثر اور مجروح ہو جاتی ہے کہ نہ اس کا کوئی دبدبہ قائم رہتا ہے اور نہ اس کو عظمت اور اس کا وقار باقی رہتا ہے۔

ظرافت کے فوائد:

جو مزاح وظرافت حد کے اندر اور کبھی کبھار ہو وہ نہ صرف مباح ہے بلکہ صحت مزاج سرور ونشاط اور سلامت طبع کی علامت

بھی ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ بھی مزاح اور ظرافت کو اختیار فرماتے تھے جس سے آپ ﷺ کا مقصد مخاطب کی دل بستگی و خوش طبعی اور آپس میں محبت و موانست کے جذبات کو مستحکم کرنا ہوتا تھا اور یہ چیز سنت مستحبہ ہے۔

حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ظرافت سے متعلق ایک اشکال:

اشکال واقع ہوتا کہ یہ بات کہ وہی مزاح و ظرافت مباح ہے جو کبھی کبھار ہو۔ اس روایت کے مخالف ہے جس میں حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ما رایت احدا اکثر مزاحا من رسول الله صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یعنی میں نے رسول کریم ﷺ سے زیادہ مزاح کرنے والا کوئی شخص نہیں دیکھا

میں کہتا ہوں کہ زیادہ مزاح و ظرافت کرنے کی ممانعت اس وجہ سے ہے کہ اس سے نفس پر قابو نہیں رہتا اور ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کے برابر کوئی اور شخص اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکتا لہٰذا یہ چیز (زیادہ مزاح کرنا) ان امور میں سے ہے جو صرف آنحضرت ﷺ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں اور دوسروں کے لئے ان سے اجتناب ہی اولیٰ ہے اس کی تائید شمائل ترمذی میں مروی حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو آگے آئے گی: کہ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ ہمارے ساتھ مزاح فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا میں مزاح میں سچ کہتا ہوں۔ حاصل یہ کہ زیادہ مزاح کرنے کی ممانعت کا تعلق آنحضرت ﷺ کے سوا دوسرے لوگوں سے ہے ہاں اگر کوئی شخص حد پر قائم رہے نفس پر قابو رکھے اور راہِ اعتدال سے منحرف نہ ہونے پر قادر ہو وہ بھی اس ممانعت سے مستثنیٰ ہوگا۔

الفصل الاول:

اے ابو عمیر! تمہارے نُغَیر کا کیا بنا؟

۴۸۸۴: عَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيُخَالِطُنَا حَتّٰى يَقُوْلَ لِاَخٍ لِيْ صَغِيْرًا يَا اَبَا عُمَيْرٍ مَا فَعَلَ النُّغَيْرُ وَكَانَ لَهٗ نُغَيْرٌ يَلْعَبُ بِهٖ فَمَاتَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۵۸۲/۱۰ الحديث رقم ۶۲۰۳ و مسلم في ۱۶۹۲/۳ الحديث رقم (۳۰-۲۱۵۰) وابو داوٗد في السنن ۲۵۱/۵ الحديث رقم ۴۹۶۹، والترمذي في ۳۱۴/۴ الحديث رقم ۱۹۸۹ و ابن ماجه في ۱۲۲۶/۲ الحديث رقم ۳۷۲۰، واحمد في المسند ۱۱۵/۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہم سے گھل مل کر رہتے تھے حتیٰ کہ میرے چھوٹے بھائی سے فرمایا اے ابو عمیر! چڑیا کا کیا بنا؟ ان کی ایک چڑیا تھی جس سے وہ کھیلا کرتے تھے وہ مرگئی تھی۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: "ان": مخففه من المثقله ہے اس کا اسم ضمیر شان ہے۔

لیخالطنا: لام فارقہ فتحہ کے ساتھ ہے۔ شمائل میں لیخاطبنا ہے۔

''ما فعل'': بصیغہ فاعل ہے۔

قولہ: یقول لأخ لی صغیر: حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اس چھوٹے بھائی کا نام کبشہ تھا اور وہ ان کے ماں شریک بھائی تھے ان کے والد کا نام ابوطلحہ زید بن سہیل انصاری رضی اللہ عنہ تھا۔

''نُغَیر'' تصغیر ہے ''نُغَر'' کی۔ ''نغر'' نون کے ضمہ' غین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ جو ایک چھوٹے پرندے کا نام ہے جو چڑیا کی طرح ہوتا ہے' اس کی چونچ سرخ ہوتی ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ ''نغیر'' سے مراد چڑیا ہے بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد چھوٹا چڑا ہے جس کی چونچ چھوٹی ہوتی ہے' اور اس کا سر لال ہوتا ہے۔ **قولہ: مافعل النغیر**: یعنی تمہارا پرندہ کیا ہوا' مجھے دکھائی نہیں دے رہا۔ اس جملہ سے نبی کریم ﷺ ان کو اس پرندہ کی موت پر تسلی دیتے تھے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں: **الفعل التاثیر من جهة مؤثرة 'والعمل کل فعل یکون من الحیوان یقصد عمل** 'فعل سے اخص ہے' چونکہ فعل کی نسبت کبھی حیوانات کی طرف بھی ہوتی ہے' اور حیوانات سے وقوع بغیر قصد کے ہوتا ہے اور کبھی فعل کی نسبت جمادات کی طرف کی جاتی ہے۔ (انتھی) چنانچہ معنی یہ ہوا: **ما جاله و شانه** (ذکرہ الطیبی) اور اگر بصیغہ مجہول مروی ہوتا تو اس میں بڑی اچھی توجیہ و تنبیہ ہوتی اور معنی یوں ہوتا: **مافعل به**؟ صاحب شرح السنۃ لکھتے ہیں: یہ حدیث کئی فوائد پر مشتمل ہے: **①** مدینہ کا شکار مباح ہے' بخلاف مکہ کے شکار کے' میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں اگر یہ بات ثابت ہو جائے تو یہ اختلاف ہی ختم ہو جائیگا کہ مدینہ کا بھی حرم ہے کہ نہیں۔ **②** اسماء کی تصغیر جائز ہے۔ میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں چونکہ یہ لطف وشفقت پر مبنی ہے' خصوصاً جب کہ اس میں سجع کی رعایت بھی ہے اور کلام مباح میں ہے جب کہ اس میں تکلیف نہ ہو۔ **③** مزاح' خوش طبعی کرنا مباح ہے جب تک کہ گناہ نہ ہو۔ میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ دل لگی کے لئے ہو تو مستحب ہے۔ (صاحب شرح السنۃ) فرماتے ہیں: شیخ نجم الدین حمیر سے اس کے علاوہ فوائد بھی منقول ہیں۔ میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں یہ محل بحث ہے' چونکہ اگر مراد یہ لیں گے کہ اجنبی عورت کے ساتھ خلوت جائز ہے تو واضح رہے کہ بالا جماع یہ جائز نہیں ہے' اور مراد یہ ہے کہ اجنبی عورت کے ساتھ اگر کوئی اور بھی ہو تو اس کے پاس جانا جائز ہے تو بالکل واضح بات ہے اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے حتی کہ اپنے نفس کے بارے میں اندیشہ سے مامون نہ ہو تو تب بھی جائز ہے جیسا کہ تحمل شہادت وغیرہ کے مسئلہ میں ہے۔ مزید یہ کہ اس حدیث میں خلوت پر کوئی دلالت موجود نہیں' اور اگر ہو بھی تو یہ بات معروف ہے کہ آپ ﷺ معصوم تھے' اور اجنبیہ کے پاس خلوت میں جانے کا جواز آپ ﷺ کی خصوصیات میں سے تھا۔ مزید کہ آپ ﷺ معصوم تھے اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ اس امت کی ماؤں کے باپ تھے' اور یہ باتیں آپ ﷺ کے علاوہ کسی میں نہیں پائی جاتیں۔ اگر چہ وہ ولی ہی کیوں نہ ہو۔ چونکہ ''حفظ'' کا مرتبہ بہر حال ''عصمت'' سے کم تر ہی ہے۔ چنانچہ جب جنید بغدادی سے پوچھا گیا کہ کیا عارف زنا کرتا ہے؟ (یعنی کر سکتا ہے؟) تو وہ کچھ دیر سر جھکائے رہے اور پھر بولے: **وکان امر اللہ قدرا مقدورا**۔ میں نے اس بحث کو طویل اس لئے کیا تا کہ کوئی زندیق' ملحد ومباحی اس سے تمسک نہ کرے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ آدمی کے لئے جائز ہے کہ از راہ تعجب ایسی کوئی بات پوچھے جس کا اس کو پہلے سے علم ہو۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ یہ اس بات پر موقوف ہے کہ اس کا علم آنحضرت ﷺ کو پہلے سے تھا۔ چونکہ یہ ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات محض اس کے دکھائی نہ دینے پر ارشاد فرمائی ہو' اس میں عموم ہے جو موت کو بھی شامل ہے۔ فرمایا: اس حدیث سے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کمال اخلاق کا پتہ چلتا ہے۔اور یہ کہ صغناء کی رعایت کرنا مکارم اخلاق میں سے ہے۔اور چھوٹے بچوں سے مزاح کرنا اوران کا دل خوش کرنا مستحب ہے۔میں (ملاعلی قاری) کہتا ہوں ایسا کیوں نہ ہو جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام قدیم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف کریم یوں بیان فرمایا: [**انك لعلى خلق عظيم**] [القلم:٤] نیز بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اہل مدینہ اس پرندے کو بلبل کہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کا ہمارے ساتھ بہت ہی میل ملاپ تھا یا ہم مل جل کر رہتے تھے آپ ہمارے ساتھ بیٹھا کرتے تھے اور ہنسی مذاق فرمایا کرتے تھے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: حتى، يخالطنا کی غایت ہے۔يخالطنا کی ضمیر متکلم سے مراد حضرت انسؓ اوران کے اہل خانہ ہیں۔عبارت کی معنوی تقدیر گویا یوں ہے: **انتهت مخالطته لأهلنا كلهم حتى الصبى، وحتى الملاعبة معه، وحتى السؤال عن فعل النغير.**

بچوں کو چڑیا وغیرہ سے دل بہلانا اوران کے ساتھ کھیل کود کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس کو تکلیف وایذا نہ پہنچائیں کسی چھوٹے اور کمسن بچے کی کنیت مقرر کرنا جائز ہے اور یہ جھوٹ میں داخل نہیں ہے میں (ملاعلی قاری) کہتا ہوں چونکہ اس سے نیک فالی مقصود ہے۔

الفصل الثانی:

خوش طبعی میں بھی سچی بات

۴۸۸۵: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّكَ تُدَاعِبُنَا قَالَ اِنِّی لَا اَقُوْلُ اِلَّا حَقًّا۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/ ٣١٤ الحديث رقم ١٩٩٠، واحمد فی المسند ٢/ ٣٤٠۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے خوش طبعی بھی کرتے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سچی بات ہی کہتے ہیں۔(ترمذی)

تشریح: تداعبنا: از باب مفاعلہ معروف کے صیغہ کے ساتھ ہے۔یہ "دعابۃ" سے ماخوذ ہے جو "تمازح" کا معنی ہے۔

صحابہ کرام کا یہ کہنا "انك تداعبنا" اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت سے ہنسی مذاق کو مستبعد جانا۔اسی وجہ سے انہوں نے اپنے اس کلام کو "انّ" کے ساتھ اور لام کے ساتھ جیسا کہ بعض نسخوں میں "لتداعبنا" واقع ہوا ہے "حقا": اس کا معنی ہے: عدلا وصدقا۔

زیادہ واضح بات یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو ہنسی مذاق کرنے سے منع فرمایا تو اس کے بعد انہوں نے مذکورہ سوال کیا۔چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "انی لا اقول الاحقا" فرما کران کو جواب دیا کہ ہنسی مذاق کی ممانعت اگر بنا ہے کہ

اس میں عام طور پر جھوٹی باتوں اور غیر شرعی امور کا ارتکاب ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ تم میں سے کوئی بھی شخص اس پر قادر نہیں ہے کہ اس کا ہنسی مذاق جھوٹ اور لایعنی باتوں سے کلیتًا پاک ہو کیونکہ تم کو معصوم نہیں بنایا گیا ہے (لیکن حق تعالیٰ نے مجھ کو معصوم بنایا ہے اور مجھے اس بات پر قادر کیا ہے کہ میرے کسی بھی ہنسی مذاق کی بات میں جھوٹ کی آمیزش نہ ہو یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی ایسا مزاح نہیں فرماتے تھے جس میں جھوٹ اور لچر بات کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔

اگر ہنسی مذاق کی کوئی بات حقیقت کے اعتبار سے جھوٹ پر مبنی نہ ہو تو وہ جائز ہے لیکن اس کے باوجود ہنسی مذاق اور ظرافت کو عادت نہ بنایا جائے کیونکہ اس کی وجہ سے دبدبہ اور وقار ختم ہو جاتا ہے۔)

ہم تجھے اُونٹنی کا بچے دیں گے

۴۸۸۶: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلاً اسْتَحْمَلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ اِنِّی حَامِلُکَ عَلٰی وَلَدِ نَاقَۃٍ فَقَالَ مَا اَصْنَعُ بِوَلَدِ النَّاقَۃِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھَلْ تَلِدُ الْاِبِلَ اِلاَّ النُّوْقُ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد في السنن ٥/ ٢٧٠ الحديث رقم ٤٩٩٨، والترمذی فی ٤/ ٣١٤ الحديث رقم ١٩٩١، واحمد فی المسند ٣/ ٢٦٧۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری کا سوال کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم تجھے اونٹنی کے بچے پر سوار کریں گے۔ اس نے عرض کیا میں اونٹنی کے بچے کا کیا کروں گا؟ فرمایا اونٹ کو اونٹنی ہی تو جنتی ہے۔

(ترمذی' ابوداؤد)

تشریح: النوق: بضم النون — ناقة (اونٹنی) کی جمع ہے۔ الابل: جنس مراد ہے۔

کہا گیا ہے کہ ان صاحب میں ضعف عقل تھا۔ وہ صاحب یہ سمجھے کہ بچہ کا اطلاق تو چھوٹے بچے ہی پر ہوتا ہے اور چھوٹا بچہ سواری کے قابل نہیں ہوتا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ اونٹ کا بچہ سواری کے قابل ہو یا نہ ہو وہ بچہ تو اونٹنی ہی کا ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی طلب پر مذکورہ ارشاد بطور خوش طبعی فرمایا اور اس کے ذریعہ نہ صرف حقیقت مفہوم کو ادا کیا بلکہ اس کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اگر تم تدبیر سے کام لیتے تو یہ بات نہ کہتے لہٰذا اس ارشاد میں محض ظرافت ہی نہیں ہے بلکہ اس امر کی طرف متوجہ کرنا بھی مقصود ہے کہ سننے والے کو چاہئے کہ وہ اس بات میں غور و تامل کرے جو اس سے کہی گئی ہے اور بغیر سوچے سمجھے سوال و جواب نہ کرے بلکہ پہلے اس بات میں غور و فکر کرے۔

مزاح مبارک اے دو کانوں والے

۴۸۸۷: وَعَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَہٗ یَا ذَا الْاُذُنَیْنِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

أخرجه ابوداؤد في السنن ٥/ ٢٧٢ الحديث رقم ٥٠٠٢، والترمذی فی ٤/ ٣١٥ الحديث رقم ١٩٩٢، واحمد

في المسند ۳/۱۲۷۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: اے دو کانوں والے۔ (ابوداؤد ترمذی)

یا ذا الأذنین کہنے کی وجہ:

تشریح: آنحضرت ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دو کانوں والے کے ذریعہ مخاطب فرمایا یہ کس بات کے پیش نظر تھا؟ اس میں کئی احتمال ہیں: ① اس میں خوش طبعی وظرافت تھی ② ان کے تئیں اس تعریف وتوصیف کا اظہار مقصود تھا کہ تم نہایت فہیم وذکی ہو اور تم سے جو بات کہی جاتی ہے اس کو تم خوب اچھی طرح سنتے ہو۔ ③ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا دونوں اقوال میں کوئی منافات نہیں' چونکہ آنحضرت ﷺ کے جو بھی الفاظ صورۃً مذاق ہوتے وہ بھی درحقیقت کسی معنوی حقیقت پر مبنی ہوتے۔ ممکن ہے کہ ان کے کان کچھ لمبے ہوں یا کچھ چھوٹے ہوں، یا کچھ اور کسی طرح کی کوتاہی ہو جس کی طرف آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ اشارہ فرمایا ہو۔ ④ ان کو تنبیہ وتحریض مقصود ہو کہ جو بات کہی جائے اس کو اچھے انداز سے سنا جائے' چونکہ کہا جاتا ہے کہ سمع کا تعلق حاسہ اذن (کان کے محسوس کرنے کی صلاحیت) سے ہے' اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے دو کان عطا کیے ہوں اور (اس کے باوجود) غفلت کرے اور بات اچھی طرح (سن کر) محفوظ نہ کر سکے تو وہ معذور نہیں۔ (یعنی ایسے شخص کا کوئی عذر قابل قبول نہیں)۔ (قالہ صاحب النہایۃ)

کوئی بڑھیا جنت میں نہ جائے گی

۴۸۸۸: وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لِامْرَاةٍ عَجُوْزٍ اِنَّهٗ لَا تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَجُوْزٌ فَقَالَتْ وَمَالَهُنَّ وَكَانَتْ تَقْرَاءُ الْقُرْاٰنَ فَقَالَ لَهَا اَمَا تَقْرَئِيْنَ الْقُرْاٰنَ اِنَّا اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَاءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا۔

(رواه رزين وفي شرح السنة بلفظ المصابيح)

أخرجه البغوي في شرح السنة ۱۳/۱۸۳ الحديث رقم ۳۶۰۶۔

ترجمہ: انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بوڑھی عورت سے فرمایا کوئی بھی بوڑھی جنت میں داخل نہ ہوگی اس نے کہا یہ کیوں حالانکہ وہ قرآن پڑھتی ہیں فرمایا کیا تم قرآن میں یہ نہیں پڑھتی: اِنَّا اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَاءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا۔ یعنی ہم ان عورتوں کو پیدا کریں گے جیسا پیدا کیا جاتا ہے پس ہم ان کو بنائیں گے کنواری۔ رزین شرح السنہ میں مصابیح کے الفاظ میں ہے۔

تشریح: **قوله: وفي شرح السنة بلفظ المصابيح:**

مصابیح میں اس روایت کو جن الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے وہ یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس عورت سے فرمایا کہ بوڑھی عورتیں جنت میں داخل نہیں ہوں گی یہ سن کر وہ عورت واپس ہوئی اور روتی ہوئی چلی گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس عورت کو جا کر بتا دو عورتیں اپنے بڑھاپے کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہوں گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّا اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَاءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا۔ [الواقعة: ۳۶]

تم اللہ کے ہاں کھوٹے نہیں ہو

۴۸۸۹: وَعَنْهُ اَنَّ رَجُلاً مِنْ اَهْلِ الْبَادِيَةِ كَانَ اسْمُهٗ زَاهِرُ بْنِ حَرَامٍ وَكَانَ يَهْدِىْ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْبَادِيَةِ فَيُجَهِّزُهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَخْرُجَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ زَاهِرًا بَادِيَتُنَا وَنَحْنُ حَاضِرُوْهُ وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّهٗ وَكَانَ دَمِيْمًا فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا وَهُوَ يَبِيْعُ مَتَاعَهٗ فَاحْتَضَنَهٗ مِنْ خَلْفِهٖ وَهُوَ لَا يُبْصِرُهٗ فَقَالَ اَرْسِلْنِيْ مَنْ هٰذَا فَالْتَفَتَ فَعَرَفَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلَ لَا يَاْلُوْ مَا اَلْزَقَ ظَهْرَهٗ بِصَدْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ عَرَفَهٗ وَجَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ يَشْتَرِى الْعَبْدَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذًا وَاللّٰهِ تَجِدُنِىْ كَاسِدًا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لٰكِنْ عِنْدَ اللّٰهِ لَسْتَ بِكَاسِدٍ۔ (رواه فى شرح السنة)

أخرجه البغوى فى شرح السنة ١٣/ ١٨١ الحديث رقم ٣٦٠٤، واحمد فى المسند ٣/ ١٦١۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی شخص جس کا نام زاہر بن حرام تھا وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے گاؤں سے ہدیہ لایا کرتا تھا جب وہ واپس جانے لگتے تو انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تحائف عطا فرماتے اور فرماتے کہ زاہر ہمارا دیہاتی ہے اور ہم اس کے شہری ہیں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے محبت کرتے تھے اور وہ خوبصورت نہ تھے ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو زاہر اپنا سامان بیچ رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پیچھے کمر کی جانب سے جکڑ لیا حالانکہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا (اور) بولے کون ہو؟ مجھے چھوڑ دو۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا تو انہوں نے موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا پہچاننے کے بعد اپنی پشت بار بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ سے مس کرنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس غلام کو کون خریدتا ہے؟ عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی قسم مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھوٹا پائیں گے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (بطور مزاح) فرمایا تم اللہ کے ہاں کھوٹے نہیں ہو۔ (شرح السنۃ)

راویٔ حدیث:

زاہر بن حرام: ''حرام'' ضد ہے حلال کی۔ مؤلفؒ نے الاکمال میں ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ البتہ ''استیعاب'' میں ہے کہ حجازی تھے دیہات میں رہا کرتے تھے اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ اشجعی تھے شرکائے بدر میں سے ہیں۔

تشریح: قوله: كان يهدى للنبى ﷺ: شمائل کی روایت میں ''الى النبى ﷺ هدية'' کے الفاظ ہیں۔

''يهدى'' یاء کے ضمہ کے اور دال کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ ''للنبى'' صلی اللہ علیہ وسلم: یہ لام اجلیہ ہے یا بمعنیٰ ''الى'' ہے اى لأجل النبى أو اليه فيجهزه: ھا کی تشدید کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں تخفیف کے ساتھ ہے جیسا کہ شمائل کی روایت میں ہے۔

بادیتنا: (یہاں مضاف محذوف ہے) اى ساكن باديتنا أو صاحبها أو اهلها بادية: بادیة کی تاء برائے مبالغہ

ہے اور بعض کا کہنا ہے، کہ" اطلاق اسم المحل علی الحال" کے قبیل سے ہے۔ شمائل کے بعض نسخوں میں" بادینا" کا لفظ ہے۔ معنی کے اعتبار سے اول کے مقابلہ میں یہ لفظ زیادہ واضح ہے۔" بادی" بادیہ میں مقیم شخص کو کہتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے: ﴿سواء العاكف فيه والباد﴾. [الحج۔ ۲۵]

قوله: ونحن حاضره: یہ" حضور" سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے: **الاقامة في المدن والقرى۔** (شہروں بستیوں میں رہائش پذیر ہوں) امام طیبی فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے دیہات میں پائی جانے والی نباتات کا استفادہ کرتے ہیں اور ہم شہر میں پائے جانے والی چیزیں ان کو فراہم کرتے ہیں۔

دمیم: دال مہملہ کے ساتھ: قبیح المنظر، کریہ الصورۃ" (حقیر، بدصورت) **فأتى النبي ﷺ يوما:** "النبی" رفع کے ساتھ ہے۔ **فجعل لا يالو:** "جعل" بمعنی شرع وطفق ہے" اور" لا یألو" ہمزہ کے سکون وابدال اور لام کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ای **لا يقصر۔**

وهو لا يبصر: جملہ حالیہ ہے۔ شمائل کی روایت میں" **ولا يبصر**" ہے۔ اور ایک نسخہ میں" **ولا يبصره**" ہے۔

"**من هذا**": شمائل کی روایت میں" **من هذا؟ أرسلني**" کے الفاظ ہیں۔

ما الزق ظهره: شمائل کی روایت میں" **ما ألصق**" صاد کے ساتھ ہے۔ بہرحال دونوں ہم معنی ہیں۔" ما" مصدریہ ہے۔ منصوب بنزع الخافض ہے۔ ای: **في الزاق ظهره.**

وجعل النبي ﷺ يقول: شمائل کے نسخوں میں (وجعل کی بجائے) "**فجعل**" ہے۔

من يشتري العبد: شمائل کے بعض نسخوں میں "**هذا العبد**" ہے۔

آنحضرت ﷺ نے زاہر کو از راہ مذاق" عبد" کہا اور حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی جھوٹ بات نہیں تھی کیوں کہ وہ" عبداللہ" (اللہ کے بندے) تو بہرحال تھے ہی۔

کسی چیز کو بطور فروخت کرنے کے لئے بطور استفہام یہ کہنا کہ کون شخص ہے جو اس کو خریدتا ہے تو لفظ" اشتراء" کے مفہوم کے اعتبار سے کبھی تو اس اطلاق کیا جاتا ہے۔ "**مقابله الشي بالشيئي**" اور کبھی اس کا اطلاق استبدال پر ہوتا ہے۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد" کون شخص ہے جو اس غلام کا خریدار ہے" کا مطلب یہ تھا کہ اس بازار میں ایسا کوئی شخص ہے جو اس غلام کی قیمت لگادے اور ایسی کوئی چیز مجھے دے سکے جس کے بدلے میں اس کو یہ غلام دے سکوں یعنی یہاں کا کوئی مال اس کا بدل نہیں ہوسکتا اور کوئی چیز اس کی قیمت نہیں بن سکتی! نیز یہ بھی ممکن ہے آپ ﷺ کا یہ ارشاد تجرید کے قبیل سے ہو جس سے گویا آپ ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ کون شخص ہے جو اس غلام کو حاصل کرے (یعنی ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو اس غلام کو حاصل کرنے اور اس کو اپنے پاس رہنے کا اہل ہو۔)

يا رسول الله! اذا: "اذًا" جواب اور جزاء ہے۔ ای: **ان بعتنی او عرضتنی للبیع او الأخذ اذًا الخ.**

والله تجدني كاسدا: شمائل کے بعض نسخوں میں" **اذا تجدني والله كاسدًا**" کے الفاظ ہیں۔ یعنی کلمہ قسم فعل سے مؤخر ہے۔" **كاسدا**": (اس کا موصوف محذوف ہے۔) ای **متاعا كاسدا!** اکثر نسخوں میں رفعہ کے ساتھ ہے۔ ممکن ہے کہ

حال کے معنی مراد ہوں، نا کہ استقبال کے۔ بعض نسخوں میں منصوب ہے، یہ ظاہر ہے۔ اور یہ اس قول کی مانند ہوگا: اذا و الله نرميهم بحرب.

تجدنی: میرک فرماتے ہیں: شمائل کے بعض نسخوں میں ''تجدونی''، جمع کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ یہاں تکلف کرنا پڑتا ہے۔ ملا علی قاریؒ کا کہنا ہے کہ اس میں دو احتمال ممکن ہیں:

- یہ صیغہ باعتبار صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے استعمال ہوا ہے۔
- یہ صیغہ نبی کریم ﷺ ہی کیلئے استعمال ہوا ہے البتہ بطور تعظیم۔

قوله: لكن عند الله لست بكاسد: ظرف کی اس کے متعلق اور عامل سے تقدیم 'اہتمام و اختصاص کی وجہ سے ہے۔ شمائل میں: ''او قال: أنت عند الله غال'' ہے۔ راوی کو شک ہے۔ اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ ''او'' ''بمعنی'' بل'' ہو۔ اور ایک نسخہ میں ''لكن عند الله غال'' کے الفاظ ہیں، اس جملہ سے حضرت زاہرہ کی منقبت اور زیادہ نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔

تخریج: اس حدیث کو صاحب المصابیح نے اپنی سند کے ساتھ شرح السنہ میں ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں امام ترمذیؒ نے شمائل میں، ابن حبان نے بھی اس کو نقل کیا اور صحیح قرار دیا ہے۔

کیا تمام کا تمام اندر آ جاؤں؟

۴۸۹۰: وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْأَشْجَعِيِّ قَالَ اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ وَهُوَ فِيْ قُبَّةٍ مِنْ اَدَمٍ فَسَلَّمْتُ فَرَدَّ عَلَيَّ فَقَالَ اُدْخُلْ فَدَخَلْتُ قَالَ عُثْمَانُ بْنُ اَبِي الْعَاتِكَةِ اِنَّمَا قَالَ اَدْخُلُ كُلِّيْ مِنْ صِغَرِ الْقُبَّةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابوداود في السنن ٥/٢٧٢ الحديث رقم ٥٠٠٠ و ابن ماجه في السنن ٢/١٣٤١ الحديث رقم ٤٠٤٢، واحمد في المسند ٦/٢٢۔

ترجمہ: حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں غزوہ تبوک کے موقع پر حاضر ہوا آپ ﷺ اس وقت چمڑے کے ایک خیمے میں تشریف فرما تھے میں نے سلام کیا آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیتے بھی فرمایا اندر آ جاؤ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ سارے کا سارا آ جاؤں آپ نے فرمایا سارے کا سارا آ جاؤ چنانچہ میں حاضر ہوا عثمان بن ابی عاتکہ کہتے ہیں کہ عوف نے یہ الفاظ خیمے کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے کہے۔

(ابوداؤد)

تشریح: قوله: وهو في قبة: 'قبة'': چھوٹے خیمہ کو کہتے ہیں۔ ''أدم'': بروزن قلم بمعنی جلد فسلمت: اس سلام میں دو احتمال ہیں: (۱) یہ سلام سلامِ استیذان تھا۔ (۲) یہ سلام سلامِ ملاقات تھا۔

کللی: بقول امام طیبیؒ مرفوع و منصوب دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔ تقدیری عبارت دو طرح ہو سکتی ہے۔ (۱) ایدخل

كلي؟ فقال: كلك يدخل۔ او ادخل كلي؟ فقال: ادخل كلك.

أدخل كلي: ثلاثی مجرد سے متکلم کا صیغہ ہے۔ایک نسخہ میں ثلاثی مزید فیہ سے ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ بظاہر باب افعال سے ہے۔ثلاثی مجرد سے پڑھنے کی صورت میں کلی کو تاکید بنانا پڑے گا،اور یہ بات بعید ہے۔

من صغر القبة کا مطلب:

① خیمہ چھوٹا تھا۔

② خیمہ چھوٹا تھا اور عوف بن مالک کا قد بڑا تھا۔

③ خیمہ چھوٹا نہیں تھا البتہ موجود لوگوں کی کثرت کے باعث تنگ پڑ گیا تھا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ اس طرح محبت و شفقت کا تعلق رکھتے تھے کہ صحابہ آپ ﷺ کے ساتھ بے تکلف ہو جاتے تھے اور اس بے تکلفی کے موقع پر آپ ﷺ سے ظریفانہ بات بھی کر لیتے تھے۔

نبی کریم ﷺ ابوبکر اور عائشہ رضی اللہ عنہما کی والہانہ محبت

۴۸۹۱: وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ اسْتَاذَنَ اَبُوْبَكْرٍ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمِعَ صَوْتَ عَائِشَةَ عَالِيًا فَلَمَّا دَخَلَ تَنَاوَلَهَا لِيَلْطِمَهَا وَقَالَ لَا اَرَاكِ تَرْفَعِيْنَ صَوْتَكِ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْجُزُهُ وَخَرَجَ اَبُوْبَكْرٍ مُغْضَبًا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ خَرَجَ اَبُوْبَكْرٍ وَكَيْفَ رَاَيْتِنِيْ اَنْقَذْتُكِ مِنَ الرَّجُلِ قَالَتْ فَمَكَثَ اَبُوْبَكْرٍ اَيَّامًا ثُمَّ اسْتَاْذَنَ فَوَجَدَهُمَا قَدِاصْطَلَحَا فَقَالَ لَهُمَا اَدْخِلَا نِيْ فِيْ سِلْمِكُمَا كَمَا اَدْخَلْتُمَا نِيْ فِيْ حَرْبِكُمَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ فَعَلْنَا۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابو داؤد في السنن ٥/ ٢٧١ الحديث رقم ٤٩٩٩۔

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے پاس آنے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آواز بلند ہوتے ہوئے سنی جب وہ داخل ہوئے تو انہوں نے عائشہ کو اس لیے پکڑا تا کہ ان کو تھپڑ ماریں اور کہنے لگے میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے آواز بلند کرتا ہوا دیکھتا ہوں۔تو نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو منع فرمایا جب ابوبکر نکل گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا تم نے مجھے کیسا پایا کہ میں نے اس آدمی سے تمہیں بچایا؟ حضرت عائشہ صدیقہ کہتی ہیں کہ چند دنوں تک حضرت صدیق پھر آئے اور اجازت مانگی تو ان دونوں کو صلح کی حالت میں پایا تو کہنے لگے تم مجھے اپنی صلح میں داخل کرلو جیسا تم نے اپنی لڑائی میں مجھے داخل کیا تو جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہم نے ایسا کر دیا۔ (ابوداؤد)

تشریح: لیطم: طاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ضمہ بھی درست ہے "لطم" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے۔منہ پر یا جسم کے کسی بھی حصہ پر تھپڑ مارنا۔ (قاموس)

لا أراك: اس میں تین احتمال ہیں:

① نفی بمعنی نہی ہے۔ ای: لا ینبغی لی أن اراك علی هذه الحالة اور اس جملہ کے قبیل سے ہے: لا أرینك ههنا.

② صیغہ نہی ہی کا ہے لیکن یہ ایک خاص لغت ہے۔

عرضِ مرتب: حدیث: ۴۸۸۲ کے تحت اس سے ملتی بحث لفظ "أعطیك" کے بارے میں گذری ہے وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

③ یہ نہی متکلم پر واقع ہے اور "أراك" کا الف اشباع کے لئے ہے۔

ترفعین صوتك علی رسول الله ﷺ:

اس جملہ کے محل اعراب میں دو احتمال ہیں:

① یہ جملہ محل نصب میں " لا اراك " کا مفعول ثانی ہے۔

② " لا اراك " جملہ دعائیہ ہے۔ اور " ترفعین " الخ سے پہلے ہمزہ انکاری مقدر ہے۔

یحجزہ: جیم اور زاء دونوں کے ضمہ کے ساتھ **مغضبا**: ضاد کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ بمعنی غضبان۔ **قالت: فمكث**: کہا گیا ہے کہ ابوداؤد کی اصل میں یہ اسی طرح مذکور ہے امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ اس پر دال ہے کہ نعمان نے یہ حدیث حضرت عائشہؓ سے سنی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں یہ مراسیل صحابہ میں سے ہوگی اور مراسیل صحابہ بالا جماع مقبول ہیں۔ **مکث**: کاف کے ضمہ کے ساتھ البتہ فتحہ بھی پڑھا جاتا ہے۔ بظاہر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تین دن سے زیادہ ناراضگی نہ دکھانا اس بناء پر ہوگا کہ تین دن سے زیادہ ترک تعلق وکلام کے بارے میں ممانعت وارد ہوئی ہے۔

من الرجل: بظاہر یوں کہنا چاہئے تھا: " من ابیك "، لیکن دوسرا اسلوب اختیار کیا: الرجل کا " ال کمالیہ " ہے، لہٰذا من الرجل کہہ کر ان کے مرد کامل ہونے کی طرف اشارہ کیا کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کی خاطر غضبناک ہوگئے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کا وہ جملہ بطور مزاح تھا جو آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ دیکھا میں نے تمہیں اس شخص کے ہاتھ سے کس طرح نجات دلائی گویا آپ ﷺ نے " تمہارے باپ " کہنے کی بجائے " اس شخص " کہہ کر بقصد مزاح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حق میں اجنبی قرار دیا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے " فمكث أبو بكر " کہا، گویا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اجنبی سمجھا حالانکہ باپ شفقت ورحمت کا پیکر ہوتا ہے۔ یہ اسلوب تکلم اپنے والد ماجد سے کچھ خفگی کے باعث تھا۔

یہ بات بعید ہے، بلکہ بہت بعید ہے، بلکہ ہر اعتبار سے بعید ہے، کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جیسی کامل عقل، اعلیٰ فہم، مئودب خاتون کہ جو نبوت کا رتبہ بھی پہنچانتی ہو۔ اور ابوت کا درجہ بھی سمجھتی ہو، وہ اتنے عرصے تک اپنے باپ سے محض اس بات پر ناراض رہی ہو کہ اس کے باپ نے اس کو تھپڑ مارنا چاہا تھا، (حالانکہ مارا بھی نہیں)۔ یا چلو مار ہی دیا، تو رسول اللہ ﷺ ہی کی خاطر مارا، اسی بات پر مارا کہ آئندہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (پہلے سے زیادہ) ادب کے ساتھ پیش آئیں۔

اس کی نظیر میں بہت سے صحابہ کرام کے واقعات ہیں، کہ انہوں نے اپنے آباء کا نام ذکر کیا ہے۔ چونکہ وہ حضرات ان تکلفات کے عادی نہ تھے جن تکلفات نے ان کے بعد کے زمانے میں جنم لیا۔ اگرچہ اولیٰ وانسب یہی تھا کہ وہ رشتہ " ابوۃ " ہی کو

ذکر کرتے۔ اور والدین کو نام لے کر پکارنا تو کھلم کھلا خلاف ادب ہے۔ علاوہ ازیں یہ روایت بالمعنی ہے، جیسا کہ اگلے اسلوب کلام ثم استأذن فوجدهما قد اصلحا فقال لهما سے بالکل واضح ہے، چونکہ اگر یہ کلام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہوتا تو یوں ہونا چاہئے تھا: فوجدنا قدا صطلحنا فقال لنا...... لہٰذا یہ اشکال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

عرضِ مرتب: ملا علی قاریؒ کی تمام باتیں سر آنکھوں پر، مندرجہ ذیل واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔

وَعَنْهَا قَالَتْ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنِّي لَاَ عْلَمُ اِذَا كُنْتِ عَنِّي رَاضِيَةً وَاِذَا كُنْتِ عَلَيَّ غَضْبٰى فَقُلْتُ مِنْ اَيْنَ تَعْرِفُ ذٰلِكَ فَقَالَ اِذَا كُنْتِ عَنِّي رَاضِيَةً فَاِنَّكِ تَقُوْلِيْنَ لَا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ وَاِذَا كُنْتِ عَلَيَّ غَضْبٰى قُلْتِ لَا وَرَبِّ اِبْرَاهِيْمَ قَالَتْ قُلْتُ اَجَلْ وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا اَهْجُرُ اِلَّا اسْمَكَ.

ترجمہ: "اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ مجھ سے فرمانے لگے کہ جس وقت تم مجھ سے خوش ہوتی ہو تو میں جان جاتا ہوں اور جب تم (کسی دنیوی معاملہ میں) مجھ سے ناراض ہوتی ہو (جیسا کہ میاں بیوی کے درمیان کسی بات پر خفگی ہو جاتی ہے) تو مجھے وہ بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ "آپ ﷺ یہ کس طرح پہچان لیتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: (اس طرح کہ) جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو تو اس طرح کہا کرتی ہو" یہ بات نہیں ہے محمد ﷺ کے پروردگار کی قسم" اور جب تم مجھ سے خفا ہوتی ہو تو اس طرح کہتی ہو کہ یہ بات نہیں ہے ابراہیمؑ کے پروردگار کی قسم (یعنی جب تم مجھ سے خفا ہونے کی حالت میں قسم کھاتی ہو تو میرا نام نہیں لیتیں بلکہ ابراہیم علیہ السلام کا پروردگار کہتی ہو) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ (یہ سن کر) میں نے عرض کیا کہ "ہاں یا رسول اللہ! یہ بات ٹھیک ہے لیکن میں صرف آپ ﷺ کا نام ہی چھوڑتی ہوں"۔

في سلمكما: سین کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ، بمعنی صلح۔

كما أدخلتماني: زوجین مطہرین کی طرف ادخال کا اسناد مجاز سببی ہے۔

بطور مشاکلت کے ہے۔

وقد فعلنا: قد برائے تحقیق ہے۔

[1] مفعول بہ محذوف ہے۔ ای: فعلنا ادخالك في السلم. [2] بمنزلہ فعل لازم کے ہے۔ ای: او قعنا هذا الفعل.

قد فعلنا:

[1] یہ دوسرا قد فعلنا پہلے قد فعلنا کی تاکید ہے۔ [2] یہ حضرت عائشہؓ کی طرف سے تھا۔

مسلمان بھائی کا مذاق مت اُڑاؤ

۴۸۹۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُمَارِ اَخَاكَ وَلَا تُمَازِحْهُ وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَهٗ۔ (رواه الترمذي وقال هذا حديث غريب)

أخرجه الترمذي في السنن ٤/٣٦٦ الحديث رقم ١٩٩٥۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے بھائی سے نہ جھگڑو نہ اس کا مذاق اڑاؤ اور نہ اس سے کوئی ایسا وعدہ کرو جس کا تم خلاف کرو۔ ترمذی نے اس کو روایت کر کے کہا یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: لا تمار: از باب مفاعلہ، مماراۃ مصدر سے ہے۔

قال: اکرمهم عند الله: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جملہ کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل فضیلت تقویٰ پرہیزگاری میں ہے کہ بغیر تقویٰ کے کوئی بھی فضیلت قابل اعتبار نہیں خدا کی نظر میں کریم یعنی بزرگ و شریف وہی شخص ہے جو پرہیزگار ہو جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ان اکرمکم عند الله اتقکم بے شک زیادہ عزت والا تم میں سے اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

قال فاکرم الناس یوسف...... : لوگوں کے نزدیک اصل حسب وفضیلت مالداری ہے کہ جو شخص مالدار اور صاحب ثروت ہو تو وہی حسب والا اور فضیلت کا مالک سمجھا جاتا ہے اور اس کی عزت کی جاتی ہے۔

لہٰذا خاندانی شرافت وعظمت اور نسبی برتری کی جو خصوصیات حضرت یوسف علیہ السلام کو حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں سب سے بڑا شرف ان کے علاوہ اور کسی انسان کو حاصل نہیں ہوا کہ وہ خود نبی علیہ السلام تھے ان کے باپ نبی علیہ السلام تھے ان کے دادا نبی تھے اور ان کے پڑدادا نبی علیہ السلام تھے۔ اس خصوصیت کے علاوہ ان کو حسن و جمال، عدل وانصاف، علم و دانائی اور ریاست وحکومت کے جو اوصاف حاصل تھے ان کے اعتبار سے ان کی ذاتی مکرمت کو شرافت کو سب سے برتر مقام حاصل ہے۔

قال فخیارکم فی الجاهلیة الخ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری جواب کا مطلب یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت میں جن لوگوں کی ذات اور شخصیت کی وجہ سے ان کو سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا وہ لوگ اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر زمانہ اسلام میں بھی معزز ومکرم قرار دیئے جائیں گے بشرطیکہ انہوں نے ایمان واسلام قبول کر کے دین کا علم اور شریعت کے احکام ومسائل حاصل کئے ہوں۔ فرق یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ان پر کفر کا سایہ معصیت کی تاریکی اور جہل کا غبار چھایا ہوا تھا اور خواہش نفس کے دام فریب میں مبتلا تھے اور اس اعتبار سے ان کی ذاتی شرافت وصفات کی کوئی حیثیت نہیں تھی مگر اب ایمان واسلام کی پاکیزگی اور عبادات وعلم دین کے نور نے ان کی ذات و شخصیت کو نکھار دیا ہے ان کی زندگی کو روشن کر دیا ہے اور ان کو حق کا تابعدار بنا دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''معادن'' سے مراد لوگوں کی اپنی ذات وشخصیات ہیں جو عمدہ صفات واعلیٰ خصوصیات سے متصف ہوں جیسا کہ کتاب العلم میں یہ روایت نقل کی جا چکی ہے کہ الناس معادن الذهب والفضة الخ یعنی لوگوں کی بھی کانیں ہوتی ہیں جیسے سونے اور چاندی کی کانیں پس جو خاندان وافراد اپنی اعلیٰ خصوصیات کے اعتبار سے زمانہ جاہلیت میں سب سے بہتر شمار کئے جاتے تھے اسلام کے زمانہ میں بھی وہی سب سے بہتر ہیں بشرطیکہ وہ دین کا علم حاصل کریں۔

عرض مرتب:

وعدہ سے متعلقہ احکام ماقبل میں ''احکام الباب'' کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

بَابُ الْمُفَاخِرَةِ وَالْعَصَبِيَّةِ

مفاخرت اور عصبیت کا بیان

مفاخرہ: کی لغوی تحقیق:

فخر- فخرا وفخارا وفخارة، اپنے یا قوم کے محاسن پر فخر کرنا۔ فخر- الرجل، فخرا، فخر میں فوقیت لے جانا۔

الافتخار: باب افتعال کا مصدر ہے، بمعنی فخر۔

تفاخر القوم: ایک دوسرے پر بڑائی جتانا، تکبر کرنا، ایک دوسرے پر فخر کرنا، فخره عليه، اور بأفخر فالنا على فالفا: کسی کو دوسرے پر فوقیت دینا۔

العصبية: کی لغوی تحقیق عصبية اپنے لوگوں کی حمایت ومدد کا جذبہ، تعصب۔

تعصب فلان: متعصب ہونا۔

احکام باب:

عصبة الرجل: اولاد اور باپ کی طرف سے رشتہ دار یا اس کے حامی وہمدرد لوگ۔ (واحد اور جمع دونوں کیلئے) اگر حق کے معاملے میں ہو۔۔۔۔ راحادیث سے معلوم ہوگا۔

اپنی جماعت اور اپنی قوم کی جائز حمایت کرنا۔۔۔ معاونت کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی۔

اپنی قوم وجماعت یا اپنے علم واخلاق اور یا اپنی مالداری وثروت وغیرہ پر نازاں ہونا اور فخر کرنا۔ تفاخر کے معنی ہیں کہ ایک دوسرے پر فخر کرنا مفاخرت کے معنی ہیں فخر میں ایک دوسرے کی برابری کرنا اور افتخار وتفخر کے معنی ایک کو دوسرے کے مقابلہ پر بڑھانا۔

مفاخرت یعنی اظہار فخر کرنا اور نازاں ہونا اگر حق کے معاملہ میں ہو حق کی خاطر ہو کسی دینی مصلحت کے پیش نظر ہو اور دشمنان اسلام پر اپنی برتری اپنی شان وشوکت اور اپنی قوت کے اظہار کے طور پر ہو تو جائز ہے چنانچہ اس طرح کی مفاخرت صحابہؓ اور سلف سے منقول ہے اور اگر مفاخرت کا تعلق ناحق معاملہ سے ہو اور نفسانیت کے تحت تکبر وغرور اور گھمنڈ کے طور پر ہو تو مذموم ہے اور عرف عام میں مفاخرت کا استعمال اکثر اسی معنی میں ہوتا ہے۔

عصبیت کے معنی ہیں عصبی یا متعصب ہونا یعنی اپنے مذہب یا اپنے خیال کی پچ کرنا اور اپنی قوم کی قوت وسختی کے اظہار کے لئے جدل وخصومت کرنا۔ چنانچہ عصبہ اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی بات یا اپنی قوم کی حمایت کرے اور یا اپنی قوم وجماعت کی پچ

کے لئے غصہ ہو تعصب بھی اگر حق کے معاملہ میں ہو اور ظلم وتعدی کے ساتھ نہ ہو تو مستحسن ہے اور اگر تعصب کا تعلق حق بات کو نہ ماننے، ظلم وتعدی اختیار کرنے اور اپنی قوت وشان وشوکت کے بیجا اظہار کی خاطر ہو تو مذموم ہے عام طور پر تعصب کا اطلاق اپنی بات وخیال اور اپنے مذہب قوم کے حق میں ناروا سختی اختیار کرنے اور دوسروں کے تئیں ظلم وتعدی کرنے پر ہوتا ہے جیسا کہ اس باب میں نقل کی جانے والی احادیث سے معلوم ہوگا۔

الفصل الاول:

سب سے بہتر شخص، احکامِ دین سے آگاہی رکھنے والا ہے

۴۸۹۳: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیُّ النَّاسِ اَکْرَمُ فَقَالَ اَکْرَمُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاهُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَنْ هٰذَا نَسْئَلُكَ قَالَ فَاَکْرَمُ النَّاسِ یُوْسُفُ نَبِیُّ اللّٰهِ ابْنُ نَبِیِّ اللّٰهِ ابْنِ نَبِیِّ اللّٰهِ ابْنِ خَلِیْلِ اللّٰهِ قَالُوا لَیْسَ عَنْ هٰذَا نَسْئَلُكَ قَالَ فَعَنْ مَعَادِنِ الْعَرَبِ تَسْاَلُوْنِیْ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ خِیَارُکُمْ فِی الْجَاهِلِیَّةِ خِیَارُکُمْ فِی الْاِسْلَامِ اِذَا فَقِهُوْا۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٣٦٢/٨ الحدیث رقم ٤٦٨٩ و مسلم فی ١٨٤٦/٤ الحدیث رقم (١٦٨-٢٣٧٨)، واحمد فی المسند ٤٨٥/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں زیادہ عزت والا کون ہے فرمایا اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا سب سے زیادہ تقویٰ رکھنے والا ہے' عرض کیا ہم نے اس کے متعلق سوال نہیں کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں میں بڑے شرف والے اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام ہیں وہ اللہ کے نبی کے بیٹے اور ان کے والد اللہ کے نبی خلیل اللہ علیہ السلام کے بیٹے عرض کیا ہم اس کے متعلق نہیں پوچھتے فرمایا کیا تم مجھ سے عرب قبائل کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟ عرض کی ہاں! فرمایا تم میں سے جو لوگ جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں جب کہ وہ احکام دین سے آگاہ ہوں۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: لیس عن هذا نسئلك: فعل بمنزلہ مصدر کے ہے۔ ای: لیس سؤالنا ایاك عن هذا. جیسا کہ کسی کا یہ قول ہے: فقالوا ما تشاء فصلت الهوی. اھ۔

یوسف: سین پر تینوں حرکتیں پڑھنا درست ہے، علاوہ ازیں واؤ کو ہمزہ سے بدل کر بھی پڑھا جاتا ہے۔ قصہ مختصر لفظ یوسف میں چھ لغات ہیں۔ البتہ ضمہ مشہور ہے۔

تسألونی: نون کے مخففہ، مثقلہ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

فصل اول، حدیث: ۲۲۰، ۲۰۱ ملاحظہ فرمائیے۔

عرضِ مرتب:

یہ حدیث حضرت یوسف علیہ السلام کی عظیم سبقت کے بیان پر مشتمل ہے۔عیاں راچہ بیاں۔ چنانچہ اس حدیث کا باب بدء الخلق وذكر الأنبياء کے تحت ذکر کرنا بھی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔لہٰذا ہم نے اس کی تشریح وہاں بھی ذکر کی ہے۔

شرفاء کا خاندان

۴۸۹۴: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْكَرِيْمُ بْنُ الْكَرِيْمِ بْنُ الْكَرِيْمِ بْنُ الْكَرِيْمِ يُوْسُفُ بْنُ يَعْقُوْبَ بْنِ اِسْحٰقَ ابْنِ اِبْرَاهِيْمَ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٦/٤١٧ الحديث رقم ٣٣٨٢، والترمذی فی السنن ٥/٢٧٣ الحديث رقم ٣١١٦، واحمد فی المسند ٢/٩٦۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شریف بن شریف بن شریف حضرت یوسف ہیں جو یعقوب کے بیٹے وہ اسحق کے بیٹے وہ ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔(بخاری)

تشریح: الكريم بن الكريم بن الكريم بن الكريم: ابن الملک شرح المصابیح میں لکھتے ہیں: لفظ ابن بغیر الف کے لکھا ہوا ہے، حالانکہ الف کے ساتھ لکھا جانا چاہئے تھا، کیونکہ صفت واقع ہو رہا ہے۔

عرضِ مرتب:

1. ہمارے نسخہ میں لفظ "ابن" الف ہی کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔
2. اس حدیث کی تشریح کیلئے پچھلی حدیث ملاحظہ فرمائیے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد نے ابن عمرؓ سے نیز حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

نوکِ زبان پر رجزیہ کلمات

۴۸۹۵: وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ فِيْ يَوْمِ حُنَيْنٍ كَانَ اَبُوْسُفْيَانَ بْنِ الْحَارِثِ اٰخِذً بِعِنَانِ بَغْلَتِهٖ يَعْنِيْ بَغْلَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا غَشِيَهُ الْمُشْرِكُوْنَ نَزَلَ فَجَعَلَ يَقُوْلُ اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبَ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ قَالَ فَمَارُئِيَ مِنَ النَّاسِ يَوْمَئِذٍ اَشَدُّ مِنْهُ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٦/١٦٤ الحديث رقم ٣٠٤٢ و مسلم فی ٣/١٤٠٠ الحديث رقم (٧٨-١٧٧٦)، واحمد فی المسند ٤/٢٨٠۔

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ غزوہ حنین کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ ابوسفیان بن حارث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر کی لگام پکڑے ہوئے تھے جب مشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیرے میں لے لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نیچے تشریف لائے اور یہ کہہ

رہے تھے میں کوئی جھوٹا نبی نہیں ہوں میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔ بیان کرتے ہیں کہ اس دن حضور ﷺ سے بڑھ کر بہادر کوئی نہیں دیکھا گیا۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: في يوم حين: ظرف مقدم ہے۔

كان أبو سفيان الخ: مقولہ ہے۔

يعني بغلة رسول الله ﷺ: یہ کلام کسی راوی کا ہے۔ اس کلام سے مقصود بغلته کی ضمیر کا مرجع بتانا ہے۔ کہ ابوسفیان بن حارث نے اپنے خچر کی نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ کے خچر کی لگام تھامی ہوئی تھی۔

انا النبي كذب ☆ انا ابن عبد المطلب.

درست بات یہ ہے کہ دونوں مصرعوں میں "با" ساکن ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ پہلے مصرع کی "با" مفتوح اور دوسرے مصرع کی باء مکسور ہے۔

عرضِ مرتب:

1. آنحضرت ﷺ کی بابت شعر کا مسئلہ، انتہائی وضاحت کے ساتھ ما قابل میں حدیث کے تحت گزر چکا ہے۔
2. یہ حدیث آنحضرت ﷺ کی بے مثال شجاعت وجوانمردی پر دلالت کرتی ہے۔

اگرچہ آنحضرت ﷺ نے حسب نسب اور خاندانی وجاہت پر اظہار فخر کرنے اور نازاں ہونے سے منع فرمایا ہے لیکن آپ ﷺ کا بطور رجز یہ فرمانا کہ میں عبدالمطلب کا سپوت ہوں اس طرح کا اظہار فخر نہیں ہے جو ممنوع ہے کیونکہ وہ فخر ممنوع ہے جو زمانۂ جاہلیت کی رسم کے مطابق بے جا اظہار نام ونمود، تعصب وہٹ دھری اور نفس کے گھمنڈ کے طور پر ہو جب کہ آنحضرت ﷺ کا مذکورہ فخر دین کی طاقت اور شان وشوکت بڑھانے اور کفار کے مقابلہ پر اپنا رعب اور دبدبہ ظاہر کرنے کے لئے تھا اور اس طرح کا فخر جائز ہے۔ علاوہ ازیں ایک بات یہ تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں بعض اہل عرب جیسے کاہن اور اہل کتاب آنحضرت ﷺ کی نبوت ظاہر ہونے سے پہلے بعثت نبوی ﷺ کی خبر دیا کرتے تھے اور نبی آخر الزمان ﷺ کی جو نشانیاں اور علامتیں بتایا کرتے تھے ان میں سے ایک نشانی یہ بھی تھی کہ وہ پیغمبر عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہوں گے۔ چونکہ پیشینگوئی میں یہ بات بھی تھی کہ وہ شخص جو خاتم الانبیاء ہوگا اس کو شکست نہ ہوگی۔ چنانچہ اللہ کی مدد اور آپ ﷺ کی دلیری اور ثابت قدمی سے معرکہ سر ہوا اور مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

مفاخرت: کی دو قسمیں ہیں: 1 محمودہ۔ 2 مفاخرت مذمومہ۔

مفاخرت مذمومہ وہ ہے وہ جس میں زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق بے جا اظہار نام ونمود، تعصب، ہٹ دھرمی اور نفس کا گھمنڈ ہو۔ مفاخرت محمودہ وہ ہے کہ جس میں فخر علی النسب کے ساتھ حسب فی الدین ہو، ریاء کاری مقصود نہ ہو۔ بلکہ اظہار نعمت کے طور پر ہو، چنانچہ "لا فخر" سے مفاخرت مذمومہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ حدیث:

فقال: (من أنا؟) قالوا: أنت رسول الله: از مرقات ۶۳۲ پہلا پیرا گراف وخيرهم بيتا".

قال: فمارئي من الناس يومئذ أشد منه: اس جملہ کی تشریح جلد دہم، باب في اخلاقه وشمائله ﷺ حدیث:

۵۷۰۲ میں شرح کے تحت ملاحظہ فرمایئے۔

سیّد البریہ ابراہیم علیہ السلام ہیں

۴۸۹۲: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا خَيْرَ الْبَرِيَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاكَ اِبْرَاهِيْمُ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١٨٣٩/٤ الحديث رقم (١٥٠-٢٣٦٩)، واحمد في المسند ١٧٨/٣۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا اے مخلوق میں سب سے بہتر! تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ (مسلم)

تعارض:

- انا سيد ولد آدم يوم القيامة، واول من ينشق عنه القبر، و اول شافع و اول مشفع. (مسلم، ابو داؤد)
- انا سيد ولد آدم يوم القيامة ولا فخر، وبيدى لواء الحمد ولا فخر، وما من نبي يومئذ آدم فمن سواه الا تحت لوائي. وانا اول من تنشق عنه الأرض ولا فخر. وانا اول بشافع و اول مشفع ولا فخر. (احمد والترمذی وابن ماجة عن ابی سعید).
- انا اول من تنشق عنه الأرض فأكسى حلة من حلل الجنة، ثم اقوم عن يمين العرش ليس أحد من الخلائق يقوم ذلك المقام غيرى. (ترمذی من ابی هريرة).
- حدیث: ۴۸۹۲ یہاں نقل کریں۔

تشریح تعارض:

پہلی تینوں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے سردار اور ساری مخلوق سے افضل و برتر ہیں۔
چوتھی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ "خیر البریہ" یعنی ساری مخلوق میں سب سے بہتر کا مصداق حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

دفع تعارض:

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس تعارض کے تین جواب ہیں:

- حقیقت کے اعتبار سے تو ساری مخلوق میں سب سے بہتر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے از راہ تواضع و انکسار اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے کہ وہ خلیل اللہ اللہ کے دوست اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جد اعلیٰ ہیں ان کو خیر البریہ کا مصداق قرار دیا جیسا کہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ کوئی شریف النفس اور خلیق انسان تعظیم و تکریم کا خود سب سے زیادہ اہل و مستحق ہونے کے باوجود بسا اوقات کسی دوسرے شخص کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہے اور اس کی تعظیم کرتا ہے۔

مذکورہ روایت میں لسان نبوت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خیر البریہ کا مصداق قرار دیا جانا اس زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ اس وقت تک یہ وحی نازل نہیں ہوئی تھی کہ آپ ﷺ تمام اولاد آدم علیہ السلام میں سے افضل اور ساری مخلوق میں سب سے بہتر ہیں۔

اس جواب پر ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ بات کہنا اسی وقت درست ہوگا جب کہ ان روایات کے تقدم تاخر کا یقینی علم ہو۔

مذکورہ ارشاد گرامی کی مراد یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے زمانہ میں ساری مخلوق سے بہتر و برتر تھے اور آپ ﷺ نے اس بات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کرنے کی خاطر مطلق الفاظ ارشاد فرمائے۔

ملا علی قاریؒ کا نقد: ہر نبی کا اپنے زمانے میں ساری مخلوق سے بہتر و برتر ہونا بدیہی بات ہے۔ (لہٰذا یہ بیان کرنے کی حاجت ہی نہیں تھی۔ ''عیاں راچہ بیاں'')۔

: حضور ﷺ کی ذات گرامی کا استثناء ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا مستثنیٰ ہونا نقلا بھی ہے۔ اور عقلا بھی۔ عقلا یوں کہ بعض اصولیین کا کہنا ہے کہ متکلم اپنے کلام سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے تفاضل بین الانبیاء کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ ملا قاریؒ فرماتے ہیں: آپ کے ذکر کردہ ان تینوں جوابات میں اس جواز پر تو دلالت سرے سے نہیں ہے، علاوہ ازیں آنحضرت ﷺ کا افضل الخلائق ہونا دلائل صریحہ سے واضح ہے۔ قریب ہے کہ یہ مسئلہ قطعی ہو بلکہ اجماعی ہو۔

البریة: بتشدید الباء از مرقات تخفیفا۔ یہ کلمہ معتل ہے یا مہموز ہے۔

اگر یہ معتل ہو تو: ی: مشددہ ہے۔ بری سے مشتق ہے۔ بمعنی تراب (مٹی) جمع برایا اور بریات ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ اصل کے اعتبار سے مہموز ہے۔ پھر ہمزہ کو ترک کر دیا گیا۔ اب یہ کلمہ مہموز مستعمل نہیں ہے۔

اگر یہ مہموز ہو تو: بریئة ہے، یعنی یاء ساکن ہے اور اس کے بعد ہمزہ ہے۔ بمعنی خلیقة (مخلوق)۔ ثلاثی مجرد سے بطور فعل متعدی استعمال ہوتا ہے۔ برأہ اللہ یبرأ (از باب فتح) برأ و بروأ، پیدا کرنا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ کلمہ مہموز ہے، قراءت مشہورہ متواترہ ہے، اس کلمہ کو امام نافع اور ابن ذکوان نے عن ابن عامل، مہموز پڑھا ہے۔ باقی قراء نے تخفیفا ہمزہ کو یاء سے بدل کر یاء کا یاء میں ادغام کر کے پڑھا ہے۔

تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو

۴۸۹۷: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُطْرُوْنِىْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰى ابْنَ مَرْيَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤٧٨/٦ الحديث رقم ٣٤٤٥، والدارمي في ٤١٢/٢ الحديث رقم ٢٧٨٤، واحمد في المسند ٢٣/١۔

ترجمہ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ مجھے اس طرح نہ بڑھاؤ جس طرح

نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کو بڑھایا میں اس کا بندہ ہی ہوں لہٰذا تم اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہا کرو۔

(بخاری ومسلم)

تشریح: لا تطرونی: از باب افعال، الطراء مصدر سے ہے۔ اصل میں لا تطریون تھا۔ الاطراء کا مطلب ہوتا ہے۔ حمد وثناء میں مبالغہ اور غلو کرنا۔

کما اطرت النصاری ابن مریم سے مفہوم مخالف کے طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ: اطراء ہ من غیر جنس اطراء ھم جائز ایسا اطراء جائز ہے جو نصاریٰ کے الاطراء کی جنس سے نہ ہو۔ کسی نے کیا خوب کہا:

دع ما ادعته النصاری فی نبیھم
واحکم بما شئت مدحا فیه واحتکم

صاحب شرح السنہ لکھتے ہیں: نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدحت میں افراط برتا' اور ان کی مدح سرائی میں مبالغہ سے کام لیا اور ان کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے دیا تو آنحضرت ﷺ نے اپنے اس ارشاد گرامی کے ذریعے سے واضح فرما دیا کہ تم لوگ میری مدح وتعریف میں حد سے تجاوز کرتے ہوئے باطل کی حدوں کو مت چھونا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں:

کہ لفظ ''عیسیٰ'' اور ''مسیح'' سے عدول کرتے ہوئے ''ابن مریم'' کا لفظ اختیار کیا ان کو الوہیت سے دور کرنے کے لئے۔ ان لوگوں نے مدحت' اطراء وکذب میں مبالغہ کیا۔

نصاریٰ نے مدحت میں غلو کیا، اور یہود نے قدح میں غلو کیا۔ چنانچہ دونوں کو منع کیا گیا: ﴿يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ﴾ [المائدة:۷۷] اور راہ حق ''درمیانی راہ'' ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿إِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ [النساء:۱۷۱] یعنی عیسیٰ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔ ''ابن مریم'' ہونا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندہ ہیں، اور اللہ ہی کی ایک بندی کے بیٹے ہیں، جیسا کہ اس فرمان میں اسی طرف اشارہ فرمایا: ﴿كَانَا يَأْكُلٰنِ الطَّعَامَ﴾ [المائدة:۷۵] یعنی یہ دونوں بول وبراز بھی کرتے تھے، دونوں کو کھانے پینے کی حاجت بھی ہوتی تھی، لہٰذا یہ دونوں معبود والہ ہونے کے صلاحیت نہیں رکھتے، شان ربوبیت ان میں کہاں ہے؟ ان میں تو شان عبودیت پائی جاتی ہے۔ قولہ: فانما انا عبدہ: یعنی میں اللہ کا خاص بندہ ہوں' اس کے ہاں مقام اختصاص رکھتا ہوں۔ (عبودیت اور بندگی کا جو سب سے اعلیٰ درجہ ہے وہ آنحضرت ﷺ کی مخصوص صفت ہے کہ بندہ حقیقی آپ ﷺ کی ذات گرامی ہے اور صفت عبودیت میں آپ ﷺ سب سے کامل وبرتر ہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ کی مدح وتعریف کا کمال اور آپ ﷺ کی علو مرتبت کا بیان اسی صفت کو ظاہر کرنے میں ہے نہ کہ آپ ﷺ کی ذات گرامی کی منقبت وتعریف ایسے الفاظ و پیرایہ میں بیان اور ان صفات کے ذریعہ کی جائے جس سے آپ ﷺ کا مقام عبودیت پیچھے رہ جائے اور وہ حد آ جائے جہاں سے معبود کی صفات شروع ہو جاتی ہیں۔)

کسی نے کیا خوب کہا:

لا تدعنی الا بیا عبدھا فانه أفضل اسمائیا

قرآن کریم میں آنحضرت ﷺ کو جابجا اسی وصف منیع سے خطاب کیا گیا۔ چنانچہ مقام اسراء میں فرمایا: ﴿سبحان الذی أسری بعبده﴾ [الاسراء:۱] دوسری جگہ فرمایا: ﴿تبارك الذی نزل الفرقان علی عبده﴾ [الفرقان:۱] ایک تیسری جگہ فرمایا: ﴿الحمد لله الذی أنزل علی عبده الکتب﴾ [الکهف:۱] اس میں لطیف اشارہ اور بشارت شریفہ ہے کہ عنایت ربوبیت غایت عبودیت کے اعتبار سے ہے۔

قوله: فقولوا عبد الله ورسوله: یعنی ان دو اوصاف سے متصف مانو تاکہ دوسرے بندوں سے امتیاز رہے۔ اس جملہ میں اپنی خصوصیت کا ذکر بھی فرمادیا۔ ''عبد'' اور ''رسول'' دونوں کا ذکر کرنا اپنے ''مبدا'' اور ''منتہیٰ'' کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

تخریج: میرکؒ فرماتے ہیں: رواه البخاری، والترمذی فی الشمائل، کذا قاله الشیخ الجوزی، فتأمل فی قول المصنف. متفق علیه.

مجھے اللہ تعالیٰ نے تواضع کا حکم دیا

۴۸۹۸: وَعَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارِ الْمُجَاشِعِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اَوْحٰى اِلَيَّ اَنْ تَوَاضَعُوْا حَتّٰى لَا يَفْخَرَ اَحَدٌ عَلٰى اَحَدٍ وَلَا يَبْغِيْ اَحَدٌ عَلٰى اَحَدٍ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۴/۲۱۹۸ الحدیث رقم (۱۴-۲۸۶۵) و ابن ماجه فی السنن ۲/۱۳۹۷ الحدیث رقم ۴۱۷۹۔

ترجمہ: حضرت عیاض بن حمار مجاشعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ تواضع کرو حتی کہ کوئی کسی پر فخر نہ کرے اور نہ کوئی کسی پر ظلم وستم کرے۔ (مسلم)

تشریح: ان تواضعوا: ''ان'' مفسرہ ہے۔ ''اوحی'' میں موجود ''قول'' کے معنی کی تفسیر کر رہا ہے۔

تواضعوا: از باب تفاعل تواضع مصدر سے امر حاضر کا صیغہ ہے۔ تواضع، ضِعَة سے مشتق ہے۔ جس کا معنی ہے: الذل والهوان والدناءة۔

حتی: ''اوحی'' کے متعلق ہے۔

لایفخر: خاء کے فتحہ کے ساتھ ہے ''الفخر'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے ادعاء العظمة والکبریاء والشرف۔ ای کی لایتعاظم لایبغی: غین کے کسرہ کے ساتھ ہے بمعنی لا یظلم۔

فخر اور ظلم کا ایک ساتھ ذکر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں باتیں تکبر کا نتیجہ ہیں۔ چونکہ متکبر اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ وبالا تصور کرتا ہے، اور کسی کی تابعداری نہیں کرتا۔

تخریج: مسلم نے اس حدیث کو ایک طویل حدیث کے ذیل میں اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ (ذکرہ میرک) اس حدیث کو ابوداؤد اور ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔ بخاری نے ''الأدب المفرد'' میں اور ابن ماجہ نے سنن میں حضرت انس سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: ان الله تعالیٰ أوحی الی أن تواضعوا ولا یبغی بعضکم علی بعض.

الفصل الثانی:

آباؤ واجداد پر فخر سے باز آؤ

۴۸۹۹: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیَنْتَهِیَنَّ اَقْوَامٌ یَفْتَخِرُوْنَ بِاٰبَائِهِمُ الَّذِیْنَ مَاتُوْا اِنَّمَاهُمْ فَحْمٌ مِنْ جَهَنَّمَ اَوْلَیَکُوْنُنَّ اَهْوَنَ عَلَی اللّٰهِ مِنَ الْجُعْلِ الَّذِیْ یُدَهْدِهُ الْخِرَاءَ بِاَنْفِهِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْکُمْ عُبِّیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ وَفَخْرَهَا بِالْاٰبَاءِ اِنَّمَا هُوَ مُؤْمِنٌ تَقِیٌّ اَوْفَاجِرٌ شَقِیٌّ اَلنَّاسُ کُلُّهُمْ بَنُوْاٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ۵/ ۳۹۹الحدیث رقم ۵۱۱۶، والترمذی فی ۵/ ۶۹۰ الحدیث رقم ۳۹۵۵. و احمد فی المسند ۲/ ۳۶۱۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ اپنے فوت شدہ آباؤ اجداد پر فخر کرنے سے باز آجائیں وہ دوزخ کا کوئلہ ہیں ورنہ وہ اللہ کے ہاں اس گندے کیڑے سے بدتر ہوجائیں گے جو اپنی ناک میں گندگی لگاتا ہے اللہ تعالیٰ نے یقیناً تم سے جاہلیت کا تکبر اور آباؤ اجداد پر فخر دور فرمایا ہے انسان مؤمن متقی ہے یا کافر بدبخت تمام لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے ہیں۔ (ترمذی وابوداؤد)

تشریح: قوله: لینتهین أقوام یفتخرون بآئهم الذین ماتوا: یہ وصف بیان واقع کے لئے ہے' اس کا مفہوم مخالف معتبر نہیں ہے اور اس کو ذکر شاید اس وجہ سے کیا کہ توضیح تقبیح میں زیادہ واضح ہے۔ اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس کو امام احمد نے ابوریحانہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: من انتسب الی تسعة آباء کفار یرید بهم عزا وکرما کان عاشر هم فی النار

قوله: انماهم فحم من جهنم: یعنی ان کی یہ کیفیت حال ومآل ہر دو میں یکساں ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں ان کے آباء کو "فحم من جہنم" کے ساتھ حصر کے انداز میں بیان کرنا' یہ بتلانا ہے کہ وہ کسی باعث افتخار فضیلت کی طرف تجاوز نہیں کر سکتے۔

لینتهین: قسم مقدر ہے ای: والله لینتهین الخ.

لیکونن: پہلا نون مضموم ہے، اس کا عطف " لینتهین" پر ہے۔ ضمیر فاعل "واؤ" محذوف ہے جو" أقوام" کی طرف عائد ہے۔ اور "کان" بمعنی "صار" ہے۔ ای لیصیرن۔

الجعل: جیم کے ضمہ اور عین کے فتحہ کے ساتھ۔ (گبریلا کی ایک قسم) کالے رنگ کا ایک چھوٹا سا کیڑا جو پاخانہ کھاتا ہے۔ اس کو "خنفساء" کہتے ہیں۔

الخراء: ملاحظہ فرمائیے لغویین کی آراء:

بفتح الخاء والراء مقصورا علی لفظ العصا.

بانفه: صفت کاشفہ ہے۔ عبیة: بضم العین. المهملة وکسرها وکسر موحدة فتحتیة مشددتین ای

نخوتها وكبرها۔

قال التوربشتي :يقال :رجل فيه

عبية بضم العين المهملة وكسرها اى كبر و تجبر والمحفوظ عن أهل الحديث تشديد الياء۔

وذكر ابو عبيد الهروى أنه من العب بمعنى الحمل الثقيل۔ ثم قال وقال الأ زهرى: بل هوما خوذ من العب وهوالنور والضياء۔ يقال: هذا عب الشمس وأصله عبوء الشمس وعلى هذا فالتشديد فيه كمافي الذرية من الذرء بالهمز ۔

والجودهرى أدخله في باب المضاعف۔ قلت وكذا فعل صاحب القاموس حيث قال: العبية وبالكسر الكبر والفخر والنخوة ۔و قال ايضًا عب الشمس ويخفف ضوء ها وذكره في المهموز ايضاً وقال:العب ء بالفتح ضياء الشمس۔

خلاصۃ الآراء:

① یہ لفظ خاء، راء اور ہمزہ کے ساتھ ہے۔

② خری- خرء وخرائة وخراء ة وخروء :بیٹ کرنا، لید کرنا، هو خارى.

الخرء: خاء کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ بمعنی قذرة بیٹ۔(ج) خروء وخرآن: جیسا کہ" جند "اور" جنود قرء اور قروء، قرء، قاف کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ بمعنی حیض۔

③ خاء کے فتحہ اور مد وقصر کیساتھ، مصدر ہے۔

④ خاء کے کسرہ اور مد کے ساتھ اسم ہے۔ بمعنی العذرة.

خلاصۃ آلاراء:

یہ لفظ عین مہملہ کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ، باء موحدۃ کے کسرہ وتشدید اور یائے تحتانیہ کی تشدید کے ساتھ ہے۔ جیسے: ذرية.

عبا يعبو عبوا: اضاء وجهه، (روشن چہرے والا ہونا)۔ العبُ: عین کے فتحہ کے ساتھ، ضياء الشمس. (سورج کی روشنی)

اور کسرہ کے ساتھ، مثل، نظیر، بوجھ۔(ج) أعباء، عب: باء کی تخفیف کے ساتھ، نیز تشدید کے ساتھ بمعنی "ضوء". (روشنی)

قوله:او ليكونن الخ: کے کئی مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ ان معانی کو مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

Ⅰ دو باتوں میں سے کوئی ایک ضرور ہو کر رہے گی۔ یا تو اس افتخار سے باز آجائیں یا یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک غلاظت کے اس مذکورہ کیڑے سے زیادہ ذلیل ہو جائیں گے۔

Ⅱ الأمرين سواء في أن يكون حال آبائهم الذين يفتخرون بهم وانت مخير في توصيفهم بايهما -

شئت۔ او ھھنا للتخییر والتسویۃ. (قالہ القاضی)

أحد الأمرین لابد منہ اما الانتھاء عماھم فیہ، أو انزال الصغار والھوان علیھم من اللّٰہ تعالٰی۔اھ۔

(قالہ الطیبی)

ایک اور حدیث میں آتا ہے: من انتسب الی تسعۃ آباء کفار یرید بھم عزا و کرما کان عاشرھم فی النار. اس حدیث کو امام احمد نے ابو ریحانہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔

قولہ: انما ھو تقی، أو فاجر شقی: یہ جملہ انتفاء تکبر کی پہلی دلیل ہے۔ زمانہ جاہلیت میں فوت شدہ اپنے باپ دادا کے متعلق شیخیاں بگھارنے والے لوگ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو مؤمن متقی یا فاجر بدکار اگر وہ مؤمن متقی ہے تو اسے چاہیے کہ تکبر کرے نہ گھمنڈ کرے، چونکہ ایمان کا مدار خاتمہ پر ہے، اور حق سبحانہ وتعالیٰ ہی جانتا ہے کہ متقی کون ہے۔ اگر وہ شیخی بھگارنے والا کوئی بدبخت فاجر ہے یعنی منافق یا کافر ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلیل ہے، اور تکبر کرنا ذلیل کے لئے مناسب نہیں، اور نہ ہی اس کے لئے تکبر درست ہے۔

چونکہ تکبر مخلوق کو زیبا نہیں دیتا، تکبر تو ''خالق'' ہی کے شایان شان ہے وہ اس کی صفت خاصہ ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے: الکبریاء ردائی والعظمۃ ازاری فمن نازعنی فیھا قصمتہ۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے دوسری دلیل کی طرف اشارہ فرمایا: الناس کلھم بنو آدم، وآدم من تراب، کہ جس کی ''اصل'' خاک ہو اس کیلئے تکبر شایانِ شان نہیں تمام انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے (اور مٹی چونکہ ایک بہت کمتر اور بے حیثیت چیز ہے لہٰذا مٹی سے بنائے گئے انسان کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی عظمت و بڑائی کا دعویٰ کرے اور غرور و تکبر میں مبتلا ہو''۔ مزید یہ کہ سب کی اصل ایک ہے۔ لہٰذا سب بھائی بھائی ہیں، چنانچہ تو پھر تکبر کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ چونکہ باقی امور تو عارضی ہیں، عارضی امور کا کیا اعتبار۔ آخرت کا اچھا انجام تو متقین ہی کے لئے ہے، اور وہ مبہم ہے۔ لہٰذا ان مسالک میں مشغول ہونے سے سالک کے لئے خوف ہی اولیٰ ہے۔ یہ ساری بات کا خلاصہ ہے اور امام طیبیؒ نے تکلف سے کام لیا اور فرمایا: ''ھو'' ضمیر کے بارے میں کئی احتمال ہیں:

کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ ''الناس کلھم بنو آدم'' مقدم ہے۔ چونکہ وہ مجمل ہے اور یہ اس کی تفصیل ہے جیسا کہ اس کلام میں ہے:

الناس من جھۃ التمثال اکفاء
أبوھم آدم والام حواء
فان یکن لھم فی اصلھم شرف
یفاخرون بہ فالطین والماء
ما الفخر الا لأھل العلم انھم
علی الھدی لمن استھدی ادلاء

جنس کا اعتبار کرتے ہوئے واحد کی ضمیر لائی گئی۔ یا "انسان" کا اعتبار کرتے ہوئے واحد کی ضمیر لائی گئی ہے۔

ضمیر مبہم ہے، خبر اس کی تفسیر کر رہی ہے۔ یہی توجیہ صاحب کشاف نے اس آیت کریمہ: ﴿وقالوا ما هي الا حياتنا الدنيا﴾ [الجاثیہ۔ ۲٤] کے تحت ذکر کی ہے۔ اسی طرح اہل عرب کا یہ قول ہے: هي العرب تقول ما شاء ت.

ضمیر بمعنی اسم اشارہ ہے۔ جس کا مرجع ما قبل میں منطوقاً و مفہوماً مذکور ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ "اقوام"، سوق المعلوم مساق غیرہ کے قبیل سے ہے۔ "اقوام" سے مراد خاص قوم ہے۔ اس کو نکرہ ذکر کیا، اور غائب قرار دیا۔ پھر غائب سے حاضر کی طرف التفات کرتے ہوئے "قد أذهب عنكم" فرمایا۔

لینتهین أقوام ...... یدهده الخراء بأنفه.

حاصل یہ کہ جو لوگ زمانہ جاہلیت میں فوت شدہ اپنے باپ دادا کے متعلق شیخیاں بگھارتے ہیں اور اپنے خاندان کی دنیاوی بڑائی پر فخر و گھمنڈ کا اظہار کرتے ہیں ان گھمنڈ کرنے والوں کو آنحضرت ﷺ نے غلاظت کے کیڑے سے تشبیہ دی ہے اور ان کے فوت شدہ باپ داداؤں کہ جن کو باعث افتخار سمجھا جا رہا ہے غلاظت کے ساتھ تشبیہ دی ہے اپنے باپ دادا پر ان کے فخر کرنے کو ایسا فعل قرار دیا ہے جیسا کہ غلاظت کا کیڑا اپنے ناک سے غلاظت کو ہٹاتا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو بزارؒ نے سند حسن کے ساتھ حضرت حذیفہؓ سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے:

"كلكم بنو آدم و آدم خلق من تراب، لينتهين قوم يفتخرون بآبائهم أو ليكونن أهون على الله من الجعلان".

کہیں شیطان تمہیں اپنا وکیل نہ بنالے

۴۹۰۰: وَعَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الشِّخِّيرِ قَالَ اِنْطَلَقْتُ فِيْ وَفْدِبَنِيْ عَامِرٍ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْنَا اَنْتَ سَيِّدُنَا فَقَالَ السَّيِّدُ اللّٰهُ فَقُلْنَا وَاَفْضَلُنَا فَضْلاً وَاَعْظَمُنَا طَوْلاً فَقَالَ قُوْلُوْا قَوْلَكُمْ اَوْبَعْضَ قَوْلِكُمْ وَلَايَسْتَجْرِيَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ۔ (رواہ ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ١٥٤/٥ الحديث رقم ٤٨٠٦، واحمد فی المسند ٢٥/٤۔

ترجمہ: حضرت مطرف بن عبداللہ بن شخیر کہتے ہیں کہ میں بنو عامر کے وفد کے ساتھ جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا ہم نے عرض کیا کہ آپ ہمارے سید ہیں آپ نے فرمایا سید تو اللہ کی ذات ہے ہم نے عرض کیا آپ ہم سب میں بڑے بزرگ اور سب سے زیادہ عطاء فرمانے والے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا تم اپنی ساری بات یا بعض کہو کہیں تمہیں شیطان اپنا وکیل نہ بنالے۔ (ابوداؤد)

حسب مال اور کرم تقویٰ ہے

۴۹۰۱: وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحَسَبُ الْمَالُ وَالْكَرَمُ

التَّقْوٰی ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/۳۶۳ الحدیث رقم ۳۲۷۱ و ابن ماجه فی ۲/۱۴۱۰ الحدیث رقم ۴۲۱۹، واحمد فی المسند ۵/۱۰۔

ترجمہ: حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حسب مالداری ہے اور کرم پرہیزگاری ہے۔ (ترمذی وابن ماجہ)

تشریح: قولہ: الحسب المال:

الحسب: حاء اور سین دونوں پر فتحہ ہے۔ "المال": سے مراد مال و دولت ہے جو عام طور پر جاہل کو حاصل ہوتا ہے۔

"حسب" آباء واجداد کے قابل فخر فضائل وخصائل کو کہتے ہیں۔

اور کرم: اس کے معنی ہیں: سخاوت یہ "لوم" (بخل) کی ضد ہے۔

وہ چیز کہ جس سے بندہ لوگوں کے نزدیک صاحب قدر ہوتا ہے وہ مال ہے۔ جو شخص مالدار اور صاحب ثروت ہو تو وہی حسب والا اور فضیلت کا مالک سمجھا جاتا ہے اور اس کی عزت کی جاتی ہے اگر کسی کے پاس مال وثروت نہ ہو تو وہ سب کی نظروں میں کم تر و بے وقعت رہتا ہے اور وہ چیز کہ جس سے بندہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عظیم القدر ہوتا ہے وہ تقویٰ پرہیزگاری ہے اور آباؤ اجداد پر فخر کرنا ان دونوں میں سے نہیں ہے کہ بغیر تقویٰ کے کوئی بھی فضیلت اعتبار نہیں رکھتی۔ خدا کی نظر میں کریم یعنی بزرگ و شریف وہی شخص ہے جو پرہیزگار ہو جیسا کہ قرآن کریم میں ہے [ان اکرمکم عند اللہ اتقکم] "بے شک زیادہ عزت والا تم میں سے اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آتا ہے: من حسب الرجل انقاء ثوبیه، کہا گیا ہے:

كانت مودة سلمان له نسبا
ولم يكن بين نوح وابنه رحم

حدیث کا حاصل:

دنیا "فانی" ہے۔ اور آخرت "باقی" ہے۔ "باقی" کو "فانی" پر ترجیح دو۔ چونکہ جو شخص آخرت کو چاہتا ہے، اپنی دنیا کو نقصان پہنچاتا ہے، اور جو شخص اپنی دنیا کو چاہتا ہے، وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، کبھی جمع نہیں ہوسکتیں، ان کی مثال ترازو کے پلڑوں کی ہے، ایک جھکتا ہے، تو دوسرا اٹھتا ہے۔ بعض ارباب حال نے کیا خوب کہا:

زيادة المرء في دنياه نقصان
وربحهٗ غير محض الخير خسران

ترجمۃ الباب سے حدیث کی مناسبت:

لوگوں کی نگاہ میں عظیم المرتبت بنانے والی چیز مال ہے، اور اللہ کی نگاہ میں عظیم القدر بنانے والی چیز تقویٰ ہے، اپنے آباء

واجداد پر افتخار ایک بے حقیقت چیز ہے۔

جاہلی نسب پر فخر کا علاج

۴۹۰۲: وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ تَعَزّٰى بَعَزَاءِ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَعِضُّوْهُ بِهَنِ اَبِيْهِ وَلَا تَكْنُوْا۔ (رواه في شرح السنة)

أخرجه البغوي في شرح السنة١٣/ ١٢٠ الحديث رقم ٣٥٤١، واحمد في المسند ٥/ ١٣٦۔

ترجمہ: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص جاہلی نسب کی طرف اپنی نسبت کرتا ہے تو اس کے منہ میں اس کے باپ کے عیوب ٹھونس دو اور کنایہ اختیار نہ کرو۔

(شرح السنة)

اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: **حسن صحیح لانعرفه الا من هذا الوجه**.(ذکرہ میرک)

تخریج: اس حدیث کو احمدؒ اور حاکمؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

تشریح: **تعزی**: بمعنی التنسب۔

عزاء: عین کے فتحہ کے ساتھ۔

فاعضوه: ضاد معجمہ کی تشدید کے ساتھ باب افعال سے امر کا صیغہ ہے، **اعضفت الشیئ** سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے: **جعلته یعضه**: کسی سے کسی کو کٹوانا۔

العض: دانتوں سے یا زبان سے کسی چیز کو پکڑنا۔ (قاموس)

هن: ہاء کے فتحہ اور نون کی تخفیف کے ساتھ۔ صاحب النہایہ فرماتے ہیں: **الهن: بالتخفیف والتشدید**. "فرج" سے کنایہ ہے۔ ای: **قولوا له: اعضض بذکر ابیك او ایره او فرجه**.

ولا تکنوا: حرف اول کے فتحہ اور نون کے ضمہ کے ساتھ: هَنْ یا هَنٌّ ہر اس قبیح اور بری چیز کو کہتے ہیں جو صاف صاف نام لے کر بیان نہیں کی جاتی اسی لئے اس لفظ کا اطلاق شرمگاہ پر بھی ہوتا ہے یعنی اگر کسی موقع پر شرمگاہ کا نام لینا ہو تو اس مقصد کے لئے "ھن" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ دادا پر فخر کرے جو زمانۂ جاہلیت میں گزرے ہیں تو اس کو صاف صاف باپ کی گالی دو اور اس کے باپ کی شرمگاہ کا ذکر کرتے ہوئے اشارہ کنایہ سے کام نہ لو بلکہ اس کا صریح نام لو اور اس ارشاد کا مطلب گویا باپ دادا اور خاندانی ثروت و وجاہت پر فخر کرنے والوں کے تئیں شاید نفرت کا اظہار اور ان کو سخت تنبیہ کرنا مقصود ہے تا کہ کوئی شخص اپنے باپ دادا کے تئیں فخر و مباہات میں مبتلا نہ ہو۔

بعض حضرات نے **من تعزی بعزاء الجاهلیة** کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص زمانۂ جاہلیت کی رسموں اور عادتوں کو اختیار کرے جیسے نوحہ اور بال نوچنے کپڑے پھاڑنے وغیرہ کے ذریعہ غمی منائے اس کے باپ کی برائیاں اشارہ کنایوں میں نہیں بلکہ صریح الفاظ میں بیان کرو یعنی یوں کہو کہ تمہارا ~~باپ بتوں~~ کو پوجتا تھا۔ فسق و فجور کی زندگی اختیار کئے ہوئے تھا اور زنا کاری و

شراب نوشی جیسی قبیح برائیوں میں مبتلا تھا تاکہ آئندہ کسی شخص کی آبروریزی کرنے کی وہ کبھی جرأت نہ کرے۔

تم کہو لو! میں انصاری غلام ہوں

۴۹۰۳: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ عُقْبَةَ عَنْ اَبِیْ عُقْبَةَ وَكَانَ مَوْلًى مِنْ اَهْلِ فَارِسٍ قَالَ شَهِدْتُّ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُحُدًا فَضَرَبْتُ رَجُلًا مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَقُلْتُ خُذْهَا مِنِّیْ وَاَنَا الْغُلَامُ الْفَارِسِیُّ فَالْتَفَتَ اِلَیَّ فَقَالَ فَهَلَّا قُلْتَ خُذْهَا مِنِّیْ وَاَنَا الْغُلَامُ الْاَنْصَارِیُّ۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد في السنن ۵/ ۳۴۲ الحديث رقم ۵۱۲۳ و ابن ماجه في ۲/ ۹۲۱ الحديث رقم ۲۷۸۴۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن ابو عقبہ رضی اللہ عنہ حضرت ابو عقبہ جو فارسی نژاد مولیٰ تھے سے روایت ہے کہ میں رسول اکرم کے ساتھ غزوہ احد میں حاضر ہوا تو میں نے ایک مشرک کو مارا اور کہا یہ مجھ سے لے لے میں فارسی ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف دیکھا اور فرمایا تم نے یوں کیوں نہیں کہا کہ یہ لے لیں مجھ سے میں انصاری غلام ہوں۔ (ابوداؤد)

تشریح: "أحدا": دونوں حرفوں پر ضمہ ہے۔

"الفارسی": راء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

وأنا الغلام الفارسی: یہ جملہ حالیہ ہے۔

فقلت خذها: کہنے کی وجہ۔

جنگ کے مواقع پر اہل عرب کی عادت تھی کہ حملہ آور اپنی شجاعت کا اظہار کرنے کی خاطر اپنے مضروب دشمن کو اپنا نام و نسب بتایا کرتے تھے۔

یعنی حملہ کرتے وقت تمہیں اگر اپنی نسبت کرنی تھی تو انصار کی طرف کرتے **هلا قلت** کہنے کی وجہ:

کہ جن کی طرف تم نے ہجرت کی تھی اور انہوں نے میری مدد کی تھی اس زمانہ میں اہل فارس کافر تھے' نبی کریم ؐ نے ان کی طرف نسبت کرنے کو ناپسند فرمایا' اور انصار کی طرف نسبت کرنے کا حکم صادر فرمایا تاکہ ان کا انتساب اہل اسلام کی طرف ہو (نہ کہ اہل کفر کی طرف) اس میں اشارہ ہے کہ مہاجرین کے باقی علاوہ صحابہ کرام پر بھی انصار کا اطلاق ہوتا ہے' انصار اہل مدینہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' جیسا کہ وہم ہوتا ہے اس تقریر سے اللہ جل شانہ کے اس فرمان: [من المهاجرين والانصار] [التوبة: ۱۰۰] میں عموم شمول حاصل ہو جاتا ہے۔

ناجائز کام میں قوم کے معاون کا حال

۴۹۰۴: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ نَصَرَ قَوْمَهٗ عَلٰى غَيْرِ الْحَقِّ فَهُوَ كَالْبَعِيْرِ الَّذِیْ رَدٰى فَهُوَ يُنْزَعُ بِذَنْبِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد في السنن ۵/ ۳۴۱ الحديث رقم ۵۱۱۸۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنی قوم کی معاونت کسی ناجائز کام میں کرے وہ اس اونٹ کی طرح ہے جو کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو جائے اور اسے دم سے پکڑ کر کنوئیں سے باہر کھینچا جائے۔

(ابوداؤد)

تشریح: قولہ: فھو کالبعیر الذی ردی:

"ردی": اس لفظ کے ضبط میں اختلاف ہے:

① دال پر فتحہ ہے، اور یاء مخفف ہے۔

② ایک نسخہ میں دال پر کسرہ ہے اور یاء پر فتحہ ہے۔

③ اور ایک صحیح نسخہ میں راء پر ضمہ، دال مشدد و مکسور ہے، اور یاء پر فتحہ ہے۔

اس کے دو معنی آتے ہیں: ① کنویں میں گرنا۔ ② ہلاک ہو جانا۔

فھو ینزع: ضمیر ابل کی طرف راجع ہے۔

ینزع، مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

اس ارشاد گرامی کے دو مطالب بیان کیے گئے ہیں:

① مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئی اونٹ کنویں میں گر کر ہلاک ہو جاتا ہے اسی طرح وہ شخص جو حق پر نہ ہو تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور اس کے مددگاروں کو اس اونٹ کی دم سے تشبیہ دی گئی ہے تو جیسے اس اونٹ کی دم سے پکڑ کھینچنے سے اس اونٹ کو ہلاکت سے نہیں بچایا جا سکتا، اسی طرح قوم کے یار و مددگار ہلاکت کے گڑھے میں پڑی ہوئی قوم کو ہلاکت سے نہیں بچا سکتے۔ اس میں سے نکالے جانے کی کوئی سبیل نہیں پاتا جو کسی ناحق معاملہ میں یا کسی ایسے معاملہ میں کہ اس کا حق ہونا مشتبہ ہو اپنی قوم و جماعت کی حمایت و مدد کے ذریعہ اپنے آپ کو اونچا اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔

② اونٹ کے مشابہ قرار دیا ہے کیونکہ جو طبقہ و گروہ حق کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کرتا ہے وہ گویا ہلاک ہو جانے والا شمار ہوتا ہے اور جو شخص اس قوم و جماعت کی حمایت کرتا ہے اس کو اس اونٹ کی دم کے ساتھ تشبیہ دی ہے چنانچہ جو اونٹ کنویں میں گر جائے اس کو اس کی دم پکڑ کر کھینچنا اس کو ہلاک ہونے سے نہیں بچا سکتا اسی طرح جو قوم و جماعت باطل ہونے کی وجہ سے ہلاکت کی کھائی میں گر پڑی ہے اس کو وہ حمایتی اور مددگار ہلاکت کی کھائی سے نجات نہیں دلا سکتا۔

ظلم میں مددگار بننا تعصب ہے

۴۹۰۵: وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا الْعَصَبِيَّةُ قَالَ اَنْ تُعِيْنَ قَوْمَكَ عَلَى الظُّلْمِ۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۴۱/۵ الحديث رقم ۵۱۱۹ و ابن ماجه فی ۱۳۰۲/۲ الحديث رقم ۳۹۴۹۔

ترجمہ: حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ تعصب کس بات کا نام ہے؟

فرمایا تمہارا اپنی قوم کے ظلم پر مددگار بننا تعصب ہے۔ (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قوم و جماعت کی حمایت و رعایت میں حق کی رعایت رکھنی چاہئے، شخص کی رعایت نہیں رکھنی چاہئے کہ یہ میرا ہم وطن، ہم قوم، ہم زبان ہے بلکہ اس کی رعایت رکھنی چاہیے کہ حق پر کون ہے؟ جیسا کہ حضرت جابر کی ایک مرفوع حدیث میں آتا ہے جس کو دارمی اور ابن عسا کر نے روایت کیا ہے:

"انصر اخاك ظالما او مظلوما ، ان يك ظالما فاردده عن ظلمه، وان يك مظلوما فانصره.

تخریج: اس حدث کو ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔

قومی دفاع ارتکابِ گناہ سے پہلے پہلے

۴۹۰۶: وَعَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِكِ بْنِ جُعْشُمٍ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ خَيْرُكُمُ الْمُدَافِعُ عَنْ عَشِيْرَتِهِ مَالَمْ يَأْثَمْ۔ (رواه ابوداؤد)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٥/٣٤١ الحديث رقم ٥١٢٠۔

ترجمہ: حضرت سراقہ بن مالک بن جعشم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ کے دوران فرمایا تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے خاندان کا اس وقت تک دفاع کرے جب تک وہ گناہ کا مرتکب نہ ہو۔ (ابوداؤد)

راوی حدیث:

سراقہ بن مالک۔ یہ سراقہ بن مالک بن جعشم مدلجی کنانی ہیں۔ مشہور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں "قدید" میں آتے جاتے تھے اور اہل مدینہ میں شمار کیے جاتے تھے ایک بڑی جماعت ان سے روایت کرتی ہے بڑے اونچے درجہ کے شاعروں میں سے تھے۔ ۲۴ھ میں وفات ہوئی۔

تشریح: "سراقہ" میں سین مہملہ مضموم ہے۔ اور "جعشم" میں جیم مضموم، عین مہملہ ساکن اور شین معجمہ مضموم ہے۔

اس شخص کو بہترین اس اعتبار سے قرار دیا کہ وہ دو صفات کو جامع ہے: ① مظلوم کی نصرت ② اقارب کے ساتھ صلہ رحمی۔

اگر یہ سوال پیدا ہو کہ جو شخص ظلم و زیادتی کا دفعیہ کر رہا ہے وہ خود ظلم کا مرتکب کس طرح ہو سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ فرض کیجئے ایک شخص کو اس کے ظلم سے زبانی ہدایت و تنبیہ اور افہام و تفہیم کے ذریعہ روکا جا سکتا ہے لیکن کوئی شخص اس ظلم کے دفعیہ کے لئے اپنی زبان کو ذریعہ بنانے کی بجائے اپنے ہاتھوں کو ذریعہ بنانے لگے کہ ظلم کرنے والے کو مارنے لگے تو ظاہر ہے کہ یہ جائز نہیں ہوگا یا اس ظلم کو روکنے کے لئے تھوڑا بہت مارنا کافی ہو سکتا ہو مگر کوئی شخص اس کو جان ہی سے مار ڈالے تو اس کی اس کارروائی کو سراسر ناجائز کہا جائے گا۔ حاصل یہ ہے کہ کسی ظلم کو روکنے کے لئے ایسا اقدام کرنا جو ضرورت سے زائد اور واجبی حد سے متجاوز ہو تو ظلم کی وہ مدافعت خود ظلم و تعدی بن جائے گی۔ چونکہ یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے قبیل سے ہے، لہٰذا ترتیب کی رعایت واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ

ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ﴾ [النحل: ۱۲۵-۱۲۶] ''(اے پیغمبر) لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے راستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔ جو اس کے راستے سے بھٹک گیا تمہارا پروردگار اسے بھی خوب جانتا ہے اور جو راستے پر چلنے والے ہیں ان سے بھی خوب واقف ہے اور اگر تم ان کو تکلیف دینی چاہو تو اتنی ہی تکلیف دو جتنی تکلیف تم کو ان سے پہنچی اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لئے بہت اچھا ہے۔''

عصبیت کی موت والا ہم سے نہیں

۴۹۰۷: وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا اِلَى عَصَبِيَّةٍ وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ مَاتَ عَلَى عَصَبِيَّةٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۵/۳۴۳ الحدیث رقم ۵۱۲۱۔

ترجمہ: حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی دعوت دے اور وہ بھی ہم میں سے نہیں جو تعصب کی خاطر لڑے اور وہ بھی ہم میں سے نہیں جس کو تعصب پر موت آئے۔

(ابوداؤد)

تشریح: قوله: من دعا الی عصبية: ایک حدیث میں آتا ہے: ما بال دعوی الجاهلية. صاحب النہایۃ لکھتے ہیں اس سے مراد یا آل فلان کی پکار ہے۔ کہ کسی پیش آمدہ حادثہ میں اپنے لوگوں کو بلایا کرتے تھے۔

شئی کی محبت اسے اندھا کر دیتی ہے

۴۹۰۸: وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ۔

(رواہ ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۵/۳۴۶ الحدیث رقم ۵۱۳۰، واحمد فی المسند ۵/۱۹۴۔

ترجمہ: حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کسی چیز سے محبت انسان کو اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: حبك الشيء يعمي ويصم:

حب: مصدر مضاف ہے اپنے فاعل کاف ضمیر مجرور کی طرف مبتدا، الشي: مصدر مضاف کا مفعول بہ ہے۔ یعمی: یہ جملہ محل رفع میں خبر ہے۔ یصم: جملہ معطوفہ ہے۔ یعمی ویصم، یہ دونوں فعل از باب افعال مضارع معروف کا صیغہ ہیں۔ (یعنی علامت مضارع پر ضمہ اور عین کلمہ پر کسرہ ہے۔)

حدیث کا مطلب: محبت کا جنون انسان کو اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے کہ وہ غلبہ محبت کی وجہ سے اپنی محبوب چیز کے عیوب کو نہ

دیکھنے کی صلاحیت باقی رکھتا ہے اور نہ سننے کی اگر محبوب میں کوئی برائی دیکھتا بھی ہے تو اس کو اچھی چیز سمجھتا ہے اور اگر اس سے کوئی بری بات سنتا بھی ہے تو اس کو اچھا جانتا ہے۔

چونکہ محبّ کے دل پر محبت کے بادشاہ کا قبضہ ہو چکا ہوتا ہے جیسا کہ کسی کہنے والے نے کہا:

وعین الرضا عن کل عیب کلیلة
ولکن عین السخط تبدی المساویا

حاصل یہ ہے کہ یہ اس کی بدصورتی تمہیں حسن دکھائی دیتی ہے۔ اور اس کی بدزبانی تمہیں قول جمیل سنائی دیتی ہے، جیسا کہ کسی نے کہا:

وتقبح من سواك الفعل عندی
فتفعله فیحسن منك ذاکا

استاذ ابوعلیؒ فرماتے ہیں: "حبك الشیئی یعمی عن الغیر غیرةً وعن المحبوب هیبة۔ کسی چیز سے تمہارا محبت کرنا تم کو غیر کی غیرت اور محبوب کی ہیبت سے اندھا کر دے گا۔"

امام طیبیؒ فرماتے ہیں:

اس حدیث کو مذمت کے سلسلہ میں اس باب میں نقل کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ارشادِ گرامی اس شخص کے حق میں فرمایا گیا ہے جو کسی کی خاطر عصبیت سے کام لے اور باطل امور میں اسی کی حمایت و مدد کرتا ہے اس کی محبت اسے اندھا کر دیتی ہے کہ وہ اس کی محبت میں حق کو نہ دیکھتا ہے اور نہ سنتا ہے۔ وگرنہ حقیقت کے اعتبار سے حدیث ذومعنی ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد، بخاری نے اپنی تاریخ میں ابوالدرداء سے نقل کیا ہے۔ خرائطی نے "اعتلال القلوب" میں ابوبرزہ سے نقل کیا ہے۔ اور ابن عساکر نے عبداللہ بن انیس سے نقل کیا ہے۔

الفصل الثالث:

قوم کی ظلم پر مدد

۴۹۰۹: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ كَثِيْرٍ الشَّامِيِّ مِنْ اَهْلِ فِلَسْطِيْنَ عَنِ امْرَاَةٍ مِنْهُمْ يُقَالُ لَهَا فَسِيْلَةُ اَنَّهَا قَالَتْ سَمِعْتُ اَبِیْ يَقُوْلُ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنَ الْعَصَبِيَّةِ اَنْ يُّحِبَّ الرَّجُلُ قَوْمَهُ قَالَ لَا وَلٰكِنْ مِنَ الْعَصَبِيَّةِ اَنْ يَنْصُرَ الرَّجُلُ قَوْمَهُ عَلَى الظُّلْمِ۔ (رواه احمد وابن ماجة)

أخرجه ابن ماجه في السنن ۲/ ۱۳۰۲ الحديث رقم ۳۹۴۹، واحمد في المسند ۴/ ۱۰۷۔

ترجمہ: حضرت عبادۃ بن کثیر شامیؒ جو کہ فلسطین کے رہنے والے ہیں وہ اپنے علاقہ کی ایک خاتون جس کا نام فسیلہ تھا روایت کرتے ہیں وہ اپنے والد کے حوالہ سے بیان کرتی ہیں کہ میں نے ان کو یہ کہتے سنا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بطور سائل عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا قوم سے محبت عصبیت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں البتہ عصبیت یہ

ہے کہ آدمی اپنی قوم کی ظلم پر مدد کرے۔ (احمد، ابن ماجہ)

راوی حدیث:

عبادہ بن کثیر شامی کے بارے میں مؤلف وشارح رحمہما اللہ نے کچھ بھی تحریر نہیں فرمایا۔

تشریح: قولہ: عن عبادۃ بن کثیر الشامی:

مصنفؒ نے عبادہ بن کثیر شامی کا تذکرہ اسماء میں نہیں کیا ہے۔

فلسطین: فاء کے کسرہ لام کے فتحہ سین کے سکون کے ساتھ اور آخر میں نون مفتوح ہے اور "المغنی" میں ہے کہ "فلسطون" اور "فلسطین" دونوں حرف اول کے کسرہ کے ساتھ ہیں۔ اور قاموس میں ہے کہ فاء پر ان دونوں میں فتحہ بھی پڑھا جاتا ہے۔

شام کا ایک ضلع ہے۔ اور حالت نصب وجر میں یاء کے ساتھ پڑھیں گے۔ یا ہر حال میں یاء کے ساتھ پڑھیں گے۔

فسیلۃ: فاء کے فتحہ سین مہملہ کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں بصیغۂ تصغیر آیا ہے۔ مؤلفؒ نے الاکمال کی "فصل تابعات" میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اور نہ (فصل صحابہ میں) ان کے والد کا ذکر کیا ہے۔

قولہ: من العصبیۃ أن ینصر الرجل قومہ علی الظلم:

"ان کے ظلم پر مدد کرنا" اس کے تین مطالب ہو سکتے ہیں:

① علی ظلمہم ② مع ظلمہم ③ علی وجہ الظلم

ذلت کی علامت زبان درازی، بیہودہ گوئی ہے

۴۹۱۰: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْسَابُكُمْ هٰذِهٖ لَيْسَتْ بِمَسَبَّةٍ عَلٰى اَحَدٍ كُلُّكُمْ بَنُوْا اٰدَمَ طَفُّ الصَّاعِ بِالصَّاعِ لَمْ تَمْلَؤُهُ لَيْسَ لِاَحَدٍ عَلٰى اَحَدٍ فَضْلٌ اِلَّا بِدِيْنٍ وَتَقْوٰى كَفٰى بِالرَّجُلِ اَنْ يَّكُوْنَ بَذِيًّا فَاحِشًا بَخِيْلًا۔ (رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان)

أخرجہ احمد فی المسند ۱۴۵/۴، والبیہقی فی شعب الایمان ۲۹۲/۴ الحدیث رقم ۵۱۴۶۔

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہارے یہ نسب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو قابل مذمت ہو تم سب آدم کی اولاد ہو جیسا کہ صاع صاع کے برابر ہوتا ہے کہ جس کو تم نے بھرا نہ ہو کسی کو دوسرے پر تقویٰ دین کے علاوہ کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے اور آدمی کی ذلت کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ وہ زبان دراز، بیہودہ گو اور بخیل ہو۔ (احمد، بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کی ہے۔)

تشریح: قولہ: انسابکم هذہ لیست بمسبة: ای المعروفة المشهورة کامر محسوس یشار الیه.

"مسبة" میم اور سین کے فتحہ اور بائے موحدہ مشددہ کے ساتھ، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں:

[illegible]

طف بطاء پر فتحہ اور فاء مشدد ہے۔اس کو مرفوع و منصوب دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

زیادہ واضح یہ ہے کہ منصوب بنزع الخافض ہے۔اور مرفوع ہونا خبر ہونے کی بناء پر ہے۔

بنو آدم:اس کی ترکیب میں تین احتمال ہیں:① بیان ہے۔② بدل ہے۔③ مبتدا دوم ہے۔

لم تملؤه: جملہ حالیہ ہے لاحد:ای علی احد۔(یعنی کسی کو کسی پر)ایک ضعیف نسخہ میں یہی الفاظ ہیں۔

''تقویٰ'':قصر کے ساتھ ہے۔اور ایک نسخہ میں تنوین کے ساتھ ہے۔

بالرجل: جار مجرور مل کر ''کفی'' کا فاعل ہے اور تمیز محذوف ہے۔ ای:مسبة وعارا او نقصانا اور'' ان یکون بذیا'' (اس محذوف) تمیز کا بیان ہے۔جیسا کہ اس حدیث میں ہے: کفی بالمرء اثما ان یحدث بکل ما سمع.

فاحشا:عطف بیان ہے۔

'' طف الصاع بالصاع''میں تشبیہ بلیغ ہے۔

دین سے مراد دین حق ہے۔اور''تقویٰ'' سے یہاں مراد یہ ہے کہ شرک جلی،شرک خفی سے اجتناب کیا جائے اور صغائر و کبائر سے احتراز کیا جائے۔

طف الصاع بالصاع: حال مؤکدہ ہونے کی بناء پر منصوب پڑھنا درست ہے۔جیسا کہ اس مثال میں ہے: زید ابوك عطوفا چونکہ ''بنی آدم'' کا ذکر کرنا نقصان پر دال ہے اس لئے کہ بنو آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔بدل ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھنا اور خبر ثانی ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھنا بھی درست ہے۔

بالصاع: کی باء حالیت کیلئے ہے۔ ای:طف الصاع مقابلا بمعله من النقصان.اور مراد یہ ہے کہ نقصان میں سب برابر ہیں۔

بذیا:فعیل کے وزن پر ہے'اور''بذاء'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے کلام قبیح۔چنانچہ''فاحشا''اس کا عطف بیان ہے۔اور قاموس میں ہے کہ البذی کرضی الرجل الفاحش۔بخیلا: یہ وصف ذکر کرنے میں اشارہ ہے کہ یہ شخص زبان کے بارے ''دراز'' ہے اور احسان کے معاملہ میں''کوتاہ'' ہے۔

''صاع'' سے مراد میانہ یا پیمانہ ہے۔ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح ایک صاع یعنی میانہ اپنے ہی جیسے دوسرے میانہ سے بالکل برابر ہوتا ہے ان دونوں میانوں میں جو چیزیں بھری ہوتی ہیں وہ یکساں اور برابر مقدار وزن کی حامل ہوتی ہیں کہ ان کو ایک دوسرے پر کوئی ترجیح حاصل نہیں ہوتی اسی طرح تمام انسان ایک باپ آدم علیہ السلام کی اولاد ہونے کی حیثیت میں برابری کا درجہ رکھتے ہیں اور کسی انسان کو دوسرے انسان پر محض نسب کے اعتبار سے کوئی فوقیت و برتری حاصل نہیں ہوتی۔

کہ انسان' انسان ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں رکھتا بلکہ انسانی جبلت اور نفسانی تقاضوں کے اختیار سے تمام انسان' نقصان و خسران کے مقام پر ہوتے ہیں البتہ جو انسان ایمان و اسلام کی دولت رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی کمال تقویٰ و دین داری کے حامل ہوتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ آخرت کے نقصان سے محفوظ ہوتے ہیں بلکہ انسانیت کا اعلیٰ مظہر ہونے کی وجہ سے دوسرے لوگوں پر فضیلت و برتری بھی رکھتے ہیں چنانچہ اسی حقیقت کی طرف اس آیت کریمہ میں

اشارہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ [العصر: ۱-۳]

''قسم ہے زمانہ کی انسان بڑے خسارہ میں ہے علاوہ ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے''۔

انسان کو ''طف صاع'' کے ساتھ تشبیہ دے کر گویا اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ تم تمام انسانوں کے باپ چونکہ آدم علیہ السلام ہیں اور آدم علیہ السلام کو خاک سے پیدا کیا گیا ہے اس لئے تم سب اپنے اصل نسب کے اعتبار سے نقصان اور درجہ کمال تک نہ پہنچنے میں ایک دوسرے کے بالکل قریب اور برابر ہو کہ ہر انسان اپنی طبعی جبلت کی وجہ سے نقصان اور ٹوٹے میں مبتلا ہے ہاں وہ انسان اس نقصان سے محفوظ ہے جو ایمان، اسلام کے حامل اور تقویٰ و کمال دینداری کے مرتبہ پر فائز ہے۔

بَابُ الْبِرِّ وَالصِّلَةِ

بر وصلہ کا بیان

صاحب النہایہ لکھتے ہیں: "بِرّ" باء کے زیر کے ساتھ۔اس کے معنی نیکی واحسان کے ہیں۔عام طور پر اس لفظ کا اطلاق اس نیکی و بھلائی پر ہوتا ہے جس کا تعلق ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں سے ہوتا ہے۔اسی لئے لغت کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ بر کے معنی ہیں ماں باپ کی فرمانبرداری واطاعت کرنا۔مذکورہ بالا عنوان میں بھی اس لفظ کے یہی معنی مراد ہیں۔واضح رہے کہ اس لفظ کی ضد "عقوق" ہے جس کے معنی ہیں ماں باپ کی نافرمانی کرنا اور ان کے ساتھ سرکشی وایذاء رسانی کا برتاؤ کرنا۔

کہا جاتا ہے: برّ یبرّ (س)، اسم فاعل بار، جمع بررة، اور برّ کی جمع "ابرار" آتی ہے۔

"صلہ" کے لغوی معنی ملانا اور پیوند لگانے کے ہیں "صلۃ الرحم" کنایہ ہے اپنے نسبی اور سسرالی اعزاء واقارب کے ساتھ احسان اور اچھے سلوک کا معاملہ کرنا ان پر رحم دل ہونا مہربان ہونا' اور ان کے احوال کی رعایت رکھنا ہے۔"صلہ رحم" کی ضد "قطع رحم" ہے۔کہا جاتا ہے: وصل رحمه يصل وصلا وصلة ، ہاء، واؤ محذوفہ کے عوض میں ہے۔تو گویا کہ انسان احسان کے ذریعے اپنے اور اپنے نسبی وسسرالی کو جوڑتا ہے۔

الفصل الاول:

حسن سلوک کی سب سے زیادہ حقدار ماں ہے

۴۹۱۱: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِیْ قَالَ اُمُّكَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمُّكَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمُّكَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اَبُوْكَ وَفِیْ رِوَايَةٍ قَالَ اُمُّكَ ثُمَّ اُمُّكَ ثُمَّ اُمُّكَ ثُمَّ اَبَاكَ ثُمَّ اَدْنَاكَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۱۰/ ۴۰۱ الحديث رقم ۱۹۷۱ و مسلم فی ۴/ ۱۹۷۴ الحديث رقم (۱-۲۵۴۸) وابن ماجه فی السنن ۲/ ۱۲۰۷ الحديث رقم ۳۶۵۸۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے عمدہ برتاؤ کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ فرمایا تمہاری ماں۔اس نے بار دیگر عرض کیا پھر کون؟ فرمایا تمہاری ماں۔اس نے عرض کیا پھر کون

فرمایا تمہاری ماں اس نے عرض کیا پھر کون فرمایا تمہارا باپ۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری ماں۔ پھر تمہاری ماں پھر تمہاری ماں پھر تمہارا باپ۔ پھر تمہارا اقربی پھر قریبی۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: قوله: من أحق بحسن صحابتي:

"صحابتي": صاد کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ' ای باحسان مصاحبتی فی المعاشرة جوہری کہتے ہیں: صحبه يصحبه صحبة: صاد کے ضمہ کے ساتھ، اور صحابة: صاد کے فتحہ کے ساتھ۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: صحبه كسمعه صحابة ويكسر وصحبه عاشره۔ وقال النووي: هو بفتح الصاد ههنا بمعنى الصحبة۔

قوله: قال امك: لفظ امك، اس روایت میں ہر جگہ مرفوع ہے۔ (كذا في الاصول المعتمدة والنسخ المصححة) اور ایک نسخہ میں یہ لفظ منصوب ہے، یہ غلط ہے۔ جیسا کہ اس کی وجہ عنقریب آئے گی۔

منصوب ہونے کی صورت میں تین ترکیبی احتمال ہیں:

1 مجرور بنزع الخافض ہے۔ ای أحسن الها 2 منصوب علی الاغراء ہے۔ ای: الزم امك۔ یعنی اس کے ساتھ اچھے طریقہ سے زندگی بسر کرو اور حسن معاشرت کے ساتھ پیش آؤ۔ 3 منصوب علی المفعولیۃ ہے۔ ای: بر امك. یہ احتمال سب سے واضح ہے۔ قوله: ثم أدناك أدناك: یہاں "أدنى" بمعنی "اقرب" ہے حرف عطف محذوف ہے' اور لفظ "أدناك" کا اعادہ تاکید کے لئے ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: امك الخ' ایک روایت میں مرفوع آیا ہے' اور ایک روایت میں منصوب' یا ہے مرفوع ہونے کی وجہ اس کے معنی تقدیری کا یوں ہونا ہے: أحق من ابر اس کی دلیل بہز بن حکیم کے یہ الفاظ ہیں:

من ابر؟۔ اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ "امك" دو روایتوں میں آیا ہے' ایک میں مرفوع آیا ہے' اور ایک میں منصوب آیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے' بلکہ اول میں رفع متعین ہے "ابوک" کی وجہ سے اور "یہاں" "اباک" کی وجہ نصب متعین ہے۔ روایت میں خلط کرنے سے بچنا چاہئے ورنہ درایت سے محرومی ہوجاتی ہے۔

علماء فرماتے ہیں اولاد پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں ماں کا حصہ باپ سے تین گنا بڑھا ہوا ہے یہ تین گنا حق ان تین اشیاء کے مقابلہ میں ہے جو ماں کے ساتھ مخصوص ہیں 1 حمل کا بوجھ اٹھانا۔ 2 ولادت کی مشقت 3 رضاعت کی محنت و مشقت۔

چنانچہ اس آیت کریمہ میں ان باتوں کی طرف واضح اشارہ ہے: ﴿حملته أمه كرها ووضعته كرها وحمله وفصاله ثلاثون شهرا﴾ [الاحقاف۔۱۵]

تخریج: (مؤخر الذکر روایت کے بارے میں) امام میرکؒ کا کہنا ہے کہ اس روایت میں امام مسلم متفرد ہیں۔ لہذا "متفق علیہ" کہنا محل نظر ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اس روایت کو "متفق علیہ" کہنا باعتبار معنی کے ہے۔

اس کی ناک خاک آلود ہو

۴۹۱۲ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَغِمَ اَنْفُهُ رَغِمَ اَنْفُهُ رَغِمَ اَنْفُهُ قِيْلَ مَنْ

يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مَنْ اَدْرَكَ وَالِدَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ اَحَدَهُمَا اَوْكِلَاهُمَا ثُمَّ لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/١٩٧٨ الحديث رقم (٩-٢٥٥١) و ابوداوٗد في السنن ٢/٣٠٧ الحديث رقم ١٦٦٨، والترمذي في ٥/٥٥٤ الحديث رقم ٣٥٤٥، واحمد في المسند ٢/٣٤٦۔

ترجمہ:حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی ناک خاک آلود ہو اس کی ناک خاک آلود ہو اس کی ناک خاک آلود ہو۔عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس کی؟۔فرمایا جس نے اپنے والدین یا دونوں میں سے ایک کو بڑھاپے میں پایا پھر وہ جنت میں داخل نہ ہو سکیا۔(مسلم)

تشریح: رغم: بروزن سمع۔رغام سے ماخوذ ہے۔جس کا معنی ہے مٹی ملی ہوئی ریت۔رَغِمَ اَنْفُهٗ کا مطلب ہوتا ہے ذلیل ہونا' یہاں دونوں احتمال ہیں کہ یہ جملہ اخبار کے قبیل سے ہو'اور یہ بھی ممکن ہے کہ بددعا ہو۔''انفہ'' کی ضمیر کا مرجع مبہم ہے جس کا بیان آگے آرہا ہے۔ابہام کے بعد بیان لانا' سامع کے لئے اوقع فی النفس ہوتا ہے۔نیز اس کا دوبارہ اعادہ فرمانا تاکید کے لئے ہے۔

لم یدخل: صیغہ معروف کے ساتھ ہے''دخول'' مصدر سے مشتق ہے۔

قیل من: ''من'' کی ترکیب میں متعدد احتمالات ہیں:

- یہ مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے۔ای: من ھو؟
- یہ خبر ہے اور مبتدا محذوف ہے۔ای ھو من؟
- فعل محذوف کا مفعول بہ ہے ای تعنی من ؟
- تعنی أنف من۔

عند الکبر: مظہرؒ فرماتے ہیں یہ ظرف ہے موضع حال میں واقع ہے۔ ظرف جب موضع حال میں ہوتا ہے تو اپنے مابعد کو مرفوع کرتا ہے۔پس''احدھما'' ظرف (کا فاعل ہونے) کی وجہ سے مرفوع ہے۔

کلاھما کا عطف احدھما پر ہے'پس احدھما او کلاھما ازروئے معنی فاعل ہے۔

اشرفؒ فرماتے ہیں ممکن ہے کہ''احدھما'' مبتداء محذوف کی خبر ہو۔ ای: مدرکہ أحدھما او کلاھما اور یہ جملہ ما قبل جملہ''من ادرك والديه'' کا بیان ہے۔

شرح المصابیح میں''من ادرك والديه الكبر احدهما او كلاهما'' کی ترکیب یوں ہے:''الکبر'' فاعل ہے''ادرك'' کا، اور''احدهما'' ادرك کا مفعول ہے۔ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:''احدھما''، بظاہر'' والدیه'' مفعول بہ سے بدل ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں:''عند الکبر''اضافت کے ساتھ ہے۔اور''احدھما'' او ''کلاھما'' دونوں مرفوع ہیں۔مسلم کی تمام روایات میں یوں ہی ہے۔

حمیدی، جامع الاصول، مصابیح کے بعض نسخوں میں''عنده الکبر'' کے الفاظ ہیں اور''الکبر'' رفع کے ساتھ اور

''احدهما'' اور ''كليهما'' نصب کے ساتھ ہے۔ اور ترمذی کی روایت کے الفاظ یوں ہیں: قال ﷺ: رغم انف رجل ادرك عنده ابواه الكبر فلم يدخلاه الجنة۔ اھ۔

والديه: میں تغلیب ہے۔

عند الكبر: کا ذکر اس وجہ سے ہے کہ والدین کو اپنی اولاد کی ضرورت سب سے زیادہ اس وقت ہوتی ہے۔

عرضِ مرتب:

اس حدیث سے متعلقہ تمام احکام وآداب ''احکام الباب'' کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

تخریج: الجامع الصغیر میں ابو ہریرہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "رغم انفه ثم رغم انفه ثم رغم انفه، من ادرك ابويه عنده الكبر احدهما او كلاهما ثم لم يدخل الجنة". (اس حدیث کو احمد و مسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے)۔

ترمذی اور حاکم نے ابو ہریرہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: "رغم انف رجل ذكرت عنده فلم يصل علي، ورغم انف رجل دخل عليه رمضان ثم انسلخ قبل ان يغفرله، ورغم انف رجل ادرك عنده ابواه الكبر فلم يدخلاه الجنة".

مشرکہ ماں سے بھی صلہ رحمی کا حکم

۴۹۱۳: وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِىْ بَكْرٍ قَالَتْ قَدِمَتْ عَلَيَّ اُمِّيْ وَهِيَ مُشْرِكَةٌ فِيْ عَهْدِ قُرَيْشٍ فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اُمِّيْ قَدِمَتْ عَلَيَّ وَهِيَ رَاغِبَةٌ اَفَاَصِلُهَا قَالَ نَعَمْ صِلِيْهَا۔

(متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢٨١/٦ الحديث رقم ٣١٨٣ و مسلم في ٦٩٦/٢ الحديث رقم (٢-٦٩٦)، واحمد في المسند ٣٤٤/٦۔

ترجمہ: حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میری والدہ میرے ہاں آئیں۔ قریش سے صلح کے زمانہ میں مشرکہ تھیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میری والدہ میرے ہاں آئی ہیں وہ اسلام سے دور ہیں کیا میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا صلہ رحمی کرو۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: في عهد قريش: یہ ''قدمت'' کے متعلق ہے۔ اى كان ذلك القدوم في المدة التي كان عهد المصالحة بينه ﷺ وبين قريش على ترك قتالهم فيها۔

قوله: وهي راغبة عن الاسلام: اس جملہ میں نسخوں اور روایت کا اختلاف ہے۔

ہمارے نسخہ میں بائے موحدہ کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ صحیحہ میں ''راغمة'' میم کے ساتھ ہے۔ تورپشتی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ باء ... مروی ہے، مصابیح میں بھی اسی طرح مروی ہے۔ البتہ درست میم کے ساتھ ''راغمة'' ہے، نا کہ باء کے ساتھ ''راغبة''۔

امام نوویؒ اس حدیث کی شرح کے ذیل میں فرماتے ہیں: قدمت علی أمی وھی راغبة أو راھبة اور ایک دوسری روایت میں بغیر شک کے راغبة کے الفاظ ہیں۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: راغبة ، بغیر شک کے "صحیح" ہے۔ اور ابوداؤد کی ایک روایت میں" راغبة فی عھد قریش "وھی راغمة مشرکه کے الفاظ ہیں۔

" وھی راغبة "کے متعدد معانی بیان کیے ہیں:

1. معرضة عن الاسلام (اسلام سے منحرف)۔
2. مائلة فی الاسلام۔
3. راغبة فی صلتی۔
4. راغبة فی الاشراك۔
5. مشرکة۔
6. راغبة عن الاسلام۔ (نفرت کرنا، اعراض کرنا، بے توجہی اختیار کرنا۔)
7. کارھة لااسلام۔
8. طامعة فیما اعطیھا حریصة علیھا۔
9. مطلقاً بغیر تقیید کے ہو تو" راغبة عن الاسلام "ہی کے معنی میں ہوگا۔ اور اگر" وھی مشرکة" یا" فی عھد قریش "کے ساتھ مقید ہو تو" راغبة فی صلتی "کے معنی میں ہوگا۔ تاکہ ابوداؤد کی روایت کے ساتھ موافقت ہو جائے۔ ابو داؤد کی روایت میں" وھی راغمة" کے الفاظ ہیں۔

قوله: وھی راغمة. اس کے بھی متعدد معانی بیان کیے گئے ہیں: 1 کارھة اسلامی وھجرتی 2 ذلیلة محتاجة الی عطائی 3 قبل ای: ھاربة من قومھا 4 کا رھة للاسلام ساخطة لهٗ۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں اس حدیث سے قریبی مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

میرے دوست تو نیک مؤمن ہیں

۴۹۱۴: وَعَنْ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اٰلِ اَبِیْ لَيْسُوْا لِیْ بِاَوْلِيَاءَ اِنَّمَا وَلِيِّیَ اللّٰهُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنْ لَهُمْ رَحِمٌ اَبُلُّهَا بِبَلَالِهَا۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰/۴۱۹ الحدیث رقم ۵۹۹۰ و مسلم فی ۱/۱۹۷ الحدیث رقم (۳۶۶-۲۱۵)، والترمذی فی السنن ۵/۳۱۶ الحدیث رقم ۳۱۸۵، والنسائی فی ۶/۲۴۸ الحدیث رقم ۳۶۴۴، واحمد فی المسند ۲/۵۱۹۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آل ابی فلاں میرے تعلق والے نہیں

میرے دوست تو اللہ تعالیٰ اور نیک مؤمن ہیں مگر ان کے لئے رشتہ قرابت ہے اس کی تری سے میں اس کو تر کروں گا۔

(بخاری، مسلم)

تشریح: قوله:ان آل آبی :اور ایک صحیح نسخہ میں "ابی فلان" کے الفاظ ہیں۔

قوله انما ولیی اللّٰہ :اور ایک نسخہ میں یائے مشددہ مفتوحہ کیساتھ ہے۔یاء کے کسرہ کے ساتھ بھی مروی ہے۔

بلا لها:باء موحدہ کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ درست ہے۔ای بصلتها والا حسان الیها بعض شراح کا کہنا ہے کہ باء کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے۔اور کسرہ کے ساتھ" بلل " کی جمع ہے۔جیسے جَمَل اور جمال' بعض نے کسرہ راجح قرار دیا ہے اور اسی سے نبی کریم ﷺ کا وہ فرمان ہے جس کو بزار نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے طبرانی نے ابوالطفیل سے اور بیہقی نے حضرت انس وسوید بن عمرو سے مرفوعاً روایت کیا ہے: بلو أرحامكم ولو بالسلام۔ای صلوها وندوها۔

ان آل ابی :ای ابی فلان' ایک نسخہ صحیحہ میں اسی طرح ہے۔بعض کا کہنا ہے کہ یہ کنایہ راویوں میں سے کسی نے ذکر کیا ہے 'فتنہ کے خوف سے' اور "مکنی عنہ" ابوسفیان بن حرب ہیں' اور بعض کا کہنا ہے کہ وہ حکم بن عاص ہے۔اور زیادہ واضح یہ ہے کہ یہ اپنے عموم پر ہے جو قریش' یا بنی ہاشم یا آپ کے چچاؤں کو شامل ہے۔حدیث کا ظاہر بھی یہی ہے۔ای آل ابی۔

لیسوا الی باولیاء:تورپشتیؒ فرماتے ہیں اس سے آنحضرت ﷺ کی مراد اس بات کو واضح کرنا تھا کہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ میری مالی امداد و معاونت اور ان کو دینا دلانا اس سبب سے نہیں ہے کہ میں ان کو زیادہ محبوب رکھتا ہوں اور مجھ کو ان سے کچھ زیادہ روحانی و باطنی تعلق ہے بلکہ چونکہ وہ میرے قرابت ہیں اس لئے میں قرابت کا حق ادا کرنے کے لئے ان کی مالی امداد کرتا رہتا ہوں۔

یہ تو میرے دوست ہو ہی نہیں سکتے، چونکہ میرے ربّ کا فرمان ہے:﴿ان اولیائه الا المتقون﴾[الاسراء-۳۴] اگلے جملہ میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

قوله:انماولیی اللّٰہ وصالح المؤمنین: ورنہ جہاں تک باطنی و روحانی تعلق اور محبت کا سوال ہے تو مجھ کو زیادہ تعلق اور زیادہ محبت اس شخص سے ہے جو مؤمن صالح ہے خواہ وہ میرا قرابتی ہو یا غیر قرابتی چنانچہ میرا دوست خدا ہے یا نیک بخت مؤمنین ہیں۔نیک بخت سے (جنس صلحاء یعنی تمام نیک بخت و صالح مسلمان) مراد ہیں بعض کا کہنا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر فاروقؓ مراد ہیں۔بعض کا کہنا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔بعض کا کہنا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام مراد ہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ اس میں عموم ہے۔

آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اس آیت کریمہ سے مقتبس ہے:

﴿فان اللّٰہ ھو مولاہ وجبریل وصالح المؤمنین﴾ [التحریم:۴] اور اسی طرح دوسری آیت کریمہ میں ہے:[ان ولی اللّٰہ الذی انزل الکتاب وھو یتولی الصالحین] [الاعراف:۱۹۶] اس میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ہے طبرانی کی ایک روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

محمد کل تقی:

قولہ: ولکن لهم رحم ابلها:

وہ لوگ چونکہ میرے قرابتدار ہیں اس لئے میں ان کے ساتھ مدد وتعاون کرتا ہوں اور ان کو مال وغیرہ دیتا رہتا ہوں تا کہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔

دراصل تری اور نرمی چونکہ متفرق اجزاء اور اشیاء کو آپس میں جوڑنے اور ملانے کا ایک ذریعہ بنتی ہے اور اس کے برخلاف خشکی اور سختی اشیاء کے باہمی افتراق وانفصال کا سبب بنتی ہے اس لئے اہل عرب اپنے کلام میں لبطور استعارہ لفظ "بل" یعنی تری اور نرمی کو صلہ رحمی ناتا جوڑنے کے معنی میں اور "یبس" یعنی خشکی کو ناتا توڑنے اور ترک تعلق کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

پانچ ناپسندیدہ اعمال

۴۹۱۵: وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوْقَ الْأُمَّهَاتِ وَوَأْدَ الْبَنَاتِ وَمَنْعَ وَهَاتِ وَكَرِهَ لَكُمْ قِيْلَ وَقَالَ وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ وَاِضَاعَةَ الْمَالِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٤٠٥ الحديث رقم ٥٩٧٥ و مسلم في ٣/١٣٤١ الحديث رقم (١٢-٥٩٣)، والدارمي في ٢/٤٠١ الحديث رقم ٢٧٥١، واحمد في المسند ٤/٢٦٤۔

ترجمہ: حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر ① ماؤں کی نافرمانی ② بچیوں کا زندہ درگور کرنا ③ بخل ④ گداگری وغیرہ کو حرام فرمایا اور کثرت سوال اور بربادیٔ مال کو ناپسند فرمایا۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: " منع": نون کے سکون کے ساتھ ہے، نون کو مفتوح پڑھنے کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں: ① مصدر ہے۔ ② فعل ماضی ہے الجامع الصغیر کی روایت میں "ومنعا" تنوین کے ساتھ ہے۔

"هات": تاء کے کسرہ کے ساتھ، اس میں دو احتمال ہیں:

① اسم فعل بمعنی امر، اعط ہے۔ ② بعض کا کہنا ہے کہ مصدر ہے، مضاف الیہ مرادی اعتبار سے محذوف ہے: ای کرہ منع ما عندہ وقول هات۔

اس جملے کے متعدد مطلب بیان کئے گئے ہیں:

① ای کرہ منع ما عندہ وقول هات.

② صاحب النہایہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں: ای: حرّم علیکم منع ما علیکم عطاؤه و طلب ما لیس لکم أخذه.

③ نهى عن منع الواجب من امواله واقواله وافعاله واخلاقه من الحقوق اللازمة فيها. ونهى عن استدعاء ما لا يجب عليهم من الحقوق. وتكليفه اياهم بالقيام بمالا يجب عليهم، فكانه ينصف ولا ينتصف وهذا من اسمج الخلال.

قوله: وكره لكم قيل وقال وكثرة السؤال واضاعة المال:

كره، راء کے کسرہ کے ساتھ (از باب سمع) ہے۔ ایک نسخہ میں راء کے فتحہ کے ساتھ (از باب تفعیل، صیغہ معروف از ماضی) ہے۔

صاحب قاموس فرماتے ہیں: **كرهه كسمعه وكرهه اليه تكريها صيّره كريها** اور لام "اجلیہ" ہے' ای **لأجلكم**۔

قوله: قيل وقال ان دو لفظوں کی تحقیق میں علماء کے بہت سے اقوال ہیں:

① "**قیل**" فعل ماضی مجہول اور "**قال**" فعل ماضی معروف ہے۔

② ابو عبید کا کہنا ہے کہ اس کلام میں تجوز ہے بایں طور کہ قیل وقال دونوں کو مصدر بنا دیا ہے۔ گویا کہ یوں فرمایا گیا ہے: **نهى عن قيل وقول**۔ کہتے ہیں: **قلت قولا وقالا وقيلا**۔ یہ تاویل ان دونوں کے اسم ہونے کی بناء پر ہے۔

③ ایک شارح فرماتے ہیں دونوں مصدر ہیں، برائے تاکید لائے گئے ہیں اور تنوین کو حذف کر دیا چونکہ محذوف مضاف الیہ نیت میں ہے۔ ای **لكم قيل وقال مالا فائدة فيه** یا دونوں ماضی ہیں۔ اس میں اس بات پر تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ لوگوں کی خبروں میں غور و خوض چھوڑ دو' ان کے احوال مت ٹٹولو اور ان کے اقوال وافعال (ایک دوسرے کے سامنے) بیان نہ کرو۔

④ دونوں اسم مصدر ہیں، بمعنی **قول**۔

⑤ "**کشمیهنی**" کے نسخہ میں دونوں لفظ (یعنی قیل وقال) تنوین کے ساتھ ہیں۔

كره لكم قيل وقال: کا مطلب: اس جملے کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں:

◼ فائق: میں لکھتے ہیں کہ ممانعت ان فضول باتوں سے تعلق رکھتی ہے جو اہل مجلس آپس میں کیا کرتے ہیں کہ یوں کہا گیا ہے' اور اس اس طرح کہا ہے۔ ان دونوں افعال کی "بناء" فعل محکی پر ہے' دونوں ضمیر کو متضمن ہیں' اور اعراب کے اعتبار سے یہ جاری مجری اسم ہیں' ضمیر سے خالی ہیں' اور اسی سے یہ قول ہے: **انما الدنيا قيل وقال**۔ اور ان دونوں پر حرف تعریف کا داخل کرنا بھی اسی وجہ سے ہے اس قول میں: **يعرف القال من القيل**۔ ◼ النھایۃ میں لکھتے ہیں: اس نہی کا تعلق اس بات کے نقل کرنے سے ہے جو صحیح نہ ہو اور اس کی حقیقت معلوم نہ ہو۔ البتہ جو ایسی بات نقل کرے جو صحیح ہو' اور اس کی حقیقت معروف ہو' اور اس کا اسناد کسی ثقہ صادق کی طرف کرے' تو ایسی صورت کی ممانعت اور مذمت کی کوئی وجہ نہیں۔ ◼ کہا گیا ہے کہ اس کلام سے مراد کثرت کلام کی ممانعت ہے' خواہ کثرت کلام متکلم کے کلام میں ہو' خواہ مجیب کے کلام میں ہو۔ ◼ بعض کا کہنا ہے کہ اس کلام کا عموم چغلی اور غیبت کی حرمت کو بھی شامل ہے' چونکہ (کسی کا کلام آگے پہنچانا نقل کرنا قبیح خصلت ہے' اور اس کے لئے کان لگانا نشتر ترین کاموں میں سے ہے۔ ◼ امام سیوطیؒ فرماتے ہیں "قیل وقال سے مراد کثرت کلام ہے' چونکہ اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ آدمی اپنے مقصد میں غلطی کر جاتا ہے۔ ◼ **قيل: حكاية اقوال الناس، والبحث عنها ليخبر بها، ويقول: قال فلان كذا وقيل له كذا والنهي اما للزجر عن الاستكثار منه، او لشيء مخصوص، وهو ان يكرهه المحكي عنه.**

قوله كثرة السؤال:

اس کی متعدد صورتیں ہیں:

1 صاحب الفائق نے ایک صورت یہ ذکر فرمائی ہے دوسرے لوگوں کے احوال و معاملات کی بہت زیادہ پوچھا پاچھی اور تجسس معلومات کرنا۔ 2 لوگوں سے ان کے اموال کا سوال کرنا۔ 3 اپنے علم کی برتری کو ظاہر کرنے یا کسی کو امتحان و آزمائش میں مبتلا کرنے یا لا حاصل بحث و مناظرہ کی خاطر بہت زیادہ علمی سوالات کرنا بعض کا کہنا ہے کہ یہ ممانعت اس صورت میں ہے جب یہ سوال بلا ضرورت ہوں' اور یہ بھی ممکن ہے کہ مطلقاً ہو۔ چونکہ یہ چیز لا یعنی تک پہنچا دیتی ہے۔ 4 اس ممانعت کے مخاطب خاص طور پر صحابہؓ تھے آنحضرت ﷺ سے زیادہ سوالات نہ کیا کریں (اور نہ اِدھر اُدھر کے معاملات میں آپ ﷺ سے پوچھ پاچھ کیا کریں کیونکہ سوالات کی زیادتی و کثرت اور غیر ضروری پوچھا پاچھی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ آنحضرت ﷺ کی طبیعت کو ناگواری ہوتی ہے بلکہ پوچھنا احکام و مسائل میں شدت و سختی اور مزید پابندیوں کا سبب بھی بن سکتا ہے) جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: ﴿لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ ......﴾ [المائدة: ۱۰۱]

قولہ "اضاعة المال" یعنی مال کو ضائع کرنے سے مراد یہ ہے کہ مال اور روپے پیسے کو اسراف اور غیر اطاعت اللہ میں خرچ کیا جائے۔ (یعنی فضول خرچی میں بہایا جائے اور اس کو ایسی جگہ خرچ کیا جائے جس کا حق تعالیٰ کی اطاعت و خوشنودی سے کوئی تعلق نہ ہو جیسے کوئی شخص اپنا سارا مال اور روپیہ پیسہ یا اس کا کچھ حصہ کسی دوسرے شخص کو دے دے مگر اس کے وہ عزیز و اقارب اور متعلقین محروم رہیں جو نہ صرف اپنے تعلق کی وجہ سے بلکہ اپنے احتیاج و ضرورت کی بنا پر بھی اس کے مال اور روپیہ پیسہ پر اپنا حق رکھتے ہوں یا کوئی شخص اپنے مال و اسباب اور دولت کو پانی میں ڈال دے یا نذر آتش کر دے اور یا کسی ایسے فاسق کو دے دے جو اس کو گناہ و معصیت کے کاموں میں خرچ کرے۔)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ تقسیم حاصر اس کی تمام اقسام کو حاوی ہے۔

(اضاعت مال کے مذکورہ بالا مسئلہ کو زیادہ تفصیل کے ساتھ یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ) اپنے مال و دولت اور روپیہ پیسہ کو جہاں خرچ کرنا واجب ہے' جیسے نفقہ' زکوٰۃ اور اس سے ملتے جلتے دیگر مصارف' تو یہاں مال خرچ کرنے میں کوئی ضیاع نہیں ہے اور اسی طرح اگر اس میں مال خرچ مندوب ہے۔ (تو وہاں پر خرچ کرنے میں کوئی ضیاع نہیں ہے۔) (اور جہاں مال خرچ کرنا) حرام یا مکروہ ہے وہاں اپنے مال اور روپیہ پیسہ کو صرف کرنا بلاشبہ اسراف اور ضائع کرنا کہلائے گا یہ دونوں صورتیں بالکل واضح ہیں اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں یا وہاں خرچ کرنا مباح ہے۔ اشکال صرف اسی قسم میں ہے۔ چونکہ بہت سے امور ایسے ہوتے ہیں جن کو لوگ مباحات میں شمار کرتے ہیں' اور ان کی تحقیق کی جائے تو معاملہ ایسا نہیں ہے۔

(یعنی اشتباہ اس جگہ ہے جہاں خرچ کرنا بظاہر تو مباح معلوم ہوتا ہو لیکن اگر اچھی طرح غور و فکر کیا جائے تو اس خرچ کے نتیجہ سے برائیاں اور ظاہری باطنی خرابیاں نکلیں) مثلاً بلا ضرورت دور دراز کے علاقوں میں مکانات بنانا' مکانات میں بے ضرورت تعمیر و ترمیم کر کے ان کو وسیع و عریض بنانا ان کی ناروا آرائش اور زیبائش کی خاطر مال خرچ کرنا جہاں نفقہ میں ضرورت سے زائد خرچ کرنا مزہ و لذت حاصل کرنے کے لئے اچھے اچھے کھانے کھانا نرم و ملائم پوشاک میں توسع کرنا۔ اور آپ یہ بات جانتے ہی ہیں کہ یہ چیزیں قساوت قلبی پیدا کرتی ہیں۔ اور اپنی شان و شوکت کو ظاہر کرنے کے لئے اونچے درجہ کی طرز معاشرت اختیار کرنا

اسی طرح برتن باسنوں ہتھیاروں اور استعمال میں آنے والی دوسری چیزوں کو سونے جواہرات اور دیگر قیمتی اشیاء سے مزین کرنا' خرید وفروخت کے معاملات میں اس طرح لاپرواہی برتنا کہ نہ تو مال کے ڈوبنے کا خوف ہو جیسے ادھار لین دین کی مدت کو ضرورت سے زائد بڑھانے اور نہ اپنے روپے پیسے کی حفاظت کا لحاظ ہو جیسے ایسی تجارت یا معاملہ میں اپنا روپیہ لگانا جس میں نقصان کا یقین ہو یا کسی چیز کو خواہ مخواہ بلا ضرورت گراں قیمت پر خریدنا یہ حدیث حسن خلق کی معرفت کے لئے اصل ہے اور حسن خلق' تمام اخلاقِ حمیدہ اور خصائلِ جمیلہ کا منبع ہے۔

یہ حدیث "جوامع الکلم" اور "بدائع الحکم" میں سے ہے۔ علاوہ ازیں بلا تکلف سجع کے جواز پر دال ہے۔

اپنے والدین کو گالی دینا کبیرہ گناہ ہے

۴۹۱۶: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهَلْ يَشْتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ قَالَ نَعَمْ يَسُبُّ اَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ اَبَاهُ وَيَسُبُّ اُمَّهٗ فَيَسُبُّ اُمَّهٗ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰/۴۰۳ الحدیث رقم ۵۹۷۳ و مسلم فی ۱/۹۲ الحدیث رقم (۱۴۶-۹۰) و ابوداؤد فی السنن ۵/۳۵۲ الحدیث رقم ۵۱۴۱، والترمذی فی السنن ۴/۲۷۶ الحدیث رقم ۱۹۰۲، واحمد فی المسند ۲/۱۶۴۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی شخص کا اپنے والدین کو گالی دینا کبیرہ گناہ ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کوئی شخص اپنے ماں باپ کو بھی گالی دیتا ہے فرمایا ہاں! یہ کسی کے باپ کو گالی دے گا تو وہ اس کے باپ کو گالی دے گا اور یہ کسی کی ماں کو گالی دے گا تو وہ اس کی ماں کو گالی دے گا۔ (بخاری)

تشریح: یشتم: عین کلمہ پر کسرہ اور ضمہ دونوں طرح جائز ہے۔ چنانچہ صاحب قاموس فرماتے ہیں: تشتمه یشتمه سبه' اور کبھی "سب" اور "شتم" میں فرق بھی کیا جاتا ہے۔ "سب" اعم ہے۔ لعنت کو بھی شامل ہے' بخلاف "شتم" کے۔ صاحب قاموس "سب" کے بارے میں لکھتے ہیں: سبه قطعه وطعنه فی السبّة ای: الأست وشتمه، والسبة بالضم العار.

کیا "شتم" کبائر میں سے ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ جانیے۔

- اپنے ماں باپ کو گالی دینا اور ان کو برا بھلا کہنا گناہ کبیرہ ہے۔
- جو شخص اپنے ماں باپ کو ایسی گالی دلوانے کا سبب بنا کہ جو گالی موجب حد ہے، تو یہ بھی گناہ کبیرہ ہے۔ مثلاً ایک شخص دوسرے شخص کو کہتا ہے کہ تیرا باپ زانی ہے، یا کافر ہے۔ وغیرہ۔ دوسرا شخص پہلے شخص کو کہتا ہے کہ بلکہ تیرا باپ زانی ہے، یا کافر ہے، وغیرہ۔ تو یہ گناہ کبیرہ ہے۔
- جو شخص اپنے ماں باپ کو صرف برا بھلا کہلوانے کا سبب بنا مثلاً ایک شخص دوسرے شخص کو کہتا ہے، کہ تیرا باپ احمق ہے، یا

جاہل ہے وغیرہ تو یہ گناہ کبیرہ نہ ہوگا۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں چونکہ بعض صورتیں گناہ کبیرہ کی ہیں، لہٰذا شتم کو کبائر میں شمار کرنا درست ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مطلقاً کبائر میں شمار کرنا بھی درست ہے، چونکہ سب، وشتم کا سبب بننا بھی سب وشتم ہے۔ چنانچہ دوسرے شخص کے ماں باپ کو بُرا بھلا کہنا یوں ہی ہے، گویا اپنے ماں باپ کو برا بھلا کہنا۔ اور اپنے ماں باپ کو بُرا بھلا کہنا یہ کبائر میں سے ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ولا تقل لهما اف ولا تنهرهما﴾ [الاسراء۔ ۲۳] ایک اور جگہ فرمایا: ﴿ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله يسوا الله عدوا بغير علم﴾ [الانعام۔ ۱۰۸] کیونکہ اگر وہ اس شخص کے ماں باپ کو گالی نہ دیتا تو وہ شخص بھی اس کے ماں باپ کو گالی نہ دیتا۔ لہٰذا جب وہ اپنے ماں باپ کو گالی دینے کا باعث بنا گویا اس نے خود گالی دی اور ماں باپ کو گالی دینا حرام ہے۔)۔

گر مادر خویش دوست داری ☆ دشنام مده بمادر من

مذکورہ بالا حدیث سے یہ مسئلہ بھی نکلا کہ اگر کوئی شخص کسی فسق ومعصیت کا سبب وذریعہ بنے گا تو اس کا شمار بھی اس فسق و معصیت کے مرتکب کی حیثیت سے ہوگا اور درجہ کا گنہگار بھی ہوگا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ''سب'' کو کبیرہ کہنا صحیح نہیں خصوصاً جب کہ بلا قصد ہو، مثلاً کوئی شخص کسی خارجی یا رافضی کو سب وشتم کرتا ہے، جواب میں وہ خارجی یا رافضی کسی صحابی کو سب وشتم کرتا ہے، تو پہلا شخص ''ساب'' شمار نہیں ہوتا، اسی طرح کسی کافر کو سب وشتم کیا، وہ کافر اللہ کو سب وشتم کرتا ہے، تو پہلا شخص کافر نہیں ہوگا۔ ہاں ''مفضی الی الحرام'' حرام ہوتا ہے، لیکن بشرط قصد وعلم۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام وسائل وذرائع کو قطع کرنا چاہئے، نیز یہ معلوم ہوا کہ شراب بنانے والے کے ہاتھ انگور کا شیرہ، اور ڈاکوؤں وغیرہ کے ہاتھ، اسلحہ فروخت کرنا بھی ممنوع ہے۔ وغیرہ وغیرہ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ مذکورہ احکام اس آیت قرآنی سے مستنبط ہوتے ہیں: ﴿وتعاونوا على البر والتقوىٰ ولا تعاونوا على الاثم والعدوان﴾ [المائدہ۔ ۲]

حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً مروی ہے:

''من الكبائر استطالة الرجل في عرض رجل مسلم ومن الكبائر البهتان بالسة''۔ اس حدیث کو ابن ابی الدنیا نے ''غضب کی مذمت'' میں روایت کیا ہے۔

بہترین نیکی باپ کے دوستوں سے حسن سلوک

۴۹۱۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مِنْ أَبَرِّ الْبِرِّ صِلَةَ الرَّجُلِ أَهْلَ وُدِّ أَبِيْهِ بَعْدَ أَنْ يُوَلِّيَ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱۹۷۹/٤ الحديث رقم (۱۳۔۲۵۵۲) و ابوداؤد في السنن ۳۵۳/٥ الحديث رقم ۵۱٤۳، والترمذي في ٤/ ۲۷٦ الحديث رقم ۱۹۰۳، واحمد في المسند ۸۸/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہترین نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے باپ کے غائب ہونے کے بعد اس کے دوستوں سے حسن سلوک کرے۔ (مسلم)

تشریح: " ود": واؤ کے ضمہ کے ساتھ ہے' بمعنی محبت و مودت۔ صاحب قاموس کے بیان کے مطابق اس پر تینوں حرکات پڑھنا درست ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: **الو دالحب والمحب ويثلث** اھ۔ دوسرے معنی مراد لینا زیادہ بلیغ ہیں۔ **كمالا يخفي۔ بعد أن يولي**: لام مکسورۃ مشدہ کے ساتھ' یعنی ان کے سفر پر چلے جانے کے بعد یا ان کی وفات کے بعد۔ ثانی زیادہ واضح ہے' چونکہ یہ ریاء ونا موری سے بعید تر ہے' چنانچہ اس میں اخلاص زیادہ ہوگا۔

چنانچہ اس کا اجر وثواب بھی بہت زیادہ ہوگا۔ اور اس لئے بھی کہ ایک حدیث میں آتا ہے جس کو ابو یعلی نے اپنی مسند میں اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے:

من أحب ان يصل اباه في قبره فليصل اخوان ابيه من بعده۔ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کلمہ میں لوگوں کو خبط ہوا ہے' اور میں جو بات جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ فعل کی اسناد "ابیہ" کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے: **أن يغيب أبوه أويموت**"۔ "**يولي**" **ولي يولي** سے ماخوذ ہے۔ اس کی تائید ابو اسید ساعدی کی روایت سے ہوتی ہے جو آگے آ رہی ہے:

"**انفاذ عهد هما من بعد هما' وصلة الرحم التي لاتوصل الابهما واكرام صديقهما۔**" (ملاحظہ فرمائیے حدیث: ۴۹۳۶) امام طیبی فرماتے ہیں "جامع الاصول" اور "مشارق الانوار" میں بھی اسی طرح صحیح قرار دیا گیا ہے (یعنی) "ان **يولي**" یاء کے ضمہ' واؤ کے فتحہ اور لام مکسورہ مشددہ کے ساتھ' میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں خبط ضبط کے قبیل سے آیا ہے کہ "**يولي**" **التولي** سے مجہول کا صیغہ ہے یا معروف کا' یا خبط اسنادی حیثیت سے ہے کہ اس کا اسناد "**أهل ودابيه**" کی طرف گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ چنانچہ مطلب یہ ہوگا کہ نیکی کے کاموں میں سے ایک نیکی اپنے باپ کے احباء کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا ہے۔ چونکہ آباء کی مودت ابناء کی قرابت ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب باپ غائب ہو' یا مر جائے تو ان کے ساتھ محبت کا رشتہ رکھنے والے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کا خیال رکھا جائے۔ چونکہ یہ والد کے ساتھ احسان کا تتمہ ہے۔ اور اس کو سب سے اعلیٰ نیکیوں میں سے ایک اعلیٰ نیکی قرار دیا کیونکہ جب اولاد باپ کی عدم موجودگی میں ان کے احباء کا خیال رکھے گی تو باپ کی موجودگی میں تو بطریق اولیٰ رکھے گی۔ اور جب وہ اپنے والد کے احباء کی رعایت رکھ رہا ہے تو اپنے اہل قرابت ذی رحم رشتے داروں کی رعایت بطریق اولیٰ ہوگی۔

صلہ رحمی سے رزق میں کشادگی

۴۹۱۸: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُبْسَطَ لَهٗ فِيْ رِزْقِهٖ وَيُنْسَاَلَهٗ فِيْ اَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٤١٥ الحديث رقم ٥٩٨٦ و مسلم في ٤/١٩٨٢ الحديث رقم (٢١-٢٥٥٧) و ابو داوٗد في السنن ٢/٣٢١ الحديث رقم ١٦٩٣۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے رزق میں کشادگی اور موت میں تاخیر کا طلبگار ہو وہ صلہ رحمی کرے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: **یبسط**: مضارع مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

ینسا: پہلے ضمہ' پھر سکون پھر فتحہ اور پھر ہمزہ پر فتحہ' جو علامت نصب ہے۔ یہ بھی مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔ صاحب "النہایة" فرماتے ہیں: "نسا" کے معنیٰ "تاخیر" کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: نسات الشیء أنسا وانسأته انساء اذا اخرته. اور "نسأ" اسم ہے۔

اس کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ یہ عمر کے تابع ہوتا ہے۔

کہتے ہیں:

يسعى الفتى لأمور ليس يدركها
والنفس واحدة والهم منتشر
والمرء ما عاش ممدود له أمل
لا ينتهي العمر حتى ينتهي الأثر

یہ اصل میں "أثر مشيه في الارض" سے ماخوذ ہے۔ چونکہ جو شخص مرجاتا ہے، اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا اور نہ زمین پر اس کا نقش پا دکھائی نہیں دیتا۔

فائدہ:

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس مقام پر ایک مشہور سوال ہے اور یہ سوال و جواب تفصیلاً اگلی حدیث میں درج ہوں گے۔

تخریج: اس حدیث کو ابو داؤدؒ اور نسائیؒ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔ اور احمدؒ اور بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

قاطع رحم اللہ تعالیٰ سے توڑنے والا ہے

۴۹۱۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَلَمَّا فَرَغَ مِنْهُ قَامَتِ الرَّحِمُ فَاَخَذَتْ بِحَقْوَیِ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ مَهْ قَالَتْ هٰذَا مَقَامُ الْعَائِذِبِكَ مِنَ الْقَطِيْعَةِ قَالَ اَلَا تَرْضَيْنَ اَنْ اَصِلَ مَنْ وَصَلَكِ وَاَقْطَعَ مَنْ قَطَعَكِ قَالَتْ بَلٰى يَارَبِّ قَالَ فَذَاكِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤١٧/١٠ الحديث رقم ٥٩٨٧ ومسلم في ١٩٨٠/٤ الحديث رقم (١٦-٢٥٥٤)، واحمد في المسند ١٩١/١۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا اور تخلیق سے فارغ ہوا تو رحم رحمان کا دامن کرم پکڑ کر کھڑا ہو گیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا چاہتا ہے؟ عرض کیا یہ وہ موقعہ ہے کہ جہاں قطع

رحم سے پناہ طلب کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تو اس پر خوش نہیں کہ جو تجھ سے جوڑے گا میں اس سے جوڑوں گا اور جو تجھ سے قطع کرے میں بھی اس سے توڑ دوں گا۔ عرض کیا یا اللہ! میں اس پر راضی ہوں۔ فرمایا ایسا ہی ہوگا۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: قولہ: قامت الرحم فاخذت بحقوی الرحمن:

حقوی: حاء کے فتحہ اور قاف کے سکون کے ساتھ۔ لغت میں اس کے کئی معنی آئے ہیں۔ کوکھ ازار: وہ جگہ جہاں ازار باندھتے ہیں۔

مہ: یہ میم کے فتحہ اور ہاء کے سکون کے ساتھ اسم فعل ہے، بمعنی اکففنی یعنی یہ التجاء نہ کر' تیری حاجت پوری کر دی گئی ہے'

زیادہ واضح یہ ہے کہ اصل میں "ما" (استفہامیہ) تھا۔ الف کو حذف کر کے ہائے سکتہ کو لایا گیا۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا: ما یقول؟ یعنی اظہار حاجت کا حکم ہے لیکن یہ حکم برائے استعلام نہیں ہے چونکہ اللہ تعالیٰ ہر سری مخفی بات کو جانتا ہے۔

ترضین: ضاد معجمہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ای الا تحبین۔

قولہ: فذاك: "ذاك" مبتدا ہے اس کی خبر محذوف ہے ای لك: افعل ما قلت، من الوصل و القطع.

من القطیعۃ: سب استعاذہ کا بیان ہے۔

قامت الرحم: رحم یعنی رشتہ و ناتہ کوئی ذات و جسم تو ہے نہیں کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوا اور حق تعالیٰ سے پناہ کا طلبگار ہو' بلکہ حقیقت میں وہ ایک معنی ہے لہٰذا اس کے لئے کھڑے ہونے اور پناہ چاہنے کے الفاظ استعمال کرنا بطور تشبیہ و تمثیل ہی ہو سکتا ہے جس سے اس بات کو واضح کرنا مراد ہے کہ رحم گویا ایک ہستی یا ایک ایسے شخص کی طرح ہے جو کھڑا ہوا اور حق تعالیٰ کی عزت و عظمت اور اس کی کبریائی کا دامن پکڑ کر پناہ کا طلبگار رہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی صورت میں کھڑا ہوا ہو۔

امام نووی فرماتے ہیں: کہ رحم جس کو جوڑا جاتا ہے یا کاٹا جاتا ہے کوئی ذات یا جسم نہیں ہے بلکہ معانی میں سے ایک معنی ہے جو (کسی ذات جسم کی طرح) نہ کھڑا ہو سکتا ہے اور نہ کلام کر سکتا ہے لہٰذا اس کے بارے میں مذکورہ ارشاد کی مراد دراصل "رحم" کی اہمیت کو ظاہر کرنا' ناتے کو جوڑنے والے کی فضیلت کو بیان کرنا اور ناتے کو توڑنے والے کی مذمت کرنا ہے کیونکہ ناتے کو جوڑنا فی الجملہ واجب ہے اور اس کو توڑنا گناہ کبیرہ ہے۔ صلہ رحم کے کئی درجات ہیں جن میں سے بعض کو بعض پر فوقیت حاصل ہے اور سب سے ادنیٰ درجہ ترک مہاجرت ہے کیونکہ صلہ رحم کا ایک ذریعہ کلام بھی ہے اگرچہ وہ محض سلام کی حد تک ہو۔

صلہ رحمی کے ان درجات کے درمیان تفاوت و اختلاف ضرورت و قدرت کے مختلف ہونے پر ہے چنانچہ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں رشتہ داری کے تعلق کی رعایت اور صلہ رحمی واجب ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں مستحب ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص نے ناتا جوڑنے کے حق کو جزوی طور پر ادا کیا اور اس کو پورا طور پر ادا نہیں کر سکا تو اس کو ناتا توڑنے والا نہیں کہیں گے۔ لیکن اگر کسی شخص نے رشتہ داری کے حقوق میں سے کسی ایسے حق کو پورا کرنے میں کوتاہی کی جس کو پورا کرنے پر قادر تھا نیز اس حق کو پورا کرنا اس کے لئے مناسب بھی تھا تو اس شخص کو ناتا جوڑنے والا نہیں کہا جائے گا۔

قولہ: فاخذت بحقوی الرحمن: اسماء ~~وصفات میں~~ سے لفظ "الرحمن" کو ذکر کرنے کی وجہ بالکل عیاں ہے کہ معنی د

معنی ہر دو میں مناسبت ہے۔

"حقوہ" کو بصیغہ تثنیہ لانے کی وجہ:

چونکہ ازار کو باندھنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس کے دونوں کناروں کو ملا کر باندھا جاتا ہے اس اعتبار سے یہاں اس لفظ کا تثنیہ استعمال کرتے ہوئے "بحقوی الرحمن" فرمایا گیا یعنی وہ جگہ جہاں ازار کے دونوں کنارے باندھے جاتے ہیں۔ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ "حقو" جیسی چیزوں سے پاک و منزہ ہے اس لئے یہ بات ملحوظ ذہنی چاہئے کہ یہ جملہ اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں ہے اس کے لئے اس کے کئی معانی بیان کئے گئے ہیں: Ⅲ یہاں مضاف محذوف ہے اور اصل میں یوں ہے: بحقوی عرش الرحمٰن ۔ یعنی رحم۔ رحمٰن کے عرش کے دونوں جانب کو پکڑے ہوئے ہے یا اس کے ذیل کے اطراف کو پکڑے ہوئے ایک جانب سے دوسری جانب آتا جاتا ہے جیسا کہ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اگلی حدیث دلالت کر رہی ہے: الرحم معلقة بالعرش۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ مستجیر کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ "مستجار به" کے "حقوین" کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے یعنی اس کی دائیں اور بائیں جانب کو۔ کوکھ سے پکڑنا استعارہ ہے "کسی شیئی سے پناہ آنا" سے عرب کہتے ہیں: عذت بحقو فلان ای استجرت واعتصمت به چنانچہ رشتہ ناتے کو اپنے کاٹے جانے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کے مفہوم کو بطور استعارہ مذکورہ عبارت کے ذریعہ بیان کیا گیا ورنہ لغوی طور پر یہاں نہ تو حقو کے حقیقی معنی مفہوم ہیں اور نہ اس کو پکڑنے کا وہی مفہوم ہے جو کسی انسان کو پکڑنے کا ہوتا ہے)

حاصل یہ ہے کہ "رحم" بزبان حال یا بزبان قال پناہ طلب کرتا ہے التجاء کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عزت و عظمت کے واسطہ سے اس بات سے پناہ مانگتا ہے کہ کوئی اس کو قطع کرے۔

لفظ رحم رحمان سے مشتق ہے

۴۹۲۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّحِمُ شُجْنَةٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ اللّٰهُ مَنْ وَصَلَكِ وَصَلْتُهٗ وَمَنْ قَطَعَكِ قَطَعْتُهٗ۔ (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۰/۴۱۷ الحديث رقم ۵۹۸۸، والترمذي في ۴/۲۸۵ الحديث رقم ۱۹۲۴، واحمد في المسند ۲/۱۶۰۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ لفظ رحم رحمان سے بنا ہوا ہے پس اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جس نے رحم کو جوڑا میں اس کو جوڑوں گا اور جس نے اس کو توڑا میں اس سے توڑوں گا۔ (بخاری)

تشریح: الشجنة: شین معجمہ کے کسرہ و ضمہ، جیم کے سکون اور نون کے ساتھ ہے۔ اور قاموس میں ہے کہ شین معجمہ مثلث الحرکات ہے۔ صاحب النہایہ وغیرہ نے شین کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ شجنہ اصل میں گھنی ٹہنی، الجھی ہوئی شاخ کو کہتے ہیں، اور یہاں مراد یہ ہے کہ لفظ "رحم" رحمٰن سے مشتق ہے، بایں طور کہ لفظ رحم کے سارے حروف لفظ رحمٰن میں موجود ہیں۔ گویا کہ رحم کا رحمٰن سے ایسا تعلق ہے، جیسا کہ شاخوں کا تعلق درخت سے ہوتا ہے۔ لہٰذا رحم اور رحمٰن کو ایک دوسرے

سے جدا نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ کسی درخت کی ٹہنیوں کو اس کی جڑ سے الگ نہیں کیا جا سکتا اس طور پر حدیث کے معنی یہ ہوں گے کہ رحم یعنی ناتا دراصل اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار میں سے ایک اثر ہے اور اس کے ساتھ مربوط ہے لہٰذا صلہ رحم کے حقوق کو اپنے سے منقطع کرنے والا اپنے آپ کو رحمت خداوندی سے منقطع کرنے والا ہے اور ناتے کو جوڑنے والا اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ اپنے کو جوڑنے والا ہے جیسا کہ خود حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

تخریج: وكذا ابو داود ولكن عن عائشه۔

رحم عرش سے معلق ہے

۴۹۲۱: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَقُوْلُ مَنْ وَصَلَنِيْ وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَنِيْ قَطَعَهُ اللّٰهُ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٤١٧ الحديث رقم ٥٩٨٩ و مسلم في ٤/١٩٨١ الحديث رقم (١٧-٢٥٥٥)، واحمد في المسند ٦/٦٢۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ رحم عرش کے ساتھ معلق ہے اور یہ کہہ رہا ہے جو شخص مجھ سے جوڑے گا اللہ تعالیٰ اس سے جوڑے گا اور جو شخص مجھ سے قطع تعلق کرے گا اللہ تعالیٰ اس سے تعلق توڑ دے گا۔

(بخاری، مسلم)

تشریح: قوله: الرحم معلقة بالعرش تقول:

پہلا مطلب۔ وہ عرش رحمٰن کا پایہ پکڑے ہوئے اپنے توڑے جانے سے بارگاہ کبریا کی پناہ کا طلبگار ہے اور اس نے اپنے حق میں اللہ تعالیٰ سے جو کچھ سنا ہے اس کے مطابق خبردار کر رہا ہے کہ اگر مجھ کو جوڑو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت کے ساتھ منسلک کرے گا اور اگر تم مجھ کو توڑو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت سے دور کر دے گا۔

دوسرا مطلب: ناتا یہ جو کچھ کہتا ہے وہ دعا کے طور پر ہے یعنی وہ عرش الٰہی کا پایہ تھامے ہوئے دعا کر رہا ہے کہ الٰہی جو شخص مجھ کو جوڑے اس کو تو اپنی رحمت کے ساتھ جوڑ دے اور جو شخص مجھ کو منقطع کرے اس کو تو اپنی رحمت سے منقطع کر دے۔ پس وصل کنایہ ہے "اقبال" "وقبول" سے۔ اور قطع کنایہ ہے "غضب" و "اعراض" سے۔

تخریج: الجامع میں اس روایت کو امام مسلمؒ کی طرف منسوب کیا ہے۔ واللہ اعلم

قاطع رحم جنتی نہیں

۴۹۲۲: وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٤١٥ الحديث رقم ٥٩٨٤ و مسلم في ٤/١٩٨١ الحديث رقم (١٨-٢٥٥٦) و ابوداؤد في السنن ٢/٣٢٣ الحديث رقم ١٦٩٦، والترمذي في ٤/٢٧٩ الحديث رقم ١٩٠٩،

واحمد فی المسند ٤/ ٨٠۔

ترجمہ: حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: قطع رحم کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قاطع: یہاں لفظ ''قاطع'' کی مراد میں دو احتمال ہیں:

۱ قاطع رحم ۲ قاطع طریق۔

اس روایت کا اس باب میں آنا پہلے معنی کی تائید کرتا ہے۔ اور قطع نظر باب کے دونوں معنی کو شامل ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں: اس کے نظائر ماقبل میں گذرتے ہیں۔ اس جیسی روایات میں تاویل کی جاتی ہے، لہٰذا عدم دخول کا مطلب یہ ہوگا جو شخص بغیر کسی سبب عذر اور بغیر کسی شبہہ کے 'قطع رحمی کو حلال جانے' اور اس کو قطع رحمی کی حرمت کا علم بھی ہو تو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص سابقین کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ ایک تیسرا مطلب یہ ہے کہ عذاب سے نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

تخریج: ورواہ أحمد وأبو داو دوالترمذی۔

صلہ رحمی تو قاطع سے جوڑنا ہے

۴۹۲۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِيْءِ وَلٰكِنِ الْوَاصِلُ الَّذِيْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/ ٤٢٣ الحديث رقم ٥٩٩١، و ابو داوٗد في السنن ٢/ ٣٢٣ الحديث رقم ١٦٩٧، والترمذي في السنن ٤/ ٢٧٩ الحديث رقم ١٩٠٨، واحمد في المسند ٢/ ١٦٠۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رشتہ جوڑنے والا وہ نہیں جو بدلہ چکائے بلکہ جوڑنے والا وہ ہے کہ جب اس سے رشتہ توڑا جائے تو وہ اسے جوڑ دے۔ (بخاری)

تشریح: قولہ: عن ابن عمرو: واؤ کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں بغیر واؤ کے ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس حدیث کے روای عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں نہ کہ ابن عمر۔ (میرکؒ) اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے، کہ امام سیوطیؒ نے الجامع الصغیر میں اس حدیث کو ابن عمرو سے روایت کیا ہے۔

قولہ: لیس الواصل بالمکافی

''واصل'' سے یہاں ''واصل الرحم'' مراد ہے۔

ولکن: نون مشدد اور لام مفتوح ہے' اور بعض نسخوں میں تخفیف کے ساتھ ہے۔ اور التقائے ساکنین کی وجہ سے نون پر کسرہ، اور مابعد کو مرفوع پڑھا گیا ہے۔ اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں روایت میں ''لٰکن'' تشدید کے ساتھ ہے اگرچہ تخفیف بھی جائز ہے۔

''قطعت رحمه'': نائب فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ چنانچہ الجامع کی روایت میں '' اذا انقطعت رحمه'' کے الفاظ آئے ہیں جس سے اس ضبط کی تائید ہوتی ہے۔ البتہ ایک نسخہ میں '' قطعت رحمه''، میں '' قطعت '' صیغہ خطاب کے ساتھ اور ''رحمه'' منصوب علی المفعولیت ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں ''الواصل'' کا الف لام ''جنس'' کا ہے۔ ای ليس حقيقة الواصل، یعنی بدلے کے طور پر نیک سلوک کرنے والا شخص حقیقی معنی میں صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے۔ حقیقی معنی میں صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جس کی بنیاد بدلہ چکانے پر نہ ہو، بلکہ محض حق شناسی اور حق کی ادائیگی کے احساس پر ہو، خواہ اس کا حق کسی نے اداء کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اس کی نظیر آپ کا یہ قول ہے: هوليس بالرجل بل الرجل من يصدر منه المكارم و الفضائل مطلب یہ ہے کہ مرد وہ ہے جس سے مکارم وفضائل کا صدور ہو۔

یہ حدیث مکارم اخلاق کی ترغیبات کے سلسلہ کی ایک بہت واضح ترغیب ہے۔ بخاری شریف میں حضرت علیؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے: صل من قطعك واحسن الى من اساء اليك، وقل الحق ولو على نفسك قرآن کریم کی یہ آیات بھی مکارم اخلاق کا درس دے رہی ہیں: ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ [فصلت۔۳٤] ﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ﴾ [فصلت۔۳٤] ﴿وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ﴾ [فصلت۔۳۵]

''اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی تو (سخت کلامی کا) ایسے طریق سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی گویا وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے اور یہ بات انہیں لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت کرنے والے ہیں اور ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے صاحب نصیب ہیں۔'' (فصلت: ۳۴، ۳۵)

تخریج: اس حدیث کو امام احمدؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ اور ابن حبان رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔

درگزر کرنے والے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد ہے

۴۹۲۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِیْ قَرَابَةً اَصِلُهُمْ وَیَقْطَعُوْنِیْ وَاُحْسِنُ اِلَیْهِمْ وَیُسِیْئُوْنَ اِلَیَّ وَاَحْلُمُ عَنْهُمْ وَیَجْهَلُوْنَ عَلَیَّ فَقَالَ لَئِنْ كُنْتَ كَمَا قُلْتَ فَكَاَنَّمَا تُسِفُّهُمُ الْمَلَّ وَلَا یَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللّٰهِ ظَهِیْرٌ عَلَیْهِمْ مَادُمْتَ عَلٰی ذٰلِكَ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ٤/١٩٨٢ الحديث رقم (٢٢-٢٥٥٨) واحمد فی المسند ٢/٣٠٠۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے کچھ قرابت دار ایسے ہیں کہ میں ان کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ برا برتاؤ کرتے ہیں میں ان سے درگزر کا معاملہ کرتا ہوں اور وہ جہالت کا ارتکاب کرتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر بات اسی طرح ہے جیسا کہ تم نے کہی تو گویا تو ان کو خاک پھنکاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد ہمیشہ تیرے شامل حال ہے۔ جب کہ تو اسی خصلت پر قائم رہے

گا۔(مسلم)

تشریح: قوله: ان لی قرابة اصلهم و یقطعو نی:

''قرابة''(اس کا مضاف محذوف ہے۔)ای ذوی قرابة۔

قوله: لئن کنت کماقلت: معنوی اعتبار سے تقدیر عبارت یوں ہے: ان کان مقولك کما قلت أوان کنت مثل ماقلت۔

یقطعونی: نون مشدد و مخفف دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ بظاہر طیبیؒ کے نسخہ میں لفظ ''علی''موجود نہیں ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ویجهلون متعلقة بمحذوف ای علی یعنی یغضبون ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ بعض شعراء کا کہنا ہے: وان الذی بینی وبین بنی أبی وبین بنی عمی لمختلف جدا اذا أکلوا لحمی وفرت لحومهم : وان هدموا مجدی بنیت لهم مجدا وان ضیعوا غیبی حفظت غیو بهم وان هم هووا عنی هویت لهم رشدا

فکانما: فاء کے ساتھ ہے،امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مصابیح، مسلم، حمیدی اور جامع الاصول کی روایت میں فاء کے ساتھ ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ لام کے ساتھ ہو' چونکہ ''لئن کنت'' میں لام موطئہ للقسم ہے'اور یہ اس کا جواب' قائم مقام جواب شرط کے ہے الا یہ کہ برعکس کیا جائے اور شرط کی جزاء کو جواب قسم کے قائم مقام کر دیا جائے۔اور شرح السنہ میں '' لکأنما'' ہی وارد ہوا ہے۔

تسفهم: تاء مضموم'سین مکسور اور پھر فاء مشدد ہے۔از باب افعال،(مخاطب کا صیغہ ہے۔) سفوف۔سین کے فتحہ کے ساتھ۔سے ماخوذ ہے۔کہا جاتا ہے: اسف فلانا السفوف،کسی کو سفوف (پھکی) کھلانا، سف الدواء سفا،از باب سمع سفوف پھانکنا۔

ملّ: میم کے فتحہ اور لام کی تشدید کے ساتھ وہ گرم راکھ جس میں روٹی دبائی جاتی ہے۔(انگارے، بھوبھل، گرم راکھ، گرم مٹی)

قوله: ولا یزال معك من الله ظهیر علیهم ما دمت علی ذلك: اس جملہ کی ترکیب میں دو احتمال ہیں:

- اس کا عطف ہو رہا ہے،اور معطوف علیہ'' لئن قلت ''الخ ہے۔
- '' فکانما'' پر عطف ہے،اس صورت میں یہ موضع تاکید میں ہوگا۔

فکانما تسفهم الملّ: کا مطلب: اس کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں:

- تمہارے قرابت دار چونکہ تمہارے نیک سلوک کے قدر دان نہیں ہیں اور تمہاری نیکی کا شکریہ ادا نہیں کرتے اس لئے تم ان کو جو کچھ دیتے ہو وہ ان کے حق میں حرام مال کا حکم رکھتا ہے اور تمہاری دی ہوئی چیزیں ان کے پیٹ میں آگ کی طرح ہیں!
- بعض حضرات نے یہ مراد بیان کی ہے کہ تم ان کے برتاؤ کے برعکس ان کے ساتھ احسان اور نیک سلوک کرو' یہ ایسا ہے کہ کوئی شخص گرم راکھ منہ میں ڈالے (اور اس کو پیٹ میں اتارے تو اس کا نفس اس کو لعنت ملامت کرتا ہے۔)
- بعض شارحین نے یہ بیان کیا ہے کہ انکے ساتھ تمہارا احسان گویا ان کے حق میں گرم راکھ ہے جو انکی انتڑیوں کو جلاتا ہے۔

☒ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ تمہارا احسان ان کا منہ اس طرح کالا کرتا ہے جیسا کہ گرم راکھ کسی کے چہرے کو جلا کر سیاہ کرتی ہے۔

☒ وہ تمہارے احسان کا معاملہ اساءت کے ساتھ دیتے ہیں تو تمہارا ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا ان پر وبال بن کر لوٹے گا حتی کہ گویا تم ان کو انکی اس اساءت کے بدلہ جو وہ تمہارے احسان کے باوجود تم سے برت رہے ہیں آگ کھلا رہے ہو۔

الفصل الثانی:

حسن سلوک سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے

۴۹۲۵: عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَرُدُّ الْقَدَرَ اِلَّا الدُّعَآءُ وَلَايَزِيْدُ فِي الْعُمُرِ اِلَّا الْبِرُّ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ يُصِيْبُهُ۔ (رواه بن ماجه)

أخرجه ابن ماجه فی السنن ۲/ ۱۳۳٤ الحديث رقم ٤٠٢٢، واحمد فی المسند ٥/ ٢٧٧۔

ترجمہ: حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تقدیر کو دعا ہی رد کر سکتی ہے اور اچھا سلوک عمر میں اضافہ کرتا ہے اور انسان لاحق ہونے والے گناہ کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔ (ابن ماجہ)

تشریح: القدر: دال کے فتحہ کے ساتھ ہے اور کبھی سکون کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

''العمر'' عین اور میم دونوں مضموم ہیں۔ اور یہی واضح ہے۔ عین کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔

''عمر'' سے مراد حیات فانیہ کے ایام ہیں جو حیات باقیہ کی آبادکاری کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ جیسا کہ مروی ہے: ان الدنیا مزرعة الآخرة۔

لیحرم: مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

الرزق: منصوب ہے مفعول ثانی ہے۔

بالذنب: باءِ ''سببیہ'' ہے۔

یصیبه: جملہ حالیہ ہے۔

عرضِ مرتب:

تقدیر کے مسئلہ کی تفصیل کیلئے ''باب الایمان بالقدر'' ملاحظہ فرمائیے۔

قوله: لا یرد القدر الا الدعاء، ولا یزید فی العمر الا البر:

''قدر'' سے مراد تقدیر ہے، اور ''تقدیر معلق'' مراد ہے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے دعا کو جس تقدیر کے بدل دینے کا سبب گردانا ہے وہ تقدیر معلق ہے اور یہ بات بذاتِ خود تقدیر الٰہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ مقدر کیا ہے کہ اگر بندہ دعا کرے گا تو اس کی یہ مصیبت دور ہو جائے گی۔ اگر حسن سلوک نہیں کرے گا، تو عمر کم

کی کم رہے گی۔

حدیث کے آخری جزء سے ایک اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ دنیا میں ایسے لوگوں کی کثرت ہے جو اپنے فسق و فجور' خدائی احکام سے سرکشی وتمرد اور یہاں تک کہ اپنے کفر وشرک کے باوجود خدا کے نیک بندوں اور کامل مؤمنین کے مقابلہ پر زیادہ اچھا کھاتے ہیں اور زیادہ رزق کے مالک ہیں تو پھر اس بات کے معنی کیا ہوں گے کہ انسان اپنے گناہوں کی وجہ سے رزق سے محروم کیا جاتا ہے چنانچہ اس کو دور کرنے کے لئے بعض حضرات نے یہ تاویل بیان کی ہے کہ حدیث میں رزق سے مراد آخرت کا رزق ہے یعنی ثواب اور اس میں کوئی شک نہیں کہ گناہ ومعصیت کا ارتکاب اس رزق (آخرت کے اجر وثواب) میں نقصان کا سبب اور اس سے محرومی کا مطلب ان چیزوں سے محروم ہونا ہے جن کے بغیر مال و دولت کی فراوانی اور رزق کی وسعت کے باوجود انسان کو اندرونی طمانیت وخوشی اور قلبی وروحانی عظمت وبڑائی عطا نہیں ہوتی جیسے رضاء الٰہی کا حصول' زندگی کا بے فکری اور سکون کے ساتھ گزرنا' قلب کا فراغ واطمینان' وقت کا یاد الٰہی اور اچھے کاموں میں صرف ہونا رزق کا طیب وپاکیزہ ہونا اور روح و باطن کا ہر قسم کی کدورت وظلمت سے پاک وصاف ہونا' یہ وہ اوصاف ہیں جو انسانی زندگی کو حیوۃ طیبہ کا درجہ عطا کرنے کی وجہ سے عطا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے

بعض حضرات نے یہ تاویل کی ہے کہ بندہ کی دعا میں مشغولیت تقدیر کے فیصلہ کو (قبول کرنا) آسان بنا دیتی ہے، اور معاملہ یوں ہو جاتا ہے، گویا کہ تقدیر کا لکھا ہوا بدل گیا ہے۔ اور ''عمر میں زیادت'' سے مراد عمر میں خیر وبرکت کا ہونا ہے۔

شرح السنہ میں ابوحاتم سجستانی حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: بندہ کا دعا میں برابر مشغول رہنا، تقدیر کے فیصلہ کو کھلے دل سے قبول کرنے کو آسان بنا دیتا ہے، گویا کہ دعا نے تقدیر کو بدل ڈالا، حسن سلوک کرنا آدمی کی زندگی کو خوش وخرم بنا دیتا ہے، گویا کہ عمر میں اضافہ ہو گیا۔ گناہ آدمی کے صاف ستھرے رزق کو مکدر کر دیتا ہے، گویا کہ رزق سے محروم ہو گیا۔

''رزق'' سے کیا مراد ہے؟

مظہرؒ فرماتے ہیں، اس کے دو معنی ہیں:

◘ آخرت کا رزق مراد ہے یعنی ثواب۔ اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ گناہ ومعصیت کا ارتکاب اس رزق (آخرت کے اجر وثواب) میں نقصان اور محرومی کا سبب ہے۔ ◘ دنیا کا رزق مثلاً مال وصحت اور عافیت وغیرہ مراد ہیں۔ گناہ کے سبب سے آدمی ان نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس پر ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کفار وفساق مال وصحت میں صلحاء سے بڑھ کر ہیں۔ (یعنی دنیا میں ایسے لوگوں کی کثرت ہے جو اپنے فسق وفجور' خدائی احکام سے سرکشی وتمرد اور یہاں تک کہ اپنے کفر وشرک کے باوجود خدا کے نیک بندوں اور کامل مؤمنین کے مقابلہ پر زیادہ اچھا کھاتے ہیں اور زیادہ رزق کے مالک ہیں تو پھر اس بات کے معنی کیا ہوں گے کہ انسان اپنے گناہوں کی وجہ سے رزق سے محروم کیا جاتا ہے۔) اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مسلمان کے ساتھ مخصوص ہے۔

ملا علی قاریؒ اس جواب پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ بھی تقدیر معلّق ہی کے تحت ہوتا ہے۔ چونکہ آجال وآمال اور اخلاق وارزاق سب اللہ کی تقدیر وتیسیر سے ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو ابن حبانؒ اور حاکمؒ دونوں نے اپنی صحیح میں اور بغوی نے شرح السنہ میں اسی طرح روایت کیا ہے۔ (ذکرہ میرکؒ)

الجامع الصغیر میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے: لا یرد القضاء الا الدعاء، ولا یزید فی العمر الا البر.

اور فرماتے ہیں: اس حدیث کو ترمذی اور حاکم نے سلمان سے روایت کیا ہے۔ اور ''الحصن'' میں یوں مروی ہے: لا یرد القضاء الا الدعاء ولا یزید فی العمر الا لبر۔ اس کو امام ترمذی ابن ماجہ، ابن حبان نے، نیز حاکم نے اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے۔

میرکؒ فرماتے ہیں: ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ کی روایت حضرت سلمان سے ہے، اور ابن حبان اور حاکم کی روایت حضرت ثوبان سے مروی ہے۔ لیکن ان دونوں کی روایت میں '' لا یرد القدر'' کے الفاظ نہیں ہیں جس طرح کہ صاحب السلاح نے ان دونوں سے روایت کی ہے۔

منذریؒ کی ''الترغیب'' میں حضرت ثوبان سے اسی طرح مروی ہے جس طرح کہ مشکوۃ کی ''اصل'' میں ہے۔ اور فرمایا: اس کو ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے، اور الفاظ انہیں کے ہیں اور کہا ہے یہ صحیح الاسناد ہے۔ واللہ اعلم

ماں سے حسن سلوک کرنے کا صلہ

۴۹۲۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ فَسَمِعْتُ فِيْهَا قِرَاءَةً فَقُلْتُ مَنْ هٰذَا قَالُوْا حَارِثَةُ ابْنُ النُّعْمَانِ كَذَا لِكُمُ الْبِرُّ كَذَا لِكُمُ الْبِرُّ وَكَانَ اَبَرَّ النَّاسِ بِاُمِّهٖ (رواه فی شرح السنة والبیهقی فی شعب الایمان وفی روایة قال) نِمْتُ فَرَاَيْتُنِيْ فِي الْجَنَّةِ بَدَلَ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ۔

أخرجه البغوی فی شرح السنة ۱۳/۷ الحدیث رقم ۳۴۱۸، واحمد فی المسند ۶/۱۵۱ الحدیث رقم ۶/۱۵۱۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں جنت میں داخل ہوا تو میں نے اس میں تلاوت سنی میں نے پوچھا یہ کون ہے۔ تو جواب ملا کہ یہ حارثہ بن نعمان ہے والدین کے ساتھ بھلائی کی یہی فضیلت ہے آپ نے دو دفعہ یہی فرمایا اور وہ اپنی والدہ کے ساتھ سب سے زیادہ نیکی کرنے والے تھے۔ صاحب شرح السنہ نے اس کو روایت کیا ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے کہ میں سویا تو میں نے اپنے آپ کو جنت میں دیکھا یہ دخلت الجنۃ کی جگہ الفاظ ہیں۔

تشریح: قراء ۃ: (یہاں عبارت مقدر ہے۔ یا مضاف محذوف ہے۔) ای: صوت قراء ۃ یقرأها أحد. یا مضاف الیہ محذوف ہے۔ ای: قراء ۃ قاری، اس صورت میں قراء ۃ کی تنوین مضاف الیہ کے عوض ہوگی۔

قوله: کذلکم البر کذلکم البر (''البر'' سے پہلے جزاء محذوف ہے۔) ای: جزاء البر یا ''البر'' میں مبالغہ مقصود ہے، باین طور کہ ''بر'' کی جزاء عین ''بر'' کو قرار دیا ہے۔

دوسرا "کذلکم البر" تقریر وتاکید کیلئے ہے۔

کذلکم: کا مشارالیہ ماقبل کلام ہے۔

"کذلکم البر" یہ کلام کس کا ہے؟

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ خواب دیکھا، تو اپنے صحابہ کو سنایا۔ اور خواب سناتے ہوئے جب حارثہ بن نعمان کے ذکر تک پہنچے تو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا، کہ اس قسم کے اعلیٰ درجات والدین کے ساتھ حسن سلوک کے ذریعے سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کوئی بعید نہیں کہ یہ کلام (کذلکم البر) بھی ملائکہ کا ہو، اور اس کلام کے مخاطب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ اور اسم اشارہ لانا یا تو تعظیم کی وجہ سے ہے اس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کرام ہیں تغلیباً۔

قوله: وكان أبر الناس بأمه:

اس کلام کے بارے میں بھی دو احتمال ہیں۔ پہلا احتمال یہ ہے یہ کلام کسی راوی کا ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ کلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ ہے۔

اسنادی حیثیت:

امام جزریؒ پہلی روایت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام حاکمؒ نے اپنی "صحیح" میں روایت کیا ہے، اور صحیح علی شرط الشیخین قرار دیا ہے۔ امام ذہبیؒ نے ان کی تصحیح کو برقرار رکھا ہے۔ اور اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے۔ اور محی السنۃ نے شرح الس[illegible]ں دونوں طریق سے نقل کیا ہے۔

والد کی رضا میں اللہ کی رضا

۴۹۲۷: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رِضَى الرَّبِّ فِيْ رِضَى الْوَالِدِ وَسَخَطُ الرَّبِّ فِيْ سَخَطِ الْوَالِدِ۔ (رواه الترمذي)

أخرجه الترمذي في السنن ٤/ ٢٧٤ الحديث رقم ١٨٩٩۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: والد کی رضا میں اللہ کی رضا ہے اور والد کی ناراضگی میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے۔ (ترمذی)

تشریح: اس حدیث میں اگرچہ والد کی رضامندی وناراضگی کا ذکر ہے، مگر واضح رہے کہ ماں کی رضامندی وناراضگی کا بھی یہی حکم ہے، بلکہ بطریق اولیٰ یہ حکم ہے۔

عرضِ مرتب:

بظاہر اس کی دلیل نقلی طبرانی اور بزار کی حدیث ہے، جو تخریج کے تحت آ رہی ہے۔

تخریج: امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو **يعلي بن عطاء، عن أبيه، عن عبد الله بن عمرو بن العاص** کے طریق سے مرفوعاً اور موقوفاً نقل کیا ہے، اور موقوف کو اصح قرار دیا ہے۔ ابن حبان نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے: **رضا الله في رضا الوالد' وسخط الله في سخط الوالد.** (كذا في التصحيح)

جامع صغیر میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو ترمذیؒ اور حاکمؒ نے ابن عمروؓ سے روایت کیا ہے۔ اور بزارؒ نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ طبرانیؒ نے ابن عمرو سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: **رضا الرب في رضا الوالدين وسخطه في سخطهما.**

امام منذریؒ اصل حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کو امام حاکمؒ نے روایت کیا ہے، اور "صحیح الاسناد علی شرط مسلم" قرار دیا ہے۔ اس حدیث کو طبرانیؒ نے ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: **طاعة الله طاعة الوالد' ومعصية الله معصية الوالد.** اور بزار نے اس حدیث کو ابن عمر یا ابن عمرو سے روایت کیا ہے۔ اس وقت مجھے یہ مستحضر نہیں کہ دونوں میں سے کس سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ البتہ الفاظ یہ ہیں:

" قال: رضا الرب تبارك وتعالىٰ في رضا الوالدين' وسخط الرب تبارك وتعالىٰ في سخط الوالدين."

والد جنت کا وسطیٰ دروازہ

۴۹۲۸: وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ اَنَّ رَجُلًا اَتَاهُ فَقَالَ اِنَّ لِيْ امْرَاَةً وَّاُمِّيْ تَاْمُرُنِيْ بِطَلَاقِهَا فَقَالَ لَهٗ اَبُوالدَّرْدَاءِ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْوَالِدُ اَوْسَطُ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَاِنْ شِئْتَ فَحَافِظْ عَلَى الْبَابِ اَوْضَيِّعْ۔ (رواه الترمذي وابن ماجة)

أخرجه الترمذي في السنن ٤/٢٧٥ الحديث رقم ١٩٠٠ و ابن ماجه في ٢/١٢٠٨ الحديث رقم ٣٦٦٣، واحمد في المسند ٥/١٩٦۔

ترجمہ: حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی ان کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا میں ایک بیوی والا ہوں اور میری ماں کہتی ہے کہ اسے طلاق دے دو۔ تو حضرت ابو درداءؓ کہنے لگے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ والد جنت کا وسطی دروازہ ہے تمہاری مرضی ہے اسے محفوظ کرو اور چاہو تو اسے گرا دو۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: **اوسط ابواب الجنة:** لفظ " **اوسط** " کی تشریح " **خير** "، " **أعلى** " اور " **احسن الابواب** " کے ساتھ کی گئی ہے۔

قوله: فان شئت فحافظ على الباب او ضيّع: یہ کلام حضرت ابو الدرداءؓ کا ہے۔ قاضیؒ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ دخول جنت کا بہترین وسیلہ اور جنت کے درجات عالیہ تک پہنچنے کا سب سے بہترین ذریعہ والد کی اطاعت اور حقوق کی رعایت ہے۔

بعض دوسرے حضرات نے مطلب یوں بیان کیا ہے کہ جنت کے بہت سے دروازے ہیں، جنت میں داخل ہونے کیلئے

سب سے بہترین دروازہ "اُوسط دروازہ" ہے۔ اور اس "باب اوسط" سے گزرنے کا ذریعہ والد کے حقوق کی رعایت ہے۔

الوالد: سائل کا سوال والدہ کے بارے میں تھا۔ اور آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی میں والدہ کا ذکر نہیں ہے، بلکہ والد کا ذکر ہے۔ چنانچہ اس موقع پر حضرت ابوالدرداء کا یہ حدیث سنانا، حضرت ابوالدرداء کا اجتہاد تھا کہ جب باپ کے حق میں اس طرح فرمایا گیا ہے تو ماں بدرجہ اولیٰ اس ارشاد کا محمول قرار پائے گی یا لفظ "والد" سے صرف باپ مراد نہیں لیا گیا بلکہ جنس والد یعنی پیدا کرنے والا مراد ہے اور یہ بات زیادہ موزوں و مناسب ہے کیونکہ پیدا کرنے والے کے مفہوم میں باپ اور ماں دونوں داخل ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں، ابوداؤد طیالسی نے، اور حاکم نے اپنی مستدرک میں ذکر کیا ہے۔ امام حاکمؒ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام ذہبیؒ نے ان کی تصحیح کو برقرار رکھا ہے۔ (نقله ميرك عن التصحيح).

منذریؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو ترمذیؒ وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ اور الفاظ یہ ہیں: وقال: ربما قال سفيان: ان أمي أو ربما قال: أبي۔ فرمایا یہ

حدیث صحیح ہے۔ اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ان رجلا اتى أبا الدرداء فقال ان أبي لم يزل بي حتى زوجني وانه الآن يأمر بطلاقها۔ قال: ما أنا بالذى آمرك أن تعق والدك ولا بالذى آمرك ان تطلق امرأتك غير انك ان شئت حدثتك ما سمعت من رسول الله ﷺ يقول: الولد أوسط أبواب الجنة فحافظ على ذلك ان شئت أو دع۔ قال: فاحسب عطاء قال فطلقها۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ عنقریب فصل ثالث میں آرہا ہے کہ نبی کریم ؐ نے ابن عمرؓ سے فرمایا تھا: اس (عورت) کو طلاق دے دو۔ چونکہ حضرت عمرؓ اس عورت کو ناپسند کرتے تھے۔

الجامع الصغیر میں ہے: الولد اوسط أبواب الجنة. اس حدیث کو احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے ابوالدرداء سے روایت کیا ہے۔

والدہ احسان کی زیادہ حقدار ہے

۴۹۲۹: وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَبَرُّ قَالَ اُمَّكَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمَّكَ قُلْتُ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمَّكَ قُلْتُ ثُمَّ مَنْ قَالَ اَبَاكَ ثُمَّ الْاَقْرَبَ فَالْاَقْرَبَ۔ (رواه الترمذى وابو داؤد)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٥/٣٥١ الحديث رقم ٥١٣٩، والترمذی فی السنن ٤/٢٧٣ الحديث رقم ١٨٩٧ و ابن ماجه فی ٢/١٢٠٧ الحديث رقم ٣٦٦١، واحمد فی المسند ٥/٣۔

ترجمہ: حضرت بہز بن حکیمؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے سوال کیا یارسول اللہ ﷺ میں کس کے ساتھ سب سے زیادہ احسان کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا اپنی والدہ سے۔ میں نے عرض کیا پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا اپنی والدہ سے۔

میں نے باردیگر عرض کیا پھر کس سے؟ فرمایا اپنے والد سے پھر درجہ بدرجہ۔ (ترمذی' ابوداؤد)

تشریح: قوله: من أبر:

"أبر": بائے موحدہ کے فتحہ اور راء مشددہ کے ضمہ کے ساتھ، متکلم کا صیغہ ہے۔ای من أحسن اليه ومن أصله۔

قال: أمك: منصوب ہے، فعل محذوف کا مفعول بہ ہے۔ ای برّ أمك.

قلت: ثم من: "من" محلا منصوب ہے، فعل محذوف کا مفعول بہ ہے۔ أی من أبرّ؟

ماں کا حق اس قدر کیوں ہے؟ اس کی وجہ ماقبل میں گذر چکی ہے۔ (ملاحظہ فرمایئے اسی فصل کی پہلی حدیث)

قوله: الاقرب فالأقرب: یعنی تمام ذی رحم رشتہ داروں سے اس اصول کے مطابق حسن سلوک کے ساتھ پیش آیا جائے

اسنادی حیثیت: "الصحیح" میں ہے کہ یہ الفاظ ترمذی کی روایت کے ہیں۔ امام ترمذیؒ نے اس کو "حسن" کہا ہے، اور بعض نسخوں میں "حسن صحیح" کے الفاظ ہیں۔

ابوداؤد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: من أبر؟ قال: "امك ثم امك ثم امك ثم الأقرب فالأقرب". اس کو حاکمؒ نے بھی روایت کیا ہے، اور صحیح قرار دیا ہے۔

الجامع الصغیر میں ہے: "امك ثم امك ثم امك ثم أباك ثم الأقرب فالأقرب". اس حدیث کو احمد، ابوداؤد، ترمذی اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے معاویہ بن حیدۃ سے، اور ابن ماجہؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں اس کے ہم معنی متفق علیہ حدیث آغاز باب میں بھی گزر چکی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے حدیث: ۴۹۱۱۔

جو رحم کو قطع کرے گا میں اس سے قطع کرونگا

۴۹۳۰: وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اَنَا اللّٰهُ وَاَنَا الرَّحْمٰنُ خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَشَقَقْتُ لَهَا مِنِ اسْمِيْ فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهٗ وَمَنْ قَطَعَهَا بَتَتُّهٗ۔ (رواه ابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ۲/۳۲۲ الحدیث رقم ۱۶۹۴، والترمذی فی ٤/۲۷۸ الحدیث رقم ۱۹۰۷، واحمد فی المسند ۱/۱۹٤۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں اللہ ہوں اور میں رحمان ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اسے اپنے نام سے مشتق کیا ہے۔ پس جو شخص اسے (تعلقات کو) جوڑے گا میں اسے جوڑوں گا اور جو شخص اسے قطع کرے گا میں اسے توڑ دوں گا۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: أنا الله وأنا الرحمٰن:

یعنی میں معبود واجب الوجود ہوں یہ جملہ دراصل آگے ارشاد ہونے والے کلام (کی اہمیت کو ظاہر کرنے) کے لئے بطور تمہید ہے۔ اس تمہید میں پہلے اسم خاص کا ذکر کیا اور پھر اپنی صفت رحمٰن کو ذکر کیا جس کا لفظی مادہ اشتقاق وہی ہے جو "رحم" کا ہے۔

خلقت الرحم: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: (۱) قدرت الرحم۔ (۲) صورتها مجسدة ۔ وصلته: اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک معنی وہ ہیں جن کی وضاحت ترجمہ کے درمیان مابین القوسین کی گئی ہے۔ دوسری معنی ہیں وصلتہ محل کرامتی۔ اس حدیث میں اشارہ ہے کہ:

مناسبت اسمیہ کی فی الجملہ رعایت واجب ہے۔ اگرچہ معنی یہ ہے کہ "رحم" رحمٰن کے آثار رحمت کا اثر ہے۔ اور مؤمن کو چاہئے کہ وہ اللہ والے اخلاق اور اللہ کی صفات کو اپنائے۔ اسی لئے فرمایا: **فمن وصلها وصلته ومن قطعها قطعته۔**

بتته: ثانی تائے فوقیہ مشدد ہے، یہ "قطعتہ" کے معنی میں ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے بھی اسی طرح اسی راوی یعنی ابوسلمہ سے نقل کیا ہے۔ امام ترمذیؒ کا کہنا ہے کہ یہ حدیث "حسن صحیح" ہے۔ امام منذریؒ "تصحیح" میں فرماتے ہیں: یہ بات محل نظر ہے۔ چونکہ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے رسول اللہ ﷺ سے بالکل سماع نہیں کیا۔ (قاله ابن معين وغيره نقله ميرك).

الجامع الصغیر میں ہے: "قال الله تعالىٰ: أنا الرحمٰن، أنا خلقت الرحم، وشققت لها اسما من اسمي، فمن وصلها وصلته، ومن قطعها قطعته، ومن بتها بتته". حدیث کا یہ آخری جملہ اپنے ماقبل جملہ کی تاکید ہے، "بتّ" سے مراد "قطع کلی" ہے، طلاق بت، اور "البتہ" بھی اسی سے مأخوذ ہے۔ واللہ اعلم۔

اس حدیث کو امام احمد نے، امام بخاریؒ نے "الأدب المفرد" میں، ابوداؤد، ترمذی اور حاکم نے عبدالرحمٰن بن عوف سے اور حاکم نے ابوہریرہؓ سے بھی نقل کیا ہے۔

قطع رحمی سے نزولِ رحمت بند ہو جاتا ہے

۴۹۳۱: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِيْ اَوْفٰى قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تَنْزِلُ الرَّحْمَةُ عَلٰى قَوْمٍ فِيْهِمْ قَاطِعُ رَحِمٍ۔ (رواه البيهقي في شعب الايمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/٢٢٣ الحديث رقم ٧٩٦٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: جس قوم میں قطع رحمی کرنے والا موجود ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل نہیں ہوتی۔ (بیہقی)

تشریح: **لا تنزل**: مضارع معروف کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

فيهم: میں لفظ "قوم" کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے جمع کی ضمیر لائی گئی ہے۔ اور ایک نسخہ میں **فيه** ہے، کہ لفظ "قوم" کا اعتبار کیا گیا ہے، اور مفرد کی ضمیر لائی گئی ہے۔

تورپشتی فرماتے ہیں اس میں دو احتمال ہیں:

(۱) "قوم" سے مراد (پوری قوم نہیں) ہے بلکہ محض وہ لوگ مراد ہیں جو ناتا توڑنے والے کی مدد و حمایت کریں اور اس پر نکیر نہ کریں۔

۷ رحمت سے بارانِ رحمت مراد ہو۔ یعنی جس قوم یا جس آبادی کے اندر ناتا توڑنے والا کوئی شخص ہوتا ہے تو ناتا توڑے جانے کی نحوست سے اس قوم یا آبادی کو بارش سے محروم رکھا جاتا ہے۔

دو گناہوں کی سزا دُنیا میں بھی

۴۹۳۲: وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَا مِنْ ذَنْبٍ اَحْرٰی اَنْ یُّعَجِّلَ اللّٰہُ لِصَاحِبِہِ الْعُقُوْبَۃَ فِی الدُّنْیَا مَعَ مَایُدَّخَرُلَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْبَغْیِ وَقَطِیْعَۃِ الرَّحِمِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٥/٢٠٨ الحدیث رقم ٤٩٠٢، والترمذی فی ٤/٥٧٣ الحدیث رقم ٢٥١١ و ابن ماجه فی ٢/١٤٠٨ الحدیث رقم ٤٢١١۔

ترجمہ: حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قطع رحمی اور بغاوت یہ دو ایسے گناہ ہیں جن کی سزا اللہ تعالیٰ آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی دیتے ہیں۔ (ترمذی ابوداؤد)

تشریح: قولہ: مامن ذنب أحری أن یعجل اللہ لصاحبه العقوبة فی الدنیا۔

ما من ذنب: ''ما'' نافیہ ہے۔ اور ''من'' زائدہ برائے استغراق ہے۔

أحری: أحق اور أولٰی کے معنی میں ہے۔

ان یعجل اللہ: ''أحری'' کا صلہ یہاں حرف جر ''باء'' مقدر ہے: ای: بتعجیله سبحانه وتعالٰی.

العقوبة: ''یعجل'' کا مفعول بہ ہے۔ ''فی الدنیا مع ما یدخر'': یعجل کا ظرف ہے۔

یدخر: دال مہملہ کی تشدید اور خائے معجمہ کے کسرہ کے ساتھ۔ ''مایدخر'' سے مراد ''مایؤجل من العقوبة'' ہے۔

قولہ: من البغی و القطیعة:

''بغی'': (یہاں مضاف الیہ محذوف ہے۔) ای من بغی الباغی۔ اس کے تین معانی بیان کئے گئے ہیں: ۱ ظلم ۲ امام وقت کے خلاف بغاوت کرنا ۳ تکبر۔

من البغی: ''من'' تفصیلیہ ہے۔

سندی حیثیت وتخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں کہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو ''حسن صحیح'' قرار دیا ہے۔ امام حاکمؒ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ اور ''صحیح الاسناد'' قرار دیا ہے۔

الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام احمد نے امام بخاریؒ نے ''الأدب المفرد'' میں، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم نے ابوبکرہ سے نقل کیا ہے۔ امام طبرانی نے بھی اس حدیث کو ابوبکرہ سے نقل کیا ہے۔ البتہ ان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: ما من ذنب اجدر أن یعجل اللہ تعالٰی لصاحبه العقوبة فی الدنیا مع مایدخر له فی الآخرة من قطعیة الرحم والخیانة والکذب، وأن اعجل الطاعة ثوابا صلة الرحم حتی ان اهل البیت لیکونوا فجرة فتنموا أموالهم ویکثر عددهم اذا تواصلوا''۔

تین جنت سے محروم

۴۹۳۳: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنَّانٌ وَلَا عَاقٌّ وَلَا مُدْمِنُ خَمْرٍ۔ (رواه النسائی والدارمی)

أخرجه النسائی فی السنن ۳۱۸/۸ الحدیث رقم ۵۶۷۲، والدارمی فی ۱۵۳/۲ الحدیث رقم ۲۰۹۴۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین آدمی جنت میں نہ جائیں گے۔ ① احسان جتانے والا۔ ② والدین کا نافرمان۔ ③ شراب کا رسیا۔

تشریح: منان: بروزن فعال ہے

بعض کا کہنا ہے کہ "منان" اصل میں "منۃ" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی کو کچھ دیا جائے اور پھر اس پر اپنا احسان جتایا جائے۔ یہ خصلت (یعنی احسان کر کے اس کو جتانا) نہایت بری بات ہے قرآن کریم میں ہے: ﴿لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى﴾۔

''احسان رکھ کر اور ایذاء دے کر اپنی خیرات کو ضائع نہ کرو''۔

دوسرا مطلب: بعض حضرات نے لفظ "مَنَّان" کے بارے میں یہ کہا ہے کہ یہ "من" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "قطع" یعنی کاٹنا لہٰذا "منان" کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ شخص جو ناتے کو کاٹے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وان لك لأجرا غير ممنون][القلم۔۳] اور اسی سے ہے المنیۃ یعنی قاطع رحم اور قاطع طریق بظاہر یہ اسم منسوب ہے، (ظلام کی طرح) ای صاحب المن.

"عاق" سے مراد وہ شخص ہے جو ماں باپ کا نافرمان ہو۔

''مدمن خمر'': اس کا معنی ہے: شارب الخمر من غير توبة۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ''وہ شخص جو دوام کے ساتھ شرابی ہے'' تو اس کا یہ مفہوم صحیح نہیں ہے۔

قوله: لايدخل الجنة: تورپشتی رحمہ اللہ اس کے دو مطلب بیان فرماتے ہیں: ① جنت میں داخل نہ ہونے کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ ایسے لوگ خدا کے ان نیک اور صالح بندوں کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہوں گے جو آخرت میں حساب کتاب کے دن فائز المرام اور نجات یافتہ قرار دیئے جائیں اور بلا کسی روک ٹوک کے شروع ہی میں جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔

② یہ مراد ہے کہ یہ لوگ عذاب کے بغیر جنت میں داخل نہیں ہوں گے یعنی ان میں سے ہر ایک کو پہلے اپنے ان گناہوں کی سزا بھگتنی ہوگی اس کے بعد جنت میں پہنچائے جائیں گے میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں تاہم اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کو بغیر عذاب کے بھی جنت میں داخل کر دے گا کیونکہ اس کا فرمان ہے:

وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ [النساء:۴۸] ای بشفاعة أو بغيرها۔

''اوراس کے علاوہ بھی جس کو وہ چاہے گا بخش دے گا''۔

صلہ رحمی کے تین فوائد

۴۹۳۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَلَّمُوْا مِنْ اَنْسَابِكُمْ مَا تَصِلُوْنَ بِهٖ اَرْحَامَكُمْ فَاِنَّ صِلَةَ الرَّحِمِ مَحَبَّةٌ فِي الْاَهْلِ مَثْرَاةٌ فِي الْمَالِ مَنْسَاَةٌ فِي الْاَثَرِ۔

(رواہ الترمذی وقال هذا حدیث غریب)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/ ٣٠٩ الحديث رقم ١٩٧٩، واحمد فی المسند ٢/ ٣٧٤۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اپنے ان انساب کو خصوصاً محفوظ کرو جن سے تمہاری رشتہ داری جڑتی ہے اس لئے کہ صلہ رحمی کے (تین) فائدے ہیں: ① خاندان والوں سے محبت۔ ② مال میں کثرت۔ ③ عمر میں برکت۔ ترمذی نے اسے غریب کہا ہے۔

تشریح: محبة: میم حائے مہملہ اور بائے موحدہ مشددہ تینوں کے فتحہ کے ساتھ مفعلۃ ''حب'' سے ماخوذ ہے۔ مصدر ہے بمعنی للمفعول ہے۔ ایک نسخہ میں حاء کے کسرہ کیساتھ ہے۔ ای: مظنة للحب وسبب للود، اور ایک نسخہ میں میم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: احبه وهو محبوب على غير قياس، ومحب قليل، وحبيته أحبه بالكسر شاذ، وحببت اليه ككرم صرت حبيبًا.

مثراة ''النهاية'' میں ہے کہ ''ثراة بروزن مفعلة ہے، ثری بمعنی ''کثرت'' سے ماخوذ ہے۔ ای: سبب لكثرة المال.

مثراة فی المال: یہ خبر ثانی ہے۔

منساة: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ بروزن مفعلۃ، منسا سے ماخوذ ہے۔ بمعنی ''تاخیر''۔

''اثر'': بروزن قلم بمعنی اجل.

مطلب یہ ہے کہ تم اپنے باپ' چچا' ماموں (دادا' ماؤں' دادیوں' نانیوں' ان کی اولاد) اور دیگر اعزاء واقرباء (کی پہچان رکھو) ان کے ناموں سے باخبر رہو (اور ان کے حالات سے واقفیت حاصل کرو) تاکہ ذوی الارحام کے ساتھ صلہ رحمی کی جا سکے۔ صلہ رحمی کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے ساتھ محبت ومؤدت اور قرب وشفقت کا رشتہ برقرار رکھ سکو اور ان کے ساتھ حسن وسلوک کر سکو۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ صلہ رحمی کا تعلق تمام ذوی الارحام سے ہے' نہ کہ صرف والدین سے۔ جیسا کہ بعض کا مذہب ہے۔

قولہ: منساة فی الأثر: کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں:

① حسن سلوک کرنا تاخیر اجل کا سبب اور عمر میں زیادتی کا موجب ہے۔

② صلہ رحمی کرنا نسل کے استمرار وبقاء کا ذریعہ ہے۔

اسنادی حیثیت: صاحب الجامع کا کہنا ہے، کہ یہ حدیث اس سند کے ساتھ غریب ہے۔ اس حدیث کو حاکم نے بھی روایت کیا ہے، اور صحیح قرار دیا ہے۔ (ذکرہ میرک)

عظیم گناہ سے معافی کی صورت خالہ سے احسان

۴۹۳۵: وَعَنْ اِبْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلاً اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّىْ اَصَبْتُ ذَنْبًا عَظِيْمًا فَهَلْ لِىْ مِنْ تَوْبَةٍ قَالَ هَلْ لَكَ مِنْ اُمٍّ قَالَ لَاقَالَ وَهَلْ لَّكَ مِنْ خَالَةٍ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَبِرَّهَا ۔ (رواه الترمذي)

أخرجه الترمذي في السنن ٢٧٦/٤ الحديث رقم ١٩٠٤، واحمد في المسند ١٤/٢۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے ایک عظیم گناہ کا ارتکاب کیا ہے کیا میری توبہ قبول ہونے کی کوئی صورت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تیری والدہ موجود ہے۔ وہ عرض کرنے لگا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تیری خالہ ہے۔ اس نے عرض کیا جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے ساتھ احسان کرو۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: هل لك من أم: "من" زائدہ ہے۔

قوله: هل لك من خالة: اس "من" میں دو احتمال ہیں: ① یہ من زائدہ ہے۔ ② یہ تبعیضیہ ہے۔

برها: امر کا صیغہ ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ ناتے داروں کے ساتھ حسن سلوک' من جملہ ان حسنات میں سے ہے جو گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ یا ان طاعات کے قائم مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ﴾ [الفرقان: ٧٠] کا ایک معنی یہی مظہر فرماتے ہیں کہ میں ہے کہ وہ گناہ اس شخص کے تئیں عظیم ہو' چونکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی عظیم ہے اگرچہ صغیرہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا گناہ عظیم تھا' کبائر میں سے تھا۔ اور اس نوع کی نیکی اس کے لئے کفارہ ہو۔ اور یہ اس شخص کے لئے مخصوص تھا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ بتایا گیا ہوگا (کہ حسن سلوک کا کبیرہ گناہ کے کفارہ کا سبب بننا اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے۔) ابن الملک نے اس کی اتباع کی ہے۔ یہ محل نظر ہے چونکہ حدیث میں اس بات پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ وہ شخص اپنے گناہ پر مصر تھا اور اس نے اس گناہ سے توبہ نہیں کی تھی' حتی کہ اس کو اس کی خصوصیت قرار دیا جائے۔ اس شخص سے جو گناہ صادر ہوا تھا وہ کبیرہ نہیں تھا بلکہ حقیقت میں صغیرہ گناہ تھا۔ البتہ اس شخص نے اپنے مضبوط جذبہ ایمانی اور احتیاط و تقویٰ کی بنا پر اس گناہ کو ایک بڑا گناہ سمجھا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خالہ ماں کا درجہ رکھتی ہے۔

والدین کی موت کے بعد بھلائی کے چار کام

۴۹۳۶: وَعَنْ اَبِیْ اُسَیْدٍ السَّاعِدِیِّ قَالَ بَیْنَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذْ جَاءَ هُ رَجُلٌ مِنْ بَنِیْ سَلِمَةَ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هَلْ بَقِیَ مِنْ بِرِّ اَبَوَیَّ شَیْءٌ اَبَرُّهُمَا بِهٖ بَعْدَ مَوْتِهِمَا قَالَ نَعَمْ اَلصَّلٰوةُ عَلَیْهِمَا وَالْاِ سْتِغْفَارُ لَهُمَا وَاِنْفَاذُ عَهْدِهِمَا مِنْ بَعْدِهِمَا وَصِلَةُ الرَّحِمِ الَّتِیْ لَا تُوْصَلُ اِلَّا بِهِمَا وَاِکْرَامُ صَدِیْقِهِمَا۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ۵/۳۵۲ الحدیث رقم ۵۱۴۲ و ابن ماجه فی ۲/۱۲۰۸ الحدیث رقم ۳۱۱۴، واحمد فی المسند ۳/۴۹۷۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بنوسلمہ کا ایک شخص آیا اور عرض کرنے لگا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا میرے والدین کی بھلائیوں میں سے کوئی ایسی بھلائی باقی ہے جو میں ان کی موت کے بعد وہ بھلائی ان سے کرسکوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جی ہاں۔ ① ان کے لئے دعا رحمت واستغفار۔ ② ان کے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرنا۔ ③ اور ان کے رشتوں کو جوڑنا جو انہی کی وجہ سے جڑتے ہوں۔ ④ اور ان کے دوستوں کا احترام واکرام کرنا۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: ابوی: میں تغلیب ہے۔ **للتی لا توصل الا بهما**: صفت کاشفہ ہے "رحم" کیلئے۔

رضاعی والدہ کا اکرام

۴۹۳۷: وَعَنْ اَبِی الطُّفَیْلِ قَالَ رَاَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَقْسِمُ لَحْمًا بِالْجِعِرَّانَةِ اِذْ اَقْبَلَتِ امْرَاَةٌ حَتّٰی دَنَتْ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَبَسَطَ لَهَا رِدَاءَ هُ فَجَلَسَتْ عَلَیْهِ فَقَالُوْا هِیَ اُمُّهُ الَّتِیْ اَرْضَعَتْهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ۵/۳۵۳ الحدیث رقم ۵۱۴۴۔

ترجمہ: حضرت ابوطفیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جعرانہ میں گوشت تقسیم کرتے دیکھا۔ اچانک ایک عورت سامنے آئی جو آپ کے قریب ہوتی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے اپنی چادر بچھادی وہ اس پر بیٹھ گئی میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ تو صحابہ کرامؓ نے بتلایا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی والدہ ہے۔ (ابوداود)

تشریح: **جعرانه**: جیم کے کسرہ، عین کے سکون، راء کی تخفیف کے ساتھ۔ بعض نسخوں میں عین کے کسرہ اور راء کی تشدید کے ساتھ ہے **قوله: فبسط لها ردائه فجلست عليه**: یا تو یہ عدم تکلف کے باعث تھا جیسا کہ اہل عرب کی عادت بے تکلفی کی تھی۔ یا کسی اور باعث سے تھا۔ اس حدیث سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے، کہ حقوق قدیمہ کی رعایت واجب ہے۔ اور پرانے ملنے جلنے والوں کا اکرام بھی کرنا چاہئے۔ "**المواهب اللدنية**" میں لکھتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی والدہ حلیمہ بنت ابی ذؤیب تھیں۔ ان کا تعلق قبیلہ ہوازن سے تھا۔ مدت رضاعت مکمل ہونے تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا۔ یوم حنین کو

آنحضرت ﷺ کے پاس تشریف لائیں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا، اور اپنی چادر مبارک پر بٹھایا۔ آنحضرت ﷺ کو حلیمہ کے علاوہ ایک اور خاتون نے بھی ابتداء میں کچھ دنوں تک دودھ پلایا تھا، جن کا نام ثویبہ تھا، یہ ابو لہب کی باندی تھیں۔ ان دونوں کے قبول اسلام کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں حلیمہ کے شوہر کے قبول اسلام میں بھی اختلاف ہے۔ نبی کریم ؐ کے حضرت خدیجہؓ سے نکاح ہو چکنے کے بعد جب۔ ثویبہ آنحضرت ﷺ کے پاس تشریف لاتیں تو حضرت خدیجہؓ ان کا اکرام فرماتی تھیں۔ ثویبہ کو ابولہب نے آزاد کیا تھا۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام مدینہ مبارکہ سے ان کو کپڑے اور دیگر ہدایا بھیجا کرتے تھے۔ ان کی وفات فتح خیبر کے بعد ہوئی۔ (ذکرہ ابوعمرو)

اعمالِ صالحہ کے توسل والے تین آدمی

۴۹۳۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ بَيْنَمَا ثَلٰثَةُ نَفَرٍ يَتَمَاشَوْنَ اَخَذَهُمُ الْمَطَرُ فَمَالُوْا اِلٰى غَارٍ فِي الْجَبَلِ فَانْحَطَّتْ عَلٰى فَمِ غَارِهِمْ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ اُنْظُرُوْا اَعْمَالاً عَمِلْتُمُوْهَا لِلّٰهِ صَالِحًا فَادْعُوْا اللّٰهَ بِهَا لَعَلَّهُ يُفَرِّجُهَا فَقَالَ اَحَدُهُمْ اَللّٰهُمَّ اِنَّهُ كَانَ لِيْ وَالِدَانِ شَيْخَانِ كَبِيْرَانِ وَلِيَ صِبْيَةٌ صِغَارٌ كُنْتُ اَرْعٰى عَلَيْهِمْ فَإِذَا رُحْتُ عَلَيْهِمْ فَحَلَبْتُ بَدَاْتُ بِوَالِدَيَّ اَسْقِيْهِمَا قَبْلَ وَلَدِيْ وَاِنَّهُ قَدْنَاٰى بِيَ الشَّجَرُ فَمَا اَتَيْتُ حَتّٰى اَمْسَيْتُ فَوَجَدْتُهُمَا قَدْنَامَا فَحَلَبْتُ كَمَا كُنْتُ اَحْلُبُ فَجِئْتُ بِالْحِلَابِ فَقُمْتُ عِنْدَ رُؤُسِهِمَا اَكْرَهُ اَنْ اُوْقِظَهُمَا وَاَكْرَهُ اَنْ اَبْدَاَ بِالصِّبْيَةِ قَبْلَهُمَا وَالصِّبْيَةُ يَتَضَاغَوْنَ عِنْدَ قَدَمَيَّ فَلَمْ يَزَلْ ذٰلِكَ دَاْبِيْ وَدَاْبُهُمْ حَتّٰى طَلَعَ الْفَجْرُ فَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنِّيْ فَعَلْتُ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ وَجْهِكَ فَافْرُجْ لَنَا فُرْجَةً نَرٰى مِنْهَا السَّمَاءَ فَفَرَّجَ اللّٰهُ لَهُمْ حَتّٰى يَرَوْنَ السَّمَاءَ قَالَ الثَّانِيْ اَللّٰهُمَّ اِنَّهُ كَانَتْ لِيْ بِنْتُ عَمٍّ اُحِبُّهَا كَاَشَدِّ مَا يُحِبُّ الرِّجَالُ النِّسَاءَ فَطَلَبْتُ اِلَيْهَا نَفْسَهَا فَاَبَتْ حَتّٰى اٰتِيَهَا بِمِائَةِ دِيْنَارٍ فَسَعَيْتُ حَتّٰى جَمَعْتُ مِائَةَ دِيْنَارٍ فَلَقِيْتُهَا بِهَا فَلَمَّا قَعَدْتُ بَيْنَ رِجْلَيْهَا قَالَتْ يَا عَبْدَ اللّٰهِ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تَفْتَحِ الْخَاتَمَ فَقُمْتُ عَنْهَا اَللّٰهُمَّ فَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنِّيْ فَعَلْتُ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ وَجْهِكَ فَافْرُجْ لَنَا مِنْهَا فَفَرَجَ لَهُمْ فُرْجَةً وَقَالَ الْاٰخِرُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ كُنْتُ اسْتَاْجَرْتُ اَجِيْرًا بِفَرَقِ اَرُزٍّ فَلَمَّا قَضٰى عَمَلَهُ قَالَ اَعْطِنِيْ حَقِّيْ فَعَرَضْتُ عَلَيْهِ حَقَّهُ فَتَرَكَهُ وَرَغِبَ عَنْهُ فَلَمْ اَزَلْ اَزْرَعُهُ حَتّٰى جَمَعْتُ مِنْهُ بَقَرًا وَرَاعِيَهَا فَجَاءَنِيْ فَقَالَ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تَظْلِمْنِيْ وَاَعْطِنِيْ حَقِّيْ فَقُلْتُ اِذْهَبْ اِلٰى ذٰلِكَ الْبَقَرِ وَرَاعِيْهَا فَقَالَ اِتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تَهْزَاْ بِيْ فَقُلْتُ اِنِّيْ لَا اَهْزَاُ بِكَ فَخُذْ ذٰلِكَ الْبَقَرَ وَرَاعِيَهَا فَاَخَذَهُ فَانْطَلَقَ بِهَا فَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنِّيْ فَعَلْتُ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ وَجْهِكَ فَافْرُجْ لَنَا مَابَقِيَ فَفَرَجَ اللّٰهُ عَنْهُمْ۔ (متفق علیہ)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/ ٢٠٩٩ الحديث رقم (١٠٠-٢٧٤٣)، واحمد في المسند ٢/ ١١٦۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ ذکر فرمایا کہ تین آدمی سفر میں تھے ان کو بارش نے گھیر لیا وہ پہاڑ کی ایک غار کی طرف گئے (اور اس میں پناہ لی) اس غار کے منہ پر پہاڑ کی ایک چٹان آ گری جس نے غار کا منہ بند کر دیا وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے اپنے اپنے کسی ایسے نیک عمل کے متعلق سوچو جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کیا ہو۔ اسی عمل کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ اس (مصیبت) کو کھول دے تو ان میں سے ایک نے کہا اے میرے اللہ! میرے والدین بہت بوڑھے تھے اور بچے چھوٹے چھوٹے تھے میں ان کے لئے جانور چراتا تھا جب میں شام کو واپس لوٹتا تو دودھ دوھ کر اپنے بچوں سے پہلے اپنے والدین کو پلاتا ایک مرتبہ میں چراگاہ میں دور چلا گیا جس کی بناء پر شام کو دیر سے لوٹا اس وقت میرے والدین سو چکے تھے میں نے حسب سابق دودھ نکالا پھر دودھ لے کر ان کے سرہانے کھڑا ہو گیا مجھے ان کو جگانے کی ہمت بھی نہ ہو رہی تھی اور یہ بھی مجھے پسند نہ تھا کہ میں ان سے پہلے بچوں کو دے دوں میرے بچے بھوک کی وجہ سے میرے قدموں کے پاس بلک رہے تھے۔ میرا ان سے یہی معاملہ رہا یہاں تک کہ صبح ہو گئی اے میرے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں نے یہ عمل تیری رضا کے لئے کیا تھا تو تو اتنی کشادگی فرما دے کہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے غار کا اتنا حصہ کھول دیا کہ انہیں آسمان نظر آنے لگا۔ پھر دوسرا عرض پیرا ہوا کہ اے میرے اللہ! میری ایک چچازاد بہن تھی جس سے میں اس طرح شدید محبت کرتا تھا جیسا مرد عورتوں سے کرتے ہیں میں نے اس سے اس کے نفس کا مطالبہ کیا تو اس نے انکار کرتے ہوئے سو دینار کا مطالبہ کیا میں نے کوشش کر کے سو دینار جمع کیے اور اس کے پاس لے گیا جب میں اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھا تو اس نے کہا اے اللہ کے بندے اللہ سے ڈر اور اس مہر کو نہ کھول تو میں اٹھ کھڑا ہوا اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ عمل میں نے تیری رضا کے لئے کیا تو اس میں اور کشادگی فرما۔ تیسرے نے عرض کیا اے اللہ! میں نے ایک مزدور کو ساڑھے دس سیر چاول کے عوض رکھا تھا جب اس نے اپنا کام پورا کیا تو وہ کہنے لگا میرا حق دے دو میں نے اس حق اس پر پیش کیا تو وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا اور اس سے بے پروائی اختیار کی میں اس چاول کو کاشت کرتا رہا یہاں تک کہ میں نے اس سے بیل اور چرواہے جمع کر لئے۔ پھر وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا اللہ تعالیٰ سے ڈر اور مجھ پر ظلم نہ کر اور مجھے میرا حق دے میں نے کہا وہ بیل اور چرواہے لے جا۔ اس نے کہا اللہ تعالیٰ سے ڈر میرا مذاق مت اڑا۔ میں نے کہا میں مذاق نہیں اڑاتا تو وہ تمام لے لے۔ اس نے ان کو اپنے قبضے میں لے لیا اور چلا گیا۔ اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے وہ عمل تیری رضا کے حصول کیلئے کیا تھا تو باقی ماندہ راستہ میں کشادگی عنایت فرما۔ اللہ تعالیٰ نے غار کا تمام راستہ ان پر کھول دیا۔

(بخاری، مسلم)

تشریح: بینما: میم کے ساتھ ہے۔

ثلاثة نفر: اضافت بیانیہ ہے۔ یتماشون: شین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

اعمالا عملتموها لله صالحة: ''اعمالاً'' موصوف ہے۔ اور ''صالحة'' صفت دوم ہے اس سے مراد یہ ہے کہ خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کیے گئے اعمال' جن میں دکھلاوا اور ریا کری نہ ہو۔ اس مفہوم پر اگلا کلام 'ابتغاء وجهك' دلالت کر رہا ہے (کذا قال الطیبی)۔ جمال الدین لکھتے ہیں: اظہر یہ ہے کہ ''صالحة'' صفت ہے اعمالا کیلئے، اور عبارت میں تقدیم ہے: انظروا أعمالا صالحة لله'' ''صالحة'' کی قید سے اعمال غیر صالحہ، اور ''لله'' کی قید سے اعمال لغیر اللہ

خارج ہوگئے۔اس کی تائید بخاری کی روایت سے ہوتی ہے:انظر وا اعمالا عملتوها صالحة للّٰہ۔

يفرجها: رائے مشددہ مکسورہ کے ساتھ ہے۔از باب تفعیل ہے۔اور ایک نسخہ میں حرف اول کے فتحہ اور رائے مشددہ کے ساتھ ہے۔ای يزيل الصخرة أويكشف الكربة۔ چنانچہ قاموس میں لکھتے ہیں: فرج الله الغم۔ يفرجه كشفه كفرجه۔ انه: ضمیر شان ہے۔

''صبية'': صاد کے کسرہ اور باء کے سکون کے ساتھ'یہ جمع ہے''صبی'' کی' ارعی علیهم: کے دومعنی بیان کئے گئے ہیں:

ابن الملکؒ فرماتے ہیں:ای أرعی ماشيتهم جوہریؒ کہتے ہیں:يقال: فلان يرعى على أبيه أي يرعى غنمه اھ۔

طیبیؒ کا کہنا ہے، کہ أرعی، ''انفاق'' کے معنی کو متضمن ہے، چونکہ بواسطہ ''علی'' متعدی ہے۔ ای: أنفق عليهم راعيا الغنيمات۔ تحقیقی بات وہ ہے جو طیبیؒ نے ذکر کی ہے۔

فاذا رحت عليهم: رددت کے معنی کو متضمن ہے۔ای فاذا رددت الماشية من المرعى الى موضع مبيتهم۔

بدأت و الدی: جواب'' اذا'' ہے۔

أسقيهما قبل ولدی: جملہ حالیہ ہے، یا جملہ مستانفہ تعلیلیہ ہے۔

و انه قد نأی: ''ان'' کے ساتھ متصل ضمیر، ضمیر شان ہے۔

قد نای: اور ایک نسخہ میں ''ناء'' ہے یعنی الف پہلے اور ہمزہ بعد میں ہے۔مسلم کے بعض نسخوں میں بھی اسی طرح ہے۔یہ دونوں لغات صحیح ہیں۔اس آیت کریمہ:﴿ونأ بجانبه﴾[الاسراء۔۸۳] میں اکثر قراء سبعہ نے تقدیم الف کیساتھ ناء پڑھا ہے۔ابن ذکوان کی ابن عامر سے مروی قراءت بھی یہی ہے۔

أحلب: لام کے ضمہ اور کسرہ (یعنی باب نصر اور باب ضرب) دونوں سے درست ہے۔

الحلاب: حاء کے کسرہ کے ساتھ، وہ برتن کہ جس میں دودھ دوہا جاتا ہے۔بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد دوہا گیا دودھ ہے۔اس صورت میں کلام میں مجاز ہوگا۔کہ ذکر محل سے حال کا ارادہ ہے۔پہلے معنی زیادہ ظاہر ہیں۔

علی رؤوسهما: ملا علی قاریؒ کے نسخہ میں ''علی رؤوسهما'' ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ایک صحیح نسخہ میں ''عندرووسهما'' ہے۔

أكره أن أوقظهما: یہ جملہ مستانفہ بیانیہ ہے یا حال ہے۔

والصبية يتضاغون عند قدمی: یہ جملہ محل نصب میں حال ہے۔

يتضاغون: غین معجمہ کے ساتھ۔ای يضجون ويصيحون من الجوع۔

ودأبهم: منصوب ہے، اور ایک نسخہ میں مرفوع ہے۔ضمیر جمع والدین اور بچوں کی طرف لوٹ رہی ہے۔

فافرج: ہمزہ وصلی اور راء کے ضمہ کے ساتھ، ثلاثی مجرد سے ہے۔اور ایک نسخہ میں مزید فیہ سے ہے، ہمزہ قطعی اور راء کے کسرہ کے ساتھ میرکؒ فرماتے ہیں ہمزہ وصل اور راء کے ضمہ کے ساتھ ''فرج'' سے ماخوذ ہے ہمزہ قطعی اور راء کے کسرہ کے ساتھ ''افراج'' سے مشتق ہونا بھی صحیح ہے۔ای اکشف لنا۔فرجة: فاء پر ضمہ اور فتحہ دونوں درست ہیں۔

حتی یرون السماء: شرح السنہ کے بعض نسخوں میں بھی اثبات نون کے ساتھ ہے، حال ماضی کی حکایت ہے۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں: شربت الابل حتی یخرج بطنه. اور بعض نسخوں میں نون کے حذف کے ساتھ ہے، اس صورت میں وصل کے وقت التقاء ساکنین کی وجہ سے واؤ پر ضمہ پڑھیں گے۔

اللهم انه: یہ ضمیر "ضمیر شان" ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "ضمیر شان" کی تفسیر مؤنث کے ساتھ کی جارہی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ بھی درست ہے۔

عسقلانیؒ فرماتے ہیں: پہلی جگہ " اللهم انه" ذکر فرمایا، دوسرے مقام پر اللهم انها ارشاد فرمایا، اور تیسرے آدمی کے قصہ میں " اللهم انی " کہا، یہ بطور "تفنن" ہے۔ پہلے مقام پر ضمیر شان ہے، اور دوسری جگہ ضمیر قصہ ہے، دوسرے واقعہ میں ضمیر قصہ لانے کی مناسبت بالکل واضح ہے چونکہ واقعہ عورت سے متعلق تھا۔

اس کلام سے یہ پتہ چلا کہ بخاری شریف کی روایت میں دوسرے آدمی کے کلام میں " انها" آیا ہے، جو کہ مشکوٰۃ کی روایت سے ہٹ کر ہے۔ (ذکرہ میرک) بظاہر مشکوٰۃ کی عبارت کے الفاظ مسلم کی روایت سے مأخوذ ہیں، چنانچہ پتہ چلا کہ یہ روایت (لفظی طور پر نہیں بلکہ) معنوی طور پر "متفق علیہ" ہے۔

قوله: أحبها كاشد ما يحب الرجال النساء: ای حبا شدیدا یہ جملہ اس آیت کریمہ کے مشابہ ہے: ﴿يحبونهم كحب الله والذين آمنوا أشد حبا لله﴾ [البقرة-١٦٥] امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مصدر محذوف کی صفت ہے۔ اور "ما" مصدریہ ہے۔ ای: احبها حبا مثل اشد حب الرجال النساء. یا حال ہے۔ ای: أحبها مشابها حبی اشد حب الرجال النساء. اور اس کی نظیر یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يخشون الناس كخشية الله أو أشد خشية﴾ [النساء-٧٧] "أشد خشية" حال ہے۔

تقدیری عبارت یوں ہے:

مشبهين أشد خشية من أهل خشية الله فطلبت اليها نفسها: اس میں "ارسال" کے معنی کی تضمین ہے. ای: أرسلت اليها طالبًا نفسها.

حتی آتيها: منصوب ہے۔ اور ایک نسخہ میں ساکن ہے، حال ماضی کی حکایت کے طور پر۔ یا عبد الله: اسم میں اسمیت اور وصفیت دونوں کا احتمال ہے۔ اتق الله: (یہاں مضاف محذوف ہے.) ای: عذاب الله او مخالفته.

الخاتم: تاء کے فتحہ کے ساتھ، پردۂ بکارت سے کنایہ ہے۔

اللهم: زیادتی تضرع کیلئے ہے۔

فان كنت: معطوف علیہ مقدر ہے۔ ای اللهم فعلت ذلك فان كنت. اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللهم "مقحم" ہو، معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان۔ اس صورت میں معطوف علیہ مقدر نہیں ماننا پڑے گا۔ اور " اللهم" ابتہال وتضرع کی تاکید کیلئے ہوگا۔ اس واقعہ میں " اللهم " مکرر لایا گیا۔ جب کہ پہلے اور تیسرے آدمی کے قصہ میں مکرر مذکور نہیں ہے، چونکہ یہ [illegible] ترین مقام تھا، خدا کے خوف کی وجہ اپنے نفس کو روکنا انتہائی مشکل کام ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وأما

من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى فان الجنة هي المأوى﴾ [النازعات۔ ٤٠]

شیخ ابو حامدؒ فرماتے ہیں: نفسانی خواہشات میں سے سخت ترین شہوت شرمگاہ کی ہے، اور ہیجان کے وقت اس پر غلبہ پانا عقل کے نزدیک صعب ترین کام ہے، جو شخص زنا کو اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے، وہ صدیقین کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جب کہ زنا پر قدرت بھی ہو، تمام موانع بھی مرتفع ہوں اسباب بھی میسر ہوں اور شہوت بھی صادق ہو۔

فرجة منها:ای من هذه الكربة أوا لصخرة۔ اس ''من'' میں ایک احتمال یہ ہے کہ تبعیضیہ ہو۔ ای بعض الفرجة

وقال الآخر: خاء کے فتحہ کے ساتھ ہے' اور ایک نسخہ میں خاء کے کسرہ کے ساتھ، حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔ دوسری صورت میں مقصود پر دلالت زیادہ واضح ہے۔

أرز: ہمزہ کے فتحہ' راء کے ضمہ اور زائے مشددہ کے ساتھ ہے اس لفظ میں متعدد لغات ہیں۔ چنانچہ صاحب قاموس لکھتے ہیں:الأرز كأشد' وعتل وقفل' وطنب' ورز' ورنز' وآرز ككابل' وارز كعضد ا ه ففيه لغات بعدد أوله وآخره.

فرق: کے بارے میں لغوین کی آراء ملاحظہ فرمائیے۔

الفرق بكسر الراء ويسكن: قال الطيبيؒ الفرق بفتح الراء مكيال يسع ستة عشر رطلا، وفي القاموس:الفرق مكيال بالمدينة يسع ثلاثة آصع ويحرك، أو هو أفصح أو يسع ستة عشر رطلا أو أربعة ارباع. وفي النهاية:الفرق بالتحريك مكيال يسع ستة عشر رطلا، وبالسكون مائة وعشرون رطلا.

خلاصۃ الآراء:

① فرق، فاء، راء اور قاف کے ساتھ ہے۔
② یہ لفظ دو طرح سے پڑھا جاتا ہے۔(الف) بروزن شمس.(ب) بروزن قمر
③ یہ مدینہ کا ایک پیمانہ ہے۔

عرضِ مرتب:

"فرق"مدینہ میں رائج ایک پیمانہ کا نام تھا اس میں سولہ رطل یعنی تقریباً آٹھ سیر غلہ آتا تھا یہ پیمانہ عام طور پر غلہ وغیرہ کے لین دین میں ماپ تول کے کام آتا تھا۔(انتھی)

④ بروزن قمر ہو تو سولہ (۱٦) رطل یا تین صاع یا اربعہ ارباع کا پیمانہ ہے۔(بقول صاحب قاموس وصاحب النہایہ)
⑤ بروزن شمس ہو، تو ۱۲۰ رطل کا پیمانہ ہے۔(بقول صاحب النہایۃ)
⑥ بروزن قمر ہو یا بروزن شمس ہو، ایک ہی پیمانہ ہے۔(بقول صاحب قاموس)۔

ایک روایت میں'' بفرق ذرة '' کے الفاظ آئے ہیں، دونوں روایتوں میں جمع یوں ہوگا کہ'' فرق '' دو الگ الگ صنف کا تھا۔

قوله: فخذ ذلك البقر وراعيها:اسم اشارہ مذکر باعتبار'' سواد مرئی'' کی تاویل کے لایا گیا اور باعتبار جنس کے ضمیر

مؤنث کی لائی گئی۔

لا تهز أبي: باء کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں نون کے ساتھ "نی" ہے۔

فأخذه: ایک نسخہ میں" فأخذها" ہے۔

حتى جمعت بقرا و راعيها: کے ذیل میں امام میرکؒ فرماتے ہیں کہ صحیح کی روایت میں" فثمرت أجره حتى كثرت من الأموال" کے الفاظ ہیں۔اسی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: فقلت له: كل ما ترى من الابل والبقر والغنم والرقيق من أجرك۔اسی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: فاستاقه فلم يترك شيئاً۔یہ روایت اس بات پر دلالت کررہی ہے، کہ مشکوۃ کی روایت مذکورہ میں" جمعت بقرا" سے مراد صرف گائے نہیں ہے۔گائے کے ذکر پر اکتفاء اس وجہ سے کہ گایوں کی تعداد بظاہر دوسرے جانوروں کے مقابلے میں زیادہ تھی۔

عرضِ مرتب:

والصبية يتصاغون: سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ جس قوم کے افراد سے متعلق ہے اس کی شریعت میں ماں باپ کا حق اولاد کے نفقہ وحق پر مقدم تھا جبھی تو اس شخص نے ماں باپ کو دودھ پلانے سے پہلے اپنے بچوں کو دودھ پلانا گوارا نہیں کیا حالانکہ بھوک کی شدت سے رات بھر روتے تڑپتے رہے اس شخص نے اپنے بچوں کو بقدر سدرمق تو دودھ پلا دیا تھا مگر وہ اتنی مقدار پر مطمئن نہیں ہوئے تھے اور مزید دودھ پینے کیلئے روچلا رہے تھے۔

علماء نے اس حدیث سے مختلف مسائل اخذ کئے ہیں۔ چنانچہ امام نوویؒ نے چند مسائل ذکر فرمائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

(ا): ہمارے اصحاب نے اس سے استدلال کیا ہے کہ کسی سخت آفت ومصیبت کے وقت اپنے نیک اعمال کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا مستحب ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ان تینوں کی دعا قبول فرمانا اور آنحضرت ﷺ کا اس واقعہ کو مدح وتعریف اور ذکر کی فضیلت کے طور پر صحابہؓ کے سامنے بیان کرنا اس امر کی دلیل ہے اور اگر یہ مستحب نہ بھی ہو تو اس کے جائز ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔

(ب): ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا ان کو اپنے بال بچوں پر ترجیح دینا بڑی فضیلت کی بات ہے۔

(ج): عفت و پارسائی اور انسانی نفس کو حرام امور سے باز رکھنا خصوصاً اس صورت میں جبکہ کسی طرح کی کوئی رکاوٹ بھی سامنے نہ ہو بڑی فضیلت کی بات ہے۔

(د): کرامات اولیاء برحق ہیں۔ اہل حق کا مذہب یہی ہے۔(اللہ کے نیک صالح بندوں کے ذریعہ ایسی چیزوں کا ظاہر ہونا جو عام انسانی عادت کے خلاف ہوں ان کو کرامات کہا جاتا ہے)

(ہ): اصحاب ابوحنیفہ وغیرہ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ غیر کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا جائز ہوتا ہے بشرطیکہ بعد میں اس کی اجازت حاصل ہو (امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے کہ فضولی کا تصرف جائز ہو جاتا ہے البتہ یہ جواز مالک کی اجازت پر موقوف رہتا ہے کہ اگر مالک اجازت دے دیتا ہے تو وہ تصرف نافذ العمل قرار پا جاتا ہے)۔ ہمارے اصحاب نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ پچھلی شریعتوں کے بارے میں خبر دی گئی ہے کیا وہ ہمارے لئے بھی شریعت کا درجہ

رکھتی ہے کہ نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔

والدہ کے قدموں میں جنت

۴۹۳۹: وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ جَاهِمَةَ اَنَّ جَاهِمَةَ جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرَدْتُّ اَنْ اَغْزُوَوَقَدْ جِئْتُ اَسْتَشِيْرُكَ فَقَالَ هَلْ لَكَ مِنْ اُمٍّ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَالْزَمْهَا فَاِنَّ الْجَنَّةَ عِنْدَ رِجْلِهَا۔ (رواه احمد والنسائي والبيهقي في شعب الايمان)

أخرجه النسائي في السنن ١١/٥ الحديث رقم ٣١٠٤، واحمد في المسند ٤٢٩/٣ والبيهقي في شعب الايمان ١٧٨/٦ الحديث رقم ٧٨٣٣۔

ترجمہ: حضرت معاویہ بن جاہمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں جہاد میں شرکت کرنا چاہتا ہوں آپ کی خدمت میں مشورہ کے لئے حاضر ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہاری والدہ ہے؟ عرض کیا جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے پاس رہو کیونکہ جنت اس کے قدموں کے پاس ہے۔ (احمد نسائی بیہقی)

تشریح: جاهمة: کہا گیا ہے کہ یہ جاہمہ ابن العباس بن مرداس سلمی تھے۔

قوله: فان الجنة عند رجلها: مطلب یہ ہے کہ تم جہاد میں جانا چاہتے ہو، اور ''ان الجنة تحت ظلال السيوف'' والی فضیلت حاصل کرنا چاہتے ہو، تو تم جہاد میں جانے کے بجائے ماں کے قدموں میں پڑے رہ کر اس کی اطاعت وخدمت کرنا زیادہ ضروری سمجھو کیونکہ ماں کی اطاعت وخدمت جنت میں جانے کا ذریعہ ہے جیسا کہ خطیب نے ''الجامع'' میں حضرت انس سے نقل کیا ہے: الجنة تحت أقدام الأمهات۔ اس جملہ (عند رجلها) کے ذریعہ بطور کنایہ اس تواضع وانکساری اور عاجزی وانکساری کو بیان کرنا مقصود ہے جس کا حکم اولاد کو دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ [الاسراء ٢٤]

''اور ان (والدین) کے سامنے شفقت سے عاجزی کے ساتھ جھکے رہو''۔ ممکن ہے کہ رسول اللہ کو ان ماں بیٹے کا حال پہلے سے معلوم ہو اس لئے آپ نے فرمایا کہ تم اپنی ماں کی خدمت کو لازمی سمجھو۔ کہ ان کے لئے یہی اولیٰ تھا۔

تخریج: منذری کا کہنا ہے کہ اس حدیث کو ابن ماجہ اور نسائی نے بھی ذکر کیا ہے۔ اور یہ الفاظ نسائی کے ہیں۔ امام حاکم کا کہنا ہے کہ یہ روایت صحیح الاسناد ہے۔

حدیث باب میں ماں کے ذکر پر اکتفاء کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ماں کی خدمت اولیٰ ہے، اسی وجہ سے دوسری حدیث ''الجنة تحت اقدام الامهات'' میں بھی ماں ہی کے ذکر پر اکتفاء کیا۔

طبرانی نے سند جید کے ساتھ ایک روایت ان الفاظ میں ذکر کی ہے: قال: اتيت النبي ﷺ استشيره في الجهاد، فقال النبي ﷺ: ''ألك الوالدان؟'' قلت: نعم قال: الزمهما فان الجنة تحت ارجلهما'' اھ۔ والد کی خدمت بھی بلا شبہ دخول جنت کا ایک ذریعہ ہے۔

والد کی پسند کو اپنی پسند پر ترجیح دو

۴۹۴۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَتْ تَحْتِي اِمْرَاَةٌ اُحِبُّهَا وَكَانَ عُمَرُ يَكْرَهُهَا فَقَالَ لِي طَلِّقْهَا فَاَبَيْتُ فَاَتٰى عُمَرُ رَسُوْلَ اللّٰهِ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهٗ فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلِّقْهَا۔

(رواه الترمذی وابو داؤد)

أخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۵/۵ الحدیث رقم ۵۱۳۸، والترمذی فی ۲۹٤/۳ الحدیث رقم ۱۱۸۹ و ابن ماجه فی ۶۷۵/۱ الحدیث رقم ۲۰۸۵۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میری ایک بیوی تھی جس سے مجھے محبت تھی حضرت عمرؓ اسے ناپسند کرتے تھے اسی وجہ سے مجھے فرمایا اسے طلاق دے دو۔ میں نے طلاق دینے سے انکار کر دیا تو حضرت عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے اور اس سلسلہ میں عرض کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا کہ اسے طلاق دے دو۔ (ترمذی' ابوداؤد)

اسنادی حیثیت:

فقال طلقها: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ فرمانا کہ ''اس عورت کو طلاق دے دو'' استحباب کے طور پر تھا یا اگر اس عورت کو طلاق دلوانے کا کوئی شرعی سبب تھا (کہ اس بناء پر ابن عمر رضی اللہ عنہما کا اس عورت سے علیحدگی اختیار کرنا ضروری تھا تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا) مذکورہ ارشاد وجوب کے طور پر ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام نسائی اور ابن ماجہ نے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں بھی روایت کیا ہے۔ (نقله میرك عن المنذری)

والدین کا اولاد پر حق

۴۹۴۱: وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا حَقُّ الْوَالِدَيْنِ عَلٰى وَلَدِهِمَا قَالَ هُمَا جَنَّتُكَ وَنَارُكَ۔ (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجه فی السنن ۱۲۰۸/۲ الحدیث رقم ۳۶۶۲۔

ترجمہ: حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص کہنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! والدین کا اولاد کے ذمہ کیا حق ہے؟ ارشاد فرمایا وہ دونوں تیری جنت اور دوزخ ہیں۔ (ابن ماجہ)

تشریح: جنتك ونارك: (یہاں مضاف محذوف ہے۔ ای: اسبابهما مطلب یہ ہے کہ والدین کی رضامندی اور خوشنودی کو بہر صورت ملحوظ رکھا جائے جو جنت میں جانے کا ذریعہ ہے۔ اور ان کی نافرمانی سے اجتناب کیا جائے جو دوزخ میں جانے کا ذریعہ ہے۔ اور یہ ایسا نہیں ہے کہ جو بعض حقوق میں منحصر ہو۔ پس یہ جواب نا صرف یہ کہ سوال کے عین مطابق ہے بلکہ اس میں مبالغہ بھی ہے۔ ''جنتك ونارك'' کا خطاب عام ہے۔ اور سائل مخاطب اول ہے۔

طیبی فرماتے ہیں، کہ اس موقع پر یہ جواب حکیمانہ اسلوب سے تعلق رکھتا ہے۔ (ورنہ اصل کلام بظاہر یوں ہوتا) حقهما

البر والاحسان الیھا وترك العقوق الموجبان لدخول الجنة وعدا 'وترك الاحسان والعقوق الموجبان لدخول النار وعیدا۔ پس نبی کریمؐ نے اپنے کلام میں ایجاز برتا۔

والدین کی خدمت سے محروم کا موت کے بعد مداویٰ

۴۹۴۲: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَمُوْتُ وَالِدَاهُ اَوْ اَحَدُهُمَا وَاِنَّهُ لَهُمَا لَعَاقٌّ فَلَا يَزَالُ يَدْعُوْلَهُمَا وَيَسْتَغْفِرُلَهُمَا حَتّٰى يَكْتُبُهُ اللّٰهُ بَارًّا۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/٢٠٢ الحديث رقم ٧٩٠٢۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کسی آدمی کے والدین فوت ہو جائیں یا ان میں سے ایک فوت ہو جائے اور یہ اب تک ان کا نافرمان تھا تو وہ ان کے لئے ہمیشہ دعا اور استغفار کرتا رہے تو آخر کار اللہ تعالیٰ اسے نیکوں میں لکھ دیتا ہے۔ (بیہقی)

تشریح: لھما ای لأجلھا أولأ حدھما ۔ جار مجرور'' عاق'' کے متعلق ہے۔ اور اختصاص کی وجہ سے مقدم ہے۔'' لعاق ''میں لام تاکید کا ہے۔

قولہ: حتی یکتبه الله: یعنی اللہ تعالیٰ ملائکہ کو حکم دے گا کہ اس کے دیوان عمل میں اس کو نیکوکار'' لکھ'' دو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ان الحسنات یذھبن السیئات﴾ ارشاد نبوی ہے:''التائب من الذنب کمن لا ذنب له''۔ اس فضیلت کے حصول میں ایک اور شرط بھی ہے، وہ یہ کہ اولاد والدین کی نافرمانی کے گناہ سے توبہ بھی کرے۔ چونکہ یہ بھی حقوق اللہ میں سے ہے، لہٰذا توبہ ضروری ہے۔ تاکہ'' بار'' بن سکے۔

والدین کے نافرمان کے لئے دوزخ کے دو دروازے

۴۹۴۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَصْبَحَ مُطِيْعًا لِلّٰهِ فِيْ وَالِدَيْهِ اَصْبَحَ لَهٗ بَابَانِ مَفْتُوْحَانِ مِنَ الْجَنَّةِ وَاِنْ كَانَ وَاحِدًا فَوَاحِدًا وَمَنْ اَصْبَحَ عَاصِيًا لِلّٰهِ فِيْ وَالِدَيْهِ اَصْبَحَ لَهٗ بَابَانِ مَفْتُوْحَانِ مِنَ النَّارِ اِنْ كَانَ وَاحِدًا فَوَاحِدًا قَالَ رَجُلٌ وَاِنْ ظَلَمَاهُ؟ قَالَ وَاِنْ ظَلَمَاهُ وَاِنْ ظَلَمَاهُ وَاِنْ ظَلَمَاهُ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/٢٠٦ الحديث رقم ٧٩١٦۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص رضائے الٰہی کی خاطر والدین کی اطاعت کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھول دیتا ہے اور اگر ایک ہو تو ایک دروازہ اور جو شخص اپنے والدین کا نافرمان ہو اس کے لئے دوزخ کے دو دروازے کھل جاتے ہیں اور اگر ایک ہو تو ایک دروازہ۔ اس شخص نے عرض کیا اگرچہ وہ اس پر ظلم کریں۔ فرمایا اگرچہ وہ اس پر ظلم کریں، ظلم کریں، ظلم کریں۔ (بیہقی)

تشریح: في والديه: (یہاں مضاف محذوف ہے۔) ای: في حقهما۔ اور ایک نسخہ میں "في والده" ہے۔ گویا کہ یہاں جنس مراد ہے قطع نظر کرتے ہوئے مرد و عورت ہونے اور بعض کا کہنا ہے کہ نسب کا صیغہ ہے جس طرح کہ "تامر" اور "لابن" ہے۔ چنانچہ یہ ماں باپ دونوں کو شامل ہے۔ پس (ملاعلی قاری) کہتا ہوں اس کے باوجود یہ ضروری ہے کہ اس سے مراد جنس ہو تا کہ اگلا کلام یعنی "أصبح له بابان" درست ہو سکے۔

من الجنة: "بابان" کی صفت ثانی ہے یا "مفتوحان" کی ضمیر سے حال ہے (ذکرہ الطیبی)۔

وان كان: اور ایک نسخہ میں "فان كان" ہے۔

وان كان واحدا فواحدا: کی معنوی تقدیر یوں ہے: فان كان الوالد المطاع واحدا فكان الباب المفتوح واحدا.

حدیث سے معلوم ہوا کہ ماں باپ کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا اور ان کی نافرمانی سے یا ایذاء رسانی سے اجتناب کرنا مستقل طاعت نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس لئے ان کی اطاعت و فرمانبرداری یا ان کی نافرمانی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری یا اس کی نافرمانی کرنا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے باب سے ہے: ﴿ان الذين يؤذون الله و رسوله﴾ [الاحزاب۔۵۷] (ذکرہ الطیبی) میں (ملاعلی قاری) کہتا ہوں اس کی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے بھی ہوتا ہے: لا طاعة لمخلوق في معصية الخلق۔ بلکہ وہ ان کی اطاعت کرے گا اور اس طاعت سے اس کی نیت اللہ تعالیٰ کی رضا نہیں ہوگی تو وہ "نیکوکار" نہیں ہوگا۔

قوله: وان ظلماه: حضور ﷺ کے اس جملہ کو تین بار فرمانا ماں باپ کی اطاعت و فرمانبرداری کی اہمیت کو ظاہر کرنے اور ان کے حقوق کو ادا کرنے کی تاکید کو زیادہ سے زیادہ شدت کے ساتھ بیان کرنے کی بنا پر تھا
تاہم واضح رہے کہ ظلم سے مراد وہ ظلم ہے جس کا تعلق دنیاوی معاملات سے ہو نہ کہ دینی امور سے (کیونکہ ماں باپ کی ایسی اطاعت و فرمانبرداری جائز نہیں ہے جس سے دین کی مخالفت اور شرعی احکام و مسائل کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔)

تخریج: اس روایت کو ابن عساکر نے بھی ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ البتہ ابن عساکر کی روایت واحدا فواحدا تک ہے۔

ایک نظر پر مقبول حج کا ثواب

۴۹۴۴: وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ وَلَدٍ بَارٍّ يَنْظُرُ اِلٰى وَالِدَيْهِ نَظْرَةَ رَحْمَةٍ اِلَّا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِكُلِّ نَظْرَةٍ حَجَّةً مَبْرُوْرَةً قَالُوْا وَاِنْ نَظَرَ كُلَّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةً قَالَ نَعَمْ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَاَطْيَبُ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ١٨٦/٦ الحديث رقم ٧٨٥٦۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ~~ہے کہ~~ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بھلائی کرنے والا بیٹا جب والدین کو بنظر

محبت دیکھے تو اللہ تعالیٰ اس ایک نظر کے بدلے مقبول حج کا ثواب لکھتے ہیں۔صحابہ کرامؓ نے سوال کیا اگر چہ ہر روز سو مرتبہ دیکھے آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! اللہ تعالیٰ بہت بڑے اور پاکیزہ ہیں۔(بیہقی)

تشریح: قوله: وان نظر كل يوم مائة مرة: اى أ يكون كذلك۔صحابہ کرام کا یہ کلام ان کے استبعاد کو ظاہر کرتا ہے۔کہ ہر نظر کے بدلے ایک مقبول نفلی حج کا ثواب لکھا جاتا ہے۔صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگر چہ وہ دن بھر میں سو مرتبہ دیکھے۔حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں! اللہ بہت بڑا ہے' اس کی شان عظمت' کبریائی تصور سے بڑھ کر ہے' اور اس کی خیر احصار' وحصر سے بھی بڑھ کر ہے۔یعنی ان کو یہ بات متبعد لگی کہ آدمی کو اپنے ماں باپ کی طرف ایک مرتبہ نظر بھر کر دیکھنے سے ایک حج کا ثواب ملتا ہے' اگر چہ وہ سو بار دیکھے۔اللہ اکبر کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا یہ جو اعتقاد ہے کہ یہ اعداد کثیرہ اس کے لئے نہیں لکھا جائے گا اور نہ اس پر ثواب دیا جائے جو اطیب ہے۔

اطیب۔ اللہ کی ذات ہر قسم کے قصور و کوتاہی سے منزہ ہے، اس کی مشیت وارادہ ہر طرح کے نقصان سے مبرّا ہے۔اس مقام پر طیبیؒ کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

اس پر اشکال یہ ہے: کہ ''اطیب''، اللہ کی صفت ہے، نا کہ ثواب کی۔واللہ اعلم

والدین کی نافرمانی کی سزا موت سے پہلے

۴۹۴۵: وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ الذُّنُوْبِ يَغْفِرُ اللّٰهُ مِنْهَا مَاشَآءَ اِلَّا عُقُوْقَ الْوَالِدَيْنِ فَاِنَّهٗ يُعَجِّلُ لِصَاحِبِهٖ فِي الْحَيٰوةِ قَبْلَ الْمَمَاتِ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/١٩٧ الحديث رقم ٧٨٩٠۔

ترجمہ: حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جس گناہ کو چاہیں معاف فرما دیں سوائے والدین کی نافرمانی کے۔کیونکہ یہ ایسا عمل ہے جس کی سزا اس کے مرتکب کو موت سے قبل دی جاتی ہے۔(بیہقی)

تشریح: قوله: يغفر الله منها: اس ''من'' کے بارے میں دو احتمال ہیں:

1 یہ من ''تبعيضيه'' ہے۔ اى: من جملتها۔ 2 زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ من ''بیانیہ'' ہے۔

في الحياة قبل الممات: یہاں عبارت میں حذف واقع ہوا ہے۔بایں طور کہ لام، مضاف الیہ کے عوض میں ہے۔ ای: في حياة العاق قبل مماته، دوسری تقدیر یوں ممکن ہے: في حياة الوالدين قبل مماتهما۔

پہلا احتمال: جو شخص ماں باپ کی نافرمانی کے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اسے اپنے اس گناہ کی سزا اپنی موت سے پہلے اسی دنیا میں بھگتنی پڑتی ہے اس کی سزا کو آخرت تک مؤخر نہیں کیا جاتا۔دوسرا احتمال: اس دنیا کی زندگی کا تعلق ماں باپ سے ہو یعنی جو والدین اپنی اولاد کی طرف سے نافرمانی کا دکھ سہتے ہیں وہ اپنی زندگی ہی میں اس اولاد کو اپنے گناہ کی نافرمانی کی سزا بھگتتے دیکھ لیتے ہیں

تیسرا احتمال: والدین کے حقوق کے مذکورہ بالا حکم میں تمام حقوق العباد شامل ہوں اور اس لئے بھی کہ اس طرح کی وعید اہل ظلم یعنی

ناحق کے بارے میں وارد ہوئی ہے (یعنی جس طرح ماں باپ کے حقوق ادا نہ کرنے والی اولاد اس گناہ کی سزا دنیا میں پاتی ہے اسی طرح ہر وہ شخص بھی اسی دنیا میں سزایاب ہوتا ہے جو بندوں کے حقوق کو پامال کرتا ہے چنانچہ حکومت وقت کے خلاف بلا کسی شرعی وقانونی وجہ کے بغاوت کرنے والے اور ناحق ظلم کرنے والے کے بارے میں مذکورہ بالا طرح کی وعید منقول ہے۔)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''من'' تبعیضیہ ہے، محل نصب میں مجازاً ''یغفر'' کا مفعول ہے۔''ما شاء'' اس سے بدل ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ''من'' ابتدائیہ ہو'' یغفر'' کے متعلق ہو اور ''ما شاء'' مفعول ہو'' کل الذنوب'' میں استغراق ہے۔ ای: کل فرد فرد من أفراد الذنوب مغفور اذا تعلقت مشیئة الله تعالٰی به الا عقوق الوالدین۔ یہ حدیث تغلیظ وتشدید پر محمول ہے اور'' یعجل '' کا مفعول ''العقوبة'' محذوف ہے، جس پر سیاق کلام دلالت کر رہا ہے۔اھ۔

ابن الملکؒ نے بھی طیبیؒ کی اتباع کی ہے۔لیکن ان دونوں حضرات کی عبارت میں خطأً فاحش ہے۔ چونکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ'' عقوق الوالدین '' کی مغفرت مستثنیٰ ہے اگرچہ اللہ کی مشیت اس کے متعلق ہو۔

حالانکہ ایسا نہیں ہے، چونکہ حدیث میں ''ما شاء'' کا لفظ ''شرک'' کے اخراج کیلئے ہے فقط۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء: ۴۸] چنانچہ اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے: کل فرد من أفراد الذنوب التي قد یتعلق به مشیئة اللّٰه تعالٰی مغفور الا عقوق الوالدین، چونکہ غالب یہی ہے، کہ مغفرت کی مشیت کا تعلق اس کے ساتھ نہیں ہوگا۔اور یہ مفہوم انتہائی زجر وتہدید پر محمول ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ عبارت کی تقدیر یوں ہے: الا عقوقهما ، چونکہ عقوق کے ساتھ مشیت کا تعلق مطلق نہیں ہے۔اس صورت میں یہ وعید وتشدید پر محمول ہے۔ چونکہ آنحضرت ﷺ کے کلام کو کسی ایسے محمل پر محمول نہیں کیا جا سکتا، کہ جس کا ظاہر کلام اللہ سے مناقض ہو۔ حالانکہ اللہ جل شانہ کا فرمانا یہ ہے کہ اس کی مشیت کا تعلق شرک کے علاوہ گناہوں سے ہے۔

بڑا بھائی بمنزلہ والد ہے

۴۹۴۲: وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَقُّ كَبِيْرِ الْاِخْوَةِ عَلٰى صَغِيْرِهِمْ حَقِّ الْوَالِدِ عَلٰى وَلَدِهٖ ۔ (روى البيهقي الاحاديث الخمسة في شعب الايمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦ / ٢١٠ الحديث رقم ٧٩٢٩۔

ترجمہ: حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بڑے بھائی کا حق چھوٹے بھائی پر اس طرح ہے جیسا کہ والد کا حق اولاد پر ہوتا ہے۔ یہ پانچوں روایات بیہقی میں ہیں۔

تشریح: قوله: حق الوالد علی ولده:

(یہاں حرف تشبیہ محذوف ہے۔) ای کحقه علیهم اس میں تشبیہ بلیغ ہے۔ الجامع کی روایت میں'' کحق الوالد علی ولده'' کے الفاظ آئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

بَابُ الشَّفْقَةِ وَالرَّحْمَةِ عَلَى الْخَلْقِ

بنی نوع انسان پر شفقت ورحمت کا بیان

شفقة، اسم ہے اشفاق سے ماخوذ ہے۔ اشفاق کا معنی ہے خوف۔ شفقة اس عنایت ومہربانی کو کہتے ہیں جس میں خوف بھی ہو۔ چونکہ ''مشفق'' کو ''مشفق علیہ'' سے محبت ہوتی ہے اور اس کو ''مشفق علیہ'' کے بارے دنیاوی اور اخروی مشقت کا خوف بھی ہوتا ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: اشفق ای حاذر.

الفصل الاول:

جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا

۴۹۴۷: عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳۵۸/۱۳ الحدیث رقم ۷۳۷۶ و مسلم فی ۱۸۰۹/٤ الحدیث رقم (۶۶-۲۳۱۹)، والترمذی فی السنن ۲۸٤/٤ الحدیث رقم ۱۹۲۲ و ابن ماجه فی ۱۳۵٤/۲ الحدیث رقم ۳۶۶۵، واحمد فی المسند ۳۵۸/٤۔

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جو شخص لوگوں پہ رحم نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر رحمت نہ فرمائیں گے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قولہ: لا یرحم اللّٰہ: اس جملہ کے دو معنی بیان کیے گئے ہیں:

پہلا مطلب یہ اخبار ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ بد دعا ہے۔ اور مطلب یہ ہوگا: انه لا یکون من الفائزین بالرحمة الکاملة، والسابقین الی دار الرحمة والافرحمته وسعت کل شیء.

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: دوسری رحمت حقیقت پر محمول ہے اور پہلی رحمت مجاز پر محمول ہے۔ چونکہ رحمت کی اسناد جب مخلوق کی طرف ہو، تو اس کے معنی تعطف ورقت کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان معنی کا حمل اللہ جل شانہ کی ذات پر درست نہیں۔ رحمت کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف ہو، تو ''مرحوم'' سے رضا کے معنی پر محمول ہوتا ہے، چونکہ جس کے لئے دل میں رقت ہوتی ہے، اس

سے راضی بھی ہوتا ہے۔ یا انعام یا ارادہ خیر پر محمول ہے۔ چونکہ مَلِک جب اپنی رعایا پر مہربان ہوتا ہے، اوران کیلئے اس کا دل نرم ہوتا ہے، توان کے ساتھ انعام واکرام کا معاملہ کرتا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو احمد، شیخین، ابوداؤد اور ترمذی رحمہم اللہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

حضرت جریر سے مروی شیخین کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: **من لا يرحم لا يرحم.** حضرت جریرؓ سے مروی احمد و شیخین اور ترمذی کی ایک روایت، اور ابوسعیدؓ سے مروی احمد و ترمذی کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

من لا يرحم الناس لا يرحمه الله.

حضرت جریرؓ سے مروی طبرانی کی ایک روایت میں: **من لا يرحم من في الأرض لا يرحمه من في السماء** کے الفاظ، اور دوسری روایت میں **من لا يرحم لا يرحم، ومن لا يغفر لا يغفر له، ومن لا يتب لا يتب عليه** کے الفاظ آئے ہیں۔ (**كذا في الجامع الصغير، ولم يذكر فيه لفظ المشكوة**). واللہ اعلم

میں شفقت تمہارے دل میں ڈال نہیں سکتا

۴۹۴۸: **وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَآءَ اَعْرَابِيٌّ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ اَتُقَبِّلُوْنَ الصِّبْيَانَ فَمَا نُقَبِّلُهُمْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَاَمْلِكُ لَكَ اَنْ نَزَعَ اللّٰهُ مِنْ قَلْبِكَ الرَّحْمَةَ.** (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٤٢٦ الحديث رقم ٥٩٩٨ و مسلم في ٤/١٨٠٨ الحديث رقم ٦٤/٢٣١٧ و ابن ماجه في السنن ٢/١٢٠٩ الحديث رقم ٣٦٦٥۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک دیہاتی حاضر ہو کر عرض کرنے لگا تم لوگ بچوں کو چومتے ہو مگر ہم نہیں چومتے تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر تیرے دل سے اللہ تعالیٰ نے رحمت کو نکال دیا ہو تو مجھے اس کے تمہارے دم میں ڈالنے کا کچھ اختیار نہیں۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **الى رسول الله**: اور ایک نسخہ میں **الى النبي** کے الفاظ آئے ہیں۔

عرضِ مرتب:

ہمارے نسخہ میں بھی یہی الفاظ ہیں۔ اھ۔

ان نزع: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ''ان'' اور فعل مل کر بتاویل مصدر ہو کر موضع ظرف میں واقع ہے۔ ایک نسخہ میں ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ (''اِن'') ہے۔ اس صورت میں یہ ''اِن'' شرطیہ ہے، اور ماقبل جملہ کی جزاء پر دال ہے۔

اشرفؒ فرماتے ہیں: یہ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے یہ ''اَن'' مصدریہ ہے، اور مضاف محذوف ہے۔ ای: **لا أملك لك دفع نزع الله من قلبك الرحمة** یا تقدیری عبارت یوں ہے: **لا أملك لك ان أضع في قلبك ما نزعه الله منه من الرحمة**، اور ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اس صورت میں یہ حرف شرط ہوگا اور جزا محذوف ہوگی جو ماقبل کی جنس سے ہے۔ ای: **ان نزع الله من قلبك الرحمة لا أملك لك دفعه ومنعه.**

أتقبلون الصبیان: ہمزہ انکاری ہے۔ ای: ان کنتم تقبلونهم فما نقبلهم. اس اعرابی کا یہ کہنا از راہ استکبار تھا، یا برائے استحقار تھا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''فما نقبلهم'' میں فاء استبعادیہ ہے. ای: أتفعلون ذلك وهو مستبعد عندنا؟ میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں کہ بظاہر استبعاد کے معنی استفہام سے مفہوم ہو رہے ہیں، نا کہ فاء سے' چونکہ فاء کے یہ معنی معروف نہیں ہیں۔

قوله: فقال النبی ﷺ: او أملك لك الرحمة: ہمزہ استفہام انکاری کیلئے ہے اور واؤ عاطفہ ہے، یا برائے رابطہ ہے۔

بیٹی آگ سے آڑ بنے گی

۴۹۴۹: وَعَنْهَا قَالَتْ جَاءَتْنِي امْرَأَةٌ وَمَعَهَا ابْنَتَانِ لَهَا تَسْأَلُنِي فَلَمْ تَجِدْ عِنْدِي غَيْرَ تَمْرَةٍ وَاحِدَةٍ فَأَعْطَيْتُهَا إِيَّاهَا فَقَسَمَتْهَا بَيْنَ ابْنَتَيْهَا وَلَمْ تَأْكُلْ مِنْهَا ثُمَّ قَامَتْ فَخَرَجَتْ فَدَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَدَّثْتُهُ فَقَالَ مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ فَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ۔

(متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٤٢٦ الحديث رقم ٥٩٩٥ و مسلم في ٤/٢٠٢٧ الحديث رقم ١٤٧-٢٦٢٩، والترمذي في السنن ٤/٢٨٢ الحديث رقم ١٩١٥ وابن ماجه في ٢/١٢١٠ الحديث رقم ٣٦٦٨، واحمد في المسند ٦/٣٣۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک عورت اپنی دو بیٹیوں کو ساتھ لیے میرے ہاں آئی اس وقت میرے پاس سوائے ایک کھجور کے کچھ نہ تھا میں نے وہ کھجور اسے دے دی اس نے وہ کھجور ان کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دی اور خود نہ کھائی پھر اٹھ کر چلی گئی اتنے میں نبی اکرم ﷺ تشریف لائے تو میں نے وہ واقع آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص ان بیٹیوں میں مبتلا کر دیا جائے اور وہ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے تو وہ اس کے لئے آگ سے آڑ بن جائیں گی۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ''من ابتلی من هذه البنات بشیء: یہ تعبیر اس لئے اختیار فرمائی کہ عام طور پر لوگ بچیوں کو پسند نہیں کرتے۔ اور بچیوں کی وجہ تخصیص شاید یہ ہے کہ وہ احسان کی زیادہ محتاج ہوتی ہیں' بنسبت' بچوں کے' پس جو شخص بچیوں کو عار لاحق ہونے میں ڈھال بنے گا تو اس کا پورا بدلہ یہ ہے کہ اس کو جہنم کی آگ سے ڈھال فراہم کی جائے گی۔

مصابیح کے ایک شارح فرماتے ہیں: قوله: من بلی من الابلاء من هذه البنات شیئا ای بشیء. اور مسلم کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: من ابتلی من هذه البنات بشیء. یہی الفاظ درست ہیں۔

تورپشتیؒ کا کہنا ہے، کہ'' من ابتلی من هذه البنات بشیء ''ہی کے الفاظ صحیح ہیں۔ اور صاحب مصابیح نے جس روایت کو اختیار کیا ہے، اس میں اکثر لوگوں کو لفظ'' شیئا '' کی وجہ سے مغالطہ لگ جاتا ہے۔ اور باء کی جگہ یاء بھی مروی ہے۔ یعنی ''الولایة'' سے ماخوذ فعل استعمال ہوا ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور درست الفاظ'' من بلی من هذه البنات

بشیء ''ہیں۔اھ۔ان کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ دوسری روایت یا تو'' ابتلی '' ہے، جیسا کہ مشکوۃ میں ہے۔یا'' بلی '' ہے، جیسا کہ مصابیح میں ہے، جب کہ درست لفظ'' بشیء ''ہیں۔'' شیئاً'' کو منصوب پڑھنا خطا ہے،اور اسی طرح یلی (یعنی یاء کے ساتھ، و لایة سے ماخوذ مان کر) پڑھنا تصحیف بلکہ تحریف ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: بخاری، حمیدی، بیہقی اور شرح السنہ کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: من ابتلی من هذه البنات بشیء.مصابیح کی روایت کے الفاظ'' من بلی من هذه البنات شیئا '' کے الفاظ پر ہمیں''اصول'' میں واقفیت نہیں ہو سکی۔اھ۔

من ابتلی: صیغہ مجہول کے ساتھ،اور'' بشیء ''ابتلی کے متعلق ہے،'' من'' بیانیہ اپنے مجرور کے ساتھ مل کر'' شیء '' سے حال ہے۔اور'' هذه '' کا اشارہ جنس کی طرف ہے۔

قوله: فأحسن الیهن کن له سترا: یعنی ان بچیوں کی کفو میں شادی کرادی جائے'اور بہتر یہ ہے کہ''احسان'' میں عموم رکھا جائے

اس بارے میں اختلاف ہے کہ ابتلاء وآزمائش محض لڑکیوں کا ہونا ہے یا بچیوں سے کسی ایسی بات کا صدور ہونا جو کہ باعث آزمائش ہو۔یا ان پر خرچ کرنے کے معاملہ میں تنگی کی آزمائش کا سامنا ہو

اس طرح اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ احسان وسلوک سے مراد وہ نان ونفقہ ہے جو باپ پر واجب ہوتا ہے یا اس واجب نان ونفقہ کے علاوہ مزید حسن سلوک کرنا مراد ہے۔بظاہر دوسرے معنی زیادہ صحیح ہیں۔کہ مذکورہ احسان وسلوک کی شرط یہ ہے کہ وہ شریعت کے موافق ہو۔

اور ظاہر یہ ہے کہ بچیوں کے ساتھ احسان وسلوک کرنے کا مذکورہ اجر اس صورت میں حاصل ہوتا ہے جبکہ اس احسان و سلوک کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ بچیاں اپنی شادی بیاہ کی وجہ سے یا کسی اور صورت میں باپ کی کفالت اور اس کے احسان وسلوک سے بے نیاز ہو جائیں۔

تخریج: احمد اور ترمذیؒ نے بھی اس روایت کو مشکوۃ کے الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے (علی ما فی الجامع الصغیر).**قوله : فلم تجد عندی غیر تمرة واحدة فاعطیتها ایاها:** حضرت عائشہؓ نے اس کو وہی ایک کھجور دے دی۔ایک کھجور کو انہوں نے حقیر شئے نہیں جانا، چونکہ ان کے سامنے یہ مسلمہ حقیقت تھی: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ [الزلزلة:۷] اور دوسری طرف آنحضرت ﷺ کا فرمان تھا: اتقو النار ولو بشق تمرة۔

دو بیٹیوں کی پرورش والا قیامت کو میرے ساتھ ہوگا

۴۹۵۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَآءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَنَا وَهُوَ هٰكَذَا وَضَمَّ اَصَابِعَهٗ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ٤/٢٠٢٧ الحدیث رقم [illegible]، والترمذی فی السنن ٤/٢٨١ الحدیث رقم ١٩١٤۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' جس شخص نے دو بیٹیوں کی تربیت کی یہاں تک کہ وہ بلوغت کو پہنچیں وہ قیامت کے دن میرے ساتھ اس طرح ہوگا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں انگلیوں کو اس طرح ساتھ ملایا۔ (مسلم)

تشریح: قوله: جاء يوم القيامة انا وهو هكذا: جملہ حالیہ ہے بغیر واؤ کے' ای جاء مصاحباله

وضم اصابعه: صیغہ اگرچہ جمع کا ہے' مگر مراد تثنیہ ہے۔ ای: أصبعيه.

تخریج: جامع صغیر میں ہے:

من عال جاريتين حتى تدركا دخلت انا وهو الجنة كهاتين. اس حدیث کو امام مسلم و ترمذی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے' اور ابو داؤد نے سند حسن کے ساتھ ابو سعید سے یوں روایت کیا ہے: من عال ثلاث بنات فأدبهن وزوجهن وأحسن اليهن فله الجنة.

مساکین پر خرچ کرنے والا مجاہد کی طرح ہے

۴۹۵۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّاعِیْ عَلَى الْاَرْمَلَةِ وَالْمِسْكِيْنِ كَالسَّاعِیْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَحْسِبُهٗ قَالَ كَالْقَائِمِ لَا يَفْتُرُ وَكَالصَّائِمِ لَا يُفْطِرُ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٤٣٧ الحديث رقم ٦٠٠٧ و مسلم في ٤/٢٢١٦ الحديث رقم (٤٢-٢٩٨٢)، والترمذي في السنن ٤/٣٠٥ الحديث رقم ١٩١٩، والنسائي في ٥/٨٦ الحديث رقم ٢٥٧٧ و ابن ماجه في ٢/٧٤٤ الحديث رقم ٢١٤٠، واحمد في المسند ٢/٣٦١۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیوگان اور مساکین پر خرچ کرنے والا اس طرح ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ خوب دوڑ دھوپ کرنے والا۔ راوی کہتا ہے کہ میرے خیال میں آپ نے یہ لفظ فرمائے کہ وہ اس قیام اللیل کرنے والے کی طرح ہے جو اس سے کبھی نہ تھکے اور اس صائم النھار کی طرح ہے جو ہمیشہ روزہ رکھے۔

تشریح: الأرملة: میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ''ارملة'' وہ خاتون کہ جس کا شوہر نہ ہو، خواہ کنواری ہو، کہ بیوہ۔ اور بعض نے یہ قید اضافی لگائی ہے کہ خواہ وہ غنی ہو کہ فقیرہ ہو۔ ملا علی قاریؒ نے اس قید کو' فيه بُعد '' سے تعبیر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ اگرچہ حدیث کا ظاہری اطلاق ہر دو کو شامل ہے، مگر غنی کا مراد ہونا بعید ہے۔ ابن قتیبہؒ لکھتے ہیں: سميت أرملة لما يحصل لها من الارمال وهو الفقر وذهاب الزاد بفقد الزوج. يقال أرمل الرجل اذا فنى زاده.

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں: ''أرملة'' کے مفہوم سے ''غنيه'' کو خارج کرنے کیلئے یہ ایک لطیف ماخذ ہے۔

المسکین: فقیر بھی اسی حکم میں شامل ہے، بلکہ بعض کے نزدیک وہ بطریق اولی اس مفہوم میں شامل ہے۔

الساعی: امام نوویؒ لکھتے ہیں: المراد بالساعي الكاسب لها العامل لمؤنتهما.

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: '' الساعي على الأرملة'' کے معنی وہی ہیں، جو امام نوویؒ نے تحریر کئے ہیں، چونکہ نبی کریم علیه

الصلوۃ والسلام نے لفظ" الساعی "کو "علی "کے ذریعے متعدی کیا ہے، اس تقدیر پر یہ" انفاق "کے معنی کو متضمن ہوگا۔
اھ۔ اس عظیم الشان ثواب کی وجہ یہ ہے کہ مال "شقیق الروح" ہے۔ اس کے خرچ کرنے میں مخالفت نفس ہے، اور رب کی رضا کا مطالبہ ہے۔

أحسبہ: سین کے کسرہ اور فتحہ ہر دو کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے بمعنی "أظنہ" ہے۔

لا یفتر:" فتور" سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی ہیں: الملل والکسل. باب نصر سے آتا ہے، جیسا کہ مفاتیح میں ہے۔ اور باب ضرب سے بھی آتا ہے، جیسا کہ قاموس میں ہے۔ اکثر نسخوں میں باب نصر سے ہے، اور یہی معتمد ہے۔

اشرف فرماتے ہیں: کالقائم...... الصائم کا "ال" تعریف کیلئے نہیں ہے، چنانچہ ان کے بعد والا اگلا جملہ ان کی صفت ہے۔ جیسا کہ شاعر کا یہ شعر:

ولقد أمر علی اللئیم یسبنی

امام طیبی لکھتے ہیں: یہ دونوں" صوم بالنہار "اور" قیام باللیل "سے عبارت ہیں۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں:" نہارہ صائم ولیلہ قائم "اس سے مراد" دوام" ہوتا ہے۔

وأحسبہ: یہ کلام کس کا ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔

ان الفاظ کی نسبت حضرت عبداللہ بن سلمہ قعنبیؒ کی طرف کی جاتی ہے جو بخاری و مسلم کے شیخ اور اس حدیث کے راوی ہیں جس کو انہوں نے حضرت امام مالکؒ سے روایت کیا ہے اس بات کی صراحت امام بخاریؒ نے کی ہے بہر حال ان الفاظ کے ذریعہ حضرت عبداللہ بن سلمہؒ کا مطلب یہ ہے کہ میرا گمان ہے کہ اس حدیث کے راوی حضرت امام مالکؒ نے یہ الفاظ کالقائم لا یفتر...... الخ نقل کئے تھے

(لیکن اگر بخاری کی مذکورہ صراحت سامنے نہ ہو تو) مصابیح اور مشکوۃ کے ظاہری الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس مقولہ کا قائل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ "احسبہ" کے ذریعہ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ میرے گمان کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کالقائم لا ...... الخ کے الفاظ بھی ارشاد فرمائے تھے

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس موقع پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنے اس شک کو ظاہر کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے" کالساعی فی سبیل اللہ" کے الفاظ ارشاد فرمائے تھے یا "کالقائم لایفتر" کے الفاظ ارشاد فرماتے تھے چنانچہ اس کی تائید جامع صغیر کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو احمد، شیخین، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہؒ سے نقل کیا گیا ہے اور جس کے الفاظ یوں ہیں: الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاهد فی سبیل الله أو القائم اللیل الصائم النهار۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ" أو" بمعنی "بل" ہو۔ واللہ اعلم۔

یتیم کا کفیل جنت میں میرے قریب ہوگا

۴۹۳۹: عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيْمِ لَهُ وَلِغَيْرِهٖ

فِي الْجَنَّةِ هٰكَذَا وَاَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى وَفَرَّجَ بَيْنَهُمَا شَيْئًا۔ (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۰/۴۳۶ الحديث رقم ۶۰۰۵ و مسلم في ۴/۲۲۸۷ الحديث رقم (۴۲-۲۹۸۳) و ابوداوٗد في السنن ۵/۳۵۱ الحديث رقم ۵۱۵۰، والترمذي في ۴/۲۸۳ الحديث رقم ۱۹۱۸ و مالك في الموطأ ۲/۹۴۸ الحديث رقم ۵من كتاب الشعر، واحمد في المسند ۲/۳۷۵۔

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرمایا اور ان کے مابین ذرا سا فاصلہ رکھا۔

تشریح: **الیتیم:** وہ نابالغ کہ جس کا باپ وفات پا گیا ہو۔ یہ لفظ مذکر و مؤنث ہر دو کیلئے مستعمل ہے۔ اور ''کافل'' سے مراد ''مربی'' ہے۔ کہا گیا ہے کہ انسانوں میں سے ''یتیم'' وہ ہے کہ جس کا باپ مرجائے اور جانوروں میں سے ''یتیم'' وہ ہے جس کی ماں مرجائے۔

له ولغيره: یہ واؤ بمعنی ''او'' ہے۔ أی: او كائنا لغيره .

أنا: مبتدا ہے۔ ''كافل اليتيم'' معطوف ہے۔ **في الجنة:** ''انا'' مبتدا کی خبر ہے۔

هكذا: منصوب على المصدرية ہے، خبر کے متعلق کیلئے۔ اس میں قرب کی طرف اشارہ ہے۔

صاحب النہایہ لکھتے ہیں: **الكافل هو القائم بأمر اليتيم المربي له، وهو من الكفيل بمعنى الضمين.**

اور کہا گیا ہے کہ ''کافل الیتیم'' کا مصداق وہ شخص ہے جو یتیم کی دیکھ بھال کرے، اس کی پرورش کرے، اس پر خرچ کرے خواہ یتیم کے مال سے ہو۔ واللہ اعلم۔

اور ''له ولغيره'' کی ضمیر غائب ''کافل'' کی طرف راجع ہے۔

''وہ یتیم خواہ اس کا ہو یا کسی اور کا'' کے ذریعہ اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ مطلق یتیم کی کفالت و پرورش کرنے کی فضیلت ہے، وہ یتیم خواہ اس کا اپنا پوتا، پڑپوتا اور پڑپوتے کے اگلی اولاد ہو، یا بھتیجا وغیرہ، یا خواہ کسی اجنبی کی اولاد ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کے ذریعہ اشارہ کر کے واضح کیا کہ جنت میں میرے اور یتیم کی پرورش کرنے والے کے درمیان اتنا قریب علاقہ ہوگا جتنا کہ ان دونوں انگلیوں کے درمیان ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں انگلیوں کی کشادگی کے ذریعہ اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ مرتبہ نبوت جو سب سے اعلیٰ درجہ ہے اس کے اور سخاوت و مروّت کے مرتبہ کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔

قوله: هكذا واشار...... : امام طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ راوی نے ان دو انگلیوں کے ذریعہ نبی کریمؐ کے مافی الضمیر میں موجود ''انضمام'' کے معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ ''هكذا'' کا بیان ہے۔ اھ۔ اور ظاہر یہ ہے کہ ''هكذا'' فرماتے وقت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی انگلیاں ملائی ہوں گی۔ چنانچہ راوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کو اپنے اس قول ''واشار'' الخ سے تعبیر کیا ہے۔ چونکہ راوی کے لئے یہ متصور نہیں تھا کہ وہ نبی کریمؐ کے مافی الضمیر کی طرف اشارہ کرتا۔

تخریج: جامع صغیر میں لکھتے ہیں: أنا و كافل اليتيم في الجنة هكذا۔اس حدیث کواحمد، بخاری، ابوداؤد اور ترمذی نے سہل بن سعد سے روایت کیا ہے۔اھ۔اس کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشکوٰۃ کی روایت میں " له و لغيره " کے الفاظ حضرت سہل کا کلام ہے، یا ان کے بعد کے کسی راوی کا ادراج ہے۔ یا ایک مستقل حدیث ہے اور زیادتی مقبول ہے۔ البتہ" وأشار" یہ حضرت سہل بن سعد ہی کا کلام ہے، اور شاید کہ صاحب جامع نے اختصار کی خاطر ترک کردیا ہے۔ واللہ اعلم

مسلمان باہمی محبت میں ایک جسم کی طرح ہیں

۴۹۵۳: وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ اِذَا شْتَكٰى عُضْوًا تَدَا عٰى لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٤٣٨ الحديث رقم ٦٠١١ ومسلم في ٤/١٩٩٩ الحديث رقم (٦٦-٢٥٨٦) واحمد في المسند ٤/٢٩٨۔

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم مسلمانوں کو باہمی رحمت ومحبت میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے کہ جب اس کا ایک عضو بیمار پڑ جائے تو دوسرے اعضاء ایک دوسرے کو بخار اور بے خوابی کی طرف بلاتے ہیں۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: توادهم: دال مشددہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

تداعى له: صاحب النہایہ لکھتے ہیں: كان بعضه دعا بعضًا. ومنه قولهم: تداعت الحيطان اى تساقطت او كادت .اھ۔ تداعی کے اصل معنی ہیں: أن يدعو بعضهم بعضًا ليتفقوا على فعل شيىء.

السهر: دونوں حرفوں کے فتحہ کے ساتھ ہے' بے خوابی۔

عضوا: تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔اى اذا تألم الجسد من جهة ذلك العضو۔ اور ایک نسخہ میں۔" اذا شكى عضو" مرفوع ہے اى اذ' تألم عضو من أعضاء جسده۔

جس طرح جب بدن کا کوئی ایک عضو دکھتا ہے تو سارا بدن اس دکھ سے متاثر ہوتا ہے اور محض ایک عضو میں تکلیف ہونے سے پورا جسم تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے اسی طرح مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ ایک جسم کی مانند ہو جائیں کہ اگر کسی ایک بھی مسلمان کو کوئی گزند پہنچے تو سارے مسلمان اس کے دکھ میں شریک ہوں اور سب مل کر اس کی تکلیف ومصیبت کو دور کرنے کی تدبیر کریں۔

ایک مسلمان کی تکلیف تمام مسلمانوں کی تکلیف ہے

۴۹۵۴: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُؤْمِنُوْنَ كَرَجُلٍ وَاحِدٍ وَاِنِ اشْتَكٰى

عَيْنُهُ اشْتَكٰى كُلُّهُ وَاِنْ اشْتَكٰى رَأْسُهُ اشْتَكٰى كُلُّهُ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/ ٢٠٠٠ الحديث رقم (٦٧-٢٥٨٦)، واحمد في المسند ٤/ ٢٧٦۔

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمام مؤمن ایک شخص کی طرح ہیں اگر اس کی آنکھ دکھے تو تمام جسم بیمار ہو جاتا ہے اور اگر درد محسوس کرے تو تمام جسم درد محسوس کرتا ہے۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: اشتکی عینہ: "عینہ" مرفوع ہے، اور ایک نسخہ میں منصوب ہے۔ یہی اختلاف مابعد کے مرفوعات میں بھی ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمدؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

ایک مؤمن دوسرے کے لئے دیوار کی مانند ہے

۴۹۵۵: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْیَانِ یَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا ثُمَّ شَبَّكَ بَیْنَ اَصَابِعِهٖ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/ ٤٤٩ الحديث رقم ٦٠٢٦ و مسلم في صحيحه ٤/ ١٩٩٩ الحديث رقم (٦٥-٢٥٨٥)، والنسائي في السنن ٥/ ٧٩ الحديث رقم ٢٥٦٠، واحمد في المسند ٤/ ٤٠٤۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن دوسرے مؤمن کے لئے دیوار کی مانند ہے جس کا بعض حصہ دوسرے کے ساتھ مضبوط ہوتا ہے پھر آپ ﷺ نے اپنی مبارک انگلیوں کی ایک دوسرے میں ڈال کر شبیک کی۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: المؤمن للمؤمن: "ال" جنسیہ ہے۔ اور مراد بعض ہے ای: بعض المؤمن للبعض. (ذکرہ الطیبی)۔ اور ممکن ہے، کہ استغراق کیلئے ہو۔ ای: کل مؤمن لکل مؤمن۔ اور اظہر یہ ہے کہ پہلا "ال" عہد ذہنی کا ہے، اور دوسرا جنس کا ہے۔ ای: المؤمن الکامل لمطلق المؤمن.

یشد بعضہ بعضا: ① یہ جملہ حالیہ ہے۔ ② یہ جملہ صفت ہے۔ ③ یہ جملہ مستانفہ ہے، اور وجہ شبہ کا بیان ہے۔ اور یہی اظہر ہے۔

ثم شبک بین أصابعہ: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ جملہ وجہ شبہ کیلئے بیان کی طرح ہے: أی شدّا مثل هذا الشد قوی وہ ہے جو ضعیف کو مضبوط و قوی کرے' حاصل معنی یہ ہے کہ معاملہ خواہ دین کا ہو یا دنیا کا' مؤمن کو قوت اپنے مسلمان بھائی سے حاصل ہے' جس طرح مکان کے

اجزاء اور تمام حصے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر پورے مکان کو مضبوط و پختہ بناتے ہیں

امام نوویؒ لکھتے ہیں: اس حدیث سے یہ معمول ہوا کہ:

① حقوق مسلمین کی تعظیم کس قدر ہے۔

۞ ہمارا دین غیر گناہ اور غیر مکروہ کاموں میں باہمی تراحم وملاطفت وتعاون پر ابھارتا ہے۔

۞ کسی بات کو عقل کے قریب تر کرنے کیلئے اس بات کو تشبیہ اور ضرب الامثال کے ساتھ سمجھانا جائز ہے۔

توضیح: امام میرکؒ نے فرمایا: اس روایت کو امام بخاریؒ نے تشبیک کے ساتھ، اور ترمذی، ونسائی نے بغیر تشبیک کے ذکر کیا ہے۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں: جامع صغیر میں بغیر تشبیک کے اس روایت کو شیخین، ترمذی اور نسائی کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے، کہ "مشبك" کی ضمیر کا مرجع حضرت ابوموسیٰ اشعری ہیں، پس جس نے اس کو روایت کیا ہے، مدرجاً ہی روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

ضرورت مند کا سفارشی اجر پائے گا

۴۹۵۲: وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا اَتَاهُ السَّائِلُ اَوْصَاحِبُ الْحَاجَةِ قَالَ اِشْفَعُوْا فَلْتُؤْجَرُوْا وَيَقْضِيْ اللّٰهُ عَلٰى لِسَانِ رَسُوْلِهٖ مَاشَآءَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۳/۴۴۸ الحدیث رقم ۷۴۷۶ و مسلم فی صحیحه ۴/۲۰۲۶ الحدیث رقم (۱۴۵-۲۶۲۷) و ابوداوٗد فی السنن ۵/۳۳۴ الحدیث رقم ۵۱۰۸، والترمذی فی ۵/۴۱ الحدیث رقم ۲۶۷۲، والنسائی فی ۵/۷۸ الحدیث رقم ۲۵۵۷، واحمد فی المسند ۴/۴۰۰۔

ترجمه: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی سائل یا ضرورت مند شخص آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے اس شخص کے لئے مجھ سے سفارش کرو تمہیں اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جو حکم چاہتا ہے جاری فرماتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: اذا اتاه السائل أو صاحب الحاجة قال: اشفعوا فلتؤجروا:

او صاحب الحاجة: اس "او" میں ایک احتمال یہ ہے کہ "تنویع" کیلئے ہو۔

فلتؤ جروا: ہمزہ ساکن ہے، واؤ سے بدلا بھی جاتا ہے۔ اگرچہ لام کے ساتھ ہے مگر امر مخاطب کا صیغہ ہے، جیسا کہ یہ آیت: ﴿قل بفضل الله وبرحمته فبذلك فليفرحو﴾ [یونس۔۵۸] قراءت عشرہ میں سے یعقوب کی روایت میں صیغہ خطاب کے ساتھ ہے۔ اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے، کہ یہ 'فافرحوا'' بھی پڑھا گیا ہے۔

اور "فاء" شرط کے معنی میں ہے، گویا کہ اصل کلام یوں ہے: ان شفعتم فتؤجروا.

المغنی میں لکھتے ہیں: لام طلبیہ کبھی معنی طلب سے نکل کر دوسرے معنی میں بھی مثلاً خبر میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہاں اس آیت مبارکہ میں: قل من كان في الضلالة فليمدد له الرحمٰن مدا اتبعوا سبيلنا ولنحمل خطاياكمای فيمد ونحمل. اھ۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس کے معنی ہوئے: اشفعوا وتؤجروا جیسا کہ ابن عساکر نے حضرت معاویہ سے روایت نقل کی ہے، علاوہ ازیں اگلی حدیث میں بھی آ رہا ہے۔

امام طیبیؒ لکھتے ہیں: "فلتؤجروا" کا فاء یا لام زائدہ ہے برائے تاکید ہے بلکہ دونوں ہی مؤکد ہیں۔ چونکہ اگر جواب امر

کے طور پر ''تو جروا'' فرما دیا جاتا تو کلام پورا ہو جاتا۔ اھ۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کی سفارش کرتے رہا کرو۔ خواہ تمہاری سفارش قبول کی جائے یا نہ کی جائے کیونکہ کسی کا کام ہونا یا نہ ہونا تقدیر الٰہی اور حکم خداوندی کے مطابق ہے لہٰذا تم اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ شاید میری سفارش قبول نہ ہو سفارش کرنے سے اجتناب نہ کرو اور اسکا ثواب ہاتھ سے نہ جانے دو۔

علی لسان رسوله: ممکن ہے، کہ یہ کلام نقل بالمعنی ہو۔ اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس کلام میں التفات ہو، جیسا کہ مظہرؒ کے کلام کا ظاہر ہے۔ اور مضاف کی زیادتی سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس کے علاوہ میں تو بطریق اولیٰ ہوگی۔

امام طیبیؒ نے لکھا ہے: یہ باب تجرید سے ہے، اس لئے کہ ظاہر یہ ہے کہ'' **علی لسانی** '' کہتے، تو گویا کہ آپ ﷺ کا ارشاد یوں ہے: **اشفعوا الی الخ** مجھ سے سفارش کرو۔ اور یہ مت کہو کہ کیا معلوم کہ رسول اللہ ﷺ ہماری شفاعت قبول فرمائیں گے، یا کہ نہیں؟ چونکہ اگر چہ میں اللہ کا رسول، اس کا نبی وصفی ہوں مجھے نہیں معلوم کہ میں تمہاری شفاعت قبول کروں گا، کہ نہیں؟ چونکہ ''قاضی'' تو اللہ ہے۔ اگر اس کا فیصلہ ہوا کہ میں شفاعت قبول کروں تو کرلوں گا وگرنہ نہیں۔ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اس قبیل سے ہے:

اعملوا فکل میسر لما خلق له.

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں: اس میں تلمیح وتلویح ہے، اس آیت کی طرف: ﴿**ما أدری ما یفعل بی ولا بکم**﴾

امام نوویؒ لکھتے ہیں: نیز اگر کوئی شخص کسی ایسے معاملہ میں ماخوذ ہو جو حد یعنی شریعت کی طرف سے متعین شدہ سزا کو لازم کرتا ہو تو اس صورت میں اس وقت سفارش کرنا جائز نہیں ہوگا جب کہ وہ معاملہ امام وقت تک پہنچ چکا ہو اگر وہ معاملہ امام تک نہ پہنچا ہو تو پھر سفارش کی جا سکتی ہے۔ ہاں تعزیری معاملات میں بہر صورت سفارش کرنا جائز ہے۔ نیز یہ ساری تفصیل اس صورت سے متعلق ہے جب کہ وہ شخص موذی و شریر نہ ہو جس کی سفارش کرنا مقصود ہے موذی اور شریر شخص کی سفارش کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔

تخریج: اس کو ابو داؤد، ترمذی اور نسائی نے (بھی) روایت کیا ہے۔ اور الجامع الصغیر میں ہے: **اشفعوا تؤ جروا ویقضی الله علی لسان نبیه ما شاء.** اس کو شیخین اور اصحاب کتب ثلاثہ نے روایت کیا ہے۔

ظالم کی مدد ظلم سے روکنا ہے

۴۹۵۷: **وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْمَظْلُوْمًا فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْصُرُهٗ مَظْلُوْمًا فَكَيْفَ اَنْصُرُهٗ ظَالِمًا قَالَ تَمْنَعُهٗ مِنَ الظُّلْمِ فَذَالِكَ نَصْرُكَ اِيَّاهُ۔** (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۳۲۳/۱۲ الحديث رقم ۶۹۵۲ و مسلم في ۱۹۹۸/٤ الحديث رقم (۶۲-۲۵۸٤)، والترمذي في السنن ٤۵۳/٤ الحديث رقم ۲۲۵۵، والدار مي في ٤۰۱/۲ الحديث رقم

۲۷۵۳، واحمد فی المسند ۳/۹۹۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم تو ایک شخص کہنے لگا مظلومیت کی حالت میں مدد تو سمجھ میں آتی ہے مگر ظالم ہونے کی حالت میں مدد کس طرح ہوگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے ظلم سے روکنا اس کے حق میں یہی تیری مدد ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: انصر أخاك ظالما أو مظلوما:

ظالما: مفعول سے حال ہے۔ او مظلوما: یہ ''او'' برائے تنویع ہے۔

مظلومًا: یہ حال ہے۔ ای حال کونہ مظلوما۔

قوله: متفق علیه: امام میرک ؒ فرماتے ہیں: یہ محل نظر ہے، چونکہ اس سیاق کے ساتھ یہ حدیث حضرت انس سے مروی ہے جس کو روایت کرنے میں امام بخاری متفرد ہیں۔ اور امام ترمذیؒ نے بھی روایت کیا ہے جیسا کہ امام جزریؒ نے بھی تصریح کی ہے۔ البتہ امام مسلمؒ نے حضرت جابرؓ سے ایک حدیث کے ضمن میں یوں روایت کیا ہے:

''ولینصر الرجل أخاه ظالمًا أو مظلومًا' ان کان ظالمًا فلینهه فانه له نصر، وان کان مظلوما فلینصره.

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں صاحب جامع صغیر کے صنیع سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

انصر أخاك ظالما أو مظلومًا' قیل: کیف أنصره ظالمًا؟ قال: تحجزه عن الظلم فان ذلك نصره.

اس حدیث کو احمد، بخاری اور ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ اور پھر فرمایا کہ دارمی اور ابن عساکر نے حضرت جابرؓ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

''انصر أخاك ظالما أو مظلوما' ان یك ظالما فاردده عن ظلمه، وان یك مظلوما فانصره.

دُنیا میں مسلمان کی تکلیف کا ازالہ قیامت کے دن کی تکلیف کے ازالہ کا باعث ہے

۴۹۵۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْلِمُ اَخُوالْمُسْلِمِ لَايَظْلِمُهٗ وَلَا يُسْلِمُهٗ وَمَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۵/۹۷ الحدیث رقم ۲۴۴۲ و مسلم فی ۴/۱۹۹۶ الحدیث رقم (۵۸۔۲۵۸۰)، والترمذی فی السنن ۴/۲۶ الحدیث رقم ۱۴۲۶۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ خود بھی اس پر ظلم نہ کرے اور نہ اسے رسواء کرے اور جو شخص اپنے بھائی کی حاجت میں کوشاں ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی حاجت پوری کرے گا اور جس نے کسی مسلمان سے تکلیف کا ازالہ کیا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکالیف میں سے ایک بڑی تکلیف کا ازالہ

فرمائیں گے اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔

(بخاری، مسلم)

تشریح: قوله: المسلم أخوا المسلم:

اس سے پتہ چلتا ہے، کہ ''مسلم'' اور ''مؤمن'' ایک ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿انما المؤمنون اخوة﴾ [الحجرات۔ ۱۰] یہ مجمل ہے، اور اس کا مابعد اس کی تفصیل ہے۔ اس وجہ سے ابو داؤد نے حضرت سوید بن حنظلہ سے اور ابن عساکر نے حضرت واثلہ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ اپنے مابعد کلام سے منقطع واقع ہوا ہے۔

اور حاصل یہ ہے کہ مسلمان وہ شخص ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ کوئی بھائی اپنے بھائی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ بلکہ ہر ممکنہ طور پر اس کو نفع پہنچاتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ترکیب تشبیہ کی قبیل سے ہو، اور مبالغہ مقصود ہو۔ جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں مروی ہے: لا یؤمن أحدکم حتی یحب لأخیه ما یحب لنفسه.

قوله: لا یظلمه: یہ نفی بمعنی نہی ہے، اور مطلب یہ ہے کہ مسلمان کیلئے مسلمان پر ظلم کرنا مناسب نہیں۔ ذمی اور مستامن کا بھی یہی حکم ہے۔ (کہ مسلمان ان پر بھی ظلم نہ کرے۔) واضح رہے کہ یہاں مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں۔ چونکہ کافر کے حق میں ظلم متصور نہیں۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ موجب یا وجہ شبہ کا بیان ہے۔ چونکہ ظالم اول تو رتبۂ نبوت سے ہی محروم ہے: ﴿لا ینال عهد الظالمین﴾. ثانیاً یہ کہ درجۂ ولایت سے بھی محروم ہے: ﴿الا لعنة الله علی الظالمین﴾. ثالثاً سلطنت سے محروم ہوتا ہے: لبیت الظالم خراب ولو بعد حین والمعاد رابعاً: مخلوق کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی: جبلت القلوب علی حب من أحسن الیها وبغض من أساء الیها

خامساً: اپنے نفس کی حفاظت سے عاری ہوتا ہے: ﴿ولکن کانوا أنفسهم یظلمون﴾

لا تظلمن اذا ما کنت مقتدرا
فالظلم آخره یأتیك بالندم
نامت عیونك والمظلوم منتبه
یدعو علیك وعین الله لم تنم

قوله: ولا یسلمه: از باب افعال ہے۔ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: یقال: أسلم فلان فلانا اذا ألقاه الی التهلکة ولم یحمله من عدوه، وهو عام فی کل من أسلمته الی شیء، لکن دخله التخصیص وغلب علیه الالقاء فی الهلکة، وقال بعضهم والهمزة فیه للسلب ای: لا یزیل سلمه وهو بکسر السین وفتحها الصلح.

قوله: من کان فی حاجة أخیه کان الله فی حاجته:

یہ کلام ''مشاکلت'' کی قبیل سے ہے۔ مسلم شریف میں مروی حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے: والله فی عون العبد ما کان العبد فی عون أخیه. حدیث مبارکہ کے اس جملہ سے اپنے مسلمان بھائی کی حاجت برآری کی فضیلت بھی معلوم ہوتی ہے۔ اور تنبیہ واشارہ ہے کہ اس حاجت برآری کی مکافات اللہ جل شانہ من جنسہ اپنی عنایت الٰہیہ سے عطا فرمائیں

گے خواہ وہ حاجت قلبی ہو کہ بدنی یا دونوں ہوں۔ حاجت برآری دو حال سے خالی نہیں، یا دفع مضرت ہوگی، یا جلب منفعت ہو گی، بہر حال مؤمن کی مدد کے زمرہ میں آتی ہے۔

قوله: من فرج عن مسلم كربةفرج الله عنه كربة۔۔۔:

ومن فرج: راء کی تشدید وتخفیف ہر دو کے ساتھ ہے اور ایک روایت میں من ''نفس'' ہے۔ دونوں بہر حال ہم معنی ہیں۔

عن مسلم كربة: ایک نسخہ میں ''من كرب الدنيا'' ہے مسلم شریف میں مروی حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں بھی اسی طرح ہے۔

كربة: کاف کے ضمہ کے ساتھ، بروزن فعلة، ''کرب'' سے مشتق ہے۔ وهي الخصلة التي يحزن بها. اس کی جمع ''کرب''، کاف کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔'' كربة'' کی تنوین افراد وتحقیر کیلئے ہے۔ ای: هما واحدا من همومها.

'' من '' تبعیضیہ ہے۔ ای بعض كربها. یا ابتدائیہ ہے. ای: كربة مبتداة.

من كربات يوم القيامة: کاف اور راء دونوں کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور ایک روایت میں ''من كرب يوم القيامة'' کے الفاظ ہیں۔

ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اور ان سے تکلیف کو دور کرنا ان کے ساتھ احسان ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿هل جزاء الاحسان الا الاحسان﴾ [الرحمن۔ ٦٠] یہ آیت جزاء، اس آیت: ﴿من جاء بالحسنة فله عشر أمثالها﴾ [الانعام۔ ١٦٠] کے منافی نہیں ہے۔ چونکہ نیکیوں کا بدل، مثل بھی ہوتا ہے، اور بڑھا چڑھا کر بھی دیا جاتا ہے، دس گنا، سو گنا، سات سو گنا اور بلا حساب بھی ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ قیامت کے دن کی تکلیفوں میں سے ایک ایک تکلیف دنیاوی تکلیفوں میں سے دس دس یا اس سے بھی زیادہ کے برابر ہوگی، چنانچہ اس مفہوم پر تنوین تعظیم اور'' يوم القيامة'' کی تخصیص دلالت کر رہی ہے۔ اور حاصل یہ ہے کہ مضاعفت کما ہوگی یا کیفاً ہوگی۔

قوله: من ستر مسلمًا ستره الله يوم القيامة:

مطلب یہ ہے کہ مسلمان بھائی کی ستر پوشی کرنے والے یا اس کے عیوب کو چھپانے والے شخص نے دنیا میں جو عیوب و گناہ کئے ہوں گے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے ان گناہ وعیوب کی پردہ پوشی کرے گا بایں طور کہ اہل موقف کے سامنے ظاہر نہیں کرے گا اس پر مواخذہ ومحاسبہ نہیں کرے گا اور نامہ اعمال کی پیشی کے وقت ان کا ذکر پوشیدہ طور پر ہوگا۔ یہ ستر پوشی کا حکم اس مسلمان کے بارے میں ہے جو فسادی معروف نہ ہو۔ وگرنہ ایسے فسادی مسلمان کا قصہ والی کے ہاں لے جانا چاہئے۔ پس جب اس کو دیکھے کہ وہ معیصت کا ارتکاب کر رہا ہے تو حسب قدرت اس پر نکیر کرے، اور اگر اس سے عاجز ہو تو اس کا معاملہ حاکم کے ہاں لے جائے بشرطیکہ اس پر کوئی فساد برپا نہ ہو۔ (کذا فی شرح مسلم للنووی)

اور ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:'' ستره الله في الدنيا والآخرة''. اس میں خفیہ اشارہ ہے کہ جو شخص اہل [illegible] کے مقامات وکرامات میں سے کسی شئی پر واقف ہو جائے تو چاہئے کہ اس راز کی حفاظت کرے اور اس کو چھپا کر رکھے،

چونکہ اغیار پر کشف اسرار کرنا، بابِ عنایت کو بند کر دیتا ہے، اور موجب حرمان ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی کا کہنا ہے:

من أطلعوه علی سر فباح به
لم یأمنوه علی الأسرار ما عاش

توضیح: یہ حدیث ایک طویل روایت کا ٹکڑا ہے، جس کو امام نوویؒ نے اپنی اربعین میں مسلم شریف کے حوالہ سے نقل کیا ہے وقد سبق ذکرہ فی الکتاب۔

مسلمان کا مال، جان اور آبرو سب دوسرے پر حرام ہے

۴۹۵۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا یَظْلِمُهٗ وَلَا یَخْذُلُهٗ وَلَا یَحْقِرُهُ اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا وَیُشِیْرُ اِلٰی صَدْرِهٖ ثَلٰثَ مِرَارٍ بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ اَنْ یَحْقِرَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهٗ وَمَالُهٗ وَعِرْضُهٗ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱۹۸۶/۴ الحدیث رقم (۳۲-۲۵۶۴) و ابوداوٗد فی السنن ۱۹۶/۵ الحدیث رقم ۴۸۸۲، والترمذی فی ۲۸۶/۴ الحدیث رقم ۱۹۲۷، واحمد فی المسند ۴۹۱/۳۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا: ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اسے نہ تو اس پر ظلم کرنا چاہیے اور نہ اسے ذلیل ہونے دے اور نہ اسے حقیر قرار دے آپ نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تقویٰ یہاں ہے اور یہ کلمہ تین بار دھرایا۔ انسان کیلئے یہ شر ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے مسلمان کی دوسرے مسلمان پر ہر چیز حرام ہے اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو و عزت۔ (مسلم)

تشریح: قوله: المسلم أخو المسلم لایظلمه:

عرضِ مرتب:

اتنے ٹکڑے کی تشریح پچھلی روایت کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

قوله: لا یخذله: ذال معجمہ کے ضمہ کے ساتھ، "خذلان" سے ماخوذ ہے۔ "خذلان" کا مطلب ہوتا ہے: اعانت ونصرت کو ترک کرنا۔

مسلمان:

قوله: ولا یحقره: "یحقره": حرف اول کے فتحہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ۔ اس کو ذلیل وحقیر نہ سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان بھائی کو نہ حقیر سمجھے، بایں طور کہ نہ اس کے عیوب ذکر کرے، نہ برے القاب سے پکارے، نہ اس کے ساتھ ٹھٹھا کرے، کسی کو پراگندہ حال دیکھے، یا کسی جسمانی آفت میں مبتلا دیکھے تو بھی اس کو حقیر نہ سمجھے۔ چونکہ ممکن ہے کہ وہ شخص پاکیزہ نفس ہو، اور دلی طور پر انتہائی متقی ہو، اور مبادا یہ شخص اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے ایسے شخص کی تحقیر کے باعث کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے عزت و وقار بخشا ہے۔

قوله: التقوی ههنا: مظہرؒ فرماتے ہیں: یعنی وہ متقی شخص جو شرک اور گناہوں سے اجتناب کرتا ہے اس کو حقیر و کمتر سمجھنا جائز نہیں ہے تقویٰ کا مصدر و مخزن اصل میں سینہ یعنی دل ہے (اور وہ ایک ایسی صفت ہے جو باطن کی ہدایت اور نورانیت سے پیدا ہوتی ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ ان الفاظ کا مقصد ماقبل جملہ کی تاکید و تقویت ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو چیز کسی انسان کو معزز و مکرم بناتی ہے وہ تقویٰ ہے) اور جب تقویٰ کا تعلق باطن سے ہے اور اس کی جگہ دل ہے جو ایک پوشیدہ چیز ہے کہ جس کو انسان ظاہری طور پر نہیں دیکھ سکتا تو پھر کسی مسلمان کو کیونکر حقیر و ذلیل کہا جا سکتا ہے۔ درآنحالیکہ اس کی حقیقت معلوم نہیں ہے

ایک بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ تقویٰ کی جگہ دل کو قرار دے کر اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ جس کے دل میں تقویٰ ہو وہ کسی مسلمان کو حقیر و ذلیل نہ کرے کیونکہ کوئی بھی متقی کسی بھی مسلمان کو ذلیل کرنے والا نہیں ہو سکتا

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی مسلمان ایسا کوئی کام نہ کرے اور نہ اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نکالے جس سے کسی مسلمان بھائی کی خونریزی ہو یا اس کا مال تلف و ضائع ہو اور یا اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچے۔

یہ حدیث (اپنے الفاظ کے اختصار لیکن مفہوم و معنی کی وسعت کے اعتبار سے) جوامع الکلم میں سے ہے۔ اور وہ ''فصل الخطاب'' ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی عطیہ ہے۔ (انتھی)

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿انما المؤمنون اخوة فأصلحوا بين أخويكم واتقوا الله﴾، ﴿اولئك الذين امتحن الله قلوبهم للتقوىٰ﴾۔

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: بعض عارفین فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ تقویٰ کی حقیقت میرے سینہ میں ہے اور اس کی فروع پوری مخلوق کے دلوں میں پھیلی ہوئی ہیں، چونکہ وہ آپؐ کا (سینہ) ''عین الجمع'' کا محل ہے اور ''کشوف غیبیہ'' کا آئینہ ہے۔ جیسا کہ آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے: ''انا اعلمكم بالله واخوفكم منه'۔ (اس میں) یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو معرفت میں بڑھا ہوا ہوگا وہ خشیت میں بڑھ کر ہوگا۔ اور کونین میں کوئی بھی آپؐ سے بڑھ کر صاحب معرفت نہیں ہے۔ مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: لكل شيئ معدن التقوى قلوب العارفين۔ چونکہ عارف اللہ تعالیٰ کی عظمت میں غائب ہوتا ہے وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بقاء کا شائق ہوتا ہے، وہ اس کی محبت میں ہوتا ہے۔ تقویٰ کا چشمہ اس کی معرفت کے سمندروں سے جاری ہوتا ہے، جو اس کی روح سے قلب کی طرف، اور اس کے قلب سے اس کے قالب کی طرف بہتا ہے۔ اور اس کا راز معدن توحید ہے۔ چونکہ اس میں تجلی ڈالتا ہے۔ اور اس کی روح معرفت کی ''کان'' ہے۔ چونکہ حق، وصف بقاء کے ساتھ اس میں اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس کا دل خشیت کی ''کان'' ہے۔ چونکہ وہ وصف کبریاء و عظمت کے ساتھ روشن ہوتا ہے۔ پس توحید ''عین القدم'' سے، معرفت ''عین البقاء'' سے اور تقویٰ ''عین الکبریاء'' سے ہے۔

قوله: ويشير الى صدره ثلث مرار اصول میں یہ عبارت اسی طرح ہے۔ بعض نسخوں میں تائے فوقیہ کے ساتھ (مرات) ہے۔ یہ جملہ واقع ہوا ہے دو جملوں کے درمیان، جن میں سے پہلا ''ولا يحقره'' اور دوسرا ''بحسب امریء'' ہے۔ یہ دونوں جملے احتقار کی ممانعت کو متضمن ہیں اور آپ یہ بات جانتے ہی ہیں کہ جملہ معترضہ تاکید میں واقع ہوتا ہے

اور راوی نے ماضی سے مضارع کی طرف عدول کیا' مشاہدہ سامع میں اس حالت کے استحضار کا اور اس حالت کے اہتمام کی خاطر۔

بحسب امرئ: مبتدا ہے، باء زائدہ ہے، اور "ان یحقروا خاہ": خبر ہے۔ چنانچہ تقدیری عبارت یوں ہوگی: حسبه وکافیه من خلال الشر، ورذائل الأخلاق تحقیر أخیه المسلم. (کذا ذکرہ الطیبی).اس عبارت سے یہ وہم ہوتا ہے کہ یحقر باب تفعیل سے ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ "اصول" میں یاء کے فتحہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

حَسْب کی نحوی تحقیق:

بعض محققین لکھتے ہیں: "حسب" واحد، تثنیہ جمع مذکر مؤنث سب کیلئے مستعمل ہے، چونکہ مصدر ہے۔
نحاۃ فرماتے ہیں: اس کا مابعد معرفہ ہو تو مرفوع ہوتا ہے خبر ہونے کی وجہ سے' یا مبتدا ہونے کی بناء پر، اور اضافت لفظی ہوتی ہے۔
اور اگر نکرہ ہو، تو یہ صرف مرفوع مبتدا ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، اور اضافت معنوی ہوتی ہے۔

عرضِ مرتب:

"حسب" کے دو استعمال معروف ہیں۔

پہلا استعمال: حسب بمعنی کفایۃ مستعمل ہے۔ اس کا اعراب اسکے موقع محل کے اعتبار سے ہوتا ہے۔

① کبھی صفت واقع ہوتا ہے، جیسے: مررت بعالم حسبك من عالم.
② کبھی حال واقع ہوتا ہے جیسے: هذا زید حسبك من مجتهد.
③ کبھی مبتدا واقع ہوتا ہے جیسے: ﴿حسبهم جهنم﴾.
④ کبھی حرف مشبہ بالفعل کا اسم واقع ہوتا ہے، جیسے: ﴿فان حسبك الله﴾ [الأنفال:۶۲]

دوسرا استعمال: یہ بمعنی "لا غیر" آتا ہے۔ چنانچہ یہ مبنی علی الضم ہوتا ہے۔ اور مختلف محل اعراب میں واقع ہوتا ہے:

① نعت واقع ہوتا ہے، جب کہ اسم کا ماقبل نکرہ ہو، جیسے: رأیت تلمیذا حسب.
② حال واقع ہوتا ہے، جب کہ اس کا ماقبل اسم معرفہ ہو، جیسے: شاهدت زیداً حسب.
③ کبھی اس پر فاء زائدہ بھی داخل ہوتی ہے، جیسے نجح طالب فحسب.

اس کی ترکیب یوں ہوگی: فاء حرف زائد، مبنی علی الفتح، لا محل له من الاعراب. "حسب" اسم، مبنی علی الضم، فی محل رفع نعت. (موسوعة النحو والصرف والاعراب، حسب، ص: ۳۴۹)۔

"عرض" سے مراد وہ چیز ہے کہ جس کی حفاظت شرعاً محبوب و مستحب ہو۔ چنانچہ عصبیت اور زمانہ جاہلیت والی عصبیت اس سے خارج ہے۔ بہت سے لوگوں نے انہی چیزوں کو ایک شیوہ بنا رکھا ہے، وہ اپنا مال بھی خرچ کرتے ہیں تو طلب جاہ کیلئے اور مخلوق خدا کے دل موہ لینے کیلئے۔ یہ تو خواہش نفسانی ہے، کہ جس کی اتباع کرنے والے ہلاک و برباد ہوگئے۔ لوگوں کو لوگوں نے ہی ہلاک کیا، اگر علماء انصاف کریں تو جان لیں کہ ان کو علوم و عبادات پر ابھارنے والی چیز صرف مراعاۃ الخلق ہے۔

یحییٰ بن معاذ فرماتے ہیں: ''ریاست ابلیس کے میدان ہیں، جن میں وہ راس کے لشکر پڑاؤ ڈالتے ہیں۔''
اور بعض کا کہنا ہے، کہ صدیقین کے دل و دماغ سے سب سے آخر میں رخصت ہونے والی چیز ''محبت جاہ'' ہے۔

حدیث کا حاصل:

اپنے کسی مسلمان بھائی کی عزت خراب نہ کرے۔ اپنے کسی بھی مسلمان بھائی کی غیبت نہ کرے، اس کو طعنہ نہ دے، اس پر تہمت نہ لگائے، اس پر سب وشتم نہ کرے، اس کو اشارہ نہ کرے، اس کی ٹوہ میں نہ لگے، اس کا راز افشاء نہ کرے، چونکہ جو شخص کسی کے پوشیدہ امور کی ٹوہ میں لگتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کی ٹوہ میں لگ جاتا ہے، اور رسوا کر ڈالتا ہے، اگر چہ وہ شخص اپنے گھر کی کسی کال کوٹھڑی ہی میں کیوں نہ ہو، اس سے مقابلہ باقی نہیں کرتا، ہر شخص کو خود سے افضل سمجھتا ہے۔ (صغیر) چھوٹے کو بایں طور افضل سمجھتا ہے، کہ اس نے اللہ کی نافرمانی نہیں کی۔ جب کہ یہ شخص نافرمانی کرتا ہے اور بڑے کو اس سبب سے کہ اس نے اللہ کی عبادت اس سے زیادہ کی ہے، اور عالم کو اس کے علم کے سبب سے اور جاہل کو (اس کی جہالت کی وجہ سے بایں طور)، کہ اس نے اگر چہ اللہ کی نافرمانی کی ہے، مگر جہالت کی وجہ سے کی ہے۔ لہٰذا عالم کی پکڑ اللہ تعالیٰ کی طرف سے زیادہ سخت ہے۔ چنانچہ مروی ہے: ويل للجاهل مرة، وويل للعالم سبع مرات. اور کافر کو اس طور پر افضل سمجھتا ہے کہ کیا معلوم خاتمہ بالخیر کس کا ہوتا ہے۔ اور سارا مدار تو خاتمہ پر ہی ہے۔ اللہ ہم سب کا خاتمہ الخیر پر فرمائے اور بلند مقامات سے نوازے۔

توضیح: یہ حدیث بھی ایک طویل روایت کا حصہ ہے۔ جس کو امام بغویؒ نے اپنی اربعین میں ذکر کیا ہے۔ اور بحوالہ امام مسلم حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً یوں روایت کیا ہے:

" لا تحاسدوا، ولا تناجشو، ولا تباغضوا، ولا تدابروا، ولا يبع بعضكم على بيع بعض، وكونوا عباد الله اخوانا، المسلم أخوا المسلم" (الحديث)

جنتی اور دوزخی لوگ

۴۹۶۰: وَعَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَهْلُ الْجَنَّةِ ثَلٰثَةٌ ذُوْسُلْطَانٍ وَمُقْسِطٌ مُتَصَدِّقٌ مُوَفَّقٌ وَرَجُلٌ رَحِيْمٌ وَرَقِيْقُ الْقَلْبِ لِكُلِّ ذِيْ قُرْبٰى وَمُسْلِمٍ وَعَفِيْفٌ مُتَعَفِّفٌ ذُوْعِيَالٍ وَاَهْلُ النَّارِ خَمْسَةٌ اَلضَّعِيْفُ الَّذِيْ لَازَبْرَلَهُ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْكُمْ تَبَعٌ لَا يَبْغُوْنَ اَهْلًا وَلَا مَالًا وَلَا الْخَائِنُ الَّذِيْ لَا يَخْفٰى لَهُ طَمَعٌ وَاِنْ دَقَّ اِلَّا خَانَهُ وَرَجُلٌ لَا يُصْبِحُ وَلَا يُمْسِيْ اِلَّا وَهُوَ يُخَادِعُكَ عَنْ اَهْلِكَ وَمَالِكَ وَذَكَرَ الْبُخْلَ وَالْكِذْبَ وَالشِّنْظِيْرَ الْفَحَّاشَ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٢١٩٧/٤ الحديث رقم (٦٣-٢٨٦٥)، واحمد في المسند ٢٦١/٤۔

ترجمہ: حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنتی لوگوں کی تین قسمیں ہیں: ① ایسا ... جو انصاف کرنے والا، صدقہ کرنے والا ... تعالیٰ کی طرف سے توفیق بخشا ہوا ہوا۔ ② ایسا شخص جو ہر قرابت

والے پر رحم کرنے والا اور نرم دل ہو۔ ③ وہ مؤمن جو پاکدامن، سوال سے بچنے والا اور عیالدار ہو۔ آپ نے فرمایا دوزخی پانچ طرح کے ہیں: وہ کمزور آدمی کہ جس کے پاس مال نہ ہو اور دوسروں کا تابع ہو اہل و مال کا طلبگار نہ ہو خیانت کرنے والا آدمی کہ جس کی حرص چھپی نہیں رہ سکتی اگر چہ اسے تھوڑی سی چیز ملے اور اس میں بھی خیانت کرے وہ آدمی جو صبح شام تم کو تمہارے گھر اور مال کے بارے میں دھوکہ دیتا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخیل یا جھوٹے اور بدخواور بیہودہ گالیاں بکنے والے آدمی کا بھی ذکر فرمایا اور ابوغسان نے اپنی روایت میں یہ ذکر نہیں کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خرچ کریں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی خرچ کیا جائے گا۔

تشریح: **قوله: أهل الجنة ثلاثة ذو سلطان مقسط متصدق موفق:**

ثلاثة: (کی ضمیر محذوف ہے۔) ای: **ثلاثة اجناس من الأشخاص.**

ذو سلطان کے کئی مطالب بیان کئے گئے ہیں: ① ای: ذو حکم. ② أی: السلطان. ③ ذو حجة.

"**مقسط**": مرفوع ہے' مضاف کی صفت ہے بمعنی عادل ہے۔ **اقسط یقسط** عدل کرنا، ہمزہ برائے سلب ہے، جیسا کہ" **شکا الیه فأشکاه**" میں۔ **قسط یقسط فهو قاسط**، ظلم کرنا۔

قوله: رجل رحیم رقیق القلب لکل ذی قربی و مسلم:

رقیق القلب: امام طیبیؒ لکھتے ہیں:" **رقیق القلب**" تفسیر ہے" **رحیم**" کیلئے. **أی یرق قلبه، ویرحم لکل من بینه وبینه لحمة القرابة او صلة الاسلام** اھ۔ اور بظاہر رحیم سے مراد صفت فعلیہ اور رقیق سے مراد صفت قلبیہ ہے صفت فعلیہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ صفت اپنا خارجی وجود بھی رکھے اور دوسروں پر اس کے اثرات ظاہر ہوں جبکہ صفت قلبیہ کا تعلق محض اس صفت کے باطنی وجود سے ہوتا ہے خواہ علمی اور خارجی طور پر اس کا اظہار ہو یا نہ ہو۔ دوسرا مفہوم اظہر ہے، چنانچہ دوسری صورت میں اعتبار قوت کا اور پہلی میں اعتبار فعل کا ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے، کہ" **رحیم**" کی رحمت کا تعلق معنی اعم سے ہو۔ جو شامل ہوگی، ہر انسان حیوان کو خواہ مؤمن ہو کہ کافر کہ جانور۔ چنانچہ دوسرا اخص ہوگا۔ اور حاصل یہ ہے کہ تاسیس، تاکید سے اولی ہے۔ **قوله: عفیف متعفف ذو عیال: عفیف**: مرفوع ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: آپ مختلف بندوں کے احوال کا استقراء کرلیں۔ آپ کوئی ایک بھی شخص ایسا نہ پائیں گے، جو اہل جنت میں سے ہو۔ مگر یہ کہ وہ انہی تین قسموں میں سے کسی قسم سے تعلق رکھتا ہوگا۔ ان قسموں سے خارج نہ ہوگا۔

قوله: اهل النار خمسة: اس سے پتہ چلتا ہے، کہ اہل جہنم کی تعداد زیادہ ہوگی۔

قوله: الضعیف الذی لا زبرله الذین هم فیکم تبع لایبغون اهلا و لا مالا:

لا زبر: زاء کے فتحہ اور بائے موحدہ کے سکون کے ساتھ بمعنی عقل ورائے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: **الزبر العقل والکمال والصبر والانتهار والمنع والنهی** اھ۔ یہاں تمام معنی مراد ہو سکتے ہیں۔

اور شرح السنۃ میں لکھتے ہیں: ای: **لا عقل له** اور غریبین میں لکھتے ہیں: کہا جاتا ہے: **ما له زبر ای عقل.**

ای لا رأی و لا عقل کاملا یعقله، ویمنعه عن ارتکاب ما لا ینبغي:

چنانچہ مروی ہے۔ الدنیا دار من لا دار له، ومال من لا ماله له، ولها یجمع من لا عقل له.

تورپشتیؒ فرماتے ہیں: یہ معنی درست نہیں، چونکہ جس کو عقل ہی نہ ہو مکلف کیوں کر ہوگا؟ چنانچہ اس پر ''اہل نار'' کا حکم کیسے لاگو ہوگا۔ میرے نزدیک توجیہہ یہ ہے کہ اس کی تفسیر ''تماسک'' کے ساتھ کی جائے۔ چونکہ اہل لغت کہتے ہیں: لا زبر له ای: لا تماسك له. یہ اصل میں مصدر ہے۔ چنانچہ معنی یہ ہوں گے: لا تماسك له عند مجیئ الشهوات فلا یرتدع عن فاحشة، ولا یتورع عن حرام.

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: تماسك بھی تو کمال عقل وصبر ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے کسی ایک پر محمول ہو گا۔ امام طیبیؒ نے عجیب وغریب بات کہی، وہ لکھتے ہیں:

غرابت یہ ہے کہ شیخ اور قاضیؒ کے کلام میں ایسی کوئی بات موجود نہیں ہے، کہ جو ایک مزید قسم پر دلالت کرے۔ وہ دونوں انتہاء علقمند ہیں، چہ جائیکہ یہ کہا جائے، کہ انہوں نے پانچ سے زیادہ قسمیں بنا کر نص پر زیادتی کی ہے۔ خصوصاً جب کہ اصول مشہورہ کے مطابق عاطف بھی موجود ہے۔ ان دونوں کی بیان کردہ تفسیر میں بھی کوئی ایسی بات نہیں کہ جو اس مفہوم پر دلالت کرتی ہو، جس کا وہم فاضل مصنف کو ہوا۔ چونکہ وصف سابق یا لاحق میں کوئی منافات نہیں ہے، بلکہ دوسرا پہلے کیلئے ممیز ہے۔ اور حاصل یہ ہے کہ قسم اول، جنس ضعیف ہے۔ أی هو جنس الضعیف فی أمر دینه الناقصون في عقولهم الذین هم فیکم تبع.

''تبع'': امام طیبیؒ لکھتے ہیں: مصابیح کے بعض نسخوں میں '' تبع '' مرفوع ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے۔ ظرف کا فاعل ہے۔ یا مبتدا ہے اور اس کی خبر ظرف ہے۔ اور جملہ ''هم'' کی خبر ہے۔'' تبع '' بعض نسخوں میں منصوب ہے۔ جب کہ حمیدی اور جامع الاصول میں ہے: اس تقدیر پر یہ خبر کی ضمیر مستتر سے حال ہوگا۔ اھ۔'' تبع'' بروزن'' قلم''، تابع کی جمع ہے۔ جیسا کہ خدم، ''خادمؑ'' کی جمع ہے۔

''لا یبغون'': تصحیح شدہ صحیح معتمد نسخوں میں یاء کے فتحہ' بائے موحدہ کے سکون اور غین معجمہ کے ضمہ کے ساتھ۔ (یعنی ثلاثی مجرد سے ہے۔) اور بعض نسخوں میں یاء کے فتحہ' تائے فوقیہ مشددہ مفتوحہ بائے موحدہ کے کسرہ اور عین مہملہ کے ساتھ ''اتباع'' مصدر سے ہے۔ (یعنی یَتَّبِعُونَ ہے' غین کی جگہ عین ہے اور باب افتعال سے ہے)۔ اور ایک نسخہ میں یاء کے ضمہ' تائے فوقیہ کے سکون' بائے موحدہ کے کسرہ اور عین مہملہ کے ساتھ ہے۔ اور امام نوویؒ فرماتے ہیں: لایتبعون بالعین المهملة یخفف ویشدد من االاتباع۔ اور بعض نسخوں میں ''یبغون ''غین معجمہ کے ساتھ ہے۔

قوله: والخائن الذی لایخفی له طمع وان دق الا خانه: طمع: مصدر بمعنی مفعول ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: ای لا یخفی علیه شيء مما یمکن ان یطمع فیه. حسن بصریؒ فرماتے ہیں: الطمع فساد الدین والورع صلاحه.

صاحب قاموس لکھتے ہیں: خفاه یخفیه أظهره ~~وخفی~~ کرضی لم یظهر اھ۔ چنانچہ'' لا یخفی ''میں فاء کے فتحہ

کے ساتھ پڑھنا معتمد ہے۔ البتہ روایت کسرہ کے ساتھ ثابت ہے۔ واللہ اعلم۔

قوله: ورجل لا يصبح الخ ولا يمسي الاوهو يخادعك عن أهلك ومالك:

"عن" باء سببیہ کے معنی میں ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں: ﴿وما ينطق عن الهوى﴾ [النجم-۳] (علی ما فی القاموس)۔

صاحب کشاف لکھتے ہیں: ﴿فازلهما الشيطان عنها﴾ أی: حملهما الشيطان على الزلة بسببها. اس آیت میں بھی "عن" باء سببیہ کے معنی میں ہے۔

قوله: وذكر البخل أو الكذب: اگر صحابی کو شک ہے تو ("ذکر" کا) فاعل نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، اور اگر شک تابعی کو ہے، تو فاعل عیاض بن حمار ہیں۔ اسی پر مزید قیاس کر لیا جائے۔

البخل او الكذب: تورپشتی فرماتے ہیں: بخل، "بخیل" کے معنی میں ہے، اور کذب، کذاب کے معنی میں ہے۔ (بالفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں، کہ)

لفظ بخل اور کذب مصدر قائم مقام فاعل ہیں۔ وذكر البخل والكذب..... الخ کے ذریعہ راوی نے یہ بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دوزخیوں کی جو قسمیں بیان فرمائی تھیں ان میں بخیل اور کاذب کا بھی ذکر فرمایا اور پوری عبارت کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ نے دوزخیوں کی مذکورہ قسمیں بیان فرمانے کے بعد فرمایا کہ دوزخیوں کی اور قسمیں بخیل و کاذب ہیں!

رہی یہ بات کہ راوی نے ذکر البخیل والکاذب کہنے کے بجائے ذکر البخل والكذب کیوں کہا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے جو ارشاد فرمایا تھا وہ بعینہ الفاظ میں راوی کو یاد نہیں رہا تھا البتہ صحیح طور پر یہ یاد تھا کہ آپ ﷺ نے باقی دو قسموں کے سلسلے میں جو الفاظ ارشاد فرمائے تھے ان میں بخل اور کذب کا ذکر ضرور تھا خواہ آپ ﷺ نے والبخیل والکاذب ہی کے الفاظ فرمائے ہوں یا کچھ اور الفاظ فرمائے ہوں۔

اکثر روایتوں میں البخل اور الكذب کے درمیان واؤ کے بجائے او ہے یعنی البخل او الكذب۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اس موقع پر راوی کو شک واقع ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یا تو "البخل" کا لفظ ارشاد فرمایا تھا یا الکذب کا یعنی راوی گویا یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے دوزخیوں کی تین قسمیں بیان کرنے کے بعد چوتھی قسم کے طور پر یا تو بخیل کو بیان کیا تھا یا کاذب کو

اور زیادہ صحیح بات بھی یہی ہے کہ یہاں حرف او ہے جو راوی کے شک کو ظاہر کرتا ہے اور جن روایتوں میں واؤ ہے ان میں بھی واؤ حرف او کے معنی میں

نیز لفظ والشنظير کو بھی مرفوع قرار دینا زیادہ صحیح ہوگا اور اس کا عطف رجل پر کیا جاتا ہے جب کہ بعض حضرات نے اس کو منصوب قرار دیا ہے۔

کامل مؤمن کون؟

۴۹۶۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱/ ۵٦ الحدیث رقم ۱۳ومسلم فی ۱/ ٦۸ الحدیث رقم (۷۲-٤۵)، والنسائی فی ۸/ ۱۲۵ الحدیث رقم ۵۰۳۹، والدارمی فی ۲/ ۳۹۷ الحدیث رقم ۲۷٤۰، واحمد فی المسند ۳/ ۲۵۱۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس خدا کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کوئی بندہ اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی مسلمان کے لئے وہی چیز نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: لا یؤمن عبد: یہاں کمال ایمان کی نفی مراد ہے۔ چنانچہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں سمجھا جائے گا جب تک کہ وہ اپنے بھائی مسلمان کے لئے اس چیز کو پسند نہ کرے جس کو خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

شرح مسلم میں امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "لا یؤمن" سے مراد ایمان تام ہے، وگرنہ تو اصل ایمان اس شخص کو بھی حاصل ہے جو اس وصف سے متصف نہیں۔ اور "یحب لأخیه" سے مراد طاعات ومباحات ہیں۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے، جو نسائی میں ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے: "لا یؤمن أحدکم حتی یحب لأخیه ما یحب لنفسه من الخیر"۔

شیخ ابوعمرو بن صلاح نے فرمایا: یہ حکم صعب وممتنع شمار ہوتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے چونکہ حدیث کا مطلب یہ ہے: حتی یحب لأخیه فی الاسلام مثل ما یحب لنفسه اھ۔ اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ مؤمنین ارواح کے اعتبار سے متحد ہیں، اور اجسام واشباح کے اعتبار سے متعدد ہیں۔ جیسا کہ ایک نور مختلف مظاہر میں ہوتا ہے، یا ایک نفس کہ جو متفرق اجسام میں ہوتا ہے، کہ اگر ایک درد محسوس کرتا ہے، تو سارے متاثر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اسی مفہوم کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے:

المؤمنون کرجل واحد' ان اشتکیٰ عینه اشتکی کله، وان اشتکی رأسه اشتکی کله۔

تخریج: اس روایت کا متفق علیہ ہونا معنوی اعتبار سے ہے، چنانچہ بخاری کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: " لا یؤمن احدکم" اور ایک نسخہ میں عبد ہے۔ اور ایک دوسری روایت میں " أحد " ہے بغیر قسم کے۔

اور مسلم کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے: والذی نفسی بیده لا یؤمن عبد حتی یحب لجاره ، او قال: لأخیه ما یحب لنفسه. بخاری ومسلم کی ان روایات کو پیش نظر رکھا جائے، تو معلوم ہوتا ہے، کہ مؤلف رحمہ اللہ کی ذکر کردہ روایت کے الفاظ نہ بخاری میں ہیں، اور نہ مسلم کے ہیں۔ اس روایت کو ترمذی، نسائی، اور ابن ماجہ نے بھی ذکر کیا ہے۔ (ذکرہ میرک رحمہ اللہ)۔

روایت کا صرف اتنا ٹکڑا لفظاً متفق علیہ ہے: لا یؤمن أحدکم حتی یحب لأخیه ما یحب لنفسه جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے اربعین میں ذکر کیا ہے۔ اور فرمایا: اس کو احمد، شیخین اور اصحاب کتب ثلثہ نے روایت کیا ہے۔

پڑوسی کو ایذاء دینے والا کامل مؤمن نہیں

۴۹۶۲: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَايُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَايُؤْمِنُ قِيْلَ مَنْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الَّذِىْ لَايَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٤٤٣ الحديث رقم ٦٠١٦۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے خدا کی اس شخص کا ایمان کامل نہیں ہے، قسم ہے خدا کی اس شخص کا ایمان کامل نہیں ہے، قسم ہے خدا کی اس شخص کا ایمان کامل نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا یا رسول اللہ! کون؟ فرمایا جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے مامون و محفوظ نہ ہو۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: والله لا يؤمن: یہاں بھی ایمان سے مراد ایمان کامل ہے یا وہ ایمان جو اپنے مبنیٰ و معنی کے مطابق ہو۔ یہ جملہ تین بار آیا ہے۔ اور مکرر لانے کی غرض تاکید ہے۔

عرضِ مرتب:

مزید تشریح اگلی حدیث کے تحت فرمایئے۔

پڑوسی کو ایذا دینے والا جنت میں نہ جائے گا

۴۹۶۳: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَا يَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ۔

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٦٨ الحديث رقم (٣٣-٣٦)، واحمد في المسند ٢/٣٧٣۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ مامون نہ ہو۔ (مسلم)

تشریح: بوائق: بائقة کی جمع ہے، جس کا مطلب ہے: الداهية (بری بات، مصیبت، شر وفساد)۔ صاحب النہایہ نے اس کی وضاحت ''غوائل و شرور'' کے ساتھ کی ہے۔

وعید کا سبب:

کمال ایمان یہ ہے کہ قرآن پر عمل ہو، اور اعمال قرآنی میں سے من جملہ یہ بھی ہے: ﴿وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ [النساء: ٣٦]

اس حدیث میں پڑوسیوں کے حقوق کو مبالغہ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، بایں طور کہ عدم امن از وقوع ضرر کو نفی دخول جنت کا سبب قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس شخص کا کیا حال ہوگا کہ جس کی طرف سے ضرر وشر متحقق ہو چکا ہو، (یعنی اس کی وجہ سے پڑوسی تکلیف میں ہوں۔)

پڑوسی کے حقوق کی شدید تاکید

۴۹۶۴: وَعَنْ عَآئِشَةَ وَابْنَ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَازَالَ جِبْرَئِيْلُ يُوْصِيْنِيْ بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَيُوَرِّثُهٗ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤٤١/١٠ الحديث رقم ٦٠١٤و٦٠١٥ومسلم في ٢٠٢٥/٤ الحديث رقم (١٤٠-٢٦٢٤)و(١٤١-٢٦٢٥) و ابوداؤد في السنن ٣٥٧/٥ الحديث رقم ٥١٥٢، والترمذي في السنن ٢٩٣/٤ الحديث رقم ١٩٤٢ و ابن ماجه في ١٢١١/٢ الحديث رقم ٣٦٧٣ واحمد في المسند ٥٢/٦و٨٥/٢۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جبرئیل امین مجھے پڑوسی کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے محسوس ہوا کہ وہ پڑوسی کو وارث بنادیں گے۔

(بخاری ومسلم)

تشریح: جبریل: اس لفظ میں چار قراءتیں ماقبل میں گذر چکی ہیں۔

سیورثہ: یہ لفظ راء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ اور تخفیف بھی درست ہے۔ (علی مافی القاموس) قصہ مختصر یہ کہ از باب سمع، افعال اور تفعیل سے استعمال ہوتا ہے۔ **ورث أباه ومنه بكسر الراء يرثه كيعد،** وارث ہونا۔ **اورثه جعله من ورثته،** وارث بنانا۔

اس حدیث سے ہمسایہ کے حقوق کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جس تواتر کے ساتھ حکم دیتے تھے اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ گمان ہونے لگا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام عنقریب یہ وحی لے کر نازل ہوں گے کہ پڑوسی آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہیں۔

تخریج: منذریؒ نے فرمایا: اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے بھی ان دونوں سے نقل کیا ہے۔ ابوداؤدؒ اور ابن ماجہ نے صرف حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

(ذکرہ میرک)

جامع صغیر میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو احمد، شیخین، ابوداؤد اور ترمذی نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ اور احمد، شیخین اور اصحاب اربعہ نے حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ اور بیہقی نے سند حسن کے ساتھ حضرت عائشہؓ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے: **"ما زال يوصيني جبريل بالجار حتى ظننت أنه يورثه، وما زال يوصيني بالمملوك حتى ظننت أنه يضرب له أجلاً أو وقتاً اذا بلغه عتق".**

تیسرے کو چھوڑ کو دو سرگوشی نہ کریں

۴۹۶۵: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كُنْتُمْ ثَلٰثَةً فَلَا

يَتَنَاجَى اثْنَانِ دُوْنَ الْاٰخَرِ حَتّٰى تَخْتَلِطُوْا بِالنَّاسِ مِنْ اَجْلِ اَنْ يُّحْزِنَهٗ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۸۲/۱۱ الحديث رقم ۶۲۹۰ و مسلم في ۱۷۱۸/۴ الحديث رقم (۳۷-۲۱۸۴)، والترمذي في السنن ۱۱۷/۵ الحديث رقم ۲۸۲۵ والدارمي في ۳۱۷/۲ الحديث رقم ۲۶۵۷ و مالك في الموطأ ۹۸۹/۲ الحديث رقم ۱۴۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم تین ہو تو تیسرے کو چھوڑ کر دو باہمی سرگوشی نہ کرو۔ یہاں تک کہ تم مجمع میں خلط ملط ہو جاؤ کیونکہ یہ بات اسے پریشان کرے گی۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: **یحزنہ**: یاء کے فتحہ اور زاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں یاء کے ضمہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ ہے، یہ دونوں فصیح لغات ہیں۔ پہلی لغت اشہر و اکثر ہے۔ بعض حضرات نے یہ لفظ یاء اور زاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ ضبط کیا ہے، یہ خطا ہے۔ چونکہ یہ فعل لازم ہے، اور یہاں متعدی ہے۔ ضمیر فاعل "تناجی" کی طرف اور ضمیر مفعول "آخر" کی طرف عائد ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ یہ نہی کی علت کا بیان ہو۔ أی: **لا تناجوا لئلا یحزن صاحبك**. اور یہ بھی ممکن ہے کہ فعل منہی عنہ کی علت ہو۔ ای: **لا ینبغی ان یصدر منکم تناج ھو سبب للحزن**. چنانچہ معلوم ہوا کہ "تناجی" کی دو قسمیں ہیں: ① ممنوعہ تناجی. ② غیر ممنوعہ تناجی. روایت میں پہلی "تناجی" مراد ہے۔ اور دلیل یہ روایت ہے: **فأن ذلك یحزنه**۔

خطابیؒ فرماتے ہیں: یہ رنجیدگی دو وجہ سے ہو سکتی ہے:

① دوسرے کو بعض مرتبہ یہ وہم ہوتا ہے، کہ شاید یہ لوگ میرے ساتھ کوئی مکاری کرنا چاہتے ہیں۔

② اختصاص بالکرامۃ کا شبہ ہوتا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: "**حتی یختلطو**" سے دوسرے قول کی تردید ہو رہی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تین آدمی ایک ساتھ مثلاً کہیں بیٹھے ہوئے ہیں تو ان میں سے کسی بھی دو آدمیوں کے لئے یہ روا نہیں ہے کہ وہ آپس میں اس طرح سرگوشی کریں کہ ان میں کا تیسرا آدمی ان کی بات کو سننے نہ پائے' اگر کسی جگہ چار آدمی ایک ساتھ بیٹھے ہوں اور ان میں سے دو آدمی آپس میں سرگوشی کرنے لگیں تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ تیسرے آدمی کی موجودگی میں دو آدمیوں کے آپس میں سرگوشی کرنے یا اسی طرح چوتھے آدمی کی موجودگی میں تین آدمیوں کے آپس میں سرگوشی کرنے کی مذکورہ بالا ممانعت نہی تحریمی کے طور پر ہے۔ لہٰذا دو آدمی ہوں یا تین چار ہوں یا پورا مجمع ہو ان کے لئے یہ حرام ہے کہ وہ ایک آدمی کو چھوڑ کر باقی سب آپس میں سرگوشی کریں ہاں اگر اس ایک آدمی سے پوچھنے کے بعد اور اس کی اجازت کی صورت میں سرگوشی کریں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ حضرت ابن عمرؓ 'امام مالکؒ ہمارے اصحاب اور جمہور علماء کا یہی مسلک ہے اور اس حکم کا تعلق ہر موقع و ہر زمانہ سے ہے خواہ سفر ہو یا حضر ہو۔

ایک شارح کا کہنا ہے، کہ مجمع میں اگر دو افراد سرگوشی کریں تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ چونکہ تیسرا آدمی یہ گمان نہیں کرے گا، کہ یہ دونوں اس کی برائی کر رہے ہیں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اگر وہ یہ گمان کرے تو تب بھی پرواہ نہ کرنی چاہئے۔

چونکہ مجلس ہے۔

شرح السنہ میں لکھا ہے: حضرت عائشہ کی ایک صحیح حدیث میں ہے: **أنا كنا أزواج النبي ﷺ عنده يوما فاقبلت فاطمة، فلما رآها رحب ثم سارها**، یہ دلیل ہے کہ مجمع میں سرگوشی کرنا جائز ہے۔

تخریج: جامع صغیر میں اس روایت کے الفاظ یوں ہیں: "**اذا كنتم ثلاثة فلا يتناجي رجلان دون الآخر حتى تختلطوا بالناس فان ذلك يحزنه**"۔ اس حدیث کو امام احمدؒ، شیخین، ترمذی اور ابن ماجہ نے ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔

دین خیر خواہی کا نام ہے

۴۹۶۶: وَعَنْ تَمِيْمٍ الدَّارِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ ثَلٰثًا قُلْنَا لِمَنْ؟ قَالَ لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهِ وَلِرَسُوْلِهِ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/ ۷۴ الحديث رقم (۹۵-۵۵)، والترمذي في السنن ۵/ ۲۸۶ الحديث رقم ۱۹۲۶، والنسائي في ۷/ ۱۵۱ الحديث رقم ۴۱۹۹، والدارمي في ۲/ ۴۰۲ الحديث رقم ۲۷۵۴، واحمد في المسند ۴/ ۱۰۲۔

ترجمہ: حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دین خیر خواہی کا نام ہے۔ یہ کلمہ تین مرتبہ دھرایا۔ ہم نے عرض کیا کس کے لئے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب اُس کے رسول ﷺ اور مسلمان حکام اور عام مسلمانوں کے لئے۔ (مسلم)

تشریح: امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ ایک عظیم الشان حدیث ہے۔ اس پر ایمان واسلام کا دار ومدار ہے۔ اور یہ جو کہا گیا، یہ حدیث ربع اسلام ہے، یعنی چار احادیث میں سے ہے کہ جو تمام امور اسلام کو جامع ہیں۔ تو یہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ کہتے ہیں، بلکہ مدار صرف اس اکیلی حدیث پر ہے۔ اور بعض نے فرمایا: اس حدیث میں نصیحت کو دین واسلام سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہ کہ دین کا اطلاق جس طرح عمل پر ہوتا ہے، اس طرح قول پر بھی ہوتا ہے، اور علماء فرماتے ہیں: نصیحت فرض کفایہ ہے، ایک شخص کی بجا آوری سے باقی لوگوں سے ساقط ہو جائے گی۔ نصیحت بقدر طاقت لازم ہے، چنانچہ جب ناصح کو علم ہو کہ اس کی نصیحت کو قبول کیا جائے گا، اس کے حکم کی تعمیل ہوگی، اس کو خود پر کوئی خطرہ بھی نہ ہو۔ اور اگر اذیت کا اندیشہ ہو تو نصیحت کرنے کے معاملہ میں گنجائش ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

"نصحية" کی لغوی تحقیق:

وهي مأخوذة من نصحت العسل اذ اصفيته من الشمع، شبّهو تخليص القول والفعل من الغش بتخليص العسل من الشمع. حاصل یہ کہ "**نصحت العسل**" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں شہد کو صاف کرنا۔ چنانچہ "**نصح الشيء**" کہتے ہیں جب کوئی شئے صاف شفاف اور حا ـ ن ہو جائے، اس طرح جب اخلاص کے ساتھ بات کی جائے تو کہتے ہیں **نصح له القول**۔

النصیحة وهی تحری قول او فعل فیه صلاح لصاحبه، او تحری اخلاص الودّ له، والحاصل انه ارادة الخیر للمنصوح له وهو لفظ جامع لمعان شتی.

قال الخطابی: النصیحة كلمة جامعة یعبر بها عن جملة هی ارادة الخیر، ولیس یمكن ان یعبر عن هذا المعنٰی بكلمة وجیزة یحصرها ویجمع معنا هاغیرها. كما قالوا فی "الفلاح "لیس فی كلامهم كلمة اجمع لخیر الدنیا والآخرة منه

قال الطیبیؒ: النصیحة هی خلوص المحبة للمنصوح له والتحری فیما یستدعیه حقه.

امام خطابیؒ فرماتے ہیں: نصیحت ایک جامع کلمہ ہے جو باوجود مختصر سا ہونے کے اپنے اندر بہت سے جامع معانی سموئے ہوئے ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ "منصوح لہ" کیلئے تمام حظوظ خیر کو جمع کر دینا نصیحت ہے۔

قوله: الدین النصیحة:

یہاں" الدین النصیحة "فرمایا گیا ہے۔ "النصیحة" کا حمل "الدین" پر ہے۔ چنانچہ مراد یہ ہے: عماد الدین وقوامه انما هو النصیحة وبها ثباته: یعنی دین کا دارومدار نصیحت پر ہے، بایں طور کہ اسی کے ذریعہ سے دین کو قوت وثبات حاصل ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: "انما الأعمال بالنیات" اور" الحج عرفة". یہ حصر ادعائی ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ دین میں اہم ترین چیز نصیحت ہے۔

ذكرها ثلاثا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام شان اور تاکید کے سبب سے یہ جملہ تین بار ارشاد فرمایا۔ اربعین کی روایات میں یہ لفظ موجود نہیں ہے۔ چونکہ نصیحت امور اضافیہ میں سے تھی اسی لئے راوی نے اس کی تفصیل چاہی۔

قوله: قال: لله: اللہ کیلئے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وہدایات کے مطابق ایمان لائے، شرک اور اس کی تمام انواع واقسام سے اجتناب برتے، اطاعت وفرمانبرداری کو اپنا شعار بنائے، اور اخلاص نیت کے ساتھ تمام اوامر کو بجالائے، نواہی سے مکمل اجتناب کرے، خدا کے انعامات واحسانات کا معترف بنے۔ اور شکر بجالائے، اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ محبت وموالات کا تعلق رکھے اور نافرمانوں کے ساتھ معادات کا معاملہ رکھے۔

یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی ناصح کی نصیحت کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہاں اگرچہ "النصیحة لله "فرمایا گیا، لیکن درحقیقت یہ امور خود بندہ (کے منافع) کی طرف راجع ہیں۔ (كذا ذكر الخطابی). اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے امر کی تعظیم کی جائے اور اس کی مخلوق پر شفقت کی جائے۔

بعض محققین فرماتے ہیں: "نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے وجود پر ایمان لایا جائے، بایں طور کہ یہ اعتقاد حاصل ہو کہ اللہ موجود ہے۔ وہ خالق ہے، وہ اپنی صفات ثبوتیہ، سلبیہ، اضافیہ اور افعال سے متصف ہے، اس کی ذات کے علاوہ کائنات کی ہر چیز' کہ جس کو عالم کہا جاتا ہے، وہ اللہ کی قدرت سے معرض حدوث میں آئی ہے۔ عرش سے تحت الثریٰ تک سارے کا سارا جہاں، عظمت الٰہیہ کے مقابلہ میں وہ نسبت بھی نہیں رکھتا جو نسبت رائی کے ایک دانہ کو جمیع عالم کے مقابلہ میں حاصل ہے۔ اس

کے احکام معلل بالاغراض نہیں ہیں۔ احکام کی مشروعیت کا مقصد منفعت عباد ہے۔ ""حکم" وہی ہے، حکم اسی کا رواں ہے، جو چاہے سو چاہے، اس پر کوئی چیز لازم نہیں، اگر کسی کو ثواب عطاء کرے تو اس کا فضل ہے۔ اور اگر کسی کو عذاب دے، تو اس کا عدل ہے۔ اس کے اسماء توقیفی ہیں، اس کی عبادت اخلاص کے ساتھ کرے۔ اس کی نافرمانی سے اجتناب کرے، محبت رکھے تو اللہ کی خاطر، بغض رکھے تو اللہ کی خاطر۔"

قوله: ولكتابه: اللہ کی کتاب کیلئے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ اس پر ایمان لائے، کہ یہ اللہ کا کلام ہے، یہ اس کی وحی ہے۔ یہ اس کا نازل کردہ ہے۔ مخلوق میں سے کوئی بھی اس کے مثل کلام پر قادر نہیں۔

تلاوت کرتے وقت اس کے الفاظ وحروف کو درستگی کے ساتھ ادا کرے۔ اس میں مذکور وعدوں اور وعیدوں کی تصدیق کرے۔ اس کے مواعظ سے عبرت حاصل کی جائے، قرآن کے عجائبات میں تفکر کیا جائے، اس کے محکمات پر عمل کیا جائے۔ متشابہات کے سامنے سر تسلیم خم کیا جائے۔ (ذکرہ الخطابی)

بعض کا کہنا ہے کہ قرآن کی تعظیم وتکریم کرے، محرفین کی تاویلات کا ابطال کیا جائے، زبان طعن دراز کرنے والوں کی زبان کو بند کیا جائے۔

بعض محققین فرماتے ہیں: کتاب سے مراد قرآن ہے، چونکہ قرآن کریم پر ایمان لانا تمام کتب یا جنس کتب سماویہ پر ایمان لانے کو متضمن ہے۔ اس لئے کہ جنس کی اضافت مفید عموم ہوتی ہے، **(كما تقرر في الاصول)**.

"لمن" کے جواب میں" لکتبه" کا ذکر کرنا تغلیباً ہے۔

قوله: النصيحة للرسول:

خدا کے رسول ﷺ کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کی سچے دل سے تصدیق کرے کہ وہ رسول ﷺ اور اس کے پیغمبر ہیں ان کی نبوت پر ایمان لائے وہ اللہ کی طرف سے جو پیغام پہنچائیں اور جو احکام دیں ان کو قبول کرے اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری کرے ان کو اپنی جان اپنی آل اولاد اپنے ماں باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ عزیز ومحبوب رکھے ان کے اہل بیت اور ان کے صحابہؓ سے محبت رکھے اور ان کی سنت پر عمل کرے۔

"رسول" سے مراد محمد عربی ﷺ ہیں یا جنس مراد ہے، اس صورت میں ملائکہ بھی شامل ہو جائیں گے، چونکہ وہ بھی انبیاء کی طرف مبعوث، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **﴿جاعل الملئكة رسلا﴾** [فاطر۔۱] اور دوسری جگہ فرمایا: **﴿الله يصطفى من الملائكة رسلاً ومن الناس﴾** [الحج۔۷۵]

قوله: ائمة المسلمين: امام کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **ومجمل معنى الامام من له خلافة الرسول في اقامة الدين بحيث يجب اتباعه على الكل.** چنانچہ اس مفہوم میں مسلمانوں کے امراء وخلفاء ہیں۔

مسلمانوں کے اماموں کے حق میں خیر خواہی یہ ہے کہ جو شخص اسلامی حکومت کی سربراہی کر رہا ہو اس کے ساتھ وفاداری کو قائم رکھ۔ احکام وقوانین کی بیجا طور پر خلاف ورزی کر کے ان کے نظم حکومت میں خلل وابتری پیدا نہ کرے۔ اچھی باتوں میں ان کی پیروی کرے اور بری باتوں میں ان کی اطاعت سے اجتناب کرے۔ اگر وہ اسلام اور اپنے عوام کے حقوق کی ادائیگی میں

غفلت وکوتاہی کا شکار ہوں تو ان کو مناسب اور جائز طریقوں سے متنبہ کرے۔ ان کے خلاف بغاوت کا علم بلند نہ کرے اگر چہ وہ کوئی ظلم ہی کیوں نہ کریں۔ علماء کو جو مسلمانوں کے علمی و دینی رہنما ہوتے ہیں ان کی عزت و احترام کرے' شرعی احکام اور دینی مسائل میں وہ قرآن و سنت کے مطابق جو کچھ کہیں اس کو قبول کرے اور اس پر عمل کرے ان کی اچھی باتوں اور ان کے نیک اعمال کی پیروی کرے اور ان کے بارے میں حسن ظن رکھے۔

قولہ: **و عامتهم**: یہاں اعادہ عامل کو ترک کیا ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ ان کا رتبہ مقدم الذکر لوگوں سے کم ہے، چونکہ یہ تابع ہیں۔ اور پہلے متبوعات نصیحت کے اعتبار سے مستقل ہیں۔

عامۃ المسلمین کے ساتھ نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ

عوام کی ان کے دینی و دنیاوی مصالح کی طرف راہنمائی کی جائے۔ ہر جائز ممکنہ طریقہ سے ان کو نفع پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ ان کو ہر ممکنہ نقصان سے بچایا جائے۔ ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا جائے۔ قولاً اور فعلاً ہر اعتبار سے ان کی مدد کی جائے، دینی و دنیوی منافع کی تعلیم دی جائے۔ بڑوں کی توقیر کی جائے اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کی جائے۔ ان کیلئے مواعظ حسنہ کا اہتمام کیا جائے۔ ان کی غیبت نہ کی جائے، ان سے حسد نہ رکھے۔ ان کی آبرو اور جان و مال کی حفاظت کرے۔ خلاصہ یہ ہے: " **يحب لهم ما يحب لنفسه من الخير ويكره لهم ما يكره لنفسه من الشر** ".

امام طیبیؒ فرماتے ہیں:

تخریج: امام بخاری نے تاریخ میں، اس روایت کا لفظ پہلا ٹکڑا " **والدين النصيحة** " حضرت ثوبان سے ذکر کیا ہے۔ (یعنی اور بزارؒ نے ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔

عرضِ مرتب:

امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں "کتاب الایمان" کے اختتام پر اس حدیث کو بطور ترجمۃ الباب ذکر فرمایا ہے: **باب: قول النبی ﷺ: الدين النصيحة لله ولرسوله ولأئمة المسلمين وعامتهم**. حاصل یہ کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث کو بخاری شریف میں اگر چہ موصولاً ذکر نہیں کیا مگر تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس حدیث کو امام نسائی، ابوداؤد، ابن حبان، ابن مندہ اور ابن خزیمہ وغیرہ نے بھی ذکر کیا ہے۔

ہر مسلمان کی خیر خواہی پر بیعت

۴۹۶۷: وَعَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ بَايَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٥/٣١٢ الحديث رقم ٢٧١٥ و مسلم في ٢/٧٥ الحديث رقم (٩٧-٥٦)۔

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول کریم کی بیعت ان باتوں پر کی ہے:
(۱) نماز کا قائم کرنا۔ (۲) زکوۃ دینا۔ (۳) ہر مسلمان سے خیر خواہی کرنا۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: بايعت رسول الله ﷺ اقام الصلاة و ايتاء الزكوة:

اقام: کے آخر سے تاء حذف ہے چونکہ اضافت بھی ہے، اور اطالہ بھی۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: صلاۃ وزکوۃ پر اقتصار کرنا اس سبب سے ہے، کہ یہ دونوں اعمال عبادات مالیہ اور بدنیہ میں سے ''امہات العبادات'' ہیں، شہادتین کے بعد یہ دونوں اسلام کے اہم ارکان ہیں۔ اھ۔

اس روایت میں باقی عبادات کا ذکر موجود نہ ہونے سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ روزہ اور حج اس وقت تک واجب ہی نہیں ہوئے تھے۔ چونکہ اس حدیث کے راوی یعنی حضرت جریر بن عبداللہؓ نے عام الوفاۃ میں اسلام قبول کیا تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ روزہ من جملہ عبادات بدنیہ میں سے ہے، جو شخص نمازوں کی محافظت و مداومت کرے گا، تو روزہ بطریق اولیٰ رکھے گا، بخلاف اس کے برعکس کے۔ جیسا کہ اہل زمانہ کا مشاہدہ ہے۔ اور حج، عبادت مالیہ اور بدنیہ سے مرکب ہے، چنانچہ جو شخص ان دو عبادتوں کو بجالائے گا، وہ حج بھی اداء کرے گا۔ اور خصوصاً جب کہ اس کا موقع محل بھی ساری زندگی میں ایک بار ہے، بخلاف صلوٰۃ کے وہ ۲۴ گھنٹے میں پانچ بار اداء کی جاتی ہے، اور زکوٰۃ سال میں ایک مرتبہ فرض ہوتی ہے۔

قوله: والنصح لكل مسلم:

اس مفہوم میں عوام وخواص تمام مسلمان داخل ہیں۔ اس ٹکڑے کی وضاحت پچھلی حدیث کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

ایک غلطی کی نشاندہی: ''مظاہر حق'' میں اسی حدیث کے ذیل میں لکھا ہے: ''اللہ تعالیٰ کی تمام تر عبادت وطاعت کا تعلق دو ہی چیزوں سے ہے ایک تو حقوق اللہ دوسرے حقوق العباد لہٰذا حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے حقوق اللہ میں خاص طور پر ان عبادات کا ذکر کیا جو تمام بدنی اور مالی عبادتوں میں شہادت کے بعد سب سے اعلیٰ وافضل ہیں اور ارکانِ اسلام میں سے اہم ترین رکن ہیں یعنی نماز اور زکوٰۃ جہاں تک روزہ اور حج کا تعلق ہے تو ہوسکتا ہے کہ جس وقت حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے بیعت کی ہو اس وقت تک یہ دونوں روزہ اور حج مسلمانوں پر فرض نہ قرار دیئے گئے ہوں اسی طرح حقوق العباد سے متعلق اس چیز کو ذکر کیا جس کے دائرے میں بندوں کے تمام حقوق آجاتے ہیں یعنی خیر خواہی۔''

الفصل الثانی:

رحمت بد بخت سے چھینی جاتی ہے

۴۹۶۸: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا الْقَاسِمِ الصَّادِقَ الْمَصْدُوْقَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ اِلَّا مِنْ شَقِيٍّ ۔ (رواه احمد والترمذی)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲۲۳/۵ الحديث رقم ۴۹۴۲، والترمذی فی السنن ۲۸۵/۴ الحديث رقم ۱۹۲۳، واحمد فی المسند ۴۴۲/۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے آقا ابوالقاسم الصادق المصدوق ﷺ سے سنا رحمت بدبخت کے دل سے ہی نکالی جاتی ہے۔ (احمد، ترمذی)

تشریح: ''صادق'' اس کو کہتے ہیں جو اپنے قول وفعل میں سچا ہو۔اور''مصدوق'' کے معنی ہیں وہ شخص جس کو لوگوں نے سچا تسلیم کرلیا ہو یا اس کے سچا ہونے کی گواہی خود اللہ جل شانہ نے دی ہو۔ چنانچہ اللہ جل شانہ نے آپ ﷺ کے سچا ہونے کی شہادت ان الفاظ کے ساتھ دی ہے:﴿وما ینطق عن الهوی﴾ [النجم۔۳]

قوله: لاتنزع الرحمة الامن شقی:

قوله: لا تنزع الرحمة: صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے، یعنی مخلوق خدا پر رحمت وشفقت کرنے کے جذبہ کو بدبخت کے دل سے ہی نکالا جاتا ہے۔ وہ خود بھی مخلوقِ خدا میں سے ہے، دوسروں کے مقابلے میں وہ خود زیادہ رحم وشفقت کا محتاج ہوتا ہے۔ بلکہ دوسروں پر شفقت کا فائدہ بھی خود اسی کی ذات کی طرف راجع ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:﴿ان أحسنتم أحسنتم لأنفسكم﴾ [الاسراء۔۷] اور اس وجہ سے بھی کہ مخلوقِ خدا پر شفقت کے سبب سے خود اس پر رحمت کی جاتی ہے۔ جیسا کہ اگلی حدیث میں آرہا ہے: ان الراحمون یرحمهم الرحمٰن.

الا من شقی: بدبخت سے مراد کافر ہے یا فاجر!

عرضِ مرتب:

اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ کافر اپنے کفر یا فاسق اپنے فسق وفجور کی وجہ سے اپنے دل کو اتنا سخت بنالیتا ہے کہ اسکے اندر سے وہ انسانی جذبہ بھی ختم ہوجاتا ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان پر رحم وشفقت کرنے پر مائل کرتا ہے۔ (از مظاہر حق)

میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے۔ میں کہتا ہوں اس کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں' اور حاکم نے اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے۔

رحم کرنے والوں پر رحمٰن کی رحمت

۴۹۶۹: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ۔ (رواه ابوداؤد الترمذی)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ۵/۲۳۱ الحدیث رقم ۴۹۴۱، والترمذی فی السنن ۴/۲۸۵ الحدیث رقم ۱۹۲۴، واحمد فی المسند ۲/۱۶۰۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رحم کرنے والوں پر رحمان رحم کرتا ہے تم اہل زمین پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم فرمائے گا۔ (ابوداؤد' ترمذی)

تشریح: یرحمکم: جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ اور ایک نسخہ میں مرفوع ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: عموم کا صیغہ لایا گیا ہے تاکہ مخلوق کی تمام اصناف کو شامل ہوسکے۔

''زمین والوں میں'' سارے جاندار داخل ہیں خواہ وہ حیوان ہوں یا انسان۔ اور انسان بھی خواہ نیک ہوں یا بد۔

البتہ لوگوں پر رحم وشفقت کرنے کی صورت یہ ہے کہ ان کو ان کی بدی اور برائی سے روکا جائے جیسا کہ اس حدیث کہ اپنے بھائی

کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم کی تشریح میں بتایا گیا تھا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے باز رکھا جائے یا یہ کہ زمین والوں پر رحم وشفقت کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں پر رحم وشفقت کرو جو اس کے مستحق ہوں۔

جو آسمان میں ہے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کا کمال قدرت اور جس کی سلطنت آسمان میں ہے یا اس سے مراد ملائکہ ہیں اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تم زمین پر رہنے والوں پر رحم وشفقت کرو تا کہ آسمانوں میں رہنے والے یعنی ملائکہ کا رحم تم پر ہو اور تمہارے حق میں ان کا رحم یہ ہے کہ وہ تمہارے دشمنوں اور ایذاء پہنچانے والی مخلوق (جیسے جنات وشیاطین اور شریر انسانوں) سے تمہاری حفاظت کریں اور اللہ کریم سے تمہارے لئے استغفار اور طلب رحمت کریں۔

اگر "من فی السماء" سے مراد وہ ذات لی جائے، کہ جس کا امر آسمان وزمین میں نافذ ہے، تو اس صورت میں حدیث کے یہ الفاظ "باب اکتفاء" سے ہوں گے۔

آسمان کا خصوصی طور پر ذکر کرنا اس کی شرافت کے باعث ہے۔ یا یہ کہ اس کے ذکر سے ارض بطریق اولیٰ مفہوم ہو رہی ہے۔ یا اس وجہ سے کہ آسمان زمین کو بھی محیط ہے۔ اور زمین آسمان کے مقابلہ میں ایسی ہی ہے، جیسے کہ اس کے بیچوں بیچ کوئی "حلقہ" (زرہ رسّی پر گول چیز) پڑا ہو۔ چنانچہ حقارت کی وجہ سے ذکر نہیں کیا۔

توضیح وتخریج: ترمذی کی روایت میں اتنا اضافہ بھی ہے: **الرحم شجنة من الرحمٰن، من وصلها وصله الله ومن قطعها قطعه وقال: حسن صحیح. اھ۔** یہ حدیث مسلسل بالاؤلیۃ ہے۔ (ذکرہ میرک)

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اس کا طریقہ ہم نے شرح نخبہ میں "مسلسل" کی بحث میں بیان کیا ہے۔

اور الجامع الصغیر میں یوں ہے کہ اس حدیث کو امام احمد، ابوداؤد، ترمذی اور حاکم نے ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ احمد، ترمذی اور حاکم نے یہ اضافہ کیا ہے: **والرحم......**

چھوٹوں پر رحم نہ کرنے والا ہم سے نہیں

۴۹۷۰: **وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا وَيَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔** (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

أخرجه الترمذي في السنن ٥/ ٢٨٤ الحديث رقم ١٩٢١۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم اور بڑوں کی تعظیم نہیں کرتا اسی طرح اچھی باتوں کا حکم اور برائی سے نہیں روکتا۔ (ترمذی)

تشریح: **لیس منا**: یہ "براءت" سے کنایہ ہے۔ یعنی وہ ہمارے خواص میں سے نہیں۔

لم یوقر: مرقاۃ کے زیریں متن میں "**یوقر**" ہے۔ مجزوم ہے بغیر حرف جزم کے ہے۔

یامر: یہ بھی مجزوم ہے، اس کا عطف ماقبل مجزوم پر ہے۔

ینہ: بغیر الف کے ہے۔ ایک نسخہ میں الف کے اضافہ کے ساتھ ہے، یہ روایۃً تو درست نہیں، اگرچہ درایۃً کسی اعتبار سے

درست ہے۔ فتامل

قولہ:قال :هذا حديث غريب:ایک نسخہ میں "حسن غریب" ہے۔

تخریج:اس حدیث کو امام بخاری نے" **الادب المفرد**" میں، اور ابو داؤد نے اپنی سنن میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔لیکن ان الفاظ کے ساتھ:"**من لم یرحم صغیرنا ویعرف حق کبیرنا فلیس منا**".

بوڑھے کا احترام بڑھاپے کی وجہ سے

۴۹۷۱:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رسول الله صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَكْرَمَ شَابٌّ شَيْخًا مِنْ اَجْلِ سِنِّهِ اِلَّا قَيَّضَ اللّٰهُ لَهٗ عِنْدَ سِنِّهِ مَنْ يُكْرِمُهٗ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٤/٣٢٧ الحديث رقم ٢٠٢٢۔

ترجمہ:حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا جو نوجوان کسی بوڑھے آدمی کا احترام اس کے بڑھاپے کی وجہ سے کرے گا۔اللہ تعالیٰ اسکے بڑھاپے میں اس کیلئے ایسا شخص مقرر فرمائیگا جو اس کا احترام کرے گا۔(ترمذی)

تشریح:اس حدیث کے ذریعہ گویا اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ جو شخص دوسروں کی تعظیم و خدمت کرتا ہے تو اس کی بھی تعظیم و خدمت کی جاتی ہے(اور جو لوگ اپنے بزرگوں کی تعظیم و خدمت نہیں کرتے اور اپنے بڑے بوڑھوں کی تحقیر کرتے ہیں وہ اپنے بڑھاپے میں اپنے چھوٹوں کی طرف سے اسی تحقیر و تذلیل اور بے وقعتی سے دوچار ہوتے ہیں۔)

اس ارشادِ گرامی میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اُس جوان کی عمر دراز ہوتی ہے جو اپنے بڑے بوڑھوں کی تعظیم و خدمت کرتا ہے۔

چونکہ جو شخص عمر میں بڑا ہے غالب یہی ہے کہ اس کو ایمان میں سبقت ہے، اس کا علم بھی زیادہ ہے اور عمل بھی وافر ہے۔ **الا قیض اللّٰہ** :یائے مشددہ کے ساتھ ہے۔اسی قبیل سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿**وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ**﴾ [الزخرف:٣٦] "اور جو کوئی خدا کی یاد سے آنکھیں بند کر لے (یعنی تغافل کرے) ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں تو وہ اس کا ساتھی ہو جاتا ہے۔"

منقول ہے کہ ایک بزرگ تھے جو مصر میں سکونت پذیر تھے اور ان کا ایک مرید تھا جو خراسان میں رہتا تھا ایک مرتبہ وہ مرید اپنے شیخ کے پاس کچھ دن رہنے کے لئے خراسان سے چل کر مصر پہنچا اور وہاں ایک طویل مدت تک شیخ کی خدمت میں رہا انہی دنوں کچھ دوسرے بزرگوں کی جماعت اس کے شیخ کی زیارت کے لئے آئی تو شیخ نے اس مرید سے اشارہ کیا کہ ان بزرگوں کی سواری کے جانور تھام لو وہ ان کے پاس سے چلا گیا اور ان جانوروں کی نگرانی کرنے لگا۔مگر اس کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ میں جو اتنی دور دراز کا سفر طے کر کے شیخ کی خدمت میں آیا تھا یہ اس کا نتیجہ ہے! بہر حال جب وہ بزرگ ان شیخ کے پاس سے چلے گئے اور وہ مرید اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے کہا کہ عزیز من! اس وقت میں نے تمہیں ان بزرگوں کی سواری کے جانوروں کی دیکھ بھال پر جو متعین کیا تھا۔تو اس کی وجہ نہ معلوم تمہارے دل میں کیا وسوسہ پیدا ہوگا لیکن اتنی بات یاد رکھو کہ

تمہیں اس خدمت کا بہت بڑا اجر ملے گا اور عنقریب اللہ تعالیٰ تمہیں اس درجہ پر پہنچائے گا کہ تمہاری خدمت میں بڑے بڑے بزرگ اور اکابر آئیں گے اور پھر خدا کی طرف سے تمہارے پاس ایسے لوگ مقرر کیے جائیں گے جو ان آنے والوں کی خدمت کریں گے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان شیخ نے جو کہا تھا وہ صحیح ثابت ہوا اور اس شخص کی ملاقات کے لئے آنے والے بڑے بڑے بزرگوں کی کثرت کی وجہ سے ہمیشہ اس کے دروازے پر خچر اور گھوڑوں کا ایک ہجوم رہا کرتا تھا۔

خود اس حدیث کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول خدا ﷺ کی خدمت کے سلسلے میں دین و دنیا کے بڑے بڑے اجر وانعام سے نوازے گئے چنانچہ جب وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو اس وقت ان کی عمر دس سال تھی اور جب تک آنحضرت ﷺ اس دنیا میں تشریف فرما رہے ان کی زندگی کا سارا وقت حضور ﷺ کی خدمت ہی میں صرف ہوتا رہا اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک بڑی نعمت تو یہ عطا کی کہ ان کی حیات بہت طویل ہوئی اور وہ تقریباً ایک سو تین سال تک نہایت پاکیزہ اور اچھے احوال اور اطمینان و سکون کے ساتھ اس دنیا میں رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مال و دولت کی فراوانی سے بھی نوازا اور کثیر اولاد کی نعمت سے بھی سرفراز کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک سو اٹھ کے تھے۔ اور ان سے خلق کثیر نے روایت کیا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام میرکؒ فرماتے ہیں: امام ترمذیؒ نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے تین تقاضے

۴۹۷۲: وَعَنْ اَبِىْ مُوْسٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اِجْلَالِ اللّٰهِ اِكْرَامَ ذِى الشَّيْبَةِ الْمُسْلِمِ وَحَامِلِ الْقُرْاٰنِ غَيْرَ الْغَالِىْ فِيْهِ وَلَا الْجَافِىْ عَنْهُ وَاِكْرَامَ السُّلْطَانِ الْمُقْسِطِ۔

(رواہ ابوداؤد والبیهقی فی شعب الایمان)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ۵/۱۷۴ الحدیث رقم ۴۸۴۳، والبیهقی فی شعب الایمان ۷/۴٦۰ الحدیث رقم ۱۰۹۸٦۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم میں سے یہ ہے کہ بوڑھے مسلمان حافظ قرآن جو کہ اس میں غلو کرنے والا اور اس سے بے رخی اختیار کرنیوالا نہ ہو اور انصاف کرنے والے حاکم کا احترام کرے۔ (ابوداؤد، بیہقی)

تشریح: قولہ: ان من اجلال اللہ اکرام ذی الشیبۃ المسلم:

اجلال اللہ: مصدر کی اضافت اپنے فاعل کی طرف ہے یا مفعول کی طرف ہے۔ (قالہ ابن الملک)۔

اور ظاہر دوسرا احتمال ہے، جیسا کہ اگلے جملہ میں یہی متعین ہے۔

غیر: مجرور ہے۔

قولہ: وحامل القرآن غیر الغالی فیہ و لا الجافی عنہ:

حامل قرآن یعنی حافظ قرآن کی تعظیم کو اس امر کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے کہ نہ تو غلو کرنے والا ہو اور نہ قرآن پڑھنے

پڑھانے کو ترک کرنے والا ہو بلکہ اعتدال و میانہ روی کو اختیار کرنے والا ہو جیسا کہ تمام عبادات میں آنحضرت ﷺ کی عادت شریفہ تھی

چنانچہ غلو نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ الفاظ کی تجوید (اور حسن قراءت وصوت) میں حد سے تجاوز نہ کیا جائے یا یہ کہ تلاوت اس قدر تیز نہ کی جائے کہ معنی سمجھ میں نہ آئیں۔

قرآن کے الفاظ وحروف میں تحریف کے ذریعہ خیانت کا ارتکاب نہ کیا جائے اور نہ غلط سلط تاویلات اور فاسد عقائد و نظریات کے ذریعہ اس کے معنی ومفہوم میں حذف واضافہ اور ترمیم وتبدیلی کی جائے جیسا کہ اکثر فاسد ذہن وفکر کے حامل لوگوں کا شیوہ ہے اور نہ قرآن کے احکام وہدایات کے بارے میں شکوک وشبہات اور وسوسے پیدا کئے جائیں۔

اسی طرح قرآن سے نہ ہٹنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت کو ترک نہ کیا جائے۔ تجوید وقراءت کے آداب وقواعد سے اعراض نہ کیا جائے اور قرآن نے جو احکام وہدایات اور مسائل بیان کئے ہیں ان پر عمل کرنے سے گریز نہ کیا جائے۔

بعض حضرات نے غالی (قرآن میں غلو کرنے والا) اس شخص کو قرار دیا ہے جو تلاوت قرآن سے بالکل بے پرواہ اور گریزاں اور دوسری چیزوں میں مشغول رہے۔

قولہ: واکرام السلطان المقسط: ''عادل بادشاہ'' سے مراد وہ حاکم وسربراہ ہے جو حقیقی معنی میں عدل کا پیکر ہو اور اپنے عوام پر ظلم وجور کو گوارا نہ کرتا ہو اور اس کا کوئی فیصلہ اور کوئی عمل عدل وانصاف کے منافی نہ ہو اور یہ اعلیٰ درجہ ہے
اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس کا عدل اس کے ظلم پر غالب ہو اس کے برخلاف (اگر اس کے عدل پر غالب ہو تو اس کو عادل نہیں کہیں گے اور ایسے) بادشاہ حاکم سے دور رہنا ہی افضل ہوگا۔

(واضح رہے کہ اس دور کے اکثر حاکموں اور سربراہوں کے جو احوال ہیں ان کے پیش نظر بلکہ اگر حقیقت کے آئینے میں دیکھا جائے تو عدل وانصاف سرنگوں اور ظلم وزیادتی کا غلبہ نظر آئے گا)۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے بعض علماء نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جو شخص موجودہ زمانہ میں کسی بادشاہ وحاکم کو ''عادل'' کہے گا وہ کفر کی حد میں داخل ہو جائے گا اگرچہ ہر بادشاہ حاکم کو کسی نہ کسی طرح کے عدل سے بالکل خالی نہیں کہا جا سکتا دراصل اس قول کی بنیاد ایک لطیف نکتہ پر ہے اور وہ یہ کہ کسی شخص کا عدل کرنا اور کسی شخص کا عادل ہونا ان دونوں کے درمیان فرق ہے اگر یہ کہا جائے کہ زید عدل کرتا ہے تو اس کے کہنے کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہوگا کہ زید عادل ہے کیونکہ عدل کرنے کا اطلاق اس شخص پر بھی ہو سکتا ہے جو اگرچہ گاہے بگاہے عدل کرتا ہو جب کہ ''عادل'' کا اطلاق صرف اسی شخص پر ہوتا ہے جو صفت عدل کے ساتھ دوامی طور پر موصوف ہو (اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر اس طرح کہا جائے کہ زید نمازی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زید پابندی کے ساتھ ایک ایک وقت کی نماز پڑھتا ہے اور کبھی بھی اس کی کوئی نماز ترک یا قضا نہیں ہوتی جب کہ اگر یوں کہا جائے کہ زید نماز پڑھتا ہے تو اس کا مفہوم بالکل دوسرا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ زید بھی نماز پڑھتا ہے اگرچہ پابندی کے ساتھ نہیں بلکہ کبھی کبھی پڑھتا ہے۔ لہٰذا لفظ ''عادل'' اپنے جس وسیع اور اہم مفہوم کو ادا کرتا ہے اس کی بنیاد پر اس لفظ کا اطلاق نہ تو اس دور کے کسی بادشاہ وحاکم پر ہو سکتا ہے اور نہ اس دور کے کسی بھی بادشاہ وحاکم کو عادل کہنے کی اجازت ہے۔)

(حدیث باب میں تو تین طرح کے لوگوں کی توقیر وتعظیم کرنے کے حکم کا ذکر ہے) اور شرح السنہ میں ہے کہ طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ یہ مسنون ہے کہ تم چار آدمیوں کی تعظیم وتوقیر کرو: عالم کی، بوڑھے شخص کی، سلطان کی، باپ کی۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ باپ کے حکم میں ماں بھی داخل ہے اور عالم سے مراد عالم باعمل ہے جیسا کہ "حامل القرآن" سے مستفاد ہو رہا ہے۔ اور مذکورہ بالا حدیث میں باپ کا ذکر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اول تو باپ کا معاملہ بالکل ظاہر ہے یا اس وجہ سے کہ یہ کلام اجانب کے بارے میں ہے (اور ہر شخص جانتا ہے کہ باپ کی تعظیم کرنی چاہئے دوسرے یہ کہ مستحق تعظیم قرار دینے کی زیادہ ضرورت انہی لوگوں کے حق میں ہے جو اجنبی ہوں اور جن سے کوئی قرابتی تعلق نہ ہو کیونکہ قرابت کا تعلق بجائے خود ایک انسان کو دوسرے انسان کی تعظیم وتوقیر کرنے پر مائل کرتا ہے۔) لہٰذا اگر کسی شخص کا باپ بوڑھا بھی ہو حامل قرآن (یعنی حافظ و عالم باعمل) بھی ہو اور سلطان وحاکم بھی ہو اور سلطان بھی ہو خواہ اس کا سلطان وحاکم ہونا اپنے ظاہری منصب کے اعتبار سے ہو خواہ باطنی وروحانی طور پر، تو اس صورت میں اس شخص کو اپنے باپ کی بہت زیادہ تعظیم وتوقیر کرنی چاہئے کیونکہ اس کی ذات میں وہ کئی خصوصیات جمع ہیں جو تعظیم وتوقیر کو واجب کرتی ہیں۔

(اس حدیث میں مذکورہ لوگوں کی تعظیم کو منجملہ تعظیم خداوندی قرار دیا گیا ہے جب کہ ایک روایت کے مطابق اس تعظیم و توقیر کو آنحضرت ﷺ نے خود اپنی بھی تعظیم وتوقیر کے مترادف قرار دیا ہے چنانچہ) خطیبؒ نے اپنی جامع میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اِنَّ مِنَ الْاِجْلَالِ تَوْقِيْرَ۔ الشَّيْخِ مِنْ اُمَّتِيْ۔ یعنی اس بوڑھے شخص کی توقیر وتعظیم کرنا جو میری اُمت میں سے ہو منجملہ میری توقیر وتعظیم کے ہے۔ اور شاید کہ یہ حدیث بھی "جوامع الکلم" میں سے ہو چونکہ شیخ کا اطلاق بوڑھے شخص، عالم اور رئیس پر بھی ہوتا ہے۔ اسی قبیل سے یہ روایت ہے: الشيخ في قومه كالنبي في امته۔

اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے تین تقاضے

۴۹۷۳: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ بَيْتٍ فِي الْمُسْلِمِيْنَ بَيْتٌ فِيْهِ يَتِيْمٌ يُحْسَنُ اِلَيْهِ وَشَرُّ بَيْتٍ فِي الْمُسْلِمِيْنَ بَيْتٌ فِيْهِ يَتِيْمٌ يُسَاءُ اِلَيْهِ۔ (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجه في السنن ۲/ ۱۲۱۳ الحديث رقم ۳۶۷۹۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں کا سب سے بہتر گھر وہ ہے۔ جس میں یتیم کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور سب سے برا گھر وہ ہے جس میں یتیم سے برا سلوک کیا جائے۔ (ابن ماجہ)

تشریح: في المسلمين: اى فيما بين بيوتهم يحسن اليه: بصیغہ مجہول ہے۔

یتیم کے ساتھ برے سلوک کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ناحق تکلیف پہنچائی جائے۔ (مثلاً گھر کے افراد اس کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت میں غفلت وکوتاہی برتیں اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں کہ جس سے اس کو اپنی کمتری و بے چارگی کا احساس ہو اور [illegible] ڈانٹا ڈپٹا جائے اور تکلیف پہنچائی جائے اس کو تربیت کے طور پر مارنا یا تعلیم قرآن کی خاطر تادیبا مارنا جائز ہے۔ لہٰذا یہ

دونوں چیزیں معنوی اعتبار سے احسان میں داخل ہیں۔ اگر چہ صورتا ''اساءۃ'' ہیں اور اس کا عکس برعکس ہے۔ یہ سزا دینا برے سلوک میں شمار نہیں ہوگا بلکہ اس کو احسان وحسن سلوک ہی میں شمار کیا جائے گا۔

توضیح: الجامع میں اتنا اضافہ ہے: انا و کافل الیتیم فی الجنة هكذا آگے فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام بخاریؒ نے ''الأدب المفرد'' میں، ابن ماجہ نے، اور ابو نعیم نے'' الحلیه'' میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ذکر کیا ہے۔

ہر بال کے بدلے نیکی پانے والا

۴۹۷۴: وَعَنْ اَبِی اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَسَحَ رَأْسَ يَتِيْمٍ لَمْ يَمْسَحْهُ اِلَّا لِلّٰهِ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ شَعْرَةٍ تَمُرُّ عَلَيْهَا يَدُهٗ حَسَنَاتٌ وَمَنْ اَحْسَنَ اِلٰى يَتِيْمَةٍ اَوْ يَتِيْمٍ عِنْدَهٗ كُنْتُ اَنَا وَهُوَ فِى الْجَنَّةِ كَهَاتَيْنِ وَقَرَنَ بَيْنَ اِصْبَعَيْهِ۔ (رواه احمد والترمذی وقال هذا حديث غريب)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٢٨٢ الحديث رقم ١٩١٧، واحمد فی المسند ٥/٢٦٥۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کے ہاتھ کے نیچے آنے والے ہر بال کے بدلے اسے نیکی ملے گی اور جس نے یتیم بچے یا بچی کے ساتھ حسن سلوک کیا میں اور وہ جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہونگے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں انگشت مبارک آپس میں ملائیں اس روایت کو احمد و ترمذی نے نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: شعرة: عین کے سکون و فتح کے ساتھ۔

''تمر'': اگر تاء کے زبر اور میم کے پیش کے ساتھ یعنی مؤنث کا صیغہ ہو تو اس کا ترجمہ وہی ہوگا جو اوپر نقل کیا گیا اور اگر یہ لفظ یاء کے پیش اور میم کے زیر کے ساتھ یعنی''یمر'' بصیغہ مذکر ہو تو اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ (ہر اس بال کے عوض کہ)''جس پر وہ شخص اپنا ہاتھ پھیرتا ہے''۔ مطلب کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

حسنات: کان کا اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

الی یتیمة او یتیم: ''او'' برائے تنویع ہے۔

کنت انا و هو: ضمیر فاصل لائی گئی تا کہ ضمیر پر عطف درست ہو سکے۔

فی الجنة: کان کی خبر ہے۔ اس کا متعلق مقدر ہے۔ ای متقارنین فی الجنة اقترانا مثل هاتین الأصبعین. اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''کهاتین'' خبر کی ضمیر سے حال ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ خبر ہو اور'' فی الجنة '' ظرف ہو ''کنت'' کیلئے۔ (كذا حققه الطيبي).

حسنات کمیت و کیفیت کے اعتبار سے مختلف درجہ کی ہوتی ہیں اور یہ فرق و اختلاف حسن نیت کے مدار پر مبنی ہے۔

عرضِ مرتب:

اچھا سلوک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ شفقت و مہربانی کا برتاؤ کرے اس کی تعلیم و تربیت پر توجہ دے۔ جب

وہ سن بلوغ کو پہنچے تو اس کا نکاح کرے اور اگر اس کا مال وغیرہ اپنے پاس رکھا ہوا ہو تو اس کی محافظت کرے۔ (از مظاہر حق)

يَتِيْمَةٍ اَوْ يَتِيْمٍ: میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے حرف "او" تنویع کے لئے ہے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ حرف او شک کو ظاہر کرتا ہے یعنی اس موقع پر کسی راوی کو شک واقع ہوا ہے کہ یہاں آنحضرت ﷺ نے "يَتِيْمَةٍ" کا لفظ ارشاد فرمایا تھا یا "يَتِيْمٍ" کا۔

حدیث میں یتیم کی پرورش و تربیت کرنے اور اس کے ساتھ اچھا سلوک اختیار کرنے والے کے بارے میں جن الفاظ کے ذریعہ تحسین فرمائی گئی ہے ان میں اس شخص کے لئے حسن خاتمہ کی بشارت ہے۔

تخریج: صاحب جامع صغیر لکھتے ہیں: **من احسن الی یتیم او یتیمة کنت انا وھو فی الجنة کھاتین.**

اس حدیث کو حکیم نے انسؓ سے روایت کیا ہے۔ اور طبرانی میں ابن عباسؓ سے یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے:

من آوی یتیما او یتیمین ثم صبر و احتسب کنت انا وھو فی الجنة کھاتین.

جنت کی تین حقدار

۴۹۷۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اٰوٰى يَتِيْمًا اِلٰى طَعَامِهِ وَشَرَابِهِ وَجَبَ اللّٰهُ لَهُ الْجَنَّةَ اَلْبَتَّةَ اِلَّا اَنْ يَّعْمَلَ ذَنْبًا لَا يُغْفَرُ وَمَنْ عَالَ ثَلٰثَ بَنَاتٍ اَوْمِثْلَهُنَّ مِنَ الْاَخَوَاتِ فَاَدَّبَهُنَّ وَرَحِمَهُنَّ حَتّٰى يُغْنِيَهُنَّ اللّٰهُ اَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ الْجَنَّةَ فَقَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَوِثْنَتَيْنِ قَالَ اَوِثْنَتَيْنِ حَتّٰى لَوْ قَالُوْا اَوْوَاحِدَةً؟ لَقَالَ وَاحِدَةً وَمَنْ اَذْهَبَ اللّٰهُ بِكَرِيْمَتَيْهِ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا كَرِيْمَتَاهُ قَالَ عَيْنَاهُ۔ (رواہ فی شرح السنہ)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/ ٣٢٠ الحدیث رقم ١٩١٧، والبغوی فی شرح السنة١٣/ ٤٤ الحدیث رقم ٣٤٥٧۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے یتیم کو اپنے کھانے میں شریک کیا تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق اس کو جنت کا حقدار بنا دیتا ہے مگر یہ کہ وہ کوئی ایسا گناہ کرے جو نا قابل معافی ہو اور جس نے تین بیٹیاں یا تین بہنوں کی پرورش کی اور ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس سے بے نیاز کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کو لازم فرما دیتا ہے ایک شخص نے عرض کیا جو دو کی خدمت کرے تو آپ ﷺ نے فرمایا یا دو کی پرورش کرے یہاں تک کہ لوگ اگر ایک کا بھی ذکر کرتے تو آپ ﷺ ایک ذکر فرما دیتے اور اللہ تعالیٰ جس کی دو محبوب چیزیں دور کر دے اس کے لئے جنت واجب ہوگی آپ ﷺ سے عرض کیا گیا وہ دو چیزیں کیا ہیں؟ فرمایا اس کی دونوں آنکھیں۔ (شرح السنہ)

تشریح: قولہ: **من آوی یتیما الی طعامه و شرابه:**

آوی ہمزہ کے مد اور قصر کے ساتھ۔ صاحب النہایہ نے لکھا ہے: "آوی" اور "اوی" دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔ اور

فعل مقصور لازمی ومتعدی ہر دو طرح مستعمل ہے۔

یہی حسن سلوک کسی یتیم بچی کے ساتھ کر کے بھی یہ فضیلت بطریق اولی حاصل ہو سکتی ہے۔ یا یہ کہ ''یتیم'' کا ذکر کرنا باب ''اکتفاء'' سے ہے۔

قوله: الا أن يعمل ذنبا لا يغفر اس سے مراد شرک ہے۔

اس عدم مغفرت کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ [النساء: ۱۱۶] ''خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اسکے سوا (اور گناہ) جس کو چاہے گا بخش دیگا اور جس نے خدا کے ساتھ شریک بنایا وہ راستے سے دور جا پڑا'' (كذا ذكره الطيبى وهو ظاهر) ایک شارح اور انہی کی اتباع میں ابن الملک فرماتے ہیں اس سے مراد شرک ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد مخلوقِ خدا پر ڈھائے جانے والے مظالم ہیں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اظہر یہ ہے کہ یہ تمام مفاہیم کو شامل ہے، چونکہ اس پر اجماع ہے، کہ حقوق العباد محض کسی یتیم کو ٹھکانہ دینے سے معاف نہیں ہو سکتے، علاوہ ازیں یتیم کا مال کھانا بھی فی الجملہ حقوق العباد میں سے ہے، ہاں یہ مشیت کے تحت ہے، چنانچہ تقدیری عبارت گویا یوں ہے: **الا ان يعمل ذنبا لا يغفر الا بالتوبة او بالاستحلال ونحوه.** اور حاصل یہ ہے وہ تمام گناہ جو بین العبد وبین اللہ ہیں (یعنی جن کا تعلق اللہ کے حق سے ہے)، اگر اللہ نے چاہا تو معاف ہو جائیں گے۔

قوله: يا رسول الله واثنتين؟ قال أو اثنتين:

او اثنتين: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ عطف تلقین ہے۔ ای: قال: او اثنين. اس کا قرینہ اگلا جملہ ہے ای: او اثنتين ہیں (ملا علی قاریؒ کہتا ہوں: یہ ''او'' برائے تنویع ہے، یا بمعنی ''بل'' ہے یا ''او'' بمعنی واؤ، تشریک فی الحکم کیلئے ہے۔ یہ حکم الٰہی عام تھا' یا مطلق تھا مگر آپؐ کو سپرد کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ زیادہ کا ذکر کیا' اور پھر جب آپؐ سے درخواست کی گئی کہ ''واثنتين'' تو آپؐ نے فرمایا أو اثنتين۔ (بالفاظ دیگر)۔

(احکام شرعیہ کا نفاذ آنحضرت ﷺ کی صوابدید پر ہے کہ آپ ﷺ جس طرح چاہیں نافذ فرمائیں اور جس کو چاہیں مقید مستثنیٰ قرار دیں) اور ممکن ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہؓ کے مذکورہ جواب میں جو بات فرمائی وہ وحی الٰہی کی بنیاد پر تھی کہ سائلین نے اپنے سوال کے ذریعہ گویا اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ جو ثواب تین بیٹیوں یا تین بہنوں کی پرورش و تربیت کرنے پر ملتا ہے کاش وہی ثواب دو بیٹیوں یا دو بہنوں کی پرورش و تربیت کی صورت میں بھی ملے' چنانچہ حق تعالیٰ نے ان کی اس خواہش کے مطابق وحی نازل فرمائی اور حضور ﷺ نے اس کو بیان فرمایا'

اس کی نظیر یہ روایت ہے: ''**اللهم ارحم للمحلقين، قالوا: والمقصرين** (الحديث) کہ صحابہ کرامؓ کی استدعا تھی کہ اس رحمت میں ''مقصرین'' کو بھی شامل فرما دیجئے۔ حدیث باب میں صحابہؓ کرام کا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس التماس تلقینی کا سبب یہ ہوا، کہ بعض مرتبہ کسی شخص کے ہاں تین بیٹیاں یا بہنیں، دو بہنیں یا بیٹیاں نہیں ہوتی ہیں تو وہ شخص ثواب سے محروم رہ جائے گا۔ صحابہ کرام تحصیل ثواب کے ہر معاملہ میں انتہائی حریص تھے۔ جیسا کہ بخاری میں ابو سعیدؓ سے مروی ہے: انه ﷺ

قال: ما منکن امرأة تقدم بین یدیها من ولدها ثلاثة الا کن لها حجابا من النار۔ فقالت امرأة منهن: یا رسول اللّٰه! او اثنین فأعادتها مرتین؟ ثم قال: واثنین واثنین.

امام احمد نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث یوں نقل کی ہے: "ما من مسلمین یتوفی لهما ثلاثة الا ادخلهما اللّٰه الجنة بفضل رحمته ایاهما، فقالو: یا رسول الله او اثنان؟ قال: او اثنان. قالو: او واحد؟ قال: او واحد. اور بعض روایات میں آتا ہے: ومن لم یکن له فرط فانا فرطه، فانهم لن یصابوا بمثلی.

حاصل یہ ہے کہ ایک "بنت" اور "اخت" کا حکم بھی یہی ہے۔ لیکن یہ مرتبہ میں ادنیٰ ہے، اور جس کی کوئی بہن یا بیٹی نہ ہو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے کسی رشتہ دار یا اجانب میں سے کسی کی بچی کے ساتھ اسی انداز سے حسن سلوک کرلے۔ اور جو شخص اس کی قدرت بھی نہ رکھتا ہو، تو بھی فکر کی بات نہیں چونکہ مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔

قوله: رواه فی شرح السنة:

میرکؒ "التصحیح" سے نقل کرتے ہیں کہ امام طبرانیؒ نے مکمل حدیث ذکر کی ہے۔ اور امام ترمذیؒ نے "الا ان یعمل ذنبا لا یغفر" تک نقل کی ہے۔ اور مصنف یعنی صاحب مصابیح نے شرح السنہ میں مکمل حدیث نقل کی ہے، سوائے اس ٹکڑے کے: الا ان یعمل ذنبا لا یغفر۔ اھ۔ لہٰذا درست بات یہی ہے کہ اس حدیث کو طبرانیؒ کی طرف منسوب کیا جائے، چنانچہ صاحب مشکوٰۃ پر قلت تتبع کا اعتراض وارد ہوتا ہے۔

الجامع الصغیر میں یوں ہے: من عال ثلاث بنات فأدبهن وزوجهن واحسن الیهن فله الجنة. رواه ابو داود عن ابی سعید، وفیه أیضًا: من ذهب بصره فی الدنیا جعل اللّٰه له نورا یوم القیامة ان کان صالحا. رواه الطبرانی فی الاوسط عن ابن مسعود۔

صاع صدقہ سے بہتر عمل

۴۹۷۲: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاَنْ يُّؤَدِّبَ الرَّجُلُ وَلَدَهٗ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ يَّتَصَدَّقَ بِصَاعٍ۔

(رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب و نا صح الراوی لیس عند اصحاب الحدیث بالقوی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲۹۷/۵ الحدیث رقم ۱۹۵۱، واحمد فی المسند ۹۶/۵۔

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کے لئے ایک صاع صدقہ سے یہ بہتر ہے کہ وہ اپنے بچے کی بہتر تربیت کرے۔ ترمذی نے اسے غریب کہا ہے۔ ناصح کمزور راوی ہے۔

تشریح: مذکورہ تادیب کا تصدق سے بہتر ہونا کئی وجوہ سے ہے:

① تادیب بہرحال اپنے موقع محل میں واقع ہوکر رہے گی بخلاف ثانی کے۔ چونکہ وہ محتمل ہے۔ (یقینی نہیں)

② تادیب افادہ علمیہ حالیہ ہے، بخلاف ثانی کے [illegible]

۳ تادیب کا نتیجہ طویل البقاء ہے اور تصدق کا سریع الفناء ہے۔

۴ ترک تادیب گاہے باعث عقاب ہوتی ہے۔ جبکہ ترک تصدق باعث عقاب نہیں۔ وغیرہ وغیرہ

قوله: وقال: هذا حديث غريب: کی وضاحت کرتے ہوئے امام میرکؒ فرماتے ہیں: اى ولم يعرف هذا الحديث الا من هذا الوجه اھ۔ لیکن فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر بھی عمل کرنا بالاجماع جائز ہے

تادیب کا مطلب: یہاں تادیب سے مراد آداب شرعیہ کی تعلیم ہے، وہ قولاً بھی ہوتی ہے، اور فعلاً بھی۔ دلائل قرآنیہ اور احادیث سے تادیب کا یہی مفہوم مستفاد ہے۔ امام طبرانیؒ سند حسن کے ساتھ ابورافع سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں: لأن يهدى الله على يديك رجلا خير لك مما طلعت عليه الشمس وغربت. اس کی تائید اگلی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

اولاد کا سب سے بہتر عطیہ

۴۹۷۷: وَعَنْ اَيُّوْبَ بْنِ مُوْسٰى عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَانَحَلَ وَالِدٌ وَلَدَهٗ مِنْ نَحْلٍ اَفْضَلَ مِنْ اَدَبٍ حَسَنٍ

(رواه الترمذى والبيهقى فى شعب الايمان وقال الترمذى هذا عندى حديث مرسل)

أخرجه الترمذى فى السنن ٤/٢٩٨ الحديث رقم ١٩٥٢، واحمد فى المسند ٤/٧٨ والبيهقى فى شعب الايمان ٦/٣٩٩ الحديث رقم ٨٦٥٣۔

ترجمہ: حضرت ایوب بن موسیٰ اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی باپ اپنی اولاد کو اچھی تربیت سے بہتر عطیہ نہیں دے سکتا۔ (ترمذی، بیہقی) ترمذی نے کہا ہے کہ میرے نزدیک یہ حدیث مرسل ہے۔

راویانِ حدیث:

ایوب بن موسیٰ۔ یہ ایوب بن موسیٰ ہیں جو عمرو بن سعید بن العاص اموی کے بیٹے تھے۔ یہ بڑے فقہاء میں سے تھے انہوں نے عطاء اور مکحول اور ان کے ہم مرتبہ محدثین سے روایت کی ہے ان سے شعبہ وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ۱۳۳ھ میں وفات ہوئی۔

سعید بن العاص۔ یہ سعید بن العاص "قریشی" ہیں ہجرت والے سال میں ان کی پیدائش ہوئی۔ قریش کے سرداروں میں سے تھے جن حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے قرآن کی کتابت کی ان میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو کوفہ کا گورنر بنایا تھا۔ اہل طبرستان سے ہونے والی جنگ میں شریک ہوئے۔ اور اس میں فتح یاب ہوئے۔ ۵۹ھ ان کی وفات ہوئی۔

تشریح: قوله: مانحل والد ولده من نحل أفضل من أدب حسن:

من نحل: نون کے ضمہ اور فتحہ ہر دو کے ساتھ بمعنی عطیہ واعطاء۔ النہایہ میں لکھتے ہیں: النحل العطية الهبة ابتداء من

غير عوض ولا استحقاق، يقال: نحله ينحله نحلا بضم، والنحلة بالكسر العطية.

صاحب قاموس نے لکھا ہے: النحل الشیء المعطي وبالضم مصدر نحله أعطاه، والاسم النحلة بالكسر ويضم.

''ادب'' وہ عمل ہے جو عرف کے مطابق ہو اور شرع کے موافق ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: کلام میں مبالغہ ہے، بایں طور کہ جنس ادب کو جنس مال وعطیات سے قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ نے اپنے اس فرمان گرامی میں قلب سلیم کو بنین ومال کی جنس سے قرار دیا ہے: ﴿يوم لا ينفع مال ولا بنون الا من اتى الله بقلب سليم﴾ [الشعراء:۸۸۔۸۹] (میں ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں: آیت کی بابت درست بات یہ ہے کہ یہ استثناء منقطع ہے۔ ای: ولكن سلامة من اتى الله بقلب سليم تنفعه یا استثناء متصل ہے۔ ای: الاموال من هذا شانه وبنوه حيث انفق ماله من البر، وارشد بنيه الى الحق.

بعض کا کہنا ہے کہ استثناء اس چیز سے ہے کہ جس پر مال وبنون دلالت کر رہے ہیں: ای: لا ينفع غنى الاغنياء. نہ حدیث میں کوئی وجہ مبالغہ نظر آتی ہے اور نہ اس آیت میں۔ باوجود یکہ حدیث تکلف سے مستغنی ہے۔ چونکہ جب یہ کہہ دیا: '' الأدب خير من الذهب'' یا یوں کہہ دیا گیا: '' البر خير من الملك'' تو معنی واضح ہے کہ یہ جنس، اس جنس سے بہتر ہے، ایک کو دوسرے کی جنس سے قرار دینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ چونکہ کلام کے معنی اس کے بغیر بھی تام ہیں۔

قوله: وقال الترمذي هذا حديث عندي مرسل:

امام طیبیؒ لکھتے ہیں: امام ترمذیؒ کا ''عندي'' فرمانا اختلاف کی علامت ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ '' عن جده'' میں اتصال ارسال کا وہم ہوتا ہے۔ چونکہ احتمال ہے کہ (جدہ کی ضمیر ایوب کی طرف راجع ہو۔ اس صورت میں) ایوب کے جد ''عمرو'' مراد ہیں، چنانچہ حدیث مرسل ہوگی۔ اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ (جدہ کی ضمیر کے والد کی طرف لوٹ رہی ہو۔ اس صورت میں) جد اُبیہ مراد ہیں، تو سعید چونکہ صحابی ہیں، لہٰذا یہ حدیث متصل ہوگی۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: روى البخاري الحديث في تاريخه وقال: انه لم يصح سماع جد أيوب، فوافق الترمذي البخاري وقال: هذا عندي مرسل. وفي جامع الأصول: اشعار بأنه متصل حيث روى عن سعيد بن العاص عن النبي ﷺ.

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں: الجامع الصغیر میں اس حدیث کے مرسل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ لکھا ہے: رواه الترمذي والحاكم عن عمرو بن سعيد بن العاص. جہاں تک امام بخاری کا یہ کہنا ہے کہ '' لم يصح له سماع جد يوب''، تو اگر انکی مراد جد اکبر مراد ہیں تو کوئی نقصان کی بات نہیں، زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا، یہ روایت مراسیل صحابہ میں سے ہے، سو وہ سب کے نزدیک مقبول ہے۔ اور اگر ان کی مراد یہ ہے کہ ان کے جد بلا واسطہ ہیں تو یہ حدیث مرسل متعارف ہوگی، لیکن جمہور کے نزدیک یہ بھی حجت ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ یہ روایت فضائل اعمال سے تعلق رکھتی ہے۔

اولاد کے لئے اپنی جوانی تج دینے والی عورت کا اجر

۴۹۷۸: وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْاَشْجَعِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا وَامْرَأَةٌ سَفْعَاءُ الْخَدَّيْنِ كَهَاتَيْنِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاَوْمَأَ يَزِيْدُ بْنُ زُرَيْعٍ اِلَى الْوُسْطٰى وَالسَّبَّابَةِ اِمْرَأَةٌ اٰمَتْ مِنْ زَوْجِهَا ذَاتُ مَنْصَبٍ وَجَمَالٍ حَبَسَتْ نَفْسَهَا عَلٰى يَتَامَاهَا حَتّٰى بَانُوْا اَوْمَاتُوْا۔ (رواه ابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد في السنن ٥/٣٥٦ الحديث رقم ٥١٤٩، واحمد في المسند ٦/٢٩۔

ترجمہ: حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ میں اور سیاہ رخسار والی عورت قیامت کے دن ان دو انگلیوں کی طرح ہوں گے۔ یزید بن زریع نے درمیانی اور انگشت شہادت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ عورت جو صاحب عزت و جمال تھی اور اپنے خاوند سے الگ ہوگئی لیکن اس نے اپنے آپ کو یتامیٰ کے لئے روک کر رکھا۔ یہاں تک کہ وہ جدا ہوگئے یا وفات پاگئے۔ (ابوداؤد)

تشریح: أومأ: کے آخر میں ہمزہ ہے ومأ سے مأخوذ ہے، بمعنی "أشار" کذا فی (قاموس) لیکن "و م ی" کا مادہ ذکر نہیں کیا، چنانچہ بعض نسخوں میں "أومی"، یاء کے ساتھ ہے۔ اس کی کوئی مناسب توجیہہ معلوم نہیں ہوتی، الا یہ کہ یوں کہا جائے کہ ابدال ہوا ہے۔ ہمزہ متحرک کا ابدال ایک جماعت کے نزدیک ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔

حتی بانوا: "بین" سے ماخوذ ہے۔ "بین" اضداد میں سے ہے۔ وصل و فصل ہر دو معنی میں مستعمل ہے۔ ایک شارح نے اس کو "بون" "بمعنی" فضل و مزیة" سے قرار دیا ہے۔

آمت: آمت المرأة ايمة و أيوما، بغیر شوہر کے ہونا۔

امرأة: کی تنوین برائے تعظیم ہے۔ (طیبی)

سفعاء، منصوب ہے، یا مرفوع علی المدحة ہے مبتدا اور خبر کے درمیان واقع ہے۔ (طیبی) "هی" مقدر ہے (یہ اس کی خبر ہے۔)۔ یا "أعنی" مقدر ہے (اور یہ اس کا مفعول یہ ہے) احمد مسلم ابوداؤد اور ترمذی کی روایت میں سہل بن سعد سے مروی ہے: أنا و كافل اليتيم هكذا۔

قوله: حبست نفسها على يتا ماها: ① جملہ مستانفہ ہے۔ ② صفت ثانی ہے۔ ③ بتقدیر "قد" حال ہے۔ یا بغیر تقدیر کے حال ہے اور ایک نسخہ میں "علی یتا ما ھا" کے الفاظ ہیں۔

أو ماتوا: کی تفسیر اگر "أو مامت" کے ساتھ کی جائے تو "او" برائے تنویع ہے۔ قاضیؒ فرماتے ہیں: امرأة آمت: بدل ہے، بیان و تفسیر کے قائم مقام ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس عورت کا خاوند چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مر گیا ہو یا جس عورت کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی ہو اور اس عورت نے محض اپنے یتیم بچوں کی خاطر کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کیا ہو بلکہ اپنے حسن و جمال اور جاہ عزت کے باوجود اپنے جذبات کو کچل کر ازدواجی زندگی کی خوشیوں اور مسرتوں سے دور رہی اور اپنے ان بچوں کی پرورش و دیکھ بھال میں

اس وقت تک اپنی جان کھپاتی رہی جب تک کہ وہ اس کے ساتھ رہے یہاں تک کہ اس نے ان کی پرورش میں مشغول رہ کر اپنی زندگی کے جوان ایام کو قربان اور اپنے حسن و جمال کو برباد کر دیا۔ تو حضور ﷺ نے ایسی حوصلہ مند عورت کے بارے میں فرمایا کہ وہ قیامت کے دن میرے اس قدر قریب ہوگی جس قدر یہ دونوں انگلیاں ہیں۔

صاحب مظاہر لکھتے ہیں: اس سے معلوم ہوا کہ جو عورتیں اپنے خاوند کی وفات یا طلاق کی وجہ سے بیوہ ہوگئی ہوں تو ان کو صبر و استقامت' عفت و پاکدامنی اور ترک زیب و زینت کو اختیار کرنا اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر دوسرا نکاح نہ کرنا اور ان بچوں کی صحیح پرورش و تربیت میں مشغول رہنا بڑی فضیلت کا حامل ہے۔

بیٹی کی پرورش والا جنت میں

۴۹۷۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَتْ لَهٗ اُنْثٰى فَلَمْ يَئِدْهَا وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهٗ عَلَيْهَا يَعْنِي الذُّكُوْرَ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ (رواه ابوداؤد)

أخرجه ابو داؤد في السنن ٥/ ٣٥٤ الحديث رقم ٥١٤٦، واحمد في المسند ١/ ٢٢٣۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کی بیٹی ہو اور اس نے اسے زندہ دفن نہ کیا اور نہ اسے ذلیل کیا اور نہ اس پر بیٹے کو ترجیح دی۔ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔ (ابوداؤد)

تشریح: لم یئد: بروزن لم یعد.

ولم یھنھا: اھانة سے ماخوذ ہے۔ حدیث مبارکہ (کے اس جملہ) میں آیت کریم کی طرف اشارہ ہے: ﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ط اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ط اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ﴾ [النحل: ۵۸ ۔ ۵۹] "حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خبر ملتی ہے تو اس کا منہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے اور اس کے دل کو دیکھو تو وہ اندوہناک ہو جاتا ہے اور اس خبر بد سے (جو وہ سنتا ہے) لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کہ آیا ذلت برداشت کر کے لڑکی کو زندہ رہنے دے یا زمین میں گاڑ دے۔ دیکھو یہ جو تجویز کرتے ہیں بہت بری ہے۔"

یعنی الذکور: "ولد" کا اطلاق لغوی اعتبار سے چونکہ لڑکا لڑکی دونوں پر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے "یعنی الذکور" فرمایا۔ اور یہ بھی احتمال ہے، کہ یہ تفسیر کسی اور راوی کی ہے۔ (فتامل)

"ولد" کی تفسیر" ذکور" یعنی صیغہ جمع کے ساتھ کی ہے، چونکہ "ولد" اسم جمع ہے۔

یا جنسیت کے معنی اضافت سے مستفاد ہو رہے ہیں،

اور ممکن ہے کہ ولد کی تفسیر" ذکر" کے بجائے" ذکور" کے ساتھ کرنے میں حفظ لسان از لفظ" ذکر" مقصود ہو۔ فتدبر۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "بنت" کی جگہ لفظ" انثی" استعمال کرنا تحقیر شان کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ" ابن" کی جگہ لفظ "ولد" استعمال کرنے میں" ابن" کی تعظیم شان کی طرف اشارہ ہے۔ اس تعبیر سے یہ اطلاع مقصود ہے کہ خواہشات نفسانی

کی پیروی سے بچے، اللہ کی چاہت کو اپنی مرضی پر مقدم رکھے اور اسی سبب سے اس پر دخول جنت کا ترتب ہے۔

مسلمان کی مدد پر مدد الٰہی

۴۹۸۰: وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اغْتِيْبَ عِنْدَهُ اَخُوْهُ الْمُسْلِمُ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلٰى نَصْرِهِ فَنَصَرَهُ نَصَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَاِنْ لَمْ يَنْصُرْهُ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلٰى نَصْرِهِ اَدْرَكَهُ اللّٰهُ بِهِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (رواه في شرح السنة)

أخرجه البغوي في شرح السنة ۱۳/۱۰۷ الحديث رقم ۳۵۳۰۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے پاس کسی مسلمان کی غیبت کی جائے اور وہ اس کی مدد پر قدرت رکھتا تھا اس نے اس کی مدد کی تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی مدد فرمائیں گے اور اگر قدرت کے باوجود مدد نہ کی تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی گرفت فرمائیں گے۔ (شرح السنۃ)

تشریح: من اغتیب: وصل میں "من" موصولہ کے نون پر کسرہ اور ضمہ دونوں درست ہیں۔

وھو یقدر علی نصرہ: جملہ حالیہ ہے۔ "من" کی طرف راجع ضمیر سے حال ہے۔

فنصرہ: شرط پر عطف ہو رہا ہے۔

نصرہ اللّٰہ...... : جملہ جزائیہ ہے۔

اسنادی حیثیت: اس حدیث کی سند میں ضعف ہے۔ لیکن اس کے شواہد بھی ہیں جن سے اس روایت کو تقویت حاصل ہے۔

(نقله ميرك عن التصحيح)

غیبت سے دفاع پر جزاء

۴۹۸۱: وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ذَبَّ عَنْ لَحْمِ اَخِيْهِ بِالْمَغِيْبَةِ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُعْتِقَهُ مِنَ النَّارِ۔ (رواه البيهقي في شعب الايمان)

أخرجه احمد في المسند ٦/٤٦١، والبيهقي في الشعب الايمان۔

ترجمہ: حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے بھائی کی غیر موجودگی میں اس کے گوشت سے دفاع کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے اس کو آگ سے آزاد کرنے کی ذمہ داری لے لیتے ہیں۔ (بیہقی شعب الایمان)

تشریح: بالمغیبة: یہ مصدر ہے یا اسم زمان یا مکان ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں: گویا کلام یوں ہے: من ذب عن غیبة اخیه فی غیبته، اس تقدیر پر "بالمغیبة" ظرف ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حال ہو، اس صورت میں مبالغہ سے کنایہ ہوگا۔

سندی حیثیت و تخریج: "التصحیح" میں لکھا ہے: اس حدیث کو طبرانی اور محی السنہ نے نقل کیا ہے، اور اس کی سند میں ایک راوی

ضعیف ہے۔ حافظ منذریؒ ''الترغیب'' میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام احمدؒ نے سند حسن کے ساتھ، ابن ابی الدنیا، اور طبرانی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ (نقلہ میرک) جامع صغیر میں ان الفاظ کے ساتھ ہے: من ذب عن عرض أخيه بالمغيبة كان حقا على الله ان يقيه من النار. اس حدیث کو احمد نے، اور طبرانی نے الکبیر میں اسماء بنت یزید سے روایت کیا ہے۔

دوزخ آزادی کی ذمہ داری

۴۹۸۲: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَرُدُّ مِنْ عِرْضِ اَخِيْهِ اِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يَرُدَّ عَنْهُ نَارَ جَهَنَّمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (رواه فی شرح السنة)

أخرجه البغوى في شرح السنة ١٣/١٠٦ الحديث رقم ٣٥٢٨، والترمذى فى ٤/٣٢٧ الحديث رقم ١٩٣١، واحمد فى المسند ٦/٤٥٠۔

ترجمہ: حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو مسلمان کسی مسلمان بھائی کی عزت کی حفاظت کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے اس کو دوزخ سے آزاد فرمانے کا ذمہ لے لیتا ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ ایمان کی مدد ہم پر لازم ہے۔

تشریح: قوله: ثم تلا هذه الآية [وكان حقا علينا نصر المؤمنين]:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ آیت استشہاد ہے'' الا کان حق علی اللہ ان یرد عنه'' کے لئے۔ اور'' عنه'' کی ضمیر'' المسلم الذاب عن عرض أخيه'' کی طرف راجع ہے۔ اور صیغہ عام استعمال کیا چنانچہ اس میں '' من سیق له الکلام''، کو دخول اولی حاصل ہوگا، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة: ٨٩] یہ اسلوب کلام ابلغ ہے، بہ نسبت اس کلام کے کہ اگر'' عليهم'' فرماتے، چونکہ موقع کنایہ ہے۔ اھ۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ بات مخفی نہ رہے کہ حدیث کی ابتداء میں موجود'' ما'' نافیہ ہے۔ اور'' من'' زائدہ ہے جو استغراق نفی کیلئے ہے۔ چنانچہ حکم عام ہے۔ اور حدیث میں کوئی چیز ایسی ہے ہی نہیں جو من سیق الکلام پر دلالت کرے۔ چہ جائیکہ دخول اولی مراد ہو۔

اور جہاں تک تعلق ہے آیت کا، سو ظاہر یہ ہے کہ '' عليهم'' سے عدول کر کے'' کافرین'' فرمانا اس لئے ہے، تا کہ اس حکم سے آئندہ ایمان لانے والے مؤمنین خارج ہو جائیں، اور ان کافروں کے علاوہ دیگر کفار اس حکم میں شامل ہو جائیں، علاوہ ازیں تنبیہ ہے کہ زندہ کافروں پر لعنت بھیجنا درست نہیں، جب کہ وہ محصور ہوں، چونکہ مدار تو خاتمہ پر ہے۔

اور امام طیبیؒ کا یہ کہنا: وفيه ان مفهوم المسلم والمؤمن واحد كما في قوله تعالى: ﴿فاخرجنا من كان فيها من المؤمنين فما وجدنا فيها غير بيت من المسلمين﴾ محل اشکال ہے، اس میں اشکال یہ ہے کہ درست بات یہ ہے [illegible] مسلم کے مفہوم لغوی و شرعی کے اعتبار سے ~~متغایر~~ [illegible] کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے: ﴿قالت الأعراب

آمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا أسلمنا﴾ اس کی دلیل حدیث جبرئیل بھی ہے، کہ وہاں ایمان واسلام کی تعریف میں تغایر ہے، ہاں اتنی بات درست ہے، کہ فقہاء و متکلمین کے عرف میں یہ دونوں ایک دوسرے کی جگہ مستعمل ہیں، چونکہ انقیاد ظاہری، انقیاد باطنی کے بغیر صحیح نہیں، اور اسی طرح اس کے برعکس بھی۔ چنانچہ ان دونوں کا تحقق ضروری ہے۔ مزید یہ کہ اعمال اسلام میں سے کسی عمل کے ترک کرنے سے عدم انقیاد ظاہر لازم نہیں آتا۔ چونکہ ترک کسلاً اور اعراضاً میں فرق ہے، چنانچہ جو شخص نماز کو عمداً ترک کرتا ہے، بایں اعتبار کہ وہ وجود ترک صلوٰۃ کا اعتقاد رکھتا ہے۔ یا کسی کو قتل کرتا ہے لیکن قتل کو حرام نہیں سمجھتا تو یہ شخص کافر ہو جائے گا، یہی وہ مذہب ہے کہ جو اہل حق اہل سنت والجماعت اور معتزلہ، خوارج اور باقی اہل بدعت وضلالت کے درمیان فارق ہے۔

تخریج: منذریؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

من ردّ عن عرض أخیه ردّ الله عن وجهه النار یوم القیامة اور لکھا ہے، کہ یہ حدیث حسن ہے۔ علاوہ ازیں ابن ابی الدنیا نے اور ابوالشیخ نے ''کتاب التوبیخ'' میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے:

قال: من ذب عن أخیه رد اللّٰه عنه عذاب النار یوم القیامة، وتلا رسول اللّٰه ﷺ: ﴿وکان حقا علینا نصر المؤمنین﴾ [الروم-٤٧] [نقله میرك]۔

الجامع الصغیر میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے: من رد عن عرض أخیه رد اللّٰه عن وجهه النار یوم القیامة.

اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے حضرت ابوالدرداء سے روایت کیا ہے، اور بیہقی نے حضرت ابوالدرداء سے ان الفاظ کے ساتھ بھی روایت کیا ہے:

من ردّ عن عرض أخیه کان له حجابا من النار.

حرمت وعزت میں مددگار کو خصوصی مدد

۴۹۸۳: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ اِمْرِءٍ مُسْلِمٍ يَخْذُلُ اِمْرَأً مُسْلِمًا فِيْ مَوْضِعٍ يُنْتَهَكُ فِيْهِ حُرْمَتُهٗ وَيُنْتَقَصُ فِيْهِ مِنْ عِرْضِهٖ اِلَّا خَذَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ مَوْطِنٍ يُحِبُّ فِيْهِ نُصْرَتَهٗ وَمَا مِنِ امْرِءٍ مُسْلِمٍ يَنْصُرُ مُسْلِمًا فِيْ مَوْضِعٍ يُنْتَقَصُ فِيْهِ مِنْ عِرْضِهٖ وَيُنْتَهَكُ فِيْهِ مِنْ حُرْمَتِهٖ اِلَّا نَصَرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ مَوْطِنٍ يُحِبُّ فِيْهِ نُصْرَتَهٗ۔ (رواه ابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٥/١٩٧ الحدیث رقم ٤٨٨٤، واحمد فی المسند ٤/٣٠۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی مسلمان کی کسی ایسی جگہ آبروریزی کرے جہاں اس کی بے عزتی کی جارہی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسی جگہ ذلیل کرے گا جہاں وہ مدد کا طلبگار ہوگا اور جو کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کی ایسی جگہ مدد کرے جہاں اس کی حرمت وعزت ختم کی جارہی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی ایسی جگہ مدد فرمائے گا جہاں وہ مدد کو پسند کرتا ہوگا۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: مامن امرئ مسلم یخذل ۔۔۔ یحب فیه نصرته:
یخذل: ذال کے ضمہ کیساتھ ہے۔
ینتھك: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔
وینقص: "انقاص" مصدر سے صیغہ مجہول کے ساتھ ہے، لازم ومتعدی ہر دوطرح مستعمل ہے۔
ینتھك فیه حرمته: الجامع الصغیر کی روایت میں "من حرمته" کے الفاظ ہیں۔ اور شاید کہ یہی درست ہے، چونکہ درایۂ حسن مقابلہ کا تقاضا بھی یہی ہے۔ البتہ الجامع کی روایت میں" ینتقص فیه من عرضه وینتهك فیه من حرمته"، ترتیبی اعتبار سے یہ انسب ہے۔ مشکوٰۃ میں یہاں ترتیب برعکس ہے: من عرضه وینتهك
قوله: وما من امرئ مسلم ینصر مسلما الخ: اور ایک نسخہ میں "ینتھك" کے بعد "فیه" کا اضافہ بھی ہے۔ یہ نسخہ الجامع کی روایت کے موافق ہے۔
الا نصره الله فی موطن: اس میں "تفنن فی العبارۃ" ہے۔ (بایں طور کہ "موضع" فرمایا اور ایک جگہ موطن فرمایا) الجامع کی روایت میں دونوں جگہ لفظ "موطن" ہے۔ اور ممکن ہے کہ یہ حدیث ان اشادات باری تعالیٰ سے مقتبس ہو: ﴿جزاء وفاقا﴾ [النبأ: ۲۱] ﴿ومن یعمل سوءًا یجزبه﴾ [النساء: ۱۲۳]
تخریج: امام احمد اور ضیاء نے بھی یہ حدیث حضرت جابر اور طلحہ بن سعد سے نقل کی ہے۔

عیب پر پردہ ڈالنے والا زندہ درگور کو زندہ کرنے والا ہے

۴۹۸۴: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ رَاٰى عَوْرَةً فَسَتَرَهَا كَانَ كَمَنْ اَحْيٰى مَوْءُدَةً۔ (رواه احمد والترمذی وصححه)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ۵/ ۲۰۰ الحدیث رقم ۴۸۹۱، والترمذی ۴/ ۲۸۷ الحدیث رقم ۱۹۳۰، واحمد فی المسند ۴/ ۱۴۷۔

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی کا مخفی عیب دیکھے اور اس کی پردہ پوشی کرے تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو زندہ درگور کو زندہ کرے۔ احمد وترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

تشریح: عورة: ہر وہ چیز جس کے ظہور کو انسان مکروہ سمجھتا ہو۔ چنانچہ یہاں "عورة" سے مراد عیب یا امر قبیح ہے، یا ستر ہے، کہ جس نے کسی مسلمان کے ستر کو اپنے پاس موجود کپڑے سے چھپایا، یا اسی کے کسی کپڑے سے چھپایا، اس کو یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ای: من رای خللا من هتك ستر او وقع فی عرض ونحوهما۔
كان كمن أحیا موءودة: اس جملہ کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں: (۱) اس شخص کا ثواب اس شخص کے ثواب کی طرح ہوگا جس نے موءودہ کو حیات بخشی ہو، بایں طور کہ کسی کو دیکھا کہ وہ لڑکی کو زندہ درگور کرنا چاہتا ہے، چنانچہ اس نے اس

شخص کو اس ارادہ سے باز رکھا، یا کسی حیلہ وغیرہ سے اس بچی کو بچانے کی کوشش کی ہو۔ ▣ مظہرؒ فرماتے ہیں، یعنی کسی قبر میں کسی زندہ شخص کو مدفون دیکھا، تو اس مدفون کو قبر سے اس جذبہ کے تحت نکالا کہ کہیں یہ مر نہ جائے،

وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس شخص کی کوئی معیوب بات ظاہر ہو جاتی ہے تو مارے شرم کے گویا مردہ کے ہو جاتا ہے اور یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش میں مر جاتا کہ میرا عیب ظاہر نہ ہوتا اور مجھ کو اپنی یہ رسوائی دیکھنی نہ پڑتی۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی کے عیب چھپاتا ہے تو گویا اس کی اس شرمندگی اور خجالت کو دفع کرتا ہے جو اس کے لئے موت کے برابر ہے' اس اعتبار سے کسی کے عیب کو چھپانا اس کو زندگی بخشنے کے مترادف ہوا۔

اور ممکن ہے کہ وجہ مشابہت ''مناسبت ضدیت'' ہو۔ چونکہ شیء سے اس کی ضد تازہ ہوتی ہے۔ چنانچہ مطلب یہ ہوا: **من ستر ما شرع الله ستره كان كمن رفع الستر عما لم يشرع ستره.** یا وجہ شبہ ''اصلاح الفساد'' ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ وجہ شبہ ''امر عظیم'' ہو۔ یعنی **من ستر علی مسلم فقد ارتكب أمرا عظيما، كمن أحيا موء ودة، فانه امر عظيم.** چنانچہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اس فعل شنیع کی فخامت پر دال ہوگا۔ جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿ومن أحياها فكانما أحيا الناس جميعا﴾ [المائدۃ۔۳۲] صاحب کشاف لکھتے ہیں: **فيه تعظيم قتل النفس واحيائها في القلوب ليستمر الناس على الجسارة عليها، ويتراغبوا في المحاماة على حرمتها، لأن المتعرض لقتل النفس اذا تصور قتلها بصورة قتل جميع الناس عظم ذلك عليه فثبطه، وكذلك الذى أراد احياء ها۔ كلامه.**

پس اسی طرح جو شخص کسی مسلمان کے عیب وعزت وآبرو کی پردہ پوشی اس تصور کے ساتھ کرتا ہے، کہ یہ زندہ درگور ہونے والی کا احیاء ہے، تو اس پردہ پوش کے دل میں ستر عورۂ مومن کی عظمت جاگزین ہو جاتی ہے، چنانچہ وہ اس سلسلے میں بھرپور سعی وکوشش کرتا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ معنی مراد لینا، ماقبل میں مذکور وجہ تشبیہ کے منافی نہیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں: اس کا طلب یہ ہے کہ جس نے ایک مسلمان کے خون بہانے کو حلال جانا، گویا کہ اس نے تمام لوگوں کے خون کو حلال جانا۔ چونکہ یہ بھی نفس ہے اور وہ بھی نفس ہے، نفس نفس میں کوئی فرق نہیں۔ یہ قول ابن عباسؓ کا ہے۔

یا اس وجہ سے کہ اس کو قصاصاً قتل کیا جائے گا، جیسا کہ اگر یہ تمام انسانوں کو قتل کر ڈالتا، اس کی جزاء جہنم ہے۔ یہ قول مجاہد کا ہے۔

یا یہ کہ قباحت وگناہ کے اعتبار سے یہ اس شخص کی مانند ہے، جس نے ساری مخلوق کو قتل کر ڈالا ہو۔ یہ قول قتادہ کا ہے۔ اس قول سے قتل کے عظیم الشان ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ یہ قول اسی صورت میں درست ہوسکتا ہے، کہ اس کو وعید وتہدید پر محمول کیا جائے۔

اور بیضاویؒ فرماتے ہیں: گویا کہ اس نے تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا اس اعتبار سے کہ ایک کو قتل کرنا اور سب کو قتل کرنا اللہ کے غضب اور عذاب عظیم کے اصل استجلاب میں برابر ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تخریج: میرک "التصحیح" سے نقل کرتے ہیں: اس حدیث کو امام احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اس میں قصہ بھی ہے اور متعدد طرق سے مروی ہے۔ اھ۔ الجامع الصغیر میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

من رأى عورة فسترها كان كمن أحيا موء ودة من قبرها اس حدیث کو بخاریؒ نے "**الادب المفرد**" میں، اور ابوداؤد و حاکم نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے۔

ہر مسلمان دوسرے کا آئینہ ہے

۴۹۸۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهُ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَدَکُمْ مِرْاٰةَ اَخِیْهِ فَاِنْ رَاٰی بِهٖ اَذًی فَلْیُمِطْ عَنْهُ (رواه الترمذی وضعفه وفی روایة له ولابی داؤد) اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰةُ الْمُؤْمِنِ وَالْمُؤْمِنُ اَخُوا الْمُؤْمِنِ یَکُفُّ عَنْهُ ضَیْعَتَهٗ وَیَحُوْطُهٗ مِنْ وَّرَائِهٖ۔

أخرجه ابوداؤد فی السنن ۵/ ۲۱۷ الحدیث رقم ۴۹۱۸، والترمذی فی ۴/ ۲۸۷ الحدیث رقم ۱۹۲۹۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص اپنے بھائی کا آئینہ ہے ترمذی نے اسے ضعیف کہا ہے۔ ابوداؤد کی روایت میں اس طرح ہے ہر مؤمن دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے اور مؤمن مؤمن کا بھائی ہے اس سے ہلاکت کو دور کرتا ہے اور اس کی غیر حاضری میں اسکی حفاظت کرتا ہے۔

تشریح: قوله: **ان أحد كم مرآة أخيه فان رأى به اذى فليمط عنه:**

مرآۃ: میم کے کسرہ کے اور ہمزہ کے مد کے ساتھ۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح آئینہ دیکھنے والا اس آئینہ میں اپنے خدوخال کو دیکھتا ہے اور اس میں جو عیب و خرابی ہوتی ہے اس سے آگاہ ہو جاتا ہے خواہ وہ عیب کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو' اسی طرح ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے حق میں اتنا حساس اور بہی خواہ ہونا چاہئے کہ اگر کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی میں کوئی عیب دیکھے اور اس کو کسی برائی میں مبتلا پائے تو اس کو فوراً آگاہ کر دے اور اس عیب و برائی کی مضرت و ہلاکت کو واضح کر دے اور یہ آگاہ کرنا اور واضح کرنا پوشیدہ طور پر ہوتا کہ اس کے اس عیب سے دوسرے لوگ مطلع نہ ہوں اور وہ دنیا کی نظر میں ذلیل و رسوا نہ ہوں۔ جیسا کہ آئینہ اپنے دیکھنے والے کو اس کے عیب سے آگاہ کرتا ہے کہ کسی دوسرے شخص کو معلوم نہیں ہوتا' نیز اس مسلمان کو بھی چاہئے کہ جب کوئی مسلمان اس کو اس کے کسی عیب سے آگاہ کرے تو وہ فوراً اس عیب پر مطلع ہو جائے اور اپنی ذات کو اس کے داغ سے پاک و صاف کرے جیسا کہ کوئی شخص آئینہ میں اپنے چہرے پر کسی داغ و دھبہ کو دیکھ کر فوراً مطلع ہو جاتا ہے اور چہرے کی صفائی و زیبائش کرتا ہے!

کوئی مسلمان اپنے کسی بھائی مسلمان کو کسی برائی' کسی عیب اور کسی ناشائستہ حرکت میں مبتلا دیکھے تو اس احساس کے ساتھ کہ یہ میرا بھائی نقصان و تباہی کے راستہ پر لگ گیا ہے اور اس کا نقصان میرا نقصان ہے اور اس کی تباہی میری تباہی ہے اس کو اس عیب و برائی سے بچانے کی کوشش کرے رویم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: **لايزل الصوفية بخير ماتنا فروا 'فاذا اصطلحوا هلكوا** صوفیا اس وقت تک خیر و بھلائی پر ہیں جب تک وہ ایک دوسرے کے احوال کی اصلاح کی سعی و کوشش کرتے

رہیں گے۔ جب بھی وہ ایک دوسرے کی طرف سے بے پرواہ اور ایک دوسرے کے احوال سے اتفاق کر لیں گے ہلاکت میں پڑ جائیں گے۔

قوله: ويحوط من ورآئه: کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایمانی اخوت کا مظہر ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی عدم موجودگی میں بھی اس کی عزت وآبرو اور اس کی جان ومال کا تحفظ کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ چنانچہ کوئی مسلمان نہ صرف یہ کہ خود کسی مسلمان کی غیبت اور عیب جوئی نہیں کرتا۔ اگر کوئی دوسرا شخص کسی مسلمان کی غیبت کرتا ہے اور اس کو قدرت حاصل ہے تو یہ اس پر خاموش نہیں رہتا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے: **رحم الله امرًا اهدیٰ الی بعیوب نفسی** اور (عیب کو) بصیغہ جمع لانے میں اشارہ ہے کہ نفس معدن عیوب ہے، اور منبع عیوب بھی ہے، اسی وجہ سے کسی کہنے والے نے کہا ہے:

وجودك ذنب لا يقاس به ذنب

تیرا وجود (اتنا بڑا اور) ایسا گناہ ہے کہ جس پر کسی (بھی) گناہ کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انصار ومہاجرین کی ایک مجلس میں فرمایا: **أرأيتم لو ترخصت في بعض الأمور ماذا كنتم فاعلين مرتين او ثلاثا؟ فلم يجيبوا. قال بشير بن سعد: لو فعلت ذلك قومناك تقويم القدح. قال عمر: أنتم اذاً أنتم.** "مجھے بتاؤ اگر میں چند امور میں رخصت دے دوں تو تم کیا کرو گے؟ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ بات دو یا تین مرتبہ فرمائی۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بشیر بن سعد نے کہا: اگر آپ ایسا کریں گے تو ہم آپ کو نیزے کی طرح سیدھا کر دیں گے۔ یہ سن کر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا: تب تو تم، تم ہو"۔ (کذا فی کتاب العوارف)

ندیم الباری خواجہ عبداللہ انصاری فرماتے ہیں: ہائے! ہائے! اللہ کے راستے پر گامزن سالکین میں اتنا تفاوت! لوہا ایک ہی بھٹی میں ڈھلتا ہے، اس کے ایک ٹکڑے سے آئینہ بنتا ہے کہ جس میں اپنی محبوب صورت دیکھی جاتی ہے، اور دوسرے سے لوہے کا وہ سم بنتا ہے جو سواری کے کھر تلے لگتا ہے۔ ان کا اشارہ اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرف تھا: ﴿**أولئك كالأنعام بل هم أضل أولئك هم الغافلون**﴾ [الاعراف۔۱۷۹]

﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۭ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ [المطففين:۱۸۔۲۸] "(یہ بھی) سن رکھو کہ نیکوکاروں کے اعمال علیین میں ہیں اور تم کو کیا معلوم علیین کیا چیز ہے؟ ایک دفتر ہے لکھا ہوا جس کے پاس مقرب (فرشتے) حاضر رہتے ہیں بیشک نیک لوگ چین میں ہوں گے تختوں پر بیٹھے ہوئے نظارے کریں گے تم ان کے چہروں ہی سے راحت کی تازگی معلوم کر لو گے ان کو خالص شراب سربمہر پلائی جائے گی جس کی مہر مشک کی ہوگی۔ تو (نعمتوں کے) شائقین کو چاہیے کہ اس سے رغبت کریں اور اس میں تسنیم (کے پانی) کی آمیزش ہوگی وہ ایک چشمہ ہے جس میں سے (خدا کے) مقرب پئیں گے"۔

عارف ابن فارض فرماتے ہیں:

علیك بها صرفا وان شئت مزجها،

فعدلك عن ظلم الحبيب هو الظلم.

توضیح: اس حدیث کا ابتدائی ٹکڑا'' المؤمن مرآة المؤمن ''مستقل حدیث کے طور پر بھی مروی ہے۔اس کو امام طبرانی نے اوسط میں اور ضیاء نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

عیب جس کو پُل صراط پر روک لیا جائے گا

۴۹۸۶: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَمٰى مُؤْمِنًا مِّنْ مُنَافِقٍ بَعَثَ اللّٰهُ مَلَكًا يَحْمِيْ لَحْمَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنْ نَارِ جَهَنَّمَ وَمَنْ رَمٰى مُسْلِماً بِشَيْءٍ يُرِيْدُ بِهِ شَيْنَهُ حَبَسَهُ اللّٰهُ عَلٰى جِسْرِ جَهَنَّمَ حَتّٰى يَخْرُجَ مِمَّا قَالَ۔ (رواه ابوداؤد)

أخرجه ابوداوٗد في السنن ١٩٦/٥ الحديث رقم ٤٨٨٣، واحمد في المسند ٤٤١/٣۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی مسلمان کو منافق سے محفوظ رکھے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک ایسا فرشتہ بھیجے گا جو اس کے گوشت کی دوزخ کی آگ سے حفاظت کرے گا اور جو شخص کسی مسلمان کی عیب جوئی کی خاطر گالی دے اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ کے پل پر روک دے گا یہاں تک کہ وہ (اس کی سزا پا کر) اس سے بری ہو جائے۔ (ابوداؤد)

تشریح: یہاں''منافق'' سے مراد غیبت کرنے والا شخص ہے۔

اس کو''منافق'' اس لئے فرمایا گیا ہے کہ غیبت کرنے والا کسی شخص کے منہ پر اس کی برائی نہیں کرتا بلکہ اگر وہ سامنے ہوتا ہے تو دل میں اس کی طرف سے برائی رکھنے کے باوجود اس کی خیر خواہی کا دم بھرتا ہے اور پیٹھ پیچھے اس پر عیب لگاتا ہے۔(غیبت کرنا اور عیب جوئی منافق کا کام ہے جس کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ۔)

قولہ: حَتّٰى يَخْرُجَ مِمَّا قَالَ کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ شخص اپنی اتہام تراشی کا شکار بنانے والے شخص کو راضی نہ کر لے گا یا شفاعت کے ذریعہ اور یا گناہ کے بقدر عذاب بھگت لینے کے ذریعہ الزام تراشی کے گناہ سے صاف نہ ہو جائے گا اس وقت تک اس کی گلوخلاصی ممکن نہیں ہوگی۔

قولہ: ومن رمی مسلما: میں تفنن ہے۔اور اشارہ ہے کہ (مؤمن و مسلم کا) ایک دوسرے پر اطلاق درست ہے۔

یرید به شینه: یہ جملہ ضمیر سے حال ہے۔نیز یہ احتراز ہے اس صورت سے کہ جب اس سے مراد زجر ہو یا کسی دوسرے شخص کو اس سے بچانا مقصود ہو،قصہ مختصر یہ کہ جواز شرعی سے احتراز ہے۔

جسر جهنم: اس کی تفصیل جلد نہم میں ملاحظہ فرمائیے۔

توضیح: امام میرکؒ نے ذکر کیا ہے، کہ ابوداود نے اس روایت کو سهل بن معاذ بن انس عن أبيه کے طریق سے روایت کیا

اللہ تعالیٰ کے ہاں بہترین پڑوسی

۴۹۸۷: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ الْاَصْحَابِ عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرُهُمْ لِصَاحِبِهٖ وَخَيْرُ الْجِيْرَانِ عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرُهُمْ لِجَارِهٖ۔

(رواه الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حديث حسن غريب)

أخرجه الترمذي في السنن ٥/٢٩٤ الحديث رقم ١٩٤٤، والدارمي في ٢/٢٨٤ الحديث رقم ٢٤٣٧، وأحمد في المسند ٢/١٦٨۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اللہ کے ہاں بہتر وہ شخص ہے جو اپنے ساتھی کے ساتھ بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں کا بہترین خیر خواہ ہو۔ (ترمذی' دارمی) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے دوستوں اور اپنے ہمسائیوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے اور ہر حالت میں ان کا خیر خواہ رہتا ہے تو وہ نہ صرف بہترین دوست اور بہترین پڑوسی قرار پاتا ہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے بہت زیادہ ثواب بھی ملتا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام میرک رحمہ اللہ نے فرمایا: اس کی اسناد جید ہے، اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

اور الجامع الصغیر میں ہے کہ خير الأصحاب صاحب اذا ذكرت الله أعانك، وان نسيت ذكرك اس کو ابن ابی الدنیا نے "کتاب الاخوان" میں حسن سے مرسلاً روایت کیا ہے۔

اچھے عمل کی نشانی

۴۹۸۸: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ لِيْ اَنْ اَعْلَمَ اِذَا اَحْسَنْتُ اَوْاِذَا اَسَأْتُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعْتَ جِيْرَانَكَ يَقُوْلُوْنَ قَدْ اَحْسَنْتَ فَقَدْ اَحْسَنْتَ وَاِذَا سَمِعْتَهُمْ يَقُوْلُوْنَ قَدْ اَسَأْتَ فَقَدْ اَسَأْتَ۔ (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجه في السنن ٢/١٤١١ الحديث رقم ٤٢٢٢، واحمد في المسند ١/٤٠٢۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا مجھے یہ کس طرح معلوم ہو کہ میں نے یہ عمل اچھا کیا یا برا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم اپنے پڑوسی کو یہ کہتے سنو کہ تم نے اچھا کیا تو تم نے اچھا کیا اور جب اس سے سنو کہ تو نے برا کیا ہے تو تو نے برا ہی کیا ہے۔ (ابن ماجہ)

تشریح: قوله: كيف لي أن أعلم اذا أحسنت أو اذا أسأت:

اذا أحسنت او اذا أسأت: ایک نسخہ میں (او: کے بجائے) واو ہے، یہ واو بمعنی "أو" ہے۔

''پڑوسیوں'' سے سارے پڑوسی مراد ہیں کیونکہ (دو چار پڑوسی تو کسی غلط بات پر اتفاق کر سکتے ہیں لیکن) عام طور پر سارے پڑوسیوں کا کسی گمراہی پر متفق ہونا ممکن نہیں ہوسکتا۔ صاحب ''مظاہر'' لکھتے ہیں: حدیث کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ اس کے پڑوسی اہل حق' صاحب انصاف اور کسی کام کی اچھائی کو سمجھنے والے ہوں نیز وہ اس شخص سے نہ بہت زیادہ محبت وتعلق رکھتے ہوں اور نہ بہت زیادہ دشمنی وعداوت۔

یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس عارفانہ قول کی تائید کرتی ہے: **السنة الخلق اقلام الحق**۔ یعنی مخلوقِ خدا کی زبان حق تعالیٰ کا قلم ہے۔ اسی مفہوم کو ہمارے یہاں اس محاورہ ''زبان خلق کو نقارۂ خدا'' کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے' کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

؎ برا کہے جسے عالم اُسے برا سمجھو ☆ زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

تخریج: اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں، احمد نے اپنی مسند میں اور طبرانی نے روایت کیا ہے، ابن ماجہ کی روایت کے رجال، صحیحین کے رجال ہیں۔ سوائے ان کے شیخ محمد بن یحیٰی کے۔ ان سے امام بخاری نے تو روایت لی ہے، لیکن امام مسلم نے نہیں لی۔ (کذا فی الصحیح) اور الجامع الصغیر میں ہے کہ اس حدیث کو امام احمد، ابن ماجہ اور طبرانی نے ابن مسعود سے، اور ابن ماجہ نے کلثوم الخزاعی سے بھی روایت کیا ہے۔

لوگوں کے ساتھ ان کے مرتبے کے مطابق سلوک کرو

۴۹۸۹: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابوداوٗد في السنن ۵/۱۷۳ الحديث رقم ۴۸۴۲۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر ایک آدمی کو اس کے درجہ پر رکھو۔ (ابوداوٗد)

تشریح: **أنزلوا**: انزال مصدر سے امر کا صیغہ ہے۔

منازلهم: منصوب بنزع الخافض ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی جو حیثیت عرفی اور جس کا جو متعین مرتبہ ودرجہ ہے اس کے ساتھ اسی کے مطابق سلوک وتعظیم کرو۔ یہ نہیں کہ ہر ایک شخص کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کیا جائے کیوں کہ کوئی شخص شریف اور صاحب عزت ہوتا ہے اور کوئی شخص ذلیل وکمینہ' اگر دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ غیر موزوں ہوگا اس لئے تعظیم وتکریم میں ہر ایک کے ساتھ ایسا سلوک کرو جو نہ تو تکلیف پہنچائے اور شکایت پیدا ہونے کا باعث ہو اور نہ درجہ ومرتبہ کے غیر مناسب۔ اس سے معلوم ہوا کہ خادم ومخدوم کے ساتھ برابری کا سلوک نہ کرنا چاہئے بلکہ دونوں میں سے ہر ایک کو اس کے درجہ پر رکھنا چاہئے اور یہ بات قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ثابت ہوتی ہے: ﴿وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ﴾ [الزخرف: ۳۲] ایک اور فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ﴾ [المجادلة: ۱۱]

[illegible] سے معلوم ہوا کہ جو علماء تفاضیل انبیاء وتفضیل خلفاء وغیرہ کے قائل ہیں اگر کچھ لوگ امراء واغنیاء اور ارباب

اقتدار کے تئیں اختیار کیے جانے والے اعزاز واکرام کو اس حدیث کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کریں تو ان کی یہ کوشش گمراہی کے مترادف ہوگی (کیونکہ علماء تو اہل علم وفضل کو ان کے علم وفضل کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فضیلت دیتے ہیں اور اس فضیلت دینے میں کسی کی حقارت وتوہین کا جذبہ ہرگز شامل نہیں ہوتا جب کہ دنیادار لوگ غریب ومسکین اور محتاج لوگوں کے ساتھ تو حقارت ونفرت کا برتاؤ کرتے ہیں چاہے کوئی غریب شخص علم وفضل کے بڑے سے بڑے درجہ کا حامل ہی کیوں نہ ہو اور امراء مقتدرین کی تعظیم وعزت کرتے ہیں۔ چاہے وہ کتنے ہی بڑے فاسق وفاجر کیوں نہ ہوں۔ اگر ایسے دنیادار لوگ اس حدیث سے استدلال کرنے لگیں تو اس حدیث کا اس کے سوا اور کیا مطلب رہ جائے گا کہ ایک طرف تو وہ علماء ہیں جنہیں اس حدیث سے استدلال اور استنباط میں اللہ تعالیٰ نے سرفراز کیا اور دوسری طرف وہ بدنصیب دنیادار ہیں جن کو گمراہ کیا۔) قد علم کُلُّ أناسٍ مَشْرَبَهُمْ ......

توضیح سند: امام ابوداؤد نے اس روایت کو میمون بن ابی شعیب عن عائشة کے طریق سے روایت کیا ہے، اور فرماتے ہیں: میمون بن شعیب نے حضرت عائشہ کو نہیں پایا۔ ابوبکر رازی سے سوال کیا گیا: میمون عن عائشة متصل؟ تو انہوں نے جواب دیا نہیں۔ (نقلہ میرک عن التصحیح)

جامع صغیر میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام مسلم اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ چنانچہ صاحب مصابیح اور صاحب مشکوۃ دونوں حضرات پر اعتراض وارد ہوتا ہے، اور اگر جامع کی نقل کو درست مان لیا جائے، تو صاحب تصحیح پر بھی اعتراض وارد ہوتا ہے۔

خرائطی نے ''مکارم الاخلاق'' میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

أنزل الناس منازلهم من الخير والشرو أحسن أدبهم على الأخلاق الصالحة.

الفصل الثالث:

محبتِ رسول کے تین تقاضے

۴۹۹۰: عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ قُرَادٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّاَیَوْماً وَجَعَلَ اَصْحَابُهٗ یَتَمَسَّحُوْنَ بِوَضُوْئِهٖ فَقَالَ لَهُمُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا یَحْمِلُکُمْ عَلٰی هٰذَا قَالُوْا حُبُّ اللّٰہِ وَرَسُوْلِهٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یُّحِبَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَهٗ اَوْ یُحِبَّهُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُهٗ فَلْیَصْدُقْ حَدِیْثَهٗ اِذَا حَدَّثَ وَلْیُؤَدِّ اَمَانَتَهٗ اِذَا اؤْتُمِنَ وَلْیُحْسِنْ جِوَارَمَنْ جَاوَرَهٗ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٢/ ٢٠١ الحديث رقم ١٥٣٣۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن ابی قراد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تو صحابہ کرامؓ نے آپ کے بچے ہوئے پانی سے تبرک حاصل کرتے ہوئے اسے اپنے جسموں پر ملنا شروع کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں اس بات پر کس چیز نے آمادہ کیا انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص یہ چاہتا ہے

کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرے یا اس کے ساتھ اللہ اور اس کا رسول ﷺ محبت کرے تو اسے چاہیے کہ وہ جب بات کرے تو سچ بولے۔ اگر اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ اسے ادا کرے۔ اپنے پڑوسی کے ساتھ بہتر سلوک کرے۔(بیہقی)

راویٔ حدیث:

عبدالرحمٰن بن ابی قراد۔ یہ عبدالرحمٰن بن ابوقراد "اسلمی" ہیں۔ اہل حجاز میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے ابوجعفر خطمی وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ "قراد" قاف کے پیش اور غیر مشدّد دال کے ساتھ ہے۔

تشریح: بوضوئه: واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ بعض حضرات نے واؤ کے ضمہ اور حذف مضاف "ماء" کے ساتھ بیان کیا ہے، لیکن یہ توجیہ نہایت بعید ہے۔

فلیصدق: دال کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: صدق، قاف کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ "کذب" کی ضد ہے۔ یا یہ کہ بفتح الاول مصدر ہے، اور بکسر الاول اسم ہے، (بواسطہ حرف جر و بدون واسطہ ہر دو مستعمل ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے:) صدق فی الحدیث. صدق فلانا الحدیث او القتال. صدقه تصدیقا، کذبه کا متضاد ہے۔

اؤتمن: ہمزہ (یعنی ہمزہ ثانیہ) کے سکون کے ساتھ ہے۔ حالت وصل میں الف سے بھی بدلا جاتا ہے۔ یہ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ اور (از روئے رسم الخط) واؤ کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ چونکہ جب ماقبل پر وقف کر کے آگے پڑھیں گے تو دوسرے ہمزہ کو واؤ سے بدلنا واجب ہوگا۔

اکثر نسخوں میں یاء کے ساتھ لکھا ہوا ہے، اس سے دھوکا نہ کھائیں یہ ایک غلطی ہے، جس کا منشاء آداب رسم الخط اور آداب وصل و فصل پر قلت اطلاع ہے۔ یہ مستقل علم ہے۔ بلکہ یہ دونوں علوم، قواعد نحویہ و صرفیہ سے ہٹ کر کلمہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی قبیل سے یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے: ﴿فلیؤد الذی اؤتمن أمانته﴾ [البقرہ۔۲۸۳]

جوار: جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

علی هذا: اسم اشارہ کا مشار الیہ محذوف ہے۔ ای: التمسح.

حب الله ورسوله: یہ مبتدا محذوف کیلئے خبر ہیں۔ "الحامل" ہے یا فعل محذوف ہے۔ أی: حملنا.

بوضوئه: یہاں دو معنوں میں سے کوئی ایک معنی مراد ہو سکتا ہے۔ ایک تو وہ پانی ہے جو وضو کرنے کے بعد برتن میں بچ گیا تھا اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جو وضو کے وقت حضور ﷺ کے اعضاء مبارک سے جدا ہو کر گر رہا تھا۔

اَوْ یُحِبَّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ: میں حرف "او" تنویع کے لئے ہے (واضح رہے کہ ایک درجہ تو بندہ کا اللہ و رسول ﷺ سے محبت رکھنا ہے اور دوسرا درجہ اللہ و رسول ﷺ کا بندہ سے محبت رکھنا ہے ظاہر ہے کہ دوسرا درجہ پہلے درجہ سے کہیں بالا ہے لیکن حقیقت میں دونوں درجے ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ بایں طور کہ ہر کوئی اپنے دوست دار کو دوست رکھتا ہے)

یا یہ کہ حرف "او" دراصل لفظ "بل" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا کہ جو شخص یہ پسند کرتا ہے اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھے بلکہ جو شخص پسند کرتا ہو کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ اس سے محبت کرے تو اس کو

چاہئے...... الخ") یہ قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ایک احتمال یہ بھی ہے کہ حرف "او" راوی کے شک کو ظاہر کرتا ہے (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں یا تو یہ فرمایا تھا کہ جو شخص اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا چاہتا ہو یا یہ فرمایا تھا کہ جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اللہ اور اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس سے محبت کرے۔)

بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ ایسی باتوں کے ذریعہ کرنا کہ جو نفس پر چنداں شاق نہیں، کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس دعوے کے ثبوت کے لئے ضروری ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے ان کو اختیار کیا جائے اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے اجتناب کیا جائے خصوصاً ان احکام پر زیادہ توجہ و مستعدی اور زیادہ پابندی کے ساتھ عمل کیا جائے جن کا تعلق لوگوں کے حقوق اور باہمی معاملات سے ہو اور حقوق و معاملات بھی وہ کہ جن سے اکثر و بیشتر واسطہ رہتا ہے، جیسے سچ بولنا، امانت کو ادا کرنا اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھے سلوک اور آداب ہمسائیگی کو لازم پکڑنا۔

احتمال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاید ان صحابہؓ کو مذکورہ بالا چیزوں سے متعلق ادائے حقوق کی کسی تقصیر و کوتاہی میں مبتلا پایا ہوگا اس لئے خاص طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی چیزوں کا ذکر فرمایا۔

امام طیبیؒ کی یہ عبارت گویا کہ اس کا خلاصہ یہ ہے: يريد أن ادعاء كم محبة الله ومحبة رسول لا يتم؛ ولا يتم بمسح الوضوء فقط؛ بل بالصدق في المقال وبأداء الأمانة وبالاحسان الى الجار.

اسنادی حیثیت: امام میرکؒ نے لکھا ہے کہ اس روایت کو امام طبرانی نے سند ضعیف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

جو خود سیر ہوا اور پڑوسی بھوکا رہا، مؤمن نہیں

۴۹۹۱: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِيْ يُشْبِعُ وَجَارُهٗ جَائِعٌ اِلٰى جَنْبِهٖ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٥/ ٣١ الحديث رقم ٥٦٦، واحمد في المسند ١/ ٥٥۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ وہ شخص کامل مؤمن نہیں ہو سکتا جو پیٹ بھر کر کھالے جب کہ اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا ہو دونوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ليس المؤمن بالذي يشبع:

بالذی: "لیس" کی خبر پر کبھی باء زائدہ بھی داخل ہوتا ہے۔ (جیسا کہ یہاں ہے)۔ اور ایک صحیح نسخہ میں (بغیر حرف جر کے) "الذی" ہے۔

و جاره جائع الخ: یہ جملہ يشبع کی ضمیر سے حال ہے۔ اى يشبع وهو عالم بحال اضطراره وقلة اقتداره.

وہ مسلمان کامل ایمان کے درجہ کو کس طرح پہنچ سکتا ہے جو خود تو پیٹ بھر کے کھانا کھائے اور اس کا پڑوسی بالکل بھوکا رہے۔

کسی کامل مسلمان کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ جاننے کے باوجود کہ اپنے پڑوسی میں فلاں شخص کو محتاجگی وافلاس وشدت بھوک نے مضطرب و بے حال کر دیا ہے وہ اس کی خبر نہ لے اور اس کو اپنے کھانے میں شریک نہ کرے۔

الى جنبه: ''اس کے پہلو میں''۔اس جملہ کے ذریعہ گو اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ جو شخص اپنے پڑوسی کے حالات سے بے خبر ولا پرواہ ہو اس سے بڑا غافل اور لا پرواہ کون ہو سکتا ہے۔

تخریج واسنادی حیثیت: الجامع الصغیر کی تصریح کے بموجب اس حدیث کو امام بخاریؒ نے '' الأدب المفرد '' میں، ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں ذکر کیا ہے اور امام طبرانی نے ''الکبیر'' میں سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔

پڑوسی کو ایذاء دینے والی عورت دوزخ میں

۴۹۹۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فُلَانَةَ تُذْكَرُ مِنْ كَثْرَةِ صَلَاتِهَا وَصِيَامِهَا وَصَدَقَتِهَا غَيْرَ اَنَّهَا تُؤْذِيْ جِيْرَانَهَا بِلِسَانِهَا قَالَ هِيَ فِي النَّارِ قَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِنَّ فُلَانَةَ تُذْكَرُ قِلَّةُ صِيَامِهَا وَصَدَقَتِهَا اَوْ صَلَاتِهَا وَاِنَّهَا تَصَدَّقُ بِالْاَثْوَارِ مِنَ الْاَقِطِ وَلَا تُؤْذِيْ بِلِسَانِهَا جِيْرَانَهَا قَالَ هِيَ فِي الْجَنَّةِ۔ (رواه احمد والبيهقى فى شعب الايمان)

أخرجه احمد فى المسند ۲/ ٤٤٠، والبيهقى فى شعب الايمان ۷/ ۷۹ الحديث رقم ٥٩٤٦۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاں عورت کی نماز، روزے اور صدقہ کی کثرت کا خوب چرچا ہے مگر وہ عورت اپنے پڑوسی کو اپنی زبان سے تکلیف دیتی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ دوزخی ہے۔

تشریح: أثوار: ثور (ثائے مثلثہ کے ساتھ) کی جمع ہے۔ جوہریؒ لکھتے ہیں: وهو قطعة من الأقط. چنانچہ کلام میں تجرید ہے یا تاکید ہے۔

تذکر: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے اور ضمیر غائب '' فلانة '' کی طرف راجع ہے۔

من كثرة: ''من'' تعلیلیہ ہے۔ اى: من أجل هذه النوافل. اور'' تذكر '' کے متعلق ہے. غير أنها: '' غير '' بمعنی ''الا'' ہے۔ اى: الا أنها. امام طیبیؒ کا کہنا ہے کہ استثناء منقطع ہے۔یعنی لكن تؤذى. تذكر قلة صيامها: ایک نسخہ میں (''من '' کا اضافہ ہے، یعنی)'' من قلة صيامها '' ہے۔امام طیبیؒ لکھتے ہیں: اس دوسرے فقرہ میں ''من '' موجود نہیں ہے، اور'' قلة'' منصوب بنزع الخافض ہے۔ اھ۔ تو گویا کہ امام طیبیؒ کے نسخہ میں روایت کے یہ الفاظ نصب کے ساتھ ہیں، جیسا کہ دونوں فقروں میں رعایت مناسبت کا تقاضا ہے۔ اور اگر رفع کے ساتھ مروی ہوتا تو وجہ رفع بالکل ظاہر ہے۔

وانها تصدق: ''انّ'' بکسر الهمزہ ہے۔ اور تصدق میں ایک تاء محذوف ہے۔ یہ جملہ حال ہے۔ [illegible] اگر'' ان '' بفتح الهمزہ [illegible] عطف '' تذكر '' کے معمول پر ہوگا۔

ولا تؤذی: اس جملہ کا عطف "تصدق" پر ہے، یا اس کی ضمیر سے حال ہے۔

حضور ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ اصل میں دین کا مدار جس چیز پر ہے وہ اکتساب فرائض اور اجتناب معاصی ہے (یعنی انسان کی اخروی فلاح ونجات محض اس بات پر منحصر ہے کہ وہ دینی فرائض وواجبات پر عمل کرے اور گناہ ومعصیت سے پرہیز کرے اور گناہ ومعصیت خواہ ترک فرائض وواجبات کی صورت میں ہوں یا بدعملیوں کی شکل میں) اس بات سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں کہ فضول یعنی نفلی عبادات وطاعات کو اختیار کیا جائے اور اصول یعنی واجبات کو ضائع کر دیا جائے) جیسا کہ اکثر علماء اور صلحاء اس کمزوری میں مبتلا ہیں چنانچہ علماء تو ان چیزوں کو ترک کرتے ہیں جن پر عمل کرنا واجب ہے اور صلحاء اس علم کو حاصل نہیں کرتے جس کو حاصل کرنا واجب ہے گویا دونوں طبقے ترک واجب کی معصیت کے مرتکب ہیں البتہ صوفیاء علم وعمل دونوں کے حامل ہوتے ہیں (وہ واجبات پر عمل کرنے کو جو درجہ دیتے ہیں وہی درجہ ترک واجب کی معصیت سے اجتناب کو بھی دیتے ہیں بلکہ ایک طرح سے) ان کے نزدیک اجتناب کی اہمیت مقدم ہے اور وہ حکمائے طب کے اس اصول کو اختیار کرتے ہیں کہ تحلیہ پر تخلیہ مقدم ہے (لہٰذا جس طرح اطباء مریض کو پرہیز کراتے اور دوا بعد میں دیتے ہیں۔ اس طرح) وہ صوفیاء بھی سالکین طریقت کے لئے پہلی منزل توبہ قرار دیتے ہیں (حقیقت بھی ہے کہ جس طرح مریض مضر چیزوں سے پرہیز نہ کرے تو لاکھ دوائیں بھی اس کے لئے بے فائدہ ہیں اسی طرح کوئی مسلمان گناہ ومعصیت سے اجتناب نہ کرے اور ترک واجبات سے دامن نہ بچائے تو لاکھ عبادات کرے اور نوافل واوراد میں مشغول رہے اس کو خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ) کلمہ توحید میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے نفی ہے پھر اثبات اور یہ کہ صفات ثبوتیہ پر صفات سلبیہ مقدم ہیں کیونکہ صفات ثبوتیہ کا حصول تو لازم آتا ہے لیکن صفات ثبوتیہ سے صفات سلبیہ کا حصول لازم نہیں آتا۔

جراحات السنان لها التیام
ولا یلتام ماجرح اللسان

تخریج واسنادی حیثیت: اس حدیث کو اسی طرح امام بزارؒ نے، ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ امام حاکمؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث "صحیح الاسناد" ہے۔ اور ابن ابی شیبہ نے اسناد صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے۔ (ذکرہ میرکؒ)

اچھے برے کی پہچان

۴۹۹۳: وَعَنْهُ قَالَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَقَفَ عَلٰى نَاسٍ جُلُوْسٍ فَقَالَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِكُمْ مِنْ شَرِّكُمْ قَالَ فَسَكَتُوْا فَقَالَ ذٰلِكَ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ فَقَالَ رَجُلٌ بَلٰى يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنَا بِخَيْرِنَامِنْ شَرِّنَا فَقَالَ خَيْرُكُمْ مَنْ يُرْجٰى خَيْرُهٗ وَيُؤْمَنُ شَرُّهٗ وَشَرُّكُمْ مَنْ لَا يُرْجٰى خَيْرُهٗ وَلَا يُؤْمَنُ شَرُّهٗ۔

(رواه الترمذی والبیهقی فی شعب الایمان وقال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٥٧ الحدیث رقم ٢٢٦٣، واحمد فی المسند ٢/٣٦٨ والبیهقی فی شعب الایمان ٧/٥٤٠ الحدیث رقم ١١٢٦٨۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں کے سامنے ٹھہر کر فرمایا کیا میں تمہیں اچھے برے کی خبر نہ دوں آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہی بات فرمائی ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمیں اچھے برے کی نشاندہی فرمایئے آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے اچھے وہ ہیں جن سے بھلائی کی امید ہو مگر برائی کا خطرہ نہ ہو اور برے وہ ہیں جن سے خیر کی توقع نہ ہو مگر شر کا خطرہ ہو۔ (بیہقی شعب لایمان، ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے)۔

تشریح: جلوس : جالسین کے معنی میں ہے، یا مضاف محذوف ہے۔ ای : ذوی جلوس.

من شر کم: متکلم سے حال ہے۔

قولہ: ألا أخبر کم بخیر کم من شر کم : جار مجرور "متمیزا" محذوف کے متعلق ہو کر متکلم سے حال ہے ۔أی ممیزا من شر کم۔

فقال رجل: تنوین برائے تعظیم ہے۔ أی کل الرجل شدید القلب.

خیر کم من یرجی خیرہ. پہلا خیر بمعنی" أخیر "اور دوسرا" خیر"، خیور کا مفرد ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس موقع پر سکوت اختیار فرمایا، انہیں توقف تھا کہ سوال اولیٰ ہے، یا سکوت احریٰ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا سوال کرنا ﴿لا تسئلوا عن أشیاء ان تبدلکم تسؤ کم﴾ کے باب سے نہ ہو۔ اور اس حدیث: وسکت عن اشیاء رحمة لکم من غیر نسیان فلا تبحثوا، کا تقاضا بھی یہی تھا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فضیحت کے خوف سے خاموش رہے۔ حتی کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کو اپنا سوال تین مرتبہ دہرانا پڑا۔ اور پھر جواب میں اسلوب ایسا اختیار فرمایا، کہ جس میں کسی کی جگ ہنسائی اور رسوائی نہ ہو۔ تقسیم عقلی چار اقسام کا تقاضا کرتی ہے۔ چنانچہ ان دو قسموں کو ذکر فرمایا، کہ جن میں ترغیب وترہیب کا پہلو تھا، اور ان دو قسموں کو ذکر نہیں فرمایا، کہ جن میں ترغیب وترہیب کا پہلو نہیں تھا۔

وہ دونوں صورتیں باہم تعارض ہیں۔ لہذا ساقط الاعتبار ہیں۔ اس کی نظیر وہ حدیث ہے کہ جس کا مفہوم کچھ یوں ہے:

ان من الناس من هو سريع الغضب سريع الفيئ، ومنهم بطئ الغضب بطئ الفئ وخيرهم من يكون بطئ الغضب سريع الرجوع وشرهم عكس ذلك.

تخریج: الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: "خیر کم من یرجی خیرہ......" کو ابو یعلی نے اپنی مسند میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، احمد و ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ احمد، ترمذی اور ابن حبان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

الا أخبر کم بخیر کم من شر کم؟ خیر کم من یرجی خیرہ الخ

اور ابن عساکرؒ نے حضرت معاذؓ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

الا انبئكم بشر الناس؟ من أكل وحده، ومنع رفده، وسافر وحده، وضرب عبده، الا انبئكم بشر من هذا؟ من يبغض الناس ويبغضونه. الا أنبئكم بشر من هذا؟ من يخشى شره ولا يرجى

خيره. ألا أنبئكم بشر من هذا؟ من باع آخرته بدنيا غيره. الا أنبئكم بشر من هذا؟ من أكل الدنيا بالدين.

مسلمان وہ ہے جس کا دِل و زبان مسلمان ہو

۴۹۹۴: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَسَمَ بَيْنَكُمْ اَرْزَاقَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُعْطِى الدُّنْيَا مَنْ يُّحِبُّ وَمَنْ لَا يُحِبُّ وَلَا يُعْطِى الدِّيْنَ اِلَّا مَنْ اَحَبَّ فَمَنْ اَعْطَاهُ اللّٰهُ الدِّيْنَ فَقَدْ اَحَبَّهٗ وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ لَا يُسْلِمُ عَبْدٌ حَتّٰى يَسْلَمَ قَلْبُهٗ وَلِسَانُهٗ وَلَا يُؤْمِنُ حَتّٰى يَاْمَنَ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ۔

أخرجه البيهقي في كشف الايمان ٤/ ٣٩٥ الحديث رقم ٥٥٢٤ واحمد في المسند ١/ ٣٨٧۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان اخلاق کو بھی اسی طرح تقسیم فرمائے جیسا کہ تمہارے مابین روزی کو تقسیم فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ دنیا ہر اس شخص کو بھی دیتے ہیں جو پسند ہے اور جو ناپسند ہے اور دین پسندیدہ بندے کو عنایت کرتے ہیں پس جس کو اللہ تعالیٰ نے دین دے دیا اس کو اللہ تعالیٰ نے پسند کر لیا۔ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اور بندہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس کا دل و زبان مسلمان نہ ہو اور کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کے شر سے اس کے پڑوسی بچے ہوئے نہ ہو۔ (احمد، بیہقی)

تشریح: قسم: تخفیف و تشدید ہر دو طرح درست ہے۔ چنانچہ صاحب قاموس لکھتے ہیں: **قسمه وقسّمه جزأه.**

قوله: ان الله تعالى يعطى الدنيا من يحب ومن لا يحب: یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے اخلاق یعنی اعمال و احوال کو اسی طرح تقسیم فرمایا ہے، جس طرح تمہارے حلال و حرام رزق و مال کو تمہارے درمیان تقسیم کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾ [الزخرف: ٣٢] "کیا یہ لوگ تمہارے پروردگار کی رحمت کو بانٹتے ہیں؟ ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کیے تا کہ ایک دوسرے سے خدمت لے اور جو کچھ یہ جمع کرتے ہیں تمہارے پروردگار کی رحمت اس سے کہیں بہتر ہے" اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا تو اس شخص کو بھی دیتا ہے، جس کو وہ دوست رکھتا ہے، خواہ وہ نبی ہو، جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام، خواہ وہ کوئی ولی ہو، جیسے حضرت عثمان غنی اور اس شخص کو بھی دیتا ہے جس کو دوست نہیں رکھتا، جیسے فرعون و ہامان وغیرہ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَهٰۤؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا﴾ [الاسراء: ٢٠] اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت عطاء فرمائی، اور آخرت درجات و تفضیل کے اعتبار سے بہت بڑی ہے۔

قوله: ولا يعطى الدين الا من احب فمن اعطاه الله الدين فقد احبه: بعض عارفین نے فرمایا: ترجیح، تصوف، نام

ہے خلق کا۔ چنانچہ جو شخص اخلاق حسنہ میں تجھ سے بڑھ کر ہے وہ تصوف میں بھی تجھ سے بڑھ کر ہے۔ یہ توہم درست نہیں کہ جو شخص دنیاوی ارزاق اور دینی اخلاق کو جامع ہے وہ افضل ہے اس شخص سے کہ جو دین سے متصف ہونے کے ساتھ بقدر کفایت دنیا بھی رکھتا ہے۔ جیسا کہ بعض اربابِ عقل ناقص کو متبادر الی الذہن ہوتا ہے۔ چونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: من احب آخرته اضر بدنياه، ومن احب دنياه اضرباً خرته فآثروا ما يبقى على ما يفنى. اور ایک روایت میں آتا ہے: اجوعكم في الدنيا اشبعكم في الآخرة. مروی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام دوسرے انبیاء کے جنت میں جانے کے پانچ سو سال جنت میں داخل ہوں گے۔ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف باوجودیکہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، جنت میں (چوتڑوں کے بل گھسٹتے ہوئے) داخل ہوں گے۔

یہ سارا مسئلہ اس بات کے گرد گھومتا ہے کہ فقیر صابر افضل ہے کہ غنی شاکر افضل ہے۔ صوفیہ اور اکثر علماء کا اجماع ہے کہ فقیر صابر افضل ہے۔ بلکہ بعض کا کہنا ہے کہ فقیر شاکر افضل ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ تفویض وتسلیم اکمل ہے، معاملہ ایسا ہی ہے لیکن اس کا بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ اس میں اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے: ﴿ان ربك يبسط الرزق لمن يشاء ويقدر انه كان بعباده خبيرا بصيرا﴾ [الاسراء۔ ۳۰] اس مسئلہ کو میں نے فی الجملہ بسط کے ساتھ شرح حزب الفتح للشیخ ابی الحسن البکری میں تحریر کر دیا ہے۔ عاقل کیلئے اشارہ کافی ہے، اس کو طویل عبارت کی حاجت نہیں ہوتی، البتہ استیعاب کیلئے ''احیاء'' کا مطالعہ فرمائیں۔

قوله: والذی نفسی بیده لا یسلم عبد الخ:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ان الله تعالى يعطى الدنيا یہ کلام ماقبل کلام کیلئے بمنزلہ ''نشر'' کے ہے۔ ''دنیا'' سے ''ارزاق'' کی طرف اشارہ ہے اور ''دین'' سے ''اخلاق'' کی طرف اشارہ ہے، یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ وہ ''رزق'' کہ جو ''خلق'' کا مقابل ہے اس کی دین کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ہے۔ اور اخلاق حمیدہ غیر دین نہیں ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وانك لعلى خلق عظيم﴾ [القلم۔ ٤] پھر دینیات میں سے اعمال خارجیہ اور اعمال داخلہ یعنی انقیاد وتصدیق کا ذکر فرمایا کہ جو افضل چیز ہیں۔ جیسا کہ حدیث جبرائیل میں اسلام وایمان کے بعد فرمایا: أتاكم ليعلكم امر دينكم. اور ان کی تفسیر اخلاق کے ساتھ فرمائی، دل اور زبان کا ذکر خصوصی طور پر فرمایا، چونکہ انسان کا سارا دار ومدار انہی دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ جب کہ مثل مشہور ہے: المرء باصغريه (آدمی کی وقعت دو چھوٹی چھوٹی چیزوں یعنی دل وزبان سے وابستہ ہے) زبان کا اسلام لانا یہی ہے کہ زبان کو اس کی آفات سے محفوظ رکھا جائے۔ اور زبان کی آفتیں لاتناہی ہیں۔ اور قلب کا اسلام لانا یہی ہے کہ اس کو عقائد باطلہ، آراء زائغہ، اور اخلاق ذمیمہ سے مطہر ومزکیٰ کیا جائے۔ اور پھر ان کے برعکس امور سے اس کو محلّی ومجلّی کیا جائے۔

مؤمن اُلفت والا ہوتا ہے

۴۹۹۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُؤْمِنُ مَألَفٌ وَلَاخَيْرَ فِيْمَنْ لَا يَأْلَفُ وَلَا يُؤْلَفُ ۔ (رواهما احمد والبيهقي في شعب الايمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/ ٢٧٠ الحديث رقم ٨١١٩، واحمد في المسند ٢/ ٤٠٠۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مؤمن الفت رکھنے والا ہے جو نہ الفت رکھے اور نہ اس سے الفت کی جائے اس میں کوئی خیر نہیں۔ (احمد بیہقی)

تشریح: دل کا اسلام تو یہ ہے کہ اس کو باطل عقائد ونظریات سے پاک رکھا جائے اور زبان کا اسلام یہ ہے کہ اس کو لا یعنی باتوں سے محفوظ رکھا جائے لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ دل اور زبان کے مسلمان ہونے سے مراد وہ تصدیق واقرار ہے جس پر ایمان کی بنیاد ہے اور اس کے ذریعہ گویا اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ ظاہر و باطن کا ایک ہونا کمال ایمان واسلام کی دلیل ہے اور چونکہ دل اور زبان ہی ایمان واسلام کا مدار ہیں اس لئے خاص طور پر ان دونوں کا ذکر کیا گیا۔

تخریج: الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: اس (یعنی دوسری) حدیث کو امام احمد نے سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، اور دارقطنی نے افراد میں اور ضیاء نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

المؤمن يألف ويؤلف، ولا خير فيمن لا يألف ولا يؤلف. وخير الناس أنفعهم للناس.

مؤمن کو خوش کرنا اللہ اور رسول ﷺ کو خوش کرنا ہے

۴۹۹۶: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَضٰى لِاَحَدٍ مِّنْ اُمَّتِيْ حَاجَةً يُرِيْدُ اَنْ يَّسُرَّهٗ بِهَا فَقَدْ سَرَّنِيْ وَمَنْ سَرَّنِيْ فَقَدْ سَرَّ اللّٰهَ وَمَنْ سَرَّ اللّٰهَ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/ ١١١ الحديث رقم ٧٦٣٥۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے میری امت کے کسی آدمی کو خوش کرنے کے لئے اس کی حاجت پوری کی اس نے مجھے خوش کیا اور جس نے مجھے خوش کیا اس نے اللہ تعالیٰ کو خوش کیا اور جس نے اللہ تعالیٰ کو خوش کیا اس کو وہ جنت میں داخل فرما دے گا۔ (بیہقی)

تخریج: الجامع الصغیر میں ہے: **من قضى لأخيه المسلم حاجة كان له من الاجر كمن حج او اعتمر**

تشریح: آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کی کسی حاجت وضرورت کو پورا کیا تو اس کو حج وعمرہ کرنے والے شخص کے ثواب کی مانند ثواب ملتا ہے''۔ اس حدیث کو خطیبؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

ومن قضى لأخيه المسلم حاجة كان له من الأجر كمن خدم الله عمره: اس حدیث کو ابو نعیم نے ''الحلیة'' میں حضرت انسؓ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

تہتر مغفرتوں کا حقدار

۴۹۹۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَغَاثَ مَلْهُوْفًا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ ثَلٰثًا وَّسَبْعِيْنَ مَغْفِرَةً وَّاحِدَةٌ فِيْهَا صَلَاحُ اَمْرِهٖ كُلِّهٖ وَثِنْتَانِ وَسَبْعُوْنَ لَهٗ دَرَجَاتٌ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/ ١٢٠ الحديث رقم ٧٦٧٠۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی مظلوم کی فریاد رسی کی تو اس کے لئے تہتر مغفرتیں لکھ دی جاتی ہیں ان میں سے ایک بھی اس کے معاملات کی درستگی کے لئے کافی ہے اور بقیہ بہتر اس کے لئے قیامت کے دن درجات کا باعث ہوں گی۔ (بیہقی)

تشریح: قوله: من أغاث ملهوفا كتب الله له ثلثا وسبعين مغفرة:

ملهوف کے معنی ہیں ضعیف و متحیر، اور صاحب النہایہ لکھتے ہیں: "مکروب"

تہتر کی قید کی حکمت:

اس کی حکمت صاحب وحی ہی جانتا ہے۔ (البتہ ممکنہ طور پر چند احتمال ذکر کیے جاتے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔)

ایک احتمال یہ ہے کہ کثرت مراد ہے جیسا کہ یہ عدد اکثر و بیشتر بیان کثرت کیلئے آیا کرتا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ تہتر کا عدد "ملهوف" سے ابجد کے اعتبار سے مناسبت رکھتا ہے۔ بایں طور کہ میم اور لام کے کل عدد ستر، اور آخری تین حروف ھا، واؤ اور فاء کے کل تین عدد۔ چنانچہ لکھتے ہیں: **ويمكن ان يكون بالنظر الى صاحب الحساب عدد الثلاث مأخوذ من الثلاثة الحروف في آخر الملهوف، وعدد السبعين من مجموع الميم واللام، وهذا من أنواع التعمية والابهام.** واللہ اعلم بالمرام۔

قوله: واحدة فيها صلاح امره كله الخ: اس جملہ میں ایک بشارت جلیہ کی طرف خفیہ اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ مغفرت واحدہ، اس کے تمام گناہوں کے لئے دنیا میں کافی ہوگی۔ اور مغفرت کے باقی اعداد کے عوض آخرت میں درجات عالیہ عنایت ہوں گے۔ اور ممکن ہے، کہ یہ حدیث امام نوویؒ وغیرہ کے اس قول کا مآخذ ہو: **المكفرات اذا اجتمعت فتوجه اولا الى محو الصغائر، ثم الى تخفيف الكبائر من السيئات، ثم تكون سببا لرفع الدجات العلى.**

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس سے پتہ چلتا ہے، کہ گناہوں کی مغفرت، دنیا و عقبیٰ میں اللہ کی رحمت کے دروازے کی کشادگی پر مقدم ہے، چنانچہ اسی وجہ سے اس آیت کریمہ میں بھی مغفرت کا ذکر مقدم ہے: ﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴾ [الفتح: ٢] چونکہ تحلیہ تخلیہ کے بعد ہوتا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: پس تأمل فرمائیے ایسی چیز ظاہر ہوگی جو کہ مخفی نہیں۔

عرض مرتب:

ملا علی قاریؒ کا یہ جملہ بظاہر امام طیبیؒ کی بیان کردہ وضاحت پر نقد ہے۔

مخلوق عیال اللہ ہے

۴۹۹۸۔ ۴۹۹۹: وَعَنْهُ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ

فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ رَوٰى البيهقى الاحاديث الثلثة فى شعب الايمان۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/ ١٢٠ الحديث رقم ٧٦٧٠۔ أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/ ٤٢ الحديث رقم ٧٤٤٧و٧٤٤٨۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مخلوق عیال اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ کو تمام بندوں میں وہ پسند ہے جو اس کے عیال سے حسن سلوک برتنے والا ہے۔ یہ تینوں روایات بیہقی سے منقول ہیں۔

تشریح: وعنه وعن: قول مشہور کے مقتضیٰ پر اعادہ عامل کیا تا کہ عطف درست ہو سکے۔

عیال: عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ رزاق وخلاق تو اللہ ہی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾[هود:٦] ''اور زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا نہیں مگر اس کا رزق خدا کے ذمے ہے۔ وہ جہاں رہتا ہے اسے بھی جانتا ہے اور جہاں سونپا جاتا ہے اسے بھی۔ یہ سب کچھ کتاب روشن میں (لکھا ہوا) ہے۔''

قوله: فأحب الخلق الى الله من أحسن الى عياله:

جیسا کہ ایک حدیث میں آرہا ہے: **خير الناس أنفعهم للناس.**

تخریج: الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: **الخلق كلهم عيال الله ، فأحبهم الى الله انفعهم لعياله.** اس حدیث کو ابو یعلی نے اپنی مسند میں، بزار نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، اور طبرانی نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

قوله: روى البيهقي الأحاديث الثلاثة:

ضمیر کے بجائے اسم ظاہر ذکر کیا تا کہ لفظاً یا معنًی تثنیہ سے التباس نہ ہو، نیز عدد پر تنصیص ہو جائے۔ ان میں سے دوسری حدیث کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں بھی روایت کیا ہے۔

پہلا مقدمہ

٥٠٠٠: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَوَّلُ خَصْمَيْنِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ جَارَانِ۔

(رواه احمد)

احمد في المسند ٤/ ١٥٠۔

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن سب سے پہلا مقدمہ دو پڑوسیوں کا پیش ہوگا۔ (احمد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اہل دوزخ کے بعد حقوق کی عدم ادائیگی سے متعلق جو معاملہ سب سے پہلے پیش ہوگا وہ ان دو ہمسایوں کا ہوگا۔ جنہیں آپس میں ایک دوسرے سے ایذا رسانی یا حقوق واجب الادا میں تقصیر وکوتاہی وغیرہ

سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ امام سیوطیؒ فرماتے ہیں: ایک روایت میں یوں فرمایا گیا ہے: اول ما یحاسب به العبد صلاته۔ کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جس محاسبہ کا سامنا کرنا پڑے گا وہ نماز سے متعلق ہوگا نیز ایک روایت میں یہ منقول ہے: اول مایقضی بین الناس الدم: کہ قیامت کے دن بندہ کے سب سے پہلے جس معاملہ کا فیصلہ کیا جائے گا وہ خون کا معاملہ ہوگا (اور مذکورہ بالا روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جو معاملہ پیش ہوگا وہ ہمسایوں کی مخاصمت کا معاملہ ہوگا چونکہ ان روایتوں میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے) ان میں کوئی تنافی نہیں ہے۔ چونکہ یہ ارشاد گرامی مظالم کے بارے میں ہے (كذا في الزجاجة حاشية علي بن ماجه) اس کا حاصل یہ ہے کہ حقوق اللہ میں سے سب سے پہلے نماز کے معاملہ کا محاسبہ ہوگا' چونکہ نماز تمام عبادات میں افضل ترین عبادات ہے اور حقوق العباد کے سلسلہ میں سب سے پہلے خون کے معاملہ کا فیصلہ کیا جائے گا کیونکہ کسی کا ناحق خون بہانا خطیات میں سے سب سے بڑی خطیہ ہے۔

رہی مذکورہ بالا حدیث تو لفظ "خصمین" کے ذریعہ یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حدیث دونوں فریقوں کے ایک دوسرے کے خلاف دعویٰ رکھنے کے ساتھ مقید ہے (یعنی جو لوگ ایسے ہیں ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کے حقوق کی ادائیگی میں تقصیر و کوتاہی کی ہے اور اس کی وجہ سے ہر ایک گناہگار رہا ہے) تو ایسے لوگوں میں سے جو دو آدمی سب سے پہلے اپنا معاملہ لے کر پیش ہوں گے اور ایک دوسرے کے خلاف دعویٰ کریں گے وہ دو ہمسایہ ہوں گے اور ان کا فیصلہ کیا جائے گا اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ادائیگی حقوق میں تقصیر و کوتاہی کا تعلق دونوں فریق سے نہ ہو بلکہ کسی ایک سے ہو تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ دونوں فریق پر خصمین کا اطلاق بطریق تغلیب اور مشاکلت کے ہے جیسا کہ قرآن کے یہ الفاظ: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ [الشوریٰ۔ ٤٠] اس کی مثال ہیں۔ حاصل یہ کہ مذکورہ بالا روایتوں میں جن معاملات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک میں اولیت اضافی ہے جس کی وجہ سے حقیقی طور پر کوئی باہمی تضاد لازم نہیں آتا اور یہ ممکن ہے کہ اُس سے صغائر مراد ہوں کبائر مراد نہ ہوں۔ واللہ اعلم۔

تخریج: اس حدیث کو امام طبرانی رحمہ اللہ نے بھی اسی راوی سے نقل کیا ہے۔

دِل کی سختی کا علاج

۵۰۰۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلًا شَكٰی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَسْوَةَ قَلْبِهٖ قَالَ اِمْسَحْ رَأْسَ الْيَتِيْمِ وَاَطْعِمِ الْمِسْكِيْنَ۔ (رواه احمد)

أخرجه احمد في المسند ٢/٢٦٣۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے دل کی سختی کا تذکرہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر اور کسی مسکین کو کھانا کھلا۔ (احمد)

تشریح: قوله: أن رجلا شكا الى النبي ﷺ قسوة قلبه:

شکا: مناسب یہی ہے کہ اس لفظ کو "دعا" اور "عفا" کی طرح الف کے ساتھ ہی لکھا جائے، البتہ یاء کے ساتھ بھی

کتابت درست ہے، چونکہ اس میں ایک لغت "شکیت" بھی ہے۔

قولہ: امسح راس الیتیم:

اس میں نکتہ یہ ہے کہ اس عمل سے موت کی یاد تازہ ہوگی، اور زندگی کو غنیمت جانے گا۔ چونکہ قسوت کا منشا سوائے غفلت کے کچھ نہیں۔

قولہ: واطعم المسکین:

اس عمل کے نتیجہ میں اللہ کی نعمتوں کا اظہار ہے کہ اس نے تجھ کو غنی بنایا ہے۔ تاکہ تیرا دل نرم پڑ جائے، اور قسوت زائل ہو جائے۔

اور ان دونوں کی وجہ تخصیص ممکن ہے کہ یہ ہو کہ صغیر وکبیر پر رحمت کرنا اللہ کی اپنے بندہ پر رحمت کا موجب بنتا ہے۔ چنانچہ اس پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ اور سختی وقساوت زائل ہوتی ہے اور ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے: **لابد ارتکاب اسباب تحصیل الاخلاق بالمعالجة العلمية او بالعملية، او بالمعجون المرکب منهما (علی مابينه فی الاحياء)**

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ان دونوں کا خصوصی طور پر ذکر فرمانا، اس آیت کریمہ کی طرف تلمیح ہے: ﴿**او اطعام فی یوم ذی مسغبة یتیما ذا مقربة او مسکینا ذا متربة**﴾[البلد۔۱۴۔۱۶] جو شخص اس پرمشقت گھاٹی پر چڑھ گیا وہ رقیق القلب ہو جائے گا، اور ہر خیر کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے گا۔

اور اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اخلاق ذمیمہ میں سے کسی بری بیماری میں مبتلا ہو تو اس کا علاج اس کی ضد سے کیا جائے۔ چنانچہ تکبر کا علاج تواضع کے ساتھ، بخل کا علاج سماحت وسخاوت کے ساتھ، اور قسوت قلبی کا علاج تعطف ورقت کے ساتھ کیا جائے۔

افضل ترین صدقہ مطلقہ بیٹی کی کفالت

۵۰۰۲: وَعَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ اَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰی اَفْضَلِ الصَّدَقَةِ اِبْنَتُكَ مَرْدُوْدَةٌ اِلَيْكَ لَيْسَ لَهَا كَاسِبٌ غَيْرُكَ۔ (رواہ ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجه فی السنن ۲/ ۱۲۰۹ الحديث رقم ۳۶۶۷، واحمد فی المسند ۴/ ۱۷۵۔

ترجمہ: حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمہیں سب سے افضل ترین صدقہ نہ بتلا دوں وہ یہ کہ تمہاری وہ بیٹی ہے جو تمہاری طرف لوٹا دی گئی اور اس کا تمہارے سوا کوئی کمانے والا نہ ہو۔

(ابن ماجہ)

تشریح: قولہ: ابنتك مردودة اليك ليس لها كاسب غيرك:

ابنتك: مرفوع ہے۔

مردودة: منصوب علی الحالیۃ ہے

غیرك: مرفوع ہے صفت ہونے کی وجہ ہے۔ اور ایک نسخہ میں منصوب علی الاستثناء ہے۔ لیکن یہ ضعیف ہے۔ چونکہ ذوالحال کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ وہ معرفہ ہو۔ صاحب النہایہ کا کہنا ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے۔ أی ألا أدلکم علی أفضل اهل الصدقة. اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ تقدیری عبارت یوں ہو: صدقة تستحقها ابنتك فی حال ردها الیك،

ولیس لها کاسب غیرك. یہ دونوں حال مترادفہ ہیں یا حال متداخلہ ہیں۔ واللہ اعلم۔

بَابُ الْحُبِّ فِي اللّٰهِ وَمِنَ اللّٰهِ

للہ کے ساتھ اور اللہ کے لئے محبت کرنے کا بیان

"الحب في اللّٰه" کا مطلب ہے: الحب في ذات اللّٰه وجهته اور "الحبّ من اللّٰه" کا مطلب ہے: الحبّ من جهة اللّٰه یعنی کسی بندہ کے ساتھ تعلق ومحبت کا جو رشتہ قائم کیا جائے، وہ محض اللہ کی خاطر ہو، (اس میں ریاء ونمائش اور خواہشات نفسانی کی آمیزش نہ ہو۔) ترجمۃ الباب میں موجود "من اور في" اسی معنی میں ہے جس معنی میں مندرجہ ذیل آیات میں موجود "من اور في" ہے: ﴿تفيض من الدمع﴾ [المائدہ۔۸۳] اور ﴿والذين جاهدوا فينا﴾ [العنکبوت۔٦٩]
یہ اسلوب کلام ابلغ ہے چونکہ اس میں "محبت" کو "مظروف" بنایا ہے۔ (کذا افادہ الطیبیؒ)

امام طیبیؒ کی بات محل نظر ہے، چونکہ ان کی ذکر کردہ توضیح کے اعتبار سے دونوں کا حاصل ایک ہی بنتا ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ عنوان الباب سے "حب للہ" اور "حب اللہ" پر من جانب اللہ مرتب ہونے والے نتائج کی فضیلت کا بیان ہے۔ اس کی تصریح آگے والی روایات سے بھی ہو رہی ہے۔ لہٰذا درست بات یہ ہے کہ "في" تعلیلیہ ہے اور "من" ابتدائیہ ہے۔ اس تقدیر پر عبارت یوں ہوگی: حب العبد العبد لأجل رضا الرب' والحب الكائن من اللّٰه للعبد یہ دوسری محبت پہلی محبت کا نتیجہ ہے، جیسا کہ شریعت میں ہے۔ یا اس کیلئے "مقدمہ" ہے، جیسا کہ طریقۃ میں ہے۔ یا وہ دونوں سے "محفوف" ہے جیسا کہ حقیقت میں ہے۔ چنانچہ ان ارشادات باری تعالیٰ سے اس کا ثبوت ہوتا ہے: ﴿يحبهم ويحبونه﴾ [المائدۃ۔٥٤] اور ﴿ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله﴾ [آل عمران۔۳۱] واللہ اعلم۔

الفصل الاوّل:

ارواح منضبط لشکر تھے

۵۰۰۳: عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ٣٦٩/٦ الحديث رقم ٣٣٣٦ و مسلم في ٢٠٣١/٤ الحديث رقم (١٥٩-٢٦٣٨) وابو داؤد في السنن ١٩٩/٥ الحديث رقم ٤٨٣٤، واحمد في المسند ٢٩٥/٢۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ارواح منضبط لشکر تھے تو جن کی آپس میں جان پہچان ہوگئی وہ دنیا میں اس سے مانوس ہوا اور جوان میں ایک دوسرے سے غیر مانوس رہی۔ اس کا دوسری روحوں سے اختلاف ہوا وہ الگ تھلگ رہتی ہے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: جنود: جند کی جمع ہے۔ بمعنی جموع

مجندۃ: نون مشدد کے فتحہ کے ساتھ۔ **ای مجتمعة متقا بلة أو مختلطة۔**

تعارف: باہمی پہچان۔ اور اس کی ضد "تناکر" آتی ہے۔

ائتلف: پہلا ہمزہ وصلی ہے۔ دوسرا ہمزہ حالت وصل میں جوازاً الف سے بدل دیا جاتا ہے۔ اور حالت ابتداء میں یاء سے وجوباً بدل دیا جاتا ہے۔ اور "ما" کے لفظ کی رعایت کے اعتبار سے دونوں فعلوں کو مذکر لایا گیا ہے۔

روحیں جسموں میں داخل کیے جانے سے پہلے لشکر کی مانند مجتمع تھیں۔ ان روحوں میں سے کچھ روحیں "حزب اللہ" کا مصداق تھیں: ﴿**الا ان حزب اللہ هم المفلحون**﴾ [المجادلة۔ ۲۲] اور بعض روحیں "**حزب الشیطان**" کا مظہر تھیں: ﴿**الا ان حزب الشیطان هم الخاسرون**﴾ [المجادلة۔ ۱۹] اس آیت کریمہ: ﴿**وللہ جنود السموٰت والأرض**﴾ [الفتح۔ ٤] میں دو لشکروں کی طرف اشارہ ہے۔ کہ ان میں سے ایک لشکر "**علوی الهمة**" اور دوسرا لشکر "**سفلی الهمة**" ہے۔

صاحب شرح السنۃ لکھتے ہیں: یہ حدیث دلیل ہے کہ ارواح اعراض نہیں ہیں، اور یہ کہ ارواح اجسام کی خلقت سے پہلے وجود میں آچکی تھیں۔ (یعنی دنیا میں اب تک جتنے اجسام پیدا ہو چکے ہیں یا قیامت تک جتنے اجسام پیدا ہوں گے ان سب کی روحیں اپنے جسمانی وجود سے بھی بہت پہلے پیدا کی جا چکی ہیں، جو عالم ارواح میں جمع ہیں اور دنیا میں جب کسی روح کا جسم پیدا ہوتا ہے تو وہ روح اس جسم میں بھیج دی جاتی ہے)

چنانچہ ابتداء خلقت میں اور روز ازل اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا عہد و اقرار کرنے کیلئے جب پوری کائنات کی انسانی روحوں کو چیونٹیوں کی صورت میں جمع کیا تو اس وقت وہاں جو روحیں آپس میں ایک دوسرے سے مانوس و متعارف ہوئیں اور جن روحوں کے درمیان صفات کی مناسبت اور موانست و محبت پیدا ہوئی یا جو روحیں آپس میں نامانوس انجان رہیں اور جن روحوں کے درمیان اختلاف و تفرقہ رہا وہ دنیا میں اپنے اجسام میں آنے کے بعد بھی اسی مناسبت و محبت و موانست اور ایک دوسرے کی صفات سے مناسبت و محبت یا اختلاف و اجنبیت پر قائم رہتی ہیں۔

بالفاظ دیگر اس دنیا میں جو انسان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت و موانست اور ایک دوسرے کی صفات سے مناسبت و مشابہت رکھتے ہیں جیسے جو لوگ نیک اور اچھے ہوتے ہیں وہ نیک اور اچھے لوگوں سے محبت و تعلق رکھتے ہیں اور جو لوگ فاسق و بدکار ہوتے ہیں وہ فاسقوں اور بدکاروں سے محبت و تعلق رکھتے ہیں یا جو لوگ اس دنیا میں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف و عناد اور اجنبیت رکھتے ہیں جیسے نیک لوگ برے لوگوں سے اجتناب کرتے ہیں اور برے لوگ نیک لوگوں سے اختلاف و عناد رکھتے ہیں تو وہ دراصل اپنی روحوں کے ازلی اتحاد موانست یا اختلاف و اجنبیت کا مظہر ہیں کہ روز ازل جن روحوں میں محبت و موانست تھی ان کے درمیان اس دنیا میں بھی محبت و موانست رہتی ہے اور جن روحوں میں وہاں اختلاف و عناد رہا وہ

یہاں بھی اختلاف وعناد رکھتے ہیں۔

روحوں کے درمیان روزِ ازل سے جو تعارف وتعلق پیدا ہو گیا تھا اس کا ظہور اس دنیا میں الہامِ خداوندی کے سبب ہوتا ہے بایں طور کہ جب وہ روحیں اس دنیا میں اپنے جسموں میں آتی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی وہاں (روزِ ازل) کی محبت کے سبب یہاں (دنیا میں) بھی ان کے دلوں میں تعلق ومحبت ڈال دیتا ہے۔

كانت مودة سلمان له نسبا ولم يكن بين نوح ابنه رحم

حکیمؒ فرماتے ہیں: اقرب القرب مودة القلب وان تباعد جسم احدهما من الثانی، وابعد البعد تنافر التدانی

صاحب النہایہ لکھتے ہیں: جنود مجندة ای مجموعة، یہ اسلوب کلام ایسا ہے جیسا کہ " الوف مؤلفة "اور" قناطیر مقنطرة"

صاحب النہایہ کے ذکر کردہ کلام سے حدیث اور عنوان باب کی مناسبت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

۵۰۰۴: رَوَاهُ مُسْلِمٌ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ۔

أخرجه مسلم فی صحيحه ٤/٢٠٣١ الحديث رقم (١٥٩-٢٦٣٨)۔

ترجمہ: مسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

تشریح: الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام بخاریؒ نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے۔ امام احمد، مسلم اور ابوداؤد نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ طبرانی نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔ اور اس میں یہ اضافہ بھی ہے: تلتقی فشام كما تشام۔

اللہ تعالیٰ کی پسند و ناپسند

۵۰۰۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِيْلَ فَقَالَ اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهٗ قَالَ فَيُحِبُّهٗ جِبْرَئِيْلُ ثُمَّ يُنَادِیْ فِی السَّمَآءِ فَيَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ فَيُحِبُّهٗ اَهْلُ السَّمَآءِ ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِی الْاَرْضِ وَاِذَا اَبْغَضَ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِيْلَ فَيَقُوْلُ اِنِّیْ اُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضْهُ قَالَ فَيُبْغِضُهٗ جِبْرَئِيْلُ ثُمَّ يُنَادِیْ فِیْ اَهْلِ السَّمَآءِ اِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضُوْهُ قَالَ فَيُبْغِضُوْنَهٗ ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْبَغْضَآءُ فِی الْاَرْضِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٦/٣٠٣ الحديث رقم ٣٢٠٩ و مسلم فی ٤/٢٠٣٠ الحديث رقم (١٥٧-٢٦٣٧) و مالك فی الموطأ ٢/٩٥٣ الحديث رقم ١٥ من باب ماجاء فی المتحابين، واحمد فی المسند ٢/٢٦٧۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو پسند کرتے ہیں تو جبرائیل علیہ السلام کو بلا کر فرماتے ہیں مجھے اپنے فلاں بندے سے محبت ہے پس تو بھی اس سے محبت کر؛ پس جبرئیل اس سے

محبت کرنے لگتے ہیں پھر وہ آسمان میں اعلان کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے کو پسند کرتے ہیں پس تم بھی اسے پسند کرو تو تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر زمین میں اس کی مقبولیت عام کر دی جاتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ناپسند کرتے ہیں تو جبرئیل کو بلا کر فرماتے ہیں کہ مجھے فلاں بندے سے بغض ہے۔ تو بھی اسے ناپسند کر۔ پھر وہ تمام آسمان والوں کو آواز دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو فلاں بندہ ناپسند ہے پس تم بھی اس سے نفرت کرو۔ پس وہ اسے ناپسند کرتے ہیں پھر زمین میں اس کے لئے بغض و نفرت رکھ دی جاتی ہے۔ (مسلم)

تشریح: ان الله اذا أحب عدا: اگر یہ صفات ذاتیہ میں سے ہو، تو اس کے معنی ہیں ارادۂ خیر، اور اگر صفات افعال میں سے ہو تو اس کے معنی ہیں کہ حق جل شانہ اپنے بندہ کے ساتھ اکرام و احسان اور انعام کا معاملہ فرماتے ہیں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا کسی بندے کو محبوب رکھنے کا مطلب دراصل اس بندے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و بھلائی اور ہدایت و فلاح کی بارش ہونا اور اس پر رحمت خداوندی کا نازل ہونا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی شخص سے نفرت کرنا گویا اس شخص کو عذاب میں مبتلا کرنے کے ارادۂ خداوندی کو ظاہر کرنا اور اس کی شقاوت وغیرہ کو ظاہر کرنا ہے حضرت جبرائیل اور ملائکہ علیہم السلام کا کسی بندہ سے محبت کرنے کو دو صورتوں پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ اس بندے کے حق میں استغفار کرتے ہیں اس کی مدح و تعریف کرتے ہیں اور اس کے لئے بارگاہِ خداوندی میں دعا کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ''محبت'' کے وہی ظاہری معنی مراد ہیں جو عام طور پر مفہوم ہوتے ہیں۔ یعنی ان کے دل اس بندے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اس سے ملاقات کا اشتیاق رکھتے ہیں۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ دوسری صورت (یعنی محبت کو اس کے اپنے ظاہری معنی پر محمول کرنا) زیادہ واضح ہے کیونکہ جب کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی پر محمول کرنا صحیح ہو تو مجازی معنی مراد لینے کا کوئی جواز نہیں' علاوہ ازیں پہلے یعنی دوسرے معنی پر متفرع ہیں۔ (محبت کو اس کے حقیقی معنی پر محمول کرنے کی صورت میں اس بندے کے حق میں جبرئیل اور فرشتوں کا دعا و استغفار اور مدح و تعریف کرنا ضمنی طور پر خود بخود متحقق ہو جاتے ہیں۔)

(امام نوویؒ) فرماتے ہیں: اہل سماء کا اس سے محبت کرنے کا سبب یہ ہے کہ وہ شخص اللہ کا مطیع و فرمان بردار و محبوب ہے۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں یا وہ مطیع سابق ہوتا ہے، یا مطیع لاحق ہوتا ہے جیسا کہ سالک و مجذوب اور مرید و مراد کے مراتب کی تحقیق میں گزرا۔ امام نوویؒ) فرماتے ہیں: '' یوضع له القبول في الارض '' کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے اور وہ اس سے راضی ہوتے ہیں۔ چنانچہ لوگوں کے دل اس کی طرف کھنچتے چلے جاتے ہیں اور اس سے راضی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں '' فتوضع له المحبة'' کے الفاظ آئے ہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: محبت اور اس کے اشتقاق کا بھرپور بیان اسماء حسنیٰ کے ذیل گزر چکا ہے۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں: بایں ہمہ بہت سے مباحث رہتی ہیں جو ''احیاء'' میں ملیں گی۔

قوله: دعا جبرائيل: یہ جملہ حضرت جبرائیل کی شان خصوصی پر دلالت کرتا ہے، بایں طور کہ اس موقع پر صرف ان ہی کا [illegible] مایا گیا۔ چنانچہ یہ اسرافیل، مکائیل، حاملین عرش [illegible] ملائکہ مقربین سے افضل ٹھہرے۔ اور ان کی وجہ تخصیص یہ بھی

ممکن ہے کہ یہ اللہ اور انبیاء و رسل کے درمیان سفیر رہے ہیں۔

قوله: فقال انی أحب فلانا فأحبه:

محبت کا سبب کا ذکر نہ کرنا بتاتا ہے کہ افعال باری تعالیٰ اغراض و علل سے مبرا ہیں۔ بلکہ اللہ کے اپنے بندہ سے محبت کرنے پر ہی بندہ بھی اپنے اللہ سے محبت کرتا ہے۔ بایں طور کہ صراط مستقیم پر چلتا ہے' اس کے انبیاء کی اتباع کرتا ہے' ہر لحہ ذکر باری تعالیٰ میں مشغول ہو جاتا ہے، اللہ کی حمد و ثناء کرتا ہے، اور اللہ کی رضاء و لقاء کا شوقین ہو جاتا ہے۔ اللہ جل شانہ کا حضرت جبرائیل علیہ السلام کو یہ حکم دینا کہ ''تم بھی اس سے محبت کرو'' اپنے اس محبوب بندہ کے مزید اکرام کی خاطر ہے، ورنہ تو اللہ جل شانہ جیسے محب و محبوب، طالب و مطلوب اور حامد و محمود کے ہوتے ہوئے اس کی کیا حاجت؟

قوله: ان اللّٰہ یبغض فلانا فأ بغضوه: بصریین کے نزدیک اضمار القول ہے، اور کوفیین کے نزدیک نداء چونکہ قول کے معنیٰ میں ہے اس میں '' انّ'' بکسر الهمزه ہے۔ (ذکرہ ابن الملک) و راحتمال یہ بھی ہے کہ بفتح الهمزه ہو اضمار الباء کے سبب جیسا کہ بعض نسخوں میں ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ کی بابت مفسرین کا کہنا ہے: ﴿فنادته الملائكة وهو قائم يصلي في المحراب ان اللّٰه﴾ [آل عمران: ۳۹]

جمہور قراء کی قراءت بفتح الهمزه ہے۔ ان کے درمیان فرق بھی کیا جاتا ہے، بایں طور کہ بکسر الهمزه ہو تو من جملہ منادیٰ ہوتا ہے، بخلاف اس کے کہ جب مفتوح ہو۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ملأ اعلیٰ کی مخلوق کو اللہ جل شانہ کے محبوب و مبغوض افراد کا علم نہیں ہوتا، الا یہ کہ انہیں مطلع کیا جائے۔ نیز ان محبوب و مبغوض کی الفت و بغض کا یہ معاملہ کبھی بدلتا نہیں، تا کہ اخبار باری تعالیٰ مین تخلف لازم نہ آئے۔

درمنثور میں اس آیت کریمہ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ [مریم: ۹۶] ''اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کیے خدا انکی محبت (مخلوقات کے دل میں) پیدا کردے گا'' کے تحت لکھتے ہیں: حکیم ترمذی اور ابن مردویہ حضرت علیؓ سے نقل کرتے ہیں: فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کریمہ کے بارے میں پوچھا، کہ اس کی کیا حقیقت ہے؟ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''المحبة في صدور المؤمنين والملائكة المقربين يا علي! ان اللّٰه اعطى المقت والمحبة والحلاوة والمهابة في صدور الصالحين''

ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ھناد، ابن المنذر اور ابن حاتم نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی بابت فرمایا: **یحبهم ویحببهم**۔

عبد بن حمید، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، نیز امام بیہقی ''اسماء والصفات'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ناقل ہیں:

ان رسول اللّٰه ﷺ قال: اذا أحب اللّٰه عبدا نادى جبرائيل عليه السلام انى قد احببت فلانا فاحبه، فينادى في السماء، ثم تنزل له المحبة في أهل الارض، فذلك قول اللّٰه تعالى: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾

جبریل: انی قد أبغضت فلانا فینادی فی اهل السماء، ثم ینزل له البغضاء فی الارض۔اھ۔
پس (ان روایات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ) مشکوٰۃ کی حدیث معنوی اعتبار سے متفق علیہ ہے۔

عظمتِ الٰہی کے لئے محبت والے سایہ عرش میں

۵۰۰۶: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَيْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِيْ اَلْيَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلِّيْ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱۹۸۸/۴ الحدیث رقم (۳۷-۲۵۶۶)، والترمذی فی السنن ۵۱۶/۴ الحدیث رقم ۲۳۹۰، والدارمی ۴۳/۲ الحدیث رقم ۲۷۵۷ و مالك فی الموطا ۹۵۲/۲من باب ما جاء فی المتحابین فی الله ، واحمد فی المسند ۳۳۸/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائیں گے میری عظمت کے لئے کون آپس میں محبت کرنے والے ہیں آج میں ان کو اپنے سایہ میں جگہ دوں گا جب میرے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہیں۔ (مسلم)

تشریح: قوله: این المتحابون بجلالی: " بجلالی": باء سببیہ ہے بسبب عظمتی ولأ جل تعظیمی أو الذین یکسون التحابب بینهم لأجل رضا جنابی وجزا ثوابی امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ باء بمعنی "فی" ہے میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں: یہ "فیہ ما فیہ" ہے۔ امام طیبیؒ اس سلسلۂ کلام میں آگے لکھتے ہیں: جلال کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا تاکہ ہیبت وسطوت پر دلالت کرے۔ یعنی المنزهون عن شائبة الهوی والنفس والشیطان فی المحبة، فلا یتحابون الا لأجلی ولوجهی

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ یہ کلام "باب اکتفاء" سے ہو۔ اور تقدیری عبارت: بجلالی وجمالی ہو۔ ای: المتحابون لی یعنی جو لوگ میرے جلال و جمال کے سبب دونوں حالتوں میں یعنی قبض وبسط' خوف ورجاء، محنۃ ومنحۃ میں باہم محبت کرتے تھے۔ ان کی یہ دائمی محبت ان کو نفع پہنچائے۔

"الیوم": ایک شارح کا کہنا ہے کہ یہ ظرف " این" کے متعلق ہے۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں: اظہر یہ ہے کہ ظرف تو ہے لیکن" اظلهم فی ظلی" کیلئے۔

قوله: أظلهم فی ظلی: اس کی وضاحت میں علماء کے کئی اقوال ہیں: ➊ "ظل الله " مراد' ظل حمایة الله" ہے۔ یعنی میں ان کو اپنی حمایت کے سایہ تلے جگہ دوں گا۔ ➋ میں ان کو موقف کی گرمی میں ایسی راحت سے نوازوں گا کہ جس طرح سایہ تلے موجود شخص کو راحت ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سایہ سے مراد عرش کا سایہ ہے' جیسا کہ بعض احادیث میں اس کا صراحتاً ذکر ہے چنانچہ طبرانی نے "الکبیر" میں ایوب سے نقل کیا ہے: المتحابون فی الله علی کرسی من یاقوت تحت العرش ➌ شرح مسلم للنووی میں ہے کہ قاضی عیاض فرماتے ہیں ~~کہ ظاہر~~ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص گرامی اور موقف کی تپش

سے سایہ میں ہوگا۔ عیسیٰ بن دینار فرماتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی حفظ وامان میں ہونے سے کنایہ ہے۔ (یعنی سایہ سے مراد حفاظت خداوندی اور رحمت الٰہی ہے) جیسا کہ وہ کہتے ہیں: السلطان ظل الله في الارض (بادشاہ) دنیا میں اللہ تعالیٰ کا سایہ ہے' اور اس کا بات کا احتمال بھی ہے کہ یہ راحت وتنعّم سے عبارت ہو۔ (یعنی ''سایہ'' کے ذریعہ قیامت کے دن کی ان راحتوں اور نعمتوں کو تعبیر کیا گیا ہے جو ان لوگوں پر حق تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوں گے) چنانچہ کہا جاتا ہے: هو في عيش ظليل اى طيب۔ (یعنی عربی میں لفظ ''ظل'' (ذکرہ الطیبی) ظل کی اسناد اللہ جل شانہ کی طرف حقیقتاً کرنا تو صحیح نہیں ہے' لہٰذا تاویل متعین ہے کہ مجازی معنی پر محمول کیا جائے' یا حذف مضاف مانا جائے۔ اور مذکورہ بالا احتمالات میں سے آخری احتمال تو انتہائی بعید احتمال ہے' چونکہ اس صورت میں معنوی تقدیر یوں ہوگی: الفهم في نعمتي لیکن تقلید میں زبردستی غالب ہے اور یہ مسلمہ بات ہے: حبك الشئ يعمى ويصم۔ (سایہ) راحت ونعمت کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ خوشی وراحت کے ساتھ گزرنے والی زندگی کو ''عیش ظلیل'' کہا جاتا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمدؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت والا اللہ تعالیٰ کا محبوب ہے

۵۰۰۷: وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَجُلاً زَارَ اَخًا لَهُ فِيْ قَرْيَةٍ اُخْرٰى فَاَرْصَدَ اللّٰهُ لَهُ عَلٰى مَدْرَجَتِهِ مَلَكًا قَالَ اَيْنَ تُرِيْدُ قَالَ اُرِيْدُ اَخًالِيْ فِيْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ قَالَ هَلْ لَكَ عَلَيْهِ مِنْ نِعْمَةٍ تَرُبُّهَا قَالَ لَاغَيْرَاَنِّيْ اَحْبَبْتُهُ فِي اللّٰهِ قَالَ فَاِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَبَّكَ كَمَا اَحْبَبْتَهُ فِيْهِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/١٩٨٨ الحديث رقم (٣٨-٢٥٦٧)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص اپنے مسلمان بھائی کی ملاقات کے لئے دوسری بستی میں گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے راستہ میں ایک فرشتہ انسانی شکل میں بھیجا اس نے پوچھا تم کہاں جارہے ہو اس نے بتایا کہ اس بستی میں اپنے ایک بھائی سے ملنے جارہا ہوں۔ فرشتے نے کہا کیا تیرے لئے اس کے علاوہ بھی کوئی مقصد ہے جس کو تو حاصل کرنا چاہتا ہو۔ اس آدمی نے جواب دیا نہیں اس کے سواء ہرگز کوئی اور مقصد نہیں۔ میں تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کرتا ہوں۔ فرشتے نے کہا میں تیری طرف پیغام لانے والا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھ سے محبت کرتا ہے۔ جیسا کہ تو نے اس کی خاطر محبت کی۔ (مسلم)

تشریح: قوله: فأرصد الله له على مدرجته:

اس کے تین معنی بیان کئے گئے ہیں: ① اعد وهيأ ② اقعد في طريقه (اس کے راستہ میں ایک فرشتہ کو بٹھا دیا۔) ③ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: اى وكله بحفظ مدرجته يقال: رصدته اذ قعدت له على طريقه تسترقبه۔ اھ۔ چنانچہ اس ارشاد باری تعالیٰ: ﴿ان ربك بالمرصاد﴾ [الفجر: ١٤] میں تجرید ہے۔ اور اس کا معنی ہوگا: ان ربك مراقب

للعباد لکھتے ہیں: مدرجة: میم اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ''راستہ'' کو کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لأن الناس یدرجون علیها ای یمضون ویمشون اھ۔ اور اظہر یہ ہے کہ ''مدرجہ'' اس راستہ کو کہتے ہیں جو بلندی پر ہو جس پر سیڑھیاں چڑھ کر جایا جائے، اور سیڑھیوں سے اترا جائے۔ چنانچہ اسی مناسبت سے "مدرجة منٰی" ہے۔ یہ منٰی جانے کا راستہ ہے۔

قال: این ترید یہ جملہ مستانفہ ہے۔

قوله: این ترید:

بظاہر یہ تجاہل عارفانہ ہے، نیز ایک قسم کا توریہ بھی ہے، کہ سوال سے مقصود اصلی ''من ترید'' تھا۔ لیکن بات وہی ہے، کہ ''من أحب شیئا اکثر ذکره والاناء بترشح بمافیه''۔

قال: أرید اخالي في هذه القریة: ممکن ہے کہ اس قریہ کی تعیین اشارہ کے ساتھ کر دی ہو۔ اور کلام میں اطناب کا حکیمانہ اسلوب اختیار کیا، گویا کہ اس نے یوں: لا تسأل عن المحل واکتف بالسؤال عن الحال، فان هذا طریق ارباب الحال بلا محال

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اگر یہ کہا جائے کہ سوال و جواب میں مطابقت نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال خود اس سوال کو متضمن ہے جس کا جواب مجیب نے دیا۔ یعنی :این تتوجه ومن تقصد؟ لیکن چونکہ مقصود اصلی زیارت تھا اس لئے اس کو ذکر کیا اور غیر اہم بات کو چھوڑ دیا۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں: یہ توجیہ تب ہی تام ہوتی، کہ '' في هذه القریة'' نہ کہا ہوتا)۔

فرمایا: اور اس کی نظیر یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وما أعجلك عن قومك یا موسٰی قال هم أولاء علی أثری وعجلت الیك رب لترضی﴾ [طٰہٰ ۔ ۸۴] چونکہ سوال کی غرض یہ تھی کہ تم اپنے قوم کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے کیوں چلے آئے، تو اس غرض کو سامنے رکھتے ہوئے، جواب میں اصل کو مقدم کر دیا، اور جس چیز کی بابت سوال تھا، اس کو مؤخر کر دیا۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں: اس کا نظیر ہونا محل نظر ہے۔ بلکہ معنی کے اعتبار سے یہ اس کی مثال ہے۔ اور اس کی وضاحت وہ ہے جو قاضی بیضاویؒ:

﴿وما اعجلك عن قومك یا موسٰی﴾ [طٰہٰ۔۸۴] کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: سؤال عن سبب العجلة یتضمن انكارها من حیث انها نقیضه في نفسها انضم الیها اغفال القوم وابهام التعظیم علیهم، فلذلك أجاب موسٰی عن الأمرین، وقدم جواب الانكار لأنه أهم [قال هم أولاء عن أثری] :أی: ما تقدم عنهم الابخطا یسیرة لا یعتد به عادة ولیس بیني وبینهم الا مسافة قریبة یتقدم به الرفقة بعضهم بعضا ﴿وعجلت الیك رب لترضی﴾ فان المسارعة الی امتثال أمرك والوفاء بوعدك یوجب مرضاتك اھ ۔

قال هل لك علیه من نعمة تربها: تربها: راء مہملہ کے ضمہ اور بائے موحدہ مشددہ کے ساتھ ای تقوم باصلاحها واتمها۔ یعنی کیا وہ تمہارا مملوک ہے یا تیرا بیٹا ہے یا ان کے علاوہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا نفقہ تجھ پر ہے۔ یہ '' رب فلان الضیعة'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے ~~اصلحها~~ واتمها۔ بعض نسخوں میں عبارت یوں ہے: '' هل له علیك من

نعمة تربها؟" ای تقوم بشکرها

بعض کا کہنا ہے کہ" نعمة": مبتدا ہے۔" من" زائدہ ہے اور" لك" خبر ہے۔ اور" علیه" محذوف کے ساتھ مل کر "حال" ہے۔ ای: هل لك نعمة داعية علی زيارتها تربها ای: تحفظها وتستزيدها بالقيام علی شكرها

امام طیبیؒ لکھتے ہیں: ای: هل اوجبت عليه شيئا من النعم الدنيوته تذهب اليها فتربها ای: تملكها منه وتستو فيها؟

قوله لا غير أني أجبتد في الله : کی معنوی تقدیر یوں ہے: ليس لی داعية الی زيارته الا محبتی اياه فی طلب مرضاة الله ـ

قوله: ان الله قد أحبك كما أحببته فيه: شاید کہ وجہ تشبیہ محبت کا دنیاوی سبب سے خالی ہونا ہے۔ یعنی جیسے تو اس کو بغیر کسی دنیاوی سبب کے چاہتا ہے، اسی طرح اللہ تجھے بغیر کسی سبب اخروی کے چاہتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کاف تعلیلیہ ہو۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں کاف تعلیلیہ ہے: ﴿واذكروه كما هداكم﴾ [البقرہ۔۱۹۸]

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کرنے کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے اور کہ یہ چیز (حب فی اللہ) محبت الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے نیز اس سے صالحین کی ملاقات کے لئے ان کے پاس جانے کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کبھی فرشتوں کو دیکھتا ہے۔ میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں انبیاء و رسل کے علاوہ دیگر مؤمنین کا ملائکہ کو بصورت بشریہ دیکھنا ایک واضح امر ہے جس کا ثبوت آغاز کتاب میں حدیث جبرائیل وغیرہ میں گذر چکا ہے۔ ہاں یہاں یہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے نیک ومحبوب بندوں کے پاس فرشتوں کو بھیجتا ہے جو ان سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ لیکن بظاہر یہ چیز پچھلی امتوں کے ساتھ مخصوص تھی کیونکہ اب نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے (اور انسانوں کے پاس فرشتوں کی آمد کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔)

آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے

۵۰۰۸: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ تَقُوْلُ فِيْ رَجُلٍ اَحَبَّ قَوْمًا وَلَمْ يَلْحَقْ بِهِمْ فَقَالَ الْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۱۰/۵۵۷ الحديث رقم ۶۱۶۹ ومسلم فی ۴/۲۰۳۴ الحديث رقم (۱۶۵-۲۶۴۰) و ابوداؤد فی السنن ۵/۳۴۴ الحديث رقم ۵۱۲۶، والترمذی فی السنن ۴/۵۱۴ الحديث رقم ۲۳۸۷، والدارمی فی ۲/۴۱۴ الحديث رقم ۲۷۸۷، واحمد فی المسند ۱/۳۹۲۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ذکر کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حکم ہے جو کسی جماعت سے محبت رکھتا ہے مگر وہ ان میں شامل نہیں یا وہ علم وفضل میں ان تک نہ پہنچا ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قولہ: أحب قوما: (قوم میں خصوص وعموم ہر دو کا احتمال ہے' تفصیل آگے آرہی ہے۔) ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جو کسی قوم یعنی علماء یا صلحاء سے محبت رکھتا ہو لیکن اس کو ان کی صحبت حاصل نہ ہوئی' یا ان سے علم نہ حاصل نہ کر پایا ہو یا یہ کہ نہ ان کی صحبت سے فیض یاب نہ ہو سکا اور نہ ان کے علم وعمل سے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ ان کی زیارت نہ کر پایا۔

قولہ: المرء مع من أحب: یعنی اس کا حشر اپنے محبوب کے ساتھ ہوگا' اور اپنے مطلوب کا رفیق وہمدم ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء: ٦٩] ''اور جو لوگ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں وہ قیامت کے دن ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر خدا نے بڑا فضل کیا یعنی انبیاء وصدیق اور شہید اور نیک لوگ اور ان لوگوں کی رفاقت بہت ہی خوب ہے''۔

حدیث کا ظاہری مفہوم عمومیت پر دلالت کرتا ہے جو صالح وطالح ہر دو کو شامل ہے۔ یعنی اس ارشاد گرامی میں عمومی طور پر یہ نکتہ بیان فرمایا گیا ہے کہ جو شخص کسی سے محبت رکھتا ہے اس کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا خواہ وہ شخص کہ جس کے ساتھ محبت ہے نیک و صالح ہو یا بدکار و فاسق کی اس بات کی تائید اس حدیث: اَلْمَرْءُ عَلٰى دِيْنِ خَلِيْلِهٖ سے ہوتی ہے۔ جو آگے آئے گی۔ چنانچہ اس صورت میں اس میں ترغیب و ترتیب بھی ہے اور وعدہ وعید بھی ہے۔ (یعنی جو لوگ علماء وصلحاء اور بزرگانِ دین کے ساتھ عقیدت ومحبت اور دوستی رکھتے ہیں ان کے لئے اس حدیث میں خاتمہ بخیر اور اخروی فلاح وسعادت کی بشارت ہے اور جو لوگ بدکار و فاسق اور خدا کے دشمنوں کے ساتھ عقیدت ومحبت رکھتے ہیں ان کے لئے اس حدیث میں سخت وعید وتنبیہ ہے۔)

تخریج: الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: المرء مع من أحب اس حدیث کو امام احمد، شیخین، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ شیخین نے اس روایت کو بحوالہ ابن مسعود بھی روایت کیا ہے۔ اور ترمذی کی ایک روایت میں حضرت انسؓ سے مروی حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''المرء مع من احب وله ما اکتسب۔

میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوں

۵۰۰۹: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلًا قَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَتَى السَّاعَةُ قَالَ وَيْلَكَ وَمَا اَعْدَدْتَّ لَهَا قَالَ مَا اَعْدَدْتُّ لَهَا اِلَّا اِنِّيْ اُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ قَالَ اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ قَالَ اَنَسٌ فَمَا رَاَيْتُ الْمُسْلِمِيْنَ فَرِحُوْا بِشَيْءٍ بَعْدَ الْاِسْلَامِ فَرِحَهُمْ بِهَا۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٥٥٣ الحديث رقم ٦١٦٧ و مسلم في ٤/٢٠٣٢، الحديث رقم (١٦١-٢٦٣٩)، والدارمي في السنن ٢/٤١٤ الحديث رقم ٦٧٨٧، واحمد في المسند ٣/١٦٨۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی تو حضور ﷺ نے فرمایا تم پر افسوس ہے تم نے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے۔ اس نے عرض کیا کہ میں نے اس کے لئے کوئی تیاری نہیں کی' سوائے اس کے کہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت رکھتا ہوں۔ فرمایا میں نے تو اس کے ساتھ ہوگا جس سے تو

محبت کرتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد میں نے مسلمانوں کو کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا جتنا کہ وہ اس خوش خبری پر ہوئے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: متى الساعة: اى متى وقت قيام القيامة۔

اس شخص نے ''تیاری'' کے زمرہ میں صرف خدا اور خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کو ذکر کیا اس کے علاوہ دوسری بدنی و قلبی اور مالی عبادتوں کا اس نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ (جن سے اس کی زندگی یقیناً خالی نہیں تھی۔ اس کی وجہ ایک تو اظہار عجز و انکساری اور اپنے مرتبہ عبودیت کا اخفاء تھا جو ایک مخلص مؤمن کی شان ہے' دوسری وجہ یہ تھی کہ خدا اور خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت ہی اصل چیز ہے اور) تمام عبادتیں اسی محبت کی شاخیں اور اس کا لازمی اثر ہوتی ہیں۔ (جس شخص کا قلب خدا اور خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ عبادت وطاعت خود بخود اس کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔ علاوہ ازیں صرف محبت کو ذکر کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ) محبت بذاتِ خود سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے۔ ان سے اللہ تعالیٰ بھی محبت کرتا ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: [يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ] [المائدة۔ ٥٤] اور ایک جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ ظاہر ہے کہ جس بندے کو محبت الٰہی کی دولت حاصل ہو جائے اس کی دنیاوی واخروی فلاح ونجات میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ بات تو ان کے نزدیک بالکل واضح تھی کہ بغیر متابعت کے محبت محضہ کا بہت زیادہ فائدہ حاصل نہیں ہے۔

قوله: أنت مع من أحببت: کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی سے اس درجہ تعلق رکھتا ہے کہ اس کی محبت دوسری تمام چیزوں یہاں تک کہ اپنے مال' اپنے اہل وعیال اور اپنی جان تک کی محبت پر غالب آ جاتی ہے۔ تو وہ اپنے محبوب کے ساتھ منسلک وملحق ہو جاتا ہے اور اس کا شمار محبوب کے اپنے لوگوں میں ہونے لگتا ہے۔ اور محبت صادقہ کی علامت یہ ہے کہ وہی کام کرے جس کا محبوب حکم کرے اور اس کام سے اجتناب وپرہیز کرے جو محبوب کے حکم ومرضی کے خلاف ہو اور اس کے غیر کی مرضی ومراد کو پورا کرنے والا ہو۔ (لہٰذا تم اگر اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو اپنے عقیدہ وقول اور فعل وعمل سے اس دعوے کو ثابت کرتے رہو بایں طور کہ فرائض وواجبات کی بجا آوری کرو۔ حق تعالیٰ جن امور سے راضی وخوش ہوتا ہے ان کو ہمیشہ اختیار کرو اور اس نے جن چیزوں سے منع کر دیا ہے ان کے قریب بھی مت جاؤ)۔

اسی بات کو رابعہ عدویہ نے یوں بیان کیا ہے:

تَعْصِي الْاِلٰهَ وَاَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهٗ ☆ هٰذَا لَعَمْرِي فِي الْقِيَاسِ بَدِيْعٌ
لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَاَطَعْتَهٗ ☆ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُّحِبُّ مُطِيْعٌ

''تم اللہ کی نافرمانی کو اختیار کیے ہوئے حالانکہ تم اس کی محبت کا دم بھرتے ہو۔ اپنی جان کی قسم یہ چیز قیاس میں انوکھی چیز ہے۔ اگر تمہاری محبت سچی ہوتی تو یقیناً تم اس کی اطاعت کرتے (کیونکہ) محبت کرنے والا (درحقیقت) اپنے محبوب کا فرمانبردار ہوتا ہے''۔ خطابیؒ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نے بغیر کسی زیادت عمل کے' ان کو اصحاب اعمال صالحہ کے ساتھ ملحق فرما دیا۔ اھ۔ ان کا یہ کلام ابہام وایہام سے خالی نہیں۔ اس بارے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ صحابہ کرام کا

گمان یہ تھا۔“

کہ جنت میں آنحضرت ﷺ کی معیت محض آنحضرت ﷺ کے ساتھ محبت اور آپ ﷺ کی متابعت کی وجہ سے حاصل نہیں ہوگی بلکہ اس سعادت کو حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ عبادت میں مشغول رہنا اور کثرت کے ساتھ ریاضت و مجاہدہ اختیار کرنا بھی ضروری ہے اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو عماد الدین ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دن نبی کریم کی خدمت میں ایک صحابیؓ حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ یارسول اللہ ﷺ حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ مجھ کو اپنی جان اپنے اہل خانہ اور اپنے بچوں سے بھی زیادہ محبوب ہیں، میں اپنے گھر میں ہوتا ہوں تو جب آپ ﷺ کو یاد کرتا ہوں تو میں صبر نہیں کرتا یہاں تک کہ آپؐ کی زیارت نہ کرلوں۔ جب مجھے اپنی اور آپ کی موت کا خیال کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ آپ ﷺ جنت میں جائیں گے تو جنت کے سب سے اعلیٰ درجہ میں انبیاء کے ساتھ ہوں گے اور اگر مجھے بھی جنت میں داخل کیا تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں آپ ﷺ کی زیارت سے محروم رہوں گا۔ آنحضرت ﷺ نے ان صحابیؓ کی یہ بات سنی لیکن کوئی جواب نہیں دیا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء: ٦٩]

”جس نے (ضروری احکام میں) اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کی وہ (جنت میں) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا انعام نازل کیا ہے یعنی انبیاء علیہم السلام، صدیق، شہداء اور صالحین“۔

قوله: أنت مع من أحببت: یہاں ”معیت“ سے معیت خاصہ مراد ہے تو جاننا چاہئے کہ ”معیت“ سے یہ مراد ہے کہ جنت میں محب و محبوب دونوں مرتبہ کے اعتبار سے ایک ہو جائیں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی لمحے اپنے اپنے درجات سے اتر کر جنت کے کسی باغ میں اکٹھے ہو جایا کریں گے، جس کو ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اس سند سے یوں بیان کیا ہے: **عن ابن جرير، حدثنا المثنى، حدثنا ابن أبى جعفر، عن أبيه، عن الربيع فى قوله تعالى: [ومن يطع الله ورسوله......]** [النساء: ١٣] **قال: ان أصحاب رسول الله ﷺ قالوا قد علمنا أن النبى ﷺ له فضل على من آمن به فى درجات الجنات وعلى من اتبعه وصدقه، وكيف لهم اذا اجتمعوا فى الجنة أن يرى بعضهم بعضا فانزل الله فى ذلك يعنى هذه الآية فقال: يعنى رسول الله ﷺ: ان الا علين ينحد رون الى من هو أسفل منهم، فيجتمون فى ريا ضها فيذ كرون ماأنعم الله عليهم ويثنون عليه، وينزل لهم أهل الدرجات فيسعون عليهم بما يشتهون ومام يدعون به، فهم روضة يحبرون ويتنعمون۔** ربیع سے اللہ جل شانہ کے اس فرمان [**ومن يطع الله ورسوله**“......] کے بارے میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب نے عرض کیا یارسول اللہ! ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ نبی کریم ﷺ کو فضیلت حاصل ہوگی جنت کے درجات میں ان لوگوں پر جو اس پر ایمان لائے اور ان پر جنہوں نے اس کی اتباع کی اور تصدیق کی۔ جب یہ سب لوگ جنت میں اکٹھے ہوں گے تو بعض، بعض کو کیسے دیکھیں گے۔ تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ یعنی آیت نازل فرمائی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اعلیٰ درجہ والے ان لوگوں کے پاس آئیں گے جو نیچے کے درجات

میں ہوں گے اور پھر سب جنت کے باغات میں یکجا ہوں گے۔ (وہاں ایک دوسرے کی زیارت وملاقات ہوگی اور درجہ عالیہ والے) ان چیزوں کا ذکر کریں گے جو ان کو اللہ کی طرف سے بطور انعام حاصل ہوئی ہوں گی اور حق تعالیٰ کے انعامات واکرامات پر اس کی حمد وثنا کریں گے پھر درجات سافلہ والے ان کی خاطر وتواضع کریں گے اور دوڑ دوڑ کر ہر وہ چیز لائیں گے اور ان کو دیں گے جن کی وہ خواہش وطلب کریں گے غرضیکہ اس طرح وہ سب جنت کے باغات میں اس طرح کی تقریب سے لطف اندوز اور مسرور ہوا کریں گے۔

واضح رہے کہ متابعت اور ضروری احکام کے مدارج مختلف ہوتے ہیں' لہٰذا جس درجہ کے احکام ضروریہ میں اطاعت ہوگی اسی درجہ کی محبت بھی شمار ہوگی اور جس درجہ کی محبت یا جس درجہ کا حسن معاملہ ہوگا اسی درجہ کی یہ معیت وملاقات بھی نصیب ہوگی۔

اچھے برے ساتھی کی ایک عمدہ مثال

۵۰۱۰ : اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْجَلِیْسِ الصَّالِحِ وَالسُّوْءِ کَحَامِلِ الْمِسْکِ وَنَافِخِ الْکِیْرِ فَحَامِلُ الْمِسْکِ اِمَّا فَاَنْ یُّحْذِیْکَ وَاِمَّا اَنْ تَبْتَاعَ مِنْہُ وَاِمَّا فَاَنْ تَجِدَ مِنْہُ رِیْحًا طَیِّبَۃً وَنَافِخُ الْکِیْرِ اِمَّا فَاَنْ یُّحْرِقَ ثِیَابَکَ وَاِمَّا اَنْ تَجِدَ مِنْہُ رِیْحًا خَبِیْثَۃً۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٩/٦٦٠ الحدیث رقم ٥٥٣٤ و مسلم فی ٤/٢٠٢٦ الحدیث رقم (١٤٦-٢١٢٨) و ابوداؤد فی السنن ٥/١٦٦ الحدیث رقم ٤٨٢٩، واحمد المسند ٤/٤٠٨۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھے اور برے ساتھی کی مثال کستوری والے اور بھٹی جلانے والے جیسی ہے۔ خوشبو والا یا تمہیں خوشبو دے دے گا یا تم اس سے خرید لو گے یا اس سے عمدہ خوشبو کا جھونکا پاؤ گے اور بھٹی والا یا تو تمہارے کپڑے جلا دے گا یا تم اس سے (دھوئیں کی) بدبو پاؤ گے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: سوء: سین کے فتحہ اور ضمہ ہر دو کے ساتھ۔

الکیر: بکسر الکاف۔

اچھے لوگوں کی محبت وہم نشینی اور برے لوگوں کی محبت وہم نشینی کے درمیان جو فرق ہے اس کو مذکورہ بالا مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے کہا گیا ہے کہ اس ارشاد گرامی کی مراد اس بات کی تاکید وتنبیہ ہے کہ علماء وصلحاء سے محبت وتعلق پیدا کرو' ان کی صحبت وہم نشینی کو اختیار کرو' ان کی صحبت وہم نشینی دنیا وآخرت میں فائدہ حاصل کرنے کا سبب ہے اور برے لوگوں کی صحبت وہم نشینی دنیا وآخرت میں نقصان کا ذریعہ ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ اخیار کی مصاحبت اختیار کرنا مورث خیر ہے، اور اشرار کی مصاحبت اختیار کرنا مورث شر ہے، ہوا کی مانند ہے، کہ خوشبودار چیزوں کو چھوتی ہوئی گزرتی ہے، تو ساری فضا کو معطر اور مہکتا ہوا کر چھوڑتی ہے، اور اگر ہوا بدبودار چیزوں کو مس کرتے ہوئے گزرے گی تو فضا کو بدبودار بنا دے گی۔

بعض کا کہنا ہے، کہ اگر تم احمقوں کی مصاحبت اختیار کرو گے تو تمہارے اندر حماقت گھر کر جائے گی، بخلاف عقلاء کے اگر تم

عقلمندوں کی ہم نشینی اختیار کرو گے، تو تمہیں اس قدر عقل وفہم حاصل نہ ہوگی، چونکہ "فساد" ایک ایسی چیز ہے جو طبائع میں بہت جلد اثر دکھاتا ہے، اور حاصل یہ ہے کہ صحبت بہر حال اثر دکھاتی ہے۔ اس وجہ سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله وكونوا مع الصدقين﴾ [التوبۃ۔۱۱۹] بعض عارفین نے فرمایا: كونوا مع الله، فان لم تقدروا أن تكونوا مع الله فكونوا مع من يكون مع الله اھ۔

اختلاط وخلوت نشینی اور مسئلہ ہذا کی تفصیل بسط کے ساتھ ملاحظہ فرمانا چاہیں تو "احیاء" کی طرف رجوع فرمائیں۔

تخریج: الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں:

مثل الجليس الصالح والجليس السوء كمثل صاحب المسك وكير الحداد، لا يعديك من صاحب المسك اما تشتريه أو تجد ريحه، وكير الحداد يحرق بيتك او ثوبك او تجد منه ريحا خبيثة ـ

اس حدیث کو امام بخاریؒ نے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

مثل الجليس الصالح مثل العطار، ان لم يعطك من عطره أصابك من ريحه ـ

ابوداؤدؒ اور حاکمؒ نے حضرت انسؓ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

مثل المؤمن كمثل العطار، ان جالسته نفعك، وان ماشيته نفعك، وان شاركته نفعك اس حدیث کو امام طبرانی نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم

الفصل الثانی:

اللہ تعالیٰ کی عظمت کی خاطر محبت والے

۵۰۱۱: عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَجَبَتْ مَحَبَّتِيْ لِلْمُتَحَابِّيْنَ فِيَّ وَالْمُتَجَالِسِيْنَ فِيَّ وَالْمُتَزَاوِرِيْنَ فِيَّ وَالْمُتَبَاذِلِيْنَ فِيَّ (رواه مالك وفى رواية الترمذى) قَالَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اَلْمُتَحَابُّوْنَ فِيْ جَلَالِيْ لَهُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُّوْرٍ يَغْبِطُهُمُ النَّبِيُّوْنَ وَالشُّهَدَآءُ.

أخرجه الترمذى فى السنن ٥١٥/٤ الحديث رقم ٢٣٩٠ و مالك فى الموطأ ٩٥٣/٢ الحديث رقم ١٦ واحمد فى المسند ٢٤٧/٥۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا میں ان لوگوں سے یقیناً محبت کرتا ہوں جو میری وجہ سے آپس میں محبت کرتے ہیں میری وجہ سے آپس میں اکٹھے بیٹھتے اور ملاقات کرتے ہیں میری وجہ سے خرچ کرتے ہیں موطا مالک، ترمذی کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو لوگ میری عظمت کی خاطر آپس میں محبت کریں گے' ان کے لیے نور کے منبر بچھائے جائیں گے ان پر انبیاء وشہداء رشک کریں گے۔

تشریح: وجبت: یہ وجوب' ثبوت وتقدم کے معنی میں ہے۔

محبتي للمتحابين في: "في" میں یائے مشددہ ہے' تعلیلیہ ہے ای لأجلي.

قولہ :المتحابون في جلالي ،یعنی میرے عظمت وجلال کی وجہ سے آپس میں محبت کرنے والے۔نیز صرف جلال کا ذکر کرنا''باب اکتفاء'' سے ہے۔المتجالیسن في:(جار مجرور کے درمیان مضاف محذوف ہے۔)اي في جبي أو سبيلي موطا کی اس روایت کے بارے میں الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں:اس حدیث کو امام احمد طبرانی' حاکم اور بیہقی نے حضرت معاذؓ سے روایت کیا ہے۔

يغبطهم:بائے موحدہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔''غبطة''(بکسرالعین)سے ماخوذ ہے۔

غبطہ کی تعریف یہ ہے: هي تمنى نعمة على ان لا تتحول عن صاحبها بخلاف الحسد، فانه تمنى زوالها عن صاحبها اور صاحب قاموس لکھتے ہیں: الغبطة حسن الحال والمسرة پس اس کے معنی حقیقی اس کے معنی لغوی کے مطابق ہیں۔پس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ انبیاء وشہداء ان کی یہ خوش حالی دیکھ کر خوشی اور مسرت کا اظہار فرمائیں گے۔اس مطلب سے وہ اشکال بھی ختم ہو جاتا ہے جس میں علماء حیران وسرگردان ہیں۔الجامع الصغیر میں ہے:التحابون في الله على كرسي من ياقوت حول العرش۔اس حدیث کو طبرانی نے ابوایوب سے روایت کیا ہے۔

''جن پر انبیاء وشہداء رشک کریں گے'' اس جملہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات کس طرح درست ہو سکتی ہے کیونکہ انبیاء علی الاطلاق تمام لوگوں سے افضل و برتر ہیں اور شہداء راہ میں اپنی جان ومال قربان کر دینے کے سبب عظیم فضیلت رکھتے ہیں لہٰذا ان دونوں کا ایسے لوگوں کے اجر وانعام پر رشک کرنا کس طرح موزوں ہو سکتا ہے جس کا مذکورہ عمل (یعنی خدا کے لئے آپس میں میل محبت رکھنا) نہایت آسان اور سہل ہے علاوہ ازیں اس بات سے انبیاء اور شہداء کے مقابلہ پر مذکورہ لوگوں کا زیادہ افضل ہونا لازم آتا ہے کیونکہ رشک اسی کو ہوتا ہے جو مفضول ہو اور جس پر رشک کیا جاتا ہے وہ فاضل ہوتا ہے؟

پہلا جواب یہ ہے کہ انبیاء وشہداء مذکورہ بالا لوگوں کو ملنے والے اجر وانعام پر خوشی ومسرت کا اظہار کریں گے۔یہ رشک کا وہی مفہوم ہے جو صاحب قاموس نے ذکر کیا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث کا مذکورہ بالا جملہ دراصل فرض وتقدیر پر مبنی ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو رتبہ و مقام حاصل ہوگا اس کی اہمیت وفضیلت کو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر بفرض محال انبیاء وشہداء کو کسی رتبہ ومقام پر رشک ہوتا تو ان لوگوں کے رتبہ ومقام پر ہوتا۔

تیسرا جواب جو اس طرح کے مواقع پر عام طور پر دیا جاتا ہے یہ ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مفضول میں کوئی ایسی خاص صفت وفضیلت ہوتی ہے جو فاضل میں نہیں ہوتی اور باوجودیکہ فاضل اپنے اندر جو فضائل اور خوبیاں رکھتا ہے۔ان کے مقابلہ پر مفضول کی اس صفت وفضیلت کی اہمیت نہیں ہوتی لیکن فاضل کی تمنا وخواہش ہوتی ہے کہ اس کو وہ صفت وخوبی حاصل ہو جائے جو مفضول میں ہے۔(اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ زید کے پاس ایک ہزار بہت خوب صورت غلام ہوں اور ان میں خوبصورتی کے علاوہ دوسری اور خوبیاں بھی اور اس کے مقابلہ پر بکر کے پاس صرف ایک غلام بچہ ہو جو بہت نیک اور ہونہار ہو ظاہر ہے کہ زید اپنے غلاموں کی تعداد واہمیت کے اعتبار سے بکر کے مقابلہ پر کہیں زیادہ برتری وفضیلت رکھتا ہے اور اس کو اس بات کی بظاہر کوئی ضرورت ہی نہیں کہ وہ بکر کے غلام بچہ پر رشک کرے لیکن اس کے باوجود اس کی خواہش یہ ہو کہ بکر کے پاس جو

غلام بچہ ہے اسی طرح کا ایک غلام بچہ مجھے بھی حاصل ہو جائے۔) اسی طرح انبیاء و شہداء بھی مذکورہ لوگوں کی فضیلت دیکھ کر یہ آرزو کریں گے کہ کاش دوسری فضیلتوں کے ساتھ یہ فضیلت بھی ان کو حاصل ہو جاتی۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کی تائید مسلم کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے: **عن المغیرة بن شعبة انه غزامع رسول الله ﷺ بتبوك قال: فتبرز رسول الله ﷺ قبل صلاة الفجر للوضوء وحملت معه أداوة ثم أقبلنا حتى نجد الناس قدموا عبد الرحمن بن عوف فصلى بهم 'فادرك رسول الله ﷺ احدى الركعتين فصلى مع الناس الركعة الأخيرة' فلما سلم عبد الرحمن قام رسول الله ﷺ يتم صلاته فأفزع ذلك المسلمين فاكثروا لتسبيح' فلما قضى رسول الله ﷺ أقبل عليهم ثم قال أحسنتم أوقال :أ صبتم يغطهم أن صلوا الصلاة لوقتها۔الصلاة لوقتها**

تائید بایں طور ہوتی ہے کہ: **يغبطهم**..... یہ راوی کا کلام ہے جو آنحضرت ﷺ کے فرمان **أحسنتم او اصبتم** کے لئے بیان و تفسیر واقع ہوا ہے۔ فرمایا نیز کوئی بعید نہیں کہ محشر میں یہ حالت لوگوں کے جنت یا جہنم میں جانے سے پہلے پیش آئے۔ اس حالت سے مراد وہ ہے جو اگلی حدیث میں آ رہا ہے کہ" **لا يخافون اذ اخاف الناس** " اور الف لام استغراق کا ہو، چنانچہ ان لوگوں کو بعض ایسے اوقات میں امن و امان حاصل ہوگا جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہیں ہوگا' چونکہ ان کو اپنے حال میں اشتغال ہوگا۔ یا یہ کہ امت کے حال میں اشتغال ہوگا، چنانچہ وہ اس وجہ سے اس وقت غبطہ کریں گے اھ۔

ملا علی قاریؒ آخری بات کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یہ بات صحیح نہیں کہ 'ان کو وہ امن و امان حاصل ہوگا جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہیں ہوگا۔'' اور عدم صحت کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ [الانعام: ۸۲] نیز متحابین کے بارے میں امن کا تصور کرنا، اور انبیاء کرام کی بابت یہ کہنا کہ خود انہیں بعض احوال میں اپنا خوف ہوگا، یہ خطأ فاحش ہے۔ چونکہ اس سے اولیاء کی انبیاء پر تفضیل لازم آتی ہے۔ جیسا کہ حدیث کے ظاہر سے مستفاد ہوتا ہے۔ اور علماء نے اس حدیث میں ایسی تاویلات فرمائی ہیں، کہ جس سے یہ اشکال زائل ہو جائے۔ واللہ اعلم بالحال اسی طرح بعض دیگر شراح نے لکھا ہے: **يغبطهم وقت الحساب قبل دخولهم الجنة يعني هم على المنابر والخلق في الحساب** اھ۔ یہ بات بھی درست راہ سے ہٹی ہوئی ہے۔

مقربین بارگاہ الٰہی

۵۰۱۲: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ لَاُنَاسًا مَاهُمْ بِاَنْبِيَاءَ وَلَا شُهَدَاءَ يَغْبِطُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ وَالشُّهَدَاءُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِمَكَانِهِمْ مِنَ اللّٰهِ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُخْبِرُنَا مَنْ هُمْ قَالَ هُمْ قَوْمٌ تَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللّٰهِ عَلٰى غَيْرِ اَرْحَامٍ بَيْنَهُمْ وَلَا اَمْوَالٍ يَتَعَاطَفُوْنَهَا فَوَاللّٰهِ اِنَّ وُجُوْهَهُمْ لَنُوْرٌ وَّاِنَّهُمْ لَعَلٰى نُوْرٍ لَا يَخَافُوْنَ اِذَا خَافَ النَّاسُ وَلَا يَحْزَنُوْنَ اِذَا حَزِنَ النَّاسُ وَقَرَأَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابو داوٗد في السنن ۷۹۹/۳ الحديث رقم ۳۵۲۷، واحمد في المسند ۳۴۳/۵ ۔سورة يونس، الآية : ۶۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید مگر ان کے اللہ کے ہاں قرب کی وجہ سے ان پر انبیاء اور شہداء رشک کریں گے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمیں ان لوگوں کے بارے میں آگاہ فرمائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ ایسے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قرآن کی وجہ سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں حالانکہ ان میں باہمی نہ تو قرابت داری ہے اور نہ کوئی مالی لین دین اللہ کی قسم ان کے چہرے سراپا نور ہوں گے اور وہ نور پر ہوں گے جب لوگ ڈر رہے ہوں گے ان پر کوئی خوف نہ ہوگا جب لوگ غمگین ہوں گے ان پر کوئی غم نہ ہوگا اور پھر یہ آیت مبارکہ تلاوت کی: ﴿اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ یہ روایت ابوداؤد کی ہے۔

تشریح: ''انبیاء'' سے وہ نبی اور پیغمبر مراد ہیں جو اپنی زندگی میں کسی عذر یا کسی اور سبب سے باہمی ملاقات کا موقع نہ پا سکے ہوں گے' ورنہ تو جہاں تک نفس محبت و ہم نشینی کا تعلق ہے تو ہر نبی اور پیغمبر کو بلاشبہ اللہ کی خاطر اپنی اُمت کے لوگوں سے محبت ہوتی ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: ''رُوْح'' راء کے پیش کے ساتھ ہے (اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ جسم زندہ رہتا ہے یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس جوہر کو کہتے ہیں جس کے سبب زندگی کو بقا حاصل ہوتی ہے) کہا گیا ہے کہ۔ یہاں ''روح'' سے مراد ''قرآن'' ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ''رُوْح'' کے معنی ''قرآن'' کے بھی آئے ہیں جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: [وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا] [الشوری۔ ۵۲] اور اس اعتبار سے بھی ''قرآن'' کو ''روح'' کہنا نہایت موزوں ہے کہ جس طرح جسم و بدن کی زندگی کا مدار ''روح'' پر ہے اسی طرح قلب انسان کی حیات کا مدار ''قرآن'' پر ہے۔

قرآن کو باہمی میل و محبت کا سبب قرار دینا یا تو اس اعتبار سے ہے کہ قرآن یعنی دین اسلام انسانوں کو جوڑنے' ان میں اتحاد اور باہمی میل و محبت پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے یا اس اعتبار سے ہے کہ قرآن کو نظام زندگی کا اساس و قانون ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے باہمی محبت و موانست کی دولت حاصل ہوتی ہے کیونکہ قرآن کریم کی تعلیمات' محبت و موانست کا ذریعہ اور مؤمنین کو باہمی میل ملاپ اور اتحاد و یکجہتی اختیار کرنے کی ہدایت دینے والی ہیں۔

بعض حضرات نے ''روح اللہ'' کی مراد' محبت کو قرار دیا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے: **أنت روحي اى محبوبي كالروح**۔ (اسی طرح فارسی میں محبوب کو ''جان من'' کہا جاتا ہے۔) ان کے نزدیک ''محبت'' پر ''روح'' کا اطلاق اور وجہ مناسبت یہ ہوگی کہ محبت بھی قلب انسان کی حیات و نشاط اور تازگی کا سبب ہے۔ **اى تحابوا بما ألقى الله قلوبهم من المحبة الخالصة لله عزوجل**۔

مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں یہ لفظ راء کے زبر کے ساتھ یعنی ''رَوْحِ اللہ'' منقول ہے چنانچہ النہایہ میں ہے کہ ''روح'' راء کے فتحہ کے ساتھ ''بادِ نسیم'' کو کہتے ہیں۔ پس مطلب یہ ہوگا: **انه باذن الله او ينفح من نفحاته** ۔ اور اسی سے یہ حدیث ہے: **انى لأجد نفس الرحمن من قبل اليمين**۔ کے معنی رحمت اور رزق کے ہیں' بہر حال مآل و ماحصل کے اعتبار سے معنی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مطلب سب کا ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنا۔ اور امام

طیبیؒ کا یہ فرمانا: اسی سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [فأ رسلنا اليها روحنا] [مریم ۔۱۷] انتہائی بعید ہے چونکہ باتفاق مفسرین یہاں اس سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں اور ان کو ''روح'' اس لئے کہا گیا کہ دین ان کے اور ان کی وحی سے زندہ ہے۔
باالفاظ مصابیح یہ روایت یوں ہے:

عن ابی مالك الا شعری انه قال: كنت عند النبی صلى الله عليه وسلم اذ قال: ان لله عزوجل عبادا ليسوا بانبياء ولا شهداء يغبطهم النبيون والشهداء بقربهم ومقعدهم من الله يوم القيامة فقال أعرابی: حدلنا من هم؟ فقال: هم عباد من عباد الله من بلدان شتى وقبائل شتى، لم يكن بينهم ارحام يتواصلون ولا دنيار يتباذلون بها يتحابون بروح الله، يجعل الله وجوههم نورا ويجعل لهم منابر من نور قدام عرش الرحمٰن۔

''حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ عزوجل کے بعض بندے ایسے ہیں جو اگرچہ انبیاء اور شہداء تو نہیں ہیں لیکن قیامت کے دن خدا کے نزدیک ان کا مرتبہ ومقام اور ان کی رفعت شان دیکھ کر انبیاء اور شہداء بھی ان پر رشک کریں گے۔ (یہ سن کر) ایک اعرابی نے عرض کیا کہ آپ ہمیں بتائیں کہ وہ کون لوگ ہوں گے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: وہ اللہ کے بندے ہیں جن کا تعلق مختلف شہروں اور مختلف قبائل سے ہوتا ہے۔ ان کے درمیان کوئی رشتہ ناتا بھی نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے تعلق ومحبت قائم کرنے پر مجبور ہوں اور نہ وہ ایک دوسرے سے (دنیاوی) لین دین کے معاملات کرتے ہیں (جس سے ان کے درمیان تعلقات قائم ہوں) مگر وہ محض خدا کی روح یعنی قرآن کریم کے سبب آپس میں میل محبت رکھتے ہیں (قیامت کے دن) ان کے چہرے نور کے ہوں گے اور عرش الٰہی کے نیچے ان کے لئے نور کے منبر رکھے جائیں گے۔ (جن پر وہ متمکن ہوں گے)''۔

ابن ملکؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں: یہ اللہ عزوجل سے قرب منزلت سے عبارت ہے اور ایک دوسرے شارح ''قدام الرحمٰن'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یعنی رحمٰن کے عرش کے سامنے لوگ گھبرائے ہوئے ہوں گے، لیکن ان پر گھبراہٹ نہ ہوگی، دوسرے لوگ خوف میں مبتلا ہوں گے یہ لوگ بالکل بے خوف ہوں گے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: فزع اور خوف میں فرق ہے، وہ یہ کہ فزع، خوف کی نسبت سے شدید نوع ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ فزع اس خوف کو کہتے ہیں، جس کے ساتھ ''جبن'' بھی ہو، اور خوف اس غم کو کہتے ہیں، جو کسی انسان کو کسی آئندہ درپیش امر مکروہ کے حوالہ سے درپیش ہو۔ اھ۔

فزع اور خوف کے درمیان فرق (کے سلسلہ) میں زیادہ واضح بات یہ ہے کہ یہاں فزع سے مراد استغاثہ ہے، جیسا کہ قاموس میں لکھا ہے۔ یہ کیفیت عقوبت کے خوف سے پیدا ہوتا ہے۔ اور کبھی بلندئ درجات کی طمع سے پیدا ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

۵۰۱۳: **وَرَوَاهُ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ عَنِ اَبِيْ مَالِكٍ بِلَفْظِ لِمَصَابِيْحٌ مَعَ زَوَائِدِ وَكَذَا فِي شُعَبِ الْإِيْمَانِ۔**

اخرجه البغوی فی شرح السنة ۱۳/۵۳ الحديث رقم ۳٤٦۸، والبيهقی فی شعب الايمان ٦/٤٨٦ الحديث رقم

۸۹۹۸۔

ترجمہ: شرح السنۃ میں ابو مالک سے مزید الفاظ مذکور ہیں اور بیہقی نے بھی وہ اضافہ نقل کیا ہے۔

تشریح: مؤلف کو یہ چاہئے تھا کہ وہ آغاز حدیث میں "عن ابن مالك" فرماتے' اور حدیث کو مصابیح کے مطابق اصل کے مقتضی کے مطابق لاتے' اور پھر یہ فرماتے: رواه البيهقي في الشعب، وكذا رواه في شرح السنة، اور پھر فرماتے: ورواه ابو داود ونحوه مع تغيير يسير، لكن من رواية عمر۔

ایمان کی مضبوط گرہ

۵۰۱۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَبِيْ ذَرٍّ يَا اَبَا ذَرٍّ اَيُّ عُرَى الْاِيْمَانِ اَوْثَقُ قَالَ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ اَلْمُوَالَاةُ فِي اللّٰهِ وَالْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ۔

(رواه البيهقي في شعب الايمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ۷/ ۷۰ الحديث رقم ۹۵۱۴۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے ابوذر! ایمان کی کونسی گرہ زیادہ پختہ اور مضبوط ہوتی ہے۔ عرض کیا اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ ہی کے لئے دوستی کرنا اور اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرنا اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے بغض رکھنا۔ (بیہقی۔شعب الایمان)

تشریح: "عری": عین کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ "عروہ" کی جمع ہے۔ "عروہ" اصل میں "دلو" اور "کوز" اور ان جیسی چیزوں کی ڈنڈی کو کہتے ہیں، پھر یہ لفظ بطور استعارہ امور دین اور شعب ایمان میں ان چیزوں کے لئے استعمال ہونے لگا جن سے تمسک کیا جاتا ہے۔ أوثق بمعنی "احکم" ہے۔ الموالاة في الله: واضح رہے کہ معاونۃ اور محابۃ طرفین سے ہوتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس موقع پر یہ سوال کرنا بظاہر اس غرض سے تھا کہ وہ جواب سنتے وقت بھرپور متوجہ ہوں، غور وفکر کے ساتھ جواب کو سنیں۔ تو گویا کہ یہ سوال بمنزلہ تاکید کے تھا۔

في الله: میں "في" تعلیلیہ ہے۔ اى لأجله نیز اس محبت کا دوطرفہ ہونا بھی ضروری نہیں، جیسا کہ بہت سے اولیاء اللہ کہ نہ انہوں نے ہمیں دیکھا، اور نہ ہم نے ان کو دیکھا لیکن اس کے باوجود ہم ان سے محبت کرتے ہیں۔ اور "بغض في الله" کا مطلب ہے "بغض في سبيل الله" ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ط اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ط وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ط اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [المجادلة: ۲۲] "جو لوگ اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان ہی کے لوگ ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کر دیا ہے اور فیض غیبی سے ان کی مدد کی ہے۔ اور وہ ان کو بہشتوں میں جن کے تلے نہریں بہہ رہی ہیں جا داخل کرے گا ہمیشہ ان میں رہیں گے خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش۔ یہی گروہ خدا کا لشکر ہے (اور) سن رکھو کہ خدا ہی کا لشکر مراد حاصل کرنیوالا ہے۔"

تخریج: اس حدیث کو امام طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے:

أوثق عرى الايمان الموالاة في اللّٰه، والمعاداة في اللّٰه، والحب في الله، والبغض في اللّٰه عز وجل

اور ابوداؤد اور ضیاء نے ابوامامہ سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً نقل کیا ہے:

من أحب للّٰه وأبغض للّٰه واعطى للّٰه ومنع للّٰه فقد استكمل الايمان اور ایک روایت میں" **فقد استكمل ايمانه**" آیا ہے۔

عیادت وملاقات والا مسلمان

۵۰۱۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا عَادَ الْمُسْلِمُ اَخَاهُ اَوْزَارَهُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى طِبْتَ وَطَابَ مَمْشَاكَ وَتَبَوَّاْتَ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْزِلاً۔ (رواه الترمذي وقال هذا حديث غريب)

أخرجه الترمذي في السنن ٤/ ٣٢٠ الحديث رقم ٢٠٠٨ و ابن ماجه في ١/ ٤٦٤، واحمد في المسند ٢/ ٣٤٤۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی عیادت ملاقات کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تو اچھا ہے تیرا چلنا اچھا ہے اور تو نے جنت میں اپنا گھر بنالیا۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: عاد المسلم أو أخاه:

اس "او" میں دو احتمال ہیں: ① یہ "او" برائے تنویع ہے۔ ② یہ "او" بیان شک کیلئے ہے، کسی ایک کو غلبہ دینے کی بناء پر یا اصل معنی کی رعایت کرتے ہوئے فرمایا۔ لفظ عیادت اور زیادہ قریب المعنی ہیں، البتہ عیادت کا لفظ عام طور پر بیماری کے موقع پر استعمال کرتے ہیں اور زیارت کا لفظ عموماً حالت صحت کے موقع پر استعمال ہوتا ہے، اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ لفظ زیارت، لفظ عیادت کے مقابلہ میں "اعم" ہے، جیسا کہ یہ دونوں لفظ "عیادت" کے مقابلہ میں اخص ہیں۔

دنیا میں زندگی کو خوشی واطمینان ملنے کا تعلق جن چیزوں سے ہے وہ یہ ہیں کہ قناعت وتوکل کی دولت نصیب ہو جائے رضائے الٰہی کی سعادت ملے رزق میں برکت قلب میں وسعت وحوصلہ عادات واطوار میں تہذیب وشائستگی اور علم وعمل کی توفیق حاصل ہو۔

قوله: طبت وطاب عشاك وتبوءات من الجنة منزلا۔ طبت: طاء مہملہ کے کسرہ کے ساتھ۔ واضح رہے کہ یہ تینوں لفظ "طبت"، "طاب اور "تبوأت" بطور خبر نقل ہوئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو حق تعالیٰ کی طرف سے مذکورہ چیزوں کے حاصل ہو جانے کی خوشخبری دی جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ یہ تینوں لفظ دعائیہ جملہ کے طور پر منقول ہوں اس صورت میں ان الفاظ کے معنی یہ ہوں گے کہ تیری زندگی کو خوشی وراحت نصیب ہو تیرا راہ چلنا مبارک ثابت ہو اور تجھے جنت میں

اعلیٰ مقام حاصل ہو۔

اس عمل پر اس قدر اجر و ثواب کا سبب یہ ہے کہ کسی مؤمن کا جی خوش کرنا عبادت ثقلین سے افضل ہے۔ خصوصاً جب کہ عیادت فرض کفایہ بھی ہے۔ اس حدیث میں وعظ وعبرت بھی ہے۔ اور تذکیر و تنبیہ ہے کہ صحت و حیات اور فراغت و رفع ہموم کو غنیمت جانو۔ نسأل الله العفو و العافيه و حسن الخاتمة۔

محبت والے بھائی کو بتلا دے

۵۰۱۶: وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا اَحَبَّ الرَّجُلُ اَخَاهُ فَلْيُخْبِرْهُ اَنَّهُ يُحِبُّهُ۔ (رواه ابو داؤد الترمذی)

أخرجه ابو داؤد فی السنن ٥/٣٤٣ الحديث رقم ٥١٢٤، والترمذی فی ٤/٥١٧ الحديث رقم ٢٣٩٢، واحمد فی المسند ٤/١٣٠۔

ترجمہ: حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب کوئی شخص اپنے بھائی سے محبت کرے تو وہ اسے بتلا دے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ (ابوداؤد، ترمذی)

اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ نے فرمایا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: یہ حکم اس لئے دیا گیا کہ جب اس مسلمان کو یہ معلوم ہوگا کہ فلاں شخص مجھ سے دوستی اور محبت رکھتا ہے تو وہ بھی اس سے دوستی و محبت رکھے گا اور دوستی کے حقوق ادا کرے گا نیز اس کے حق میں دعا گو و خیر خواہ رہے گا۔

تخریج: امام میرکؒ نے رمایا: اس حدیث کو امام نسائیؒ نے "اليوم والليلة" میں ذکر فرمایا ہے۔ جامع صغیر میں لکھتے ہیں: اذا احب احدكم اخاه فليعلمه انه يحبه اس حدیث کو امام احمد نے، نیز امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے۔ ابوداؤد، ترمذی، حاکم اور ابن حبان نے حضرت مقدامؓ سے روایت کیا ہے۔ ابن حبان نے اس حدیث کو حضرت انسؓ سے بھی روایت کیا ہے۔

احمد اور ضیاء نے حضرت ابوذرؓ کی روایت میں یہ الفاظ ذکر کئے ہیں: اذا احب أحدكم صاحبه فليأته فی منزله فليخبره أنه يحبه لله امام بیہقی نے اور ابونعیم نے "الحليه" میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

اذا احببت رجلا فلا تماره ولا تشاره ولا تسأل عنه أحدا فعسى ان توافی له عدوا فيخبرك بما ليس فيه فيفرق ما بينك وبينه

تم سے وہ ذات محبت کرے جس کی خاطر تو مجھ سے محبت کرتا ہے

۵۰۱۷: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ مَرَّ رَجُلٌ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعِنْدَهُ نَاسٌ فَقَالَ رَجُلٌ مِمَّنْ عِنْدَهُ اِنِّيْ لَاُحِبُّ هٰذَا لِلّٰهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْلَمْتَهُ قَالَ لَا قَالَ قُمْ اِلَيْهِ فَاَعْلِمْهُ فَقَامَ اِلَيْهِ

فَاَعْلَمَهُ فَقَالَ اُحِبُّكَ الَّذِيْ اَحْبَبْتَنِيْ لَهٗ قَالَ ثُمَّ رَجَعَ فَسَاَلَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَهٗ بِمَا قَالَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلَكَ مَا احْتَسَبْتَ (رواه البيهقي في شعب الايمان وفي رواية الترمذي) اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ وَلَهٗ مَا اكْتَسَبَ۔

أخرجه ابو داوٗد في السنن ٥/٣٣٤ الحديث رقم ٥١٢٥، والترمذي في ٤/٥١٤ الحديث رقم ٢٣٨٦، واحمد في المسند ٣/١٥٠ واخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/٤٨٩ الحديث رقم ٩٠١١۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو لوگ کھڑے تھے ان میں سے ایک نے کہا کہ میں اس سے اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کرتا ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا تو نے اسے بتا دیا ہے اس نے عرض کیا نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اٹھ کے اس کے پاس جاؤ اور اس کو بتا دو تو وہ شخص اٹھ کے اس شخص کے پاس گیا اور اسے (اپنی محبت کے بارے میں) بتا دیا تو اس نے کہا کہ تجھ سے وہ ذات محبت کرے جس کی خاطر تو نے مجھ سے محبت کی راوی کہتے ہیں کہ وہ واپس لوٹا اور اس نے بتلایا جو اس نے کہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تجھے اس کا ساتھ نصیب ہوگا جس سے تجھے محبت ہے اور تیرے لئے وہ جو تم نے اجر طلب کیا۔ بیہقی، شعب الایمان، ترمذی میں اس طرح ہے آدمی اس کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے اور اس کے لیے وہی ہے جو اس نے کمایا۔

تشریح: وعنده ناس: جملہ حالیہ ہے۔

أعلمته: ہمزہ مقدر ہے محققہ و مسہلہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ ہمزہ کو مد کے ساتھ پڑھا جائے چونکہ دوسرا ہمزہ منقلبہ ہے۔

ولك ما احتسب: "احتساب" کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھنا اور حسبہ اس لفظ کا اسم ہے یہ لفظ شاید کہ "حساب" سے یا "حسب" سے نکلا ہے جس کے معنی گننے شمار کرنے کے ہیں اور "احتسب بالعمل" اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص اپنے کسی عمل کے ذریعہ اللہ کی رضا کا طالب ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی رضا و خوشنودی کی خاطر کسی سے محبت کرنا ایسا فعل ہے جو اگر ثواب کی نیت سے ہو تو وہ حساب میں آتا ہے یعنی اس پر اجر مرتب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ محبت کرنے والے کو اسکی نیت کے مطابق ثواب عطا کرتا ہے۔

تورپشتیؒ نے فرمایا: یہ دونوں لفظ معنی مرادی کے اعتبار سے قریب قریب ہیں۔

اور امام طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا: **وذلك لأن معنى ما اكتسب كسب كسبا يعتد به، ولا يرد عليه مسبب الرياء والسمعة وهذا هو معنى الاحتساب، لأن الافتعال للاعتمال**

صاحب النہایہ لکھتے ہیں: "احتساب" حسب سے ماخوذ ہے، جیسا کہ "اعتداد"، عدد سے ماخوذ ہے۔ جو شخص اپنے کسی عمل کے ذریعہ اللہ کی رضا کا ارادہ کرتا ہے، کہا جاتا ہے: احتسبه چونکہ اس وقت یہ حق ہے کہ اس کے عمل کو شمار کیا جا سکے، چنانچہ مباشرت فعل میں اس کو گویا کہ معتد بہ سمجھا گیا، اور "حسبۃ"، احتساب کا اسم ہے، جیسا کہ "عدۃ"، اعتداد کا اسم ہے۔

حصن الجزری میں ہے: اذا قال له: انى احبك وفي رواية: في الله؛ قال: احبك الذى احببتني له اس کو

نسائی، ابوداؤد و ابن ماجہ نے اور ابن سنی نے" عمل الیوم واللیلۃ "میں نقل کیا ہے۔

تیری دوستی مؤمن سے ہو

۵۰۱۸: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اَنَّهٗ سَمِعَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَاتُصَاحِبْ اِلَّا مُؤْمِنًا وَلَا یَاْکُلْ طَعَامَكَ اِلَّا تَقِیٌّ۔ (رواه الترمذی وابو داؤد والدارمی)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ۱۶۷/۵ الحدیث رقم ۴۸۳۲ والترمذی فی ۵۱۹/٤ الحدیث رقم ۲۳۹۵، والدارمی فی ۱٤۰/۲ الحدیث رقم ۲۰۵۷، واحمد فی المسند ۳۸/۳۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا کہ مؤمن کے سواء کسی سے دوستی نہ لگاؤ اور تیرے کھانا بس پرہیزگار ہی کھائے۔ (ترمذی، ابوداؤد، دارمی)

تشریح: ارشادِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری جملہ کا یہ مطلب بھی ہے کہ تمہیں چاہئے کہ تم اپنی روزی حلال و جائز وسائل و ذرائع سے حاصل کرو تاکہ وہ نیک و پرہیزگار مسلمانوں کے کھانے کے قابل ہو اور یہ مطلب بھی ہے کہ تمہیں چاہئے کہ تم اپنا کھانا (دعوت کی صورت میں) صرف متقی و پرہیزگار مسلمانوں کو کھلاؤ تاکہ اس کھانے کے ذریعہ انہیں عبادت خداوندی اور نیک کام کرنے کی طاقت حاصل ہو، غیر متقی اور بدکار لوگوں کو اپنا کھانا نہ کھلاؤ کہ جس سے ان کو گناہ کرنے کی طاقت حاصل ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر متقی کے ساتھ صحبت و ہم نشینی اور ہم پیالہ و ہم نوالہ ہونے سے اس لئے منع فرمایا چونکہ مطاعم دلی الفت و مودت پیدا کرتے ہیں۔

خطابی فرماتے ہیں صرف تقی کو کھانا کھلانے کے حکم کا تعلق دعوت طعام سے ہے۔ ضرورت مندی و احتیاج کی صورت اس سے مستثنیٰ ہے (کیونکہ کسی بھوکے اور محتاج کو کھانا کھلانے کیلئے کسی قسم کا امتیاز روا نہیں ہے!) یہ بات اس آیت کریمہ: ﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا﴾ [الانسان۔۸] سے بھی ثابت ہے کیونکہ یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ اس آیت میں دوسرے ضرورتمندوں کے ساتھ جن اسیروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ کافر تھے (لہٰذا معلوم ہوا کہ رفع حاجت یعنی بھوک سے بچانے کے لئے کافر کو کھلانا جائز ہے۔)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اگر یہ کہا جائے کہ مؤمن سے مراد عام لینا بھی درست ہے، اور مؤمن سے خاص یعنی جو فاسق کے مقابلہ میں آتا ہے، مراد لینا بھی درست ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں: ﴿اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُوْنَ﴾ [السجدہ۔۱۸] چنانچہ معنی یوں ہوں گے: **لا تصاحب الا صالحا**۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: مفسرین کا اتفاق ہے، کہ (یہاں) فاسق سے مراد کافر ہے، اور مابعد کلام بھی اس پر دال ہے: ﴿اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُوْنَ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰی نُزُلًا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰهُمُ النَّارُ كُلَّمَا اَرَادُوْا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ﴾ [السجدہ۔۱۸۔۲۰] "بھلا جو مؤمن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نافرمان ہو؟ دونوں

برابر نہیں ہو سکتے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے (رہنے کے) لئے باغ ہیں یہ مہمانی ان کاموں کی جزا ہے جو وہ کرتے تھے اور جنہوں نے نافرمانی کی ان کے رہنے کے لئے دوزخ ہے جب چاہیں گے کہ اس میں سے نکل جائیں تو اس میں لوٹا دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کے عذاب کو تم جھوٹ سمجھتے تھے اس کے مزے چکھو"۔

بیضاویؒ فرماتے ہیں: یہ ان کے خلود سے عبارت ہے۔

تفسیر سید معین الدین صفوی رحمہ اللہ میں لکھا ہے، کہ یہ آیت حضرت علیؓ اور عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی، ان دونوں کے درمیان کوئی تنازع تھا، اس نے حضرت علیؓ سے کہا: **انك صبي وانا والله ابسط لسانا وأحد سنانا، واشجع منك جنانا** حضرت علیؓ نے ان کے جواب میں فرمایا: **اسكت! فانك فاسق** عطاء بن یسار اور سدی وغیرہ نے بھی اسی طرح کی بات کہی ہے۔ یہاں فاسق سے مراد خارج از ایمان قائم علی الکفر ہے، چنانچہ یہ اشکال نہ کیا جائے کہ ولید نے آخری عمر میں اسلام قبول کر لیا تھا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ نہی (لا یاکل) غیر متقی کیلئے ہے، کہ وہ اس کا کھانا نہ کھائے، اور اس نہی سے مراد یہ ہے کہ وہ غیر متقی، متقی کو اپنے کسب حرام سے نہ کھلائے، اور نہ اس کو ایسی چیز عطاء کرے کہ جس سے متقی کو نفرت ہو۔ چنانچہ معنی یہ ہو گئے: **لا تصاحب الا مطيعا، ولا تخالل الا تقيا** اھ۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: امام طیبیؒ کی یہ بات ہے تو بہت پیاری ہے مگر اس سے وجہ حصر برقرار نہیں رکھتی، چنانچہ بات وہی درست ہے، جو ہم نے ماقبل میں کہی۔ واللہ اعلم

تخریج: اس حدیث کو امام احمد، ابن حبان اور حاکم نے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

انسان اپنے دوست کے دین وطریقہ پر ہوتا ہے

۵۰۱۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَرْءُ عَلٰى دِيْنِ خَلِيْلِهٖ فَلْيَنْظُرْ اَحَدُكُمْ مَنْ يُّخَالِلُ۔ (رواه احمد والترمذی وابوداؤد والبيهقی فی شعب الايمان وقال الترمذی هذا حديث حسن غريب وقال النووی اسناده صحيح)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ١٦٨/٥ الحديث رقم ٤٨٣٣، والترمذی فی السنن ٥٠٩/٤، واحمد فی المسند ٣٠٣/٢ والبيهقی فی شعب الايمان ٥٥/٧ الحديث رقم ٩٤٣٦۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان اپنے دوست کے دین وطریقہ پر ہوتا ہے پس غور کر لینا کہ وہ کس سے دوستی لگاتا ہے۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، بیہقی) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور نوویؒ نے کہا ہے اس روایت کی اسناد صحیح ہے۔

تشریح: خلیل: "النہایۃ" میں ہے کہ "خلیل" کا معنی ہے "صدیق" یہ "فعیل" بمعنی "فاعل" ہے۔ اور کبھی بمعنی "مفعول" ہوتا ہے۔

"خلة": خاء کے ضمہ کے ساتھ بمعنی **الصداقة والمحبة التي تخللت القلب فصارت خلاله اى فى باطنه،**

یعنی وہ محبت جو دل کی ہر ہر رگ اور ہر ہر ریشہ میں رچ بس گئی ہو۔اھ۔

محبت اولیٰ ہے، کہ خلّت؟ یہ مسئلہ اختلافی ہے، بظاہر محبت اولیٰ ہے۔ یہ موضوع کلام بسط کا مقتضی ہے، چنانچہ اس سے عدول کرنا مناسب ہے۔

قال النووی: بعض نسخوں میں الف کی زیادتی بھی ہے (یعنی نوی کے بجائے نواوی ہے)۔

حدیث میں جس دوستی کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد

ارشاد باری تعالیٰ ہے: [يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ] [التوبة۔۱۱۹]

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو!''۔

امام غزالیؒ نے فرمایا کہ حریص کے ساتھ ہم نشینی و مخالطت حرص کا محرک ہے اور زاہد کی ہم نشینی و مخالطت دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ صحبت و اختلاط کا اثر قبول کرنا اور اپنے ہم نشینی و مصاحب کی مشابہت و پیروی اختیار کرنا انسانی طبیعت و جبلت کا خاصہ ہے۔ بلکہ طبائع دوسری طبائع سے چوری کرتی ہیں کہ پتہ بھی نہیں چلتا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: امام نووی نے یہ حدیث ''ریاض الصالحین'' میں ذکر کی ہے۔ مؤلف کا اس حدیث کو ذکر کرنا اور پھر اطناب برتنا اس کا مقصد حدیث پر ہونے والے طعن کا دفعیہ ہے اور ان حضرات کے وہم کو دور کرنا ہے جن کو وہم ہوا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ امام سیوطیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث مصابیح کی ان احادیث میں سے ہے، جن کی بابت حافظ سراج الدین قزوینی نے نقد کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ موضوع کہا ہے۔ حافظ ابن حجر یعنی عسقلانی اس کی تردید میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام ترمذی نے حسن اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔

دوستی کو مضبوط کرنے والی باتیں

۵۰۲۰: وَعَنْ يَزِيْدِ بْنِ نَعَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا آخَى الرَّجُلُ الرَّجُلَ فَلْيَسْئَلْهُ عَنِ اسْمِهِ وَاسْمِ اَبِيْهِ وَمِمَّنْ هُوَ فَاِنَّهُ اَوْصَلُ لِلْمَوَدَّةِ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥١٧ الحديث رقم ٢٣٩٢۔

ترجمہ: حضرت یزید بن نعامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:...... جب کوئی شخص دوسرے سے بھائی چارہ کرے تو اس سے اس کا نام، قبیلے کا نام اور والد کا نام دریافت کرلے کیونکہ یہ دوستی کو مضبوط کرنے والی چیزیں ہیں۔ (ترمذی)

راویٔ حدیث:

یزید بن نعامۃ ۔ یہ یزید ''نعامہ'' کے بیٹے اور ''ضبی'' ہیں۔ ان سے ''سعید بن سلیمان'' نے روایت کی ہے۔ بحالت شرک حنین میں شریک ہوئے اور اس کے بعد مسلمان ہوئے ترمذی رحمہ اللہ کا ارشاد ہے کہ ان کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث کی

تشریح: آخی: ہمزہ ممدودہ کے ساتھ، مؤاخاۃ سے ماضی کا صیغہ ہے۔

فلیسائلہ: باب مفاعلہ سے ہے۔ اور ایک نسخہ فصیحۃ میں **فلیسال** ہے۔

فانہ: ضمیر کا مرجع "السؤال عما ذکر" ہے۔ شرح المصابیح میں صرف" **او صل** " ہے (یعنی" **للمودۃ** " کا اضافہ نہیں ہے)۔

تخریج: اس حدیث کو ابن سعد نے، اور امام بخاری نے اپنی تاریخ میں یزید بن نعامہ سے نقل کیا ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث غریب ہے۔ اس حدیث کے راوی یزید بن نعامہ کا سماع آنحضرت ﷺ سے ہم نہیں جانتے۔ اھ۔ اس حدیث کے رجال موثق ہیں۔ اس حدیث کو ابن عمرؓ کی حدیث سے بھی تقویت ملتی ہے، جس کو امام بیہقی نے شعب الایمان میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے: **اذا احببت رجلا فاسالہ عن اسمہ وسم أبیہ، فان کان غائبا حفظتہ، وان کان مریضا عدتہ، وان مات شھدتہ** یہ حدیث پچھلی حدیث کیلئے بمنزلہ تفسیر کے ہے۔ واللہ اعلم بالحقائق۔

الفصل الثالث:

اللہ تعالیٰ کے لئے محبت و بغض سب سے زیادہ محبوب عمل ہے

۵۰۱۱: عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَدْرُوْنَ اَیُّ الْاَعْمَالِ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی قَالَ قَائِلٌ الصَّلٰوۃُ وَالزَّکٰوۃُ وقَالَ قَائِلٌ الْجِھَادُ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَبَّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ۔

(رواہ احمد وروی ابوداؤد والفصل الاخیر)

أخرجہ احمد فی المسند ۵/ ۱۴۶ واخرج ابوداؤد الفصل الاخیر فی السنن ۵/ ۶ الحدیث رقم ۴۵۹۹۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے ہاں تشریف لائے اور فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کو کونسا عمل زیادہ پسند ہے کسی نے نماز تو دوسرے نے زکوۃ کا ذکر کیا اور کسی نے جہاد کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب عمل اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت و بغض رکھنا ہے۔ (احمد و اور ابوداؤد نے اپنی روایت میں حدیث کا صرف آخری جزو یعنی اِنَّ اَحَبَّ الْاَعْمَالِ...... نقل کیا ہے۔

تشریح: **قال أتدرون أی الاعمال احب الی اللّٰہ:** جملہ مستانفہ بیانیہ ہے۔ سوال مقدر کا جواب ہے۔

قولہ: قال قائل الصلوۃ والزکوۃ:

لفظ والزکوۃ میں حرف واؤ معنی کے اعتبار سے "او" کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ گویا مفہوم کے اعتبار سے" **الصلوۃ** " کے بعد کی عبارت گویا یوں ہے وَقَالَ: قَائِلٌ الزَّکٰوۃُ (اور کسی کہنے والے نے کہا کہ زکوۃ) **قال قائل: الجھاد** : ایک نسخہ میں (واؤ کے ساتھ) "وقال قائل :الجھاد" ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں حدیث میں آنحضرت ﷺ کے سوال' صحابہؓ کے جواب اور پھر آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا جواب اور پھر آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا جو اسلوب نقل کیا گیا ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کا درجہ نماز' زکوٰۃ اور جہاد سے بھی بڑا ہے جبکہ حقیقت یہ نہیں ہے کیونکہ نماز و زکوٰۃ اور جہاد وہ اعمال ہیں جو بلاشک وشبہ تمام اعمال سے افضل واعلیٰ ہیں'

اشکال کا جواب یہ ہے کہ جو شخص حقیقی معنی میں کسی سے اللہ کی رضا وخوشنودی کی خاطر محبت وتعلق رکھے گا وہ یقیناً انبیاء وعلماء اور اولیاء اللہ سے سچی محبت وعقیدت رکھے گا۔ تو ظاہر ہے کہ وہ یقیناً ان کی اتباع و پیروی بھی کرے گا۔ (بایں طور کہ نماز بھی پڑھے گا)۔ اور زکوٰۃ دے گا۔ اسی طرح جو شخص کسی سے اللہ کی رضا وخوشنودی کی خاطر بغض ونفرت رکھے گا تو وہ یقیناً دشمنانِ دین سے دشمنی اور عداوت رکھے گا اور جب وہ ان سے دشمنی وعداوت رکھے گا تو ظاہر ہے کہ وہ ان کی بیخ کنی' جہاد فی سبیل اللہ اور دین کی سربلندی کی سعی وکوشش کرے گا۔ (لہٰذا حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کے ضمن میں ساری طاعتیں آ جائیں گی خواہ وہ نماز وزکوٰۃ ہو یا جہاد وغیرہ ان میں سے کوئی بھی چیز اس عمل سے باہر نہیں رہے گی اس اعتبار سے حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ دین کی اصلی بنیاد اور اعمال وطاعات کا مدار حب فی اللہ اور بغض فی اللہ پر ہے جس شخص نے اس درجہ کو حاصل کر لیا اس کے لئے تمام عبادات وطاعات کو اختیار کرنا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔) اھ۔ یہ جواب غیر شافی ہے' جیسا کہ مخفی نہیں' اور ان دونوں کے درمیان معنی ومبنی میں کوئی مناسبت نہیں ہے'

اس ارشاد گرامی ﷺ سے مراد یہ ہے کہ قلبی اعمال میں سب سے افضل اعمال حب فی اللہ اور بغض فی اللہ ہے اور بدنی اعمال میں سب سے افضل عمل نماز' روزہ' زکوٰۃ اور جہاد ہیں' اس صورت میں کوئی اشکال پیدا نہیں ہوگا

حاصل یہ ہے کہ شریعت نے جن امور کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے ان پر عمل کرنے کے بعد اور شریعت نے جن امور سے باز رکھا ہے ان سے اجتناب کرنے کے بعد (یعنی فرائض وواجبات کی تکمیل کے بعد) حب فی اللہ اور بغض فی اللہ سب سے افضل عبادت ہے اور سب سے کامل طاعت ہے لہٰذا تم ان دونوں کو لازم پکڑو۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے:

أحب الاعمال الی اللّٰہ بعد الفرائض ادخال السرور فی قلب المؤمن۔

''فرائض کے بعد خدا کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل کسی مؤمن کے دل کو خوشی ومسرت سے بھرنا ہے''۔

یہ حدیث حکیم بن عمیر سے مروی ہے' البتہ الفاظ یوں ہیں:

أحب الأعمال الی اللّٰہ من اطعم مسکینا من جوع' او دفع عنہ مغرما أو کشف عنہ کربا۔ اھ۔

تخریج: الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: امام احمد نے اس حدیث کو بحوالہ ابوذر کے ان الفاظ ساتھ ذکر کیا ہے:

أحب الأعمال الحب فی اللّٰہ و البغض فی اللّٰہ۔

ربّ کریم کا اکرام کرنے والا

۵۰۲۲: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا اَحَبَّ عَبْدٌ عَبْدًا لِلّٰهِ اِلَّا اَکْرَمَ رَبَّهٗ عَزَّوَجَلَّ۔ (رواه احمد)

أحمد في المسند ۵/ ۲۵۹۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی بندے سے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کرتا ہے وہ اپنے رب کریم کا احترام واکرام کرتا ہے۔ (احمد)

بہترین مسلمان کون؟

۵۰۲۳: وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ یَزِیْدَ اَنَّهَا سَمِعَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِخِیَارِکُمْ قَالُوْا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ خِیَارُکُمُ الَّذِیْنَ اِذَا رُؤُوْا ذُکِرَ اللّٰهُ۔ (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجه في السنن ۲/ ۱۳۷۹ الحديث رقم ۴۱۱۹۔

ترجمہ: حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ کیا میں تمہیں بہترین مسلمان کے متعلق نہ بتلاؤں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور بتائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہتر وہ شخص ہے جس کو دیکھتے ہی خدا یاد آئے۔ (ابن ماجہ)

تشریح: بخیاکم: "خیر" بمعنی "ا خیر" کی جمع ہے اي أفا ضلکم۔

رؤا بصیغہ مفعول ہے۔ اور اسی طرح "ذکر" بھی بصیغہ مجہول ہے۔

عرضِ مرتب:

اس حدیث سے متعلقہ تمام تر تشریحات کے لئے ملاحظہ فرمائیے "باب حفظ اللسان" کی فصل ثالث کے آخر میں حدیث ۴۸۷۲، واضح رہے کہ "باب حفظ اللسان" کی روایت میں اتنا اضافہ بھی ہے:

وشرار عباد الله المشاؤون بالنمية، والمفرقون بين الأحبة، الباغون البراء العنت

تخریج: الجامع الصغیر میں ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے: الا انبئكم بخيلوكم؟ خياركم الذين اذارؤوا ذكر الله۔

اس حدیث کو امام احمد اور ابن ماجہ نے بھی اسی راویہ سے نقل کیا ہے۔

بھلائی کی اصل تین چیزیں

۵۰۲۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّ عَبْدَیْنِ تَحَابَّا فِی اللّٰهِ

عَزَّوَجَلَّ وَاحِدٌفِی الْمَشْرِقِ وَاٰخَرُ فِی الْمَغْرِبِ لَجَمَعَ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَقُوْلُ ھٰذَا الَّذِیْ کُنْتَ تُحِبُّہٗ فِیَّ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/٤٩٢ الحديث رقم ٩٠٢٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر دو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے آپس میں محبت کرتے تھے۔ ان میں سے ایک مشرق اور دوسرا مغرب میں رہتا تھا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو جمع فرمائے گا اور فرمائے گا یہ وہ شخص ہے جس کے ساتھ تو میری وجہ سے محبت کرتا تھا۔

تشریح: تحابا: اصل میں "تحاببا" تھا۔

واحد: حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور فتحہ بھی درست ہے۔ اور ایک نسخہ میں "واحدھما" ہے۔

یقول: ای سیقول اویقال 'اللہ کے ہاں صبح وشام نہیں ہے۔ اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ یہ فاعل سے خالی ہے۔

فی: تعلیلیہ ہے ای لأجلی

تنہائی میں ذکرِ خدا

۵۰۲۵: وَعَنْ اَبِیْ رَزِیْنٍ قَالَ قَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَاَ اَدُلُّکَ عَلٰی مِلَاکِ ھٰذَا الْاَمْرِ الَّذِیْ تُصِیْبُ بِہٖ خَیْرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ عَلَیْکَ بِمَجَالِسِ اَھْلِ الذِّکْرِ وَاِذَا خَلَوْتَ فَحَرِّکْ لِسَانَکَ مَا اسْتَطَعْتَ بِذِکْرِ اللّٰہِ وَاَحِبَّ فِی اللّٰہِ وَاَبْغِضْ فِی اللّٰہِ یَا اَبَارَزِیْنَ ھَلْ شَعَرْتَ اَنَّ الرَّجُلَ اِذَا خَرَجَ مِنْ بَیْتِہٖ زَائِرًا اَخَاہُ شَیَّعَہٗ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَکٍ کُلُّھُمْ یُصَلُّوْنَ عَلَیْہِ وَیَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اِنَّہٗ وَصَلَ فِیْکَ فَصِلْہُ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تُعْمِلَ جَسَدَکَ فِیْ ذَالِکَ فَافْعَلْ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/٤٩٢ الحديث رقم ٩٠٢٤۔

ترجمہ: حضرت ابو رزین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمہیں اس چیز کی اصل نہ بتاؤں جس سے تمہیں دنیا وآخرت کی بھلائی مل جائے تم اہل ذکر کی مجلس کو لازم پکڑو اور جب تم تنہائی میں ہو تو جہاں تک ہو سے اپنی زبان کو ذکر الٰہی سے تر رکھو اور اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت وعداوت کرو۔

تشریح: "ألا": برائے تنبیہ ہے۔ یا ہمزہ برائے استفہام انکاری اور "لا" برائے نفی ہے۔ اور نفی، نفی اثبات ہوتا ہے، لیکن اس کے جواب میں بلی ذکر نہیں فرمایا، لیکن وہ لانا ضروری بھی نہیں ہے۔ بہر حال اس کلام میں تنبیہ بر تنبیہ ہے۔ چنانچہ یہاں "ألا" کا معنی یہ ہوجائے گا: تنبه بقولی: ألا الخ

ملاك: کے کسرہ کے ساتھ، وہ چیز کہ جس سے کسی شیء کی بقاء وقوام ہو۔ اور مشار الیہ ذہنی ہے، لیکن چونکہ مبہم تھا، چنانچہ اگلے جملہ میں اس کی وضاحت فرمادی۔

" علیك بمجالس الذکر": مجالس ذکر کو لازم پکڑو۔ چونکہ یہ مجالس درحقیقت "ریاض الجنه" ہیں۔ جیسا کہ امام

ترمذی حضرت انسؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں: اذا مررتم بریاض الجنة فارتعوا قال: یا رسول اللّٰہ! وما ریاض الجنة؟ قال: الذکر

اور مطلب یہ ہے کہ جب تم کسی ایسی جماعت کے پاس ہو، جو ذکر اللہ میں مشغول ہو، تو تم بھی ان کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے ذکر اللہ کرلو، چونکہ وہ جنت کے باغات میں ہیں۔

ترمذی میں مروی حضرت ابو ہریرہ سے مروی ایک مرفوع حدیث میں یوں آتا ہے: اذا مررتم برباض الجنة فارتعوا قلت: وما ریاض الجنة؟ قال: المساجد قلت: وما الرتع؟ یا رسول اللّٰہ! قال: سبحان اللہ والحمد للّٰہ ولا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر بعض شراح حدیث فرماتے ہیں: یہ حدیث مکان اور ذکر کے بارے میں مطلق ہے۔ چنانچہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ (ذکرہ میرک)

صحیح بات یہ ہے کہ مساجد و اذکار کا ذکر بطور مثال کے ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ مساجد "خیر المجالس" ہیں، لہٰذا یہ کہا جائے گا، کہ ان کا ذکر افضل ہونے کی وجہ سے فرمایا اور جہاں تک تعلق ہے اذکار کا سو وہ باقیات صالحات ہیں، نیز قرآن میں سے ہیں۔ اس وجہ سے ان پر نص فرمائی، وگرنہ تو مجالس ذکر، علماء واعظین اور اولیاء اللہ کی محافل کو بھی شامل ہیں، بایں طور کہ ان کی مجالس بھی ذکر اللہ سے پُر ہوتی ہے، ان کی مجالس معرفت عقائد، شرائع دینیہ، عبادات مالیہ و بدنیہ، حلال حرام سے متعلقہ مسائل، ترغیب وترہیب اور ان جیسے امور پر مشتمل ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

واذا خلوت الخ: حاصل یہ ہے کہ کسی بھی گھڑی اللہ کے ذکر سے غافل مت ہو، نہ "جلوت" میں نہ "خلوت" میں۔ امام بزار اسناد صحیح کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:

قال: قال اللّٰہ تبارك وتعالٰی: یا ابن آدم اذ اذکرتنی خالیا ذکرتك خالیا، واذا ذکرتنی فی ملأ ذکرتك فی ملأ خیر من الذی ذکرتنی فیهم

ایک اور حدیث میں کہ جس کو امام ابوداؤد کے علاوہ محدثین کی جماعت نے نقل کی ہے یوں آتا ہے:

یقول اللّٰہ: انا عند ظنی عبدی بی، وانا معه اذا ذکرنی، فان ذکرنی فی نفسه ذکرته فی نفسی، وان ذکرنی فی ملأ ذکرته فی ملأ خیر منهم

فی نفسه سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ذکر قلبی ہے، چونکہ اس کے مقابلہ میں ذکر نفسی ہے، اور وہ فی الجملہ کلام نفسی ہے۔ پس اس میں ذکر کی دو انواع میں سے اعلیٰ قسم ذکر خفی کی طرف اشارہ ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی "فحرك لسانك" مبتدی پر محمول ہے، کہ وہ اپنے اعضاء و جوارح کے ذریعہ ذکر اللہ کا محتاج ہوتا ہے، جس کی تحقیق نیت کی بحث میں گزر چکی ہے۔ یا اس میں اشارہ ہے، کہ ان دونوں قسموں کو جمع کرنا اکمل ہے، اگرچہ ان میں سے ایک افضل ہے۔ اس کی دلیل ابو یعلیٰ کی وہ روایت ہے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے:

قالت: قال رسول اللّٰہ ﷺ لفضل الذکر الخفی الذی لا یسمعه الحفظة سبعون ضعفا، اذا کان

يوم القيامة وجمع الله الخلائق لحسابهم وجاء ت الحفظة بما حفظوا وكتبوا قال لهم: انظروا هل بقي له من شيء؟ فيقولون: ما تركنا شيئا مما علمناه وحفظناه الا وقد أحصيناه وكتبناه، فيقول الله: ان لك عندي حسنا لا تعلمه، وأنا أجزيك به وهو الذكر الخفي اھ۔

اس حدیث کے جملہ" لا تعلمه "میں صوفیا کی بات:"فناء الذاكر بالذكر وبقائه بالمذكور" کی طرف خفیہ اشارہ ہے۔جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے:﴿واذكر ربك اذا نسيت﴾ ای: نسيت نفسك او ذكرها ايضا۔

زبرجد کے بالاخانوں کے مکین

۵۰۲۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كُنْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَعُمُدًا مِنْ يَاقُوْتٍ عَلَيْهَا غُرَفٌ مِنْ زَبَرْجَدٍ لَهَا اَبْوَابٌ مُفَتَّحَةٌ يُضِيْئُ كَمَا يُضِيْئُ الْكَوْكَبُ الدُّرِّيُّ فَقَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ يَسْكُنُهَا قَالَ الْمُتَحَابُّوْنَ فِي اللّٰهِ وَالْمُتَجَالِسُوْنَ فِي اللّٰهِ وَالْمُتَلَاقُوْنَ فِي اللّٰهِ ۔ (روى البيهقي الاحاديث الثلاثة في شعب الايمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٤٨٧/٦ الحديث رقم ٩٠٠٢۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں یاقوت کے کچھ ستون ہیں جن پر زبرجد کے بالاخانے ہیں ان کے دروازے کھلے ہیں اور روشن ستارے کی طرح چمکتے ہیں۔صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ان میں کون رہے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی خاطر آپس میں محبت کرنے والے اور اللہ ہی کی خاطر آپس میں مل بیٹھنے والے اور اللہ ہی کی خاطر آپس میں ملاقات کرنے والے۔یہ تینوں روایات بیہقی نے شعب الایمان سے ذکر کی ہیں۔

تشریح: قوله: ان في الجنة لعمدًا من ياقوت عليها غرف من زبرجد:

"لعمدا": عین اور میم ہر دو کے ضمہ کے ساتھ، عمود بمعنی اسطوانة کی جمع ہے۔ایک نسخہ میں یہ دونوں حرف مفتوح ہیں۔اس آیت کریمہ:﴿في عمد ممددة﴾ میں یہ لفظ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔قاموس میں لکھتے ہیں: العمود معروف، والجمع اعمدةٌ و عمدٌ وعمَدٌ

"غرف": غین کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔" غرفه" کی جمع ہے۔

"زبرجد": زاء اور باء کے فتحہ، راء کے سکون اور جیم کے فتحہ کے ساتھ۔

ابواب مفتحة: اس قید میں اشارہ ہے کمال امن کی طرف یا اس طرف کہ یہ صاحب خانہ کے انتظار میں ہیں۔

تضیئ: یہ لازم ومتعدی دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

" الدری": دال کے ضمہ اور کسرہ کیساتھ، راء کی تشدید اور یائے تحتانیہ کے ساتھ۔صاحب قاموس کا کہنا ہے کہ یہ مثلث ہے۔امام بیضاویؒ اس آیت کریمہ:﴿كانها كوكب دری﴾ ... لکھتے ہیں

ای مضئ متلألئ كالزهرة فی صفائه و زهرته، منسوب الی الدر او فعیل كمریق أی العصفر من الدرء 'فانه یدفع الظلام لضوئه او بعض ضوئه بعضا من لمعانه الأ نه قلب همزته یاء، وبدل علیه قراء ة حمزة وابی بكر علی الاصل، وقراء ة بی عمرو الكسائی دری كشریب ای كثیر الشرب، وقد قری به مقلوبا ای بكسر الدال، وقلب همزته یاء لكنه شاذ قرابه الزهری

"المتلاقون": سے مراد باہم ایک دوسرے کی زیارت کرنے یا باہم مصافحہ کرنے والے۔
تخریج: آخری حدیث کو ابن ابی الدنیا نے "کتاب الاخوان" میں ذکر کیا ہے۔

بَابُ مَا يُنْهٰى عَنْهُ مِنَ التَّهَاجُرِ وَالتَّقَاطُعِ وَاتِّبَاعِ الْعَوْرَاتِ

ممنوع چیزوں یعنی ترک ملاقات' انقطاع تعلق اور عیب جوئی کا بیان

الفصل الاول:

تین دن سے زائد قطع تعلقی جائز نہیں

۵۰۲۷: وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا یَحِلُّ لِلرَّجُلِ اَنْ یَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلٰثِ لَیَالٍ یَلْتَقِیَانِ فَیُعْرِضُ هٰذَا وَیُعْرِضُ هٰذَا وَخَیْرُهُمَا الَّذِیْ یَبْدَأُ بِالسَّلَامِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۴۹۲/۱۰ الحدیث رقم ۶۰۷۷ و مسلم فی ۱۹۸۴/۴ الحدیث رقم (۲۵-۲۵۶۰) و ابوداؤد فی السنن ۲۱۴/۵ الحدیث رقم ۴۹۱۱، والترمذی فی ۲۸۸/۴ الحدیث رقم ۱۹۳۲ و مالك فی الموطأ ۹۰۶/۲ الحدیث رقم ۱۳ من کتاب حسن الخلق، واحمد فی المسند ۱۷۶/۱۔

ترجمہ: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ آدمی کو مناسب نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زائد قطع تعلقی کرے اور ملاقات کے وقت دونوں ایک دوسرے سے منہ پھیر لیں اور دونوں میں بہتر سلام میں پہل کرنے والا ہے۔ (بخاری و مسلم)

''ہجر'' ضد ہے، ''وصل'' کی۔ اور ''تہاجر'' اخص ہے ''تقاطع'' سے۔ اور اتباع معنی میں ہے تتبع اور تجسس کے۔ اور ''عورۃ'' انسان کے عیب وخلل کو کہتے ہیں۔

عرضِ مرتب:

''تہاجر'' کے معنی ہیں ترک کرنا' کاٹنا اور ''تقاطع'' کے معنی بھی یہی ہیں' اس اعتبار سے لفظ ''تقاطع'' معنوی طور پر لفظ ''تہاجر'' کی وضاحت اور اس کے بیان کے لئے ہے

ان دونوں لفظوں سے مراد ہے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ سلام وکلام اور ملنا جلنا چھوڑے رکھنا' صحبت وہم نشینی کے تعلق کو منقطع رکھنا اور اسلامی بھائی چارہ کو نظر انداز کرنا چونکہ ان امور کی ممانعت علی اطلاق نہیں ہے بلکہ بعض حالت میں اور بعض قیود کے ساتھ ان کو اختیار کرنا کوئی گناہ نہیں رکھتا اس لئے مذکورہ بالا عنوان میں یوں کہا گیا ہے ''ما ینھی

عنه من التهاجر والتقاطع۔"

''عورات'' عورت کی جمع ہے۔لغت میں عورت اس چیز کو کہتے ہیں جو شرم کی متقاضی ہو' جس کے ظاہر ہونے کو کوئی شخص پسند نہ کرتا ہو بلکہ یہ چاہتا ہو کہ وہ چیز پوشیدہ رہے' جیسا کہ کسی شخص میں کسی عیب اور نقصان کا ہونا۔ اس اعتبار سے'' اتباع عورت'' کا مطلب ہے کسی کی عیب جوئی کرنا''

اگر کسی وجہ سے اظہار خفگی کی خاطر تین دن تک ملنا جلنا چھوڑے رکھا جائے تو یہ جائز ہے کیونکہ انسان کی طبیعت میں غیظ و غضب' کا مادہ ہے وہ بہر حال اپنا اثر ضرور ظاہر کرتا ہے اس لئے اس قدر مدت معاف کر دی گئی ہے تا کہ انسان کے ان جذبات کی بھی کچھ تسکین ہو جایا کرے اور اس تین دن کے عرصہ میں خفگی و ناراضگی اور بغض و نفرت کے جذبات بھی ختم ہو جائیں یا کم سے کم ہلکے پڑ جائیں اور صلح و صفائی ہو جائے۔(ذکرہ السیوطی)

سیوطیؒ نے موطا کے حاشیہ میں ابن عبد البرؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ اس حدیث میں' کعب بن مالکؓ اور ان کے رفقاء والی حدیث کے ذریعہ تخصیص کی گئی ہے' بایں طور کہ نبی کریمؐ نے اپنے صحابہ کو حکم دیا تھا ان تین حضرات سے قطع تعلق کا یعنی تین سے زائد کا' یہاں تک کہ یہ سلسلہ پچاس دنوں تک پہنچ گیا۔ فرمایا علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس شخص کو یہ خوف ہو کہ اگر میں فلاں آدمی سے سلام کروں گا اور اس سے ملنا جلنا رکھوں گا تو اس کی وجہ سے مجھے دینی یا دنیاوی نقصان برداشت کرنا پڑے گا اس شخص سے کنارہ کشی اختیار کرنا اور اس سے دور رہنا جائز ہے۔ داناؤں نے کہا ہے'' رب صرم جمیل خیر من مخالطة موذیة''

صاحب النہایہ فرماتے ہیں کہ یہاں ''ھجر'' سے مراد ''وصل'' کی ضد ہے' اجتماعی طور پر ایک جگہ رہنے سہنے اور روزمرہ کے باہمی معاملات کی وجہ سے آپس میں نزاع ہو جایا کرتا ہے اور ایک دوسرے سے کوئی شکایت پیدا ہو جانے کی وجہ سے خفگی کی صورت پیش آجاتی ہے ہاں اگر ترک موالات کسی دینی معاملہ کی وجہ سے ہو جیسے کوئی شخص خواہشات نفسانی کا غلام بن گیا ہو یا کوئی شخص بدعتی ہو تو اس سے ترک ملاقات اس وقت تک واجب ہے۔ جب تک وہ توبہ کر کے راہ راست اختیار نہ کرے اور حق کی طرف رجوع نہ کرے۔

(آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ کے زمانہ کے ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن میں مسلمانوں کا دینی مصالح کے پیش نظر ایک دوسرے سے تین دن سے زیادہ بھی ترک ملاقات کئے رہنا ثابت ہے)

ان تین صحابہؓ کا واقعہ تو بہت مشہور ہے جو غزوہ تبوک میں نہیں گئے اور آنحضرت ﷺ نے ان میں نفاق کی راہ پا جانے کے خدشہ سے ان کو تمام مسلمانوں سے الگ تھلگ کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہاں تک کہ ان تینوں کی ازواج اور ان کے عزیز و اقارب کو ان سے ترک ملاقات اور ترک سلام و کلام کا حکم دیا تھا' یہ حکم اور اس پر عمل پچاس دنوں تک جاری رہا' خود آنحضرت ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مہینہ تک اپنی ازواج مطہراتؓ سے ملنا جلنا چھوڑے رکھا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک مدت تک حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے ترک ملاقات اختیار کئے رکھی اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنے بیٹے حضرت بلالؓ سے ایک دینی معاملہ [illegible] درجہ ناراض ہوئے کہ ان سے بات چیت کرنا چھوڑ دی تھی۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت مرتے دم تک قطع تعلق پر

قائم رہی حتی کہ وفات بھی قطع تعلقی کی حالت میں پائی تو ممکن ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک منسوخ اور دوسرا ناسخ ہو۔ غرضیکہ ایسے بہت سے واقعات منقول ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دینی معاملات میں خفگی وناراضگی تین دن سے زیادہ بھی جاری رکھی جاسکتی ہے۔لیکن شرط یہ ہے کہ نیت صادق رکھی جائے اوراس میں کسی نفسانی خواہش اوردنیاوی غرض کادخل نہ ہو۔

قوله: وخير هما الذي يبدأ بالسلام ''جوسلام کے ذریعہ ابتداء کرے'' کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں میں سے جو شخص خفگی وناراضگی کوختم کرنے کے لئے پہلے سلام کرے گا'اس کا درجہ دوسرے کے مقابلہ پر بڑا ہوگا۔نیز اس میں اسی طرف بھی اشارہ ہے کہ سلام میں پہل کرنا ترک ملاقات کے گناہ کوزائل کردیتا ہےاور یہ کم سے کم ترک سلام کوتو ختم کرہی دینا چاہئے تاکہ اخوۃ اسلامی کا یہ بنیادی حق ضائع نہ ہونے پائے۔

ہمارے حدیث کے ائمہ میں سے اکمل الدین فرماتے ہیں: یہ حدیث اس بات پردلالت کررہی ہے، کہ اپنے مسلمان بھائی سے، تین دن سے زائد قطع متعلق کرنا حرام ہے۔البتہ یہ کہنا کہ تین دن تک یہ قطع تعلقی جائز ہے، تو یہ بات حدیث سے بطور مفہوم تو سمجھ آتی ہے، لیکن منطوق نہیں ہے۔چنانچہ جوحضرات مفہوم مخالف کی حجیت کے قائل ہیں، جیسا کہ شافعیہ توان کے نزدیک تین دن تک قطع تعلق کرنا مباح ہوگا، اور جواس کے قائل نہیں ہیں، ان کے نزدیک یہ مباح بھی نہ ہوگا اھ۔

اس میں اشکال یہ ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے۔اورشارع نے ہجران مطلق کوحرام قراردیا ہے، تاکہ ہجران مقید کو، باوجود یکہ اس کے اطلاق سے بھی حرج عظیم لازم آتا ہے، بایں طورکہ مطلق غضب مفضی الی مطلق ہجران ہے، اوروہ حرام ہے۔

امام خطابیؒ فرماتے ہیں: مسلمان کواپنے بھائی سے تین دن تک غضبناک رہنے کی رخصت دی گئی ہے، چونکہ یہ مدت قلیل ہے۔اس مدت سے زیادہ کی اجازت نہیں، الا یہ کہ ہجران کا باعث حقوق اللہ میں سے کوئی حق ہو، تواس صورت میں تین دن سے زیادہ بھی جائز ہوگا۔

نو(۹) زرّیں نصائح

۵۰۲۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ وَلَا تَحَسَّسُوْا وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا وَفِیْ رِوَايَةٍ وَلَا تَنَافَسُوْا۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۰/۴۸۴ الحديث رقم ۶۰۶۶ و مسلم في ۴/۱۹۸۵ الحديث رقم (۲۸-۲۵۶۳) و ابوداؤد في السنن ۵/۲۱۳ الحديث رقم ۴۹۱۰ في الحديث رقم ۴۹۱۷ و مالك في الموطأ ۲/۹۰۷ الحديث رقم ۱۴ من كتاب حسن الخلق واحمد في المسند ۳/۱۱۰۔

ترجمه: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ① بدگمانی سے بچو کیونکہ یہ بدترین جھوٹ ہے۔② عیب جوئی نہ کرو۔③ کسی کی خفیہ باتیں نہ سنو۔④ نہ برتری جتاؤ۔⑤ نہ حسد کرو۔⑥ کسی سے عداوت نہ رکھو۔⑦ ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے عیب چینی نہ کرو۔اے اللہ کے بندو! بھائی بن جاؤ ایک روایت میں ایک دوسرے پر

حسد نہ لے جاؤ۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ایاکم والظن: (یہاں فعل محذوف ہے): ای: احذروا اتباع الظن

فان الظن: ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر فرمایا، تاکہ یہ مسئلہ ذہن سامع میں متمکن ہو جائے، نیز اجتناب پر ابھارنا مقصود ہے۔

قوله: لا تحسسوا ولا تناجشوا ولا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا:

ان پانچوں افعال میں ایک ایک تاء محذوف ہے۔ اور حالت وصل میں تاء کو مشدد پڑھنا بھی درست ہے۔ جیسا کہ ابن کثیر کے راوی "بزی" نے "لا تیمموا" جیسے کلمات میں پڑھا ہے۔

قوله: وکونوا عباد اللّٰه اخوانا: یہ خبر ثانی ہے۔ یا بدل ہے۔ یا خبر ہے، اور عباد الله منصوب علی الاختصاص بالنداء ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں، یہ صورت "اوقع" ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: بلکہ اس کا تحت الامر خبر واقع ہونا "اوجہ" ہے۔ بایں طور کہ اس صورت میں علت کی طرف اشارہ ہوگا۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ایک روایت میں لفظ "عباداً" منصوب ہے، اور "لِلّٰه" مجرور بلام الأجلیہ ہے۔

اخوانا: بعض کا کہنا ہے کہ "اخ" نسبی کی جمع "اخوۃ" آتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [فان كان له اخوة] [النساء۔ ۱۱] اور "اُخ" مجازی کی جمع "اخوان" آتی ہے۔ حق جل شانہ کا ارشاد ہے: ﴿اخوانا علی سرر متقابلين﴾ [الحجر۔ ٤٧] چنانچہ اس آیت: ﴿انما المؤمنون اخوة﴾ [الحجرات۔ ۱۰] میں لفظ "اخوۃ" (کا استعمال) برائے مبالغہ ہے۔ اور قاموس سے ان دونوں میں عدم فرق مستفاد ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

بدگمانی کو باتوں کا سب سے بدتر جھوٹ فرمایا گیا ہے چنانچہ جب کوئی شخص کسی کے بارے میں بدگمانی کرتا ہے تو وہ یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ شخص ایسا ایسا ہے اور چونکہ وہ شخص حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا اس لئے اس فیصلہ کو جھوٹ ہی کہا جائے گا۔

واضح رہے کہ "باتوں" سے مراد وہ باتیں ہیں جو نفس پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں وہ شیطان کی طرف سے نفس میں ڈالی جاتی ہیں۔ اسی اعتبار سے بدگمانی کو "بدترین جھوٹ" کہا گیا ہے یا یہ کہ اس کو "بدترین جھوٹ" کا نام دینا گویا اس کی برائی کو زیادہ سے زیادہ کر کے بیان کرنا مقصود ہے۔

قرآن کریم میں یوں فرمایا گیا ہے: [اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ] چنانچہ ان الفاظ میں جس ظن کو گناہ قرار دیا گیا ہے اس سے بدگمانی مراد ہے اور جیسا کہ علماء نے وضاحت کی ہے جس بدگمانی کے بارے میں ممانعت منقول ہے۔ اس سے وہ بدگمانی مراد ہے جو ذہن میں بیٹھ جائے اور اس پر یقین کر لیا وہ بدگمانی مراد نہیں ہے جو محض خیال کے طور پر دل میں گزر جائے

بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ "بدگمانی" گناہ گار اس وقت کرتی ہے جب کہ اس کا ذکر کیا جائے اور اس کو زبان پر لایا جائے۔

عرضِ مرتب:

بدگمانی کے موجب گناہ ہونے کی شرط یہ بھی ہے کہ اس بدگمانی کو قائم کرنے کے لئے کوئی معقول وجہ اور دلیل نہ ہو یا اگر بدگمانی کی بھی معقول وجہ اور دلیل ہو تو بدگمانی نہ کرنے کی بھی کوئی معقول وجہ اور دلیل ہو اور دونوں دلیلیں باہم متعارض ہوں ہاں بدگمانی کو درست ثابت کرنے کے لئے کوئی ~~ایسا واضح~~ قرینہ اور معقول دلیل ہو جس کو تسلیم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار

نہ ہو تو ایسی بدگمانی پر مواخذہ نہیں ہوگا اور نہ اس کو حقیقی معنی میں ''بدگمانی'' کہیں گے۔ (مظاہر حق)

قولہ: ولا تحسسوا ولا تجسسوا: تحسس اور تجسس (یعنی ٹوہ اور جاسوسی) بظاہر ایک ہی مفہوم کے حامل دو الفاظ ہیں لیکن علماء نے کئی وجوہ سے ان دونوں کے درمیان فرق ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ صاحب قاموس نے جیم کی فصل میں لکھا ہے کہ ''تجسس'' کے معنی ہیں خبروں کی تلاش میں رہنا جیسا کہ تحسس کے معنی ہیں اور ''جاسوس'' اسی سے مشتق ہیں جن کے معنی ہیں ایسی پوشیدہ خبریں رکھنے والا جو اچھی نہ ہوں۔ پھر انہوں نے حاء کی فصل میں لکھا ہے کہ ''حاسوس'' کے وہی معنی ہیں جو جاسوس کے ہیں یا یہ کہ ''حاسوس'' خاص طور پر ایسی پوشیدہ خبریں رکھنے والے کو کہتے ہیں جو اچھی ہوں۔

بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ ''تجسس'' کے معنی ہیں اچھی خبروں کو ہوشیاری اور نرمی کے ساتھ دریافت کرنا اور ''تحسس'' کے معنی ہیں ان خبروں کو قوت حاسہ کے ذریعہ دریافت کرنا جیسے کوئی شخص کسی بات کو چوری چھپے سنتا اور دیکھتا ہے۔

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ ''تجسس'' کے معنی ہیں کسی شخص کی برائیوں اور عیوب کی تفتیش کرنا اور ''تحسس'' کے معنی ہیں ان برائیوں اور عیوب کو سننا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ''تجسس'' کے معنی ہیں دوسروں کے لئے خبر کی ٹوہ میں رہنا اور ''تحسس'' کے معنی ہیں اپنے لئے کسی خبر کی ٹوہ لگانا!

اور طیبیؒ نے یہ کہا ہے کہ اس ارشاد گرامی میں ''تجسس'' مراد ہے خود اپنے طور پر یا کسی کی مدد سے دوسرے لوگوں کے عیوب اور ان کے پوشیدہ ذاتی احوال و معاملات کی ٹوہ لگانا اور ''تحسس'' کے معنی ہیں کسی کی مدد کے بغیر خود اپنے طور پر ٹوہ لگانا!

بہر حال اگر حدیث کی مراد لوگوں کے ایسے احوال و معاملات کی ٹوہ لگانے اور ایسی خبروں کی تلاش میں رہنے سے منع کرنا ہے جن کا تعلق عیب و برائی اور کردار و احوال کی کمزوریوں سے ہو تو اس کی ممانعت بالکل ظاہر ہے اور اگر اچھی خبر کی تلاش میں رہنے اور اچھے احوال و معاملات کی ٹوہ میں رہنے سے بھی منع کرنا مراد ہے تو اس صورت میں اس ممانعت کی وجہ یہ بیان کی جائے گی کہ ہوسکتا ہے کہ کسی کے بارے میں کوئی اچھی خبر پانے کے بعد اپنے اندر حسد کا جذبہ پیدا ہو جائے یا طمع و حرص جاگ اٹھے جو کوئی اچھی چیز نہیں ہے لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ کسی کی اچھی خبر کی ٹوہ میں بھی نہ رہا جائے۔

قولہ: ولا تناجشوا: یہ لفظ ''نجش'' سے ماخوذ ہے، جس کے اصل معنی ہیں شکار کو برانگیختہ کرنا!

اس جملہ کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں:

① بعض حضرات نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ دوسروں کے مقابلہ پر اپنی عظمت و وقعت اور بڑائی کی طلب و خواہش کرنا اور

② بعض حضرات نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ کسی کو دھوکا دینے کے لئے بکنے والی چیز کی بڑھا چڑھا کر تعریف کرنا یا مصنوعی خریدار بن کر بکنے والی چیز کی قیمت بڑھانا تا کہ دوسرا شخص اس کے دیکھا دیکھی اس چیز کو اسی قیمت میں خرید لے یا کسی بکتی ہوئی چیز کو برائی کرنا تا کہ خریدار اس کو چھوڑ کر دوسری طرف ہو جائے۔ علماء نے حدیث میں اس لفظ کو اسی معنی پر محمول کیا ہے یعنی مذکورہ بالا طریقوں میں سے کسی بھی طریقے سے سودے کو بگاڑنا!

بعض حضرات نے اس لفظ کے اصل معنی رعایت سے حدیث میں ولا تناجشوا کے یہ معنی مراد لئے ہیں کہ کسی کو کسی کی

برائی اور خصومت پر نہ اکساؤ۔

قولہ: ولا تحاسدوا (آپس میں حسد نہ کرو) کا مطلب یہ ہے کہ کسی غیر ظالم کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر اس کے زوال کی آرزو نہ کرو یا یہ خواہش وآرزو نہ رکھو کہ وہ نعمت اس کے پاس سے ہٹ کر تمہارے پاس آجائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَاسْــَٔـلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِــيْمًا﴾ [النساء:۳۲] ''اور جس چیز میں خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اس کی ہوس مت کرو مردوں کو ان کے کاموں کا ثواب ہے جو انہوں نے کئے اور عورتوں کو ان کے کاموں کا ثواب ہے جو انہوں نے کئے اور خدا سے اس کا فضل (وکرم) مانگتے رہو۔ کچھ شک نہیں کہ خدا ہر چیز سے واقف ہے''۔

قولہ: ولا تباغضوا (ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو) کا مطلب یہ ہے کہ ایسے اسباب کو پیدا کرنے سے احتراز کرو جو بغض ونفرت کو لازم کرتے ہیں! جس طرح محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو خود بخود پیدا ہوتا ہے اسی طرح بغض ونفرت بھی پیدائشی ہیں کہ اس جذبہ کے پیدا ہونے یا نہ ہونے میں کسی شخص کا کوئی اختیار نہیں ہے البتہ انسان اپنے آپ کو ایسے اسباب سے محفوظ رکھنے پر یقیناً قادر ہوسکتا ہے جن سے باہمی بغض ونفرت پیدا ہوسکتی ہے

بعض حضرات نے ولا تباغضوا کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ شرعی احکام ومسائل میں خواہشاتِ نفسانی کی بناء پر آپس میں اختلاف وانتشار پیدا نہ کرو اور خود ساختہ افکار ونظریات کو دین میں شامل نہ کرو۔ کیونکہ دین میں بدعت اختیار کرنا اور راہِ مستقیم سے گمراہ ہونا وہ اسباب ہیں جو مسلمانوں کے درمیان ایک دوسرے سے بغض ونفرت پیدا کرتے ہیں

زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث میں ایک دوسرے سے بغض رکھنے کی ممانعت کا اصل مقصد باہمی محبت والفت کے حکم کو موکد کرنا ہے اور محبت والفت کے اس حکم کا تعلق علی الاطلاق مسلمانوں کی پوری زندگی سے ہے البتہ جس محبت والفت سے دین میں خلل پڑتا ہو اس صورت میں محبت کو جائز قرار نہیں دیا جائے گا' بلکہ دین کو نقصان پہنچانے والے شخص سے بغض ونفرت ہی رکھنا جائز ہوگا حاصل یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشادِ گرامی کے ذریعہ تمام مسلمانوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ وہ خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لئے محبت واتحاد کی زنجیر میں منسلک رہیں جو ارشاد خداوندی کا بھی تقاضا ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾

''اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کی رسی کو اس طور پر کہ باہم سب متفق رہیں اور باہم نا اتفاقی مت کرو''۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محبت والفت' اتحاد واجتماع کا ذریعہ ہے اور بغض نفرت' افتراق وانتشار کا موجب ہے۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ تم ایک دوسرے سے بغض ونفرت نہ رکھو۔

بعض حضرات نے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ تم مسلمانوں کے درمیان عداوت ودشمنی پیدا نہ کرو! اس صورت میں مذکورہ ممانعت کا تعلق گویا چغل خوری سے ہوگا۔ کیونکہ چغل خوری سے فساد کی بنیاد پڑتی ہے اور ایک دوسرے سے عداوت ودشمنی پیدا ہوجاتی ہے۔

قولہ: ولا تدابروا: کا مطلب یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائی بیان نہ کرو۔ تدابر سے مراد تقاطع۔

(ترک ملاقات) ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ایک دوسرے سے ملنا جلنا چھوڑ دو! اس معنی کو مذکورہ جملہ سے لفظی مناسبت بایں طور ہے کہ ترک ملاقات کرنے والوں میں سے ہر ایک دوسرے سے پیٹھ پھیر لیتا ہے اور اسلام کے بتائے ہوئے باہمی حقوق کی ادائیگی سے گریز کرتا ہے۔

قوله: و كونوا عباد الله اخوانًا کا مطلب یہ ہے کہ تم سب اللہ کے ایک بندے ہو اور عبودیت میں سب برابر ہو نیز تم سب اخوت کی ایک زنجیر سے منسلک ہو لہٰذا تمہاری اس حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے کے درمیان حسد، بغض اور غیبت جیسی برائیوں کو حائل کر کے اپنے دلوں میں افتراق اور اپنی صفوں میں انتشار پیدا نہ کرو۔ بلکہ اپنے مرتبہ عبودیت پر اتحاد و یکجہتی کے ساتھ قائم رہو اور آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔

قوله: ولا تنافسوا : تنافس لغوی طور پر تحاسد (ایک دوسرے سے حسد کرنے) کے معنی کے قریب ہے لیکن احتمال یہ ہے کہ تنافس کے معنی دنیا کی طرف میلان و رغبت رکھنا ہوں (اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ مجھے خدشہ ہے کہ تم پر دنیا کے دروازے کھول دیئے جائیں اور تنافس کرنے لگو یعنی تم دنیا کی طرف راغب ہو جاؤ۔ اسی اعتبار سے ترجمہ میں (تنافس) کے معنی "آپس میں حرص کرنا" نقل کیے گئے ہیں۔)

بلکہ مناسب یہ ہے کہ ان اشیاء نفیسہ میں رغبت کی جائے، جو آخرت کے اعتبار سے محمود و مرضیہ ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وفي ذلك فليتنافس المتنافسون﴾ [المطففين۔ ۲۶] امام شاطبیؒ نے بھی اپنے اس نفیس کلام میں اسی مفہوم کو اجاگر کیا ہے:

عليك بها ما عشت فيها منافسا
بع نفسك الدنيا بانفاسها العلى

تخریج: جامع صغیر کی روایت میں اتنا اضافہ بھی ہے: **ولا يخطب الرجل على خطبة اخيه حتى ينكح او يترك** اور فرماتے ہیں، کہ اس حدیث کو امام مالک، احمد، شیخین، ابوداؤد اور ترمذی نے بھی حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

باہمی عداوت والوں کی بخشش ملتوی

۵۰۲۹: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُفْتَحُ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ لَايُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا اِلَّا رَجُلٌ كَانَتْ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ اَنْظِرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١٩٨٧/٤ الحديث رقم (٣٥-٢٥٦٥) و ابوداؤد في السنن ٢١٦/٥ الحديث رقم ٤٩١٦، والترمذي في ٣٢٧/٤ الحديث رقم ٢٠٢٣ ومالك في الموطأ ٩٠٨/٢ الحديث رقم ١٧ من كتاب حسن الخلق، واحمد في المسند ٢٦٨/٢۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت کے دروازے سوموار اور جمعرات کو

کھولے جاتے ہیں اور ہر ایسے بندے کی بخشش کردی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ کرنے والا ہو۔ البتہ اس شخص کا معاملہ ملتوی کردیا جاتا ہے جس کی کسی دوسرے مسلمان سے عداوت ہو اور یہ کہہ دیا جاتا ہے۔ ان کو صلح کرنے تک مہلت دو۔ (مسلم)

تشریح: تفتح: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ البتہ بصیغۂ مذکر و مؤنث ہر دو طرح پڑھا گیا ہے۔

قوله: فیغفرلکل عبد لا یشرك بالله شیئا الا رجل: مشکوۃ کے تمام نسخوں میں لفظ "رجل" مرفوع ہے۔ اس سے پہلے مضاف محذوف ہے اى: الا ذنب رجل وگرنہ تو ظاہراً منصوب ہے۔ (کذا قالہ السید جمال الدین)۔

اس میں اشکال یہ ہے کہ تقدیر مضاف کی بناء پر مرفوع پڑھنا جائز تو نہیں ہوجاتا، ہاں اگر مجروراً مروی ہوتا، تو پھر یہ توجیہ ہوسکتی تھی کہ مضاف منصوب محذوف ہے، اور مضاف الیہ کو اس کی اصل پر چھوڑ دیا گیا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کا منصوب ہونا ظاہر ہے، چونکہ یہ کلام موجب سے استثناء ہے۔ اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ یہ کلام اس معنی پر محمول ہے اى: **لا یبقٰی ذنب احد الا ذنب رجل۔** یہ آیت کریمہ بھی اسی طرح ہے: ﴿**فشربوا منه الا قلیل**﴾ [البقرة۔ ۲۴۹] اى: **فلم یطیعوه الا قلیل منهم** رفع کی قراءت شاذہ ہے، البتہ قراءت متواترہ نصب کے ساتھ ہے۔

اور بعض کا کہنا ہے، کہ لفظ "**رجل**" **کل عبد** کی ضعف ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، چونکہ اس کا محل رفع ہے۔ اور **الا** بمعنی **غیر** ہے اى: **غیر رجل شیئا: اى من الاشرك أو من الاشیئا من شرك جلى أو خفى۔**

فیغفر: جامع صغیر کی روایت میں "**فیهما**" کا اضافہ بھی ہے۔

کانت: ایک نسخہ میں "**کان**" ہے۔

لکل عبد ایک روایت میں "**لکل عبد مؤمن**" کے الفاظ ہیں اور ممکن ہے کہ مؤمن سے مراد مؤمن کامل ہو۔

قوله: فیقال :انظروا هذین حتى یصطلحا: انظروا: میں ہمزہ قطعی اور ظاء معجمہ ہے۔ اس کا معنی ہے مہلت دو۔

هذین: امام طیبیؒ فرماتے ہیں ضمیر کی جگہ اسم اشارہ کو ذکر فرمانا مزید تمییز و تعیین کیلئے ہے۔ اھ۔ اور مطلب یہ ہے کہ مطلقاً ان دونوں کے گناہوں کی مغفرت کا معاملہ مؤخر کردو' تاکہ دونوں کو زجر ہو' اور یہ بھی ممکن ہے کہ فقط قطع تعلقی کے گناہ کے مغفرت کا معاملہ مؤخر کرنے کا حکم ہو۔ اور یہی زیادہ واضح ہے۔

قوله: تفتح ابواب الجنة یوم الاثنین ویوم الخمیس: "ابواب" کے بعد مضاف مقدر ہے۔ **أى أبواب طبقاتها أو غرفها و درجاتها۔** یعنی جنت کے طبقات و درجات کے دروازے یا اس کے بالا خانوں کے دروازے ان دنوں میں کھول دیئے جاتے ہیں کیونکہ ان دونوں دنوں میں حق تعالیٰ کی رحمت کثرت سے نازل ہوتی ہے جو بندوں کی مغفرت کا باعث ہوتی ہے۔ شرح مسلم میں لکھا ہے کہ قاضی عیاض فرماتے ہیں دروازوں کا کھلنا دراصل اس بات سے کنایہ ہے کہ ان دو دنوں میں بندوں کو بہت زیادہ مغفرت سے نوازا جاتا ہے ان کے گناہ و جرائم سے درگزر کیا جاتا ہے اور انہیں ثواب کی کثرت اور بلندی درجات کی سعادت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ کو ان کے ظاہری معنی پر محمول کیا جائے' چونکہ نصوص (یعنی قرآن و حدیث میں منقول احکام) کو ان کے ظاہری مفہوم پر محمول کرنا واجب ہے۔ تاوقتیکہ کوئی ایسی

واضح دلیل موجود نہ ہو جس سے اس سے ظاہری مفہوم کے بجائے کوئی دوسرا مطلب مراد لیا جا سکتا ہے۔

"تا آنکہ وہ آپس میں صلح وصفائی کر لیں" سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کی مغفرت باہمی صلح وصفائی اور عداوت کے ختم ہو جانے پر موقوف رہتی ہے۔ خواہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے عداوت رکھتے ہوں۔ یا ان میں سے ایک عداوت رکھتا ہو اور دوسرا اس عداوت سے صاف ہو۔

تخریج: اس حدیث کو امام بخاری نے الأدب المفرد میں، ابوداؤد اور ترمذی نے ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

کینہ وعداوت والوں کی مغفرت میں تاخیر

۵۰۳۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْرَضُ اَعْمَالُ النَّاسِ فِيْ كُلِّ جُمُعَةٍ مَرَّتَيْنِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ اِلَّا عَبْدًا بَيْنَهُ وَبَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ اُتْرُكُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَفِيْئَا۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١٩٨٧/٤ الحديث رقم (٣٦-٢٥٦٥) و ابوداؤد في السنن ٨١٤/٢ الحديث رقم ٢٤٣٦، والترمذي في السنن ١٢٢/٣ الحديث رقم ٧٤٧، والنسائي في ٢٠٢/٤ الحديث رقم ٢٣٥٩، والدارمي في ٣٢/٢ الحديث رقم ١٧٥٠ ومالك في الموطأ ٩٠٩/٢ الحديث رقم ١٨ من كتاب من حسن الخلق، واحمد في المسند ٢٦٨/٢۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر ہفتہ میں دو بار پیر اور جمعرات کو لوگوں کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں اور ہر مؤمن کو بخش دیا جاتا ہے سوائے ان دو آدمیوں کے جن کے مابین کینہ وعداوت ہو۔ ان کو رجوع کرنے کے لئے ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ (مسلم)

تشریح: قوله: يعرض أعمال الناس في كل جمعة مرتين يوم الاثنين ويوم الخميس:

یعرض: بصیغہ مذکر ومؤنث ہر دو طرح پڑھا گیا ہے۔

جمعة: بضمتین اور بسکون الثانی دونوں طرح پڑھا جاتا ہے۔

یوم الاثنین: لفظ یوم ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے۔ اور اظہر یہ ہے کہ "مرتین" سے بدل ہے، وگرنہ تو یہ وہم ہو سکتا ہے کہ ان دونوں ایام میں اعمال دو دو مرتبہ پیش کئے جاتے ہیں۔

قوله: فيغفر لكل عبد مؤمن الا عبدا

عرضِ مرتب:

مرقات کے محشی لکھتے ہیں: مرقات کے مطبوعہ نسخہ میں "**فیغفر لکل عبد مؤمن**" کے الفاظ موجود نہیں ہیں، البتہ مرقاۃ کے مخطوطہ اور مشکاۃ میں موجود ہیں اھ۔

تورپشتی فرماتے ہیں: مصابیح میں "**الا عبد**" رفع کے ساتھ ہے، جب کہ مسلم شریف میں منصوب ہے، اور یہی "اوجہ"

ہے۔ چونکہ اس صورت میں کلام موجب سے استثناء ہوگا۔ اور روایات صحیحہ میں بھی اسی طرح ثابت ہے۔

حتی یفیئا: "فاء" سے مضارع کا تثنیہ کا صیغہ ہے۔

اعمال الناس: احتمال ہے کہ "الناس" سے مراد مؤمنین ہوں، چونکہ (حقیقی معنی میں) "ناس" (تو) یہی ہیں۔

فی کل جمعۃ: قاضیؒ فرماتے ہیں: جمعہ سے مراد "اسبوع" ہے۔ "معروض علیہ" اللہ جل شانہ ہوں گے۔ یا وہ فرشتہ ہو گا، کہ جس کے سپرد اعمال کے تمام صحائف ہیں۔ پہلا مفہوم صحیح ہے، جیسا کہ عنقریب اس کی تصریح آرہی ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام طبرانی نے بحوالہ حضرت اسامہ بن زید ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

تعرض الأعمال علی اللّٰہ یوم الاثنین والخمیس، فیغفر اللّٰہ الا ما کان من متشاحنین او قاطع رحم اور حکیم کی روایت عن والد عبد العزیز ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے: **تعرض الأعمال یوم الاثنین والخمیس علی اللّٰہ تعالٰی، وتعرض علی الأنبیاء وعلی الآباء والأمھات یوم الجمعۃ، فیفرحون بحسناتھم وتزداد وجوھھم بیاضا واشراقا، فاتقوا اللّٰہ ولا تؤذوا موتاکم**

فائدہ: اور ان احادیث سے تین دن سے زائد کی قطع تعلقی سے ممانعت کی حکمت بھی واضح ہو جاتی ہے، وگرنہ وہ شخص عرض اعمال کے ان دو دنوں میں مغفرت سے محروم رہ جائے گا۔ واللہ اعلم بالاحوال۔

دو آدمیوں میں صلح کرانے والا جھوٹا نہیں

۵۰۳۱: وَعَنْ اُمِّ كُلْثُوْمٍ بِنْتِ عُقْبَةَ بْنِ اَبِيْ مُعَيْطٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِيْ يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ وَيَقُوْلُ خَيْرًا وَيَنْمِيْ خَيْرًا (متفق علیہ وزاد مسلم) قَالَتْ وَلَمْ اَسْمَعْهُ تَعْنِي النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُرَخِّصُ فِيْ شَيْءٍ مِمَّا يَقُوْلُ النَّاسُ كَذِبٌ اِلَّا فِيْ ثَلٰثٍ الْحَرْبُ وَالْاِصْلَاحُ بَيْنَ النَّاسِ وَحَدِيْثُ الرَّجُلِ امْرَاَتَهُ وَحَدِيْثُ الْمَرْاَةِ زَوْجَهَا۔

أخرجه البخاري في صحيحه ٥/٢٩٩ الحديث رقم ٢٦٩٢ و مسلم في صحيحه ٤/٢٠١١ الحديث رقم (١٠١-٢٦٠٥)، واحمد في المسند ٦/٤٠٣۔

ترجمہ: حضرت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابو معیط رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: وہ آدمی جو دو آدمیوں میں صلح کرانے کے لئے بھلی بات کہے وہ جھوٹا نہیں اور بھلی بات پہنچائے۔ یہ بخاری، مسلم کی روایت ہے۔ مسلم میں یہ اضافہ ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین مقامات کے علاوہ جھوٹ (توریہ) کی کہیں اجازت دیتے نہیں دیکھا: ① جنگ۔ ② لوگوں کے مابین صلح کے موقعہ پر۔ ③ خاوند کو بیوی کے ساتھ (بہلانے کے لئے) اور بیوی کو خاوند کے ساتھ (خوش کرنے کے لئے)۔

تشریح: قولہ: لیس الکذاب الذی یصلح بین الناس وینمی خیرا: "الکذاب": ذو کذب کے معنی میں

"الذی": اور جامع کی روایت میں "بالذی" ہے۔

"ینمی": یائے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ (بروزن یرمی)

"کذب": کاف کے فتحہ اور ذال اور کاف کے کسرہ اور ذال کے سکون کے ساتھ ہے، اور مرفوع ہے، اور ایک نسخہ میں منصوب ہے۔ اور ایک نسخہ میں مجرور ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: کذب کا مرفوع ہونا اس بناء پر ہے کہ خبر ہے، مبتدا محذوف کیلئے جو قول کا مقولہ ہے۔ اور مما یقول بیان ہے فی شیء کیلئے ای فی شیء من اقوال الناس هو کذب

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اظہر یہ ہے کہ کذب، مبتداء ہے، اور اس کی خبر محذوف ہے۔ اور "من" تبعیضیہ ہے۔ عبارت کی معنوی تقدیر یوں ہوگی: لم اسمعه ترخص فی شیء من جملة ما یقول الناس فیه ای فی حقه کذب۔

الا فی ثلاث: تمیز محذوف ہے۔ یہ استثناء شیء سے ہے۔ اور عامل کا اعادہ کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اگر یہ منصوب ہو تو مفعول مطلق ہوگا۔ ای قوله کذبا

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ یقول مقدر کے مفعول سے حال ہو، اور وہ مفعول موصول کی طرف عائد ہو۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: اگر مجرور مروی ہو تو شیء کی صفت ثانیہ ہوگا۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اظہر یہ ہے کہ "شیء" موصول سے بدل ہے۔

الحرب، ثلاث سے بدل ہونے کی باعث مجرور ہے۔ اور ایک نسخہ میں مرفوع ہے۔ اسی تقدیر پر احدها، یا أولها، یا منها محذوف ہوگا۔ اور اعنی فعل محذوف کیلئے مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب پڑھنا بھی درست ہوگا۔ جامع الاصول اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں روایت پہلی وجہ اعراب کے ساتھ ہے، یہی اولیٰ ہے۔

قوله : الاصلاح بین الناس یہاں ثانیتها مقدر ہے۔

قوله : وحدیث الرجل امرأته، وحدیث المرأة زوجها یہاں تقدیری عبارت یوں ہے: وثالثها مجموع قوله حدیث الرجل......۔

"بھلی بات پہنچائے" یعنی صلح کرانے والا شخص دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کی طرف سے دوسرے فریق کو وہ بات پہنچائے جو حقیقت میں اس فریق نے نہ کہی ہو اور وہ بات اس طرح کی ہو جس سے دونوں کے درمیان صلح و دوستی کے جذبات پیدا کرنے میں مدد ملتی ہو مثلاً وہ دونوں فریق میں سے کسی کے پاس جائے اور اس سے یوں کہے کہ تم اس (دوسرے فریق) سے خواہ مخواہ کی عداوت رکھتے ہو حالانکہ وہ تمہارا بڑا خیر خواہ ہے اور تمہارے حق میں اچھی بات کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کہتا اس نے تمہیں سلام کہا ہے اور تمہارے تئیں دوستی و خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

جنگ کی حالت میں جس جھوٹ بولنے کی اجازت ہے اس کا تعلق ایسی باتیں کہنے سے ہے جن سے مسلمانوں کی طاقت و قوت کا اظہار ہوتا ہو اپنے لشکر کے لوگوں کا حوصلہ بڑھتا ہو اور ان کے دل قوی ہوتے ہوں اور دشمن کے لشکر کا فریب کھا جانا ممکن ہو اگرچہ وہ باتیں حقیقت کے بالکل خلاف ہی کیوں نہ ہوں مثلاً یوں کہا جائے کہ ہمارے لشکر کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ دشمن کا لشکر کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا اور ہمارے لشکر کی مدد کے لئے مزید کافی کمک آ رہی ہے یا اپنے سامنے کھڑے ہوئے دشمن سے

یوں کہا جائے کہ دیکھ سنبھل فلاں شخص تجھے ختم کر دینے کے لئے تیرے پیچھے آ پہنچا ہے اور پھر جب وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے اور اس کا دھیان سامنے سے ہٹ جائے تو موقع سے فائدہ اٹھا کر اس پر وار کر دیا جائے۔

میاں بیوی کی باتوں میں جھوٹ کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً میاں بیوی سے یا بیوی میاں سے اپنے اتنے زیادہ پیار ومحبت کا اظہار کرے جو حقیقت کے خلاف ہو اور اس سے مقصد یہ ہو کہ آپس میں محبت والفت زیادہ بڑھے۔

تخریج: جامع صغیر میں یہ الفاظ ہیں: فینمی خیرا اس حدیث کو امام احمد، شیخین، ابوداؤد اور ترمذی نے اسی راوی سے کیا ہے۔ اور طبرانی نے شداد بن اوس سے نقل کیا ہے۔ اور سنن ابوداؤد میں مروی ام کلثوم کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

لم یکذب من ینم بین اثنین لیصلح

عرضِ مرتب:

اسی مفہوم پر مشتمل ایک حدیث ماقبل میں بھی گزر چکی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے حدیث: ۴۸۲۶۔

۵۰۳۲: وَذَكَرَ حَدِيْثَ جَابِرٍ اَنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ اَيِسَ فِيْ بَابِ الْوَسْوَسَةِ۔

مسلم فی صحیحه ٤/٢١٦٦ الحدیث رقم (٦٥-٢٨١٢)۔

یہ روایت جابر رضی اللہ عنہ سے باب الوسوسہ میں گزری۔

الفصل الثانی:

تین باتوں میں جھوٹ کی اجازت

۵۰۳۳: عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَحِلُّ الْكَذِبُ اِلَّا فِيْ ثَلٰثٍ كَذِبُ الرَّجُلِ امْرَأَتَهٗ لِيُرْضِيَهَا وَالْكَذِبُ فِي الْحَرْبِ وَالْكَذِبُ لِيُصْلِحَ بَيْنَ النَّاسِ۔ (رواه احمد والترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٢٩٢ الحدیث رقم ١٩٣٩، واحمد فی المسند ٦/٤٦١۔

ترجمہ: حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جھوٹ کو تین مقامات کے علاوہ بولنے کی اجازت نہیں دی۔ ① بیوی کو راضی کرنے کیلئے۔ ② لڑائی میں۔ ③ لوگوں کے درمیان صلح کرنے کے لئے۔

(احمد وترمذی)

الا فی ثلاث: (تمیز محذوف ہے۔) ای: ثلاث کذبات

کذب الرجل: قواعد عربیہ کے مطابق یہاں تینوں اعراب مجرور علی البدلیۃ اولیٰ ہے۔

قولہ: کذب الرجل مرأنه لیرضیها: اس حدیث میں صرف شوہر کے جھوٹ بولنے کی اجازت کا ذکر ہے بیوی کے جھوٹ بولنے کا ذکر نہیں ہے جب کہ پچھلی حدیث میں دونوں کا ذکر ہے (ملاحظہ فرمائیے ۵۰۳۱) اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ راوی نے اختصار کی خاطر صرف شوہر کے بارے میں نقل کیا اور بیوی کے ذکر کو حذف کر دیا یہ کہ خود آنحضرت ﷺ نے اکثر و

اغلب کا اعتبار کرتے ہوئے صرف شوہر ہی کا ذکر فرمایا کیونکہ عام طور پر عورتیں اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے زیادہ شکی اور بدگمان ہوا کرتی ہیں۔اسلئے انکی تسلی اور ان کو خوش رکھنے کی شوہر کو زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔

تین دن سے زیادہ قطع تعلق کی ممانعت

۵۰۳۴: وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَكُوْنُ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَّهْجُرَ مُسْلِمًا فَوْقَ ثَلٰثَةٍ فَاِذَا لَقِيَهٗ سَلَّمَ عَلَيْهِ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ كُلُّ ذٰلِكَ لَا يَرُدُّ عَلَيْهِ فَقَدْ بَآءَ بِاِثْمِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۵/۲۱۵ الحدیث رقم ۴۹۱۲۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ کسی مسلمان کے لئے مناسب نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ میل جول کو چھوڑے جب اس کو ملے تین مرتبہ اس کو سلام کرے اگر اس نے ہر بار جواب نہ دیا تو گناہ اسی پر لوٹے گا۔ (ابوداؤد)

تشریح: "لا یکون"۔ یہاں اس کے چار مطلب ہو سکتے ہیں:

① لا ینبغی (سہل نہیں، مناسب نہیں) ② لا یصح (صحیح نہیں درست نہیں) ③ لا یوجد (نہ پایا جائے)۔ ④ لا یکون حلالا (حلال نہیں)

فوق ثلاثة: (تمیز محذوف ہے۔) ای: ثلاثة ایام

سلم علیه: لقیه سے بدل ہے، یا "لقیه" کے فاعل سے حال ہے، اس کی تائید ابوخراش کی روایت سے بھی ہوتی ہے: **فلقیه فلیسلم علیه قوله: کل ذلك لایر دعلیه**: کل: مبتداء ہے اور "لا یردہ" اس کی خبر ہے، اور یہ پورا جملہ "ثلاث مرات" کی صفت ہے، اور عائد محذوف ہے۔ ای: لا یرد فیها ای فی المرات اور ایک نسخہ میں (کل) منصوب ہے "لا یرد" کا ظرف ہونے کی بناء پر۔

قوله: فقد باء باثمه: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ جواب اذا ہے۔ ای اذا سلم علیه ثلاث مرات غیر مردود فیها فقد باء باثمه اور احتمال ہے کہ (باثمہ کی) ضمیر ثانی کی طرف عائد ہو۔ یعنی جواب نہ دینے والے کی طرف راجع ہو۔ چنانچہ مطلب یہ ہوگا کہ سلام کرنے والا تو ترک ملاقات کے گناہ سے نکل آئے گا لیکن سلام کا جواب نہ دینے والے گناہ پر بدستور رہے گا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر "مسلم" کی طرف راجع ہو۔ چنانچہ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا۔

کہ اگر وہ سلام کرنے والے کے سلام کا جواب نہیں دے گا تو ترک ملاقات کا گناہ اس کے سر پڑے گا بلکہ سلام کا جواب نہ دینے کی وجہ سے سلام کرنے والے کا گناہ بھی اس پر ہوگا۔

قطع تعلق کرنے والا آگ میں جائے گا

۵۰۳۵: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَّهْجُرَ اَخَاهُ

فَوْقَ ثَلٰثٍ فَمَنْ هَجَرَ فَوْقَ ثَلٰثٍ فَمَاتَ دَخَلَ النَّارَ۔ (رواه احمد وابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٥/ ٢١٥ الحديث رقم ٤٩١٥، واحمد فی المسند ٤/ ٢٠٠۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے جس نے قطع تعلق کیا اور اسی دوران اس کی موت آگئی تو وہ آگ میں جائے گا۔

(احمد، ابوداؤد)

تشریح: فوق ثلاث: (تمیز محذوف ہے۔) ای ثلاث لیال: یہاں صنعت ''تفنن'' ہے، اور دونوں روایتوں کے مجموعے سے بظاہر یہ پتہ چلتا ہے کہ تین دن رات مراد ہیں جیسا کہ سیدنا حضرت زکریاؑ کے قضیہ میں بھی تین دن رات مراد ہیں ۔قولہ: فمن هجر فوق ثلاث فمات دخل النار: اس کا ظاہری مطلب یہ نکلتا ہے کہ خواہ تین دن سے ایک پل بھی زائد ہو تو وہ اس وعید کا مستحق ہوسکتا ہے۔ اور ''فوق ثلاث'' سے مراد اگلا عدد کامل یعنی چار مراد ہے۔

فمات دخل النار: امام تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یعنی یہ شخص مستوجب نار ہوگیا چونکہ گناہ میں پڑا ہوا شخص عقوبت میں مبتلا شخص کی طرح ہے۔ اگر چاہے تو اس کو عذاب دے، اور اگر چاہے تو بخش دے۔

تخریج: امام میرکؒ نے ذکر کیا ہے، کہ اس حدیث کو امام نسائی نے ایسی اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے جو شیخین کی شرط پر ہے۔

ایک سال کی قطع تعلقی خون بہانے کی طرح ہے

٥٠٣٦: وَعَنْ اَبِیْ خِرَاشٍ السُّلَمِیِّ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ هَجَرَ اَخَاهُ سَنَةً فَهُوَ كَسَفْكِ دَمِهٖ۔

(رواه ابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٥/ ٢١٥ الحديث رقم ٤٩١٥، واحمد فی المسند ٤/ ٢٢٠۔

ترجمہ: حضرت ابوخراش سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی سے ایک سال کے لئے قطع تعلق کیے رکھا وہ اس کے خون بہانے کی طرح ہے۔ (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

ابوخراش۔ یہ ابوخراش حدرد بن ابی حدرد اسلمی ہیں صحابی رسول ہیں۔ ان سے صرف ایک حدیث مروی ہے۔ خائے معجمہ کے زیر رائے مہملہ غیر مشدد اور شین معجمہ کے ساتھ ہے اور ''حدرد'' حائے مہملہ کے زیر اور دونوں دال مہملہ کے سکون اور رائے مہملہ کے زبر کے ساتھ ہے۔ فوقانی اور تحتانی دونوں متنوں میں ''سلمی'' سین مہملہ کے ضمہ اور لام کے فتحہ کے ساتھ ہے' یہ کاتب کا سہو ہے۔ یہی ضبط صحیح ہے' متعدد اصحاب رجال نے اپنی کتب میں اس کی تصریح کی ہے۔

تشریح: قولہ: فهو كسفك دمه:

اس سے متعدد مطالب بیان کیے گئے ہیں:

① اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ تہاجر موجب عقوبت ہے، جیسا کہ اپنے مسلمان بھائی کا خون بہانا موجب عقوبت ہے۔ پس یہ خون بہانے کے مشابہ ہے، بایں طور کہ اس کے سبب سے بھی عقوبت واجب ہوتی ہے۔ چونکہ عقوبت میں تو یہ اس کے مثل ہے، وجہ یہ ہے کہ قتل عظیم ترین گناہ ہے، شرک کے بعد اس سے بڑا گناہ کوئی نہیں، چنانچہ قطع تعلقی کو قتل کے ساتھ تشبیہ دینے میں ممانعت کی تاکید مقصود ہے اور مشابہت میں بعض صفات کا پایا جانا بھی کافی ہے۔

(کذا ذکرہ بعض شراح الحدیث)

② امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ اسلوب تشبیہ مبالغہ کیلئے ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: زید کالا سد اس مثال کے ذریعے "زید" کو "اسد" کے ساتھ ملحق کر دیا جاتا ہے جراءت میں، اور یہ اس کی نظیر ہے، اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ زید "اسد" سے کم ہے۔ چنانچہ حدیث باب میں بھی اسی طرح ہے، چونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی "لا یحل لمؤمن ان یھجر مؤمنا فوق ثلاث" اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ تین دن سے زیادہ قطع تعلقی حرام ہے۔ اس کا مرتکب مرتکب اثم ہے۔ اور جب یہ مدت اتنی طویل ہو جائے، کہ جتنی مدت میں کوئی غیر موجود آدمی بھی اپنے وطن لوٹ آتا ہے، تو یہ تہاجر و تقاطع اپنی آخر حد کو پہنچ گیا، چنانچہ اسی طرح اس کا گناہ بھی اپنے حد کو پہنچ گیا ہے۔ سال کی تخصیص کے یہی معنی ہیں۔ واللہ اعلم۔ اھ۔
ممکن ہے کہ سال کی تخصیص اس بناء پر ہو کہ سال چار موسموں پر مشتمل ہوتا ہے، چنانچہ جب اس ترک تعلق کرنے والے شخص کا مزاج پورا سال گزرنے کے بعد بھی اعتدال پر نہ آیا، تو اس سے رجوع کی امید ختم کر لینا چاہئے۔ اور اس کی نظیر مسئلہ عنین ہے، (کہ اس کو سال بھر تک مہلت دی جاتی ہے۔)

تخریج: الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام احمدؒ نے، امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابوداؤد اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔ اور میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام میرکؒ فرماتے ہیں: امام ابوداؤدؒ نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے اور امام حاکم اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے، اور امام ذہبیؒ نے اس تصحیح کو برقرار رکھا ہے۔

اَجر میں دونوں شریک

۵۰۳۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَایَحِلُّ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّهْجُرَ مُؤْمِنًا فَوْقَ ثَلٰثٍ فَاِنْ مَرَّتْ بِهٖ ثَلٰثٌ فَلْیَلْقِهٖ فَلْیُسَلِّمْ عَلَیْهِ فَاِنْ رَدَّ عَلَیْهِ السَّلَامَ فَقَدِ اشْتَرَکَا فِی الْاَجْرِ وَاِنْ لَّمْ یَرُدَّ عَلَیْهِ فَقَدْ بَآءَ بِالْاِثْمِ وَخَرَجَ الْمُسَلِّمُ مِنَ الْهِجْرَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٥/٢١٤ الحدیث رقم ٤٩١٢ و مالك فی الموطأ ٢/٩٠٦ الحدیث رقم ١٣ من کتاب حسن الخلق۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے اگر تین دن گزر جائیں تو اس کو جا ملے اور اس کو سلام کرے اگر اس نے

سلام کا جواب دے دیا تو وہ دونوں اجر میں شریک ہو گئے اور اگر وہ جواب نہ دے گو وہ گناہ لے کر لوٹا۔ مسلم نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔ (ابوداؤد)

تشریح: **قوله: فان رد عليه السلام فقد اشتركا في الاجر:**

اس اجر سے کون سا اجر مراد ہے؟ اس میں تین احتمال ہیں: ① مراد سلام کا اجر ہے، ② ترک ہجران کا اجر مراد ہے ③ یہ دونوں اجر مراد ہیں۔

قوله: وان لم يرد عليه فقد باء بالاثم:

اس گناہ سے کون سا گناہ مراد ہے۔ اس میں کئی احتمال ہیں: ایک احتمال یہ ہے کہ ترک تعلق کا گناہ مراد ہے۔ (کذا قال شارح)

② اظہر یہ ہے کہ گناہ ہجران وترک سلام دونوں مراد ہیں۔ چنانچہ الف لام جنس کا ہوگا، یا مضاف الیہ کے عوض ہے۔ ای باثم الأمرین ③ یہ کہنا بھی کوئی بعید نہیں کہ ہجران کا گناہ مستمر جو مسلمان کا خون بہانے کے قریب قریب ہے، اس گناہ کے ساتھ ساتھ ترک سلام کے گناہ کے ساتھ بھی لوٹے گا۔

قوله: وخرج المسلم من الهجرة: المسلم بلام مکسورہ مشدہ کے ساتھ ہے۔ **من الهجرة:** (جار مجرور کے درمیان مضاف محذوف ہے۔)

قوله: رواه ابو داؤد: امام ابوداؤدؒ نے اس حدیث کو ہلال بن ہلال مولیٰ یعنی کعب عن ابی ہریرۃ کے طریق سے روایت کیا ہے: امام احمدؒ ہلال کے بارے میں فرماتے ہیں: میں ان کو نہیں جانتا۔ اور ابوحاتم نے فرمایا: یہ مشہور نہیں ہیں۔ اور بعض نے ان کی توثیق کی ہے۔ (ذکرہ میرک)

فسادِ ذات البین مونڈنے والا ہے

۵۰۳۸: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَفْضَلِ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّدَقَةِ وَالصَّلٰوةِ قَالَ قُلْنَا بَلٰى قَالَ اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ۔

(رواه ابوداؤد والترمذی وقال هذا حديث صحيح)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ٥/٢١٨ الحديث رقم ٤٩١٩، والترمذی فی ٤/٥٧٢ الحديث رقم ٢٥٠٩ و مالك فی ٢/٩٠٢ الحديث رقم ٧من كتاب حسن الخلق واحمد فی لمسند ٦/٤٤٤۔

ترجمہ: حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تم کو ایسی چیز نہ بتلا دوں جو درجے کے اعتبار سے صیام وصدقہ اور نماز سے بڑھ کر ہے انہوں نے کہا کیوں نہیں آپ ﷺ نے فرمایا رشتے داروں میں صلح کرانا اور رشتہ داروں میں فساد مٹاتے اور ختم کرنے والا ہے۔ اس روایت کو ترمذی، ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: حدیث میں صلح کرانے کو جو روزہ' صدقہ اور نماز سے افضل کہا گیا ہے تو یہاں فرض روزہ یا فرض صدقہ یا فرض نماز مراد نہیں ہے بلکہ نوافل مراد ہیں۔ اور قرینہ یہ ہے کہ ''صدقہ'' عام طور پر نفلی ہی ہوتا ہے۔ او صلوۃ کا ذکر مؤخر کرنا ممکن ہے ''ترقی'' کے پیش نظر ہو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''والصدقۃ'' میں حرف واؤ جمع کے لئے ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ صلح صفائی کرانا ان سب عبادات کی ادائیگی سے افضل ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ حرف واؤ مفہوم کے اعتبار سے ''او'' کے معنی میں ہو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ صلح صفائی کرانا ان عبادتوں میں سے ہر ہر عبادت سے افضل ہے۔ حدیث کا جو مقصد ہے یعنی آپس میں دشمنی رکھنے والوں کے درمیان صلح کرانے کی ترغیب دلانا اس کے پیش نظر پہلا قول زیادہ بلیغ ہے۔ اشرفؒ فرماتے ہیں ان مذکورات (یعنی مذکورہ عبادات) سے مراد نوافل ہیں نا کہ فرائض۔ میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں واللہ اعلم بالمراد۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ویسے تو یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ حقیقی مراد کیا ہے' لیکن اگر وہ فریقین کے درمیان پائی جانے والی دشمنی وعداوت کی نوعیت یہ ہو کہ اس کے نتیجہ میں لوگوں کی خونریزی' مال واسباب کی غارت گری اور عزت وناموس کی بے حرمتی کا ہونا یقینی امر ہو تو قیاس کہتا ہے کہ ایسی عداوت ودشمنی کو ختم کرانا اور دونوں فریقوں کے درمیان صلح صفائی کرانا مذکورہ فرض عبادات سے بھی افضل ہو کیونکہ اول تو یہ عبادات ایسا عمل ہیں جو کسی وقت چھوٹ جائیں تو ان کی قضا ہو سکتی ہے جب کہ اس عداوت ودشمنی کے نتیجہ میں ہلاک ہونے والی جانیں' تباہ وبرباد ہونے والے مال واسباب اور بے حرمت ہونے والی عزت وناموس کی مکافات ممکن نہیں۔

دوسرے یہ کہ ان عبادات کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور مذکورہ ہلاکت وتباہی کا تعلق حقوق العباد سے ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ بعض اعتبار سے پروردگار کے نزدیک حقوق اللہ سے زیادہ حقوق العباد کی اہمیت ہے لہٰذا اس حقیقت کی بناء پر یہ کہنا زیادہ صحیح ہو سکتا ہے کہ اس جنس عمل کو ان عبادات پر جزوی فضیلت بہرحال حاصل ہے اور اسکا قرینہ یہ ہے کہ کہا جاتا ہے: البشر خیر من الملك والرجل خير من المراة۔ ''انسان فرشتہ سے بہتر ہے اور مرد عورت سے بہتر ہے۔''

قوله: قال: قلنا: بلى قال: اصلاح ذات البين'' فلنا بلى'':

اور ایک نسخہ میں یارسول اللہ کا اضافہ بھی موجود ہے۔ ''اصلاح'' ذات کی خبر ہے۔) ی هو اصلاح ذات البين۔ ''ذات البین'' سے مراد وہ خصلت ہے جو لوگوں میں پائی جاتی ہے مثلاً قرابت' مودت' اور ان جیسی دیگر خصلتیں اور بعض کا کہنا ہے کہ البین سے مراد ہے لوگوں کا باہمی بغض وعداوت قطع تعلقی جو باعث فرقت وفتراق ہو۔ لفظ ''بین'' اضداد میں سے ہے' اس کا معنی ''وصل'' بھی آتا ہے اور ''فرق'' بھی۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں ''اصلاح ذات البین کا مطلب ہے ''اصلاح احوال بینکم'' یعنی باہمی احوال الفت ومحبت اور اتفاق کی اصلاح جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿والله عليم بذات الصدور﴾ [آل عمران ١٥٤] ''ذات الصدر'' سے ''مضمرات الصدور'' (سینہ کی پوشیدہ باتیں) اور ''احوال'' کی چونکہ ''بین'' کے ساتھ ملابست تھی اس لئے اس کو ''ذات البین'' سے تعبیر فرمایا' جیسا کہ عرب کا یہ قول ہے: اسقنی ذا اناء ك سے ان کی مراد برتن میں موجود مشروب ہوتا ہے۔ صاحب کشاف نے اس آیت مبارکہ: [و أصلحوا ذات بينكم] [الانفال - ١] کے تحت اسی طرح کلام کیا ہے۔ اھ۔

قوله: وفساد ذات البين هي الحالقه :

کلام سابق ’’صلاح ذات البین‘‘ کی قوت وطاقت کے بارے میں تھا جو ایک خصلت صادقہ تھی' یہاں سے اس کی برعکس خصلت کا بیان ہے۔ کہ ’’فساد ذات البین‘‘ اعمال کے بدلہ اور بھلائیوں کو مٹا دیتا ہے' زائل کر دیتا ہے' اس فعل کی نحوست تحصیل طاعات وعادات سے مانع بن جاتی ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ’’خالقۃ‘‘ ماخوذ ہے: حلق بعضهم بعضا سے جس کا معنی ہے ایک دوسرے کو ہلاک کرنا' چنانچہ "کالقه" بمعنی مهلكة ہے۔ النھایۃ میں لکھتے ہیں: هي الخصلة التي من شأنها أن تحلق۔ یعنی یہ ایسی خصلت ہے جو ہلاک کر دیتی ہے اور دین کو جڑ سے پکڑتی ہے جس طرح استرا باتوں کو جڑ سے پکڑتا ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ فی قطیعة الرحم والتظالم۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس حدیث میں اصلاح ذات البین' اور اجتناب عن فساد البین پر ابھارا گیا ہے اور ترغیب دی گئی ہے۔ چونکہ ’’اصلاح‘‘ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے اور مسلمانوں کے درمیان عدم تفرقہ کا باعث وسبب ہے' اس کا برخلاف ’’فساد ذات البین‘‘ دین میں رخنہ ہے دین کا ضیاع ہے پس جو شخص اصلاح ذات البین کو اختیار کرے گا' "فساد ذات البين" کو ختم کرے گا وہ ایسا درجہ پا جائے گا جو اس روزہ دار' تہجد گزار کے درجہ سے بڑھ کر ہو گا جو اپنی ذات میں مشغول ہو۔ پس اس بنیاد پر مناسب ہے کہ صلاۃ وصوم کو اطلاق پر محمول کیا جائے اور ’’حالقۃ‘‘ کو ’’ما يحتاج اليه امر الدين‘‘ پر محمول کیا جائے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ نیز امام ترمذی فرماتے ہیں:

ويروى عن النبى ﷺ: قال: هي الحالقة لا اقول تحلق الشعر ولكن تحلق الدين اھ۔ اس معنی میں بہت سی احادیث مروی ہیں، چنانچہ امام میرک امام منذریؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

عن ابى هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: مامن عمل شئى أفضل من الصلاة واصلاح ذات البين۔ (رواہ اصبہانی) عبد اللہ بن عمرو سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: أفضل الصدقة اصلاح ذات بين۔ اس حدیث کو طبرانی اور بزار نے نقل کیا ہے' اس کی سند میں عبد الرحمٰن بن زیادہ بن انعم ہے' ان کی یہ حدیث حسن ہے۔ ابو داؤد اور ترمذی کی اس حدیث کی وجہ سے جو ابو الدرداء اور ابو ایوب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: يا أبا أيوب ألا أدلك على صدقه يحب الله موضعها۔ قلت: بلى يا رسول الله بأبى انت وأمى قال: تصلح بين الناس فانها صدقة يحب الله موضعها۔ وهو حديث غريب جدًا (رواہ الاصبہانی) ان کی ایک روایت اور طبرانی کی روایت میں یوں ہے: الا ذلك على صدقه يحبها الله ورسوله تصلح بين الناس اذا تغاضبوا و تفاسد۔ اور بزار اور بزار کی ایک روایت میں ہے: الا اذلك على عمل يرضا الله ورسوله قال: من اصلح بين الناس أصلح الله امره واعطاه بكل كلمة بها عتق رقبة ورجع مغفور اله ماتقدم من ذنبه (رواہ اصبہانی) یہ حدیث بہت ہی غریب ہے۔

حسد وبغض دین کو مونڈتے ہیں

۵۰۳۹: وَعَنِ الزُّبَيْرِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَبَّ اِلَيْكُم دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَكُمُ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ۔ (رواہ احمد والترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٤/٥٧٣ الحديث رقم ٢٥١٠، واحمد في المسند ١/١٦٧۔

ترجمہ: حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری طرف پہلی امتوں کی بیماریاں سرایت کر رہی ہیں یعنی حسد اور بغض اور یہ مونڈنے والا ہے میں نہیں کہتا کہ یہ بالوں کو مونڈتا ہے بلکہ یہ دین کو مونڈ دیتا ہے۔
(احمد، ترمذی)

تشریح: قوله: دب عليكم داء الامم قبلكم :الحسد والبغضاء:

دب: دال مہملہ کے فتحہ اور باء موحدہ کی تشدید کے ساتھ۔

الحسد والبغضاء: یہ دونوں اسم "داء" سے بدل یا بیان ہونے کی وجہ سے مرفوع ہیں۔

قوله: هي الحالقة 'لا أقول :تحلق الشعرولكن تحلق الدين: هي الحالقة: ضمیر کا مرجع" البغضاء" ہے، چونکہ معنی ومبنی کے اعتبار سے وہ اقرب ہے۔ یا" الحسد والبغضاء " دونوں ہیں۔ حسد کو مقدم کیا چونکہ یہ مفضی الی الثانی (یعنی البغضاء) ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ یہ خصلت دین کو مٹا ڈالتی ہے، جیسا کہ استرا بالوں کا صفایا کر ڈالتا ہے، اور ضمیر مؤنث "بغضاء" کی طرف راجع ہے۔ جیسا کہ ان آیات میں: ﴿والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها﴾ [التوبة۔٣٤] اور ﴿واستعينوا بالصبر والصلوٰة وانها لكبيرة﴾ [البقرة۔٤٥] بعض مفسرین نے ھاء ضمیر کے مرجع کے بارے میں کہا ہے۔ اور" بغضاء "دین کے بگاڑ میں زیادہ بڑھ کر ہے، اگرچہ بعض افراد میں یہ حسد کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔

تخریج: جامع صغیر میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام احمدؒ، ترمذی، اور ضیاء نے بحوالہ حضرت زبیر بن عوامؓ ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

دب اليكم داء الأمم قبلكم الحسد البغضاء، والبغضاء هي الحالقة حالقة الدين لا حالقة الشعر، والذى نفس محمد بيده لا تدخلوا الجنة حتى تؤمنوا، ولا تؤمنوا حتى تحابوا، أفلا أنبئكم بشيء اذا فعلتموه تحاببتم؟ افشوا السلام بينكم

اسنادی حیثیت: امام منذریؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام احمد اور بزار نے صحیح جید سند کے ساتھ روایت کیا ہے، اور بیہقی وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے۔ (نقله ميرك)

حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے

۵۰۴۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔ (رواه ابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد في السنن ٥/٢٠٨ الحديث رقم ٤٩٠٣۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حسد سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو کیونکہ حسد

نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح لکڑیوں کو آگ کھا جاتی ہے۔ (ابوداؤد)

تشریح: حدیث کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ جس طرح آگ اور لکڑی کا معاملہ ہے کہ آگ لکڑی کو جلا کر اس کا وجود مٹا دیتی ہے۔ اسی طرح حسد وہ خصلت ہے جو انسان کو اپنی گرفت میں لے کر اس کی نیکیوں کو مٹا دیتا ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں ''معتزلہ'' اس حدیث کو اپنے مسلک کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ ارتکاب معصیت' عمل صالح کو باطل کر دیتا ہے (برائیاں نیکیوں کو مٹا دیتی ہیں کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو اس کے اچھے اعمال محض اس گناہ کے ارتکاب سے ملیا میٹ ہو جاتے ہیں اور برائی کا خاصہ یہ ہے کہ وہ پچھلی نیکیوں کو ختم کر ڈالتی ہے۔ لیکن ہم سنت والجماعت ان کا کہنا یہ ہے کہ برائیوں سے نیکیاں ختم نہیں ہوتیں البتہ نیکیوں کا خاصہ یہ ضرور ہے کہ وہ برائیوں کو مٹا دیتی ہیں جیسا کہ فرمایا گیا ہے اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں) معتزلہ وغیرہ کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ نیکیوں کو کھا جانے سے مراد یہ ہے کہ حسد' حاسد کو محسود کا مال تلف کرنے اس کی زندگی تباہ کرنے اور اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچانے پر اکساتا ہے اگر حاسد ان چیزوں کو عملاً پورا نہیں کرتا تو وہ ان باتوں کا ارادہ ورجحان ضرور رکھتا ہے اور کچھ نہیں تو غیبت وغیرہ کے ذریعہ ان کی عزت وآبرو کو نقصان پہنچاتا ہے۔ لہٰذا حسد کی سزا یہ ملے گی کہ قیامت کے دن حاسد کی نیکیاں محسود کو دے دی جائیں گی اور یہ محسود ان کے حقوق کا بدلہ ہوگا جو حاسد اپنی گردن پر لے کر اس دنیا سے جائے گا۔

جہاں تک اس حدیث سے معتزلہ کے استدلال کا سوال ہے تو اہل سنت والجماعت کی طرف سے کہا جاتا ہے اس ارشاد گرامی میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے تو اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ حسد نیکیوں کے حسن وکمال کو زائل کر دیتا ہے جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: الحسد يفسد الايمان كما يفسد الصبر العسل یعنی حسد ایمان میں فتور پیدا کر دیتا ہے جس طرح ایلوا شہد کو بدمزہ کر دیتا ہے۔ اس حدیث میں وہ بات صراحتاً موجود ہے جو ہم نے کہی کہ حسد کمال ایمان اور دیگر نیکیوں کو خراب کر دیتا ہے' اور بے کار کر دیتا ہے' اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ یکبارگی سب نیکیاں لے جاتا ہے اور ان کو فناء کر دیتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ حدیث میں مضاف محذوف مانا جائے۔ اس تاویل کی موافقت اس تشبیہ سے بھی ہو رہی ہے کہ آگ ایندھن کا نور لیتی ہے اور ایندھن کی اصل کو یعنی راکھ چھوڑ دیتی ہے۔ لہٰذا یہ حدیث اس آیت مبارکہ کے معارض نہیں: [ا ن الحسنات يذهبن اليسئات] [هود۔ ۱۱۴]۔ میرے دل کو ایک بات سوجھی ہے۔ واللہ اعلم بالحال۔ کہ ممکن ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہو: **ان الحسد يأكل حسنات المحسود الى صاحب الحسد۔ یعنی انها لا تؤثر فيه ولا تغيره ولا يوجد لها قدر عنده كما تأكل النار الحطب۔** چنانچہ اس میں تنبیہ ہے کہ حاسد کے ساتھ احسان کرنا نافع نہیں ہے' اس کا تقرب ضائع ہے۔

جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ میری اُمت میں حقیقی مفلس شخص وہ ہے جو قیامت کے دن (اپنے نامۂ اعمال میں) نماز روزہ زکوٰۃ اور شب بیداری (کا ثواب) لئے ہوئے آئے گا لیکن اس کی حالت یہ ہوگی کہ اس نے (دنیا میں) کسی کو گالی دی ہوگی' کسی پر زنا کا بہتان لگایا ہوگا کسی کا مال کھایا ہوگا کسی کا خون کیا ہوگا اور کسی کو مارا پیٹا ہوگا۔ لہٰذا اس کی تمام نیکیاں (جو [illegible] زکوٰۃ اور شب بیداری جیسی صورتوں میں ہوں گی) ان لوگوں کو دے دی جائیں گی جن پر اس نے (گالی اور بہتان

وغیرہ کے ذریعہ) زیادتی کی ہوگی لہٰذا مذکورہ بالا حدیث میں نیکیوں کے مٹائے جانے سے یہی مراد ہے یعنی قیامت کے دن اپنی نیکیوں سے محروم ہو جانا نہ کہ ان نیکیوں کو دیوانِ اعمال میں سے مٹا دینا اور ختم کر دینا مراد ہے۔ یہ مراد یوں بھی صحیح نہیں ہوگی کہ اگر کسی کی نیکیوں کو یہیں مٹا دیا جائے اور ان کو دیوانِ اعمال میں سے محو کر دیا جائے تو پھر وہ وہاں (قیامت کے دن) کن اعمال کے ساتھ آئے گا۔ درآنحالیکہ حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جس شخص نے دنیا میں جو اعمال کئے ہوں گے وہ قیامت کے دن انہی اعمال کے ساتھ میدانِ حشر میں حاضر ہوگا۔

تورپشتی رحمہ اللہ نے دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ ہر بندہ اپنی دینی استعداد وصلاحیت کے مطابق اپنی نیکیوں میں اضافہ کرتا ہے اور اس کے نامہ اعمال میں ثواب کی تعداد بڑھتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب بندہ خطاؤں کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے اعمال کا ثواب کم ہو جاتا ہے مثلاً فرض کریں کہ کوئی ظالم نیکی کرتا ہے تو اس کو اس پر دس گناہ اجر دیا جائے گا اور وہ ظالم نہ ہوتا تو اس کو اس کی نیکی کا ثواب بڑھا چڑھا کر کئی گنا کر دیا جاتا۔ پس یہاں پر احباط سے مراد یہ ہے یعنی تضعیف میں ہونے والی وہ کمی جو گناہ کے ارتکاب کے سبب سے ہے۔ اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حسنات بواسطہ حسد کے قبول نہیں کی جاتیں چونکہ نیکیاں حسد کی وجہ سے بے کار ہو جاتی ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ دونوں معنی قریب قریب ہیں۔ مزید یہ کہ نفی قبول کے مضمون پر مشتمل روایات، نفی کمال پر محمول ہیں اور اس طرح اللہ جل شانہ کا یہ فرمان: [انما يتقبل الله من المتقين] [المائدة-٢٧] بھی اہل السنت والجماعت کے ہاں اسی طرح ہے۔ اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ حسد، حاسد کو اچھی بات سے ہٹا کر گویا ان نیکیوں سے محروم رکھتا ہے جو اس کو بری خصلت سے اجتناب کی صورت میں حاصل ہوتیں۔

حسد ہر عداوت سے بڑھ کر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ﴾ [فصلت-٣٤] ''اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی تو (سخت کلامی کا) ایسے طریق سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی گویا وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے''۔

کسی کا کہنا ہے: ؎

کل العداوة قد يرجى ازالتها

الا عداوة من عاداك من حسد

''ہر عداوت کے ازالہ کی امید کی جا سکتی ہے، سوائے اس شخص کی عداوت کے جو تجھ سے حسد کے باعث دشمنی رکھتا ہے۔''

توضیح: امام ابوداؤد نے اس حدیث کو ابراهيم بن اسيد عن جده عن ابي هريرة کے طریق سے روایت کیا ہے۔ اور جد ابراہیم کا نام ذکر نہیں کیا۔ حدیث، کے اس راوی ابراہیم کا تذکرہ امام بخاریؒ نے ''التاريخ الكبير'' میں کیا ہے، اور ان سے یہ حدیث بھی نقل کی ہے۔ اور فرمایا: صحیح نہیں ہے۔ (كذا ذكره الشيخ الجزري) امام میرکؒ فرماتے ہیں: لیکن اس کا ایک شاہد ہے جو حضرت انسؓ سے مرفوعاً مروی ہے: الحسد يأكل الحسنات كما تاكل النار الحطب اس کو ابن ماجہ اور بیہقیؒ نے روایت کیا ہے۔

عرضِ مرتب:

مرقاۃ کے تحتانی متن میں یہ حدیث موجود نہیں ہے۔ مرقات کے محشی لکھتے ہیں: **هذا الحديث ناقص من الشرح وأثبتناه من المشكاة......**

اپنے کو رشتہ داری کے فساد سے بچاؤ

۵۰۴۱: وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِيَّاكُمْ وَسُوْءَ ذَاتِ الْبَيْنِ فَاِنَّهَا الْحَالِقَةُ۔

(رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥٧٢/٤ الحديث رقم ٢٥٠٨۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنے آپ کو رشتہ داری میں فساد سے بچاؤ اس لیے کہ یہ چیز مونڈھنے والی ہے۔ (ترمذی)

جس نے کسی کو نقصان پہنچایا وہ بدلہ پائے گا

۵۰۴۲: وَعَنْ اَبِیْ صِرْمَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ مَنْ ضَارَّ ضَارَّ اللّٰهُ بِهٖ وَمَنْ شَاقَّ شَاقَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ۔

(رواه ابن ماجة والترمذی وقال هذا حديث غريب)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤٩/٤ الحديث رقم ٣٦٣٥، والترمذی فی السنن ٢٩٣/٤ الحديث رقم ١٩٤٠ و ابن ماجه فی ٧٨٥/٢ الحديث رقم ٢٣٤٢، واحمد فی المسند ٤٥٣/٣۔

ترجمہ: حضرت ابوصرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جس نے کسی کو نقصان پہنچایا اللہ اس کے بدلے میں اس کو نقصان پہنچائے گا اور جس نے کسی کی مخالفت کی یا کسی کو مشقت و تکلیف میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ اس کو مشقت و تکلیف میں ڈالیں گے۔ (ابن ماجہ) اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله: من ضار رضار الله به: ایک روایت میں "من ضار" کے بعد "مؤمنا" کا اضافہ بھی ہے۔ من ضار ضار اللّٰه به اس کلام میں ایک قسم کی مشاکلت و مقابلہ ہے۔

قوله: ومن شاق شاق الله عليه:

یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص پر اپنا عقاب نازل فرمائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ومن يشاق اللّٰه فان اللّٰه شديد العقاب﴾ [الحشر۔٤] مومن کی جگہ اپنی ذات اقدس کا ذکر کرنا درحقیقت مؤمن کے علو درجات کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ومن يشا اللّٰه رسوله﴾ [الانفال۔١٣] اور ایک اور جگہ فرمایا: ﴿ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ما تولى ونصله جهنم﴾ [النساء۔١١٥]

"مشاقه" تنازع کرنے والے دو افراد کے درمیان ہوتا ہے، بایں طور کہ ان میں سے ایک شخص ایک شق کو اختیار کئے

ہوئے ہوتا ہے، اور دوسری شق کو چھوڑے ہوئے ہوتا ہے، یا ایک شق میں اپنے مقابل سے دور ہوتا ہے، یا ان دونوں میں سے ہر شخص دوسرے کی شق کو اختیار کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ لفظ "شاق" "شق بکسر الشین بمعنیٰ 'المشقہ" سے ماخوذ ہے۔ یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی اسی قبیل سے ہے: ﴿الا بشق الأنفس﴾ [النحل۔۷]

یا شق بمعنیٰ "نصف شئے" سے ماخوذ ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: اتقوا النار ولو بشق تمرۃ، تو گویا کہ تنازع کرنے والے دونوں شخص پہلے مجتمع تھے، اب نصف نصف ہوگئے۔ یا "شق" بفتح الشین سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے: فصل فی الشیء ای الفرق۔ بعض کا کہنا ہے کہ ضرر و مشقت متقارب ہیں، لیکن ضرر کا استعمال اتلاف مال کے موقع پر ہوتا ہے، اور مشقت کا اطلاق بدنی اذیت رسانی پر ہوتا ہے، جیسا کہ کسی عمل شاق کی تکلیف۔ اھ۔

اور اظہر یہ ہے کہ "ضرر" بدنی، مالی، دنیاوی و اخروی سب کو شامل ہے۔ اور "مشاقہ" اس مخالفت کو کہتے ہیں، جو "مفضی الی المنازعۃ والمحاربۃ" ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

جامع الاصول میں ہے: المضارۃ المضرۃ والمشقۃ النزاع، فمن أضر غیرہ تعدیا او شاقہ ظلما بغیر حق فان اللّٰہ یجازیہ علی فعلہ بمثلہ اھ۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ دونوں ہم معنی ہیں۔ اور ثانی اول کی تاکید ہے، اور چونکہ ہماری تحقیق مفید تاسیس و تقیید ہے لہٰذا ہماری تحقیق اولیٰ ہے، اور امام طیبی رحمہ اللہ کا یہ کہنا: ویجوز ان یحمل علی المشقۃ ایضًا بأن کلف صاحبہ فوق طاقتہ فیقع فی التعب والمشقۃ" بھی مضرت میں داخل ہے۔

توضیح و تخریج: "التصحیح" میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام ابن ماجہ، ترمذی، ابوداؤد اور امام نسائی نے بھی ذکر کیا ہے۔ امام ترمذی کا کہنا ہے کہ یہ حدیث "حسن غریب" ہے۔ (ذکرہ میرك)

اور الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: من ضار ضر اللّٰہ بہ ومن شاق شق اللّٰہ علیہ اس حدیث کو امام احمد، اور اصحاب کتب اربعہ نے ابوصرمہ سے روایت کیا ہے۔

مسلمان سے مکر و فریب کرنے والا ملعون ہے

۵۰۴۳: وَعَنْ اَبِیْ بَکْرِ الصِّدِّیْقِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَلْعُوْنٌ مَنْ ضَارَّ مُؤْمِنًا اَوْمَکَرَ بِہٖ۔

(رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

أخرجہ الترمذی فی السنن ۲۹۳/۴ الحدیث رقم۔

ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص ملعون ہے جو کسی مسلمان کو ضرر پہنچائے یا اس کے ساتھ مکر و فریب کرے اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو خواہ ظاہری طور پر ضرر و نقصان پہنچائے، خواہ پوشیدہ طور پر نقصان پہنچائے وہ خیر سے دور ہے۔

توضیح: صاحب "التصحیح" لکھتے ہیں: اس حدیث کی سند کے راوی ابو سلمہ کندی کا فرقد سنجی سے روایت کرنا معروف نہیں ہے۔ ابن معین نے ان کی توثیق اور دیگر حضرات نے ان کی تضعیف کی ہے۔ (ذكره ميرك)

عیب کا متلاشی خود ہی رُسوا ہو گا

۵۰۴۴: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَعِدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمِنْبَرَ فَنَادٰى بِصَوْتٍ رَفِيْعٍ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ مَنْ اَسْلَمَ بِلِسَانِهٖ وَلَمْ يُفْضِ الْاِيْمَانُ اِلٰى قَلْبِهٖ لَا تُؤْذُوا الْمُسْلِمِيْنَ وَلَا تُعَيِّرُوْهُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِهِمْ فَاِنَّهٗ مَنْ يَّتَّبِعْ عَوْرَةَ اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ يَتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ وَمَنْ يَّتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ يَفْضَحْهُ وَلَوْ فِيْ جَوْفِ رَحْلِهٖ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ١٩٤/٥ الحديث رقم ٤٨٨٠، والترمذی فی السنن ٣٣١/٤ الحديث رقم ٢٠٣٢، واحمد فی المسند ٤٢١/٤۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوئے اور بلند آواز سے یہ بات فرمائی اے وہ گروہ جو فقط اپنی زبان سے ایمان لائے ہو اور ابھی ان کے دل میں ایمان نہیں پہنچا مسلمانوں کو ایذاء مت پہنچاؤ نہ انہیں عار دلاؤ اور نہ ان کے عیوب کو تلاش کرتے پھرو اس لیے کہ جو آدمی اپنے مسلمان بھائی کے عیب تلاش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا عیب تلاش فرمائیں گے اور جس کے عیب اللہ تلاش فرمائیں گے تو اس کو رسوا کر ڈالتے ہیں اگرچہ وہ اپنے گھر یا کجاوے میں ہو۔

تشریح: قوله: صعد رسول الله ﷺ المنبرفنادی بصوت رفيع فقال: "صعد": عین کے کسرہ کے ساتھ "رفیع" بمعنی "عالی" ہے۔ "فقال" یہ بیان ہے "فنادی" کا۔

قوله: یا معشر من أسلم بلسانه ولم یفض الایمان الی قلبه۔ولم یفض: "افضاء" (باب افعال کا مصدر) سے ماخوذ ہے۔ اس خطاب میں مؤمن اور منافق دونوں شامل ہیں۔ جن کے دل تک ایمان نہیں پہنچا ہے سے مراد یہ ہے کہ جن کا دل اصل ایمان یا کمال ایمان کے نور سے منور نہیں ہوا ہے"۔ اس خطاب میں فاسق کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ بات اس لئے بھی زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ارشاد گرامی میں آگے یہ فرمایا گیا ہے "جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے عیب تلاش کرتا ہے" (تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب تمام مسلمانوں سے تھا خواہ وہ کامل مسلمان ہوں یا منافق اور یا فاسق!) اگر خطاب صرف منافقین سے ہوتا تو چونکہ مسلمان اور منافق کے درمیان اخوۃ یعنی بھائی چارہ نہیں ہے (اس لئے اس ارشاد گرامی میں "اپنے مسلمان بھائی" کا لفظ استعمال نہ کیا جاتا) لہٰذا طیبی رحمہ اللہ کا اس حدیث کے حکم کو منافق میں منحصر ماننا (کہ ارشاد گرامی کا مخاطب صرف منافقین کو قرار دیا) ظاہر مفہوم کے خلاف ہے۔ یہاں حکم بالکل عام ہے۔ واللہ اعلم۔

قوله: ولا تعیروهم تعیروا: "تعییر" سے مشتق اس کا معنی ہے: توبیخ (سرزنش کرنا، جھڑکنا، ملامت کرنا، عار دلانا، دھمکانا) والتعییب (عیب کی نسبت کرنا، عیب دار بتلانا، عار کی طرف نسبت کرنا فعل کی برائی بیان کرنا) ان کو عار نہ دلاؤ کا

مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کو اس کے اس گناہ پر طعن و تشنیع نہ کرو جو کبھی پہلے اس سے صادر ہوا ہو' خواہ اس گناہ سے اس کا توبہ کرنا تمہیں معلوم ہو یا نہ ہو' البتہ اگر کوئی شخص کسی گناہ کے ارتکاب کی حالت میں ہو یا وہ کوئی گناہ کر چکا ہو اور وہ گناہ اس کے توبہ کرنے سے پہلے علم میں آ گیا ہو تو اس صورت میں اس کو اس گناہ پر طعن و تشنیع اور تنبیہ کرنا اس شخص پر واجب ہوگا جو اس پر قادر ہو اور بعض مرتبہ وہ گناہ مستوجب حد و تعزیر ہوتا ہے۔ (یعنی اگر وہ گناہ قابل حد و تعزیر ہو تو اس پر حد اور تعزیر بھی جاری کرنا (قاضی و حاکم پر) واجب ہوگا۔) گویا اس صورت میں یہ عمل ''عار دلانے'' کے قبیل سے نہیں ہوگا بلکہ اس کا شمار امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کے باب سے ہوگا۔

قولہ: ولا تتبعوا عوراتهم فانه من يتبع الخ: یعنی تم کسی مسلمان کے جن عیوب کو نہیں جانتے اس کی ٹوہ مت لگاؤ اور اس کے جو عیوب تمہارے علم میں آ گئے ہیں ان کو دوسروں کے سامنے ظاہر نہ کرو۔ اس سے ثابت ہوا کہ کسی مسلمان (جو فاسق نہ ہو) کے عیوب کی ٹوہ میں رہنے یا اس کے جو عیوب اپنے علم میں ہوں ان کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنے سے اجتناب کرنا واجب ہے اور جو شخص ایسا کرے (یعنی کسی مسلمان کی عیب جوئی کرے یا کسی مسلمان کے عیوب کو دوسروں کے سامنے بیان کرتا پھرے) اس سے خود بھی کنارہ کشی اختیار کرنا اور دوسروں کو بھی اس سے دور رکھنا واجب ہے۔

جو شخص اس دنیا میں کسی مسلمان کی عیب جوئی کرتا ہے یا کسی مسلمان کے عیوب کو دوسروں کے سامنے بیان کر کے اس کی رسوائی کراتا ہے اس کو جان لینا چاہئے کہ آخرت میں اس کے ساتھ بھی ایسا معاملہ ہوگا۔ بایں طور کہ اللہ تعالیٰ وہاں اس کے عیوب سے درگزر کرنے کے بجائے اس کی ایک ایک برائی پر نظر رکھے گا اور اس کے تمام عیوب کو مخلوق کے سامنے ظاہر کرے گا تا کہ جس طرح اس نے اپنے ایک مسلمان بھائی کو دنیا میں رسوا کیا تھا اسی طرح آخرت میں وہ خود رسوا ہو اور ظاہر ہے کہ آخرت کی رسوائی دنیا کی رسوائی سے کہیں زیادہ ہوگی۔ اور دنیا میں اللہ تعالیٰ اس شخص کو ایسے رسوا کرے گا کہ خواہ یہ شخص اپنے گھر کے بیچوں بیچ' لوگوں سے چھپ کر ہی کیوں نہ بیٹھا ہو' اللہ اس کو رسوا کر دے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [**ان الذين يحبون أن تشيع الفاحشة في الذين آمنوا لهم عذاب اليهم في الدنيا والآخرة والله يعلم وأنتم لاتعلمون**] [النور-١٩]

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ عیب جوئی وہ خصلت ہے جو دراصل مسلمان کے ساتھ بدگمانی رکھنے کا ثمرہ ہے۔ دل ظنی بات پر قناعت نہیں کرتا' اور تحقیق طلب کرتا ہے۔ چنانچہ یہ چیز اس کو پردہ دری تک لے جاتی ہے (شریعت نے کسی مسلمان کے عیوب کی پردہ پوشی کا جو حکم دیا ہے) اس کی حد یہ ہے کہ (اگر کسی کے پڑوس میں ایسا مکان ہو جہاں شغل مے نوشی ہوتا ہو اور راگ رنگ کی مجلسیں جمتی ہوں' تو) اس شخص کو چاہئے کہ وہ خود اپنے مکان کا دروازہ بند کرے (تا کہ اس کی نظر مکان میں ہونے والے غیر شرعی امور تک نہ جا سکے اس کے گھر کے لوگوں کی بدکاریاں اس کے علم میں نہ آ سکیں) نیز اس شخص کے مکان اور مذکورہ مکان کے درمیان جو دیوار حائل ہو اس سے کان لگا کر چوری چھپے اس آواز کو سننا جائز نہیں۔ جو اس مکان میں گانے بجانے اور راگ رنگ وغیرہ کے ذریعہ پیدا ہو رہی ہو اور نہ یہ جائز ہے کہ اس برائی کو دیکھنے کے لئے اس شخص کے گھر میں گھسا جائے۔ ہاں اگر اس مکان کے مکین اپنے افعال بد کو خود ظاہر کر رہے ہوں جیسے وہ اتنی بلند آواز میں گانا بجانا کر رہے ہوں کہ باہر تک آواز آ رہی ہو یا شرابی لوگ آپس میں شرابیوں جیسا شور و شغب کر رہے ہوں اور ان کی آواز ان کے شغل مے نوشی بھی ان تک ظاہر کر رہی ہو تو یہ

دوسری بات ہے۔ (اسی طرح اگر وہ شخص ان کی ٹوہ لینے کے مقصد کے بغیر یونہی اس گھر میں چلا جائے اور وہ لوگ شغل مے نوشی یا گانا بجانا موقوف کر کے) شراب کے برتن اور گانے بجانے کی چیزیں اپنے دامن وغیرہ کے نیچے چھپا لیں تو اس شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ ان کے دامن وغیرہ ہٹوا کر ان چیزوں کو دیکھنے کی کوشش کرے اس طرح شراب کی بو کی ٹوہ میں منہ وغیرہ سونگھنا بھی جائز نہیں ہوگا اور نہ یہ جائز ہوگا اپنے پڑوسیوں سے دریافت کرتا پھرے کہ اس کے مکان میں کیا کیا ہوتا ہے اسی مفہوم کو کسی نے شعر میں کہا ہے:

لا تلتمس من مساوی الناس ما ستروا
فیهتك الله سترا عن مساویكا
واذكر محاسن ما فیهم اذا ذكروا
ولا تعب أحدا بما فیكا

لوگوں کی ان برائیوں کی ٹوہ میں مت لگ کہ جس کو لوگوں نے چھپایا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ تیری برائیوں پر پڑا پردہ چاک کر دے۔ جب لوگوں کا ذکر کیا جائے، تو ان میں موجود محاسن کا ذکر کر۔ اور ان لوگوں کی بابت بھی ایسا عیب مت بیان کر جو تجھ میں ہے۔

حدیث کے الفاظ :ولم یفض الایمان الی قلبه (اور ان کے دل تک ایمان نہیں پہنچا ہے) میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب تک ایمان کا نور دل کو روشن نہیں کر دیتا اس وقت تک نہ اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور نہ اس کے حقوق ادا ہوتے ہیں اور یہ کہ قلب کے تمام روحانی امراض کا علاج اللہ کی معرفت اور اس کے حقوق کو ادا کرنے پر موقوف ہے چنانچہ جو شخص اللہ کی معرفت حاصل کر لیتا ہے اور اس کے حقوق کو ادا کرتا ہے تو وہ نہ کسی کو تکلیف پہنچاتا ہے اور نہ کسی کو نقصان وضرر میں مبتلا کرتا ہے نہ کسی کو عار دلاتا ہے اور نہ کسی کے احوال و کردار کی کمزوریوں اور اس کے عیوب کی تلاش و جستجو میں رہتا ہے۔ (انتهى كلام الامام وحصل تمام المرام)

لا تتبعوا: باب افتعال سے ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ تجسس مت کرو۔

فانه: ضمیر شان ہے۔

یتبع: مجزوم ہے اور تاء مشدد ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ مرفوع ہے۔ اور مشائخ کے سامنے پڑھے گئے بعض نسخوں میں باب تفعل سے صیغہ ماضی معلوم ضبط کیا گیا ہے۔ یہاں بھی اور اگلے دونوں مقامات پر بھی۔

یفضحه: از باب منع ہے۔

توضیح: امام میرک نقل فرماتے ہیں کہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے۔

بدترین سود

۵۰۴۵: وَعَنْ سَعِيدِ بْنِ زَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ مِنْ اَرْبَى الرِّبٰو الْاِسْتِطَالَةَ فِي

عِرْضِ الْمُسْلِمِ بِغَيْرِ حَقٍّ۔ (رواه ابوداؤد والبيهقي في شعب الايمان)

أخرجه ابوداؤد في السنن ١٩٣/٥ الحديث رقم ٤٨٧٦، واحمد في المسند ١٩٠/١، والبيهقي في شعب الايمان ٣٩٥/٤ الحديث رقم ٥٥٢١ اخرجه عن ابي هريرة وعن انس ۔

ترجمہ: حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے بدترین سود یہ ہے کہ کسی مسلمان بھائی کی عزت میں ناحق دست درازی کرے۔ (ابوداؤد' بیہقی)

تشریح: "اسطالة" کے اصل معنی ہیں لوگوں کو حقیر جاننا اور ان پر اپنی بڑائی جتلانا۔

''اصربوا'': لغت میں ''ربو'' کے معنی ہیں زیادہ ہونا' بڑھنا۔ اور اصطلاح شریعت میں اس کا جو مفہوم ہے وہ معروف ہے کتب فقہ میں مذکور ہے اور اس کی انواع محرمہ کا بیان بھی مذکور ہے کسی کی آبروریزی کے لئے زبان درازی کو ''ربوا'' کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور پھر اس کو ''اربی'' کہا گیا ہے کیونکہ ارباب کمال کے نزدیک عزت وآبرو مال وزر سے زیادہ قیمتی اور عزیز ہے (اور مال وزر کی بہ نسبت عزت وآبرو کا نقصان زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ سخت ہوتا ہے۔) ارباب کمال کے نزدیک عزت مال سے قیمتی ہے۔

اصون عرضي لمالي لا أدنسه
لا بارك الله بعد العرض في المال

''میں اپنے مال کے ذریعے اپنی عزت کی حفاظت کرتا ہوں، اپنی عزت کو خاک آلود نہیں کرتا۔ عزت (چلی جانے) کے بعد اللہ مال میں برکت نہ دے۔''

قولہ: بغیر حق: امام تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ ''ناحق'' کی قید میں ''تنبیہ'' ہے کہ بعض صورتوں میں ایسی بات کہنا کہ جس سے عزت وآبرو مجروح ہوتی ہو' مباح ہے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: لَيُّ الواجد يحل عرضه۔ (کسی شخص پر کسی شخص کا کوئی حق (جیسے قرض وغیرہ ہو اور وہ اس حق کو ادا نہ کر رہا ہو تو) صاحب حق کو اجازت ہے کہ وہ اس شخص کے بات میں کہہ سکتا ہے کہ یہ ظالم ہے' یہ حد سے تجاوز کر رہا ہے' اور اسی جیسی دیگر باتیں۔ اور اسی طرح شاہد پر جرح کرنا بھی جائز ہے۔ (مثلاً کوئی شخص کسی کے حق میں گواہی دے رہا ہو تو اس پر جرح کرنا اور اس گواہ کے عیوب بیان کرنا درست ہے اسی قسم سے راویان حدیث پر جرح کرنا بھی ہے۔ یعنی محدثین کا حدیث کے راویوں کے عیوب ظاہر کرنا بھی درست ہے کیونکہ اس کا مقصد حدیث کی صحت کو محفوظ رکھنا اور دین کی حفاظت کرتا ہوتا ہے۔) اسی طرح لوگوں کو نقصان وفساد سے بچانے کیلئے نکاح کا پیغام دینے والے شخص کی' بدعتیوں کی اور فاسقوں کی برائیوں کو ذکر کرنا بھی درست ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔

تانبے کے ناخنوں سے چہرہ نوچنے والے

۵۰۴۶: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَمَّا عَرَجَ بِیْ رَبِّیْ مَرَرْتُ بِقَوْمٍ لَّهُمْ اَظْفَارٌ مِنْ نُّحَاسٍ

يَخْمِشُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَصُدُوْرَهُمْ فَقُلْتُ مَنْ هٰؤُلَاءِ يَاجِبْرَئِيْلُ قَالَ هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ يَاكُلُوْنَ لُحُوْمَ النَّاسِ وَيَقَعُوْنَ فِيْ اَعْرَاضِهِمْ۔ (رواه ابوداؤد)

أخرجه ابوداوٗد فى السنن ٥/١٩٤ الحديث رقم ٤٨٧٨، واحمد فى المسند ٣/٢٢٤۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے مجھے معراج کرائی تو میرا گزر کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا کہ جن کے ناخن تانبے کے تھے جن سے وہ اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے میں نے جبرئیل سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں تو انہوں نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے اور ان کی آبروریزی کرتے ہیں۔ (ابوداؤد)

عرضِ مرتب:

محشی لکھتے ہیں: مشکاۃ میں عرج بی ربی کے الفاظ ہیں۔اھ۔ مرقات کے تحتانی متن میں لفظ''ربی'' موجود نہیں ہے۔

یخمشون: میم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ چنانچہ مصباح میں لکھتے ہیں: **خمشت المرأة كضرب وجهها بظفر جرحت ظاهر البشرة۔** (چہرہ پر ناخن مار کر خراش لگانا)

تشریح: قوله: لما عرج بى مررت باقوام لهم اظفار من نحاس يخمشون:

حضرت جبرئیل علیہ السلام کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کی غیبت کرتے ہیں ان کے حق میں نازیبا (اور ناشائستہ الفاظ اپنی زبان سے نکالتے ہیں اور اس طرح ان لوگوں کی عزت و آبرو کو پامال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا اپنے چہروں اور سینوں کو کھرونچنا' اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے بھائیوں کی آبروریزی کی اور اس آبروریزی پر خوش ہو کر ان بھائیوں کے سینوں (یعنی دلوں) اور چہروں کو مجروح و مغموم کیا لہٰذا ان کی سزا یہی ہے کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے سینوں اور چہروں کو بھی زخمی کریں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: چہرہ اور سینہ کا نوچنا نوحہ کرنے والی عورتوں کی صفات ہیں۔ غیبت کرنے والے اور مسلمانوں کی عزت کو داغ دار کرنے والے لوگوں کی جزاء بھی یہی بتلائی گئی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہ دونوں صفات مردوں والی نہیں۔ بلکہ یہ دونوں صفات عورتوں کی خصال میں سے بدترین عادات ہیں۔

اسنادی حیثیت: اس حدیث پر امام ابوداؤد اور امام منذریؒ نے سکوت اختیار کیا ہے۔ یہ حدیث سعید بن جبیر سے مرسلاً مروی ہے۔ (ذکرہ میرک)

تخریج: جامع صغیر میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو امام احمد، ابوداؤد اور ضیاء نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔

تین عملوں کی تین سزائیں

۴۰۲۷: وَعَنِ الْمُسْتَوْرِدِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَكَلَ بِرَجُلٍ مُسْلِمٍ اُكْلَةً فَاِنَّ اللّٰهَ يُطْعِمُهُ مِثْلَهَا مِنْ جَهَنَّمَ وَمَنْ كُسِيَ ثَوْبًا بِرَجُلٍ مُسْلِمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَكْسُوْهُ مِثْلَهُ مِنْ جَهَنَّمَ وَمَنْ قَامَ

بِرَجُلٍ مَقَامَ سُمْعَةٍ وَرِيَاءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ يَقُوْمُ لَهٗ مَقَامَ سُمْعَةٍ وَرِيَاءٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواه ابوداؤد)

أخرجه ابوداوٗد في السنن ٥/١٩٥ الحديث رقم ٤٨٨١، واحمد في المسند ٤/٢٢٩۔

ترجمہ:حضرت مستورد رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا کہ جس نے کسی مسلمان کا ایک لقمہ ناحق کھایا تو اللہ تعالیٰ اسی کی مثل دوزخ کا لقمہ اسے کھلائیں گے اور جس نے کسی مسلمان کی غیبت کے عوض کپڑا پہنا اللہ تعالیٰ اسی کی مثل دوزخ کا کپڑا پہنائیں گے اور جو شخص نام ونمود اور ریاکاری کے لئے کھڑا ہوا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے شہرت کی جگہ میں کھڑا کرے گا۔ (ابوداؤد)

تشریح:**قوله:من أكل برجل مسلم أكلة فان الله تعالى يطعمه مثلها من جهنم**:

"اکلة" ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ اس کے معنی "ایک لقمہ" کے ہیں اور ایک نسخہ میں یہ "اکلة" ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ منقول ہے جس کے معنی ہیں "ایک بار کھانا۔ من جهنم: (جار مجرور کے درمیان میں مضاف محذوف ہے۔) ای من نار جهنم او عذابها۔ کسی مسلمان کی آبروریزی کر کے کچھ کھانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی غیبت کے ذریعہ اس پر تہمت لگا کر اس کی آبروریزی کر کے یا دشمن سامنے اس کے کسی دشمن کا ساتھ دیکھ کر اس کو اذیت پہنچاتا ہے تو اللہ اسی شخص کو اس کے فعل کے مثل خواہ اس کا فعل قلیل تھا یا کثیر تھا، جہنم کی آگ کھلائے گا یا عذاب جہنم کھلائے گا۔ صاحب النہایہ نے اس کو مثال سے واضح فرمایا ہے۔ کہ (مثلاً) ایک شخص (زید) ہے جو کسی مسلمان سے عداوت رکھتا ہے اور اس مسلمان کی برائی سن کر بہت خوش ہوتا ہے چنانچہ ایک اور شخص بکر اس کے اس مزاج کو جان کر اس کے پاس جاتا ہے اور ازراہِ خوشامد و چاپلوسی اس کے سامنے اس مسلمان کو برا بھلا کہتا ہے یا اس کے عیوب کو بیان کرتا ہے اور زید اس کی اس حرکت سے خوش ہو کر اس کو روپیہ پیسہ یا کچھ کھانے پینے کے لئے دے دیتا ہے

قوله:ومن كسا ثوبًا برجل مسلم فان الله يكسوه مثله من جهنم:لفظ "کسا" بصیغہ معروف ہے (اوپر ترجمہ میں اسی کا اعتبار کیا گیا ہے) ای ألبس شخصا اور ایک نسخہ میں "کسی" بصیغہ مجہول ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا کہ "جس شخص کو کسی مسلمان کی تحقیر واہانت کرنے کے بدلے میں کپڑا پہنایا جائے"۔ یہ معنی ماقبل کی عبارت کے زیادہ مطابق ہے بعض کا کہنا ہے کہ بصیغہ معروف ہونے کی صورت میں اول کا معنی یوں ہوگا: کسا نفسه ثوبا۔ اور ثانی کا معنی یوں ہوگا: اكتسى ثوبا۔ دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔ (قبل کی عبارت میں من اكل برجل مسلم اكله کو دیکھتے ہوئے ترجمہ یوں ہوگا "اور جو شخص کسی مسلمان کی تحقیر واہانت کرنے کے بدلہ میں اپنے آپ کو کپڑے پہنائے)

قوله:ومن قام برجل مقام سمعة ورياء ......:

"برجل": میں حرف باء تعدیہ کے لئے اور "رجل" سے مراد خود وہی شخص بھی ہوسکتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص بھی! تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نمود ونمائش کی خاطر خود اپنی زبان سے اپنی بڑائیاں بیان کرے اور اپنی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہو یا وہ لوگوں میں اس کی بڑائی شہرات کرائے اور لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے اس کی تعریف وتوصیف کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی برائیاں ظاہر کر کے لوگوں کے درمیان اس کو رسوائی پیدا کرے گا۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: ''برجل'' میں حرف باء تعدیہ کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور سبیت کے لئے بھی! پس اگر تعدیہ کے لئے ہو تو یہ مطلب ہوگا من أقام رجلا مقام سمعة ورياء کہ جو شخص کسی کو سمعہ و ریاء (نمود و نمائش) کے طور پر اس کی پرہیزگاری و دینداری کا ڈنکا پیٹتا پھرے اور اس کے زہد و عبادات اور اس کی بزرگی کو جھوٹی شہرت دے اور اس سے مقصد یہ ہو کہ لوگ اس کے معتقد ہوں اور اس کے حلقہ ارادات میں شامل ہو کر اپنے جان و دل سے اس کی خدمت کیا کریں اور اس کی آڑ میں اپنا جاہ و مال کا فائدہ ہو جیسا کہ بعض بزرگان کے خدام کا شیوہ ہے کہ وہ ان کی شہرت کی آڑ میں اپنے لئے مختلف فوائد حاصل کرتے ہیں۔ ایسے شخص کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کو رسوائی و فضیحت کی جگہ کھڑا کرے گا یعنی فرشتوں کو حکم دے گا کہ اس شخص کے بارے میں اعلان کرو کہ یہ جھوٹا ہے۔

اور اگر حرف باء سبیت کے لئے ہو تو مطلب یہ ہوگا من قام ـــ لأجل أن يعتقد رفيه رجل...... کہ اگر کوئی شخص کسی کی توجہ حاصل کرنے کے لئے خود اپنے آپ کو سمعہ و ریاء کے مقام پر کھڑا کرے یعنی اپنے آپ کو بڑا زاہد و متقی اور نہایت صالح و پاکباز ظاہر کرے تا کہ کوئی صاحب جاہ اور مالدار شخص اس کا معتقد ہو اور وہ اس کے ذریعہ جاہ و مال کی اپنی خواہش و طلب کو پورا کرے۔

قوله: فان الله يقوم له مقام سمعة ورياء يوم القيامة: یہ کنایہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص سے اپنی ناراضگی کے سبب اس کو ذلیل و رسوا کرے گا چنانچہ طبرانی کی روایت میں عبداللہ خزاعی سے مرفوعاً مروی ہے: من قام مقام رياء وسمعةفانه في مقت الله حتى يجلس۔

قوله: فان اللّٰه يىرم له مقام سمعة ورياء يوم القيامة: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ کلام از تہدید سے کنایہ ہے، جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿سنفرغ لكم ايها الثقلان﴾ [الرحمن۔ ۳۱] صاحب کشاف لکھتے ہیں: سنفرغ مستعار من قول الرجل لمن يهدده سافرع لك اى سأتجرد للايقاع بك من كل شيء ما يشغلنى عنه حتى لا يكون لى شعل سواه والمراد التوفر على الكتابة فيه والا نتقام منه

اشرفؒ فرماتے ہیں: '' ومن كسا ثوبا برجل مسلم'' میں موجود باء کو سبت کے لئے قرار دینا صحیح نہیں ہے، پس یہ بات محل کی ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ بات بھی درست نہیں کیونکہ عبارت کی تقدیر یوں ہو جائے گی: ومن كسا ثوبا رجلا مسلما یہ معنی کے اعتبار سے فاسد ہے، چنانچہ اصل توجیہہ وہی ہے جو ہم نے ماقبل میں ذکر کی۔ اور امام طیبیؒ کا یہ کہنا بھی محل نظر ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ''کسا'' دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو، اور یہاں صرف ایک ہی مفعول ہے۔ چنانچہ ضروری ہوگا کہ یہاں ''رجل'' مفعول ثانی ہو۔ وجہ نظر یہ ہے کہ اس میں بھی فساد معنی لازم آتا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ تقدیری عبارت یوں ہو: من كسا نفسه ثوبا برجل

حسن ظن بھی عبادت ہے

۵۰۴۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَةِ۔

(رواہ احمد وابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد في السنن ٥/٢٦٦ الحديث رقم ٤٩٩٣، واحمد في المسند ٢/٤٠٧۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حسن ظن خوبی عبادت ہے۔

(احمد، ابوداؤد)

تشریح: قوله: حسن الظن من حسن العبادة: اس جملہ کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں:

1. حسن الظن بالله من حسن عبادة الله۔ جن اعمال کو عبادت حسنہ کہا جاتا ہے ان میں سے ایک بہترین چیز اور بہترین عبادت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا گمان رکھا جائے لہٰذا ضروری ہے کہ عبادتوں کو ترک نہ کیا جائے۔ بہت سے لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن کا مطلب یہ ہے کہ اگر عبادتیں ترک ہوتی ہیں تو ہونے دو! البتہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد ہونا چاہئے کہ وہ کریم اور غفور ورحیم ہے۔ (جو تارک عبادت کو بھی یقیناً بخش دے گا)

2. آنحضرت ﷺ کے اس ارشادِ گرامی کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے: "بعض حسن العبادة حسن الظن" خبر کو اہتماماً مقدم مان لیا جائے۔ چونکہ سالک جب اللہ جل شانہ کے ساتھ علی سبیل الرجاء حسن ظن رکھتا ہے، تو وہ جلوت وخلوت ہر دو میں اپنے خالق کی عبادت اچھے سے اچھے انداز کے ساتھ کرتا ہے۔ چنانچہ ایسے سالک کی امید ورجاء مستحسن شمار ہوتی ہے، اور قبولیت کی امید ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ان الذين آمنوا والذين هاجروا وجاهدوا في سبيل الله اولئك يرجون رحمة الله﴾ [البقرة۔۲۱۸] جو شخص عبادت کو ترک کرے اور معبود کے ساتھ حسن ظن کا دعویٰ کرے وہ شخص یقیناً مغرور ومردود اور فریب زدہ ہے۔

امام غزالیؒ نے ان دونوں کی مثال یوں بیان کی ہے، کہ ایک شخص نے زراعت کی اور دوسرے نے نہیں کی، اور دونوں کھیتی کے امیدوار ہیں، یہ دوسرا شخص بلاشبہ ظاہر فسادی ہے اور اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔

3. مظہرؒ فرماتے ہیں: مسلمانوں کے حق میں خیر وصلاح کا اعتقاد رکھنا عبادت ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس صورت میں "من" تبعیضیہ ہوگا۔ ای: من جملة عبادة الله والاخلاص فيها حسن المعاشرة مع عباده اور یہ بھی ممکن ہے کہ "من" ابتدائیہ ہو: ای: حسن الظن بعباد الله تعالى ناشيء من حسن عبادة الله اور اس کی تائید اس ارشاد نبوی سے بھی ہوتی ہے: المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده۔ اھ۔

ایک اشکال ہوتا ہے، وہ یہ کہ ایک روایت میں تو یہ آتا ہے: احترسوا من الناس بسوء الظن اس روایت کو ابن عدی نے اور امام طبرانی نے اوسط میں حضرت انسؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔

ملا علی قاریؒ نے اس کے کئی جواب ارشاد فرمائے ہیں:

① یہاں تقدیری عبارت یوں ہے: من بعضهم۔ اسی وجہ سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اجتنبوا كثيرا من الظن ان بعض الظن اثم﴾ [الحجرات:۱۲]

② یا اس حدیث کا مطلب یہ ہے: یحترس منهم بسوء الظن في الباطن اس روایت کو محدثین کی ایک جماعت نے ابو الدرداء سے نقل کیا ہے۔ اور اس مفہوم پر یہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے: ان الناس كابل مائة لا تجد فيها راحلة۔

③ یا یہ کہ ظاہر میں تو معاملہ حسن ظن والا کیا جائے، البتہ بناء امر مبہم پر ہو۔ واللہ اعلم۔

تخریج: اس حدیث کو امام حاکمؒ نے اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے۔

تادیب کے لئے تین دن سے زائد ناراضگی

۵۰۴۹: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتِ اعْتَلَّ بَعِيْرٌ لِصَفِيَّةَ وَعِنْدَ زَيْنَبَ فَضْلُ ظَهْرٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِزَيْنَبَ اُعْطِيْهَا بَعِيْرًا فَقَالَتْ اَنَا اُعْطِيْ تِلْكَ الْيَهُوْدِيَّةَ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهَجَرَهَا ذَا الْحِجَّةِ وَالْمُحَرَّمَ وَبَعْضَ صَفَرٍ۔ (رواه ابوداؤد وذكر حديث معاذ بن انس) مَنْ حَمٰى مُؤْمِنًا فِيْ بَابِ الشَّفْقَةِ وَالرَّحْمَةِ۔

أخرجه ابو داؤد في السنن ٥/٨ الحديث رقم ٤٦٠٢، واحمد في المسند ٦/٢٦١۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ صفیہ رضی اللہ عنہا کا اونٹ بیمار ہو گیا اس وقت زینبؓ کے پاس سواری سے زائد اونٹ تھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اونٹ انہیں دے دو تو انہوں نے کہا کیا یہودیہ کو اونٹ دے دوں۔ اس بات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر ناراض ہوئے کہ آپ نے ان سے ذوالحجہ، محرم اور صفر کا کچھ حصہ ان سے علیحدگی کیے رکھی۔ (ابوداؤد)

حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں: مَنْ حَمٰى مُؤْمِنًا فِيْ بَابِ الشَّفْقَةِ وَالرَّحْمَةِ میں نقل کی جا چکی ہے۔

تشریح: اعتل: لام کی تشدید کے ساتھ (از باب افتعال) بمعنی مرض۔

قوله: أنا اعطي تلك اليهودية:

أنا أعطي: یہاں استفہام انکاری مقدر ہے۔ اور مفعول محذوف ہے تا کہ مفید عموم ہو اور نفی میں مبالغہ بھی ہو۔ ای: انا ما اعطي شيئا حضرت زینبؓ کا حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو ''یہودیہ'' کہنا ان کے ماضی کے اعتبار سے تھا اور ان کو یہ بات کہنے پر ان کی اس غیرت نے ابھارا جو ان کو اکابر قریش میں سے ہونے کے سبب لاحق ہوئی تھی۔ لیکن یہ مخالفت صرف مخالفت برائے مخالفت تھی۔

قوله: فهجرها ذا الحجة والمحرم:

والمحرم: یہ منصوب ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص کسی قبیح فعل کا مرتکب ہو تو اس کی تادیب و تنبیہ کی خاطر نہ کہ کسی بغض و عداوت کے تحت اس سے تین دن سے زیادہ بھی ملنا جلنا چھوڑے رکھنا جائز ہے اور اس سے احادیث میں تطبیق بھی ہو جائے گی جیسا کہ پہلے

بھی بیان کیا جا چکا ہے۔

اسنادی حیثیت: صاحب ''التصحیح'' فرماتے ہیں: اس حدیث کے رجال مسلم کے رجال ہیں۔ مگر یہ کہ سمیہ بصریہ عن عائشہ کے طریق سے امام مسلم نے کسی حدیث کی تخریج نہیں فرمائی۔ اھ۔ منذریؒ فرماتے ہیں: سمية لم تثبت اور عسقلانی فرماتے ہیں: مقبولة من الثالثة (نقله ميرك)

عرضِ مرتب:

معاذ بن انسؓ کی یہ حدیث '' باب الشفقه و الرحمة'' کی فصل ثانی کے آخر میں گزری ہے۔

الفصل الثالث:

سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کے کمالِ ایمان

۵۰۵۰: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَاٰی عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ رَجُلًا یَسْرِقُ فَقَالَ لَهٗ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ سَرَقْتَ قَالَ كَلَّا وَالَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَقَالَ عِیْسٰی اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَكَذَّبْتُ نَفْسِیْ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/١٨٣٨ الحديث رقم (١٤٩-٢٣٦٨)، وأحمد في المسند ٢/٣١٤۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ نے ایک آدمی کو چوری کرتے دیکھا تو آپ نے فرمایا تو نے چوری کی ہے اس نے کہا ہرگز نہیں مجھے قسم ہے اس ذات جس کے سوا کوئی معبود نہیں تو حضرت عیسیٰ نے فرمایا میں اللہ پر ایمان لایا اور میں اپنے نفس کو جھٹلاتا ہوں۔ (مسلم)

تشریح: قوله: فقال عيسى: آمنت والله و كذبت نفسي: ''میں خدا پر ایمان لایا'' یعنی تم نے اپنی قسم میں خدا کی واحدانیت کا جو ذکر کیا ہے میں اس پر اپنے ایمان واعتقاد کا اقرار کرتا ہوں

یا یہ جملہ مفہوم کے اعتبار سے یوں ہے کہ تم نے اللہ کی جو قسم کھائی ہے میں اس کا اعتبار کرتا ہوں اور اپنے نفس کو اس بات کے کہنے میں جھوٹا قرار دیتا ہوں کہ تم نے چوری کی ہے اگر چہ میرا یہ کہنا ظاہری حالات میں غمازی کی بنا پر تھا۔ ممکن ہے کہ اس شخص نے کہیں سے کوئی چیز اس کے مالک سے پوشیدہ طور پر اٹھائی ہوگی اس بنا پر چوری نہ ہو کہ اس موقع پر ایسی کوئی شرط نہیں پائی گئی ہو گی جس کا چوری کے ثبوت کے لئے اور چوری کی حد جاری کرنے کے لئے پایا جانا شرعی طور پر ضروری ہوتا ہے

امام طیبیؒ نے یہ مطلب لکھا ہے کہ میں تمہیں تمہاری قسم ''والذی لا اله الاهو'' میں سچا مانتا ہوں' اور تمہیں بری قرار دیتا ہوں اپنے اس گمان سے رجوع کرتا ہوں جو میں نے تمہارے بارے میں قائم کیا تھا اور (مذکورہ بات کہنے میں) اپنے نفس کو جھوٹا قرار دیتا ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ﴾

[الحجرات:١٢] ''اے اہل ایمان! بہت گمان کرنے سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں اور ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے (تو غیبت نہ کرو) اور خدا کا ڈر رکھو بیشک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے'' انتھی ۔ وفیه مارا یخفی ۔

قریب ہے فقر، کُفر تک پہنچا دے

۵۰۵۱ :وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا وَّكَادَ الْحَسَدُ اَنْ يَّغْلِبَ الْقَدَرَ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٥/ ٢٦٧ الحديث رقم ٦٦١٢۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فقر و افلاس قریب ہے کہ کفر کی حد تک پہنچا دے اور حسد قریب ہے کہ تقدیر پر غالب آ جائے۔

تشریح : قوله: كاد الفقر أن يكون كفرا:

یعنی فقر قلبی قریب ہے کہ کفر کا سبب بن جائے۔ مطلب یہ کہ فقر و افلاس اور تنگدستی ایسی بری چیز ہے کہ بسا اوقات انسان اس سے مجبور ہو کر کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنے لگتا ہے یا شکوہ و گلہ غیر خدا کے سامنے کرنے لگتا ہے اور ماسواء اللہ کو اپنا حاجت روا ماننے لگتا ہے اور یا جب وہ دیکھتا ہے کہ اکثر کافر مال دار ہیں اور عیش و راحت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور دوسری طرف اکثر افلاس اور تنگدستی کی آزمائش میں مبتلا ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے مقتضی کے مطابق:

اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ۔

''یہ دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت ہے''۔ تو وہ آدمی کفر کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم میں ایک موقع پر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تسلی دیتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:

﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ٥ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ٥ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِاللّٰهِ وَمَا عِنْدَاللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ﴾ [آل عمران : ١٩٦]

''(اے مؤمن) تجھ کو ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا مغالطہ میں نہ ڈال دے۔ (کیونکہ یہ) چند روزہ بہار ہے پھر ان کا ٹھکانہ (ہمیشہ کے لئے) دوزخ ہوگا اور وہ بری ہی آرام گاہ ہے۔ لیکن جو لوگ (ان میں سے) خدا سے ڈریں (اور مسلمان و مطیع ہو جائیں) ان کے لئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔ یہ (ان کی) مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے اور جو چیز خدا کے پاس ہیں یہ نیک بندوں کے لئے بدر جہا بہتر ہیں''۔

قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں اس آیت کا سبب نزول یہ منقول ہے کہ بعض صحابہؓ جب مشرکین کے یہاں مال و دولت کی ریل پیل اوران کو دنیا کی راحت وآسائش میں دیکھتے تو ان کی زبان پر یہ الفاظ آجاتے تھے کہ یہ لوگ جو خدا کے دشمن ہیں ان کا حال تو ہم بڑا اچھا دیکھتے ہیں حالانکہ ہم افلاس وبھوک سے ہلاک ہوئے جارہے ہیں۔ (اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی)

قوله: كا دالحسدان يغلب القدر:

اس کی تشریح ماقبل میں گذر چکی ہے۔اھ۔اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "اور حسد قریب ہے کہ تقدیر الٰہی پر غالب آجائے" کا مطلب یہ ہے کہ بفرض محال کوئی چیز ایسی ہوتی جو تقدیر پر غالب آجانے اوراس کو بدل دینے کی طاقت رکھتی تو حاسد کے زعم کے مطابق وہ حسد ہوتا جو تقدیر کو پلٹ کے رکھ دیتا۔ الجامع الصغیر میں یہ روایت یوں مروی ہے: **وكان دالحسد أن يكون سبق القدر**۔ان لفاظ کے ساتھ ابونعیم نے "الحلیہ" میں اس کو روایت کیا ہے۔حدیث مبارکہ کے ان دونوں جملہ میں مناسبت یہ ہے کہ حسد عام طور پر فقر سے پیدا ہوجاتا ہے اور کبھی یہ کفر کی کوئی شکل اختیار کر رجاتا ہے چونکہ حاسد یہ چاہتا ہے کہ بندہ پر اللہ کی جو نعمت ہے وہ زائل ہوجائے تو یہ قضاء کے ساتھ معارضہ ہے یا اپنے نفس اوراپنے غیر کے حق میں تقدیر کے ساتھ لڑائی ہے پس حسد کفر کے زیادہ قریب ہے' بنسبت فقر مجرد کے' الہذا یہ ترتیب ذکری "ترقی" کے لئے ہے یا یہ کہ اول سبب ہے حصول ثانی کا' باوجویکہ حسد پرانا مرض ہے جس سے صحت یابی کی امید نہیں۔فقر کبھی غنی سے بدل جاتا ہے اور کبھی صبر ورضا سے۔اکثر انبیاء واولیاء کی یہی کیفیت تھی۔حتی کہ صوفیہ کا اجماع ہے کہ صابر فقیر' شاکر غنی سے افضل ہے۔اکثر علماء کا بھی یہی موقف ہے۔واللہ اعلم۔

ابن راوندی فرماتے ہیں:

كم عاقل عاقل أعيت مذاهبه
وكم جاهل جاهل تلقاه مرزوقا
هذا الذى ترك الأوهام حائرة
وصير العالم النحرير زنديقا

عرضِ مرتب:

ملاعلی قاریؒ نے اس حدیث کے تحت بھی یہ مسئلہ چھیڑا ہے، کہ فقیر صابر افضل ہے، کہ غنی شاکر افضل ہے؟ یہ مسئلہ ماقبل میں نسبتاً بسط کے ساتھ گزر چکا ہے، وہاں ملاحظہ کرلیا جائے۔اور یہ حدیث: **الفقر فخرى وبه أفتخر** باطل وموضوع ہے۔جیسا کہ حافظ عسقلانی وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے۔

معالم التنزیل میں امام بخاریؒ اپنی سند متصل ذکر کرنے کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس کی یہ روایت ذکر کی ہے: قال: **قال عمر بن الخطاب: جئت فاذا رسول الله ﷺ فى مشربة اى غرفة وانه لعلى حصير مابينه وبينه شئ وتحت رأسه وسادة من أدم حشو هاليف 'وان عندرجليه قرظا مصبوبا'وهو مايد بغ به وعند رأسه أهب معلقة' فرأيت اثر الحصير فى جنبه فبكيت فقال :مايبكيك فقلت :يارسول الله ان كسرى وقيصر فيما هما فيه وأنت رسول الله فقال :أمام ترضى أن تكون لهما الدنيا ولنا الآخرة۔ ولنا الآخرة**

بَابُ الْحَذْرِ وَالتَّانِّي فِي الْأُمُوْرِ

معذرت قبول نہ کرنے والے پر گناہ کا بیان

۵۰۵۲: وَعَنْ جَابِرٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اعْتَذَرَ اِلٰى اَخِيْهِ فَلَمْ يَعْذِرْهُ اَوْلَمْ يَقْبَلْ عُذْرَهُ كَانَ عَلَيْهِ مِثْلُ خَطِيْئَةِ صَاحِبِ مَكْسٍ ۔ (رواهما البيهقي في شعب الايمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/ ٣٢١ الحديث رقم ٨٣٣٨۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی اپنے بھائی سے معذرت کرے اور وہ معذرت نہ مانے یا اس کا عذر قبول نہ کرے تو اس پر ٹیکس وصول کرنے والے کی طرح گناہ ہے۔ ان دونوں حدیثوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ مکاس ٹیکس لینے والے کو کہتے ہیں۔

تشریح: **فلم یعذرہ**: یاء کے ضمہ اور فتحہ اور ذال کے کسرہ کے ساتھ۔

أولم یقبل عذرہ: یہ راوی کا شک ہے۔ یہ جملہ ماقبل کی تفسیر ہے۔

صاحب مکس: میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ای **صاحب عشر**۔

بعض ''اصول'' میں (المکاس کے بجائے) ''**الماکس العشار**'' ہے۔

''مکس'' کے معنی ہیں محصول لینا' اسی اعتبار سے عشر لینے والے کو ''**ماکس مکاس**'' کہا جاتا ہے۔

عام طور پر ''صاحب مکس'' چونکہ ظلم کرتا ہے' اور علم پر عمل نہیں کرتا اس لئے اس کی مطلق مذمت کی۔ یا اس سے وہ شخص مراد ہے جو از راہ ظلم و تعدی ناحق لوگوں سے مال وصول کرے۔ چنانچہ صاحب قاموس لکھتے ہیں: **المکس النقص الظلم** (گھٹانا' ظلم کرنا) ناحق اور خلاف شرع محصولات لگانے اور وصول کرنے کا گناہ بہت سخت ہے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ صاحب مکس جنت میں نہیں جائے گا۔

عذر خواہی کو قبول نہ کرنے والے اور صاحب مکس کے درمیان مشابہت کی وجہ شاید یہ ہے کہ مذکورہ شخص کی طرح مکاس بھی محصول دہندہ کے کسی عذر اور دلیل کو قبول نہیں کرتا' کوئی تاجر لاکھ کہے کہ مجھ پر اس قدر محصول عائد نہیں ہوتا یا میرے پاس مال تجارت نہیں ہے بلکہ امانت کا ہے اور یا یہ کہ میں قرضدار ہوں' یہ محصول ادا نہیں کر سکتا وغیرہ وغیرہ مگر وہ اس کی کسی بات کو تسلیم نہیں [illegible] اس سے زبردستی محصول وصول کر لیتا ہے۔ الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو ابن ماجہ اور ضیاء نے ان الفاظ کے

ساتھ روایت کیا ہے: **من اعتذر اليه اخوه بمعذرة فلم يقبلها كان عليه من الخطيئة مثل صاحب مكس۔**

عذر خواہی کو قبول نہ کرنے کی مذمت اور اس کے گناہ کے بارے میں اور احادیث بھی منقول ہیں۔ میرک ؒ نے منذری ؒ سے نقل کیا ہے کہ حضرت جابر کی حدیث کو امام طبرانی نے بھی اوسط میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ طبرانی ؒ نے اوسط میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

مَنِ اعْتَذَرَ اِلٰی اَخِیْہِ المسلم فلم يقبل عذره لم يرد على الحوض ۔

''اگر کسی شخص نے اپنے کسی مسلمان بھائی سے عذر خواہی کی اور اس نے اس کے عذر کو قبول نہیں کیا تو اس کو حوض کوثر پر آنا نصیب نہیں ہوگا''۔

طبرانی اور دوسرے محدثین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں برا شخص کون ہے؟ صحابہ ؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ ہاں! اگر آپ ﷺ بہتر سمجھیں تو ضرور بتائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تم میں برا شخص وہ ہے جو تنہا کسی منزل پر اترے اپنے غلام کو کوڑے مارے اور (محتاج و ضرورت مندوں کو) اپنی عطا و بخشش سے محروم رکھے۔ پھر فرمایا: کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اس سے بھی برا شخص کون ہے؟ صحابہ ؓ نے عرض کیا کہ ہاں اگر آپ ﷺ بہتر سمجھیں تو ضرور بتائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: وہ شخص کہ جو قصور (کرنے والے کے عذر) کو تسلیم نہ کرے' معذرت کو قبول نہ کرے اور خطا کو معاف نہ کرے۔ پھر فرمایا: کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اس سے بھی برا شخص کون ہے؟ صحابہ ؓ نے عرض کیا کہ ہاں! اگر آپ ﷺ بہتر سمجھیں تو ضرور بتائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: وہ شخص کہ جس سے خیر و بھلائی کی توقع نہ ہو اور نہ اس کی فتنہ انگیزیوں سے امن ملتا ہو''۔

عرضِ مرتب:

یہ حدیث قبل ازیں متن میں بھی گذری ہے۔

حاکم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے: **عن ابي هريرة عن النبي ﷺ قال: عفوا عن نساء الناس تعف نساؤكم 'وبرّوا آباء كم يبركم أبناء كم 'ومن أتاه أخوه متنصلا فليقبل ذلك 'محقا كان او مبطلا 'فان لم يفعل لم يرد على الخوص ۔** حضور ﷺ نے فرمایا: لوگوں کی عورتوں کے تئیں پاکدامن رکھو (یعنی تم دوسروں کی عورتوں پر بری نظر نہ رکھو تمہاری عورتیں دوسرے لوگوں سے اپنے دامن عفت کو محفوظ رکھیں گی۔ تم اپنے باپ سے اچھا سلوک کرو' تمہارے بیٹے تم سے اچھا سلوک کریں گے اور جس شخص کے پاس اس کا کوئی مسلمان بھائی (اپنے کسی قصور پر) عذر خواہ بن کر آئے تو چاہیے کہ اس کی عذر خواہی کو قبول کرے خواہ اس کی عذر خواہی صحیح ہو یا غلط' اگر اس نے اپنے اس مسلمان بھائی کی عذر خواہی کو قبول نہیں کیا تو وہ (یاد رکھے کہ) اس کو حوض کوثر پر آنا نصیب نہیں ہوگا۔ (حاکم نے اس روایت کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے۔)

الفصل الاوّل:

مؤمن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا

۵۰۵۳: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَّاحِدٍ مَرَّتَيْنِ۔

(متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۵۲۹/۱۰ الحديث رقم ۶۱۳۳ و مسلم في ۲۲۹۵/۴ الحديث رقم (۶۳-۲۹۹۸) و ابوداؤد في السنن ۱۸۵/۵ الحديث رقم ۴۸۶۲ و ابن ماجه في ۱۴۰۱/۲ الحديث رقم ۴۱۸۹، واحمد في المسند ۳۷۹/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مؤمن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: لا یلدغ: یہ لفظ دو طرح سے ضبط کیا گیا ہے۔ Ⅰ بصیغہ فعل مضارع منفی مرفوع۔ Ⅱ بصیغہ فعل مضارع نہی مجزوم۔

"لدغ" کے معنی ہیں ڈسنا' سانپ اور بچھو کا کاٹنا۔ جحر: (پہلے جیم اور پھر حاء) سوراخ اور بل کو کہتے ہیں

خطابیؒ فرماتے ہیں: حدیث کا مقصد اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ مؤمن دانا واضح رہے کہ کسی دنیاوی معاملہ میں فریب کھا جانا زیادہ اہمیت نہیں رکھتا مگر دین کے معاملہ میں ہرگز فریب نہ کھانا چاہئے۔

تورپشتیؒ فرماتے ہیں: میرا گمان ہے کہ یہ حدیث امام خطابیؒ کو نہیں پہنچی۔ حالانکہ اہل السیر کے درمیان یہ بالکل مشہور ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ زمانۂ رسالت میں عرب کا ایک بڑا مشہور شاعر ابو غرہ تھا اور اس کا تعلق کفار کے اس طبقہ سے تھا جو اسلام' ذات رسالت اور مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت اور سب و شتم کے پہاڑ تراشنے پر مامور تھا' چنانچہ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ مسلمانوں کی ہجو کیا کرتا تھا اور اپنی قوم کے شریر لوگوں کو مسلمانوں کی ایذاء و اہانت پر اکسایا کرتا تھا۔ جب بدر کے میدان میں حق و باطل کے درمیان پہلی معرکہ آرائی ہوئی اور خدا نے اپنے مٹھی بھر بندوں کو دشمنانِ دین پر فتح عطا فرمائی اور مکہ کے بہت سارے کفار جس میں ان کے زعماء و اساطین بھی تھے۔ قیدی بنا کر مدینہ منورہ لائے گئے تو ان میں وہ بد بخت شاعر ابو غرہ بھی تھا اس نے بارگاہِ رسالت میں اپنے پچھلے سیاہ کارناموں پر ندامت کا اظہار کیا اور عفو خواہی کے ساتھ یہ عہد و اقرار کیا کہ اب میں کبھی بھی ایسے افعال بد کے پاس نہیں پھٹکوں گا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس بد بخت پر رحم و کرم کر کے اس کے عہد و پیمان کی بنیاد پر اس کو رہا کر دیا۔ لیکن اس کی ازلی شقاوت و بدبختی نے اس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا اور وہ اپنی قوم میں پہنچ کر پہلی روش پر چلنے لگا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دوبارہ جنگ احد کے موقع پر قیدی کی حیثیت سے بارگاہِ رسالت میں پہنچا دیا۔ اس نے اس مرتبہ بھی وہی حربہ استعمال کیا اور اظہار ندامت و عفو خواہی کے ساتھ امان چاہنے لگا اور آئندہ اپنی ان حرکتوں سے باز رہنے کا عہد و پیمان کیا۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے اس کو معاف نہیں کیا اور اس کو جہنم رسید کرنے کا حکم فرما دیا۔ چنانچہ اسے قتل کر دیا گیا۔ اس وقت

جب بعض لوگوں نے اس کی سفارش کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اس کو مزید ایک مرتبہ معاف فرما دیا جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مؤمن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا۔

اس ذکر کردہ سبب کی روشنی میں توجیہ ثانی ضعیف پڑ جاتی ہے۔(ذکرہ الطیبی) میرے نزدیک اس کی وجہ ضعف واضح نہیں۔ جب کہ یہ بھی کہا جاتا ہے، کہ'' **العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب**'' وگرنہ تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہوتا۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں خبر دی ہے۔ امام طیبیؒ نے خطابیؒ کے کلام کی تائید کیلئے اطناب سے کام لیا ہے، حتی کہ آخر میں لکھا ہے: **فظهر ان القول بالنهي اولى والمقام له ادعى** اھ۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اس کا بُعد مخفی نہیں۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ اور احمد و ابن ماجہ نے ابن عمر سے روایت کیا ہے۔

دو محبوب خصال' حلم و وقار

۵۰۵۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِاَشَجِّ عَبْدِ الْقَيْسِ اِنَّ فِيْكَ لَخَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللّٰهُ الْحِلْمُ وَالْاَنَاةُ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤٩/١ الحديث رقم (٢٥-١٧)، والترمذي في السنن ٣٢٢/٤ الحديث رقم ٢٠١١ وابن ماجه في ١٤٠١/٢ الحديث رقم ٤١٨٧، واحمد في المسند ٢٣/٣۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عبدالقیس کے سردار اشج کو فرمایا کہ تمہارے اندر جو دو خوبیاں ہیں ان کو اللہ تعالیٰ بہت پسند کرتا ہے۔ ایک حلم' دوسرا وقار۔ (مسلم)

تشریح: لا شج: مضاف ہو رہا ہے۔ اور ایک نسخہ میں فتحہ کے ساتھ ہے غیر منصرف ہونے کی وجہ سے' اور'' عبدالقیس'' اس سے بدل ہے۔ یا عطف بیان ہے مگر حذف مضاف کی تقدیر پر ای **ارئیس عبد القیس**

الحلم: بکسر الحاء، اصل کے اعتبار سے'' حلم'' کے معنی ہیں، ظالم کے مکافات عمل میں تاخیر کرنے کو، پھر اس لفظ کا استعمال''**عفو عن الذنب**'' (گناہ سے معافی) کے معنی میں ہونے لگا۔

الأناة: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ، بروزن **نواة**،'' **تأني**'' کا اسم ہے۔ اس کے متعدد معانی بیان کئے گئے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کے معنی ہیں **الوقار والتثبت**، بعض کا کہنا ہے کہ اس کے معنی ہیں: **الثبات في الطاعات**، بعض کا کہنا ہے، کہ اس سے مراد **جودة نظره في العواقب** ہے۔

الحلم والأناة: سید کے نسخہ میں یہ دونوں لفظ مرفوع ہیں۔ لیکن اظہر یہ ہے کہ'' **خصلتين** '' سے بدل ہونے کی بناء پر منصوب ہیں۔ جیسا کہ یہی تحقیق ﴿**الحمد لله رب العلمين**﴾ کے تحت اور'' **بني الاسلام على خمس** '' کے تحت گزری ہے۔

شرح السنۃ میں منذر اشج سے مروی ہے:

أنه قال: يا رسول الله! : أنا أتخلق بهما الله جبلني عليها ؟ قال: الله جبلك عليها ۔قال الحمد الله الذي جبلني على خلقين يحبهما الله ورسوله اھ۔

انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے اندر جو یہ دوخوبیاں ہیں ان کو میں نے ازراہ تکلف اختیار کیا ہے اور میری خود ساختہ ہیں یا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں خوبیوں کو میری فطرت میں پیدا کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ان دونوں خوبیوں کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مزاج وفطرت میں ودیعت فرمایا ہے۔ (یہ سن کر) انہوں نے کہا کہ "تمام تعریفات اللہ ہی کے لئے ہیں جس نے مجھ کو ان دوخوبیوں کے ساتھ استوار کیا جن کو خدا اور اس کا رسول ﷺ پسند کرتا ہے (یعنی اگر یہ دونوں خوبیاں میری خود ساختہ اور ازراہ تکلف اختیار کی ہوئی ہوتیں تو ان کے زائل ہو جانے اور یا ان میں نقصان پیدا ہو جانے کا خدشہ ہوتا مگر چونکہ فطری ہیں اور خدا کی عطا کی ہوئی ہیں اس لئے میں بجا طور پر امید رکھتا ہوں کہ یہ دونوں میرے اندر ہمیشہ رہیں گی اور باقی رہیں گی۔)

لفظ "رسولہ" کا عطف لفظ جلالہ پر ہے۔ چونکہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا محبت فرمانا، اللہ جل شانہ کے محبت فرمانے کے تابع ہے، اس سے جدا نہیں ہوسکتا۔

تخریج: اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

عرضِ مرتب:

حدیث باب کا تفصیلی واقعہ یوں ہے کہ عبدالقیس' ایک قبیلہ کا نام ہے۔ جب اس قبیلہ کے لوگ آنحضرت ﷺ کی زیارت وملاقات کے لئے مدینہ آئے اور مسجد نبوی کے سامنے پہنچے تو آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر فرط شوق سے اپنے اونٹوں سے کود پڑے بے تابانہ اور دیوانہ وار دوڑتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور آنحضرت ﷺ کے تئیں محبت وعقیدت اور شوق ملاقات کی بے قراری کا اظہار نہایت جذباتی طور پر کیا آنحضرت ﷺ نے ان کی اس بیقراری ومضطرب حالت کو دیکھا تو سکوت فرمایا اور ان سے کچھ نہیں کہا لیکن یہ لوگ جس عظیم المرتبت شخصیت اور اپنے سردار یعنی اشج کی زیر قیادت بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تھے اور جن کا اصل نام منذر رضی اللہ عنہ تھا ان کی کیفیت بالکل دوسری تھی وہ پہلے اپنی قیام گاہ پر اترے وہاں انہوں نے اپنے تمام رفقاء کا سامان جمع کیا اور ساری چیزوں کو باندھ کر اطمینان کے ساتھ نہائے دھوئے' نہایت نفیس وپاکیزہ کپڑے زیب تن کئے اور پھر انتہائی وقار وتمکنت کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مسجد نبوی میں آئے وہاں دو رکعت نماز ادا کی دعا مانگی اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو ان کی یہ وضع اور روش بہت پسند آئی اور ان سے مذکورہ بالا الفاظ ارشاد فرمائے۔ (انتھی)

الفصل الثانی:

جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے

۵۰۵۵: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْاَنَاةُ مِنَ اللّٰهِ وَالْعَجَلَةُ

مِنَ الشَّيْطَانِ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب وقد تَكَلَّمَ بعض اهل الحديث فی عبد المهيمن بن عباس الراوی من قبل حفظه)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٣٢٢ الحديث رقم ٢٠١٢۔

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وقار و بردباری اللہ کی جانب سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے۔ یہ ترمذی کی روایت ہے انہوں نے اس کو غریب کہا ہے بعض محدثین نے عبدالمہیمن کے حافظے پر تنقید کی ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: قولہ: العجلة من الشيطان: کا مطلب یہ ہے کہ کسی دنیاوی کام میں غور و فکر نہ کرنا اس کے انجام پر نظر رکھے بغیر اس کو شروع کر دینا اور جلد بازی کی روش اختیار کرنا ایک ایسی خصلت ہے جس کو شیطان وسوسوں اور واہموں کے ذریعہ انسان میں پیدا کرتا ہے۔ جس سے اس کا مقصد اس کے کام کو خراب کرنا اور خود اس کو پریشانیوں میں مبتلا کرنا ہوتا ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے وہ امور مستثنیٰ ہیں جن کی خیر و برکت میں کوئی شبہ نہیں۔ یعنی اچھی چیزوں میں عجلت کرنا شیطان کی خصلت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: [انهم كانوا يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ] [الانبیاء۔۹۰]

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ (جہاں تک عبادات و طاعات کا تعلق ہے تو جاننا چاہئے کہ) ایک تو کسی عبادت و طاعت کی طرف سرعت و چست روی کو اختیار کرنا ہے اور دوسرے اس عبادت و طاعت کو کرتے وقت جلد بازی کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کے درمیان فرق ہے چنانچہ اول الذکر ایک مطلوب و مستحسن چیز ہے اور ثانی الذکر ایک مذموم خصلت ہے

صاحب ''مظاہر'' نے ان دونوں کے فرق کو ایک مثال سے واضح فرمایا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں: اس بات کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک تو نماز کے لئے جلدی کرنا ہے اور ایک نماز میں جلدی کرنا ہے نماز کے لئے جلدی کرنا تو یہ ہے کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو اس کو ادا کرنے میں تاخیر نہ کی جائے جلدی جلدی تیاری کرے اور نماز پڑھنے لگے۔ یہ چیز نہ صرف یہ کہ اس ''جلد بازی'' میں شامل نہیں ہے جس کی برائی بیان کی گئی ہے۔ بلکہ یہ ایک مستحسن و مطلوب فعل ہے اور (نماز میں جلدی کرنا) یہ ہے کہ جب نماز پڑھنے لگے تو اس نماز سے جلد از جلد فارغ ہو جانے کی خاطر اس کے ارکان و افعال کی ادائیگی میں عجلت کرنے لگے یہ چیز یعنی کسی نیک کام کو جلد بازی سے پورا کرنا مذموم ہے۔ لہٰذا ملا علی قاریؒ کے مذکورہ بالا الفاظ کا حاصل یہ نکلا کہ فرط شوق سے کسی اچھے کام کی طرف لپکنا اور اس کی انجام دہی کے لئے جلد سے جلد تیار ہونا ایک اچھی چیز ہے اور اس اچھے کام کو جلد بازی کے ساتھ کرنا ایک بری چیز ہے۔'' (انتہی ملخصًا)

قولہ: وهذا حديث غريب: امام میرکؒ فرماتے ہیں کہ بعض نسخوں میں حسن غریب ہے۔ اس حدیث کو بیہقی نے بھی شعب الایمان میں حضرت انسؓ بطریق مرفوع نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: اَلتَّأَنِّيْ مِنَ اللّٰهِ وَالْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ۔

ٹھوکر کھانے کے بعد حلم پیدا ہوتا ہے

۵۰۵۲: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا حَلِیْمَ اِلَّا ذُوْعَثْرَۃٍ وَلَا حَکِیْمَ اِلَّا ذُوْتَجْرِبَۃٍ۔ (رواہ احمد والترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٣٣٢ الحدیث رقم ٢٠٣٣، واحمد فی المسند ٣/٦٩۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ ٹھوکر کھانے والا ہی حوصلہ والا ہوتا ہے اور تجربہ کار ہی حکمت والا ہوتا ہے۔ اس روایت کو احمد اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قولہ: لا حلیم الا ذو عثرۃ: اس کے دو مطلب بیان کئے ہیں: کا مطلب یہ ہے کہ حلم و بردباری اور لحاظ و مروت کا جوہر اسی شخص میں ہوتا ہے جس نے دھوکا کھایا ہو لغزشوں اور خطاؤں سے دوچار ہوا ہو گناہ و معصیت کا مرتکب ہو چکا ہو اور اپنے معاملات میں خلل و نقصان برداشت کر چکا ہو اور ہوشیار ہونے کے بعد ندامت و خجالت کا بارِ گراں کاندھوں پر اٹھائے پھرا ہو! ظاہر ہے کہ ایسا شخص چونکہ اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہے کہ کسی کے دکھ درد اور نفع و نقصان کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ کسی کے عیوب کو چھپانے اور کسی کی خطاؤں سے درگزر کرنے کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ دوسروں کے تئیں حلیم و بردبار اور خیر خواہ ہوتا ہے اور لوگوں کے عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے اور اگر کسی سے کوئی خطا و لغزش ہو جاتی ہے تو اس سے درگزر کرتا ہے۔

قولہ: ولا حکیم الاذو تجربۃ: حکیم اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو دانا و عقلمند، راست باز اور استوار کار ہو' کیونکہ حکمت کے معنی ہیں ہر چیز کی حقیقت و اصلیت کو جاننا! اور ''تجربہ'' کا مطلب ہے کاموں کی واقفیت حاصل ہونا اور کسی کام کو کرنے کا طریقہ جاننا۔ لہٰذا فرمایا گیا کہ جس شخص کو اشیاء کی حقیقت و پہچان حاصل ہوئی ہر چیز کے نفع نقصان سے آگاہ ہو' حالات کے اتار چڑھاؤ اور معاملات و افراد کی بھلائی برائی سے واقف ہوا تو اس کو ''حکمت کی دولت مل گئی اور وہ ''کامل حکیم'' ہوا۔

عرضِ مرتب:

اگر ''حکیم'' سے طبیب و معالج مراد لیا جائے تو بھی مطلب بالکل صاف ہے کہ کوئی شخص محض علم طب پڑھنے سے کامل طبیب و معالج نہیں ہو جاتا' بلکہ اس کے لئے تجربہ اور معالجہ کی مشق و مزاولت ضروری ہے۔ (انتہی از مظاہر حق)

لیکن یوں کہنا مناسب ہے: لا حلیم و لا حکیم من المخلوقین الا کذا کہ یوں حصر برقرار رہے گا۔ اور اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں: لا حلیم الا وقد یعثر جیسا کہ مروی ہے: نعوذ باللّٰہ من عضب الحلیم واضح رہے کہ یہ دونوں اللہ جل شانہ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور امام حاکم نے اپنی مستدرک میں ذکر کیا ہے۔

خوب تدبیر سے کام لو

۵۰۵۳: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَوْصِنِیْ فَقَالَ خُذِ الْاَمْرَ بِالتَّدْبِیْرِ فَاِنْ

رَأَيْتَ فِيْ عَاقِبَتِهٖ خَيْرًا فَاَمْضِهٖ وَاِنْ خِفْتَ غَيًّا فَاَمْسِكْ۔ (رواه فی شرح السنة)

أخرجه البغوی فی شرح السنة ۱۳/ ۱۷۵ الحديث رقم ۳۶۰۰۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کام خوب تدبیر سے کرو پھر اگر آپ اس کے انجام میں بھلائی پاؤ تو کر گزرو اور اگر اس میں گمراہی کا خطرہ ہو تو اس باز رہو۔ (شرح السنۃ)

تشریح: التدبیر: باب تفعیل کا مصدر ہے۔

أمضه: از باب افعال امر حاضر کا صیغہ ہے۔

و ان خفت: یہ لفظ خوف بمعنی رؤیتہ ہے۔ اور اس کا قرینہ پچھلا جملہ ہے۔ چنانچہ اس میں صفت تفنن ہے۔

"غیًا": "شر" کی جگہ لفظ "غی" کا استعمال یہ بھی ایک انتہائی شاندار تعبیر ہے۔ بایں طور کہ اس میں رعایت مقابلہ کو ترک کیا ہے۔ تاکہ مفید مشاکلت ہو، گویا کہ شارع علیہ السلام نے پہلے جملہ میں "خیر و ہدایت" کا ذکر فرمایا اور دوسرے جملہ میں "شر وضلالت" کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ اسلوب کلام بھی "بدیع" کی ایک قسم ہے۔

رأیت: بمعنی علمت یا بمعنی ظننت ہے۔ دوسرا معنی زیادہ ظاہر ہیں، چونکہ غالب امور شرعیہ کی بناء اسی پر ہے اور سارے کے سارے مطالب عرفیہ کی بنیاد بھی اسی پر ہے خصوصاً مخاطب کی نسبت سے۔ چونکہ ہر قضیہ میں ارباب یقین یعنی انبیاء اور عارفین کاملین کہاں پائے جاتے ہیں۔ باوجودیکہ علم کا حکم تو پہلے سے بھی معلوم ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ مخفی نہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث میں موجود لفظ "خفت" بمعنی "ظن" ہے، جیسا کہ اس ارشاد باری میں ہے: ﴿الا ان یخافا ان لا یقیما حدود اللّٰہ﴾ [البقرۃ۔۲۲۹] اور یہ بھی ممکن ہے بمعنی علم و یقین ہو، چونکہ جو شخص کسی چیز سے خائف ہوتا ہے، اس سے احتراز کرتا ہے، اور اس کی حقیقت کی تحری کرتا ہے۔ اھ۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں یہ محل بحث ہے، قابل تحقیق ہے

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ مقام کے زیادہ مناسب ہے چونکہ "رأیت" کے مقابلہ میں واقع ہوا ہے۔ اور وہ بمعنی علم ہے، اور یہ دونوں تفکر و تدبیر کا نتیجہ ہیں۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں بلکہ یہ دونوں اس پر متفرع ہوتے ہیں۔

تخریج: امام سیوطیؒ اس حدیث کا مرفوع حصہ الجامع الصغیر میں ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو عبدالرزاق نے جامع میں، ابن عدی نے کامل میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے۔

آخرت کے معاملات میں جلدی بہتر ہے

۵۰۵۸: وَعَنْ مُصْعَبِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ الْاَعْمَشُ لَا اَعْلَمُهٗ اِلَّا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ التُّؤَدَةُ فِيْ كُلِّ شَيْءٍ خَيْرٌ اِلَّا فِيْ عَمَلِ الْاٰخِرَةِ۔ (رواه ابو داؤد)

أخرجه ابو داؤد فی السنن ۵/ ۱۷۵ الحديث رقم ۴۸۱۰۔

ترجمہ: حضرت مصعب بن سعدؒ نے اپنے والد سے نقل کیا۔ اعمش کہتے ہیں کہ میرے خیال میں یہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے وقار و تسلی سے کام کو انجام دینا ہر چیز میں بہتر ہے سوائے آخرت کے معاملات کے (یعنی ان میں جلدی کرنی چاہیے)۔

راویٔ حدیث:

مصعب بن سعد۔ یہ ''مصعب'' ہیں۔ ''مصعب'' بصیغۂ مفعول ہے۔ ان کی کنیت ''ابو زارہ'' ہے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور قریشی ہیں۔ اپنے والد اور حضرت علی بن ابی طالب اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے حدیث کی سماعت کی۔ ان سے ''سماک بن حرب'' وغیرہ نے روایت کی۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں توقف و تاخیر نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان کو فوراً کر لینا چاہئے۔ کیونکہ نیک کام میں تاخیر کا مطلب بہت سی آفات اور کوتاہیوں کا خطرہ مول لینا ہے

علاوہ ازیں دنیاوی امور کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کسی دنیاوی کام کو کیا جائے تو ابتداء میں عام طور پر اس کے انجام کا حال معلوم نہیں ہوتا کہ آیا اس کام کا انجام یقینی طور پر اچھا ہوگا۔ جس کی وجہ سے اس کو فوراً کر لینا ضروری ہو یا اچھا نہیں ہوگا کہ اس کے کرنے میں تاخیر کی جائے لہٰذا تعلیم دی گئی ہے کہ اپنے دنیاوی معاملات میں توقف و تاخیر اختیار کرو اور کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے اچھی طرح غور و فکر کر لو اس کے برخلاف دینی کاموں کا انجام چونکہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا علم نہ ہو اس لئے ان میں تاخیر کی گنجائش نہیں ہوتی علاوہ ازیں قرآن کریم میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے:

﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾

''نیکی و بھلائی کے کاموں میں سبقت و عجلت کرو اور مغفرت و بخشش کی طرف لپکو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے''۔

امام غزالیؒ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: [اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ] [البقرۃ۔۲۶۸] کی تفسیر میں لکھا ہے کہ مؤمن کے لئے مناسب یہ ہے کہ جونہی اس کے دل میں خدا کے نام پر اپنا مال خرچ کرنے کا داعیہ پیدا ہو تو وہ اس نیک کام میں توقف نہ کرے کیونکہ شیطان اس کو فقر و افلاس سے ڈراتا ہے اور صدقہ و خیرات کرنے سے روکتا ہے۔

ابو حسن فرشخی کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک دن بیت الخلاء میں تھے کہ انہوں نے وہیں سے اپنے شاگرد کو آواز دی اور کہا کہ میرے بدن کی قمیص اتار کر فلاں شخص کو دے دو' شاگرد نے یہ سن کر کہا کہ یہ بات آپ بیت الخلاء سے نکلنے کے بعد بھی کہہ سکتے تھے اس قدر بے صبری کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ جیسے ہی میرے دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ میں یہ قمیص فلاں ضرورت مند کو دے دوں تو میں نے ارادہ کر لیا کہ فوراً یہ نیک کر لوں کیونکہ میں اپنے نفس پر بھروسہ نہیں کر سکتا نہ معلوم اس کا ارادہ کب بدل جائے۔

مروی ہے کہ اکثر اہل جہنم کا چیخنا چلانا ''تسویف العمل'' کی وجہ سے ہوگا۔ (''تسویف العمل'' کا مطلب ہے کسی عمل کے میں بار بار کہنا کہ عنقریب کروں گا۔ اور وہ کام ٹلتا چلا جائے۔ از مرتب)

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام حاکم نے اپنی مستدرک میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت سعد سے مرفوعاً

نقل کیا ہے۔

میانہ روی نبوت کا چوبیسواں حصہ

۵۰۵۹: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ سَرْجِسَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ السَّمْتُ الْحَسَنُ وَالتُّؤَدَۃُ وَالْاِقْتِصَادُ جُزْءٌ مِنْ اَرْبَعٍ وَّعِشْرِیْنَ جُزْءً مِّنَ النُّبُوَّۃِ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٣٢٢/٤ الحديث رقم ٢٠١٠ و مالك في الموطأ ٩٥٤/٢ الحديث رقم ١٧ من كتاب الشعر۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پسندیدہ طریقہ اور تسلی و اطمینان سے کام کی انجام دہی اور میانہ روی یہ نبوت کا چوبیسواں حصہ ہے۔ (ترمذی)

تشریح: السمت الحسن: کے متعدد معانی بیان کئے گئے ہیں۔

صاحب فائق لکھتے ہیں: **السمت اخذ المنهج ولزوم الحجة**

ایک شارح لکھتے ہیں: **السمت الطريق، ويستعار لهيئة اهل الخير**

ایک معنی یہ بیان کئے گئے ہیں: **السيرة المرضيه والطريقة المستحسنة**

امام خطابیؒ فرماتے ہیں: **الهدى والسمت حالة الرجل ومذهبه** سب کا حاصل تقریباً ایک ہی ہے۔

الاقتصاد: تورپشتیؒ فرماتے ہیں: اقتصاد کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم محمود و مذموم کا درمیانی طریقہ، جیسا کہ جود و عدل اور بخل و جور کی درمیانی حالت۔ اس ارشاد باری تعالیٰ: ﴿**ومنهم مقتصد**﴾ [فاطر۔ ۳۲] میں یہی قسم مراد ہے۔

اقتصاد کی دوسری قسم وہ ہے، جو علی الاطلاق محمود ہے۔ اس قسم کا تعلق ان امور و اشیاء سے ہوتا ہے، جن میں دو رخ ہوتے ہیں ایک رخ افراط اور دوسرا رخ تفریط جیسا کہ جود و سخاوت ہے کہ یہ اسراف و بخل کے درمیان ہے' اور جیسا کہ شجاعت ہے کہ وہ تہور و جبن (پرواہ کیے بغیر لڑائی میں گھس جانے اور بزدلی) کی درمیانی حالت ہے۔ بعض عارفین فرماتے ہیں: **اطلب العلم بحيث لم يمنعك عن العمل، واعمل بحيث لم يشغلك عن العلم۔**

''میانہ روی'' کے معنی ہیں ہر کام اور ہر حالت میں درمیانی راہ اختیار کرنا اور افراط و تفریط (یعنی زیادتی اور کمی) سے اجتناب کرنا' جیسے خرچ کرنے میں نہ تو اسراف کرنا اور نہ بخل کرنا بلکہ درمیانی طریقہ یعنی جود و سخاوت اختیار کرنا۔ ہمت و حوصلہ کے اظہار کے موقع پر نہ تو تہور دکھانا اور نہ بزدل بن جانا بلکہ درمیانی راہ شجاعت کو اختیار کرنا۔ اعتقادی اور نظریاتی معاملات میں بھی میانہ روی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسی عقیدہ پر اعتماد کیا جائے اور وہی نظریہ اپنایا جائے جو دین و دیانت اور عقل و دانش کے اعتبار سے معتدل سمجھا جاتا ہے مثلاً ایک عقیدہ جبر کا ہے اور ایک قدر کا ہے یہ دونوں عقیدے افراط کے حامل ہیں۔ ان دونوں کے برخلاف درمیانی عقیدہ وہ ہے جو اہل سنت والجماعت کا ہے اسی طرح میانہ روی اختیار کرنے کے حکم کا تعلق معیشت سے بھی ہے اور اس کی درمیانی راہ یہ ہے کہ ضروریات زندگی پر نہ تو اتنا خرچ کیا جائے جو اسراف اور عیش و عشرت کی حد تک ہو اور

نہ اس قدر کم خرچ کیا جائے جو تنگی و تکلیف میں مبتلا کر دے بلکہ ان دونوں کے درمیان اعتدال پیدا کیا جائے جیسا کہ خود ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:

الاقتصاد فی النفقة نصف المعيشة

''خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرنا معیشت کا آدھا سرمایہ ہے''۔

غرضیکہ انسانی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر فعل وعمل میں میانہ روی اختیار کرنے کا حکم ہے اور یہی چیز (یعنی ہر ایک امر میں اعتدال ومیانہ روی اختیار کرنا) وہ کمال ہے جو انسان کو اس کی مراد اور اس کے مقاصد تک پہنچاتا ہے کیونکہ بہت دوڑ کر چلنے والا گر پڑتا ہے اور سست رفتاری سے چلنے والا بچھڑ جاتا ہے۔ صرف اعتدال کی چال چل کر ہی منزل پر پہنچا جا سکتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے متعدد مواقع پر راہِ اعتدال اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور بعض چیزوں کا نام لے کر ذکر فرمایا ہے جیسے ایک جگہ ارشاد ہے کہ واقصد فی مشیك (یعنی اپنی چال میں میانہ روی اپناؤ) اور ایک جگہ یوں فرمایا ہے کہ كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا (یعنی کھاؤ پیو اور اسراف سے اجتناب کرو)۔

''حصول علم میں اتنی ہی مشغولیت بہتر ہے جو عمل سے باز نہ رکھے اور عمل میں اسی قدر انہماک روا ہے جو حصول علم سے باز نہ رکھے''۔ علم وعمل میں میانہ روی کی وجہ سے مختلف علمی وعملی آفات سے بچا جا سکتا ہے۔

عرضِ مرتب:

جزء من النبوة: کا مطلب یہ ہے کہ یہ خوبیاں اور صفات ان خوبیوں اور صفات میں سے ایک ہیں جن سے انبیاء کرام متصف ومزین ہوتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ اجزاء نبوت کے عدد کے تعین سے کیا مراد ہے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ اس کی مراد صرف شارع علیہ السلام ہی بیان فرما سکتے تھے۔ جس کو بیان نہیں فرمایا گیا یوں بیان کرنے کو مختلف باتیں کہی جا سکتی ہیں مگر اس کی حقیقت تک چونکہ نورِ نبوت کے علاوہ کوئی بھی انسانی فہم وادراک نہیں پہنچ سکتا اس لئے اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں کہنا چاہئے اور اس کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے سپرد کر دینا چاہئے (از مظاہر حق)

خوش اخلاقی نبوت کا پچیسواں حصہ ہے

۵۰۶۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْهَدْيَ الصَّالِحَ وَالسَّمْتَ الصَّالِحَ وَالْاِقْتِصَادَ جُزْءٌ مِنْ خَمْسٍ وَّعِشْرِيْنَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۵/ ۱۳۶ الحدیث رقم ۴۷۷۶، واحمد فی المسند ۱/ ۲۹۶۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا طریقہ اور خوش اخلاقی اور میانہ روی نبوت کا پچیسواں حصہ ہے۔ (ابوداؤد)

جزء من أربع وعشرين جزء: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

پہلا مطلب یہ ہے کہ یہ تینوں خوبیاں مل کر نبوت کے چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء (کا درجہ رکھتی) ہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان تینوں خوبیوں میں سے ہر ہر خوبی نبوت کے چوبیس اجزاء میں سے ایک ایک جزء ہے۔اس کی تائید حضرت انسؓ کی اس مرفوع روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو ضیاء نے نقل کیا ہے: السمت الحسن جزء من خمسة وسبعین جزء من النبوة۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس عدد مذکور سے تحدید نہیں بلکہ تکثیر مراد ہے۔اوراس کی تائید اگلی حدیث سے بھی ہوتی ہے،جس میں "جزء من خمس وعشرین" کے الفاظ ہیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اختلاف "متصف بہٖ" کی کم وکیف کے اختلاف کے اعتبار سے ہو۔

بعض شراح کا کہنا ہے کہ عددوں کا یہ تفاوت (یعنی چوبیس اور پچیس کا اختلاف) ممکن ہے کہ راویوں سے غلطی ہوئی ہو۔ واضح رہے کہ یہ احتمال پیش کرنا غلط ہے۔اوراس کا سبب ان امور سے غفلت ہے جن کو ہم نقلاً وعقلاً پیش کر چکے ہیں۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: درست یہ تھا کہ اربعة بصیغہ تذکیر فرماتے۔ممکن ہے کہ عدد کو مؤنث لانا کسی تاویل کی وجہ سے ہو۔ مثلاً خصلة، قطعة یا "اجراء الجزء مجری الکل فی التذکیر والتانیث" کے باعث ایسا کیا ہو۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ تمام تاویلات مستحسن ہیں،لیکن یہ کہنا کہ "درست یہ تھا کہ" کھلم کھلا غلطی ہے۔

عرضِ مرتب:

بظاہر قاضیؒ کے کلام سے کسی درجہ میں سوءِ ادب کا پہلو نکلتا ہے۔

الهدی: ھاء کے فتحہ اور دال کے سکون کے ساتھ ہے۔

جزء من خمسة: الجامع کی روایت میں "خمسة" ہے۔یہ زیادہ ظاہر ہے۔

عرضِ مرتب:

"سمت" اور "اقتصاد" کی وضاحت پچھلی حدیث میں ملاحظہ فرمائیے۔

"ہدی صالح" اور "سمت صالح" کے درمیان فرق یہ ہے کہ "ہدی" کا تعلق انسان کے باطنی احوال سے ہے اس کا ترجمہ نیک سیرت کیا گیا ہے۔جس کو نیک خوئی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور "سمت" کا تعلق انسان کے ظاہری احوال وکردار سے ہے اس لئے اس کا ترجمہ "نیک راہ وروش" کیا گیا ہے اس کو نیک چلنی بھی کہا جا سکتا ہے۔

راہ سلوک وطریقت میں ان دونوں کا وہی درجہ ہے جو شریعت میں ایمان واسلام کا ہے۔اس اعتبار سے نیک خوئی اور نیک چلنی یہ دونوں خوبیاں ایک ساتھ جس مؤمن میں ہوں تو نور علی نور ہے اوراس کے مرتبہ حقیقت کے کامل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

اس حدیث میں ان خوبیوں کو پچیس اجزاء میں سے ایک جز کہا گیا ہے جب کہ پچھلی حدیث میں چوبیس کا عدد منقول ہوا ہے۔دونوں روایتوں میں یہ تفاوت وفرق کیوں ہے؟اس کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں:

اول: یہ کسی راوی کے وہم وخطا میں مبتلا ہو جانے کی بنا پر ہے۔

دوم: اس میں بھی کوئی بھید ہے کہ حضور ﷺ نے کسی موقع پر تو چوبیس کا عدد ذکر فرمایا ہے اور کسی موقع پر پچیس کا۔

سوم: ممکن ہے پہلے تو حضور ﷺ نے یہی فرمایا کہ یہ خوبیاں نبوت کے چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء ہیں اور پھر آپ ﷺ نے

از راہ عنایت ان خوبیوں کا ایک درجہ اور بڑھا دیا اور یہ فرمایا کہ یہ خوبیاں نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔

چہارم: پچھلی حدیث میں جن تین خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ مل کر چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء کا درجہ پاتی ہیں اور اس حدیث میں جن تین خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ مل کر پچیس اجزاء میں سے ایک جزء کا درجہ پاتی ہیں' اس صورت میں یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ یہ راوی کے وہم وخطا میں مبتلا ہو جانے کا نتیجہ ہے کہ اس سے ایک روایت میں چوبیس کا عدد نقل ہوا اور ایک روایت میں پچیس کا۔

تخریج: اس حدیث کو امام حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔

گفتگو امانت ہے

۵۰۶۱:وَعَنْ جَابِرِ ابْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ الْحَدِيْثَ ثُمَّ الْتَفَتَ فَهِيَ اَمَانَةٌ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ١٨٨/٥ الحديث رقم ٤٨٦٨، والترمذی فی السنن ٣٠١/٤ الحديث رقم ١٩٥٩، واحمد فی المسند ٣٧٩/٣۔

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کسی آدمی نے ایک بات کی پھر وہ دوسری طرف متوجہ ہو گیا تو وہ بات امانت ہے۔(ترمذی' ابوداؤد)

تشریح: فهي: خبر کی رعایت کے پیش نظر ضمیر مؤنث لائی گئی ہے۔اور بعض کا کہنا ہے، کہ چونکہ ''حدیث'' بمعنی ''حکایت'' ہے اس لئے مؤنث لائی گئی ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ اس کی وہ بات' سننے والوں کے لئے ایک امانت کا حکم رکھتی ہے لہٰذا ان کو چاہئے کہ وہ اس امانت کو ظاہر کر کے خیانت نہ کریں۔

مظہرؒ نے ''التفت'' کی وضاحت ''غاب'' کے ساتھ کی ہے۔اس صورت میں ''ثم'' اپنے اصل معنی یعنی ''تراخی'' کیلئے ہوگا۔اس سے تعقیب کا حکم بطریق اولی مستفاد ہو رہا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں:''التفت'' عبارت ہے ''التفات خاطره الى ما تكلم'' کہ پھر وہ احتیاطاً دائیں بائیں دیکھتا ہے، چنانچہ ''ثم'' تراخی فی الرتبة کے لئے ہے۔اور فاء کا ترتب اس پر دال ہے، پہلا سبب اور دوسرا مسبّب ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ تکلف ہے،اس کی کوئی حاجت نہیں، چونکہ حکم عام ہے، مخصوص نہیں ہے،اور فاء جزاء کے لئے لازم ہے،لہٰذا طیبیؒ کے مدعا پر کوئی دلیل نہیں ہے۔اس حدیث کا اجمالی مفہوم وہ نکلتا ہے، جو اگلی حدیث: المجالس بالأمانة کا ہے اور اس کے مستثنیات کا ذکر عنقریب آ رہا ہے۔

تخریج: اسی طرح امام احمد اور ضیاء نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے،اور ابو یعلی نے اس حدیث کو اپنی مسند میں حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔

مؤتمن: باب افتعال سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، ''امن'' سے ماخوذ ہے۔

واستوص به معروفا: ("معروفًا" مفعول مطلق کے قائم مقام ہے۔) ای استیصاء معروف۔

استیصاء معروف اس جملہ کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں:

① قیل: معناه لا تأمره الا بالمعروف والنصح له

② قیل: وص فی حصه بمعروف (کذا ذکرہ زین العرب)

③ قال الطیبیؒ: ای اقبل وصیتی فی حقه احسن ملکته بالمعروف

ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ جب حضرت ابوالہیثم رضی اللہ عنہ اس غلام کو لے کر اپنے گھر آئے اور اہلیہ محترمہ سے فرمایا کہ سرکار ﷺ نے مجھ کو یہ غلام عطا کیا ہے اور اس کے ساتھ اچھا سلوک اور بھلائی کرنے کی وصیت فرمائی ہے تو ان کی بیوی نے کہا کہ اس وصیت پر عمل پیرا ہونے کا حق شاید پوری طرح ادا نہ ہو سکے اس لئے اس کے ساتھ حسن سلوک یہی ہے کہ اس کو آزاد کر دو۔

قوله: فانی رأیته یصلی: حدیث مبارکہ کا یہ جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کسی شخص میں آثار صلاح مثلاً نماز وغیرہ ظاہر ہوں تو اس شخص کے بہتر ہونے پر استدلال کیا جا سکتا ہے، چونکہ نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام ترمذی نے جامع اور شمائل ہر دو میں ذکر کیا ہے۔ شمائل میں اس روایت کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ ہم "باب الضیافۃ" میں ذکر کر چکے ہیں۔ اور اس حدیث میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ انہوں نے وہ غلام آنحضرت ﷺ کی نصیحت کے پیش نظر آزاد کر دیا تھا۔

حدیث کے ان الفاظ: "المستشار مؤتمن" کی تخریج متعدد محدثین نے کی ہے۔ چنانچہ اصحاب کتب اربعہ نے حضرت ابو ہریرہ سے اور امام ترمذی نے ام سلمہ سے نقل کیا ہے۔ ابن ماجہ نے بحوالہ ابن مسعودؓ روایت کیا ہے۔

امام طبرانی نے یہ روایت کبیر میں حضرت سمرہ سے ان الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے: المستشار مؤمن، ان شاء اشار وان شاء لم یشر

الاوسط میں حضرت علیؓ سے ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے: المستشار مؤتمن، ان شاء اشار، وان شاء لم یشر

اور الاوسط میں حضرت علیؓ سے مروی ایک اور حدیث میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

المستشار مؤتمن، فاذا استشیر فلیشر بما هو صانع لنفسه۔

جس سے مشورہ کیا جائے وہ امین ہے

۵۰۶۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِاَبِی الْهَیْثَمِ بْنِ التَّیِّهَانِ هَلْ لَكَ خَادِمٌ قَالَ لَا فَقَالَ فَاِذَا اَتَانَا سَبْیٌ فَأْتِنَا فَاُتِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِرَاْسَیْنِ فَاَتَاهُ اَبُوالْهَیْثَمِ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ اخْتَرْ مِنْهُمَا فَقَالَ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اخْتَرْلِیْ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ اِنَّ الْمُسْتَشَارَ مُؤْتَمَنٌ خُذْ هٰذَا فَاِنِّیْ رَاَیْتُهٗ یُصَلِّیْ وَاسْتَوْصِ بِهٖ مَعْرُوْفًا۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ٥/٣٤٥ الحدیث رقم ٥١٢٨ مختصراً، واخرجه الترمذی فی ٤/٥٠٤ الحدیث رقم ٢٣٦٩ و ابن ماجه فی ٢/١٢٢٣ الحدیث رقم ٣٧٤٥ واحمد فی المسند ٤/١٧٢۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوالہیثم بن تیہان رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ تمہارا کوئی خادم ہے؟ عرض کیا نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب ہمارے ہاں قیدی آئیں تو پھر ہمارے پاس آنا چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو آدمی لائے گئے ادھر سے ابوالہیثم آ گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان دونوں میں سے ایک کو پسند کر لو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی میرے لئے منتخب فرما دیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہے تم یہ لے جاؤ میں نے اسے نماز پڑھتے دیکھا ہے اور اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا۔ (ترمذی)

تین مجالس جن کی بات امانت نہیں

۵۰۶۳: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ اِلَّا ثَلٰثَةَ مَجَالِسَ سَفْكُ دَمٍ حَرَامٍ اَوْ فَرْجٌ حَرَامٌ اَوِ اقْتِطَاعُ مَالٍ بِغَيْرِ حَقٍّ۔

(رواه ابوداؤد وذکر حدیث ابی سعید وَاِنَّ اَعْظَمَ الْاَمَانَةِ فی باب المباشرة فی الفصل الاول)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٥/١٨٩ الحدیث رقم ٤٨٦٩، والترمذی فی ٤/٣٠١ الحدیث رقم ١٩٥٩، واحمد فی المسند ٣/٣٤٢۔

ترجمه: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجالس کی باتیں امانت ہوتی ہیں مگر تین مجالس اس سے مستثنیٰ ہیں: ❶ حرام خون بہانے کی بات کی جائے۔ ❷ حرام شرمگاہ کا مشورہ کیا جائے۔ ❸ ناحق مال کے حصول کی بات کی جائے۔ (ابوداؤد) حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت: **ان اعظم الامانة باب المباشرة** کی پہلی فصل میں ذکر کی جا چکی ہے۔

تشریح: **الاثلاثة: مجالس: ای احدی الثلاثة من المجالس۔**

سفك دم: " **سفك** " مرفوع ہے (خبر ہونے کی وجہ سے)۔ تقدیری عبارت یوں ہے: **هی مجلس اراقة دم۔**

حرام: صفت ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ **ای دم حرام۔**

مظہرؒ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے یہ بات سنے کہ میں فلاں آدمی کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں یا فلاں عورت کے ساتھ بدکاری کروں گا یا فلاں شخص کا مال زور و زبردستی ہتھیاؤں گا تو اس طرح کی بات سننے والے کو چاہئے کہ وہ اس کو ایسا راز نہ سمجھے جس کو پوشیدہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے بلکہ اس کو فوراً ظاہر کر دے (یعنی اس بات سے متعلقہ لوگوں کو آگاہ کر دے تاکہ وہ ہوشیار ہو جائیں اور اپنے آپ کو بچائیں۔ اسی طرح اس مجلس کی باتوں کا افشاء کرنا بھی جائز ہے جن میں دین وملت اور قوم کو نقصان پہنچانے پر گفتگو و تجویز ہوئی ہو!)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مؤمن کے لئے مناسب یہ ہے کہ اگر وہ کسی مجلس میں لوگوں کو کوئی برا کام کرتے دیکھے تو وہ ان کی اس بد عملی کا چرچا نہ کرتا پھرے۔ البتہ تین مجلسیں ایسی ہیں کہ ان میں کی جانے والی برائیوں کا چرچا کیا جا سکتا ہے۔ جن میں

سے ایک مجلس وہ ہے جس میں کسی کو ناحق قتل کیا جا رہا ہو' دوسری مجلس وہ ہے جس میں کسی عورت کی عصمت لوٹی جا رہی ہو اور تیسری مجلس وہ ہے جس میں کسی شخص کا مال ناحق ہتھیایا جا رہا ہو۔

''بغیر حق'' کی قید کا تعلق صرف آخری الفاظ سے ہے، اور لفظ ''حرام'' سے عدول کر کے یہ اسلوب اختیار کرنا اس وجہ سے ہے کہ اس کا مفہوم حلال سے نکلتا ہے اس لیے کہ لوگوں کا مال ظلماً لوٹنا حرام ہے، خواہ مال حلال ہو کہ حرام ہو۔ لہٰذا جار مجرور کا تعلق ''اقتطاع'' کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

تخریج وتوضیح: حدیث کا پہلا حصہ: '' **المجالس بالأمانة**'' خطیب نے حضرت علی سے نقل کیا ہے۔

ابوسعید کی وہ مکمل حدیث یوں ہے: **ان اعظم الامانة عند اللّٰه يوم القيامة الرجل يفضى الى امرأته وتفضى اليه ثم ينشر سرها۔**

قوله: ذكر حديث أبي سعيد...... : امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ یہ حدیث مصابیح میں مکرر آئی ہے۔ نیز اس حدیث کو حسان میں ذکر کرنے کے بجائے صحاح میں ذکر کرنا اولیٰ تھا۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں بظاہر اس حدیث کو یہاں کے بجائے وہاں اس لئے ذکر کیا کہ یہ حدیث اُس باب کے زیادہ مناسب تھی۔ چنانچہ یہ اعتراض بھی ہے اور اعتذار بھی ہے، کہ کہیں کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ مؤلف نے اس حدیث کو ساقط کر دیا ہے۔ واللّٰہ اعلم

الفصل الثالث:

عقل کے سبب آدمی مسئول ہے

۵۰۶۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ قَالَ لَهٗ قُمْ فَقَامَ ثُمَّ قَالَ لَهٗ اَدْبِرْ فَاَدْبَرَ ثُمَّ قَالَ اَقْبِلْ فَاَقْبَلَ ثُمَّ قَالَ لَهُ اُقْعُدْ فَقَعَدَ ثُمَّ قَالَ لَهٗ مَا خَلَقْتُ خَلْقًا هُوَ خَيْرٌ مِّنْكَ وَلَا اَفْضَلُ مِنْكَ وَلَا اَحْسَنُ مِنْكَ بِكَ اٰخُذُ وَبِكَ اُعْطِيْ وَبِكَ اُعْرَفُ وَبِكَ اُعَاتِبُ وَبِكَ الثَّوَابُ وَعَلَيْكَ الْعِقَابُ وَقَدْ تَكَلَّمَ فِيْهِ بَعْضُ الْعُلَمَآءِ۔

أخرجه البيهقي في شعب ٤/ ١٥٤ الحديث رقم ٤٦٣٣۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو اس سے فرمایا کہ کھڑی ہو جا! وہ کھڑی ہو گئی پھر اس سے فرمایا کہ پشت پھیر اس نے پشت پھیرلی' پھر اس سے فرمایا کہ میری طرف منہ کر' اس نے خدا کی طرف منہ کر لیا پھر اس سے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ! وہ بیٹھ گئی اور پھر اس سے فرمایا کہ میں نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو تجھ سے بہتر ہو اور تجھ سے کوئی افضل ہے اور نہ کوئی اچھا ہے۔ میں تیری وجہ سے پکڑوں گا اور تیرے ذریعہ ہی سے عطاء کروں گا میری پہچان تیری وجہ سے ہوگی اور تیری وجہ سے میں عتاب کروں گا تیرے ہی سبب عذاب وثواب ہے بعض محدثین نے اس روایت میں کلام کیا ہے۔ (بیہقی)

تشریح: حدیث میں ''عقل'' کی طرف قیام وقعود، ادبار واقبال کا اسناد کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کی وضاحت علماء نے

مختلف طریقے سے کی ہے۔

اس کا پہلا مطلب یہ بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے عقل کو جسم کے ساتھ پیدا کیا تھا' جیسا کہ قیامت میں حساب کتاب کے بعد موت کو دنبہ کی صورت میں لایا جائے گا۔ اور جنت وجہنم کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا۔

دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ قیام وقعود اور اقبال وادبار سے مراد وہ امور معنویہ ہیں، جو عقل سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور ارباب عقول کے اختلاف کے اعتبار سے اس سے ناشی ہوتے ہیں۔

تیسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ قیام کنایہ ہو ظہور سے، قعود کنایہ ہو اس کے خفاء سے، اقبال کنایہ ہو توجہ الی الشئی سے اور ادبار کنایہ ہو اعراض عن الشئی سے ارادۂ ازلی کے تعلق کے اعتبار سے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ مجموعہ اس بات سے کنایہ ہے کہ عقل محل تکلیف ہے۔ یہی اوامر ونواہی کا منتہیٰ ہے اور مکلف مخلوق کو پیدا کرنے کی غرض یعنی عبادت کہ جس کیلئے آسمان وزمین کی تخلیق وجود میں آئی۔ عقل کے ذریعہ ہی مکمل ہوتی ہے۔ اور اس پر دلالت اس کا مابعد کر رہا ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: لفظ غرض کی جگہ لفظ حکمت درست ہے، چونکہ افعال باری تعالیٰ معلل بالاغراض ہونے سے منزہ ہیں۔

عقل کی وجہ تسمیہ یہ ہے: **انہ یعقل صاحبہ عما لا ینبغی** ''عقل'' کو'' نہیۃ '' بھی کہتے ہیں۔ اور وجہ یہ ہے: **انہ ینھی عن الفحشاء والمنکر** امام راغبؒ فرماتے ہیں: عقل اس قوت کو کہتے ہیں جو قبول علم کیلئے تیار ہو۔ اور اس علم کو بھی عقل کہتے ہیں، جس کو انسان اس قوت یعنی عقل کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے کہا گیا ہے:

فان العقل عقلان فمطبوع ومسموع

بلاشبہ عقل کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم ہے عقل مطبوع اور دوسری قسم ہے عقل مسموع۔

ولا ینفع مسموع اذا لم یك مطبوع

اور عقل مسموع نفع نہیں دیتی، جب تک کہ وہ عقل مطبوع نہ ہو۔

کما لا تنفع الشمس وضوء العین ممنوع

جیسا کہ سورج فائدہ نہیں دیتا، درانحالیکہ آنکھ میں نور بینائی نہ ہو۔

عقل کی پہلی قسم کی طرف اشارہ اس حدیث میں ہے: **ما خلق اللّٰہ خلقاً أکرم علیه من العقل**

اور عقل کی دوسری قسم کا بیان اس حدیث مبارکہ میں ہے: **ما کسب احد شیئا افضل من عقل یھدیه الی ھدی او یردہ عن ردی** اس ارشاد باری تعالیٰ میں عقل کے یہی معنی مراد ہیں: ﴿**وما یعقلھا الا العالمون**﴾ [العنکبوت: ۴۳] ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: جیسے کہ عقل مسموع نافع نہیں جب تک کہ مطبوع نہ ہو، اسی طرح عقل مطبوع بھی نافع نہیں جب تک مسموع نہ ہو۔ اس کی بہت واضح مثال حکماء ہیں، ان کا زعم ہے کہ وہ اکبر العقلاء (سب سے زیادہ عقل والے) ہیں، لیکن ان کی عقول مطبوعہ ان کیلئے نافع ثابت نہ ہوئیں، چونکہ انہوں نے انبیاء اور انبیاء کے اقوال مسموعہ کی متابعت نہیں کی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أفرأیت من اتخذ الٰھه ھواہ وأضله اللّٰہ علی علم﴾ [الجاثیہ: ۲۳] اور اس کی آنکھوں دیکھی نظیر پیدائشی بہرا ہے کہ وہ اپنی

عقل مطبوع سے نفع اٹھاتا ہے اور عقل مسموع کا اس کے پاس کوئی حصہ ہی نہیں۔

تخریج: اس حدیث کو امام بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے۔ اس حدیث کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔

سخاوی "مقاصد" میں لکھتے ہیں: **انه كذب موضوع اتفاقًا۔**

شیخ محمد بن یعقوب فیروز آبادی "مختصر" میں لکھتے ہیں: **اول ما خلق الله العقل..... وما خلق الله خلقا اكرم من العقل للحكيم ضعيف۔**

امام طیبیؒ لکھتے ہیں: **قال الشيخ تقي الدين ابن تيمية الحديث الذى ذكروه كذب موضوع عند اهل المعرفة بالحديث، كما ذكر ذلك ابو جعفر العقيلي، وابو حاتم السبتي، وابو الحسن الدار قطني، وابن الجوزي وغيرهم اه۔**

ترجمۃ الباب سے حدیث کی مناسبت:

اس حدیث کو اس باب میں ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حذر و تانی، عقل کے نتائج میں سے ہیں۔ واللہ اعلم۔

قیامت میں عقل کے مطابق بدلہ

۵۰۶۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَكُوْنُ مِنْ اَهْلِ الصَّلٰوةِ وَالصَّوْمِ وَالزَّكٰوةِ وَالْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ وَحَتّٰى ذَكَرَ سِهَامَ الْخَيْرِ كُلَّهَا وَمَا يُجْزٰى يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِلَّا بِقَدْرِ عَقْلِهٖ ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٤/ ١٥٥ الحديث رقم ٤٦٣٧۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک آدمی نماز، روزہ، اور حج وزکوۃ والے لوگوں سے ہوتا ہے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی کی تمام اقسام کا ذکر فرمایا اور فرمایا قیامت میں وہ اپنی عقل کے مطابق بدلہ پائے گا۔

تشریح: **وما يجزى:** صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ ای ما یثاب

الا بقدر عقله کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں:

① **اى بمقدار استعماله في هذه العبادات**

دوسرا احتمال یہ ہے کہ عقل سے مراد "مستفاد بالعقل" ہے، کہ عبادات پر بیش بہا اجر و درجات، اصحاب علم کے مراتب اور ارباب عقل کے مراتب کے اختلاف کے ساتھ ہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس میں اشارہ ہے کہ عقل مسموع، عقل مطبوع کے بغیر مکمل طور پر نافع نہیں، چونکہ عقل ہی وہ ممیز ہے، کہ جو ہر شیء کو اس کے موقع محل پر رکھتی ہے۔ اس کے ذریعہ نماز نماز، روزہ روزہ، اور صدقہ صدقہ میں فرق ہوتا ہے۔ چونکہ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی ایک (ہی رکعت پڑھ جاتا ہے جو غیروں کی ہزار رکعت سے افضل ہوتی ہے۔ یہی معاملہ صدقہ

اور دیگر اعمال خیر کا ہے بعض مرتبہ یوں بھی ہوتا ہے کہ وہی عمل اس کیلئے وبال بن جاتا ہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں یہ بات مخفی نہیں کہ عقل مطبوع امور شرعیہ میں کوئی تمیز نہیں کر پاتی، اسی وجہ سے نہ تحسین عقلی کا کوئی اعتبار ہے اور نہ تقبیح عقلی کا کوئی اعتبار ہے۔ چنانچہ یہاں مدار عقل مسموع پر ہے، لیکن عقل مطبوع کی مدد سے، بایں طور کہ مثلاً نماز شرعی طریقہ کے مطابق اداء کرے، ایسی جگہ اداء کرے کہ جو اس کے شایان شان ہے، اس طرح دیگر عبادات اور نیتوں کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ مثلاً کمال صلاۃ کا مدار، نماز کے شروط، ارکان، واجبات، سنن اور آداب مسموعہ معروفہ کے بعد حضور قلب مع اللہ اور قطع النظر عما سواہ پر ہے۔ چنانچہ امام احمد، ابوداؤد، اور ابن حبان حضرت عمار بن یاسرؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:

ان الرجل لینصرف وما کتب له الا عشر صلاته، تسعها ثمنها سبعها سدسها خمسها ربعها ثلثها نصفها۔

اخلاق بڑا اشرف ہے

۵۰۶۶: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا اَبَاذَرٍّ لَا عَقْلَ كَالتَّدْبِیْرِ وَلَا وَرَعَ كَالْكَفِّ وَلَا حَسَبَ كَحُسْنِ الْخُلُقِ۔

أخرجه ابن ماجه في السنن ۲/۱۴۱۰ الحديث رقم ۴۲۱۸، والبيهقي في شعب الايمان ۵/۲۷ الحديث رقم ۵۶۴۷۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوذر! تدبیر جیسی کوئی عقل نہیں، پرہیز جیسا کوئی تقوی نہیں اور اچھے اخلاق جیسا کوئی حسب نہیں۔ (بیہقی)

تشریح: قوله: لا عقل کالتدبیر:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: تدبیر سے مراد عقل مطبوع ہے، چونکہ ماقبل میں گزرا کہ عقل مسموع کوئی معتد بہ چیز نہیں اور نہ صاحب عقل مسموع کیلئے ثواب کی امید کی جا سکتی، الا یہ کہ عقل مطبوع بھی ساتھ ہو۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں ماقبل میں یہ بات گزر چکی ہے، کہ عقل مطبوع، عقل مسموع کے بغیر نافع نہیں، بلکہ بعض مرتبہ عقل مسموع بغیر عقل مطبوع کے بھی نفع دے جاتی ہے، مثلاً جیسا کہ کوئی شخص محض تقلیداً ایمان قبول کر لے۔ چنانچہ "لا عقل کالتدبیر" کا مطلب یہ ہے: **لا عقل کعقل الذی یصحبه التدبیر**

"تدبیر" کے معنی ہیں ہر کام کے انجام پر نظر رکھ کر اس کے لئے سامان کرنا۔ لہٰذا "عقل تدبیر کے مانند نہیں" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی عقل، عقل تدبیر (وہ عقل کہ جس کے ساتھ تدبیر ہو) کے برابر نہیں ہو سکتی! گویا مذکورہ جملہ میں "عقل" سے مراد مطلق علم و ادراک ہے "تدبیر" سے مراد عقل تدبیر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی کام کیا جائے پہلے اس کے انجام پر نظر رکھی جائے اور اس میں جو بھلائیاں و برائیاں ہوں ان کو پہچانا جائے۔

قوله: ولا ورع کالکف: "ورع" کے معنی پرہیزگاری کے ہیں جس کو تقوی بھی کہا جاتا ہے اگر چہ بعض حضرات کے

نزدیک ورع اور تقویٰ کے درمیان بھی فرق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ورع کا درجہ تقویٰ کے درجہ سے بڑھا ہوا ہے بایں طور کہ تقویٰ کا مطلب ہے کہ حرام چیزوں سے پرہیز کرنا اور ورع کا مطلب ہے ان چیزوں سے بھی پرہیز کرنا جو مکروہ یا مشتبہ ہوں لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ تقویٰ اور تورع دونوں کے ایک ہی معنی ہیں اور عام طور پر سب لوگ ان دونوں کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ حدیث میں جو دو لفظ ورع اور کف نقل کیے گئے اور ان میں سے ورع کا ترجمہ پرہیزگاری اور کف کا ترجمہ اجتناب واحتیاط کیا گیا ہے تو کیا ان دونوں کے درمیان کچھ فرق ہے؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیونکہ ورع کے معنی ہیں باز رہنا اور ''کف'' کے بھی معنی باز رہنے کے ہیں اس صورت میں حدیث کے اس جملہ لا ورع کالکف پر اشکال واقع ہوتا ہے کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ یوں ہوگا ''باز رہنا' باز رہنے کے برابر نہیں''۔ اور ظاہر ہے کہ یہ معنی درست نہیں۔ پہلا جواب: یہاں کف کے معنی مسلمانوں کو ایذا پہنچانے یا زبان کو لایعنی باتوں میں مشغول کرنے سے پرہیز کرنا ہے اور چونکہ دینی طور پر بھی اور سماجی ومعاشرتی طور پر بھی ان دونوں چیزوں میں سے ہر ایک کے مفاسد اور اس کی برائیاں بہت زیادہ ہیں اس لئے ان کے مفاسد کو از راہ مبالغہ بیان کرنے کے لئے گویا یہ فرمایا کہ ورع یعنی حرام چیزوں سے باز رہنا ایک اعلیٰ وصف ہے دوسرا جواب: ورع وتقویٰ کے لغوی معنی اگرچہ باز رہنا اور پرہیز کرنا ہیں لیکن شرعی طور پر ان کے مفہوم میں امتثال اور اجتناب دونوں ایک ساتھ داخل ہیں اور اگر ان کا مفہوم صرف اجتناب یعنی پرہیزگاری ہی ہوتو احکام فرماں برداری ترک کرنے سے پرہیز کرنا بھی ان کے مفہوم میں داخل ہوتا لہٰذا بات وہی رہی کہ ورع اور تقویٰ کے مفہوم میں امتثال اور اجتناب دونوں داخل ہیں۔ اس صورت میں بھی حاصل یہی نکلے گا کہ ورع اور تقویٰ کا اصل مفہوم یہ ہے کہ جو احکام دیئے گئے ہیں ان پر چلا جائے خواہ امتثال کے طور پر ہو یا اجتناب کے طور پر اس طرح جب یہ بات واضح ہوگئی کہ ورع کا تعلق دو چیزوں سے ہے یعنی جن امور کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کو اختیار کرنا اور جن امور سے منع کیا گیا ہے ان سے باز رہنا اور ''کف'' کا تعلق صرف ایک چیز یعنی ممنوعات سے باز رہنے سے ہے تو مذکورہ اشکال رفع ہوگیا۔

عرض مرتب:

جانب اجتناب کی رعایت' جانب امتثال کی رعایت کی بہ نسبت زیادہ مقدم اور زیادہ ضروری ہے' یعنی شریعت نے جن چیزوں سے باز رہنے کا حکم دیا ہے وہ مقدم اور زیادہ ضروری ہے بہ نسبت اس بات کے کہ جن چیزوں کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسی بنا پر علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص جانب امتثال میں فرض وواجبات اور سنن موکدہ پر اکتفا کرے اور نوافل ومستحبات کو ترک کرے لیکن جانب اجتناب میں خوب اہتمام کرے یعنی تمام حرام مکروہ اور مشتبہ چیزوں سے پرہیز کرے تو وہ شخص منزل مقصود پالے گا۔ یعنی معرفت وحقیقت اور قرب خداوندی کا درجہ حاصل کرے گا اس کے برخلاف اگر کوئی شخص جانب امتثال میں خوب اہتمام کرے یعنی فرائض وواجبات اور سنن موکدہ پر بھی عمل کرے اور تمام نوافل ومستحبات کو بھی ادا کرے لیکن جانب اجتناب کی رعایت نہ کرے یعنی ممنوعات کا ارتکاب کرتا رہے تو وہ شخص منزل مقصود کو نہیں پہنچے گا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بیمار ہو اور وہ پرہیز تو پوری طرح کرے لیکن دوا نہ کھائے تو وہ اچھا ہو جائے گا خواہ کتنی ہی دیر میں اچھا ہو اس کے برخلاف اگر وہ دوائیں کھاتا رہے لیکن پرہیز بالکل نہ کرے تو وہ ہرگز شفا نہیں پائے گا۔ بلکہ روز بروز بیمار ہوتا چلا جائے گا۔ (مظاہر حق)

قولہ: و لا حسب کحسن الخلق: ''حسب'' اصل میں کہتے ہیں اپنے اور اپنے باپ دادا کے فضائل و مناقب کو گنوانا اور اپنے خاندان کے فخریہ کارناموں کو بیان کرنا۔

لہٰذا اس جملہ میں اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ انسان کی ذاتی فضیلت و بزرگی اور انسانیت کا اصل تقاضا یہ ہے کہ اس میں خوش خلقی ہو اگر کوئی شخص خوش خلقی کی صفت سے محروم ہے تو وہ لاکھ اپنے مناقب گنوائے اور لاکھ اپنے فخریہ کارناموں کا اظہار کرے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی۔

اگر خوش خلقی میں ''خلق'' سے مراد تمام باطنی اوصاف ہوں تو ظاہر ہے کہ حسن اخلاق کو سب سے بہتر اور اصل فضیلت کہا جائے گا

اور اگر ''خلق'' سے مراد نرم خوئی و مہربانی اور مروت کے اوصاف ہوں جیسا کہ عام طور پر خوش خلقی انہی اوصاف کو کہا جاتا ہے تو اس صورت میں یہ فرمانا کہ حسب و فضیلت خوش خلقی کے برابر نہیں ہے خوش خلقی کی فضیلت کو از راہ مبالغہ بیان کرنے کے لئے ہوگا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: درست بات یہ ہے کہ پہلا خاص ہے اور دوسرا عام ہے، چونکہ حسن خلق تمام مستحسنات کو شامل ہے، چنانچہ مروی ہے: **الخلق الحسن احسن الحسن** اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**وانك لعلى خلق عظيم**﴾ [القلم۔۴]

حسن سوال نصف علم ہے

۵۰۶۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاِقْتِصَادُ فِي النَّفَقَةِ نِصْفُ الْمَعِيْشَةِ وَالتَّوَدُّدُ اِلَى النَّاسِ نِصْفُ الْعَقْلِ وَحُسْنُ السُّوَالِ نِصْفُ الْعِلْمِ۔

(رواه البيهقي الاحاديث الاربعة في شعب الايمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ۵/ ۲۵۴ الحديث رقم ۶۵۶۸۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خرچہ میں میانہ روی نصف معیشت ہے لوگوں سے محبت کرنا نصف عقل ہے اور حسن سوال نصف علم ہے۔ ان چاروں روایتوں کو بیہقی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: الاقتصاد في النفقة نصف المعيشة: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی درحقیقت اس آیت کریمہ سے مقتبس ہے: ﴿**والذين اذا انفقوا لم يسرفوا ولم يقتروا وكان بين ذلك قواما**﴾ [الفرقان۔۶۷]

(جزء کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اور اپنے متعلقین کی ضروریاتِ زندگی خرچ کرنے میں نہ تو اسراف کرنا اور نہ تنگی و سختی کرنا بلکہ اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنا زندگی کا آدھا سرمایہ ہے بایں طور کہ انسان کی معاشی زندگی کا دارومدار دو چیزوں پر ہے ایک تو آمدنی دوسرے خرچ اور ان دونوں کے درمیان توازن' خوشحالی کی علامت بھی ہے اور معیشت کے مستحکم ہونے کا ذریعہ بھی لہٰذا جس طرح آمدنی کے توازن کا بگڑنا' خوشحالی کے منافی اور معیشت کے عدم استحکام کا سبب ہے۔ اسی طرح اگر اخراجات کا توازن [illegible]ے تو نہ صرف خوش حالی مفقود ہوگی بلکہ معیشت کا سارا ڈھانچہ درہم برہم ہوکر رہ جائے گا۔ لہٰذا مصارف میں اعتدال اور

خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرنا معیشت کا نصف حصہ ہوا۔)

قولہ: والتودد الی الناس نصف العقل: اس (مطلب یہ ہے کہ نیک مسلمانوں کے ساتھ محبت کرنا اوران کی محبت کو اپنے معاملات واحوال میں خیر وبرکت کا سرچشمہ جاننا اس عقل کا نصف حصہ ہے جو حسن معاشرت کی ضامن ہے۔ گویا پوری عقل مندی یہ ہے کہ انسان کوئی کسب وپیشہ اور سعی ومحنت کر کے جائز روزی حاصل کرے اور اس کے ساتھ آپس میں محبت ومروت کے جذبات بھی کارفرما رکھے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے: **علمان خیر من علم واحد**۔ ایک عارف اپنے شاگرد سے کہا کرتے تھے: **أنا وأنت انسان کامل، لأنك حافظ القرآن وأنا مفسرہ** (یعنی تم اور میں مل کر ایک کامل انسان ہیں۔ چونکہ تو حافظ قرآن ہے اور میں مفسر ہوں۔) بظاہر یہی مفہوم اس حدیث میں ہے: **المرء کثیر بأخیه** اس حدیث کو ابن ابی الدنیا نے ''الاخوان'' میں سہل بن سعد سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔

قولہ: وحسن السؤال نصف العلم: مطلب یہ ہے کہ کسی علمی مسئلہ میں خوب سوچ سمجھ کر اور اچھی طرح سوال کرنا آدھا علم ہے کیونکہ جو شخص سوال کرنے میں دانا اور سمجھ دار ہوتا ہے تو وہ اسی چیز کے بارے میں سوال کرتا ہے جو بہت زیادہ ضروری اور بہت کارآمد ہوتی ہے اور چونکہ وہ اپنے علم میں اضافہ کا متمنی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ پوچھی جانے والی چیزوں کے درمیان تمیز کرنا جانتا ہے کہ کیا پوچھنا چاہئے اور کس سے پوچھنا چاہئے اس لئے جب وہ اپنے سوال کا جواب پالیتا ہے تو محل طلب مسئلہ میں اس کا علم پورا ہو جاتا ہے اس اعتبار سے گویا علم کی دو قسمیں ہوئیں ایک تو سوال اور دوسرے جواب۔

رہی یہ بات کہ اچھی طرح سوال کرنے کا مطلب ہے تو جاننا چاہئے کہ ''اچھے سوال'' کا اطلاق اس سوال پر ہوتا ہے جس کے تمام پہلوؤں کی تحقیق وتنقیح کر لی گئی ہو اور اس میں جتنے احتمالات پیدا ہو سکتے ہیں ان سب کی واقفیت ہو تاکہ شافی وکافی جواب پائے اور جواب میں کوئی پہلو تشنہ نہ رہنے پائے اس طرح کا سوال بذات خود علم کی ایک شق ہو گی اور اس پر یہ اشکال وارد نہیں ہو گا کہ جب سوال کرنا، جہل (ناواقفیت) اور تردد پر دلالت کرتا ہے تو سوال کرنے کو نصف علم کس طرح کہا گیا ہے تاہم مذکورہ اشکال کے پیش نظر ایک بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ جو شخص خوب سوچ سمجھ کر اور صحیح انداز میں سوال کرتا ہے اس کے بارے میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسا شخص ہے جو علمی ذوق کا حامل ہے اور علم میں اپنا کچھ حصہ ضرور رکھتا ہے اور اس بات کا خواہش مند ہے کہ اپنے ناقص علم کو پورا کرے لہٰذا اس کے سوال کو نصف علم کہنا موزوں ہو گا۔ اس کے برخلاف جو شخص بغیر سوچے سمجھے اور خراب انداز میں سوال کرتا ہے تو یہ اس کے نقصان عقل وکمال اور جہالت پر دلالت کرتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت امام ابو یوسفؒ نے اپنی علمی مجلس میں اپنے ایک شاگرد کو مسلسل خاموش بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس سے فرمایا کہ یہاں بیان کی جانے والی باتوں میں سے کوئی تمہاری سمجھ میں نہ آئے یا کوئی مسئلہ تمہیں مشکل معلوم ہو رہا ہو تو اس کے بارے میں پوچھ لینا شرمانا نہیں، کیونکہ کسی حل طلب بات میں سوال کرنے سے شرمانا علم سے باز رکھتا ہے اس وقت حضرت امام ابو یوسفؒ روزہ کی تعریف میں گفتگو فرما رہے تھے چنانچہ جب انہوں نے فرمایا کہ روزہ صبح سے شروع ہوتا ہے اور غروب آفتاب تک رہتا ہے تو اسی شاگرد نے سوال کیا کہ حضرت اگر آفتاب غروب ہی نہ ہو تو پھر روزہ کب تک رہے گا؟ حضرت امام ابو یوسفؒ نے (اس کا جاہلانہ سوال سن کر) فرمایا کہ چپ رہو! تمہارا چپ رہنا ہی تمہارے بولنے سے بہتر ہے۔

حاصل یہ کہ سوال کی نوعیت اور سوال کرنے کا انداز سوال کرنے والے کی شخصیت وحالت پر بذاتِ خود دلالت کرتا ہے اور اس کے سوال کی روشنی میں یہ اندازہ نکالنا مشکل نہیں ہوتا کہ یہ شخص بالکل ہی جاہل ہے یا علم سے کچھ سروکار رکھتا ہے۔ جس شخص میں علم وعقل کی روشنی ہوگی اس کا سوال بھی عالمانہ اور عاقلانہ ہوگا اور جو شخص نرا جاہل ہوگا اس کی اور باتوں کی طرح اس کا سوال بھی جاہلانہ اور عامیانہ ہوگا

جب جاہل بات کرتا ہے تو گدھے کی طرح معلوم ہوتا ہے اور جب چپ رہتا ہے تو دیوار کی طرح معلوم ہوتا ہے۔

بعض ارباب حال نے کیا خوب کہا: **ان الجاهل اذا تكلم فهو كالحمار، واذا سكت فهو كالجدار**

آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: **لا أدری أعزير نبی ام لا؟** قرآن کریم میں آتا ہے: ﴿**لا أدری ما يفعل بی ولا بكم**﴾ [الاحقاف۔۹] [**وقل الروح من امر ربی وما اوتيتم من العلم الا قليلا**﴾ [الاسراء۔۸۵]

مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما تھے، کہ ان سے کسی چیز کی بابت سوال کیا گیا، تو آپؓ نے فرمایا: **لا أدری**، چنانچہ ان سے کہا گیا، جب آپؓ جانتے نہیں، تو منبر پر کیوں بیٹھے؟ حضرت علیؓ نے بڑا پیارا جواب دیا: **انما طلعت بقدر علمی، ولو صعدت بقدر جهلی لوصلت السماء** اور ملائکہ کا قول ہے: ﴿**سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا**﴾ [البقرۃ:۳۲]

تخریج: آخری حدیث کو امام طبرانی نے مکارم اخلاق میں ابن عمرؓ سے بھی روایت کیا ہے۔ اور خطیب حضرت انسؓ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں: **الاقتصاد نصف العيش، وحسن الخلق نصف الدين**

امام احمد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں: **ما عال من اقتصد**

بَابُ الرِّفْقِ وَالْحَيَآءِ وَحُسْنِ الْخُلُقِ

نرمی، حیاء اور حسن خلق کا بیان

قوله: الرفق: ''رِفق''۔ راء کے کسرہ کے ساتھ۔ عنف کی ضد ہے۔ اس کے معنی ہیں نرمی اور فروتنی کا رویہ اختیار کرنا' اپنے ساتھیوں کے حق میں مہربان و نرم خو ہونا اور ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آنا اور ہر کام اطمینان وخوش اسلوبی کے ساتھ کرنا۔

قوله: الحیاء: ''حیاء'' سے مراد ہے شرمندہ ہونا۔ اور حیاء دراصل اس کیفیت کا نام ہے جو کسی انسان پر عیب و برائی کے خوف و ندامت کی وجہ سے طاری ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بہترین حیاء وہی ہے جو نفس کو اس چیز میں مبتلا ہونے سے روکے جس کو شریعت نے بری قرار دیا ہے۔

جنیدؒ کا قول یہ ہے کہ حیاء اس کیفیت وحالت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے حاصل ہونے اور ان نعمتوں کا شکر ادا نہ کرنے کی وجہ سے دل میں پائی جائے۔ دقاق رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ حیاء اس کیفیت کا نام ہے جو آقا کے سامنے طلب سے باز رکھتی ہے۔

قوله: حسن الخلق: ''حسن خلق'' یعنی خوش خلق یا اچھے اخلاق کا سب سے واضح مطلب یہ ہے کہ اس چیز کی اتباع و پیروی کی جائے جس کو خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی طرف سے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا ہے یعنی احکام سریعت' آداب طریقت اور احوال حقیقت۔ چنانچہ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ [وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ] [القلم۔ ۴] (اور بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خلق عظیم کے مرتبہ پر فائز ہیں) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اخلاق کیا تھے؟ جن کو ''خلق عظیم'' سے تعبیر کیا گیا ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن کریم ہے۔ یعنی قرآن مجید میں جو اچھی خصلتیں اور اعلیٰ اوصاف بیان کئے گئے ہیں ان کو اپنائے ہوئے تھے اور' قرآن کریم میں جو بری خصلتیں بیان کی گئی ہیں (خواہ ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کی نافرمانی وغیرہ سے ہو یا مخلوق خدا کے ساتھ بدمعاملگی وغیرہ سے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سب سے اجتناب فرماتے تھے (اور یہی چیز انسانی اخلاق وکردار کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے)

رہی اتباع کے درجات کی بات تو ظاہر ہے کہ اتباع بقدر محبت وتوفیق متابعت کے حاصل ہوتی ہے (یعنی جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے جتنا زیادہ سرشار ہوتا ہے اور اس کو اتباع کرنے کی جس قدر توفیق نصیب ہوتی ہے وہ اتنا ہی زیادہ

اور اسی قدر اتباع بھی کرتا ہے اور جس شخص کو آنحضرت ﷺ کی محبت کا جتنا کم حصہ حاصل ہوتا ہے اور اتباع کرنے میں جس قدر کم توفیق نصیب ہوتی ہے وہ اتباع میں بھی اسی قدر پیچھے رہتا ہے۔)

چنانچہ امام شاطبیؒ قراء کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اولو البر والاحسان والصبر والتقی ☆ حلاهم بها جاء القرآن مفصلا

الفصل الاول:

اللہ تعالیٰ نرمی کو پسند کرتا ہے

۵۰۶۸: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ وَيُعْطِيْ عَلَى الرِّفْقِ مَالَا يُعْطِيْ عَلَى الْعُنْفِ وَمَالَا يُعْطِيْ عَلٰى مَاسِوَاهُ (رواه مسلم وفی رواية له) قَالَ لِعَائِشَةَ عَلَيْكِ بِالرِّفْقِ وَاِيَّاكِ وَالْعُنْفَ وَالْفُحْشَ اِنَّ الرِّفْقَ لَايَكُوْنُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا زَانَهُ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا شَانَهُ۔

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢٠٠١ الحديث رقم (٧٧-٢٥٩٣)، والرواية الثانية في ٤/٢٠٠٤ الحديث رقم (٧٨-٢٥٩٤) و ابو داود في السنن ٥/١٥٥ الحديث رقم ٤٨٠٧و٤٨٠٨، والترمذی فی ٥/٥٨ الحديث رقم ٢٧٠١ و ابن ماجه في ٢/١٢١٦ الحديث رقم ٣٦٨٨، والدارمي فی ٢/٤١٦ الحديث رقم ٢٧٩٣ و مالك فی الموطأ ٢/٩٧٩ الحديث رقم ٣٨ من كتاب الاستئذان، واحمد في المسند ٦/١٧١۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نرمی فرمانے والے اور نرمی کو پسند کرنے والے ہیں۔ نرمی پر وہ کچھ دیتا ہے جو سختی پر نہیں دیتا اور اس کے علاوہ پر نہیں دیتا۔ (مسلم)

تشریح: العنف: صاحب قاموس لکھتے ہیں: **هي مثلثة العين ضد الرفق**

قاضیؒ فرماتے ہیں: ظاہر یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ پر ''رفیق'' کا اطلاق بطور اسم جائز نہیں، چونکہ نہ یہ متواتر ہے اور نہ بقصد اسمیت مستعمل ہے، یہاں اس حدیث میں یہ لفظ مابعد حکم کیلئے بطور تمہید کے آیا ہے، گویا کہ ارشاد نبوی یوں ہے: **هو الذی يرفق عباده في امورهم فيعطيهم بالرفق ما لا يعطيهم على** "**ما سواه**" اور **ما لا يعطي على العنف**'' کے بعد'' **ما لا يعطي على ما سواه**'' فرمایا تاکہ اس بات پر دلالت کرے، کہ تمام اسباب میں سے رفق ہی وہ سبب ہے جو'' **انجح**'' اور'' **انفع**'' ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اسی معنی میں شاعر کا یہ قول ہے:

یا طالب الرزق الهنی بقوة
هيهات انت بباطل مشغوف
اكل العقاب بقوة جيف الفلا

ورعى الذباب الشهد وهو ضعيف

''اور مطلب یہ ہے کہ تحصیل رزق کے معاملہ میں انسان کو حرص نہیں کرنا چاہئے بلکہ اپنے معاملہ کو اللہ جل شانہ کے سپرد کر دینا چاہئے کہ تمام مخلوقات کی رزق کی تقسیم اسی کے سپرد ہے، چنانچہ گدھا اپنی تختی کی بدولت مردار کھاتا ہے، اور مکھی اپنے رفق کی بناء پر شہد کی رکھوالی کرتی ہے۔''

تورپشتیؒ فرماتے ہیں: اگر یہ کہا جائے کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد مبارک: ''أنت رفيق والله الطبيب'' کے کیا معنی ہیں؟ تو ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں: الطبيب الحاذق بالشيء الموصوف، ولم يرد بهذا القول نفي هذا الاسم عمن يتعاطى ذلك، وانما حوّل المعنى من الطبيعة الى الشريعة، وبين لهم ان الذى يرجون من الطبيب فالله فاعله، والمنان به على عباده یہ ارشاد گرامی اس حدیث قدسی کی طرح ہے: فان الله هو الدهر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں نہ تو ''طبیب'' ہے، اور نہ ''رفیق'' ہے۔ لہٰذا دعا مانگتے ہوئے ''یا طبیب'' اور ''یا رفیق'' کہنا جائز نہیں۔ اھ۔

اس کلام میں اشارہ ہے کہ ''هو الطبيب وهو الرفيق'' کہنا درست ہے۔ غرض یہ کہ جس اسلوب میں یہ اسماء منقول ہیں اس اسلوب میں ان اسماء کا اطلاق درست ہے۔ اور جہاں تک تعلق ہے آنحضرت ﷺ کے آخری کلام ''الرفيق الاعلى'' کا سو اس میں احتمال ہے، کہ ''الرفيق الأعلى'' سے مراد اللہ جل شانہ ہوں اور یہ بھی احتمال ہے کہ ملأ اعلیٰ مراد ہوں، لہٰذا احتمال کے ہوتے ہوئے استدلال درست نہیں۔

شرح مسلم میں لکھتے ہیں: مازریؒ نے فرمایا: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو صرف ان اسماء سے موسوم کرنا درست ہے، کہ جو اسماء باری تعالیٰ نے خود اپنے نام کے طور پر بتلائے ہیں، یا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بتائے ہیں۔ یا جن پر اجماع امت ہے۔ اور جن اسماء کے اطلاق کی بابت نہ اذن مروی ہے، اور نہ ممانعت مروی ہے سو، ان میں اختلاف ہے، بعض کا کہنا ہے: يبقى على ما كان قبل ورود الشرع فلا يوصف به ولا يمنعه منه اور بعض نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اللہ جل شانہ کے جو اسماء اخبار احاد سے ثابت ہیں ان کی بابت اصولیین میں اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ جائز ہے، چونکہ خبر واحد عمل کی مقتضی ہے، اور بعض عدم جواز کے قائل ہیں، چونکہ یہ مسئلہ ''علمیات'' سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا قیاس آرائیوں کے ذریعہ یہ چیز ثابت نہیں ہو سکتی۔ اگر چہ مسائل تعبیہ عملیہ میں قیاس سے کام لیا جاتا ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: رفیق وغیرہ جیسے وہ اسماء جو اخبار احاد سے ثابت ہیں، ان سے اللہ جل شانہ کو موسوم کرنا درست ہے۔

تخریج: الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: ان الله رفيق يحب الرفق ويعطي عليه ما لا يعطي على العنف اس حدیث کو امام بخاریؒ نے ''الأدب المفرد'' میں روایت کیا ہے۔ اور ابوداؤد نے اپنی جامع میں عبداللہ بن مغفل سے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ اور ابن حبان نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ امام احمد نے اپنی مسند میں، امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت علیؓ سے، امام طبرانیؒ نے ابو امامہؓ سے، اور امام بزارؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ قریب ہے کہ یہ حدیث بعض حضرات کے نزدیک متواتر ہو۔

قولہ:ان الرفق لایکون فی شیئی الازانہ: یہ جملہ مستانفہ بیانیہ ہے۔

لا یکون: بمعنی "لا یوجد" ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یکون کے بارے میں دونوں احتمال ہیں،تامہ بھی ہوسکتا ہے، چنانچہ "فی شیء" اس کے متعلق ہوگا۔اور ناقصہ بھی ہوسکتا ہے، چنانچہ "فی شیء" کان کی خبر ہوگا۔اور استثناء مفرغ اعم سے ہوگا۔عبارت یوں ہوگی: لا یکون الرفق مستقرا فی شیء یتصف بوصف من الاوصاف الا بصفة الزینة اھ۔ولا ینزع: یہ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

تخریج: الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: علیك بالرفق وایاك والعنف والفحش ۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے "الادب المفرد" میں حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔اور امام مسلمؒ نے حضرت عائشہؓ سے یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے:

علیك بالرفق' ان الرفق لا یکون فی شیء...... الحدیث واللہ اعلم۔

نرمی سے محروم ہر خیر سے محروم

۵۰۶۹:وَعَنْ جَرِيْرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ يُّحْرَمُ الرِّفْقَ يُحْرَمُ الْخَيْرَ۔

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٤/٢٠٠٣ الحدیث رقم (٧٤-٢٥٩٢) و ابوداوٗد فی السنن ٥/١٥٧ الحدیث رقم ٤٨٠٩ و ابن ماجه فی ٢/١٢١٦ الحدیث رقم ٣٦٨٧، واحمد فی المسند ٤/٣٦٢۔

ترجمہ:حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص نرمی سے محروم کردیا گیا وہ خیر سے ہی محروم کردیا گیا۔(مسلم)

تشریح: من یحرم: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے اور مجزوم ہے' اور بعض کا کہنا ہے کہ مرفوع ہے۔

الرفق مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

یحرم الخیر :الجامع الصغیر کی روایت میں کلہ کا (اضافہ بھی) ہے۔

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے:

- رفق ایک باعث فضیلت ہے۔ - عنف ایک مذموم صفت ہے۔
- رفق کو اپنانا چاہئے۔ - رفق ہر خیر کا سبب ہے۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام احمدؒ، ابوداوٗدؒ اور ابن ماجہؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

حیا ایمان سے ہے

۵۰۷۰:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ وَهُوَ يَعِظُ اَخَاهُ

فِی الْحَیَآءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَعْہُ فَاِنَّ الْحَیَاءَ مِنَ الْاِیْمَانِ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ٧٤/١ الحديث رقم ٢٤ و مسلم في ٦٣/١ الحديث رقم (٥٩-٣٦) وابو داؤد في السنن ١٤٧/٥ الحديث رقم ٤٧٩٥، والترمذي في ٣٢٩/٤ الحديث رقم ٢٠٢٧ والنسائي في ١٢١/٨ الحديث رقم ٥٠٣٣ و ابن ماجه في ٢٢/١ الحديث رقم ٥٨ ومالك في الموطأ ٩٠٥/٢ الحديث رقم ١٠ من كتاب حسن الخلق، واحمد في المسند ١٤٧/٢۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری صحابیؓ کے پاس سے گزرے جو اپنے بھائی کو حیاء کے متعلق نصیحت کر رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے چھوڑ دو اس لئے کہ حیاء ایمان سے ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: وہ صحابیؓ اپنے بھائی کو زیادہ حیا کرنے سے منع کر رہے تھے چونکہ حیاء مانع رزق ہے اور علم سے روکتی ہے۔ جیسا کہ مروی ہے (جو شخص زیادہ حیا کرتے [illegible] تحمل کرنے سے باز رہتا ہے)

امام طیبیؒ نے کہا ہے کہ "یعظ" سے مراد "یعظ [illegible] صحابی اپنے بھائی کو ذرا دھمکا رہے تھے۔ امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ "وعظ" کے معنی ہیں کسی کو اس طرح تنبیہ کرنا کہ اس میں تھوڑا دھمکانا بھی ہو۔ خلیلؒ نے یہ بیان کیا ہے "وعظ" کہتے ہیں خیر و بھلائی کی اس طرح نصیحت کرنا کہ اس سے دل نرم ہو جائے۔ اھ۔ یہاں حدیث میں "وعظ" عتاب کے معنی میں ہے جیسا کہ شرح السنۃ میں حدیث ہے: **مر رسول الله ﷺ برجل وهو يعاتب أخاه في الحياء ويقول: انه ليستحي يعني كانه يقول: قد أضربك** ۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں۔

واضح رہے کہ لفظ "دعہ" بخاری کی روایت میں ہے، مسلم کی روایت میں نہیں ہے۔

تخریج: حدیث کا پہلا حصہ: **الحیاء من الایمان** امام ترمذیؒ نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ اور اس طرح ترمذی، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے "**الادب المفرد**" میں، ابن ماجہ، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو بکرہ ثقفی سے روایت کیا ہے۔ امام طبرانی اور بیہقی نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے، اور ابن عساکر نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

حیا تمام کا تمام خیر ہے

۵۰۷۱: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْحَیَآءُ لَا یَاْتِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ وَفِیْ رِوَایَۃٍ وَالْحَیَآءُ خَیْرٌ کُلُّہٗ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٥٢١/١٠ الحديث رقم ٦١١٧ ومسلم في صحيحه ٦٤/١ الحديث رقم (٦٠-٣٧)، واحمد في المسند ٤٢٧/٤۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حیا نیکی اور بھلائی کا ذریعہ ہے ایک اور روایت میں یہ ہے کہ حیاء کی تمام صورتیں بہتر ہیں۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: امام طیبیؒ حیاء کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **الحیاء تغیر وانکساری یعتری الانسان من خوف وما یعاب به ویذم۔**

امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہاں ایک اشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ بسا اوقات حیا بعض حقوق کی ادائیگی جیسے امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں مخل ہوتی ہے تو اس اعتبار سے حیا کی تمام صورتوں کو بہتر قرار دینا کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔ اس کا جواب علماء کی ایک جماعت کہ جس میں شیخ ابوعمرو بن صلاح بھی ہیں نے یہ دیا ہے کہ جو حیا اظہار حقیقت اور حق کی ادائیگی سے باز رکھے یہ حیا نہیں ہے بلکہ ظلم بجز اور ہے۔ اور اس کو حیاء کہنا لغت کے اعتبار سے ہے۔ (اور اگر اس کو حیا کہا بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ مجازاً کہا جا سکتا ہے) کیونکہ شریعت کی اصلاح میں حقیقی حیا وہی ہے جو برائی کو ترک کرنے کا باعث بنے (علاوہ ازیں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ حیا کے زیادہ صحیح معنی ہیں نفس کا برائی سے رک جانا خواہ وہ برائی طبعی ہو یا شرعی اور شریعت میں جس حیا کو بہتر اور قابل تعریف قرار دیا گیا ہے اس کی صحیح پہچان یہ ہے کہ نفس اس چیز کو اختیار کرنے سے باز رہے جس کو شریعت نے برائی قرار دیا ہے اور خواہ وہ حرام ہو یا مکروہ اور ترک اولیٰ ہو لہٰذا مذکورہ بالا اشکال کا زیادہ واضح جواب یہ ہے کہ یہ کلیہ حیاء خیر کلہ ... ان صورتوں کے ساتھ مخصوص ہے جو حق تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے مطابق ہوں۔)

حیاء کی اس تعریف کی تائید اس کلام سے بھی ہوتی ہے، جس کو امام ابوالقاسم قشیری نے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں **الحیاء رؤیة الآلاء، ورؤیة التقصیر فیتولد بینهما حالة تسمی الحیاء** قاضی عیاضؒ وغیرہ فرماتے ہیں حیاء کو ایمان اس وجہ سے قرار دیا چونکہ کبھی دیگر اعمال کی طرح اکتسابی اور تخلیقی ہوتی ہے، اور کبھی "غریزی" ہوتی ہے۔ لیکن قانون شرع کے مطابق یہ صفت بھی اکتساب اور نیت وعمل کی محتاج ہوتی ہے۔ "**الحیاء من الایمان**" کے یہی معنی ہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ بھی ممکن ہے، کہ "تعریف" کو "عہد" پر محمول کر لیا جائے، اور اس حدیث کی طرف اشارہ مقصود ہو: **الاستحیاء من الله ان یحفظ الرأس وماوعی والبطن وما حوی** اھ۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: **وهو معنی حسن وقید مستحسن یزول به الاشکال السابق۔**

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ جل شانہ سے حیاء کرنا یہی وہ حیاء ہے جو "**خیر کله ولا یأتی الا بخیر**" کا مصداق ہے، یہی وہ حیاء ہے، جو ایمان سے جدا نہیں ہوتی۔ اور وہ حیاء جو مخلوقِ خدا سے کی جاتی ہے، وہ بھی محمود ہے۔ چنانچہ حصر ادعائی ہے۔ یا یہ حیاء، (جو مخلوقِ خدا سے کی جاتی ہے) بھی کُل کی کُل محمود ہے۔ الّا یہ کہ جب "ترک حیاء من اللہ" اس سے معارض ہو، تو اداء حقوق کی جانب کو چھوڑ دیا جائے گا۔ اور جانب مخلوق کی رعایت رکھی جائے گی۔ اس وقت یہ "حیاء" اس بات کی مستحق ہوگی کہ اس کو "حیاء" نہ کہا جائے۔

قوله: وفی روایة: بظاہر یوں لگتا ہے، کہ یہ اگلا جملہ بھی متفق علیہ ہے۔ لیکن الجامع میں اس کو مسلم اور ابوداؤد کی طرف منسوب قرار دیا ہے۔ طبرانی نے قرہ سے روایت یوں نقل کی ہے: **الحیاء هو الدین کله۔**

قوله: الحیاء کله خیر: بعض کا کہنا ہے کہ یہاں عام سے خاص مراد ہے، یعنی **الحیاء عن فعل ما لا یرضاه الله سبحانه**

جب تم میں حیاء ختم ہو جائے پھر جو چاہو کرو

۵۰۷۲: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِمَّا اَدْرَکَ النَّاسُ مِنْ کَلَامِ النُّبُوَّۃِ الْاُوْلٰی اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰/۵۲۳ الحدیث رقم ۶۱۲۰ و ابوداؤد فی السنن ۵/۱۴۸ الحدیث رقم ۴۷۹۷ و ابن ماجه فی ۲/۱۴۰۰ الحدیث رقم ۴۱۸۳، واحمد فی المسند ۴/۱۲۱۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ سابقہ انبیاء کے کلام سے ہے جب تو حیاء نہ کرے تو جو چاہے کر۔ (بخاری)

تشریح: قوله: وعن ابی مسعود: اور ایک نسخہ میں ابن مسعود ہے، یہ غلط ہے۔

ادرك الناس: کازرونیؒ نے صراحت کی ہے، کہ از روئے روایت یہ مرفوع ہے۔ اور بعض نسخوں میں یہ منصوب ہے۔

من کلام النبوة: یہ "مِن" "تبعیضیہ" ہے۔

لم تستحی: حاء کے سکون اور یاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ دوسری یاء محذوف ہے، چونکہ حالت جزمی ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مما میں "مِن" "ابتدائیہ ہے" "ان" کی خبر ہے۔ اور" اذا لم تستحی "بتاویل" هذا القول "خبر" ان" ہے۔ "ما" کی طرف عائد ضمیر محذوف ہے۔ اور" الناس" ادرك کا فاعل ہے۔ مکمل تقدیری عبارت یوں ہے: ان هذا القول: اذا لم تستحی ما صنع ما شئت حاصل مما أدرك الناس

شیخ تورپشتیؒ بھی یہی فرماتے ہیں: المعنی ان مما بقی بین الناس وأدرکوہ من کلام الأنبیاء اور یہ بھی ممکن ہے، کہ" ادرك " کا فاعل ضمیر ہو "ما" کی طرف راجع ہو۔ اور" الناس "مفعول بہ ہو۔

قاضیؒ کا کلام بھی یوں ہی ہے، وہ فرماتے ہیں: ای مما بلغ الناس من کلام الانبیاء المتقدمین: ان الحیاء هو المانع من اقتراف القبائح والاشتغال بمنهیات الشرع ومستحبات العقل

اور خطابیؒ فرماتے ہیں:" من کلام النبوة الاولی" معناه اتفاق کلام الانبیاء علیهم السلام علی استحسان الحیاء فما من نبی الا وقد ندب الیه، وبعث علیه، ولم ینسخ فیما نسخ من شرائعه، ولم یبدل فیما بدل منها، وذلك انه امر قد علم صوابه وبان فضله، واتفقت العقول علی حسنه، وما کان هذا صفة له نم یجر علیه النسخ والتبدیل، وقد النبوة بالاولی للارشاد الی اتفاق کلمة الانبیاء علیهم السلام من اولهم الٰی آخرهم

شرح السنۃ میں لکھتے ہیں:" فاصنع ما شئت فیه " کی تشریح میں متعدد اقوال ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ یہ امر بمعنی خبر ہے۔ گویا عبارت یوں ہے: اذا لم یمنعك الحیاء فعلت ما شئت مما تدعوك الیك نفسك من القبیح ابوعبید نے اسی معنی کو اختیار کیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ وعید ہے۔ جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿اعملوا ما شئتم﴾ [فصلت۔ ٤٠] ای: اصنع ما شئت فان الله یجازیك ابوالعباس نے اس توجیہہ کو اختیار کیا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اس جملہ کی معنوی تقدیر یوں ہے: ینبغي ان تنظر الی ماترید ان تفعله فان کان ذلك مما لا یستحي منه فافعله، وان کان مما یستحي منه فدعه ابواسحاق مروزی نے اس کو مختار قرار دیا ہے۔

(چوتھا قول) جریر نے اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ نقل کر کے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی عمل خیر کرنے کا ارادہ کرتا ہے، اور لوگوں سے حیاء کے باعث اس کو چھوڑ دیتا ہے، گویا کہ وہ ریا کاری سے ڈرتا ہے، تو اس کو خطاب کر کے کہا جا رہا ہے: فلا یمنعك الحیاء من مضی ما أردت،

ابوعبید فرماتے ہیں: یہ ایک دوسری حدیث کے ''شبیہ'' ہے، کہ جس میں یہ آتا ہے: اذا جاء ك الشیطان و أنت تصلی، فقال: انك مراء فزدها طولا میں کہتا ہوں اس کی تائید فضیل بن عیاض کے کلام سے بھی ہوتی ہے: ترك العمل لأجل الناس ریاء، والعمل لأجلھم شرك، والاخلاص ان یخلصك الله منھما

امام نوویؒ کا قول مختار یہ ہے کہ صیغہ امر اباحت کیلئے ہے۔ چنانچہ مطلب یہ ہوگا: اذا اردت ان تفعل شیئا فان کان بحیث لا یستحي من الله ومن الناس في فعله فافعله، والافلا

امام نوویؒ کے کلام کا لب لباب یہ ہے کہ جب تم کسی کام کے کرنے سے حیاء محسوس نہ کرو، تو یہ دلیل ہے، کہ اس کام کا ارتکاب جائز ہے۔ پھر فرماتے ہیں: اسلام کا مدار بھی اسی پر ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ افعال انسانی دو حال سے خالی نہیں، کہ ان افعال سے حیاء کرے گا، کہ نہیں۔ اگر حیاء کرتا ہے، تو یہ حرام اور مکروہ کو شامل ہے۔ اور ان کا ترک مشروع ہے، اور حیاء نہیں کرتا تو یہ واجب، مندوب اور مباح کو شامل ہے۔ واجب ومندوب کو بجالانا مشروع اور مباح کو بجالانا جائز ہے، اس تفصیل وبیان کو پیش نظر رکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے، کہ یہ حدیث ''احکام خمسہ'' کو شامل ہے۔

عارف سہروردی فرماتے ہیں: الحیاء اطراق الروح اجلا لا لعظم الجلال اسرافیل کا حیاء کرنا اسی قبیل سے ہے۔ جیسا کہ مروی ہے: انه یتستر بجناحه حیاء من الله عز وجل اسی قبیل حضرت عثمانؓ کا حیاء کرنا ہے، آپؓ فرماتے ہیں: انی لأغتسل في البیت المظلم، فانطوی حیاء من عز وجل۔

میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں ابن عساکر نے حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: الحیاء من الایمان وأحیی امتي عثمان۔

قوله: ان مما ادرك الناس...... : کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بات پہلے انبیاء علیہم السلام پر اترنے والے کلام سے ماخوذ ہے اور جس کا حکم ابھی تک باقی ہے نہ اس کو منسوخ قرار دیا گیا ہے اور نہ اس میں کوئی تغیر وتبدل ہوا ہے۔

قوله: فاصنع ماشئت: واضح رہے کہ مذکورہ جملہ میں امر کا جو یہ صیغہ استعمال کیا گیا ہے اس سے حکم دینا یا طلب مراد نہیں ہے بلکہ یہ امر بطور خبر کے ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ جو چیز بری باتوں سے باز رکھتی ہے وہ حیا ہے اور جب کسی نے شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ دیا اور بے حیائی کو شیوہ بنالیا تو پھر وہ جو چاہے گا کرے گا اور اسے کسی گناہ اور کسی برائی کو اختیار کرنے میں کوئی

باک نہیں ہوگا۔ یا یہ کہ امر کا صیغہ تہدید و توبیخ کے طور پر ہے اور اس سے مقصد یہ آگاہی دینا ہے کہ جب تم نے بے حیائی پر کمر باندھ ہی لی ہے تو جو جی چاہے کرتے پھرو! لیکن یاد رکھو کہ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے کہ جب تمہیں اپنے سارے کرتوتوں کی سزا بھگتنی پڑے! گویا یہ جملہ ایسا ہی ہے جیسا کہ: اِعملوا ماشِئتُمْ۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے ابومسعود سے نقل کیا ہے۔ امام احمد نے اس حدیث کو حضرت حذیفہؓ سے بھی روایت کیا ہے۔

نیکی عمدہ اخلاق کا نام ہے

۵۰۷۳: وَعَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ قَالَ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ فَقَالَ الْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۴/ ۱۹۸۰ الحدیث رقم (۱۴-۲۵۵۳)، والترمذی فی ۴/ ۵۱۵ الحدیث رقم ۲۳۸۹، والدارمی فی ۲/ ۴۱۵ الحدیث رقم ۲۷۹۹، واحمد فی المسند ۴/ ۱۸۲۔

ترجمہ: حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور گناہ کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نیکی عمدہ اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تجھے یہ پسند نہ ہو کہ لوگوں کو اس کی اطلاع ملے۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: البر حسن الخلق: حسن الخلق کا مطلب ہے: حسن الخلق مع الخلق بأمر الحق او مداراۃ الخلق و مراعاۃ الحق

بعض کا کہنا ہے کہ حدیث میں "بر" کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ اس کی تفسیر یہ بیان کی گی ہے: ما اطمأنت الیه النفس و اطمأن الیه القلب دوسری جگہ اس کی تفسیر "ایمان" کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

ما یقربك الی اللّٰه کی گئی ہے اور (چوتھی تفسیر) یہاں "بر" کی تفسیر "حسن خلق" کے ساتھ کی ہے۔

اور "حسن خلق" کی تفسیر یہ ہے کہ تکلیفوں کو برداشت کیا جائے، غصہ کم سے کم کیا جائے، خندہ پیشانی کے ساتھ ملا جائے، کلام پاکیزہ کیا جائے۔ یہ سب تفسیرات معنوی اعتبار سے قریب قریب ہیں۔ (ذکرہ الطیبی)

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہاں "برّ" سے مراد صلہ، تصدق اور طاعت ہے، اور "حسن الخلق" ان سب کو جامع ہے۔

بعض محققین فرماتے ہیں: "برّ" ایسا لفظ ہے، جو تمام طاعات اور مقرب اعمال کو جامع ہے۔ اور "بر الوالدین" کا شمار بھی اسی میں ہے۔ بر الوالدین کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ہر (جائز) طریقہ سے خوش کیا جائے۔

بعض کا کہنا ہے، کہ "برّ" انبیاء کے خواص میں سے ہے۔ یعنی کمال بر انبیاء کے خواص میں سے ہے، کمال کی قید کا اضافہ اس وجہ سے ہے کہ غیر انبیاء میں بھی "بر" کا وجود بہر حال ہوتا ہی ہے۔

قولہ: والاثم ماحاك فی صدرك: تردد پیدا ہو جانے" کا مطلب یہ کہ جب تم کوئی ایسا کام کرو جس پر تمہارے دل کو

اطمینان نہ ہو بلکہ اس کی وجہ سے دل و دماغ میں ایک خلش پیدا ہو جائے تو سمجھو کہ تمہارا وہ کام بہتر نہیں ہے بلکہ گناہ کا باعث ہے یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس بات کا تعلق اس شخص سے ہے جس کے سینے کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دولت کے لئے کھول دیا ہو اور اس کا دل نور تقویٰ سے روشن و آراستہ ہو

دوسری بات یہ ہے کہ ''کام'' سے مراد وہ اعمال و افعال نہیں ہیں جن کی برائی کو شریعت نے وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور جس کا گناہ ہونا کسی شک و شبہ سے بالاتر ہو بلکہ اس سے مراد کوئی ایسا فعل و عمل ہے جس کا ممنوع ہونا شارع علیہ السلام سے واضح طور پر منقول نہ ہو اور اس کے متعلق علماء کے اختلافی اقوال ہوں اور تم اس بات کو پسند نہ کرو یہ گویا گناہ کی دوسری پہچان بیان فرمائی گئی ہے لیکن اس کا تعلق بھی انہی لوگوں سے ہے جو اچھے احوال کے ہوں۔

تخریج: الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: البر حسن الخلق (الحدیث) اس حدیث کو امام بخاریؒ نے ''الادب المفرد'' میں اور مسلم و ترمذی نے حضرت نواس سے نقل کیا ہے۔ امام احمد نے اس حدیث کو بحوالہ ابوثعلبہ ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

البر ما سکنت الیه النفس واطمأن الیه القلب، والاثم ما لم تسکن الیه النفس ولم یطمئن له القلب، وان أفتاك المفتون

اربعین میں امام نوویؒ نے حضرت وابصہ بن معبد الاسدی سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

قال: اتیت رسول الله ﷺ فقال جئت تسأل عن البر؟فقلت نعم، فقال: استفت قلبك، البر ما اطمأنت الیه النفس واطمأن الیه القلب، والاثم ماحاك فی النفس وتردد فی الصدر وان أفتاك الناس وأفتوك

یہ حدیث حسن ہے، اس کو امام احمد بن حنبل اور امام دارمی نے اپنی اپنی مسند میں اسناد حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔

پسندیدہ شخص سب سے بہتر اخلاق والا ہے

۴۵۰۷: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَحَبِّكُمْ اِلَيَّ اَحْسَنَكُمْ اَخْلَاقًا ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰۲/۷ الحدیث رقم ۳۷۵۹، والترمذی فی ۳۲۵/٤ الحدیث رقم ۲۰۱۸، واحمد فی المسند ۱۸۹/۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے پسندیدہ اور محبوب شخص وہ ہے جس کے اخلاق سب سے بہتر ہوں۔ (بخاری)

تشریح: قولہ: عن عبد الله بن عمرو: ''عمرو'' واؤ کے ساتھ ہے۔

قولہ: ان من أحبکم الی: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: (۱) ای اکثر کم محبة لی (۲) أعظمکم محبوبیة عندی۔

جو علماء یہ کہتے ہیں کہ "من" زائدہ کلام مثبت میں بھی آ سکتا ہے، ان کے مذہب پر یہ "من" زائدہ ہو سکتا ہے۔

قولہ: أحسنکم اخلاقا کا ایک مطلب یہ ہے کہ جو اچھے اطوار و عادات اور بہترین خصلتوں کا حامل ہو اور حقوق ربوبیت و عبودیت ہر دو کی رعایت رکھتا ہو۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرتا ہو اور بندوں کے حقوق بھی ادا کرتا ہو، دونوں میں سے کسی کے حقوق میں بھی تقصیر و کوتاہی نہ کرتا ہو۔)

حکیم، علاء بن کثیر سے مرسلاً نقل کرتے ہیں:

ان محاسن الاخلاق مخزونة عند اللّٰہ تعالٰی، فاذا أحب اللّٰہ عبدا منحه خلقا حسنا

امام طبرانی الاوسط میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں:

ان هذه الأخلاق من اللّٰہ، فمن أراد اللّٰہ، خیرا منحه خلقا حسنا، ومن أراد اللّٰہ به سوءا منحه سیئا

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے: احسنکم اخلاقا مع الخلق اس مفہوم کی تائید حضرت عائشہؓ کی حدیث سے ہوتی ہے، جس کو امام ترمذیؒ و حاکم نے روایت کیا ہے:

ان من أکمل المؤمنین ایمانا احسنهم خلقا و ألطفهم بأهله

اور پہلے مفہوم کی تائید الجامع الصغیر میں منقول ابن عمرؓ کی روایت سے ہوتی ہے: خیارکم احسنکم أخلاقا اس حدیث کو امام احمد، شیخین اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

بہتر شخص بہتر اخلاق والا

۵۰۷۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا۔

(متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٥٦٦/٦ الحدیث رقم ٣٥٥٩ و مسلم فی ١٨١٠/٤ الحدیث رقم (٦٨-٢٣٢١) والترمذی فی السنن ٣٠٨/٤ الحدیث رقم ١٩٧٥، واحمد فی المسند ١٩٣/٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: تم میں سے بہتر وہ ہے جو اخلاق میں اچھا ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: احاسنکم: اور ایک نسخہ صحیحہ میں أحسنکم کے الفاظ ہیں۔

الفصل الثانی:

نرمی سے محروم آخرت کی خیر سے محروم

۵۰۷۶: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ أُعْطِيَ حَظَّهُ مِنَ الرِّفْقِ أُعْطِيَ حَظَّهُ مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَنْ حُرِمَ حَظَّهُ مِنَ الرِّفْقِ حُرِمَ حَظَّهُ مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔

(رواه في شرح السنة)

أخرجه البغوی فی شرح السنة ۱۳/۷۴ الحديث رقم ۳۴۹۱، واحمد فی المسند ۶/۱۵۹۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص جس کو نرمی سے حصہ دیا گیا اور جو نرمی سے عطیے سے محروم ہوا ہو دنیا و آخرت کی خیر سے محروم ہوا۔ (شرح السنہ)

تشریح: "اعطی" اور" حرم "دونوں فعل صیغۂ مجہول کے ساتھ ہیں۔

حظہ: منصوب ہے۔ حدیث مبارکہ کا آخری جملہ، پہلے جملہ سے مستفاد ضمنی مفہوم کیلئے مبالغہ اور تاکید فی الحکم ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے ابوالدرداءؓ سے" من خير الدنيا والآخرة "کے بجائے" من الخير "کے الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ دونوں حدیثیں معنوی اعتبار سے متفق ہیں، چونکہ "خیر" سے مراد جنس ہے، جو دونوں انواع کو شامل ہے۔

حیاء ایمان اور درشتی دوزخ ہے

۵۰۷۷: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحَيَاءُ مِنَ الْإِيْمَانِ وَالْإِيْمَانُ فِي الْجَنَّةِ وَالْبَذَاءُ مِنَ الْجَفَاءِ وَالْجَفَاءُ فِي النَّارِ۔ (رواه احمد والترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۴/۳۲۱ الحديث رقم ۲۰۰۹، واحمد فی المسند ۲/۵۰۱۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حیاء ایمان سے ہے اور ایمان جنت میں (لے جانے والا) ہے فحش گوئی برائی ہے اور درشتی دوزخ میں (لے جانے والی) ہے۔ (احمد، ترمذی)

تشریح: قوله: الايمان فی الجنة:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اہل ایمان کو عین ایمان سے تعبیر کیا، یہ دلالت کرتا ہے کہ یہ لوگ ایمان کے اعلیٰ شعبہ پر فائز و متمکن ہیں۔ جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ: ﴿والذی تبوؤا الدار والايمان﴾ میں "ایمان" کو "اہل ایمان" کیلئے "مقرّ ومبوأ" قرار دیا ہے۔ چونکہ یہ لوگ دین میں متمکن ہیں، اور ثابت قدم ہیں۔

قوله: والبذاء من الجفاء: البذاء: باء کے فتحہ کے ساتھ، حیاء کی ضد ہے۔ فحش گوئی اور بد خلقی اس سے پیدا ہوتی ہے۔

یہاں بھی مضاف محذوف ہے یعنی ان صفات سے متصف لوگ جہنم میں جائیں گے، یہ جانا کسی خاص مدت کیلئے ہوگا یا ابدی طور

پر دونوں احتمال ہیں۔ چونکہ ان صفات کا ذکر ایمان کامل یا مطلق ایمان کے مقابل کے طور پر ہے، چنانچہ ان صفات (جفاء وبذاء) سے متصف شخص بھی "اہل کفران" میں سے ہے یا "اہل کفر" میں سے ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے "**الادب المفرد**" میں، ابن ماجہ، حاکم اور بیہقی نے ابوبکرہ ثقفی سے نقل کیا ہے۔ طبرانی اور بیہقی نے عمران بن حصین سے، احمد، ترمذی اور حاکم نے ابوامامہ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: **الحیاء والعی شعبتان من الایمان والبذاء والبیان شعبتان من النفاق۔**

اللہ تعالیٰ کا بہترین عطیہ خوش اخلاقی

۵۰۷۸: وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ مُزَيْنَةَ قَالَ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا خَيْرُمَا أُعْطِيَ الْإِنْسَانُ قَالَ الْخُلُقُ الْحَسَنُ۔ (رواه البيهقي في شعب الايمان)

أخرجه احمد في المسند ٤/٢٧٨، والبيهقي في شعب الايمان ٦/٢٣٥ الحديث رقم ٧٩٩٢۔

ترجمہ: قبیلہ مزینہ کے ایک شخص نے بیان کیا کہ صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا! یارسول اللہ ﷺ انسان کو کونسی چیز بہترین عطاء کی گئی ہے آپ ﷺ نے فرمایا خوش اخلاقی۔ اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ماخير مأأعطي الانسان:

الانسان: مرفوع ہے: ای اعطیه الانسان، اور مفعول ثانی محذوف ہے جو موصول کی طرف عائد ہے۔ اور ایک نسخہ میں (انسان) نصب کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں نائب فاعل وہ ضمیر ہے جو "ما" اسم موصول کی طرف عائد ہے۔

الخلق الحسن: مبتدا محذوف کی خبر ہے: ای هو الخلق الحسن

۵۰۷۹: وَفِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ عَنْ اُسَامَةَ بْنِ شَرِيْكٍ۔

أحمد في المسند ٤/٢٧٨۔

ترجمہ: اور شرح السنة میں یہ روایت اسامہ بن شریکؓ سے منقول ہے۔

تشریح: میرکؒ فرماتے ہیں: اس کے ظاہر سے لگتا ہے، کہ امام بیہقی نے اس حدیث کو اسامہ سے نقل نہیں کیا ہے۔ لیکن شیخ جزریؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام بیہقی نے شعب الایمان میں اسامہؓ سے نقل کیا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: الجامع میں لکھا ہے: خير ما اعطي الناس خلق حسن

اس حدیث کو امام احمد، نسائی، ابن ماجہ اور حاکم نے اسامہ بن شریک سے روایت کیا ہے۔

ابن ابی شیبہ نے عن رجل من جهينة ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

خير ما أعطي الرجل المؤمن خلق حسن، وشر ما اعطي الرجل قلب سوء في صورة حسنة

امام بیہقی حسن سے مرسلاً نقل کرتے ہیں:

ثلاث خلال من لم تكن فيه واحدة منهن. واحدة منهن كان الكلب خيرا منه: ورع يحجزه

عن محارم اللّٰہ عز وجل، او حلم یرد به جهل جاهل، او حسن خلق یعیش به فی الناس

امام سیوطیؒ عن الحسن، عن أبی الحسن، عن جد الحسن نقل کرتے ہیں:

ان أحسن الحسن الخلق الحسن

عرضِ مرتب:

حدیث: ۵۰۶۵ کی شرح کے آخر میں ملا علی قاریؒ نے اس کے برعکس نقل کیا ہے، چنانچہ وہاں یوں ہے:

ولذا ورد: الخلق الحسن أحسن الحسن

بدزبان جنت میں نہ جائے گا

۵۰۸۰: وَعَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَدْخُلُ الْجَنَّةَ الْجَوَّاظُ وَلَا الْجَعْظَرِيُّ قَالَ وَالْجَوَّاظُ الْغَلِيْظُ الْفَظُّ (رواه ابوداؤد فی سننه والبیهقی فی شعب الایمان وصاحب جامع الاصول فیه عن حارثة وكذافی شرح السنة عنه ولفظه) قَالَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ الْجَوَّاظُ الْجَعْظَرِيُّ يُقَالُ الْجَعْظَرِيُّ الْفَظُّ الْغَلِيْظُ۔ وَفِيْ نُسَخِ الْمَصَابِيْحِ عَنْ عِكْرَمَةَ بْنِ وَهْبٍ وَلَفْظُهُ قَالَ وَالْجَوَّاظُ الَّذِيْ جَمَعَ وَمَنَعَ وَالْجَعْظَرِيُّ الْغَلِيْظُ الْفَظُّ۔

أخرجه ابوداؤد فی السنن ۵/۱۵۱ الحدیث رقم ۴۸۰۱، والبغوی فی شرح السنة۱۳/۱۶۹ الحدیث رقم ۳۵۹۳، واخرجه البیهقی فی شعب الایمان ۶/۲۸۵ الحدیث رقم ۸۱۷۳۔

ترجمہ: حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جنت میں بداخلاق اور سخت زبان والا داخل نہ ہوگا ابوداؤد، بیہقی، صاحب جامع الاصول اور صاحب شرح السنۃ نے حضرت حارثہؓ سے ان الفاظ میں روایت کی ہے کہ جنت میں جواظ، جعظری کا داخلہ نہ ہوگا یہ سخت دل سخت زبان کو کہتے ہیں مصابیح میں عکرمہ بن وہب سے ان الفاظ میں روایت ہے: قَالَ وَالْجَوَّاظُ الَّذِيْ جَمَعَ وَمَنَعَ وَالْجَعْظَرِيُّ الْغَلِيْظُ الْفَظُّ۔ وہ شخص جو مال کو جمع کرے اور سائل کو منع کرے اور جعظری، بدعادت والا سخت زبان۔ اور مصابیح کے (بعض) نسخوں میں یہ روایت حضرت عکرمہ بن وہب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے) ان میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ روای نے کہا ہے جواظ اس شخص کو کہتے ہیں جو مال و دولت جمع کرے لیکن سائل کو کچھ نہ دے اور جعظری اس شخص کو کہتے ہیں جو سخت کلام اور بدخلق ہو۔

تشریح: الجواظ: جیم کے فتحہ، واؤ کی تشدید اور ظاء معجمہ کے ساتھ ہے۔

الجعظری: جیم کے فتحہ، عین مہملہ کے سکون، ظاء معجمہ کے فتحہ، اور آخر میں یائے تحتیہ مشدد اور اس سے پہلے راء ہے۔

''جوّاظ'' کے متعدد معانی بیان کئے گئے ہیں:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: الجواظ لغلیظ الفظ کذا فی سنن ابی داود والبیهقی

نہایہ شرح تورپشتیؒ میں اور قاضی کا کہنا ہے: کے کلام میں (اس کے کئی معانی بیان کئے گئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

① الجواظ المختال
② بعض کا کہنا ہے: الجموع المنوع
③ بعض کا کہنا ہے: السمین
④ بعض کا کہنا ہے: الصیاح المهذار

''جعظری'' کے بھی متعدد معانی بیان کیے گئے ہیں:

① الفظ الغلیظ
② بعض کا کہنا ہے: القصیر المنتفخ بما لیس عنده
③ بعض کا کہنا ہے: العظیم الجسم الأکول

ان لوگوں کا عجب، بدخلقی، کھانے کی حرص اور کلام میں افراط ان کے دخول جنت سے مانع ہوگا۔اھ۔

زیادہ واضح بات یہ ہے کہ اس سے مراد ''غلیظ القلب سیئ الخلق'' ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿ولو کنت فظا غلیظ القلب﴾ [آل عمران:۱۵۹] لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ''جعظری'' کی تفسیر ''غلیظ القلب'' کے ساتھ کی جائے۔

اوپر کی بعض عبارتوں معلوم ہوا کہ ''جواظ'' اور ''جعظری'' دونوں کے ایک معنی ہیں اور بعض سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ''جواظ'' کے معنی ''متکبر'' کے ہیں اور ''جعظری'' کے معنی ہیں ''بدخلق''، لیکن ان سب کا حاصل یہ ہے کہ یہ دونوں الفاظ معنی و مفہوم میں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

زیادہ صحیح ہے کہ جواظ اور جعظری سے مراد وہ شخص ہے جو سخت دل اور بدخلق ہو (یعنی وہ شخص کہ اس کے باطنی احوال کی گمراہیوں اور عادات واطوار کی خرابیوں نے اس کو شقی القلب بنا دیا ہو کہ نہ اس پر کسی وعظ و نصیحت کا اثر ہوتا ہو اور نہ اس کو خدا کا خوف برائیوں سے روکتا ہو۔اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا کہ وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا) اس کا قرینہ وہ روایت ہے، جس کو خطیبؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ (حضور ﷺ نے فرمایا) ہر چیز کے لئے توبہ ہے مگر بدخلق (یعنی بدچلن اور بداطوار شخص) کے حق میں توبہ کارگر نہیں کیونکہ وہ ایک گناہ سے توبہ کرتا ہے تو اس سے بڑے دوسرے گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے (اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی بدچلنی اور بداطواری اپنی جگہ قائم رہتی ہے)۔

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ الْجَوَّاظُ وَلَا الْجَعْظَرِیُّ : میں لفظ جعظری سے پہلے لا زائد لانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو شخص ان دونوں بری خصلتوں میں سے کسی بھی ایک خصلت میں مبتلا ہوگا اس کو جنت میں داخل نہیں کیا جائے گا۔اگر وہ شخص منافقین میں سے ہوگا تو اس کا جنت میں داخل نہ کیا جانا مطلق معنی پر محمول ہوگا اور اگر اس شخص کا تعلق مؤمنین سے ہو تو پھر کہا جائے گا کہ اس کے حق میں ان الفاظ کہ ''وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ ابتداء جنت میں داخل نہیں ہوگا۔)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مؤلفؒ نے یہ عبارت لا کر اشارہ کیا ہے، کہ کتب اصول میں اس حدیث کے راوی کا نام حارثہ بن وہب منقول ہے۔اور مصابیح کے بعض نسخوں میں عکرمہ بن وہب منقول ہے۔شیخ تورپشتیؒ نے لکھا ہے کہ ان کو کسی نے بھی صحابہ میں

شمار نہیں کیا، لہٰذا یہ حدیث مرسل ہے، یعنی اگر ان راوی کا تابعی ہونا صحیح ہے، تو یہ حدیث مرسل ہے۔ علاوہ ازیں ''جمع ومنع'' کے الفاظ ''اصول'' میں موجود نہیں ہیں، البتہ مصابیح کے حواشی میں موجود ہیں، یہاں سے متن کے ساتھ ملحق کر دیے گئے ہیں اور اس طرح ''جعظری'' کی تفسیر ''الغليظ الفظ'' ہے کہ اصول میں ''جواظ'' کی تفسیر (طور پر منقول) ہے۔ (تم کلامہ)

الجامع میں بروایت طبرانی از ابوالدرداء مروی ہے:

ألا أخبرك بأهل النار؟ كل جعظري، جواظ مستكبر جماع منوع ألا أخبرك بأهل الجنة؟كل مسكين لو أقسم على الله لأبره۔

فحش گو اللہ تعالیٰ کو ناپسند

۵۰۸۱:وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَآءِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَثْقَلَ شَيْءٍ يُوْضَعُ فِيْ مِيْزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ وَاِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِيَّ۔

(رواه الترمذی وقال حديث حسن صحيح وروى ابوداؤد الفصل الاول)

أخرجه ابوداؤد والفصل الاول فی السنن ١٤٩/٥ الحديث رقم ٤٧٩٩، والترمذی فی السنن باكمله ٣١٨/٤ الحديث رقم ٢٠٠٢، واحمد فی المسند ٤٤٢/٦۔(١(متفق عليه۔

ترجمہ: حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے زیادہ وزنی چیز جو مؤمن کے ترازو میں رکھی جائے گی وہ عمدہ اخلاق ہیں اور اللہ تعالیٰ فحش گوئی اور بداخلاقی کو ناپسند فرماتے ہیں۔ ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے اور ابوداؤد نے فصل اول میں روایت کی ہے۔

تشریح: قوله: ان اثقل شيء:

شيء سے مراد وہ شئے مجسّد بھی ہو سکتی ہے۔ صحیفہ عمل بھی مراد ہو سکتا ہے، اور ثواب بھی مراد ہو سکتا ہے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن مؤمن کے میزان اعمال میں رکھی جانے والی چیزوں میں ثقیل ترین شئے حسن خلق ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ حسن خلق کو پسند کرتا ہے، اور اصحاب حسن خلق کو بھی پسند کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فحش اور بے ہودہ گو سے سخت نفرت وعداوت رکھتا ہے اور یہ بات متعین ہے کہ جو چیز عند اللہ مبغوض ہے اس چیز کی کوئی قدر وقیمت نہیں، وہ چیز بے وزنی ہے۔ اور یہ بات بھی متعین ہے کہ جو چیز اللہ کے ہاں محبوب ہے، وہ قدر وقیمت اور وزن رکھتی ہے۔ چنانچہ کفار کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فلا نقيم لهم يوم القيامة وزنا﴾ [الکھف۔۱۰۵] اور ایک حدیث مشہور میں آتا ہے: **كلمتان خفيفتان على اللسان، ثقيلتان فی الميزان حبيتان الى الرحمن: سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم** اس سے دونوں جملوں کے درمیان مقابلہ واضح ہو جاتا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''ان اثقل شيء يوضع فی الميزان'' کے مقابلہ میں دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا: ''ان الله يبغض الفاحش البذی'' یہ مقابلہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ: أخف ما يوضع فی الميزان هو سوء الخلق وان

حسن الخلق أحب الاشياء عند الله والخلق السيء أبغضها وان الفحش والبذاء ة أسوا شيء في مساوئ الاخلاق

تخریج: امام احمد نے اسامہ بن زید سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: ان الله يبغض الفاحش المتفحش

اور دیلمی مسند فردوس میں حضرت علیؓ سے ناقل ہیں: ان الله يبغض المعبس في وجوه الناس

اچھے اخلاق سے قائم اللیل کا درجہ

۵۰۸۲: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ يَقُوْلُ اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهٖ دَرَجَةَ قَائِمِ اللَّيْلِ وَصَآئِمِ النَّهَارِ۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد في السنن ١٤٩/٥الحديث رقم ٤٧٩٨ و مالك في الموطأ ٩٠٤/٢ الحديث رقم ٦ من كتاب حسن الخلق، واحمد في المسند ٩٠/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مؤمن اچھے اخلاق کی وجہ سے رات کو قیام کرنے اور دن کو روزہ رکھنے والے کا درجہ پالیتا ہے۔ (ابوداؤد)

عرضِ مرتب:

اس حدیث سے متعلقہ ''حسن خلق'' پر کلام ہم نے حدیث: ۵۰۶۵ کے تحت ذکر کیا۔ ہے وہاں ملاحظہ کرلیا جائے۔

قال الحسن: حسن الخلق بسط الوجه وبذل الندى وكف الأذى

قال الواسطي: هو ان لا يخاصم ولا يخاصم من شدة معرفته بِاللّٰهِ تَعَالٰى۔

وقال ايضا: هو ارضاء الخلق في السراء والضراء

سہلؒ فرماتے ہیں کہ ادنیٰ خوش خلقی یہ ہے کہ لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف کو برداشت کیا جائے' انتقام لینے سے گریز کیا جائے (اور یہ کہ نہ صرف ظالم کے ظلم سے درگزر کیا جائے بلکہ) اس پر رحمت کی جائے' اس کے حق میں مغفرت و بخشش کی دعا کی جائے اور اس کے تئیں شفقت کو اختیار کیا جائے۔

تخریج و توضیح: الجامع میں ''درجة القائم الصائم'' کے الفاظ ہیں۔ امام ابوداؤد نے اور امام حبان بھی اپنی صحیح میں یہ روایت حضرت عائشہؓ سے نقل کی ہے۔

نیکی برائی کو مٹانے والی

۵۰۸۳: وَعَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُ مَا كُنْتَ اَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

أخرجه الترمذي في السنن ٣١٢/٤ الحديث رقم ١٩٨٧، والدارمي في ٤١٥/٢ الحديث رقم ٢٧٩١ واحمد

فی المسند ۵/۱۵۳۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہاں بھی ہو اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ برائی کے بعد نیکی کرو وہ اس مٹا دے گی اور لوگوں سے اچھے اخلاق سے پیش آؤ۔ (احمد' ترمذی و دارمی)

تشریح: **قولہ: اتق اللہ حیث ما کنت:** ''اللہ سے ڈرو'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن امور کو تم پر واجب کیا ہے ان سب کی بجا آوری و فرمانبرداری کرو اور جن چیزوں سے منع کیا ہے یعنی تمام طرح کی برائیاں ان سے اجتناب و پرہیز کرو کہ اسی کو ''تقویٰ'' کہا گیا ہے اور تقویٰ دین کی بنیاد ہے جس کے ذریعہ ایقان و معرفت کے مراتب و درجات حاصل ہوتے ہیں۔

تقویٰ کا سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ شرک سے بیزاری و پاکی اختیار کی جائے اور اس کا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ماسویٰ اللہ سے اعراض کیا جائے۔ ان دونوں درجوں کے درمیان تقوٰ ے دوسرے مراتب ہیں جن میں سے بعض کو بعض پر برتری حاصل ہے۔ جیسے ممنوعات کو ترک کرنا ایک مرتبہ ہے' اس سے برتر مرتبہ یہ ہے کہ مکروہات کو بھی ترک کیا جائے' اور اس سے بھی برتر مرتبہ یہ ہے کہ جو چیزیں مباح ہیں ان میں سے بھی ان چیزوں کو ترک کیا جائے جو غیر ضروری اور بے فائدہ ہوں۔

قولہ: اتق اللہ حیثما کنت: ''تم جہاں کہیں ہو'' کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا خدا سے ڈرنا یعنی احکام خداوندی پر عمل کرنا کسی خاص وقت' کسی خاص جگہ اور کسی خاص حالت پر موقوف نہیں ہونا چاہئے بلکہ تم خواہ سفر میں ہو یا حضر میں' خواہ نعمتوں سے بہرہ مندی کی حالت میں ہو یا آفات بلاؤں میں مبتلا اور خواہ جلوت میں ہو یا خلوت میں' غرضیکہ تم کسی جگہ پر ہو اور کسی حالت میں ہو اور اس وقت اس جگہ اور اس حالت سے متعلق جو بھی احکام خداوندی ہوں ان پر عمل پیرا ہوں کیونکہ خدا کے نزدیک تمہاری کوئی حالت پوشیدہ نہیں ہے اور وہ کسی بھی وقت تمہاری طرف سے غافل نہیں رہتا وہ جس طرح تمہاری ظاہری باتوں کو جانتا ہے اسی طرح تمہاری پوشیدہ باتیں بھی خوب جانتا ہے لہٰذا تمہارے لئے ضروری ہے کہ اس کے احکام کی بجا آوری اور اس کی معصیت سے اجتناب کے جو تقاضے اور جو آداب ہیں ان کو بہر صورت نگاہ میں رکھو!

منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت داؤد طائی ؒ (کسی قبر کے پاس سے گزر رہے تھے کہ خدا نے ان پر اس قبر کے اندر کے حالات منکشف کئے بایں طور کہ انہوں) نے سنا قبر کے اندر سے ایک آواز باہر آ رہی ہے جس میں مردہ کہہ رہا ہے کہ پروردگار! کیا میں نے تیری نمازیں ادا نہیں کی ہیں۔ کیا میں نے تیری زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے۔ اور کیا میں نے یہ نہیں کیا ہے اور وہ نہیں کیا ہے؟ (یعنی اس نے دنیا میں جب بھی نیک کام کئے تھے ان سب کو گنواتا رہا۔ اس کی یہ بات سن کر فرشتوں نے جواب دیا' کیوں نہیں' اے اللہ کے بندے! (بے شک تو نے یہ سب کام کئے ہیں) لیکن (کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ) جب تو خلوت میں ہوتا تھا اس وقت خدا کے خوف پر گناہوں کو ترجیح دیتا تھا اور تجھے اس بات کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا تھا کہ اس حالت میں بھی تو خدا کی نگاہ میں ہے۔

قولہ: واتبع السیئۃ الحسنۃ تمحھا: مطلب یہ ہے کہ انسان بہر حال انسان ہے' لہٰذا اگر بتقاضائے بشریت تم سے کوئی گناہ صادر ہو جائے تو اس کے بعد فوراً نیک کام کر لو! تاکہ وہ نیکی اس گناہ و برائی کے اثرات کو مٹا دے!

رہی یہ بات کہ نیک کام سے کیا مراد ہے؟ تو اس سے توبہ اور مطلق کوئی بھی مراد ہے یا یہ کہ وہ نیکی مراد ہے جو اس گناہ و برائی کی ضد ہو۔ چنانچہ طیبیؒ نے کہا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ نیک کام کرنے کے ذریعہ برائیوں کے اثرات مٹانے سے کسی بھی لمحہ غافل نہ رہے اس سے جو بھی برائی صادر ہو اس کے بدلہ میں اسی کی جنس سے کوئی نیک کام ضرور کر لے اگر شراب نوشی کا گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے بدلے میں حلال چیزیں خدا واسطے لوگوں کو پلائے اگر کسی وقت تکبر میں مبتلا ہو جائے تو تواضع اختیار کرے' اگر کسی جگہ گانا بجانا سننے کا اتفاق ہو جائے اور ان لوگوں کی ہم نشینی میں کچھ وقت گزارنا پڑا ہو جو گانے بجانے کی لغویت میں مبتلا ہوں تو اس کے بدلے میں قرآن پاک کی تلاوت سنے اور ذکر و نصیحت کی مجلس میں بیٹھے اور اس طرح بخل کا تدارک' خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ کرے۔

جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ''تاکہ وہ نیکی اس برائی کو مٹا دے'' تو مٹانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نیکی کے ذریعہ اس بندے کے دل پر سے برائی کے اثرات مٹا دیتا ہے یا اعمال لکھنے والے فرشتوں کے رجسٹر میں سے اس برائی کو محو کر دیئے ہے۔
اور یہ مٹانا اس صورت میں بھی ہوتا ہے جب کہ اس برائی کا تعلق کسی حقوق العباد سے ہوتا ہے بایں طور کہ کوئی شخص کسی کے حق کو تلف کرتا ہے یا کسی پر ظلم و زیادتی کرتا ہے تو اس حق تلفی یا ظلم کا تدارک اس طرح کیا جاتا ہے کہ حق تلفی کرنے والے یا ظلم کرنے والے کے نامۂ اعمال میں جو نیکیاں ہوتی ہیں ان میں سے اس کے بقدر نیکیاں صاحب حق کو دے دی جاتی ہیں یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے دوسرے اجر و انعامات کے ذریعہ صاحب حق کو خوش کر دے اور وہ اس شخص کو معاف کرنے پر راضی ہو جائے۔

منقول ہے کہ ایک بزرگ کا انتقال ہو گیا کچھ عرصہ بعد ایک دوسرے بزرگ نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنے احسان و انعام سے نوازا اور میری بخشش فرما دی لیکن حساب کتاب ضرور ہوا یہاں تک کہ اس دن کے بارے میں بھی مجھ سے مواخذہ ہوا جب کہ میں روزے سے تھا اور ایک دوست کی دوکان پر بیٹھا ہوا تھا جب افطار کا وقت ہوا تو میں نے گیہوں کی ایک بوری میں سے گیہوں کا ایک دانہ اٹھا لایا اور اس کو توڑ کر کھانا ہی چاہتا تھا کہ ایک دم مجھے احساس ہوا کہ یہ گیہوں میرا نہیں ہے چنانچہ میں نے وہ گیہوں فوراً اسی جگہ ڈال دیا جہاں سے اٹھایا تھا اس کا بھی حساب لیا گیا۔ یہاں تک کہ اس گیہوں کے توڑے جانے کے نقصان کے بقدر میری نیکیاں مجھ سے لی گئیں۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ نیکیاں صغیرہ گناہوں کا بھی کفارہ ہوتی ہیں اور کبائر میں بھی ان گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہیں جو پوشیدہ ہوں کیونکہ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد: [لَنُكَفِّرَنَّ عَنكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ] [النساء۔ ۳۱] بھی عموم پر دلالت کرتا ہے اور مذکورہ بالا حدیث بھی مطلق اور عام ہے البتہ جو کبیرہ گناہ ظاہر ہو گئے اور حاکم و قاضی کے نزدیک ثابت ہو جائیں ان پر حد یعنی شرعی سزا کا نفاذ ساقط نہیں ہوگا اور نہ وہ توبہ سے معاف ہوں گے۔
بعض اہل حال نے کیا خوب کہا:

من عرف اللّٰہ فلم تغنه معرفة اللّٰہ فذاك الشقی ☆ ما یصنع العبد بعز الغنی فالعز کل العز للمتقی

''جس نے اللہ کو پہچان لیا اور پھر اللہ کی معرفت نے اس کو غنی نہیں کیا تو یہی شخص بد بخت ہے، بندہ غناء و مالداری کی عزت کے ساتھ کیا کرے گا اور پوری پوری عزت تو متقی کیلئے ہے۔''

تخریج: اربعین میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے، اور بعض نسخوں میں ہے کہ حسن صحیح ہے۔ اھ۔

الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام احمد، ترمذی، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کیا ہے۔ امام احمد، ترمذی اور بیہقی نے حضرت معاذؓ سے بھی روایت کیا ہے۔ نیز ابن عساکر نے اس حدیث کو حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔

نرم خو پر آگ حرام ہے

۵۰۸۴: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِمَنْ يَحْرُمُ عَلَى النَّارِ وَبِمَنْ تَحْرُمُ النَّارُ عَلَيْهِ عَلٰى كُلِّ هَيِّنٍ لَيِّنٍ قَرِيْبٍ سَهْلٍ۔

(رواه احمد والترمذی وقال هذا حديث حسن غريب)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٦٤ الحديث رقم ٢٤٨٨، واحمد فی المسند ١/٤١٥۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمہیں اس شخص کے بارے میں نہ بتاؤں جو آگ پر حرام ہے اور آگ اس پر حرام ہے ہر نرم دل، نرم زبان اور لوگوں سے درگزر کرنے والا ہے۔ اس روایت کو احمد اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: یعنی اس میں از راہ مبالغہ و تاکید دونوں صورتیں (یعنی اس شخص کا آگ پر حرام ہونا اور آگ کا اس شخص پر حرام ہونا) ذکر فرمائی ہیں ورنہ تو دونوں معنی لازم و ملزوم ہیں (یعنی عبارتوں کا حاصل ایک ہی ہے اور وہ ہے اس شخص کا دوزخ کی آگ سے محفوظ رہنا۔ اس لئے جواب میں پہلی بات کے لیے ہی جواب ذکر کیا ہے۔

"هين" اور "لين" یہ دونوں لفظ یاء مشددہ کے ساتھ ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ جب ان دونوں الفاظ کا اطلاق انسان پر کرنا ہو، تو یائے مشددہ اور مخففہ ہر دو کے ساتھ درست ہے، اور جب غیر انسان پر اطلاق کیا جاتا ہے، تو یاء مخففہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ابن اعرابی سے مروی ہے کہ یاء کی تخفیف کے ساتھ ہو تو مدحت کیلئے ہوتا ہے، اور یاء کی تشدید کے ساتھ ہو تو مذمت کیلئے ہوتا ہے۔

(ذکرہ ابن الملک)

"هين" بروزن فیعل، هون بمعنی سکون، وقار و سہولت سے ماخوذ ہے۔ یہ کلمہ واوی ہے، واؤ کو یاء سے بدل کر یاء کا یاء میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ اور لفظ "لين" یہ کلمہ یائی ہے۔

علی کل هين لين قريب سهل: جار مجرور کا متعلق فعل محذوف ہے: ای: تحرم علی کل الخ

قریب کا مطلب یہ ہے کہ محافل طاعت میں لوگوں کی ہم نشینی اختیار کرتا ہے، اور بقدر طاقت ان کے ساتھ ملاطفت سے پیش آتا ہے۔

سھل: یعنی لوگوں کی حوائج وضروریات پوری کرنے میں نرم خوئی سے کام لیتا ہے۔
یا مطلب یہ ہے کہ قضاء واقتضاء میں، بیع وشراء میں سخاوت وجودت کا مظاہرہ کرتا ہے، جیسا کہ مؤمن کامل کی فضیلت میں مروی ہے۔
امام طیبیؒ فرماتے ہیں: علی کل هین لین، یہ جملہ دونوں سوالوں کا جواب ہے۔ اور دونوں کا ظاہری جواب ''کل هین لین'' ہے۔ پھر دوسرے درجہ میں پہلے کی بابت یوں فرماتے ''یحرم علی النار کل هین لین'' اور دوسرے کی بابت یوں فرماتے ''تحرم النار علی کل هین لین'' چنانچہ آپ علیہ السلام کا جواب ایسا جز تھا کہ جس میں دونوں پر تفصیلی دلالت ہے۔ اور اگر ویسے ذکر کرتے جیسا کہ ظاہر کا تقاضا تھا کہ'' کل هین لین ''فرماتے، تو بالتفصیل دلالت نہ ہوتی اھ۔
امام طیبیؒ کی یہ بات عجیب وغریب ہے۔ چونکہ معاملہ برعکس ہے جیسا کہ ادنیٰ تأمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ چونکہ تقدیری عبارت ہے: هو کل هین لین اور ضمیر کا مرجع دونوں اوصاف ہوں گے یعنی'' من یحرم علی النار ''اور'' من تحرم علیه النار'' بلکہ اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور دقت تأمل سے کام لیا جائے، تو پتہ یہ چلتا ہے، کہ جو جواب بزعم طیبیؒ موجز ہے وہ تفصیل پر قطعاً دلالت نہیں کرتا، بلکہ دلالت اجمالی ہے،
اور یہ بھی کہا جاتا ہے، کہ یہ از باب اکتفاء ہے، جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿سرابیل تقیکم الحر﴾ [النحل-۸۱] أی: والبرد چنانچہ یہاں پر بھی مقدر مانا جائے: وعلی کل هین لین صورت کے بیان پر اکتفاء فرمایا اور ویسے بھی یہ بات عام بول چال کے زیادہ قریب ہے کیونکہ عام طور پر اس طرح کہا جاتا ہے کہ دوزخ کی آگ فلاں شخص پر حرام ہے۔
یہاں یہ احتمال بھی ہے، کہ یہ دوسرا فقرہ کسی راوی نے مبالغہ کی غرض سے بڑھا دیا ہو۔ اس کی تائید الجامع میں موجود روایت سے ہوتی ہے: الا اخبرکم بمن تحرم علیه النار غدا؟ علی کل هین لین قریب سهل واللہ اعلم
تخریج: الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو ابو یعلی نے اپنی مسند میں حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے۔ اھ ترمذی اور طبرانی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔

فاسق عیار ہوتا ہے

۵۰۸۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُؤْمِنُ غِرٌّ کَرِیْمٌ وَالفَاجِرُ خَبٌّ لَئِیْمٌ۔ (رواہ احمدوؒ الترمذی وابوداؤد)

أخرجه ابو داؤد فی السنن ۵/۱۴۴ الحدیث رقم ۴۷۹۰، والترمذی فی ۳۰۳/۴ الحدیث رقم ۱۹۶۴، واحمد فی المسند ۳۹۴/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مؤمن بھولا بھالا باعزت ہوتا ہے اور فاسق عیار اور بداخلاق ہوتا ہے۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد)
تشریح: غر: غین معجمہ کے کسرہ اور راء کی تشدید کے ساتھ۔ غِرٌّ: کے معنی ہیں دھوکہ کھانے والا شخص اسی طرح صراح

دغیرہ میں غر کے معنی ناآزمودہ یا ناتجربہ کار نوجوان کے لکھے ہیں خب کے معنی ہیں وہ شخص جو دھوکہ دینے والا اور چالاک ہو۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نیکوکار شخص چونکہ طبعاً مطیع وفرمانبردار ہونے کی وجہ سے نرم مزاج' شریف النفس اور سادہ لوح ہوتا ہے اس لئے وہ ہر فریب کار شخص سے دھوکہ کھا جاتا ہے وہ نہ تو لوگوں کے مکروفریب سے آگاہ ہوتا ہے اور نہ مکروفریب کی باتوں اور چالوں کی چھان بین اور دھوکہ بازوں کے احوال کی تحقیق وجستجو کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ جاہل و نادان ہوتا ہے بلکہ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کے مزاج کی نرمی ومروت' حلم وکرم' عفو ودرگزر کرنے کی عادت اور خوش خلقی ہوتا ہے۔

بعض حضرات نے حدیث کا مطلب اس اسلوب میں بیان کیا ہے کہ نیکوکار شخص چونکہ سلیم القلب اور سادہ لوح ہوتا ہے اس لئے وہ لوگوں کے بارے میں ہمیشہ نیک گمان رکھتا ہے کسی کے اندر کیا بھرا ہوا ہے اس کو وہ نہیں دیکھتا جس کے سینے میں کینہ ہوتا ہے اس کو پہچانتا نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو شخص اس کے سامنے جو کچھ کہہ دیتا ہے اس کو مان لیتا ہے اور دھوکہ کھا جاتا ہے

ایک بات یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کے سامنے آخرت کے معاملات اور نفس کی اصلاح کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے اور دنیا کے معاملات اس کی نظر میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتے لہٰذا وہ اپنے نفس کی اصلاح اور آخرت کے کاموں میں مشغول رہتا ہے اور دنیا کے کاموں پر زیادہ توجہ نہیں دیتا اس لئے اگرچہ وہ دنیاوی معاملات میں دھوکہ کھا جاتا ہے مگر آخرت کے معاملات میں ہوشیار اور عقل معاد میں کامل ہوتا ہے

نیکوکار مؤمن کی اس حالت کو اگرچہ تعریف کے طور پر بیان پر فرمایا گیا ہے مگر اس کے باوجود حضور ﷺ نے اپنے اس ارشاد "لا یلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین" کے ذریعہ آگاہ بھی فرمایا ہے کہ مؤمن کے لئے مناسب نہیں ہے کہ ہمیشہ غفلت اختیار کر کے مسلسل دھوکہ کھاتا رہے اور ہوشیاری کے طریقہ کو بالکل ترک کر دے

بات پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ لا یلدغ المؤمن الخ کے ذریعہ مؤمن کو جس ہوشیاری وبیدار مغزی کی تلقین کی گئی ہے اس کا تعلق دنیا وآخرت دونوں معاملات سے ہے اگرچہ بعض حضرات نے اس کو صرف اخروی معاملات کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔

قولہ: والفجر خب لئیم: نیکوکار کے برخلاف فاجر یعنی منافق وغیرہ کی خصلت یہ بیان فرمائی گئی ہے چونکہ دھوکہ دہی اور مکاری اس کی فطرت ہی میں داخل ہوتی ہے' فتنہ وفساد پھیلانا ہی اس کا شیوہ ہوتا ہے اور اس کے نزدیک چشم پوشی ایک بے معنی چیز ہوتی ہے اس لئے وہ جلد دھوکا نہیں کھاتا الا یہ کہ کوئی شخص اس سے بھی بڑا مکار وعیار ہو اور وہ اس کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جائے تاہم اگر وہ نادانستہ دھوکا کھا بھی جاتا ہے تو اس کو برداشت نہیں کرتا بلکہ انتقام لینے کی سعی کرتا ہے۔

فرزدق کہتا ہے:

ان الکریم اذا خادعتہ انخدع

"کریم کو جب تم دھوکہ دو گے تو بلاشبہ وہ دھوکہ کھا جائے گا۔"

الخب: خاء معجمہ کے فتحہ کے ساتھ' بمعنی خداع مصدر ہے۔ وہ شخص جو لوگوں کے درمیان فساد پھیلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل خب خاء کو کبھی مکسور بھی پڑھا جاتا ہے۔ البتہ مصدر صرف کسرہ ہی کے ساتھ ہے۔ اھ۔ خلاصہ یہ ہوا کہ بکسر الخاء دونوں آتنوں ہیں۔ فتأمل۔

تخریج: امام حاکم نے بھی اس روایت کو اسی طرح نقل کیا ہے۔ البتہ امام بیہقی نے اس حدیث کو ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: المؤمن هين لين حتى تخاله من اللين أحمق

مؤمن نرم دِل ہوتا ہے

۵۰۸۶: وَعَنْ مَكْحُوْلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُؤْمِنُوْنَ هَيِّنُوْنَ لَيِّنُوْنَ كَالْجَمَلِ الْاَنِفِ اِنْ قِيْدَ انْقَادَ وَاِنْ اُنِيْخَ عَلٰى صَخْرَةٍ اسْتَنَاخَ۔ (رواه الترمذی مرسلا)

أخرجه ابو نعيم في الحلية ٥/١٨٩۔

ترجمہ: حضرت مکحولؒ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مؤمن نرم دل، نرم طبیعت ہوتے ہیں۔ جیسے نکیل والا اونٹ اگر اسے چلایا جائے تو اطاعت کرے اور اگر پتھر پر بٹھائیں تو بیٹھ جائے۔ ترمذی نے مرسل روایت کی ہے۔

تشریح: هينون لينون: یہ دونوں لفظ مشدد و مخفف دونوں طرح درست ہیں۔ النہایہ میں لکھتے ہیں: هما تخفيف الهين واللين اھ۔

گویا کہ ان کا اعتماد ابن اعرابی کے کلام پر ہے۔ اور ماقبل میں یہ بات گزری چکی ہے، کہ یہ ضعیف ہے، اور خلاف اصل ہے۔ لہٰذا بغیر ثبوت کے ثابت نہیں مانا جائے گا۔ اور الفائق میں لکھتے ہیں کہ ''هين'' اور ''لين'' میں پہلی یاء محذوف ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے، کہ دوسری یاء محذوف ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: دوسری یاء پہلی یاء سے اولیٰ ہے۔ چونکہ تخفیف کے وقت اس کی احتیاج ہوتی ہے۔ اور اس لئے بھی کہ دوسری تخفیف کی نوبت نہ آئے۔ فتدبر

انف: ہمزہ کے فتحہ و مد، اور نون کے کسرہ کے ساتھ۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: أنف البعير كفرح اشتكى أنفه من البرة، فهو أنف ككتف وصاحب، والأول أصح وأفصح اور ایک شارح کا کہنا ہے کہ اس میں مدّ خطا ہے۔ تو ممکن ہے کہ شارح کی مراد روایۃً یا درایۃً ہو۔ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: ''أنف'' بمعنی ''مانوف'' ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ ''أنف'' بمعنی ''ذلول'' ہے۔ چنانچہ ''أنف البعير فهو أنف'' اس وقت کہا جاتا ہے، کہ جب اس کی ناک میں تکلیف ہو۔ اصل کے اعتبار سے ''مأنوف'' کہنا چاہئے تھا، چونکہ مفعول بہ ہے، جیسا کہ ''مصدور'' اور ''مبطون'' کہتے ہیں۔ چنانچہ یہ شاذ ہے۔ اور مد کے ساتھ ''كالجمل الآنف'' بھی مروی ہے۔ یہ بھی اسی معنی میں ہے۔

جوہریؒ کہتے ہیں: الخشاش بالكسر خشب يدخل في أنف البعير کاف محل رفع میں ہے، خبر ثالث ہے۔ اور مطلب یہ ہے: كل واحد منهم كالجمل الآنف اور یہ بھی ممکن ہے، کہ محل نصب میں ہو، مصدر محذوف کی صفت ہو۔ اور تقدیری عبارت یوں ہو: لينون لينا مثل الجمل الآنف (ذکرہ الطیبی)

دوسرا اظہر ہے پہلا أدق ہے، اور اعتماد کیلئے احق ہے۔ اور ''كل واحد'' کی تقدیر کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ معنی یہ ہوں گے: المؤمنون كلهم من كمال انقيادهم واجتماعهم في سبيل رضاء مولاهم، مثل الجمل الواحد المأنوف۔ اس کلام میں مبالغہ ہے، جیسا کہ مروی ہے: المؤمنون كرجل واحد، ان اشتكى رأسه اشتكى كله، وان

اشتکی عینہ اشتکی کلہ جیسا کہ اس حدیث کو امام احمد اور مسلم نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے۔
یا "جمل" سے مراد جنس ہے، چنانچہ اس سے جمعیت کے معنی مستفاد ہوں گے، اس صورت میں کوئی اشکال باقی نہیں رہے گا۔
شرح السنۃ میں لکھتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن طبعاً فرماں بردار ہوتا ہے وہ شریعت کا اتباع بلا چون و چرا کرتا ہے' خدا اور خدا کے رسول کے احکامات جس طرح ہوتے ہیں ان کو اسی طرح بجالاتا ہے اور ان میں اپنی طرف سے کوئی دخل اندازی نہیں کرتا اور ان احکام کی بجا آوری اور شریعت کی اتباع میں جو مشقت پیش آتی ہے اس کو برضا و رغبت برداشت کرتا ہے۔
یہ احتمال بھی ہے کہ اس حدیث میں مسلمانوں کی اس خصوصیت کو بیان کرنا مقصود ہو جو وہ آپس میں ایک دوسرے کی اتباع و فرمانبرداری اور ایک دوسرے کے ساتھ تواضع وانکساری اختیار کرنے اور غرور وتکبر سے اجتناب کرنے کی صورت میں رکھتے ہیں اور حقیقت میں یہ خصوصیت بھی احکام خداوندی کی اطاعت میں شامل ہے۔
تخریج: الجامع میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو ابن مبارک نے مکحول سے مرسلاً روایت کیا، اور بیہقی نے ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔یعنی سند متصل کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے:

تکالیف پر صابر مؤمن بہتر ہے

۵۰۸۷:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْمُسْلِمُ الَّذِيْ يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلٰى اَذَاهُمْ اَفْضَلُ مِنَ الَّذِيْ لَايُخَالِطُهُمْ وَلَايَصْبِرُ عَلٰى اَذَاهُمْ۔ (رواه الترمذي وابن ماجة)

أخرجه الترمذي في السنن ٥٧٢/٤ الحديث رقم ٢٥٠٧ و ابن ماجه في ١٣٣٨/٢ الحديث رقم ٤٠٣٢، واحمد في المسند ٤٣/٢۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ مسلمان جو دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہے اور ان کی طرف سے آنے والی تکالیف پر صبر کرے ایسا مسلمان اس سے بہت بہتر ہے جو نہ تو مل جل کر رہے اور نہ ان کی تکلیف پر صبر کرے۔ (ترمذی' ابن ماجہ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے ساتھ ربط واختلاط اور میل جول رکھنا' عزلت وتنہائی اور گوشہ نشینی اختیار کرنے سے افضل ہے چنانچہ اکثر تابعین اس پر عامل تھے اور یہ چیز امر بالمعروف ونہی عن المنکر' خیر وبھلائی کے پھیلانے' باہمی امداد وتعاون اور دین واسلام کی استعانت کے اعتبار سے بھی زیادہ کامل اور زیادہ افضل ہے۔
رہی یہ بات کہ عزلت وگوشہ نشینی کے بارے میں بھی احادیث منقول ہیں جس سے عزلت وگوشہ نشینی کا افضل وبہتر ہونا ثابت ہوتا ہے تو اس سلسلے میں اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس اختلاف کا تعلق زمان ومکان اور لوگوں کے احوال کے اختلاف سے ہے (یعنی بعض موقعہ ومقام اور بعض لوگوں کے حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ ربط واختلاط رکھا جائے۔ چنانچہ ایسی صورت میں لوگوں سے ملنا جلنا عزت وگوشہ نشینی اور لوگوں سے الگ تھلگ رہنا ہی افضل وبہتر ہوتا ہے۔
درمیانی راہ یہ ہے کہ ذہنی طور پر ضروری اور ناگزیر معاملات کے علاوہ باقی اوقات میں عوام الناس سے الگ تھلگ رہا جائے

اور جمعہ کے دن ان کے ساتھ اکٹھا ہونے پر اکتفا کیا جائے البتہ خواص یعنی صالحین وغیرہ کے ساتھ برابر ربط واختلاط رکھا جائے اوران سے عزلت وگوشہ نشینی اختیار نہ کی جائے۔لیکن عوام الناس سے عزلت وگوشہ نشینی اختیار کرنا اس صورت میں سودمند ہوگا جب کہ باعث عمل علم حاصل کیا جاچکا ہواور زہد وتوکل کا وہ درجہ نصیب ہوگیا ہو جہاں پہنچ کرانسان مخلوق سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے اور کسی طرح کی طمع وخواہش نہیں رکھتا۔اسی لئے بعض عارفین نے کہا ہے:ا لعزلة بغير عين العلم زلة وبغيرزی الزهد علة۔کہ ''عزلت وگوشہ نشینی بغیر علم کے ذلت ورسوائی ہے اور بغیر زہد وقناعت کے علت وخرابی ہے!'' چنانچہ کامل صوفیاء جیسے نقشبندیہ شاذلیہ اور بکریہ اس طریقہ پر عامل تھے کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ بھی رہتے تھے اوران سے ربط واختلاط بھی رکھتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

انه قال:عليكم با لاخوان' فانهم عدة لكم فى الدنيا و الآخرة، الا تسمع الى قول اهل النار:فما لنا من شافعين و لا صديق حميم

حضرت عمرؓ نے فرمایا: خذوا حظكم من العزلة اور فضیلؒ فرماتے ہیں: كفى بالله محبا و بالقرآن مؤنسا وبالموت واعظا، اتخذ الله صاحباً، ودع الناس جانبا

داؤد طائی نے ابوالربیع کو وصیت کی:صم من الدنيا' واجعل فطرك الآخرة ، وفر من الناس فرارك من الاسد

وہب ابن ورد فرماتے ہیں:بلغنا ان الحكمة عشرة اجزاء تسعة منها فى الصمت والعاشر فى عزلة الناس

حاتم اصم کے پاس کوئی امیر آیا اور کہنے لگا:ألك حاجة؟ آپ نے فرمایا،ہاں! ہے۔اس نے کہا: کیا؟ تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا: أن لا ترانی

ابن عباسؓ فرماتے ہیں:افضل المجالس مجلس فى قعر بيتك ان لا ترى ولا ترى

تخریج:الجامع میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

المؤمن الذي يخالطه الناس ويصبر على أذاهم أفضل من المؤمن الذى لا يخالط الناس ولا يصبر على أذاهم۔

اس حدیث کوامام احمد نے،امام بخاریؒ نے ''الادب المفرد'' میں،ترمذی اورابن ماجہ نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

غصہ پی جانے کا بدلہ

۵۰۸۸:وَعَنْ سَهْلِ بْنِ مُعَاذٍ عَنْ اَبِيهِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَى اَنْ يُّنْفِذَهٗ دَعَاهُ اللّٰهُ عَلٰى رُؤُسِ الْخَلَائِقِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُخَيِّرَهٗ فِىْ اَيِّ الْحُوْرِ شَآءَ۔

(رواه الترمذى وابوداؤد والترمذى هذا حديث غريب)

أخرجه ابو داؤد في السنن ٥/١٣٧ الحديث رقم ٤٧٧٧، والترمذى فى السنن ٤/٣٢٦ الحديث رقم ٢٠٢١ وابن ماجه ٢/١٤٠٠ الحديث رقم ٤١٨٦ واحمد فى المسند ٣/٤٤٠۔

ترجمه: حضرت سہل بن معاذؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص غصہ پی جائے حالانکہ وہ اس کے نفاذ پر قدرت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام مخلوق کے سامنے بلائے گا اور اسے اختیار دے گا جو حور منتخب کرنا چاہے وہ کرے۔ ابوداؤد، ترمذی نے اسے غریب کہا۔

تشریح: قوله: دعاه الله على رؤوس اخلائق يوم القيامة:

حق تعالیٰ قیامت کے دن ساری مخلوق کے درمیان اس شخص کو نیک شہرت دے گا' اس کی تعریف وتوصیف کرے گا اور اس پر فخر کا اظہار کرے گا' نیز اس کے بارے میں اعلان کیا جائے گا کہ یہ وہ شخص ہے جس کے اندر اتنی بڑی خوبی تھی۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: غصہ پر قابو پانے کی صفت کو اتنا اونچا مقام دینے کی وجہ یہ ہے کہ غصہ دراصل نفس امارہ کی ہیجانی کیفیت کا نام ہے اور جس نے اپنا غصہ پی لیا اس نے گویا اپنے نفس امارہ کو کچل ڈالا' اسی لئے غصہ پر قابو پانے والوں کی تعریف حق تعالیٰ نے بھی ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے: [وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ] [آل۔عمران۔۱۳۴] اور جو شخص اپنے نفس کو اس کی خواہش سے باز رکھتا ہے اس کا آخری ٹھکانہ جنت اور اس کی جزاء حور عین ہے۔ میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں جب اتنا عظیم اجر محض غصہ کو پی جانے پر حاصل ہوگا تو اس شخص کے مقام ومرتبہ کی بلندی کا کیا اندازہ ہوسکتا ہے جو محض غصہ کو پی جانے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کے ساتھ عفو واحسان کا برتاؤ بھی کرے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: الاحسان أن تحسن الى المسيء فان الاحسان الى المحسن متأجرة''۔ کہ اصل احسان یہی ہے کہ تم اس شخص پر احسان کرو جو تمہارے ساتھ برا کرے کیونکہ جس شخص نے تم پر احسان کیا ہے اگر تم اس پر احسان کرے ہو تو یہ تجارت ہے۔

على أن ينفذه: باب تفعیل سے ہے، اور ایک روایت میں ''على انفاذه'' کے الفاظ ہیں۔ لہٰذا باب افعال سے پڑھنا بھی درست ہے۔ جملہ حالیہ ہے اور جواب شرط اگلا جملہ ہے۔

كظم: صاحب نہایہ لکھتے ہیں: كظم الغيظ تجرعه واحتمال سببه والصبر عليه۔

بیضاوی میں لکھتے ہیں: عن النبي ﷺ ان هؤلاء في امتي قليل الا من عصمه الله، و قد كانوا كثيرا من الأمم التي مضت۔ اھ۔ اس روایت کو ثعلبی نے مقاتل بن حبان سے نقل کیا ہے۔ قال: بلغنا ان رسول الله ﷺ قال: ان هؤلاء الخ اور شاید کہ یہ اس آیت مبارکہ سے ماخوذ ہے: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (١٠) اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ (١١) فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (١٢) ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ (١٣) وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ (١٤)﴾ [الواقعة: ١٠۔١٤] ''اور جو آگے بڑھنے والے ہیں (انکا کیا کہنا) وہ آگے ہی بڑھنے والے ہیں وہی (خدا کے) مقرب ہیں نعمت کی بہشتوں میں وہ بہت سے تو اگلے لوگوں میں سے ہوں گے اور تھوڑے سے پچھلوں میں سے''۔

تخریج: اس روایت کو امام احمدؒ نے بھی اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔

٥٠٨٩ : وَفِيْ رِوَايَةٍ لِاَبِيْ دَاوُدَ عَنْ سُوَيْدِ بْنِ وَهْبٍ عَنْ رَجُلٍ مِّنْ اَبْنَآءِ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ مَلَاَ اللّٰهُ قَلْبَهٗ اَمْنًا وَاِيْمَانًا وَذَكَرَ حَدِيْثَ سُوَيْدٍ مَّنْ تَرَكَ لُبْسَ ثَوْبِ جَمَالٍ فِيْ كِتَابِ اللِّبَاسِ۔

أخرجه الترمذي في السنن ٤/٥٦١ الحديث رقم ٢٤٨١۔

حضرت سوید رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ترَكَ لُبْسَ ثَوْبِ جَمَالٍ فِيْ كِتَابِ اللِّبَاسِ میں نقل کی جاچکی ہے۔
واضح رہے کہ اس روایت کا ابتدائی حصہ بھی روایت سابق کے مثل ہے، البتہ سوید بن وہب کی روایت میں ''علی انفاذہ'' کے الفاظ ہیں۔

تخریج: اس روایت کو ابن ابی الدنیا نے ''ذم الغضب'' میں حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ (الجامع)

عرضِ مرتب:

من ترك لباس...... یہ مکمل روایت یوں ہے:

وَعَنْ سُوَيْدِ بْنِ وَهْبٍ عَنْ رَّجُلٍ مِنْ اَبْنَاءِ اَصْحٰبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ تَرَكَ لُبْسَ ثَوْبَ جَمَالٍ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ تَوَاضُعًا كَسَاهُ اللّٰهُ حُلَّةَ الْكَرَامَةِ وَمَنْ تَزَوَّجَ لِلّٰهِ تَوَجَّهُ اللّٰهُ تَاجَ الْمُلْكِ ٥١۔

اس روایت کو تکرار کے باعث یہاں سے ساقط کر دیا ہے، باب کی مناسبت سے وہاں ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الفصل الثالث:

اسلام کا اخلاق حیاء ہے

۵۰۹۰: عَنْ زَيْدِ بْنِ طَلْحَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِكُلِّ دِيْنٍ خُلُقًا وَخُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَيَاءُ۔ (رواه مالك مرسلاً)

أخرجه مالك في الموطأ ٢/٩٠٥ الحديث رقم ٩، من كتاب حسن الخلق۔

ترجمہ: حضرت زید بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ ہر دین کے اخلاق ہوتے ہیں اور اسلام کا اخلاق حیاء ہے مالک نے اسے مرسلاً روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

زید بن طلحہ۔ یہ زید بن طلحہ ہیں، تابعی ہیں۔ ان سے ''سلمہ بن صفوان زرقی'' روایت کرتے ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے ان کی حدیث ''حیاء'' کے بارے میں ذکر کی ہے۔

تشریح: یہاں ''حیاء'' سے اس چیز میں شرم وحیا کرنا مراد ہے جس میں حیا کرنا مشروع ہے، چنانچہ جن چیزوں میں شرم وحیاء کرنے کی اجازت نہیں ہے جیسے تعلیم وتدریس، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، ادائیگی حق کا حکم دینا، خود حق کو ادا کرنا اور گواہی دینا وغیرہ وغیرہ، ان میں شرم وحیا کرنے کی کوئی فضیلت نہیں ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر دین کے لوگوں پر کوئی نہ کوئی وصف وخصلت غالب رہتی ہے چنانچہ اہل

اسلام پر جس طبعی وصف کو غالب قرار دیا گیا ہے وہ حیاء ہے اور باوجودیکہ حیا بھی ان اوصاف وخصائل میں سے ہے جو تمام ادیان ومذاہب کے لوگوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں لیکن اسی وصف حیاء کو خاص طور پر اہل اسلام پر غالب کیا گیا ہے اور دوسرے مذاہب کے لوگوں میں اس جوہر کو بہت کم رکھا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حیاء نہ صرف یہ کہ طبعی خاصیتوں اور خصلتوں میں سب سے اعلیٰ درجہ رکھتی ہے بلکہ یہ وہ جوہر ہے جس سے انسانی اخلاق وکردار کی تکمیل بھی ہوتی ہے اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بعثت لا تمم مکارم الاخلاق (میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہوں) اس لئے اس جوہر کے ذریعہ ملت اسلامیہ کے اخلاق واوصاف کو کمال کے درجہ پر پہنچایا گیا ہے اور ایک موقع پر اپنے اصحاب کرامؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: استحیوا من اللہ تعالیٰ حق الحیاء۔ (الحدیث) میں (ملا (علی قاری)) کہتا ہوں

حقیقت تو یہ ہے کہ صرف حیا ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ ہم سے پہلے کی امتوں میں تمام ہی اخلاق وخصائل ناقص تھے یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ملت اسلامیہ میں تمام اخلاق وخصائل کو کامل ومکمل کیا گیا اسی لئے ملت اسلامیہ کی اس خاصیت کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: [كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ]

[آل عمران ـ ۱۱۰]

۵۰۹۱-۵۰۹۲: وَرَوَاهُ ابْنِ مَاجَةِ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْإِيْمَانِ عَنِ أَنَسٍ وَابْنِ عَبَّاسٍ ۔

أخرجه ابن ماجه في ۲/ ۱۳۹۹ الحديث رقم ۴۱۸۱ و عن ابن عباس الحديث رقم ۴۱۸۲ والبيهقي في الشعب ۶/ ۱۳۶ الحديث رقم ۷۷۱۶۔

ترجمہ: اور ابن ماجہ اور شعب الایمان میں بیہقی نے اس روایت کو حضرت انس وابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔

تشریح: ابن ماجہؒ اور بیہقیؒ نے مذکورہ بالا روایت کو حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بطریق موقوف نقل نہیں کیا ہے جیسا کہ عبارت کے ظاہر اسلوب سے یہ گمان ہوسکتا ہے بلکہ بطریق مرفوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے طور پر نقل کیا ہے۔

نیز مذکورہ عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں یعنی ابن ماجہ اور بیہقی میں سے ہر ایک نے ان دونوں صحابیؓ سے اس روایت کو نقل کیا ہے اور یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ مذکورہ عبارت میں ان دونوں کا ذکر علی الترتیب ہو یعنی ابن ماجہ نے اس روایت کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ لیکن جامع صغیر میں اس حدیث کو ابن ماجہ کے سلسلہ کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح بیہقی نے بھی اس روایت کو ان دونوں صحابیؓ سے نقل کیا ہے۔

دو ساتھی حیا اور ایمان

۵۰۹۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْحَيَاءَ وَالْاِيْمَانَ قُرَنَاءُ جَمِيْعًا فَاِذَا رُفِعَ اَحَدُهُمَا رُفِعَ الْاٰخَرُ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/ ١٤٠ الحديث رقم ٧٧٢٧۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حیاء اور ایمان ساتھی ہیں جب ایک ختم ہو جائے تو دوسرا بھی ختم ہو جاتا ہے۔

تشریح: قرناء: قرین کی جمع ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ لفظ ان لوگوں کی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اقل جمع کا اطلاق دو پر ہوتا ہے۔اھ۔اور ایک نسخہ میں یہ لفظ ماضی مجہول کے صیغہ تثنیہ کے ساتھ "قرنا" منقول ہے ای جعلا مقرونین۔

جمیعًا: "مجتمعین" کے معنی میں ہے۔یہ ماقبل کی تاکید معنوی ہے۔

۵۰۹۴: وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ فَإِذَا سُلِبَ اَحَدُهُمَا تَبِعَهُ الْاٰخَرُ۔(رواه البيهقي في شعب الايمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/ ١٤٠ الحديث رقم ٧٧٢٦۔

ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ جب یہ چھین لیا جائے تو دوسرا خود چھن جاتا ہے۔بیہقی شعب الایمان۔

توضیح و تخریج: امام حاکم نے اور ابو نعیم نے "الحلیہ" میں عن ابن عمر اس کی موافقت کی ہے۔اور طبرانی نے بھی الاوسط میں عن ابن عباس اسکی موافقت کی ہے۔لیکن ان کے الفاظ یہ ہیں: الحياء والايمان في قرن، فاذا سلب احدهما تبعه الآخر اور انہی کی ایک روایت میں عن ابی موسیٰ ہے یہ الفاظ مروی ہیں: الحياء والايمان مقرونان لا يفترقان الا جميعا۔

ایک نصیحت اپنے اخلاق درست رکھو

۵۰۹۵: وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ كَانَ اٰخِرُ مَا اَوْصَانِيْ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ وَضَعْتُ رِجْلِيْ فِي الْغَرْزِ اَنْ قَالَ يَا مُعَاذُ اَحْسِنْ خُلُقَكَ لِلنَّاسِ۔ (رواه مالك)

أخرجه مالك في الموطأ ٢/ ٩٠٢ الحديث رقم ١ من كتاب حسن الخلق۔

ترجمہ: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے جو آخری نصیحت فرمائی جب کہ میں نے رکاب میں پاؤں رکھا فرمایا اے معاذ! اپنے اخلاق لوگوں کے لئے اچھے رکھو۔(مالک)

تشریح: الغرز: غین معجمہ کے فتحہ، راء کے سکون اور زاء معجمہ کے ساتھ، اونٹ کے کجاوے میں موجود موضع رکاب کو کہا جاتا ہے۔(قالہ الباجی)

النہایہ میں لکھتے ہیں: الغرز ركاب كور الجمل اذا كان من جلد أو خشب وقيل هو الكور مطلقا كالركاب للسرج أن قال: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: أن قال، "كان" کی خبر ہے۔اور حين وضعت، "أن قال" کے لئے ظرف ہے۔

قوله: أحسن خلقك للناس:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانۂ حیات میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا۔چنانچہ جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اپنے منصب سنبھالنے کے لئے یمن روانہ ہونے لگے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بہت سی نصیحتیں فرمائیں۔گھوڑے پر سوار کرایا اور رخصت کرنے کے لئے خود پا پیادہ کچھ دور تک ان کے ساتھ گئے اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ الفاظ

بھی فرمائے تھے کہ معاذ! شاید تم پھر مجھے نہ دیکھ پاؤ۔ چنانچہ معاذ رضی اللہ عنہ کو اس کے بعد سرکار رسالت پناہ کی زیارت نصیب نہیں ہوئی، وہ یمن ہی میں تھے کہ آنحضرت ﷺ نے اس دنیا سے پردہ فرمالیا۔ بہرحال حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا روایت میں آنحضرت ﷺ کی جس وصیت کا ذکر کیا ہے وہ اسی موقع پر ان کے لئے آنحضرت ﷺ کی آخری نصیحت تھی۔

سیوطیؒ کہتے ہیں کہ یہاں ''لوگوں'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو خوش خلقی اور نرمی و مہربانی کے مستحق ہوں ورنہ جہاں تک اہل کفر و کا تعلق ہے (وہ اس دائرہ سے خارج ہیں) اور ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنے کا حکم ہے (بلکہ سرکش لوگوں کے ساتھ اختیار کی جانے والی سختی و درشتی ہی حسن خلق ہے کیونکہ نہ صرف ان کی تربیت و تہذیب اسی درشتی و سختی پر منحصر ہوتی ہے بلکہ ان کے ساتھ اختیار کئے جانے والے اس رویہ کے ساتھ دوسرے لوگوں کے حالات کی بہتری و سلامتی بھی وابستہ ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیوطیؒ کے نزدیک گویا حدیث میں حسن خوش خلقی سے مراد نرمی و مہربانی اور عفو و درگزر کا رویہ اختیار کرنا ہے۔)

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہا جاتا ہے کہ رفق و مہربانی حسن خلق میں سے ہے۔ تو ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی تمام مخلوق کو شامل ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ادع الی سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة......﴾ [النحل۔۱۲۵]

مجھے عمدہ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا

۵۰۹۶: وَعَنْ مَالِكٍ بَلَغَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ۔

(رواه فی المؤطا)

أخرجه مالك فی الموطأ ۲/۹۰۴ الحديث رقم ۲ من كتاب حسن الخلق۔

ترجمہ: حضرت مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے۔ (مؤطا امام مالک)

تشریح: بلغه: مجرور ہے، اور فاعل ''أن رسول الله ﷺ'' الخ ہے۔

احتمال ہے کہ یہ روایت امام مالک کے نزدیک متصل ہو، لیکن انہوں نے تابعی اور صحابی دونوں کو ذکر نہیں کیا۔ اور ایک احتمال یہ ہے کہ منقطع ہو، بایں طور کہ دو راویوں کو ترک کردیا ہے۔ اور ظاہر بھی یہی ہے، چنانچہ اگر یہ روایت مرفوع ہوتی تو صحابی کا نام ذکر کرتے، اور اگر مرسل ہوتی تو تابعی کا نام ذکر کرتے۔

امام طیبیؒ نے بھی تقریباً یہی بات کہی ہے، وہ فرماتے ہیں: هذا يحتمل ان يكون متصلا، وراوی مالك لم يذكر الاتصال وأن يكون مرسلا وان لم يذكر مالك التابعی ولا الصحابی وقيل انه منقطع

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں یہ تمام احتمالات عقلی ہیں، اور قواعد حدیث کی رو سے یہ منقطع ہے۔ اس لئے کہ اس کے علاوہ میں ''بلغه'' کی تعبیر اختیار نہیں کی جاتی، بلکہ تحقیقی بات یہ ہے کہ یہ روایت معلق کے قبیل سے ہے۔ اس میں طویل بحث ہے، جس کو میں نے ''شرح النخبة'' میں بیان کیا ہے۔

بعثت صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔

حسن: حاء کے ضمہ اور سین کے سکون کے ساتھ ہے۔

حسن الأخلاق ای الاخلاق الحسنة والافعال المستحسنة

اور ایک نسخہ میں بروزن قلم ہے۔اس صورت میں مطلب یہ ہوگا: لان أجعل حسنها أحسنها

قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں: وکانت العرب أحسن اخلاقا بما بقی عندھم من شریعة ابراهيم عليه السلام، وكانوا ضلوابا لكفر عن كثير منها' فبعث ﷺ ليتم محاسن الأخلاق (ذکرہ السیوطی) اور تحقیقی بات وہ ہے جو ہم نے ماقبل میں ذکر کی ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: لأ تمم الخ اس میں دو احتمال ہیں: ان يراد به ان كملها بعد النقصان أنه جمعها بعد التفرقة ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اولئك الذين هدى الله فبهدا هم اقتده﴾ [الانعام۔ ۹۰]

امام فخر الدین فرماتے ہیں یہ آیت آنحضرت ﷺ کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔ چونکہ اللہ جل شانہ نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم یہ دیا ہے، کہ آپ ان کے طریقہ کی اقتداء کریں، لہٰذا آنحضرت ﷺ کیلئے لازم ہے، کہ آپ امتثال امر فرمائیں، چنانچہ یہ بات لازم آتی ہے، کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام میں ان لوگوں کے تمام اخلاق وخصائل متفرقہ پائے جائیں۔ پہلے معنی کی طرف آنحضرت ﷺ نے ان الفاظ کے ساتھ اشارہ فرمایا: مثلی ومثل الانبياء كمثل قصر احسن بنيانه وترك موضع لبنة منه ......لكنت انا سددت موضع تلك اللبنة حتى تم بی البنيان اھ۔ دونوں اقوال کے جمع میں بھی کوئی مانع نہیں چونکہ آنحضرت ﷺ من جانب اللہ "جمع الجمع" کے مرتبہ پر فائز تھے۔

قوله: رواه فی المؤطا: اس عبارت میں ایک مناقشہ ہے جو ماقبل میں گزر چکا ہے۔ یا اس کی تقدیری عبارت یوں ہے: رواہ مالك عن مالك لہٰذا مؤلف کو یوں کہنا چاہئے تھا: كذا فی المؤطا

۵۰۹۷: وَرَوَاهُ اَحْمَدُ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ ۔

اخرجه احمد فی المسند ۲/۳۸۱۔

ترجمہ: اور احمدؒ نے اس روایت کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

تشریح: الجامع میں لکھتے ہیں: "انما بعثت لأتمم صالح الاخلاق" اس حدیث کو ابن سعد سے امام بخاری نے "الادب المفرد" میں، امام حاکم نے اور امام بیہقی نے "شعب الایمان" میں حضرت ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے۔

آئینہ دیکھنے کی دعا

۵۰۹۸: وَعَنْ جَعْفَرِبْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا نَظَرَ فِي الْمِرْاٰةِ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ حَسَّنَ خَلْقِيْ وَخُلُقِيْ وَزَانَ مِنِّيْ مَاشَانَ مِنْ غَيْرِيْ۔

(رواه البيهقی فی شعب الايمان مرسلا)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٤/ ١١١ الحديث رقم ٤٤٥٩۔

ترجمہ: حضرت جعفر بن محمد اپنے والد محترمؒ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب آئینہ دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے: تمام تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے میری صورت اور اخلاق دونوں کو خوبصورت بنایا اور میری ہر وہ چیز اچھی بنائی جو دوسروں کی بری ہے۔ اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: **المرآۃ**: میم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

حسن: از باب تفعیل صیغہ معروف کے ساتھ ہے۔ بمعنی اُحسن۔

خلقي و خلقي: پہلا لفظ بفتح الاول اور دوسرا لفظ بضم الخاء ہے۔ "خلق" کو خلق پر مقدم فرمایا، چونکہ خلق ظاہری چیز ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح بعض آدمیوں کی جسمانی تخلیق میں کوئی عیب ونقصان ہوتا ہے (کہ مثلاً کوئی شخص ایک ہاتھ سے یا ایک آنکھ وغیرہ سے محروم ہوتا ہے یا کسی شخص کی کوئی ٹانگ ٹیڑھی ہوتی ہے یا کوئی اور عضو ناقص ہوتا ہے) اس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھ میں کوئی جسمانی عیب ونقص نہیں رکھا بلکہ مجھ کو تمام نقصان وعیوب سے محفوظ اور صحیح وسلامت رکھا! نقصان وعیب عام ہے بلکہ اس کا تعلق خواہ جسمانی تخلیق وپیدائش سے ہو یا اخلاق وکردار سے۔ بہر حال یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کسی بھی انسان کے مقابلہ میں آنحضرت ﷺ کی سیرت وصورت بہت اعلیٰ اور بہت خوب تھی اور جیسا کہ طیبیؒ نے کہا ہے مذکورہ بالا حدیث گویا آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد: **بعثت لا تمم حسن الاخلاق** (میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں) کی وضاحت بھی ہے۔ کہ "نقصان" کو "شین" قرار دیا۔ جیسا کہ ابوالطیب کا کہنا ہے: **ولم ار في عيوب الناس عيبا كنقص القادرين على التمام** آنحضرت ﷺ کا اپنے حسن صورت وحسن سیرت پر اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کا شکر ادا کرنا، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس حمد وشکر کی طرح ہے جس کو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

[النحل: ١٥]

"اور بلا شبہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم سے مالا مال کیا اور ان دونوں نے کہا کہ تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں اپنے مؤمن بندوں میں سے اکثر پر فضیلت عطا فرمائی۔"

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آئینہ دیکھنا مستحب ہے اور اپنے حسن صورت وحسن سیرت پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا بھی مستحب ہے کیونکہ یہ دونوں نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوتی ہیں لہٰذا ان پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ انتھیٰ

رہی یہ بات کہ ظاہری حسن وخوبصورتی ایک ایسی چیز ہے جس کو آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے لہٰذا آئینہ دیکھ کر اس پر شکر ادا کرنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن اس کے ساتھ حسن سیرت یا حسن خلق کا ذکر سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ وہ ایک پوشیدہ چیز ہے جس کا آئینہ میں دیکھا جانا ممکن ہی نہیں ہے؟

اس کے جواب میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ بے شک حسن سیرت کوئی نظر آنے والی چیز نہیں ہے لیکن انسان کا ظاہر حال اس کے باطن کی غمازی کرتا ہے اور کسی دوسرے کے بارے میں بات چاہے صحیح نہ ہو لیکن رسول خدا پر یہ بات ضرور

صادق آتی ہے کہ حسن صورت وحسن سیرت کا ایک ایسا جلی عنوان ہوتا ہے جس کو دیکھ کر باطن کے احوال کا ادراک کیا جا سکتا ہے لہٰذا اس مناسبت سے حضور ﷺ نے حسن سیرت کے ساتھ حسن صورت کو بھی ذکر فرمایا

اور اگر یہ سوال پیدا ہو کہ کیا آنحضرت ﷺ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی اتباع میں آئینہ دیکھ کر مذکورہ طرح سے حمد وثنا کریں یا اس طرح حمد وثنا کرنا صرف آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا اور دوسرے لوگ وہ دعا پڑھنے پر اکتفا کریں جو آگے آنے والی حدیث میں نقل ہوگی

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں حمد وثنا اور شکر کے جو الفاظ مذکور ہیں ان کو ہر مؤمن پڑھ سکتا ہے کیونکہ انسان اس اعتبار سے کہ وہ اچھی صورت کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اور وہ صاحب ایمان ہے بلاشک وشبہ دین واخلاق کے اوصاف سے مزین ہوتا ہے۔

عرضِ مرتب:

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حمد وثنا اور شکر کے مذکورہ الفاظ اپنی ذات کے تعلق سے فرمائے تھے اور ظاہر ہے کہ حسن صورت اور حسن سیرت کا وصف جو کمال ونہایت کے ساتھ حضور ﷺ کی ذات میں تھا وہ کسی دوسرے میں نہیں ہو سکتا اس لئے کسی دوسرے کے لئے ان الفاظ کو استعمال کرنا موزوں نہیں ہوگا چاہے امت کے بعض افراد کے اعتبار سے اس طرح کے الفاظ کے استعمال کو جائز نہ کہا جائے لیکن امت کے لئے بہتر یہی ہے کہ اسی دعا کو اختیار کیا جائے جو اگلی حدیث میں منقول ہے۔ (مظاہر حق)

تخریج: اس حدیث کو بزارؒ نے حضرت انسؓ سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے:

الحمد لله الذی سوی خلقی، واحسن صورتی، وزان منی ما شان من غیری

حضرت انسؓ سے مروی طبرانی اور ابن سنی کی روایت میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

الحمد لله الذی سوی خلقی فعدله، وصور صورة وجهی فأحسنها، وجعلنی من المسلمین

پاکیزگیٔ اخلاق کی دعا

۵۰۹۹: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ حَسَّنْتَ خَلْقِيْ فَاَحْسِنْ خُلُقِيْ۔

(رواه احمد)

أخرجه احمد فی المسند ٦/٦٨۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ! تو نے میری صورت جس طرح حسین بنائی ہے اسی طرح میری سیرت کو بھی حسین بنا دے۔ (احمد)

تشریح: یہ دعا یا تو آپ ﷺ مطلق (کسی بھی وقت) فرماتے تھے یا آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر فرماتے تھے جیسا کہ جزریؒ نے حصن حصین میں صراحت بھی کی ہے اور پہلی حدیث کے مطابق یہی زیادہ موزوں ہے!

آنحضرت ﷺ کی یہ دعا امت کی تعلیم وتلقین کے لئے تھی تاکہ امت کے لوگ اپنے حق میں اسی طرح دعا مانگا کریں
اس دعا کا تعلق خود آپ ﷺ کی ذات سے تھا اس صورت میں آپ ﷺ کی مراد گویا یہ طلب و درخواست تھی کہ خدایا! اپنے دین کو کامل اور اپنی نعمتوں کو پورا کر دے ارشاد باری تعالیٰ ہے: [الیوم اکملت لکم دینکم وأتممت علیکم نعمتی] [المائدۃ۔۳] اس مراد کا قرینہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خلق کو اچھا اور مہذب کرنے کا ذریعہ قرآن کریم تھا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا کہ آنحضرت ﷺ کا خلق قرآن تھا۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ کا اپنے اخلاق کا اچھا ہونے کی دعا کرنا درحقیقت قرآن کو نازل کرنے اور اس کے نزول کو پورا کرنے کی طلب و درخواست تھی۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ دعا مانگنا طلب مزید کیلئے تھا۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ سے مستفاد ہوتا ہے: ﴿وقل رب زدنی علمًا﴾ [طٰہٰ۔۱۱۴] بعض عارفین نے تصریح کی ہے، کہ ترقیات باطنیہ لامتناہی ہیں، حتی کہ ان کا سلسلہ جنت میں بھی چلے گا۔ (اور جنت میں ہونے والی باطنی ترقیاں بھی غیر متناہی ہوں گے،) چونکہ یہ ترقیاں، تجلیات الٰہیہ سے حاصل ہوں گی، اور تجلیاتِ الٰہیہ لامتناہی ہیں۔ اور شاید کہ اس آیت کریمہ: ﴿للذین أحسنوا الحسنٰی وزیادۃ﴾ [یونس۔۲۶] میں اسی افادہ کی طرف اشارہ ہو۔

تخریج: اس حدیث کو امام دارمی نے حضرت عائشہؓ سے، اور ابن حبان نے حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے۔ دونوں کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: **اللھم أنت حسنت خلقی فحسن خلقی**

اس حدیث کو امام بزارؒ نے حضرت عائشہؓ اور ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

اللھم کما حسنت خلقی فأحسن خلقی وحرم وجھی علی النار

بہتر آدمی لمبی عمر اور عمدہ اخلاق والا

۵۱۰۰: وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِخِیَارِکُمْ قَالُوْا بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ خِیَارُکُمْ اَطْوَلُکُمْ اَعْمَارًا وَاَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا۔ (رواہ احمد)

أخرجه احمد فی المسند ۲/۳٦۸۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں بہتر لوگوں کے متعلق آگاہ نہ کروں صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ضرور کریں فرمایا تم میں بہترین وہ ہیں جن کی عمر لمبی اور اخلاق اچھے ہوں۔

(احمد)

تشریح: (ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے اخلاق واطوار پاکیزہ اور اچھے ہوں گے اور ان کی عمر زیادہ ہوگی تو وہ نیکیاں اور عبادتیں بہت کریں گے جس کے نتیجے میں ان کو فضائل و کمالات بھی زیادہ حاصل ہوں گے اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی عمر کا دراز ہونا اس کے حق میں بہت مبارک ہے اور حقیقت میں دراز عمر شخص وہی ہے جو نیک کاموں میں مشغول رہے۔)

طبرانی نے حضرت علیؓ سے اور ابو نعیم نے "الحلیہ" میں عبداللہ بن بسرؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: طوبی لمن طال عمرہ

وحسن عمله امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث مبارکہ میں ایک اور ارشاد نبوی کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں یہ مذکور ہے، کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا گیا: ای الناس خیر؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: من طال عمره وحسن عمله تو گویا کہ "احسنكم اخلاقا" حسن عمله کی طرح ہے۔ کہ طول عمر اور حسن خلق کو یکجا ذکر فرمایا۔

کامل مؤمن

۵۱۰۱: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا۔

(رواه ابو داؤد والدارمی)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٥/٦٠ الحديث رقم ٤٦٨٢، والدارمی فی ٢/٤١٥ الحديث رقم ٢٧٩٢، واحمد فی المسند ٢/٢٥٠۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایمان کے لحاظ سے کامل مؤمن وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہے۔ (ابوداؤد، دارمی)

تخریج: اس حدیث کو امام احمد، ابن حبان اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان کی روایت میں اتنا اضافہ بھی ہے: وخياركم خياركم لنسائهم

تین سچائیاں

۵۱۰۲: وَعَنْهُ اَنَّ رَجُلًا شَتَمَ اَبَابَكْرٍ وَّالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ يَتَعَجَّبُ وَيَتَبَسَّمُ فَلَمَّا اَكْثَرَ رَدَّ عَلَيْهِ بَعْضَ قَوْلِهٖ فَغَضِبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَامَ فَلَحِقَهٗ اَبُوْبَكْرٍ وَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَشْتِمُنِيْ وَاَنْتَ جَالِسٌ فَلَمَّا رَدَدْتُّ عَلَيْهِ بَعْضَ قَوْلِهٖ غَضِبْتَ وَقُمْتَ قَالَ كَانَ مَعَكَ مَلَكٌ يَرُدُّ عَلَيْهِ فَلَمَّا رَدَدْتَّ عَلَيْهِ وَقَعَ الشَّيْطَانُ ثُمَّ قَالَ يَااَبَا بَكْرٍ ثَلٰثٌ كُلُّهُنَّ حَقٌّ مَامِنْ عَبْدٍ ظُلِمَ بِمَظْلِمَةٍ فَيُغْضِيْ عَنْهَا لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اِلَّا اَعَزَّاللّٰهُ بِهَا نَصْرَهٗ وَمَا فَتَحَ رَجُلٌ بَابَ عَطِيَّةٍ يُرِيْدُ بِهَا صِلَةً اِلَّازَادَ اللّٰهُ بِهَا كَثْرَةً وَّمَا فَتَحَ رَجُلٌ بَابَ مَسْئَلَةٍ يُرِيْدُ بِهَا كَثْرَةً اِلَّا زَادَ اللّٰهُ بِهَا قِلَّةً (رواه احمد)

أخرجه احمد فی المسند ٢/٤٣٦۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے جناب ابوبکرؓ کو گالی دی آپ ﷺ تشریف فرما تھے اس پر متعجب ہو کر تبسم فرما رہے تھے جب اس نے زیادہ گالیاں دیں تو حضرت ابوبکر نے ایک کا جواب دیا آپ ﷺ ناراض ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ابوبکر کہنے لگے یارسول اللہ ﷺ وہ مجھے گالی دیتا رہا اور آپ ﷺ تشریف فرما رہے جب میں نے اس کی ایک گالی کا جواب دیا تو آپ اٹھ گئے آپ ﷺ نے فرمایا تیرے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو اس کا جواب دے رہا تھا جب تو نے خود جواب دینا شروع کیا تو شیطان درمیان میں کود پڑا [illegible]

ہو رضائے الٰہی کی خاطر چشم پوشی کرے تو اللہ تعالیٰ اسے معزز و منصور فرمائے گا جس شخص نے سخاوت کا دروازہ کھولا اس کا مقصود صرف صلہ رحمی تھا تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے مال میں اضافہ فرمائے گا اور جس نے مال بڑھانے کی خاطر مانگنا شروع کیا اللہ تعالیٰ اس کے مال میں کمی کر دے گا۔ (احمد)

تشریح: ثلاث: کی تمیز محذوف ہے أي ثلاث خصال

مظلمة: بکسر اللام مشہور ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ فتحہ کے ساتھ بھی ہے، لیکن بعض نے اس کی تردید کی ہے۔ فراء نے ضمہ بھی نقل کیا ہے۔ المغرب میں لکھتے ہیں: **المظلمة الظلم واسم المأخوذ** اور صاحب قاموس لکھتے ہیں: **الظلم وضع الشیء فی غیر موضعه والمظلمة بکسر اللام ما یظلم الرجل**

فیغض: اغضاء سے مأخوذ ہے، غین اور ضاد معجمہ کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں عین مہملہ کے ساتھ ہے یعنی **اعفاء** سے مأخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں عفو و درگزر اور تسامح کرنا۔

قوله: الا عز الله بها: یہ باء برائے مقابلہ ہے، یا سبب کے معنی میں ہے۔ ای: **بمقابلة تلك المظلمة والاهانة او بسبب تلك الخصلة المعانة**

باب عطية يريد بها صدقة: ایک روایت میں **باب عطية بصدقة او صلة** کے الفاظ ہیں۔

قوله: يتعجب ويتبسم: حیرت کا تعلق یا تو اس شخص کی بدزبانی اور اس میں شرم و حجاب کی کمی سے تھا یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صبر و تحمل اور ان کے باوقار و بردبار رویہ سے تھا اور مسکرانے کا تعلق اس فرق سے تھا جو آپ ﷺ ان دونوں کے درمیان دیکھ رہے تھے علاوہ ازیں آپ ﷺ کی نظر ان دونوں کے حق میں مرتب ہونے والے نتیجہ پر بھی تھی کہ وہ شخص تو اپنی بدکلامی کے سبب عذاب کا مستوجب ہو رہا تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر ان کے صبر و تحمل اور بردباری و چشم پوشی کے سبب رحمت الٰہی نازل ہو رہی تھی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اس کی بعض باتوں کا جواب دیا گویا انہوں نے اس موقع پر (جواب دے کر) رخصت و اجازت پر عمل کیا جو ایک عام آدمی کے لئے موزوں ہے اور اس عزیمت کو ترک کیا جو خواص کے مرتبہ و شان کے عین مطابق ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: [وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ] [الشوریٰ:۳۹] ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ﴾ [النحل:۱۲۶] (برائی کا بدلہ اس برائی کے مطابق لیا جا سکتا ہے لیکن جو شخص درگزر کرے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ پر ہے) چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اگرچہ اس شخص کی باتوں کا بدلہ لے کر اور بعض باتوں پر صبر اختیار کر کے گویا دونوں پہلوؤں کی رعایت کی مگر نگاہ نبوت میں چونکہ ان کے لئے وہ مرتبہ کمال مطلوب تھا جو ان کی شان صدیقیت کے مطابق ہے اس لئے ان کا اس شخص کی بعض باتوں کا جواب دے کر جزوی بدلہ لینا بھی حضور ﷺ کو پسند نہیں آیا اور آپ ﷺ پر وہ کیفیت طاری ہو گئی جو ناراض ہو جانے والے شخص پر معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ مجلس سے اٹھ کر چلے گئے تاکہ ایک طرف تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے رویہ پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی ہو جائے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر عمل بھی ہو جائے: ﴿وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ﴾

[القصص:۵۵] ''جب وہ کوئی لغو بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں''۔

قوله: فلما رددت عليه وقع الشيطان: حضور ﷺ نے گویا یہ واضح فرمایا کہ جب تم خود جواب دینے لگے تو پھر شیطان کو دخل دینے کو موقع مل گیا اور وہ فرشتہ جو تمہاری طرف سے جواب دے رہا تھا آسمان پر چلا گیا اور تم یہ جانتے ہی ہو کہ جب کسی معاملہ میں شیطان کود پڑے تو کیا کچھ نہیں ہو جاتا' وہ بے حیائی اور برائی پر اکسانے کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہے۔ چنانچہ مجھے خوف ہوا کہ کہیں شیطان کا داؤ تم پر نہ چل جائے اور تم اپنے مخالف سے بدلہ لینے میں حد سے زیادہ بڑھ جاؤ اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ تم جو مظلوم تھے ظالم کی جگہ پر آ جاؤ جب کہ چاہئے کہ یہ تم اللہ کے مظلوم بندے بنو ظالم بندے نہ ہو۔

ایک روایت میں ہے: **كن عبد الله المظلوم، ولا تكن عبد الله الظالم**

اور ایک دوسری روایت میں آتا ہے: **كن خير ابني آدم،** ہابیل نے قابیل کے جواب میں جو کچھ کہا تھا اللہ جل شانہ نے یوں ذکر فرمایا ہے: ﴿**لئن بسطت الي يدك لتقتلني ما أنا بباسط يدى اليك لأقتلك**﴾ [المائدة۔۲۸]

تخریج: ابن ابی الدنیا نے ''ذم الغضب'' میں عبدالرحمٰن بن عوف سے یوں روایت کیا ہے: **ثلاث أقسم عليهن ما نقص مال قط من صدقة فتصدقوا' ولا عفا رجل عن مظلمة ظلمها الا زاده الله بها عزا' فاعفوا يزدكم الله عزا' ولا فتح رجل على نفسه باب مسألة يسأل الناس الافتح الله عليه باب فقر۔** اسی حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے ابو کبشہ انماری سے یوں نقل کیا ہے: **ثلاث أقسم عليهن مانقص مال عبد من صدقة ولا ظلم عبد مظلمة صبر عليها الازاده الله عزوجل عزا 'ولا فتح عبد باب مسألة الافتح الله عليه باب فقر' وأحد ثكم حديثا فاحفظوه' انما الدنيا لأربعة نفر عبد رزقه الله مالا وعلما فهو يتقى فيه ربه ويصل فيه رحمه ويعلم لله فيه حقا فهذا بأ فضل المنازل' وعبد رزقه الله علما ولم يرزقه مالا فهو صادق النية يقول :لوان لى مالا لعملت بعمل فلان فهو بنيته فأجرهما سواء' وعبد رزقه الله مالاولم يرزقه علما يخبط في ماله بغير علم لايتقى فيه ربه ولا يصل فيه رحمه ولا يعلم لله فيه حقا فهذا بأخبث المنازل 'وعبد لم يرزقه الله مالا ولا علما فهو يقول :لو أن مالا لعملت فيه بعمل فلان فهو بنيته فوزرهما سواء**

بھلائی والا خاندان

۵۱۰۳: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُرِيْدُ اللّٰهُ بِاَهْلِ بَيْتٍ رِفْقًا اِلَّا نَفَعَهُمْ وَلَا يُحْرِمُهُمْ اِيَّاهُ اِلَّا ضَرَّهُمْ۔ (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

أخرجه البيهقى فى شعب الايمان ٦/ ٣٣٧ الحديث رقم ٨٤١٨۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جس خاندان پر مہربانی کرتا ہے انہیں نفع دیتا ہے اور جن کو اس سے محروم کرتا ہے تو ان کے نقصان کا ارادہ کرتا ہے۔ (بیہقی شعب الایمان)

تشریح: لا يحرم : یاء کے فتحہ اور بعض کا کہنا ہے کہ ضمہ کے ساتھ ہے۔

بَابُ الْغَضَبِ وَالْكِبْرِ

غصہ وخود بینی (خودستائی) کا بیان

"غضب" کے معنی ہیں غصہ ہونا اور حقیقت میں غضب یا غصہ اس طبعی کیفیت وحالت کو کہتے ہیں جو طبیعت ومزاج کے خلاف پیش آنے والی بات پر نفس کو برانگیختہ کرتی ہے' انتقام لینے پر اکساتی ہے اور ناپسندیدہ چیز میں مغضوب علیہ کی طرف میلان کرتی ہے تاکہ اس سے انتقام لے سکے اور طبیعت کے خلاف پیش آنے والی صورت حال کو دور کر سکے

غصہ کی حالت میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور رگیں پھول جاتی ہیں اسی طرح خوشی کی حالت میں بھی روح باہر کی طرف میلان کرتی ہے تاکہ اس چیز کے سامنے آجائے جو خوشی کا باعث بنی ہے۔ چنانچہ غصہ یا خوشی کی زیادتی کے وقت ہلاکت کا خوف اسی لئے ہوتا ہے کہ اس موقع پر روح پوری طرح نکل آنا چاہتی ہے۔ اس کے برخلاف غم یا خوف کی حالت میں روح اندر کی طرف چلی جاتی ہے جس کی وجہ سے چہرہ پر زردی چھا جاتی ہے اور جسم کو کمزوری لاحق ہو جاتی ہے' اس حالت میں بھی ہلاکت کا خوف ہوتا ہے کیونکہ روح پوری طرح اندر کی طرف چلی جاتی ہے اور مطلق سرد ہو جاتی ہے! اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف غضب وغصہ کی نسبت کرنا جیسا کہ ایک موقع پر فرمایا گیا ہے: من لم یسأل اللّٰہ یغضب علیه (جو شخص اللہ کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتا تو اللہ اس پر غصہ ہوتا ہے) مجاز ہے اور اللہ تعالیٰ کے غصہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس بندے سے ناراض ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہے جو کوئی بادشاہ غصہ کے وقت اپنی رعایا کے ساتھ کرتا ہے یعنی سزا دیتا ہے اور عذاب نازل کرتا ہے۔

غضب کی ضد حلم ہے اور حلم دراصل نفس وطبیعت کے اس سکون واستقلال کا نام ہے جو محبوب ترین چیز کے قریب پہنچ جانے اور مقصود ومراد کے بالکل سامنے ہونے کے وقت بھی انسان کو بے قرار نہیں ہونے دیتا جیسا کہ وفد عبدالقیس کے سردار حضرت منذر رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ جب وہ اپنا وفد لے کر مدینہ پہنچے تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر اس اضطراب وبے قراری کا اظہار نہیں کیا جو ان کی قوم کے دوسرے لوگوں نے ظاہر کیا تھا اور اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ان کو حلم ووقار کی خوبیوں سے موصوف قرار دیا تھا۔

کیا غصہ مذموم ہے؟

واضح رہے کہ غضب غصہ کوئی ایسی خصلت نہیں ہے جس کو بذات خود برا کہا جائے بلکہ اس میں برائی اس وقت آتی ہے

جب اس کی وجہ سے راہِ حق چھوٹ جائے اور احکام شریعت کی پابندی ترک ہو جائے چنانچہ جو غضب وغصہ حق کی خاطر ہو اور حق کی راہ میں ہو اس کو محمود و مستحسن کہا جائے گا یہی وجہ ہے کہ راہ طریقت وسلوک میں ریاضت ومجاہدہ کا مقصد مطلق غضب وغصہ کو ختم کر دینا نہیں ہوتا بلکہ اس کو قابو میں رکھنا اور حق کے تابع کرنا ہوتا ہے اور ویسے بھی قدرت نے غضب کو ایک ایسی قوت بنایا ہے جو جسمانی نظام کو برقرار رکھنے کا ذریعہ اور بقاء حیات کا سبب ہے کیونکہ یہ قوت غضبیہ ایسی ہوتی ہے جو مضرات وموذیات سے بچاتی ہے چنانچہ نباتات و جمادات کو نیست و نابود کرنے پر ہر کوئی اسی لئے قادر ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان دونوں کو قوت غضبیہ سے محروم رکھا ہے اس کے برخلاف حکمت کاملہ خداوندی نے حیوانات میں نہ صرف یہ کہ قوت غضبیہ پیدا کی ہے بلکہ ان کے بعض جسمانی حصوں کو گویا ایسے آلات وہتھیار کے طور پر بنایا جن سے وہ نقصان وایذا پہنچانے والوں سے اپنا دفاع کر سکیں جیسے سینگ اور دانت وغیرہ اور انسان میں اگرچہ اس طرح کی چیزیں پیدا نہیں کی ہیں لیکن اس کو وہ عقل وتدبیر دکھادی ہے جس کے ذریعہ وہ ضرورت و حالت کے مطابق ایسے آلات وہتھیار بنا سکتا ہے جو اس کو نقصان و ایذاء پہنچانے والے سے محفوظ رکھ سکتے ہوں۔(مظاہر حق)

"کبر" کے اصل معنی تو بڑائی کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد وہ کبر ہے جو عجب یعنی خود بینی وخود ستائی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے چنانچہ اپنے آپ کو اس طور پر بڑا سمجھنا اور بڑا ظاہر کرنا کہ جس کے سبب لوگوں پر اپنی فوقیت برتری جتانا مقصود ہو حق کو قبول کرنے اور حق کی فرمانبرداری سے انکار ہوتا ہو اور تمرد وسرکشی ظاہر ہوتی ہو تکبر اور استکبار کہلائے گا!

واضح رہے کہ تکبر اس صورت میں مذموم ہے جب کہ وہ واقع کے خلاف ہو یعنی اگر کوئی شخص اپنی ذات میں ایسے اوصاف و فضائل اور کمالات کا دعویٰ کرے جن سے حقیقت میں وہ خالی ہو اور مصنوعی طور پر اپنے آپ کو ان فضائل وکمالات سے متصف ظاہر کرتا ہو تو ایسا کرنا مذموم ہوگا اور اگر اس شخص کی ذات میں واقعتاً ایسے فضائل وکمالات ہوں جن کی بناء پر وہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر وبلند اور بڑا سمجھتا اور ظاہر کرتا ہو تو یہ مذموم نہیں بلکہ محمود ہوگا۔

نیز یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ تکبر کے مقابلہ پر تواضع ہے جو کبر اور صغر کے درمیان توسط اور راہ اعتدال ہے چنانچہ کبر تو یہ ہے کہ کوئی شخص ان اوصاف وفضائل سے بھی زیادہ کا دعویٰ کرے جو وہ اپنے اندر رکھتا ہے اور صغر یہ ہے کہ اپنے اصل مقام سے بھی نیچے گر جائے اور وہ جس چیز کے دعویٰ کا حق رکھتا ہے اس کو بھی ترک کر دے ان دونوں کے درمیان تواضع ہے جو توسط اور اعتدال کا مقام ہے یعنی اپنے آپ کو نہ تو حد سے زیادہ بڑھایا جائے اور نہ حد سے نیچے گرایا جائے بلکہ بین بین رکھا جائے کیونکہ ہر چیز اور ہر حالت کی طرح اس معاملہ میں بھی اصل کمال توسط اور اعتدال ہی ہے۔ مشائخ اور صوفیاء قدس اللہ ارواحہم کا معمول یہ رہا ہے کہ جب وہ اپنے نفس میں تکبر کا غلبہ دیکھتے تو اس کو زائل کرنے میں اتنا مبالغہ کرتے تھے کہ تواضع کے بجائے صغر کا مقام اختیار کرنے کی کوشش کرتے تاکہ نفس آخر الامر تواضع کے مقام پر رک جائے۔

الفصل الاول:

ایک نصیحت غصہ مت کرو

۵۱۰۴: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَوْصِنِیْ قَالَ لَا تَغْضَبْ فَرَدَّدَ ذٰلِكَ مِرَارًا قَالَ لَا تَغْضَبْ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٥١٩ الحديث رقم ٦١١٦، والترمذي في السنن ٤/٣٢٦ الحديث رقم ٢٠٢٠ و مالك في الموطأ ٢/٩٠٥ الحديث رقم ١١ من باب الغضب واحمد في المسند ٢/١٧٥۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے نصیحت کا سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا غصہ مت کیا کرو اس نے دوبارہ سوال دھرایا تو آپ ﷺ نے پھر فرمایا غصہ مت کیا کرو۔ (بخاری)

عرضِ مرتب:

سائل کے جواب میں آپؐ نے ہر بار ایک ہی جواب ارشاد فرمایا۔ اس کی بابت صاحب ''مظاہر حق'' لکھتے ہیں: چونکہ اس شخص میں غصہ کا مادہ زیادہ تھا اس لئے اس نے جتنی مرتبہ بھی یہ درخواست کی کہ مجھ کو کوئی نصیحت فرما دیجئے' آپ ﷺ نے یہی جواب دیا کہ غصہ مت کرو چنانچہ آنحضرت ﷺ کا معمول یہی تھا کہ سوال کرنے والا جس حالت و کیفیت کا حامل ہوتا اس کو جواب اسی حالت و کیفیت کے مطابق ارشاد فرماتے اور ہر ایک کے مرض کے علاج اس کے احوال کی مناسبت سے تجویز فرماتے' اسی لئے آپ ﷺ نے اس شخص کے حق میں اجتناب کے حکم کو بار بار ظاہر کرنا ہی مناسب جانا۔ (انتھی)

بعض محققین کہتے ہیں کہ غضب و غصہ کی کیفیت دراصل شیطانی وسوسوں سے پیدا ہوتی ہے جس کے سبب انسان ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی' اعتدال کی راہ سے گزر جاتا ہے اور شیطان کے جال میں پھنس جاتا ہے چنانچہ اس حالت میں وہ نہ صرف اس طرح اول فول بکنے لگتا ہے اور ایسے افعال و حرکات کا ارتکاب کرتا ہے جو شرعی طور پر بھی اور اخلاقی طور پر بھی نہایت برے اور نازیبا ہوتے ہیں' بلکہ دل میں کینہ اور بغض بھی رکھتا ہے' اس کے علاوہ ایسی اور بہت سی چیزیں اس سے صادر ہوتی ہے جو بد خلقی و بدخوئی کی نشانیاں ہیں اور بسا اوقات تو غصہ کرنے والا اس درجہ مغلوب الغضب ہو جاتا ہے کہ اس سے کفر تک سرزد ہو جاتا ہے۔

غضب و غصہ چونکہ انسان کو دین و دنیا کے سخت ترین نقصان میں مبتلا کر دیتا ہے اس لئے آپ ﷺ نے مذکورہ شخص کے بار بار عرض گزار ہونے کے باوجود بس ایک ہی نصیحت کی کہ غصب مت کرو! اور ہر مرتبہ اسی کی تاکید فرماتے رہے' گویا آپ ﷺ نے اس کو یہ تعلیم ارشاد فرمائی کہ غصب کا تعلق بد خلقی سے ہے اور بد خلقی محض ایک برائی ہی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے نہ معلوم کتنی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور کتنے نقصانات کرنا پڑتے ہیں۔ لہٰذا غصہ سے اجتناب و پرہیز کر کے خوش خلقی اختیار کرو جو دین و دنیا کی بھلائیوں اور دارین کی سعادتوں کی ضامن ہے۔

شریعت نے غصہ کا علاج بھی تجویز کیا ہے جو علم و عمل کا مرکب ہے' چنانچہ اگر کوئی ایسی صورت حال پیش آ جائے جو غصہ کا

سبب ہوتو علاج یہ ہے کہ دل میں یہ تصور کرے اوراس پر یقین رکھے کہ کوئی کام اللہ تعالیٰ کے ارادہ وتقدیر کے بغیر نہیں ہوتا' جو کچھ بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے' نفع ونقصان سب اسی کے اختیار میں ہے' انسان تو ظاہر میں ایک آلہ ہے' لہٰذا جس شخص کی طرف سے کوئی نقصان یا تکلیف پہنچے اس پر غصہ ہونا ایسا ہے جیسے کوئی شخص چھری یا چاقو پر غصہ ہو کہ اس نے کیوں کاٹا علاوہ ازیں اپنے نفس کو سمجھائے کہ دیکھ اللہ تعالیٰ کس قدر قادر ہے اوراس کا غضب کتنا شدید ہے مگر اس کے باوجود وہ درگزر کرتا ہے بندے اس کی کس طرح مخالفت کرتے ہیں اوراس کے احکام سے کس طرح سرکشی اختیار کرتے ہیں لیکن وہ ان پر غضب نازل نہیں کرتا' پھر تو اتنا بڑا کہاں کا آیا کہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا

دوسرا علاج ہے وہ یہ ہے کہ فوراً وضو کر ڈالے اوراعوذ پڑھنے لگے تا کہ پانی کی ٹھنڈک' غصہ کی حرارت کو فرو کردے اورنفس دوسری طرف مشغول ہوجائے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ کلام وبیان بڑا مستحسن ہے، مگر تحقیق یہ ہے کہ غصہ کا مدار شہوت نفس پر ہے۔ چونکہ انسان کو غضب مذموم اسی وقت لاحق ہوتا ہے جب وہ قوت شہوت کا شکار ہوتا ہے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جس میں شہوت زیادہ ہوگی اس کا غصہ بھی تیز ہوتا ہے جیسا کہ ملوک وامراء، لہٰذا اس سے بچنا چاہئے ،اس کی تائید اگلی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے اورامام احمد وحاکم نے حارثہ بن قدامہ سے نقل کیا ہے اور ابن ابی الدنیا نے "ذم الغضب" میں (کسی راوی کا نام ذکر کئے بغیر) عن رجل کہتے ہوئے یوں بیان کی ہے: "**لاتغضب فان الغضب مفسدۃ**۔" ابن ابی الدنیا کی ایک روایت میں اورطبرانی میں ابو الدرداء سے یوں منقول ہے: **لا تغضب ولك الجنۃ**۔

مضبوط غصہ پر قابو پانے والا ہے

۵۱۰۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِیْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۱۸/۱۰ الحدیث رقم ۶۱۱۴ و مسلم فی ۲۰۱۴/۴ الحدیث رقم (۱۰۷-۲۶۰۹) و ابوداوٗد فی السنن ۱۳۸/۵ الحدیث رقم ۴۷۷۹ و مالك فی الموطأ ۹۰۶/۲ الحدیث رقم ۱۲ من کتاب البر والصلة، واحمد فی المسند ۲۳۶/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مضبوط وہ شخص نہیں جو کشتی میں پچھاڑ دے بلکہ مضبوط وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت اپنے اوپر قابو رکھتا ہو۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: "صرعة" بروزن همزه' صرع سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں اپنے مدمقابل کو پچھاڑنا۔ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: **الصرعة بضم الصاد وفتح الراء، المبالغ فی الصرع الذی لا یغلب**۔

اصل میں اگر کوئی چیز انسان کی سب سے بڑی دشمن اوراس کے مقابلہ میں سب سے زیادہ طاقتور ہے تو وہ خود اس کا نفس

ہے! اگر کوئی شخص بڑے بڑے پہلوانوں کو پچھاڑتا رہا اور اپنے طاقتور ترین دشمن کو بھی زیر کرتا رہا' مگر خود اپنے نفس پر غالب نہیں آسکا تو یہ کوئی کمال نہیں ہے' اصل کمال تو یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو زیر کرے جو اس کا اصل دشمن ہے۔ اسی لئے فرمایا: اعدی عدوك نفسك التی جنبیك۔

''تمہارے دشمنوں میں سب سے بڑا دشمن تمہارا نفس ہے جو تمہارے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے''۔

بدن کی قوت ظاہری اور جسمانی ہے جو زوال پذیر اور فنا ہو جانے والی ہے اس کے برخلاف جو قوت نفس کو زیر کرتی ہے وہ دینی اور روحانی ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ لہٰذا نفس کو مارنا' وصف اور کمال کی بات ہے جبکہ آدمی کو پچھاڑنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا ۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔

اہل جنت او اہل نار

۵۱۰۶: وَعَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ الْجَنَّةِ كُلُّ ضَعِيْفٍ مُتَضَعِّفٍ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ النَّارِ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ (متفق عليه وفي رواية لمسلم) كُلُّ جَوَّاظٍ زَنِيْمٍ مُتَكَبِّرٍ ۔

أخرجه البخاري في صحيحه ٨/٦٦٣ الحديث رقم ٤٩١٨ و مسلم في ٤/٢١٩٠ الحديث رقم (٤٦/٢٨٥٣)، والرواية الثانية في (٢٧-٢٨٥٣)، والترمذي في السنن ٤/٦١٨ الحديث رقم ٢٦٠٥ و ابن ماجه في ٢/١٣٧٨ الحديث رقم ٤١١٦، واحمد في المسند ٤/٣٠٦۔

ترجمہ: حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تمہیں اہل جنت کے متعلق نہ بتاؤں؟ ہر وہ شخص جو کمزور رہو اور اسے کمزور قرار دیا جاتا ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم اٹھالے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں کیا میں تمہیں اہل نار کے متعلق نہ بتاؤں جو ناحق لڑائی کرنے والا اور متکبر ہو۔ (بخاری، مسلم) اور مسلم کی روایت میں درشت خو، متکبر کے الفاظ ہیں۔

تشریح: کل: ''ھو'' مبتدا محذوف کی خبر ہے، چنانچہ مرفوع ہے۔ ایک نسخہ میں مجرور ہے۔ وجہ جر بدلیت ہے۔ **متضعف:** باب تفعّل سے صیغہ فاعل و مفعول دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ ''ضعیف متضعف'' از باب تاکید ہے، جیسا کہ جنود مجندة، قناطیر مقنطرة اور ظل ظليل ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أشداء على الكفار رحماء بينهم﴾ [الفتح:۲۹] ﴿أذلة على المؤمنين أعزة على الكافرين﴾ [المائدۃ:۵۴] چنانچہ اس میں اشارہ ہے کہ جو شخص مؤمنین کے ساتھ بکثرت تواضع اختیار کرے گا، وہ مقربین کے اعلیٰ مراتب میں ہوگا؛ اور اسی طرح جو شخص بکثرت تکبر و تجبر کا اظہار کرے گا، وہ اسفل السافلین میں ہوگا۔

حدیث میں ''ضعیف'' سے مراد وہ شخص ہے ~~جو متکبر~~ متکبر ہو اور نہ لوگوں پر جبر و زیادتی کرنے والا ہو۔

امام نووی ؒ فرماتے ہیں: لفظ "متضعف" کو عین کے زیر اور زبر دونوں طرح ضبط کیا ہے اور مشہور عین پر زبر ہی ہے اور عین کو زیر کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں اس لفظ کے معنی متواضع، کمتر اور گمنام کے ہوں گے۔

اور مراد یہ ہے کہ جنت میں جن لوگوں کی اکثریت ہوگی وہ یہی لوگ ہوں گے، اسی طرح دوسری قسم کے لوگ (یعنی جن کو دوزخی قرار دیا گیا ہے) سے بھی یہی مراد ہے کہ دوزخیوں کی اکثریت ان ہی لوگوں پر مشتمل ہوگی۔

علماء نے **لأبره** کے کئی معنی بیان کئے ہیں:

① اگر وہ شخص اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم پر اعتماد کر کے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کو سچا کرتا ہے اور اس کے اعتماد کو پورا کرتا ہے یعنی اس کی قسم ٹوٹتی نہیں ہے بلکہ پوری ہو جاتی ہے۔

ترجمہ میں اس معنی کو ملحوظ رکھا گیا ہے!

② اگر وہ شخص اپنے پروردگار سے کسی چیز کا طلب گار ہوتا ہے اور اس کو قسم دے کر اپنی مراد پوری ہونے کی دعا کرتا ہے تو پروردگار اس کی قسم کی لاج رکھتا ہے اور اس کی مراد پوری کرتا ہے

③ اگر وہ شخص کسی کام کے بارے میں قسم کھا کر یہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کام کو کرے گا یا اس کام کو نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو سچا کرتا ہے یعنی اس طرح کرتا ہے جو اس کی قسم کے مطابق ہوتا ہے۔

"زنیم" کے معنی کمینہ کے ہیں اور اس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو اپنے آپ کو نسبی اعتبار سے کسی ایسی قوم (یا ایسے طبقہ) کی طرف منسوب کرے جس سے حقیقت میں وہ کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ (ذکرہ الطیبی) (اسی لئے "زنیم" کا ترجمہ "حرام زادہ" کیا جاتا ہے۔) چنانچہ "عتل" اور "زنیم" کے الفاظ قرآن کریم میں بھی آئے ہیں اور مذکورہ بالا معنی ہی میں ان الفاظ کا مصداق ولید بن مغیرہ اور اس کے مشابہ لوگوں کو قرار دیا گیا ہے (جو کفار مکہ میں سے تھا اسلام و پیغمبر اسلام کا سخت ترین دشمن تھا۔) مناسب یہ ہے کہ حدیث میں اس لفظ کی تفسیر اعم معنی کے ساتھ کی جائے۔ اس کے اعم معنی ہیں وہ لئیم جو اپنی صفت لوم میں یا اپنے شر کی وجہ سے معروف ہو۔ (ملا علی قاری) اور یہ بھی ممکن ہے، کہ زنیم اس وصف سے کنایہ ہو، چونکہ غالب احوال میں یہ اس کو لازم ہے۔ امام احمد وغیرہ نے ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے: **ولد الزنا شر الثلاثة** اور ایک روایت میں ہے: **اذا عمل بعمل أبويه** اور یہ جو مروی ہے: "**ولد الزنا لا يدخل الجنة**" تو اس روایت کی بالکل کوئی اصل نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

عتل: عین اور تاء دونوں مضموم ہیں، اور لام مشدد ہے۔ اس کے معنی ہیں: **جاف شديد الخصومة بالباطل**، اور بعض کا کہنا ہے، **الجافي الفظ الغليظ**

جواظ: واؤ کی تشدید کے ساتھ۔ اس کے متعدد معانی بیان کئے گئے ہیں:

① **جموع منوع**: ② **مختال** ③ **قيل: السمين من التنعيم**

④ **قيل: الفاجر** (جیم کے ساتھ) ⑤ **قيل: الفاخر** (خاء کے ساتھ)

"**متكبر**" کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں: ① **متكبر عن الحق** ② **متكبر على أهله**

تخریج: اس حدیث کو ابن ماجہ نے حضرت معاذؓ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

ألا أخبر كم عن ملوك الجنة؟ رجل ضعيف مستضعف ذو طمرين لا يؤبه له، لو أقسم على الله لأبره

اسی حدیث کوامام طبرانی نے ابوالدرداءؓ سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

ألا أخبر كم بأهل النار؟ كل جعظرى جواظ مستكبر جماع منوع، ألا أخبر كم بأهل الجنة؟ كل مسكين لو أقسم على الله لأبره

رائی کے برابر ایمان والا دوزخ میں نہ جائے گا

۵۱۰۷: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَدْخُلُ النَّارَ اَحَدٌ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ اِيْمَانٍ وَلَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اَحَدٌ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ۔

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٩٣ الحديث رقم (١٤٨-٩١) و ابوداؤد في السنن ٤/٣٥١ الحديث رقم ٤٠٩١، والترمذي في ٤/٣١٧ الحديث رقم ١٩٩٨ و ابن ماجه في ٢/١٣٩٧ الحديث رقم ٤١٧٣، واحمد في المسند ١/٤١٢۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ وہ شخص دوزخ میں داخل نہیں ہو سکتا جس کے دل کے اندر رتی رائی کے برابر ایمان ہو اور جس شخص کے دل میں رائی کے برابر تکبر ہے وہ جنت میں نہ جائیگا۔ (مسلم)

تشریح: مثقال حبة: سے مراد مقدار وزن حبہ ہے۔

من خردل: بعض کا کہنا ہے کہ ''خردل'' سے مراد ''حبه سوداء'' ہے۔ اور یہ ''قلت'' کی تمثیل بیان کرنے کیلئے آتا ہے۔ جیسا کہ'' مثقال ذرة '' کہ یہ بھی بیان قلت کے لئے آتا ہے۔ ''ایمان'' سے مراد اصل ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان کے ثمرات مراد ہیں جن کو فضائل واخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے خواہ ان کا تعلق ظاہر سے ہو یا باطن سے اور جو نور ایمان اور ظہور ایقان سے صادر ہوتے ہیں۔

جہاں تک اصلی ایمان کا تعلق ہے وہ چونکہ تصدیق قلبی کا نام ہے اس لئے اس میں نہ تو زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی' اس اعتبار سے اس کو اجزاء میں منقسم بھی نہیں کیا جا سکتا' البتہ اس کے شعبے اور شاخیں بہت ہیں جو اصل ایمان کی حقیقت و ماہیت سے خارج ہیں جیسے نماز روزہ اور زکوۃ اور اسی طرح اسلام کے دوسرے تمام ظاہری احکام یا جیسے تواضع اور ترحم اور اسی طرح وہ تمام چیزیں جو باطنی اوصاف وخصائل کا درجہ رکھتی ہیں' چنانچہ اس حدیث میں فرمایا گیا ہے: الايمان بضع وسبعون شعبة (ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں) ظاہر ہے کہ شاخوں اور اس کی اصل کے درمیان اتنا گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کا درجہ رکھتی ہیں لیکن اس کے باوجود حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے کوئی بھی شاخ اپنی اصل کا مترادف نہیں ہو تی۔ اسی طرح اصل ایمان ایک الگ چیز ہے اور اسلام کے تمام ظاہری احکام و باطنی اخلاق و خصائل جداگانہ حیثیت رکھتے

ہیں جن کو اصل ایمان کی حقیقت و ماہیت میں شامل نہیں کیا جا سکتا' چنانچہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد: الحیاء شعبة من الایمان (حیاء ایمان کی ایک شاخ ہے) مذکورہ بالا قول کی دلیل ہے کیونکہ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حیاء ایمان کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔ اور اس پر حدیث کا اگلا جملہ (ولا یدخل الجنة أحد فی قلبه مثقال حبة من خردل من کبر) بھی دلالت کر رہا ہے۔

ولا یدخل الجنة أحد فی قلبه مثقال حبة من خردل من کبر: مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ اس کے نامہ اعمال میں تکبر کا گناہ موجود ہے ہاں جب وہ تکبر اور دوسری بری خصلتوں کی آلائش سے پاک وصاف ہو جائے گا تو اس وقت جنت میں داخل کیا جائے گا۔ اور یہ پاکی وصفائی اس طرح حاصل ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس کو عذاب میں مبتلا کرے گا اور وہ عذاب اس آلائش کو دھو دے گا یا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کو معاف کر دے گا اور یہ معافی اس آلائش کو زائل کر دے گی۔

خطابیؒ نے لکھا ہے کہ حدیث کے اس جزء کی دو تاویلیں ہیں' ایک تو یہ کہ کبر سے کفر وشرک مراد ہے۔ (اور ظاہر ہے کہ کفر وشرک پر جنت کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ بند رہیں گے) دوسری تاویل یہ ہے کہ (''کبر'' سے مراد اس کے اپنے معنی ہی ہیں یعنی اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے برتر وبلند سمجھنا اور غرور وگھمنڈ میں مبتلا ہونا البتہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ) متکبر شخص اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ حق تعالیٰ کی رحمت اس پر متوجہ نہ ہو چنانچہ جب حق تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرنا چاہے گا تو اس کے دل میں سے کبر کو نکال باہر کرے گا اور پھر اس کی کدورتوں سے پاک وصاف کر کے جنت میں داخل کر دے گا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: پہلی صورت از باب ''مقابلہ معنویہ'' ہے۔ اس میں ''ایمان'' کے ذریعہ اشارہ ہے کہ ''کبر'' کافر کی صفات میں سے ہے، لہٰذا اس سے اجتناب واجب ہے، اور ''کبر'' میں تلمیح ہے، کہ تواضع مؤمنین کی صفات میں سے ہے، لہٰذا اس میں رغبت کرنا چاہئے۔ آگے لکھتے ہیں: وهو الوجه لأن القصد الأولی فی سیاق الکلام وایراده الی معنی الوصفین الترغیب فی أحدهما والتنفیر عن الآخر، لا الی حکم الموصوفین وان لزمه تبعا وهذا غایة تحقیق ونهایة تدقیق۔ امام طیبی کا یہ کلام پر مبنی ہے۔

تکبر حق کو جھٹلانا اور لوگوں کو حقیر قرار دینا

۵۱۰۸: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ فَقَالَ رَجُلٌ اِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ اَنْ يَكُوْنَ ثَوْبُهٗ حَسَنًا وَنَعْلُهٗ حَسَنًا قَالَ اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۹۳ الحدیث رقم (۱٤۷-۹۱) و ابوداوٗد فی السنن ٤/۳۵۱ الحدیث رقم ٤۰۹۱۔ والترمذی فی ٤/۳۱۷ الحدیث رقم ۱۹۹۹، واحمد فی المسند ۱/۳۹۹۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں ایک ذرے کی مقدار تکبر ہے وہ جنت میں نہ جائے گا ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آدمی کو یہ بات پسند ہوتی ہے کہ اس کا کپڑا بھی خوبصورت ہو اور اس کا جوتا بھی خوبصورت ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جمیل ہیں اور جمال کو پسند کرتے ہیں یعنی ستھرائی اس کو پسند ہے تکبر حق کو جھٹلانا اور لوگوں کو حقیر و ذلیل سمجھنا ہے۔ (مسلم)

تشریح: ان الرجل: جنس مراد ہے۔

نعله حسنا: "نعل" مؤنثات سماعیہ میں سے ہے۔ جیسا کہ ابن حاجب نے اپنے رسالہ میں ذکر کیا ہے۔ المشارق میں لکھتے ہیں: و نعله حسنة، پس صیغہ مذکر لانے میں معنی کا اعتبار ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تقدیری عبارت یوں ہو: نعله ذات حسن اور یہ بھی ممکن ہے کہ لفظ "حسناء" بروزن "فعلاء" سے لفظ "حسن" بروزن "فعل" کی طرف عدول برائے مشاکلت ہو۔ نیز یہ لفظ اس بات کی صلاحیت بھی رکھتا ہے، کہ اس کو اس طرح پڑھا جائے۔

حدیث میں آتا ہے: ان اللّٰه يحب ان يرى اثر نعمته على عبده

قوله: الكبر بطر الحق: بطر: بائے موحدہ کے فتحہ اور طاء کے ساتھ۔ اس کے متعدد معانی بیان کیے گئے ہیں:

■ الكبر المذموم بطلان جمال الحق

"ذرہ" سے یا تو چیونٹی مراد ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس جیسی سو چیونٹیاں مل کر ایک جو کے وزن کے برابر ہوتی ہیں یا وہ ریزہ و غبار مراد ہے جو ہوا میں باریک باریک نظر آتا ہے اور روشنی کے وقت چمکتا ہے۔

قوله: فقال رجل: کے بارے میں مختلف اقوال ہیں کہ "ایک شخص" سے کون صحابیؓ مراد ہیں۔ چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس وقت جن صحابیؓ نے مذکورہ بات عرض کی تھی وہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ تھے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما تھے۔ اور بعض حضرات نے ربیعہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا ہے۔

سوال کا سبب:

امام طیبیؒ نے ذکر کیا ہے کہ وہ یہ دیکھا کرتے تھے کہ جو لوگ غرور و تکبر کرتے ہیں اور اپنے علاوہ ہر ایک کو ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں ان کی شان یہی ہوتی ہے۔ (ان کے جسم پر اعلیٰ اور نفیس لباس ہوتا ہے ان کے پیروں میں نہایت اعلیٰ جوتیاں ہوتی ہیں اور ان کے کپڑے وغیرہ اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں) چنانچہ جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ ارشاد سنا تو ان کو گمان ہوا کہ کہیں یہ چیزیں تو تکبر کی نشانیاں نہیں ہیں اور اعلیٰ و نفیس لباس وغیرہ ہی سے تو تکبر پیدا نہیں ہوتا' لہٰذا انہوں نے پوچھا کہ اگر کوئی شخص محض اپنی ذاتی خواہش و پسند اور استطاعت کی بنا پر اچھے اچھے کپڑے پہنے اور عمدہ جوتے وغیرہ استعمال کرے اور اس کے خیال میں بھی یہ بات نہ ہو کہ وہ اپنے کپڑوں وغیرہ کے ذریعہ دوسروں پر اپنی امارت و بڑائی کا رعب ڈالے گا۔ لوگوں کو ذلیل و حقیر سمجھے گا اور اتراہٹ و گھمنڈ کرے گا اور اس شخص کی اس نیت کی علامت یہ ہو کہ وہ جس طرح لوگوں کے سامنے اچھے کپڑے وغیرہ استعمال کرنا پسند کرتا ہو اسی طرح تنہائی میں بھی ان چیزوں کو پسند کرتا ہو (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مذکورہ جواب کے ذریعہ واضح فرما دیا کہ) عمدہ زیب تن کرنا اور اچھے پہننا اس کی تہذیب و شائستگی اور اس کی خوش ذوقی کی علامت ہے اس سے شریعت نے منع

نہیں کیا ہے)**قولہ:الكبر بطر الحق وغمط الحق الناس**: آپ ﷺ نے کبر کی حقیقت بیان فرمائی کہ جس کبر کو مذموم قرار دیا گیا ہے وہ دراصل اس کیفیت وحالت کا نام ہے جو انسان کو حق کے راستہ سے ہٹا دے یعنی توحید وعبادت خداوندی سے بے پرواہ بنا دے' حق وصداقت سے سرکشی کرنے پر مائل کرے' حقیقت تک پہنچنے سے روکے' اور سچائی کو قبول کرنے سے باز رکھے' اور مخلوق خدا کو ذلیل وحقیر سمجھنے پر مجبور کرے! بعض حضرات نے ''بطر الحق'' کے معنی ''جمال حق کو باطل کرنا'' لکھے ہیں۔

قولہ:ان الله تعالىٰ جميل:اس کی کئی تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔

اول: ''اللہ تعالیٰ جمیل ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات وصفات میں اور اپنے افعال میں جمیل ہے' اور تمام ظاہری وباطنی حسن وجمال اسی کے جمال کا عکس ہیں۔ جمال' جلال' کمال بس اسی کی ذات پاک کا خاصہ ہے۔

ثانی: بعض حضرات نے ''جمیل'' کے معنی ''آراستہ کرنے والے اور جمال بخشنے والے'' بیان کئے ہیں۔

ثالث: بعضوں نے یہ کہا ہے کہ ''جمیل'' دراصل ''جلیل'' کے معنی میں ہے۔ اس صورت میں ''اللہ جمیل ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام نور و بہجت اور حسن وجمال کا مالک ہے۔

اور نیز بعض حضرات نے یہ معنی بھی بیان کئے ہیں کہ وہ اپنے بندوں کا اچھا کارساز ہے۔

تخریج:اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے ابن مسعودؓ سے، امام طبرانی نے ابو امامہؓ سے، امام حاکم نے ابن عمرؓ سے، اور ابن عساکر نے حضرت جابرؓ اور ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ امام بیہقی نے اس حدیث کو ابو سعیدؓ سے اس اضافہ کے ساتھ نقل کیا ہے:

ويحب ان يرى أثر نعمته على عبده ويبغض البؤس والتباؤس۔

اور ابن عدی نے اس زیادتی کے ساتھ ذکر کیا ہے: **سخي يحب السخاء، نظيف يحب النظافة ۔**

نظر رحمت کے تین محروم

۵۱۰۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَفِیْ رِوَايَةٍ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ شَيْخٌ زَانٍ وَمَلِكٌ كَذَّابٌ وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ۔

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم في ١٠٢/١ الحديث رقم (١٧٢-١٠٧) و ابوداؤد في السنن ٧٤٩/٣ الحديث رقم ٣٤٧٥ والترمذي في ١٢٨/٤ الحديث رقم ١٥٩٥، والنسائي في ٢٤٥/٧ الحديث رقم ٤٤٥٨ و ابن ماجه في ٧٤٤/٢ الحديث رقم ٢٢٠٧، واحمد في المسند ٤٨٠/٢۔

ترجمہ:حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تین آدمیوں سے اللہ قیامت کے دن نہ کلام فرمائیں گے اور نہ ان کو پاک فرمائیں گے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ نہ ان کی طرف نگاہ رحمت ڈالیں گے اور وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے ان میں ایک زنا کرنے والا بوڑھا' جھوٹ بولنے والا بادشاہ اور متکبر فقیر۔ (مسلم)

تشریح: **قولہ:وفي رواية ولا ينظر اليهم......** :اس میں دو احتمال ہیں۔ پہلا احتمال تو یہ ہے کہ حدیث کے یہ

الفاظ (ولاینظر الیھم ...... ماقبل سے) بطور بدل کے مذکور ہوں۔ دوسرا احتمال یہ ہے، کہ (یہ الفاظ) بطور زیادت کے منقول ہوں، اور ظاہر بھی یہی ہے۔

''قیامت کے دن'' سے میدانِ حشر کا وقت مراد ہے جب اللہ کے فضل وعدل' غضب وناراضگی اور رضا کا ظہور ہوگا اور جنتیوں ودوزخیوں کے بارے میں فیصلے صادر کئے جائیں گے۔

قوله: وَلَا يُزَكِّيهِمْ: اس کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں: اول جب اللہ تعالیٰ میدانِ حشر میں اپنی تمام مخلوق کے سامنے اپنے مؤمن اور نیکوکار بندوں کی تعریف وستائش کرے گا تو اس وقت ان تین طرح کے آدمیوں کو اس تعریف وستائش سے خارج کر دیا جائے گا دوم: اللہ تعالیٰ ان تینوں طرح کے آدمیوں کو اپنے عفو ودرگزر کے ذریعہ ان کے گناہوں کی نجاست سے پاک و صاف نہیں کرے گا۔ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ کے بارے، میں دو احتمال ہیں: ایک: یہ جملہ دوسری روایت کا تتمہ ہے۔

دوم اس کا تعلق اصل حدیث سے ہے۔ یہ دوسرا احتمال زیادہ قوی اور قابل اعتماد ہے۔

حاصل یہ کہ مذکورہ باتیں دراصل اللہ تعالیٰ کے غضب وکبر اور اس کی ناراضگی سے کنایہ ہیں' چنانچہ جو کوئی کسی شخص سے ناراض وخفا ہوتا ہے تو وہ نہ اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے نہ اس سے کلام کرتا ہے اور نہ اس کی تعریف وستائش کرتا ہے بلکہ اس کو سزا وتنگی میں مبتلا کرتا ہے۔

حدیث میں جن تین برائیوں کے مرتکبین کے بارے میں وعید بیان فرمائی گئی ہے' وہ ہر حال میں مذموم اور مستوجب عذاب ہیں' خواہ ان برائیوں کا مرتکب کسی درجہ کا' کسی حیثیت کا اور کسی عمر کا آدمی ہو' لیکن یہاں ان برائیوں کے تعلق سے جن تین لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے' ان کے اعتبار سے ان برائیوں کی سنگینی کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

قوله: شیخ زان: زنا ایک بہت برا فعل ہے اور جب یہ فعل جوان کے حق میں بھی بہت بڑا گناہ ہے جو طبعی طور پر معذور بھی ہوتا ہے تو ایک بڈھے کے حق میں یہ فعل کہیں زیادہ برا ہوگا کیونکہ نہ تو طبعی طور پر اس کی احتیاج رکھتا ہے اور نہ اس کی طبیعت پر جنسی خواہش اور قوت مردمی کا وہ غلبہ ہوتا ہے جو بسا اوقات عقل وشعور سے بیگانہ اور خوفِ خداوندی سے غافل کر دیتا ہے۔ لہٰذا جو بڈھا زنا کا مرتکب ہوتا ہے وہ گویا اپنی نہایت بے حیائی اور خبث طبیعت پر دلالت کرتا ہے'

قوله: ملك كذاب: جھوٹ بولنا ہر شخص کے حق میں برا ہے لیکن بادشاہ کے حق میں بہت ہی برا ہے کیونکہ اس پر ملک کے انتظام' رعایا کے مصالح ومفاد کی رعایت اور مخلوق خدا کے معاملات کی نگہداشت کی ذمہ داری ہوتی ہے اس کا ایک ادنیٰ سا حکم پورے ملک کے نظم ونسق پر اثر انداز ہوتا ہے' اگر وہ جھوٹ کا مرتکب ہو تو اس کی اس برائی کی وجہ سے پورا ملک اور ملک کے تمام لوگ مختلف قسم کی برائیوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں' علاوہ ازیں جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں وہ عام طور پر اس برائی کا ارتکاب اپنے کسی فائدہ کے حصول یا کسی نقصان کے دفعیہ کے لئے کرتے ہیں' جب کہ ایک بادشاہ وحاکم یہ مقصد بغیر جھوٹ بولے بھی حاصل کرنے پر قادر ہوتا ہے لہٰذا اس کا جھوٹ بولنا نہ صرف بالکل بے فائدہ بلکہ نہایت مذموم ہوگا۔

قوله: عائل مستکبر: کہ جو چیزیں عام طور پر انسان کو غرور وتکبر میں مبتلا کر دیتی ہیں جیسے مال ودولت اور جاہ واقتدار وغیرہ اگر کسی شخص میں پائی جائیں اور وہ ان چیزوں کی وجہ سے تکبر کرے تو اگرچہ اس شخص کو بھی برا کہیں گے مگر اس کا تکبر کرنا

ایک طرح سے سمجھ میں آنے والی بات ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر کوئی فقیر ومفلس تکبر کرے کہ جو نہ تو مالی و دولت رکھتا ہے اور نہ جاہ واقتدار وغیرہ کا مالک ہے تو یہ اس کا یہ فعل نہایت ہی برا ہوگا اور اس کے بارے میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جائے گا کہ وہ خبث باطن میں مبتلا ہے۔

بعض حضرات نے عائل مستکبر میں لفظ عائل سے (مفلس کے بجائے) عیال دار مراد لیا ہے (یعنی جو بال بچے دار ہو اور اپنی خستہ حالی کی وجہ سے اپنے متعلقین کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے پر قادر نہ ہو لیکن اس کے باوجود) ازراہ تکبر صدقہ و زکوٰۃ کا مال قبول کرنے پر تیار نہ ہو لوگوں کی تواضع و امداد کو ٹھکراتے ہوں اور اس طرح وہ اپنے اہل وعیال کی ضرورت کو پورا کرنے سے بے پرواہ ہو کر گویا ان کو تکلیف وہلاکت میں مبتلا کرتے ہوں تو ایسے لوگ حدیث میں مذکورہ وعید کا مورد ہیں

صاحب ''مظاہر حق'' یہاں لکھتے ہیں: واضح رہے کہ خدا کی ذات پر توکل و اعتماد اور غیرت وخودداری کے تحت اپنی حالت کو چھپانا اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے شرم وحیاء کرنا تو ایک الگ چیز ہے لیکن سخت احتیاج واضطرار کے باوجود کبر و نخوت اختیار کرنا اور ازراہِ تکبر لوگوں کا احسان قبول نہ کرنا ایک ایسا فعل ہے جس کو نہایت مذموم ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ (انتھیٰ)

شَيْخٌ زَانٍ کے بارے میں بھی بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہاں ''شیخ'' سے مراد محصن (شادی شدہ شخص) بھی ہوسکتا ہے خواہ وہ بوڑھا ہو یا جوان۔ جیسا کہ اس منسوخ التلاوت آیت [اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا نَكَالاً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ] میں ''شیخ'' سے مراد شادی شدہ مرد ہے، چنانچہ ایسے شخص کے حق میں زنا کا زیادہ برا ہونا شرعاً بھی اور عرفاً بھی بالکل ظاہر بات ہے اسی لئے ایسے شخص کو سنگسار کرنا واجب ہے

اسی طرح مَلِكٌ كَذَّابٌ کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں ملک (بادشاہ) سے مراد غنی و مالدار شخص بھی ہوسکتا ہے! چنانچہ کسی مفلس یا قلاش شخص کا جھوٹ بولنا تو ایک درجہ میں سمجھ میں آنے والی بات ہوسکتی ہے کیونکہ وہ اپنی تنگ دستی وخستہ حالی کی وجہ سے بسا اوقات اپنی کسی سخت غرض اور شدید دنیاوی ضرورت کی وجہ سے جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے جب کہ غنی و مالدار شخص اپنے مال وزر کی وجہ سے ایسی کوئی احتیاج نہیں رکھتا اور وہ جھوٹ بولے بغیر بھی اپنی غرض پوری کرسکتا ہے لہٰذا جھوٹ بولنا اس کے حق میں زیادہ برا ہے۔ عائل مستکبر کے بارے میں بھی ایک قول یہ ہے کہ یہاں ''عائل'' یعنی مفلس سے مراد وہ شخص ہے جو فقیر ومسکین کے ساتھ تکبر کرے چنانچہ فقراء ومسکین کے ساتھ تکبر کرنا سخت برا ہے جب کہ مغرور مالداروں کے ساتھ تکبر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے!

زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہاں ''مفلس'' سے مراد وہ شخص ہے جو کسب وکمائی اور محنت ومشقت کر کے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے پر قادر ہو مگر اس کے باوجود ازراہِ رعونت ونخوت کوئی کسب وکمائی اور محنت مزدوری کرنے کو کسر شان سمجھتا ہو جیسا کہ آج کل عام طور پر دیکھا جاتا ہے (کہ اچھے خاصے اور ہٹے کٹے لوگ کوئی کام کاج کرنے اور محنت ومزدوری اختیار کرنے میں اپنی ذلت سمجھتے ہیں خواہ ان کو اور ان کے متعلقین کو فاقوں کی اذیت ہی کیوں نہ برداشت کرنا پڑتی ہو یا ناروا طور پر دوسرے لوگوں کے کاندھوں کا بار ہی کیوں نہ بننا پڑتا ہو) اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے لوگوں کا یہ طریقہ یقیناً تکبر کے ہم معنی ہے اور یہ تکبر مالداروں کے تکبر سے کہیں زیادہ برا ہے کیونکہ اس کی بنیاد رعونت ونخوت، بے جا شان دکھانے خواہ مخواہ کے لئے اپنے اور اپنے

متعلقین کو تکلیف و ہلاکت میں مبتلا کرنے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور ناجائز طور سے مال حاصل کرنے پر ہے خصوصاً ایسی صورت میں اس تکبر کی برائی اور کہیں بڑھ جاتی ہے جب کہ ایسا کوئی شخص اپنے دست و بازو کے ذریعہ اپنا اور اپنے متعلقین کا رزق حاصل کرنے کے بجائے دین کا لبادہ اوڑھ لے اور اپنی وضع قطع دینداروں اور بزرگوں کی سی بنا کر اپاہج کی طرح بیٹھ جائے اور سادہ لوح مسلمانوں پر اپنی مصنوعی بزرگی کا سکہ جما کر ان کے کاندھوں کا بار بنا رہے۔

تخریج: الجامع میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے:

ثلثة لا يكلمهم الله يوم القيامة ولا يزكيهم ولهم عذاب أليم: شيخ زان، وملك كذاب، وعائل مستكبر

متکبر جہنمی ہے

۵۱۱۰:وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اَلْكِبْرُ يَاءُ رِدَآئِيْ وَالْعَظْمَةُ اِزَارِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ وَاحِدًا مِّنْهُمَا اَدْخَلْتُهُ النَّارَ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢٠٢٣ الحديث رقم (١٣٦-٢٦٢٠) و ابن ماجه في السنن ٢/١٣٩٧ الحديث رقم ٤١٧٤، واحمد في المسند ٢/٤١٤۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کبریائی میری ردا ہے اور عظمت میرا ازار ہے جو ان دونوں میں سے ایک کے بارے میں بھی مجھ سے جھگڑا کرے گا میں اس کو آگ میں داخل کروں گا۔ (مسلم)

تشریح: ''میری چادر'' اور ''میرا تہبند'' جیسے الفاظ حق تعالیٰ نے مثال کے طور پر فرمائے ہیں اور اس مثال کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ یہ دونوں صفتیں یعنی کبریائی اور عظمت صرف میری ذات سے تعلق رکھتی ہیں جن میں کوئی بھی میرا ساجھی یا شریک نہیں ہوسکتا جیسے کسی کے لباس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا' حق تعالیٰ کی صفات دو طرح کی ہیں:

اوّل: حق تعالیٰ کی کچھ صفات تو ایسی ہیں جن میں کا کچھ حصہ بندوں کو بھی دیا گیا ہے اور بندے بطریق مجاز خود کو ان صفات کے ساتھ موصوف کر سکتے ہیں جیسے جود و کرم اور مہربانی وغیرہ۔

ثانی: کچھ صفات ایسی ہیں جو صرف حق تعالیٰ کی ذات کے لئے مخصوص ہیں اور جن کے ساتھ کوئی بندہ اپنے آپ کو بطریق مجاز بھی موصوف نہیں کر سکتا اسی حقیقت کو مثال کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے کہ جس طرح کوئی شخص ان کپڑوں کو نہیں پہن سکتا جو کسی دوسرے شخص کے جسم پر ہوں اسی طرح کبریائی اور حقیقی عظمت و بڑائی کا بھی کوئی بندہ دعویٰ نہیں کر سکتا کیونکہ یہ دونوں صفتیں صرف میری ذات کے لئے موزوں اور مخصوص ہیں۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ''کبریاء'' اور ''عظمه'' دونوں ہم معنی ہیں (یعنی بزرگی اور بڑا ہونا) لیکن حدیث کے ظاہری اسلوب سے ان دونوں کے درمیان فرق معلوم ہوتا ہے کہ ایک کو چادر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور دوسرے کو تہبند کے ساتھ' لہٰذا

اس فرق کو سامنے رکھتے ہوئے بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ کبریا تو صفت ذاتی ہے

یعنی اللہ کی ذات کبیر و متکبر ہے خواہ دوسرا اس حقیقت کو جانے یا نہ جانے اور ''عظمت'' لفظ کا حق تعالیٰ کی اس بڑائی کو بیان کرتا ہے جس کا ظہور اس کے غیر پر بھی ہوتا ہے کہ ساری مخلوق جانتی ہے کہ وہ ایسا بڑا ہے' پس یہ (عظمت) حق تعالیٰ کی صفت اضافی ہوئی اور ذاتی صفت کا اضافی صفت سے اعلیٰ ہونا ضروری ہوتا ہے' (انتھیٰ)

کبریائی کو چادر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ چادر تہبند سے اعلیٰ ہوتی ہے اور عظمت کو تہبند کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

صفت کا رتبہ ذات کے رتبہ سے کم ہے۔ اسی وجہ سے تکبیر کو قیام کے ساتھ مخصوص کیا، اور تعظیم کو رکوع کے ساتھ خاص کیا، کہ رکوع میں ''سبحان ربی العظیم'' کے الفاظ مقرر فرمائے۔ تعظیم لأ مراللہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

امام طیبیؒ فخر الدین رازیؒ کے قول کی توجیہ اطناب کے ساتھ ذکر کر کے بعد فرماتے ہیں: آپ یہ جان چکے ہیں، کہ تکبر ھو الاعراض عن الحق وتحقیر الناس فالتواضع ھو الاذعان للحق وتوقیر الناس، لہٰذا" تعظیم لامر اللّٰہ" اور شفقت علی خلق کے یہی معنی ہیں۔ لہٰذا حدیث باب کا مطلب یہ ہوا کہ جو اللہ کے مقابلہ میں تکبر کرے گا، اور مخلوق خدا کے ساتھ تکبر کا معاملہ کرے گا، اللہ تعالیٰ اس متکبر کو اس دنیا میں ذلت ورسوائی سے دوچار کرے گا، اور آخرت میں جہنم کی تہہ میں پھینکے گا۔ اور جو شخص مخلوقِ خدا کے ساتھ تواضع کے ساتھ پیش آئے گا، اللہ تعالیٰ اس متواضع کو دنیا و آخرت میں بلند درجات عطاء فرمائے گا۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد، ابو داؤد، اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ امام ابن ماجہ نے اس حدیث کو ابن عباسؓ سے بھی روایت کیا ہے۔ اور امام حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اقتصار کے ساتھ یوں نقل کیا ہے:

الكبرياء ردائى فمن نازعنى ردائى قصمته

اور سمویہ نے ابو سعید اور ابو ہریرہ سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

الكبرياء ردائى، والعزء ازارى، من نازعنى فى شىء منهما عذبته۔

الفصل الثانی:

متکبرین لکھا جانا

۵۱۱۱: عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَ كْوَعِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَذْهَبُ بِنَفْسِهٖ حَتّٰى يُكْتَبَ فِى الْجَبَّارِيْنَ فَيُصِيْبُهٗ مَآ اَصَابَهُمْ۔ (رواه الترمذى)

أخرجه الترمذى فى السنن ٤/ ٥١٥ الحديث رقم ٢٣٩٠ و مالك فى الموطأ ٢/ ٩٥٣ الحديث رقم ١٦ واحمد فى المسند ٥/ ٢٤٧۔

ترجمہ: حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول نے فرمایا کہ آدمی اپنے آپ کو بڑھاتا رہتا ہے یعنی سمجھ بیٹھتا ہے یہاں تک کہ اس کو متکبروں میں لکھ دیا جاتا ہے اور اس کو وہی عذاب دیا جائے گا جو ان کو دیا جائے گا۔ (ترمذی)

تشریح: قوله:لايزال الرجل يذهب بنفسه:

لفظ "بنفسه" میں حرف باء

اولیٰ: کے بارے میں مظہر وغیرہ نے دو احتمال ذکر فرمائے ہیں: اگر تعدیہ کے لئے ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ اپنے نفس کو اوپر اٹھاتا ہے خود کو بلند مرتبہ سمجھ کر لوگوں سے دور رکھتا ہے اور اپنے آپ کو ہر ایک کے مقابلہ پر بزرگ و برتر جانتا ہے

ثانی: اگر حرف باء مصاحبت کے لئے ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ وہ اپنے نفس کے دھوکے میں مبتلا ہو کر اس کے ساتھ کبر و غرور کی طرف بڑھتا ہے اس کو عزت دیتا ہے اور اس کی تعظیم و توقیر کرتا ہے۔ جیسا کہ دوست دوست کی تعظیم و توقیر کرتا ہے یہاں تک کہ وہ متکبر و مغرور ہو جاتا ہے۔ اساس البلاغہ میں لکھتے ہیں: يقال: ذهب به مربه مع نفسه میں (ملا علی قاریؒ (کہتا ہوں کہ پہلے کے قبیل سے یہ آیت ہے: ﴿ذهب الله بنورهم﴾ اى أذهب نورهم

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے نفس کے دھوکے میں پڑ کر خود بینی و خودستائی کا شکار ہو جاتا ہے تو اپنے آپ کو اپنے اصل مرتبہ و مقام سے اوپر اٹھا کر بڑے مرتبہ و مقام تک پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے یہاں تک تکبر اور سرکشی میں پوری طرح مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے لئے دنیا و آخرت کا وہ عذاب مقدر ہو جاتا ہے جو فرعون ہامان اور قارون جیسے سرکشوں کے لئے مخصوص ہے۔

متکبرین کو پیپ پلائی جائے گی

۵۱۱۲: وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُحْشَرُ الْمُتَكَبِّرُوْنَ اَمْثَالَ الذَّرِّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْ صُوَرِالرِّجَالِ يَغْشَاهُمُ الذُّلُّ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ يُسَاقُوْنَ اِلٰى سِجْنٍ فِيْ جَهَنَّمَ يُسَمّٰى بُوْلَسَ تَعْلُوْهُمْ نَارُ الْاَنْيَارِ يُسْقَوْنَ مِنْ عُصَارَةِ اَهْلِ النَّارِ طِيْنَةِ الْخَبَالِ۔

(رواه الترمذى)

أخرجه ابوداوٗد فى السنن ٧٩٩/٣ الحديث رقم ٣٥٢٧، واحمد فى المسند ٣٤٣/٥ ـ سورة يونس، الآية : ٦٢ـ

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ متکبر لوگوں کو قیامت کے دن چیونٹیوں کی صورت میں جمع کیا جائے گا اور شکل مردوں جیسی ہوگی اور ان پر ہر جگہ ذلت چھائی ہوگی پھر انہیں دوزخ کے قید خانے کی طرف لے جائے گا جس کا نام بولس (پس) ہے ان پر آگوں کی آگ چھانے والی ہوگی اور ان کو جہنمیوں کی پیپ پلائی جائے گی جس کا نام (طينة الخبال) ہے۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: يحشر المتكبرون أمثال الذر يوم القيامة: "چھوٹی چیونٹیوں کی طرح" کے اصل مفہوم کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ چیونٹیوں کی تشبیہ دراصل اس بات سے کنایہ ہے کہ تکبر کرنے والے لوگ قیامت کے دن میدانِ حشر میں نہایت ذلت و خواری کی حالت میں ہوں گے اور گویا وہ لوگوں کے پاؤں کے نیچے اس طرح پامال ہوں گے جس طرح چیونٹیوں کو روندا جاتا ہے۔ ان حضرات کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ قیامت کے دن مخلوق کا

اٹھنا اوران کے اجسام کا دوبارہ بننا ان ہی اجزاء اصل کے ساتھ ہوگا جو دنیا میں رکھتے تھے جیسا کہ یہ ثابت ہے کہ ہر شخص میدان حشر میں اپنے اجزاء واعضاء کے ساتھ اٹھ کر آئے گا جن پر دنیا میں اس کا جسم مشتمل تھا اور ظاہر ہے کہ چیونٹی کی صورت اور اس کا جثہ اس جسم وبدن کے اجزاء اصلی کے حامل نہیں ہوسکتا' اسی لئے حدیث میں ''فی الصور الرجال'' (مردوں کی صورت میں) کے الفاظ بھی اس قول پر دلالت کرتے ہیں بلکہ یغشاھم الذل کے الفاظ بھی اس کا قرینہ ہیں کہ ''چیونٹیوں کی طرح'' سے مراد ذلت وخواری ہی ہے نہ کہ یہ مراد ہے کہ ان کے جسم چیونٹیوں کی طرح ہوں گے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث اپنے ظاہری مفہوم پر محمول ہے' یعنی تکبر کرنے والے درحقیقت چیونٹیوں کے جسم کے ساتھ اٹھیں گے البتہ ان کی شکل وصورت مردوں جیسی ہوگی اور یہ چیز قطعاً بعید از قیاس نہیں ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو اس امر پر پوری قدرت حاصل ہے کہ وہ قیامت میں کسی کے ان اجزاء اصلی کو جن کے ساتھ وہ اٹھے گا' ایک چیونٹی کے جثہ میں جمع کردے اور اس کو چیونٹی کا جسم دے کر پوری مخلوق کے سامنے ذلیل وخوار کرے۔

شیخ تورپشتیؒ فرماتے ہیں ہم اس حدیث کے ظاہری معنی اس لئے مراد نہیں لیتے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب لوگ قیامت کے دن دوبارہ اٹھ کر میدان حشر میں آئیں تو ان کے جسم وبدن ان ہی اجزاء پر مشتمل ہوں گے جن پر دنیا میں ان کے جسم مشتمل تھے یہاں تک کہ ان کے عضو تناسل کی کھال کا وہ حصہ بھی لگا دیا جائے گا جو ختنہ کے وقت کاٹا جاتا ہے گویا سارے لوگ غیر مختون اٹھیں گے (لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان کے جسم کے سارے اجزاء یہاں تک کہ ناخن اور بال وغیرہ بھی ایک چیونٹی کے جثہ میں جمع ہو جائیں۔) اسی مفہوم کی طرف اگلے جملے (یغشاھم الذل من کل مکان) میں اشارہ فرمایا ہے۔

لہٰذا تحقیقی بات یہ ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب لوگ اپنی قبروں سے اٹھ کر میدانِ حشر میں آئیں گے تو اس وقت اللہ تعالیٰ دوسرے لوگوں کی طرح تکبر کرنے والوں کے جسم کو بھی دوبارہ بنائے گا اور وہ بھی اپنے تمام اجزاء معدومہ کے ساتھ اپنے پورے جسم میں اٹھ کر آئیں گے تاکہ ہر ایک کی دوبارہ جسمانی تخلیق کی قدرت پوری طرح ثابت ہو جائے لیکن پھر ان لوگوں کو میدانِ حشر میں مذکورہ جسم وصورت میں تبدیل کردے گا یعنی ان کے جسم چیونٹیوں کی طرح ہو جائیں گے اور ان کی صورت مردوں کی سی رہے گی اور یہ تبدیلی جسم اس لئے ہوگی تاکہ ان کی ذلت واہانت پوری مخلوق کے سامنے ظاہر ہو جائے

یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب مذکورہ لوگ حساب کتاب کی جگہ آئیں گے اور ان کے سامنے عذاب الٰہی کی نشانیاں ظاہر ہوں گی تو اس وقت وہ ہیبت ودہشت کے سبب اس قدر گھٹ جائیں گے کہ ان کے جسم چیونٹیوں کی طرح معلوم ہوں گے اور اہل دوزخ کا اپنی اپنی حالتوں اور گناہوں کے اعتبار سے مختلف صورتوں جیسے کتے' سور اور گدھے وغیرہ کی شکلوں میں تبدیل ہو جانا مختلف منقولات سے ثابت بھی ہے۔

لفظ ''بولس'' بائے موحدہ کے فتحہ' واؤ کے سکون لام کے فتحہ اور سین مہملہ کے ساتھ ہے اور بعض نسخوں میں حرف اول کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ یہ لفظ با کے ضمہ اور لام کے فتحہ کے ساتھ ہے جہنم کا قید خانہ ہے۔ اور منذریؒ فرماتے ہیں کہ ''بولس'' بائے موحدہ کے ضمہ واؤ کے سکون اور لام کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ (ذکرہ میرک) اور ایک شارح فرماتے ہیں کہ یہ 'ابلاس' سے مشتق ہے اور جس کے معنی ناامیدی کے ہیں (شیطان کا نام ابلیس بھی اسی سے مشتق ہے۔)

''آگوں کی آگ میں'' کی طرف نسبت ایسی ہی ہے جیسے آگ کی نسبت کسی ایسی چیز کی طرف کی جائے جس کو آگ جلا

دیتی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ آگ اس طرح کی ہوگی کہ وہ خود آگ کو لکڑی کی طرح جلائے گی۔

قوله: يسقون من عصارة أهل النار طينة الخبال: طينة الخبال: خبال خاء کے زبر کے ساتھ ہے۔ اس کے لغوی معنی فساد اور خرابی کے ہیں ایک شارح فرماتے ہیں کہ "طينة الخبال" اہل دوزخ کے "عصارہ" کا نام ہے۔ یعنی وہ پیپ خون اور کچ لہو جو دوزخیوں کے زخموں سے بہے گا۔

﴿ومن يعمل مثقال ذرة﴾ [الزلزال۔۸] ﴿ان الله لا يظلم مثقال ذرة﴾ [النساء۔۴۰] ایک حدیث میں آتا ہے:

ان الأجساد تعاد على ما كانت عليه من الأجزاء حتى انهم يحشرون غرلا يعاد منهم ما انفصل عنهم من القلفة۔

عبداللہ بن احمد "زوائد الزہد" میں حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

يجاء بالجبارين والمتكبرين رجال في صور الذر يطؤهم الناس من هوانهم على الله، حتى يقضى بين الناس، ثم يذهب بهم الى نار الأنيار قيل: يا رسول الله! وما نار الأنيار؟ قال: عصارة أهل النار۔

اس حدیث کو امام سیوطیؒ نے "البدور السافرة في احوال الآخرة" میں ذکر کیا ہے۔

غصہ کا علاج وضو ہے

۵۱۱۳: وَعَنْ عَطِيَّةَ بْنِ عُرْوَةَ السَّعْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّيْطٰنِ وَاِنَّ الشَّيْطٰنَ خُلِقَ مِنَ النَّارِ وَاِنَّمَا يُطْفَأُ النَّارُ بِالْمَاءِ فَاِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ۔ (رواه ابوداؤد)

أخرجه ابوداوٗد في السنن ۵/۱۴۱ الحديث رقم ۴۷۸۴، واحمد في المسند ۴/۲۲۶۔

ترجمہ: حضرت عطیہ بن عروہ سعدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوا اور آگ پانی سے بجھتی ہے پس جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اسے وضو کر لینا چاہیے۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: ان الشيطان خلق من النار: شیطان کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے، اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

﴿والجان خلقناه من قبل نار السموم﴾ [الحجر۔۲۷]

نیز ﴿خلقتني من نار﴾ [الاعراف۔۱۲] یہ دلیل ہے کہ شیطان جنات میں سے ہے، چونکہ ملائکہ کو نور سے پیدا کیا گیا ہے "خلق من النار" کا مطلب یہ ہے، کہ شیطان کا عنصر ناری اس کے تمام اجزا پر غالب ہے، بخلاف انسان کے۔

قوله: فاذا غضب أحد كم فليتو ضأ: وضوء، ماء حسی اور مطہر معنوی کا معجون مرکب ہے۔ یہ وہ طب انبیاء ہے جس سے "حکماء" غافل ہیں۔ امام طیبیؒ نے بڑی عجیب بات کہی ہے۔ انہوں نے حدیث کو حقیقت اصلی سے نکال ڈالا، حالانکہ امور نقلیہ میں سے کوئی داعی تھا، نہ امور عقلیہ میں سے کوئی باعث تھا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: کہ نبی کریمؐ کی مراد یہ تھی: اذا غضب احد کم فليستعذ بالله من الشيطان الرجيم ~~خلق الغضب~~ من الشيطان ۔ اھ۔ اور درست بات یہ ہے کہ استعاذہ

علیحدہ سے ایک مستقل علاج ہے، جیسا کہ ایک "اثر" میں منقول ہے، جس کو جزریؒ نے "حصن" میں نقل کیا ہے: قال: ومن غضب فقال: أعوذ بالله من الشيطان الرجيم ذهب عنه ما يجد اس اثر کو بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے عن سليمان بن صرد کی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ (حدیث وعلاج) درحقیقت اس آیت کریمہ سے اقتباس ہے: ﴿واما ينزغنك من الشيطان نزغ فاستعذ بالله﴾ [الاعراف۔ ۲۰۰] اس کو ابن عدی نے الکامل میں از ابو ہریرہؓ ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: اذا غضب الرجل فقال: أعوذ بالله سكن غضبه

خلاصہ یہ ہے کہ یہ علاج قولی سہل الحصول ہے، اور وضوء معالجہ فعلیہ ہے، جس میں مشقت ہے، خصوصاً وضو نماز کا مقدمہ ہے۔ یہ بمنزلہ اس معجون مسہل کے ہے، جو مواد فاسدہ کو جڑ سے نکال پھینکتا ہے۔ اور استعاذہ محضہ بمنزلہ استفراغ کے ہے، جو معدہ کی صفائی کرتا ہے۔ اور حاصل یہ ہے کہ حکیم کامل نے معالجہ میں تدریج کا راستہ بتایا۔ ہر بیمار کا مزاج اس کے موافق ہوتا ہے۔ اور اشیاء مفردہ ومرکبہ کے خواص اس کے مناسب حال ہوتے ہیں۔ مختلف امراض کی طرح غصہ کی مختلف انواع ہیں۔ چنانچہ مریض کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر تسلیم وسپرد کردے، اور اپنے نفس کو اس طبیب کے سپرد کرے جو حبیب کامل ہے۔ اور اس طرح سے سپرد کرے کہ جس طرح غسل کرانے والے کے سامنے میت۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس وقت غصہ کے آثار محسوس کرے، تو اولاً تعوذ پڑھے، اور جب دیکھے کہ اس سے غصہ زائل نہیں ہو رہا، تو وضوء کیلئے اٹھ کھڑا ہو، اور اللہ کی رضاء کی خاطر دو رکعات اداء کرے۔ یہ وہ کڑوی دوا ہے، جو طبع شیطانی ومزاج نفسانی کیلئے انتہائی ناگوار ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿واستعينوا بالصبر والصلوٰة وانها لكبيرة الاعلى الخاشعين﴾ [البقرۃ: ۲٤٥]

غصہ دوسرا علاج

۵۱۱۴: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا غَضِبَ اَحَدُکُمْ وَھُوَ قَائِمٌ فَلْیَجْلِسْ فَاِنْ ذَھَبَ عَنْہُ الْغَضَبُ وَاِلَّا فَلْیَضْطَجِعْ۔ (رواہ احمد والترمذی)

أخرجه ابو داوٗد فی السنن ١٤١/٥ الحدیث رقم ٤٧٨٢، واحمد فی المسند ١٥٢/٤۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اگر وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور اگر غصہ دور ہو جائے ٹھیک ورنہ ہو لیٹ جائے۔ (احمد، ترمذی)

تشریح: قوله: اذا غضب أحد كم وهو قائم فليجلس: کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، چونکہ معالجہ بالاضداد کا یہی تقاضا ہے۔ قوت غضبانیہ، شیطانی وساوس سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ خفت کی مقتضی ہے، اور احساس تعلّی یہ آگ کے خواص میں سے ہے، اور قیام برائے انتقام ہے، لہٰذا اس حالت کیلئے بیٹھنے کا حکم معالجہ مذکورہ میں مبالغہ کی خاطر ہے، نیز اس میں اشارہ ہے کہ انسان نے لوٹ کر مٹی میں جانا ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ تواضع کرے اور یہ کہ ہر شئے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ غصہ کی حالت میں کھڑا رہنے کی بجائے بیٹھ جانے میں حکمت یہ ہے کہ (عام طور پر غصہ کے وقت

انسان بے قابو ہو جاتا ہے اور اگر وہ غصہ کے وقت کھڑا ہوا ہو تو اس بات کا زیادہ خوف رہتا ہے کہ وہ کوئی ایسی حرکت کر گزرے جس سے بعد میں پریشانی اور پشیمانی اٹھانی پڑے اور ظاہر ہے کہ بیٹھے ہوئے ہونے کی صورت میں کسی حرکت کا صادر ہونا اتنی سرعت اور آسانی کے ساتھ نہیں ہوتا جس قدر کہ کھڑے ہونے کی صورت میں صورت میں ہوتا ہے۔ غصہ کے وقت اپنی حالت میں اس طرح تبدیلی کر لینا جس سے جسم وذہن کو سکون وآرام ملے جیسے کھڑا ہو تو فوراً بیٹھ جائے یا بیٹھا ہوا ہو تو لیٹ جائے' غصہ اور اشتعال کے دفعیہ کے لئے بہترین تاثیر رکھتا ہے۔)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں ممکن ہے، کہ اس سے تواضع وخفض مراد ہو، چونکہ غضب کا منشاء تکبر وترفع ہے۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں ان کے جمع میں کوئی مانع نہیں چونکہ ارشاد نبوی حکمتوں کا منبع ہے۔ واللہ اعلم۔ یہ احتمال بھی ہے، کہ یہ عمل وضوء سے پہلے کیا جائے' جیسا کہ ظاہر ہے، اور احتمال یہ بھی ہے، کہ اگر غصہ زائل نہ ہو تو وضوء کے بعد کیا جائے۔

تخریج: اس حدیث کو امام ابوداؤد نے، اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

غافل بدترین بندہ ہے

۵۱۱۵: وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ تَخَيَّلَ وَاخْتَالَ وَنَسِيَ الْكَبِيْرَ الْمُتَعَالَ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ تَجَبَّرَ وَاعْتَدٰى وَنَسِيَ الْجَبَّارَ الْاَعْلٰى بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ سَهٰى وَلَهٰى وَنَسِيَ الْمَقَابِرَ وَالْبِلٰى بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ عَتَاوَطَغٰى وَنَسِيَ الْمُبْتَدَ اَوَالْمُنْتَهٰى بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ يَّخْتِلُ الدُّنْيَا بِالدِّيْنِ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ يَخْتِلُ الدِّيْنَ بِالشُّبُهَاتِ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدُ طَمَعٍ يَقُوْدُهٗ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ هَوًى يُضِلُّهٗ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ رَغَبٌ يُذِلُّهٗ۔

(رواه الترمذی والبیهقی فی شعب الایمان وقالا لیس اسناده بالقوی وقال الترمذی ایضا هذا حدیث غریب)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٤٥ الحدیث رقم ٢٤٤٨، والبیهقی فی شعب الایمان ٦/٢٧٨ الحدیث رقم ٨١٨١۔

ترجمہ: حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: بدترین بندہ وہ ہے جو اترا کر اور غرور سے چلے اور کبیر المتعال ذات کو بھول جائے بدترین بندہ وہ ہے جو ظلم کرے اور حد سے آگے بڑھ جائے اور جبار اعلیٰ کو بھول جائے بدترین بندہ وہ ہے جو بھولے اور غفلت میں مبتلا ہو جائے اور قبر میں گل سڑ جانے کو بھول جائے بدترین بندہ وہ ہے جو سرکشی اختیار کرے اور حد سے آگے بڑھ جائے اور اپنی ابتداء اور انتہاء کو بھول جائے بدترین بندہ وہ ہے جو شبہات کے ذریعے دین میں خلل پیدا کرے بدترین بندہ وہ ہے جو طمع باز ہو اور طمع نے اسے اپنا ماتحت بنا لیا ہو اور بدترین بندہ وہ ہے جو کہ خواہش کا بندہ بن جائے اور خواہش اسے جدھر چاہے گمراہ کرے اور بدترین بندہ وہ ہے جس کو رغبت ذلیل کر دے۔ اس روایت کو ترمذی نے اور شعب الایمان میں بیہقی نے نقل کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد قوی نہیں ہے نیز ترمذی نے بھی کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: المتعال: رعایت فاصلہ کی وجہ سے ایک یاء کو حذف کر دیا گیا ہے۔ معرف باللام اسم منقوص میں ایک لغت اسی طرح ہے۔ نیز جمہور قراء نے اس آیت میں بھی اس طرح پڑھا ہے: ﴿عالم الغيب والشهادة الكبير المتعال﴾ [الرعد۔ ۹] ابن کثیر اس یاء کو دونوں حالتوں میں برقرار رکھتے ہیں۔

سهي ولهي: ان لفظوں کو الف کے ساتھ لکھنا چاہئے تھا، چونکہ یہ دونوں کلمات واوی ہیں، ''سهو'' اور ''لهو'' سے ماخوذ ہیں اور بہت سے نسخوں میں یاء کے ساتھ ہیں۔ تو ممکن ہے فواصل سجع اور مشاکلت لفظی کی خاطر ایسا کیا گیا ہو۔

البلى: بائے موحدہ کے کسرہ کے ساتھ۔ اعضائے جسمانی اور ہڈیوں کا ٹوٹ پھوٹ کر چورہ چورہ ہو جانا۔

عتا: عتو سے ماخوذ ہے۔ طغي طغيان سے ماخوذ ہے۔ تجاوز کرنا۔ بعض کا کہنا ہے کہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں۔

دونوں الفاظ کو ذکر کرنا، برائے تاکید ہے، یا دوسرا لفظ پہلے لفظ کی تفسیر ہے، اور فاصلہ کیلئے لایا گیا ہے۔

المبتدأ والمنتهى: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

الشبهات: شین اور باء دونوں مضموم ہیں۔ باء کو فتحہ بھی دیا جاتا ہے۔

عبد طمع: اصل عبارت ''له طمع'' ہے۔ یا مضاف محذوف ہے۔ أي ذو طمع۔ یا یہ مصدر ہے ''رجل عدل'' کے قبیل سے ہے۔ اور اگر ترکیب اضافی کے ساتھ پڑھا جائے تو کسی توجیہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

قوله: بئس العبد عبد رغب يذله: عبد رغب: اس لفظ کے بارے میں علماء نے بہت سا کلام کیا ہے۔ چنانچہ وہ سارا کلام ذکر کیا جاتا ہے۔ پھر اس کا خلاصہ ذکر کیا جائے گا۔

رغب: بضم الراء وفتحه۔

خلاصة الأقوال:

اس لفظ میں راء، غین اور باء ہے۔ یہ بطور فعل کے از باب سمع اور کرم مستعمل ہے۔ اس کا مصدر ''رغبا'' اور ''رغبة'' آتا ہے۔ اس کے صلہ میں ''في'' اور ''عن'' دونوں آتے ہیں۔ لفظ ''رغب'' کو متعدد طرح سے ضبط کیا گیا ہے۔ [1] بروزن ظلم۔ [2] بروزن کتب۔

تخریج: تورپشتیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے اپنی سند کے ساتھ عن هاشم بن سعيد الكوفي روایت کیا ہے۔ ان کا ذکر ابن عدی نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عامة ما يرويه لا يتابع عليه میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں اس حدیث کا ایک متابع ہے، چنانچہ اس متابع کو طبرانی اور بیہقی نے نعیم ابن حماد سے نقل کیا ہے نیز اس کو حاکم نے بھی اپنی مستدرک میں اسماء بنت عمیس سے نقل کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کثرت طرق ضعیف حدیث کو قوی کر دیتی ہے اور اس کو حسن لغیرہ کے درجہ پر پہنچا دیتی ہے جس سے روایت کا مقصود پورا ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قوله: وقال الترمذي ايضا هذا حديث غريب: جہاں تک ترمذی کے اس قول کا تعلق ہے کہ یہ حدیث غریب ہے تو واضح ہے کہ اول تو غرابت صحت اور حسن کے منافی نہیں دوسرے یہ کہ تمام محدثین کے نزدیک فضائل اعمال میں ضعیف حدیث

پر بھی عمل کیا جاتا ہے لہٰذا وعظ و نصیحت کے موقع پر (اس حدیث کا ذکر کرنا اور لوگوں کو اس سے سبق حاصل کرنے کی تلقین کرنا) بطریق اولیٰ مناسب ہوگا۔

الفصل الثالث:

سب سے زیادہ محبوب گھونٹ

۵۱۱۶: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاتَجَرَّعَ عَبْدٌ اَفْضَلَ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ جُرْعَةِ غَيْظٍ يَكْظِمُهَا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰى۔ (رواه احمد)

أخرجه ابن ماجه في السنن ۲/ ۱٤۰۱ الحديث رقم ٤۱۸۹ ، واحمد في المسند ۲/ ۱۲۸۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ بندے کے لئے اللہ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ محبوب وہ غصے کا گھونٹ ہے جو رضاء الٰہی کی خاطر وہ بھرتا ہے۔ (احمد)

تشریح: أفضل: نائب عن المفعول المطلق ہے۔ای تجرعا أفضل

يكظمها: ظاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔أی يبلغها ويمنعها من اظهارها مع كثرتها وملء باطنه منها یہ" كظم القربة" ملأها وشد فمها سے ماخوذ ہے (على ما في أساس البلاغة)۔اور الجامع کی روایت میں "كظمها" بصیغہ ماضی ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔

دشمن سے حفاظت کا راز

۵۱۱۷: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي قَوْلِهِ تَعَالٰى اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ قَالَ الصَّبْرُ عِنْدَ الْغَضَبِ وَالْعَفْوُ عِنْدَ الْإِسَاءَةِ فَإِذَا فَعَلُوْا عَصَمَهُمُ اللّٰهُ وَخَضَعَ لَهُمْ عَدُوُّهُمْ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ قَرِيْبٌ۔

(رواه البخاري تَعلِيْقًا)

البخاري تعليق من حديث طويل ۸/ ۵۵۵ سورة السجدة۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی زیادتی کے وقت معاف کر دینا ہے چنانچہ جب وہ لوگ ایسا کریں گے تو اللہ ان کو دشمن سے محفوظ فرمائیں گے اور ان کے دشمن کو ان کے سامنے جھکا دیں گے گویا کہ وہ گہرا دوست اور قریبی ہے۔ بخاری نے اس کو تعلیقاً نقل کیا ہے۔

تشریح: روایت میں آیت کا جو ٹکڑا نقل کیا گیا ہے وہ اپنے سیاق و سباق کے ساتھ اس طرح ہے: وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔

"قریب" دراصل لفظ حمیم کی تفسیر ہے ~~جس سے تعلق~~ مراد ہے اور یہ جملہ مذکورہ آیت کے اس آخری جز کی تفسیر ہے

فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ یعنی پھراچانک (تم دیکھو گے کہ) تم میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی قریبی دوست ہوتا ہے۔

اس آیت میں بہت زیادہ مبالغہ ہے، وہ یوں کہ لفظ "حسنة" سے "احسن" کی طرف عدول فرمایا، اور اس آیت کریمہ: ﴿وجزاء سیئة سیئة مثلها﴾ [الشوری۔ ۴۰] سے رخصت کا مفہوم مستفاد ہوتا ہے، اس آیت میں "بدلہ" کو "سیئہ" سے تعبیر کرنا مشاکلت کی وجہ سے ہے، یا باعتبار نسبت واضامت الی الاحسن کے ہے، اگلی آیت یوں ہے:

﴿فاذا الذی بینك وبینه عداوة كأنه ولی حمیم وما یلقاها الا الذین صبروا وما یلقاها الا ذو حظ عظیم﴾ [سورۃ فصلت۔ ۳۴] واما ینزغنك من الشیطان نزغ فاستعذ باللّٰہ انه هو السمیع العلیم﴾

[الاعراف۔ ۲۰۰]

اس آیت میں اشارہ ہے کہ اس پر عمل کرنا، اخلاق انسانیہ کا اکمل درجہ ہے، یہ وہ اخلاق کریمہ ہیں جس سے اکثر افراد بشریہ عاجز ہیں۔

قوله: الصبر عند الغضب والعفو عند الاساءة: یہ واؤ بمعنی اُو ہے، چونکہ یہ دونوں امور خصائل حسنہ میں سے ہیں، تو گویا کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے سالک سے مطلوب چھوٹی سے چھوٹی خوبی کا ذکر فرمایا، وگرنہ تو سادات صوفیہ تو بدلہ میں انواع احسان میں سے احسن صورت کا انتخاب فرماتے ہیں۔ تواضع اور ہاتھ پاؤں چومتے ہیں۔ اور مالی عطیات خواہ قلیل ہوں کہ کثیر، سے بھی نوازتے ہیں۔ اور اقل مراتب یہ ہے کہ حلال کروائے۔ اس کیلئے توبہ اور ہدایت کی دعا کرے، اور بعض حضرات کا کہنا ہے، کہ قیامت کے دن شفاعت کا وعدہ بھی کرے۔ یہ سارے خرق عادات ہیں۔ بعض مرتبہ ابتداء میں اور کبھی انتہاء کے باعث آدمی دھوکہ میں پڑ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا گیا: الاستقامة خیر من ألف كرامة ایک روایت میں آتا ہے: شیبتنی هود، تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس کا سبب پوچھا گیا، تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس آیت: ﴿فاستقم كما أمرت﴾ [هود۔ ۱۱۲] کی طرف اشارہ فرمایا۔ اور بعض کا کہنا ہے، کہ اصل سبب وہ واقعات ہیں، جو اس سورت میں مذکور ہیں۔ واللہ اعلم۔

كأنه: ضمیر "عدو" کی طرف راجع ہے۔ یہ لفظ مفرد و جمع دونوں کے لئے مساوی طور پر مستعمل) ہے۔

ولی: یہاں "ناصر" کے معنی میں ہے۔

حمیم: اس دوست کو کہتے ہیں، جو لوگوں کے معاملات کی فکر کرے، لوگوں کی حاجات کا غم کھائے اور "قریب" بمعنی "قرابت دار" ہے۔ اور حاصل کلام یہ ہے کہ یہ وہ عادت حسنیٰ ہے کہ جو عداوت کو محبت سے بدل دیتی ہے۔ حقد، حسد اور غیبت وغیرہ جیسے اعمال ذمیمہ کو نکال پھینکتی ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ تفسیر "ولا السیئة" میں "لا" کو زائدہ ماننے کی تقدیر پر ہے۔ اور معنی یہ ہوگا: لا تستوی الحسنة والسیئة، چنانچہ "التی هی أحسن" سے مراد "التی هی حسنة" ہے۔ اور لفظ "أحسن" کا ذکر فرمانا، مفہوم کے اعتبار سے ابلغ ہے، بایں طور کہ سیئہ کا جواب سیئہ سے دینا جائز ہے، حسن سے دینا بہتر ہے، مگر احسن سے دینا چاہئے۔

اور اگر ''لا'' کو زائدہ نہ مانیں تو پھر یہ مطلب ہوگا: أن الحسنة والسيئة متفاوتتان في أنفسهما فخذ بالحسنة التي هي أحسن من أختها، فاذا اعترضك حسنات، فادفع بها السيئة التي ترد عليك من بعض اعدائك اس کی مثال یہ ہے کہ کسی نے آپ کے ساتھ برائی کی ہے تو ''حسنہ'' یہ ہے کہ آپ اس کی برائی کے بدلہ میں اس کو معاف کردیں اور ''احسن'' یہ ہے کہ آپ اس کی برائی کے بدلہ میں اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں۔ مثلاً اس نے آپ کی مذمت بیان کی ہے، تو آپ اس کی مدحت بیان کریں، چنانچہ ایسا کرنے کے نتیجہ میں آپ کا سخت دشمن بھی آپ کا گہرا جگری دوست ہو جائے گا۔

غصہ ایمان کا بگاڑ ہے

۵۱۱۸: وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْغَضَبَ لَيُفْسِدُ الْاِيْمَانَ كَمَا يُفْسِدُ الصَّبْرُ الْعَسَلَ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/٣١١، الحديث رقم ٨٢٩٤۔

ترجمہ: حضرت بہز بن حکیم نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے نقل کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غصہ ایمان کو اس طرح تباہ کر دیتا ہے جیسا کہ صبر شہد کو بگاڑ دیتا ہے۔ (بیہقی)

تشریح: ''ایمان'' سے یا تو کمال ایمان مراد ہے یا نور ایمان ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بسا اوقات غصہ کی شدت اصل ایمان کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ اور چونکہ بعض افراد یقیناً ایسے ہی ہیں، لہٰذا یہ تشبیہ دینا بالکل درست ہے۔

الصبر: صاد کے فتح اور باء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ ایک نسخہ کے مطابق باء ساکن ہے۔ لیکن صاحب قاموس فرماتے ہیں: الصبر ككتف ولا يسكن الا في ضرورة الشعر عصارة شجر مر۔ انتهى۔ لوگوں کی زبان پر بسکون الباء مشہور ہے ممکن ہے کہ یہ شہرت اس وجہ سے ہو کہ اس کا ضبط بیان کرتے ہوئے ''ککتف'' کہا جاتا ہے۔ اور ''کتف'' میں خود دو لغات ہیں۔ واللہ اعلم۔

تواضع، تکبر کا موازنہ

۵۱۱۹: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَا اَيُّهَا النَّاسُ تَوَاضَعُوْا فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِيْ نَفْسِهٖ صَغِيْرٌ وَفِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ عَظِيْمٌ وَمَنْ تَكَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ صَغِيْرٌ وَفِيْ نَفْسِهٖ كَبِيْرٌ حَتّٰى لَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِمْ مِنْ كَلْبٍ اَوْ خِنْزِيْرٍ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/٢٧٦ الحديث رقم ٨١٤٠۔

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے راوی کہتے ہیں کہ وہ منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمار ہے تھے اے لوگو! تواضع اختیار کرو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جو اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرے اللہ اس کو بلند فرماتے ہیں اور

لوگوں کی نگاہ میں وہ بڑا ہوتا ہے اور جو شخص تکبر اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پست کر دیتے ہیں وہ لوگوں کی نگاہ میں حقیر ہوتا ہے اور اپنے نزدیک وہ بہت بڑا بنتا ہے یہاں تک کہ وہ لوگوں کے ہاں کتے اور خنزیر سے زیادہ ذلیل ہو جاتا ہے۔

تشریح: قوله:وهو على المنبر:

اس جملہ میں اشارہ ہے، کہ راوی کو یہ قضیہ بخوبی یاد ہے۔اور اگلی بات چونکہ صحابہ کے مجمع عام میں کہی تھی، لہٰذا گویا یہ مسئلہ اجماعی ہے۔

قوله:يا أيها الناس:

"يا أيها المؤمنون" کے بجائے" يا ايها الناس" کے الفاظ کی طرف عدول فرمانا افادۂ عموم کیلئے ہے۔ اور توہم خصوص کی نفی بھی مقصود ہے۔

قوله:تواضعوا: یعنی تم لوگ باہمی طور پر تواضع اختیار کرو، اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ تکبر کے ساتھ مت پیش آؤ، چونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿أذلة على المؤمنين أعزة على الكافرين﴾ [المائدة۔٥٤] اور لفظ" أذلة " کی تعبیر میں کمال تواضع علی سبیل المبالغہ کی طرف اشارہ ہے۔من تواضع لله رفعه الله فهو في نفسه صغير:

فهو میں فاء تفریعیہ ہے أى فالمتواضع المرفوع نتيجته أو علامته أنه ،

یا فاء جزائیہ ہے، اور تقدیری عبارت یوں ہے: واذا رفعه الله فهو في نفسه صغير

حتى:" صغير " کے متعلق ہے، یا حاصلِ مجموعہ کے متعلق ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ" حتى " ابتدائیہ ہے۔مغنی میں لکھتے ہیں:" حتى " کبھی حرف ابتداء ہوتا ہے، یعنی ایسے حرف کے طور پر واقع ہوتا ہے، کہ جس کے بعد جملہ کی ابتداء ہو رہی ہوتی ہے۔یعنی اس کے بعد جملہ مستانفہ ہوتا ہے۔چنانچہ جملہ اسمیہ پر داخل ہوتا ہے۔جیسا کہ جریر کا یہ قول:

فما زالت القتلى تمج دمائها
بدجلة حتى ماء دجلة أشكل

اور اس کی تائید اگلے جملہ سے بھی ہوتی ہے، کہ اس جملہ میں لام ابتداء داخل ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں:"فهو " میں فاء جزائیہ ہے، اور شرط محذوف ہے۔یعنی من تواضع لله هضم حقه من نفسه فجعل نفسه دون منزلته

شرح السنۃ میں لکھتے ہیں کہ عمر بن الخطاب نے فرمایا:

ان الرجل اذا تواضع رفع الله حكمته وقال:انتنفش نفسك' فهو في نفسه صغير وفي أعين الناس كبير، واذ ا بطر وعداً طوره وهضه الله الى الأرض، وقال:اخسأ أخسأك الله فهو في نفسه كبير، وفي اعين الناس صغير حتى يكون أهون على الله من الخنزير

مطلب یہ ہے کہ متکبر و مغرور شخص اگر چہ خود کو بڑا اور عزت دار سمجھتا ہے اور دوسروں کو بھی اپنی مصنوعی بڑائی اور عزت دکھاتا ہے لیکن وہ خدا کے نزدیک بھی ذلیل و حقیر ہوتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں بھی نہایت کمتر و بے وقعت رہتا ہے' اس کے برخلاف

جو شخص تواضع و فروتنی اختیار کرتا ہے وہ اگرچہ اپنی نظر میں خود کو حقیر سمجھتا ہے اور لوگوں کے سامنے بھی اپنے آپ کو کمتر و بے وقعت ظاہر کرتا ہے مگر خدا کے نزدیک اس کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں بھی اس کی بڑی عزت و وقعت ہوتی ہے۔

ایک ماثور دعا میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: اللهم اجعلني في نفسي صغيرا و في أعين الناس كبيرا۔

سب سے زیادہ عزت والا بندہ

۵۱۳۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مُوْسٰى بْنُ عِمْرَانَ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَارَبِّ مَنْ اَعَزُّ عِبَادِكَ عِنْدَكَ قَالَ مَنْ اِذَا قَدَرَ غَفَرَ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/٣١٩ الحديث رقم ٨٣٢٧۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے عرض کیا' میرے پروردگار! تیرے ہاں سب سے زیادہ عزت والا کون ہے؟ پروردگار نے فرمایا: جو قدرت پانے پر بخش دے۔ (بیہقی)

تشریح: قوله: من اذا قدر غفر:

مطلب یہ ہے کہ سب سے عزیز بندہ وہ ہے جو طریق عبودیت اور عبدیت میں اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ چونکہ ''عبد'' اور'' عبادت'' یہ دونوں لفظ'' طريق معبد اى مذلل'' سے ماخوذ ہیں۔ عارفین فرماتے ہیں: العبادة هي أقصى غاية الخضوع والتذلل کہ عبادت خضوع و تذلل کی انتہاء ہے۔ اور اسی وجہ سے ''عبادت'' کا لفظ غیر اللہ کے لئے مستعمل نہیں، البتہ غفران مع القدرة یہ از باب تخلق با خلاق اللہ ہے۔ اس آیت مبارکہ میں اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے: ﴿اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا﴾ [النساء: ۱۴۹] یعنی اگر اس پر کسی شخص نے کوئی ظلم کیا اور اس کو رنج و تکلیف میں مبتلا کیا تو وہ اس سے انتقام لینے کی طاقت و قدرت رکھنے کے باوجود اس کو معاف کر دے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طبیعت پر چونکہ جلالی کیفیت غالب تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس جواب کے ذریعہ گویا ان کو تلقین کی ہے کہ وہ عفو و درگزر کا رویہ اختیار کیا کریں۔

جامع صغیر کی ایک روایت میں منقول ہے من عفا عند القدرة عفا الله عنه يوم العسرة کہ ''جو شخص انتقام لینے کی طاقت وقدرت کے باوجود عفو و درگزر کرے تو اللہ تعالیٰ یوم عسرت یعنی قیامت کے دن اس کے ساتھ عفو و درگزر فرمائے گا۔'' اس حدیث کو امام طبرانی نے حضرت ابو امامہ سے نقل کیا ہے۔

کمال کا تقاضا یہ ہے کہ درجہ اعتدال حاصل ہونا چاہئے، بلکہ صفت جمال کا غلبہ ہونا چاہئے، جیسا کہ اس حدیث قدسی میں اسی طرف اشارہ ہے: غلبت رحمتي غضبي اور صفت رحمت کی وجہ سے ہمارے نبی کریم کو ''رحمۃ للعالمین'' کے لقب سے نوازا گیا، اور اس امت کو ''امت مرحومہ'' کے نام سے پکارا گیا۔ نیز ماقبل میں گزرا کہ الراحمون يرحمهم الرحمن

حفاظت زبان کا بدلہ

۵۱۲۱: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ خَزَنَ لِسَانَهٗ سَتَرَ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ وَمَنْ كَفَّ غَضَبَهٗ كَفَّ اللّٰهُ عَنْهُ عَذَابَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمَنِ اعْتَذَرَ اِلَى اللّٰهِ قَبِلَ اللّٰهُ عُذْرَهٗ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/٣١٥ الحديث رقم ٨٣١١۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنی زبان کو محفوظ کر کے رکھا اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے اور جس نے اپنے غصہ کو روک لیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے اپنے عذاب کو روک دیں گے اور جس نے اللہ کے دربار میں معذرت کی تو اللہ تعالیٰ اس کی معذرت قبول فرمالیں گے۔ (بیہقی)

تشریح: خزن: خاء کے فتحہ کے ساتھ بمعنی حفاظت۔ امرؤ القیس کہتا ہے:

اذا المرء لم يخزن عليه لسانه
فليس على شيء سواه بخزان

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی جو شخص لوگوں کے ان عیوب اور برائیوں کو بیان کرنے سے باز رہتا ہے جو اس کے علم میں ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے عیوب و معاصی کو لوگوں کی نگاہوں سے یا اعمال لکھنے والے فرشتوں سے اور یا دونوں سے چھپاتا ہے۔

الجامع میں بروایت ابن ابی الدنیا عن ابن عمر مروی ہے: من كف غضبه ستر الله عورته اس آخری جملہ کا مطلب اگر یہ بیان کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اس کو عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا، تو دونوں حدیثوں میں موافقت ہو جائے گی۔

قوله: ومن اعتذر الى الله: قبل الله عذره: پچھلے جملوں کا ظاہر یہ کہتا ہے، کہ یہاں عبارت یوں ہوتی: ومن قبل عذر أخيه قبل الله عذره ممکن ہے کہ راویوں میں سے کسی کا تصرف ہو یا حکمت اسی کی مقتضی ہو۔ والله اعلم بما هنالك۔

تین نجات دہندہ اور تین ہلاک کن اشیاء

۵۱۲۲: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلٰثٌ مُنْجِيَاتٌ وَثَلٰثٌ مُهْلِكَاتٌ فَاَمَّا الْمُنْجِيَاتُ فَتَقْوَى اللّٰهِ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ وَالْقَوْلُ بِالْحَقِّ فِي الرِّضٰى وَالسَّخَطِ وَالْقَصْدُ فِي الْغِنَا وَالْفَقْرِ وَاَمَّا الْمُهْلِكَاتُ فَهَوًى مُتَّبَعٌ وَشُحٌّ مُطَاعٌ وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ وَهِيَ اَشَدُّهُنَّ۔

(روى البيهقي والاحاديث الخمسة في شعب الايمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٥/٤٥٢ الحديث رقم ٧٢٥٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں نجات دینے والی اور تین باتیں ہلاک کرنے والی ہیں: ① خفیہ اور اعلانیہ تقویٰ اختیار کرنا۔ ② خوشی اور ناخوشی سچی بات کرنا اور ③ سرداری اور فقر میں

اعتدال پر رہنا۔ ہلاک کرنے والی چیزیں یہ ہیں: ① ایسی نفسانی خواہش کی جس کی پیروی کی جائے۔ ② وہ بخل جس کی اطاعت کی جائے۔ ③ انسانی خود پسندی اختیار کرنا۔ یہ ان تینوں میں سب سے بڑی چیز ہے۔ ان پانچوں روایات کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: القول بالحق فی الرضی والسخط: خوشی و ناخوشی میں حق بات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت بیانی اور حق گوئی کو اپنی کسی مصلحت کسی مفاد اور اپنے کسی جذبۂ خوشی و ناخوشی کا پابند نہیں بنانا چاہئے بلکہ اگر کسی سے راضی و خوش ہے تو اس کے سامنے بھی وہی بات کہے جو حق ہے اور اگر اس سے ناراض و ناخوش ہو تو اس صورت میں بھی حق بات ہی کہے مثلاً اگر خود کو کسی ایسے شخص سے کوئی نفع و فائدہ پہنچتا ہے دوسروں کے ساتھ جس کا ظلم اور جس کا فسق ظاہر و ثابت ہو تو اس کی ناحق تعریف و ستائش اور خلاف واقعہ بات محض اس لئے بیان نہ کرے کہ ذاتی فائدہ حاصل ہونے کی وجہ سے اس سے خوش ہے اسی طرح اگر کسی صالح و بزرگ شخصیت سے کسی معاملہ میں کوئی اختلاف اور ناراضگی کی صورت پیدا ہو جائے تو محض اپنی ذاتی ناراضگی کی وجہ سے اس کی برائی اور مذمت نہ کرے۔ حاصل یہ کہ خواہ کسی سے خوش ہو یا ناراض دونوں صورتوں میں راہ استقامت پر گامزن رہے اور حق گوئی کے فریضہ کو کسی بھی حالت میں پس پشت نہ ڈالے۔

قولہ: والقصد فی الغنا والفقر: میانہ روی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خرچ و اخراجات میں نہ تو اس قدر وسعت و فراخ دستی کا طور اپنائے کہ اس پر اسراف کا اطلاق ہونے لگے اور نہ اس قدر تنگی و سختی اختیار کرے کہ فقر و افلاس ظاہر ہونے لگے یا یہ مراد ہے کہ فقر و غنا کے درمیان اعتدال قائم کرے اور درمیانی راستہ کو اختیار کرے جیسا کہ علماء نے کہا ہے کہ حصولِ معاش کی جدوجہد میں اس حد پر اکتفا کرنا کہ جس سے ضروریاتِ زندگی کی تکمیل اور بقاء حیات کا سامان فراہم ہو جاتا ہو غنا اور فقر دونوں سے افضل ہے۔

قولہ: فھوی متبع الخ: ''خواہش نفس کہ جس کی پیروی کی جائے'' کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس طرح کا تابع کر دینا کہ اس کی ہر خواہش پوری کرنے لگے وہ جو کچھ کہے اور جس طرف لے جائے اِدھر چل پڑے ایک ایسی خصلت ہے جو ہلاکت و تباہی میں ڈال دیتی ہے اس کے برخلاف ایمان کا کامل ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ اپنے نفس کو فرمانِ حق اور شریعت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تابع بنا دیا جائے۔

قولہ: شح مطاع: بخل و حرص کا غلام بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بخل و حرص انسان کی طبیعت میں داخل ہے اور اس وجہ سے یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان بخل و حرص کے مادہ سے بالکل خالی ہو لیکن اپنے آپ کو بخل و حرص کا اس طرح غلام بنا دیا کہ کسی بھی صورت میں ان چیزوں سے خود کو محفوظ رکھنا ممکن نہ ہو ایک ایسی خصلت ہے جو انسان کو اخروی تباہی و ہلاکت میں ڈال دیتی ہے۔

قولہ: اعجاب المرء بنفسہ وھی أشدھن: مطلب یہ ہے کہ ہلاکت میں ڈالنے والی جن تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں از روئے گناہ اور نقصان سب سے بدتر خصلت عجب ہے جس کی وجہ سے انسان تکبر و غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے کیونکہ خواہش نفس کی اتباع اور بخل و حرص کی غلامی یہ دونوں ~~برائیاں اس~~ طرح کی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں گرفتار ہو تو ان سے اپنے

آپ کو نکال لینا اور توبہ وانابت کی راہ اختیار کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا مگر عجب ایک ایسا مرض ہے جو اگر لاحق ہو جاتا ہے تو کم ہی پیچھا چھوڑتا ہے اور انسان کو کبر و نخوت میں اس طرح مبتلا کر دیتا ہے کہ وہ اپنے کسی برے فعل کی برائی کے احساس تک سے خالی ہو جاتا ہے' اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کسی برے فعل پر نادم نہیں ہوتا اور توبہ وانابت کی راہ اس سے دور ہوتی چلی جاتی ہے' جیسا کہ بدعتی' بدعت کے پھندے میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ اس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا چنانچہ بدعتی کو کم ہی توبہ کی توفیق ہوتی ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: خود پسند اپنی خواہشات کا تابع ہوتا ہے، اور ''شح مطاع'' یہ بھی خواہشات نفسانی میں سے ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**ومن یوق شح نفسه فأولئك هم المفلحون**﴾ [الحشر۔۹] کہ یہاں ''شح'' کی اضافت ''نفس'' کی طرف کی گئی ہے۔

بَابُ الظُّلْمِ

ظلم کا بیان

"ظُلْمٌ" کے لغوی معنی ہیں "کسی چیز کو بے موقع محل رکھنا" (یعنی جس چیز کی جو جگہ اور جو محل ہو اس کو وہاں رکھنے کی بجائے دوسری جگہ اور دوسرے محل میں رکھنا) یہ مفہوم ہر اس چیز کو شامل ہے جو اپنی حد سے تجاوز کر جائے اور اس کو جس طرح' یا جس وقت 'یا جس جگہ واقع ہونا چاہیے اس کے بجائے زیادتی ونقصان کے ساتھ' یا بے جا یا بے وقت واقع ہو۔ چنانچہ امام راغبؒ فرماتے ہیں: الظلم عند أهل اللغة وضع الشيء في غير موضعه المختص به اما بنقصان أو بزيادة، واما بعدول عن وقته أو مكانه شریعت میں بھی ظلم کے یہی معنی مراد لئے جاتے ہیں۔ البتہ شرعی طور پر ظلم کا اطلاق اس چیز پر ہوگا جو اپنے شرعی محل سے بلا وجہ شرعی تجاوز کر جائے۔

قطب ربانی شیخ عبدالکبیر یمانی فرماتے ہیں: ان الله سبحانه خلق قلب عبده لذكره وفكره، فمن وضع فيه غيره فهو ظالم لنفسه "اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندہ کا دل اپنے ذکر وفکر کیلئے پیدا کیا ہے، چنانچہ جو شخص اپنے دل میں غیر اللہ کو جگہ دے گا، وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے"۔ عارف باللہ ابن فارض فرماتے ہیں:

عليك بها صرفا وان شئت مزجها
فعدلك عن ظلم الحجيب هو الظلم

ظلم قیامت کے دن اندھیرے ہوں گے

۵۱۲۳: عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٥/ ١٠٠ الحديث رقم ٢٤٤٧ و مسلم في ٤/ ١٩٩٦ الحديث رقم (٥٧-٢٥٧٩)، والترمذي في السنن ٤/ ٣٣٠ الحديث رقم ٢٠٣٠، والدارمي في ٢/ ٣١٣ الحديث رقم ٢٥١٦، واحمد في المسند ٢/ ١٣٧۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ظلم قیامت کے دن اندھیرے ہوں گے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: الظلم ظلمات يوم القيامة کا مفہوم مخالف یہ نکلتا ہے: العدل بأنواعه أنوار" عدل کرنا

قیامت کے دن روشنیوں کا باعث ہوگا''۔اور قیامت کے دن کی تخصیص کا سبب واضح ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

شرح مسلم للنووی میں قاضیؒ فرماتے ہیں: یہ اپنے ظاہر پر ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ ظالم کو قیامت کے دن میدانِ حشر میں تاریکیاں اس طرح گھیرے ہوئے ہوں گی کہ وہ اس نور سے محروم رہے گا جو مؤمن کو نصیب ہوگا اور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یوں فرمایا: [یَسْعٰی نورھم بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ] [الحدید۔۱۲] ترجمہ: (قیامت کے دن) مؤمنین کا نوران کے آگے اور دائیں طرف دوڑتا ہوگا (جس کی روشنی میں وہ اپنی منزل پائیں گے۔)

اس میں ایک احتمال یہ ہے کہ ظُلُمٰتٌ (تاریکیوں) سے آخرت کے وہ شدائد (تکلیف ومشکلات) اور عذاب مراد ہیں جن سے قیامت کے دن واسطہ پڑے گا اور جن میں اہل دوزخ مبتلا ہوں گے۔چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: [قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْکُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ] [الانعام۔٦٣] ''کہہ دیجئے کہ تمہیں جنگل اور دریا کی تکلیف ومشکلات سے کون نجات دیتا ہے۔''

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ''ظلمات'' انکال وعقوبات سے عبارت ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: قاضی کا یہ کہنا کہ ''یہ اپنے ظاہر پر ہے'' سے یہ وہم ہوتا ہے، کہ ''ظلمات'' کے مجازی نہیں بلکہ حقیقی معنی مراد ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجازی معنی مراد ہیں۔چونکہ یہاں ''حمل علی المسبب'' ہے، چنانچہ مراد یہ ہوگا: ظلمات حقیقة مسببة عن الظلم۔ میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں: قاضی نے ''حقیقت'' سے مراد وہ حقیقت لی ہے جو ''مجاز'' کے مقابلہ میں آتی ہے جس کی تفسیر اصلی معنی کی طرف نظر کرتے ہوئے ''شدائد'' کے ساتھ کی گئی ہے۔قطع نظر کرتے ہوئے معرب دمبنی ہونے سے۔

پھر آگے فرماتے ہیں: ''شدائد وانکال'' میں فرق یہ ہے کہ ''شدائد'' کا تعلق دخول نار سے پہلے کے اوقات کے ساتھ ہے۔اور ''انکال'' کا تعلق دخول نار کے بعد کے ساتھ ہے۔میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں: تو پھر ''یوم قیامت'' سے مراد ''دارالآخرۃ'' ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ظالم کو پکڑتا ہے تو پھر نہیں چھوڑتا

۵۱۲۴: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ لَیُمْلِیْ الظَّالِمَ حَتّٰی اِذَا اَخَذَہٗ لَمْ یُفْلِتْہُ ثُمَّ قَرَأَ وَکَذٰلِکَ اَخْذُ رَبِّکَ اِذَا اَخَذَ الْقُرٰی وَھِیَ ظَالِمَۃٌ الْاٰیَۃَ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ٣٥٤/٨ الحديث رقم ٤٦٨٦ و مسلم في ١٩٩٧/٤ الحديث رقم (٦١-٢٥٨٣) و ابن ماجه في السنن ١٣٣٢/٢ الحديث رقم ٤٠١٨۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے اور جب اسے پکڑتا ہے تو پھر نہیں چھوڑتا پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: کَذٰلِکَ اَخْذُ رَبِّکَ اِذَا اَخَذَ الْقُرٰی وَھِیَ ظَالِمَۃٌ......۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: لیملی: از باب افعال، ڈھیل دینا، مہلت دینا۔

لم یفلته: ''افلات'' سے مأخوذ ہے، جس کے معنی ہیں خروج من ضیق مع فرار (ذکرہ شارح) اور مطلب یہ ہے کہ اس کو چھوڑے گا نہیں بلکہ سخت طریقہ سے پکڑے گا۔ (ذکرہ ابن الملک)

بعض کا کہنا ہے، کہ أفلت الشیء و تفلت اور ''انفلت'' ہم معنی ہیں۔ افلته غیرہ بھی مستعمل ہے۔ اور صاحب النہایہ نے ''لم یفلته'' کی توضیح ''لم ینفلته'' کے ساتھ کی ہے۔ اور اس کے یہ معنی بھی ممکن ہیں: لم یفلته منه أحد أی: لم یخلصه ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ معنی ظاہر ہیں، جیسا کہ اس پر ضمیر دلالت کر رہی ہے اور قول اول یا تو حاصل معنی ہے، یا یہ کہا جائے کہ یہاں حذف وایصال ہے۔

اس حدیث میں گویا مظلوم کو تسلی دی گئی ہے (کہ وہ اپنے اوپر کئے جانے والے ظلم وستم پر صبر واستقامت اختیار کرے اور اس دن کا انتظار کریں جب ظالم کو اپنے ظلم کی سخت سزا بھگتنی پڑے گی) نیز اس ارشادگرامی میں ظالموں کے لئے سخت وعید و تنبیہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے اس مہلت پر مغرور نہ ہو جائیں گے بلکہ ان کو اپنے ظلم کی سزا یقیناً بھگتنی ہو گی) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: [وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلاً عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ] [ھود۔۱۰۲] الایۃ ''اور تم اللہ تعالیٰ کو اس چیز سے غافل مت سمجھو جس کو ظالم اختیار کرتے ہیں۔''

الجامع کی روایت میں ''ثم قرأ'' تک کے الفاظ ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو شیخین، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

ظالموں کی جائے عذاب میں مت داخل ہو

۵۱۲۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا مَرَّ بِالْحَجْرِ قَالَ لَا تَدْخُلُوْا مَسَاكِنَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ اِلَّا اَنْ تَكُوْنُوْا بَاكِيْنَ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مَا اَصَابَهُمْ ثُمَّ قَنَّعَ رَاْسَهٗ وَاَسْرَعَ السَّيْرَ حَتّٰى اجْتَازَ الْوَادِيَ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۸/۱۲۵ الحدیث رقم ۴۴۱۹ و مسلم فی ۴/۲۲۸۶ الحدیث رقم (۳۹۔۲۹۸۰). واحمد فی المسند ۲/۶۶۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مقام حجر سے گزرے تو فرمایا ان ظالموں کے گھروں میں تم مت داخل ہو مگر یہ کہ تم رونے والے ہو اس خطرے سے کہ کہیں ان کی طرح کا عذاب تمہیں بھی نہ آئے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر مبارک کو ڈھانپ لیا اور وادی کو عبور کرنے تک رفتار کو تیز کر لیا۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ان یصیبکم: یہاں تقدیری عبارت دو طرح سے ہو سکتی ہے:

① لئلا یصیبکم ② مخافة أن یصیبکم قاضیؒ فرماتے ہیں کہ استثناء نہی سے ہے اور ''ان یصیبکم'' مفعول نہ ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ أی مخافه ان یصیبکم۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے: لاتدخلو مساکنهم فی ... من الاحوال الاحال کونکم باکین۔

''حجر'' حائے مہملہ کے ساتھ ہے۔ حجر ایک جگہ کا نام ہے' جہاں حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ''ثمود'' آباد تھی۔

تورپشتیؒ لکھتے ہیں: ''حجر اس جگہ کا نام ہے جو مشہور پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ثمود کا مسکن تھی'! (حجاز کے شمالی علاقہ میں جس کا نام مدین ہے۔ ایک تاریخی وادی ہے جس کا نام وادی القریٰ ہے اسی وادی میں تبوک سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر یہ جگہ واقع ہے۔

یہاں قوم ثمود کی بستیاں تھیں۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ کے لئے تبوک جا رہے تھے یا غزوہ سے فارغ ہو کر وہاں سے واپس تشریف لا رہے تھے تو راستہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر اسی علاقہ سے ہوا' یہ ارشاد گرامی آپؐ نے اسی موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔

قولہ: ثم قنع رأسہ و أسرع السیر حتی اجتاز الوادی: قنع: نون کی تشدید کے ساتھ ''قنع'' کے یہاں دو معنی ہو سکتے ہیں: ◼ **اطرق رأسہ** ۔ یعنی سر مبارک جھکا لیا الخ ◼ **جعل قناعة علی رأسہ** ۔ کہ اپنے سر پر چادر ڈال لی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے سر پر چادر ڈال کر اس جگہ سے جلدی گزرنا جیسا کہ کسی جگہ سے کوئی خوفزدہ شخص جلد سے جلد گزر جاتا ہے' دو وجہ سے تھا۔

اولؔ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک دائیں بائیں اس تباہ شدہ قوم کے مکانات کھنڈرات پر نہ پڑے اور حقیقت میں آپؐ کا یہ عمل مسلمانوں کی تعلیم کے واسطے تھا تا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں۔ چنانچہ آپ نے پہلے تو قول کے ذریعہ لوگوں کو اس امر کی طرف متوجہ کیا اور پھر از راہ تاکید اپنے فعل کے ذریعہ بھی توجہ دلائی۔

ثانیؔ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے اس طرح گزرنا اس بنا پر تھا کہ خود آپ پر خوف خدا کا نہایت غلبہ رہتا تھا اور عذاب الٰہی کے آثار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ لرزاں کر دیا کرتے تھے چونکہ خشیت بقدر معرفت ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [**انما یخشی اللہ من عبادہ العلموا**] [فاطر۔۲۸] اور جیسا کہ ایک ارشاد میں فرمایا اَنَا اَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ وَاَخْشَاكُمْ لَه ''میں تم سب سے زیادہ خدا کا علم رکھتا ہوں اور سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں۔''

ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ صحابہؓ کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ وہ اس جگہ کا پانی نہ پئیں۔ صحابہ کرام نے وہاں کے پانی سے آٹا گوندھا تھا۔ تو ان کو حکم دیا گیا کہ وہ آٹا اپنے جانوروں کو کھلا دیں' صحابہ کرام کو وہ آٹا استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

شرح السنۃ میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث دلیل ہے اس بات کی کہ خدا کے سرکش بندوں اور ظالموں کے مکانات اور ان کی جگہوں میں نہ تو رہائش اختیار کی جائے اور نہ ان کے علاقوں کو اپنا وطن بنایا جائے۔ چونکہ نبی کریمؐ نے منع فرمایا ہے کہ تم ان لوگوں کے مکانات میں داخل نہ ہونا الا یہ کہ تم روتے ہوئے گزرا۔ چنانچہ جو شخص ان ظالموں کے علاقوں کو اپنا وطن بنائے گا اسے تو چاہئے کہ وہ سدا روتا ہی رہے۔ (انتھی) میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں اللہ جل شانہ کے اس فرمان کا ظاہر تفریع و توبیخ میں اس کے مناسب ہے: ﴿وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ﴾ [ابراھیم: ۴۵] ''اور جو لوگ اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے تم ان کے مکانوں میں رہتے تھے اور تم پر ظاہر ہو چکا تھا کہ ہم نے ان لوگوں

کے ساتھ کس طرح (کا معاملہ) کیا تھا اور تمہارے (سمجھانے) کیلئے مثالیں بھی بیان کردی تھیں۔"

نیز اس حدیث میں تنبیہ ہے کہ مختلف مکانات ومقامات کی اُس کے رہنے والوں کے اعتبار سے عند اللہ ایک خاص تاثیر ہے۔ جیسا کہ مختلف اوقات میں اللہ جل شانہ کے ہاں مختلف تاثیرات ہیں۔ چنانچہ طاعات کے مختلف اوقات اور اجابت کی گھڑیاں وغیرہ۔ اسی قبیل سے یہ فرمان نبویؐ ہے: ان للّٰہ في أیام دھرکم نفحات الا فتعرضوا لھا نیز ماقبل میں یہ حدیث گزرچکی ہے۔

ان أحب البلاد الی اللّٰہ المساجد وأبغضھا الیہ الأسواق اوراس کی ایک نظیر اخیار واشرار کی مصاحبت کی تاثیر بھی ہے۔

زیادتی کی معافی دنیا میں مانگ لو

۵۱۲۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ کَانَتْ لَهٗ مَظْلِمَةٌ لِاَخِیْهِ مِنْ عِرْضِهٖ اَوْشَیْءٌ فَلْیَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْیَوْمَ قَبْلَ اَنْ لَّا یَکُوْنَ دِیْنَارٌ وَّلَادِرْهَمٌ اِنْ کَانَ لَهٗ عَمَلٌ صَالِحٌ اُخِذَ مِنْهُ بِقَدْرِ مَظْلِمَتِهٖ وَاِنْ لَّمْ تَکُنْ لَهٗ حَسَنَاتٌ اُخِذَمِنْ سَیِّئَاتِ صَاحِبِهٖ فَحُمِلَ عَلَیْهِ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ٥/ ١٠١ الحديث رقم ٢٤٤٩، واحمد في المسند ٢/ ٢٠٦۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم میں سے کسی نے دوسرے پر ظلم کیا ہے یا اس کی آبرو ریزی کی یا اور کچھ کہا تو اس سے آج ہی معافی مانگ لے اس سے پہلے کہ اس کے پاس دینار ودرہم نہ ہوں اگر ظالم کے پاس اعمال صالحہ ہوں گے تو اس سے لے لیے جائیں گے اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوں تو اس پر مظلوم کے گناہ لاد دیئے جائیں گے۔ (بخاری)

تشریح: قولہ: من کانت لہ مظلمۃ لأخیہ من عرضہ أوشي' فلیتحللہ منہ الیوم:

مظلمۃ: لام پر کسرہ اور فتحہ دونوں درست ہیں۔

عرض: عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

من عرضہ: "مظلمۃ" کا بیان ہے۔

أو شيئ: یہ تعمیم بعداز تخصیص ہے۔

فلیتحللہ: صاحب النہایہ لکھتے ہیں: تحللتہ واستحللتہ ان دونوں کے معنی ہیں کسی سے حلّت کا مطالبہ کرنا۔

لا یکون: "لا یوجد" کے معنی میں ہے۔ اور "لم یکن": "لم یوجد" کے معنی میں ہے۔

قولہ: ان عمل صالح أخذ منہ بقدر مظلمتہ الخ:

"أخذ" اور "حمل" دونوں فعل مجہول ہیں۔

آخرت میں ظالم سے اس کے ظلم کا بدلہ اس طرح لیا جائے گا کہ اگر اس کے اعمال نامہ میں کچھ نیکیاں ہوں گی تو وہ مظلوم کو

دے دی جائیں گی اور اگر وہ اپنے اعمال نامہ میں نیکیاں نہیں رکھتا ہو گا تو اس صورت میں مظلوم کے وہ گناہ جو اس نے دنیا میں کئے ہوں گے اس ظالم پر لاد دیئے جائیں گے چنانچہ وہ اپنے گناہوں کی سزا تو بھگتے ہی گا مزید برآں مظلوم کے گناہوں کے عذاب میں بھی مبتلا ہو گا اور مظلوم کو اس کے عذاب سے نجات دے دی جائے گی جس کا وہ ان گناہوں کی وجہ سے مستوجب ہوتا۔

قوله: قبل أن لا يكون دينار ولا درهم: حدیث کے یہ الفاظ کہ ''وہ نہ درہم رکھتا ہو گا نہ دینار'' اس طرف اشارہ کرتے ہیں جس شخص نے کسی پر ظلم و زیادتی حق تلفی کی ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ ہر حالت میں مظلوم یا حق دار سے اس ظلم یا حق کو ضرور معاف کرا لے خواہ اس معافی کے عوض درہم و دینار (یعنی روپیہ پیسہ) خرچ کرنا پڑے اور اس دنیا ہی میں معافی تلافی کا ہو جانا اس سے کہیں زیادہ بہتر اور آسان ہے کہ عدم معافی کی صورت میں اس کی نیکیاں لے لے یا اپنے گناہوں کا بوجھ اس پر ڈال دے۔ جیسا کہ اگلے کلام میں یہی بات ارشاد فرمائی گئی ہے۔

''اس کے ظلم یا واجب حق کے بقدر'' کے بارے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے ان نیکیوں اور گناہوں کی مقدار کا تعین علم الٰہی کے سپرد ہے' (یعنی وہی بہتر جانتا ہے کہ ان نیکیوں اور گناہوں کا لینا دینا کس طرح اور کس اعتبار سے ہو گا) ابن ملکؒ نے لکھا ہے کہ جن نیکیوں اور برائیوں کا لینا دینا ہو گا' ہو سکتا ہے کہ وہ اس موقع پر نفس اعمال ہوں گے جن کو جواہر کی مانند مجسم کر کے پیش کیا جائے گا' اور یہ احتمال بھی ہے کہ ایک دوسرے کو وہ نعمتیں یا عذاب ملیں جو ان نیکیوں یا برائیوں کی جزا و سزا کے طور پر حق تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں اور یہ بات اس ارشاد باری تعالیٰ کے منافی نہیں: ﴿ولا تزرو وازرة وزر أخرى﴾ [الانعام۔١٦٤] چونکہ ظالم درحقیقت اپنے ہی ظلم کا بوجھ اٹھا رہا ہے۔ مظلوم کی سیئات اس لئے لی جائیں گی تاکہ مظلوم پر سے تخفیف ہو، اور عدل بھی ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ان كان، جملہ مستانفہ ہے، کہ گویا جب یہ فرمایا: **فليتحلل منه اليوم قبل أن لا يكون دينار ولا درهم يؤخذ منه بدل مظلمته**۔ تو سائل کو متوجہ فرمایا کہ وہ یہ پوچھے: **فما يؤخذ منه بدل مظلمته بعد أن كان**......۔

مفلس کسے کہتے ہیں

۵۱۲۷: وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْمُفْلِسُ قَالُوْا اَلْمُفْلِسُ فِيْنَا مَنْ لَّا دِرْهَمَ لَهٗ وَلَا مَتَاعَ فَقَالَ اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِيْ يَاْتِيْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِصَلٰوةٍ وَصِيَامٍ وَّزَكٰوةٍ وَّيَاْتِيْ قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا وَاَكَلَ مَالَ هٰذَا وَسَفَكَ دَمَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا فَيُعْطٰى هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ وَهٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ فَاِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ اَنْ يُّقْضٰى مَا عَلَيْهِ اُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/١٩٩٧ الحديث رقم (٥٩-٢٥٨١)، والترمذي في ٤/٥٢٩ الحديث رقم ٢٤١٨، واحمد في المسند ٢/٣٠٣۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم مفلس کس کو خیال کرتے ہو۔ انہوں نے

عرض کیا ہم مفلس اسے کہتے ہیں جس کے پاس درہم اور سامان نہ ہو آپ ﷺ نے فرمایا میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز روزہ زکوٰۃ لے کر آئے گا۔ مگر اس نے کسی کو گالی دی ہوگی اور دوسرے پر تہمت دھری ہوگی اور کسی کا مال لیا ہوگا اور کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کی مار پٹائی کی ہوگی۔ تو اس کی نیکیاں اس مظلوم کو دے دی جائیں گی اور کچھ دوسرے کو پھر اگر اس کے ذمہ ادائیگی حقوق سے پہلے نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو مظلوموں کی غلطیاں اس ظالم پر ڈال دی جائیں گی پھر اسے آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ (مسلم)

تشریح: قوله: قال: أتدرون ما المفلس؟:

صحیح مسلم، جامع الترمذی، کتاب الحمیدی، جامع الاصول اور شرح السنۃ کی روایت میں "ما المفلس" کے الفاظ ہیں۔ چنانچہ اس تقدیر پر اصل سوال مفلس کے وصف کے بارے میں ہے، نا کہ اس کی حقیقت کے بارے میں۔ اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے جواب میں اس کے اوصاف کا ذکر فرمایا: "شتم و اكل و قذف"، مشارق الانوار میں اور مصابیح کے بعض نسخوں میں سوال مفلس کے بارے میں ہے، کہ "من المفلس"؟ یہ سوال سوالِ ارشاد ہے نا کہ سوال استعلام۔ چنانچہ اس وجہ سے جواب میں یہ فرمایا: ان المفلس كذا و كذا ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: بظاہر "ما المفلس" سے مراد "من المفلس" ہے۔ اس کی دلیل آنحضرت ﷺ کا جواب گرامی ہے جو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس موقع پر صحابہ کو عنایت فرمایا، نیز حضور کے اپنے کلام میں بھی "من المفلس" کی تعبیر موجود ہے۔

اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ بندوں کے حقوق کی پامالی کرنے والے کو آخرت میں نہ تو معافی ملے گی اور نہ اس کے حق میں شفاعت کام آئے گی، ہاں اگر اللہ تعالیٰ کسی کے لئے چاہے گا تو وہ مدعی (صاحب حق) کو اس کے مطالبہ کے مطابق اپنی نعمتیں عطا فرما کر راضی کر دے گا۔

نوویؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ عام طور پر لوگ مفلس اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس مال و دولت اور روپیہ پیسہ نہیں ہوتا یا بہت کم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں مفلس وہی شخص ہے جس کے بارے میں ذکر کیا گیا، چنانچہ دنیاوی مال و دولت سے تہی دست شخص کو حقیقی مفلس نہیں کہا جا سکتا کیونکہ مال و دولت اور روپیہ پیسہ کا افلاس عارضی ہوتا ہے جو موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے بلکہ بسا اوقات زندگی ہی میں وہ افلاس، مال و دولت کی فراوانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف حدیث میں جس افلاس کا ذکر کیا گیا ہے اس کا تعلق ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی سے ہے اور اس افلاس میں مبتلا ہونے والا شخص پوری طرح ہلاک ہوگا۔ مازریؒ فرماتے ہیں بعض بدعتیوں کا زعم ہے کہ یہ حدیث اللہ جل شانہ کے اس فرمان کے معارض ہے: [الانعام. ١٦٤] (ان کا) یہ (زعم) باطل ہے۔ چونکہ اس شخص کو عقاب اس کے "وزر" کی پاداش میں ہوگا، چنانچہ اس کی طرف اس کے غرماء کے حقوق متوجہ ہوں گے، اور ان کو اس کی حسنات میں سے نیکیاں دی جائیں گی، اور جب اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو اس کے خصوم کی سیئات لے کر اس پر ڈال دی جائیں گی پس عقوبت کی حقیقت اس کے ظلم کا سبب ہے اس کو عقاب اس کی جنایت کے بغیر نہیں دیا گیا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: عقل و نقل ہر دو کا مقتضی یہ ہے کہ عدل ہونا چاہیے، چونکہ جب ظالم کی حسنات کثیر تعداد میں ہیں

اور اس کا پلڑا ابھی بوجھل ہے، اور اس کی سیئات پر غالب ہیں، تو اگر اس ظالم کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا، تو مظلوم کا حق ضائع ہو جائے گا۔ اور اگر اس ظالم کو جہنم میں ڈال دیا جائے تو اللہ جل شانہ کے اس قول کے منافی ہوگا: ﴿فمن ثقلت موازینه فأولئك هم المفلحون﴾ [الاعراف۔۸] اور عنقریب یہ بات بھی آئے گی کہ حقوق العباد ایسی چیز ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ چھوڑے گا نہیں۔ لہٰذا دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ضروری ہے۔ یا ''اخذ حسنات'' ہو یا'' وضع سیئات'' ہو، تاکہ ظالم کا میزان عمل کچھ ہلکا پڑ جائے، یوں اس کو جہنم میں داخل کر دیا جائے گا اور بقدر استحقاق عذاب دیا جائے گا، پھر جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا بشرطیکہ اس کے نامۂ اعمال میں حسنات باقی رہی ہوں۔ وگرنہ ایمان کی برکت سے جنت میں داخل کر دیا جائے گا [فان الله لا يضيع اجر من أحسن عملا]۔

قیامت کے دن حقوق دلوائے جائیں گے

۵۱۲۸: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَتُؤَدُّنَّ الْحُقُوْقَ اِلٰى اَهْلِهَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حَتّٰى يُقَادَ لِلشَّاةِ الْجَلْحَاءِ مِنَ الشَّاةِ الْقَرْنَاءِ (رواہ مسلم وذکر حدیث جابر) اِتَّقُوا الظُّلْمَ فِي بَابِ الْاِنْفَاقِ۔

أخرجه مسلم في صحيحه ۴/۱۹۹۷ الحديث رقم (۶۰/۲۵۸۲)، والترمذي في السنن ۴/۵۳۰ الحديث رقم ۲۴۲۰، واحمد في المسند ۲/۴۱۱۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن اہل حقوق کے حقوق دلوائے جائیں گے یہاں تک کہ سینگ والی بکری سے بے سینگ کا بدلہ لیا جائے گا۔ (مسلم)

تشریح: حضرت جابرؓ کی روایت باب الانفاق میں ذکر ہوئی جس کی ابتداء (اِتَّقُوا الظُّلْمَ) سے ہے۔

''لتؤدن'': دال مشددہ کے فتحہ کے ساتھ ہے اور بعض نسخوں میں ضمہ کے ساتھ ہے۔

''الحقوق'' پہلی توجیہ کی بنیاد پر مرفوع ہے اور دوسری توجیہہ کی بنیاد پر منصوب ہے۔ ایک شارح جزم کرتے ہوئے فرماتے ہیں: هو بفتح الدال على بناء المجهول والحقوق اقيم مقام فاعله

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: یہ لام قسم مقدر کے جواب پر داخل ہے۔ اس میں دال مضموم ہے اور فعل کا اسناد اس جماعت کی طرف ہے جس سے خطاب ہو رہا ہے اور 'حقوق' اس کا مفعول ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ دال مفتوح ہے، اور یہ صیغہ مجہول کا ہے، اور ''الحقوق'' نائب فاعل ہے، لیکن یہ بات درست نہیں ہے، چونکہ اگر ایسا ہوتا تو یاء ظاہر ہوتی، اور یوں فرمایا جاتا: لتؤدین اھ۔ اور ان کی مراد یہ ہے کہ یہ صیغہ واحد ہوتا' اور اس کا حکم أخشين، اغزون اور ارمين والا ہوتا، کہ لام کلمہ کو لوٹایا جا سکتا اور تثنیہ کے مطابق فتحہ ہوتا، جیسا کہ ''اخشیا وارمیا واغزوا'' میں ہے۔ اور تورپشتیؒ فرماتے ہیں: هو على بناء المجهول' ''والحقوق'' مرفوع، هذه الرواية المعتمد بها، ويزعم بعضهم ضم الدال ونصب'' الحقوق''، والفعل مسند الى الجماعة الذين خوطبوا به، والصحيح ما قدمناه۔ اھ۔

بظاہر صحت سے مراد صحت روایت ہے' وگرنہ تو درایت کی رو سے اس کا درست ہونا ماقبل میں تحریر کیا جا چکا ہے۔ اور شیخ کے کلام کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سید کے اصل نسخہ میں' تمام اصول معتمدہ اور نسخہ مصححہ میں دال کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کے ساتھ فعل صحیح والا معاملہ کیا گیا ہے، جیسا کہ مفرد مجہول میں " لیضربن "، بائے موحدہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ امام طیبیؒ نے اس طرف توجہ ہی نہیں فرمائی اور معنی کی رعایت کرتے ہوئے یہ فرمادیا: ان كان الرد لأجل الرواية فلا مقال، وان كان حسب الدراية فان باب التغليب واسع فيكون قد غلب العقلاء على غيرهم

قوله: حتى يقاد للشاة الجلحاء من الشاة القرناء: اس کو حسب " تغلیبا " غایت قرار دیا ہے' جیسا کہ اس فرمان باری میں ہے: ﴿جعل لكم من أنفسكم أزواجا ومن الأنعام أزواجا يذرؤكم فيه﴾ [الشوری۔ ۱۱] " يذرء كم " کی ضمیر " الاناسي والأنعام " کی طرف " تغلیبا " راجع ہے' اور اس (يذرؤكم فيه) کا معنی ہے " يكثركم " الذرء سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے: البث (بسانا)۔ (ذکرہ البیضاوی) " في " کو ظرفیت معنویہ کے لئے قرار دیا ہے' اور " تدبیر " کو منبع " سے تشبیہ دی ہے اور " الاتقان " میں ہے کہ " فی " بمعنی " باء " ہے۔ ای بسبہ۔ یہ بہت واضح ہے۔ یہ ساری تقریر اس تقدیر پر ہے کہ " جلحاء " اور " قرناء " سے مراد بکریاں لی جائیں، البتہ اگر " جلحاء " سے مراد فقیر یا مظلوم ہو' اور " قرناء " سے مراد غنی یا ظالم ہو، جیسا کہ ایک تفسیر یوں ہی مروی ہے۔ تو اس صورت میں تغلیب کی تاویل کرنے کی حاجت نہیں۔

جلحاء: پہلے جیم، پھر لام اور پھر حائے مہملہ ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: جلحاء، مد کے ساتھ ہے۔ بغیر سینگ کی بکری کو " جلحاء " کہتے ہیں۔ اور اس کی ضد " قرناء " ہے۔ یہ (حدیث) اس مسئلہ میں صریح ہے، کہ قیامت کے دن بہائم کا بھی حشر و اعادہ ہوگا۔ جیسا کہ انسان، اطفال ومجانین میں سے مکلف مخلوق کا اعادہ ہوگا، اور ان کا بھی کہ جن کو دعوت نہیں پہنچی۔ اس کی تائید دلائل قرآن وسنت سے بھی ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وإذا الوحوش حشرت﴾ [التکویر۔ ۵] جب شریعت میں کوئی لفظ وارد ہوا اور اس کو شرعاً وعقلاً ظاہر پر محمول کرنے سے کوئی مانع نہ ہو تو اس کو اس کے ظاہر پر محمول کیا جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ اس دن (میدانِ حشر میں) اللہ تعالیٰ کا عدل وانصاف اس حد تک کارفرما ہوگا کہ آدمیوں کے حقوق کا بدلہ تو لیا ہی جائے گا لیکن حیوانات کہ جن کو انسان کی طرح مکلف قرار نہیں دیا گیا ہے ان سے بھی حق تلفی کا بدلہ لیا جائے گا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ قصاص یعنی بدلہ (جس کا ذکر مذکورہ بالا حدیث میں ہے) اس طرح کا قصاص نہیں ہے جو مکلف سے لیا جاتا ہے بلکہ اس سے مقابلہ کا قصاص مراد ہے۔ اھ۔ اس کو مقابلہ کا قصاص قرار دینا محل نظر ہے یعنی اشکال واقع ہوسکتا ہے کہ حیوان مکلف نہیں ہوتا لہٰذا اس سے قصاص کس طرح لیا جائے گا؟ اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ " فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ " ہے اس اعتبار سے وہ اپنی مرضی کا مالک اور اپنے ہر فعل پر قادر ومختار ہے لہٰذا ولا يسأل عما يفعل یعنی وہ جو کچھ کرے گا اور جس طرح کرے گا اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں بکری سے قصاص لئے جانے کا ذکر درحقیقت بندوں کو اس امر سے آگاہ کرنے کے لئے ہے کہ کسی کا کوئی حق ضائع نہیں ہوگا بلکہ جو بھی شخص جس شخص کا حق مارے گا اور اس کے ساتھ ظلم کرے گا اس سے اس حق تلفی اور ظلم کا ... اور مظلوم کو ضرور دلایا جائے گا۔ اور

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ دوسری تاویل زیادہ قابل فہم انتہائی مستحسن ہے۔لیکن ''حکمت'' کی جگہ لفظ ''غرض'' کی تعبیر غیر موقع محل میں ہے۔ساری مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ قضیہ دلالت کرتا ہے، کہ تمام مکلفین کے درمیان بطریق مبالغہ کمال عدل ہوگا۔چونکہ جب حیوانات کہ جو غیر مکلف ہیں ان کے درمیان کا معاملہ یہ ہے تو ذوی العقول میں ہے، وضیع وشریف اور قوی وضعیف کے درمیان انصاف کا کیا عالم ہوگا۔

تخریج: الجامع کی روایت میں ''تنطحها'' کا اضافہ ہے۔اس حدیث کو امام احمد، مسلم اور امام بخاری نے ''الادب المفرد'' میں اور امام ترمذی نے ذکر کیا ہے۔حدیث جابرؓ کے الفاظ یہ ہیں: **اتقوا الظلم فان الظلم ظلمات یوم القیامة، واتقوا الشح فان الشح أهلك من كان قبلكم حملهم على أن يسفكوا دماء هم واستحلوا محارمهم** مؤلفؒ نے اس حدیث کو اگر تکرار کے باعث ساقط کیا ہے، تو یہ اعتذار احسن ہے۔اور اگر حدیث کو اس باب میں اس لئے ذکر کیا ہے، کہ وہ اس باب سے زیادہ مناسبت رکھتی تھی۔تو یہ اعتراض بے موقع محل ہے۔فتأمل۔

الفصل الثانی:

زیادتی والے پر ظلم نہ کریں

۵۱۲۹: عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَكُوْنُوْا اِمَّعَةً تَقُوْلُوْنَ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَحْسَنَّا وَاِنْ ظَلَمُوْا ظَلَمْنَا وَلٰكِنْ وَطِّنُوْا اَنْفُسَكُمْ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَنْ تُحْسِنُوْا وَاِنْ اَسَآءُوْا فَلَا تَظْلِمُوْا۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٤ / ٣٢٠ الحديث رقم ٢٠٠٧۔

ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگوں کی نقل کرتے ہوئے مت کہو کہ اگر لوگوں نے بھلائی کی تو ہم بھلائی کریں گے اپنے آپ کو اس پر آمادہ نہ کرو کہ اگر لوگوں نے ظلم کیا تو ہم بھی ظلم کریں گے اپنے آپ کو اس پر آمادہ کرو کہ اگر لوگوں نے احسان کیا تو ہم احسان کریں گے اور اگر وہ برائی کریں گے تو ہم ظلم نہ کریں گے۔(ترمذی)

تشریح: امعة: ہمزہ کے کسرہ اور میم مشددہ کے ساتھ ہے 'یاء برائے مبالغہ ہے اور ہمزہ اصلی ہے یہ کلمہ عورتوں کیلئے مستعمل نہیں ہوتا ہے۔چنانچہ'' امرأة امعة ''نہیں کہا جاتا۔(کذا فی النہایۃ)

صاحب ''الفائق'' فرماتے ہیں: '' امعة'' اس شخص کو کہتے ہیں جو ہر کسی کے پیچھے چل پڑے اور ہر ایک سے کہے: أنا معك، چونکہ اس کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی کہ جس کی طرف وہ رجوع کر سکے۔اس کا وزن ہے'' فعلة '' جس طرح دیمة ہے، اس کے ہمزہ کو زائدہ کہنا درست نہیں چونکہ صفات میں سے کوئی بھی صفت'' فعلة'' کے وزن پر نہیں آتی اور اسماء میں یہ وزن قلیل ہے۔اس سے مراد وہ مقلد ہے جو اپنے دین کو دوسرے کے دین کے تابع بنادے بلا رؤیت اور بلا تحصیل برہان کے اھ۔

اس میں اشارہ ہے کہ تقلید مجرد نہیں کرنی چاہئے، حتی کہ اخلاق میں بھی، چہ جائیکہ اعتقادات وعبادات میں تقلید محض کی

جائے۔ اظہر یہ ہے کہ یہ کلمہ صفت یا اسم کے طور پر موضوع نہیں ہے' بلکہ دو کلموں سے مرکب ہے "أنا" اور "معك" سے۔ اس کی نظیر "بسمله" اور "حيعلة" اور ان جیسے کلمات ہیں۔

صاحب قاموس لکھتے ہیں: الامع كهلع وهلعة ويفتحان، الرجل يتابع كل واحد على رأيه لا يثبت على شيء، ومتبع الناس الى الطعام من غير ان يدعى، والمحقب الناس دينه والمتردد فى غير ضعة، ومن يقول: "أنا مع الناس"، قدلا يقال:" امرأة امعة" أوقد يقال: وتأمع واستأمع صار امعة۔

ایک شارح لکھتے ہیں: الأمع والأمعة عند أهل اللغة الرجل الذى يكون لضعف رأيه مع كل أحد، والمرادهنا من يكون مع ما يوافق هواه، ويلائم أدب نفسه وما يتنماه۔

بظاہر لفظ أمعه مفرد وغیر مفرد ہر دو کیلئے مستعمل ہے۔

قوله: يقولون ان أحسن الناس الخ: یہ جملہ "أمعة" کے لئے بیان وتفسیر ہے، چونکہ اگلے جملہ کا مطلب یہ ہے: ان ظلموا أنا مقلد الناس فى احسانهم وظلمهم ومقتصى أثرهم

قوله: ولكن وطنوا أنفسكم: توطین مصدر سے امر کا صیغہ ہے، کسی کام کا عزم کرنا۔ اساس البلاغۃ میں لکھتے ہیں: أوطن الأرض ووطنها واستوطنها ومن المجاز وطنت نفسي على كذا فتوطنت قال:

ولا خير فمن لا يوطن نفسه
على نائبات الدهر حين تنوب

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اپنے نفوس پر احسان کو لازم پکڑو، بایں طور کہ اپنے نفوس کو احسان کا عادی بنالو۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس تقدیر پر" أن تحسنوا"، وطنوا کے متعلق ہوگا اور جواب شرط محذوف ہے۔ جس پر" أن تحسنوا " دلالت کررہا ہے۔ اور تقدیری عبارت یوں ہے: وطنوا أنفسكم على الاحسان' ان أحسن ا لناس فأحسنوا، وان أساؤا فلا تظلموا "چونکہ عدم ظلم" احسان" ہے

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہاں حدیث میں اس لفظ سے وہ شخص مراد ہے جو یہ کہے کہ لوگ جیسا سلوک میرے ساتھ کریں گے ویسا ہی سلوک میں بھی ان کے ساتھ کروں گا' اگر وہ میرے ساتھ بھلائی کریں گے تو میں بھی ان کے ساتھ بھلائی کروں گا اور اگر وہ میرے ساتھ برائی کریں گے تو میں بھی ان کے ساتھ برائی کروں گا۔ میں (ملاعلی قاری) کہتا ہوں۔ یہاں یہی معنی مراد لینا متعین ہے' جیسا کہ "تقولون" اس پر دلالت کررہا ہے۔ صاحب مظاہر حق لکھتے ہیں: بھلائی کا بدلہ بھلائی تو ہے ہی لیکن برائی کا بدلہ بھی بھلائی ہی کو قرار دو! جو شخص تمہارے ساتھ برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلائی کرکے گویا اس کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو کیونکہ انتقاماً بھی ظلم اور برائی کی راہ کو ترک کرنا احسان ہے! لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ" اگر لوگ برائی کریں تو تم ان کے ساتھ ظلم نہ کرو" سے یہ مراد ہو: ① اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ برائی کرے تو تم اس کے مقابلہ میں حد سے تجاوز نہ کرو بلکہ اعتدال کی حد میں رہتے ہوئے اس سے بدلہ لو جیسا کہ مشروع ہے ② برائی کرنے والوں سے بدلہ لینے ہی پر اپنے آپ کو پابند نہ بناؤ بلکہ ان کے ساتھ عفو ودرگزر کا معاملہ بھی کرو ③ برائی کا بدلہ بھلائی کو قرار دے کر برائی کرنے والے کے

ساتھ احسان کرو۔ پہلی صورت کو عام مسلمانوں کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے۔ دوسری صورت کا تعلق ان مسلمانوں سے ہے جن کا شمار خواص میں ہوتا ہے۔ تیسری صورت سب سے اعلیٰ درجہ ہے ان مسلمانوں سے متعلق ہے جن کو "اخص الخواص" کہا جاتا ہے۔

شیخ علی متقی نے ایک رسالہ میں بڑی عارفانہ بات کہی ہے: "دنیا اور آخرت کی محبت کو پہنچانے کا معیار یہ چار چیزیں ہیں:

① جس شخص پر دنیا کی محبت غالب ہوتی ہے وہ لوگوں کو بلا وجہ ایذا پہنچاتا ہے۔

② جو شخص دنیا کی محبت میں اس درجہ مبتلا نہیں ہوتا وہ کسی کو ایذا پہنچانے میں ابتدا نہیں کرتا' البتہ جب کوئی شخص اس کو ایذا پہنچاتا ہے تو وہ حد سے تجاوز کئے بغیر اس کو اسی قدر ایذا پہنچاتا ہے جس کو شریعت نے بدلہ کے طور پر جائز رکھا ہے۔

③ جس شخص کی آخرت کی محبت قوی ہوتی ہے اور دنیا کی محبت ضعیف تو وہ ظلم کے مقابلہ میں عفو و درگزر کرتا ہے۔

④ جس شخص کی آخرت کی محبت بہت زیادہ قوی ہوتی ہے وہ ظلم کے مقابلہ پر احسان کرتا ہے۔

اور یہ وہ درجہ ہے جو صدیقین اور مقربین کو حاصل ہوتا ہے"۔ (انتھی)

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی وصیت

۵۱۳۰: وَعَنْ مُعَاوِيَةَ اَنَّهٗ كَتَبَ اِلٰى عَائِشَةَ اَنِ اكْتُبِىْ اِلَىَّ كِتَابًا تُوْصِيْنِىْ فِيْهِ وَلَا تُكْثِرِىْ فَكَتَبَتْ سَلَامٌ عَلَيْكَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّىْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنِ الْتَمَسَ رِضَى اللّٰهِ بِسَخَطِ النَّاسِ كَفَاهُ اللّٰهُ مُؤْنَةَ النَّاسِ وَمَنِ الْتَمَسَ رِضَى النَّاسِ بِسَخَطِ اللّٰهِ وَكَّلَهُ اللّٰهُ اِلَى النَّاسِ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٤/ ٥٢٧ الحديث رقم ٢٤١٤۔

ترجمہ: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق وارد ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ کو خط لکھا کہ مجھے کچھ وصیت تحریر فرمائیں مگر وہ طویل نہ ہو انہوں نے سلام کے بعد لکھا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا لوگوں کی ناراضگی میں تلاش کرے اللہ تعالیٰ اس سے کفایت فرمائے گا اور اسے لوگوں کی تکلیف سے محفوظ کر دے گا اور جو لوگوں کی رضا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی پر تلاش کرے گا اللہ تعالیٰ اسے لوگوں کے سپرد کر دے گا۔ واللہ اعلم۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: ان اكتبي الى كتابا توصيني فيه ولا تكثري:

أن اكتبي: "ان" مصدریہ ہے، یا مفسرہ ہے۔ چونکہ "كتابة" میں "قول" کے معنی ہیں۔ "الی": "مرسلاً" یا "موصولاً" کے متعلق ہو کر حال ہے، یا "كتابا توصيني فيه" کے متعلق ہے۔

یعنی کلام میں اطناب نہ ہو بلکہ کلام موجز ہو، جامع ہو فصل الخطاب کا نمونہ ہو چونکہ آپ ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں، کہ جو گھر "جوامع الکلم" اور "بدائع الکلم" والے صاحب کا ہے۔

قوله: ومن التمس رضى الناس بسخط الله وكله الى الناس:

وكله الله: کاف کی تخفیف کے ساتھ ہے۔ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: وكلت أمرى الى فلان اى: ألجأته اليه

واعتمدت فيه عليه

مظہرؒ کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی خفگی و ناراضگی سے بے پرواہ ہو کر لوگوں ہی کی رضامندی و خوشنودی کو ترجیح دیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی اس سے بے پرواہ ہو جاتا ہے اور اس کے امور کو لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے' یہی نہیں کہ اس کے ان امور میں اس کی مدد نہیں کرتا اور دوسروں کے شر و فتنہ سے اس کو محفوظ نہیں رکھتا بلکہ لوگوں کو اس پر مسلط کر دیتا ہے جو اس کو ایذا پہنچاتے ہیں اور اس پر ظلم و ستم کرتے ہیں۔ حاصل یہ کہ بندوں کے حق میں اصل چیز رضائے مولیٰ ہے' اگر خدا راضی و خوش ہے تو مخلوق خدا بھی راضی و مطیع ہو جائے' اور اگر رضائے مولیٰ پر نظر نہ ہو تو پھر نہ خدا راضی و خوش ہوتا ہے اور نہ مخلوق خدا راضی و خوش ہوتی ہے۔

قوله: والسلام عليك:

اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ خط کے شروع میں بھی سلام لکھا جائے اور آخر میں بھی۔

ان دو سلاموں کے بارے میں کئی احتمال ہیں:

اولیٰ: شروع کا سلام تو ملاقات کے سلام کا درجہ رکھتا ہے اور آخر کا سلام رخصت کے سلام کا قائم مقام ہوتا ہے۔

ثانی: گویا کہ ان کے سلام کا مطلب یہ ہے کہ تم پر سلامتی ہو اولاً بھی آخراً بھی۔

ثالث: تم پر دنیا میں بھی سلامتی ہو اور آخرت میں بھی۔

تکرار سلام میں خفیہ اشارہ ہے کہ طلب سلامت کی تاکید اور مفضی الی الملامۃ کے ترک کی طرف۔

الفصل الثالث:

بڑا ظلم شرک ہے

۵۱۳۱: عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ شَقَّ ذٰلِكَ عَلٰى اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّنَا لَمْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ ذَاكَ اِنَّمَا هُوَالشِّرْكُ اَلَمْ تَسْمَعُوْا قَوْلَ لُقْمَانَ لِاِبْنِهٖ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ وَاِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (وفی روایۃ) لَيْسَ هُوَ كَمَا تَظُنُّوْنَ اِنَّمَا هُوَ كَمَا قَالَ لُقْمَانُ لِاِبْنِهٖ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢٩٤/٨ الحديث رقم ٤٦٢٩، وأخرجه مسلم في ١١٤/١ الحديث رقم (١٩٧-١٢٤)

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ...... نازل ہوئی تو جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں ظلم کی ملاوٹ نہ کی تو اس آیت کا نزول صحابہ کرامؓ پر گراں ہوا۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے اوپر ظلم نہ کیا ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم نے

لقمان کا وہ قول نہیں سنا جو انہوں نے فرمایا تھا۔'' اے بیٹے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک مت بنا ؤ یقیناً شرک ظلم عظیم ہے دوسری روایت ہے تم نے جو سمجھا وہ مراد نہیں اس سے مراد وہ ہے جو لقمان نے اپنے بیٹے کو فرمایا۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: نزلت: مؤنث کا صیغہ لایا گیا چونکہ اس کا فاعل مابعد آیت ہے۔ اور تقدیری عبارت یوں ہے: لما نزلت الآية: ﴿الذين آمنوا ولم يلبسوا﴾

يلبس: یاء کے فتحہ اور کسرہ ہر دو کے ساتھ درست ہے۔

لاتشرك بالله: اس کا مطلب ہے: لتخلط الاشراك بالايمان بالله وسائر ما يحب الايمان به

جب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ نے ''ظلم'' کو ''گناہ'' پر حمل کیا یعنی وہ سمجھے کہ اس آیت میں جن مؤمنین کو مامون اور ہدایت یافتہ قرار دیا گیا ہے ان سے وہی مؤمنین مراد ہیں جن کے اعمال' گناہ و معصیت کی آمیزش سے بالکل پاک و صاف ہوں' چنانچہ وہ اپنے گمان کے مطابق اس آیت کریمہ کے نزول سے بہت پریشان ہوئے اور حضور سے عرض کیا کہ اس آیت کی روشنی میں تو ہم میں سے شاید ہی کوئی مؤمن ہدایت یافتہ اور مامون قرار پائے کیونکہ ہم میں سے ایسا کون شخص ہے' جس سے کبھی معصیت و گناہ صادر نہ ہوا ہو! تب رسول کریم ﷺ نے صحابہؓ کے سامنے واضح فرمایا کہ اس آیت میں ''ظلم'' سے مراد ''گناہ'' نہیں ہے جیسا کہ تم نے گمان کیا ہے بلکہ ''شرک'' مراد ہے۔

اگر یہ اشکال واقع ہو کہ ایمان کے ساتھ شرک کا مخلوط ہونا کیونکر ممکن ہے کیونکہ ایمان شرک کی ضد ہے' البتہ ایمان کے ساتھ گناہ کا مخلوط ہونا سمجھ میں آنے والی بات ہے اور اسی وجہ سے صحابہؓ کا ذہن اس طرف گیا تھا کہ ''ظلم'' سے مراد گناہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ ایمان کے ساتھ شرک کا مخلوط ہونا واقع کے اعتبار سے صحیح ہے' اس کی مثال مشرکین مکہ تھے' جو اگرچہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی بت پرستی بھی کرتے۔

واضح رہے کہ ''شرک'' کی دو قسمیں ہیں:

ایک تو شرك في الربوبية یعنی عبادت و تعظیم میں اور کسی کو بھی خدا قرار دینا۔ دوسرے شرک في الالوهية یعنی عبادت و تعظیم اور اللہ کی صفات خاص جیسے خالقیت' رزاقیت اور حاجت براری وغیرہ میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا' چنانچہ حدیث میں جس شرک کو ظلم کا محمول قرار دیا گیا ہے اس سے وہ شرک مراد ہے جس کا تعلق دوسری قسم سے ہو اس بات کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے: [وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ] (اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں اور شرک بھی کرتے جاتے ہیں۔)

بعض کا کہنا ہے کہ ایمان کے ساتھ ظلم یعنی شرک کو ملانے سے یہ مراد ہے کہ زبان سے تو ایمان کا اقرار کیا جائے اور دل میں شرک ہو۔

قوله: إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ] [لقمان۔۱۳] استیناف تعلیل ہے' جس کی مراد اس بات کو واضح کرنا ہے کہ شرک ایسا گناہ ہے جو ایمان کو سرے سے ختم کر دیتا ہے' گویا ایمان اور شرک کسی بھی حال میں جمع نہیں ہو سکتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: [وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ] اس کے برخلاف اور تمام گناہ اس درجہ کے نہیں ہیں کہ وہ ایمان کے منافی ہوں' چنانچہ

تمام اہل سنت والجماعت کا یہی مسلک ہے (کہ کفر وشرک کے علاوہ اور کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو ایمان کو سرے سے ختم کر دے) بخلاف معتزلہ' خوارج اور دیگر اہل بدعت کے (کہ وہ ہر گناہ کبیرہ کو ایمان کے منافی سمجھتے ہیں لہٰذا جب مذکورہ آیت نازل ہوئی تو) صحابہؓ نے پہلے یہ ہی سمجھا تھا کہ اس آیت میں جن لوگوں کو مؤمن و ہدایت یافتہ قرار دیا گیا ہے ان سے وہی لوگ مراد ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کو گناہ سے ملوث نہیں کیا ہے کیونکہ شرک کا ایمان کے ساتھ مخلوط ہونا سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان پر واضح فرمایا کہ بعض صورتوں میں ایمان کے ساتھ شرک کا ملنا ممکن ہے جیسے کوئی شخص اللہ پر ایمان لائے اور اس کی عبادت میں غیر اللہ کو شریک کرے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آیت میں ایمان باللہ کا مفہوم اسی وقت پورا ہوتا ہے اس سے اس کے لغوی معنی مراد ہوں نہ کہ شرعی معنی کیونکہ شرعی نقطہ نظر سے ایمان تمام صفات کمالیہ کو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرنے اور اس کی ذات کو تمام نقصان وعیوب سے پاک قرار دینے پر مشتمل ہے' ورنہ (آیت میں لفظ ایمان کو اس کے لغوی معنی پر محمول قرار دینے کی صورت میں) یہ لازم آئے گا کہ حقیقت کے اعتبار سے تمام مشرکین وکفار ایمان رکھنے والے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: [وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ......] لیکن ظاہر ہے کہ شریعت میں اس طرح کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے اصل ایمان وہی ہے جو اللہ کی ذات کے اعتراف واقرار کے ساتھ اس کی صفاتِ خاص اور عبادت میں کسی کو شریک قرار نہ دینے پر مشتمل ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کسی ایسے فعل وعمل کی بھی اجازت نہیں دی ہے جس سے ظاہراً اور صورۃً ہی شرک کا ارتکاب ہوتا ہو جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنَا اَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ۔

بدترین آدمی وہ ہے جو دوسروں کی دُنیا کے بدلے اپنی آخرت برباد کرے

۵۱۳۲: وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنْ شَرِّ النَّاسِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَبْدٌ اَذْهَبَ اٰخِرَتَهٗ بِدُنْيَا غَيْرِهٖ۔ (رواه ابن ماجة)

أخرجه بن ماجه في السنن ۲/ ۱۳۱۲ الحديث رقم ۳۹۶۶۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن بدترین وہ شخص ہے جو دوسروں کی دنیا کی خاطر اپنی آخرت برباد کر لے۔ (ابن ماجہ)

تشریح: قوله: قال: من شر الناس منزلة

الجامع کی روایت میں "أن" کی زیادتی ہے جو برائے تاکید ہے۔ (ای قال: ان من شر الناس)

منزلۃ: ایک نسخہ میں "عند اللہ" ہے۔

"یوم القیامه": یہ قید اس لئے لگائی کہ اصل معاملہ تو اسی دن ظاہر ہو گا۔

تخریج: اس حدیث کو امام طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔

صاحب مظاہر لکھتے ہیں: "مطلب یہ ہے کہ یوں تو خود اپنی خاطر آخرت کے مفاد کو دنیا کے مفاد پر ترجیح دینا نہایت سنگین ۔۔۔ ہے لیکن یہ برائی اس وقت کہیں زیادہ سخت اور بدترین ہو جاتی ہے جب کسی دوسرے کے لئے ۔۔۔ کو حاصل کرے اور اس کی وجہ

سے لوگوں پر ظلم کر کے اپنی آخرت کو ضائع کر دے جیسا کہ بعض ناعاقبت اندیش اور مفاد پرست لوگ ظالموں اور بدکاروں کی مدد واعانت کرتے ہیں۔"

تین دفاتر کا الگ حساب

۵۱۳۳: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الدَّوَاوِيْنُ ثَلٰثَةٌ دِيْوَانٌ لَّايَغْفِرُ اللّٰهُ اَلْاِ شْرَاكُ بِاللّٰهِ يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِنَّ اللّٰهَ لَايَغْفِرُاَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَدِيْوَانٌ لَا يَتْرُكُهُ اللّٰهُ ظُلْمُ الْعِبَادِ فِيْمَا بَيْنَهُمْ حَتّٰى يَقْتَصَّ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ وَدِيْوَانٌ لَايَعْبَأُ اللّٰهُ بِهٖ ظُلْمُ الْعِبَادِ فِيْمَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ اللّٰهِ فَذَاكَ اِلَى اللّٰهِ اِنْ شَآءَ عَذَّبَهٗ وَاِنْ شَآءَ تَجَاوَزَ عَنْهُ۔

أخرجه احمد في المسند ٦/ ٢٤٠، والبيهقي في شعب الايمان ٦/ ٥٢ الحديث رقم ٧٤٧٣۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دفاتر ورجسٹر تین ایک وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ معاف نہ کرے گا وہ شریک باری بنانا ہے۔ ایک دفتر وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ چھوڑے گا نہیں وہ بندوں کا آپس میں ظلم و زیادتی کرنا ہے یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے بدلہ لے لے۔ ایک دفتر ایسا ہے جس کی اللہ تعالیٰ پروانہیں کرتے وہ ظلم ہے جو بندوں کا اپنے اور رب کے درمیان ہے اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے خواہ وہ معاف کرے خواہ وہ عذاب دے۔ (بیہقی)

تشریح: قوله: الدواوين ثلاثة:

الدواوین: صاحب مغرب لکھتے ہیں: الديوان الجريدة من دون الكتب اذا جمعها لأنها قطع من القراطيس مجموعة

لا يعبأ: بائے موحدہ کے فتحہ اور ہمزہ کے ساتھ بمعنی لا يبالي يہ "العب" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے "الثقل" اس لفظ کی تفصیلی تحقیق ماقبل میں گزر چکی ہے۔

حتی يقصه: جار مجرور "لایترکه" کے متعلق ہے اور ایک صحیح نسخہ میں "حتی يقتص" ہے۔

صاحب مظاہر لکھتے ہیں: "اس حدیث سے یہ واضح ہوا کہ دنیا میں بندے جن برائیوں اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں ان میں سے جن کا تعلق حقوق العباد سے ہوگا جیسے کسی نے کسی پر ظلم کیا ہوگا، کسی کا حق مارا ہوگا کسی کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچایا ہوگا وغیرہ وغیرہ تو آخرت میں ان گناہوں پر ہر حالت میں مواخذہ ہوگا اور اس مواخذہ سے کسی کو نجات نہیں ملے گی، اسی طرح جن برائیوں اور گناہوں کا تعلق حقوق اللہ سے ہوگا ان میں شرک کا گناہ بخشش و معافی کے قابل نہیں ہوگا البتہ شرک کے علاوہ اور تمام گناہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہوں گے کہ چاہے وہ ان گناہوں پر عذاب دے اور چاہے اپنے فضل و کرم سے بخش دے۔"

عرضِ مرتب:

باقی حدیث: ۵۱۳۶ میں ذکر ہو رہا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: پہلے جملہ میں "لا یغفر" فرمانا، اس بات پر دلالت کرتا ہے، کہ شرک کی قطعاً معافی نہیں ہے۔ اور دوسرے جملہ میں "لا یشرك" فرمانا، اس بات کی اطلاع ہے کہ غیر کے حق کو مہمل قطعاً نہیں قرار دیا جائے گا۔ یا تو اس کے دشمن سے قصاص لیا جائے گا، یا اللہ تعالیٰ اس کو راضی فرمائیں گے، اور تیسرے جملہ میں "لا یعبأ" فرمانا اشارہ ہے کہ حقوق اللہ میں مساہلت ہے وہ اپنے حق از روئے کرم ولطف چھوڑ سکتا ہے۔

قولہ: فذاك الی الله: ان شاء عذبه وان شاء تجاوز عنه:

فذاك. اصول معتمدہ میں یہ لفظ الف کے ساتھ ہے لام کے بغیر ہے۔ اور اس سے حق عبد کے قرب کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ (اور جار مجرور کا متعلق محذوف ہے۔) ای مفوض الی مشیئة الله۔

مظلوم کی بددعا سے بچو

۵۱۳۴: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِيَّاكَ وَدَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّمَا يَسْاَلُ اللّٰهُ تَعَالٰى حَقَّهٗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَايَمْنَعُ ذَاحَقٍّ حَقَّهٗ۔

أخرجه احمد في المسند ٢/ ٣٤٣، والبيهقي في شعب الايمان ٦/ ٤٩ الحديث رقم ٧٤٧٤۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مظلوم کی بددعا سے بچو وہ اللہ تعالیٰ سے اپنا حق مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی صاحب حق کا حق نہیں روکتے۔ (بیہقی)

تشریح: اور سوال سے مراد سوال محاسبہ ومطالبہ ہے۔

ظالم کو مضبوط کرنے والا

۵۱۳۵: وَعَنْ اَوْسِ بْنِ شُرَحْبِيْلَ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ مَشٰى مَعَ ظَالِمٍ لِيُقَوِّيَهٗ هُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْاِسْلَامِ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/ ١٢٢ الحديث رقم ٧٦٧٥۔

ترجمہ: حضرت اوس بن شرحبیل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا جو شخص کسی ظالم کا ساتھ اس لئے دیتا ہے تاکہ وہ اسے مضبوط کرے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ (بیہقی)

راویٔ حدیث:

اوس بن شرحبیل۔ صحابی ہیں مؤلف علیہ الرحمۃ نے "الاکمال" میں ان کا اسم گرامی ذکر نہیں کیا۔ "شرحبیل" میں شین

معجمہ مضموم' راء مہملہ مفتوح ''حا'' مہملہ ساکن' اور بائے موحدہ مکسور اور آخر میں لام ہے مغنی میں ہے کہ ''شرحبیل'' غیر منصرف ہے۔

تشریح: لیقویه: الجامع کی روایت میں لیقویہ کی بجائے'' لیعینه" کے الفاظ ہیں۔

قوله: فقد خرج من الاسلام: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: اول: یعنی وہ کمال ایمان سے محروم ہو جاتا ہے دوم: اسلام کی حقیقت سے خارج ہو جاتا ہے، چونکہ اسلام کا تقاضا تو یہ ہے: ان یسلم المسلمون من لسانه ویده

ظالم کے ظلم کی نحوست سے حباریٰ اپنے گھونسلے میں مرجاتا ہے

۵۱۳۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّهٗ سَمِعَ رَجُلاً یَقُوْلُ اِنَّ الظَّالِمَ لَا یَضُرُّ اِلاَّ نَفْسَهٗ فَقَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ بَلٰی وَاللّٰهِ حَتّٰی الْحُبَارٰی لَتَمُوْتُ فِیْ وَکْرِهَا هُزْلاً بِظُلْمِ الظَّالِمِ۔ (رواه البيهقى والاحاديث الاربعة فى شعب الايمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/٥٤ الحديث رقم ٧٦٧٩۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کسی شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ظالم اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچاتا ہے آپ نے فرمایا کیوں نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قسم ظالم کے ظلم کی وجہ سے حباری بھی اپنے گھونسلے میں کمزوری کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔ چاروں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان الظالم لا يضر الا نفسه: اس قائل کی یہ بات بالکل درست تھی۔ اور ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق ہے: ﴿ولکن کانوا أنفسهم يظلمون﴾ [اور ایک دوسری آیت میں ہے: ﴿من عمل صالحا فلنفسه ومن أساء فعليها﴾

قوله: فقال ابوهريرة: بلى والله حتى الحبارى لتموت فى وكرها هزلا لظلم الظالم: لیکن اللہ تعالیٰ بکثرت عفو و درگزر کا معاملہ ہی فرماتے ہیں، چنانچہ بہت سے لوگوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن مظلوم کا حق نہیں چھوڑتے۔ اس ارشاد باری تعالیٰ میں اسی طرح اشارہ ہے:

﴿وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَیْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ یُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ [النحل: ٦١] "اور اگر خدا لوگوں کو ان کے ظلم کے سبب پکڑنے لگے تو ایک جاندار کو زمین پر نہ چھوڑے لیکن ان کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیئے جاتا ہے۔ جب وہ وقت آ جاتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے رہ سکتے ہیں نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔"

امام طیبی فرماتے ہیں: '' بلی'' ماقبل کے ایجاب کیلئے آیا ہے۔ یہاں کلام مثبت کے جواب میں واقع ہوا ہے۔ چنانچہ '' لا یضر الا نفسه '' کا مطلب ہے'' لا یضر غیره'' چنانچہ جواب میں ارشاد فرمایا: بلی یضر غیره حتی یضر الحباری

الحباری: حائے مہملہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ مشہور پرندہ ہے۔

هزلا: حاء کے ضمہ اور زاء معجمہ کے سکون کے ساتھ ''سمن'' کی ضد ہے۔

لظلم الظالم: لام اجلیہ ہے۔ای لاجل ظلمه

تخریج: آخری حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے موقوفاً مروی ہے۔پہلی حدیث کو امام احمد نے، اور حاکم نے اپنی مستدرک میں ان الفاظ سے نقل کیا ہے:

الدواوين ثلاثة: فديوان لا يغفر الله منه شيئا، وديوان لا يعبأ الله به شيئا وديوان لا يترك الله منه شيئا، أما الديوان الذى لا يغفر الله منه شيًا فالاشراك بالله، وأما الديوان الذى لا يعبأ الله له شيئا فظلم العبد نفسه فيما بينه وبين ربه من صوم يوم تركه او صلاة تركها فان الله يغفر ذلك ان شاء ويتجاوز، وأما الديوان الذى لا يترك الله منه شيئا فظالم للعباد بينهم القصاص لا محالة

دوسری حدیث کو سمویہ نے حضرت انسؓ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

اياك ودعوة المظلوم، وان كانت من كافر، فانه ليس لها حجاب دون الله عز وجل

اس حدیث کو امام احمد اور ابو یعلی نے اپنی اپنی مسند میں، اور ضیاء نے حضرت انسؓ سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

اتقوا دعوة المظلوم وان كان كافرا، فانه ليس مادون دعائه حجاب

اس حدیث کو امام حاکم نے ابن عمرؓ سے بایں الفاظ نقل کیا ہے:

اتقوا دعوة المظلوم، فانها تصعد الى السماء كأنها شرارة

اس حدیث کو طبرانی اور ضیاء نے حضرت خزیمہ بن ثابت سے یوں نقل کیا ہے:

اتقوا دعوة المظلوم فانها تحمل على الغمام ثم يقول الله: وعزتي وجلالي لأ نصرنك ولو بعد حين

تیسری حدیث کو امام طبرانی نے اور ضیاء نے اوس بن شرحبیل سے بھی روایت کیا ہے۔

بَابُ الْاَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ

امر بالمعروف (بھلائی) کا بیان

مؤلف کو ترجمۃ الباب یوں قائم کرنا چاہئے تھا: **باب الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر** ممکن ہے، کہ مؤلفؒ نے اس طرز کو اس وجہ سے اختیار نہ کیا ہو کہ ''امر بالمعروف'' نہی عن المنکر کو بھی شامل ہے یا یہ اسلوب از باب اکتفاء ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے: ﴿**سرابيل تقيكم الحر**﴾ [النحل۔۸۱] **أى والبرد۔**

''معروف'' اصل میں ''معرفت'' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پہچاننا' حقیقت کو پالینا۔ یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ وہ چیزیں جن کو شریعت کے ذریعہ پہچانا گیا ہے اور جن کو اختیار کرنے کا حکم شریعت نے دیا ہے۔

''معروف'' کے مقابلہ پر ''منکر'' ہے یعنی وہ چیزیں جن کا شریعت سے کوئی واسطہ نہ ہو اور ان کو اختیار کرنے سے شریعت نے باز رکھا ہو۔

واضح رہے کہ ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' تعلیمات اسلامی کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں لوگوں کو بھلائیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا! چنانچہ اس باب میں اسی مضمون سے متعلق احادیث نقل ہوں گی۔

الفصل الاوّل:

برائی سے روکنے کے درجات

۵۱۳۷: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ رَّاٰی مِنْكُمْ مُّنْكَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٦٩١ حديث رقم (٧٨-٤٩) و ابوداوٗد في السنن ٥١١/٤ حديث رقم ٤٣٤٠، والترمذي في السنن ٤٠٨/٤ حديث رقم ٢١٧٢، والنسائي في السنن ١١١/٨ حديث رقم ٥٠٠٨، واحمد في المسند ٢٠/٣۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: جو شخص تم میں سے کسی برائی کو دیکھے تو وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدلے اگر یہ طاقت نہ ہو تو زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے (نفرت کرے) اور یہ ایمان کا

سب سے کمزور درجہ ہے۔ (مسلم)

تشریح: یہ خطاب اصل میں تو صحابہ کرامؓ سے ہے اور امت کے دیگر افراد کو تبعاً ہے۔ اور ''من'' تبعیضہ لانے میں اشارہ ہے کہ یہ کام فرض کفایہ میں سے ہے اور اشارہ ہے کہ اس کام کو صرف وہی بجالائے جو مراتب احسان اور تفاوت منکرات کی معرفت رکھتا ہو متفق علیہ اور مختلف فیہ میں تمیز کر سکتا ہو۔

اس حدیث کا مفہوم اس آیت مبارکہ سے ماخوذ ہے: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۰۴] اور دوسری جگہ یوں فرمایا گیا ہے: ﴿وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ﴾ [آل عمران: ۱۱۴] برائیوں کے پھیلنے سے روکنے اور ان کا قلع قمع کرنے کی جو ذمہ داری اہل ایمان پر عائد ہوتی ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کے تین درجے بیان کئے گئے ہیں: پہلا درجہ یہ ہے کہ ہر برائی کا سر طاقت کے ذریعہ کچل دیا جائے بشرطیکہ اس طرح کی طاقت میسر ہو اور اگر یہ طاقت حاصل نہ ہو تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس برائی کا فریضہ زبان کے ذریعہ ادا کیا جائے اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ اگر زبان کے ذریعہ بھی کسی برائی کی مذمت کرنے اور اس کو ختم کرنے کی ہمت نہ ہو تو پھر دل سے اس فریضہ کو انجام دیا جائے۔ یعنی کسی خلاف شرع امر کو دیکھ کر اسے دل سے برا جانے' اس درجہ کو ایمان کا سب سے کمزور درجہ قرار دیا گیا ہے اس کے متعدد مطالب ہوتے ہیں:

جب اہل ایمان اس درجہ کمزور ہو جائیں کہ وہ کسی برائی کو مٹانے کے لئے ہاتھ اور زبان کی طاقت سے محروم ہوں تو سمجھا جائے کہ اگر اہل ایمان طاقتور ہوتے تو وہ کسی برائی کو اپنی قولی و فعلی طاقت کے ذریعہ مٹانے کے بجائے محض قلبی نفرت پر اکتفا نہ کرتے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی برائی کو محض قلبی طور پر برا جاننے پر اکتفا کرتا ہے اگر یہ دین میں متصلب ہوتا تو فقط اس پر اکتفاء نہ کرتا۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے: افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر ''بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا ہے'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: [وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ] [المائدة_٥٤] اور ان کو کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں ہوتا۔

ہمارے بعض علماء نے فرمایا ہے کہ حدیث میں پہلے حکم (یعنی برائی کو ہاتھ کے ذریعہ مٹانے) کا تعلق امراء سے ہے (یعنی بادشاہ و حاکم وغیرہ) دوسرے حکم (یعنی برائی کو زبانی مذمت اور تلقین و نصیحت کے ذریعہ ختم کرنے) کا تعلق علماء سے ہے۔

بعض حضرات نے حدیث کے اس آخری جملہ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ چیز یعنی کسی برائی کو دیکھ کر محض دل میں اس کو برا سمجھنے پر اکتفا کر لینا ایمان کے مراتب میں سب سے کمزور مرتبہ ہے کیونکہ اگر کوئی مسلمان ایسی چیز کو دیکھے کہ جس کا دینی نقطہ نظر سے برا ہونا قطعی طور پر ثابت و ظاہر ہو اور وہ اس چیز کو برا بھی نہ سمجھے بلکہ اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کرے اور اس کو اچھا جانے تو مسلمان نہیں رہے گا بلکہ کافر ہو جائے گا۔

اس موقع پر یہ بات بھی جان لینا چاہئے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم معروف یا منکر کی شرعی حیثیت کے تابع ہے یعنی اگر کوئی چیز اس درجہ کی ہے کہ اس کو اختیار کرنا واجب ہے تو اس کو اختیار کرنے کا حکم دینا (یعنی امر بالمعروف) بھی

واجب ہوگا اور اگر وہ چیز مستحب ہوگی تو امر بالمعروف بھی مستحب ہوگا' اسی طرح اگر کوئی خلاف شرع چیز حرام کا درجہ رکھتی ہو اس سے روکنا یعنی نہی عن المنکر واجب ہوگا اور اگر وہ چیز مکروہ ہو تو اس صورت میں نہی عن المنکر بھی مستحب ہوگا۔

''منہی'' کی ضد یا واجب ہے' یا مندوب ہے' یا مباح ہے' اور یہ تمام ''معروف'' ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ ان کی وجہ سے کوئی فتنہ و فساد جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے نہ ہو۔ (مثلاً اگر یہ ظاہر ہو کہ فلاں شخص کو کسی نیک کام کی تلقین کرنے کی وجہ سے فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا یا جو شخص کسی برے کام کا مرتکب ہے اگر اس کو اس برائی سے روکا گیا تو اس کے نتائج اور زیادہ فتنہ و فساد کی صورت میں نکلیں گے تو اس صورت میں اس فریضہ کی ادائیگی قطعاً ضروری نہیں ہوگی۔

اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو قبول کیے جانے کا گمان بھی ہو' لہٰذا اگر یہ گمان ہو کہ جس شخص کو نیک کام کرنے کی تلقین کی جائے گی یا اس کو کسی برے کام سے روکا جائے گا تو وہ اس بات کو قبول نہیں کریگا) تو اس کو اس نیک کام کا حکم کرنا یا برے کام سے روکنا واجب تو نہیں ہوگا) مستحسن ضرور رہے گا تاکہ شعار اسلام کا اظہار ہو جائے۔

حدیث کے الفاظ مَنْ رَاٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا میں لفظ ''من'' کے ذریعہ مذکورہ حکم کا مخاطب جن لوگوں کو قرار دیا گیا ہے ان میں ہر فرد شامل ہے' (یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہیے) خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور خواہ آزاد ہو یا غلام یہاں تک کہ فاسق اور صبی ممیز بھی اس امر کا ذمہ دار ہے۔ اگرچہ فاسق کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا قبیح سمجھا جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [أتا مرون الناس بالبر وتنسون أنفسكم] [البقرة۔ ٤٤] ایک دوسرے کے مقام پر اللہ عزوجل فرماتا ہے: [لم تقولون مالا تفعلون] [الصف۔ ٢] کسی کہنے والے نے کہا ہے: وغير تقي يأمر الناس بالتقي طبيب يداوي الناس وهو مريض۔

عرضِ مرتب:

اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ امر بالمعروف کے لئے شرط نہیں ہے کہ جو شخص کسی نیکی کا حکم کرنے والا ہو وہ پہلے خود بھی اس نیکی پر عامل ہو اور بغیر اپنے عمل کے امر بالمعروف کا فریضہ انجام دینا اس کے لئے درست نہ ہو کیونکہ جس طرح خود اپنے نفس کو کسی نیکی پر عمل کرنے کی تلقین کرنا ایک واجب چیز ہے اسی طرح ایک واجب امر یہ ہے کہ دوسروں کو نیکی کی تلقین کی جائے' لہٰذا اگر ان میں سے کوئی ایک واجب ترک ہوتا تو اس کی وجہ سے دوسرے واجب کو ترک کرنا قطعاً جائز نہیں ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ جس واجب کا ترک ہوگا اس کا گناہ بہر صورت لازم آئے گا۔ لہٰذا قرآن کریم میں جو یہ فرمایا گیا ہے: [لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ] (یعنی تم اس کو کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے) تو اس آیت کریمہ کا محمول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو تسلیم کرنے کی صورت میں یہ کہا جائے گا کہ اس آیت کی مراد ترک عمل سے روکنا اور اس پر زجر و تنبیہ ہے نہ کہ دوسروں کو بھلائی کی تلقین سے منع کرنا مراد ہے' اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں سمجھئے کہ جو شخص بھلائیوں کی تلقین کرتا ہے اور دوسروں سے نیک عمل اختیار کرنے کو کہتا ہے لیکن وہ خود اس بھلائی اور نیک عمل کو اختیار نہیں کرتا تو یہ آیت کریمہ ایسے شخص کو متنبہ کرتی ہے کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ تم دوسروں کو بھلائی اور نیک عمل کرنے کی تلقین کرتے ہوئے لیکن یہ نہایت غیر موزوں بات ہے کہ تم خود اس

بھلائی اور نیک عمل کو اختیار نہیں کرتے! لہٰذا آیت یہ بات قطعاً ثابت نہیں کرتی کہ جو شخص خود نیک عمل اختیار نہ کرے وہ دوسروں کو بھی نیک عمل اختیار کرنے کی تلقین نہیں کر سکتا تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نیکی کی تلقین کرنے والا اگر خود بھی نیکی کو اختیار کرے تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں ہو سکتی کیونکہ جو شخص خود عمل نہیں کرتا اس کی تلقین و نصیحت دوسروں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

(مظاہر حق)

امام نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ حدیث میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کی جو ترتیب ذکر کی گئی ہے وہ قرآن و سنت اور اجماع امت کے ذریعہ واجب ہے نیز یہ نصیحت بھی ہے جس کو ''دین'' کہا گیا ہے۔ اس بارے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ کچھ روافض کا اس سے اختلاف ہے جن کا کوئی اعتبار نہیں ہے امام الحرمین ابو المعالی نے لکھا ہے: ہم ان کے اختلاف کی پرواہ نہیں کرتے' اور اس عمل کا وجوب شرع سے ثابت ہے نہ کہ عقل سے' برخلاف معتزلہ کے۔ لہٰذا اگر کسی شخص نے مذکورہ ترتیب کے مطابق اس کو انجام دیا اور مخاطب نے اس کو قبول کر لیا تو سبحان اللہ اور اگر قبول نہ کیا تو وہ شخص اپنی ذمہ داری سے بہر حال سبک دوش ہو جائے گا' اس کے بعد اب اس پر کوئی اور چیز واجب نہیں ہو گی چونکہ یہ اپنی ذمہ داری ادا کر چکا ہے اس پر یہ ضروری نہیں تھا کہ مخاطب اس کی بات کو قبول کرے۔

اس امر (یعنی بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے) کی فرضیت بطریق کفایہ ہے اور جو شخص اس فریضہ کی ادائیگی کی طاقت و قوت رکھنے کے باوجود اس ذمہ داری کو بلا کسی عذر کے پورا نہ کرے تو وہ گناہ گار ہوتا ہے' اور بعض صورتوں میں یہ امر فرض عین بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی برائی کسی ایسی جگہ رونما ہو رہی ہو کہ ایک شخص کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا یا اس کے ازالہ کی قدرت اس کے علاوہ کوئی اور نہیں رکھتا جیسے اس کی بیوی یا اولاد یا غلام کسی برائی کا ارتکاب کرے تو اس برائی کو ختم کرنے کی ذمہ داری خاص طور پر اسی شخص پر عائد ہو گی۔

علماء فرماتے ہیں کہ عدم قبولیت کا گمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وجوب کو ساقط نہیں کرتا' (لہٰذا اگر کسی کو یہ گمان ہو کہ فلاں شخص کے سامنے بھلائی کی تلقین کرنا یا اس کو برے کام سے روکنا بے کار ہے کیونکہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قبول نہیں کرے گا تو) اس صورت میں بھی اس پر واجب ہو گا کہ وہ اس شخص کو نیک کام کرنے کا حکم دے برائی سے روکے فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

عرضِ مرتب:

اس بات کی قطعاً پرواہ نہ کرے کہ اس کی بات مانی جائے گی یا نہیں کیونکہ موعظت و نصیحت اول تو بذات خود بڑے فائدے رکھتی ہے اور کسی نہ کسی صورت میں اور کبھی نہ کبھی ضرور اثر کرتی ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے دوسرے یہ کہ محض اس گمان کی بنا پر کہ مخاطب تلقین و نصیحت سے کوئی اثر نہیں لے گا اپنی ذمہ داری سے اعراض نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر بھلائیوں کو پھیلانے اور برائیوں کو مٹانے کی جدوجہد میں مصروف رہنا چاہئے کہ لوگوں نے تو رسولوں تک کو جھٹلایا ہے اور پیغمبروں تک کی موعظت و نصیحت کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے تو کیا ان رسولوں اور پیغمبروں نے حق بات پہنچانے کا فریضہ [illegible] تھا! قرآن نے جو بات رسول و پیغمبر کے بارے میں فرمائی ہے وہ ہر اس شخص پر صادق آتی ہے جو امر بالمعروف اور

نہی عن المنکر کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے یعنی وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ یعنی رسول کا کام بس یہ ہے کہ (خدا کے احکام) صاف صاف پہنچا دے (ان احکام کا ماننا یا نہ ماننا دوسروں کا کام ہے)۔ (مظاہر حق)

واضح رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ صرف حاکم اور مقتدر مسلمانوں ہی پر عائد نہیں ہوتا اور نہ یہ ضروری ہے کہ اس امر کی انجام دہی کے لئے حاکم اپنی طرف سے احکام جاری کر دے بلکہ اس کا حق عام لوگوں کو بھی پہنچتا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام کو انجام دیں۔ بلکہ ایسے زمانہ میں جب کہ طاقت و اقتدار رکھنے والے مسلمان اس فریضہ سے بالکل لاپرواہی برتتے ہیں۔ خصوصیت سے عام مسلمانوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس کام کو انجام دیں اور تمام مسلمانوں میں بھی زیادہ ذمہ داری علماء و مشائخ پر عائد ہوتی ہے۔ اسی طرح اس فریضہ کی ادائیگی میں اپنا مخاطب صرف عام مسلمانوں ہی کو نہیں ماننا چاہئے بلکہ خواص جیسے حاکموں وغیرہ کو بھی مناسب انداز میں بھلائیوں کی تلقین کرنی چاہئے اور وہ جن برائیوں میں مبتلا ہوں ان سے ان کو روکنا چاہئے' چنانچہ پچھلے زمانوں کے بزرگ صرف عوام الناس کو بھلائیوں کی تلقین نہیں کرتے تھے اور ان کو برائیوں سے روکنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے' بلکہ بادشاہوں' حاکموں اور مقتدر مسلمانوں کے سامنے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے تھے۔

تاہم یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسی شخص کو کرنا چاہئے جو یہ علم رکھتا ہو کہ وہ جس چیز کا حکم دے رہا ہے یا جس چیز سے روک رہا ہے شریعت کے اعتبار سے اس کی کیا حیثیت و اہمیت ہے' چنانچہ جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے جن کا فرض و واجب ہونا یا جن کا حرام ہونا اس طرح ظاہر ہے کہ تمام مسلمان ان کو جانتے ہیں جیسے نماز اور روزہ وغیرہ یا زنا اور شراب وغیرہ تو ان چیزوں کے بارے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عام مسلمان بھی کر سکتے ہیں

جو قولی یا فعلی چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے بارے میں عام مسلمانوں کو کوئی علم نہیں ہوتا جو مجتہد فیہ امور سے تعلق رکھتی ہیں تو عوام کو اس طرح کی چیزوں سے صرف اسی چیز کو اختیار کرنے سے منع کرنا چاہئے جن کی ممانعت متفق علیہ ہو مختلف فیہ امور میں منع نہیں کرنا چاہئے خصوصاً ان حضرات کے مسلک کے مطابق کہ جو یہ کہتے ہیں کہ ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے۔

آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر کو چاہئے کہ وہ نرمی سے کام لے' تاکہ تحصیل مطلوب زیادہ قریب ہو۔ (یعنی اس فریضہ کی ادائیگی میں خوش خلقی' نرمی اور تہذیب و متانت کا رویہ اختیار کریں اور وہ اس امر کو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی خاطر انجام دیں نہ کہ کسی دنیاوی غرض و مقصد اور نفس کی خاطر' اس صورت میں مخاطب پر بات اثر بھی کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ ثواب بھی عطا فرماتا ہے اسی طرح جب کسی شخص کو کوئی نصیحت کرنی ہو تو لوگوں کی موجودگی میں نہ کی جائے بلکہ تنہائی میں اور پوشیدہ طور پر اس کو نصیحت کرنی چاہئے کیونکہ لوگوں کی موجودگی میں کسی کو نصیحت کرنا' نصیحت نہیں بلکہ فضیحت ہے۔)

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: من وعظ أخاه سرًا فقد نصحه وزانه، ومن وعظ علانية فقد فضحه وشانه

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: ان هذا الباب باب عظيم في الدين به قوام لأمر وملاكه، فاذا فسد عم العقاب الصالح والظالم یہ باب دین کا ایک ایسا عظیم باب ہے، کہ جس سے دین قائم ہے، اور جب یہ خراب ہو جائے گا، تو عقاب باری تعالیٰ صالح و ظالم سب کو گھیر لے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة﴾

[انفال۔۲۵] ابن الملکؒ فرماتے ہیں: اگر آپ یہ کہیں کہ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ ''ایمان بڑھتا گھٹتا ہے'' جیسا کہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے تو حنفیہ کے ہاں اس کی کیا تاویل ہے؟ ہم کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ یہ ایمان کا ضعیف ترین ثمرہ ہے۔ اور دل میں برائی کو برا سمجھنا یہ ایمان کے ثمرات میں سے ہے۔

پھر اگر آپ یہ کہیں کہ اگر بات ایسی ہی ہوتی تو لازم آتا ہے کہ اس کے انتفاء سے خروج من الایمان لازم نہ آئے' حالانکہ ایسا نہیں ہے' چونکہ بعض روایات میں یوں آتا ہے: ''ولیس وراء ذلك من الایمان حبة خردل''۔ میں کہتا ہوں مراد یہ ہے کہ جب یہ منتفی ہو جاتے ہیں تو ایمان کالمعدوم ہو جاتا ہے۔ اھ۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد اور اصحاب اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

برائی سے منع نہ کرنے کے نتائج

۵۱۳۸: وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْمُدَاهِنِ فِيْ حُدُوْدِ اللّٰهِ وَالْوَاقِعِ فِيْهَا مَثَلَ قَوْمٍ اسْتَهَمُّوْا سَفِيْنَةً فَصَارَ بَعْضُهُمْ فِي اَسْفَلِهَا وَصَارَ بَعْضُهُمْ فِي اَعْلَاهَا فَكَانَ الَّذِيْ فِيْ اَسْفَلِهَا يَمُرُّ بِالْمَآءِ عَلَى الَّذِيْنَ فِيْ اَعْلَاهَا فَتَاَذَّوْا بِهٖ فَاَخَذَهٗ فَأْسًا فَجَعَلَ يَنْقُرُ اَسْفَلَ السَّفِيْنَةِ فَاَتَوْهُ فَقَالُوْا مَالَكَ قَالَ تَاَذَّيْتُمْ بِيْ وَلَا بُدَّلِيْ مِنَ الْمَآءِ فَاِنْ اَخَذُوْا عَلٰى يَدَيْهِ اَنْجَوْهُ وَنَجَوْا اَنْفُسَهُمْ وَاِنْ تَرَكُوْهُ اَهْلَكُوْهُ وَاَهْلَكُوْا اَنْفُسَهُمْ ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۹۲/۵ حدیث رقم ۲۶۸۶، والترمذی فی السنن ٤٠٨/٤ حدیث رقم ۲۱۷۳، واحمد فی المسند ۲۷۳/٤۔

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی حدود میں سستی کرنے والے اور ان میں گرنے والے کی مثال ان لوگوں جیسی ہے جنہوں نے قرعہ اندازی کی پس کچھ لوگ اس کے نچلے حصہ میں رہے اور کچھ اوپر والے میں نیچے والے پانی لے کر اوپر والوں کے پاس سے گزرے۔ انہیں اس پر تکلیف ہوئی تو انہوں نے کلہاڑی سے نیچے والے حصہ کو توڑنا شروع کر دیا دوسروں نے کہا تمہیں کیا ہوا انہوں نے کہا ہماری وجہ سے تمہیں تکلیف ہوتی ہے اور مجھے پانی کی ضرورت ہے اگر وہ اس کا ہاتھ پکڑ لیں تو اسے اور خود کو بھی محفوظ کر لیں گے اور اگر اسے چھوڑ دیں گے تو اسے اور خود کو بھی ہلاک کر لیں گے۔ (بخاری)

تشریح: مثل قوم: لفظ ''مثل'' مرفوع ہے۔

فاسا: ہمزہ ساکن ہے، اس کو الف کے ساتھ بدل کر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

ما لك: ''ما'' بمعنی ''ای شیء'' ہے ای: أی شیء باعث لك علی ذلك

نجوا: جیم کی تشدید کے ساتھ ہے۔

قوله: مثل المداهن فی حدود الله والواقع فیها مثل قوم:

مداھن: اس کے معنی ہیں مداہنت کرنے والا۔ مداہنت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص طاقت وقدرت رکھنے کے باوجود کسی خلاف شرع امر کو دیکھ کر اس کو مٹانے وختم کرنے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے سے باز رہے اور یہ باز رہنا خواہ شرم حضوری کی وجہ سے ہو یا دینی بے حمیتی کی بنا پر اور خواہ کسی کی جانب داری اور کسی غرض ولالچ کی وجہ سے ہو یا دین کی پرواہ نہ ہونے کی وجہ سے۔

واضح رہے کہ لغت میں ''مداہنت'' اور ''مدارت'' کے ایک ہی معنی ہیں، لیکن شریعت میں مدارت اور مداہنت کے درمیان فرق یہ ہے کہ مدارت کی بنیاد دین کی حفاظت مصالح وقت کی رعایت اور ظالموں کے ظلم کو دور کرنے پر ہوتی ہے اور مداہنت کی بنیاد اپنے نفس کے تحفظ اور اس کی خواہشات کی تکمیل، لوگوں سے منفعت ومفاد حاصل کرنے اور دین سے لاپرواہی پر ہوتی ہے۔ اور اسی سے شاعر کا یہ قول ہے :فدارھم مادمت فی دارھم۔

''خدا کی حدود میں غفلت وسستی کرنے'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گناہوں کی جو حد (سزائیں) مقرر کی ہیں (جیسے شرابی کو کوڑے مارنے وغیرہ) ان کو طاقت وقدرت کے باوجود قائم وجاری کرنے میں لاپرواہی وغفلت کرنا۔ یا اللہ تعالیٰ نے جن گناہوں کو موجب حد قرار دیا ہے (جیسے زنا اور شراب نوشی وغیرہ) ان کے مرتکبین کو ان گناہوں سے روکنے میں غفلت کرنا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دینے سے باز رہنا۔

قولہ: فان أخذوا علی یدیه انجوہ ونجو أنفسهم وان ترکوہ أهلکوہ وأهلکوا انفسهم :''نجوا'' تشدید''نجوا و انجوا''میں تنفس فی العبادۃ ہے۔ جس طرح کشتی میں سوار کوئی شخص کشتی کی سطح کو توڑنے لگے اور کشتی میں سوار دوسرے لوگ اس کو اس کی حرکت سے باز رکھیں تو کشتی ڈوبنے سے بچ جائے گی اور تمام مسافر محفوظ وسلامت رہیں گے اور اگر دوسرے مسافر اس شخص کو اس کے اس عمل سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ صرف وہی شخص بلکہ دوسرے تمام مسافر بھی اس شخص کی اس حرکت کی وجہ سے غرقاب وہلاک ہو جائیں گے اسی طرح اگر لوگ کسی فاسق وبدکار کو اس کے فسق وبدکاری سے روکیں اور برائیوں کے راستہ سے باز رکھیں تو وہ اس فاسق وبدکار کی نجات وفلاح کا بھی باعث بنیں گے اور خود کو بھی عذاب خداوندی سے محفوظ رکھ پائیں گے اور اگر لوگ اس فاسق وبدکار کو اس حالت پر چھوڑ دیں کہ وہ اسی طرح فسق وبدکاری میں مبتلا رہے تو پھر نہ صرف وہ فاسق وبدکار ہی تباہ وبرباد ہوگا بلکہ وہ لوگ اپنے آپ کو بھی ہلاکت وتباہی میں مبتلا کریں گے کیونکہ جب دنیا والوں کی بداعمالیوں اور بدکاریوں کی وجہ سے خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے تو اس کی تباہ کاریوں میں کسی نہ کسی حیثیت سے سب ہی لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: [وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً] [الانفال۔ ۲۵] یعنی تم لوگ اپنے آپ کو اس فتنہ سے بچاؤ جو خاص طور پر ان ہی لوگوں کو مبتلا نہیں کرے گا جنہوں نے ظلم کیا ہے بلکہ تمہاری مداہنت کی وجہ سے تمہیں بھی مبتلا کرے گا۔

قولہ: استھموا سفینة: مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے کشتی کو درجات میں تقسیم کر لیا ہو جن میں سے ایک درجہ تو کشتی کے اوپر کے حصہ میں واقع ہو اور دوسرا درجہ کشتی کے نیچے کے حصہ میں ہو اور ان دونوں درجات میں بیٹھنے کے لئے قرعہ اندازی کا طریقہ اختیار کیا گیا ہو کہ جس شخص کا نام قرعہ میں جس درجہ کے لئے نکلے وہ شخص اسی درجہ میں بیٹھے گا۔ واضح رہے کہ یہ قرعہ والی

بات محض ایک قید اتفاقی کے طور پر ہے ورنہ عام طور سے کشتی میں بیٹھنے کا یہ طریقہ رائج نہیں ہے بلکہ نشست اور درجات کی تقسیم کشتی کے مالک و منتظم کی صوابدید پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ کرایہ وغیرہ کی ترتیب کے مطابق جس شخص کو جہاں چاہتا ہے جگہ دیتا ہے یا جس شخص کو جہاں جگہ مل جاتی ہے وہاں بیٹھ جاتا ہے۔ ہاں اگر کشتی کسی ایک شخص کی ملکیت ہونے کے بجائے مشترکہ طور پر چند اشخاص کی یکساں طور پر ملکیت ہو اور وہ اشخاص ایک ساتھ اس کشتی میں داخل ہونا چاہیں تو اس صورت میں یہ ہوسکتا ہے کہ وہ سب اپنی اپنی نشست کے لئے قرعہ ڈال لیں اور جس شخص کا نام جس درجہ اور جس جگہ کے لئے نکلے وہ وہاں بیٹھ جائے۔

قولہ: یمر بالماء علی الذین فی اعلاھا فتاذوا بہ: فَکَانَ الَّذِیْ فِیْ اَسْفَلِهَا۔

الذی: استعمال کرنا ماسبق میں ذکر کیے گئے لفظ "بعض" کی مناسبت سے ہے اور اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر اس حصے میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں میں سے صرف ایک شخص بھی ایسا کرے (یعنی کشتی کی سطح کو توڑنے لگے) تو اس کے بارے میں بھی یہ ہی حکم ہوتا ہے۔

"بالماء" میں باء سببیہ ہے۔ ای بسبب الماء اور "فتاذوا بہ" میں ضمیر مجرور کا مرجع "مرور" ہے۔ ای بمرورہ علیھم۔ "وہ جب پانی لینے کے لئے اوپر کے حصہ میں آئیں" میں لفظ "پانی" سے مراد اکثر شارحین کے نزدیک وہی عام پانی ہے جو پینے وغیرہ کے استعمال میں آتا ہے اور بعض شارحین کہتے ہیں کہ یہاں "پانی" سے مراد پیشاب پاخانہ ہے جو نیچے کے حصے میں کوئی شخص کسی برتن وغیرہ میں کرے اور پھر اس کو دریا میں ڈالنے کے لئے اوپر کے حصے میں آئے اور وہاں کے لوگوں کے درمیان سے گزرے اس صورت میں اس شخص کی وجہ سے اوپر کے حصہ والوں کا تکلیف و ناگواری محسوس کرنا زیادہ بدیہی بات ہوگی اور ان کی وجہ سے وہاں کے لوگ تکلیف و اذیت محسوس کرنے لگیں اور پھر نیچے والوں میں سے کوئی شخص ان کی تکلیف و ناگواری کو دیکھ کر کشتی کے نیچے کی سطح توڑنے لگے تاکہ اس جگہ سے پانی حاصل کرے یا غلاظت وغیرہ پھینک دیا کرے......

تشبیہ کی وضاحت:

اشرف فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی حدود میں غفلت و سستی کرنے والے کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو کشتی کے اوپر کے درجہ میں ہو اور حدود میں گر پڑنے والے کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی جو کشتی کے نیچے کے درجہ میں ہو اور اس کے انہماک یعنی ان حدود (گناہوں) میں مشغول رہنے اور ان کو ترک نہ کرنے کو کشتی کے نیچے کی سطح کو توڑنے کے عمل کے ساتھ تشبیہ دی اور گناہوں کے مرتکب کو ان گناہوں سے روکنے کو کشتی کی سطح توڑنے والے کا ہاتھ پکڑنے اور اس کو کشتی توڑنے سے منع کرنے سے تعبیر کیا اور گناہوں سے روکنے و منع کرنے کے فائدہ کو ان سب لوگوں کی فلاح و نجات سے تعبیر کیا جو پانی لینے کے لئے اوپر آنے والوں کو منع کریں یا جو پانی کے لئے اوپر جائیں اور ان کو اوپر آنے سے روکا جائے اور گناہوں سے منع نہ کرنے والوں کو ان لوگوں سے تعبیر کیا جو کشتی توڑنے والے کو اس کے حال پر چھوڑ دیں یعنی اس کو کشتی توڑنے سے باز نہ رکھیں اور مدافعت نہ کرنے والوں یعنی لوگوں کو گناہوں سے نہ روکنے والوں کے گناہ اور گناہوں کا ارتکاب کرنے والے کے انجام کو اس امر سے تعبیر کیا کہ اگر کشتی کے اوپر والے کشتی کو توڑنے والے کو منع نہ کریں تو وہ اپنے آپ کو بھی اور کشتی

توڑنے والے کو بھی ہلاکت وتباہی میں ڈال دیں گے! نیز اسلام کو گویا کشتی سے تعبیر فرمایا جو دونوں قسم کے لوگوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

حدیث میں منع کرنے والوں کے طبقہ کو جمع کے صیغہ کے ساتھ ذکر فرمایا جس کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ تمام مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس شخص کی حسب قدرت پوری مدد کریں جو لوگوں کو گناہوں اور برائیوں سے باز رکھنے کا فریضہ انجام دے اور اسی طرح گناہ کرنے والے کا ذکر مفرد کے صیغہ کے ساتھ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ گناہ کے مرتکب اپنی حیثیت کے اعتبار سے ناقص ہیں خواہ وہ تعداد میں کتنے ہی ہوں۔

یا اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جس شخص سے یہ نہی صادر ہوگی (یعنی "ناھی" کا فریضہ انجام دے گا) وہ جماعت کی مانند ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ان ابراھیم کان أمة﴾

شاعر کا یہ قول بھی اسی قبیل سے ہے:

ع فدارھم ما دمت فی دراھم

آگ میں انتڑیوں کے گرد گھومنے والا

۵۱۳۹: وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُجَاءُ بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُلْقٰى فِي النَّارِ فَتَنْدَلِقُ اَقْتَابُهُ فِي النَّارِ فَيَطْحَنُ فِيْهَا كَطَحْنِ الْحِمَارِ بِرَحَاهُ فَيَجْتَمِعُ اَهْلُ النَّارِ عَلَيْهِ فَيَقُوْلُوْنَ اَیْ فُلَانُ مَا شَانُكَ اَلَيْسَ كُنْتَ تَامُرُنَا بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَانَا عَنِ الْمُنْكَرِ قَالَ كُنْتُ اٰمُرُكُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَا اٰتِيْهِ وَاَنْهَاكُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاٰتِيْهِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٣٣١/٦ حديث رقم ٣٢٦٧ ومسلم في صحيحه ٢٢٩٠/٤ حديث رقم (٥١-٢٩٨٩) واحمد في المسند ٢٠٥/٥۔

ترجمہ: حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن ایک شخص کو لا کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا آگ میں اس کی انتڑیاں جلد نکل پڑیں گی وہ ان کے گرد اس طرح چکر کاٹے گا جس طرح گدھا چکی کے گرد گھومتا ہے اہل دوزخ مل کر دریافت کریں گے اے فلاں! کیا ہوا؟ کیا تم ہمیں نیکیوں کا حکم نہیں کرتے تھے اور برائیوں سے منع نہیں کرتے تھے؟ وہ کہے گا میں تمہیں نیکی کے متعلق کہتا تھا مگر خود نہیں کرتا تھا تمہیں برائی سے روکتا مگر خود نہ رکتا تھا۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: اقتاب: أی امعاء یعنی انتڑیاں۔

فیطحن: صیغۂ معروف کے ساتھ ہے۔ امام طیبیؒ نے فرمایا: "فیطحن فیھا" صیغہ معروف کے ساتھ ہے۔ بمعنی "یدور" اور ضمیر "الرجل" کی طرف عائد ہے۔ اور "فیھا" کی ضمیر "أمعاء" کی طرف راجع ہے۔ مصابیح کے بعض نسخوں میں صیغہ مجہول کے ساتھ ہے وہ خطاً ہے۔ چونکہ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: فیدور کما یدور

الحمار برحاه ۔

أي فلان: کنایہ ہے، اس کے علم و مشیخت کے اسم و وصف سے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں (یعنی جس طرح چکی میں چلنے والا گدھا اپنی چکی کے گرد چلتا رہتا ہے اسی طرح وہ شخص اپنی ان انتڑیوں کے گرد چکر لگائے گا اور ان کو پیروں تلے روندتا رہے گا

آمر کم: صیغہ واحد متکلم کے ساتھ ہے۔

عرضِ مرتب:

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اس شخص کو یہ سزا عمل نہ کرنے کی وجہ سے ملے گی نہ کہ اس وجہ سے ملے گی کہ وہ جب خود عمل نہیں کرتا تھا تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ کیوں انجام دیتا تھا۔ چنانچہ اگر وہ اس فریضہ کو بھی ترک کرتا تو وہ مذکورہ عذاب سے بھی سخت عذاب کا مستوجب ہوتا کیونکہ اس صورت میں اس پر دو واجب کے ترک کا گناہ ہوتا۔ (مظاہر حق)

الفصل الثانی:

نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے رہو

۵۱۴۰: عَنْ حُذَيْفَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَتَامُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْلَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ عِنْدِهٖ ثُمَّ لَتَدْعُنَّهٗ وَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ۔

(رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤٠٦/٤ حدیث رقم ٢١٦٩ و ابن ماجه ١٣٢٧/٢ حدیث رقم ٤٠٠٤، واحمد فی المسند ٣٨٨/٥۔

ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے رہنا۔ ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر عذاب بھیج دے۔ پھر تم دعا کرو پھر وہ تم سے قبول نہ کی جائے۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ دونوں باتوں میں سے ایک بات ضرور ہوگی یا تو تم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہو اور یا اگر تم اس فریضہ کی انجام دہی سے غافل رہے تو اللہ تعالیٰ مختلف طرح کی سختیوں اور مصائب کی صورت میں تم پر اپنا عذاب نازل کرے گا اور اس وقت تم ان سختیوں اور مصائب کے دفعیہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو گے تو تمہاری دعا قبول نہیں کی جائے گی۔

عرضِ مرتب:

اس سے معلوم ہوا کہ دوسرے عذاب اور مصائب دعا کی برکت سے ٹلنے کا احتمال رکھتے ہیں لیکن امر بالمعروف اور نہی عن

المنکر کے ترک پر خدا کی طرف سے جو آفات و بلائیں نازل ہوتی ہیں وہ دعا کے ذریعہ بھی ٹلنے کا احتمال نہیں رکھتیں کیونکہ ان کے دفعیہ کے لئے کی جانے والی دعا قبول نہیں ہوتی۔ (مظاہر حق)

تخریج: بزارؒ نے اور طبرانیؒ نے اوسط میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں لتامرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر او ليسلطن الله عليكم شراركم فيدعو خياركم فلا يستجاب لهم۔

حضور ﷺ نے فرمایا: دو باتوں میں سے ایک بات کا ہونا ضروری ہے یعنی یا تو تم) یقیناً امر بالمعروف بھی کرو گے اور یقیناً نہی عن المنکر کا فریضہ بھی انجام دو گے یا ان دونوں فریضوں کی عدم ادائیگی کی صورت میں یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر تمہارے برے لوگوں کو مسلط کر دے گا اور پھر تمہارے نیک لوگ (ان برے لوگوں کے فتنہ و فساد اور ظلم و جور کے دفعیہ کے لئے) دعا کریں گے مگر ان کی دعا قبول نہیں کی جائے گی۔

گناہ سے نفرت کرنے والا غیر موجود کی طرح ہے

۵۱۴۱: وَعَنِ الْعُرْسِ ابْنِ عُمَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا عُمِلَتِ الْخَطِيْئَةُ فِي الْأَرْضِ مَنْ شَهِدَهَا فَكَرِهَهَا كَانَ كَمَنْ غَابَ عَنْهَا وَمَنْ غَابَ عَنْهَا فَرَضِيَهَا كَانَ كَمَنْ شَهِدَهَا۔

(رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابو داؤد في السنن ٤/ ٥١٠ حديث رقم ٤٣٤٥۔

ترجمہ: حضرت عرس بن عمیرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب زمین پر کوئی گناہ ہوتا ہے اور وہاں دوسرا موجود شخص اس کو ناپسند کرتا ہے۔ وہ غائب کی مانند ہوتا ہے اور جو وہاں موجود نہ تھا لیکن اس گناہ کو پسند کرتا ہے وہ تو موجود کی طرح ہوگا۔ (ابوداؤد)

راوئ حدیث:

عرس بن عمیرۃ۔ عرس بن عمیرہ "کندی" ہیں۔ ان سے ان کے بھتیجے عدی وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ "عرس" عین کے ضمہ راء کے سکون اور سین مہملہ کے ساتھ ہے۔ "عمیرۃ" میں عین مہملہ مفتوح، میم مکسور، یاء ساکن اور پھر راء ہے۔ واضح رہے کہ رجال میں "عمیرۃ" عین مہملہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ کوئی بھی عین مہملہ کے ضمہ کے ساتھ نہیں ہے۔ (مغنی)

عرضِ مرتب:

علامہ طاہر پٹنی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عدی بن عمیرہ سے ان کے بھائی عرس روایت کرتے ہیں۔ (ص ۱۸۰) اس سے یوں لگتا ہے کہ عدی اور عرس دونوں بھائی ہیں نہ کہ چچا بھتیجا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تشریح: عملت: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

من شهدها: ای من حضرها جواب شرط ہے۔ اور فاء محذوف ہے جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں (بھی فاء محذوف

ہے۔):﴿وان اطعتموھم انکم لمشرکون﴾ [الانعام:۱۲۱] (ذکرہ الطیبی)
یہاں فاء کا حذف مستحسن ہے کیونکہ شرط بلفظ ماضی ہے۔(ذکرہ القاضیؒ)

عرضِ مرتب:

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ گناہ کو ہر حال میں گناہ سمجھو اور اس کو برا خیال کرو! اگر تمہاری آنکھوں کے سامنے کسی گناہ کا ارتکاب ہو رہا ہو تو اول اس کو ہاتھ اور زبان کے ذریعہ مٹانے اور ختم کرنے کی کوشش کرو اگر ان دونوں میں سے کسی کی بھی طاقت وقدرت نہیں رکھتے ہو تو پھر جو آخری درجہ ہے اس کو اختیار کرو یعنی اس گناہ کو برا خیال کرو۔ اس صورت میں تمہارا شمار گویا ان لوگوں کے زمرہ میں ہوگا جو وہاں موجود ہی نہ ہوں اور جن کی آنکھوں کے سامنے اس گناہ کا ارتکاب نہ ہو رہا ہو۔

اس حدیث سے واضح ہوا کہ حقیقی موجودگی وغیر موجودگی کا تعلق دل سے ہے نہ کہ جسم وبدن سے چنانچہ جس شخص نے اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے والے گناہ کو برا خیال کیا اور دل میں بھی اس کے خلاف نفرت رکھی تو گویا حقیقت میں اس جگہ موجود نہیں جہاں وہ گناہ کیا جا رہا ہے اگرچہ ظاہری طور پر وہاں موجود ہے۔ اور اگر کسی شخص نے گناہ کو گناہ نہیں سمجھا یعنی اس گناہ کو اور اس گناہ کے مرتکب کو دل میں برا خیال نہیں کیا تو گویا وہ حقیقت میں اس جگہ موجود ہے جہاں وہ گناہ کیا جا رہا ہے اگرچہ ظاہری طور پر وہاں موجود نہیں ہے۔ (مظاہر حق)

الجامع میں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ مسنداً مروی ہے:

اذا عملت الخطيئة في الارض كان من شهدها فكرهها كمن غاب عنها (الحدیث)

آیت : عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ کا درست مطلب

۵۱۴۲: وَعَنْ اَبِىْ بَكْرِ الصِّدِّيْقِ قَالَ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّكُمْ تَقْرَءُوْنَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ فَاِنِّىْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَاَوْا مُنْكَرًا فَلَمْ يُغَيِّرُوْهُ يُوْشِكُ اَنْ يَّعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابِهِ (رواه ابن ماجة والترمذى وصححه وفى رواية ابى داؤد) اِذَا رَاَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ يَاْخُذُوْا عَلٰى يَدَيْهِ اَوْ شَكَ اَنْ يَّعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابِهِ وَفِىْ اُخْرٰى لَهُ مَا مِنْ قَوْمٍ يُعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِىْ ثُمَّ يَقْدِرُوْنَ عَلٰى اَنْ يُّغَيِّرُوْا ثُمَّ لَا يُغَيِّرُوْنَ اِلَّا يُوْشِكُ اَنْ يَّعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ وَفِىْ اُخْرٰى لَهُ مَا مِنْ قَوْمٍ يُعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِىْ هُمْ اَكْثَرُ مِمَّنْ يَّعْمَلُهٗ۔

أخرجه ابوداؤد فى السنن ۵۰۹/۴ حديث رقم ۴۳۳۸، والترمذى فى السنن ۴۰۶/۴ حديث رقم ۲۱۶۸، واخرجه ابن ماجه فى السنن ۱۳۲۷/۲ حديث رقم ۴۰۰۵، واحمد فى المسند ۲/۱۔

ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا: اے لوگو! تم یہ پڑھتے ہو: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ اے ایمان والو! اپنی جان کی حفاظت کرو۔ تمہیں کوئی گمراہ

نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جب کہ تم ہدایت پر ہو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ جب لوگ برائی کو دیکھ کر منع نہ کریں گے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے عذاب میں مبتلا کر دے۔ ابن ماجہ، ترمذی نے اسے صحیح کہا ابوداؤد کے الفاظ یہ ہیں۔ کہ جب انہوں نے ظالم کی زیادتی دیکھی تو اس کے ہاتھ نہیں پکڑے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ان کو بھی عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ دوسری روایت میں اس طرح ہے جس قوم میں لوگ برائی کریں اور وہ لوگ اس کے مٹانے پر قادر ہوں اور وہ نہ مٹائیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس کے عذاب میں شامل کرے۔ ایک اور روایت اس طرح ہے کہ جن لوگوں میں برائی ہو اور دیگر لوگ اس برائی کے کرنے والوں سے تعداد میں زیادہ ہوں۔

تشریح: قوله: يا ايها الذين آمنوا عليكم انفسكم ۔۔۔ اذا اهتديتم:

”عليكم أنفسكم“: ای الزموا حفظ أنفسكم عن المعاصی

قوله: فاني سمعت رسول الله ﷺ يقول ۔۔۔ والترمذی وصححه: ”فاني“: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: فاء فصیحیہ ہے جو محذوف پر دلالت کر رہی ہے۔ گویا کہ یوں ارشاد فرمایا: **انكم تقرؤون هذه الآية وتجرون على عمومها، وتمتنعون عن الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، وليس كذلك فاني سمعت الخ**

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ میں نے ”**ليس كذلك**“ اس لئے کہا کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی کہ جن کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا گیا تھا تو انہوں نے اس کو قبول کرنے سے کلی طور پر انکار کر دیا۔ مسلمانوں کو ان پر حسرت ہونے لگی، چنانچہ مسلمانوں کو خطاب کر کے کہا گیا کہ تم پر اپنے نفسوں کی حفاظت لازم ہے۔ اور اسی کی اصلاح کے تم مکلف بنائے گئے ہو، ہدایت کے راستے پر چلو، جب تم ہدایت پر ہو گے تو گمراہی تمہیں نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ اس مفہوم کی تائید اس کی ماقبل آیت سے بھی ہوتی ہے: ﴿**واذا قيل لهم تعالوا الى ما أنزل الله والى الرسول**﴾ [المائدة۔۱۰۵] یہ تخصیص بحسب الاشخاص ہے۔ اور تخصیص بحسب الزمان کی دلیل ابوثعلبہ کی روایت جو آگے آ رہی ہے، چونکہ عام میں بعض مرتبہ دوبارہ بھی تخصیص ہو جاتی ہے۔ اھ۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: دو وجوہ سے یہ تقریر نہ تو صحیح المبنی ہے، اور نہ صریح المعنی ہے:

اول تو یہ کہ آپ کا یہ کہنا ”**نزلت الآية في قوم أمروا بالمعروف فأبوا كل الاباء**“ اس کی سرے سے کوئی اصل موجود نہیں بلکہ اس کا تو کبھی آئندہ زمانہ میں بھی تصور نہیں کیا جا سکتا، چونکہ یہ بات مشہور و معروف ہے کہ امر بالمعروف کا حکم صرف مسلمانوں ہی کو ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ مسلمان کلی طور پر انکار کر دیں۔ اور نہ یہ بات ثابت ہے کہ کوئی جماعت اس امر کی وجہ سے مرتد ہو گئی ہو، حتیٰ کہ یہ کہنا صحیح ہو کہ ”**فذهبت أنفس المؤمنين حسرة عليهم** ......“

دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ کہنا: ”**ويشهد لذلك ما قبل هذه الآية**“، آیت کا تو باب امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے مطلق کوئی تعلق ہی نہیں، بلکہ مطلوب یہ تھا کہ وہ ”**منزل من الله على الرسول**“ پر ایمان لے آئیں، اور اپنے آباء واجداء کے گمراہ امور کی تقلید نہ کریں، چنانچہ انہوں نے اپنے قول باطل پر اصرار کیا اور کہنے لگے: [**حسبنا ما وجدنا عليه آباء نا**] [المائدة۔۱۰۴]، اس پر یہ ارشاد باری تعالیٰ اترا: ﴿**أولو كان أباؤهم لا يعقلون شيئا ولا يهتدون**﴾

[المائدۃ۔۱۰۴] ہاں البتہ ابن ابی حاتم کی ذکر کردہ اس روایت کے ذریعے دونوں آیتوں میں اقتران ثابت ہوجاتا ہے:

أنه انما أنزلت هذه الآية، لأن الرجل كان يسلم ويكفر أبوه، ويسلم الرجل ويكفر أخوه، فلما دخل قلوبهم حلاوة الايمان دعوا آباء هم واخوانهم فقالوا: [حسبنا ما وجدنا عليه أباء نا] فأنزل الله: ﴿يا أيها الذين آمنوا عليكم أنفسكم﴾ [المائدة۔۱۰۵] [الآية]

بیضاوی کی بات کا مطلب بھی یہی ہے (جیسا کہ وہ فرماتے ہیں): والآية نزلت لما كان المؤمنون يتحسرون على الكفرة ويتمنون ايمانهم

قوله: وفي رواية أبي داود ـــ ان يعمهم الله بعقاب: ''یعمل'' بصیغہ مجہول ہے اور جار مجرور نائب فاعل ہے۔ یا تقدیری عبارت یوں ہے: يعمل احد فيما بينهم ۔

قوله: وفي اخرى عله: مامن قوم يعمل فيهم بالمعاصي هم اكثر ممن يعمله: ''ھم'' صفت ہے ''قوم'' کی۔ معنوی اعتبار سے عبارت یوں ہے: اذا كان الذين لا يعملون المعاصي اكثر من الذين يعملونها فلم يمنعوهم عنها عمهم العذاب امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس کے بعد یہ اضافہ ہونا چاہئے: ثم لا يغيرون الا يو شك ان يعمهم الله بعقاب ۔ اور ''ھم'' صفت ہے ''قوم'' کی اور ''الا یوشک'' ''ما'' کی خبر ہے۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں یہ تقدیر و ماقبل سے مستفاد ہو رہی ہے مصنفؒ کا ارادہ آغاز حدیث میں موجود اختلاف روایت بیان کرنا ہے۔ امام بغویؒ نے فرمایا: ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

:لتأمرن بالمعروف و لتنهون عن المنكر، أوليستعملن الله عليكم شراركم' فليسونكم سوء العذاب، ثم ليد عن الله خياركم فلا يستجاب لكم ۔

ابو عبید فرماتے ہیں: ابو بکر صدیقؓ کو خوف ہوا کہ لوگ اس آیت میں غلط تاویل کریں گے، چنانچہ یہ تاویل انہیں امر بالمعروف کے ترک کی دعوت دے گی، تو مجھے یہ بتا دینا چاہئے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ'' امساك عن تغيير المنكر '' کی اجازت ذمیوں کیلئے ہے۔ یہ اجازت اہل اسلام کیلئے نہیں ہے۔ خواہ وہ فاسق ہو، عاصی ہو یا کوئی اور۔ مجاہد اور سعید بن جبیرؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یعنی عليكم أنفسكم لا يضركم من ضل من أهل الكتاب، فخذوا منهم الجزية واتركوهم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں: مروا بالمعروف وانهوا ما قبل منكم 'فان رد عليكم فعليكم أنفسكم...... اس وقت اس آیت کی تاویل آئے گی۔ (انتھیٰ)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ کلام ابو ثعلبہ کی آئندہ روایت کے مطابق ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! تم اپنے آپ کو گناہوں سے محفوظ رکھو' اگر تم نے گناہوں اور برائیوں سے خود کی حفاظت کر لی اور اس طرح ہدایت یافتہ بن گئے' نیز کسی وجہ سے تم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے سے عاجز رہے تو پھر تمہیں ان لوگوں کی گمراہی کا وبال کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا جو خلاف شرع امور اور برائیوں کا ارتکاب کر کے گمراہ ہو

گئے ہوں۔

برائی سے نہ روکا تو موت سے پہلے عذاب میں مبتلا ہوگا

۵۱۴۳: وَعَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ رَجُلٍ يَكُوْنُ فِيْ قَوْمٍ يَّعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِيْ يَقْدِرُوْنَ عَلٰى اَنْ يُّغَيِّرُوْا عَلَيْهِ وَلَا يُغَيِّرُوْنَ اِلَّا اَصَابَهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ اَنْ يَّمُوْتُوْا۔

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ٤/ ٥١٠ حديث رقم ٤٣٣٩ و ابن ماجه فی السنن ٢/ ١٣٢٨ حديث رقم ٤٠٠٩، واحمد فی المسند ٤/ ٣٦٤۔

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات فرماتے سنا کہ جو شخص کسی قوم میں ہو اور وہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہو اور دوسرے لوگ اس کے روکنے پر قادر تھے مگر انہوں نے منع نہ کیا تو انہیں موت سے پہلے اللہ تعالیٰ عذاب میں گرفتار فرمائے گا۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: قوله: ما من رجل يكون في قوم يعمل فيهم بالمعاصي:

صیغہ معروف کے ساتھ ہے، یہ جملہ "رجل" کی صفت ثانی ہے یا حال ہے۔ اور اس کا حال بننا اس بناء پر صحیح ہے کہ اس کے ذوالحال کی صفت لائی گئی ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ضمیر مجرور "الرجل" کی طرف عائد ہے یا "عدم التغير" کی طرف راجع ہے اور "من" "ابتدائیہ" ہے۔ أي بسبب شؤمه اور یہ بھی ممکن ہے کہ باری تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہو۔ أي عذابا من عنده اور یہ ابلغ ہے، جیسے کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿انی أخاف ان يمسك عذاب من الرحمٰن﴾ [مریم: ٤٥]

توضیح: امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث باعتبار لفظ مصابیح کی حدیث کے مخالف ہے۔ اس کا موقع محل فصل ثالث تھا۔ لیکن انہوں نے یہاں اس تنبیہ کی خاطر ذکر کر دی کہ مؤلف کو یہ روایت اصول میں اس طرح نہیں ملی کہ جس طرح سے مصابیح میں ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ تنبیہ اعتراض فعلی کو متضمن ہے، اور یہ کہنا کہ اس کا موقع محل فصل ثالث تھا یہ بات خود موقع محل سے ہٹ کر ہے۔

عرضِ مرتب:

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ عذاب اسی دنیا میں نازل ہوتا ہے خواہ اس کی صورت کچھ ہی ہو! اس سے پہلے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک کی وجہ سے دنیا میں بھی عذاب پہنچتا ہے اور آخرت کا عذاب باقی رہتا ہے جو وہاں پہنچے گا' اس کے برخلاف اور گناہوں کے مرتکبین پر اس دنیا میں عذاب ہونا ضروری نہیں ہے۔ (مظاہر حق)

تخریج: اس حدیث کو عبدالرزاق اور عبد بن حمید نے حضرت جریر بجلی سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

سمعت النبی ﷺ يقول: ما من قوم يكون من اظهرهم رجل يعمل بالمعاصي هم أمنع منه

وأعز، لم لا يغيرون عليه الا او شك أن يعمهم الله منه بعقاب

جس کام میں تمہیں چارہ کار نہ ہو اس سے اپنے کو بچانا لازم ہے

۵۱۴۴: وَعَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَۃَ فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَایَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ فَقَالَ اَمَا وَاللّٰہِ لَقَدْ سَاَلْتُ عَنْھَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ بَلِ ائْتَمِرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنَاھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ حَتّٰی اِذَا رَاَیْتَ شُحًّا مُطَاعًا وَھَوًی مُتَّبَعًا وَدُنْیَا مُؤْثَرَۃً وَاِعْجَابَ کُلِّ ذِیْ رَاْیٍ بِرَاْیِہٖ وَرَاَیْتَ امْرًا لَا بُدَّلَکَ مِنْہُ فَعَلَیْکَ نَفْسَکَ وَدَعْ اَمْرَ الْعَوَامِ فَاِنَّ وَرَآءَ کُمْ اَیَّامَ الصَّبْرِ فَمَنْ صَبَرَ فِیْھِنَّ قَبَضَ عَلَی الْجَمْرِ لِلْعَامِلِ فِیْھِنَّ اَجْرُ خَمْسِیْنَ رَجُلًا یَعْمَلُوْنَ مِثْلَ عَمَلِہٖ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اَجْرُ خَمْسِیْنَ مِنْھُمْ قَالَ اَجْرُ خَمْسِیْنَ مِنْکُمْ۔ (رواه الترمذی و ابن ماجة)

أخرجه ابوداوٗد فی السنن ۵۱۲/۴ حدیث رقم ۴۳۴۱، والترمذی فی السنن ۲۴۰/۵ حدیث رقم ۳۰۵۸ و ابن ماجه ۱۳۳۱/۲ حدیث رقم ۴۰۱۵۔

ترجمہ: حضرت ابوثعلبہ رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ کے متعلق مروی ہے اللہ کی قسم میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا بلکہ نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو جب تم دیکھو کہ لوگ بخل کی اطاعت کررہے ہیں اور خواہشات کے پیچھے پڑے اور دنیا کو ترجیح دے رہے ہیں اور ہر صاحب رائے اپنی رائے پر فخر کررہا ہے اور ایسا معاملہ دیکھو جس میں کوئی چارہ کار نہ ہو تو تمہیں اپنے کو بچانا لازم ہے دوسروں کے معاملہ کو چھوڑ دو کیونکہ تمہارے پیچھے صبر کے ایام ہیں جس نے ان دنوں میں صبر کیا اس نے آگ کی چنگاری پکڑی ان دنوں میں نیکی پر عمل کرنے والوں کے لئے پچاس آدمیوں کے عمل کے برابر ثواب ہے جو اس جیسا عمل کریں گے صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ان کے پچاس آدمیوں کے عمل جیسا فرمایا تمہارے پچاس آدمیوں کے عمل کے برابر ثواب ملے گا۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: قوله: عليكم انفسكم: امام طیبی فرماتے ہیں: راوی کی مراد یہ ہے: سئل ابو ثعلبة فی شأن قوله تعالیٰ: [عليكم أنفسكم] [فقال الخ]۔ "اما": میم کی تخفیف کے ساتھ ہے یہ "اما" برائے تنبیہ ہے۔

قاضی بیضاویؒ (اس کی تفسیر میں) لکھتے ہیں: أي احفظوها والزموا اصلاحها جار مع مجرور "الزموا" کا اسم ہے، اور اسی وجہ سے "انفسکم" منصوب ہے۔ اور اس کو مرفوع علی الابتداء بھی پڑھا گیا ہے۔

قوله: لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم کا مطلب یہ ہے: لا یضرکم الضلال اذا کنتم مهتدین اپنی طاقت کے بقدر نہی عن المنکر یہ بھی اهتداء کا حصہ ہے جیسا کہ ماقبل حدیث میں گزرا۔

ولا یضرکم": میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ ~~استیناف~~ کی وجہ سے مرفوع ہو، اور اس کی تائید ایک قراءت سے بھی ہوتی ... میں "لا یضرکم" کو مجزوم علی الجواب پڑھا گیا ... [illegible]

ضاد کے ضمہ کی اتباع کے باعث ہے۔اور ضاد کا ضمہ راء مدغمہ سے منقول ہوکر آیا ہے۔اور اس کی تائید اس قراءت سے ہوتی ہے کہ جس میں ''لا یضرکم'' فتحہ کے ساتھ اور ''لا یضرکم'' ضاد کے کسرہ وضمہ اور راء کے سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے، اس بناء پر کہ ضارہ یضیرہ ویضورہ سے ماخوذ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''بل ائتمروا'' یہ جملہ کلام مقدر سے اضراب ہے أی: سألت عنها رسول الله ﷺ وقلت: أما نترك الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر بناء علی ظاهر الآية؟ فقال عليه الصلوٰة والسلام: لا تتركوا بل ائتمروا بالمعروف الخ (انتهى) قوله: حتى اذا رأيت شحا مطاعا وهو ى متبعا و دنيا مؤ ثرة۔

هو ى متبعا: صیغہ مفعول کے ساتھ ہے۔

دنيا: قصر کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں تنوین کے ساتھ ہے۔ الاعجاب: باب افعال کا مصدر ہے۔ اس کا مطلب ہے وجدان الشيء حسنا، ورؤيته مستحسنا بحيث يصبر صاحبه به معجبا، وعن قبول كلام الغير مجتنبا، وان كان قبيحا في نفس الأمر

قوله: ورايت امر ا لا بدلك منه: ''لابد'' کو دو طرح ضبط کیا گیا ہے: ▣ تمام تصحیح شدہ نسخوں اور اصول معتمدہ میں بائے موحدہ کے ضمہ اور دال مہملہ مشددہ کے ساتھ ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: احتمال ہے کہ بائے موحدہ کے ساتھ ہو اور ''لا فراق لك منه'' کے معنی میں ہو۔ چنانچہ مطلب یہ ہوگا کہ اگر کسی ایسی برائی کا دور دورہ ہو کہ جس کی طرف خواہش نفس کا میلان ہوتا ہے اور لوگوں کے درمیان آنے اور ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے جبلت طبعی کی بناء پر بے اختیار اس برائی میں مبتلا ہو جانے کا خدشہ ہو تو اس صورت میں ان لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لینا لازم ہے تا کہ اس برائی کا ارتکاب نہ ہو۔ یہ معنی کتاب کے ان نسخوں کی روایت کے مطابق ہے جن میں ''لابد لك'' (لا فراق لك منه جس کے علاوہ تمہارے لئے کوئی چارہ کار نہ ہو) کے الفاظ ہیں

دوم: مراد اپنے عجز کے سبب نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے سے معذور رہنا ہے! یعنی اگر تم کسی ایسی برائی کو دیکھو جس سے لوگوں کو روکنے اور منع کی طاقت تم نہ رکھتے ہو اور اس وجہ سے تم نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے سے سکوت واعراض کرتے ہو تو اس صورت میں تمہارے لئے یہ ضروری ہے کہ تم ایسے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لو جو اس برائی میں مبتلا ہیں۔ یہ معنی مصابیح کے ان بعض نسخوں کی روایت کے مطابق ہے جن میں لا يدلك یائے مثناۃ کے ساتھ۔ (بمعنی لا طاقه لك عليه یعنی جس سے روکنے اور منع کرنے کی طاقت تمہیں حاصل نہ ہو) کے الفاظ ہیں۔ (انتهى) اور ''نفسك'' منصوب ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ مرفوع ہے: ای فالواجب أو فيجب عليكم حفظها من المعاصي

عرضِ مرتب:

مذکورہ جملہ کی مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اگر تمہیں کوئی ایسا امر درپیش ہو جو تمہارے لئے نہایت ضروری ہو اور سخت اہمیت کا حامل ہو اور اس کی وجہ سے تم نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہ دے سکتے ہو بایں طور کہ اگر تم اپنی توجہ اور اپنے وقت کو اس فریضہ کی انجام دہی میں لگاتے ہو تو تمہارا وہ ضروری امر فوت ہو جاتا ہو تو اس صورت میں تم ان لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لو جو برائیوں

قوله: ودع أمر العوام:

''اور عوام کے معاملات سے کوئی تعلق نہ رکھو'' کا مطلب یہ ہے کہ جب تم کچھ لوگوں کو دیکھو کہ وہ گناہ کرتے ہیں اور برائیوں میں مبتلا ہیں مگر تم طاقت وقدرت نہ رکھنے کی وجہ سے ان لوگوں کو نیکی کی تلقین کرنے اور برائی سے روکنے سے سکوت و اعراض کرنا ضروری سمجھتے ہو تو اس صورت میں تمہیں چاہئے کہ بس اپنی ذات کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کے بجائے خود اپنے آپ کو گناہوں اور برائیوں سے محفوظ رکھنے اور نیک کاموں کو اختیار کرنے میں مشغول رہو اس حکم کی بنیاد اس حقیقت پر ہے: [**لایکلف الله نفسا الا وسعها**] کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو بس اسی قدر ذمہ دار قرار دیتا ہے' جتنی ذمہ داری اٹھانے کی وہ طاقت وقدرت رکھتا ہو۔

قوله: فمن صبر فیهن قبض علی الجمر ''گویا اس نے اپنے ہاتھ میں انگارہ لے لیا ہے''۔ یہ جملہ دراصل مشقت و کلفت برداشت کرنے سے کنایہ ہے۔ یعنی اس زمانہ میں دین پر چلنا اور دنیا سے بے رغبتی رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا بلکہ یہ کام اتنا سخت اور اس قدر مصائب اور کلفتوں سے بھرپور ہوگا کہ جیسے کوئی شخص اپنے ہاتھ پر دہکتا ہوا انگارہ رکھ لے اور پھر اس کی تکلیف واذیت کو برداشت کرلے۔ امام شاطبیؒ نے اپنے اس شعر میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے: **وهذا زمان الصبر من لك بالتی کقبض علی جمر فتنجو من البلا۔**

عرضِ مرتب:

حدیث کے آخری جزء سے مذکورہ صفت (یعنی دین پر عمل پیرا ہونے کی کلفت ومشقت برداشت کرنے اور اس پر صابر و شاکر رہنے) میں صحابہؓ پر آخر زمانہ کے دیندار لوگوں کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جزوی فضیلت' کلی فضیلت کے منافی نہیں ہو سکتی' چنانچہ ابو عمرو بن عبدالبر نے' جو مشاہیر محدثین میں سے ہیں۔ اپنی کتاب استیعاب میں اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ ممکن ہے اس امت میں صحابہؓ کے بعد کوئی ایسا شخص پیدا ہو جو کسی صحابیؓ کے مرتبہ جیسی فضیلت رکھتا ہو بلکہ صحابیؓ سے زیادہ فضیلت کا حامل ہو! انہوں نے اپنے اس قول کی دلیل میں ان احادیث کو پیش کیا ہے جن سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے لیکن علماء کا مختار قول اس کے خلاف ہے تاہم واضح رہے کہ یہ اختلاف اقوال بس ان صحابہؓ کی حد تک ہے جو آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے اور واپس اپنے وطن چلے گئے' اس سے زیادہ صحبت رسول ﷺ ان کو حاصل نہ رہی' ورنہ جہاں تک صحابہ کرامؓ کی ذات کا تعلق ہے جنہیں آنحضرت ﷺ کی طویل صحبت ورفاقت کا شرف حاصل رہا ہے اور جو شب و روز آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر رہے اور انہوں نے آثار وانوار صحبت جمع کئے ان کی ذات اس اختلاف اقوال سے ماوراء ہے کہ ان کے بارے میں کسی بھی عالم کا یہ قول نہیں ہے کہ اس امت کا کوئی بھی فردان صحابہؓ میں سے کسی کے رتبہ کے بقدر یا اس سے زائد فضیلت رکھتا ہے' بلکہ ہم تو جمہور علماء کے قول کے مطابق بلا استثناء تمام ہی صحابہؓ کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ شرف صحابیت کا مرتبہ ہر ایک صحابیؓ کو حاصل ہے خواہ وہ آنحضرت ﷺ کے دست مبارک پر ایمان لا کر اپنے وطن چلے گئے ہوں اور خواہ تمام عمر آنحضرت ﷺ کی خدمت ورفاقت میں رہے ہوں اور یہ شرف بذاتِ خود اس درجہ کا ہے کہ ان کے علاوہ کوئی بھی فرد اس

مرتبہ میں ان کا شریک نہیں ہوسکتا' لہٰذا اس امت کا کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی بلا استثناء کسی بھی صحابیؓ کے مرتبہ جیسی فضیلت نہیں رکھ سکتا! قوت القلوب میں کیا خوب لکھا ہے کہ جمال مصطفیٰ ﷺ پر پڑنے والی ایک ہی نظر سے وہ حقائق آشکارا ہو جاتے ہیں اور وہ مقام و مقصد حاصل ہو جاتا ہے جو دوسروں کو سالہاسال کے چلوں اور قرنہا قرن کی ریاضت ومجاہدہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ (مظاہر حق)

تخریج: اس حدیث کو ابن جریر نے، امام بغوی نے اپنی معجم میں، ابن منذر، ابن ابی حاتم، طبرانی، ابوالشیخ، ابن مردویہ، حاکم، اور بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں عن ابی امیة الشعبانی دریں الفاظ نقل کیا ہے:

قال: قال: أتیت أبا ثعلبة الخشني فقلت له، کیف تصنع في هذه الآیة؟ قال: أی آیة؟ قلت: قوله تعالٰی: ﴿یا أیها الذین آمنوا علیکم أنفسکم﴾ [المائدة۔۱۰۵] **قال: أما واللّٰه لقد سألت عنها خبیرا، سألت عنها رسول اللّٰه ﷺ الحدیث الی ان قال: فان من ورائکم أیام الصبر، الصابر فیهن مثل القابض علی الجمر، للعامل فیهن مثل أجر خمسین رجلا، یعملون مثل عملکم** اس حدیث کو امام بغوی نے اپنی تفسیر میں اپنی سند کے ساتھ **ابن المبارك، عن عتبة بن ابی حکیم** بالفاظ اصل مشکوٰۃ **مثل عمله** نقل کیا ہے، اور اس کے بعد فرمایا، **وزاد في غیره، قال: یا رسول اللّٰه! أجر خمسین منهم؟ قال: أجر خمسین منکم**

اسنادی حیثیت: امام ترمذی اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

آپ ﷺ کا خطبہ دُنیا اور عورتوں سے خبردار رہو

۵۱۴۵: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَامَ فِیْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَطِیْبًا بَعْدَ الْعَصْرِ فَلَمْ یَدَعْ شَیْئًا یَكُوْنُ اِلٰی قِیَامِ السَّاعَةِ اِلَّا ذَكَرَهٗ حَفِظَهٗ مَنْ حَفِظَهٗ وَنَسِیَهٗ مَنْ نَسِیَهٗ وَكَانَ فِیْمَا قَالَ اِنَّ الدُّنْیَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ وَاِنَّ اللّٰهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِیْهَا فَنَاظِرٌ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ اَلَا فَاتَّقُوا الدُّنْیَا وَاتَّقُوا النِّسَآءَ وَذَكَرَ اَنَّ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَآءً یَوْمَ الْقِیٰمَةِ بِقَدْرِ غَدْرَتِهٖ فِی الدُّنْیَا وَلَا غَدْرَ اَكْبَرُ مِنْ غَدْرِ اَمِیْرِ الْعَامَّةِ یُغْرَزُ لِوَآئُهٗ عِنْدَ اِسْتِهٖ قَالَ وَلَا یَمْنَعَنَّ اَحَدًا مِّنْكُمْ هَیْبَةُ النَّاسِ اَنْ یَّقُوْلَ بِحَقٍّ اِذَا عَلِمَهٗ وَفِیْ رِوَایَةٍ اِنْ رَاٰی مُنْكَرًا اَنْ یُّغَیِّرَ فَبَكٰی اَبُوْ سَعِیْدٍ وَقَالَ قَدْ رَاَیْنَاهُ فَمَنَعَتْنَا هَیْبَةُ النَّاسِ اَنْ نَّتَكَلَّمَ فِیْهِ ثُمَّ قَالَ اَلَا اِنَّ بَنِیْ اٰدَمَ خُلِقُوْا عَلٰی طَبَقَاتٍ شَتّٰی فَمِنْهُمْ مَنْ یُّوْلَدُ مُؤْمِنًا وَیَحْیٰی مُؤْمِنًا وَیَمُوْتُ مُؤْمِنًا وَمِنْهُمْ مَنْ یُّوْلَدُ كَافِرًا وَّیَحْیٰی كَافِرًا وَّیَمُوْتُ كَافِرًا وَمِنْهُمْ مَنْ یُّوْلَدُ مُؤْمِنًا وَّیَحْیٰی مُؤْمِنًا وَّیَمُوْتُ كَافِرًا وَّمِنْهُمْ مَنْ یُّوْلَدُ كَافِرًا وَّیَحْیٰی كَافِرًا وَّیَمُوْتُ مُؤْمِنًا قَالَ وَذَكَرَ الْغَضَبَ فَمِنْهُمْ مَنْ یَّكُوْنُ سَرِیْعَ الْغَضَبِ سَرِیْعَ الْفَیْءِ فَاِحْدٰهُمَا بِالْاُخْرٰی وَمِنْهُمْ مَنْ یَّكُوْنُ بَطِیْءَ الْغَضَبِ بَطِیْءَ الْفَیْءِ فَاِحْدٰهُمَا بِالْاُخْرٰی وَخِیَارُكُمْ مَنْ یَّكُوْنُ بَطِیْءَ الْغَضَبِ سَرِیْعَ الْفَیْءِ وَشِرَارُكُمْ مَنْ یَّكُوْنُ

سَرِيْعَ الْغَضَبِ بَطِيْءَ الْفَيْءِ قَالَ اتَّقُوْا الْغَضَبَ فَاِنَّهٗ جَمْرَةٌ عَلٰى قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ اَلَا تَرَوْنَ اِلَى انْتِفَاخِ اَوْدَاجِهٖ وَحُمْرَةِ عَيْنَيْهِ فَمَنْ اَحَسَّ بِشَيْءٍ مِنْ ذٰلِكَ فَلْيَضْطَجِعْ وَلْيَتَلَبَّدْ بِالْاَرْضِ قَالَ وَذَكَرَ الدَّيْنَ فَقَالَ مِنْكُمْ مَنْ يَكُوْنُ حَسَنَ الْقَضَآءِ وَاِذَا كَانَ لَهُ اَفْحَشَ فِى الطَّلَبِ فَاِحْدَاهُمَا بِالْاُخْرٰى وَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ سَيِّءَ الْقَضَآءِ وَاِنْ كَانَ لَهُ اَجْمَلَ فِى الطَّلَبِ فَاِحْدٰهُمَا بِالْاُخْرٰى وَخِيَارُكُمْ مَنْ اِذَا كَانَ عَلَيْهِ الدَّيْنُ اَحْسَنَ الْقَضَآءَ وَاِنْ كَانَ لَهُ اَجْمَلَ فِى الطَّلَبِ وَشِرَارُكُمْ مَنْ اِذَا كَانَ عَلَيْهِ الدَّيْنُ اَسَآءَ الْقَضَآءَ وَاِنْ كَانَ لَهُ اَفْحَشَ فِى الطَّلَبِ حَتّٰى اِذَا كَانَتِ الشَّمْسُ عَلٰى رُؤُسِ النَّخْلِ وَاَطْرَافِ الْحِيْطَانِ فَقَالَ اَمَا اِنَّهٗ لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنْيَا فِيْمَا مَضٰى مِنْهَا اِلَّا كَمَا بَقِىَ مِنْ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِيْمَا مَضٰى مِنْهُ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤١٩ حدیث رقم ٢١٩١ و ابن ماجه فی السنن ٢/١٣٢٥ حدیث رقم ٤٠٠٠ واحمد فی المسند ٣/٦١۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے مابین عصر کے بعد خطبہ دے رہے تھے اس خطبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک پیش آنے والے تمام حالات کو ذکر فرمایا اس میں کسی (ضروری) چیز کو نہیں چھوڑا ان کو جس نے یاد رکھا سو یاد رکھا اور جو بھول گیا سو بھول گیا اس موقعہ پر فرمائی گئی باتوں میں سے یہ بھی دنیا میٹھی سرسبز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس میں نائب بنایا ہے تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم کس طرح کام کرتے ہو خبردار! دنیا سے بچتے رہنا عورتوں سے بچنا (کہیں ان کے فتنہ میں مبتلا نہ ہو جانا) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہر دھوکا باز کے لئے قیامت کے دن اس کے دھوکے کی مقدار جھنڈا ہوگا' جھنڈا اس کا ہوگا جس نے خلیفہ کے ساتھ غدر کیا' سب سے زیادہ بڑا ہوگا اس کا جھنڈا اس کی شرمگاہ کے قریب گاڑا جائے گا (تاکہ اس کی مزید رسوائی ہو) اور فرمایا تم میں سے کسی کو حق بات جانتے ہوئے کہنے سے لوگوں سے مرعوب ہو کر نہ رکنا چاہیے۔ ایک روایت میں اس طرح ہے۔ اگر وہ دیکھے تو اس کو بدل یعنی روک دے یہ بات بیان کر کے ابوسعید رو پڑے اور کہنے لگے ہم لوگوں کو برائی میں دیکھتے تو لوگوں کے رعب کی وجہ سے ان کے متعلق بات کرنے سے ہم رک جاتے (ابوسعید کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا)۔ اولاد آدم مختلف طبقات میں پیدا کیے گئے ہیں ان میں سے بعض ایمان کی حالت میں پیدا ہوئے مؤمن ہی زندہ رہتے اور ایمان ہی پر ان کا خاتمہ ہوتا ہے اور ان میں سے بعض کفر کی حالت میں پیدا ہوئے اور کفر پر ہی زندہ رہتے اور ان کا خاتمہ کفر پر ہوتا ہے' راوی کہتے ہیں کہ آپ نے غصے کا ذکر فرمایا۔ ان میں سے بعض کو غصہ آتا ہے اور جلد ہی غصہ چلا جاتا ہے۔ پس ایک دوسرے کے بدلے جائے گا' ان میں سے بعض کو غصہ دیر سے آتا ہے اور دیر سے ٹھنڈا ہوتا ہے۔ پس ایک دوسرے کے ساتھ ہے اور تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جسے دیر سے غصہ آئے اور جلد چلا جائے اور تم میں سے برا شخص وہ ہے جسے جلد غصہ آئے اور دیر سے جائے فرمایا غصے سے بچو کیونکہ غصہ ابن آدم کے دل پر چنگاری ہے کیا تم نے اس کی رگوں کا پھولنا نہیں دیکھا اور اس کی آنکھوں کی سرخی نہیں دیکھی تو جو شخص غصہ محسوس کرے اسے چاہیے کہ پہلو کے بل لیٹ جائے راوی کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے قرض کا ذکر فرمایا فرمایا تم میں سے کوئی قرض احسن طریقے سے ادا کرتا ہے مگر جب اس نے کسی سے اپنا قرض لینا ہوتا ہے تو لینے میں فحش کلامی (درشتی) کرتا ہے دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں اوران میں سے کوئی شخص قرض ادا کرنے میں برا ہے لیکن اگر اس نے کسی سے اپنا قرض لینا ہو تو لینے میں اچھا ہے پس یہ ایک دوسرے کے مقابل ہے اور تم میں سے بدترین شخص وہ ہے کہ جب اس پر کسی کا قرض ہو تو ادا کرنے میں برا ہو اور اپنی قرض لینے کا معاملہ ہو تو فحش گوئی کرتا ہو یہاں تک کہ سورج کھجور کے درختوں کی چوٹیوں اور دیواروں کے کناروں تک باقی رہ گیا۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا ہاں نہیں باقی رہا دنیا کی زندگی کا وہ وقت جو گذرے ہوئے وقت کے مقابلے میں ہے مگر جتنا آج کے دن بقیہ وقت باقی ہے گذرے ہوئے دن سے۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: ان الدنیا حلوة خضرة: اور جامع کی روایت میں یوں ہے: أما بعد: فان الدنیا......

حلوة، بضم الحاء ہے۔

قوله: ألا فاتقوا الدنیا واتقوا النساء: یہ ألا برائے تنبیہ ہے۔

وذکر ان لکل: "ان" کو بفتح الھمزہ اور بکسر الھمزہ دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔

غدرته: مصدر بمعنی "غدر" ہے۔

لا یمنع: بصیغہ مذکر و مؤنث ہر دو طرح درست ہے۔

أن یقول بحق: النہایہ میں لکھتے ہیں، کلام عرب میں قول، تمام افعال سے عبارت ہے، اس کا اطلاق غیر کلام پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: قال بیده ای أخذ وقال برجله أی مشی

وفی روایة: یعنی ایک روایت میں "أن یقول بحق" کے بجائے یہ الفاظ ہیں جو آگے آرہے ہیں: بطیی بروزن فعیل ہے، بطأ سے ماخوذ ہے، کبھی ادغام اور کبھی ابدال بھی ہوتا ہے۔ سریع کی ضد ہے۔

قوله: حتی اذا کانت الشمس علی رؤوس النخل وأطراف الحیطان:

طیبیؒ فرماتے ہیں: "حتی اذا کانت الشمس"، قام فینا خطیبا کی غایت ہے أی: قام فلم یدع شیئاً الا ذکره، حتی اذا کانت الشمس أو قعت۔

الحیطان: حائط بمعنی "جدار" کی جمع ہے۔

اذا مستقبل کیلئے ہے اور کانت فعل ماضی ہے، یہ اسلوب کلام استحضار الحال الماضیة فی مشاهدة السامع کا فائدہ دے رہا ہے۔ جیسا کہ یہ آیت کریمہ: ﴿وَقَالُوا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ......﴾ [آل عمران: ١٥٦] صاحب کشاف لکھتے ہیں: هو علی حکایة الحال الماضیة کقوله حین یقربون فی الأرض

قوله: فقال أما انه لم یبق من الدنیا...... :

أما: برائے تنبیہ ہے اور "انه" میں ضمیر "ضمیر شان" ہے۔

الا کما بقی: لم یبق کے فاعل سے مستثنیٰ ہے۔ أی: لم یبق شیء من الدنیا الامثل ما بقی من یومکم هذا

قوله:ثم قال :ألا ان بنی آدم خلقوا علی طبقات شتی۔۔۔۔ ویموت مؤمنا :

بنی آدم کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا، چونکہ ملائکہ صرف خیر کیلئے پیدا کیئے گئے ہیں، اور شیاطین محض شر کیلئے پیدا کیئے گئے ہیں، چنانچہ اول الذکر مخلوق مظاہر جمال ہے، اور مؤخر الذکر مخلوق مظاہر جلال ہے۔ اور بنی آدم کی تخلیق وصف کمال پر ہوئی۔

ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی: **ان اللّٰہ خلق آدم علی صورته** کا یہی مطلب ہو، کہ اللہ جل شانہ نے آدم کو اپنی صفت کمال یعنی صفات جلالیہ وکمالیہ پر بنایا۔ اور جب ان میں یہ قابلیت کاملہ ودیعت فرمادی، تو اس امانت کے بار گراں کے متحمل ہوگئے کہ جو امانت آسمان وزمین اور پہاڑوں یعنی علویات وسفلیات پر پیش کی گئی، تو انہوں نے اس امانت کو اٹھانے سے انکار کردیا، چونکہ ان میں استعداد نہ تھی، وہ عدم استطاعت کے باعث ڈر گئے اور انسان نے اس امانت کو اٹھالیا۔

چنانچہ حضرت انسان ایسا معجون مرکب ہے کہ جس میں نعوت ملکیہ بھی ہیں جو عنایت جمال ربانی کی موہب ہیں، اس میں صفات شیطانیہ بھی ہیں جو جلال صمدانی کے غضب کی موجب ہیں، اگر سالک ملائکہ کی طرف مائل ہوگیا، تو خیر ہوگی اور اگر شیطان کی طرف جھک گیا تو شر ہوگا۔

قوله :قال :وذکر الغضب فمنهم من یکون سریع الغضب......:

عقلی طور پر اس کی چار ہی قسمیں بنتی ہیں، پانچویں قسم نہیں بنتی۔ اور اس میں اشارہ ہے، کہ صفات حمیدہ صفات ذمیمہ پر غالب آجائیں، ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ صفات محمودہ بالکلیہ معدوم ہوجائیں۔ چنانچہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں اسی طرف اشارہ ہے: ﴿**والکاظمین الغیظ**﴾ کہ "**والعادمین**" نہیں فرمایا، چونکہ اصل خلق میں تغیر وتبدل نہیں ہوتا، چانچہ اسی وجہ سے مروی ہے: **ولو سمعتم أن جبلا زال عن مکانه فصدقوه، وان سمعتم أن رجلا غیر عن خلقه أی الاصلی فلا تصدقوه**

البتہ یہ حدیث تبدیل اخلاق کے جواز پر دلالت کرتی ہے: **اللهم اهدنی لصالح الاخلاق لا یهدی لصالحها الا أنت، وانصرف عنی سیئها لا یصرف عنی سیئها الا أنت قوله: قال اتقوا الغضب۔۔۔ولیتلبد با لأرض:**

قال کے اعادہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ راوی کو یہ حدیث طوالت کی وجہ سے کامل طور پر یاد نہیں رہ سکی۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد، ترمذی، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابوسعید سے کچھ تغیر وزیادت کے ساتھ نقل کیا ہے۔

"یہ دنیا بڑی شیریں اور ہری بھری ہے" کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا اپنے متعلقات کے ساتھ بظاہر اس قدر لذت آمیز اور خوش نما ہے کہ محض ظاہری حالت پر رکھنے والے لوگوں کو طبعی طور پر اس سے بہت مناسبت اور اس کی طرف میلان ہوتا ہے اور ان کی آنکھوں میں اس کی حقیقت نہایت دلکش اور سرسبز معلوم ہوتی ہے!

اہل عرب کے نزدیک جو چیز نرم ونازک ہوتی ہے اور اپنی ناپائیداری کی وجہ سے زیادہ مدت نہیں ٹھہرتی بلکہ جلد جاتی رہتی ہے اس کو وہ لوگ خضروات یعنی سبزیوں اور ترکاریوں سے مشابہت دیتے ہوئے "خضراء" کہتے ہیں۔ بہر حال حدیث کے اس جملہ میں دراصل اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ دنیا مکر وتصنع اور ظاہری حسن ولذات سے بھری ہوئی ہے کہ لوگوں کو اپنے ظاہری ٹیپ ٹاپ رکھنے والے حسن وجمال پر فریفتہ کرتی ہے اور اپنی جھوٹی لذات اور خواہشات کی طرف مائل کرتی ہے حالانکہ

اس کی تمام تر دلکشی اور رنگینی اور خواہشات ولذات بہت جلد فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔

قولہ: ان الله مستخلفكم فيها فنا ظر كيف تعملون: اس کا پہلا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں تمہیں جو مال و دولت حاصل ہے اس کے بارے میں تم اس حقیقت کو جان لو کہ اس مال و دولت کے تم حقیقی مالک نہیں ہو بلکہ حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور تم صرف اس کے خرچ و تصرف میں خلیفہ اور وکیل کی حیثیت رکھتے ہو۔

اس کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان لوگوں کا خلیفہ قرار دیا ہے جو تم سے پہلے اس دنیا میں تھے اور ان کے اموال و جائیداد کو تمہاری سپردگی میں دے دیا ہے' لہٰذا وہ دیکھتا ہے کہ تم اپنے اموال و املاک کے بارے میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہو اور اس میں کس طرح تصرف کرتے ہو' تم گزرے ہوئے لوگوں کے احوال وانجام سے کس طرح عبرت پکڑتے ہو اور ان کے چھوڑے ہوئے اموال و جائیداد میں کس طرح تصرف کرتے ہو۔

قولہ: ألا فاتقو الدنيا و اتقوا النساء: ''تم دنیا سے بچو'' کا مطلب یہ ہے کہ جب تم نے دنیا کی حقیقت جان لی کہ وہ فنا ہونے والی چیز ہے اور اس کی کسی بھی شے کو کوئی استحکام و دوام نہیں ہے تو پھر اس کے پیچھے پڑنا نہایت نازیبا اور غیر دانش مندی کی بات ہے' لہٰذا تم دنیا کو اس قدر حاصل کرنے کی خواہش و کوشش نہ کرو جو ضرورت و حاجت سے زیادہ ہو اور ضرورت و حاجت بھی وہ کہ جس سے آبرومندانہ زندگی کی بقاء دین کی مدد اور آخرت میں نفع حاصل ہو۔'' اسی طرح عورتوں سے بچو'' کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے مکر و فریب اور ان کی ناروا محبت سے اپنے آپ کو بچاؤ کہ مبادا یہ چیز مال و دولت جمع کرنے کی حرص میں مبتلا کر دے جس کی وجہ سے تم علم و عمل کی راہ سے دور ہو جاؤ۔ اور الجامع کی روایت میں زیادت بھی منقول ہے: **فان اول فتنه بنی اسرائیل كانت فی النساء۔**

قولہ: ولا غدر اكبر من غدر امير العامة يغرز لواؤ ه عند استه: تورپشتیؒ فرماتے ہیں: ''امیر عامہ'' سے مراد متغلب ہے یعنی وہ شخص جو مسلمانوں کے معاملات اور ان کے ملک و شہر پر غالب و حکمران ہو گیا ہو اور عام لوگوں نے ارباب حل و عقد یعنی علماء اور دانشورانِ زمانہ کی رائے و مشورہ کے بغیر اس شخص کو امیر و حاکم تسلیم کر لیا ہو اور اس کے حامی و مددگار رہوں۔

يغرز: بصیغۂ مجہول ہے۔ **ای يضب لواؤه عند استه تحقير اله۔**

است: اس کے شروع میں یہ ہمزہ وصلی ہے' اس کا معنی ہے **مكسورة الدبر' حلقه دبر۔**

قولہ: فبكى ابو سعيد وقال۔۔۔ ان فتكلم فيه: اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کا رونا اس احساس کی بنا پر تھا کہ ہم نے کلمہ حق کہنے کے سلسلہ میں اس مرتبہ کو ترک کر دیا جو اولیٰ ہے اور وہ یہ کہ ہر حال میں حق بات کہی جائے خواہ اس کی پاداش میں جان ہی کیوں نہ دینی پڑے! ظاہر ہے کہ ان کا یہ احساس محض اس کے کمال ایمان اور دین کے تئیں شدت احتیاط پر مبنی تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس مرتبہ کو ترک کرنا اسلامی تعلیمات کے قطعاً خلاف نہیں تھا بلکہ ان احادیث پر عمل کرنے کی بناء پر تھا جن سے واضح ہوتا ہے کہ اہل ایمان کے ضعف واضمحلال کے زمانہ میں اور عجز و بے بسی کی صورت میں کلمہ حق کہنے سے سکوت اختیار کرنا جائز ہے' بشرطیکہ اس کی وجہ سے جان و مال اور آبرو کی ہلاکت و نقصان کا خوف ہو! اور جہاں تک بات ہے عزیمت کی سوان مذکورہ بالا باتوں کی پرواہ نہ چاہئے' اسی لئے آنحضرت **الجهاد كلمة حق عند سلطان جائز** ۔ جیسا کہ اس حدیث کو ابن ماجہ

نے ابوسعید سے اور محدثین کی ایک جماعت نے ابوامامہ وغیرہ سے روایت کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ:۲۰۷] ای یبیعها ببذلها فی الجها أو یأمر بالمعروف وینهی عن المنکر حتی یقتلك طلبا لرضاه لالغرض سواه۔ جب اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اکابر صحابہ کرامؓ جیسے عظیم انسان کو جو دین کے بارے میں انتہائی سخت و مضبوط تھے اور جو یقین و معرفت کی دولت سے پوری طرح مالا مال تھے اگر وہ اس وصف و مرتبہ کے باوجود اہل باطل جیسے یزید و حجاج سفاک وغیرہ کے خوف سے اظہارِ حق کی قدرت نہیں رکھتے تھے تو ہم جیسے مسلمانوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جو اہل ایمان کے انتہائی ضعف و اضمحلال کا زمانہ پائے ہوئے ہیں جن میں باعمل علماء اور ایمانی جرأت و ایثار رکھنے والے راہبر کم ہیں جو ریاکار مشائخ و صوفیاء کی کثرت رکھتے ہیں اور جن پر اکثر ظالم امراء و حکماء مسلط ہیں! لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ زمانہ صبر و تحمل، رضا بالقضاء اور سکوت و یکسوئی اختیار کرنے اور بقدر بقاء زندگی معاشی ضروریات کے حصول پر قناعت کرنے کا ہے۔

''بعض وہ ہیں جن کو مؤمن پیدا کیا جاتا ہے'' یعنی ان کی پیدائش مؤمن ماں باپ کے یہاں یا مسلم آبادی یا شہر میں ہوتی ہے اور اس اعتبار سے ان کو مؤمن کہا جاتا ہے۔ یہ وضاحت اس لئے کی جاتی ہے کہ جب کوئی شخص پیدا ہوتا ہے تو سن تمیز کو پہنچنے سے قبل اس کی طرف ایمان کی نسبت نہیں کی جاتی، یہ اور بات ہے کہ علم الٰہی کے اعتبار سے یا اس سے آئندہ زمانہ کی حالت کے اعتبار سے اس کی طرف ایمان کی نسبت کر دی جائے۔

اسی طرح ''بعض وہ ہیں جن کو کافر پیدا کیا جاتا ہے'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو کافر ماں باپ سے پیدا ہوتے ہیں یا جن کی پیدائش کافروں کی آبادی اور ان کے شہر میں ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے حدیث کا یہ جملہ اس حدیث کے منافی نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہے: کل مولود یولد علی الفطرۃ کیونکہ اس ارشاد گرامی (کل مولود الخ) کی مراد یہ بتانا ہے کہ جو بھی شخص اس دنیا میں آتا ہے وہ فطری طور پر ہدایت و راستی قبول کرنے کی استعداد و صلاحیت رکھتا ہے بشرطیکہ کوئی ایسا مانع پیش نہ آئے جو اس کو گمراہی کے راستہ پر ڈال دے جیسا کہ خود اسی حدیث کے بعد کے الفاظ :فابواہ یھودانه...... اس پر دلالت کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا ارشادِ گرامی میں لوگوں کی جو قسمیں بیان کی گئی ہیں وہ غالب و اکثریت کے اعتبار سے ہیں، ورنہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مؤمن پیدا ہوتے ہیں، کفر کی حالت پر زندگی گزارتے ہیں، لیکن ان کا خاتمہ ایمان ہی کی حالت پر ہوتا ہے، اسی طرح بعض وہ ہیں جو کافر پیدا ہوتے ہیں، ایمان کی حالت پر زندگی گزارتے ہیں لیکن ان کا خاتمہ کفر کی حالت پر ہوتا ہے۔

نعوذ باللہ من ذلك ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں قسمیں اس لئے ذکر نہ فرمائی گئی ہوں کہ یہاں حقیقی مقصد اس بات کو واضح کرنا ہے کہ ہدایت و گمراہی میں اصل اعتبار خاتمہ کی حالت کا ہے، اور یہ بات مذکورہ قسمیں بیان کرنے سے بھی اجمالی طور پر سمجھ میں آجاتی ہے۔

قوله: فمن احسن شیئی من ذلك فلیضطجع و لیتلبد بالارض: ''پہلو پر لیٹ جائے اور زمین سے چمٹ جائے'' غصہ آنے کے وقت اس حالت کو اختیار کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ حالت نفسیاتی طور پر غصہ کو فرو کرنے کا

بہترین ذریعہ ہے' کیونکہ غصہ کے وقت زمین سے لگ کر پہلو پر لیٹ جانا فوری طور پر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ جب میری حقیقت بس اتنی ہے کہ میں مٹی سے پیدا ہوا اور آخرکار مٹی ہی میں مل جاؤں گا تو مجھ کو تکبر نہ کرنا چاہئے بلکہ تحمل اور انکساری کی راہ اختیار کرنی چاہئے۔

معذور بنا لینے میں ہلاکت کا خطرہ

۵۱۴۶: وَعَنْ اَبِی الْبَخْتَرِیّ عَنْ رَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَنْ یَّهْلِکَ النَّاسُ حَتّٰی یُعْذِرُوْا مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه ابوداؤد في السنن ٤/ ٥١٥ حديث رقم ٤٣٤٧، واحمد في المسند ٤/ ٢١٠۔

ترجمہ: حضرت ابوالبختری نے ایک صحابی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ کہ لوگوں کو ہرگز ہلاک نہیں کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو معذور بنالیں۔ (ابوداؤد)

تشریح: لن یہلك: پہلے فتحہ اور پھر کسرہ ہے۔

"یعذروا": یاء کے پیش' عین کے جزم اور ذال کے زیر اور زبر کے ساتھ ہے "اعذار" سے مشتق ہے اور ایک نسخہ میں یاء کے زبر اور ذال کے زیر کے ساتھ ہے قاضیؒ نے لکھا ہے کہ یہ أعذر فلان سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے کثر ذنبہ بہت گناہ گار ہونا۔ اس طرح قاموس میں لکھا ہے کہ اعذر فلان ای کثرت ذنوبه وعیوبه (یعنی جب اہل عرب یہ کہتے ہیں کہ "اعذر فلان" یعنی فلاں شخص نے اعذار کیا تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس شخص سے بکثرت گناہ اور عیوب صادر ہوئے۔) مفہوم کے اعتبار سے حدیث نے اس جملہ میں اعذار کا لفظ گویا سلب عذر کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی جب کسی شخص کے گناہ اور عیوب بکثرت ہو جائیں تو پھر اس پر حق تعالیٰ کے عذاب کے نازل ہونے اور لوگوں کی طرف سے ان کو ان گناہ وعیوب سے روکنے اور منع کرنے میں کوئی عذر حائل نہیں رہ جاتا' لہٰذا اس شخص نے اپنے گناہوں اور عیوب کی کثرت کے سبب گویا اس عذر کو ختم کر دیا جو اس کو عذاب الٰہی سے محفوظ رکھتا ہے۔

یا یہ "اعذر" بمعنی صار ذا اعذر سے ماخوذ ہے۔ "صاحب عذر ہونا" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ معنی بھی حدیث کے مفہوم سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ لوگ اس وقت تک ہلاکت و بربادی میں مبتلا نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے اور اپنی برائیوں کے بارے میں دور دراز کی تاویلیں اور ناروا عذر و معذرت کرنے کا رویہ اختیار نہ کریں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ معنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے باب کے زیادہ مناسب ہیں گویا کہ ناہی اس کے گناہ پر نکیر کر رہا ہے اور وہ گناہ سے تبری کر رہا ہے اور اپنے لئے اور اقدام کے لئے عذر خواہی کر رہا ہے۔ اور ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ "اعذر الرجل" بمعنی "صار ذا ذنب کثیر" سے ماخوذ ہے۔ اور "من" بیانیہ ہے۔ ای تکثر ذنوب أنفسهم لا ذنوب غیر هم۔ یہ بصیغۂ مجہول بھی مروی ہے' جو "اعذرہ" بمعنی "سلب عذرہ" سے ماخوذ ہے ای حتی یجعلهم الله بحیث لا اور یاء کے فتحہ کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا: حتی یعذروا انفسهم بتأویلات زائغة

وأعذار باطلة

بعض روایتوں میں یہ لفظ یعذروا (یاء کے زبر کے ساتھ) منقول ہے جس کا مادہ اشتقاق عذر (عین کے زبر کے ساتھ) ہے اور یا یہ أعذر غیرہ بمعنی جعلہ معذورا سے ماخوذ ہے اس کے معنی ہیں معذور رکھنا! اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ لوگ اس وقت تک ہلاکت وتباہی میں مبتلا نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ لوگوں کو اس طرح معذور و مجبور نہ کر دیں کہ وہ ان کو کثرت گناہ اور برائیوں میں مبتلا دیکھ کر ان کو ان گناہوں اور برائیوں سے نہ روک سکیں اور نہ ان پر ملامت کر سکیں۔

عرضِ مرتب:

بہرحال تینوں صورتوں میں حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دنیا کے مصائب و آفات اور ہلاکت وتباہی میں صرف اسی وقت مبتلا کرتا ہے جب کہ وہ گناہوں اور خلاف شرع امور کے ارتکاب میں منہمک ہو جاتے ہیں' احکام الٰہی کی نافرمانی کثرت سے کرنے لگتے ہیں' اور جب خدا کے نیک بندے ان کو گناہوں اور برائیوں سے روکتے ہیں تو ان کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے بلکہ نہایت بے حسی اور لاپرواہی کے ساتھ اپنی اختیار کی ہوئی راہ پر چلتے رہتے ہیں۔ (مظاہر حق)

تخریج: اس حدیث کو امام احمد نے اپنی مسند میں اسناد حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔

خاص لوگوں کی وجہ سے عام کو عذاب نہیں دیا جاتا

۵۱۴۷: وَعَنْ عَدِيِّ بْنِ عَدِيِّ الْكِنْدِيِّ قَالَ حَدَّثَنَا مَوْلًى لَنَا اَنَّهُ سَمِعَ جَدِّيْ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَا يُعَذِّبُ الْعَامَّةَ بِعَمَلِ الْخَاصَّةِ حَتّٰى يَرَوُا الْمُنْكَرَ بَيْنَ ظَهْرَانِيْهِمْ وَهُمْ قَادِرُوْنَ عَلٰى اَنْ يُّنْكِرُوْهُ فَلَا يُنْكِرُوْا فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَذَّبَ اللّٰهُ الْعَامَّةَ وَالْخَاصَّةَ۔

(رواه في شرح السنة)

أخرجه البغوي في شرح السنة ١٤/٣٤٦، حديث رقم ٤١٥٥ و مالك في الموطأ ٢/٩٩١ حديث رقم ٢٣ من باب ماجاء في عذاب العامة بعمل الخاصة، واحمد في المسند ٤/١٩٤۔

ترجمہ: حضرت عدی بن عدی کندی کہتے ہیں کہ ہمیں ہمارے ایک مولیٰ نے حدیث بیان کی اس نے میرے دادا سے سنا وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ خاص لوگوں کے عمل کی وجہ سے عام لوگوں کو عذاب نہیں دیتا یہاں تک کہ وہ اپنے درمیان برے اعمال ہوتے ہوئے دیکھیں اور وہ ان برے کاموں کے روکنے پر قادر ہوں اور نہ روکیں تو جب صورت حال یہ ہو تو اللہ تعالیٰ عام اور خاص سب کو اکٹھا عذاب میں مبتلا فرما دیتا ہے۔ (شرح السنہ)

راویٔ حدیث:

عدی بن عدیؒ۔ نام عدی۔ عدی کے بیٹے ہیں۔ ''بنو کندہ'' میں سے ہیں۔ اپنے والد ''عدی'' اور ''رجاء بن حیوہ'' سے روایت کی۔ ان سے عیسیٰ بن عاصم وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ مؤلف رحمہ اللہ نے ان کے والد کے حالات ذکر نہیں فرمائے۔

تشریح: قوله: وهم قادرون على ان ينكروه: یہ جملہ حالیہ معترضہ ہے۔

فلا ينكروا: کا عطف ''يروا المنكر'' پر ہے۔

قوله: فاذا فعلوا ذلك عذب الله العامة والخاصة: ذلك کا مشار اليه ما ذكر من سكوتهم عن المنكر مع قدرة الأكثر ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ قوم کے ان بعض افراد کو تو ان کی بدعملیوں اور احکامِ خداوندی کی نافرمانیوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے اور باقی افراد کو اس لئے عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے کہ انہوں نے قدرت وطاقت کے باوجود ان بعض افراد کو بدعملیوں سے باز کیوں نہیں رکھا اور برائیوں کو مٹانے کا فریضہ انجام کیوں نہیں دیا۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة﴾ [الانفال۔ ۲۵]

ظلم کو روکو ورنہ عذاب عام ہو جائے گا

۵۱۴۸: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا وَقَعَتْ بَنُوْا اِسْرَائِيْلَ فِي الْمَعَاصِيْ نَهَتْهُمْ عُلَمَآؤُهُمْ فَلَمْ يَنْتَهُوْا فَجَالَسُوْهُمْ فِيْ مَجَالِسِهِمْ وَاٰكَلُوْهُمْ وَشَارَبُوْهُمْ فَضَرَبَ اللّٰهُ قُلُوْبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ فَلَعَنَهُمْ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسٰى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ قَالَ فَجَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَكَانَ مُتَّكِئًا فَقَالَ لَا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ حَتّٰى تَاطِرُوْهُمْ اَطْرًا (رواه الترمذی وابوداؤد وفی روایته) قَالَ كَلَّا وَاللّٰهِ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَاْخُذُنَّ عَلٰى يَدَيِ الظَّالِمِ وَلَتَاْطِرُنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ اِطْرًا وَلَتَقْصُرُنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ قَصْرًا اَوْ لَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ بِقُلُوْبِ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ثُمَّ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ۔

أخرجه ابوداؤد فی ٤/٥١٩ حدیث رقم ٤٣٣٧، والترمذی فی السنن ٥/٢٣٥ حدیث رقم ٣٠٤٧ و ابن ماجه فی السنن ٢/١٣٢٧ حدیث رقم ٤٠٠٦ واحمد فی المسند ١/٣٩١۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بنی اسرائیل گناہوں میں پڑ گئے ان کے علماء نے انہیں روکا تو وہ نہیں رکے تو ان کے علماء نے ان کی مجلسوں میں بیٹھنا شروع کر دیا اور وہ ان (برے لوگوں کے) ساتھ کھاتے پیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بعض کے دلوں کو بعض سے ملا دیا حضرت داؤد حضرت عیسیٰ ابن مریم سے ان پر لعنت فرمائی یہ اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کرتے تھے راوی نے کہا کہ رسول

اللہ ﷺ بیٹھے تھے اس حال میں کہ آپ ٹیک لگائے ہوئے تھے تو آپ نے فرمایا قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہاں تک کہ تم ان کو ظلم کرنے سے پوری طرح روک لو۔ اور ایک روایت میں ہے فرمایا ہرگز نہیں خدا کی قسم! تم ضرور بالضرور نیکی کا حکم دو اور فرمایا ضرور بالضرور برائی سے روکو اور البتہ ضرور بالضرور تم ظالم کا ہاتھ پکڑو اور ضرور بالضرور اسے حق کی طرف کھینچ لو اور اسے تم حق پر قائم رہنے پر مجبور کر دو ورنہ اللہ تعالیٰ تم سے بعض کے دلوں کو بعض سے ملا دے گا۔ پھر وہ ضرور بالضرور تم پر لعنت کرے گا جیسا کہ اس نے دوسروں پر لعنت کی تھی۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: لما وقعت بنواسرائيل --- وشارلوهم:

فجالسوا، آكلوا، شاربوا: یہ تینوں فعل باب مفاعلہ سے ہیں، اور باب مفاعلہ میں یہاں مشارکت کا خاصہ ہے۔

قوله ضرب الله قلوب بعضهم ببعض:

امام راغبؒ فرماتے ہیں: يقال: ضرب اللبن بعضه ببعضه اى خلطه

قوله: فلعنهم على لسان دادو--- وكانوا يعتدون: اس میں تغلیب ہے، جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں: ﴿لعن الذين كفروا من بني اسرائيل﴾

بما عصوا: یہ باء سببیہ ہے۔ أي بسبب عصيانهم

قوله: فقال لا والذى نفسي بيده حتى تأطر وهم أطرا: لا: یہاں اس کے بعد مختلف فعل مقدر مانے جا سکتے ہیں: مثلاً تعذرون، تنجون

تأطروهم: ہمزہ ساکن ہے، الف سے بھی بدلا جا سکتا ہے، اور طاء مکسورہ ہے۔

أطراً: ہمزہ مفتوح ہے۔ مفعول مطلق ہے اور برائے تاکید لایا گیا ہے۔ أي حتى تمنعوا أمثالكم الخ ایک شارح نے لکھا ہے: "أطر" کے معنی ہیں الامالة والتحريف من جانب الى جانب أى حتى تمنعوا الظلمة والفقة عن الظلم والفسق وتميلوهم عن البطل الى الحق

الفائق میں لکھتے ہیں: حتى، لا کے متعلق ہے، بایں طور کہ گویا کسی قائل نے بنی اسرائیل کے مظالم کا سن کر یوں کہا: هل يعذر في تخلية الظالمين وشأنهم؟ فقال: لا، حتى تأطروهم الخ قسم کو "لا" اور "حتى" کے درمیان ذکر فرمانا، یہ قسم وہ نہیں ہے کہ جس کے بدلے میں مقسم کو ذکر کیا جائے تاکید کی قسم کیلئے۔

قوله: وفي روايته قال: كلا والله الخ:

وفي روايته: یہ ضمیر "ابی داؤد" کی طرف راجع ہے۔ اور ایک نسخہ میں "وفي رواية" ہے۔ أي لأبي داود على ما هر الظاهر، ويحتمل الترمذي أو لهما أو لغيرهما

على يدى الظالم: تثنیہ کا صیغہ مبالغہ کیلئے لایا گیا ہے، اور ایک نسخہ میں بصیغہ مفرد ہے، چنانچہ یا تو جنس مراد ہے یا ایک پر اکتفاء مقصود ہے۔

٭ لتقصرنه: صاد کے ضمہ کے ساتھ ہے

ليضربن الله بقلوب: باء زائدہ تعدیہ کی تاکید کیلئے ہے۔ جیسا کہ ماقبل میں گزرا کہ یہ (یعنی ضرب) براہ راست متعدی ہوتا ہے۔

ابن الملک" فرماتے ہیں کہ لفظ ببعض میں حرف باء سببیت کے لئے ہے' اس صورت میں مذکورہ جملہ کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے گناہگاروں کی نحوست کے سبب سے ان لوگوں کے دل بھی سیاہ کر دیئے جنہوں نے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا تھا لہٰذا وہ سب کے سب سخت دل ہو گئے حق وراستی کی راہ قبول واختیار کرنے کی استعداد وصلاحیت ان سب میں سے ختم ہو گئی اوران میں کا ہر ایک شخص خیر ورحمت سے دور ہو گیا' اور یہ اس لئے ہوا کہ ان میں سے جن لوگوں نے گناہ اور برائی کی راہ اختیار کی تھی ان کو تو اپنے گناہوں کی سزا ملی' اور جنہوں نے گناہ نہیں کئے تھے ان کو اس لئے مبتلا کیا گیا کہ گناہگاروں کے ساتھ خلط ملط رکھا اوران کے بارے میں سکوت ومداہنت کا رویہ اختیار کیا۔ (انتھیٰ)

عمل سے دُور خطباء کا بدلہ

۵۱۴۹: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رَاَيْتُ لَيْلَةَ اُسْرِيَ بِيْ رِجَالًا تُقْرَضُ شِفَاهُهُمْ بِمَقَارِيْضَ مِنْ نَارٍ قُلْتُ مَنْ هٰؤُلَاءِ يَا جِبْرَئِيْلُ قَالَ هٰؤُلَاءِ خُطَبَاءُ مِنْ اُمَّتِكَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَيَنْسَوْنَ اَنْفُسَهُمْ (رواه في شرح السنة والبيهقي في شعب الايمان وفي رواية) قَالَ خُطَبَاءُ مِنْ اُمَّتِكَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَيَقْرَءُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَلَا يَعْمَلُوْنَ

أخرجه البغوي في شرح السنة ۱۴/۳۵۳ حديث رقم ۴۱۵۹، والبيهقي في شعب الايمان ۲/۲۸۳ حديث رقم ۱۷۷۳، واحمد في المسند ۳/۱۲۰۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے شب معراج کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کترے جارہے ہیں میں نے پوچھا کہ جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت کے وہ علماء وواعظ اور مشائخ ہیں جو لوگوں کو تو نیکی کی تلقین کرتے تھے مگر خود اپنی ذات کو فراموش کر دیتے اس روایت کو بغوی نے شرح السنۃ میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور بیہقی کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا: یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے وہ واعظ وخطیب ہیں جو اس چیز کو کہتے تھے جس کو خود نہیں کرتے تھے جو کتاب اللہ کو پڑھتے تھے لیکن اس پر عمل نہیں کرتے تھے۔ (شرح السنۃ، بیہقی)

تشریح: قوله: رأيت ليلة أسرى بى رجا لاتقرض شفا هم بمقاريض من نار:

ليلة أسرى بى: "لیلة" کی اضافت ہے مابعد کی طرف' اور" أسري" فعل مجہول کا صیغہ ہے۔ اور ایک نسخہ میں 'لیلة" منصوب ہے مفعول فیہ ہونے کی وجہ سے۔ أى أبصرت ليلة اسرى بى فيها

رجالا تقرض: فعل مجہول کا صیغہ ہے۔

شفاهھم: فاء کے کسرہ کے ساتھ' جمع شفهة بالفتح وبكسر اس کا لام کلمہ ھا' جیسا کہ اس کی جمع اس پر دلالت کر رہی ہے۔

مقاریض: مقراض ،کی جمع ہے۔مقراض،میم کے کسرہ کے ساتھ'یہ کترنے کا معروف آلہ ہے۔من نار :(جار مجرور کا متعلق محذوف ہے۔)ای مخلوقة من نار۔

قوله:من هؤلاء يا جبريل؟ قال :هؤ لاء خطبا من اُمتك:

هؤلاء :اس کا مشار الیہ محذوف ہے۔ أی هؤلاء الرجال۔

خطباء من امتك :"من" بیانیہ ہے۔اور ایک نسخہ میں" خطباء أمتك" کے الفاظ ہیں۔

قوله:رواه في شرح السنة والبيهقي في شعب الايمان:

والبيهقي:اس کا عطف فاعل مقدر (البغوی) پر ہے۔

من أمتك:"من" بیانیہ ہے۔

الذين يقولون الخ یہ خطباء سے بدل ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے صفت ہو چونکہ اس میں کوئی توقیت نہیں ہے۔ برعکس شاعر کے اس قول کے:ولقد أمر علی اللئيم يسبني اور یہ بھی ممکن ہے کہ منصوب علی الذم ہو،یہ صورت اوجہ ہے۔ (ذکرہ الطیبی)

اس میں کلام ہے وہ یہ کہ اہل عربیت کا اتفاق ہے کہ اس جیسی تراکیب میں بدل بنانا،بنسبت دوسرے احتمالات کے اوجہ ہے۔جیسا کہ استاذہ اور بسملہ کے بارے میں تحقیق گذری ہے۔اور ان آیات میں بھی یہی صورت ہے:﴿الحمد لله رب العلمين﴾ [الفاتحة۔۲'غافر۔۶۵] ﴿فيه هدى للمتقين الذين يؤمنون﴾ [البقرة۔۲۔۳] ﴿وما يضل به الا الفاسقين الذين ينقضون﴾ [البقرة۔۲۶۔۲۷] اور نبی کریمؐ کا یہ ارشاد گرامی: بنی الاسلام علی خمس شهادة أن لا اله الا الله

اور جیسا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:ویل للجاهل مرة وويل للعالم سبع مرات "جاہل کے لئے ایک بار خرابی ہے اور (بے عمل) عالم کے لئے سات بار خرابی ہے''اور ایک حدیث مشہور میں یوں فرمایا گیا ہے:

اشد الناس عذابا يوم القيامة عالم لم ينفعه الله بعلمه

''قیامت کے دن لوگوں میں سب سے سخت عذاب کا مستوجب وہ عالم ہوگا جس کو اللہ نے علم سے فائدہ نہیں پہنچایا ہوگا''۔

قوله:هؤلاء خطباء أمتك يأمرون الناس بالبر وينسون أنفسهم:

محل انکار دوسرا جملہ (ينسون أنفسهم) ہے، پہلا جملہ ان کے اقوال وافعال کی شناعت کا بیان ہے،اور توبیخ ہے کہ ان کا علم مقرون بترک العمل ہے، یہ سزا بے عمل علماء وواعظین اور مشائخ کو ان کی بے عملی کی وجہ سے ملے گی۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿أتأمرون الناس بالبر وتنسون أنفسكم وأنتم تتلون الكتاب افلا تعقلون﴾[البقرة۔۴۴] أی سوء صنيعكم ''کیا تم لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو''۔اور دوسری جگہ یوں ارشاد فرمایا:﴿كبر مقتا عند الله ان تقولوا ما لا تفعلون﴾ [الصف۔۳]

خیانت کا نتیجہ

۵۱۵۰: وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُنْزِلَتِ الْمَآئِدَةُ مِنَ السَّمَآءِ خُبْزًا وَلَحْمًا وَّاُمِرُوْا اَنْ لَّا يَخُوْنُوْا وَلَا يَدَّخِرُوْا لِغَدٍ فَخَانُوْا وَادَّخَرُوْا وَرَفَعُوْا لِغَدٍ فَمُسِخُوْا قِرَدَةً وَّخَنَازِيْرَ۔

(رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥/٢٤٢ حديث رقم ٣٠٦١۔

ترجمہ: حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ آسمان سے روٹی اور گوشت والا دستر خوان اتارا گیا اور حکم دیا گیا کہ نہ خیانت کرنا اور نہ ہی کل کے لئے جمع کرنا تو انہوں نے خیانت بھی کی اور کل کے لئے ذخیرہ بھی کیا اور انہوں نے اٹھایا پس وہ بندروں اور سوروں کی شکلوں میں تبدیل کر دیئے جائیں گے۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: انزلت المائدة من السماء خبزا ولحما:

المائدة: امام راغبؒ فرماتے ہیں: "مائدہ" اس "طبق" کو کہتے ہیں جس پر کھانا رکھا جائے، ان میں سے ہر ایک کو مائدہ کہا جاتا ہے۔ یعنی حقیقت مشترکہ کے باعث، یا ان میں سے ایک کو باعتبار مجاورت کے مجازاً یا بذکر المحل وارادة الحال کے باعث۔

خبز او لحما: تمیز ہے۔

ولا یدخروا: دال مہملہ مشددہ کے ساتھ ہے، یہ اصل میں باب افتعال سے ہے، ذخیرۃ سے ماخوذ ہے۔ تحیۃ "لا یدخروا" میں ذال کو دال سے بدل کر دال کا دال میں ادغام کیا ہے۔

قوله: وادخروا ورفعوا الغد: یہ کلام ماقبل کیلئے تفسیر ہے۔

قوله: فمسخوا قردة وخنازیر: یہ دونوں اسم مفعول ثانی ہونے کے باعث منصوب ہیں۔ قاموس سے یہی مستفاد ہوتا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: مسخه كمنعه حول صورته الى أخرى ومسخه الله قردا فهو مسخ ومسيخ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ دونوں حال مقدرہ ہیں جیسا کہ اللہ جل شانہ کے اس فرمان میں ہے: ﴿وتنحتون من الجبال بيوتا﴾ [الشعراء۔١٤٩] اھ۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے جو لوگ بوڑھے تھے ان کو تو بندروں کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا اور جو لوگ جوان تھے ان کی صورتوں کو سوروں جیسی بنا دیا۔

الفصل الثالث:

اُمت کے لوگوں کو حکمرانوں کی طرف سے ملنے والی آفتیں

۵۱۵۱: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ تُصِيْبُ اُمَّتِيْ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ مِنْ سُلْطَانِهِمْ شَدَآئِدُ لَا يَنْجُوْا مِنْهُ اِلَّا رَجُلٌ عَرَفَ دِيْنَ اللّٰهِ فَجَاهَدَ عَلَيْهِ بِلِسَانِهٖ وَيَدِهٖ وَقَلْبِهٖ فَذٰلِكَ الَّذِيْ سَبَقَتْ لَهُ السَّوَابِقُ وَرَجُلٌ عَرَفَ دِيْنَ اللّٰهِ فَصَدَّقَ بِهٖ وَرَجُلٌ عَرَفَ دِيْنَ اللّٰهِ فَسَكَتَ

عَلَيْهِ فَإِنْ رَاى مَنْ يَّعْمَلُ الْخَيْرَ اَحَبَّهُ عَلَيْهِ وَإِنْ رَاى مَنْ يَّعْمَلُ بِبَاطِلٍ اَبْغَضَهُ عَلَيْهِ فَذٰلِكَ يَنْجُوا عَلٰى اِبْطَانِهِ كُلِّهِ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/٩٥ حديث رقم ٧٥٨٧۔

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ میری امت کا آخری زمانے میں ان کے حکمرانوں کی طرف سے سخت تکالیف پہنچیں گی اور ان سے نجات وہی شخص پائے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے دین کی پہچان دی ہوگی پس وہ دین کی خاطر اپنے دل اپنے ہاتھ اور اپنی زبان سے جہاد کرے گا یہ وہ شخص ہوگا جو مکمل طور پر آگے بڑھ جانے والا ہوگا اور دوسرے نمبر پر وہ آدمی ہوگا جس نے اللہ کے دین کو پہچانا اور اس کی تصدیق کی اور تیسرے نمبر پر وہ آدمی جس نے اللہ کے دین کو پہچانا اور اس پر خاموشی اختیار کی اگر اس نے کسی کو نیک عمل کرتے دیکھا تو اس سے محبت کرنے لگا اور اگر کسی برائی کرنے والے کو دیکھا تو اس سے نفرت کرنے لگا یہ اپنی باطنی حالت کی وجہ سے نجات پا جائیں گے۔ (بیہقی)

تشریح: انه: یہ ضمیر شان ہے۔

سلطان: سے مراد جنس بھی ہو سکتی ہے اور کوئی خاص شخص بھی مراد ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ یزید اور حجاج اور ان جیسے لوگ۔

لا ينجوا: یہ جملہ مستانفہ بیانیہ ہے، یا حال ہے۔

منه: سے سلطان اور اس کے شدائد و مظالم مراد ہیں، چونکہ وہ دونوں ایک ہی حکم میں ہیں، لہٰذا صیغہ مفرد کے ساتھ تعبیر کرنا درست ہے۔ اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں: منه کی ضمیر سلطان کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسم اشارہ کی جگہ واقع ہوئی ہو۔ یا شدائد کی طرف راجع ہے، باعتبار مذکور کے۔

یا باعتبار منکر کے "اور منکر" سے مراد "شدائد" ہیں، اور لا ينجوا پہلے احتمال کی تقدیر پر جملہ مستانفہ ہے، اور دوسرے احتمال کی بناء پر شدائد کی صفت ہے۔ اھ۔

برائی پر نفرت کا اظہار ضروری ہے

۵۱۵۲: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى جِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِاَهْلِهَا فَقَالَ يَارَبِّ اِنَّ فِيْهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ قَالَ فَقَالَ اقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ فَاِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ۔

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٦/٩٧ حديث رقم ٧٥٩٥۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں فلاں بستی کو اُلٹا دو۔ انہوں نے عرض کی اے میرے رب ان میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے ایک پل کے لئے بھی تیری نافرمانی نہیں کی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب پر پلٹ دو اس لیے کہ ان کا چہرہ کبھی کسی برائی کو دیکھ ایک

لحہ کے لئے بھی متغیر نہیں ہوا۔ (بیہقی)

تشریح: باھلھا: یہ "باء" مصاحت کیلئے ہے۔ای مصحوبة معھم

ان قلب: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "ان" مفسرہ ہے "اوحی" میں قول کے معنی ہیں۔اھ۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ "ان" مصدریہ ہواور باء مقدر ہو اور "اقلب" میں ہمزہ وصلی اور لام مکسور ہے۔

فی: فاء پر کسرہ ہے اور یا مشدد ہے، یہ "فی" تعلیلیہ بھی ہوسکتا ہے ای فی حقی و لا جلی ۔

عرضِ مرتب:

اس حدیث قدسی کا حاصل تھا کہ بے شک اس بندے نے کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی اور وہ ایک لحہ بھی برائی کی راہ پر نہ چلا مگر اس کا یہ جرم ہی کیا کم ہے کہ لوگ اس کے سامنے گناہ کرتے رہے اور وہ اطمینان کے ساتھ ان کو دیکھتا رہا برائی پھیلتی رہی اور لوگ خدا کی نافرمانی کرتے رہے مگر ان برائیوں اور نافرمانی کرنے والوں کو دیکھ کر اس کے چہرہ پر کبھی بھی اس طرح کے آثار پیدا نہیں ہوئے جن سے یہ معلوم ہو کہ اس کے دل میں برائیوں کے خلاف غیظ وغضب اور نفرت وعداوت کا کوئی جذبہ ہے لہٰذا شہر کے اور باشندوں کے ساتھ وہ شخص بھی ہلاکت و بربادی کا مستوجب ہے۔ **قولہ: اقلبھا علیه وعلیھم فان وجھه لم یتمعر فی ساعة قط:** اس شخص کا ذکر مقدم کرنا اور بستی والوں کو مؤخر کرنا در حقیقت اس شخص کے بارے میں سخت وعید کا اعلان ہے اور "ایک ساعت" کے الفاظ اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اگر وہ شخص اپنی پوری زندگی میں ایک مرتبہ بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے برائیوں کے خلاف غصہ ونفرت کا اظہار کر دیتا تو اس کی زندگی کے باقی حصے میں اس کی اس تقصیر سے درگزر کیا جاتا۔

قولہ: فقال: یا رب: ان فیھم عبدك فلانا لم یعصك طرفة عین:

یہ جملہ حفاظت اولیاء پر دلالت کرتا ہے۔

اُمیدِ رحمت

۵۱۵۴: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ یَسْأَلُ الْعَبْدَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَیَقُوْلُ مَالَكَ اِذَا رَاَیْتَ الْمُنْكَرَ فَلَمْ تُنْكِرْهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَیُلَقّٰی حُجَّتَهٗ فَیَقُوْلُ یَارَبِّ خِفْتُ النَّاسَ وَرَجَوْتُكَ ۔

(رواہ البیھقی الاحادیث الثلاثة فی شعب الایمان)

أخرجه ابن ماجه فی السنن ١٣٣٢/٢، حدیث رقم ٤٠١٧ والبیھقی فی شعب الایمان ٩١/٦ حدیث رقم ٧٥٧٥۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ بندے سے قیامت کے دن پوچھیں گے اور فرمائیں گے کہ تمہیں کیا ہو گیا تھا جب تم نے برائی کو دیکھا تو اس کا انکار نہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو اس کی دلیل القاء کی جائے گی تو وہ کہے گا اے میرے رب لوگوں کا ڈر اور تیری رحمت کی امید اس بات سے مانع رہی۔ تینوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: فیلقی: قاف مفتوح و مشدد ہے۔

حجتہ منصوب ہے:

قولہ: فقیول :یارب خفت الناس و رجوتك: اس جملہ میں اس بندہ کی طرف سے اپنی تقصیر کا اقرار اپنے عجز کا اظہار اور رب کریم کے فضل و کرم پر اپنے یقین کا بیان ہے بیہقی نے کہا ہے یہ احتمال بھی ہے کہ اس حدیث کا تعلق اس شخص سے ہو جو خلاف شرع امور کا ارتکاب کرنے والوں کے غلبہ و دبدبہ سے ڈرتا ہو اور ان کی طرف سے پہنچائے جانے والے کسی بھی طرح کے نقصان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی طاقت و قدرت نہ رکھتا ہو۔ (ذکرہ الطیبی) اس سے معلوم ہوا کہ اگر لوگوں کے رعب داب کی وجہ سے کوئی شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہ دے سکے تو وہ مستوجب مواخذہ نہیں ہوگا اور حق تعالیٰ کی طرف سے اس کے حق میں عفو و درگزر کی امید رکھی جا سکتی ہے، لیکن یہ محل نظر ہے چونکہ ایسا شخص شریعت کی نظر میں معذور ہے، قیامت کے دن نہ تو اس سے مواخذہ ہوگا اور نہ اس کو معذرت کے لئے کسی تاویل کے سکھانے کی ضرورت ہوگی اس حدیث کا تعلق دراصل اس شخص سے ہے جس نے کسی عذر کے بغیر مذکورہ فریضہ کی انجام دہی میں کچھ تقصیر کی ہوگی اور اگر اللہ تعالیٰ اس کی اس جزوی تقصیر کو معاف کرنا چاہے تو اس کو مذکورہ تاویل القاء کر دے گا تا کہ وہ معذرت کر سکے۔

نیکی و بدی کے لئے کھڑا کیا جائے گا

۵۱۵۴: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ اِنَّ الْمَعْرُوْفَ وَالْمُنْكَرَ خَلِیْقَتَانِ تُنْصَبَانِ لِلنَّاسِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَاَمَّا الْمَعْرُوْفُ فَیُبَشِّرُ اَصْحَابَهٗ وَیُوْعِدُهُمُ الْخَیْرَ وَاَمَّا الْمُنْكَرُ فَیَقُوْلُ اِلَیْكُمْ اِلَیْكُمْ وَمَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَهٗ اِلَّا لُزُوْمًا۔

(رواہ احمد والبیهقی فی شعب الایمان)

أخرجه احمد فی المسند ٤/٣٩١ والبیهقی فی شعب الایمان ٧/٥١٧ حدیث رقم ١١١٨۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ بلاشبہ نیکی اور بدی کو قیامت کے دن لوگوں کے لئے کھڑا کیا جائے گا نیکی تو اپنے کرنے والوں کو خوش خبری سنائے گی اور انہیں بھلائی کا وعدہ دے گی اور برائی انہیں یہ کہے گی دور ہو جاؤ دور ہو جاؤ اور وہ لوگ اس

کے چھٹنے کے بغیر کسی اور چیز کی طاقت نہ رکھ سکیں گے۔ (احمد، بیہقی)

تشریح: خلیقتان: بمعنی "مخلوقتان" ہے۔ (ذکرہ الطیبیؒ) اور ظاہر معنی یہ ہے کہ یہ دونوں عنقریب پیدا ہوں گے دیگر معانی مثلاً اعمال اور موت وغیرہ کی طرح اور پھر ان کو جسم وبدن کی صورت دی جائے گی۔ اور یہ معنی مراد لینے کا قرینہ "تنصبان" ہے۔

الیکم عنی: اس کی معنوی تقدیر یوں ہے: **ابعد واعنی وتنحوا من قربی۔**

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ انسان دنیا میں جو نیک اور اچھے اعمال کرے گا وہ اس کے مرنے کے بعد قبر میں بھی خوبصورت و پاکیزہ اور نہایت عمدہ معطر صورتوں میں ظاہر ہوں گے اور قیامت کے دن بھی بہترین شکل وصورت اختیار کر کے اس شخص کے سامنے آئیں گے اور اس کو آخرت کی لازوال سعادتوں اور حسن انجام کی خوشخبری سنائیں گے' اس کے برخلاف اگر کوئی شخص برے اعمال اختیار کرے گا تو اس کے اعمال اس کے برعکس آئیں گے (یعنی وہ اعمال قبر میں بھی خراب اور ڈراؤنی صورتوں میں آ کر پریشان کریں گے اور قیامت کے دن بھی بری شکل وصورت کے ساتھ اس کے سامنے آئیں گے اور اس کو اس کے برے انجام سے ڈراتے ہوئے کہیں گے کہ ہمارے پاس سے دور ہٹ جا' مگر وہ شخص اس سے دور ہٹنے پر قادر نہیں ہوگا یعنی ان برے اعمال پر جو سزا ملنے والی ہوگی اس سے وہ شخص بھاگ نہیں پائے گا)۔

"تنصبان": مجہول ہونے کی وجہ سے مؤنث کا صیغہ ہے لیکن مشکوٰۃ کے ایک نسخے میں یہ لفظ بہ صیغہ مذکر منقول ہے اور یہی زیادہ موزوں ہے کیونکہ لفظ "خلیقة" میں حرف تاء تانیث کے لئے نہیں ہے بلکہ اظہار مبالغہ کیلئے ہے۔ اور اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ یہ دونوں (یعنی عمل خیر اور عمل بد) مخلوقات میں سے دو جدا جدا نوع ہیں جو قیامت کے دن لوگوں کے سامنے شکل وصورت اختیار کر کے ظاہر ہوں گے۔

اس کی تائید حدیث قدسی سے بھی ہوتی ہے: **یا عبادی! انما هی أعمالکم أحصیها علیکم ثم أو فیکم ایاها فمن وجد خیرا فلیحمد اللّٰه ، ومن وجد غیر ذلك فلا یلومن ا لا نفسه۔** اس مقام پر تحقیق یہ ہے کہ بندوں کے افعال بذاتہا موجب ثواب وعقاب نہیں، مگر اللہ جل شانہ کی عادت مبارکہ رہی ہے کہ ان دونوں چیزوں کو اسی طرح مربوط کر دیا ہے، کہ جس طرح مسببات، اسباب کے ساتھ مربوط ہیں۔ بعض ارباب الباب نے کہا ہے:

أخاف وأرجو عفوه وعقابه
وأعلم حقا أنه حکم عدل

میں ڈرتا ہوں، اور اس کے عفو وعقاب کی امید بھی رکھتا ہوں، اور جانتا ہوں کہ وہ "حکم"، "عدل" ہے۔

فان یك عفوا فهو منه تفضل
وان یك تعذیبا فانی له أهل

اگر عفو ودرگزر کا معاملہ ہو جائے، تو اس کا فضل ہے، اور اگر تعذیب کا معاملہ ہو تو میں اس کا اہل ہوں۔

خیر وشر کا سبب فاعلی اپنے فضل وعدل کے مقتضی اور اپنے جمال وجلال کے بموجب اللہ وحدہ لاشریک کے سواء کوئی نہیں۔

اور سبب قابلی بھی اگر چہ درحقیقت اسی کی طرف سے ہے، لیکن قابلیت خیر اس استعداد اصلی میں سے ہے، جو اس کے فیض اقدس سے ہے۔ اس میں اختیار کا کوئی دخل نہیں، اور قابلیت شر استعداد حادث میں سے ہے، اور اس کا سبب نفس میں ظاہر ہونے والی صفات اور دل کے افعال حاجبہ ہیں، جو جو ہر روح کو مکدر کرتے ہیں، حتیٰ کہ رزایا اور بلایا وغیرہ کے ذریعہ صقل کی حاجت پیش جاتی ہے۔ اسی لئے اللہ جل شانہ نے فرمایا: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ [الشوریٰ: ۳۰] اور وہاں قضاء وقدر کے سمندر میں موجیں اٹھ رہی ہیں، کہ بندوں کے درمیان ان کے افعال کے اعتبار سے تقسیم کی جائے، اور سفینۂ نجات یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ [الانبیاء: ۲۳]

''وہ جو کام کرتا ہے اس کی پرسش نہیں ہوگی اور (جو کام یہ لوگ کرتے ہیں اس کی) ان سے پرسش ہوگی''۔

❀ ❀ ❀

كِتَابُ الرقاق

رقاق (رقت ورحمت) کا بیان

''الرقاق'' کا را مکسور ہے، ''رقیق'' کی جمع ہے۔ ''رقیق'' وہ جس میں رقت یعنی لطافت ہو، (قالہ شارح) اور زیادہ واضح وہ معنیٰ ہے جو علامہ سیوطی نے بیان فرمائے ہیں کہ رقاق سے مراد وہ کلمات ہیں جن کو سننے سے دل نرم ہو جائیں، دنیا سے ہٹ جائیں اور اعراض کریں ان احادیث کو ''رقاق کا'' نام دیا گیا کیونکہ یہ احادیث دل میں رقت ورحمت پیدا کرتی ہیں۔

۵۱۵۵ : عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ۔ (رواه البخاري)

اخرجه البخاري في صحيحه ١١/٢٢٩ حديث رقم ٦٤١٢، والترمذي في السنن ٤/٤٧٧ حديث رقم ٢٣٠٤ و ابن ماجه في السنن ٢/١٣٩٦ حديث رقم ٤١٧٠ والدارمي في السنن ٢/٣٨٥ حديث رقم ٢٧٠٧، واحمد في المسند ١/٣٤٤۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دو نعمتیں ایسی ہیں کہ ان کے معاملہ میں اکثر لوگ گھاٹا کھائے ہوئے ہیں (اور وہ دو نعمتیں) ''تندرستی'' اور ''فراغت'' ہیں''۔ (بخاری)

تشریح: ''نعمتان'' مبتدا ہے۔ معبون فيها كثير من الناس، ''نعمتان'' کی صفت ہے یا خبر ہے۔

قولہ: الصحۃ والفراغ بدن اور کسی قوت کی صحت، امن کے حاصل ہونے کی وجہ سے فراغت قلب۔

مطلب یہ ہے کہ اکثر لوگ ان دو نعمتوں کی قدر نہیں کرتے بایں طور کہ ان دو نعمتوں میں اعمال کی اتنی مقدار حاصل نہیں کرتے، جس کی ان کو آخرت میں ضرورت ہوگی، یہ لوگ ان دو نعمتوں کے زائل ہونے کے بعد اپنی عمروں کو ضائع کرنے پر پشیمان ہوں گے، اور پشیمانی کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ذلك يوم التغابن۔ اور حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے: ليس يتحسر أهل الجنة الاعلى ساعة مرت بهم ولم يذكر و الله فيها۔

''جنت والوں کو دنیا کی کسی چیز پر حسرت نہیں ہوگی سوائے اس گھڑی کے جو بغیر ذکر کے گزری ہوگی''۔

سیوطیؒ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ علماء نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ انسان عبادت کیلئے اسی وقت فارغ ہوتا ہے، جب وہ خود کفیل اور تندرست ہو، کبھی تو انسان خود کفیل ہوتا ہے مگر تندرست نہیں ہوتا، اور کبھی تندرست ہوتا ہے، مگر خود کفیل نہیں ہوتا۔ چنانچہ کمانے کی مشغولی کی وجہ سے علم اور عمل کیلئے فارغ نہیں ہوتا جب کسی شخص کو یہ دو نعمتیں حاصل ہوں اور عبادت میں سستی کرے تو یہ شخص مغبون یعنی تجارت میں نقصان اٹھانے والا ہے۔

لفظ ''مغبون'' غبن سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے خرید و فروخت میں غبن کرنا۔اھ۔ اور ممکن ہے کہ غبن کنایہ ہو انسان کے حال کے بگڑنے اور مال کے ضائع ہونے سے، جیسا کہ بعض حضرات نے فرمایا:

ان الشباب والفراغ والجدة

مفسدة للمرء اي مفسدة :

''انسان کی نوجوانی، فراغت اور قوت انسان کیلئے بڑی فساد والی چیزیں ہیں۔''

اور عارف باللہ ابن الفارض نے فرمایا:

على نفسه فليبك من ضاع عمره

وليس له فيها نصيب ولا سهم

''وہ شخص اپنے آپ پر روئے جس نے اپنی عمر ضائع کی اور دنیا میں آخرت کیلئے کچھ حصہ نہیں بنایا۔''

تخریج: اور جامع صغیر میں لکھا ہے کہ امام بخاری نے اس حدیث کو اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے اور ترمذی اور ابن ماجہ نے ان (ابن عباسؓ) سے نقل کیا ہے۔

۵۱۵۲ : وَعَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ وَاللّٰهِ مَا الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مِثْلُ مَا يَجْعَلُ اَحَدُكُمْ اِصْبَعَهُ فِي الْيَمِّ فَلْيَنْظُرْ بِمَا يَرْجِعُ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢١٩٣ حديث رقم (٥٥-٢٨٥٨)، والترمذي في السنن ٤/٤٨٦ حديث رقم ٢٣٢٣، ابن ماجه في ٢/١٣٧٦ حديث رقم ٤١٠٨، واحمد في المسند ٤/٢٢٩۔

ترجمہ: ''حضرت مستورد بن شداد کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ کی قسم! آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ تم میں سے کوئی آدمی اپنی انگلی کو سمندر میں ڈبوئے اور پھر دیکھے کہ وہ انگلی کیا لے کر واپس لوٹی ہے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: والله ماالدنيا ـــــ اصبعه في اليمّ:

واللہ: قسم حکم کے پائے جانے میں مبالغہ کے لئے ہے۔

ماالدنیا: ''ما'' نافیہ ہے۔ (اور مضاف محذوف ہے۔) ای ماَمثل الدنيا من نعيمها وزمانها۔

الامثل: میم کے کسرہ اور لام کے رفع کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں لام کے نصب کے ساتھ ہے۔

مایجعل احدکم أصعبه: میں ''ما'' مصدریہ ہے ای مثل جعل احد کم' اور جامع میں (أصبعه کے بعد)

''ھذا'' کی زیادتی کے ساتھ منقول ہے اور ظاہر یہ ہے کہ اُنگلی سے مُراد ہاتھ کی سب سے چھوٹی اُنگلی ہے۔

فی الیم: (جار مجرور کا متعلق محذوف ہے۔) ای **مغموسافی البحر۔** اس کی تفسیر ماءِ کثیر (سمندر) کی گئی ہے۔

قوله فلینظر بم یرجع: ''یرجع'' اکثر اُصول میں مذکر کے صیغہ کے ساتھ منقول ہے اور بعض نسخوں میں بصیغہ تانیث کیا گیا ہے یہی زیادہ ظاہر ہے اس لئے کہ ''یرجع'' کی ضمیر ''اصبع'' کی طرف راجع ہے، اور ''اصبع'' مونث ہے اور کبھی مذکر ہوتا ہے جیسا کہ قاموس میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ انسان غور کرے کہ سمندر سے اس کی اُنگلی تری کی کتنی مقدار لے کر نکلتی ہے۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ معنی یہ ہو کہ وہ اُنگلی فی الحال کتنا پانی ساتھ لے کر آتی ہے اور انجام کے اعتبار سے کیا حیثیت ہے۔ حاصل یہ کہ دُنیا کی عطا اور جان ومال کو حاصل کرنے کیلئے دنیا کی کوششیں فانی اور جلدی زائل ہونے والی چیزیں ہیں۔ لہٰذا کسی کیلئے دنیا کی وسعت پر دھوکہ کھانا اور خوش ہونا مناسب نہیں ہے، اور نہ دنیا کی تنگی پر فریاد اور شکایت مناسب ہے۔ بلکہ وسعت اور تنگی دونوں حالتوں میں یہ کہنا چاہیے کہ ''اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے'' اس لئے کہ یہ بات حضور اقدس علیہ السلام نے ایک مرتبہ جنگ احزاب کے دن فرمائی اور دوسری مرتبہ حجۃ الوداع کے موقع پر صحابہ کی جماعت کے سامنے فرمائی ۔انسان کو یقین ہونا چاہیے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور دنیا کی زندگی ایک گھڑی ہے جس کو اطاعت میں صرف کرنا چاہیے۔

طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضور اقدس علیہ السلام نے ''فلا یرجع بشی'' کی جگہ ''بم یرجع'' فرمایا گویا کہ آپ علیہ السلام وہ حالت سننے والے کے سامنے لا رہے ہیں پھر حکم دے رہے ہیں کہ غور وفکر کرے کہ کیا اس کی اُنگلی پانی کی کوئی مقدار اپنے ساتھ لاتی ہے یا نہیں۔ اور یہ مثال ہے بات سمجھانے کیلئے، ورنہ متناہی اور غیر متناہی کے درمیان کیا مناسبت ہے۔

تخریج: احمد اور ابن [illegible] نے بھی یہ روایت نقل کی ہے۔

۵۱۵۷ :وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ مَرَّ بِجَدْيٍ اَسَكَّ مَيِّتٍ قَالَ اَيُّكُمْ يُحِبُّ اِنَّ هٰذَا لَهٗ بِدِرْهَمٍ فَقَالُوْا مَانُحِبُّ اَنَّهٗ لَنَا بِشَيْءٍ قَالَ فَوَاللّٰهِ لَلدُّنْيَا اَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذَا عَلَيْكُمْ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٢٧٢/٤ حديث رقم (٢-٢٩٥٧)، والترمذي في السنن ٤٨٥/٤ حديث رقم ٢٣٢١ و ابن ماجه في السنن ١٣٧٧/٢ حديث رقم ٤١١١۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بکری کے کن کٹے مردہ بچے کے قریب سے گزرے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس کو دیکھ کر صحابہ کرام سے) فرمایا کیا تم میں ایسا کوئی شخص ہے جو اس (مردہ بچہ) کو ایک درہم کے بدلے لینا پسند کرے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم تو اس کو کسی معمولی چیز کے بدلے بھی پسند نہیں کر سکتے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! یہ دنیا (اپنی تمام لذتوں اور آسائشوں کے ساتھ) اللہ کے ہاں اس سے زیادہ حقیر ہے جتنا تمہاری نظر میں یہ مردار بچہ (حقیر ہے)''۔ (مسلم)

تشریح: بکری کا بچہ۔ أسك کا کاف مشدد ہے۔ ① چھوٹے کانوں والا ② جس کے کان نہ ہوں ③ کن کٹا۔

قوله :ایکم ان هذا اله بدرهم : نبی کریم نے یہ بات بطور مثال کے ارشاد فرمائی۔

بشیئ: سے مراد وہ [illegible]

اس حدیث کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو عنقریب ذکر ہوگی: ان الدنیا لو کانت تزن عندالله جناح بعوضة ماسقی منها شربة ماء۔

''اگر دنیا کی قدر و قیمت اللہ کے ہاں مچھر کے پَر کے برابر ہوتی تو کافر پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پی سکتا تھا
مقصود دُنیا سے بے رغبتی دلانا اور آخرت کا شوق دلانا ہے، کیونکہ دنیا کی محبت ہر خطا کی جڑ ہے، جیسا کہ بیہقی نے حسن سے مرسلاً نقل کیا ہے: ان حب الدنیا رأس کل خطیئة۔ ''بے شک دنیا کی محبت ہر خطا کی بنیاد ہے'' اور وجہ یہ ہے، کہ دنیا سے محبت کرنے والا اگرچہ دینی کاموں میں مشغول ہو تو بھی اس کے اعمال میں اغراض فاسدہ کا دخل ہوتا ہے۔ اور جس کے دل میں دنیا کی محبت نہ ہو وہ اگرچہ دنیاوی کاموں میں مشغول ہو اُسکے سامنے کوئی اُخروی مقصد ہوگا۔ اسی لئے اہل یقین میں سے بعض حضرات نے فرمایا: ''جو دینا سے محبت کرتا ہے اس کے تمام مرشد مل کر بھی اُس کو راہ راست پر نہیں لا سکتے اور جس نے دنیا کو چھوڑ دیا ہو تمام فساد پھیلانے والے مل کر بھی اُس کو گمراہ نہیں کر سکتے'' ۔

۵۱۵۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْکَافِرِ۔

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٤/٢٢٧٢ حدیث رقم (١-٢٩٥٦)، والترمذی فی السنن ٤/٤٨٦ حدیث رقم ٢٣٢٤ و ابن ماجه فی السنن ٢/١٣٧٨ حدیث رقم ٤١١٣ واحمد فی المسند ٢/٣٢٣۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ جب کہ کافر کے لئے جنت ہے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله :الدنیا سجن المؤمن وجنة الکافر:

یعنی دنیا مؤمن کیلئے اُس ثواب اور باقی رہنے والی نعمتوں کے مقابلہ میں جو آخرت میں مؤمن کے واسطے تیار کی گئی ہیں قید خانہ کی طرح ہے اور کافر کیلئے آخرت میں جو سزا اور دردناک عذاب تیار کیا گیا ہے اُسکے مقابلہ میں دنیا کافر کیلئے جنت کی طرح ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ مؤمن اپنے نفس کو دنیا کی لذات سے روکتا ہے، اور مشقتوں میں ڈالتا ہے تو گویا کہ قید خانہ میں ہوتا ہے اور کافر اپنے نفس پر خواہشات کی فراوانی کرتا ہے، تو گویا کہ جنت میں ہوتا ہے۔ (کذا ذکرہ فی الفائق)

دوسرے قول کی تائید فضیل بن عیاض کے قول سے ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں: ''جس نے دنیا کی لذتوں اور خواہشات کو چھوڑ دیا وہ قید خانہ میں ہے۔ اور جس نے دنیا کی لذتوں اور خواہشات کو نہیں چھوڑا اُس کیلئے کونسا قید خانہ ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ بظاہر قیدیوں کے احوال کے مختلف ہونے کی وجہ سے قید خانہ کے مراتب مختلف ہوتے ہیں۔ باوجودیکہ کسی شخص کو بھی شرعی پابندیوں یعنی واجب اُمور کو بجالانے اور ممنوعہ اُمور سے پرہیز کرنے کی تنگی سے خلاصی نہیں اسی طرح تکوینی امور مثلاً گرمیوں میں گرمی اور سردیوں میں سردی کی تکالیف، دوستوں کا بچھڑ جانے اور دشمنوں کے غالب آنے، مہنگائی اور دوسرے مصائب کی مشقتوں سے بھی کسی کو چھٹکارا نہیں۔ اسی طرح پیٹ کے اندھیروں میں نطفے کی ابتدائی تخلیق اور مختلف اطوار

سے لے کر دُنیا میں ظہور اور اس کے بعد لحد کی تنگی میں داخل ہونے تک کی مختلف تکالیف اور مشقتوں سے کسی انسان کو کوئی چھٹکارا نہیں۔ اسی وجہ سے اللہ کا ارشاد ہوا:

﴿لقد خلقنا الانسان فی کبد﴾ [البلد: ٤] یعنی ہمیشہ انسان ایک بہت بڑی مشقت میں رہتا ہے۔ ابتداء میں رحم مادر کی تاریکی اور رحم کی تنگی ہوتی ہے، اور انتہاء میں موت آجاتی ہے، اور اس قید خانہ کے بعد یا تو انسان کو بادشاہی لباس پہنا دیا جاتا ہے، اور بلند مقامات میں ٹھہرایا جاتا ہے، یا اللہ کی ناراضگی کے باعث اس پر زبانیہ فرشتے مسلّط کر دیئے جاتے ہیں۔ اور اس انسان کو تھوڑی تکلیف والے فانی قید خانہ سے منتقل کر کے سخت تکلیف والے اور باقی رہنے والے قید خانہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اس قید خانہ سے

جب داود طائی فوت ہوگئے تو ایک غیبی آواز سنائی دی کہ داود قید خانہ سے چھوٹ گیا۔ ابوحفص سہروردی نے فرمایا کہ قید و بند اور اس سے خلاصی دونوں حالتیں مؤمن کے دل پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وارد ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ نفس جب بھی اپنی صفات کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے، تو فوراً دل کو تاریک کر دیتا ہے، یہاں تک کہ دل تنگ ہونے لگتا ہے، اور نفس کی تنگی اور اندر جانے اور باہر آنے سے رک جانے ہی کا نام ''سجن'' ہے۔ جب بھی دل دنیاوی خواہشات سے نجات حاصل کرنے' آخرت کی خواہشات کی خاطر دنیاوی خواہشات سے پرہیز کرنے کا، اور اللہ کے ازلی جمال کے مشاہدہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان مردود رکاوٹ پیدا کر کے اس دروازہ سے روکتا ہے، وہ نفس امّارہ کے واسطہ سے مقابلہ کرتا ہے۔ انسان کیلئے زندگی مکدّر ہو جاتی ہے، اور وہ انسان اور اس کی طبیعت کی محبوب چیز کے درمیان حائل آجاتا ہے، اور یہی سخت ترین اور بڑی ہی تنگی والی قید ہے۔ اسلئے کہ جب انسان کے اور اس کی محبوب چیز کے درمیان کوئی رُکاوٹ ہو تو انسان پر زمین کشادگی کے باوجود تنگ ہو جاتی ہے، اور دل تنگ ہو جاتا ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صحابہ کی ایک جماعت جو کہ ایک غزوہ میں حضور علیہ السلام سے پیچھے رہ گئی تھی کے بارے میں فرمایا: ﴿وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْاؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ......﴾ [التوبة:١١٨] ''اور ان تین شخصوں کے حال پر بھی جنکا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ زمین باوجود اپنی فراخی کے ان پر تنگی کرنے لگی''۔

تخریج: احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے ابوہریرہ سے طبرانی اور حاکم نے مسلمان سے اور بزار نے ابن عمر سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

احمد، طبرانی اور ابونعیم نے حلیہ میں اور حاکم نے عمرو بن العاص سے اس روایت کو نقل کیا ہے۔ اور اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''الدنیا سجن المؤمن وسنته' فاذا فارق الدنیا فارق السجن السنة:

''سنة'' سین کے فتحہ کے ساتھ اس کا معنی ہے قحط وجدب اور ابن مبارک نے ابن عمرو سے نقل کیا ہے: کہ دنیا کافر کیلئے جنت ہے اور مؤمن کیلئے قید خانہ ہے، اور اور مؤمن سے جب روح نکلتی ہے، تو اس کی مثال اُس شخص کی طرح ہے، جو قید خانہ میں ہو اور قید خانہ سے نکالا جائے تو زمین پر لوٹ پوٹ ہوتا ہے اور اس میں وہ کشادگی محسوس کرتا ہے۔

ابن ابی شیبہ نے بھی ابن عمرو سے اس طرح روایت نقل کی ہے، اور ابونعیم نے ابن عمر سے نقل کیا ہے: ان النبی ﷺ قال لأبی ذر: یا أباذر ان الدنیا سجن المؤمن والقبر أمنه والجنه مصیره۔ یا أباذر! ان الدنیا جنة الکافر والقبر

عذابه والنار مصيره۔ کہ حضور اقدس علیہ السلام نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا:

''اے ابوذر! دنیا مؤمن کیلئے قید خانہ ہے اور قبر انسان کیلئے پناہ گاہ ہے، اور جنت انسان کا اصل ٹھکانہ ہے۔ اے ابوذر! دُنیا کافر کیلئے جنت ہے اور قبر اس کے لئے عذاب کی جگہ ہے، اور جہنم اس کا اصل ٹھکانہ ہے۔

ابن لال نے عائشہؓ سے نقل کیا ہے: الدنيا تصفو المؤمن كيف وهي سجنه وبلاتوه۔

دُنیا مؤمن کیلئے خوشی کی جگہ نہیں ہے اور دنیا مؤمن کیلئے خوشی کی جگہ ہو بھی کیسے سکتی ہے جبکہ دنیا مؤمن کیلئے قید خانہ اور آزمائش ہے''۔

۵۱۵۹ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَايَظْلِمُ مُؤْمِنًا حَسَنَةً يُعْطٰى بِهَا فِي الدُّنْيَا وَيُجْزٰى بِهَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَمَّا الْكَافِرُ فَيُطْعَمُ بِحَسَنَاتِ مَا عَمِلَ بِهَا لِلّٰهِ فِي الدُّنْيَا حَتّٰى اِذَا قَضٰى اِلَى الْاٰخِرَةِ لَمْ تَكُنْ لَهٗ حَسَنَةٌ يُجْزٰى بِهَا۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢١٦٢ حديث رقم (٥٦۔٢٨٠٨)، واحمد في المسند ٣/١٢٣۔

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ مؤمن کی کسی نیکی کو ضائع نہیں فرماتا اس نیکی کے سبب دنیا میں بھلائیاں دی جاتی ہیں اور آخرت میں بھی اس نیکی کا اجر وثواب دیا جائے گا اور کافر کو راہ خدا میں کی گئی اچھائیوں کے بدلے میں اسی دنیا میں کھلایا جاتا ہے (یعنی وہ ان اچھے کاموں کی وجہ سے جس بھلائی کا مستحق ہوتا ہے وہ اس کو نعمتوں اور راحتوں کی صورت میں اس دنیا میں دے دی جاتی ہے) یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کی کوئی اچھائی قابل جزا نہ ہوگی''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: ان الله لايظلم مومنا حسنة: ایک شارح فرماتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ مؤمن کی نیکی کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ اھ۔ اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ حدیث کا حاصل معنی ہے جہاں تک ترکیب اور معنی کا تعلق ہے تو لفظ ''ظلم'' دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے، اللہ کا ارشاد ہے:

﴿ان الله لا يظلم الناس شيئًا﴾ [یونس۔٤٤] اللہ لوگوں پر کچھ ظلم نہیں کرتا۔

قاموس میں ہے کہ ''ظلمه حقه'' معنی ہے کہ اُسکا حق اس سے روک دیا، چنانچہ یہ حدیث قرآن کی مذکورہ آیت کی تفسیر ہے اور جنس انسان کی دو نوع کا بیان ہے۔ اور اس بات کا بیان ہے، کہ اللہ تعالیٰ مؤمن اور کافر کو اُسکی ہر چھوٹی اور بڑی، تھوڑی اور زیادہ نیکی اور برائی کا دنیا میں یا آخرت میں بدلہ دے گا۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال:٧۔٨] ''سو جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا۔ وہ اس کو دیکھ لے اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا، وہ اس کو دیکھ لے گا''۔

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿ان الله لا يظلم مثقال ذرة وان تك حسنة يضاعفها ويوت من لدنه اجرًا عظيمًا﴾ [النساء۔٤٠] ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے اور اگر ایک نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا کر دیں گے اور اپنے پاس سے اجر عظیم دیں گے''۔

اس وجہ سے حضرت عمرؓ نے فرمایا: لو کانت لی حسنة واحدة لکفتنی۔
''اگر میرے پاس ایک بھی نیکی ہوگی تو میرے لئے کافی ہوگی''
حضرت عمرؓ کا یہ فرمان اسی عظیم ثواب اور مذکورہ مضاعفت کی وجہ سے تھا۔

قوله: یعطی بها فی الدنیا ویجزی بها فی الآخرة۔ یہ جملہ مُستانفہ ہے اور مجہول کا صیغہ ہے (اور ''بھا'' میں باء سببیہ ہے۔)۔ **ای یعطی المؤمن من کل خیر بسبب تلك الحسنة۔** اور مطلب یہ ہوگا کہ مؤمن کو اس نیکی کے سبب سے ہر خیر دی جاتی ہے' اس کی مصیبت کو رفع کرے اور رزق میں کشادگی کی جائے اور دوسری نعمتیں عطا ہوتی ہیں۔ اور ایک نسخہ میں ''**یعطی**'' معروف کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

یجزی ''**یعطی**'' کی طرح معروف ومجہول دونوں طرح ہے۔

قوله: وأما الکافر فیطعم بحسنات ما عمل بها لله فی الدنیا۔

فیطعم صرف مجہول کے صیغہ کے ساتھ دُرست ہے۔ ''**فیطعم**'' کا لفظ لانے میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ کافر کو عطاء میں مقصود پیٹ ہوتا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اس کو جزاء دی جائے گی۔

بحسنات ما عمل بها لله: مثلاً فقیروں کو کھانا کھلانا' یتیم کے ساتھ احسان کرنا' مصیبت زدہ کی مدد کرنا اور اس جیسی وہ طاعات جن کے لئے اسلام شرط نہیں ہے۔

فی الدنیا'' **یطعم**'' کے متعلق ہے

قوله: حتی اذا أفضی الی الآخرة لم یکن له حسنة یجزی بها: کیونکہ اللہ نیک عمل کرنے والے کسی شخص کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

شرح السنۃ میں ہے کہ ''**یظلم**'' دومفعولوں کی طرف متعدی ہے، ایک مفعول ''**مؤمناً**'' ہے، اور دوسرا مفعول ''**حسنة**'' ہے اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب مؤمن نیکی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ مؤمن کو پورا بدلہ عطا فرماتے ہیں، کہ اُسکی روزی کشادہ کرتے ہیں، دنیا میں اُس کو آسودہ حال رکھتے ہیں اور آخرت میں بھی اُس نیکی کا بدلہ عطا فرماتے ہیں۔ اور کافر جب کسی قیدی کو آزاد کر کے' یا پانی میں ڈوبنے والے کسی کو ڈوبنے سے بچا کر نیکی کرتا ہے، تو اللہ دنیا میں اُس کی نیکی کا پورا بدلہ عطا فرماتے ہیں، اور آخرت میں کچھ بدلہ نہیں دیتے۔ اھ۔

خلاصہ یہ کہ اللہ اپنے مؤمن بندہ کے ساتھ فضل والا اور کافر کے ساتھ عدل والا معاملہ فرماتے ہیں، اور اللہ سے اُس کے کیئے کے بارے میں کوئی پوچھ نہیں سکتا۔ اور شاید کہ یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۙ وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ﴾ [الشوریٰ: ۲۰] ''اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ دنیا میں (اگر چاہیں) دے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔'' اور سے مقتبس ہے۔

تخریج: جامع میں ہے، کہ احمد اور مسلم نے اس روایت کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور الفاظ یہ ہیں:

ان الله لایظلم المؤمن حسنة یعطی علیها فی الدنیا ویثاب علیها فی الاخرة ' واما الکافر فیطعم

بحسناته في الدنيا حتیٰ اذا افضی الی الآخرة لم تکن حسنة یعطی بها خیرا۔اھ۔

''اللہ مؤمن کی کسی نیکی میں کمی نہیں کرتے دنیا میں نیکی کے بدلہ میں عطاء کرتے ہیں اور آخرت میں اس پر ثواب عنایت فرماتے ہیں اور کافر کو اس کی نیکی کے بدلہ میں دنیا میں کھلایا جاتا ہے، اور جب آخرت میں پہنچتا ہے تو اُسکے پاس کوئی نیکی نہیں ہوتی کہ اُسکے بدلہ میں کچھ بھلائی ملے''۔

اس مقام میں ''مقابلہ'' کا مقتضیٰ وہ ہے جو دوسری حدیث میں وارد ہوا ہے ان المؤمن یجزی بسیئاته في الدنیا من أنواع المحنة والمشقة والبلایا والرزایا حتی اذا أفضی الی الآخرة لم یکن له سیئته یعاقب علیه کہ ''مؤمن کو اس کے گناہوں کی وجہ سے دنیا میں مختلف قسم کی تکالیف مشقتوں اور مصائب میں مبتلا کیا جاتا ہے، اور جب آخرت میں پہنچتا ہے تو اسکا کوئی گناہ باقی نہیں رہتا کہ اُس پر سزا دی جائے''۔

اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے، جس کو احمد اور ابن حبان نے نقل کیا ہے: انه لما نزل قوله تعالیٰ: ﴿مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ﴾ [النساء: ۱۲۳] ''جو شخص کوئی برا کام کرے گا وہ اس کے عوض میں سزا دیا جائے گا''۔ قال ابوبکر الصدیق رضي الله عنه: فمن ینجو من هذا یا رسول الله۔ فقال علیه الصلوة والسلام: غفر الله لك یا أبابکر! ألست تحزن ألست تنصب ألست تمرض ألست تصیبك اللأواء؟ قال: بلی یا رسول الله! قال: هو مما تجزون به۔ جب قرآن کی آیت ﴿مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ﴾ [النساء: ۱۲۳] ''جو شخص کوئی برا کام کرے گا وہ اس کے عوض میں سزا دیا جائے گا''۔ نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیق نے عرض کیا یارسول اللہ! پھر کس کو نجات ملے گی؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا اے ابوبکر! اللہ تیری مغفرت فرمائے کیا آپ کو حزن لاحق نہیں ہوتا، کیا آپ کو تھکاوٹ نہیں ہوتی؟ کیا آپ بیمار نہیں ہوتے؟ کیا آپ کو رنج اور دُکھ نہیں پہنچتا؟ ابوبکرؓ نے عرض کیا: کیوں نہیں یارسول اللہ (یہ ساری باتیں آتی ہیں)، حضور علیہ السلام نے فرمایا: یہی وہ احوال ہیں، جو بطور بدلہ کے تم لوگوں پر آتے ہیں۔

ترمذی اور ابن جریر نے ایک صحیح روایت نقل کی ہے: المصائب والأمراض في الدنیا جزاء۔

''مصائب اور امراض دنیا میں گناہوں کا بدلہ ہیں''۔

حاکم نے مستدرک حاکم میں ابوبکرؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

من یعمل سوءا یجزء به في الدنیا۔ ''جو بُرا عمل کرتا ہے دنیا میں اُسکا بدلہ دیا جاتا ہے''

ابن عمر ﷺ کا ارشاد ہے۔

''جب بندہ کو دنیا کی کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو اللہ کے ہاں اُسکے درجات میں کمی آجاتی ہے، اگرچہ اللہ انسان پر مہربان ہے'' اس مقولہ کو ابن ابی الدنیا نے نقل کیا ہے۔

۵۱۲۰ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ وَحُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَکَارِهِ (متفق علیه الا عند مسلم) حُفَّتْ بَدَلَ حُجِبَتْ۔

... بخاری فی صحیحه ۱۱/ ۳۲۰ حدیث رقم ٦٤٨٧ ومسلم فی صحیحه ٤/ ۲۱۷٤ حدیث رقم

۱/۲۸۲۲ والترمذی فی السنن ۵۹۸/٤ حدیث رقم ۲۵۵۹، والنسائی فی السنن ۳/۷ حدیث رقم ۳۷۶۳، والدارمی فی السنن ٤۳۷/۲ حدیث رقم ۲۸٤۳، واحمد فی المسند ۳۸۰/۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جہنم کو شہوات (مثل شراب وزنا) سے ڈھانپا گیا ہے اور جنت کو مشقتوں (مثل نماز زکوۃ) سے ڈھانپا گیا ہے'' اس روایت کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے لیکن مسلم کی روایت میں "حجبت" (یعنی ڈھانکی گئی ہے کہ بجائے) "حفت" (یعنی گھیری گئی ہے) کا لفظ ہے''۔

تشریح: الشھوات: جیسے شراب نوشی اور زنا ہے۔

المکارہ: جیسے نماز اور زکوۃ ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ناگواریاں برداشت کیے بغیر جنت میں نہیں پہنچا جا سکتا اور خواہشات پوری کیے بغیر جہنم میں نہیں پہنچایا جا سکتا' جنت اور جہنم کو ناگواریوں اور خواہشات سے ڈھانپا گیا ہے، جو پردہ پھاڑے گا پردہ میں ڈھکی ہوئی جگہ میں پہنچ جائے گا' ناگواریاں برداشت کرنے سے جنت کے پردے ہٹ جاتے ہیں، عبادت میں مشقت اُٹھانا، اطاعت پر دوام اور خواہشات سے اپنے نفس کو روکنا ''مکارہ'' میں داخل ہے اور وہ خواہشات جن سے جہنم کو ڈھانپا گیا ہے، بظاہر ان سے حرام خواہشات مراد ہیں جیسا کہ شراب نوشی، زنا اور غیبت وغیرہ۔ مباح خواہشات اس میں داخل نہیں۔اھ۔اسی حدیث کے ہم معنی ایک حدیث علامہ سیوطی نے جامع کبیر میں نقل کی ہے، کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: ''ان اللّٰہ بنی مکۃ علی المکروھات والدرجات۔'' ''اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کی بنیاد ناگواریوں اور درجات پر رکھی ہے''

یعنی بیت اللہ کا ثواب بیت اللہ کی مشقتوں کو برداشت کر کے ہی ملے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تخریج: یہ روایت متفق علیہ ہے' امام بخاریؒ نے حجبت کا لفظ ذکر کیا ہے، اور " حفت " کا لفظ امام مسلم نے ذکر کیا ہے، چنانچہ ابوہریرہ سے یہ حدیث معناً متفق علیہ ہے۔ امام احمد اور ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے امام مسلم کی طرح الفاظ نقل کیے ہیں، لیکن اس روایت میں تقدیم وتاخیر ہے، ترتیب میں بخاری کے مخالف ہے' کہ امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی میں "حفت الجنۃ بالمکارہ وحفت النار بالشھوات " کے الفاظ ذکر کیے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۱۶۱: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ وَعَبْدُ الْخَمِيْصَةِ اِنْ اُعْطِيَ رَضِيَ وَاِنْ لَّمْ يُعْطَ سَخِطَ تَعَسَ وَانْتَكَسَ وَاِذَا شِيْكَ فَلَا انْتَقَشَ طُوْبٰى لِعَبْدٍ اٰخِذٍ بِعِنَانِ فَرَسِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَشْعَثَ رَأْسُهٗ مُغْبَرَّةً قَدَمَاهُ اِنْ كَانَ فِي الْحِرَاسَةِ كَانَ فِي الْحِرَاسَةِ وَاِنْ كَانَ فِي السَّاقَةِ كَانَ فِي السَّاقَةِ اِنِ اسْتَاذَنَ لَمْ يُؤْذَنْ لَهٗ وَاِنْ شَفَعَ لَمْ يُشَفَّعْ (رواہ البخاری)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۸۱/٦ حدیث رقم ۲۸۸۷ و ابن ماجہ فی السنن ۱۳۸٦/۲ حدیث رقم ٤۱۳۵۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہلاک ہو دینار کا غلام' درہم کا غلام اور چادر کا غلام (یعنی اس شخص کے لئے آخرت میں ہلاکت وتباہی مقدر ہے جس نے مال ودولت کے حصول کو اپنا مقصد زندگی بنا لیا ہو) اگر اسے کچھ ملے تو خوش ہوتا ہے اور اگر نہ ملے تو ناخوش ہوتا ہے۔ ہلاکت ورسوائی ہو جب اسے کانٹا چبھ جائے تو

کوئی نہ نکالے سعادت و برکت ہو راہ خدا میں اپنے گھوڑے کی لگام تھامنے کے لئے۔ اس کے بال پراگندہ اور خاک آلود قدم ہیں۔ اگر وہ نگہبانی پر مامور ہے تو ڈٹ کر پہرہ دیتا ہے اور اگر لشکر کے پیچھے رکھا جائے تو وہیں ڈٹا ہوا ہے اگر وہ اجازت طلب کرے تو اسے اجازت نہیں دی جاتی اور اگر کسی کی سفارش کرتا ہے تو قبول نہیں کی جاتی۔

تشریح: قولہ :تعس عبد الدینار و عبد الدرھم و عبد الخمیصۃ: تعس: عین کو مکسور اور مفتوح دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

"عبد الدینار" سے مراد وہ شخص ہے جو ناجائز طور پر مال حاصل کرے اور ناجائز استعمال کرے اور اپنے معبود کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دے، اور یہی مطلب ہے "عبد الدرھم" کا دینار و درہم کا ذکر بطور مثال ہے۔

صوفیائے کرام کا اس میں اختلاف ہے، کہ قیمتی اور کم قیمت لباس میں کونسا لباس افضل ہے شاذلیہ نقشبندیہ اور بکریہ کے نزدیک اغنیاء کا لباس پہننا افضل ہے اور سلف میں سے بعض کی بھی یہی رائے ہے۔

تعس عبد الدینار: یہ جملہ خبریہ ہے یا بدعا ہے اُن لوگوں کیلئے جن کو دنیا کی محبت نے اور خواہشات کی اتباع نے غلام بنا رکھا ہے، اور اپنے مولیٰ کی عبادت سے اعراض کر بیٹھے۔ اس وجہ سے ایک صاحب معرفت نے فرمایا:

اتمنی علی الزمان محالا

ان تری مقلتای طلعۃ حر

"میں زمانے سے ایک ناممکن چیز کی اُمید کر رہا ہوں اور وہ یہ کہ میری آنکھیں کامل انسان کا دیدار کریں۔"

رسول اللہ علیہ السلام نے "عبد الدینار" کی جگہ "صاحب الدینار" نہیں فرمایا یہ بات سمجھانے کیلئے کہ مذموم وہ شخص ہے، جو مال جمع کرنے کا اس طرح غلام بن جائے کہ بادشاہ حقیقی کے حقوق ادا نہ کرے۔

خاص طور پر ان دونوں کو ذکر کیا کیونکہ دینار و درھم نقدی ہے، اس سے نفس اور شیطان کے تمام مقاصد پورے ہوتے ہیں۔

"خمیصہ" سے مراد ہے ریشم کا کپڑا یا وہ اُونی کپڑا جس پر بیل بوٹے ہوں۔ اور اس کو بطور خاص اسلئے ذکر کیا کہ اس کے پہننے میں عموماً تکبر، بڑائی ریاء اور دکھلاوا کا اظہار ہوتا ہے اور نفس اس کی طرف کامل طور پر مائل ہوتا ہے اور اس کو چھوڑنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ گویا پہننے والا اس کپڑے کا غلام ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ "خمیصہ" سے مراد وہ کالی مربع چادر ہے جس پر دو نشان ہوتے ہیں۔

"عبد الخمیصۃ" سے مراد وہ شخص ہے جو عمدہ لباس کی کثرت پسند کرتا ہو اور طاقت سے زیادہ تزین کی حرص رکھتا ہو۔

خلاصہ: ① اس کا کہ اس مقام پر عمدہ لباس کے ذریعے ظاہری تزین کا اہتمام کرنے کی مذمت کی گئی ہے خصوصاً جبکہ وہ لباس حرام یا مکروہ ہو اور ② (یہ کہ) اپنے باطن کو بُری خصلتوں سے خالی نہ کرنے اور عمدہ صفات کے ساتھ مزین نہ کرنے کی مذمت کی گئی ہے، چنانچہ جو دنیا میں ریشم پہنے گا آخرت میں نہیں پہنے گا' جس کے کپڑے باریک ہوں گے اُسکا دین باریک (کمزور) ہوگا' آستینوں کو لمبا کرنا اور دامن گھسیٹنا (لمبا کرتہ بنوانا) بطور تکبر اور فخر کے حرام ہے' اور اگر تکبر اور فخر کیلئے نہ ہو تو مکروہ ہے اور جب لباس شریعت کی نظر میں مباح ہوگا تو لباس میں تکلف کرنے اور تکلف چھوڑنے میں نیت کے اختلاف سے

حکم مختلف ہوگا چنانچہ ارشادی باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ ......﴾ [الاعراف: ۳۲] ''آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے کپڑوں کو جس کو اُس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے، اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کسی شخص نے حرام کیا''۔

قولہ: ان اعطی رضی وان لم یعط سخط: سخط: خاء مکسور ہے اور معنی ہے ''غصہ ہوتا ہے''۔ یہ جملہ انسان کی شدت حرص اور حالت کے انقلاب کا بیان ہے جیسا کہ اللہ نے منافقین کے بارے میں فرمایا: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ﴾ [التوبۃ: ۵۸] ''وہ لوگ ہیں جو صدقات کے بارے میں آپ پر طعن کرتے ہیں، سو اگر ان صدقات میں سے ان کو مل جاتا ہے تو وہ راضی ہو جاتے ہیں اور اگر ان صدقات میں سے ان کو نہیں ملتا تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔''

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰي حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُۨ انْقَلَبَ عَلٰي وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ﴾ [الحج: ۱۱]

قولہ: تعس وانتکس: تعس: اس لفظ کو دوبارہ ذکر کیا ہے تاکہ کلام میں تاکید ہو جائے اور بیان شدت کیلئے اس پر دوسرے جملہ کا عطف ہو جائے۔

قولہ: واذا شیك فلا انتقش: شیك: شین مکسور ہے۔ اس کا معنی ہے کانٹا چبھنا۔

فلا انتقش: یہ مجہول کا صیغہ ہے اور ایک نسخہ میں بصیغہ معروف ہے، یعنی اُس کانٹے کے نکالنے پر قدرت نہ رکھے اور نہ کوئی ایسا شخص ملے جو کانٹا نکال دے، مطلب یہ ہے کہ جب کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو کوئی اُس پر رحم نہ کرے اور نہ بذات خود اُس مصیبت کو دفع کر سکے۔

نہایہ میں ہے کہ ''تعس'' اُس وقت بولا جاتا ہے، جب کوئی پھسل جائے اور اوندھے منہ گرے۔ کبھی ''تعس'' کا عین مفتوح پڑھا جاتا ہے۔ اس کا معنی ہے انسان کیلئے ہلاکت کی بددعا کرنا' اور ''انتکس'' کا معنی ہے ''سر کے بل گرنا'' یہ انسان کیلئے نامرادی کی بددعا ہے۔ اس لیے کہ جو سر کے بل گر جائے تو وہ نامراد اور ناکام ہو گیا۔ اور ''واذا شیك'' کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کو کانٹا چبھ جائے تو ''انتقاش'' پر قادر نہ ہو یعنی کے ''منقاش'' کے ذریعے کانٹا نکالنے پر قادر نہ ہو۔ اور ''خمیصہ'' سے مراد ریشم کا کپڑا یا اُون کا وہ کپڑا جس پر بیل بوٹے ہوں۔

بعض نے فرمایا ہے کہ ''خمیصہ'' اُس سیاہ کپڑے کو کہتے ہیں جس پر بیل بوٹے بنے ہوئے ہوں۔ پہلے لوگوں کا لباس تھا۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض شارحین نے لکھا ہے، کہ حضور اقدس کے ارشاد ''عبدالدینار'' میں لفظ عبد کو خصوصی طور پر ذکر کرنے میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ دُنیا کی محبت اور دُنیا کی خواہشات میں انہماک سے انسان اُس قیدی کی طرح بن جاتا ہے، جو قید سے چھوٹ نہ سکتا ہو۔

حضور اقدس علیہ السلام نے ''مالك الدینار اور جامع الدینار'' نہیں فرمایا اس لئے کہ مذموم وہ دُنیا ہے جو زائد از مقدار حاجت ہو' بقدر ضرورت دُنیا مذموم نہیں اور حضور اقدس علیہ السلام کے ارشاد: ''ان اعطی رضی وان لم یعط سخط''۔ میں

دُنیا کو جمع کرنے کی حرص اور لوگوں کی اشیاء میں طمع کرنے کی شدت کی طرف اشارہ ہے' اور "تعس" اور "انتکس" میں "تردیہ" کے ساتھ "ترقی" بھی ہے۔ یعنی حضور اقدس علیہ السلام نے لفظ "تعس" جس کا معنی ہے اُوندھے منہ گر جانا کو دوبارہ ذکر کیا تا کہ اُسکے ساتھ لفظ "انتکاس" جس کا معنی ہے سر کے بل گر جانا، کو بطور ترقی ذکر کر فرمایا تا کہ بددعا ہلکی نہ رہے بلکہ مزید سخت ہو جائے اور پھر ترقی کرتے ہوئے اس سے بڑھ کر بددُعا فرمائی: واذا شیك فلا انتقش) جس کا معنی ہے کہ یہ شخص (یعنی عبدالدینار) جب کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو اللہ کرے کہ اُسکا کوئی پُرسان حال نہ ہو، کیونکہ جب مصیبت زدہ پر لوگ ترس کھاتے ہیں تو بسا اوقات اُسکی مصیبت ہلکی ہو جاتی ہے، اور کچھ تسلی مل جاتی ہے لیکن یہ لوگ ایسے نہ ہوں بلکہ دشمنوں کی راحت وطنز سے ان کا غصہ بڑھتا رہے۔

حضور اقدس علیہ السلام نے خصوصی طور پر "انتقاش الشوك (پیر سے کانٹا نکالنا) کو ذکر فرمایا' کیونکہ کسی کے پیر سے کانٹا نکالنا مصیبت زدہ کی سب سے کم درجہ کی معاونت ہے' جب اس کم درجہ کی معاونت کی نفی فرمائی تو زیادہ معاونت کی نفی بدرجہ اولیٰ ہوگئی۔

قوله : طوبی لعبد آخذ..... مغبرة قدماه طوبیٰ(یہ موصوف محذوف کی صفت ہے ۔) ای حالة طیبة۔ خوشحالی یا اس سے مراد جنت کا خاص "طوبیٰ نامی" درخت ہے۔

"لعبد" سے یہاں وہ بندہ مراد ہے جو خالص اللہ ہی کی بندگی کرتا ہے۔

آخذ باسم فاعل کا صیغہ ہے اس کا معنی ہے پکڑنے والا۔

عنان: بعین مکسور ہے

اشعث: منصوب ہے عبد سے حال ہے یا "عبد" کی صفت ہے۔

راسه: مرفوع ہے' "اشعث" کا فاعل ہونیکی وجہ سے' اور "اشعث راسه" کا معنی ہے وہ شخص جس کے سر کے بال غبار آلود ہوں۔ اور ایک نسخہ میں "راسہ" مرفوع ہے مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے اور جملہ "عبد" کی صفت ہے۔

مغبرة: منصوب ہے اور ایک نسخہ میں اس کا رفع ذکر کیا گیا ہے، جب کہ ایک اور نسخہ میں یہ مجرور ہے "عبد" کی صفت ہونے کی بناء پر۔

قدماه: "مغبرة" کا فاعل ہے' اور علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ "اشعث" اور "مغبرة" دونوں "آخذا" کی ضمیر سے حال ہیں' "اور آخذا" نے "موصوف" پر اعتماد کیا ہوا ہے' اور یہ بھی درست ہے کہ "اشعث" اور مغبرة" دونوں "عبد" سے حال ہوں کیونکہ "عبد" موصوف ہے۔

قوله: ان كان في الحراسة.... كان في الساقة: الحراسة حاء مکسور ہے یعنی اسلامی لشکر کے پہرہ اور دشمن کے حملہ سے ان کی حفاظت کرنے میں مصروف عمل ہے۔ "حراسة" اگرچہ لغت میں عام ہے لیکن عُرف میں لشکر کے اگلے حصہ والے مجاہدین کے پہرہ کو کہتے ہیں۔ اس وجہ سے فرمایا: کان فی الساقة، یعنی وہ لشکر کے پچھلے حصہ میں رہ کر بھی اسی طرح کامل [illegible] پہرہ چھوٹنے کا خوف نہیں ہوتا اور پہرہ کی جلد سے تجاوز نہ کرے بلکہ پہرہ دیتا رہے۔ اور علم معانی میں یہ بات معلوم

ہو چکی ہے، کہ جب شرط اور جزاء ایک جیسی ہوں تو جزاء سے مراد کمال ہوتا ہے۔ چنانچہ معنی یہ ہے کہ چاہے لشکر کے اگلے حصہ میں پہرہ دے یا پیچھے پہرہ دے خوب کوشش کرتا ہے، اور اس طرح کمال کے ساتھ پہرہ دیتا ہے کہ تھوڑی سی غفلت بھی نہیں کرتے۔

علامہ توریشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "حراسة" سے مراد لشکر کی دُشمن سے حفاظت کیلئے پہرہ دینا ہے اور پہرہ لشکر کے اگلے حصہ میں دیا جاتا ہے جبکہ "ساقة" لشکر کے پچھلے حصہ کو کہتے ہیں، لہٰذا معنی یہ ہوا کہ جس کام کا کہا جائے وہ کام کرے اور وہاں کھڑا رہے جہاں کھڑا ہونے کو کہا جائے اور اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

حضور اقدس علیہ السلام نے "حراسة" اور "ساقة" ذکر فرمایا اس لئے کہ اس میں مشقت ہے۔ اوّل (اگلے حصہ میں رہ کر پہرہ دینا) میں اُس وقت مشقت ہوتی ہے جس وقت اسلامی لشکر دار الحرب میں داخل ہو رہا ہو اور دوم (پچھلے حصہ میں رہ کر پہرہ دینا) میں اُس وقت مشقت ہوتی ہے جس وقت اسلامی لشکر دار الحرب سے نکل رہا ہو۔

قوله: ان استأذن لم يؤذن له الخ:

اور ایک نسخہ میں "اذا استأذن" ہے۔

لم يشفع: فاء مفتوح اور مشدد ہے۔

بعض نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ اس جملہ میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ یہ آدمی دُنیا اور دنیا والوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا یہاں تک کہ مکمل طور پر گمنام ہوتا ہے، نہ لوگوں کے ہاں عزت و مرتبہ کا طالب ہوتا ہے، اور نہ مال کا طالب ہوتا ہے جبکہ اللہ کے ہاں صاحب منزلت ہوتا ہے، اور لوگ تو اس کی سفارش قبول نہیں کرتے لیکن اللہ کے ہاں اس کی سفارش مقبول ہوتی ہے۔

تخریج: امام ترمذی نے حدیث کے شروع کے الفاظ اختصار کے ساتھ ذکر کیے ہیں "**لعن عبد الدينار لعن عبد الدرهم**"

۵۱۶۲ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ مِمَّا اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِیْ مَا يُفْتَحُ عَلَيْكُمْ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتِهَا فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَ يَاْتِی الْخَيْرُ بِالشَّرِّ فَسَكَتَ حَتّٰى ظَنَنَّا اَنَّهٗ يُنْزَلُ عَلَيْهِ قَالَ فَمَسَحَ عَنْهُ الرُّحَضَاءَ وَقَالَ اَيْنَ السَّائِلُ وَكَاَنَّهٗ حَمِدَهٗ فَقَالَ اِنَّهٗ لَا يَاْتِی الْخَيْرُ بِالشَّرِّ وَاِنَّ مِمَّا يُنْبِتُ الرَّبِيْعُ مَا يَقْتُلُ حَبَطًا اَوْ يُلِمُّ اِلَّا اٰكِلَةَ الْخَضِرِ اَكَلَتْ حَتّٰى امْتَدَّتْ خَاصِرَتَاهَا اسْتَقْبَلَتْ عَيْنَ الشَّمْسِ فَثَلَطَتْ وَبَالَتْ ثُمَّ عَادَتْ فَاَكَلَتْ وَاِنَّ هٰذَا الْمَالَ خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ فَمَنْ اَخَذَهٗ بِحَقِّهٖ وَوَضَعَهٗ فِیْ حَقِّهٖ فَنِعْمَ الْمَعُوْنَةُ هُوَ وَمَنْ اَخَذَهٗ بِغَيْرِ حَقِّهٖ كَانَ كَالَّذِیْ يَاْكُلُ وَلَا يَشْبَعُ وَيَكُوْنُ شَهِيْدًا عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۳۲۷/۳ حديث رقم ۱۴۶۵ و مسلم فی صحيحه ۷۲۸/۲ حديث رقم (۱۲۳/۱۰۵۲)، والترمذی فی السنن ۵۵۳/۴ حديث رقم ۲۴۶۳۔

ترجمہ: ''حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مجھے اپنی وفات کے بعد تمہارے بارے میں اندیشہ ہے کہ تم پر دنیوی آرائش وزیبائش کو کشادہ کر دیا جائے گا۔ ایک آدمی نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! کیا بھلائی اپنے ساتھ برائی بھی لے کر آئے گی؟ آپ ﷺ خاموش رہے حتی کہ ہمیں خیال ہوا کہ آپ وحی نازل ہو رہی ہے۔ روای کہتے ہیں کہ آپؐ نے اپنے چہرہ مبارک سے پسینہ صاف فرمایا اور فرمایا کہ کہاں ہے وہ شخص جس نے سوال کیا تھا۔ آپؐ نے سائل کو تحسین فرمائی۔ پھر فرمایا نہیں بھلائی اپنے ساتھ برائی کو نہیں لے کر آئے گی۔ اور یقیناً موسم بہار جو چارہ اگاتا ہے اس میں بعض چارہ جانوروں کو اپھارہ کر کے مار ڈالتا ہے یا ہلاک کے قریب پہنچا دیتا ہے اور یہی چارہ سبزہ خور جانور نے کھایا کہ اس کی کوکھیں نکل آئیں۔ اور وہ سورج کے سامنے بیٹھ گیا جگالی کرتا ہے گوبر اور پیشاب کرتا ہے اور پھر چراگاہ کی طرف جا کر سبزہ کھانے لگا یہ مال بھی سرسبز وشیریں ہے چنانچہ جس نے اسے درست طریقہ سے حاصل کیا ہے اور اس کے حق کے موافق خرچ کیا تو وہی مال بہترین مددگار ثابت ہوگا اور جس نے اس مال کو ناجائز طریقہ سے حاصل کیا تو پھر وہ اس شخص کی مانند ہے جو کھاتا رہتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا اور وہ مال قیامت کے دن اس کے خلاف گواہ ہوگا۔

تشریح: قولہ: ان مما أخاف۔۔۔۔۔ زهرة الدنيا وزينتها:

زهرة الدنيا:

زهرة: زاء مفتوح اور ھاء ساکن ہے ھاء کا فتح بھی منقول ہے۔ قاموس میں ہے کہ ''زهرة'' کا معنی ہے نبات' کلی' شگوفہ اور ''زهرة الدنيا'' سے مراد دنیا کا حُسن اور اس کی رونق ہے۔

وزينتها: عطف تفسیر ہے۔

حضور اقدس علیہ السلام نے دنیا کے حُسن ورونق کو ''زهرة'' سے تعبیر کیا۔ اس بات کی طرف اشارہ کرنے کیلئے کہ دنیا کی مٹھاس اور سرسبز وشادابی فانی ہے، اور جلد زائل ہو جانے والی ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ مجھے تم پر اس بات کا خوف ہے کہ مختلف ممالک کے فتح ہونیکی وجہ سے کثرت اموال تم کو نیک اعمال سے روک دے گی اور نافع علوم کے حصول سے غافل کر دے گی اور تمہارے اندر گھٹیا اخلاق تکبر' خود پسندی' غرور' مال وجاہ کی محبت' اور وہ امور دنیویہ جو مال وجاہ سے متعلق ہیں، کے پیدا ہونے کا باعث بن جائیگی اور موت اور موت کے بعد والے احوال اُخرویہ کیلئے تیاری سے اعراض کا باعث بن جائیگی۔

قولہ: اویاتی الخیر بالشر؟:

واؤ مفتوح ہے اور استفہام رہنمائی طلب کرنے کیلئے ہے۔ ای أيفتح علينا ويأتي الخير من الغنائم الخ معنی یہ ہے کہ کیا ہمیں فتوحات ہونگیں اور کیا ایسا بھی ہوگا کہ ہمارے پاس خیر یعنی اموال غنیمت اور دوسرے اموال حلال اور وسعت رزق آئے اور اُسکے بعد شر یعنی ترک عبادت اور ترک اطاعت آئے جس کا آپ کو ہم پر خوف ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ ''باء'' یأتي کا متعلق ہے، اور تعدیہ کیلئے ہے۔ ای هل يستجلب الخير الشر: یعنی کیا خیر اپنے بعد شر لے کر آئے گا۔ مزید وضاحت یہ ہے کہ غنیمت کا مال ہمارے لئے خیر ہے کیا یہ خیر شر کا سبب بنے گا۔

قولہ: فسکت حتی ظننا انه ينزل عليه ~~جبرئیل~~ صیغہ مجہول ہے۔ ای نزل الوحی۔

یعنی بواسطہ جبریل کے ورنہ تو حضور علیہ السلام کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کرتے بلکہ وہ جو بھی فرماتے ہیں، وہ اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ چاہے وحی جلی ہو چاہے وحی خفی ہو۔

قوله :قال فمسح عنه الرحضاء:

الرحضاء: ''راء'' مضموم، ''حاء'' مفتوح، اور اس کے بعد نقطہ والا ''ضاد'' اور ممدود ہے۔

مقدمہ میں مذکور ہے کہ'' الرحضاء '' کا معنی ہے بخار میں آنے والا پسینہ اس مقام پر وہ پسینہ مراد ہے جو حضور اقدس ﷺ کو آتا تھا وحی کے اُترنے کے وقت۔ اس جملہ میں ایک بلیغ تشبیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے وہ پسینہ پونچھ لیا جو بخار کی وجہ سے آنے والے پسینہ کی طرح تھا اور کثرت کی وجہ سے بدن پر غسل کے پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔

قوله:انه لا يأتي الخير بالشر:

فقال انه: یہ ضمیر شان ہے۔

لاياتي الخير بالشر : یعنی حقیقۃً کیونکہ شر اور خیر میں منافات ہے لیکن بعض اوقات خیر شر کیلئے سبب بن جاتا ہے، اس کے بعد حضور علیہ السلام نے نے اپنی بات کیلئے ایسی مثال بیان فرمائی جو خیر کو (زهرة) کے ساتھ بیان کرنے کے مناسب ہے۔

قوله وان مما ينبت الربيع..... :یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت و ارادہ سے اور ان کی جانب سے پیداوار کے اسباب کو پیدا کر کے یعنی ایسے پودے یا ایسی چیز جس سے چوپائے مرجاتے ہیں۔

حبطا: ''حاء'' اور ''باء'' دونوں مفتوح ہیں، اس کا معنی ہے پیٹ کے بھر جانے کی وجہ سے پیٹ کا پھول جانا۔ یہ ترکیب میں تمیز ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ یہ سبز چارہ بعض اوقات حقیقۃً چوپایوں کے مرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

اويلم: ''یاء'' مضموم اور ''میم'' مشدد ہے۔ مطلب یہ ہے، کہ یہ سبز چارہ جانوروں کو مرنے کے قریب کر دیتا ہے، چنانچہ ''او'' نوع بیان کرنے کیلئے ہے اور کلام کا مطلب یہ ہوا۔ کہ موسم بہار میں ایسا بہترین چارہ اور گھاس اُگتی ہے جو چوپایوں کو اچھی معلوم ہوتی ہے، اور اتنا زیادہ چارہ کھاتے ہیں کہ اعتدال سے تجاوز کرتے ہیں، اور پیٹ پھول جاتا ہے اور انتڑیاں پھول جاتی ہیں، چنانچہ چوپائے مرجاتے ہیں، یا مرنے کے قریب ہو جاتے ہیں۔

یہ بات تو واضح ہے کہ موسم بہار میں مختلف قسم کا چارہ اُگتا ہے، جو بذات خود ایک بھلائی کی چیز ہے۔ لیکن جانوروں کی ہلاکت کی صورت جو برائی ظاہر ہوئی یہ تو کھانے میں حد سے تجاوز کرنیکی وجہ سے ہوئی۔ اسی طرح مال حرام جمع کر کے یا آخرت سے غافل کرنے والا مال حلال جمع کر کے حد اعتدال سے تجاوز کرنے والا اپنے مال کے ذریعے عیش پرستی میں مگن ہو جاتا ہے، اور اپنے انجام کی فکر نہیں کرتا تو زیادہ کھا کر دل سخت ہو جاتا ہے۔ اور گھٹیا اخلاق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر تکبر کرتا ہے۔ ظلم کرتا ہے، اور لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور صاحب حق کو اس کا حق نہیں دیتا، لہٰذا جب کثرت مال کا انجام دنیا میں ہلاکت اور آخرت میں عذاب ہے تو درحقیقت یہ مال 'وبال' عبرتناک سزا اور بدحالی کا سبب بن جاتا ہے۔

الخضر: ''خاء'' مفتوح ہے اور ''ضاد'' مکسور ہے اور ''خضر'' تروتازہ چارہ کو کہتے ہیں اور ایک نسخہ میں ''خ'' مضموم اور ''ضاد'' مفتوح ہے یہ خضرة کی جمع ہے اور ھاء کی زیادتی کے ساتھ بھی منقول ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ چارہ ہر کھانے والے چوپائے کو مار دیتا ہے سوائے اُس چوپائے کے جو اس طرح اعتدال کے ساتھ کھائے جس کو حضور علیہ السلام نے اپنے قول (اکلت) سے بیان فرمایا۔ یعنی چرنے والا چوپایہ پیٹ بھر جائے اور سیر ہو جائے، سیر ہونے کو کوکھ کے بھر جانے سے تعبیر کیا کیونکہ جانور جب سیر ہو جاتا ہے، تو کوکھ بھر جاتے ہیں، یعنی چارہ کھا کر سورج کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح کر کے جو کچھ کھایا ہوتا ہے اُس کو ہضم کرتا ہے۔

اور شارح نے لکھا ہے کہ چارہ کھانا چھوڑ دیتا ہے، اور اپنے پیٹ کی گنجائش سے زیادہ نہیں کھاتا تاکہ زیادہ کھانا موت کا سبب نہ بنے اس کے بعد دھوپ کی طرف متوجہ ہو کر آرام کرتا ہے۔ جب پیٹ کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور کھانے کی ضرورت پڑتی ہے تو لوٹتا ہے، اور دوبارہ چرنے لگتا ہے۔ یہی حال ہے اُس شخص کا جو مال سے مال کے حقوق ادا کرے اور اپنے آپ کو اغنیاء کی طرح زندگی سے بچاتا ہے، (اغنیاء کے ساتھ برابری نہیں کرتا) نفس کی بیماری اور علاج کو جانتا ہے، حکماء انبیاء اور اولیاء کے کلام سے واقف ہے، تو مال ایسے شخص کیلئے خیر ہے کیونکہ یہ مال اس کے لئے خیر حاصل کرنے اور شر کو رفع کرنے میں معاون ہے، لیکن چونکہ مال میں خطرہ زیادہ ہے اور یہ اکثر سالکین کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اکثر انبیاء اور اولیاء کیلئے فقر و فاقہ کا راستہ پسند فرمایا۔

تمام صوفیاء اور اکثر علماء کا مذہب یہ ہے کہ صابر فقیر شاکر غنی سے افضل ہے۔ اس مقام میں اتنا مجمل کلام ہی مقصود ہے۔

اس حدیث کی لغوی تفصیل اور الفاظ و معانی کی تحقیق کے بارے میں نہایہ میں لکھا ہے، کہ "حبط" "حاء" اور "باء" مفتوح ہو تو اس کا معنی ہے ہلاکت عربی میں "حبطت الدبة تحبط حبطا" حاء اور باء کے فتحہ کے ساتھ) اُس وقت بولا جاتا ہے جب جانور کو عمدہ چراگاہ ملے اور چرنے میں حد سے اتنا تجاوز کرے کہ پیٹ پھول جائے' یہ اُس وقت ہوتا ہے جب موسم بہار میں اچھی اور عمدہ گھاس اُگتی ہے اس لئے جانور حد سے زیادہ گھاس کھاتے ہیں۔

"یلم" کا معنی ہے ہلاکت کے قریب ہو جاتے ہیں۔

"الخضر: 'ضاد' کے کسرہ کے ساتھ یہ ایک قسم کی گھاس ہے جو اچھی نہیں ہوتی۔ جانور یہ گھاس اُس وقت کھاتے ہیں، جب دوسری قسم کی گھاس نہ ملے' اس لئے اس گھاس سے نہ اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور نہ مزید کھانے کیلئے اس کو ہضم کرنے کیلئے کوئی حرکت کرتے ہیں۔

قاضی نے لکھا ہے کہ "آکله" يقتل کا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور استثناء مفرغ ہے اور اصل عبارت یوں ہے:"ان ممانبت الربیع مایقتل اکله الا آکل الخضر علی هذا الوجه" (موسم بہار میں پیدا ہونے والی بعض قسم کی گھاس اُس جانور کو مار دیتی ہے جو اُس کو کھائے سوائے "خضر" نامی گھاس کے جبکہ "خضر" نامی گھاس کو حدیث میں مذکور طریقہ سے کھایا جائے۔("الوجه المذکور" سے مراد، أكلت حتى اشدت استقبلت الشمس ...... الخ) اور کلام میں عموم کیلئے کلام مثبت سے استثناء مفرغ درست ہے اور اس کی نظیر "قرات الا یوم کذا" ہے (فلاں دن کے علاوہ روزانہ پڑھا)۔

علامہ طیبیؒ اللہ نے لکھا ہے کہ مظہر کا کلام [illegible] ہے۔ زیادہ اچھا یہ ہے کہ استثناء منقطع ہو کیونکہ مثبت کلام میں رفع

ہے۔ اور استثناء مفرغ صاحب کشاف کے نزدیک بغیر تاویل کے جائز نہیں کیونکہ موسم بہار میں اُگنے والی گھاس میں سے بعض قسم کی گھاس ایسی ہوتی ہے کہ جس کو جانور زیادہ کھاتے ہیں، اور مرجاتے ہیں، کیونکہ "من" تبعیضیہ اس پر دلالت کرتا ہے اور حضور علیہ السلام کے ارشاد "الا اکل الخضر" سے گھاس کے انواع کی جو تقسیم ہوئی یہ بھی دلالت کرتی ہے کہ بعض قسم کی گھاس ایسی ہوتی ہے جس کو جانور زیادہ کھاتے ہیں، اور زیادتی کی وجہ سے مرجاتے ہیں، کیونکہ (خضر) ایسی گھاس نہیں ہے جس کو جانور زیادہ کھاتے ہوں اور شرح السنہ کی عبارت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

ازھری نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں دو مثالیں بیان فرمائی گئی ہیں، ایک اُس شخص کی مثال ہے جو دُنیا کو جمع کر کے اور صاحب حق سے حق روک کر حد سے تجاوز کرتا ہے۔ اور دوسری اُس شخص کی مثال ہے جو دُنیا حاصل کرنے اور دُنیا سے نفع لینے میں اعتدال پر ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد: "وان مما ینبت الربیع ما یقتل حبطا" اُس شخص کی مثال ہے جو ناحق دنیا حاصل کر کے حد سے تجاوز کرے اور مثال کی وضاحت اس طرح ہے، کہ موسم بہار میں عُمدہ قسم کی گھاس اُگتی ہے اور جانور اس کو اتنا زیادہ کھاتے ہیں، کہ حد اعتدال سے تجاوز کرتے ہیں۔ پیٹ پھول جاتے ہیں، اور انتڑیاں پھول جاتی ہیں اور ہلاک ہوجاتے ہیں، اسی طرح وہ شخص جو ناحق دنیا کو جمع کرتا ہے۔ اور صاحب حق سے حق کو روک لیتا ہے تو وہ جہنم میں داخل ہو کر آخرت میں ہلاک ہوجاتا ہے۔ اور حد اعتدال پر قائم رہنے والے شخص کی مثال ارشاد رسول ﷺ "الا اکلة الخضر" میں بیان کی گئی ہے اور مثال کی وضاحت اس طرح ہے کہ "خضر" نامی گھاس موسم بہار میں اُگنے والی گھاس میں سے اتنی عُمدہ قسم کی گھاس نہیں ہے کہ جانور اس کو زیادہ کھائیں بلکہ یہ موسم گرما کی گھاس ہے۔ دوسری گھاس ختم ہونے کے بعد جانور اس کو تھوڑا تھوڑا کھاتے ہیں، اور زیادتی نہیں کرتے۔ یہ اُس شخص کی مثال ہے کہ جو دُنیا حاصل کرنے میں اعتدال پر ہو اور حرص اس کو ناحق دُنیا لینے پر مجبور نہ کرے۔ اور دُنیا کے وبال سے نجات پالیتا ہے۔

حضور علیہ السلام کے ارشاد: "حتی امتدت خاصرتاہ استقبلت عین الشمس" کے بارے میں اشرفؒ لکھتے ہیں کہ وہ شخص جو اعتدال پر ہو اور اُس کا انجام اچھا ہوتا ہے۔ اگر چہ بعض اوقات حد اعتدال سے تجاوز کرتا ہے اور اللہ کی طرف سے انسان کی طبیعت میں رکھی ہوئی شہوت کے غلبہ سے مذموم حد اسراف کے قریب ہوجاتا ہے۔ یہی مطلب ہے "اکلت حتی امتدت خاصرتاہ" کا لیکن وہ شخص جلد ہی اُس مذموم حد اسراف سے لوٹ آتا ہے اور اُس حد پر زیادہ ٹھہرتا نہیں بلکہ اُن روشن اور واضح دلائل کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو مہلک حرص کو دفع کرتے ہیں، اور جن سے حرص کا قلع قمع ہوجاتا ہے۔ یہی مطلب ہے: "استقبلت عین الشمس فثلطت و بالت" کا۔ دوسری بار کچھ عبارت حذف کردی کیونکہ پہلی والی عبارت اُس محذوف عبارت پر دلالت کررہی ہے اور اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ وہ شخص جس کا انجام اچھا ہوا گر چہ بار بار شہوت کے غلبہ کی وجہ سے حد اعتدال سے تجاوز کرنے لگتا ہے اور حد اسراف کے قریب ہونے لگتا ہے لیکن اللہ کی مشیت سے حد مذموم یعنی حد اسراف سے بچ جاتا ہے اور حد محمود یعنی حد اعتدال کے قریب ہوجاتا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں، کہ مذکورہ وضاحت کے مطابق استثناء متصل ہے۔ لیکن مستثنیٰ منہ کی جانب میں تاویل ضروری ہے اور مطلب یہ ہے کہ مِن جملہ اُس چارہ کے جو موسم بہار میں اُگتا ہے کچھ ایسا بھی ہے جس کی وجہ سے جانور مرجاتے ہیں

سوائے "خضر" نامی گھاس کے کہ اس کو کھانے میں جانور حد اعتدال پر ہوتے ہیں، اور اتنی مقدار میں نہیں کھاتے کہ ہلاک ہو جائیں۔

قولہ: وان هذا المال خضرة حلوة:

خضرة: "خاء" مفتوح اور "ضاد" مکسور ہے۔

حلوة: "حاء" مضموم ہے۔ معنی یہ ہے کہ دُنیا اچھا منظر پیش کرتی ہے۔ کیونکہ اس کا ذائقہ بھی بہت بڑھا ہوا۔ اور مونث صیغہ لانا اس وجہ سے ہے کہ مال سے مراد دُنیا اور دُنیا کی زینت ہے۔ کیونکہ تقدیری عبارت یوں ہے "ان زهرة هذا المال خضرة حلوة".

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح مونث کے صیغہ کے ساتھ بخاری سے ہم نقل کرتے ہیں، اور "خضر حلو" بھی نقل کیا گیا ہے۔ ایک وجہ مونث کا صیغہ لانے کی یہ بھی ہے کہ خضرة حلوة کو مونث کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ مشبہ بہ کی تانیث کی وجہ سے یعنی "ان هذا المال شيئ كا لخضرة" (یہ مال "خضرة" کی طرح ہے)۔ بعض نے معنی "كالبقلة الخضرة" ذکر کیا ہے۔ یا یہ تاویل کی جائے کہ "فائدة المال اى الحياة به والعيشة خضرة" (مال کا فائدہ یعنی مال کے ذریعہ سے معاش اور زندگی گزارنا خضرہ کی طرح ہے۔

علامہ طیبی نے لکھا ہے کہ یہ درست ہے کہ دُنیا کو مال سے تعبیر کیا جائے۔ کیونکہ مال دنیا کی زینت والی دو چیزوں میں سب سے زیادہ زنیت والی چیز ہے۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿المال والبنون زينة الحياة الدنيا﴾ اس طرح یہ حدیث ابوسعید خدری کی اس حدیث کے موافق ہو جائیگی: "الدنيا خضرة حلوة وان الله مستخلفكم ......الخ"۔

مطلب یہ کہ مال کو تشبیہ دی ہے اُس چراگاہ کے ساتھ جو چوپایوں کی پسندیدہ جگہ ہے۔ قوله: فمن أخذه بحقه فنعم المعونة هو: یعنی وہ چیز جس سے اطاعت پر اعانت لی جاتی ہے اور کفالت کی ضرورت کو پورا کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ "معونة" سے مراد وصف ہے بطور مبالغہ یعنی دین پر اعانت کرنے والی اچھی چیز۔

"هو" سے اشارہ مال کی طرف: ، اور اس کی نظیر ہے یہ قول "نعم المال الصالح للرجل الصالح" جب صالح بندہ کو حلال مال مل جائے تو یہ اچھی چیز ہے۔

قوله: ومن اخذه بغير حقه كان كالذي يأ كل ولا يشبع: یعنی جو شخص بغیر ضرورت مال جمع کرے اور مال حرام جمع کرے اور مال کو اللہ کی مرضی کے مطابق خرچ نہ کرے تو لا علاج بیماری اور مہلک پریشانی میں مبتلا ہو جائے۔ حرص کے غلبہ کی وجہ سے جیسا کہ وہ مریض جس کو "جوع البقر" یا استسقاء کی بیماری ہو جس میں پانی سے پیاس نہ بجھے بلکہ جتنا پیتا جائے پیاس بڑھتی چلی جائے اور پیٹ پھولتا چلا جائے۔

قوله: ويكون شهيدا عليه يوم القيامة:

یعنی یہ مال قیامت کے دن اس شخص کے خلاف اس کی حرص اور اسراف پر گواہی دے گا۔ اور اس بات پر گواہی دے گا کہ اس نے مال اللہ کی مرضی کے مطابق خرچ نہیں کیا اور اس بات پر گواہی دے گا کہ اس شخص نے اللہ کے بندوں کے حقوق ادا نہیں کیے۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''دنیا کی مثال سانپ کی سی ہے۔ کہ سانپ میں نفع والی چیز تریاق بھی ہوتا ہے۔ اور نقصان والی چیز زہر بھی ہوتا ہے۔ اگر دُنیا اُس شخص کے ہاتھ لگے جو دُنیا کے شر سے بچنا جانتا ہے اور اس دُنیا سے تریاق نکالنے کا طریقہ جانتا ہے تو اُسکے لئے نعمت ہے۔ اور اگر نالائق اناڑی کے ہاتھ لگے تو اُسکے لئے ہلاکت ہے۔

اس کی وضاحت خواجہ عبید اللہ نقشبندی کے قول سے بھی ہوئی ہے وہ فرماتے ہیں کہ دُنیا سانپ کی طرح ہے جو سانپ سے بچنے کا دم جانتا ہے اُسکے لئے اس کا حاصل کرنا جائز ہے ورنہ نہیں جائز کسی نے پوچھا کہ اس سے بچنے کا دم کیا ہے؟ فرمایا کہ یہ جاننا کہ ''مال کہاں سے حاصل کرنا چاہیے اور کہاں خرچ کرنا چاہیے'' اس سے بچنے کا دم ہے۔''

۵۱۶۳ : وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَاللّٰهِ لَا الْفَقْرَ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ وَلٰكِنْ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ اَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا كَمَا بُسِطَتْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَتَنَافَسُوْهَا كَمَا تَنَافَسُوْهَا وَتُهْلِكَكُمْ كَمَا اَهْلَكَتْهُمْ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٣١٩/٧ حدیث رقم ٤٠١٥ و مسلم فی صحیحه ٢٢٧٣/٤ حدیث رقم ٢٩٦١/٦، والترمذی فی السنن ٢٤٦٢، واخرجه ابن ماجه ١٣٣٤/٢ حدیث رقم ٣٩٩٧۔

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خدا کی قسم مجھے تمہارے بارے میں فقر و افلاس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے (کیونکہ فقر و افلاس کی حالت میں دین کی سلامتی کا امکان غالب ہوتا ہے اور یہ چیز تمہارے حق میں زیادہ سودمند ہے) بلکہ مجھے اندیشہ اس بات سے ہے کہ دنیا تم پر کشادہ کی جائے گی (اور تم مالداروں کا طور طریقہ اختیار کر کے مختلف قسم کی آفتوں اور بلاؤں کے ذریعہ ہلاکت و تباہی میں مبتلا ہو جاؤ گے) تم سے پہلے لوگوں پر دنیا کو کشادہ کیا گیا تھا (اور وہ مال و دولت کی بے حد رغبت و محبت رکھنے کی وجہ سے فقراء اور مساکین پر رحم نہیں کھاتے تھے اور ان کی مدد و اعانت سے گریز کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو تباہ و برباد کر دیا گیا) چنانچہ تم دنیا کی طرف مائل ہو جاؤ گے جیسے تم سے پہلے لوگ مائل ہوئے تھے اور پھر یہ دنیا تم کو اسی طرح تباہ و برباد کر دے گی جس طرح ان کو تباہ و برباد کر چکی ہے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: فوالله لا الفقر أخشى عليكم:

لا الفقر: منصوب ہے مفعول ہونیکی بناء پر اور اہتمام کی وجہ سے اپنے عامل پر مقدم کیا گیا ہے۔ اور اس کا عامل ''اخشى عليكم'' ہے۔ اور اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ انسان کی حفاظت اس میں ہے کہ زیادہ قدرت نہ رکھے۔ اگر چہ فقر انسان کو کفر کے قریب کر دیتا ہے۔

قوله: ولكن أخشى عليكم ----- وتهلكم كما أهلكتهم:

فتنافسوها: اس کی ایک ''تاء'' حذف کی گئی' اور اس کا ''تبسط'' پر عطف ہے اور ''نافست في الشئي'' بمعنی رغبت فيه'' (مجھے فلاں چیز میں رغبت ہے) سے لیا گیا ہے۔ اور در حقیقت ''منافسه'' اور ''تنافس'' کا معنی ہے نفس کا نفیس

چیز کی طرف مائل ہونا، اسی وجہ سے اللہ نے فرمایا: ﴿خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنٰفِسُوْنَ﴾ [المطففین: ٢٦]

کما تنافسوھا: ماضی صیغہ ہے۔

طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر یہ سوال کیا جائے کہ پہلے جملہ میں مفعول کو مقدم کیا گیا' جبکہ دوسرے میں ایسا نہیں کیا گیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ فقر کے معاملہ کی اہمیت بتانے کیلئے اس طرح کیا گیا۔ اس لئے کہ مہربان والد کی موت کا وقت جب قریب آتا ہے تو اولاد کے ضائع ہونے اور تنگدستی کی اس کو فکر وغم بڑھتا ہے۔ تو گویا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے ساتھ میرا معاملہ اس طرح نہیں ہے جس طرح کہ والد کا معاملہ ہوتا ہے۔ کیونکہ مجھے تم پر فقر کا اس طرح اندیشہ نہیں جس طرح والد کو اولاد پر فقر کا اندیشہ ہوتا ہے۔ بلکہ مجھے تو تم پر مالداری (غنیٰ) کا خوف ہے حالانکہ یہ مالداری اولاد کیلئے والد کا مطلوب ہوتا ہے۔

"الفقر" میں "الف لام" یا تو عہدی ہیں، چنانچہ وہ حالت فقر مراد ہے جس پر صحابہ تھے یعنی اُنکے پاس دُنیا بالکل نہ تھی اور اگر تھی تو بالکل قلیل مقدار میں اور "البسط" سے مراد، وہ کشادگی ہے جو صحابہ پر مختلف ممالک فتح کرنے کی وجہ سے آئی تھی۔

یا "الف لام" جنس کیلئے ہے اور "فقر" سے مراد وہ حالت ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے۔

"البسط" سے مراد بھی وہ حالت ہے جس کی حقیقت ہر شخص جانتا ہے۔ اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا﴾ [الانشراح: ٥-٦] اور بظاہر فقر سے مراد وہ حالت ہے جس میں انسان کے پاس دین اور بدن کی وہ تمام ضروریات نہ ہوں جن کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے۔

غنیٰ سے مراد مقدار کفایت سے زائد وہ دنیا مراد ہے جس کی وجہ سے انسان میں سرکشی اور اللہ کی عبادت سے غفلت پیدا ہو جائے۔ اور طیبی رحمہ اللہ نے اس کا معنی یوں بیان کیا ہے کہ تم لوگوں کو دُنیا کی رغبت ہوگی اور دنیا کو جمع کرنے میں مشغول ہوگے۔ اور اپنے پاس مال روکے رکھنے کی حرص ہوگی۔ اور اس دُنیا کی وجہ سے سرکش ہو جاؤ گے۔ اور ہلاک ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿کلا ان الانسان لیطغی ان راہ استغنٰی﴾ ترجمہ "سچ مچ بیشک آدمی حد سے نکل جاتا ہے۔ اس وجہ سے کہ اپنے کو مستغنی دیکھتا ہے۔"

اور یہ بھی احتمال ہے کہ اغنیاء کی ہلاکت مال کی وجہ سے اس لئے ہوتی ہے کہ ان کے اموال میں لوگوں کو رغبت ہوتی ہے اور لوگ ان سے اُمید اور توقع رکھتے ہیں' تو جب لوگوں سے مال کو روکتے ہیں تو ان کے اور لوگوں کے درمیان عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ عداوت ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔ لیکن حدیث سے یہ مراد لینا بعید ہے بلکہ محال ہے اور اس احتمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تخریج: طبرانی نے جامع صغیر میں انسؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: "من اصبح حزینا علی الدنیا أصبح ساخطا علی ربه تعالیٰ' ومن أصبح یشکو مصیبة نزلت به فا نما یشکوا الله تعالیٰ' ومن تضعضع لغنی لینال مما فی یدیه أسخط الله تعالیٰ فدخل النا رفابعده الله تعالیٰ۔

"جو دنیا کے فوت ہو جانے پر غمگین ہو جائے وہ اللہ کے فیصلوں پر ناراض ہوتا ہے۔ اور جو کسی آئی ہوئی مصیبت کی شکایت

کرے تو وہ درحقیقت اللہ کی شکایت کرتا ہے۔اور جو شخص کسی مالدار سے مال حاصل کرنے کی غرض سے اُسکے سامنے عاجزی ظاہر کرتا ہے وہ اپنے رب کو ناراض کرتا ہے۔اور جو شخص قرآن سیکھ کر بھی جہنم میں داخل ہو جائے اللہ اُس کو جہنم کے سب سے نیچے درجے تک پہنچا دیتا ہے۔"

ابوالشیخ نے ثواب میں ابودرداءؓ کی حدیث اسی طرح بیان کی ہے مگر اس حدیث کے آخر میں ہے:

ومن قعد اوجلس الی غنی فتضعضع له لدنیا تصیبه ذهب ثلثا دینه ودخل النار

"جو شخص کسی مالدار کے پاس بیٹھ جائے اور دنیا حاصل کرنے کی غرض سے اُسکے سامنے ذلت اُٹھائے تو اُسکا دو تہائی دین چلا جاتا ہے اور آگ میں داخل ہو جاتا ہے۔"

۵۱۶۴ : **وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا وَفِیْ رِوَایَةٍ کَفَافًا.** (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۸۱/۱۱ حدیث رقم ٦٤٦٠ و مسلم فی صحیحه ۲۲۸۱/٤ حدیث رقم (۱۸-۱۰۵۵)، والترمذی فی السنن ٥۰۱/٤ حدیث رقم ۲۳٦۱ و ابن ماجه فی السنن ۱۳۸۷/۲ حدیث رقم ٤۱۳۹، واحمد فی المسند ٤٤٦/۲۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی: "اے اللہ! تو آل محمد (ﷺ) کو بقدر قوت رزق عطا فرما" اور ایک روایت میں (قوت کے بجائے) "کفاف" کا لفظ مروی ہے۔(بخاری و مسلم)

تشریح: "**آل محمد**" سے مراد حضور اقدس علیہ السلام کی اولاد اہل بیت اور وہ لوگ جنہوں نے آپ کی کامل تابعداری کی اور آپ کے ساتھ محبت کا ثبوت دیا۔

قوت: جس سے اطاعت پر قدرت ملے اور زندگی کے لیے سانس چلتی رہے۔

قوله: وفی روایة کفافا:

"**کفافاً**": "کاف" مفتوح ہے اور کفاف گزارہ اس بقدر روزی کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان بھوک اور سوال سے بچ جائے۔بظاہر یہ روایت پہلی روایت کی تفسیر ہے اور اس کا بیان ہے کہ کم سے کم معیشت پر اکتفاء کرنا بہتر طریقہ ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس علیہ السلام کی اس دُعا کو ہر اُس شخص کے بارے میں قبول فرمایا جس کو اللہ نے پسند فرمایا اور منتخب کیا۔

"آل" کی تفسیر میں دوسری رائے یہ ہے کہ "آل" سے مراد اس اُمت کے وہ خواص ہیں جو اہل کمال ہیں۔اور اس کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جس کو ابن ماجہؒ نے **عمرو بن غیلان الثقفی** اور طبرانی نے معاذ بن جبل سے آپ کی دُعا کے بارے میں نقل کیا ہے: "**اللهم من آمن بی......**" اے اللہ جو شخص میرے اُوپر ایمان لایا اور میری تصدیق کی اور اس بات کا یقین رکھا کہ جو دین میں تیری طرف سے لے کر آیا ہوں وہ حق ہے اُس کو کم مال اور کم اولاد دے اور اپنی ملاقات اُسکی محبوب چیز بنا اور اُسکی عُمر مختصر کر دے۔اور جو شخص میرے اُوپر ایمان نہیں لایا اور میری تصدیق نہیں کی اور اُس دین کے حق ہونے کا یقین نہ رکھا جس کو میں تیری طرف سے لے کر آیا ہوں اُس کو زیادہ مال اور زیادہ اولاد دے اور اُسکی عُمر طویل کر دے"۔اور شاید اس کی

وجہ وہ ہے جو آپؐ سے مروی ہے :"**قلیل یکفیك خیر من کثیر یطغیك**" وہ قلیل مال جو بقدر کفایت ہو اُس کثیر مال سے بہت ہے، جو سرکشی پیدا کرے۔

اور ایک روایت میں ہے، کہ وہ "قلیل مال جس کا شکرادا کیا جائے۔ بہتر ہے اُس کثیر مال سے جس کا شکرادا کرنے کی تم طاقت نہ رکھو"۔ اور ایک صاحب حال نے کیا ہی اچھا کہا ہے:

زیادة المرء فی دنیاه نقصان

وربحه غیر محض الخیر خسران

"دُنیاوی اُمور میں انسان کی ترقی اس کے لئے نقصان دہ ہے اور نیکی کیے بغیر صرف دُنیاوی نفع حاصل کرنا آخرت کا خسارہ ہے۔

نہایہ میں ہے، کہ "**کفاف**" اُس مال کو کہتے ہیں، جو بقدر ضرورت ہو اور ضرورت میں خرچ کرنے کے بعد نہ بچے۔ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ روایت پہلی روایت کی تفسیر کرتی ہے۔ کیونکہ (**قوت**) اُس رزق کو کہتے ہیں جس سے زندگی کے لیے سانس چلتی رہے۔

بعض کہتے ہیں کہ "**قوت**" اس وجہ سے ہیں کہ اس سے قوت حاصل ہوتی ہے۔

حضور اقدس علیہ السلام نے اللہ کے ہاں پسندیدہ عمل اعتدال کا راستہ بتایا ہے۔ کیونکہ مال کی کثرت انسان کو آخرت سے غافل کر دیتی ہے۔ اور مال کی قلت انسان کو آخرت بھلا دیتی ہے۔ چنانچہ وہ مال قلیل جو بقدر کفایت ہو بہتر ہے اُس مال سے جو کثیر ہو اور غافل کر دے۔

آپ ﷺ کی دُعا میں اُمت کیلئے مکمل رہنمائی ہے کہ بقدر ضرورت روزی سے زائد روزی طلب کرنے کیلئے اپنے آپ کو تھکانا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس میں خیر نہیں ہے۔

"**کفاف**" کا حکم اشخاص اور احوال کے اختلاف سے بدل جاتا ہے۔ بعض کو اتنا کم کھانے کی عادت ہوتی ہے کہ پورے ہفتہ میں ایک مرتبہ کھاتے ہیں ان کے لئے "**کفاف**" اور "**قوت**" وہی ایک مرتبہ کھانا ہے۔ بعضوں کو دن میں ایک یا دو بار کھانے کی عادت ہوتی ہے۔ ان کے لئے "**کفاف**" وہ مقدار ہے۔ اس لئے کہ اس سے کم میں ان کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور عبادت کی طاقت نہیں رہتی۔ بعض کی اولاد زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے لئے "**کفاف**" وہ روزی ہے جو اس کے عیال کی زندگی کیلئے ضروری ہو۔ اور بعض کی اولاد کم ہوتی ہے۔ ان کو زیادہ روزی اور زیادہ مشغولیت کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا "**کفاف**" کی مقدار متعین نہیں ہے۔ مگر پسندیدہ وہ مقدار روزی ہے جس سے اطاعت پر قدرت حاصل ہو اور بقدر ضرورت مشغول ہو۔

تخریج: اور جامع میں ہے: "**اللهم ارزق آل محمد فی الدنیا قوتا**"

اے اللہ! آل محمد کو دنیا میں بقدر ضرورت رزق دے۔ اس کو مسلم، ترمذی اور ابن ماجہ نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔

۵۱۶۵ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَسْلَمَ وَرُزِقَ كَفَافًا وَقَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا آتَاهُ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢/ ٧٣٠ حديث رقم (١٢٥-١٠٥٤)، والترمذي في السنن ٤/ ٤٩٧ حديث رقم ٢٣٤٨ و ابن ماجه في السنن ٢/ ١٣٨٦ حديث رقم ٤١٣٨ واحمد في المسند ٢/ ١٦٨۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ کامیاب ہوگیا وہ شخص جس نے اسلام قبول کیا (یا ''اسلم'' سے مراد یہ ہے کہ اس نے قضاوقدر الٰہی کے سامنے سرتسلیم خم کیا) اس کو گزارہ لائق رزق دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے عطا کردہ رزق پر قناعت کی توفیق بخشی۔ (مسلم)

تخریج: احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے اسی طرح روایت کیا ہے۔

احمد کی ایک روایت میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا گیا ہے: ''قد افلح من اخلص۔

''جس نے اپنے دل کو ایمان کیلئے خالص کیا اور اپنے دل کو محفوظ کیا اور اپنی زبان کو سچ گو بنالیا اور اپنے نفس کو نفس مطمئنہ بنا دیا اور اپنے اخلاق کو بہتر بنالیا اور اپنے کان کو حق سننے والا بنایا اور اپنی آنکھ کو حق دیکھنے والا بنایا وہ کامیاب ہوا''

اور ایک روایت میں اختصار کے ساتھ منقول ہے: ''قد افلح من رزق لبا'' . وہ شخص کامیاب ہوا جس کو عقل دی گئی۔

بیہقیؒ نے قرہ بن ہبیرہ سے اس کو نقل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾ [المؤمنون۔١-٢] ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

٥١٦٦: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْعَبْدُ مَالِیْ مَالِیْ وَاِنَّ مَالَهٗ مِنْ مَالِهٖ ثَلٰثٌ مَا اَكَلَ فَاَفْنٰی اَوْ لَبِسَ فَاَبْلٰی اَوْ اَعْطٰی فَاقْتَنٰی وَمَاسِوٰی ذٰلِكَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَتَارِكُهٗ لِلنَّاسِ۔

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٤/ ٢٢٧٣ حديث رقم (٤-٢٩٥٩)، والترمذي في السنن ٤/ ٤٩٤ حديث رقم ٢٣٤٢، والنسائي في السنن ٦/ ٢٣٨ حديث رقم ٣٦١٣ واحمد في المسند ٢/ ٣٦٨۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بندہ کہتا رہتا ہے کہ میرا مال' میرا مال (یعنی جو شخص مالدار اور دولت مند ہوتا ہے وہ اپنے مال ودولت پر بہت فخر کرتا ہے اور دوسرے پر یہ جتانے کی کوشش کرتا ہے کہ میرے پاس مال ودولت ہے) حالانکہ اس کا مال تین طرح سے (اس کے کام کا) ہے (اور ان تین چیزوں میں سے بھی صرف ایک چیز ایسی ہے جو اس کے لئے حقیقی نفع بخش اور باقی رہنے والی ہے جب کہ بقیہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کا تعلق دنیا سے ہے اور جو فنا ہو جانے والی ہے) ایک وہ جو اس نے کھا کر ختم کر دیا' دوسرا جو اس نے پہن کر بوسیدہ کر دیا اور تیسرا جو اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اپنی آخرت کے لئے) محفوظ کر لیا' ان تینوں کے سوا اور جو کچھ ہے وہ لوگوں کے لئے چھوڑ کر (اس دنیا سے) چلا جانے والا ہے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: يقول العبد مالي مالي :

حالانکہ بندہ اور اُسکے قبضہ میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے اور صوفیہ نے بھی لکھا ہے کہ انسان کیلئے دُرست نہیں کہ کسی چیز کی نسبت اپنی طرف کرے۔ یعنی میرا مال اتنا ہے اور اتنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بطور فخر مال گنتا ہے یا مطلب یہ ہے کہ مال کو تھوڑا سمجھ کر مال کو ذکر کرتا ہے اور مال سے جو مقصود ہے اُس کو نہیں جانتا اور مال کے انجام یعنی وبال کو نہیں جانتا۔

قوله: وان ماله من ماله ثلاث: ثلاث: پہلا "ما" موصولہ ہے اور "لا" اس کا صلہ ہے اور "من ماله" صلہ سے متعلق ہے اور "ثلاث" خبر ہے۔ اور عدد میں مونث کا معاملہ کیا گیا "منافع" کی تاویل کر کے (یہ بات طیبی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے) اور مطلب یہ ہے کہ انسان کے لیے اُن میں سے ایک منفعت حقیقی اور باقی رہنے والی ہے دوسری دو صُوری اور فانی ہیں۔

ما أكل فافني: یعنی جو کھائی جانے والی اور پی جانے والی چیزیں استعمال کی اس میں تغلیب اور اکتفاء ہے۔

قوله: فهو ذاهب وتاركه للناس:

یعنی ورثاء وغیرہ کیلئے بغیر کسی ایسے فائدہ کے جو اس بندہ کو ملے، باوجودیکہ حساب کا مطالبہ ہوگا اور سزا دی جائیگی۔

۵۱۶۷ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتْبَعُ الْمَيِّتَ ثَلٰثَةٌ فَيَرْجِعُ اثْنَانِ وَيَبْقٰى مَعَهٗ وَاحِدٌ يَتْبَعُهٗ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ وَعَمَلُهٗ فَيَرْجِعُ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ وَيَبْقٰى عَمَلُهٗ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۳۶۲/۱۱ حديث رقم ٦٥١٤ واخرجه مسلم في صحيحه ۲۲۷۳/٤ حديث رقم ۲۹٦۰/۵، والنسائي في السنن ۵۳/٦ حديث ۱۹۳۷ والترمذي في السنن ۵۰۹/٤ حديث رقم ۲۳۷۹؛ واحمد في المسند ۱۱۰/۳۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میت کے ساتھ (قبر تک) تین چیزیں جاتی ہیں اُن میں سے دو چیزیں تو (اس کو اکیلا چھوڑ کر) واپس لوٹ آتی ہیں اور ایک چیز اس کے ساتھ باقی رہ جاتی ہے اس کے اہل وعیال اس کا مال اور اسکے اعمال اہل اور مال واپس آ جاتے ہیں اسکے اعمال ساتھ رہ جاتے ہیں"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: يتبع الميت ثلاثه:

مظہر نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد ایک قسم کا مال اس کے غلام ہیں، اور طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ گھر والوں کا میت کے پیچھے چلنا حقیقۃً ہوتا ہے اور مال کا میت کے پیچھے چلنا مجازاً ہوتا ہے۔ کیونکہ موت کے بعد بھی مال کا انسان کے ساتھ اُسکی تجہیز، تکفین، غُسل کا خرچہ، قبر تک لے جائے جانے اور تدفین میں تعلق رہتا ہے۔ اور جب میت کو دفنا دیا جاتا ہے تو مال کا اُسکے ساتھ تعلق بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: "القبر صندوق العمل" قبر عمل کا صندوق ہے۔ اور حدیث میں ہے: القبر روضة من رياض الجنة أو حفرة من حفر النيران "قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے"۔

۵۱۶۸ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّكُمْ مَالُ وَارِثِهٖ اَحَبُّ اِلَيْهِ مِنْ مَالِهٖ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَامِنَّا اَحَدٌ اِلَّا مَالُهٗ اَحَبُّ اِلَيْهِ مِنْ مَالِ وَارِثِهٖ قَالَ فَاِنَّ مَالَهٗ مَاقَدَّمَ وَمَالُ وَارِثِهٖ مَا اَخَّرَ۔ (رواه البخاري)

اخرجه البخاري في صحيحه ۲٦۰/۱۱ حديث رقم ٦٤٤٢ واحمد في المسند ۳۸۲/۱۔

ترجمہ: "حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ

''تم میں سے کون ہے جسے اپنے ورثا کا مال اپنے مال سے زیادہ پسند ہو؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم میں کوئی ایسا شخص نہیں جو اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کے مال کو محبوب رکھتا ہو۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حقیقت میں اس کا مال وہ ہے جسے اس نے (صدقہ وخیرات وغیرہ کے ثواب کی صورت میں) آگے بھیج دیا ہے جب کہ پیچھے رہ جانے والا مال اس کے ورثا کا ہے (بخاری)

تشریح: قوله: فان ماله ما قدم:

یعنی جس مال کو بندہ نے اپنی موت سے پہلے آخرت کے لئے بھیج دیا۔ کیونکہ یہ مال بندہ کو نفع دے گا اور اس کے لئے آخرت میں باقی رہے گا۔ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا تُقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [البقرة: ۱۱۰]

''جو بھلائی تم اپنے لئے آگے بھیجو گے اللہ کے ہاں پالو گے۔''

قوله: ومال وارثه ما اخر یعنی جو مال اپنے ورثاء کیلئے پیچھے چھوڑ دیا۔ کہ ورثاء اُس مال سے وہ بُرائی یا بھلائی کرینگے جو اُنکے لئے مقدر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ﴾ [الانفطار: ۵] ''ہر شخص اپنے اگلے اور پچھلے اعمال کو جان لے گا۔''

۵۱۶۹ : وَعَنْ مُطَرِّفٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَقْرَءُ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ قَالَ يَقُوْلُ ابْنُ اٰدَمَ مَالِيْ قَالَ وَهَلْ لَكَ يَا ابْنَ آدَمَ اِلَّا مَا اَكَلْتَ فَاَفْنَيْتَ اَوْلَبِسْتَ فَاَبْلَيْتَ اَوْ تَصَدَّقْتَ فَاَمْضَيْتَ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/ ٢٢٧٣ حديث رقم (٣-٢٩٥٨) واحمد في المسند ٤/ ٢٤۔

ترجمہ: ''حضرت مطرف (تابعی) اپنے والد ماجد (حضرت عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ الهكم التكاثر کی تلاوت فرما رہے تھے آپ نے ارشاد فرمایا ابن آدم میرا مال میرا مال کہتا ہے آپ نے فرمایا اے ابن آدم! تیرا مال تو محض وہ ہے جو تو نے کھا کر ختم کر دیا یا پہن کر پرانا کر دیا یا صدقہ کر کے توشہ آخرت بنالیا''۔ (مسلم)

تشریح: قال يقول ابن آدم (مالي مالي): کیونکہ وہ امانت کا ذمہ اٹھانے میں ظلوم وجہول ہے۔

مال کو اپنی طرف منسوب کر کے کبھی تو دھوکہ کھا جاتا ہے اور کبھی فخر کرتا ہے۔

قال: وهل لك الخ: ماقبل بات کا تکرار تاکید کیلئے ہے اور اس وہم کو زائل کرنے کیلئے ''کہ یہ راوی کا قول ہے۔

یعنی اس مال کو بوسیدہ کرنے اور ختم کرنے کیلئے خرچ کیا۔ اور قیامت کے دن اپنے نفع کیلئے باقی رکھا۔ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿ما عندكم ينفد وما عند الله باق﴾ [النحل۔٩٦]

ترجمہ ''جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے باقی رہے گا۔''

اللہ تعالیٰ کا ایک اور مقام پر ارشاد ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾

[البقرة۔٢٤٥]

''کوئی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسنہ دے پھر خدا تعالیٰ اس کو اس شخص کیلئے بڑھاتا چلا جائے، اور اس کے لئے اجر

پسندیدہ ہے۔"

۵۱۷۰ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ کَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰکِنَّ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۱/۲۷۱/حدیث رقم ٦٤٤٦ و مسلم فی صحیحه ۲/۷۲٦ حدیث رقم (۱۲۰-۱۰۵۱) والترمذی فی السنن ٤/٥٠٦ حدیث رقم ۲۳۷۳وابن ماجه ۲/۱۳۸٦ حدیث رقم ٤١٣٧، واحمد فی المسند ۲/۲٦۱۔

ترجمه: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "حقیقی دولتمندی مال و منال کی کثرت نہیں بلکہ دولتمندی تو نفس (یعنی دل) کا مالدار ہونا (مال کا غنی ہونا) ہے"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: لیس الغنی کثرة العرض:

حقیقت جاننے والوں کے ہاں غنی وہ نہیں ہے جو عارضی اشیاء اور عارضی احوال کے اعتبار سے غنی ہے۔

"عرض" : "عین" اور "راء" مفتوح ہے۔ اور نہایہ میں اس کا معنی دنیا کا سامان اور ملبہ ہے۔ شارح نے لکھا ہے کہ "عرض" کی "را" اگر متحرک ہو تو نقدی اور نقدی کے علاوہ دوسرے اموال کو کہتے ہیں اور اگر ساکن ہو تو نقدی کو شامل نہ ہوگا۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ مذکور لفظ "عن" ارشاد باری ﴿فازلهما الشیطن عنها﴾ میں مذکور "عن" کی طرح ہے۔

کشاف نے لکھا ہے کہ شیطان نے اُن دونوں کو اس درخت کی وجہ سے پھسلایا اور کلام کی اصل یوں ہے کہ شیطان اپنے آپ سے اُن دونوں کا پھسلن صادر کیا۔

قوله: لکن الغنی غنی النفس: "نون" مشدد ہے اور مخفف پڑھنا بھی دُرست ہے۔

غنی النفس: یعنی اللہ کی توفیق سے مخلوق سے مستغنی ہونا۔ اور مطلب یہ ہے کہ حقیقی غنی اللہ کے دیئے ہوئے پر قناعت کرنے اور دنیا طلب کرنے میں حرص سے پرہیز کرنے کا نام ہے لہٰذا جس کے دل میں دنیا جمع کرنے کی حرص ہو وہ فی الحال بھی فقیر ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی فقیر ہے اگرچہ اس کے پاس بہت سارا مال ہو' کیونکہ اپنی لمبی اُمیدوں کی وجہ سے مال کی زیادتی کا محتاج ہے۔ جس شخص کا دل بقدر ضرورت روزی پر قناعت کرے۔ اور مالک الملک والملکوت کے دئے ہوئے رزق پر راضی رہے اُسکا دل غنی ہے اور اپنے رب کی طرف محتاج رہ کر دوسروں سے مستغنی ہے' چاہے اس کے پاس مال ہو یا نہ ہو۔ اسلئے کہ یہ شخص بقدر کفایت روزی سے زیادہ طلب نہیں کرتا اور موت تک دنیا کو طلب کرنے میں اپنے آپ کو نہیں تھکاتا۔ بلکہ اللہ سے زیادہ انعام حاصل کرنے اور آخرت میں زیادہ اجر و ثواب حاصل کرنے کیلئے دُنیا کی تھوڑی مقدار پر گزارہ کرتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ "قناعت نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے" اور ایک روایت میں ہے کہ "قناعت فنا نہ ہونے والا خزانہ ہے"۔ اور ایک صاحب ں نے کیا ہی اچھا کہا ہے:

عزیزالنفس من لزم التناعة
ولم یکشف لمخلوق قناعه

''وہ شخص عزت والا ہے جو قناعت کو لازم پکڑے اور مخلوق کے سامنے اپنی ضروریات ظاہر نہ کرے۔''

اشرف لکھتے ہیں، کہ غنیٰ نفس سے مراد قناعت ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ غنیٰ نفس سے مراد وہ روزی جو حاجت پوری ہو جائے۔ شاعر کہتا ہے:

غنی النفس ما یکفیك من سد حاجة

فان زاد شیا عاد ذاك النفی فقر

''نفس کا غنا اتنی مقدار روزی ہے جس سے حاجت پوری ہو اگر اس سے بڑھ جائے تو غنا دوبارہ فقر بن جاتا ہے۔''

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی درست ہے کہ غنیٰ نفس سے کمالات علمیہ اور عملیہ کا حصول مراد لیا جائے۔ ابو طیب نے اسی معنی کو شعر میں یوں بیان کیا ہے:

ومن ینفق الساعات فی جمع ماله

مخافة فقر فالزی فعل الفقر

''جو شخص فقر کے خوف سے مال جمع کرنے میں اپنے اوقات خرچ کرتا ہے یہی حقیقی فقیر ہے۔''

یعنی انسان کیلئے مناسب یہ ہے کہ وہ اپنے اوقات حقیقی غنیٰ حاصل کرنے میں خرچ کرے۔ اور وہ تو کمالات کو طلب کرنے کو کہتے ہیں تا کہ غنیٰ پر غنیٰ بڑھ جائے۔ مال میں کمال طلب کرنے کا نام نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو فقر پر فقر ہے۔ ایک صاحب کمال یوں کہتا ہے:

رضینا قسمة الجبار فینا

لنا علم و للاعداء مال

''اللہ تعالیٰ نے ہماری قسمت میں جو کچھ لکھ دیا ہے۔ ہم اس پر راضی ہیں
ہمارے لئے علم مقدر کیا اور دشمنوں کیلئے مال مقدر کیا۔''

فان المال یغنی عن قریب

وان العلم یبقی لایزال

''دنیا کا مال تو بہت جلد فنا ہونے والا ہے جبکہ علم کی دولت ہمیشہ کیلئے باقی رہنے والی ہے۔''

اور یہ بات تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ مال فرعون، قارون، اور تمام کفار و فجار کی میراث ہے اور علم انبیاء، اولیاء اور صالح علماء کی میراث ہے۔

تخریج: امام احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

۵۱۷۱ : عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ یَاْخُذُ عَنِّیْ هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ فَیَعْمَلُ بِهِنَّ اَوْ یُعَلِّمُ مَنْ یَّعْمَلُ بِهِنَّ قُلْتُ اَنَا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَخَذَ بِیَدِیْ فَعَدَّ خَمْسًا فَقَالَ اتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ اَغْنَی

النَّاسِ وَاَحْسِنْ اِلٰی جَارِكَ تَكُنْ مُؤْمِنًا وَاَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا وَلَا تُكْثِرِ الضِّحْكَ فَاِنَّ كَثْرَةَ الضِّحْكِ تُمِيْتُ الْقَلْبَ ۔ (رواہ احمد والترمذی وقال هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذی ٤/٤٧٨ حديث رقم ٢٣٠٥ و ابن ماجه فی السنن ٢/١٤١٠ حديث رقم ٤٢١٧، واحمد فی المسند ٢/٣١٠۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کون شخص ہے جو مجھ سے یہ باتیں سیکھے اور پھر ان پر عمل کرے یا اس شخص کو سکھائے جو ان پر عمل کرے۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ شخص میں ہوں۔ حضور ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور پانچ باتیں شمار فرمائیں اور بیان فرمایا کہ تم اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے بچو اگر تم ان سے بچو گے تو سب لوگوں سے زیادہ عبادت گزار ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے جو تمہاری قسمت میں لکھ دیا ہے اس پر راضی (شکر گزار) رہو سب لوگوں سے زیادہ غنی بن جاؤ گے۔ اپنے ہمسایہ سے حسن سلوک کرو گے تو مؤمن بن جاؤ گے دوسروں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لیے کرتے ہو مسلمان بن جاؤ گے۔ زیادہ ہنسنے سے اجتناب کرو ہنسنے کی کثرت دل کو مردہ کر دیتی ہے'' اس روایت کو احمد نے نقل کیا ہے اور (ترمذی) نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: قولہ: **من يأخذ عني۔۔۔۔۔ أو يعلم من يعمل بهن:**

من: استفہامیہ ہے۔

او: ''واؤ'' کے معنی میں ہے جیسا کہ ارشاد باری: ﴿عذرا او نذرا﴾ [المرسلات: ٦] ''پھر ان ہواؤں جو (دل میں) اللہ کی یعنی توبہ کا یا ڈرانے کا القاء کرتی ہیں'' میں ہے، یہ توجیہ طیبی رحمہ اللہ نے اور ان کے متبعین نے ذکر کی ہے۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں ''او'' نوع بیان کرنے کیلئے جیسا کہ علامہ بیضاویؒ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔

علامہ بیضاویؒ فرماتے ہیں: **عذرا للمحقين او نذرا للمبطلين،** یعنی ''عذر'' حق والوں کیلئے ہے یا ''نذر'' باطل والوں کیلئے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ حدیث میں ''او'' بل کے معنی میں ہو۔ اور ''بل'' میں اشارہ ہے مرتبہ کمال سے مرتبہ تکمیل کی جانب ترقی کی طرف باوجود اس کے کہ ''او'' کے نوع کیلئے ہونے میں ایک بہتر تنبیہ ہے اور اعلیٰ سبب ہے۔ اس لئے کہ کسی نیک کام سے عاجز بندہ کبھی دوسرے کو اس نیکی پر لانے کا سبب بن جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ کہ ''بسا اوقات فقہ کا حامل اپنے سے زیادہ فقیہ کو فقہ دیتا ہے''۔

قولہ: **قلت أنا يا رسول الله: قلت انا:** خبر محذوف ہے: ای: **انا آخذها عنك.**

یہ ایک خاص بیعت اور خالص معاہدہ تھا اسی طرح بعض صحابہؓ نے آپ کے ساتھ اس بات پر بیعت کی تھی کہ مخلوق سے سوال نہیں کریں گے گھوڑے پر سوار کسی صحابی کے ہاتھ سے کوڑا اگر جاتا تو نیچے اُترتا اور اپنے ساتھیوں سے مدد لئے بغیر خود ہی اُٹھا لیتا۔

قولہ: **فاخذ بيدي فعد خمسا:** تا کہ مسئلہ مطلوبہ بتائیں اور میری خصوصیت ظاہر ہو جائے۔

فقال اتق المحارم: ''محارم'' تمام قسم کے حرام کاموں سے یعنی گناہ کرنے اور نیکی چھوڑنے سے بچو۔ اس لئے کہ نفس کی ذمہ داری سے نکلنے سے افضل کوئی عبادت نہیں عام لوگ فرائض چھوڑتے ہیں اور نوافل کی کثرت کا اہتمام کرتے ہیں، ... وضائع کرتے ہیں، اور فضائل کو لیتے ہیں، بسا اوقات ایک شخص کے ذمہ فرائض کی قضاء باقی ہوتی ہے۔ اُن فرائض کی

قضاء سے غافل ہوتے ہیں، کوشش کرتے ہیں، اسی طرح بسا اوقات ایک شخص کے ذمہ زکوۃ اور لوگوں کے حقوق ہوتے ہیں، اور فقراء کو کھانا کھلاتا ہے، مساجد اور مدارس وغیرہ بناتا ہے۔

حضور علیہ السلام نے پرہیز کی اہمیت بتانے کیلئے لفظ اتقاء سے اپنی بات کو بیان کیا جیسا کہ حکماء کے نزدیک دوا کے ذریعے علاج کرنے سے پرہیز کرنا زیادہ مفید ہے۔

قوله: وارض بما قسم الله لك تكن اغنى الناس :

چاہے مخلوق کے واسطے سے تجھے ملے چاہے بغیر کسی واسطہ کے۔

ایک شخص نے سید ابوالحسن شاذلی رحمہ اللہ سے پوچھا: کہ کیمیاء کیا ہے؟

دو باتیں ہیں، مخلوق سے اپنی نظریں ہٹاؤ اور اللہ سے یہ اُمید نہ رکھو کہ تجھے وہ رزق دے جو تیرے لئے مقدر نہ ہو۔

سید عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بات کو غور سے سن لو کہ طلبِ رزق کو چھوڑنے سے مقدر فوت نہیں ہوگا اور جو تیرے مقدر میں نہیں ہے وہ نہ زیادہ حرص سے ملے گا۔ اور نہ زیادہ محنت و کوشش سے چنانچہ صبر کر موجودہ حالت پر رہو اور موجودہ روزی پر راضی رہو تاکہ اللہ ذوالجلال تجھ سے راضی ہو جائے۔

قوله: واحسن الیٰ جارك تكن مؤمنا: اگرچہ وہ تیرے ساتھ بُرا سلوک کرے۔

"**تكن مؤمنا**" اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

1. تو کامل مؤمن بن جائے گا۔
2. اُس کو (یعنی پڑوسی کو) امن دینے والا بن جائے گا کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"تم میں سے کوئی اُس وقت تک کامل مؤمن نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کا پڑوسی اس کے شرور اور تکالیف سے محفوظ نہ ہو"۔

أحب للناس ما تحب لنفسك: یعنی دوسرے عام لوگ۔ جو چیز اپنی ذات کیلئے پسند کرتے ہو۔ یہاں تک کہ کافر کیلئے ایمان اور فاجر کیلئے توبہ پسند کرو تم کامل مسلمان، یہ حدیث "**المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده**" سے عام ہے اور طیبی رحمہ اللہ نے اس استدلال کیا ہے۔ چنانچہ استدلال کیلئے زیادہ ظاہر حدیث "**لا یومن احدکم حتی یحب لأخيه مایحب لنفسه**" ہے۔

لا تكثر الضحك (جواب محذوف ہے جس کی تقدیر یہ ہے:) "**تكن طيب القلب وحيا بذكر الرب**" (تیرا دل تروتازہ رہے گا اور اللہ کے ذکر سے دل کو زندگی حاصل ہوگی)۔

قوله: فان كثرة الضحك تميت القلب): یعنی موت کی تیاری سے اور موت کے بعد آخرت کیلئے توشہ حاصل کرنے سے غفلت پیدا کر دیتی ہے۔ اگر دل زندہ ہو تو اس کو مار دیتی ہے اور اگر دل پہلے سے مردہ ہے تو اُسکی سیاہی کو بڑھا دیتی ہے۔

تخریج و اسنادی حیثیت: جزریؒ کی تصحیح میں ہے کہ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کی سند سے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ جبکہ حسن نے ابو ہریرہؓ سے سماع نہیں کیا۔ ابو عبیدہ الباجی نے اس حدیث کو حسن سے روایت کیا اور "**عن ابی هريرة عن النبی عليه السلام**" کا ذکر نہیں کیا۔ منذریؒ نے ترمذی کا قول نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حسن نے ابو ہریرہؓ سے سماع نہیں کیا۔

بزارؒ نے اور بیہقیؒ نے اپنی کتاب "کتاب الزھد" میں اسی طرح کی حدیث بروایت مکحول عن واثلہ نقل کی ہے۔لیکن بقیہ اسناد میں ضعف ہے (ذکرہ میرک) حسن کی حدیث کو مکحول کی حدیث سے قوت مل گئی اور ضعف کے درجہ سے ترقی کر گئی۔ علاوہ ازیں ضعیف حدیث بھی فضائل میں بالاجماع معتبر ہے۔

۵۱۷۲ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ ابْنَ آدَمَ تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِيْ اَمْلَأْ صَدْرَكَ غِنًى وَاَسُدَّ فَقْرَكَ وَاِنْ لَا تَفْعَلْ مَلَأْتُ يَدَكَ شُغْلًا وَلَمْ اَسُدَّ فَقْرَكَ۔ (رواه احمد وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٥٤ حديث رقم٢٤٦٦ حديث رقم ٢/٣٥٦وابن ماجه ٢/١٣٧٦ حديث رقم٤١٠٧ ۔

ترجمہ:" حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ابن آدم! تو خود کو میری عبادت کے لئے فارغ کر لے' میں تیرے سینے کو استغناء سے بھر دوں گا اور تیری غربت کو ختم کر دوں گا۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا (اگر تو نے اس حکم سے اعراض کیا اور اپنے قوائے فکر وعمل کو میری عبادت میں مشغول رکھنے کے بجائے صرف دنیاوی امور اور اپنے نفس کی خواہشات کی تکمیل میں مشغول ومنہمک رکھا) تو میں تیرے ہاتھوں کو (بے فائدہ کاموں میں) مشغول کر دوں گا اور تیری غربت کو دور نہیں کروں گا"۔

تشریح: قوله:يقول يا ابن آدم تفرغ لعبارتي املاصدرك غني واسد فقرك:

بطور خاص انسان کو اس لئے پکارا کہ عبادت کرنے والی مخلوقات میں سے انسان اشرف المخلوقات ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کی طرف اضافت کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمام انسان توبہ کرنے کے مرتبہ میں حضرت آدم علیہ السلام کے تابع ہیں۔

لفظ "اسدّ" تصحیح شدہ نسخوں میں "دال" کے فتحہ اور تشدید کے ساتھ مذکور ہے کیونکہ جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم پر اس کا عطف ہے۔اور ایک نسخہ میں "دال" کے ضمہ کے ساتھ ہے' دال کو عین کلمہ کی اتباع میں ضمہ دیا گیا ہے۔اور "لم یمد" میں ادغام کے ساتھ "دال" کی تینوں حرکات کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

قوله :وان لا تفعل: کا مفعول محذوف ہے: ای: ما امرتك من اعراض عن الدنيا والا قبال على عبادة المولى" یعنی میں نے تجھے دنیا سے اعراض اور اللہ کی عبادت کی طرف توجہ کرنے کا حکم دیا ہے جو دنیا وآخرت میں تیرے لئے مفید ہے۔

ملات يدك: یہاں "ید" سے مراد اعضاء وجوارح میں چنانچہ "یدیك" کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے۔اور جامع میں تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ "یدیك" ہے اور بطور خاص "ید" کا ذکر اس لئے کیا کہ اکثر افعال ہاتھ سے کیے جاتے ہیں۔

شغلا:"شین" مضموم اور "غین" ساکن ہے علاوہ ازیں دونوں کو مضموم پڑھنا دونوں کو مفتوح پڑھنا "شین" کو مفتوح "غین" کو ساکن پڑھنا بھی درست ہے۔اسی طرح قاموس میں مذکور ہے

قوله: **ولم اسد فقرك:** یعنی نہ تو تیری اپنی مشغولیت و محنت سے تیرا فقر دور کرونگا اور نہ دوسروں کی محنت اور تعاون سے، اور کلام کا حاصل یہ ہے کہ تو مال کو طلب کرنے کیلئے پریشان ہو کر اپنے آپ کو تھکاتا ہے۔ اور وہی مال تجھے ملتا ہے جو تیرے لئے میں نے ازل میں مقدر کر دیا ہے۔ اور رب کی عبادت ترک کر کے دل کے استغناء سے محروم ہو جاتا ہے۔

تخریج: جامع میں لکھا ہے کہ اسی طرح ترمذی اور حاکم نے بھی نقل کیا ہے۔ اور تصحیح میں ہے کہ اس روایت کو ترمذی اور ابن ماجہ نے ابوخالد والبی کی سند سے نقل کیا ہے۔ اور ابوخالد کا نام ہریرہ ہے۔ بعض نے **هرم عن ابی هويره** کی سند سے نقل کیا ہے۔

ابن عدی فرماتے ہیں، کہ ابوخالد کی حدیث میں **سقم** ہے۔ حافظ منذریؒ نے ترغیب میں لکھا ہے کہ اس حدیث کو ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور الفاظ اسی کے ہیں، اور فرمایا کہ **حدیث حسن** ہے۔ اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں اختصار کے ساتھ اس روایت کو نقل کیا ہے مگر اس میں "**یدیك شغلا**" مذکور ہے اور حاکمؒ نے بھی نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ "**صحیح الاسناد**" ہے اور بیہقیؒ نے اس کو "**کتاب الزهد**" میں نقل کیا ہے۔

میرک نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی "شاید" معقل بن یسار کی یہ حدیث ہے:

"آپ نے فرمایا کہ تمہارے رب کا ارشاد ہے: اے ابن آدم تم میری عبادت کیلئے فارغ ہو جاؤ میں تیرے دل کو غنی سے اور تیرے ہاتھوں کو رزق سے بھر دونگا، اے ابن آدم مجھ سے دُور نہ ہو ورنہ میں تیرے دل کو فقر اور تیرے بدن کو شغل سے بھر دونگا۔ حاکم نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور فرمایا کہ یہ صحیح الاسناد ہے، اور ابن عساکر اور دیلمی نے مسند فردوس میں ابن عباس سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ سلیمانؑ کو مال، ملک اور علم کے درمیان اختیار دیا گیا تو سلیمانؑ نے علم کو اختیار کیا چنانچہ اللہ نے علم کو اختیار کرنے کی وجہ سے سلیمان کو ملک اور مال بھی دے دیا۔"

بیہقیؒ نے عمران بن حصینؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

"جو مکمل طور پر اللہ کی طرف یکسو ہو جائے تو اللہ ہر مشقت میں اُسکی کفایت کرتا ہے، اور ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے، جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور جو مکمل طور پر دُنیا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اللہ اُسے دُنیا کے حوالہ کر دیتے ہیں۔"

دیلمی نے مسند فردوس میں ابو ہریرہؓ سے اور بیہقیؒ نے علیؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

"**آلى الله ان یرزق عبده المؤمن الامن حیث لا یحتسب**"

"اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ اپنے مؤمن بندے کو وہاں سے رزق عطا کرے گا جہاں سے اُسکا گمان بھی نہ ہو۔"

۵۱۷۳ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ ذُكِرَ رَجُلٌ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعِبَادَةٍ وَاجْتِهَادٍ وَذُكِرَ اٰخَرُ بِرِعَةٍ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَعْدِلُ بِالرِّعَةِ يَعْنِى الْوَرْعَ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٧٧ حدیث رقم ٢٥١٩۔

ترجمہ: "حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک ایسے شخص کا تذکرہ کیا گیا جو خوب اہتمام اور کثرت کے ساتھ عبادت کرنے والا ہے اور ایک دوسرے شخص کے کا تذکرہ کیا گیا جو پرہیز گاری اختیار کرتا ہے (یعنی

گناہوں سے بچتا ہے) تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: محض کثرت عبادات کو پرہیزگاری کے برابر نہ ٹھہراؤ (اگرچہ اس پرہیزگاری کے ساتھ عبادت وطاعت کی اس قدر کثرت اور سعی اور اہتمام شامل نہ ہو"۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: ذكر رجل عند رسول الله بعبادة واجتها وذكر آخر برعة دونوں اسموں کی تنوین یا تو تعظیم کیلئے ہے یا تنکیر کیلئے۔

"رعة": "را" مکسور ہے، یہ "عدة" کے وزن پر ہے۔ یعنی حرام سے پرہیز کرتا ہے اگرچہ عبادت کم کرتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام سے اُن دونوں میں سے افضل کے بارے میں پوچھا گا۔

قوله: فقال النبی ﷺ لاتعدل بالرعة:

"تعدل": معروف کا صیغہ ہے اور مجزوم ہے اور بعض کے نزدیک مجہول کا صیغہ ہے اور مرفوع ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مصابیح کے ایک نسخہ میں "لاتعدل بالرعة" کے بعد "شيئًا" کی زیادتی ہے۔ جامع ترمذی میں اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں یہ زیادتی نہیں ہے اور جامع میں "لا يعدل" صیغہ مذکر مجہول کے ساتھ ضبط کیا گیا ہے اس صورت میں جار مجرور نائب فاعل ہوگا۔ اور یہ زیادہ واضح ہے کیونکہ کسی کلمہ کو مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

قوله: يعنی الورع: یہ راوی کی طرف سے تفسیر ہے

"ورع" سے مراد حرام امور سے پرہیز کرنا کیونکہ حرام امور سے پرہیز کرنا واجب عبادات بجالانے کا سبب ہے۔

مظہرؒ نے فرمایا کہ "لاتعدل" کو اگر نہی کا واحد مذکر حاضر کا صیغہ مان لیا جائے تو بھی دُرست ہے اور "لا" کی وجہ سے مجزوم ہوگا۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تقویٰ کا کسی چیز کے ساتھ مقابلہ نہ کر۔ "رعة" رائے مکسور اور عین مخفف کے ساتھ اس کا معنی ہے ورع "تقویٰ" ہے۔ کیونکہ تقویٰ ہر خصلت سے افضل ہے۔ یہ بھی دُرست ہے کہ "لاتعدل" جملہ خبریہ منفیہ ہو اور اس کی "تاء" مضموم اور "دال" مفتوح ہے یعنی کسی خصلت کا تقویٰ کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ تقویٰ سب سے افضل خصلت ہے۔

امام راغبؒ فرماتے ہیں: شریعت میں ورع سے مراد دُنیا کے اسباب کی طرف بھاگ دوڑ چھوڑنا ہے۔ اور ورع کے تین اقسام ہیں:

ایک قسم واجب ہے۔ حرام سے پرہیز کرنا۔ یہ درجہ عام متقیوں کا ہے۔

دوسری قسم مندوب ہے۔ مشتبہات سے پرہیز کرنا۔ درجہ درمیانی متقیوں کا ہے۔

تیسری قسم افضلیت کا ہے۔ بہت سارے مباحات سے پرہیز کرنا اور کم سے کم ضروریات پر اکتفاء کرنا یہ درجہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کا ہے۔

۵۱۷۴: وَعَنْ عَمْرِو ابْنِ مَيْمُوْنَ الْاَوْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِرَجُلٍ وَهُوَ يَعِظُهُ اغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ وَحَيٰوتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ (رواه الترمذی مرسلا)

اخرجه البغوی فی شرح السنة ١٤/٢٢٤ حدیث رقم ٤٠٢١۔

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن میمون اودی (تابعیؒ) کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو! اپنی جوانی کو اپنے بڑھاپے سے پہلے اپنی تندرستی کو بیماری سے پہلے اپنی دولتمندی کو اپنی غربت سے پہلے اپنی دولتمندی کو اپنی غربت سے پہلے اپنی فرصت کو اپنی مصروفیت سے پہلے اور اپنی زندگی کو موت سے پہلے زندگی کو! اس روایت کو ترمذی نے مرسلاً نقل کیا ہے''۔

راویٔ حدیث:

عمرو بن میمون۔ عمرو ''میمون'' کے بیٹے اور ''اودی'' ہیں۔ زمانہ جاہلیت اور اسلام دونوں دیکھے۔ آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں مسلمان ہو چکے تھے لیکن آپ ﷺ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ان کا شمار کوفہ کے بڑے تابعین میں ہے۔ عمر بن الخطاب، معاذ بن جبل اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے روایت کی۔ ان سے ''ابواسحاق'' رحمہ اللہ نے حدیث سنی۔ ۷۴ھ میں وفات پائی۔ ''امام سیوطی'' رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ''اودی'' میں ہمزہ مفتوح اور دال مہملہ ساکن ہے۔ ''اود بن صعب'' کی طرف منسوب ہے۔ اھ

تشریح: **قوله: عن عمرو بن میمون الأودی:**

''الأودی'' کا ہمزہ مفتوح اور ''واؤ'' ساکن ہے۔ اُود بن صعب کی طرف منسوب ہے۔ (ذکرہ السیوطیؒ) مولفؒ نے لکھا ہے کہ انہوں نے جاہلیت کا زمانہ پایا ہے البتہ نبی علیہ السلام کے زمانہ میں اسلام لائے مگر آپ سے ملاقات نہ ہوئی۔ اور کوفہ کے بڑے تابعین میں ان کا شمار ہے۔ یہ عمر بن خطاب، معاذ بن جبل اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت حدیث کرتے ہیں۔

قوله: قال رسول الله ﷺ لرجل وهو يعظه اغتنم خمسا قبل: حال ہے۔

وهو يعظه اغتنم: یہ ''اغتنام'' مصدر سے ہے۔ اس کا معنی ہے ''غنیمت لینا''۔

هرم: ''ھاء'' اور ''را'' دونوں مفتوح ہیں۔

سقم: ''سین'' اور ''قاف'' دونوں مفتوح ہیں۔ یا ''سین'' مضموم اور ''قاف'' ساکن ہے۔

قوله: غناك قبل فقرك: یعنی مطلق احوال اور عمومی اموال میں عبادات مالیہ، خیرات اور اُخروی نیکی پر قدرت سے پہلے یا موت پر ہے۔

قوله: وفراغك قبل شغلك: لفظ ''شغل'' کے معنی و بنی کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

قوله: وحياتك قبل موتك: اگرچہ ایسا بڑھاپا ہو جس میں ایسی بیماری لاحق ہو یا ایسا فقر ہو جس میں اللہ کو یاد کرنا آسان ہو۔

موت کے آنے اور عمل کے منقطع ہونے کے وقت۔

تخریج: تصحیح میں جزری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عمرو بن میمون کی حدیث کو نسائی نے بھی اسی طرح مرسلاً نقل کیا ہے۔ اور عمرو بن میمون مخضرمین میں سے ایک بڑے تابعی ہیں زمانہ جاہلیت کو پایا اور حضور علیہ اسلام کی زندگی میں ہی السلام قبول کیا لیکن

آپ سے ملاقات نہ ہوئی۔

علامہ میرکؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی تائید ابن عباسؓ کی مرفوع حدیث سے ہوتی ہے جس کو حاکم نے انہی الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔ اور جامع میں یہ حدیث ان الواظ کے ساتھ منقول ہے اور وہ "اغتنم خمسا قبل خمس ...... الخ"

"پانچ چیزوں کو پانچ احوال سے پہلے غنیمت جانو! موت سے پہلے زندگی کو، بیماری سے پہلے صحت کو، مشغولیت سے پہلے فراغت کو، بڑھاپے سے پہلے جوانی کو اور فقر سے پہلے غنی کو۔"

حاکمؒ اور بیہقیؒ نے اس حدیث کو ابن عباس سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ اس حدیث کو احمدؒ نے "زہد" میں اور ابو نعیم نے "حلیہ" میں اور بیہقی نے عمرو بن میمون سے مرسلاً نقل کیا ہے۔

۵۱۷۵ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَایَنْتَظِرُ اَحَدُكُمْ اِلاَّ غِنًی مُطْغِیًا اَوْفَقْرًا مُنْسِیًا اَوْمَرَضًا مُفْسِدًا اَوْهَرَمًا مُفْنِدًا اَوْمَوْتًامُجْهِزًا اَوِ الدَّجَّالَ فَالدَّجَّالُ شَرٌّغَائِبٌ یُنْتَظَرُ اَوِ السَّاعَةَ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰی وَاَمَرُّ ۔ (رواہ الترمذی والنسائی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٧٨ حدیث رقم ٢٣٠٦۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر شخص بہت دولتمندی کا منتظر ہے یا بھلا دینے والی غربت کا انتظار کرتا ہے یا بدن کو تباہ کرنے والے مرض کا منتظر ہے یا بد حواس کر دینے والے بڑھاپے کا انتظار کرتا ہے یا ناگہانی موت کا یا دجال کا سو دجال تو پوشیدہ فتنہ ہے یا منتظر ہے قیامت کا جو بڑی آفت انگیز اور شدید ہے" (ترمذی، نسائی)

تشریح: قوله: الاغنی مطغیا۔

قوله: "ما ینتظر احدکم" حضور ﷺ کے یہ الفاظ ان لوگوں کے حق میں تنبیہ اور ڈانٹ کے طور پر ہیں جو دینی امور میں غفلت کرتے ہیں۔ یعنی تم اپنے رب کی عبادت کس وقت کرو گے؟ کیونکہ تم اگر مشغولیت کی کمی اور بدن کی قوت کے ساتھ اللہ کی عبادت نہ کرو گے تو مشغولیت کی زیادتی اور بدن کے ضعف کے ساتھ عبادت کیسے کرو گے۔ شاید تم لوگوں کو انتظار نہیں ہے مگر ایسے غناء کا جو مجھے سرکش، عاصی اور حدود سے تجاوز کرنے والا بنا دے۔

قوله: فقرا منسیا" نیا باب افعال سے ہے اور اگر باب تفعیل سے ہو تو بھی درست ہے۔ لیکن باب افعال سے زیادہ بہتر ہے۔ تا کہ پہلے والے لفظ "مطغیا" کے مشابہ ہو جائے۔ یعنی فقر اس فقیر کو مدہوش بنا دیتا ہے، روٹی کپڑے کی تنگی اور طلب معاش کی پریشانی کے باعث اطاعت بھلا دیتا ہے۔

قوله: او مرضا مفسدا:

یعنی شدت کے باعث بدن کو خراب کرنے والی بیماری یا ایسی بیماری کہ جس سے سستی پیدا ہو جاتی ہے اور دین میں فساد کا باعث بنتی ہے۔

قولہ:أوهرما مفندا:

"مفندا" : تخفیف کے ساتھ ہے یعنی ایسا بڑھاپا جو بوڑھے کو "فند" تک پہنچائے اور "فند" کا معنی ہے رائے کا کمزور ہو جانا۔ عرب اُس وقت "افندہ" کہتے ہیں جب رائے کمزور ہو جائے اور شارح رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عرب "فند الرجل" اُس وقت کہتے ہیں جب خوف کی وجہ سے باتوں میں تیزی آجائے اور "افندہ الکبر" اُس وقت کہتے ہیں جب زیادہ بڑھاپے کی وجہ سے اپنی بات میں تمیز نہ کر سکے۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ "تفنید" فساد عقل کی طرف نسبت کرنے کو کہتے ہیں۔ انہی الفاظ میں اللہ جل شانہٗ کا یعقوب علیہ السلام کے بارے میں یہ ارشاد ہے: ﴿انی لا جد ریح یوسف لولا ان تفندون﴾ [یوسف ۔ ۹۳] بیضاوی رحمہ اللہ نے معنی بیان فرمائے ہیں "تم لوگ مجھے "فند" کی طرف منسوب کرتے ہو۔ اور "فند" کا معنی ہے۔ بڑھاپے کی وجہ سے عقل کا کم ہو جانا۔

قاموس میں ہے کہ "الفند" جبکہ "فا" اور "نون" متحرک ہو، کا معنی ہے "بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے عقل کا فاسد ہو جانا"۔ بات اور رائے میں خطا کرنا اور جھوٹ افناد کے معنی ہے۔ فندہ اور افندہ کا معنی ہے جھوٹ بولا، رائے میں خطا کی اور اُس سے عاجز ہوا اور "عجوز مفندۃ" کہنا درست نہیں ہے کیونکہ بوڑھی عورت کبھی رائے والی نہیں ہوئی۔
علامہ بیضاویؒ نے بھی اسی طرح فرمایا ہے۔ اور علت یہ بیان کی ہے کہ عورت کی عقل کا نقصان ذاتی ہے۔ اور میری رائے ہے کہ یہ بات یقینی ہے کہ عورت کی عقل کی کمی اضافی ہے۔ اور اس وجہ سے عورت پر "مفندۃ" کے اطلاق کی درستگی میں کوئی حرج نہیں کیونکہ نقصان عارضی رہتا ہے۔

نہایہ میں ہے کہ اصل میں "الفند" جھوٹ کو کہتے ہیں اور أفند کا معنی ہے "جھوٹ بولنا"۔

فائق میں ہے کہ عرب "قد افند" اُس بوڑھے کے بارے میں کہتے ہیں جو دُرست بات چھوڑ کر اِدھر اُدھر کی بات کرے اور اِدھر اُدھر کی بات کرنے میں بوڑھے کو چھوٹے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اہل عرب کا قول "الھرم المفند" عربوں کے قول "نھارہ صائم" کی قبیل سے ہے۔ چنانچہ اسی طرح "افندہ الھرم" بھی کہا جاتا ہے یعنی بڑھاپے کی طرف منسوب کیا گیا، حالانکہ فند بوڑھے کی صفت ہے۔

"کتاب العین" میں ہے "شیخ مفند" وہ شخص جو "فند" کی طرف منسوب ہو۔ اور عربوں کے ہاں "امرأۃ مفندۃ" نہیں کہا جاتا ہے کیونکہ عورت جوانی میں بھی رائے والی نہیں ہوتی تو بڑھاپے میں "فند" کی طرف کیسے منسوب ہوگی۔

علامہ تورپشتیؒ نے لکھا ہے کہ "مفند" تخفیف کے ساتھ ہے اور جس نے تشدید کے ساتھ نقل کیا ہے درست نہیں کیا۔

قولہ: أوموتا مجھزا: نہایہ میں ہے کہ "المجھز" کا معنی ہے "سریع" یعنی جلدی سے آنے والا، اور عربوں کے ہاں "اجھز علی الجریح" اُس وقت کہتے ہیں جب کسی کو جلدی سے قتل کر دیا گیا ہو۔

قولہ: أوموتا مجھزا: قاضی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ "الموت المجھز" سے مراد ایسی اچانک موت ہے جس کا سبب کوئی بیماری یا بڑھاپا نہ ہو۔ مثلاً قتل، پانی میں ڈوب جانا اور دیوار کا گر جانا وغیرہ۔

قولہ:او الدجال فالدجال شر ینتظر :

فالدجال: اور ایک نسخہ میں "والدجال" ہے۔

قولہ: والساعة ادھی امر: یعنی انسان پر آنے والے دُنیا کی مصیبتوں میں سے سخت مصیبت والی کڑوی چیز ہے اُس شخص کیلئے جو قیامت کے دن سے غفلت کرے اور قیامت آنے سے پہلے اس کے لئے تیاری نہ کرے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ کے ارشاد "فالدجال" میں "فاء" تفسیر یہ ہے۔ اس لئے کہ اس نے کلام سابق کے ابہام کی تفسیر کی ہے اور "الساعة" میں "واؤ" فاء ملابسة کے قائم مقام ہے عطف کی وجہ سے، اور میرے نزدیک زیادہ بہتر یہ ہے کہ واؤ حال کیلئے ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث میں اُس شخص کو سستی پر تنبیہ کی گئی ہے جو فارغ ہو لیکن فرصت کے اوقات کو غنیمت نہیں سمجھتا۔ چنانچہ مطلب یہ ہے کہ کہ انسان دینا میں مذکورہ حالات میں کسی ایک کا انتظار کرتا ہے۔ چنانچہ نیک بخت ہے وہ شخص جو فرصت کو غنیمت سمجھے اور قوت وطاقت کو غنیمت سمجھے اور موت سے پہلے فرائض اور سنتوں کی ادائیگی میں مشغول رہے۔ اور یہ ایک بلیغ نصیحت اور ایک مفید یاد دہانی ہے۔

۵۱۷۲ : وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلَا اِنَّ الدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ مَلْعُوْنٌ مَّافِيْهَا اِلاَّ ذِكْرُ اللّٰهِ وَمَا وَالَاهُ وَعَالِمٌ اَوْ مُتَعَلِّمٌ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٨٥ حدیث رقم ٢٣٢٢ و ابن ماجه فی السنن ٢/١٣٧٧ حدیث رقم ٤١١٢۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خوب جان لو دُنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا کے اندر ہے وہ بھی ملعون ہے (یعنی دنیا کی جو چیزیں ذکر اللہ سے غافل رکھتی ہیں ان کو بھی راندۂ درگاہ قرار دے دیا گیا ہے) البتہ ذکر خدا اللہ کے پسندیدہ امور اور عالم اور متعلم (اس لعنت) سے مستثنیٰ ہیں"۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: اَلَا: تنبیہ کیلئے ہے۔

ذکر اللہ: مرفوع ہے اور ایک نسخہ میں "ذکر اللہ" منصوب ہے اور استثناء منقطع ہے۔

وما والاہ: اس کے کئی مطلب بیان کیے گئے ہیں یعنی قرب اور نیکی والے وہ اعمال مراد ہیں جو اللہ کو محبوب ہیں یا وہ ذکر خیر اور اتباع اوامر اور اجتناب نواہی مراد ہیں جو ذکر اللہ کے قریب ہیں۔

مظہر فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ہے، "ما یحبه الله فی الدنیا وہ جس کو اللہ دنیا میں پسند فرماتے ہیں۔ اور "موالاة" کا معنی ہے دو اشخاص کا آپ میں محبت کرنا اور کبھی ایک جانب سے دوستی رکھنے کو بھی "موالاہ" کہتے ہیں۔ اور یہی معنی اس مقام میں مراد ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہے وہ ملعون ہے سوائے اللہ کے ذکر کے، اور دنیا کی وہ اشیاء اور اُمور اللہ کو محبوب ہیں۔ اور اس کے سوا ملعون ہے۔

اشرف نے فرمایا یہ "موالاة" سے مشتق ہے جس کا معنی ہے متابعت کرنا اور یہ بھی درست ہے کہ ذکر کے قریب اشیاء سے مراد اللہ کی اطاعت، اللہ کے اوامر کی اتباع اور نواہی سے اجتناب ہے۔

قولہ: وعالم او متعلم:

''اوْ'' واؤ کے معنی میں ہے یا تنویع کیلئے ہے۔چنانچہ دونوں واؤ''او'' کے معنی میں ہیں۔

اشرف کہتے ہیں کہ ''عالم او متعلّم '' اکثر نسخوں میں مرفوع ہے اور قواعد عربیت کا تقاضا ہے کہ ان کا عطف ''ذکر الله'' پر ہو۔اور کلام موجب میں مستثنیٰ ہونے کی بناء پر منصوب ہو۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس روایت کے الفاظ جامع ترمذی میں ''وما والاہ وعالم ومتعلّم'' مرفوع ہیں اور جامع الاصول میں بھی اسی طرح ہیں مگر اس میں ''اوْ'' کی جگہ ''واؤ'' ہے۔سنن ابن ماجہ میں حدیث کے الفاظ ''او عالمًا او متعلمًا'' او کے ساتھ وارد ہوئے ہیں تکرار کے ساتھ منصوب ہیں۔تینوں کلمات میں نصب تو ظاہر ہے اور رفع تاویل کے ساتھ دُرست ہے گویا کہ یوں کہا گیا ہے: الدنیا مذمومة لا یحمد ما فیھا الا ذکر الله و عالم و متعلّم۔اس ارشاد کا مطلب ہے دُنیا مذموم ہے اس میں موجودہ اُمور قابل تعریف نہیں ہیں۔سوائے اللہ کے ذکر، عالم اور متعلّم کے۔

مختصر الاحیاء میں لکھا ہے:

''دُنیا دونوں منزلوں میں سے ایک گھٹیا منزل ہے۔اسی وجہ سے اس کا نام دُنیا ہے اور دُنیا آخرت کی طرف چلتے ہوئے ایک گزرگاہ ہے۔ایک جانب گہوارہ ہے اور دوسری جانب لحد ہے اور دونوں کے درمیان ایک مسافت ہے دنیا کی زندگی ایک پل ہے۔دُنیا سے مراد موجودہ اشیاء ہیں۔انسان کیلئے ان میں حصہ رکھا گیا ہے۔اور اس کو دُرست کرنے میں انسان کی مشغولیت رکھی گئی ہے اور موجودہ اشیاء سے مراد زمین اور اس میں موجود نباتات، حیوانات اور معاون ہیں۔اور دُنیا میں انسان کیلئے رکھے گئے نصیب (حظ) سے مراد دُنیا کی محبت ہے اور دُنیا کی محبت میں تمام باطنی مہلکات مثلاً ریاء، حسد وغیرہ داخل ہیں۔اور قول مذکور ''دُنیا کو دُرست کرنے میں انسان کی مشغولیت ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے یا کسی دوسرے شخص دنیوی یا اُخروی نصیب سے دُنیا کو درست کرتا ہے۔چنانچہ اس میں پیشہ اور صفت داخل ہیں۔اور جب دُنیا کی حقیقت معلوم ہوگئی تو تمہاری دُنیا وہ ہے جس میں تیرے لئے جلدی آنے والی لذت رکھی گئی ہے۔اور یہ مذموم ہے۔لہٰذا عبادات کا وسیلہ بننے والی اشیاء دُنیا نہیں ہے۔مثلاً روٹی کھانا کیونکہ اس سے عبادت پر قوت حاصل ہوتی ہے۔اور اسی کی طرف اشارہ ہے ارشاد نبی ''الدنیا مزرعة الاخرة'' دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور ''الدنیا ملعونة'' میں اور ابن عباسؓ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ نے دُنیا کے تین اجزاء بنائے ہیں: ایک جزء مؤمن کو ملتا ہے دوسرا جزء منافق کو ملتا ہے اور تیسرا جزء کافر کو ملتا ہے۔مؤمن آخرت کیلئے سامان سفر حاصل کرتا ہے منافق زینت میں لگا رہتا ہے اور کافر مزے حاصل کرتا رہتا ہے۔''

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بظاہر ''وما والاہ'' پر اکتفاء کرنا چاہیے تھا کیونکہ یہ لفظ تمام بھلائیوں، نیکیوں اور شریعت کے مستحبات پر مشتمل ہے۔دوسرے درجہ میں ''العلم'' کو ذکر کیا، یہ تعمیم کے بعد تخصیص ہے۔علم کی فضیلت پر دلالت کرنے کیلئے اس طرح کیا پھر ''عالم و متعلّم'' کو ذکر کیا تا کہ صراحۃً ان دونوں کی شان کی عظمت ظاہر ہو جائے۔بخلاف پہلی صورت کے کہ اس کی دلالت عظمت پر التزامی ہے اور تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ عالم اور متعلّم کے علاوہ تمام لوگ بے کار اور بے فائدہ ہیں اور تا کہ یہ تنبیہ ہو جائے کہ عالم اور متعلّم سے مراد وہ علماء ہیں جو دینی علم اور عمل دونوں کے حامل ہوں۔چنانچہ جہلاء، بے عمل عالم اور وہ شخص جس نے بے فائدہ علم یا دینی علوم کے علاوہ کے علوم حاصل کیے ہوں، نکل گئے۔

اور حدیث میں ہے کہ اللہ کا ذکر ہر عبادت اور ہر سعادت کی جڑ ہے بلکہ اللہ کا ذکر ایسا ہے جیسا کہ بدن کیلئے حیات اور انسان کیلئے روح' کیا انسان کیلئے زندگی سے بے نیازی ہے؟ کیا انسان اپنی روح پر کسی اور چیز کو ترجیح دے سکتا ہے؟ اور یہ کہنا بھی بجا ہے کہ اللہ کے ذکر کی برکت سے دُنیا باقی ہے اور زمین و آسمان قائم ہیں۔ مسلم کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: کسی بھی شخص پر اُس وقت تک قیامت نہیں آئیگی جب تک کوئی اللہ، اللہ کہنے والا موجود ہو۔ چنانچہ یہ حدیث ایک بہت بڑی حکمت والی ہے اور جوامع الکلم ہے جو خصوصی طور پر حضور علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی کیونکہ یہ حدیث اپنی منطوق کے اعتبار سے تمام اچھے اخلاق پر دلالت کرتی ہے اور مفہوم کے اعتبار سے تمام بُرے اخلاق پر دلالت کرتی ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی کا کہنا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔

تخریج: بیہقیؒ نے بھی اسی طرح روایت کی ہے۔ اور جامع میں اس روایت کو ان دونوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ بغیر لفظ "الا" کے، اور "عالما او متعلما" میں لفظ "او" کے بغیر نصب کے ساتھ منسوب کیا ہے۔ یہ باب الہمزہ میں ہے۔ اور باب الدال میں "الدنیا ملعونة ملعون ما فیها الا ما کان منها لله عز و جل" کے الفاظ ہیں۔

اس حدیث کو ابونعیم نے جابرؓ سے حلیہ میں نقل کیا ہے۔

"الدنیا ملعونة ملعون ما فیها الا ذکر الله وما والاه وعالما او متعلما" کے الفاظ کو ابن ماجہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور طبرانی نے اوسط میں ابوسعید سے روایت کیا ہے۔

"الدنیا ملعونة ملعون ما فیها الا امرا بمعروف اونهیا عن منکر اوذکر الله" کے الفاظ کو بزار نے ابومسعودؓ سے نقل کیا ہے۔

"الدنیا ملعونة ملعون ما فیها الا ما ابتغی به وجه الله" کے الفاظ کو طبرانی نے ابودرداءؓ سے نقل کیا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے فرمایا ہے: یہ حدیث صحیح ہے۔

۵۱۷۷ : وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْكَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَاسَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةً۔ (رواه احمد والترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٨٥ حدیث رقم ٢٣٢٠ و ابن ماجه فی السنن ٢/١٣٧٧ حدیث رقم ٤١١٠۔

ترجمہ: "حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ دُنیا اگر اللہ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی قدر و قیمت رکھتی تو اللہ تعالیٰ اس میں سے کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلاتا"۔ (احمد' ترمذی' ابن ماجہ)

تشریح: تعدل "تاء" مفتوح اور دال مکسور ہے۔

جناح بعوضة: یہ قلت اور حقارت کی ایک مثال ہے کافر سے دُنیا کا تھوڑا سا فائدہ بھی روک لیتے کیونکہ کافر اللہ کا دشمن ہے۔ اور دشمن کو وہ چیز نہیں دی جاتی جو دینے والے کے ہاں قیمتی ہو اور دُنیا کی حقارت کی وجہ سے اللہ اپنے محبوب بندوں کو دُنیا نہیں دیتے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے اس حدیث میں جس میں ارشاد ہے:

"اللہ اپنے مؤمن بندے کو دُنیا سے اس طرح ~~محفوظ رکھتا~~ ہے جیسا کہ تم مریض کو پانی سے محفوظ رکھتے ہو۔"

اس حدیث میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے: ''دنیا کو جس سے بھی روک دیا گیا یہ اُسکے لئے بہتر ہے''۔ صوفیاء کا قول ہے کہ انسان کی پاک دامنی اس میں ہے کہ زیادہ دُنیا حاصل کرنے پر قادر نہ ہو۔ اور حضور علیہ السلام کی ایک دُعا ہے جو جامع مانع ہے رضا کے قائم مقام ہے اللہ کے فیصلوں پر قناعت دلانے والی ہے۔

''اے اللہ تو نے جو چیز مجھے میری پسند کی عطا کی ہے اُس کے ذریعے مجھے اُن کاموں کیلئے قوت عطا فرما جو کام تیری خوشنودی کا باعث ہوں۔ اور اے اللہ تُو نے میری پسند کی جو چیز مجھ سے روک دی ہے اُسکے ذریعے سے مجھے اُن کاموں کیلئے فراغت نصیب فرما جو کام تیری خوشنودی کا باعث ہوں۔''

اللہ کے ہاں دُنیا کے بے قیمت اور گھٹیا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ کفار اور فجار کو زیادہ دُنیا دیتے ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ﴾ [الزخرف۔۳۳] ''اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تمام آدمی ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو جو لوگ خدا کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کیلئے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے۔''

آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: کیا تجھے یہ بات پسند نہیں کہ کفار کو دنیا مل جائے اور ہمیں آخرت مل جائے۔ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ......﴾ [آل عمران :۱۹۸]

''جو چیزیں اللہ کے پاس ہیں وہ نیک بندوں کیلئے بدرجہا بہتر ہیں اور آپ کے رب کا عطیہ بدرجہا بہتر ہے اور دیرپا ہے۔''

تخریج: اسی طرح ضیاء نے بھی نقل کیا ہے۔

۵۱۷۸ : وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَتَّخِذُوا الضَّيْعَةَ فَتَرْغَبُوْا فِي الدُّنْيَا۔ (رواه الترمذی والبیهقی فی شعب الایمان)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٨٨ حدیث رقم ٢٣٢٨ واحمد فی المسند ١/٣٧٧ والبیهقی فی شعب الایمان ٧/٣٠٤ حدیث رقم ١٠٣٩١۔

ترجمہ: ''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ضیعہ کو (اس طرح) اختیار نہ کرو کہ وہ دنیا کی طرف رغبت کا سبب بن جائے''۔ (ترمذی، بیہقی)

تشریح: ضیعة: سے مراد باغ، بستی اور کھیتی ہے۔ نہایہ میں ہے کہ ضیعة اصل میں ایک بار ضائع ہونے کو کہتے ہیں اور کسی کی ''ضیعہ'' سے مراد وہ اشیاء ہوتی ہیں جن سے انسان کا معاش متعلق ہے مثلاً جائیداد، تجارت اور زراعت وغیرہ۔

یعنی تم آخرت کو چھوڑ کر دُنیا کی طرف مائل ہو جاؤ گے۔ اس حدیث میں جائیداد اور اس جیسی دوسری ان چیزوں جو اللہ کی عبادت سے اور آخرت کی طرف توجہ سے مانع ہیں، میں مشغول ہونے سے روکنا مقصود ہے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ جائیداد حاصل کرنے میں زیادہ مشغول نہ ہو۔ ورنہ اللہ کی یاد سے غافل

ہو جاؤ گے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ......﴾ [النور: ۳۷]
''جن کو اللہ کی یاد سے اور نماز پڑھنے سے اور زکوۃ دینے سے تجارت اور خرید و فروخت غافل نہیں کرتی۔''

تخریج: اس حدیث کو احمد اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔

۵۱۷۹ : وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ دُنْيَاهُ اَضَرَّ بِاٰخِرَتِهٖ وَمَنْ اَحَبَّ اٰخِرَتَهٗ اَضَرَّ بِدُنْيَاهُ فَاٰثِرُوْا مَا يَبْقٰى عَلٰى مَا يَفْنٰى۔ (رواه احمد و البيهقى فى شعب الايمان)

اخرجه احمد فى المسند ٤/٤١٢ و البيهقى فى شعب الايمان ٧/٢٨٨ حديث رقم ١٠٣٣٧۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنی دنیا کو محبوب رکھتا ہے (اس قدر محبوب رکھنا کہ خدا کی محبت پر غالب آ جائے) تو وہ اپنی آخرت کا نقصان کرتا ہے اور جو شخص اپنی آخرت کو محبوب رکھتا ہے وہ (بظاہر) اپنی دنیا کا نقصان کرتا ہے (یعنی اخروی امور میں مشغولیت کی وجہ سے دینوی انہماک میں کمی آتی ہے) پس تمہیں چاہئے کہ فانی چیز (دنیا) پر باقی رہنے والی چیز (آخرت) کو ترجیح دو''۔ (احمد' بیہقی)

تشریح: اضر باخرته: ''باء'' تعدیہ کیلئے ہے اور اس کے مشابہ دوسرے جملہ میں بھی تعدیہ کیلئے ہے۔

فاثروا: یہ ماقبل کی تفریع ہے یا شرط مقدر کا جواب ہے۔ گویا کہ یہ فرمایا کہ جب تمہیں یہ بات معلوم ہوئی کہ آخرت اور دنیا دونوں ضد ہیں اور جمع نہیں ہوتیں۔ اسی وجہ سے حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

''دنیا میں تم میں سے زیادہ بھوک والا آخرت میں سب سے زیادہ سیر ہوگا۔ اور دُنیا میں ننگے بدن پھرنے والے بہت سے آخرت میں لباس پہنے ہوئے ہونگے۔''

قیامت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿خافضة رافعة﴾ [الواقعة: ۳]

فآثروا: مد کے ساتھ ہے۔

عقل مند شخص فنا ہونے والے سونے پر اُس مٹی کے برتن کو ترجیح دیتا ہے جو باقی رہنے والا ہے تو یہاں معاملہ برعکس کیسے۔

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''کم از کم علم بلکہ کم از کم ایمان بلکہ کم از کم عقل یہ ہے کہ بندہ دنیا کو فانی سمجھے اور آخرت کو باقی رہنے والا سمجھے۔ اور اس علم کا نتیجہ یہ ہے کہ بندہ فانی دنیا سے اعراض کرے اور باقی رہنے والی آخرت کی طرف توجہ دے۔ اور آخرت کی طرف توجہ دینے اور دنیا سے اعراض کرنے کی علامت یہ ہے کہ موت کے آنے اور آخرت کے ظاہر ہونے سے پہلے موت کی تیاری کرے۔''

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دنیا اور آخرت کی مثال ترازو کے دو پلڑوں جیسی ہے' اگر ایک پلڑا جھک جاتا ہے تو دوسرا ہلکا ہو جاتا ہے اور دوسرا جھک جاتا ہے تو پہلا ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ دنیا کی محبت دنیا میں مشغول ہونے اور دنیا میں منہمک ہو جانے کا سبب ہے۔ اور دنیا میں مشغولیت اور انہماک آخرت سے غفلت کا سبب ہے۔ اور اس وجہ سے ذکر، فکر اور عبادت چھوڑ دیتا ہے اور آخرت کے درجات اور ثواب فوت ہو جاتا ہے۔ اور یہ بذات خود ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ جبکہ اس کے ساتھ یہ بندہ خوف' پریشانی اور تکلیف جھیلتا ہے حاسدین سے اپنا دفاع کرنے' مال کمانے پھر اس کی حفاظت کیلئے مصائب اور صعوبتیں

برداشت کرتا رہتا ہے۔

اسنادی حیثیت: اس کے سارے راوی ثقہ ہیں۔

تخریج: حاکم نے اپنی مستدرک میں اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور خطیب نے جامع میں حضرت انسؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: ''تم میں سے سب سے بہتر شخص وہ ہے جو نہ دنیا کیلئے آخرت کو چھوڑے اور نہ آخرت کیلئے دنیا کو چھوڑے اور نہ لوگوں پر بوجھ بنے۔''

۵۱۸۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لُعِنَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَلُعِنَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ۔

(رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/ ۵٠٧ حدیث رقم ٢٣٧۵۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دینار اور درہم کے بندے پر لعنت ہو''۔ (ترمذی)

تشریح: قوله :لعن عبد الدنیا رولعن عبد الدرهم :

صحیح نسخوں اور معتمد اُصول میں اسی طرح عطف کے ساتھ منقول ہے۔ اور جامع میں ''واؤ'' عاطفہ کے بغیر منقول ہے۔ واللہ تعالیٰ اَعلم اور اس جیسی ایک حدیث ''تعس عبد الدینار'' پہلے گزر چکی ہے۔ (ملاحظہ کیجئے اسی باب کی حدیث: ۵۱٦۱ جو ترتیب کے لحاظ سے فصل اوّل کی ساتویں روایت ہے' از مرتب)

۵۱۸۱ : وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَاذِئْبَانِ جَائِعَانِ اُرْسِلَافِیْ غَنَمٍ بِاَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَی الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِیْنِهٖ۔ (رواه الترمذی والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/ ۵٠٨ حدیث رقم ٢٣٧٦، واحمد فی المسند ٣/ ٤٦٠۔

ترجمہ: ''حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: دو بھوکے بھیڑیئے' جن کو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے' وہ بھی اس قدر نقصان دہ نہیں جتنا کسی کے دین کے لئے مال و منصب کی طمع نقصان دہ ہے''۔ (ترمذی' دارمی)

تشریح: قوله :وعن كعب بن مالك عن ابیه:

موجودہ تمام نسخوں میں اسی طرح ہے مگر قلم کا سہو اور پرانی غلطی ہے۔ اسی وجہ سے میرکؒ فرماتے ہیں کہ صحیح یوں ہے:

عن ابن كعب بن مالك عن ابیه: اور اس طرح بھی صحیح ہے: ''عن كعب بن مالك'' عن ابیه کے بغیر۔ اور سید جمال الدین فرماتے ہیں کہ مشکوۃ کے جتنے نسخوں کو ہم نے دیکھا سب میں اسی طرح ہے۔ اور مصابیح کے بہت سارے نسخوں میں ہمیں اسی طرح ملا مگر یہ سہو ہے۔ اور بظاہر یہ اصل میں مصابیح سے ہوئی۔ اور صاحب مشکوۃ سے تقلیداً ہوئی اور صحیح یہ ہے:

عن ابن كعب بن مالك عن ابیه ، اسی طرح اصل ترمذی میں ہے۔ اور مذکور بیٹا عبداللہ ہے۔ جامع الاصول میں اس بات کی تصریح ہے۔

ما قوله :ماذئبان جائعان...... : "ما" نافیہ ہے۔

ذئبان :ہمزہ ساکن ہے اور کبھی یاء سے تبدیل کیا جاتا ہے۔

جائعان :اس کو مبالغہ کیلئے ذکر کیا۔

بأفسد): "باء" زائدہ ہے۔

لھا :یعنی اُس ریوڑ کیلئے ،اور مونث کی ضمیر ذکر کی ہے جنس کا اعتبار کرتے ہوئے یا (قطعة) کا اعتبار کرتے ہوئے۔

دو بھیڑیوں کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی ہے کہ حرص کا تعلق بھی دو چیزوں کے ساتھ ہے۔ایک ظاہری ہے۔اور ایک باطنی ہے اور وہ دو چیزیں جن سے حرص کا تعلق ہے اُن میں سے ایک کثیر مال اور دوسری بڑا مرتبہ ہے۔

لدینہ :" افسد " کے متعلق ہے۔اور معنی یہ ہے کہ انسان کا مال اور جاہ کی حرص کرنا اُسکے دین کیلئے بہت زیادہ نقصان وہ ہے۔اور " دین " کو " بکری " کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی کہ جس طرح بکری بھیڑیا کے سامنے کمزور ہو جاتی ہے اسی طرح دین ان دو اشیاء کی حرص کے سامنے کمزور ہو جاتا ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ " ما " لیس کے معنی میں ہے " ذئبان " اس کا اسم ہے " جائعان " صفت ہے " بافسد " " ما " کی خبر ہے " باء " زائدہ ہے اور " افسد " اسم تفضیل کا صیغہ ہے معنی ہے " بہت زیادہ فساد و نقصان پہنچانے والا " اور " لھا " کی ضمیر " غنم " کی طرف راجع ہے۔اور اس میں جنسیت کا اعتبار کیا گیا ہے۔اس وجہ سے مونث کی ضمیر لائی گئی اور " من حرص المرء " اسم تفضیل کیلئے مفضل علیہ ہے۔اور " علی المال و الشرف " حرص کے متعلق ہیں۔اور " شرف " سے مراد جاہ ہے اور (لدینہ) میں لام بیان کیلئے ہے جیسا کہ اس ارشاد باری :﴿لمن اراد ان یتم الرضاعة﴾ [البقرة:۲۳۴] " یہ مدت اس کے لئے ہے جو شیر خوارگی کی تکمیل کرنا چاہے " میں ہے۔

گویا کہ پوچھا گیا کہ یہ حرص کس چیز کیلئے بہت زیادہ نقصان وہ ہے۔ جواب دیا گیا اُسکے دین کیلئے اور معنی یہ ہوا کہ اگر دو بھوکے بھیڑیے بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیئے جائیں تو ان کا نقصان اُس نقصان سے زیادہ نہیں جو نقصان انسان کو مال و جاہ کی حرص سے ہوتا ہے۔کیونکہ حرص کی وجہ سے انسان کے دین کو اس سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے جتنا کہ دو بھوکے بھیڑیوں کو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑنے سے ہوتا ہے۔مال کا نقصان اس لئے بہت زیادہ ہے کہ یہ ایک گونہ قدرت ہے جس کی وجہ سے شہوات کی طلب پیدا ہوتی ہے اور مباحات سے عیش پرستی کا باعث بنتا ہے پھر عیش پرستی اور ناز و نعمت کی زندگی محبوب بن جاتی ہے۔اور بسا اوقات مال کے ساتھ اُنس بڑھتا جاتا ہے۔اور حلال مال کمانے سے عاجز ہوتا ہے۔اس لئے مشتبہات میں پڑ جاتا ہے جو اللہ کی یاد سے غفلت کا باعث ہے۔اور اس سے تو کوئی بھی نہیں بچ سکتا اور " جاہ " کے نقصان دہ ہونے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ مال کو جاہ کیلئے خرچ کیا جاتا ہے۔مگر جاہ کو مال کیلئے خرچ نہیں کیا جاتا اور یہ شرک خفی ہے۔پھر انسان ریا کاری ،مداہنت ، نفاق اور تمام اخلاق ذمیمہ میں داخل ہو جاتا ہے اور یہ بہت زیادہ نقصان ہے۔

صوفیاء کا قول ہے کہ صدیقین کے سر (یعنی دماغ) سے جو چیز سب سے آخری میں نکلتی ہے وہ جاہ ہے۔جاہ وہ چیز ہے جو ... کیلئے جلوت میں خلوت کیلئے رکاوٹ بنتی ہے اگرچہ جاہ امور علمیہ عملیہ ۔مشیخت اور حالات کشفیہ میں ہی کیوں نہ ہو۔اور

صاحب کشاف نے ربیع الابرار میں ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے:

آدمی اپنی زندگی میں بھی ریا کار ہوتا ہے اور اپنی زندگی کے بعد بھی کسی نے پوچھا وہ کس طرح؟ فرمایا کہ بندہ چاہتا ہے کہ موت کے بعد لوگ کثرت سے اس کے جنازہ میں شرک ہوں۔

تخریج وتوضیح: شاید حدیث کے یہ الفاظ ترمذی کے ہیں ورنہ تو دارمی کو مقدم رکھنا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ مسلم ابوداؤ داور ترمذی وغیرہ دارمی سے نقل کرتے ہیں۔ اور جامع میں ہے کہ احمد اور ترمذی نے اس حدیث کو کعب بن مالک سے نقل کیا ہے۔ اور ''عن ابیہ'' کا ذکر نہیں کیا۔

۵۱۸۲ : وَعَنْ خَبَّابٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اَنْفَقَ مُؤْمِنٌ مِنْ نَفَقَةٍ اِلاَّ اُجِرَ فِيْهَا اِلاَّ نَفَقَتَهٗ فِي هٰذَا التُّرَابِ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذي في السنن ٥٨٢/٤ حديث رقم ٢٤٨٣ وابن ماجه في السنن ١٣٩٣/٢ واحمد في المسند ١١٠/٥۔

ترجمہ: ''حضرت خباب رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمان (اپنے رہن سہن پر) جو اخراجات کرتا ہے اس پر اسے اجر دیا جاتا ہے سوائے اس خرچ کے جو اس مٹی میں کرتا ہے''۔ (ترمذی ابن ماجہ)

تشریح: اُجر: صیغہ مجہول ہے۔

الا نفقته: کلام موجب سے مستثنیٰ ہونے کی بناء پر منصوب ہے اس لئے کہ استثناء اول کی وجہ سے نفی ایجاب بن گیا۔

فی هذا التراب: اسم اشارہ بیان کیلئے ہے۔ بعض کے نزدیک ''التراب'' کنایہ ہے بدن اور بدن کو حاصل ہونے والی ضرورت سے زائد دینی یا دنیوی لذتوں سے طیبی فرماتے ہیں کہ ''نفقتہ'' کلام موجب سے استثناء کی بناء پر منصوب ہے اس لئے کہ مستثنیٰ منہ کلام منفی سے مستثنیٰ ہے لہٰذا کلام موجب بن گیا۔

۵۱۸۳ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّفَقَةُ كُلُّهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلاَّ الْبِنَاءَ فَلَا خَيْرَ فِيْهِ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذي في السنن ٥٦١/٤ حديث رقم ٢٤٨٢۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(ضروریاتِ زندگی کے) تمام اخراجات اللہ کی راہ میں (خرچ کرنے کی مانند) ہیں (یعنی انسان اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات پر جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کو اس کا ثواب ملتا ہے) البتہ (ضرورت وحاجت سے زائد) تعمیر پر خرچ کرنے میں کوئی بھلائی نہیں''۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: ''البناء'' لام عہدی ہے۔

قوله: فلا خير فيه: اسراف کی وجہ سے اور اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے اور نفقہ میں اسراف کا تصور نہیں

ہے' کیونکہ نفقہ یا کسی کو کھلانا ہے یا کوئی دوسرا احسان کرنا اور یہ دونوں خیر کی چیزیں ہیں۔ چاہے مستحق کو ملیں یا کسی اور کو ملیں۔
فلا خیر فیہ: ''فاء'' تفریعیہ ہے اور یہ ''فاء'' موجودہ تمام نسخوں میں ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طیبیؒ کے اصل نسخہ میں ''فا'' کی جگہ ''واؤ'' ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی شرح میں لکھا ہے کہ ''ولا خیر فیہ'' حال مؤکدہ ہے۔

۵۱۸۴ : وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمًا وَنَحْنُ مَعَهُ فَرَاٰى قُبَّةً مُشْرِفَةً فَقَالَ مَا هٰذِهٖ قَالَ اَصْحَابُهٗ هٰذِهٖ لِفُلَانٍ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ فَسَكَتَ وَحَمَلَهَا فِيْ نَفْسِهٖ حَتّٰى لَمَّا جَآءَ صَاحِبُهَا فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فِي النَّاسِ فَاَعْرَضَ عَنْهُ صَنَعَ ذٰلِكَ مِرَارًا حَتّٰى عَرَفَ الرَّجُلُ الْغَضَبَ فِيْهِ وَالْاِعْرَاضَ عَنْهُ فَشَكٰى ذٰلِكَ اِلٰى اَصْحَابِهٖ وَقَالَ وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاُنْكِرُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا خَرَجَ فَرَاٰى قُبَّتَكَ فَرَجَعَ الرَّجُلُ اِلٰى قُبَّتِهٖ فَهَدَمَهَا حَتّٰى سَوَّاهَا بِالْاَرْضِ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَلَمْ يَرَهَا قَالَ مَا فَعَلَتِ الْقُبَّةُ قَالُوْا شَكٰى اِلَيْنَا صَاحِبُهَا اِعْرَاضَكَ فَاَخْبَرْنَاهُ فَهَدَمَهَا فَقَالَ اَمَا اِنَّ كُلَّ بِنَاءٍ وَبَالٌ عَلٰى صَاحِبِهٖ اِلَّا مَالَا اِلَّا مَا لَا يَعْنِيْ اِلَّا مَا لَا بُدَّ مِنْهُ ۔ (رواہ ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٥/٤٠٣ حدیث رقم ٥٢٣٧ واحمد فی المسند ٣/٢٢٠۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ (کہیں جانے کے لئے) باہر نکلے۔ ہم صحابہؓ کی ایک جماعت بھی آپ ﷺ کے ہمراہ تھی' آپ ﷺ نے راستہ میں ایک بلند قبہ کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ قبہ کیا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ قبہ فلاں انصاری کی ملکیت ہے۔ آپ ﷺ (یہ سن کر) خاموش رہے اور (کچھ فرمایا تو نہیں لیکن) اس بات کو (ناگواری اور غصہ کے طور پر) اپنے دل میں رکھا یہاں تک کہ جب اس قبہ کا مالک آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے لوگوں کی موجودگی میں آپ ﷺ کو سلام کیا تو آپ ﷺ نے اس سے بے رخی کا مظاہرہ فرمایا (یعنی یا تو آپ نے اس کے سلام کا جواب ہی نہیں دیا یا جواب تو دیا لیکن اس سے منہ پھیر لیا اور دوسرے لوگوں کو بھی تنبیہ ہو جائے) آنحضرت ﷺ نے متعدد بار ایسا ہی کیا (کہ وہ شخص آپ ﷺ کو سلام کرتا اور آپ ﷺ اس کا جواب نہ دیتے اور اس سے منہ پھیر لیتے تھے) آخرکار اس شخص نے آپ ﷺ کی ناگواری اور بے رخی کو محسوس کر لیا چنانچہ اس شخص نے صحابہؓ سے اس بات کا شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ اللہ کی قسم مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے حضور ﷺ مجھے پہچانتے ہی نہ ہوں صحابہؓ نے انہیں کو بتایا کہ حضور ﷺ ادھر (تمہاری طرف) تشریف لے گئے تھے اور تمہارے قبہ کو دیکھا تھا۔ وہ انصاری صحابی اپنے قبہ کی طرف گئے اور اسے منہدم کر کے زمین کے برابر کر دیا! (اس واقعہ کے بعد) ایک دن رسول اللہ ﷺ پھر اس طرف تشریف لے گئے اور قبہ کو وہاں نہ دیکھ کر دریافت فرمایا کہ اس قبہ کا کیا ہوا؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ قبہ بنانے والے نے اپنے طور پر آپ ﷺ کی بے التفاتی اور ناراضگی کا تذکرہ ہم سے کیا تھا تو ہم نے اس صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا (کہ حضور ﷺ تم سے اس لئے ناراض ہیں کہ تم نے اس قبہ کی صورت میں ایک ناپسندیدہ تعمیر کرائی ہے) چنانچہ اس شخص نے اس قبہ کو منہدم کر دیا۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''خوب جان لو کہ ہر عمارت اپنے بنانے والے کے لئے آخرت میں وبال (یعنی عذاب کا

سبب) بنے گی اِلَّا مَالَا اِلَّا مَالَا یعنی علاوہ اس چیز کے' کہ جس کے بغیر گزر راہ نہ ہو سکے'۔ (ابوداؤد)

تشریح: ونحن معه: جملہ حالیہ ہے۔

فقال: ما هذا؟: استفہام انکاری ہے۔

لفلان رجل: "رجل" مجرور ہے اور ایک نسخہ میں مرفوع ہے۔

"حملها": اساس البلاغہ میں ہے کہ "حملت الحقد" اُس وقت کہا جاتا ہے جب اس کو دل میں پوشیدہ رکھے۔ شاعر کہتا ہے:

ولا احمل الحقد القديم عليهم
وليس رئيس القوم من يحمل الحقدا

"میں ان لوگوں کے خلاف پرانی باتوں کو اپنے دل میں نہیں رکھتا اور وہ شخص قوم کا سردار نہیں بن سکتا جو پرانی باتوں کو دل میں رکھتا ہے۔"

قوله: فاعرض عنه: یعنی اُس کے سلام کا جواب نہیں دیا یا جواب دیا مگر اُسکی طرف التفات نہیں کیا۔ کسی کے ساتھ نرمی سے بھلائی کرنے کے وقت آپ علیہ السلام کی عادت مبارکہ اسی طرح تھی۔ اور آپ علیہ السلام نے اس شخص کی تادیب کرنے اور دوسروں کو تنبیہ کرنے کے واسطے اس طرح کیا۔

قوله: صنع ذالك مرارا: ممکن ہے کہ یہ جملہ "لما" کا جواب ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ حتیٰ کا مدخول ہو۔ اور "لما" ظرفیہ ظرف مقدر جو عامل اور معمول کے درمیا متانفہ ذکر کیا گیا۔ طیبیؒ نے "صنع" کو جملہ متانفہ بنایا کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ "فاعرض" "فا" سمیت کو "لما" کا جواب بنانا دُرست ہے۔ حالانکہ ایسا کم ہوتا ہے۔ اور "لما" کے جواب مقدر ہو۔ تو بھی دُرست ہے اور اصل عبارت یوں ہے: "كرهه فاعرض عنه"۔

وقال قوله: قال: ما فعلت القبة: ماقبل کی تفسیر ہے۔ "الى رسول الله" کا اضافہ ہے لیکن اس اضافہ کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اور ایک نسخہ میں ہے: قال جملہ متانفہ ہے۔

ما فعلت: معروف کا صیغہ ہے۔ اور ایک نسخہ میں مجہول کا صیغہ ہے۔

"اما": میم مخفف ہے تنبیہ کیلئے ہے۔

بناء: "باء" مکسور ہے۔ یہ مصدر ہے۔ اور اس سے مراد عمارت ہے۔

الا مالا: تاکید کے واسطے تکرار کیا۔

قوله: يعني الا مالابد منه:

بعض نے حدیث کا مطلب یوں بیان کیا ہے کہ ہر وہ عمارت جس کو بندہ تعمیر کرے وبال یعنی آخرت میں عذاب ہے۔ وبال اصل میں ثقل اور مکروہ یعنی ناپسندیدہ چیز کو کہتے ہیں۔ اور حدیث میں وہ عمارت مراد ہے جو ضرورت سے زائد ہو اور تفاخر اور عیش پرستی کیلئے بنائی گئی ہو۔ بھلائی اور خیر کی عمارات مثلاً مدارس، مساجد اور سرحدی لشکر کی حفاظت کیلئے پناہ گاہ مراد نہیں ہیں۔

کیونکہ ان کی تعمیر آخرت کیلئے ہے۔اسی طرح گزارہ کی وہ روزی لباس اور رہائش گاہ مراد نہیں ہیں جن سے کوئی خلاصی نہیں۔

بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

''ہر عمارت مالک عمارت پر قیامت کے دن وبال ہوگی سوائے مسجد کے۔''

طبرانی نے واثلہؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

''ہر عمارت صاحب عمارت پر وبال ہوگی سوائے اُس عمارت کے جو اس طرح ہو''۔اور اپنے ہتھیلی سے اشارہ کیا'' اور ہر علم صاحب علم پر قیامت کے دن وبال ہوگی سوائے اُس علم کے جس پر عمل کیا ہو۔''

۵۱۸۵ : وَعَنِ ابْنِ هَاشِمِ بْنِ عُتْبَةَ قَالَ عَهِدَ اِلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا يَكْفِيْكَ مِنْ جَمِيْعِ الْمَالِ خَادِمٌ وَمَرْكَبٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (رواه احمد والترمذی والنسائی وابن ماجة وفی بعض نسخ المصابيح عن ابی هاشم بن عتبد بالدال بدل التأء وهو تصحيف)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٨٨ حديث رقم ٢٣٢٧ وابن ماجه فی السنن ٢/١٤٣٢ حديث رقم ٤١٠٣ واحمد فی المسند ٥/٢٩٠۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا: تمہارے لئے صرف اس قدر مال کا جمع کرنا کافی ہے کہ ایک خادم ہو اور ایک راہ جہاد کی سواری اس کو روایت کیا ہے احمد۔ ترمذی نسائی اور ابن ماجہ نے جب کہ مصابیح کے بعض نسخوں میں حدیث کی سند عن ابی ہاشم بن عتبہ منقول ہے۔

راویٔ حدیث:

ابو ہاشم۔ یہ ابو ہاشم ہیں۔ان کا نام شیبہ ہے۔عتبہ بن ربیعہ کے بیٹے ہیں اور نسب کے اعتبار سے قرشی ہیں۔کہتے ہیں کہ ان کا نام ''ہشام'' ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کا نام ہی ان کی کنیت ہے۔حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے ماموں ہیں فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے اور شام میں سکونت پذیر ہو گئے۔نیک نہاد صاحب فضل صحابی ہیں۔ان سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ نے روایت کی۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں وفات پائی۔

تشریح: قوله:قال :عهد الى رسول الله ﷺ قال: قال:''عهد'' سے بدل ہے۔یا''عهد'' کی تفسیر ہے۔یا'' عهد'' کا بیان ہے۔طیبیؒ نے پہلی ترکیب کو اختیار کیا ہے۔اس لئے کہ فرمایا''عهد'' سے قال بدل ہے' یہ فعل سے فعل بدل ہے۔جیسا کہ شاعر کے اس قول میں:

متی تاتنا تلمم بنا فی دیارنا
تجد حطبا جزلا ونارا تاججا

''جب تم ہمارے پاس ہمارے علاقے میں آؤ گے تو تم وہاں ایندھن کی بہت زیادہ لکڑیاں اور بھڑکتی ہوئی آگ پاؤ گے''۔

یہاں ''تلمم بنا'' تأتنا سے بدل ہے۔

قوله:انمایکفیك من جمع المال ومرکب فی سبیل الله:

کہ ضرورت کے بقدر اُن چیزوں پر قناعت اور اکتفاء کیا جائے جو چیزیں آخرت کیلئے توشہ بن جاتی ہیں۔ طبرانی اور بیہقی نے سے نقل کیا ہے:

''تمہارے لئے دُنیا کی اتنی چیزیں کافی ہیں جو سوار کیلئے توشہ ہوں۔''

تخریج وتوضیح: اور جامع میں ارشاد نبوی ''انما یکفیہ'' کی نسبت آخری تین کی طرف ہے۔ ابی ہاشم بن عتبہ کی سند سے منقول ہے۔ اور اس حدیث کا تتمہ ایک قصہ ہے جو فصل ثالث میں آئے گا۔

قولہ: وفی بعض نسخ المصابیح عن ابی ہاشم بن عتبد:

عتبد کی ''عین'' مضموم ''تاء'' ساکن اور ''باء'' مفتوح ہے (بالدال) بغیر نقطہ والی ''دال'' کے ساتھ (بدل التاء) دو نقطوں والی ''تاء'' جو لفظ عتبہ کے آخر میں ہے وہ تصحیف ہے۔ اس لئے کہ یہ نام راویوں کے ناموں میں مذکور نہیں ہے۔ نیز یہ اُس ضبط کے مخالف ہے جو اُصول میں موجود ہے۔ بعض نسخوں میں تحریف ہے اور بعض حواشی میں بھی تحریف ہے۔ چنانچہ خیال رکھیں دُرست وہ ہے جو یہاں لکھا ہے۔

۵۱۸۶ : وَعَنْ عُثْمَانَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیْسَ لِابْنِ اٰدَمَ حَقٌّ فِیْ سِوٰی هٰذِهِ الْخِصَالِ بَیْتٌ یَسْکُنُهٗ وَثَوْبٌ یُوَارِیْ بِهٖ عَوْرَتَهٗ وَجِلْفُ الْخُبْزِ وَالْمَآءِ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴/۴۹۴ حدیث رقم ۲۳۴۱ واحمد فی المسند ۱/۶۲۔

ترجمہ: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ابن آدم کو ان چیزوں کے علاوہ اور کسی چیز کا حق نہیں' ایک سکونت کے لئے گھر دوسرے ستر ڈھانپنے کے لئے لباس' تیسرے سادہ روٹی اور پانی''۔ (ترمذی)

تشریح: قولہ: لیس لابن آدم حق فی سوی ھذہ الخصال:

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سویٰ کا موصوف محذوف ہے۔ اصل عبارت یوں ہے: شی سوی ھذہ اھ۔ اور ایک نسخہ میں جامع کے موافق عبارت ''فیما سوی ھذہ الخصال'' ہے اور ان سے مراد بدن کی وہ ضروریات ہیں جو دین کیلئے معین ہیں۔

قولہ: بیت یسکنہ: بیت: مجرور ہے اور رفع کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے۔ اور یہی اعراب بعد میں بیان کیے گئے ''خصال'' کا بھی ہے۔

قولہ: وثوب یواری بہ عورتہ: لوگوں سے یا نماز میں ستر چھپا سکے کیونکہ نماز کیلئے شرط ہے۔

جلف قولہ: ھو جلف الخبز: ''جیم'' مکسور اور ''لام'' ساکن ہے۔ لام کو مفتوح بھی پڑھا گیا ہے۔ قاموس میں ہے کہ ''جلف جیم'' کے کسرہ کے ساتھ کا معنی ہے بغیر سالن کے خشک موٹی روٹی یا روٹی کا ایک ٹکڑا اور ایک برتن اور روٹی رکھنے کیلئے ایک برتن۔

شارح نے لکھا ہے کہ اور مراد مظروف ہے۔ اور زیادہ مناسب یہ ہے، کہ مراد ظرف اور مظروف دونوں ہوں۔ اور ایک کو

چھوڑ کر دوسرے کو ذکر کرنے پر اس لیے اکتفاء کیا کہ دونوں استعمال میں ایک دوسرے کو لازم ہیں۔

قولہ و الماء: مجرور ہے۔ "جلف" کا "خبز" پر عطف ہے۔ شراح کے کلام سے یہی بات مفہوم ہوتی ہے۔ اور ایک نسخہ میں مرفوع ہے۔ اس لئے کہ یہ بھی خصال مذکورہ میں سے ایک خصلت ہے۔

شارحؒ فرماتے ہیں کہ حق سے مراد وہ جو اللہ کی طرف سے اس کو دی گئی ہو نہ آخرت میں نہ اس کے بارے میں سوال ہوگا۔ اور نہ اس پر عقاب ہو۔ اور اللہ کی طرف سے دی گئی اشیاء میں سے حلال پر اکتفاء کرے تو اُسکے بارے میں سوال نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ ایسے حقوق ہیں جو نفس کیلئے ضروری ہیں اور جو اُسکے علاوہ ہیں اُن کے بارے میں سوال ہوگا اور اُسکے شکر کا مطالبہ کیا جائے گا۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حق سے مراد وہ اشیاء ہیں جن کی انسان کو ضرورت ہو اور انسان کی زندگی اس پر موقوف ہو۔ اس وجہ سے انسان ان اشیاء کا مستحق ہو اور وہ جو مال سے حقیقی مقصود ہو۔

بعض فرماتے ہیں۔ کہ حق سے مراد وہ اشیاء کہ جن کو اگر حلال طریقہ سے کمایا جائے تو اس کے بارے میں حساب نہ ہو۔

نہایہ میں ہے کہ "جلف" بغیر سالن کی روٹی کو کہتے ہیں۔ اور بعض نے لکھا ہے کہ "جلف" خشک موٹی روٹی کو کہتے ہیں۔ اور فرمایا کہ "جلف" کو لام کے فتحہ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ یہ "جلفة" کی جمع ہے۔ اور "جلفة" کا معنی ہے روٹی کا ٹکڑا۔ الغریبین میں لکھا ہے کہ شمر نے ابن الاعرابی سے نقل کیا ہے کہ

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظرف کو ذکر کیا اور مظروف مراد لیا یعنی روٹی کا ٹکڑا اور پانی کا ایک گھونٹ اور مقصود یہ ہے کہ انتہائی قناعت اور کفایت شعاری کے ساتھ وقت گزارے جیسا کہ ابن ادھم سے منقول ہے:

وماهي الا جوعة قد سددتها
وكل عظام بين جنبي واحد

اور امام شافعی رحمہ اللہ کے اشعار ہیں:

ايانفس يكفيك طول الحياة
اذا ماقنعت ورب الفلق

"اے نفس! جب تو قانع بن جائے گا تو رب فلق (صبح کی روشنی لانے والے رب) کی قسم تیرے لئے ساری زندگی کے واسطے۔"

رغيف بفوذنج يا بس
وما روى ولبس خلق
وخفش تكفلك جدرانه
فما ذا العنا وما ذا القلق

"اور وہ جھونپڑی کافی ہوگی جس کی دیوار میں تجھ پر سایہ کرے پھر اس کے بعد دنیا کیلئے کیوں پریشان ہو۔ اور کیوں افسوس کرتے ہو۔"

تخریج: اس حدیث کو امام حاکم نے بھی اپنی مستدرک میں اسی طرح نقل کیا ہے۔

۵۱۸۷ : وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ دُلَّنِيْ عَلٰى عَمَلٍ اِذَا اَنَا عَمِلْتُهُ اَحَبَّنِيَ اللّٰهُ وَاَحَبَّنِيَ النَّاسُ قَالَ اِزْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللّٰهُ وَازْهَدْ فِيْمَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ۔

(رواه الترمذى وابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۲/ ۱۷۷۳ حدیث رقم ۴۱۰۲۔

ترجمہ: ''سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے (بارگاہِ رسالت میں) حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) میری کسی ایسے عمل کی طرف رہنمائی فرمائیں کہ میں جب اس کو اختیار کروں تو اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت کرنے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: دنیا سے بے رغبتی اختیار کرو (یعنی دنیا کی محبت میں گرفتار نہ ہو اس کی فضولیات سے اعراض کرو اور امورِ آخرت کی طرف متوجہ رہو) اگر تم ایسا کرو گے تو گویا تم اس چیز سے نفرت کرنے والے ہو گے جس سے اللہ تعالیٰ نفرت کرتا ہے اور اس کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ تم سے محبت رکھے گا اور اس چیز بے اعتنائی کرو جو لوگوں کے پاس ہے (یعنی مال و دولت اور منصب) لوگ تم سے محبت کریں گے''۔

تشریح: قوله: يارسول الله دلنى ۔۔۔۔ وأ جتبنى الناس: انا: تاکید کیلئے ہے۔

احبنی: یائے متکلم کو مفتوح اور ساکن دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

قوله قال ازهد فى الدنيا:

اس کی محبت کو چھوڑ' بایں طور کہ اس کی زائد اشیاء سے اعراض کر اور آخرت اور آخرت میں کام آنے والی اشیاء کی طرف متوجہ ہو۔

یحبك الله: کیونکہ اللہ کے دُشمن کے ساتھ تیری محبت نہ ہوگی۔

جواب امر کی بناء پر مجزوم ہے۔ اور ''باء'' مفتوح مشدد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ جملہ مستانفہ ہونیکی وجہ سے مرفوع ہے۔

قوله: وازهد فما عند الناس يحبك الناس:

لوگ تم سے محبت کریں گے کیونکہ تم نے اُن کی محبوب چیز کو چھوڑ دیا اور اُنکے مطلوب میں اُنکی مزاحمت نہیں کی۔

ایک شاعر کا شعر ہے:

وما الذهد الا فى انقطاع الخلائق
وما الحق الا فى وجود الحقائق

''زہد یہی ہے کہ انسان مخلوق سے طمع منقطع کر دے اور حق تو حقائق میں ہی ہے۔''

وما الحب الا حب من كان قلبه
عن الخلق مشغولا برب الخلائق

''حقیقی محبت تو اُس شخص کی محبت ہے جس کا دل اللہ کے ساتھ لگا ہوا ہو۔ اور مخلوق سے غافل ہو گیا ہو۔''

بعض نے لکھا ہے کہ زہد سے مراد نفس کا دنیا پر قدرت رکھنے کے باوجود دنیا سے آخرت کی وجہ سے دور ہو جانا جہنم کی آگ سے خوف کی وجہ سے یا جنت کی اُمید میں یا غیر اللہ کی طرف التفات سے پرہیز کرنے کیلئے۔ اور یہ اُسی وقت ہوتا ہے جب لقمہ

کے نور سے شرح صدر ہو جائے۔ اور اُس شخص سے زُہد کا تصور نہیں ہو سکتا جس کے پاس نہ مال ہو۔ اور نہ جاہ۔

ابن مبارک رحمہ اللہ سے کسی نے کہا: اے زاہد! فرمایا: زاہد تو عمر بن عبدالعزیز تھے' دُنیا پیشانی رگڑ کر اُنکے پاس آئی مگر اُنہوں نے ترک کیا' اور جہاں تک میری بات ہے تو میں کس چیز میں زہد کروں۔

یہ کمال زہد کا بیان ہے' ورنہ اصل زہد یہ ہے کہ نفس کسی چیز کی طرف مائل نہ ہو' اور یہ زہد در حقیقت ایک الٰہی جذبہ ہے جو اللہ کی طرف روحانی سفر کرنے والے کو فانی امور سے بچاتا ہے اور باقی رہنے والی چیزوں میں مشغول کر دیتا ہے۔ حاصل یہ کہ نفس زہد کا دعوٰی کرتا ہے لیکن اس کا سچ اور جھوٹ اُس وقت واضح ہوتا ہے جس وقت دُنیا موجود ہو اور دُنیا قدرت ہو اور جس وقت قدرت نہ ہو تو دونوں میں سے کوئی ایک احتمال ہوتا ہے اور ثمرہ اس کا یہ ہے۔ کہ راستہ کے توشہ کے بقدر ضرورت کی دُنیا پر قناعت ہو۔ اور وہ اتنا طعام ہے جس سے بھوک دفع ہو جائے۔ اور اتنا لباس جس سے ستر و پوشی ہو جائے۔ ایسا مکان جس کی وجہ سے گرمی و سردی سے بچ جائے۔ اور اتنا سامان جس کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلی حدیث میں گزر چکا۔

منازل کی عبارت کا حاصل یہ ہے کہ زہد نام ہے بتکلف کسی چیز کی رغبت اپنے دل سے نکالنے کا اور اس کے تین مراتب ہیں:

پہلا مرتبہ: مشتبہات پر اللہ کے عقاب سے ڈر اور خوف کی وجہ سے مشتبہات میں زہد کرنا

دوسرا مرتبہ: مراقبہ میں مشغول ہو کر وقت کو قیمتی بنانے کیلئے فراغت کو غنیمت سمجھے اور بقدر ضرورت روزی سے زائد میں زہد کرے۔

تیسرا مرتبہ: زہد کے بارے میں زہد کرے یعنی اگر بعض چیزوں کے بارے میں زہد اختیار کیا ہے تو اللہ کی عظمت کی نسبت سے اُس زہد کو حقیر سمجھے اور اُس شخص کے ہاں زہد اور عدم زہد دونوں برابر ہو جائیں اور دُنیا کو ترک کر کے اجر حاصل کرنے کیلئے اس طرح وقت گزارنا کہ حقیقت کی آنکھوں سے فاعل حقیقی کی وحدانیت کو دیکھ رہا ہو اور اللہ کی طرف سے دین وعطاء اور منع و ترک میں اللہ کے تصرف کا مشاہدہ کرے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زہد ایک اعلیٰ اور افضل مقام ہے۔ اس لئے کہ زہد اللہ کی محبت کا سبب ہے' اور دنیا سے محبت کرنے والا اپنے آپ کو اللہ کے بُغض کے سامنے پیش کرتا ہے۔

توضیح و تخریج: میرک ؒ فرماتے ہیں کہ ترمذی کا ذکر کتاب کے کاتب نے یا صاحب کتاب نے سہواً کیا ہے' کیونکہ حافظ منذری، امام نووی اور شیخ جزری ان تمام نے صرف ابن ماجہ کا ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نووی ؒ نے اس حدیث کو اپنی اربعین میں ذکر کیا ہے اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے۔ اس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے' لیکن ترمذی کا ذکر اُصول میں نہیں ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جامع میں یہ ارشاد نبوی "ازھد فی الدنیا" منقول ہے اور آگے لکھا ہے کہ اس حدیث کو ابن ماجہ طبرانی، حاکم اور بیہقی نے سہل بن سعید سے نقل کیا ہے۔ ہاں ایک حدیث جس کو ترمذی اور ابن ماجہ نے ابوذر ؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے میں یوں وارد ہوا ہے:

"دُنیا میں زہد کرنا حلال کو حرام کرنے اور مال کو ضائع کرنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ دُنیا کے بارے میں زہد یہ ہے کہ اپنے

ہاتھ میں جو کچھ ہے اُس پر اُس سے زیادہ اعتماد نہ ہو جو اللہ کے قبضہ میں ہے۔اور اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے اُسکے ثواب کی وجہ سے اُس مصیبت کا باقی رہنا زیادہ پسندیدہ و محبوب ہو۔"

احمد نے ''زھد'' میں اور بیہقی نے طاؤس سے مرسلاً نقل کیا ہے:

''دُنیا کے بارے میں زہد دل اور بدن کو راحت پہنچاتا ہے اور دُنیا کی رغبت غم اور پریشانی کو بڑھاتی ہے۔''

اس حدیث کو قضاعی نے ابن عمرؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے اور اُسکے الفاظ یہ ہیں۔یطیل کی جگہ یکثر کا لفظ ہے۔

اس حدیث کو طبرانی نے اوسط میں ابن عدی اور بیہقی نے ابوہریرہ سے مرفوعاً اور بیہقی نے حضرت عمرؓ سے موقوفاً روایت کیا ہے۔اور اس میں ''تشعب القلب و البدن'' کے الفاظ ہیں۔

بیہقی نے ضحاک سے مرسلاً نقل کیا ہے:

''لوگوں میں سب سے زیادہ زاہد وہ شخص ہے جو قبر اور قبر کی بوسیدگی کو نہ بھولے اور دُنیا کی اچھی زینت کو چھوڑ دے۔ اور باقی رہنے والی زندگی کو فنا ہونے والی زندگی پر ترجیح دے اور آنے والی کل کو اپنی زندگی میں سے نہ سمجھے اور اپنے آپ کو مردوں میں شمار کرے۔''

ابن عمر سے ﷺ مرفوعاً منقول ہے:

''اس اُمت کے پہلے طبقہ کی صلاح و درستگی زہد اور یقین سے ہوئی اور اس کے آخری طبقہ کی ہلاکت بخل اور اُمیدوں سے ہوگی۔'' طبرانی نے اس کو نقل کیا ہے۔

۵۱۸۸ : وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَامَ عَلٰى حَصِيْرٍ فَقَامَ وَقَدْ اَثَّرَ فِي جَسَدِهٖ فَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ اَمَرْتَنَا اَنْ نَبْسُطَ لَكَ وَنَعْمَلَ فَقَالَ مَالِيْ وَلِلدُّنْيَا وَمَا اَنَا وَالدُّنْيَا اِلَّا كَرَاكِبٍ اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا۔ (رواه احمد و الترمذی و ابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٠٨/٤ حديث رقم ٢٣٧٧ وابن ماجه ١٣٧٦/٢ حديث رقم ٤١٠٩ واحمد فی المسند ٣٩١/١۔

ترجمہ: ''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ چٹائی پر سوئے اور اٹھے تو آپ ﷺ کے جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑے ہوئے تھے (یہ دیکھ کر) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم آپ (ﷺ) کے لئے نرم بستر اور اچھے کپڑوں کا انتظام کر دیں (تا کہ آپ ﷺ اس سخت چٹائی پر لیٹنے سے تکلیف محسوس نہ کریں) حضور ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس دنیا (کے عیش و آرام) سے اور اس دنیا کو مجھ سے کیا سروکار؟ میری اور دنیا کی مثال تو اس سوار کی سی ہے جو کسی درخت کے سایہ میں آئے کچھ دیر رکنے کے بعد اسے وہیں چھوڑ کر چلا جائے''۔(احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: لو امرتنا ان نبسط: ''سین'' مضموم ہے اور احتمال ہے کہ ''لو'' تمنی کیلئے ہو۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ ''لو'' شرطیہ ہو اور تقدیری عبارت یوں ہو: الو اذنت لنا ان نبسط۔

قوله:فقال مالي وللدنيا وما انا والدنيا......:

''ما'' نافیہ ہے۔یعنی مجھے دُنیا سے اُلفت ومحبت نہیں اور نہ دُنیا کو مجھ سے اُلفت ومحبت ہے۔تاکہ میں اُسکی طرف رغبت کروں اوراس میں کشادگی کروں اوراس دنیا کی اشیاء اورلذتوں کو جمع کروں۔

''ما'' استفہامیہ ہے۔یعنی مجھے دنیا سے کیا اُلفت ومحبت ہے۔یا مطلب یہ ہے کہ میرے دنیا کی طرف مائل ہونے اور دُنیا کے میری طرف مائل ہونے سے مجھے کیا واسطہ ہے میں تو آخرت کا طالب ہوں اور آخرت دنیا کی سوکن اور ضد ہے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "نعمل" کا متعلق محذوف ہے۔چنانچہ کلام سابق کی جنس سے کچھ مقدر مانا جائے اور وہ یہ ہے۔''عیش پرستی اوردنیوی اسباب سے لذت حاصل کرنا بستر سے عام ہے یعنی کوئی بھی شے ہو۔اس وجہ سے اس کے مطابق ہو جائے گا۔ارشادنبوی مالي وللدنيا، یعنی دنیا کے ساتھ میری حالت نہیں ہے۔مگر (کراکب) اُس سوار کے حال کی طرح

قوله:استظل تحت شجرة ثم راح وتركها:

یہ تشبیہ تمثیلی ہے۔اس میں جلدی کوچ کرنے اورقلیل قیام میں تشبیہ ہے۔اسی وجہ سے خاص طور پر سوار کا ذکر کیا

''لدنیا'' : میں لام تاکید کیلئے ہے اگر''واؤ'' مع کے معنی میں ہو۔اور گر''واؤ''عطف کیلئے ہے تو تقدیر کی عبارت یوں ہے:

مالي مع الدنيا ومالدنيا معي.

تخریج: اس حدیث کواسی طرح حاکم اورضیائ نے بھی نقل کیا ہے۔

۵۱۸۹ : وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَغْبَطُ اَوْلِيَائِیْ عِنْدِیْ لَمُؤْمِنٌ خَفِيْفُ الْحَاذِ ذُوْحَظٍّ مِنَ الصَّلٰوةِ اَحْسَنَ عِبَادَةَ رَبِّهٖ وَاَطَاعَهٗ فِی السِّرِّ وَكَانَ غَامِضًا فِی النَّاسِ لَايُشَارُ اِلَيْهِ بِالْاَصَابِعِ وَكَانَ رِزْقُهٗ كَفَافًا فَصَبَرَ عَلٰی ذٰلِكَ ثُمَّ نَقَدَ بِيَدِهٖ فَقَالَ عَجِلَتْ مَنِيَّتُهٗ قَلَّتْ بَوَاكِيْهِ قَلَّ تُرَاثُهٗ۔

اخرجه الترمذي في السنن ٤/٤٩٦ وابن ماجه ١٣٧٨/٢ حديث رقم ٤١١٧ واحمد في المسند ٢٥٢/٥۔

ترجمہ: ''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا:''میرے نزدیک (یعنی میرے دین ومذہب کے اعتبار سے) میرے رفقاء میں نہایت قابل رشک وہ مؤمن ہے جس کا ساز وسامان کم ہو' نماز میں لذت حاصل کرتا ہو۔اورحسن وخوبی سے اپنے رب کی عبادت کرتا ہو (اورجس طرح جلوت میں عبادت کرتا ہے اسی طرح) پوشیدہ طور پر بھی (خلوت میں بھی) اطاعت الٰہی میں مشغول رہتا ہو'لوگوں میں شہرت نہ ہو کہ اس کی طرف انگلیاں اٹھیں (یعنی اپنے علم وعمل کے سبب لوگوں میں مشہور ومعروف نہیں ہے بلکہ نہایت بے نفسی کے ساتھ گوشۂ گمنامی میں رہ کر علم وعمل کے ذریعہ دین وملت کی خدمت کرتا ہے) نیز اس کا رزق یعنی ضروریاتِ زندگی کا خرچ) بقدر کفایت ہواوراسی پراوراسی پر صبروقناعت کرتا ہو۔یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کے ذریعہ چٹکی بجائی اور فرمایا''اس کی موت بہت جلد اپنا کام پورا کرلیتی ہے اوراس کی موت پر رونے والی عورتیں بھی کم ہوتی ہیں اوراس کا ترکہ بھی بہت مختصر (یعنی نہ ہونے کے برابر) ہوتا ہے''۔(احمد' ترمذی' ابن ماجہ)

تشریح: اغبط اولیائی: اغبط اسم تفضیل ہے اور مبنی للمفعول ہے اس لئے کہ اس کی تقدیر یوں ہے: المغبوط به حاله یعنی لوگوں میں اچھی حالت والے اور لوگوں میں سے افضل انجام والے۔

لمؤمن: مبتدا کی خبر لام زائد ہے تاکید کیلئے یا یہ لام ابتدائیہ ہے۔ یا مبتدا محذوف ہے۔ ای لھو مؤمن۔

خفیف الحاذ: ''ذال'' مخفف ہے۔ یعنی وہ شخص کم مال والا اور کم عیال والا ہو۔ اور مخلوق کے درمیان اللہ کی راہ پر چلنے کی قدرت ہو اور کوئی مصیبت اور پریشانی اُسکے لئے رُکاوٹ نہ ہو۔

مجمل معنی یہ ہے کہ میرے نزدیک میرا حقیقی دوست اور حقیقی انصاری جس کی حالت قابل رشک ہے وہ مؤمن ہے جس میں مذکورہ صفات ہوں۔

ذوحظ من الصلاۃ: یعنی اس کے ساتھ ہی وہ مشاہدہ و مراقبہ اور اللہ کے ساتھ مناجات کی وجہ سے لذت اور راحت حاصل کر رہا ہو۔ یہی معنی اس ارشاد نبوی میں ہے:

''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔''

''اے بلال نماز کے ذریعے ہمیں راحت پہنچاؤ'' اور راحت کا مفہوم آنکھوں کی ٹھنڈک کے کتنا ہی قریب ہے۔

بعض حضرات نے بڑی بعید توجیہ کی ہے کہ اس کا معنی ہے ''اے بلال! نماز کیلئے اذان دے دو، تاکہ نماز پڑھ کر دل کی پریشانی جو نماز کی وجہ سے ہے، سے راحت حاصل کریں''۔

قولہ: احسن عبادۃ ربه:

تخصیص کے بعد تعمیم ہے۔ (طیبی رحمہ اللہ نے یہ بات ذکر کی ہے) یا پہلے جملہ میں کمیت (مقدار) کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے جملہ میں کیفیت کی طرف اشارہ ہے

قولہ: واطاعۃً فی السر جیسا کہ علانیہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ اس طرح کرنا اکتفاء اور تخصیص کے باب سے ہے اس لئے کہ اس میں اہتمام ہے۔ طیبی رحمہ اللہ نے اس کو عطف تفسیر قرار دیا ہے۔ مگر ہماری تشریح زیادہ بہتر ہے اور یہ معنی بھی ممکن ہے کہ مخفی طور پر عبادت کر کے اپنے رب کی اطاعت کرے اور ملامتی صوفیاء کی طرح اس کی اطاعت مجلس میں ظاہر نہ ہو۔ اور اگلا جملہ اس کے ہم معنی ہے: قولہ: وکان غامضا فی الناس یعنی گمنام پوشیدہ اور غیر مشہور ہو۔ (لوگوں کے درمیان) اور اس میں اشارہ ہے۔ اس بات کی طرف کہ لوگوں سے جدائی اختیار نہیں کرتا بلکہ اُن میں رہتا ہے کیونکہ لوگوں سے الگ تھلگ ہونے سے شہرت ہوتی ہے۔ اور اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ لوگوں سے عام لوگ مراد ہیں۔ لہٰذا مجلس کے خاص ساتھی یعنی اولیاء اور صلحاء کی معرفت مُضر نہیں ہے۔ ارشاد نبوی: لا یشار الیه بالا صابع اس پر دلالت کرتا ہے۔ غموض (گمنامی) کیلئے بیان تقریر ہے۔

قولہ: وکان رزقه کفافا: یعنی بقدر ضرورت ہو کہ لوگوں کی طرف جھکنے اور ہاتھ پھیلانے سے اس کو روکے۔

فصبر علی ذالك: بقدر ضرورت رزق پر یا گمنامی اور پوشیدگی پر یا مذکورا مور پر اس لئے کہ انسان کا سرمایہ صبر ہے۔ اور اسی سے اطاعت کو قوت ملتی ہے۔ ارشاد باری ہے: ﴿واستعینوا بالصبر والصلوۃ﴾ [البقرۃ۔ ۴۵]

ترجمہ: ''اور مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے''۔

ایک اور ارشاد باری ہے: ﴿اولئك يجزون الغرفة بما صبروا﴾ [الفرقان۔۷۵]

قوله: ثم نقد بيده:

نقد : ''نون'' ''قاف'' اور ''دال'' تینوں مفتوح ہیں۔ ضمیر کا مرجع النبی ﷺ ہے اور معنی یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایک اُنگلی کے پورے کو دوسری اُنگلی کے پورے پر اس طرح مارا کہ اُس سے آواز سنائی دی یعنی چٹکی بجائی نہایہ میں لکھا ہے کہ عربی میں بولا جاتا ہے نقدت الشي باصبع۔ اس کا معنی ہے کہ اُنگلی سے فلاں چیز کو اس طرح اُلٹا پلٹا جس طرح درھم کو اپلٹا پلٹا جاتا ہے ''ونقد الطاير الحب'' اُس وقت بولا جاتا ہے جب پرندہ ایک ایک کر کے دانے چگتا ہے یعنی ٹھونگ مارتا ہے۔

اور ایک روایت میں ''را'' کے ساتھ منقول ہے اور اسی طرح ایک نسخہ میں محفوظ ہے۔ یعنی اپنی اُنگلی سے آواز پیدا کی اور ایک روایت جس کا معنی بہت زیادہ واضح ہے میں وارد ہوا ہے: ''ثم نفض يده'' ۔

عجلت : یہ باب تفعیل سے مجہول کا صیغہ ہے۔

بواكيه : باكية کی جمع ہے اور اُس عورت کو کہتے ہیں جو میت پر روتی ہے۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''نقد'' سے مراد اُنگلیوں کے پوروں کو اُنگلیوں کے پوروں پر مارنا' چٹکی بجانا ہے۔ کسی چیز کو کم بتانے کیلئے اس طرح کیا جاتا ہے۔ یعنی دُنیا میں تھوڑی دیر ٹھہرتا ہے اور اللہ تعالیٰ روح قبض کر لیتے ہیں' اُس کو کم عمر دیتے ہیں اور اُس پر رونے والوں کو اور میراث کی مقدار کو کم کر دیتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ اس طرح اُنگلی کے پورے پر وہ شخص مارتا ہے جس کو کسی چیز پر تعجب ہو' یا کسی حسین چیز کو دیکھ کر اُسکے حسن پر تعجب ہو اور بسا اوقات اس طرح وہ شخص کرتا جو کسی چیز کے بارے میں بے پرواہی ظاہر کرے' یا فرحت اور خوشی کے وقت کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جس کی یہ صفت ہو تو وہ اپنی دنیاوی زندگی کی سہولت اور آخرت میں اپنے اچھے انجام پر خوش ہوگا۔

بعض کہتے ہیں کہ ''عجلت منيته'' کا معنی ہے۔ کہ دنیا سے تعلق کم ہو اور مولیٰ سے ملاقات کا شوق ہو کیونکہ حدیث میں ہے'' الموت تحفة المؤمن'' اس وجہ سے اُس کی روح جلدی سے نکلے۔

اشرف رحمہ اللہ فرماتے ہیں ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہو جس کی ساری زندگی دنیا میں کم تکلفات والی ہو اور موت پر بھی کم تکلفات اور کم خرچہ ہو۔

جامع میں ہے کہ اس حدیث کو احمد ترمذی، حاکم اور بیہقی نے ابوامامہؓ سے نقل کیا ہے اور اُسکے الفاظ یہ ہیں:

"اغبط الناس عندى مؤمن خفيف الحاذ ذوحظ من الصلاة وكان رزقه كفافا فصبر عليه حتى يلقى الله واحسن عبادة ربه وكان غامضا في الناس عجلت منيته وقل تراثه وقلت بواكيه" .

دیلمی نے اپنی مسند میں حضرت حذیفہؓ سے نقل کیا ہے:

"خيركم في المائتين كل خفيف الحاذ الذى لااهل له ولاولد"

شیخ المشائخ سخاوی نے کتاب ''المقاصد الحسنة في الاحاديث المشهورة على الالسنة'' میں لکھا ہے کہ امام

ابوداؤدؒ نے اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے۔ اور اسی وجہ سے خلیلؒ فرماتے ہیں کہ حفاظ حدیث نے اس روایت کا ضعف اور غلطی بیان کی ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو زمانہ فتن میں رھبانیت کے جواز پر محمول ہوگی اور اس حدیث کے معنی میں بہت ساری ضعیف احادیث موجود ہیں اُن میں سے ایک وہ حدیث ہے۔ جس کو حارث بن ابی اُسامہ نے ابن مسعودؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

لوگوں پر عنقریب ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں بغیر شادی کے رہنا جائز ہوگا اور صرف اُسی شخص کا دین محفوظ ہوگا' جو اپنے دین کو لے کر ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ پر بھاگے اور ایک ٹیلہ سے دوسرے ٹیلہ کی طرف بھاگے جس طرح پرندہ اپنے بچوں کو اور لومڑی اپنے بچوں کو لے کر بھاگتی ہے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور کسی بھلائی کے کام کے علاوہ لوگوں سے دُور رہے۔"

اور اُن میں سے ایک حدیث زکریا بن یحییٰ صوفی کی وہ حدیث ہے جس کو وہ ابن حذیفہ بن الیمان سے اور وہ اپنے والد حذیفہؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:

"خیر نسائکم بعد ستین ومائة العواقر' وخیر اولادکم بعد اربع وخمسین البنات"۔

"۱۶۰ برس کی عمر میں تمہارے لئے اچھی عورتیں وہ ہیں جو بانجھ ہو اور ۵۴ برس کی عمر میں اچھی اولاد بیٹیاں ہیں۔"

اور ترمذی میں ہے جس کو علی بن یزید عن القاسم عن ابی امامة کی سند سے مرفوعاً نقل کیا گیا ہے:

ان اغبط أولیائی ـــ فصبر علی ذالك ثم نفض یده فقال عجلت منیته ...... "

عقبہ فرماتے ہیں کہ "علی" ضعیف ہے۔ اور اس حدیث کو احمد نے 'بیہقی نے زہد میں اور حاکم نے اپنی مستدرک کے باب الاطعمة میں نقل کیا ہے اور فرمایا کہ یہ شامی راویوں کی سند ہے اور اُن کے ہاں صحیح ہے۔ اس حدیث کو صرف علی بن یزید نے روایت نہیں کیا بلکہ ابن ماجہ نے اپنی کتاب کے باب الزہد میں دوسری سند یعنی:

صدقة بن عبدالله عن ابراهیم بن قرة عن ایوب بن سلیمان عن ابی اُمامة کی سند سے یوں نقل کیا ہے: اغبط الناس عندی مؤمن حفیف الحاذ ......"

اس کی تائید ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اُس مرفوع حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کو خطیب اور دوسروں نے نقل کیا ہے:

"جب اللہ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے۔ اُسکو اپنے لئے خاص کر لیتا ہے' نہ اسکو بیوی میں مشغول کرتا ہے اور نہ اولاد میں۔"

دیلمی نے عبداللہ الوھاب الخوازمی عن داؤد بن غفال عن انس کی سند سے حدیث مرفوع نقل کی ہے:

"یأتی علی الناس زمان لان یربی احدکم جرو کلب خیرله من ان یربی ولد من صلبه"

"لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ کتے کے بچے کو پالنا اپنی صلبی اولاد کی پرورش سے اُسکے لئے زیادہ بہتر ہوگا۔"

۵۱۹۰ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَضَ عَلَيَّ رَبِّيْ لِيَجْعَلَ لِيْ بَطْحَاءَ مَكَّةَ ذَهَبًا فَقُلْتُ لَايَارَبِّ وَلٰكِنْ اَشْبَعُ يَوْمًا وَاَجُوْعُ يَوْمًا فَاِذَا جُعْتُ تَضَرَّعْتُ اِلَيْكَ وَذَكَرْتُكَ وَاِذَا شَبِعْتُ حَمِدْتُكَ وَشَكَرْتُكَ ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴/۴۹۶ حدیث رقم ۲۳۴۷ واحمد فی المسند ۵/۲۵۴۔

ترجمہ: "حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:" میرے رب نے مجھے پیشکش کردی

کہ وہ میرے لئے وادی بطحا مکہ (کے سنگریزوں) کو سونا بنا دے' لیکن میں نے عرض کیا کہ میرے پروردگار! مجھ کو اس چیز کی قطعاً خواہش نہیں ہے میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز پیٹ بھر کر کھاؤں اور ایک روز بھوکا رہوں اور جب میں بھوکا رہوں تو تیرے حضور گڑگڑاؤں' (اپنی عاجزی بیان کروں) اور تجھے یاد کروں اور جب میں شکم سیر ہوں تو تیری حمد و ثنا کروں اور تیرا شکر ادا کروں''۔ (احمد' ترمذی)

تشریح: قوله: عرض علي ربي ليجعل لي بطحاء مكة ذهباً: یعنی حسی طور پر پیش کیا یا معنوی طور پر۔ یہ زیادہ واضح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے مشورہ فرمایا اور مجھے اختیار دیا کہ چاہوں تو دُنیا کی وسعت پسند کر لوں اور چاہوں تو بغیر حساب و عذاب آخرت میں نجات کی راہ اختیار کر کے آخرت کا توشہ پسند کر لوں۔

يجعل لي : یعنی میری ملک میں دے یا دُنیا کی طرف میرے متوجہ ہونے کی صورت میں میری وجہ سے میری اُمت کیلئے مخصوص کر دے۔

اصل میں ''بطحاء'' پانی بہنے کی نالی کو کہتے ہیں یہاں اس سے مراد مکہ کے میدان اور صحراء ہیں۔ چنانچہ اضافت بیانی ہے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "بطحاء مكه" میں دو فعلوں یعنی عرض اور ''يجعل'' کا تنازع ہے۔ یعنی میرے اُوپر مکہ کی وادیوں کو پیش کیا کہ ان کو میرے لئے سونا بنا دیا جائے۔

قوله: فقلت: لا رب !ولكن الخ:

و ذكرتك: فقر کی وجہ سے کیونکہ فقر سے اللہ کی یاد آ جاتی ہے جس طرح غنیٰ ناشکری پیدا کرتی ہے۔ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صبر اور شکر کو جمع کیا کیونکہ یہ دونوں کامل مؤمن کی صفات ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ان في ذلك لايات لكل صبار شكور﴾ [ابراهيم ۔ ۵' لقمٰن ۔ ۳۱' سبا ۔ ۱۹' الشورىٰ ۔ ۳۳]

ترجمہ ''اس میں ہر صبر اور شکر کرنے والے کیلئے نشانیاں ہیں''۔ صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ آزمائشوں پر صبر کرنے والا اور نعمتوں پر شکر کرنے والا اور یہ دونوں مخلص مؤمن کی نشانیاں ہیں۔'' چنانچہ ''صبار'' اور شکور میں اشارہ ہے مخلص مؤمن کی طرف۔

صوفیاء کے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ مذکورہ بالا دو صفتیں بندہ میں اُس وقت پیدا ہوتی ہیں اللہ جلال اور جمال کی کیفیت میں بندہ سالک کی تربیت کرتا ہے۔ اس لئے کہ ان دونوں سے مرتبہ کمال پورا ہو جاتا ہے۔ اور مرتبہ کمال یہ ہے کہ اللہ کے فیصلوں پر ہر حال میں راضی ہو رہے۔ اور سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے سیاہ کار اور حق کے بارے میں سرگرداں لوگوں کی حالت اس سے مختلف ہے' اُن کے بارے میں ارشاد باری ہے: ﴿فان اعطوا منها رضوا وان لم يعطوا منها اذاهم يسخطون﴾ [التوبة ۔ ۵۸]

''سو اگر ان (صدقات) میں سے ان کی خواہش کے مطابق ان کو مل جاتا ہے تو وہ راضی ہو جاتے ہیں۔ اور اگر ان (صدقات) میں سے ان کو (ان کی خواہش کے موافق) نہیں ملتا تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔''

نیز ارشاد فرمایا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اِۨطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ اِۨنْقَلَبَ

عَلٰی وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ﴾ [الحج۔۱۱] ”پھر اگر اس کو کوئی (دنیوی) نفع پہنچ گیا تو اس کی وجہ سے (ظاہری) قرار پالیا اور اگر اس کی کچھ آزمائش ہوئی تو منہ اٹھا کر (کفر کی طرف) چل دیا (جس سے) دنیا و آخرت دونوں کو کھو بیٹھا یہی کھلا نقصان (کہلاتا) ہے۔“

۵۱۹۱ : وَعَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ مِحْصَنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَصْبَحَ مِنْكُمْ اٰمِنًا فِيْ سِرْبِهٖ مُعَافًى فِيْ جَسَدِهٖ عِنْدَهٗ قُوْتُ يَوْمِهٖ فَكَاَنَّمَا حِيْزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيْرِهَا۔

رواه الترمذى وقال هذا حديث غريب

اخرجه الترمذى فى السنن ٤/٤٩٦ حديث رقم ٢٣٤٦ وابن ماجه فى السنن ٢/١٣٨٧ حديث رقم ٤١٤١۔

ترجمہ: ”حضرت عبیداللہ بن محصن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تم میں سے جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ اپنے اہل وعیال کے متعلق بے خوف ہو (ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی) اس کا بدن تندرست ہو اور اس کے پاس ایک دن کے کھانے کا سامان ہو تو گویا اس کے لئے دنیا بھر کی نعمتیں جمع کر دی گئی ہیں“۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے“۔

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن محصن ۔ عبداللہ بن محصن انصاری وخطمی ہیں۔ اہل مدینہ میں ان کا شمار ہوتا ہے آپ کی حدیث مدینہ والوں میں پائی جاتی ہے۔ ان سے ان کے بیٹے سلمہ روایت کرتے ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کچھ لوگ ان کی حدیث کو ”مرسل“ کہتے ہیں۔ عرض مرتب: فوقانی وتحتانی متن میں ”عبیداللہ“ ہے جبکہ ”الاکمال“ میں عبداللہ ہے واللہ اعلم بالصواب۔

تشریح: قوله: وعن عبد الله بن محصن:

احتمال ہے کہ صحابی ہوں۔ مگر آپ علیہ السلام سے ان کا سماع ثابت نہیں چنانچہ ان کی حدیث مراسیل صحابہ میں ہے اور یہ اتفاقی طور پر حجت ہے۔ اور احتمال ہے کہ یہ تابعی ہوں۔ اور تابعی کی مرسل حدیث جمہور کے نزدیک حجت ہے جبکہ امام شافعی کے نزدیک حجت نہیں، پہلی بات راجح ہے۔ کیونکہ محدثین ان کی حدیث کو مطلق بیان کرتے ہیں۔

قوله: من أصبح آمناً: دشمن سے خوف نہ ہو، یا گناہ سے پرہیز کرنے۔ یا گناہ سے توبہ کرنے کی وجہ سے اللہ کے عذاب سے محفوظ ہو۔ اسی وجہ سے فرمایا کہ ”عید اُس شخص کیلئے نہیں جو نیا لباس پہنے بلکہ عید تو اُس شخص کیلئے ہے جو وعید سے بچے“۔

سربه: سین کا کسرہ مشہور ہے۔ یعنی اپنی ذات میں

بعض نے ”مسترب“ کا معنی جماعت لکھا ہے۔ چنانچہ معنی یہ ہوگا ”فی اهله وعياله“ یعنی اپنے اہل وعیال میں۔ بعض کہتے ہیں کہ ”سین“ مفتوح ہے اور معنی ہے ”فی مسلکه وطريقه“ یعنی اپنے راستے میں بعض کہتے ہیں کہ ”سین“ اور ”را“ دونوں مفتوح ہیں۔ اور معنی ہے ”فی بيته“ یعنی اپنے گھر میں شارح نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

تورپشتی فرماتے ہیں کہ بعض کے نزدیک تو ”سین“ اور ”را“ پر فتحہ پڑھنا ہی درست ہے اور دوسری روایات نقل نہیں کی، اگر ان کی یہ بات اس طرح تسلیم کی جائے کہ ”سرب“ کا اطلاق ہر گھر پر کیا جائے تو پھر یہ اقوال میں سب سے زیادہ مضبوط قول

ہے لیکن "سَرَب" اُس گھر کو کہتے ہیں جو زمین پر ہوتا ہے۔
قاموس میں ہے کہ "سَرَب" بمعنیٰ راستہ کے ہے اور سین کے کسرہ کے ساتھ اس کا معنی ہے راستہ، حال، دل، نفس اور "سین" اور "را" دونوں کی حرکت کے ساتھ اس کا معنی ہے زمین کے نیچے جنگلی جانور کا بل حدیث سے مراد امن ملنے میں مبالغہ اگر چہ زمین کے نیچے تنگ مکان ہو جیسا کہ جنگلی جانور کا بل ہوتا ہے۔ یا خفاء اور روشنی کے فقدان میں وحشی جانور کے بل کے ساتھ تشبیہ مقصود ہے۔

قوله: معافی فی جسده عنده قوت یومه: معافی: باب مفاعلہ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ یعنی تندرست ہو اور عیوب سے سالم ہو۔

حیزت: "حیازۃ" مصدر سے مجہول کا صیغہ ہے۔ اور اس کا معنی ہے جمع کرنا اور ملانا
"لہ": ضمیر "من" کی طرف راجع ہے اور جملہ کیلئے رابط ہے۔

بحذافیرھا: تصحیح شدہ نسخہ میں اسی طرح ہے۔ یعنی ساری کی ساری "حذافیر" کا معنی ہے اطراف، بعض نے اس کا معنی "بلندیاں" بیان کیا ہے۔ اس کا واحد "حذفاء" یا "حذفور" ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ گویا ساری دنیا اُس کو دی گئی۔

تخریج: جامع میں ہے کہ بخاری نے اس حدیث کو "الادب المفرد" میں ذکر کیا ہے۔ اور ترمذی اور ابن ماجہ نے "حذافیرھا" کا ذکر نہیں کیا۔

۵۱۹۲ : **وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامَلأَ اٰدَمِيٌّ وِعَاءً شَرًّا مِنْ بَطْنٍ بِحَسْبِ ابْنِ اٰدَمَ اُكُلَاتٌ يُقِمْنَ صُلْبَهٗ فَاِنْ كَانَ لَامُحَالَةَ فَثُلُثٌ طَعَامٌ وَّثُلُثٌ شَرَابٌ وَّثُلُثٌ لِنَفَسِهٖ ۔** (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

اخرجہ الترمذی فی السنن ۲/۵۰۹ حدیث رقم ۲۳۸۰ وابن ماجہ فی السنن ۲/۱۱۱۱ حدیث رقم ۳۳۴۹ واحمد فی المسند ۴/۱۳۲۔

ترجمہ: "حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:" انسان (اگر اپنے پیٹ کو حد سے زیادہ بھر لے تو اس) نے پیٹ سے برا کوئی برتن نہیں بھرا (کیونکہ پیٹ کو زیادہ بھرنے سے جو برائیاں اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا کوئی شمار نہیں) ابن آدم کے لئے بس چند لقمے کافی ہیں جو اس کی کمر کو سیدھا رکھ سکیں (تا کہ وہ اطاعت الٰہی کی بجا آوری اور بقدر ضرورت اپنی معاشی جدوجہد کو جاری رکھنے پر قادر رہ سکے) اگر زیادہ کھانے کی ضرورت ہو (یعنی کوئی پیٹ بھرنا ہی چاہتا ہو اور کھانے کی کم سے کم مقدار پر قناعت نہ کر سکتا ہو) تو اس کو چاہیے کہ پیٹ کا ایک حصہ کھانے کے لئے ایک حصہ پانی کے لئے ہو اور ایک حصہ سانس (کی آمدورفت) کے لئے (خالی چھوڑ دے)"۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: قوله: ماملأ آدمی وعاء شر من بطن ---یقمن صلبه شرامن بطن: "وعاء" کی صفت ہے "حسب": مبتدا ہے اور "باء" زائد ہے۔

اکلات: ''ہمزہ'' اور ''کاف'' دونوں مضموم ہیں۔ یہ مبتدا کیلئے خبر ہے۔ جس طرح ''بحسبك درهم'' میں۔
''الالحة'' ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ کا معنی ہے لقمہ اور ایک روایت میں (لقیمات) یعنی تصغیر کے ساتھ وارد ہوا ہے۔
تحقیر کی طرف اشارہ کیا اور تنکیر سے تقلیل کی طرف اشارہ کیا اور ''الاکلالت'' کی طرف اقامت کی نسبت مجازی ہے۔

قولہ: فان كان لامحالة فثلث طعام...... : ''میم'' مفتوح ہے البتہ ضمہ کے ساتھ بھی درست ہے۔

فثلث: ''ثا'' اور ''لام'' دونوں کے ضمہ کے ساتھ اور نیز لام کے سکون کے ساتھ ''ثلث طعام'' مبتدا اور خبر ہیں۔

وثلث شراب: ان دونوں جملوں میں ''لام'' مقدر ہے۔ اگلا جملہ ''وثلث لنفسه'' اس پر قرینہ ہے۔

''نفس'': ''نون'' اور ''فا'' دونوں متحرک ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر ادنیٰ مقدار طعام پر اکتفاء نہ کرے اور پیٹ بھرنا ضروری ہو تو پیٹ ایک تہائی حصہ کھانے کیلئے رکھے ایک تہائی پانی کیلئے اور تیسرا تہائی خالی رکھے سانس کیلئے۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ زیادہ گمراہ ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ﴾ [الحجر:٣] ''آپ ان کو ان کے حال پر رہنے دیجئے کہ وہ (خوب) کھالیں اور چین اڑالیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں۔ ان کو ابھی حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے۔'' اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ مؤمن ایک انتڑی کے بقدر کھاتا ہے اور کافر سات انتڑیوں کے بقدر کھاتا ہے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ واجب ہے کہ جس سے کمر سیدھی ہو اور اللہ کی اطاعت کیلئے قوت حاصل ہو اور اُس مقدار سے تجاوز نہ کرے اگر کچھ زیادہ طعام کھانا چاہتا ہے تو مذکورہ تقسیم سے تجاوز نہ کرے۔ اولاً ''بطن'' کو گھر کی ضروریات کیلئے استعمال کیے جانے والے برتنوں کی طرح ایک برتن کہا پیٹ کے معاملہ کی توہین کیلئے پھر پیٹ کو بدترین برتن کہا گیا اس لئے کہ برتن جس مقصد کیلئے بنائے جاتے ہیں اُسی میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ جبکہ پیٹ کو تو اس لئے پیدا کیا گیا تھا کہ اس میں کھانا جا کر انسان کو قوت بخشے اور کمر سیدھی رہے۔ لیکن اس کا بھر جانا دین دنیا میں فساد کا باعث ہے۔ چنانچہ بدترین برتن ہے۔

شیخ ابو حامد فرماتے ہیں کہ بھوک میں دس فوائد ہیں:

پہلا فائدہ: دل کی صفائی حاصل ہوتی ہے، طبیعت کھل جاتی ہے، عقل بڑھ جاتی ہے، پیٹ بھر کر کھانے سے دل اندھا ہو جاتا ہے، دماغ میں بخارات زیادہ ہو جاتے ہیں اور جال کی طرح اس پر پھیل جاتے ہیں کہ فکر کے معادن کو گھیر لیتے ہیں اور دل اس کی وجہ سے اپنی حرکت سے سست پڑ جاتا ہے۔

دوسرا فائدہ: دل کی نرمی اور دل کی وہ صفائی حاصل ہوتی ہے جس سے دل مناجات کی لذت حاصل کرنے اور اللہ کے ذکر سے اثر لینے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔

تیسرا فائدہ: عاجزی اور تواضع پیدا ہوتی ہے۔ اور تکبر اور اکڑ ختم ہوتی ہے اور وہ خوشی زائل ہو جاتی ہے جس سے سرکشی کی ابتدا ہوتی ہے اور نفس میں بھوک سے جتنی عاجزی پیدا ہوتی ہے۔ اتنی عاجزی کسی اور چیز سے پیدا نہیں ہوتی۔ بھوک کے وقت اللہ کے سامنے عاجزی کرتا ہے اور عاجزی پر برقرار رہتا ہے۔

چوتھا فائدہ: اللہ کی آزمائش، اللہ کے عذاب اور مصیبت زدہ لوگوں کو نہیں بھولتا کیونکہ سیر آدمی بھوک اور بھوکوں کو بھول

جاتا ہے۔

پانچواں فائدہ: یہ بہت بڑا فائدہ ہے وہ یہ کہ تمام شہوتیں ٹوٹ جاتی ہیں' نفس امارہ پر غلبہ حاصل ہو جاتا ہے اور بھوک کی کمی سے ہر شہوت اور قوت بڑھ جاتی ہے۔ اور "سعادت" اس میں ہے کہ بندہ اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور "شقاوت" اس میں ہے کہ نفس انسان کو قابو میں رکھے۔

چھٹا فائدہ یہ: نیند بھاگ جاتی ہے اور بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جو پیٹ بھر کر کھاتا ہے وہ پانی زیادہ پیتا ہے' اور جو زیادہ پیتا ہے وہ زیادہ سوتا ہے' اور زیادہ سونے میں عمر ضائع ہو جاتی ہے' تہجد فوت ہو جاتی ہے' طبیعت سُست ہو جاتی ہے' دل سخت ہو جاتا ہے۔ عمر انسان کیلئے ایک عمدہ اور نفیس موتی ہے' اور بندے کا راس المال ہے جس میں انسان تجارت کرتا ہے۔ نیند موت ہے' اس کی زیادتی عمر کو گھٹاتی ہے۔

ساتواں فائدہ: عبادت پر ہمیشگی آسان ہو جاتی ہے۔ کیونکہ زیادہ کھانا عبادت کی کثرت سے مانع ہے۔ کیونکہ کھانے میں بھی وقت لگتا ہے' اسی طرح طعام کے خریدنے اور پکانے میں وقت خرچ ہوتا ہے' ہاتھ دھونے اور بیت الخلاء کے استعمال میں وقت خرچ ہوتا ہے' اسی طرح پانی لینے کیلئے پانی کی جگہ بار بار آنے جانے کیلئے وقت درکار ہوتا ہے' اور اگر یہ اوقات ذکر و مناجات اور دوسری عبادات میں صرف کرے گا تو بہت زیادہ نفع مل جائے گا۔

حضرت سری ؒ فرماتے ہیں کہ میں نے علی جرجانی کو دیکھا کہ ستو پھانک رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ صرف سُتو کیوں پھانک رہے ہو؟ فرمایا کہ میں نے روٹی چبانے اور پھانکنے کا حساب لگایا تو روٹی چبانے میں ستر (۷۰) مرتبہ تسبیح کے بقدر زیادہ وقت خرچ ہوتا ہے۔ چنانچہ چالیس سال سے روٹی کھانا چھوڑ دیا ہے۔

آٹھواں فائدہ یہ: کم کھانے سے بدن تندرست رہتا ہے اور بیماریاں دُور ہوتی ہیں۔ اخلاط کا فضلہ جمع ہونے سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر یہ بیماریاں عبادات سے مانع بنتی ہیں اور دل کو تشویش میں ڈالتی ہے۔ اور انسان کو ان بیماریوں کی وجہ سے پچھنا لگوانے، دوائی اور طبیب کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور ان سارے کاموں کیلئے خرچہ اور مشقت کی ضرورت ہے۔ اور بھوک میں ان سب سے خلاصی ہے۔

نواں فائدہ: خرچہ اور محنت کم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جس کو کم کھانے کی عادت ہوگی اُسکے لئے تھوڑا مال بھی کافی ہوگا۔

دسواں فائدہ: جو کھانا بچے گا اُس کو مساکین پر صدقہ کرنے میں آسانی ہوگی اور قیامت کے دن اپنے صدقہ کے سایہ میں ہوگا۔ اور جو خود کھائے گا اُسکا ٹھکانہ بیت الخلاء ہے۔ اور جو صدقہ کرے گا اُسکا بدلہ اللہ کی طرف سے فضل و احسان ہوگا۔

تخریج: جامع میں ہے کہ اس حدیث کو احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے نقل کیا ہے۔ جس کے الفاظ یوں ہیں:

فثلث لطعامه وثلث لشرابه.

۵۱۹۳ : وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعَ رَجُلاً فَقَالَ اَقْصِرْ مِنْ جُشَاءِكَ فَاِنَّ اَطْوَلَ النَّاسِ جُوْعًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَطْوَلُهُمْ شِبَعًا فِي الدُّنْيَا.

(رواه في شرح السنة وروى الترمذي نحوه)

اخرجه البغوی فی شرح السنة۲۵۰/۱٤ حدیث رقم ٤٠٤٩ والترمذی فی السنن ٤/ ٩٦٠ حدیث رقم ۲۵۸۷وابن ماجه فی السنن ۲/ ۱۱۱۱ حدیث رقم ۳۳۵۰۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو ڈکار تے سنا تو اس سے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو کم کر دو (یعنی اتنا زیادہ نہ کھایا کرو کہ لمبی لمبی ڈکاریں آنے لگیں) اس لئے کہ قیامت کے دن لوگوں میں سب سے زیادہ دیر تک بھوکا وہ رہے گا جو دنیا میں خوب شکم سیر ہو کر کھاتا تھا۔ (یعنی جو شخص اس دنیا میں بہت زیادہ کھانے والا ہوگا اس کو قیامت کے دن بھی بہت زیادہ بھوک لگے گی)۔ جس کی وجہ سے وہ نہایت پریشانی میں مبتلا ہوگا''۔ بغوی نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

تشریح: **قوله:ان رسول الله ﷺ سمع رجلا يتجشأ:** یتجشا) ''شین'' مشدد ہے اس کے بعد ہمزہ ہے۔ یعنی ڈکار آرہی تھی۔ اور ''جشاء'' اُس آواز کو کہتے ہیں جو منہ معدہ سے معدہ بھر جانے کے بعد آتی ہے اور ساتھ ہوا بھی نکلتی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ آدمی وہب بن عبداللہ تھے اور ان کا شمار چھوٹے صحابہ میں ہوتا تھا۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں بالغ نہیں ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد انہوں نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔

تورپشتی فرماتے ہیں کہ یہ آدمی وہب ابو جحیفہ سوائی تھے، ان سے روایت ہے کہ میں نے گوشت میں گندم کی روٹی کی ثرید بنا کر کھائی اور میں حضور علیہ السلام کے پاس آیا اس حال میں کہ مجھے ڈکار آرہے تھے۔

قوله:فقال:اقصر من جشائك: ہمزہ مفتوح اور صاد مکسور ہے۔ یعنی رُک جا

جشاء جیم مضموم ہے ممدود ہے اصل میں کلام اس طرح تھا ''اقصر عنا'' اس کا معنی یہ ہے کہ ہماری طرف ڈکار نہ نکال بلکہ اس کو روک دے۔ اور ڈکار سے روکنا زیادہ کھانے سے روکنا ہے۔ کیونکہ زیادہ کھانا ہی ڈکار کا سبب ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ''التجشؤ'' کا معنی ہے تکلف۔

قوله:فان أطول الناس جوعايوم القيامة اطولهم شبعافي الدنيا:

''شین'' مکسور اور ''با'' مفتوح ہے۔

تخریج: میرکؒ فرماتے ہیں کہ یہ شخص وہب بن عبداللہ ابو جحیفہ تھے۔

فرماتے ہیں کہ میں نے گوشت میں روٹی کی ثرید بنا کر کھائی اور آپ علیہ السلام کے پاس اس حال میں آیا کہ مجھے ڈکار آرہے تھے۔ تو فرمایا کہ اے فلاں ڈکار بند کر دے۔ کیونکہ دنیا میں زیادہ کھانے والے قیامت کے دن زیادہ بھوکے ہونگے۔

اس حدیث کو حاکم نے نقل کیا ہے اور فرمایا کہ اس کی سند صحیح ہے۔ منذری فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بہت زیادہ ضعیف ہے۔ اس میں وھد بن عوف اور عمرو بن موسیٰ ہیں۔ لیکن بزار نے اس حدیث کو دو سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ایک کے راوی ثقہ ہیں۔

اس کو ابن ابی الدنیا نے اور طبرانی نے الکبیر الا وسط میں' اور بیہقی نے روایت کیا ہے' اور یہ بات بھی لکھی ہے کہ راوی فرماتے ہیں کہ ''ابو جحیفہ نے موت تک پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا جب رات کا کھانا کھاتے تو صبح کو کچھ نہ کھاتے اور جب صبح کھا

لیتے تورات کو کچھ نہ کھاتے۔"

ابن ابی الدنیا کی ایک روایت میں ہے:

ابوجحیفہ نے فرمایا کہ میں نے تیس برس سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔

میرک فرماتے ہیں اس کے الفاظ ابن عمرؓ سے اس طرح منقول ہیں:

تجشأ رجل عند رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال له: كف عنا جشائك' فان اكثرهم شبعافي الدنيا اطولهم جوعا يوم القيامة. اس حدیث کو ابن ماجہ' بیہقی اور دوسرے سب نے یحیٰی البکاء عن ابن عمرؓ کی سند سے نقل کیا ہے۔ اور ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ منذری کی "الترغیب" میں اسی طرح لکھا ہے۔

شیخ جزری فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں عبدالعزیز بن عبداللہ عن یحیٰی ہیں اور یہ دونوں ضعیف ہیں۔ لیکن اس حدیث کی تائید ابوجحیفہ وہب بن عبداللہ السوائی کی حدیث سے ہوتی ہے۔

۵۱۹۴ : وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عِيَاضٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ لِكُلِّ اُمَّةٍ فِتْنَةً وَفِتْنَةُ اُمَّتِي الْمَالُ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٩٢ حديث رقم ٢٣٣٦ واحمد فی المسند ٤/١٦٠۔

ترجمہ: "حضرت کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ (حق تعالیٰ کی طرف سے) ہر اُمت کے لئے ایک امتحان اور آزمائش ہے (جس میں اس امت کے لوگوں کو مبتلا کر کے ان کو آزمایا جاتا ہے) اور میری امت کے لئے آزمائش مال ہے"۔ (ترمذی)

راویٔ حدیث:

کعب بن عیاض۔ یہ ہیں "مرہ کعب" جو "عیاض" کے بیٹے ہیں۔ اشعری ہیں۔ طبقہ صحابہ ؓ سے تعلق رکھتے ہیں اور اہل شام میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سے جابر بن عبداللہ اور جبیر بن نفیر نے روایت کی۔ عیاض میں عین مہملہ پر کسرہ اور یاء مخففہ کے نیچے دو نقطے اور ضاد معجمہ ہے۔

تشریح: "فتنہ" وہ چیز ہے جو کسی کو گمراہی اور معصیت میں مبتلا کر دے۔

وفتنة: مرفوع ہے اور ایک نسخہ میں منصوب ہے۔ یعنی میری امت کے لئے وہ آزمائش مال ہے۔

کیونکہ مال حصول منال کیلئے جامع اور آخرت کے کمال سے مانع ہے۔

تخریج: اس حیثیت کو امام حاکم نے بھی اپنی مستدرک میں نقل کیا ہے۔

۵۱۹۵ : وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُجَاءُ بِابْنِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كَاَنَّهٗ بَذَجٌ فَيُوْقَفُ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ لَهٗ اَعْطَيْتُكَ وَخَوَّلْتُكَ وَاَنْعَمْتُ عَلَيْكَ فَمَا صَنَعْتَ فَيَقُوْلُ رَبِّ جَمَعْتُهٗ وَثَمَّرْتُهٗ وَتَرَكْتُهٗ اَكْثَرَ مَا كَانَ فَارْجِعْنِيْ اٰتِكَ بِهٖ كُلِّهٖ فَيَقُوْلُ لَهٗ اَرِنِيْ مَا قَدَّمْتَ فَيَقُوْلُ رَبِّ جَمَعْتُهٗ

وَثَمَّرْتَهُ وَتَرَكْتُهُ اَكْثَرَ مَا كَانَ فَارْجِعْنِيْ اٰتِكَ بِهٖ كُلِّهٖ فَاِذَا عَبْدٌ لَمْ يُقَدِّمْ خَيْرًا فَيُمْضٰى بِهٖ اِلَى النَّارِ۔

(رواه والترمذی وضعفه)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/ ٥٣٤ حديث رقم ٢٤٢٧ والدارقطنی ١/ ٥١ حديث رقم ٢ من باب النية۔

ترجمہ: ”حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن ابن آدم کو (اس کے کمال ضعف کی وجہ سے) بکری کے بچے کی طرح (ذلت کے ساتھ) لایا جائے گا اور اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ میں نے تجھے عطاؤں سے نوازا (زندگی، عقل، تندرستی اور عافیت) تمہیں خدمتگار دیئے، تم پر انعام فرمایا پس تو نے کیا کام کیا؟ (یعنی کیا تو نے ان چیزوں کے حقوق ادا کیے اور ان سب نعمتوں کا شکر گزار رہا)“ وہ شخص عرض کرے گا ”میرے پروردگار! میں نے (تو بس یہ کیا کہ تجارت اور کاروبار کے ذریعہ) مال و دولت جمع کرنے اور اس کو بڑھانے میں لگا رہا اور (مرتے وقت) اس کو دنیا میں اس سے زیادہ چھوڑ کر آیا جتنا کہ (میری زندگی کے دنوں میں پہلے میرے پاس) تھا، اور اب آپ مجھے دنیا میں دوبارہ بھیج دیجئے تا کہ میں اس تمام مال و دولت کو (آپ کی راہ میں خرچ کروں اور اس کا ثواب) لے کر آپ کی خدمت میں پیش کروں“۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ کوئی مال دکھاؤ جو تم نے آگے بھیجا ہو (یعنی تم کو پہلے بھی راہ خدا میں خرچ کرنے کی توفیق ہوئی ہے جواب ہو گی؟) تو پھر وہ (اپنی بات دہراتے ہوئے کہے گا کہ ”میں تو بس مال کو جمع کرنے اور اضافہ کرنے میں مشغول رہا اور اس کو دنیا میں اس سے زیادہ کر کے چھوڑ آیا جتنا کہ پہلے تھا اور اب آپ مجھے دنیا میں دوبارہ بھیج دیجئے تا کہ میں اس تمام مال و دولت کو لے کر آپ کے ہاں پیش کروں“۔ یہ ایک ایسا شخص ہوگا جس نے کوئی بھلائی آگے نہ بھیجی ہوگی چنانچہ اسے جہنم کی طرف دھکیل دیا جائے گا اسے امام ترمذی نے روایت فرمایا اور اسے سنداً ضعیف قرار دیا ہے۔ (اگرچہ معنی کے لحاظ سے یہ بالکل صحیح ہے)

تشریح: **قوله: يجاء بابن آدم يوم القيامة كانه بذج:** یعنی زیادہ ضعف کی وجہ سے

”بذج“: ”باء“ مضموم، اس کے بعد ”ذال“ اور اس کے بعد ”جیم“ بھیڑ کا بچہ ”برہ“ کا معرب ہے۔ اس سے مراد اس انسان کی کمزوری اور عجز ہے۔ اور شرح السنہ میں ہے کہ ابن آدم کو چھوٹا ہونے کی وجہ سے بھیڑ کے بچے کے ساتھ تشبیہ دی۔ یعنی حقیر اور ذلیل ہوگا۔

قوله: فيقول له: أعطيتك وخولتك وانعمت عليك:

خولتك یعنی میں نے تجھے خدم و حشم اور مال و جاہ وغیرہ دیا تھا۔

بعض کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ میں نے تجھے بعض کا مالک بنایا تھا اور بعض کا مملوک بنایا تھا۔

قوله: فيقول: يارب! جمعته ...۔ آتك به كله: فارجعني: ہمزہ وصلی کے ساتھ

آتك به كله: آپ کے راستہ میں خرچ کر کے۔ کفار کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ آخرت میں کہیں گے: ﴿رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ﴾ [المؤمنون۔ ۹۹۔ ۱۰۰] ”اے میرے رب! مجھ کو دنیا میں واپس بھیج دیجئے تا کہ جس (دنیا) کو میں چھوڑ آیا ہوں (پھر جا کر) نیک کام کروں۔ ہرگز ایسا نہیں (ہوگا)“

لم یقدم خیر افیمضی به الی النار :

"فاذا" "فاء" فصیحیہ ہے جو مقدر عبارت پر دلالت کرتا ہے "اذا" مفاجاتیہ ہے اور "عبد" مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ مقدر عبارت کے ساتھ عبارت یوں ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فاذاهو عبد:

مطلب یہ ہوا کہ اُن نعمتوں میں جو اللہ نے اُسے دی تھیں اور اللہ نے جن باتوں کا حکم دیا اُس کی بجا آوری نہیں کی۔ اور اللہ نے اپنے اس ارشاد: [ولتنظر نفس ماقدمت لغد] [الحشر۔١٨]: "جس چیز کی نصیحت کی تھی اس سے نصیحت حاصل نہیں کی" اور [ماتقدموا لانفسکم من خیر تجدوه عندالله] [البقرہ:١١٠] "اور ہر شخص دیکھ لے گا کہ کل (قیامت) کے واسطے اس نے کیا (فیض) بھیجا ہے"۔

یضی: مجہول کا صیغہ ہے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس شخص کے بارے میں جو حکایت بیان کی گئی اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس آدمی کی مثال اُس غلام جیسی ہے جس کو اس کے آقا نے رأس المال دیا ہو کہ اس میں تجارت کرے اور نفع حاصل کرے تو وہ اپنے آقا کے حکم کو پورا نہ کرے اور رأس المال کو بے جا خرچ کر کے ضائع کر دے اور ان چیزوں کی تجارت کرے جن کی تجارت کرنے کا اس کو کہا نہیں گیا تھا تو یہ غلام خوفزدہ ہوگا اور نقصان اُٹھائے گا۔ ارشاد باری ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ﴾ [البقرہ:١٦] "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے تو سودمند نہ ہوئی ان کی یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے۔"

اس مقام میں غلام کا واقعہ کتنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

شیخ ابوحامد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہر خیر، لذت اور سعادت بلکہ ہر مطلوب اور پسندیدہ چیز کو نعمت کہتے ہیں لیکن حقیقی نعمت آخرت کی سعادت ہے اور اس کے ماسوا کو نعمت کہنا غلط ہے یا مجاز ہے۔ جیسا کہ دنیا کی وہ سعادت جس کے ذریعے انسان آخرت کی سعادت تک نہ پہنچے اس کو نعمت کہنا غلط ہے۔ اور ہر وہ سبب جو آخرت کی سعادت تک پہنچائے اور آخرت کی سعادت کیلئے ایک واسطہ سے معین ہو یا کہ کئی واسطوں سے تو اُس کو نعمت کہنا درست ہے۔ اس لئے یہ حقیقی نعمت کا ذریعہ ہے۔

٥١٩٢ : وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ مَا يُسْاَلُ الْعَبْدُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ النَّعِيْمِ اَنْ يُّقَالَ لَهٗ اَلَمْ نُصِحَّ جِسْمَكَ وَنُرَوِّكَ مِنَ الْمَآءِ الْبَارِدِ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥/٤١٨ حدیث رقم ٣٣٥٨۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قیامت کے دن ابتدائی طور پر بندے سے نعمتوں کے بارے میں جو سوال کیا جائے گا وہ یوں ہوگا کہ "کیا ہم نے تیرے جسم کو صحت مند نہیں بنایا تھا اور تجھے ٹھنڈے پانی سے سیراب نہیں کیا تھا"۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: ان اول ما یسأل العبد یوم القیامة من النعیم أن یقال: "من النعیم" کا بیان ہے

"ان يقال له" ان کی خبر ہے۔ طیبی رحمہ اللہ نے "من النعيم" کو "یسأل" کا متعلق قرار دیا ہے اس لئے کہ فرماتے تھے کہ "ما" مصدریہ ہے اور "ان يقال" ان کی خبر ہے۔ (یعنی بندہ سے پہلا سوال یہ ہوگا کہ اُس سے کہا جائے گا۔)

الم نصح: اصحاح مصدر سے ہے اور اس کا معنی ہے "صحت دنیا"۔

نروك: "واؤ" کی تشدید کے ساتھ اور ایک نسخہ میں ارواء مصدر ہے۔

تخریج: اس حدیث کو ابن حبان اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔ اور ان دونوں کے الفاظ یوں ہیں:

اول مايحاسب به العبد يوم القيامة ان يقال له الم اصح لك جسمك واروك من الماء البارد

حاکم فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ (ذکرہ میرک)۔

۵۱۹۷ : وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ عَنْ عُمْرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٢٩ حديث رقم ٢٤١٦۔

ترجمہ: "حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قیامت کے دن انسان کے پاؤں سرکنے نہیں پائیں گے جب تک کہ اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں پوچھ نہ لیا جائے گا۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ اس نے اپنی عمر کن کاموں میں صرف کی؟ (خصوصاً) اس نے اپنی جوانی کو کس کام میں بوسیدہ کیا (یعنی جوانی گویا نیا لباس ہے جو رفتہ رفتہ پرانا ہوتا ہے) اس نے مال کہاں سے کمایا (یعنی اس نے دنیا میں جو کچھ مال و دولت اور روپیہ پیسہ کمایا وہ حلال و وسائل ذرائع سے حاصل کیا یا حرام ذرائع سے؟) اس نے مال کو کن مصارف میں خرچ کیا (یعنی اپنے مال اور روپیہ پیسہ کو اچھے کاموں میں صرف کیا یا برے کاموں میں ضائع کیا) اور یہ کہ اس نے اپنے علم پر کس قدر عمل کیا؟" ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے"۔

تشریح: قوله: لاتزول قدما ابن آدم ۔۔۔فيما أبلاه: خمس: (کی تمیز محذوف ہے۔) ای خمسة احوال مذکر اور مؤنث دونوں طرح درست ہے۔ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "خصال" کی تاویل کے اعتبار سے مونث لایا گیا ہے۔

عمره: "عین" اور "میم" دونوں مضموم ہیں اور "میم" کا سکون بھی درست ہے۔

وعن شبابه فيما أبلاه: اس میں تعمیم کے بعد تخصیص ہے۔ اور جوانی کے طرفین یعنی بچپن اور بڑھاپا کے بارے میں مسامحت کی طرف اشارہ ہے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر اعتراض ہو کہ یہ خصلت پہلی خصلت میں داخل ہے تو دوبارہ ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس سے مراد انسان کی قوت اور اُس زمانہ کے بارے میں سوال کرنا ہے جس زمانہ میں زیادہ قوت والی عبادت پر قادر ہوتا ہے۔

قوله: وماذا عمل فيما علم:

شاید اُسلوب سے عدول مطلوب تک پہنچانے والی عبارت میں تفنن پیدا کرنے کیلئے ہے۔ اور طیبی نے جو بات ذکر کی ہے کہ "پانچویں خصلت میں انداز سوال کو تبدیل کیا کہ "وعن علمه ماذاعمل به" نہیں فرمایا کیونکہ یہ اشیاء میں سے اہم اور اولیٰ شے ہے۔" تو یہ بات مناسب نہیں ہے ہاں اس پر "خصال" کا اختتام کرنے میں نکتہ ترقی ہے۔

پھر فرمایا کہ "اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ علم عمل کیلئے مقدمہ ہے اور علم کا کوئی اعتبار نہیں اگر عمل نہ ہو"۔ یہ بات علی الاطلاق دُرست نہیں۔ یہ بات صرف دنیوی فروع کے علم میں ہے اور اللہ کی ذات وصفات کا علم حاصل کرنا اور اس کی کتاب اور نشانیوں کی معرفت حاصل کرنا یہ سب علوم سے افضل واکرم ہیں۔ فرمایا کہ "جو علم تم سیکھو گے وہ تمہارے ساتھ جائے گا"۔ اور اس میں اشارہ ہے اُس روایت کی طرف جس میں ہے کہ اہل جنت بھی جنت میں علماء کے محتاج ہونگے اور ایک حدیث میں ہے جس کو عسا کرنے ابودرداءؓ سے نقل کیا ہے:

"اے عویمر! تمہارا کیا حال ہوگا جس وقت تجھ سے پوچھا جائے گا کہ علم حاصل کیا یا جاہل رہ کر آیا ہے۔ اگر تم کہو کہ علم حاصل کیا تو پوچھا جائے گا کہ اپنے علم پر کتنا عمل کیا اور اگر تم کہو کہ جاہل ہوں تو پوچھا جائے گا کہ تیرا کیا عذر ہے علم کیوں حاصل نہیں کیا۔؟

اس کے ساتھ یہ بھی مروی ہے:

ویل للجاهل مرة وویل للعالم سبع مرات: جاہل کیلئے ایک مرتبہ ہلاکت ہے، اور عالم کیلئے سات مرتبہ ہلاکت ہے۔

اور ایک صحیح حدیث میں ہے: أشد الناس عذابا یوم القیامة عالم لم ینفعه الله بعلمه۔

"لوگوں میں سب سے زیادہ عذاب قیامت کے دن اُس عالم کو ہوگا جس کو اس کے علم نے نفع نہیں دیا۔"

قولہ: وقال ھذا حدیث غریب امام ترمذیؒ کا مکمل کلام یوں ہے: ابن مسعود کی حدیث کو ہم نہیں جانتے مگر حسین بن قیس سے اور حسین بن قیس حدیث میں ضعیف ہے ذکرہ میرک)

۵۱۹۸ : وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ اِنَّكَ لَسْتَ بِخَیْرٍ مِنْ اَحْمَرَ وَلَا اَسْوَدَ اِلَّا اَنْ تَفْضُلَهٗ بِتَقْوٰی۔ (رواه احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۵/۱۵۸۔

ترجمہ: "حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (ابوذر!) تم نہ تو سرخ رنگ والے سے بہتر ہو اور نہ سیاہ رنگ والے سے سوائے اس بات کے کہ پرہیزگاری میں تم ان پر فضیلت پاؤ"۔ (احمد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ انسان کی فضیلت کسی ایک خاص رنگ کی وجہ سے نہیں ہے۔ اور خصوصی طور پر ان دو رنگوں کا ذکر اس لئے کیا کہ یہ دو رنگ انسانوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اور راجح یہ ہے کہ ان دو رنگوں سے مراد آقا اور غلام کا رنگ ہے۔ جیسا کہ عموماً اسی طرح ہوتا ہے۔ علامہ طیبی نے بڑا عجیب کام کیا ہے کہ بڑے وثوق سے فرمایا ہے کہ احمر سے مراد عجم ہیں اور اسود سے مراد عرب ہیں۔

تفضله "ضاد" کے ضمہ کے ساتھ

بتقوای: قصر کے ساتھ اور ایک نسخہ میں تنوین کے ساتھ ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿افمن اسس بنیانہ علی تقویٰ من اللہ﴾ [التوبۃ-۱۰۹] قرأت شاذہ میں تنوین کے ساتھ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ فضیلت نہ ظاہری صورت کی وجہ سے ہے اور نہ اُونچی نسبت کی وجہ سے بلکہ تقویٰ کی وجہ سے ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ [الحجرات: ۱۳] ''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اللہ کے نزدیک تم سب سے بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔''

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "تفضلہ" کی ضمیر ''احمر'' اور ''اسود'' میں سے ہر ایک کی طرف لوٹ رہی ہے اور ان دونوں کی طرف انسان کی تاویل سے لوٹتی ہے۔ اور استثناء مفرغ ہے اور عبارت کی تقدیر اس طرح ہے لست بافضل منھما بشیٔ من الاشیاء الا بالتقویٰ'' یعنی تم تقویٰ کے علاوہ کسی اور چیز کی وجہ سے کسی کالے اور گورے سے افضل نہیں ہو۔ اور ''ان تفضلہ'' کا تکرار تاکید کیلئے ہے۔ اس میں تامل کریں کیونکہ ''احمر'' اور ''اسود'' تمام جنس انسان پر دلالت کرتے ہیں اور مخاطب بھی جنس انسان کا ایک فرد ہے۔ پھر ضمیر کو ''اسود'' اور ''احمر'' کی طرف لوٹانا درست نہیں ہے۔ اسی طرح ''احمر'' اور ''اسود'' کو انسان کی تاویل میں لینا ظاہر یہ ہے کہ یہ عمومی احوال سے استثناء مفرغ ہے یعنی تم اللہ کے ہاں ان دو قسم کے انسانوں میں سے کسی سے کسی حال میں فضیلت والے نہیں ہو سوائے اُس حال کے کہ میں جس حال میں تمہارے اندر اُس تقویٰ کی زیادتی ہو جو شریعت میں معتبر ہے۔

تقویٰ کے کئی مراتب ہیں:

تقویٰ کا ادنیٰ مرتبہ شرک جلی سے پرہیز کرنا ہے۔

اوسط درجہ معاصی، منکرات، لہو و لعب اور شرک خفی سے پرہیز کرنا ہے شرک خفی سے مراد عبادت و اطاعت میں ریاکاری اور شہرت کا جذبہ ہے۔

اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ہر وقت اللہ کا استحضار ہو اور غیر اللہ کا استحضار بالکل نہ ہو۔ اسی کی طرف اشارہ ہے اُس حدیث میں جو حضور علیہ السلام سے مروی ہے: ما فضلکم ابو بکر صوم ولا صلاۃ ولکن بشیٔ وقر فی قلبہ

''ابوبکرؓ تم لوگوں سے روزہ اور نماز کی وجہ سے افضل نہیں۔ بلکہ ایک ایسی چیز کی وجہ سے افضل ہے جو چیز ان کے دل میں قرار پکڑ چکی ہے''۔ عراقی فرماتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کو مرفوعاً نہیں دیکھا اور یہ حکیم ترمذی اور نوادر میں بکر بن عبداللہ مزنی کے قول کے حوالہ سے مذکور ہے۔ اور الجامع میں ہے: انظر فانک لست بخیر۔ (الحدیث)

۵۱۹۹ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَازَهِدَ عَبْدٌ فِي الدُّنْيَا اِلَّا اَنْبَتَ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فِيْ قَلْبِهٖ وَاَنْطَقَ بِهَا لِسَانَهٗ وَبَصَّرَهٗ عَيْبَ الدُّنْيَا وَدَآءَهَا وَدَوَآءَهَا وَاَخْرَجَهٗ مِنْهَا سَالِمًا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ ۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان

اخرجہ البیہقی فی شعب الایمان ۷/۳٤٦ حدیث رقم ۱۰۵۳۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو بندہ دنیا میں (زائد از ضرورت و

حاجت' دنیاوی مال وجاہ سے) زہد یعنی بے رغبتی اختیار کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے دل میں حکمت یعنی معرفت و یقین کی دولت پیدا فرما دیتا ہے۔ اس کی زبان سے حکمت کو جاری کر دیتا ہے اور اس کو دنیا کے عیوب (جیسے کثرت غم و رنج' قلت غناء' خست شرکاء' سرعت فنا اور ذکر الٰہی سے دل کی غفلت وغیرہ کو یقین کی آنکھوں سے) دکھلا دیتا ہے' نیز اس دنیا کی بیماری (یعنی دنیاوی محبت کی علت وسبب) اور (علم و عمل' صبر و قناعت اور زہد و تقویٰ اور رضا قضاء کی توفیق عطا فرما کر) اس بیماری کا علاج بھی اس کو دکھلاتا ہے (اور اس کے دنیا سے اعراض کرنے اور عقبیٰ کی طرف متوجہ رہنے کے سبب) اللہ تعالیٰ اس کو دنیا (کی آفات و بلیات) سے سلامتی کے ساتھ دار السلام میں پہنچا دیتا ہے''۔ (بیہقی)

تشریح: قوله: يصره عيب الدنيا ودائها ودواءها وبصره)''صاد'' کی تشدید کے ساتھ بصیرت سے ماخوذ ہے۔ یعنی معائنہ کرا دیتے ہیں دنیا کے عیوب کا مثلاً کثرت غم و رنج، قلت غناء' شرکاء کا گھٹیاپن، جلدی فنا ہونا اور دوسرے عیوب مثلاً بدن کی تھکاوٹ' غموں کی کثرت اور دل کا اللہ کے ذکر سے غافل ہونا۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دوسرے درجہ کی طرف اشارہ ہے' یعنی جب انسان کو دنیا کے عیوب کا علم الیقین حاصل ہو جاتا ہے۔ اور دنیا سے بے رغبتی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے بصیرت عطا فرماتے ہیں جس کی وجہ سے دنیا کے عیوب کا عین الیقین حاصل ہو جاتا ہے۔

یعنی دنیا کو چاہنے اور طلب کرنے کی بیماری اس کو دکھادی جاتی ہے۔

ودائها: اس کی آزمائش کی علت اور طلب کرنے کی

ودوائها: یعنی علم و عمل کے معجون سے علاج اور صبر و قناعت اور اللہ کی تقسیم پر راضی ہو کر اس کی آزمائش سے بچ جانا۔

قوله: أخرجه منها سالما الى دار السلام :سالما: دنیا سے اعراض کرتا ہوا اور آخرت کی طرف توجہ کرتا ہوا دار السلام میں پہنچا دیا گیا۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جو دنیا میں بے رغبتی نہ کرے۔ اس کے عیب بیماری اور دوا پر مطلع نہ ہو۔ تو وہ شخص یا تو جنت میں بالکل داخل نہ ہوگا یا سلامتی کے ساتھ داخل نہ ہوگا بلکہ عذاب بھگت کر اور تکالیف کا حجاب لاحق ہونے کے بعد۔

تخریج: ابونعیم نے حلیہ میں ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے:

مازان الله العباد بزينة أفضل من زهادة في الدنيا وعفاف في بطنه وفرجه۔

''اللہ تعالیٰ نے بندوں کو دنیا کی بے رغبتی اور پیٹ اور شرمگاہ میں پاکدامنی سے جتنی زینت زیادہ افضل اسی اور چیز سے اپنے بندوں کو زینت نہیں بخشی۔''

۵۲۰۰ : وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَخْلَصَ اللّٰهُ قَلْبَهُ لِلْاِيْمَانِ وَجَعَلَ قَلْبَهُ سَلِيْمًا وَلِسَانَهُ صَادِقًا وَنَفْسَهُ مُطْمَئِنَّةً وَخَلِيْقَتَهُ مُسْتَقِيْمَةً وَجَعَلَ اُذُنَهُ مُسْتَمِعَةً وَعَيْنَهُ نَاظِرَةً فَاَمَّا الْاُذُنُ فَقَمْعٌ وَاَمَّا الْعَيْنُ فَمُقِرَّةٌ لِمَا يُوْعِي الْقَلْبُ وَقَدْ اَفْلَحَ مَنْ جَعَلَ قَلْبَهُ وَاعِيًا۔

(رواه احمد والبيهقي في شعب الايمان)

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ١٣٢/١ حديث رقم ١٠٨ واحمد في المسند ١٤٧/٥۔

ترجمہ: ''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ شخص حقیقتاً کامیاب ہوگیا جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے (نفاق کی آمیزش سے پاک کرکے) ایمان کے لئے خالص کردیا اور اس کے دل کو (تمام دل کی بیماریوں سے) سلامتی عطا فرمائی اس کی زبان کو راست گو بنایا اس کے نفس کو (ذکر اللہ اور محبت الٰہیہ سے مطمئن فرمایا اس کی خلقت و طبیعت کو (کجی و باطل کی طرف مائل اور افراط و تفریط میں مبتلا ہونے سے بچا کر) اور سیدھا رکھا اس کے کانوں کو (حق بات کا) سننے والا بنایا اور اس کی آنکھوں کو (وحدانیت کے دلائل و مشاہدات اور پروردگار کے نظام قدرت و صنعت کا) دیکھنے والا بنایا پس کان تو ''قیف'' ہیں اور آنکھ اس چیز کو قائم اور ثابت رکھنے والی ہے جس کو دل محفوظ کرتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شخص فلاح یاب ہوا جس نے اپنے دل کو (حق کا) محافظ بنایا۔

تشریح: قوله: قدا فلح من اخلص الله قلبه للايمان: یعنی اُسکے دل کو ایمان کیلئے اس طرح خالص کردیتے ہیں کہ دوسری چیز کی اس میں نہ گنجائش ہے اور نہ دوسری کوئی چیز اس کے بعد وارد ہوسکتی ہے۔

قوله: وجعل قلبه سليما ..... وخليقة مستقيمة: حسد، کینہ، بغض، برے اخلاق اور دوسرے بُرے احوال مثلاً دنیا کی محبت، اللہ سے غفلت اور آخرت سے بے توجہی ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يوم لاينفع مال ولابنون الامن اتى الله بقلب سليم﴾ [الشعراء: ۸۸-۸۹]

ولسانه صادقا: قول میں، وعدہ میں اور عہد میں

''خليقه'' وہ عادت جس پر اس کو پیدا کیا گیا ہے۔ اُن عوارض سے قطع نظر کرکے جن کو فطرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قوله: وجعل اذنه مستمعة وعينه ناظرة:

''اذنة'' ہمزہ اور ''ذال'' دونوں کے ضمہ کے ساتھ اور ''ذال'' کو ساکن پڑھنا بھی درست ہے۔ ک

قوله: فأما الاذن فقمع: ''فاما'' ''فاء'' عاطفہ ہے اور شاید معطوف علیہ مقدر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں پہلے ذکر کی گئیں یعنی دل، زبان وغیرہ ان کا کامیابی اور نجات کیلئے شرط ہونا تو ظاہر ہے۔

قمع: ''قاف'' کا فتحہ اور میم کا سکون بھی درست ہے۔ اور ''قاف'' کا کسرہ اور میم کا سکون اور فتحہ بھی درست ہے۔ قاموس میں ہے کہ '' القمع'' فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ''عنب'' کے وزن پر ہے۔ اس کا معنی ہے وہ چیز جس کو برتن کے منہ پر رکھتے ہیں تاکہ اس سے تیل وغیرہ ڈالا جائے۔ اور نہایہ میں ہے کہ ''القمع'' (قیف) ایک نلکی دار برتن ہوتا ہے جس کو تنگ منہ والے برتن مثلاً بوتل وغیرہ کے منہ پر رکھ کر مائع چیز تیل اور پانی وغیرہ ڈالا جاتا ہے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں وہ لوگ جو بات کو کانوں سے سُن کر دلوں میں محفوظ کرلیتے ہیں۔ ان کے کانوں کو ''اقماع'' کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

قوله: واما العين فمقرة لما يوعى القلب :

مقرة: ''میم'' مضموم ''قاف'' مکسور اور ''را'' مشدد ہے۔ اصل نسخوں میں اس طرح ہے۔ اور اکثر نسخوں میں دونوں مفتوح ہیں اور یہ زیادہ ظاہر ہے۔

''اَلقلب'': مرفوع ہے اور بعض نسخوں میں منصوب ہے۔ اس سے اصل نسخہ کی عبارت کی تائید ہوتی ہے۔ اور ''یوعی'' کے مناسب یہی ہے۔

طیبی فرماتے ہیں کہ آپ کا قول ''فمقر ۃ'' میں استعارہ ہے۔ اس لئے کہ قلب میں وہ چیز قرار پکڑتی ہے جس کا حاسہ سے ادراک کیا ہو گویا کہ دل ایک برتن ہے اور اس میں وہ چیزیں محفوظ ہوتی ہیں جن کو آنکھوں سے دیکھا ہے۔

اساس البلاغۃ میں ہے کہ (''قر الکلام فی اذنہ'' یہ مجازاً اس معنی میں ہے کہ فلاں کے کان پر اپنا منہ رکھا اور بات سنائی اور یہ ''قر الماء فی الاناء'' سے ماخوذ ہے۔ یہ جملہ اُس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی برتن میں پانی اُنڈیلے۔

''قلب'' فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔ اور نصب کا احتمال بھی ہے۔ اس وقت معنی یہ ہوگا کہ دل میں قرار پکڑتی ہے یعنی دل اس کو محفوظ کر لیتا ہے۔ خاص طور پر کان اور آنکھ کا ذکر اس لئے کیا کہ اللہ کی وحدانیت پر دلالت کرنے والی نشانیاں یا تو سمعی ہیں (یعنی سننے سے تعلق رکھتی ہیں) تو کان ان کو سن کر دل کو اُسکے لئے برتن بنا دیتے ہیں۔ اور یا دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ تو آنکھیں اُنکو دیکھ کر دل میں پہنچاتی ہیں۔ اور دل کو ان کے لئے برتن بنا دیتے ہیں۔

قولہ: وقد افلح من جعل قلبہ واعیا:

میں کہتا ہوں کہ اسی پر علم کے آلات اور اسباب ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ [الاسراء:۳۶]

''کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب کی (قیامت کے دن) پوچھ ہوگی''۔

''سمع'' کو مقدم کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ''عُمدہ'' وہ علوم شرعیہ ہیں جو ایسے سماعی دلائل سے حاصل کیے جاتے ہیں جو علم یقین پیدا کر دیتے ہیں۔ پھر غور و فکر کے مرتبہ تک ترقی کر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ علم ''عین الیقین'' بن جاتا ہے اور دل پر انتہا ہوتی ہے۔ اور دل اللہ کا عرش ہے۔ اور اس کے ذریعے ''حق الیقین'' کے کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کے درجات میں یقین کے وہ تمام مراتب نصیب فرمائیں جن کو اللہ نے اس آیت میں بیان فرمایا: [**واعبد ربك حتى ياتيك اليقين**] [الحجر:۹۹] ''اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہنا یہاں تک کہ آپ کو موت آ جائے''۔

اور یقین کے عبادت کی غایت و انتہا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یقین کے حاصل ہونے کے بعد ترک عبادت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ میت کو غاسل (نہلانے والے) کے سامنے رکھنے کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: **موتوا قبل ان تموتوا** ''(موت سے پہلے مر جاؤ) اسی وجہ سے تمام مفسرین فرماتے ہیں کہ یقین سے مراد موت ہے۔ اور یہ کتنی اچھی موت ہے جو بعینہٖ زندگی ہے۔ اللہ ہمیں اس کا کچھ ذائقہ جو شوق کی حلاوت کے ساتھ ہو نصیب فرمائے۔

۵۲۰۱ : وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا رَاَيْتَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يُعْطِي الْعَبْدَ مِنَ الدُّنْيَا عَلٰى مَعَاصِيْهِ مَايُحِبُّ فَاِنَّمَا هُوَ اِسْتِدْرَاجٌ ثُمَّ تَلَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا نَسُوْا مَاذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا بِمَا اُوْتُوْا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً

فَاِذَاھُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۔ (رواہ احمد)

اخرجه احمد فی المسند ٤/١٤٥۔

ترجمہ: ''حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو اس کے گناہ و معصیت میں مبتلا ہونے کے باوجود اس کی محبوب ترین چیزیں (یعنی مال و جاہ وصحر اور لمبی عمر وغیرہ) دیتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ (یعنی اس کو اس کی محبوب ترین چیزیں دینا) استدراج ہے۔ اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے بطور استشہاد یہ آیت تلاوت فرمائی: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ...... ۔'' جب کافر اس نصیحت کو بھول گئے جو انہیں کی گئی تھی (یعنی اللہ تعالیٰ کا عہد، یا یہ کہ جب انہوں نے حق تعالیٰ کی نافرمانی کی) تو ہم نے ان پر (دنیا کی نعمتوں کی) ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں پر خوش ہوئے جو انہیں دی گئی تھیں (یعنی جاہ و دنیوی عیش وعشرت وغیرہ ہم نے ان کو (اپنے عذاب میں) پکڑ لیا اور وہ نہایت حیران و ناامید ہو گئے''۔ (احمد)

تشریح: قوله: اذا رأیت الله عز وجل ۔۔۔ فانما هو استدراج:

مراد ہے اللہ کی طرف سے ایک مہلت اور حیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿سنستدرجهم من حيث لا يعلمون﴾ [الاعراف ۔ ۱۸۲]

ترجمہ: ''ہم اُنکو بتدریج (جہنم کی طرف) لئے جا رہے ہیں اس طور پر کہ اُنکو خبر بھی نہیں''۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''استدراج کا معنی ہے کسی کام کو شروع کر کے اس کام میں درجہ بدرجہ آگے بڑھنا' جیسا کہ چڑھنے والا چڑھتے ہوئے ایک ایک سیڑھی پر ترتیب وار چڑھتا ہے اور اسی طرح اُترنے والا اُترتے ہوئے کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے استدراج کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی معصیت کے باوجود اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں دے کر آہستہ آہستہ ہلاکت کی طرف بڑھاتا ہے اور ان کیلئے آخرت کے عذاب کو اس طرح بڑھاتا رہتا ہے کہ ان کو اس کا شعور نہیں ہوتا۔ اور یہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ وقفہ وقفہ سے اپنی نعمتیں دیتا ہے۔ اور یہ لوگ سرکشی میں منہمک ہوتے ہیں جب اللہ نئی نعمت بھیجتے ہیں ان لوگوں میں سرکشی بڑھتی جاتی ہے۔ اور نئے نئے انداز میں نافرمانی کرتے ہیں اور لگاتار نعمتوں کی وجہ سے نافرمانی میں درجہ بدرجہ بڑھتے ہیں۔ اور ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پے در پے نعمتوں کا آنا اللہ کی طرف سے اکرام اور اللہ کا قرب ہے۔ حالانکہ یہ اللہ کی طرف سے رسوائی اور دُوری ہوتی ہے۔

قوله: ثم تلا رسول الله ﷺ الخ: فلمانسوا یعنی اللہ کے عہد و اللہ کے امر اور نہی کی پرواہ نہ کی۔

فتحنا تخفیف اور تشدید دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

اخذناهم بغتة: اچانک موت یا عذاب میں اس حالت میں عذاب زیادہ شدید محسوس ہوتا ہے۔

مبلسون: غمگین خاموش حسرت والے پریشان حال نا اُمید۔

تخریج: اور جامع میں ان سے یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے:

اذا رأیت الله یعطی العبد من الدنیا مایحب وهو مقیم علی معاصیه فانماذالك منه استدراج۔

اس کو طبرانی، احمد اور بیہقی نے نقل کیا ہے۔

۵۲۰۲ : وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَجُلاً مِنْ اَهْلِ الصُّفَّةِ تُوُفِّیَ وَتَرَكَ دِیْنَارًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَیَّةٌ قَالَ ثُمَّ تُوُفِّیَ اٰخَرُ فَتَرَكَ دِیْنَارَیْنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ كَیَّتَانِ ۔

رواه احمد والبیهقی فی شعب الایمان

اخرجه احمد فی المسند ٥/٢٥٨ والبیهقی فی شعب الایمان ٥/٣٦٤ حدیث رقم ٦٩٦٤۔

ترجمہ: ''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اصحاب صفہ میں سے ایک شخص وفات پا گئے اور (بطور ترکہ) ایک دینار چھوڑا۔ رسول کریم ﷺ نے (جب اس دینار کو دیکھا تو) فرمایا کہ ''یہ دینار (اس شخص کی پیشانی، پشت اور پہلو پر) ایک داغ ہے''۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر (کچھ دنوں بعد) صفہ والوں میں سے ایک اور شخص نے وفات پائی اور اس نے (بطور ترکہ) دو دینار چھوڑے، نبی کریم ﷺ نے ان (دیناروں کو) دیکھ کر فرمایا۔ یہ دو دینار دو داغ ہیں'' ۔(احمد، بیہقی)

تشریح: قوله: ان رجلا من اهل الصفة توفی وترك دینار افقال رسول الله كیة:

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''رجل'' کو اس صفت کے ساتھ موصوف کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ متصل حکم کیلئے یہ صفت علت ہے۔ یعنی اس شخص کا اُن فقراء کی طرف منسوب ہونا جو دنیا میں بے رغبت تھے۔ حالانکہ دینار یا دو دینار پاس تھے۔ ایک جھوٹا دعویٰ تھا۔ جس کی وجہ سے عقاب کا مستحق تھا۔ ورنہ تو بہت سارے صحابہ مثلاً عثمان بن عفانؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ اور طلحہ بن عبید اللہؓ مال کماتے تھے اور اس میں تصرف کرتے تھے۔ چونکہ اعراض کرنا، افضل چیز کو اختیار کرنا ہے۔ (وگرنہ ورع اور زہد فی الدنیا) کے حکم میں داخل ہوگا۔ اور اس میں اقناع برتنا مباح و مرخص ہے اور وہ شخص قابل مذمت ہے ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔

توفی: مجہول کے صیغہ کے ساتھ بعض نے معروف کا صیغہ بھی جائز قرار دیا ہے۔

''کیة'' ای هو کیة مبالغہ کیلئے یا داغ کا سبب ہے یا داغ کا آلہ ہے۔ اور آخری قول زیادہ راجح ہے۔ کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿یوم یحمی علیها فی نار جهنم فتکوی بها جباههم﴾ [التوبة :٣٥] الآیة

''ان کو دوزخ کی آگ میں (اول) تپایا جائے گا پھر ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں کو داغ دیا جائے گا''

اس مقام میں مقصود کی وضاحت اس طرح ہے کہ یہ دونوں اُن فقراء کے ساتھ رہتے تھے جن کو لوگ صدقہ دیا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ فقراء بہت زیادہ محتاج تھے اور ان پر فاقہ بہت زیادہ ہوتا تھا اور گویا کہ یہ لوگ قولاً یا حالاً سوال کرنے والے تھے اور اُس شخص کیلئے سوال کرنا جائز نہیں جس کے پاس موجودہ دن کیلئے بقدر ضرورت روزی ہو۔ ان دونوں کے پاس دینار موجود تھا اور پھر بھی سوال کیا جو کہ حرام ہے۔ اسی طرح ہر وہ شخص جو پرانے پھٹے کپڑے پہن لے یا گداگروں کی ہیئت اختیار کرے اور اس کے پاس کچھ نقدی یا نقدی کے قائم مقام کچھ ہو اور لوگوں سے کچھ لے اور کھائے تو یہ حرام ہے۔ اسی طرح جو اپنے آپ کو عالم یا دیندار ظاہر کرے اور حقیقت میں اس طرح نہ ہو۔ اور کوئی اس کو اس کے علم یا دینداری یا شرافت کی وجہ سے کچھ دے تو یہ اُسکے

لئے حرام ہے۔

حکایت: کسی نے حکایت بیان کی ہے کہ شیخ ابو اسحاق کازرونی رحمہ اللہ نے فقراء کی ایک جماعت کو دیکھا جو ایسا کھانا کھا رہے تھے۔ جو مستحقین کیلئے رکھا گیا تھا۔ تو فرمایا اے حرام کھانے والو! کھانے سے باز آ جاؤ۔ اور فرمایا جس شخص کے پاس کچھ دنیا بھی نہ ہو وہ تو کھائے ورنہ نہ کھائے۔ چنانچہ بعض کھاتے رہے اور بعض رُک گئے۔ فرمایا سبحان اللہ! ایک ہی کھانا بعض کیلئے حلال ہے اور بعض کیلئے حرام۔

لہٰذا اہل حرمین شریفین اعزھما اللہ کو احتیاط کرنی چاہیے کہ کوئی ایسا شخص جو شرعی غنی ہو وہ مال نہ کھائے جو فقراء کیلئے وقف کیا گیا ہے۔ اسی طرح جو مکانات اور کمرے مساکین کی رہائش کیلئے بنائے گئے ہیں ان میں مالداروں کا رہائش اختیار کرنا حرام ہے۔

ابن ھمام رحمہ اللہ نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ غنی کیلئے حرام ہے کہ خانقاہوں کے رہائشی صحروں میں مفت رہائش اختیار کرے۔ اور کوئی بھی اس بات سے دھوکہ نہ کھائے جو مشہور ہو چکی ہے کہ حرمین کے وقف کی اشیاء فقیر اور غنی دونوں کیلئے عام ہیں۔ کیونکہ ایسا ہو تو ہمارے نزدیک اُن اغنیاء کیلئے وقف کرنا جائز نہیں جو محصور نہ ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے امام اعظم اور عظیم پیشوا اگر اس زمانہ میں ہوتے اور اس جگہ کے رہائشی لوگوں کا مشاہدہ کرتے تو اُن کے ساتھ پڑوس میں رہائش کی حرمت کا فتویٰ دیتے جبکہ پہلے زمانہ میں صرف کراہت کا فتویٰ دیا ہے۔ اس لئے کہ اس مشرف مکان کا احترام اور تعظیم بہت کم ہی افراد کرتے ہیں اور اتنے تھوڑے افراد کا اعتبار نہیں ہوتا۔

۵۲۰۳ : وَعَنْ مُعَاوِيَةَ اَنَّهٗ دَخَلَ عَلٰى خَالِهٖ اَبِيْ هَاشِمِ بْنِ عُتْبَةَ يَعُوْدُهٗ فَبَكٰى اَبُوْ هَاشِمٍ فَقَالَ مَا يُبْكِيْكَ يَاخَالُ اَوَجَعٌ يُّشْئِزُكَ اَمْ حِرْصٌ عَلَى الدُّنْيَا قَالَ كَلَّا وَلٰكِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَهِدَ اِلَيْنَا عَهْدًا لَمْ اٰخُذْ بِهٖ قَالَ وَمَا ذٰلِكَ قَالَ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ اِنَّمَا يَكْفِيْكَ مِنْ جَمْعِ الْمَالِ خَادِمٌ وَمَرْكَبٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاِنِّيْ اُرَانِيْ قَدْ جَمَعْتُ۔(رواه احمد والترمذی والنسائی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٨٨ حديث رقم ٢٣٢٧، والنسائی فی السنن ٨/٢١٨ حديث رقم ٥٣٧٢ وابن ماجه فی السنن ٢/١٣٧٤ حديث رقم ٤١٠٣ واحمد فی المسند ٥/٢٩٠۔

ترجمہ: ''حضرت معاویہ بن سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ (ایک دن) اپنے ماموں حضرت ابو ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ کے پاس ان کی عیادت کو گئے تو حضرت ابو ہاشم رضی اللہ عنہ (ان کو دیکھ کر) رونے لگے' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ ماموں جان! کون سی چیز آپ کو رلا رہی ہے؟ کیا بیماری (کی شدت) آپ کو اضطراب میں مبتلا کر رہی ہے یا دنیا کی حرص و تمنا؟'' انہوں نے فرمایا (عزیز من! تم نے جو کچھ کہا ہے) ایسا ہرگز نہیں ہے' بلکہ (وجہ اضطراب یہ ہے کہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم (صحابہؓ) کو ایک وصیت کی تھی اور میں اس پر عمل کرنے سے قاصر رہا ہوں! معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ وہ وصیت کیا تھی؟ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تمہارے لئے دنیا کے مال میں سے بس اس قدر جمع کرنا کافی ہے کہ تمہارے پاس ایک خادم ہو اور حق تعالیٰ کی راہ میں (لڑنے کے لئے) ایک سواری

ہو"۔ اور میرا خیال ہے کہ میں نے (ان دونوں چیزوں سے کہیں زیادہ مال واسباب) اپنے پاس رکھا ہوا ہے"۔
(احمد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)

تشریح: قوله:عن معاوية أنه ذخل على خاله ابى هاشم بن عتبة يعوده:

"يعوده" : حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔

قوله:ما يبكيك يا حال؟۔۔۔حرص على الدنيا:ياخال)"لام" کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں "لام" کے ضمہ کے ساتھ ہے "یاغلام" کی طرح ہے۔

يشزئك:"یا" کے ضمہ اور "ہمزہ" کے کسرہ کے ساتھ یعنی کس چیز سے بے قرار اور پریشان ہو کر رورہے ہو۔ قاموس میں لکھا ہے کہ مشئنز شازاً کا معنی ہے بڑھ گیا سخت ہو گیا۔ اور "اشازہ" کا معنی ہے بیقرار کرنا۔

ام حرص على الدنيا: یعنی حرص تجھے بے قرار کر رہی ہے اور رُلا رہی ہے۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ یہ پریشانی یا تو ظاہری بیماری کی سختی کی وجہ سے ہے' یا معنوی عرض کی وجہ سے ہے۔ اور دونوں ظاہری اور باطنی دشواری کا باعث ہیں۔

قوله:قال كلا...... : چھوڑ دو اپنا گمان' یعنی ان میں سے کوئی چیز میرے رونے کا باعث نہیں۔ اور عہد سے مراد عام و میت ہے یا خصوصی بیعت۔

ما ذالك:ایک نسخہ میں "وماذاك" ہے۔

قوله:قام سمعته يقول...... :

انی اوانی ہمزہ مضموم ہے۔ (یعنی میرا گمان ہے)۔ اور ایک نسخہ میں ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ (یعنی میں دیکھتا ہوں یا مجھے یقین ہے۔)

قدجمعت: اپنے عہد سے زیادہ۔ طیبی رحمہ اللہ نے عجیب بات فرمائی ہے کہ اس کے متعلق کو حذف کیا تا کہ مال کی انواع کی کثرت پر دلالت کرے۔

۵۲۰۴ : وَعَنْ اُمِّ الدَّرْدَاءِ قَالَتْ قُلْتُ لِاَبِی الدَّرْدَاءِ مَالَكَ لَاتَطْلُبُ كَمَا يَطْلُبُ فُلَانٌ فَقَالَ اِنِّی سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اَمَامَكُمْ عَقَبَةً كَؤُدًا لَا يَجُوْزُ هَا الْمُثْقِلُوْنَ فَاُحِبُّ اَنْ اَتَخَفَّفَ لِتِلْكَ الْعُقْبَةِ۔

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ٣٠٩/٧ حديث رقم ١٠٤٠٨۔

ترجمہ: "حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ (ایک دن) میں نے (اپنے شوہر) حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے کہا آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ (حضور اکرم ﷺ سے یا صحابہ کرام سے مال ومنصب) نہیں مانگتے جیسا کہ فلاں فلاں لوگ مانگتے ہیں؟ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے (یہ سن کر) جواباً فرمایا کہ (میں کسی سے اس کا مطالبہ کرنے سے اس لئے اجتناب کرتا ہوں کہ) میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے خبردار تمہارے سامنے ایک دشوار گزار گھاٹی ہے"

اس سے وہ لوگ (آسانی اور سہولت کے ساتھ) نہیں گزر سکتے جو گرانبار ہیں"۔ چنانچہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ (مال و دولت کے بوجھ سے) ہلکا رہوں تا کہ اس گھاٹی سے (گزرنے کے لئے ہلکا رہوں"۔

تشریح: فقال: انی: ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اور ہمزہ کا فتحہ بھی دُرست ہے اُس وقت تقدیری عبارت "لانی" ہو گی۔

"امامکم" ہمزہ مفتوح ہے۔ یہ ظرف ہے اور خبر مقدم ہے۔

"عقبۃ" عین اور "قاف" دونوں مفتوح ہیں۔ پہاڑوں کے درمیان دُشوار گزار گھاٹی قاموس میں اسی طرح لکھا ہے۔

کؤدا "کاف" مفتوح، ہمزہ مضموم پھر واؤ اور اُسکے بعد "دال"۔ یعنی دُشوار جو تمہارے اور جنت کے درمیان آڑے ہے، طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد موت، قبر، حشر اور ان کی ہولناکیاں اور سختیاں ہیں۔ ان کو گھاٹی کے ساتھ گھاٹی کو عبور کرنے میں آنے والی دُشواریوں میں تشبیہ دی۔

المثقلون: باب افعال سے ہے۔ یعنی مال کے بوجھ اور وسعت حال اور جاہ کی مشقت کو اُٹھایا ہو گا۔ اس لئے بعض نے کہا ہے کہ "ہلکے لوگ کامیاب ہو گئے اور بوجھل لوگ ہلاک ہو گئے"۔

۵۲۰۵ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ مِنْ اَحَدٍ يَمْشِيْ عَلَى الْمَآءِ اِلَّا ابْتَلَّتْ قَدَمَاهُ قَالُوْا لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَذٰلِكَ صَاحِبُ الدُّنْيَا لَا يَسْلَمُ مِنَ الذُّنُوْبِ ۔(رواهما البيهقي في شعب الايمان)

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۷/۳۲۳ حديث رقم ۱۰۴۵۷۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن، مجلس نبوی ﷺ میں موجود صحابہؓ سے) رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، کیا کوئی شخص پانی پر اس طرح چل سکتا ہے کہ اس کے پاؤں گیلے نہ ہوں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ایسا تو ممکن نہیں! حضور ﷺ نے فرمایا: دنیا دار بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ گناہوں سے محفوظ و سلامت نہیں رہ سکتا"۔ (ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: هل من احد يمشي على الماء الا بتلت قدماه: هل يمشي على الماء في حال من الاحوال الافي حال الابتلال۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں متقین کیلئے خطرناک وعید ہے۔ اور دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کو دُنیا پر ترجیح دینے کی بڑی ترغیب ہے اور وعید کیلئے اتنی بات کافی ہے کہ فقراء جنت میں اغنیاء سے پانچ سو برس پہلے داخل ہونگے۔ اللہ اپنے کرم اور فضل سے ہمارے ساتھ بھی عافیت والا معاملہ فرمائے۔

تخریج: پہلی حدیث کو حاکم نے بھی نقل کیا ہے امام میرک نے منذریؒ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ حضرت اُم درداءؓ کی حدیث کو طبرانیؒ نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے اور اس کو بزارؒ نے حضرت ابو درداءؓ سے سند حسن کے ساتھ مرفوعاً یوں نقل کیا ہے:

ان بین ایدیکم عقبۃ کوء ودالا ینجومنھالا کل مخف

۵۲۰۶ : وَعَنْ جُبَیْرِ بْنِ نُفَیْرٍ مرسَلاً قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنْ اَجْمَعَ الْمَالَ وَاَکُوْنَ مِنَ التَّاجِرِیْنَ وَلٰکِنْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنْ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَکُنْ مِنَ السّٰجِدِیْنَ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ ۔ (رواہ فی شرح السنۃ وابو نعیم فی الحلیۃ عن ابی مسلم)

اخرجہ البغوی فی شرح السنۃ ۱۴/۲۳۷ حدیث رقم ۴۰۳۶۔

ترجمہ: ''حضرت جبیر بن نفیر (تابعیؒ) بطریق ارسال روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھ پر یہ وحی نازل نہیں ہوئی ہے کہ میں دولت جمع کروں اور تاجر بنوں بلکہ مجھ پر یہ وحی نازل ہوئی ہے کہ ''آپ ﷺ اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کیجئے اور سجدہ کرنے والوں (یعنی نمازیوں) میں سے بنیں۔ اور اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہئے یہاں تک کہ آپ ﷺ (حیاۃ طیبہ) کا آخری وقت آجائے''۔ اس حدیث کو بغوی نے شرح السنہ میں اور ابونعیم نے کتاب حلیہ میں ابو مسلمؒ سے نقل کیا ہے''۔

تشریح: **قولہ: قال رسول اللہ ﷺ ما اوحی ---- واکون من التاجرین: ان اجمع المال** ''ان'' مصدریہ ہے اور ''باء'' مقدر ہے۔

واکون کا اس پر عطف ہے۔

قولہ: ولکن اوحی الی......:

''ان وحی میں قول کا معنی ہے' ان اُسکی تفسیر کرتا ہے۔

بحمد ربك جار مجرور ''مقرونا'' کے متعلق ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اُن اُمور سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کریں جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں ہیں' اور صفات جلال و جمال کو بیان کر کے اللہ کی ثنا بیان کریں۔

وکن من الساجدین: نماز پڑھنے والوں میں، نماز کا ایک رکن ذکر کیا مگر پوری نماز مراد ہے۔ جزء بول کر مجازاً کل مراد لیا گیا ہے۔

سجدہ کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ''بندہ نماز میں اللہ کے سب سے زیادہ قریب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے۔''

واعبد ربك: تخصیص کے بعد تعمیم ہے۔ چاہے عبادت کا حکم مقصود ہو چاہے بندگی کرنے کا حکم مقصود ہو۔

حتی یاتیك الیقین: تمام مفسرین کے نزدیک ''یقین'' سے مراد موت ہے حدیث میں قرآن کی آیات: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَکُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ﴾ سے اقتباس ہے۔

مؤلف فرماتے ہیں کہ مراد ابو مسلم خولانی ہیں جو بڑے زاہد تھے ان کی ملاقات ابوبکر، عمر اور معاذ سے ہوئی ہے۔ اور

جبیر بن نفیر، عروہ اور ابوقلابہ نے ان سے روایات نقل کی ہیں۔ ان کے مناقب بہت زیادہ ہیں۔ ۶۰ ھ میں فوت ہو گئے۔ ممکن ہے کہ یہ حدیث جبیر عن ابی مسلم کی سند سے مروی ہو اور یہ بھی ممکن کہ دوسری سند سے مروی ہو۔

۵۲۰۷ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ الدُّنْیَا حَلَالًا اِسْتِعْفَافًا عَنِ الْمَسْئَلَةِ وَسَعْیًا عَلٰی اَهْلِهٖ وَتَعَطُّفًا عَلٰی جَارِهٖ لَقِیَ اللّٰهَ تَعَالٰی یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَوَجْهُهٗ مِثْلُ الْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ وَمَنْ طَلَبَ الدُّنْیَا حَلَالًا مُكَاثِرًا مُفَاخِرًا مُرَائِیًا لَقِیَ اللّٰهَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَعَالٰی وَهُوَ عَلَیْهِ غَضْبَانُ۔ (رواه البيهقي في شعب الايمان وابو نعيم في الحلية)

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۲۹۸/۷ حديث رقم ۱۰۳۷۵ وابونعيم في الحلية ۲۱۵/۸۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی سے سوال کرنے کی ذلت سے بچنے' اپنے اہل وعیال کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے اور اپنے ہمسایہ پر مہربانی کرنے کی خاطر جائز وذرائع سے دنیا کو حاصل کرے' وہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کا چہرہ انتہائی مسرت اور نورانیت کی بناء پر چودھویں رات کے چاند کی مانند ہوگا اور جو شخص مال و دولت میں اضافہ کرنے (غرباء وفقراء پر) فخر کرنے' اور (محض اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کے لئے) نام ونمود کی غرض سے (حرام وسائل تو الگ رہے) جائز ذرائع سے (بھی) دنیا کو حاصل کرے تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضب ناک ہوگا'' اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں ابونعیم نے کتاب حلیہ میں نقل کیا ہے''۔

تشریح: **قوله: من طلب الدنيا حلالا ـــــ وجهه مثل القمر ليلة البدى:**

نہایہ میں ہے کہ '' استعفاف'' کا معنی ہے ''عفت طلب کرنا' اور ''عفت'' کا معنی ہے حرام سے بچنا اور لوگوں سے سوال کرنے سے بچنا۔

وسعيا على اهله اپنے ان عیال کیلئے جن کا خرچہ اس پر واجب ہے۔

وتعطفا على جاره اپنے سے زائد مال کے ذریعے پڑوسی پر احسان کرنے کیلئے۔

مثل القمر ليلة البدر اس کی حالت یہ ہوگی کہ اس کا چہرہ کمال نور اور زیادہ خوشی کی وجہ سے

مثل القمر ليلة البدر) ''لیلۃ البدر'' کے ساتھ اس لئے مقید کیا کہ یہ رات چاند کے کمال کا وقت ہے اور اس میں مخفی اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ یہ نور اس محمد مصطفیٰ ﷺ کی برکت سے ہے۔ جس پر [**طه ماانزلنا اليك القران لتشقى**] ''طٰہٰ (کے معنی تو اللہ کو معلوم ہیں) ہم نے آپ پر قرآن مجید اس لئے نہیں اتارا کہ آپ تکلیف اٹھائیں'' نازل ہوئی۔

قوله: ومن طلب الدنيا حلالا 'مكاثرا الخ: مکاثرا مال کی کثرت طلب کرے۔ تاکہ دنیا کی حالت اچھی ہو اور آخرت سنوارنے کی نیت نہ ہو۔

مرائيا: اگر بالغرض کوئی نیکی یا کوئی بخشش کرے۔

حضور علیہ السلام نے طلب حرام کا ذکر نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ یا تو بات مضمون کلام سے مفہوم ہو رہی ہے۔ یا اس بات کی

طرف اشارہ کرنے کیلئے کہ طلب حرام مسلمان کی شان نہیں ہے۔ یا یہ بتانے کیلئے کہ حرام کھانا اور حرام کے قریب ہونا دونوں حرام ہیں۔ اگرچہ حرام کو طلب نہ بھی کرے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ارشاد باری: ﴿یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ﴾ [آل عمران: ۱۰۶] کا مفہوم موجود ہے۔ چہروں کے سفید اور کالے ہو جانے سے مراد اللہ تعالیٰ کی رضا اور ناراضگی ہے۔ اور ''وجهه مثل القمر'' کے ذریعے اللہ کی رضا کے حصول میں مبالغہ بیان کیا گیا کیونکہ مقابلہ میں ''ھو علیه غضبان'' ارشاد فرمایا ہے۔

۵۲۰۸ : وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ هٰذَا الْخَيْرَ خَزَآئِنُ لِتِلْكَ الْخَزَآئِنِ مَفَاتِيْحُ فَطُوْبٰى لِعَبْدٍ جَعَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى مِفْتَاحًا لِلْخَيْرِ مِغْلَاقًا لِلشَّرِّ وَوَيْلٌ لِعَبْدٍ جَعَلَهُ اللّٰهُ مِفْتَاحًا لِلشَّرِّ مِغْلَاقًا لِلْخَيْرِ ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۱/۸۷ حدیث رقم ۲۳۸۔

ترجمہ: ''حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ خیر (یعنی مال و دولت کے ڈھیر) خزانے ہیں اور ان خزانوں کی کنجیاں ہیں۔ بشارت ہو اس شخص کو جس کو خدا نے خیر کے دروازے کھلنے اور برائی (یعنی غربا اور فقراء کی ضروریات کی پرواہ کرنے) کے دروازے بند ہونے کا سبب بنایا ہے اور (دین و دنیا کی) تباہی ہے اس بندہ کے لئے جس کو خدا نے برائی کے دروازے کھلنے اور خیر کے دروازے بند ہونے کا سبب بنایا ہے''۔ (ابن ماجہ)

تشریح: قوله: ان هذا الخير خزائن لتلك الخزائن مفاتيح: اس کی کئی انواع ہیں جن کو پوشیدہ رکھا گیا ہے۔

''تلك الخزائن'' خبر مقدم ہے اور مبتدا ''مفاتیح'' ہے یعنی اللہ کے اُن بندوں کے ہاتھوں میں جو بمنزلہ اللہ کے وکیل کے ہیں۔

خیر کو ذکر کر کے شر کو ذکر نہ کرنا، اکتفاء کے باب سے ہے۔ یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شر مخلوق لذاتہ نہیں ہے۔ اسی وجہ اللہ کا ارشاد ہے: بیده الخير [آل عمران: ۲٦]

حالانکہ تمام اُمور اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ ''خیر سارے کا سارا تیرے قبضہ میں اور شر کی نسبت تیری طرف نہیں ہے۔'' ادب کی وجہ سے اس طرح فرمایا۔ معنی یہ ہے کہ شر کی نسبت تیری طرف نہیں کی جاتی۔ ظاہر یہ ہے کہ شر خیر کو چھوڑنے سے وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا دونوں میں نسبت تضاد ہے۔ جیسا کہ نور اور ظلمت میں، عدم اور وجود میں۔

بعض آیات دلالت کرتی ہیں اس بات پر کہ شر کے خزانے بھی اللہ کے قبضہ میں ہیں۔ اُن میں ایک آیت ارشاد نبوی (فطوبیٰ لعبد جعله الله مفتاحا للخير) ہے۔

قوله: فطوبی لعبد جعله الله مفتاحا......:

خیر عمل کے اعتبار سے ہو یا علم کے اعتبار سے یا دنیا کے اعتبار سے ہو یا آخرت کے اعتبار سے

مغلاق لشر و ویل لعبد جعله الله مفتاحا للشر: کفر، نافرمانی، سرکشی، بغاوت، بخل اور بھائیوں کے ساتھ بری

معاشرت کیلئے۔

امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "خیر" سے مراد وہ اشیاء ہیں جن میں ہر ایک رغبت رکھے۔ مثلاً عقل، عدل، احسان، نفع بخش کوئی چیز اور "شر" اس کی ضد ہے۔ خیر اور شر کبھی کبھار ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں' یعنی ایک خیر دوسرے کا شر ہوتا ہے جیسا کہ مال' کہ زید کیلئے خیر کا ذریعہ ہے تو عمرو کیلئے شر کا ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے اللہ نے مال کو دونوں کے ساتھ موصوف کیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿ان ترك خيرًا﴾ [البقرہ: ۱۸۰] "بشرطیکہ کچھ مال ترکہ میں چھوڑا ہو۔" یہاں "خیر" سے مراد "مال" ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہے: ایحسبون انما نمدهم به من مال وبنين نسارع لهم في الخيرات۔ "کیا یہ لوگ یوں گمان کر رہے ہیں کہ ہم ان کو جو کچھ مال واولاد دیتے چلے جاتے ہیں تو ہم ان کو جلدی جلدی فائدہ پہنچا رہے ہیں۔"

اسی طرح علم بعض کیلئے حجاب اور سبب عذاب ہے' اور بعض کیلئے رب الارباب کے قرب کا ذریعہ ہے۔ اسی پر عبادت کو قیاس کرو۔ کیونکہ بعض اوقات عجب اور غرور پیدا کرتی ہے اور بعض اوقات نور، سرور اور خوشی کا باعث بنتی ہے۔ جس طرح کہ تلوار اور گھوڑا وغیرہ کبھی اس کو کفار کے ساتھ جہاد میں بطور آلہ جہاد استعمال کیا جاتا ہے۔ اور کبھی یہ انبیاء اور اولیاء کے قتل کا ذریعہ اور جہنم کی نچلی وادی میں پہنچنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی ایک حدیث آگے آئیگی:

الاأو ان الخير كله بحذافيره في الجنة' الا وان الشر كله بحذافيره في النار۔

"خیر ساری کی ساری جنت میں ہے۔ اور شر سارے کا سارا دوزخ میں ہے۔"

یعنی جیسی اللہ تعالیٰ نے ازلی وابدی تقسیم رکھی ہے کہ بعض کو مظاہر جلال اور بعض کو مظاہر جمال بنایا ہے۔ ارشاد باری ہے: ﴿فريق في الجنة وفريق في السعير﴾ [الشوری: ۷] اور حدیث قدسی ہے کہ "میں نے ان کو جنت کیلئے پیدا کیا اور مجھے کوئی پروانہیں اور ان کو جہنم کیلئے پیدا کیا اور مجھے کوئی پروانہیں۔" اس میں اشارہ ہے اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرف: ﴿لا يسئل عما يفعل وهم يسئلون﴾ [الانبیاء: ۲۳]

اور اللہ کے فیصلے کا سمندر ایک گہرا چوڑا سمندر ہے۔ اس میں وہی شخص غوطہ لگاتا ہے جس کو اللہ کی توفیق سے تحقیق حاصل ہو اور اس مسئلہ میں بڑے ارباب ساحل حیران ہیں اور کامل دینداری کے حامل اصحاب سفن اس سے گزر جاتے ہیں۔

تخریج: طبرانی نے اوسط میں ابو ہریرہ سے حدیث مرفوع نقل کی ہے:

ان هذا الاخلاق من الله فمن أراد الله به خيرا منحه خلقا حسنا 'و من اراد به سوءً منحه سيئاً۔

"یہ اخلاق اللہ کی طرف سے ہیں۔ جس کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے۔ اُس کو اچھے اخلاق عطا کرتا ہے۔ اور جس کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے۔ اُس کو برے اخلاق عطا کرتا ہے۔"

۵۲۰۹ : وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا لَمْ يُبَارَكْ لِلْعَبْدِ فِيْ مَالِهٖ جَعَلَهٗ فِي الْمَاءِ وَالطِّيْنِ۔

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۳۹٤/۷ حديث رقم ۱۰۷۱۹۔

ترجمہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں...

عطا نہیں ہوتی (یعنی اس کو اپنے مال و دولت کے ذریعہ اپنی آخرۃ سنوارنے کی توفیق نہیں ہوتی) تو وہ اس مال کو پانی اور مٹی میں لگا دیتا ہے یعنی اپنی دولت وضرورت سے زائد عمارتیں بنانے اور ان کی زینت وآرائش میں خرچ کرتا ہے"۔

۵۲۱۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اتَّقُوْا الْحَرَامَ فِي الْبُنْيَانِ فَاِنَّهُ اَسَاسُ الْخَرَابِ۔ رواهما البيهقي في شعب الايمان

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۷/۳۹٤ حديث رقم ۱۰۷۲۲۔

ترجمہ: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (لوگو!) تم عمارتوں میں حرام مال لگانے سے اجتناب کرو کیونکہ عمارتوں میں حرام مال لگانا (دین یا اس عمارت کی) خرابی کی بنیاد ہے"۔ ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا"۔

تشریح: جامع میں ہے: اتقوا الحجر الحرام: کہ "حرام پتھر استعمال کرنے سے بچو"۔

فانه اساس الخراب: بچے پیدا کرتے ہو جن کا انجام موت ہے۔ اور عمارتیں کھڑی کرتے ہو جن کا انجام ویرانی ہے۔ حرام کے ساتھ مقید کرنے میں کوئی خاص مقبر مفہوم نہیں ہے۔ بلکہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مال حلال کو آخرت کی بھلائی کے علاوہ کسی اور جگہ میں خرچ نہ کیا جائے۔

امام غزالی فرماتے ہیں اگر لوگ چالیس دن تک حلال کھاتے تو دنیا برباد ہو جاتی اور موجودہ نظام باقی نہ رہتا۔ اسی وجہ سے بعض کہتے ہیں: **لولا الحمقى لخربت الدنيا** (اگر بے وقوف لوگ نہ ہوتے تو دنیا برباد ہو جاتی) اور بعض نے کہا ہے کہ غفلت رحمت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**اقترب للناس حسابهم وهم في غفلة معرضون**﴾ [الانبياء ۔۱]

ترجمہ: "ان (منکر) لوگوں سے اُن کا وقت (حساب) نزدیک آ پہنچا اور یہ ابھی غفلت (ہی) میں (پڑے ہیں اور اعراض کیے ہوئے ہیں"۔

بعض تقدیری عبارت یوں بتاتے ہیں: "اسباب خراب الدين" یا "اساس خراب البنيان" پہلی عبارت تعمیر میں حلال مال خرچ کرنے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ دوسری عبارت جواز پر دلالت نہیں کرتی۔ اور دوسری عبارت باب کے زیادہ مناسب ہے۔

تخریج: طبرانی نے پہلی حدیث کو ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے مگر اس میں "لاعبد" کی جگہ "لوجل" ہے۔

۵۲۱۱: وَعَنْ عَائِشَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الدُّنْيَا دَارُ مَنْ لَّا دَارَ لَهٗ وَمَالُ مَنْ لَّا مَالَ لَهٗ وَلَهَا يَجْمَعُ مَنْ لَا عَقْلَ لَهٗ ۔۔ رواه احمد والبيهقي في شعب الايمان

اخرجه احمد في المسند ۶/۷۱ والبيهقي في شعب الايمان ۷/۳۷۵ حديث رقم ۱۰۶۳۸۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کے لئے (آخرت میں) گھر نہیں ہے اور اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہیں۔ نیز مال و دولت وہی جمع کرتا ہے جس کو عقل نہیں ہوتی"۔ (احمد، بیہقی)

تشریح: قوله: الدنیا دار من لادار له:

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں چونکہ گھر سے پہلا مقصود خوشحال قیام ہے اور دنیا میں خوشحال قیام نہیں ہوتا اس لئے دنیا گھر کہلانے کا حق نہیں رکھتی لہٰذا جو دُنیا کو اپنا گھر بنائے اُسکا کوئی گھر نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وان الدار الاخرة لهی الحیوان لو کانوا یعلمون﴾ [العنکبوت۔ ۶۴]

ترجمہ: ''اور اصل زندگی عالم آخرت ہے اگر ان کو اس کا علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے''

اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ''اے اللہ! اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔''

قوله: ومال من لامال له:

کیونکہ مال سے مقصود یہ ہے کہ نیکی اور بھلائی کے مصارف میں خرچ کیا جائے' جو شخص خواہشات پورا کرنے اور لذات حاصل کرنے میں مال ضائع کرے حق یہی ہے کہ یہ مال اُس شخص کا مال نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وما الحیاة الدنیا الامتاع الغرور﴾

ترجمہ: ''دنیا کی زندگی دھوکہ کا سامان ہے۔''

اسی وجہ سے ظرف کو اپنے عامل پر مقدم کیا۔

قوله: ولها یجمع من لا عقل له: کامل عقل یا دینی عقل اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ آخرت کے توشہ کیلئے مال محمود چیز ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿وتزودوا فان خیر الزاد التقویٰ﴾ [البقرۃ۔ ۱۹۷]

(اور جب حج کو جانے لگو) خرچ ضرور لے لیا کرو کیونکہ سب سے بڑی بات خرچ میں (گداگری سے) بچا رہنا ہے۔''

خلاصہ یہ کہ دنیا صرف اُس شخص کا گھر کہلانے کا حق رکھتی ہے جس کا کوئی گھر نہ ہو' اور اُس شخص کا مال کہلانے کا حق رکھتی ہے جس کا کوئی مال نہ ہو۔ اس کی حقارت بیان کرنا مقصود ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ جن کیلئے آخرت میں دارالقرار اور بے پناہ دولت مقدر ہے اُن کیلئے یہ دنیا گھر اور مال کہلائے جانے کے قابل نہیں ہے۔

راغب فرماتے ہیں ہر اسم نوع دو طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک استعمال یہ ہے کہ کہ مسمّیٰ پر دلالت کرے' اور دوسری شے سے تمیز کرے۔ دوسرا استعمال یہ ہے کہ اس صفت کی موجودگی کیلئے استعمال کیا جاتا ہے جو صفت اس شے کے ساتھ ہے اور اسی وصف کی وجہ سے اس شے کی تعریف کی جاتی ہے۔ چنانچہ ہر بلکہ اُس شے سے نام کی نفی کی جاتی ہے۔ جیسا کہ لوگوں کا مقولہ ہے:

فلان لیس بانسان: (فلان انسان نہیں ہے۔) یعنی اُس میں وہ وصف نہیں پایا جاتا جس کے لئے اُس کو پیدا کیا گیا تھا۔

تخریج: بیہقی نے اس حدیث کو شعب الایمان میں ابن مسعود سے موقوفاً روایت کیا ہے۔

۵۲۱۲ : وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ خُطْبَتِهِ الْخَمْرُ جُمَّاعُ الْاِثْمِ وَالنِّسَآءُ حَبَائِلُ الشَّيْطَانِ وَحُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ قَالَ وَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ اَخِّرُوْا

النِّسَآءَ حَيْثُ اَخَّرَهُنَّ اللّٰهُ ۔ (رواہ رزین)

رواہ رزین وروی عبدالرزاق فی المصنف عن ابن مسعود قوله (اخروهن حيث اخرهن الله) ۱۴۹/۳ حديث رقم ۵۱۱۵۔

''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک خطبہ کے دوران یہ فرماتے ہوئے سنا: یاد رکھو! شراب پینا' گناہوں کو جمع کرنا ہے (یعنی شراب چونکہ تمام برائیوں کی جڑ ہے اس لئے شراب پینے سے طرح طرح کے گناہ سرزد ہوتے ہیں) اور عورتیں شیطان کے جال ہیں اور دنیا کی محبت ہر گناہ کی اصل ہے''۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''عورتوں کو مؤخر کرو جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو موخر کیا ہے' (یعنی شہادت و جماعۃ اور امامۃ وغیرہ میں خدا تعالیٰ نے ان کو فضیلت نہیں دی لہٰذا تم بھی نہ دو)۔ رزین نے یہ پوری روایت نقل کی ہے''۔

قوله:الخمر جماع الاثم:

''جماع'': ''جیم'' کے کسرہ کے ساتھ یعنی ہر قسم کے گناہوں کا جامع ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اصل میں جماع کا معنی ہے وہ جو کئی سارے افراد کو جمع کرے۔ طبرانی نے ابن عباسؓ سے اس کے ہم معنی ایک حدیث مرفوع نقل کی ہے:

''شراب بے حیائی کی جڑ اور بہت بڑا گناہ ہے۔ جو اس کو پیتا ہے۔ اپنی ماں، خالہ اور پھوپھی سے بدفعلی کرتا ہے۔''

اور بیہقی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے:

''شراب بے حیائی کی جڑ اور بہت بڑا گناہ ہے۔ جو شراب پیتا ہے۔ نماز چھوڑتا ہے اور اپنی ماں، خالہ اور پھوپھی سے بدفعلی کرتا ہے۔''

کہا جاتا ہے ایک شخص سے بُت کے سامنے سجدہ کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو انکار کیا' پھر قتل کا مطالبہ کیا گیا تو انکار کیا' پھر زنا کا مطالبہ کیا گیا تو انکار کیا' پھر شراب پینے کا مطالبہ کیا گیا تو شراب پی لی۔ اور جب شراب پی لی تو وہ تمام کام کیے جن کا اس سے مطالبہ کیا گیا تھا اور اس نے انکار کیا تھا۔

قوله:النساء حبائل الشيطان:

شیطان سے مراد جنس شیطان ہے۔ یا شیطانوں کا سردار ایک نسخہ میں لفظ ''شیاطین'' ہے۔ اس پہلے احتمال کی تائید ہوتی ہے۔ ''حبائل'' کا معنی جال اور پھندا کے ہے اس کا واحد ''حبال'' ''حاء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور ''حبال'' اُس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی بھی چیز کا شکار کیا جائے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ شیطان جب بھی انسانی سے نا اُمید ہو جاتا ہے۔ تو عورت کے ذریعے سے آ کر حملہ کرتا ہے۔

قوله:وحب الدنيا راس كل خطيئة:

ہر گناہ کا سہارا اور جڑ ہے۔ اس سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے۔ کہ دُنیا کو ترک کرنا ہر عبادت کی جڑ ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جو دنیا سے محبت کرے تمام مرشدین مل کر اُسکی اصلاح نہیں کر سکتے اور جو دنیا کو ترک کرے۔ تمام مفسدین ملکر اُس کو راہ

راست سے ہٹا نہیں سکتے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تینوں جملے جوامع کلم میں سے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک علیحدہ طور پر گناہوں اور جرائم کی اصل اور دُنیا ہے۔

قوله: اخروا النساء حيث اخرهن الله:

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حیث تعلیل کیلئے ہے۔ یعنی اللہ تعالی نے ذکر، حکم اور مرتبہ میں ان کو پیچھے رکھا ہے۔ لہٰذا تم عورتوں کو ذکر، حکم اور مرتبہ میں آگے نہ رکھو۔ میں کہتا ہوں۔ کہ ہمارے اصحاب (احناف) نے اسی سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عورت کا محاذاۃ میں کھڑا ہونا باطل ہے۔ جبکہ محاذاۃ کی وہ شرائط موجود ہوں جن کو احناف نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ اور ابن الہمام نے اُنکی تحقیق کی ہے۔

تخریج: ابن الربیع کی "کتاب التمیز" میں ہے:

اخروهن حيث اخرهن الله۔ يعني النساء

ہمارے شیخ نے مصنف عبدالرزاق میں طبرانی کی سند سے اس کے ہم معنی کئی احادیث ذکر کی ہیں۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ اور پھر فرمایا کہ ہم اس کو طویل کرنا نہیں چاہتے ہمارے شیخ نے بعض کی طرف ارشارہ ہے۔ چنانچہ یہ حدیث محدثین کے ہاں مشہور ہے لیکن لغوی معنی کے اعتبار سے مشہور ہے اصطلاحی معنی کے لحاظ سے مشہور نہیں ہے۔ اسلئے کہ حدیث مشہور کا اطلاق اُس حدیث پر کیا جاتا ہے جو متواتر قطعی کے قریب ہو۔ اسی وجہ سے علامہ ابن الہمام صاحب ہدایہ کے قول "ولنا الحديث المشهور" کے بارے میں فرماتے ہیں لايثبت رفعه فضلا عن شهرته" اس حدیث کا تو مرفوع ہونا بھی ثابت نہیں ہے چہ جائیکہ مشہور ہو۔) صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر موقوف ہے، لیکن مرفوع کے حکم میں ہے۔

۵۲۱۳ : وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ مِنْهُ فِيْ شُعَبِ الْإِيْمَانِ عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلاً حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ۔

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ٣٨٨/٧ حديث رقم ١٠٥٠١۔

ترجمہ: "اور امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں حضرت حسن بصریؒ سے بطریق ارسال روایت کا صرف یہ حصہ نقل کیا ہے کہ حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ"۔ "دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔"

تشریح: قوله: وروى البيهقي عنه...... : ایک طویل حدیث سے جو متفرق جملوں پر مشتمل ہے۔

ابونعیم نے سفیان ثوریؒ کے ترجمہ میں اس کو عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کا قول بتایا ہے۔ اور ابن ابی دنیا نے اپنی کتاب "مکاید الشیطان" میں اس کو مالک بن دینار کا قول بتایا ہے۔ اسی طرح بیہقی نے "زہد" میں ذکر کیا ہے کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام کا کلام ہے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو موضوعات میں سے بتایا گیا ہے۔ اور شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے فرمایا کہ ابن مدینی نے حسن کی مرسل روایات کی تحسین کی ہے اور اس کی سند حسن ہے اور دیلمی نے اپنی مسند میں اس کو علی بن ابی طالب کی حدیث کے طور پر ذکر کیا ہے اور اس کی سند بیان نہیں۔ اور یہ قول تاریخ ابن عساکر میں سعد بن مسعود الصدفی التابعی سے "حب الدينار أس الخطايا" کے الفاظ کے ساتھ منقول ہے۔

۵۲۱۴ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَتَخَوَّفُ عَلٰى اُمَّتِى الْهَوٰى وَطُوْلُ الْاَمَلِ فَاَمَّا الْهَوٰى فَيَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ وَاَمَّا طُوْلُ الْاَمَلِ فَيُنْسِى الْاٰخِرَةَ وَهٰذِهِ الدُّنْيَا مُرْتَحِلَةٌ ذَاهِبَةٌ وَهٰذِهِ الْاٰخِرَةُ مُرْتَحِلَةٌ قَادِمَةٌ وَلِكُلِّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُمَا بَنُوْنَ فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَّاتَكُوْنُوْا مِنْ بَنِى الدُّنْيَا فَافْعَلُوْا فَاِنَّكُمُ الْيَوْمَ فِى دَارِ الْعَمَلِ وَلَا حِسَابَ وَاَنْتُمْ غَدًا فِىْ دَارِ الْاٰخِرَةِ وَلَا عَمَلَ۔

رواه البيهقي في شعب الايمان

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۷/ ۳۷۰ حديث رقم ۱۰۶۱۶۔

ترجمہ: "حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اپنی امت کے بارے میں جن دو چیزوں سے بہت زیادہ ڈرتا ہوں' ان میں سے ایک تو خواہش نفس ہے اور دوسری (اعمال صالحہ سے غفلت اور تاخیر کے ذریعہ) درازی عمر کی آرزو ہے پس نفس کی خواہش (جو حق کے مخالف اور باطل کے موافق ہوتی ہے) قبولیت حق سے روکتی ہے اور جہاں تک درازی عمر کی آرزو کا تعلق ہے تو وہ آخرت کو بھلا دیتی ہے اور خبردار یہ دنیا کوچ کر کے چلی جانے والی ہے اور آخرت کوچ کر کے آنے والی ہے (یعنی یہ دنیا لحہ بہ لحہ گزرتی چلی جا رہی ہے اور آخرت لحہ بہ لحہ تمہاری طرف چلی آ رہی ہے) نیز ان دونوں (یعنی دنیا اور آخرت) میں سے ہر ایک کے بیٹے ہیں (یعنی طلب گار ہیں) لہٰذا اگر تم سے یہ ہو سکے کہ تم دنیا کے بیٹے نہ بنو تو ایسا ضرور کرو کہ (یعنی طلب دنیا چھوڑ کر محض طالب آخرت بن جاؤ) کیونکہ تم آج دنیا میں ہو جو کام کرنے کی جگہ ہے جہاں عمل کا حساب نہیں لیا جاتا (پس اس موقع کو غنیمت جانو اور اجل آنے سے پہلے عمل کر لو) جب کہ تم کل آخرت کے گھر میں جاؤ گے تو وہاں عمل کرنے کا کوئی موقع نہیں ملے گا (بلکہ وہاں صرف محاسبہ ہوگا")۔ (بیہقی)

تشریح: قوله:ان اخوف ما اتخوف ---- فينسى الآخرة فينسى:

"الانساء" سے ہے اور تشدید بھی جائز ہے۔

اس لئے کہ اس کا ذکر اُمید کو ختم کرتا ہے اور عمل پر اُبھارتا ہے۔

قوله:هذه الدنيا مرتحلة وهذه الدنيا: جو ذہن میں متعین ہے اور حسی طور پر مفہوم ہے۔

اس طرح گزر رہی ہے کہ انسان کو احساس نہیں ہوتا۔ جیسا کہ کشتی کا سوار کشتی کی حرکت کو محسوس نہیں کرتا۔ اس لیے کہا جاتا ہے: **كل نفس خطوة الى اجل راعيها**

ذاهبة:وهذه الاخرة مرتحلة قادمة:

دنیا اور آخرت کو ایسی دو سواریوں کے ساتھ تشبیہ دی جو دو مختلف راستوں پر مختلف طریقے سے چلتی ہیں۔ اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آنے والی چیز قریب ہے۔ اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر گھڑی انسان کی زندگی کی آخری گھڑی ہو سکتی ہے۔ اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر گھڑی کو اطاعت میں گزارا جائے۔

قوله:ولكل واحدة منهما بنون:

یعنی دنیا کے ساتھ چمٹے رہنے والے محبت کرنے والے، سواری کرنے والے اور رغبت رکھنے والے۔ اور دنیا اور آخرت دونوں کو

جمع کرنا ایسی ضدین کو جمع کرنا ہے جن کا ضدین ہونا واضح ہے۔ علماء ربانی کی تحقیق اسی طرح ہے۔

قولہ: فان استطعتم ان لا تکونوا ......

اس میں دنیا کو ترک کرنے کا مکمل اہتمام ہے۔ اور آخرت کی تیاری کا اہتمام کرنے میں بے انتہا مبالغہ ہے۔ اسلئے کہ اس طرح نہیں فرمایا۔ **فان استطعتم ان تکونوا من ابناء الاخرۃ فافعلو۔** شاید اس تعبیر سے عدول اس لئے کیا کہ دنیا کی محبت ترک کرنے سے آخرت مل جاتی ہے لیکن آخرت کے حاصل ہونے سے دنیا ترک کرنا لازم نہیں آتا اس لئے کہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۙ وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ﴾ [الشوریٰ: ۲۰] ''جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے۔ اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ (اگر چاہیں) دے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔''

اور اللہ کا ارشاد ہے: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا﴾ [الاسراء ۔۱۸ ۔۱۹ ۔۲۰ ۔۲۱] ''جس کا مقصد دنیا ہوتی ہے تو ہم دنیا کے اندر جس کو مناسب سمجھتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں فوراً دیدیتے ہیں۔ پھر ہم نے اس کے لئے جہنم مقرر کردی ہے جس کی آگ میں وہ داخل ہوگا۔ ایسی حالت میں کہ اس کو برا کہا جائے گا اور پھٹکار پڑے گی' اور جو آخرت کا طلبگار ہوگا اور ایمان دار ہونے کی حالت میں آخرت کیلئے اس کے مناسب کوشش کرے گا اپنی عطاء سے ہم ہر فریق کی امداد کرتے ہیں ان کی بھی اور اُن کی بھی آپ کے رب کی عطاء سے اور آپ کے رب کی دین روکی نہیں گئی ہے۔ دیکھو ہم نے بعض کو بعض پر کس طرح فوقیت عطاء کی ہے۔ البتہ آخرت مراتب کے اعتبار سے بہت بڑی ہے۔ اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے۔''

قولہ: فانکم الیوم فی دار العمل و لاحساب:

یعنی اُس مکان میں جس میں تم لوگوں سے آخرت کا عمل مطلوب ہے۔ اس لئے کہ دنیا دار التکلیف اس لئے اُمید چھوڑ کر موت سے پہلے عمل کو غنیمت سمجھو۔ چونکہ دُنیا ایک گھڑی ہے۔ اسلئے مناسب ہے کہ اطاعت میں گزار دی جائے۔

یعنی بظاہر آج حساب نہیں ہے۔

یہ ارشاد فاجروں کے اعتبار سے ہے۔ ورنہ نیکوکاروں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا۔ ''اپنے آپ کا محاسبہ کرو اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے'' اور اس پر اللہ عزوجل کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ [الحشر ۔۱۸] ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل (قیامت) کے واسطے اُس نے کیا بھیجا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ کو تمہارے اعمال کی سب خبر ہے۔''

قولہ: وانتم غداء فی دار الآخرۃ و لاعمل: یعنی اُس حساب میں جس پر ثواب اور عقاب مرتب ہوتے ہیں۔ اُس

دن موت کی وجہ سے عمل منقطع ہو جائے گا۔

سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "ولا حساب" کی "باء" مفتوح ہے بغیر تنوین کے اور تنوین کے ساتھ رفع بھی جائز ہے۔ اسی طرح اعراب ہے "ولا عمل" کا۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "هذه الدنيا" سے دُنیا کی حالت کی حقارت اور دنیا کے جلدی زائل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔اور "الآخرة" میں آخرت کی حالت کی عظمت اور جلدی آنے کی طرف اشارہ ہے۔

فان استطعتم کا مطلب یہ ہے۔کہ میں نے تمہارے سامنے دنیا کے دھوکہ اور فناء کا حال بیان کر دیا۔اور آخرت کی نعمت اور بقاء کا حال بھی بیان کر دیا۔اور اختیار کی لگام تمہارے ہاتھ میں ہے لہٰذا جو چاہو لے لو اور بظاہر حق تو یہ تھا۔کہ یوں کہا جاتا: فانكم اليوم فيدار الدنيا و لاحساب" لیکن "دارالدنیا" کی جگہ "دارالعمل" ذکر کیا تاکہ معلوم ہو جائے۔کہ دنیا صرف عمل اور آخرت کیلئے توشہ حاصل کرنے کیلئے ہی پیدا کی گئی ہے اور اس کے برعکس اس لئے ذکر نہیں کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ گھر اصل آخرت کا گھر ہی ہے۔

تخریج: طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث کو جابرؓ نے مرفوعاً نقل کیا ہے۔اور بخاری کی ایک روایت میں بھی علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ روایت منقول ہے۔یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی مرفوع ہے۔میری رائے ہے کہ اس میں بحث ہے۔اسلئے کہ وہ موقوف حدیث جو خلاف رائے ہو اُسکے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مرفوع کے حکم ہے۔اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ حدیث موقوف اس قبیل سے نہیں ہے۔لہٰذا یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حدیث مرفوع ہو کہ آپؐ سے سنی گئی۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حدیث حضرت علیؓ کا اپنا ارشاد ہو۔اور اتفاقی طور پر حضرت جابرؓ کی حدیث کے مطابق ہو گیا ہو۔

۵۲۱۵ : وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ ارْتَحَلَتِ الدُّنْيَا مُدْبِرَةً وَارْتَحَلَتِ الْاٰخِرَةُ مُقْبِلَةً وَلِكُلٍّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُمَا بَنُوْنَ فَكُوْنُوا مِنْ اَبْنَاءِ الْاٰخِرَةِ وَلَاتَكُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الدُّنْيَا فَاِنَّ الْيَوْمَ عَمَلٌ وَلَا حِسَابَ وَغَدًا حِسَابٌ وَلَا عَمَلَ۔ (رواه البخاري في ترجمة باب)

اخرجه البخاري في صحيحه ۱۱/۲۳۵ في باب رقم٤ باب في الامل وطوله ـ

ترجمہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے (بطریق موقوف) روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: "یہ دنیا اِدھر سے کوچ کر کے منہ پھیرے ہوئے چلی جا رہی ہے اور آخرت اُدھر سے کوچ کر کے ہماری طرف منہ کئے آ رہی ہے (یعنی دنیا کی فنا اور آخرۃ کی بقاء ظاہر ہو رہی ہے) اور ان دونوں (دنیا و آخرت) میں سے ہر ایک کے بیٹے ہیں پس تم (اعمالِ صالحہ اور آخرت کی طرف راغب ہو کر) آخرت کے بیٹے بنو اور (دنیا کی طرف متوجہ ہو کر) دنیا کے بیٹوں میں سے نہ ہو یاد رکھو! تم عمل کرنے کی جگہ میں ہو۔جس میں کوئی حساب نہیں۔) اور کل (قیامت) کا دن حساب کا دن ہوگا عمل کرنے کا نہیں" اس روایت کو امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں نقل کیا ہے"۔

تشریح: قوله ولكل واحدة منهما بنون

ولا تکونوا فان الیوم عمل عمل کا وقت (ولاحساب) ایسا وقت ہے جس میں کمانے پر محاسبہ نہیں کیا جاتا ہے۔ بطور مبالغہ ''یوم'' کو عمل اور محاسبہ قرار دیا گیا۔ اسی طرح ''غداً'' کا معاملہ ہے ''غداً'' سے مراد ''یوم القیامۃ''

حساب ولا عمل: ان کے اعراب کا اختلاف پہلے گزر چکا ہے۔

۵۲۱۲ : وَعَنْ عَمْرٍو اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ يَوْمًا فَقَالَ فِيْ خُطْبَتِهٖ اَلَا اِنَّ الدُّنْيَا عَرَضٌ حَاضِرٌ يَّاْكُلُ مِنْهُ الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ اَلَا وَاِنَّ الْاٰخِرَةَ اَجَلٌ صَادِقٌ وَيَقْضِيْ فِيْهَا مَلِكٌ قَادِرٌ اَلَا وَاِنَّ الْخَيْرَ كُلَّهٗ بِحَذَافِيْرِهٖ فِي الْجَنَّةِ اَلَا وَاِنَّ الشَّرَّ كُلَّهٗ بِحَذَافِيْرِهٖ فِي النَّارِ اَلَا فَاعْمَلُوْا وَاَنْتُمْ مِنَ اللّٰهِ عَلٰى حَذَرٍ وَاعْلَمُوْا اِنَّكُمْ مَعْرُوْضُوْنَ عَلٰى اَعْمَالِكُمْ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۔ (رواه الشافعی)

لم اقف علیه فی مسند الامام الشافعی ۔

ترجمہ: ''حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس خطبہ میں فرمایا: (لوگو) رہو! دنیا بے ثبات سامان ہے اس میں سے نیک اور بد کھاتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے وعدہ ''وما من دابة فی الارض الاعلی اللہ رزقها'' کی بنا پر ہر فرمانبردار اور نافرمان کو رزق دیا جاتا ہے) خبردار رہو! آخرت واقعی مدت ہے جو سچی یعنی متحقق وثابت ہے اور اس (آخرت) میں قادر مطلق بادشاہ (یعنی اللہ تعالیٰ مومن اور کافر کے درمیان ثواب وعذاب کے ذریعہ فرق ظاہر فرمانے کے لئے) فیصلہ کرے گا یاد رکھو! تمام بھلائیاں اور خوبیاں اپنے انواع واقسام کے ساتھ جنت میں ہیں' یاد رکھو تمام برائیاں اور خرابیاں اپنے انواع واقسام کے ساتھ دوزخ میں ہیں' خبردار رہو! پس تم (نیک) عمل کرتے رہو درآنحالیکہ تم پر خدا کے حساب وعذاب کا خوف طاری ہو (یا یہ یعنی کہ نیک عمل کرو اور سارے میں خدا سے ڈرتے رہو کہ تمہارے وہ نیک عمل قبول ہوتے ہیں یا نہیں) اور اس بات کو یاد رکھو کہ اپنے اعمال کے ساتھ (خدا کے سامنے) پیش ہونا ہے' پس جو شخص ذرہ برابر بھی نیک کام کرتا ہے وہ (دنیا یا آخرۃ میں) اس کی جزا پائے گا اور جو شخص ذرہ بھی برا عمل کرتا ہے وہ اس کی سزا پائے گا''۔ (شافعی)

تشریح: قوله: ان الدنیا عرض حاضر یأکل منه البر والفاجر: تنبیہ کیلئے ہے۔

عرض: عین اور راء دونوں مفتوح ہیں۔

معنی یہ ہے کہ حادث مال ہے اور عارض حال ہے (حاضر) جلدی گزرنے والی محسوس ہونے والی زندگی ہے۔

یأکل منه: اور ایک نسخہ میں ''منها'' ہے اور ''بر وفاجر'' سے مراد مؤمن اور کافر ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وما من دابة فی الارض الاعلی اللہ رزقها﴾ [الانعام۔۳۸]

''اور کوئی رزق کھانے والا جانور روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔''

اور ارشاد باری ہے: ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا﴾ [الاسراء۔۱۷]

''آپ کے ربّ کی (اس) عطا (دنیوی) میں سے تو ہم ان کی بھی امداد کرتے ہیں اور ان کی بھی اور آپ کے ربّ کی (یہ) عطا

(دنیوی کسی پر) بند نہیں' اس آیت میں ''محظوراً'' کا معنی ہے ''ممنوع''۔

امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عرض اُس چیز کو کہا جاتا ہے جو جوہر کے بغیر باقی نہ رہے۔ مثلاً رنگ اور ذائقہ اور دنیا کو ''عرض حاضر'' کہا اس پر تنبیہ کرنے کیلئے کہ دنیا باقی نہیں رہتی۔

قوله: وان الاخرة اجل صادق ويقضي فيها ملك قادر:

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حرف تنبیہ زائد ہے اور حرف تنبیہ کے مابعد کا ''ان الدنیا'' پر عطف ہے۔ سابق جملہ کے مقابلہ میں ''الاوان لاخرة'' کو ذکر کیا گیا۔ ''اجل'' مقرر کردہ۔

''صادق'' اس کا واقع ہونا ایک سچی خبر ہے

نیک مؤمن کو ثواب دے کر اور فاسق اور کافر کو سزا دے کر دونوں کو جُدا جُدا کر دینگے۔ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''الاجل'' سے مراد وہ مقررہ مُوت ہے جس کا ہر انسان کیلئے فیصلہ کیا گیا ہے۔ صدق کو ''اجل'' کی صفت کے طور پر ذکر کیا۔ اجل کی تحقیق، تاکید اور بقاء پر دلالت کرنے کیلئے۔

امام راغب فرماتے ہیں کہ ہر اُس چیز کے بارے میں ''تصدیق'' استعمال کیا جاتا ہے جس میں تحقیق ہو۔ چنانچہ کہا جاتا ہے:

''صدقني فعله وكتابه'' اور مثل ہے: صدقني من بكره وصدق في القتال اذا وفى حقه۔

قوله: الاوان الخير كله بحذافيره في الجنة...... : معطوف اور معطوف علیہ میں سے ہر ایک کو حرف تنبیہ کے ساتھ ذکر کرنا بظاہر اس بات کی طرف اشارہ کرنے کیلئے ہے کہ دونوں جملے مستقل جملے ہیں۔ اور اس طرح نہیں جس طرح طیبی رحمہ اللہ کے حوالے سے پہلے گزر چکا ہے۔

قوله: الا فاعملوا...... واعلموا انكم معروضون على اعمالكم:

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے **الاعمال معروضة عليكم**، لیکن اس طرح کرنا باب القلب سے ہے۔ جس طرح کہ عربوں کی کہاوت ہے: **عرضت الناقة على الحوض**

اور زیادہ بہتر معنی یہ ہے کہ ''تم اپنے اعمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیے جاؤ گے اور اپنے اعمال کے مطابق تمہیں سزا و جزاء دی جائیگی۔'' جس طرح کہ لشکر کو امیر کے سامنے لایا جاتا ہے۔ اور اسی طرح کا معنی ہے اس ارشاد باری کا: ﴿**يومئذ تعرضون لاتخفى منكم خافية**﴾ نیز یہ بھی احتمال ہے کہ ''علی'' علت کیلئے ہو جس طرح ارشاد باری: ﴿**ولتكبروا الله على ماهداكم**﴾ میں ہے۔ یا یہ جملہ ''**علفت ماءً ا وتبناً**'' کے قبیل سے ہے اور تقدیری عبارت یوں ہوگی: **معرضون على مجازون على اعما لكم ان كان خير فخير وان كان شر فشر**.

قوله: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال: ۷ - ۸] ''سو جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا۔ وہ اس کو دیکھ لے اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا، وہ اس کو دیکھ لے گا''

سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''ذرۃ'' سرخ رنگ کی چھوٹی چیونٹی کو کہتے ہیں۔ ثعلب سے ''ذرۃ'' کے بارے میں پوچھا

گیا تو فرمایا کہ سو چیونٹیوں کا وزن ایک حبہ کے وزن کے برابر ہے۔ بعض کہتے ہیں ''ذرۃ'' کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ اور اس سے مراد وہ ذرات ہیں جو کھڑکی سے اندر داخل ہونے والی سورج کی شعاعوں میں نظر آتے ہیں۔ (رواہ الشافعی)۔

۵۲۱۷ : وَعَنْ شَدَّادٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ الدُّنْيَا عَرَضٌ حَاضِرٌ يَاكُلُ مِنْهَا الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ وَاِنَّ الْاٰخِرَةَ وَعْدٌ صَادِقٌ يَحْكُمُ فِيْهَا مَلِكٌ عَادِلٌ قَادِرٌ يُحِقُّ فِيْهَا الْحَقَّ وَيُبْطِلُ الْبَاطِلَ كُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الْاٰخِرَةِ وَلَاتَكُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الدُّنْيَا فَاِنَّ كُلَّ اُمٍّ يَتْبَعُهَا وَلَدُهَا۔

ابو نعیم فی الحلیۃ ۱/۲٦٤۔

ترجمہ: ''حضرت شداد (بن اوس) رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''لوگو! بے شک یہ دنیا ایک ناپائیدار سامان ہے جس میں نیک و بد (یعنی مؤمن و کافر) دونوں کھاتے ہیں اور بلاشبہ آخرت ایک یقینی طور پر پورا ہونے والا وعدہ ہے اس (آخرت) میں کامل قدرت رکھنے والا اور عدل و انصاف کرنے والا بادشاہ (اپنے فیصلہ اور حکم کے ذریعہ) حق کو ثابت کردے گا اور باطل کو مٹا دے گا (یعنی ثواب و عذاب کے ذریعہ اہل باطل اور اہل حق کو ایک دوسرے سے ممتاز کردے گا) تم آخرت کے بیٹے بنو اور دنیا کے بیٹوں میں اپنا شمار نہ کراؤ' کیونکہ ہر ماں کا بیٹا اسی (ماں) کا تابع ہوتا ہے''۔

تشریح: قوله: وان دالآخرة وعد صادق..... ويبطل الباطل:

طیبی رحمہ اللہ کی مختصر میں ہے کہ ''وعد'' کو ''صدق'' کے ساتھ موصوف کرنا اسنادی مجازی ہے۔ یعنی ''صادق وعدہ'' جس کا مطلب ہے ''صادق في وعده'' (اپنے وعدہ میں سچا ہے۔)

عادل: ایسا جو ظلم نہیں کرتا۔

الباطل: طلب یہ ہے کہ باطل والوں اور حق والوں کے درمیان فیصلہ کرے گا اور اہل حق کو ثواب دے کر اور اہل باطل کو سزا دے کر ایک دوسرے سے الگ کردے گا۔

قوله: كونوا من ابناء الآخرة الخ:

گویا کہ باطل دنیا کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔ اور حق دین کا ٹھکانہ جنت ہے جو نعمتوں والا گھر ہے۔

۵۲۱۸ : وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاطَلَعَتِ الشَّمْسُ اِلَّا وَبِجَنْبَتَيْهَا مَلَكَانِ يُنَادِيَانِ يُسْمِعَانِ الْخَلَائِقَ غَيْرَ الثَّقَلَيْنِ يٰاَيُّهَا النَّاسُ هَلُمُّوْا اِلٰى رَبِّكُمْ مَاقَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ وَاَلْهٰى۔

احمد في المسند ٥/١٩٧ وابو نعيم في الحلية ١/٢٢٦۔

''حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب بھی آفتاب طلوع ہوتا ہے اس کے دونوں طرف فرشتے ہوتے ہیں جو اعلان کرتے ہیں اور جن و انس کے علاوہ تمام مخلوق کو سناتے ہیں (اور اعلان یہ ہوتا ہے کہ) کہ

اے لوگو! اپنے پروردگار کی طرف آؤ (یعنی اپنے پروردگار کے احکام کی اتباع کرو) (اور اس بات کو جان لو کہ) جو مال قلیل ہو اور (دینی معاملات کی تکمیل یا توشۂ آخرۃ کے طور پر) کفایت کرے وہ اس مال سے بہت زیادہ بہتر ہے جو زیادہ ہو اور عبادت خداوندی سے غافل اور سکون واطمینان کی زندگی سے محروم رکھے''۔ان دونوں روایتوں کو ابونعیم نے کتاب حلیہ میں نقل کیا ہے۔

قولہ: ماطلعت الشمس لا۔۔۔غیر الثقلین:

جنبتیھا ''جیم'' اور ''نون'' کے فتحہ کے ساتھ اور نون کا سکون بھی دُرست ہے۔''باء'' کے فتحہ کے ساتھ اور ''یاء'' کے سکون کے ساتھ ''الجنبۃ'' کا تثنیہ ہے۔اور اس کا معنی ہے ایک جانب مقدمہ میں لکھا ہے:

انھا بالتحریك وفی القاموس الجنب والجانب والجنبۃ محرکہ شق لانسان وغیرہ وجانبتا الانف وجنتاہ ویحرك جنباہ۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں واؤ حالیہ ہے۔اور استثناء مفرغ ہے۔

''ملکان'' نحویوں کے ایک مذہب کے مطابق اس کو جار مجرور کا فاعل بنانا بھی دُرست ہے۔ یا یہ مبتدا ہے اور جار مجرور اس کی خبر ہے۔

ینادیان حال ہے۔یا جملہ مستانفہ ہے۔ملکان کی صفت ہے۔

''یسمعان الخلائق غیر الثقلین'' ماقبل سے بدل ہے یا ضمیر سے حال ہے یا بیان کے بعد بیان ہے۔

بظاہر مخلوق کو سُنانا حقیقت پر محمول ہے۔پھر شاید انس اور جن کو نہ سنانے کی حکمت یہ ہو کہ غیب کا معائنہ کرنے کی وجہ سے تکلیف مرتفع نہ ہو جائے۔یہی بات معلوم ہوتی ہے اُس ارشاد نبوی سے:

لو لا ان تدافعوا الدعوت اللہ ان یسمعکم من عذاب القبر

''اگر اس بات کا خوف نہ ہوتا کہ تم لوگ مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے۔تو میں اللہ سے دُعا کرتا کہ تم کو عذاب قبر سنا دے۔''

اگر کوئی اعتراض کرے کہ انس اور جن کے علاوہ دوسری مخلوقات کو سُنانے کا کیا فائدہ حالانکہ انسان اور جنات آخرت سے غفلت پر متنبہ کرنے کے محتاج ہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ صادق ومصدوق حضور اکرم ﷺ نے اپنے اس ارشاد سے اُس چیز کی خبر دی جس کو خود سنا یا جس کی اللہ نے ''اللہ کے امر اور فیصلہ کی طرف یا دوسروں کو چھوڑ کر اللہ کی طرف یکسو ہو جاؤ'' اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿ ففروا الی اللہ وتتبل الیہ تبتیلا﴾ ''تو تم اللہ ہی کی توحید کی طرف دوڑو اور سب سے قطع کر کے اسی کی طرف متوجہ رہا کر''۔

ما:''ما'' موصولہ ہے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی دُرست ہے کہ فرشتوں کا سُنانا حقیقت پر محمول ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ غفلت سے بیدار کرنے کیلئے مجازاً کہا گیا ہو۔چنانچہ ''یسمعان الخلائق غیر الثقلین'' کا مطلب یہ ہوگا کہ فرشتوں کے سُنانے میں مقصود

انس اور جن ہے' مگران دونوں کے علاوہ دوسری مخلوقات کوسُنا دیتے ہیں۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے اپنے ارشاد "یایھا الانسان" میں خاص انسان کو اسلئے ذکر کیا تا کہ غفلت میں آگے بڑھنے، حرص میں منہمک ہو جانے اور دنیا کے اتنے ساز و سامان کو جمع کرنے جو اللہ کے ذکر وعبادت سے غافل کر دے۔ پر انسان کو تنبیہ ہو جائے۔ لہٰذا انسانوں سے فرمایا گیا کہ کب تک یہ غفلت رہے گی اور ذکر سے اعراض رہے گا' اپنے رب کی عبادت کی طرف آؤ وہ قلیل مال جو تمہارے لئے کافی ہو اور غافل نہ کرے بہتر ہے اُس زیادہ مال سے جو اللہ سے غافل کر دے۔ اس آواز کو اُس شخص نے سُنا جو حاضر دماغی کے ساتھ کان لگا کر سنتا ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے مرتبہ کو اللہ نے بلند کیا۔ اور اپنے ارشاد: ﴿لاتلهيهم تجارة ولابيع عن ذكر الله......﴾[النور:۳۷] میں ان کی طرف اشارہ فرمایا۔ اور فرشتوں کا غیر مکلّف مخلوقات کو سُنانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مخلوقات اللہ کی تسبیح کرتی ہیں اور اُس کام کو بجالاتی ہیں جو ان سے مطلوب ہے۔ [وان من شي الايسبح بحمده] انتھی اور کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی (بزبان حالیا بزبان قال) بیان نہ کرتی ہو۔ انتھی اور یہ بات واضح ہے کہ کلام کے صحیح ہونے کیلئے تقدیری عبارت "غیر عامة الثقلين" ماننا ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تخریج: ابن حبان نے پہلی حدیث کو اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

۵۲۱۹: وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ يَبْلُغُ بِهِ قَالَ اِذَامَاتَ الْمَيِّتُ قَالَتِ الْمَلٰئِكَةُ مَاقَدَّمَ وَقَالَ ابْنُوْا آدَمَ مَا خَلَّفَ.

(رواه البيهقي في شعب الايمان)

رواه البيهقي في شعب الايمان ۷/۳۲۸ حديث رقم ۱۰۴۷۵۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت منقول ہے جس کو وہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچاتے ہیں کہ انہوں نے کہا: جب کوئی شخص مرتا ہے تو فرشتے تو یہ پوچھتے ہیں کہ اس شخص نے آخرت کے لئے (اعمال خیر کی صورت میں) کیا بھیجا ہے اور لوگ (یعنی مرنے والے کے ورثا اور دیگر متعلقین وغیرہ) یہ پوچھتے ہیں کہ اس نے (اپنے ترکہ میں) کیا چھوڑا ہے؟ (یعنی فرشتے اعمال پر نظر فرماتے ہیں جب کہ لوگ اموال پر)" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: "يبلغ به": "باء" تعدیہ کیلئے ہے۔

قوله: قال: اذامات الميت......:

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مال کے اعتبار سے مجازا یوں فرمایا' کیونکہ مردہ نہیں مرتا بلکہ زندہ مرتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سوائے اُس زندہ ذات کے جو نہیں مرے گا۔ کشاف میں ابن عباسؓ کا ارشاد منقول ہے کہ "جب تم میں سے کوئی حج کا ارادہ کرے تو جلدی کرے۔ کیونکہ مریض بیمار ہو جاتا ہے اور راستہ بھول جاتا ہے اور راستہ بھول جانے والا راستہ بھول جاتا ہے۔" اس حدیث میں بیماری اور راستہ بھول جانے کے قریب ہو جانے والے کو بیمار اور راستہ بھول جانے والا کہا گیا۔ اسی طرح مذکورہ بالا حدیث میں عنقریب مرنے والے کو "میت" کہا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿انك ميت وانهم ميتون﴾ [الزمر:۳۰] اسی معنی میں ہے۔ دونوں قولوں کا مال ایک ہی ہے۔ اختلاف صرف پہلی حالت اور آخری حالت پر نظر کرنے کے اعتبار سے ہے۔ جس طرح کہ صوفیاء پہلی اور آخری حالت میں نظر کرتے ہیں۔ پہلی رائے اولیٰ ہے۔

قالت: جامع کی ایک روایت میں "تقول" کا لفظ ہے۔

قدم: دال کی تشدید کے ساتھ

وقال بنو آدم: اور جامع کی روایت میں "یقول الناس" کے الفاظ ہیں۔

ماخلف: "لام" کی تشدید کے ساتھ جو اموال پیچھے چھوڑ دیے ہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ فرشتے اعمال کی فکر کرتے ہیں کہ کونسا عمل آگے بھیج دیا ہے جس پر اس کو ثواب ملے گا یا سزا ملے گی اور ورثاء کو مال کی فکر رہتی ہے۔

۵۲۴۰: وَعَنْ مَالِكٍ اَنَّ لُقْمَانَ قَالَ لِابْنِهٖ يَا بُنَيَّ اِنَّ النَّاسَ قَدْ تَطَاوَلَ عَلَيْهِمْ مَايُوْعَدُوْنَ وَهُمْ اِلَى الْاٰخِرَةِ سِرَاعاً يَذْهَبُوْنَ وَاِنَّكَ قَدِ اسْتَدْبَرْتَ الدُّنْيَا مُنْذُ كُنْتَ وَاسْتَقْبَلْتَ الْاٰخِرَةَ وَاِنَّ دَارَ تَسِيْرُ اِلَيْهَا اَقْرَبُ اِلَيْكَ مِنْ دَارٍ تُخْرَجُ مِنْهَا ۔ (رواہ رزین)

رواہ رزین

ترجمہ: "حضرت امام مالکؒ سے روایت ہے کہ لقمان (حکیم) نے اپنے بیٹے سے کہا اے میرے صاحبزادے! جس بات (یعنی مردوں کا دوبارہ زندہ ہونا اور حساب وقصاص وغیرہ) کا لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا' اس کی مدت (از آدم تا ایں دم) ان پر دراز ہو چکی ہے دراز ہوگئی جب کہ لوگ آخرت کی طرف تیزی سے چلے جا رہے ہیں اور میرے بیٹے! جس زمانہ تم پیدا ہوئے تھے اسی وقت سے تمہاری پیٹھ دنیا کی جانب اور تمہارا رخ آخرت کی جانب ہے (یعنی تم اپنی پیدائش کے دن سے گویا دنیا کو پیچھے چھوڑتے چلے آ رہے ہو اور آخرت کی طرف بڑھتے جا رہے ہو) اور یقیناً جس گھر اور مقام کی طرف تم رواں دواں ہو وہ تم سے اس گھر اور مقام کی بہ نسبت زیادہ قریب ہے جس نے تم نکالے جا رہے ہو"۔ (رزین)

تشریح: قوله: ان لقمان قال لابنه بني ان الناس قدتطاول عليهم مايوعدون:

"بنی" تصغیر کا صیغہ ہونے کی بناء پر "یاء" مفتوح مشدد ہے' اور "یاء" کا کسرہ بھی درست ہے۔ اور تصغیر کا صیغہ شفقت کی وجہ سے استعمال کیا۔

ما یوعدون: طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ جس چیز کا وعدہ کیا گیا تھا اُس کا زمانہ لوگوں کیلئے طویل ہو گیا۔

قوله: وهم الى الآخرة سراعاًيذهبون:

"سراعا:" مبتدا سے حال ہے' یا خبر کی ضمیر سے حال ہے اور خبر "یذهبون" ہے۔ حال کو اہتمام کی وجہ سے مقدم کیا گیا۔ اور یہ جملہ "مایوعدون" کی ضمیر سے حال ہے۔ مطلب یہ ہے: "تطاول على الناس بُعد الوعد وقرب العهد" حالانکہ یہ لوگ ہر گھڑی بلکہ زندگی کی ہر سانس میں آخرت کے احوال کی طرف اس طرح بڑھ رہے ہیں جس طرح ایک قافلہ جا رہا ہو۔ لیکن ان لوگوں کو لدی ہوئی کشتی کے سواروں کی طرح اپنے سفر کا احساس نہیں ہوتا۔ پھر اس مطلب کو لقمان علیہ السلام نے اپنے اگلے ارشاد سے واضح فرمایا۔ اس سے مراد ایک عام خطاب ہے جو اپنے آپ اور دوسروں کو بھی شامل ہے۔

قوله: وانك قد استدبرت الدنيا ~~الخ~~ یعنی ہر سانس میں جبکہ تمہیں شروع سے لے کر آخر تک اس سفر میں کچھ

اختیار نہیں۔ پھر لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے سامنے حکیمانہ انداز میں ایک قصہ کی وضاحت اس طرح کی کہ محسوس گھر کے ذریعے معنوی گھروں کو بیان کیا۔ اس نصیحت کے ذریعے آخرت سے غفلت کو دفع کرنا مقصود ہے۔

۵۲۲۱ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ النَّاسِ اَفْضَلُ قَالَ كُلُّ مَخْمُوْمِ الْقَلْبِ صَدُوْقِ اللِّسَانِ قَالُوْا صَدُوْقُ اللِّسَانِ نَعْرِفُهُ فَمَا مَخْمُوْمُ الْقَلْبِ قَالَ هُوَ التَّقِيُّ لَااِثْمَ عَلَيْهِ وَلَابَغْيَ وَلَا غِلَّ وَلَاحَسَدَ ۔ رواہ ابن ماجة والبيهقي في شعب الايمان

اخرجه ابن ماجه في السنن ۲/۱۴۰۹ حديث رقم ۴۲۱۵۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کون آدمی زیادہ بہتر ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر شخص جو مخموم دل اور زبان کا سچا ہو"۔ (یہ سن کر) صحابہؓ نے عرض کیا کہ زبان کے سچے کو تو ہم جانتے ہیں (کہ جو کبھی جھوٹ نہ بولے) لیکن "مخموم دل" سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مخموم دل وہ شخص ہے جو صاف اور پاک دل والا ہو پرہیزگار جس کے ذمہ نہ کوئی گناہ ہو اور نہ ہی کوئی ظلم اور نہ ہی حد سے تجاوز پایا گیا ہو اور اس میں کدورت و کینہ اور حسد کا مادہ نہ ہو"۔ (ابن ماجہ، بیہقی)

تشریح: قولہ: قال كل مخموم القلب نقطہ والی "خاء" کے ساتھ یعنی قلب سلیم والا جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿الامن اتى الله بقلب سليم﴾ مخموم کا لفظ (خممت البيت) سے ماخوذ ہے۔ اور "خممت البيت" کا معنی ہے۔ میں نے گھر کو جھاڑو دے کر صاف کیا۔ قاموس اور دوسری کتابوں نے اس طرح ذکر کیا ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہوا کہ وہ شخص جس کے دل میں سے اغیار کے غبار کو جھاڑو سے صاف کیا گیا ہو اور برے اخلاق کی گندگی سے پاک ہو۔

قولہ: صدوق السان مجرور ہے۔ یعنی اُسکی زبان میں سچ گوئی ہو۔ جس کی وجہ سے زبان اور بیان دونوں حسین بن چکے ہوں۔ اور ریا کار اور اپنی بات میں جھوٹا ہونے سے بچ گیا ہو۔

قالوا: صدوق اللسان باعراب حکائی کی بناء پر مجرور ہے۔ اور مبتدا ہونے کی بناء پر رفع بھی جائز ہے۔ اس وقت اس کی خبر (نعرفه) ہوگی

قولہ: قال هو النقي التقي: "النقي" صاف دل والا اور وہ شخص جس کا باطن اللہ کے غیر کی محبت سے پاک ہو۔

"التقي" برے خیالات سے پرہیز کرنے والا

لا اثم عليه کیونکہ یہ گناہوں سے محفوظ ہے۔ اور اللہ کی معفرت سے اس کو حصہ ملا ہے۔ اور اللہ کی مہربانی کی نگاہوں میں ہے۔ "لا" کا نفی جنس کیلئے ہونا معلوم ہے۔

قولہ: ولا حسد نہ دوسرے سے نعمت زائل ہونے کی تمنا کی ہے تکمیل اور تتمیم کیلئے خاص اور عام گناہوں کی نفی کی تاکہ صرف خاص حقوق اللہ کی نافرمانی کا وہم کوئی نہ کرے۔ اس لئے صراحۃً بیان فرمایا کہ نہ مخلوق کی جانب سے حق کا مطالبہ کرنے والا کوئی ہو اور نہ خالق کی جانب سے کسی حق کا مطالبہ ہو۔ (واللہ اعلم بالحقائق)

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس جواب سے ارشاد باری کی طرف اشارہ ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ

لِلتَّقْوٰی﴾ [الحجرات:٣] ''یہ لوگ وہ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقوی کیلئے خاص کر دیا ہے۔''

یعنی اللہ نے ان کے دلوں کو تقویٰ کیلئے خالص کر دیا۔ عرب ''امتحن الذهب وفتنه'' اُس وقت کہتے ہیں جب وقت سونے کو پگھلایا جائے اور اس سے اُسکا کھوٹ الگ ہو جائے اور خالص سونا باقی رہ جائے۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے اذهب الشهوات عنها۔

''امتحن الله قلوبهم للتقوىٰ'' کا معنی ہے: اللہ نے ان کے دلوں سے شہوات کو ختم کر دیا۔

۵۲۲۳ : وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرْبَعٌ اِذَا كُنَّ فِيْكَ فَلَا عَلَيْكَ مَافَاتَكَ الدُّنْيَا حِفْظُ اَمَانَةٍ وَصِدْقُ حَدِيْثٍ وَحُسْنُ خَلِيْقَةٍ وَعِفَّةٌ فِي طُعْمَةٍ۔

رواه احمد والبيهقي في شعب الايمان

احمد في المسند ٢/١٧٧ ورواه البيهقي في شعب الايمان ٤/٣٢١ حديث رقم ٥٢٥٨

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(لوگو!) چار خصلتیں ایسی ہیں کہ اگر وہ تم میں موجود ہوں تو دنیا کے فوت ہونے نہ ہونے کا تمہیں کوئی غم نہ ہو' ایک تو امانت کی حفاظت کرنا یعنی تمام حقوق کی مکمل ادائیگی کی رعایت کرنا دوسرے سچی بات کہنا' تیسرے اخلاق کا اچھا ہونا اور چوتھے کھانے میں احتیاط و پرہیزگاری اختیار کرنا (یعنی شریعت کے حرام کردہ کھانے سے اجتناب کرنا اور زیادہ کھانے سے رکنا وغیرہ) اور زیادہ کھانے سے اجتناب کر کے بقدر حاجت وضرورت پر اکتفا کرنا''۔ (احمد' بیہقی)

تشریح: قوله: أربع اذا كن فيك فلا عليك مافاتك من الدنيا:

جامع میں ''مافاتك من الدنيا'' کے الفاظ ہیں۔ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک احتمال یہ ہے کہ ''ما'' مصدریہ ہو اور ''وقت'' مقدر ہو۔ ای لا بأس عليك وقت فوت الدنيا ان حصلت لك هذه الخصال'' (اگر تیرے اندر یہ خصلتیں ہوں تو دنیا فوت ہونے کے وقت کوئی حرج نہیں۔)

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ''ما'' نافیہ ہو۔ معنی یہ ہوں گے کہ تجھ پر کوئی حرج نہیں اسلئے کہ تم سے دنیا فوت نہیں ہوئی اگر یہ خصلتیں تیرے اندر ہوں۔ (انتھی) پہلی توجیہ زیادہ بہتر ہے۔ یہ بات واضح ہے۔

'' حفظ امانة'' مال اور اعمال کی امانت کو شامل ہے' اور ''صدق حدیث'' تمام اقوال کو شامل ہے۔

وحسن خليقه: یعنی اخلاق میں حسن ہو۔ تصنع اور تکلف کر کے یہ حسن نہ ہو۔

وعفة في طعمة ''طا'' مضموم اور ''تا'' منون ہے۔ حرام سے احتراز کرنا اور حلال حاصل کرنا۔

تخریج: جامع میں ''صدق الحديث وحفظ الامانة وحسن الخلق وعفة مطعم'' کے الفاظ ہیں۔ اس حدیث کو احمد' طبرانی، حاکم اور بیہقی نے ابن عمرؓ بغیر واؤ کے سے نقل کیا ہے۔ اور طبرانی نے ابن عمرو (واؤ کے ساتھ) سے نقل کیا ہے۔ اور ابن عدی اور ابن عساکر نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔

۵۲۲۴ : وَعَنْ مَالِكٍ قَالَ بَلَغَنِيْ اَنَّهُ قِيْلَ لِلُقْمَانَ الْحَكِيْمِ مَابَلَغَ بِكَ مَاتَرٰى يَعْنِي الْفَضْلَ قَالَ

صِدْقُ الْحَدِيْثِ وَاَدَآءُ الْاَمَانَةِ وَتَرْكُ مَالَا يَعْنِيْنِىْ ۔ (رواه فى المؤطا)

اخرجه مالك فى الموطا ۲ /۹۹۰ حديث رقم ۱۷ من كتاب الاحكام ۔

ترجمہ: ''حضرت امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ جب لقمان حکیم سے یہ دریافت کیا گیا کہ جس مرتبہ (یعنی فضیلت ورفعت کی جس شان پر) پر ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں اس تک آپ کو کس چیز نے پہنچایا ہے؟ لقمان حکیم نے فرمایا ''سچ بولنے نے (یعنی میں نے ہمیشہ سچائی کا دامن تھاما ہے ادائیگی امانت نے (یعنی میں نے ہمیشہ دیانتداری ملحوظ رکھا) ان تمام چیزوں کے ترک کرنے جس کا کرنا میرے لیے غیر ضروری اور غیر مقید تھا۔ (مؤطا)

تشریح: یعنی الفضل: ممکن ہے کہ یہ امام مالک کا کلام ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور نے تفسیر کی ہو۔قولہ: مابلغ بلك ماترى: پہلا ''ما'' استفہامیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ دوسرے لوگوں پر تیری جو فضیلت جو ہم دیکھ رہے ہیں اس مرتبہ تک تجھے کسی چیز نے پہنچایا؟

صدق الحديث: بات کرنے اور بات نقل کرنے میں سچ کو لازم پکڑنے نے

اداء الامانة: مال اور عمل کی امانت

وترك ما لا يعنينى جو مجھے نہ فی الحال فائدہ دے اور نہ انجام کے اعتبار سے فائدہ دے۔

۵۲۲۴ : وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَجِيْءُ الْاَعْمَالُ فَتَجِيْءُ الصَّلٰوةُ فَتَقُوْلُ يَارَبِّ اَنَا الصَّلٰوةُ فَيَقُوْلُ اِنَّكِ عَلٰى خَيْرٍ فَتَجِيْءُ الصَّدَقَةُ فَتَقُوْلُ يَارَبِّ اَنَا الصَّدَقَةُ فَيَقُوْلُ اِنَّكِ عَلٰى خَيْرٍ ثُمَّ يَجِيْءُ الصِّيَامُ فَيَقُوْلُ يَارَبِّ اَنَا الصِّيَامُ فَيَقُوْلُ اِنَّكَ عَلٰى خَيْرٍ ثُمَّ تَجِيْءُ الْاَعْمَالُ عَلٰى ذٰلِكَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنَّكَ عَلٰى خَيْرٍ ثُمَّ يَجِيْءُ الْاِسْلَامُ فَيَقُوْلُ يَارَبِّ اَنْتَ السَّلَامُ وَاَنَا الْاِسْلَامُ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنَّكَ عَلٰى خَيْرٍ بِكَ الْيَوْمَ اٰخُذُ وَبِكَ اُعْطِىْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِىْ كِتَابِهٖ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔

مالك بن انس، الموطا۔

اخرجه مالك فى الموطأ ۲ /۹۹۰ حديث رقم ۱۷ من كتاب الكلام واحمد فى المسند ۲ /۳٦۲

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (قیامت کے دن) اعمال (اللہ جل جلالہ کی بارگاہ میں) کے پیش ہوں گے۔ پس (سب سے پہلے) نماز پیش ہوگی اور عرض کرے گی کہ اے میرے پروردگار! میں نماز ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ''بے شک تو بھلائی ہے'' پھر صدقہ یعنی زکوٰۃ پیش ہوگی اور عرض کرے گی کہ اے میرے پروردگار! میں صدقہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ''بے شک تو بھلائی ہے'' اور پھر روزہ پیش ہوگا اور عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار! میں روزہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ''بے شک تو بھلائی ہے'' اسی طرح (یکے بعد دیگرے) دوسرے اعمال (جیسے حج، جہاد اور طلب علم وغیرہ) پیش ہوں گے (اور ہر ایک عمل اپنا تعارف پیش کرے گا) اور حق تعالیٰ شانہ ھا فرمائے گا کہ تو خیر پر ہے (یعنی ہر اچھے عمل کے اپنا تعارف کرانے کے بعد اس کی قبولیت کو فی الحال ملتوی کر دیا

جائے گا اور یہ ملتوی ہونا اسلام کے پیش ہونے تک ہوگا) پھر (سب سے آخر میں) اسلام پیش ہوگا اور عرض کرے گا کہ اے پروردگار! تیرا نام سلام ہے (کہ تو تمام تر نقص وعیب سے خود پاک ہے اور انسانیت کو ہر مصیبت والم سے سلامتی بخشنے والا ہے) اور میں اسلام ہوں پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا بے شک تو بھلائی پر ہے' آج کے دن میں تیرے ہی سبب مواخذہ کروں گا اور تیرے ہی وسیلہ سے عطا کروں گا (یعنی آج جزا وسزا کے دن میں تجھے ہی اصل اور طاعت ومعصیت کے فیصلوں کا مدار ومعیار قرار دیتا ہوں کہ جس نے تجھے اختیار نہیں کیا اور تیرے راستے پر نہیں چلا اس سے مواخذہ کروں گا اور اس کو عذاب میں مبتلا کروں گا اور جس نے تجھے اختیار کیا اور تیرے راستہ پر گامزن رہا اس کو جزا وثواب دوں گا' لہٰذا تو جو کچھ چاہتا ہے ہمارے سامنے عرض کر' ہم تیری ہر سفارش وشفاعت قبول کریں) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا: وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا...... یعنی جو شخص اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب کو اختیار کرے گا اس سے وہ دین ہرگز مقبول نہیں ہو گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

تشریح: تجیء: مونث کا صیغہ بھی جائز ہے اور مذکر کا بھی' اعمال مجسّم ہونگے تا کہ انسان کیلئے اللہ سے حجت بازی کریں۔ نیک اعمال کی رعایت رکھنے والوں کیلئے سفارش کرینگے اور نیک اعمال کو چھوڑنے والوں کے خلاف مخاصمت کرینگے۔

قوله : فتجيء الصلاة فتقول: اپنی بولنے والی زبان سے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بزبان حال بولنا مراد ہو۔ اور اعمال کے آنے سے مراد اعمال کے اثر کا ظاہر ہونا اور آخرت میں اعمال کا نتیجہ۔

قوله: يارب انا الصلوة: یعنی وہ عمل جس کو تیری کتاب میں تمام اعمال کی ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے: ﴿**الا المصلين الذين هم على صلاتهم دائمون**﴾ [المعارج-۲۳]

ترجمہ: ''مگر وہ نمازی (یعنی مؤمن) جو اپنی نماز پر برابر توجہ رکھتے ہیں۔''

اور تمام اعمال کے اختتام میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ﴾ [المعارج-۳٤-۳٥] ''اور جو اپنی (فرض) نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔ (پس) ایسے لوگ بہشتوں میں عزت سے داخل ہونگے۔''

یوں بیان کی ہے: **انا المعروفة المشهورة بالفضل والمزية**'' (میں وہ معروف عمل نماز ہوں جس کی فضیلت اور فوقیت مشہور ہے۔) جیسا کہ کہا جاتا ہے: **انا لعالم** ۔ (میں معروف عالم ہوں۔) اور اس کی طرح ہے ایک قائل کا یہ قول:

انا ابو لنجم وشعری شعری

''میں معروف ومشہور شخص ابوالنجم ہوں اور میرے اشعار معروف اشعار ہیں۔''

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ مجھے شفاعت کا مرتبہ حاصل ہے کیونکہ میں دین کا ستون ہوں۔ جیسا کہ ارشاد ربانی [**أولئك على هدى**] میں ہے۔ یعنی بے شک تُو بھلائی کی حامل ہے لیکن صرف تُو نجات کیلئے کافی نہیں ہے۔ اور صرف تیری شفاعت ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے اعمال یعنی صدقہ، روزہ وغیرہ کو بھی دیکھا جائے گا اور ان کو دیکھ کر فیصلہ کیا جائے

---

❶ ۔ فتجيء الصدقة......ثم يجيء الصيام:

شاید آخرت میں صدقہ سے صیام کا ذکر اسلیئے مؤخر ہوا کہ دنیا میں صوم صدقہ کے بعد واجب ہوا ہے۔

یقول: جملہ مستانفہ ہے۔ یا حال ہے۔ اور بظاہر "**فیقول**" ہونا چاہیے تھا۔

اللّٰہ تعالٰی: اور ایک صحیح نسخہ میں "عزوجل" کے الفاظ بھی ہیں۔

یجیئ الاسلام: یعنی وہ باطنی تابعداری جو ظاہری تابعداری کیلیئے باعث ہے اور اس کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اصحاب یقین اور مضبوط علم کے حامل علماء اسلام اور ایمان کے مترادف ہونے کے قائل ہیں۔

فیقول: یا رب انت السلام و انا الاسلام:

ہمارے ناموں کے درمیان مادہ اشتقاق کے اعتبار سے ہے مناسبت ہے۔ ایک حدیث میں ثابت ہے:

الرحم شجنة من الرحمن: (رحم، رحمٰن کی ایک شاخ ہے)

لہٰذا اس کا مقتضی یہ ہے کہ مجھے قائم کرنے والا تیرے مہمان خانہ "دارالسلام" میں داخل ہو جائے۔

قولہ: فیقول اللّٰہ تعالٰی: انك علی خیر: بہت بڑی خیر پر ہو کیونکہ تم ایک حسین مذہب پر مشتمل ہو۔

آخذ: متکلم کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

یعنی جس کو انعام دے کر چشم پوشی کروں، تو ہی اصل ہے، اطاعت اور معصیت کا مدار تجھ پر ہے۔

قولہ. قال اللّٰہ تعالٰی فی کتابہ...... : اس میں ایک باریک اشارہ ہے جو ایک عمدہ خوشخبری کو متضمن ہے۔ اور وہ خوشخبری یہ ہے کہ جو شخص اسلام پر مرے وہ ہمیشہ کیلیئے نقصان اٹھانے والوں میں سے نہیں ہوگا بلکہ آخر میں کامیاب نجات پانے والوں میں سے ہوگا۔ اور اطاعت اور عبادت میں جبکہ اس کے ساتھ اسلام کی قوت بھی ہو اللہ کی طرف سے مسامحت اور معافی کی اُمید ہے۔ ہم اللہ سے معافی اور عافیت طلب کرتے ہیں اور دوزخ کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

۵۲۲۵ : وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ لَنَا سِتْرٌ فِيْهِ تَمَاثِيْلُ طَيْرٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاعَائِشَةُ حَوِّلِيْهِ فَإِنِّيْ إِذَا رَأَيْتُهُ ذَكَرْتُ الدُّنْيَا۔

اخرجه احمد فی المسند ٦/٢٤١۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہمارے ہاں (دروازے پر یا بطور دیوار گیری) جو پردہ تھا اس پر پرندوں کی تصویریں بنی ہوتی تھیں چنانچہ (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے عائشہ! اس پردہ کو تبدیل کردو، کیونکہ جب میں اس کو دیکھتا ہوں تو مجھے دنیا یاد آنے لگتی ہے"۔

تشریح: **قولہ: قالت: کانت لنا سنر فیہ تماثیل طیر**: ستر "سین" کے کسرہ کے ساتھ

حولیہ اس کو تبدیل کردو یا دوسری جگہ منتقل کردو۔

قولہ: فانی اذا رایتہ ذکرت الدنیا:

حکم کی جو علت بیان فرمائی یہ علت دلالت کرتی ہے کہ وہ تصاویر بہت چھوٹی تھیں۔ یا یہ واقعہ اُس زمانے کا ہے جب تصویر کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی۔ اور تصاویر والی جگہ میں ملائکہ رحمت کے داخل نہ ہونے کی بات بھی نازل نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ یہ علم تھا

کہ اغنیاء کی عیش وعشرت کی چیزوں کو دیکھنا فقراء کے قلوب کی حلاوت کو زائل کرتی ہے۔﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾ [طہ۔۱۳۱] ''ہرگز اُن چیزوں کی طرف آپ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھئے جس سے ہم نے ان (کفار) کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کیلئے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ (محض) دنیوی زندگی کی رونق ہے۔اور آپ کے رب کا عطیہ (جو آخرت میں ملے گا) بدرجہا بہتر ہے اور دیرپا ہے۔''

۵۲۲۶ : وَعَنْ اَبِيْ اَيُّوْبَ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عِظْنِيْ وَاَوْجِزْ فَقَالَ اِذَا قُمْتَ فِيْ صَلَاتِكَ فَصَلِّ صَلٰوةَ مُوَدِّعٍ وَلَا تَكَلَّمْ بِكَلَامٍ تَعْذِرُ مِنْهُ غَدًا وَاَجْمِعِ الْاِيَاسَ مِمَّا فِيْ اَيْدِي النَّاسِ۔

اخرجه ابن ماجه ١٣٩٦/٢ حديث رقم ٤١٧١ واحمد في المسند ٤١٢/٥۔

ترجمہ: ''حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا پھر عرض کیا کہ (یارسول اللہ!) مجھے کوئی نصیحت فرما دیجئے اور اس میں اختصار فرمائیے گا! حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم اپنی نماز کو ادا کرنے کے لئے کھڑے ہو تو اس شخص کی طرح نماز پڑھو جو رخصت کرنے والا اور چھوڑنے والا ہے (حاصل یہ کہ نماز کے دوران تمام سے اپنا دھیان ہٹا کر مکمل اخلاص کے ساتھ اپنے پروردگار کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھو) نیز اپنی زبان سے ایسی کوئی بات نہ نکالو جس کے سبب تمہیں کل (قیامت کے دن اللہ کے حضور) عذر خواہی کرنی پڑے (یا یہ کہ عذرخواہی کا مفہوم عموم پر محمول ہے یعنی کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکال جس کے سبب تمہیں اپنے دوستوں' رفقاء و متعلقین اور تمام مسلمانوں کے سامنے پشیمان ہونا پڑے اور معذرت کرنے کی ضرورت پیش آئے) اور اس چیز سے ناامید ہو جانے کا پختہ ارادہ کر لو جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہے' (یعنی خدا نے تمہاری مقدر میں جتنا لکھ دیا ہے اور تمہیں جو کچھ دے دیا ہے اسی پر کفایت و قناعت کرو اور لوگوں کے مال ومتاع سے اپنی امید وابستہ نہ کرو''۔ (یعنی اختصار کے ساتھ بیان کریں اور اہم بات پر اکتفاء کریں)۔

تشریح: قوله: اذا قمت في صلاة فصل صلاة مودع:

''دال'' کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ یعنی اپنے مولیٰ کے ساتھ مناجات میں مشغول ہو کر غیر اللہ کو چھوڑنے والا ہو۔ یا معنی یہ ہے کہ اُس شخص جیسی نماز پڑھو جو نماز کو زندگی کی آخری نماز سمجھ کر پڑھتا ہے۔ اور اسی معنی میں حجۃ الوداع ہے یعنی اس طرح فرض کرو کہ یہ تمہاری زندگی کی آخری نماز ہے لہٰذا اپنے آخری عمل کو اچھی طرح ادا کر کے اچھا خاتمہ حاصل کریں۔ اور اپنی اُمیدوں کو مختصر کر دو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ موت کا وقت قریب آچکا ہو۔ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ مکمل طور پر اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اپنے رب کی مناجات کیلئے دوسروں کو چھوڑ دے۔

قوله: ولا تكلم بكلام تعذر منه غدا: لا تکلم: ایک ''تاء'' حذف ہے اور ایک نسخہ میں دونوں تاء مذکور ہیں۔

تعذر ''تاء'' کے فتحہ اور ''ذال'' کے کسرہ کے ساتھ

اور اسی معنی میں یہ ارشاد نبوی ہے کہ ''مسلمان کے اسلام کا حسن اس میں ہے کہ بے کار باتوں کو چھوڑ دے۔

قوله: وأجمع الایاس ممافي ایدي الناس: واجمع لاياس ہمزہ کے فتحہ اور ''میم'' کے کسرہ کے ساتھ اور اس کے برعکس بھی درست ہے۔

اور اسی باب سے ہے یہ ارشاد باری تعالیٰ [**فاجمعوا کیدکم**] ابوعمرو کی قرات میں یہ لفظ باب **جمع یجمع** سے ہمزہ وصلی اور ''میم'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور دوسروں کی قراءت میں باب اجمع سے ہمزہ قطعی اور ''میم'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور اجمع کا معنی ہے کسی کام کا پختہ ارادہ کرنا۔ یا یہ دو لغات ہیں، جمع کے معنی میں ہے لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ اُمید منقطع کرنے کا پختہ ارادہ کر دیا طمع چھوڑ دو اور اُمید کو قطع کرنے پر اپنے دل کو جمائے رکھو۔

ضرورت کے بقدر اللہ کے ہاں جو روزی مقرر ہے لکھی جا چکی ہے اُس پر قناعت کر جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**نحن قسمنابینهم معیشتهم في الحیاة الدنیا۔۔۔ وان کل ذالك لما متاع الحیاة الدنیا والآخرة عندربك للمتقین**﴾ [**الزخرف ۔۳۲۔۳۵**]

ترجمہ: ''اور یہ سب (ساز و سامان) کچھ بھی نہیں صرف دنیوی زندگی کی چند روزہ کامرانی ہے۔۔۔۔ اور آخرت آپ کے رب کے ہاں خدا ترسوں کیلئے۔''

اور حدیث میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ لوگوں کے مال و دولت پر نظر رکھنا فقر و افلاس کی علامت ہے۔ اور قلبی غنی لوگوں کے پاس موجود اشیاء سے اُمیدوں کے منقطع ہونے کا نام ہے۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں معنی یہ ہے کہ لوگوں سے اُمیدیں منقطع کرنے پر اپنی رائے کو مضبوط کر دو اور پختہ ارادہ کرو۔ اور اس ارشاد باری تعالیٰ: **فاجمعوا کیدکم** کے ہم معنی ہے۔ اور بظاہر کاتب نے ''یاس'' کی جگہ ''ایاس'' لکھا ہے کیونکہ ''ایاس'' اسم بمعنی ''اعطی'' کا مصدر ہے تاکہ ''ایس'' کا جو کہ یئس مصدر ہے، کیونکہ فعل مقلوب کا مصدر فعل اصلی کے موافق ہوتا ہے نہ کہ فعل مقلوب کے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ باب مفاعلہ کا مصدر ہو اور تقدیر یہ ہو: **انه من ایس نفسه بما في ایدي الناس** ایاسا اور دوسرے ہمزہ کو تخفیف کیلئے حذف کر دیا ہو۔ (انتہی) قاموس میں لکھا ہے کہ ''ایس'' باب سمع سے جس کا مصدر ''ایاس'' آتا ہے کا معنی ہے نا اُمید ہونا۔

چنانچہ اُن لوگوں کا روایت کو غلطی پر محمول کرنا دُرست نہیں ہے جو اپنے سینے کے علم پر اعتماد کرتے ہیں اور کتاب کے الفاظ پر اعتماد نہیں کرتے۔ خصوصاً جبکہ یہ حدیث ایسے متعدد طرق سے مروی ہے جن کی تصحیح کی گئی ہے۔ میرک نے مؤلف کے قول (رواہ احمد) کے بعد منذری سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اس حدیث کو تائید حاصل ہوتی ہے۔

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی حضور علیہ السلام کے پاس آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے وصیت فرما دیجئے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا لوگوں کے ہاتھوں میں موجود اشیاء سے نا اُمیدی کو لازم پکڑ و اور اپنے آپ کو طمع سے بچاؤ کیونکہ یہ فی الحال نقد فقر ہے، اور اس طرح نماز پڑھا کرو جیسے رخصت ہونے والا شخص نماز پڑھتا ہے اور اپنے آپ کو اُن باتوں سے بچاؤ جن کی وجہ سے تمہیں معذرت کرنی پڑے۔

اس حدیث کو حاکم نے اور بیہقی نے زہد میں نقل کیا ہے اور حاکم نے فرمایا ہے کہ ان الفاظ کی سند صحیح ہے۔ اور طبرانی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے اس جیسی حدیث نقل کی ہے۔ اور یہ بات محال ہے کہ ایک کاتب سے سہو ہوا اور حفاظ اور اصحاب حدیث اُس پر اتفاق کریں۔ واللّٰہ تعالٰی اعلم بالصواب

۵۲۲۷ : وَعَنْ مُعَاذِبْنِ جَبَلٍ قَالَ لَمَّا بَعَثَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلَى الْيَمَنِ خَرَجَ مَعَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْصِيْهِ وَمُعَاذٌ رَاكِبٌ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْشِيْ تَحْتَ رَاحِلَتِهِ فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ يَا مُعَاذُ اِنَّكَ عَسٰى اَنْ لَّا تَلْقَانِيْ بَعْدَ عَامِيْ هٰذَا وَلَعَلَّكَ اَنْ تَمُرَّ بِمَسْجِدِيْ هٰذَا وَقَبْرِيْ فَبَكٰى مُعَاذٌ جَشَعًا لِفِرَاقِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ الْتَفَتَ فَاَقْبَلَ بِوَجْهِهٖ نَحْوَ الْمَدِيْنَةِ فَقَالَ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِيَ الْمُتَّقُوْنَ مَنْ كَانُوْا وَحَيْثُ كَانُوْا ۔

روی الاحادیث الاربعۃ احمد

اخرجہ احمد فی المسند ۲۳۵/۵۔

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں (عامل بنا کر) یمن روانہ فرمایا تو آپ ﷺ (الوداع کہنے کے لئے کچھ دور تک) ان کے ساتھ گئے اور (اس دوران) آپ ﷺ ان کو نصیحت و ہدایت کرتے رہے' نیز اس وقت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ تو اپنی سواری پر سوار تھے جب کہ رسول خدا ان کی سواری کے ساتھ ساتھ (پیدل) چل رہے تھے! جب آپ ﷺ (تلقین ونصیحت سے) فارغ ہوئے تو ارشاد فرمایا: ''معاذ! میری عمر کے اس سال کے بعد شاید تم مجھ سے ملاقات نہ کر سکو اور ممکن ہے کہ تم (جب یمن سے واپس لوٹو گے تو مجھ سے ملاقات کرنے کے بجائے) میری اس مسجد اور میری قبر کے پاس سے گزرو'' ۔ معاذ رضی اللہ عنہ (یہ سن کر) رسول اللہ ﷺ کی جدائی کے غم میں رونے لگے اور رسول کریم ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ کی طرف منہ پھیر کر مدینہ کی جانب اپنا رخ انور فرمالیا' پھر فرمایا: میرے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جو پرہیز گار ہیں خواہ وہ کوئی ہوں (یعنی کسی بھی طبقہ و مرتبہ کے کسی بھی رنگ ونسل کے لوگ ہوں) اور کہیں ہوں (یعنی کسی بھی ملک اور خطہ ارض سے ان کا تعلق ہو) رنگ ونسل' کسی ملک وقوم اور کسی طبقہ و مرتبہ کے ہوں)'' ان چاروں روایتوں کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے''۔

تشریح: یوصیہ مخفف اور مشدّد دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔

اللہ کے سامنے تواضع اور مؤمنین کے ساتھ خوش خلقی کا سلوک کرنے کے واسطے اس طرح کرتے تھے۔ اور اسی سے ساتھیوں کے ہمراہ چلنے کے استحباب پر استدلال کیا گیا ہے۔

وقبری ای: مع قبری۔ ''واؤ'' ''مع'' کے معنی میں ہے۔ یہ طیبی رحمہ اللہ کی رائے ہے۔ بظاہر ''قبری'' کا ''مسجدی'' پر عطف ہے۔

اور تقدیر عبارت یوں ہے: ان تمر بمسجدی ھذاو بقبری ایضا: شاید تم میری اس مسجد اور میری قبر کے پاس سے گزرو)۔ حضور علیہ السلام نے اس بات کو مبہم طور پر بیان کیا کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ بات مکمل طور پر واضح نہ تھی۔

پھر خوب سمجھ لو کہ " عسٰی " کا معنی محبوب چیز کی اُمید کرنا اور ناپسندیدہ چیز سے خوف کرنا ہے۔ یہ دونوں معانی اللہ کے اس ارشادِ گرامی میں پائے جاتے ہیں: ﴿وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ﴾

[البقرہ: ۲۱٦]

''اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو۔ اور یہ بات بھی ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں (باعث) خرابی ہو''۔

"لعل " کا معنی ہے توقع کرنا' اور ''توقع'' کا معنی ہے محبوب چیز کی اُمید کرنا اور ناپسندیدہ چیز کا خوف کرنا۔ جیسے :لعل الحبیب واصل اُمید ہے میرا دوست پہنچ جائے گا) اور ''لعل الرقیب حاصل'' ''لعل ''صرف ممکن اُمور میں استعمال کیا جاتا ہے جبکہ ''لیت'' ناممکن اُمور میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً لیت الشباب یعود (کاش کہ جوانی لوٹ آتی) چنانچہ ''عسٰی'' اور ''لعل'' جو حدیث بالا میں مذکور ہیں آخری معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ ظاہر اور متبادر یہی ہے۔'' المغنی'' میں لکھا ہے کہ ''لعل'' کو اکثر ''عسٰی'' پر محمول کر کے اس کی خبر پر ''ان'' داخل کرتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر کا شعر ہے:

لعلك يوما ان تلم ملمة

عليك من اللائي يد عنك اجدعا

''شاید تجھ پر کسی دن مصیبت آجائے۔ اور تم دیکھو گے کہ کون ہے جو تجھے بے یار و مددگار چھوڑے گی۔''

اور طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''لَعَلَّ'' حقیقت (اُمید کے معنی) میں مستعمل ہے' کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ جل شانہ کی ملاقات کی رغبت تھی۔ ''لَعَلَّ'' کو ''عسٰی'' کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے ''لَعَلَّ'' کی خبر پر ''اَنْ'' داخل فرما کر اس ارشاد باری کی طرف اشارہ کیا: ﴿عسى ان يبعثك ربك مقاما محمودا﴾ [الاسراء - ۷۹]

قولہ: فبكى معاذ جشعا لفراق رسول الله ثم التفت فاقبل بوجهه نحو المدينة: "جیم اور شین کے فتحہ کے ساتھ بمعنی (جزعا و فزعا۔ یعنی (دوست کی جدائی پر غمگین ہونا)۔ حدیث کے الفاظ ''لفراق رسول الله صلى الله عليه وسلم'' تاکید کیلئے ہیں' یا تجرید کی وجہ سے لائیں گئے ہیں۔

التفات کی تفسیر ہے۔ شاید حضور علیہ السلام کا معاذ سے اپنا چہرہ مبارک پھیرنے کی وجہ یہ ہو کہ معاذ کو روتا ہوا مزید نہ دیکھیں کہ کہیں حضور علیہ السلام کو رونا آ جائے اور حضور علیہ السلام کے رونے سے معاذ کا غم مزید بڑھ جائے۔ اور ساتھ اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ دنیا میں جدائی ایک ضروری چیز ہے اور آخرت کی طرف توجہ کرنے سے کوئی چارہ کار نہیں۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے معاذ رضی اللہ عنہ کو اپنے فعل سے تسلی دی اور اپنے قول سے وصیت فرمائی۔ جب فرمادیا کہ تم مجھ سے جدا ہو رہے ہو' مدینہ سے جدا ہو رہے ہو' اور مدینہ کو چھوڑ رہے ہو' مجھے اس کے بعد (دنیا میں) نہ دیکھو گے۔ اور اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا' کہ انبیاء اور متقی لوگوں کے اکٹھے ہونے کی جگہ آخرت میں ہے۔

قولہ: فقال: ان اولى الناس بى من كانوا حيث كانوا: میری شفاعت کے زیادہ حق دار یا لوگوں میں میرے مقام کے زیادہ قریب ہیں......

"من" کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے جمع کا صیغہ ذکر کیا۔اور مطلب یہ ہے کہ جو بھی ہو۔عربی چاہے عجمی کالا ہو چاہے گورا شرافت وعزت والا ہو چاہے کم درجہ والا انسان ہو۔چاہے مکہ اور مدینہ میں ہو چاہے۔یمن کوفہ اور بصرہ میں ہو۔لہٰذا اُویس قرنی کو دیکھیں کہ یمن میں رہ کر تقویٰ کا کامل درجہ حاصل کیا۔دوسری جانب حرمین شریفین میں ایک جماعت کی یہ حالت تھی کہ حضور علیہ السلام کے قریب مقام سے نہ صرف محروم ہوئے بلکہ حضور علیہ السلام کو تکالیف پہنچائیں یہاں تک کہ رشتہ داروں میں سے بعض نے ایذائیں پہنچائیں۔خلاصہ یہ کہ (اے معاذ) جب تم معنوی طور پر مجھ سے قریب ہو تو صوری طور پر تمہارا مجھ سے دور ہونا کوئی نقصان کی بات نہیں۔کیونکہ اعتبار تقویٰ کا ہے۔جیسا کہ اللہ جل شانہ نے اپنے اس ارشاد میں مطلقاً فرمایا ہے، یہ ارشاد کسی مکان یا زمانہ یا انسان کے کسی نوع کے ساتھ مختص نہیں ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [الحجرات: ۱۳] "اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔"

اور اس میں اس بات کی ترغیب ہے کہ تقویٰ کو لازم پکڑنا چاہیے۔اور دنیا کی عارضی جدائی اور دائمی جدائی (موت) کے وقت تقویٰ کی وصیت کرنی زیادہ مناسب ہے۔جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:﴿وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنِ اتَّقُوا اللَّهَ﴾ [النساء: ۱۳۱] "اور واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تھی اور تم کو بھی، کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔"

نیز اس حدیث میں اُن اُمتیوں کیلئے تسلی ہے جنہوں نے حضور علیہ السلام کا زمانہ نہیں پایا اور حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔اس مقام میں اس عبارت کے منصود کی وضاحت کے سلسلے میں میں اتنا ہی لکھ سکا ہوں۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کا معاذ کو اپنی موت کی اطلاع دینے کے بعد اپنا چہرہ مبارک پھیرنا شاید تسلی کے طور پر تھا کہ جب تم میرے بعد مدینہ لوٹو تو اُن لوگوں کی اقتدا کرنا۔جو میرے زیادہ قریب ہیں اور وہ متقی لوگ ہیں۔اور ان سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا۔اسی طرح کی ایک حدیث جبیر بن مطعم سے مروی ہے کہ ایک عورت حضور علیہ السلام کے پاس آئی اور کسی چیز کے بارے میں آپ۔ سے بات چیت کی۔حضور علیہ السلام نے اس عورت سے فرمایا کہ بعد میں حاضر ہو۔تو اُس عورت نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول !اگر میں حاضر ہوؤں اور آپ مجھے نہ ملے تو پھر کیا ہوگا؟ اس عورت کا مطلب یہ تھا کہ آپ وفات پا گئے ہوں۔میری رائے ہے کہ اس عورت کے قول کا یہ مطلب مراد لیا بظاہر خلاف ادب ہے۔بلکہ مراد یہ تھا کہ اگر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر میں نہ پا سکوں۔آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر میں نہ ملا تو ابوبکر کے پاس چلی جانا۔

یہ دلیل ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور علیہ السلام کے بعد حضور علیہ السلام کا خلیفہ اور قائم مقام ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث اس مدعیٰ پر دلالت کرنے میں صریح نہیں ہے۔کیونکہ اس بات کا صرف احتمال ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق ابوبکرؓ سے ہے۔اس لئے علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ ابوبکرؓ کی خلافت پر کوئی صریح دلیل ہے نہ علیؓ کی خلافت پر۔

اسنادی حیثیت:احمد کی اسانید میں کم سے کم درجہ یہ ہے کہ سند حسن ہوتی ہے۔

۵۲۲۸:وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ تَلَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ

صَدْرَهُ لِلْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ النُّوْرَ اِذَا دَخَلَ الصَّدْرَ انْفَسَخَ فَقِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ لِتِلْكَ مِنْ عَلَمٍ يُعْرَفُ بِهٖ قَالَ نَعَمْ اَلتَّجَافِيْ مِنْ دَارِ الْغُرُوْرِ وَالْاِنَابَةُ اِلٰى دَارِ الْخُلُوْدِ وَالْاِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُوْلِهٖ۔

رواه البيهقي في شعب الايمان ٣٥٢/٧ حديث رقم ١٠٥٥٢

ترجمہ: ''اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت شریف تلاوت فرمائی پڑھی: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ: یعنی اللہ تعالیٰ جس شخص کو ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے (یعنی خاص ہدایت کہ جو اس کو مرتبۂ اختصاص تک پہنچادے تو اس کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے (بایں طور کہ اس کو شرائع اسلام اخلاص کے ساتھ قبول کرنے کی توفیق عطا فرماتا ہے) پھر حضور ﷺ نے (گویا آیت کی تفسیر میں) فرمایا: جب (ہدایت کا) نور سینہ میں داخل ہوتا ہے تو سینہ کشادہ ہو جاتا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! (کیا کوئی ایسی علامت ہے کہ جس سے اس حالت اور کیفیت کو معلوم کیا جا سکے) حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں! اس کی نشانی ہے' دارالغرور (دنیا) سے دور ہونا 'اور آخرت کی طرف کہ جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا جہان ہے' رجوع کرنا پوری طرح متوجہ رہنا اور مرنے سے پہلے مرنے کے لئے تیاری کرنا''۔

تشریح: **قوله: تلا رسول الله ﷺ** ......: طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ اُسکے ساتھ مہربانی کرتے ہیں اور اُس کے دل میں نور داخل کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے اسلام کیلئے رغبت پیدا ہو جاتی ہے اور نفس کو اسلام کی وجہ سے آرام حاصل ہوتا ہے اور اسلام میں داخل ہونا محبوب بن جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ معنی نفس الامر میں درست ہے مگر شرح صدر کی جو تفسیر عنقریب آگے ذکر ہوگی' اُسکے موافق نہیں ہے۔

ان النور اذا دخل الصدر انفسح ۔ ہدایت کا نور جب سینہ میں داخل ہوتا ہے تو دل کھل جاتا ہے اور اس طرح وسیع ہو جاتا ہے کہ شریعت کے تمام احکام کو قبول کرنے کی گنجائش رکھتا ہے۔ اور وہ احکام جن کو اللہ نے مقرر کیا ہے اور اللہ نے اُن کا فیصلہ کیا ہے اُنکی کڑواہٹ اس کے لئے مٹھاس میں بدل جاتی ہے۔ اور یہ دل درحقیقت اللہ کا عرش ہے جس کو حدیث قدسی میں یوں بیان کیا ہے: **لا يسعني ارضي ولا سمائي ولكن يسعني قلب عبدي المؤمن**

''مجھے نہ میری زمین سمو سکتی اور نہ میرا آسمان میں، لیکن میرے مؤمن بندہ کا دل مجھے سمو لیتا ہے''۔

اسلئے کہ نچلی اور اُوپر کی تمام مخلوقات میں اُن کلیات اور جزئیات کے ادراک کی قابلیت نہیں ہے جن کا تعلق اللہ کی ذات اور صفات سے ہے۔ اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ ......﴾

[الاحزاب: ٧٢]

''ہم نے یہ امانت (یعنی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں) آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی''۔

یہ اُن لوگوں کے بارے میں ہے جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ اسلام کیلئے کھول دے اور ہدایت کا ارادہ کرے' اس کے برعکس جن کی گمراہی کا اللہ تعالیٰ ارادہ کرے تو اُن کے بارے میں ارشاد باری ہے: ﴿وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا

كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ...﴾ [الانعام۔ ۱۲۵] ''اور جس کو بے راہ رکھنا چاہتے ہیں اس کے سینے کو تنگ بہت تنگ کر دیتے ہیں۔جیسے کوئی آسمان میں چڑھتا ہو۔''

قولہ: فقيل يارسول الله هل لتلك من علم يعرف به:
درست یہ ہے کہ کیا اس حالت کی جس کو کشادگی سے تعبیر کیا گیا۔

ومن علم : یعنی علامت ونشانی اور ''من'' زائدہ ہے۔

تعرف : ایک نسخہ میں اس لفظ کو مذکر کے صیغہ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔معنی کا اعتبار کرتے ہوئے۔تا کہ ہم اپنی حالت کا اندازہ لگا سکیں اور جب آراء کا اختلاف ہو تو رجوع کریں۔فرمایا کہ ہاں بہت سی علامت ہیں۔

قولہ: التجافي : یعنی دنیا کی حقارت کی بناء پر بے رغبتی کے ساتھ دنیا سے دُوری میں تکلف اور مبالغہ کرنا تا کہ سعادت حاصل ہو جائے۔

قولہ: التجافي : دنیا جو دھوکہ باز ہے جادوگر ہے غدر کرنے والی ہے اور مکر وفریب کرنے والی ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فلا تغر نكم الحياة الدنيا﴾ [لقمان۔۳۳،فاطر۔۵] ''ایسا نہ ہو کہ یہ دنیوی زندگی تم کو دھوکہ میں ڈالے رکھے''۔ کیونکہ یہ تھکاوٹ اور بدبختی کی جگہ ہے اگر چہ اس کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خوشی کی جگہ ہے۔اس کی مثال اُس سراب جیسی ہے جس کو پیاسا بندہ پانی سمجھتا ہے۔یہاں تک کہ اس دنیا کے بارے میں بادشاہ،اغنیاء اور کمزور سب کے سب دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔

والانابة الى دار الخلود والاستعداد لموت : رجوع اور مکمل طور پر مائل ہونا۔یعنی گناہوں سے توبہ کر کے اور عبادت کی طرف آگے بڑھ کر اور اپنی طاقت کو اطاعت میں صرف کر کے

قبل نزوله : یعنی موت کے آنے سے پہلے یا موت کے مقدمات یعنی بیماری اور بڑھاپے سے پہلے جس میں بندہ علم حاصل کرنے اور عمل کرنے پر قادر نہیں ہوتا اور پشیمانی کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

۵۲۲۹۔۵۲۳۰ :وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ وَاَبِيْ خَلَّادٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا رَاَيْتُمُ الْعَبْدَ يُعْطٰى زُهْدًا فِي الدُّنْيَا وَقِلَّةُ مَنْطِقٍ فَاقْتَرِبُوْا مِنْهُ فَاِنَّهٗ يُلَقّٰى الْحِكْمَةَ ۔

رواهما البيهقي في شعب الايمان

اخرجه ابن ماجه في السنن ۱۳۷۳/۲ حديث رقم ۴۱۰۱ والبيهقي في شعب الايمان ۲۵۴/۴ حديث رقم ۴۹۸۵

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوخلاد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم کسی بندے کو اس حال میں دیکھو کہ اس کو (دنیا سے) بے رغبتی اور کم گوئی عطا کی گئی ہے تو اس کی صحبت وقرب میں رہا کرو۔کیونکہ اس کو حکمت و دانائی کی دولت سے نوازا گیا ہے''۔ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے

۱: پہلی حدیث جہت سے طرق سے ثابت ہے

راویٔ حدیث:

ابوخلاد۔ یہ ابوخلاد ایک صحابی ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا میں ان کے نام اور نسب سے واقف نہیں ہوں۔ ان کی حدیث یحییٰ بن سعید کے نزدیک معتبر ہے جو ابوفروہ سے اور ابوفروہ خلاد سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم دیکھو کسی مؤمن کو کہ اس کو دنیا کے بارے میں زہد عطا کر دیا گیا ہے اور کم گوئی عطا کی گئی ہے تو اس کی صحبت اختیار کرو۔ اس لئے کہ وہ حکمت سکھلائے گا اور دوسری روایت بھی اسی طرح ہے لیکن اس دوسری حدیث میں ابوفروہ اور ابوخلاد کے درمیان ''ابو مریم'' کا واسطہ ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

تشریح: **قولہ: وابی خلاد:** ''لام'' کی تشدید کے ساتھ مؤلف فرماتے ہیں کہ ابوخلاد صحابی ہیں۔

قولہ: اذا رایتم العبد یعطی زھدا فی الدنیا وقلۃ فاقتربوا منہ:

جب تم کسی ایسے مؤمن کو دیکھو جس کو دُنیا کے بارے میں زہد اور کم گوئی کی صفت عطا کی گئی ہو تو اُسکے قریب رہو کیونکہ اُس سے حکمت کی باتیں ملتی ہیں۔ انتہی اس میں اس حدیث کے منقطع اور متصل ہونے میں اختلاف کی طرف ارشارہ ہے۔ اور ابن عبدالبر نے جو فرمایا کہ ''اس جیسی ایک روایت جس میں'' اس جیسی روایت سے مراد یہ ہے جس کو مصنفؒ نے اپنے قول ''ان رسول اللہ ﷺ قال اذا رأیتم العبدیعطی زھدا'' سے ذکر کیا ہے۔ یعنی دنیا کی رغبت کی قلت

قولہ: فانہ یلقی الحکمۃ: **یلقی:** ''قاف'' مفتوح ومشدد ہے' اور ''قاف'' کی تخفیف بھی جائز ہے۔

''**الحکمۃ**'' ایسی نصیحت کی بات جو قرآن وسنت کے موافق ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾ [البقرۃ۔۲۶۹]

''دین کا فہم جس کو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں' اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کو دین کا فہم عطا کر دیا گیا اسکو بڑی خیر کی چیز مل گئی۔''

حکمت درحقیقت شریعت وطریقت کے مطابق علم اور عمل میں مضبوطی پیدا کرنے کا نام ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے: ''**من اخلص للہ اربعین صباحا أظھر اللہ ینا بیع الحکمۃ من قلبہ علی لسانہ۔**''

''جو شخص چالیس دن تک خالصۃً اللہ (کی عبادت) کرے گا اللہ تعالیٰ اُس کے دل سے حکمت کے چشمے اُس کی زبان پر جاری کر دیتا ہے''۔ اس کی رُو سے صاحب حکمت وہ شخص ہے جو عالم باعمل ہو کامل ہو' مخلص ہو' مرشد ہو' دوسروں کا روحانی علاج کر کے دوسروں کو کامل کرنے والا ہو۔ چنانچہ ہر شخص کیلئے ضروری ہے کہ اُسکے ساتھ مجلس میں رہے اور اُسکے کے ساتھ ہم کلامی رکھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ [التوبۃ:۱۱۹]

یعنی جو قول اور حال دونوں میں سچا ہو۔ کسی عارف باللہ کا قول ہے کہ اللہ کی صحبت حاصل کرو' اگر یہ نہیں کر سکتے تو اُن لوگوں کی صحبت حاصل کرو جو اللہ کے صحبت یافتہ ہیں۔ بندہ کے افعال اور اقوال کی درستگی کے بعد احوال کی درستگی کی علامت وہ ہے جو سابق حدیث میں گزر چکی ہے۔ یعنی سینہ اس طرح کھل جائے کہ اُسکی صحبت تمام اُمور میں اثر کرے اور اُسکی صحبت میں رہنے والے دنیا سے بے رغبت ہوتے ہیں اور آخرت کا وسیلہ بننے والے بقدر ضرورت روزی سے زائد مال اور جاہ سے بے رغبت ہو

جاتے ہیں۔ بلکہ دونوں جہانوں کے امور سے فارغ کر دیتے ہیں۔

تخریج: پہلی حدیث کو ابن مبارک نے ''زہد'' میں نقل کیا ہے۔ فریابی' عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ نے، اور بیہقی نے "الاسماء و الصفات" میں بنو ہاشم کے ایک شخص ابوجعفر المدائنی سے نقل کیا ہے اور یہ ابوجعفر المدائنی محمد بن علی نہیں ہیں بلکہ کوئی اور راوی ہے)

فرماتے ہیں کہ کسی نے حضور علیہ السلام سے پوچھا کہ مؤمنین میں سے کونسا مؤمن زیادہ سمجھدار ہے؟ حضور علیہ نے فرمایا ''جو شخص موت کو کثرت سے یاد کرے اور موت کے بعد والے احوال کیلئے زیادہ تیاری کرے''۔

نیز فرماتے ہیں کہ کسی نے حضور علیہ السلام سے: ﴿فمن یرد اللّٰہ ان یھدیہ یشرح صدرہ لاسلام﴾ [الانعام: ۱۲۵] کے بارے میں پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! اللہ کس طرح سینہ کھول دیتے ہیں؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ ایک نور دل میں ڈال دیتے ہیں اور دل اس دین کیلئے کھل جاتا ہے اور وسیع ہو جاتا ہے۔ پھر صحابہ نے پوچھا کہ کیا اسکی کوئی علامت ہے جس سے پہچانا جائے؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا: ہیشگی کے گھر آخرت کی طرف متوجہ ہونا' اور دھوکہ کے گھر سے اعراض کرنا' اور موت سے پہلے موت کیلئے تیاری کرنا''۔ اور ایک روایت میں ''قبل لقاء الموت" کی جگہ ''قبل نزول الموت" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے ابن عباسؓ سے ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ......﴾ [الانعام: ۱۲۵] کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ اللہ اُسکے دل کو توحید کے لئے اور توحید پر ایمان لانے کیلئے کشادہ کر دیتے ہیں۔

اور ﴿وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا......﴾ [ایضا] کی تفسیر میں ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ توحید کے بارے میں شک کرتا ہے۔

اور ﴿وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾ [ایضا] ''اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور (عمل میں) سچوں کے ساتھ رہو۔ سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ رستے پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتے ہیں۔ اور جس کو بے راہ رکھنا چاہتے ہیں اس کے سینے کو تنگ بہت تنگ کر دیتے ہیں'' [ترجمہ الانعام: ۱۲۵] کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جس طرح ابن آدم آسمان تک نہیں پہنچ سکتا اس طرح انسان کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے کہ توحید اور ایمان اُس کے دل میں داخل ہو جب تک اللہ تعالیٰ اُس کے دل میں داخل نہ کر دے۔ در منثور میں اس حدیث کے کئی طرق مذکور ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب فضل الفقراء وما كان من عيش النبى ﷺ

باب فقراء کی فضیلت اور نبی ﷺ کی زندگی کے بیان میں

یہاں ''فضل'' سے مراد اجر اور ثواب کی زیادتی ہے۔ مال کی فضیلت اور کپڑوں کے حُسن کی زیادتی مراد نہیں ہے۔ اور ''وما كان من عيش النبي عليه السلام'' سے مراد حضور علیہ السلام کی معیشت وزندگی۔ ایک اور نسخہ میں ''ما كان من عيش النبي صلى الله عليه وسلم'' ''فضل الفقراء'' پر مقدم کیا گیا ہے ترجمۃ الباب میں دونوں چیزوں کو جمع کر کے ذکر فرمانے میں اشارہ ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی فقراء کی مانند تھی جیسا کہ اکثر انبیاء اور اولیاء کی زندگی تھی۔ اور اغنیاء پر فقراء کی فضیلت کیلئے اتنی بات کافی ہے۔ اگرچہ یہ بات ہی اُن بعض اغنیاء پر مخفی ہے جو عالم ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔

۵۲۳۱ : عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٤/ ٢٠٢٤ حديث رقم (١٣٨-٢٦٢٢)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بہت سے وہ لوگ جو (بظاہر تو) پراگندہ بال اور غبار آلود (یعنی نہایت خستہ حال اور پریشان صورت) دکھائی دیتے ہیں جن کو (ہاتھ یا زبان کے ذریعہ) دروازوں سے دھکیل دیا جاتا ہے لیکن (وہ خدا تعالیٰ کے ہاں مقبول اور رفیع الشان ہوتے ہیں) اگر وہ اللہ کے بھروسہ پر قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم کو یقیناً پورا فرما دیتا ہے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: رب اشعث اغبر مدفوع ...... : مدفوع: جر کے ساتھ ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض کسی کے دروازہ پر کھڑا ہو جائے تو لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہونے کی وجہ سے لوگ اُس کو اپنے گھر میں اپنے ساتھ نہیں لے جاتے۔ اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ مخلوق سے اس کی حالت کو چھپانا چاہتے ہیں اور اس لئے کہ کہیں دوسری چیزوں میں اس کا دل نہ لگے اور اس کو ظلم اور حرام کھانے کے دروازوں پر کھڑا ہونے سے اس طرح محفوظ کرتے ہیں جس طرح کہ ہم مریض کو کھانے سے بچاتے ہیں۔ پھر یہ شخص صرف اللہ کے دروازہ پر حاضر ہوتا ہے۔ اپنے کامل غنی کی وجہ سے اللہ کے ماسوا سے سوال نہیں کرتا اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ شخص دنیاداروں کے دروازوں پر آتا ہے اور دنیادار اس کو دھکیل دیتے ہیں اور اپنے گھروں میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ چونکہ اللہ کے اولیاء اللہ اس قسم کی ذلت سے محفوظ ہوتے ہیں۔ اگرچہ بعض اوقات ان کو بعض لوگوں کی طرف سے ذلت اور ملامت برداشت کرنی پڑتی ہے۔

شاید بعض نسخوں میں (''مدفوع'' کی بجائے) ''مرفوع'' ''راء'' کے ساتھ ہے۔ کیونکہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''الا شعث'' کا معنی ہے وہ شخص جس کا سر غبار آلود ہو اور بال بکھرے ہوئے ہوں۔ اور (اس مادہ کی) اصل ترکیب تفرق اور

انتشارہ (کے معنی پر دلالت کرتی) ہے۔ مگر درست "مدفوع" دال کے ساتھ ہے۔ یعنی بڑے لوگوں کے پاس جانے اور محفلوں میں حاضر ہونے سے اُس کو روکا جاتا ہے۔ اور اُس کو کسی دروازے سے اندر جانے نہیں دیا جاتا ہے۔ چہ جائیکہ اُن کے درمیان جا کر مجلس میں بیٹھ جائے۔

قولہ: لو اقسم علی اللہ لا برہ یعنی اللہ کے کسی کام پر قسم اُٹھائے مثلاً قسم اُٹھائے کہ اللہ اس طرح کرے گا یا مثلاً اللہ ایسا نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُسکی قسم کو سچا کر دکھاتے ہیں اور اُسکی قسم کو پورا کر دیتے ہیں۔ اس طرح کہ وہ کام کر دیتا ہے جو قسم کے موافق ہوتا ہے۔ جیسا کہ انس بن نضر کے ساتھ ہوا۔ جب حضور علیہ السلام نے فرمایا: "کتاب اللہ القصاص" تو انس بن نضر نے قسم کھا کر فرمایا: "واللہ لاتکسر ثنیتھا خدا کی قسم اس کے دانت نہیں توڑے جائیں گے چنانچہ جب قصاص والوں نے قصاص چھوڑ دیا یا تو اس عورت کے گھر والے دیت پر راضی ہوگئے۔ قاضی فرماتے ہیں مطلب یہ ہے اگر اللہ سے کوئی چیز مانگے اور قسم اُٹھائے کہ یہ کام کرے گا تو اللہ اس کے اس قول میں اس کو نامراد نہیں کرتے۔ یعنی کسی شخص کے کسی چیز کی قسم اُٹھانے کی قبولیت کو اُس قسم کے پورا ہونے کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔

شارح فرماتے ہیں بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ پر اس طرح قسم اُٹھائے کہ اے اللہ میں تیرے جلال کے واسطے تجھ پر قسم اُٹھاتا ہوں کہ تو اس طرح کر دے یعنی اُسکی قسم کو سچا کر دیتے ہیں۔ اور اس قسم کی قسم میں سچ اور جھوٹ کا کوئی دخل نہیں کہ نیک لوگ اس میں داخل ہوں۔ میری رائے ہے کہ وہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اُسکی اُمید کو سچا کر دیتا ہے اور دُعاء کو قبول کر لیتا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد نے بھی نقل کیا ہے اور حاکم کی ایک روایت اور حلیہ میں ابو نعیم سے یہ الفاظ منقول ہیں:

رب اشعث اغبر ذی طمرین تنبو عنه اعین الناس لو اقسم علی الله لابره

"بہت سے پراگندہ بال غبار آلود اور دو پرانے کپڑوں والے افراد کہ جن کو لوگ نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں اگر اللہ کے نام کی قسم کھائیں۔ تو اللہ اُنکی قسم پوری کر دیتا ہے۔"

۵۲۳۲ : وَعَنْ مُصْعَبِ ابْنِ سَعْدٍ قَالَ رَاٰی سَعْدٌ اَنَّ لَهٗ فَضْلًا عَلٰی مَنْ دُوْنَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ اِلَّا بِضُعَفَاۗئِكُمْ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۸۸/۶ حدیث رقم ۲۸۹۶ واحمد فی المسند ۱۷۳/۱۔

ترجمہ: "حضرت مصعب بن سعد (تابعی) کہتے ہیں کہ (میرے والد) حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے بارے میں یہ خیال کیا کہ وہ اس شخص سے افضل ہیں جو ان سے کمتر ہے (یعنی ضعیف و ناتواں شخص یا فقیر و مفلس) چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کا یہ گمان ختم کرنے اور دوسروں کو آگاہ کرنے کے لئے) فرمایا: تمہیں (دشمنانِ دین کے مقابلہ پر) مدد و سہارا اور رزق انہی لوگوں کی برکت سے ملتا ہے جو کمزور اور ناتواں اور مفلس و نادار ہیں"۔ (بخاری)

تشریح: یعنی شجاعت یا سخاوت وغیرہ کی وجہ سے وہ ان فقراء و ضعفاء سے افضل ہیں جو ان سے کمتر ہیں۔

یعنی لہٰذا فقراء عباد و بلاد کیلئے بمنزلہ اقطاب و اوتاد (کیل اور سہارا) کے ہیں۔ حاصل یہ کہ دشمنوں کے خلاف اللہ کی طرف

سے تمہاری مدد اور اغنیاء کیلئے رزق کی وسعت فقراء کی برکت سے ہے۔لہٰذا ان کا اکرام کرو اور اُن کے مقابلہ میں تکبر نہ کرو۔کیونکہ یہ لوگ تنگدستی کی حالت میں اللہ کی محبت کی راہ پر چلنے والے ہیں اور جنت میں عزت کے اعلیٰ مراتب والے ہیں۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ''ان له فضلا'' کا مطلب ہے ان کی شجاعت،اعزاز اور سخاوت ہے۔لہٰذا حضور علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ یہ شجاعت کمزور مسلمانوں کی برکت سے ہے اور یہ سخاوت بھی کمزور مسلمانوں کی برکت سے ہے۔اور اس بات کو استفہام کی صورت میں اسلئے بیان کیا تاکہ مزید تعزیر وتوبیخ (سخت ڈانٹ اور ملامت) پر دلالت کرے۔

تخریج:اس حدیث کو ابونعیم نے حیلہ میں ان الفاظ سے بیان کی:

هل تنصرون الابضعفائكم بدعوتهم واخلاصهم

''تمہاری مدد صرف کمزور مسلمانوں کی دعاؤں اور ان کے اخلاص کی وجہ سے کی جاتی ہے۔''

۵۲۳۳ : **وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُمْتُ عَلٰى بَابِ الْجَنَّةِ فَكَانَ عَامَّةُ مَنْ دَخَلَهَا الْمَسَاكِيْنَ وَاَصْحَابُ الْجَدِّ مَحْبُوْسُوْنَ غَيْرَ اَنَّ اَصْحَابَ النَّارِ قَدْ اُمِرَبِهِمْ اِلَى النَّارِ وَقُمْتُ عَلٰى بَابِ النَّارِ فَاِذَا عَامَّةُ مَنْ دَخَلَهَا النِّسَاءُ.** (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٤١٥/١١ حديث رقم ٦٥٤٧ومسلم فى صحيحه ٢٠٩٦/٤ حديث رقم (٩٣-٢٧٣٦) واحمد فى المسند ٢٠٥/٥۔

ترجمہ:''حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ فرمانے لگے کہ میں (معراج کی رات'یا خواب میں'یا حالت کشف میں) جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا میں نے دیکھا کہ جولوگ جنت میں داخل ہوئے ہیں ان میں اکثریت غریبوں کی ہے'اور صاحب ثروت کو قیامت کے میدان میں روک رکھا گیا ہے۔مگر اصحاب نار یعنی کافروں کو جہنم میں لے جانے کا حکم دے دیا گیا ہے اور جب میں جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوا تو دیکھا کہ جولوگ اس میں ڈالے گئے ہیں ان میں اکثریت عورتوں کی ہے''۔(بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله:قمت على باب الجنة فكان عامة من دخلها۔**

''عامة'' مرفوع ہے۔'اور بعض نے منصوب کہا ہے۔

قوله:واصحاب الجد محبوسون:

اور جامع میں'' واذااصحاب الجد'' کے الفاظ ہیں۔

''الجد'' ''جیم'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

یعنی مؤمنین میں سے مال والے اغنیاء اور اُمراء یعنی قیامت کے دن صحراء میں روکے گئے تھے۔خلاصہ یہ کہ فانی نصیب والے یعنی اموال والے اور عہدوں والے اپنے اموال کی کثرت اور عہدے اور ان کی وجہ سے دنیاوی لذات اور نفس کی خواہشات کو پورا کرتے ہوئے عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کی وجہ سے طویل حساب میں مبتلا ہونگے اور قیامت کے میدان میں اُن کو روک دیا جائے گا کیونکہ حلال دنیا کا حساب ہوگا۔اور حرام پر سزا ملے گی اور فقراء اس سے بری ہیں۔اس لئے نہ تو ان

سے حساب ہوگا اور نہ جنت میں داخل ہونے سے روکا جائے گا۔ بلکہ اغنیاء سے چالیس برس پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ اور یہ آخرت میں فوت شدہ دنیا کا بدلہ ہوگا۔

قوله:غير أن اصحاب النار قد امر بهم الى النار:
طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یعنی کفار کو دوزخ میں داخل کر دیا جائے گا اور ایمان والوں کو محشر کے میدان میں حساب کیلئے روک دیا جائے گا اور فقراء فقر کی وجہ سے جنت کی طرف سبقت لے جائیں گے کہ میدان میں رُکے بغیر بڑھتے چلے جائیں گے۔
اور جامع میں "الا اصحاب النار فقد امربهم الى النار" کے الفاظ ہیں۔
خلاصہ یہ کہ "غیر" "لکن" کے معنی میں ہے مطلب یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کی دو قسمیں ہوں گی' ایک محبوسین دوسرے مدخلین (یعنی وہ مؤمنین جن کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ لیکن کفار کی ایک ہی قسم ہوگی ان کے جہنم میں جانے کا فیصلہ ہوگا۔
قوله: وقمت على باب النار فاذا عامة من دخلها(النساء: کیونکہ عورتیں دنیا کی طرف کثرت سے مائل ہوتی ہیں اور مردوں کو آخرت کی تیاری سے روکتی ہیں۔
تخریج: احمد اور نسائی نے اس حدیث کو نبی (یعنی اسامہ بن زید) سے روایت کیا ہے۔

۵۲۳۴ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِطَّلَعْتُ فِي الْجَنَّةِ فَرَأَيْتُ اَكْثَرَ اَهْلِهَا الْفُقَرَآءَ وَاطَّلَعْتُ فِي النَّارِ فَرَأَيْتُ اَكْثَرَ اَهْلِهَا النِّسَآءَ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤١٥/١١ حدیث رقم ٦٥٤٦ومسلم فی صحیحه ٢٠٩١/٤ حدیث رقم (٩٤-٢٧٣٧) والترمذی فی السنن ٦١٧/٤ حدیث رقم ٢٦٠٢ واحمد فی المسند ٢٣٤/١۔

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے جنت میں جھانک کر دیکھا تو مجھے جنت والوں کی اکثریت غرباء مساکین کی نظر آئی اور دوزخ میں جھانک کر دیکھا تو اس میں اکثر تعداد عورتوں کی دکھائی دی"۔

تشریح: قوله:اطلعت فى الجنة فرأيت اكثر اهلها الفقراء "فی" بمعنی "علی" کے ہے۔ چونکہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: **لو اطلعت عليهم** [الکهف:۱۸] اگر اے مخاطب تو ان کو جھانک کر دیکھتا" "فی" علی کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے: **لاصلبنكم فى جذوع النخل**۔ سب کو کھجوروں کے درختوں پر ٹنگواتا ہوں"۔
حاصل یہ کہ میں نے جنت کی طرف دیکھا اور اُسکے احوال پر مطلع ہوا۔
فرایت: "علمت" کے معنی میں ہے۔
طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اطلعت، تاملت کے معنی کو اور "رایت" علمت کے معنی کو متضمن ہے۔ اسلئے دو مفعولوں کی طرف متعدی ہیں۔ اور اگر "الاطلاع" اپنے حقیقی معنی پر محمول ہوتا تو اس کے لئے ایک مفعول کافی ہوتا۔ انتہی۔ مگر اس پر اشکال ہے۔ وہ یہ کہ یہاں یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی نہیں ہے۔ جیسا کہ یہ بات واضح ہے۔
تخریج: اس حدیث کو بخاری نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہما ابو ہریرہؓ کے حوالہ سے بھی نقل کیا ہے۔ اور مسلم نے ابن عباسؓ کے

حوالہ سے اور ترمذی نے عمرانؓ اور ابن عباسؓ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔اسی طرح شیخ جزری نے فرمایا ہے۔

میرک نے ذکر کیا ہے کہ اس بناء پر حدیث کے آخر میں مؤلف کا ''متفق علیہ'' کہنا تامل سے خالی نہیں۔اس کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ اس کی بنیاد مسامحت پر ہے۔چونکہ حدیث کے الفاظ میں اتفاق ہے اگرچہ صحابی کے بارے میں اختلاف ہے جن سے حدیث نقل کی گئی ہے۔ہاں صحیح اس طرح تھا کہ یوں کہتے کہ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری نے اس حدیث کو عمران بن حصینؓ سے روایت کیا ہے۔جیسا کہ بعینہ اسی حدیث کو ذکر کرنے کے بعد جامع میں یوں فرمایا ہے: اس حدیث کو احمد، مسلم اور ترمذی نے ابن عباسؓ سے اور بخاری وترمذی نے عمران بن حصینؓ سے روایت کیا ہے۔

۵۲۳۵ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فُقَرَآءَ الْمُهَاجِرِيْنَ يَسْبِقُوْنَ الْاَغْنِيَآءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِلَى الْجَنَّةِ بِاَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٢٨٥/٤ حديث رقم (٣٧-٢٩٧٩)وابن ماجه في السنن ١٣٨١/٢ حديث رقم ٤١٢٣ والدارمي في السنن ٤٣٧/٢ حديث رقم ٢٨٤٤ واحمد في المسند ١٦٩/٢

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: فقراء مہاجرین قیامت کے دن جنت میں اغنیاء (مالداروں) سے چالیس سال پہلے داخل ہو جائیں گے۔(مسلم)

تشریح: قوله:ان فقراء المهاجرين يسبقون الاغنياء

يوم القيامة الى الجنة بأربعين خريفا: لہٰذا غیر مہاجرین سے تو بطریق اولیٰ سبقت کر جائیں گے اسی وجہ سے اغنیاء کو مطلق رکھا گیا۔اسی پر قیاس کیا جائے گا ہر وقت اور ہر جگہ فقراء کو اُس جگہ اور اُس وقت کے اغنیاء کے مقابلہ میں۔چونکہ اغنیاء تو حساب دینے میں لگے ہوں گے اور فقراء حساب دینے کی مشقت سے خلاصی پا چکے ہوں گے۔مفلس دنیا میں بھی اللہ کی امان میں ہوتا ہے' آخرت میں بھی اللہ کی امان میں ہوگا۔

الى الجنة:''يسبقون'' کے متعلق ہے۔

خريفا: طیبی رحمہ اللہ نے نہایہ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ ''خریف'' اُس معروف وقت کو کہتے ہیں جو موسم گرما اور موسم سرما کے درمیان ہوتا ہے لیکن (یہاں) اس سے مراد سال ہے کیونکہ خریف سال میں ایک ہی مرتبہ آتا ہے۔(انتہیٰ) لہٰذا معنی یہ ہوا کہ دنیا آخرت کے چالیس برس کے بقدر ہے۔نیز یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے کثرت مراد ہو۔شریعت میں معتبر کیفیت اور کمیت میں فقراء اور اغنیاء کے احوال کے مختلف ہونے سے حکم مختلف ہوگا۔خلاصہ یہ ہے کہ آخرت میں فقراء کیلئے اس موت کے دوران اچھی زندگی ہوگی اور یہ بدلہ ہوگا اس بات کا کہ ان فقراء سے دنیا کی نعمتیں فوت ہوگئی تھیں۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ [الحاقة: ٢٤]

''کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ ان اعمال کے صلہ میں جو تم نے گزشتہ ایام (یعنی زمانہ قیام دنیا) میں کئے ہیں''۔

یعنی گزرے ہوئے ایام میں یا اُن ایام میں جو کھانے پینے سے خالی تھے روزوں کی وجہ سے یا بھوک کے وقت حدیث میں وارد ہوا ہے جو کہ پہلے گزر چکا ہے۔

''قیامت کے دن سب سے زیادہ دیر تک وہ لوگ بھوکے رہیں گے جو دنیا میں زیادہ دیر تک سیر رہے۔
اور ہم نے جو مراتب کا اختلاف ذکر کیا اس کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو ابن ماجہ میں ابوسعید کے حوالہ سے ان الفاظ کے ساتھ گزری ہے:
''فقراء مہاجرین اپنے اغنیاء سے پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل ہونگے۔''

۵۲۳۶ : وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ مَرَّ رَجُلٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِرَجُلٍ عِنْدَهٗ جَالِسٌ مَا رَأْيُكَ فِي هٰذَا فَقَالَ رَجُلٌ مِّنْ اَشْرَافِ النَّاسِ هٰذَا وَاللّٰهِ حَرِيٌّ إِنْ خَطَبَ اَنْ يُّنْكَحَ وَإِنْ شَفَعَ اَنْ يُّشَفَّعَ فَسَكَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ مَرَّ رَجُلٌ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا رَأْيُكَ فِيْ هٰذَا فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا رَجُلٌ مِنْ فُقَرَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ هٰذَا حَرِيٌّ إِنْ خَطَبَ اَنْ لَّايُنْكَحَ وَإِنْ شَفَعَ اَنْ لَّايُشَفَّعَ وَإِنْ قَالَ اَنْ لَّايُسْمَعَ لِقَوْلِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ مِّلْءِ الْاَرْضِ مِثْلَ هٰذَا. (متفق علیہ)

اخرجه البخاري في صحيحه ٢٧٢/١١ حديث رقم ٦٤٤٧ وابن ماجه في السنن ١٣٧٩/٢ حديث رقم ٤١٢٠۔

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ کے سامنے سے ایک شخص گزرا تو آپ ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ جو شخص گزرا ہے اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے' اس شخص نے جواب دیا کہ یہ شخص نہایت معزز اور شریف ترین لوگوں میں سے ہے' بخدا اس شخص کی حیثیت یہ ہے کہ اگر کسی عورت سے نکاح کا پیغام بھیجے تو اس عورت سے اس کا نکاح ہو جائے اور اگر (کسی حاکم وسردار سے کسی شخص کے بارے میں) کوئی سفارش کرے تو اس کی سفارش مان لی جائے! راوی حضرت سہل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (یہ جواب سن کر) خاموش رہے' اتنے میں ایک دوسرا شخص سامنے سے گزرا تو آپ ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) اپنے پاس بیٹھے ہوئے اسی شخص سے پوچھا کہ اچھا' اس شخص کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! یہ شخص نادار' قلاش مسلمانوں میں سے ہے' اس کی حیثیت تو یہ ہے کہ اگر نکاح کا پیغام دے تو اس سے کوئی نکاح نہ کرے' اگر کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہ ہو اور اگر کوئی بات کہے تو اس کی وہ بات سننے پر کوئی تیار نہ ہو (یعنی یہ شخص اپنے فقر وافلاس کی وجہ سے اتنی قدر ومنزلت نہیں رکھتا کہ کوئی شخص اس کی بات سننے پر آمادہ ہو جائے اور اس کی طرف التفات وتوجہ کرے) رسول کریم ﷺ نے (یہ سنا تو) فرمایا: ''یہ شخص دوسرے جیسے زمین بھر لوگوں سے بہتر ہے۔ جس کی تم نے تعریف کی ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله : فقال لرجل عنده جالس: بظاہر یہ شخص مالداروں میں سے تھا۔ حضور علیہ السلام کے سوال وجواب میں فقراء کی فضیلت پر بڑی تنبیہ ہے
''جالس'' جر کے ساتھ ''رجل'' کی صفت ہے۔ اور ایک نسخہ میں مرفوع ہے ظرف کا فاعل ہونے کی بناء پر' یا خبر کے خبر ہونے کی بناء پر یا مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بناء پر اور مبتدا محذوف ''ھو'' ہے۔

''قوله: فقال رجل من أشراف الناس...... : رجل'' متبدا محذوف کی خبر ہے۔ ای هو رجل أو هذا المار رجل.

'' اشراف الناس'' : بڑے اور اُونچے لوگ۔

هذا: یعنی بعینہ یہی شخص یا اس جیسا شخص۔

و الله حری ''فعیل'' کے وزن پر ہے۔ یہ ''هذا'' کی خبر ہے اور قسم متبدا اور خبر کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے مذکور ہے۔ (لائق اور حق دار) ہے۔

ان ینکح: مجہول کے صیغہ کے ساتھ

وان شفع ان یشفع: یعنی کوئی چیز عطاء کرنے یا کسی مصیبت کے دفع کرنے کیلئے حکام یا سرداروں کے پاس کسی کیلئے سفارش کردے۔

ان یشفع: صیغہ مجہول کا ہے۔

قوله: فقال یا رسول الله هذا رجل من فقراء المسلین هذا حری:

قسم کو ذکر نہیں کیا احتمال تھا کہ اس کے گمان کے خلاف معاملہ ہو جائے۔ جبکہ پہلی مرتبہ میں قسم کھا کر حکم میں تاکید پیدا کی اپنے گمان کے تحقق میں مبالغہ کیلئے۔ معنی یہ ہے کہ یہ لائق ہے۔

ان لا یسمع: مجہول کے صیغہ کے ساتھ اور نائب فاعل ''لقوله'' ہے

ایک عجیب قصہ نقل کیا ہے کہ ایک فقیر اجنبی ایک ایسے شخص کا رفیق بن گیا جس کے پاس ایک اُونٹ تھا۔ اُس شخص نے اُونٹ پر ایک بھاری وزن رکھا۔ فقیر نے پوچھا اس ایک طرف کا بوجھ کیا ہے اور اس دوسری طرف کا بوجھ کیا چیز ہے؟ اُس شخص نے جواب دیا کہ ایک جانب کا بوجھ غلہ ہے اور دوسری جانب کا بوجھ کنکریاں ہیں۔ تاکہ دونوں طرف کا وزن برابر ہو۔ فقیر نے کہا اگر تم کنکریوں کو گرا دو اور غلہ کو تقسیم کر کے آدھا غلہ ایک جانب رکھو اور دوسرا آدھا غلہ کجاوہ کی دوسری جانب رکھ دو گے تو بوجھ کم ہو جائے گا اور تم بھی ساتھ بیٹھ جاؤ گے۔ اُس شخص نے کہا: بہت اچھا اللہ تیری اس بات میں برکت ڈالے۔ اس شخص نے اُس فقیر کی بات مانی اور اُسکے سامنے اُونٹ پر سوار ہوا۔ فقیر نے پوچھا کیا تم اپنی اس عقل کے ساتھ اپنے ملک میں بادشاہ ہو؟ اُس نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کیا تم وزیر ہو؟ جواب دیا نہیں اسی طرح اُس فقیر نے امیر، تاجر، سردار اُونٹوں کا مالک، گھوڑوں کا مالک بکریوں کا مالک اور صاحب زراعت ہونے کے بارے میں باری باری سوال کیا۔ اور وہ شخص جواب میں ''نہیں'' کہتا رہا۔ پھر فقیر نے پوچھا کیا تم اپنی اس عقل کے ساتھ اپنے ملک کے فقیر ہو۔ اُس نے کہا: جی ہاں' وہ صاحب شتر بولا: انت شوم و وجهك شوم ومن یسمعك ایضا شوم'' یہ کہہ کر اپنے اونٹ سے اترا اور حکم دیا کہ سامان کو پہلی حالت پر کر دیا جائے۔

اس طرح کے واقعات کا اس دنیا میں بکثرت مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً مفلس عالم اور دنیوی لحاظ سے کم رتبہ شیخ کی بات کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا اور اُسکے مرتبہ کے بقدر اُسکی تعظیم نہیں کی جاتی۔ مگر ایک عالم اور بزرگ اگر مشہور ہوا اور اُسکے علم وجاہ کی خبریں پھیل گئی ہوں تو اُسکی بات مانی جاتی ہے اور اُسکے فعل کی لوگ اتباع کرتے ہیں۔ اگرچہ اُس کا علم و عمل درحقیقت کمزور بھی ہو۔ اللہ ہی اپنے دین اور اُپنے نبی کی نصرت کرتا ہے۔ اسی طرح جب حضور اقدس ﷺ نے مال اور جاہ کو چھوڑا تو کفار حضور علیہ

السلام کے حق میں کہتے تھے:﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾ [الزخرف:۳۱] ''اور کہنے لگے یہ قرآن اگر کلام (الٰہی) ہی ہے تو ان دونوں بستیوں مکہ اور طائف کے رہنے والوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا۔''

''قریتین'' سے مراد مکہ اور طائف ہے' ہر بستی والے یہی بات کرتے تھے۔اس کلام میں اس حالت پر اعتماد کرتے ہوئے تفصیل کی بجائے اجمال کے ساتھ ذکر کیا:﴿اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا......﴾ [الزخرف :۳۲] ''کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت (خاصہ یعنی نبوت) کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔دنیوی زندگی میں (تو) اُنکی روزی ہم (ہی) نے تقسیم کر رکھی ہے۔''

قولہ:ھذا خیر من مل ءالارض مثل ھذا:

فقیر کا دل چونکہ تکبر وغیرہ سے خالی ہوتا ہے اسلئے اللہ کے امر کی قبولیت کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔اور اللہ کی محبت کے مرتبہ تک پہنچنے کے قریب ہوتا ہے۔جبکہ نالائق مالداروں کے دلوں میں تکبر'فخر اور استغناء ہوتا ہے'وہ سرکش ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ [الاعراف:۱۴۶] ''میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دُنیا میں تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں۔''

علماء کے شاگردوں صلحاء کے مریدین' انبیاء کے متبعین اور عبادت نماز وغیرہ میں آگے بڑھنے والوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔یہاں تک کہ حج جو کہ صرف مالداروں پر فرض ہے اس حج کے اخلاص کے ساتھ بغیر اغراض فاسدہ کے ادا کرنے والے بھی فقراء ہی ہیں۔

شارح نے لکھا ہے کہ ''مثل'' ''مل ء الارض'' سے تمیز ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔اس کی تائید طیبی رحمہ اللہ کے قول سے بھی ہوتی ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ ''مل ء الارض'' اپنے ممیز کے اعتبار سے ''مفضل علیہ'' ہے اور وہ ''مثل ھذا'' ہے اسلئے کہ بیان اور مبین ایک ہی چیز ہیں۔(انتہیٰ)

یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا نصب عامل جار کے حذف کی وجہ سے ہو۔اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ ایک نسخہ میں جر کے ساتھ ہے۔ای من مثل ھذا الرجل الاول۔لیکن تصحیح شدہ نسخوں میں پہلی والی عبارت ہے اور وہی معتمد ہے۔

اور ابن حجر نے جو فرمایا ہے ''مثل ھذا'' میں ''لام'' مکسور ہے ور فتحہ بھی دُرست ہے۔یہ بات تمہیں دھوکہ میں نہ ڈالے۔اور وہ پہلا شخص جو بڑے لوگوں میں سے تھا اُس سے مالدار مؤمنین میں سے کوئی ایک شخص مراد ہے۔اور مقصود میں مبالغہ کے واسطے خاص فرد کو عام لفظ سے تعبیر کیا۔کیونکہ مالداری کی وجہ سے خواص وعوام کے مزاج میں تکبر کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔

یہ وہم نہ کرنا چاہیے کہ اس پہلے شخص سے مراد کوئی کافر شخص ہے' کیونکہ اس وقت کلام کا معنی درست نہ ہوگا۔اسلئے کہ نبی علیہ السلام کے ارشاد ''ھذا خیر'' کا معنی ہے:''ھذا افضل منہ'' جبکہ کفار اور اہل اسلام کے درمیان کوئی مفاضلہ ہے ہی نہیں کیونکہ کفار میں کوئی چیز ہے ہی نہیں' یہاں تک کہ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ ''نصرانی مجوسی سے بہتر ہے۔'' اس پر کفر کا خوف ہے۔اسلئے کہ اس شخص نے اُس کیلئے بہتری کو ثابت کیا جس میں کوئی بہتری ہے ہی نہیں۔مگر اس شخص پر کفر کا فتویٰ

نہیں لگایا گیا۔ اسلئے کہ "خیر" سے مراد حق کے زیادہ قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى﴾ [المائدۃ۔۸۲] "تمام آدمیوں سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت رکھنے والے آپ اُن یہود اور ان مشرکین کو پاویں گے اور اُن میں مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھنے کے قریب تر ان لوگوں کو پاویں گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں۔"

جیسا کہ "خیر" سے بعض اوقات صرف زیادہ اچھا مراد لیا جاتا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا﴾ [الفرقان۔۲۴] "اہل جنت اس روز قیام گاہ میں بھی اچھے رہیں گے اور آرام گاہ میں بھی خوب اچھے ہونگے۔"

لیکن اس حدیث کو اس باب میں ذکر کرنا دلالت کرتا ہے اس پر جو ہم نے ذکر کیا ہے اور وہ ہی درست ہے۔ اور یہ اس بات کے منافی نہیں جو امام غزالی نے ذکر کی ہے کہ گھٹیا درجے کے کافر فقیر کا عذاب مالدار کافر کے عذاب سے کم ہوگا۔ پس جب فقر جہنم میں کافر کو فائدہ دے رہا ہے تو جنت میں نیکو کار مسلمانوں کیلئے فقر کے فائدہ مند ہونے کے بارے میں تیرا کیا گمان ہے۔

۵۲۳۷ : وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَاشَبِعَ اٰلُ مُحَمَّدٍ مِنْ خُبْزِ الشَّعِيْرِ يَوْمَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ حَتّٰى قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۴۹/۹ حدیث رقم ۵۴۱۶ ومسلم فی صحیحه ۲۲۸۲/۴ حدیث رقم (۲۲۔۲۹۷۰) واخرجه النسائی فی السنن ۲۳۶/۷ حدیث رقم ۴۴۳۲ واخرجه ابن ماجه ۱۱۱۰/۲ حدیث رقم ۳۳۴۳۔

ترجمہ: "اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ محمد ﷺ کے اہل بیت (یعنی ازواج مطہرات ؓ اور متعلقین) نے دو روز مسلسل جو کی روٹی سے پیٹ بھرا ہو (چہ جائیکہ گیہوں کی روٹی سے) یہاں تک کہ رسول کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے"۔

راوئ حدیث:

سعید مقبری۔ یہ سعید بن ابی سعید مقبری ہیں۔ ابو سعید کا نام "کیسان" تھا۔ وہ چونکہ ایک مقبرہ کے قریب رہائش پذیر تھے اس لیے "مقبری" کہلاتے ہیں۔ اھ مؤلف ؒ نے ان کا اسم گرامی "الاکمال" میں ذکر نہیں فرمایا۔ "المقبری" میں میم مفتوح، قاف ساکن اور بائے موحدہ مضموم ہے۔ باء کو مفتوح و مکسور بھی پڑھا جاتا ہے۔

وعن سعید: اور ایک نسخہ میں "ابو سعید" مذکور ہے لیکن یہ غلط ہے۔ تصحیح شدہ نسخوں اور معتمد اُصول کے مخالف ہے۔ جیسا کہ بعض نے تصریح کی ہے کہ یہ سعید بن ابی سعید المقبری ہیں۔ اور ابو سعید کا نام کے سان ہے۔ یہ ایک مقبرہ کے پاس رہتے تھے۔ اس لئے مقبرہ کی طرف منسوب ہو گئے۔ اور مؤلف نے ان دونوں کا اسماء میں ذکر نہیں کیا۔

مقبری: "میم" کے فتحہ "قاف" کے سکون اور باء کے فتحہ یا ضمہ یا کسرہ کے ساتھ "مقبرہ" کی طرف منسوب ہے۔ اور مراد ابو سعید اور ان کا بیٹا سعید ہیں۔ مغنی کے انساب میں اس طرح مذکور ہے۔

تشریح: مصلية: صلّی سے اسم مفعول ہے۔ "مرمیۃ" کے وزن پر ہے۔

جب ایک دن سیر ہو کر کھاتے دوسرے دن فاقہ رہتا تھا۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے اسی طرح اختیار کیا تھا جس وقت حضور علیہ السلام کے سامنے زمین کے خزانے پیش کیے گئے۔ اور یہ پیشکش کی گئی کہ اگر چاہیں تو مکہ کے پہاڑ سونا بن جائیں مگر حضور علیہ السلام نے فقر کو اختیار کیا۔ اور فرمایا کہ ایک دن بھوکا رہوں اور صبر کروں اور دوسرے دن سیر ہو کر کھاؤں تاکہ شکر کروں۔ کیونکہ ایمان کے دو حصے ہیں' ایک حصہ شکر ہے۔ اور دوسرا حصہ صبر ہے۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿ان فی ذالك لایات لكل صار شكور﴾ [ابراھیم۔ ۵'لقمان۔ ۳۱'سبأ۔ ۱۹'الشوری۔ ۳۳]

"بے شک اس میں نشانیاں ہیں ہر صابر شاکر کیلئے"

یعنی ہر اُس مؤمن عالم و عامل کیلئے جس کے اندر یہ دونوں وصف ہوں۔

"حتی" یعنی مذکور طریقے سے آپ علیہ السلام کا بھوکا رہنا برقرار رہا یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ وفات کے وقت ایک صاع جو کے ادھار کے بدلہ میں آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس گروی تھی۔ اس میں اُن لوگوں پر رد ہے جو کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام آخری عمر میں مالدار ہوگئے تھے۔ ہاں آپ علیہ السلام کے پاس بہت اموال آگئے تھے۔ لیکن حضور علیہ السلام مال نے اپنے پاس نہیں رکھا' بلکہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کیلئے خرچ کیا اور آپ علیہ السلام کا دل ہمیشہ غنی رہا' اللہ کی طرف سے دل کا غنا عطا ہوا تھا۔

تخریج: اس حدیث کو ترمذی نے شمائل میں عائشہ رضی اللہ عنھا سے نقل کیا ہے۔ اور ابن عباس ؓ سے مروی ہے:

قال كان رسول الله ﷺ یبیت اللیالی المتتابعة طاویا ای جائعا هو واهله لا۔ یجرون عشاء' وكان اكثر خبزهم الشعیر۔"

"حضور علیہ السلام اور حضور کے گھر والے مسلسل کئی راتوں تک خالی پیٹ سوتے تھے' رات کا کھانا نہیں ملتا تھا' اور اکثر اُنکی روٹی جو کی روٹی ہوتی تھی۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہمارے زمانہ میں کوئی فقیر بھی حضور علیہ السلام کی طرح زندگی نہیں گزارتا' حالانکہ حضور علیہ السلام تمام انبیاء میں افضل نبی تھے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کے اس فعل میں فقراء کیلئے بہت تسلی ہے جیسا کہ آپ علیہ السلام کے قول میں مالداروں کیلئے بہت بڑی وصیت ہے۔ آپ علیہ السلام تمام عالموں کیلئے رحمت ہیں اور باعمل علماء کے امام ہیں۔

۵۲۳۸ : وَعَنْ سَعِيْدٍ الْمَقْبُرِيِّ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ مَرَّبِقَوْمٍ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ شَاةٌ مُّصْلِيَّةٌ فَدَعَوْهُ فَاَبٰى اَنْ يَّاْكُلَ وَقَالَ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الدُّنْيَا وَلَمْ يَشْبَعْ مِنْ خُبْزِ الشَّعِيْرِ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵٤۹/۹ حدیث رقم ۵٤۱٤۔

ترجمہ: "حضرت سعید مقبری (تابعیؒ) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ (ایک روز) وہ (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے (جو کھانا کھانے کے لئے ایک مقام پر دسترخوان لگائے ہوئے تھے) اور ان کے سامنے بھنی ہوئی بکری رکھی تھی' انہوں نے (کھانے کے لئے) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بھی دعوت دی' مگر انہوں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ اور (اپنے نہ کھانے کے عذر میں) فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ اس دنیا

سے اس حال میں کوچ فرما گئے کہ جناب نے جو کی روٹی کو بھی سیر ہو کر نہ کھایا۔ (لہٰذا میں کیسے گوارا کر سکتا ہوں کہ بھنی ہوئی بکری سے تلذذ حاصل کروں)''۔ (بخاری)

۵۲۳۹ : عَنْ اَنَسٍ اَنَّهُ مَشٰى اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِخُبْزِ شَعِيْرٍ وَاِهَالَةٍ سَنِخَةٍ وَلَقَدْ رَهَنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دِرْعًا لَهُ بِالْمَدِيْنَةِ عِنْدَ يَهُوْدِيٍّ وَاَخَذَ مِنْهُ شَعِيْرًا لِاَهْلِهِ وَلَقَدْ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ مَا اَمْسٰى عِنْدَ اٰلِ مُحَمَّدٍ صَاعُ بُرٍّ وَلَا صَاعُ حَبٍّ وَاِنَّ عِنْدَهُ لَتِسْعَ نِسْوَةٍ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۰۲/٤ حدیث رقم ۲۰٦۹ وابن ماجه فی السنن ۱۳۸۹/۲ حدیث رقم ٤۱٤۷ واحمد فی المسند ۱۳۳/۳

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک بار) وہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں جو کی روٹی اور ایسی چربی لے کر آئے جو زیادہ دن پڑے رہنے کی وجہ سے بدبودار ہو کر رنگ بدل گئی تھی۔ نیز (حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی نے بیان کیا) کہ حضور اکرم ﷺ نے (ایک بار) اپنی زرہ مدینہ میں ایک یہودی کے پاس گروی رکھ کر اس سے اپنے گھر والوں کے لئے کچھ جو لئے''۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے نے یہ بھی بیان کیا کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ محمد ﷺ کے اہل بیت کی ایسی کوئی شام نہیں ہوتی تھی جس میں ان کے پاس ایک صاع گندم یا کوئی اور اناج رہتا ہو حالانکہ حضور ﷺ کی نو ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن تھیں''۔ (بخاری)

تشریح: **بخبز شعیر:** ''باء'' مصاحبت کیلئے ہے۔ **ای مصحوبا به.**

اهالة: ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہر وہ تیل جس میں سالن تیار کیا جائے۔

سنخة ''سین'' کے فتحہ ''ون'' کے کسرہ ''خاء'' کے فتحہ اور اس کے بعد ''ھاء''۔ یعنی زیادہ دیر تک پڑے رہنے کی وجہ سے بدبودار ہو گیا تھا۔ نہایہ میں مذکور ہے کہ دُنبہ کی پگھلی ہوئی چکی اور چربی کو ''اھالۃ'' کہتے ہیں۔

''السنخة'' کا معنی گلا سڑا بدبودار۔

جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا: ﴿قل لا اسئلکم علیه من اجر ان اجری الا علی الله﴾ [الشوری:۲۳]

اسی طرح کا واقعہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں منقول ہے کہ اگر کوئی شخص امام صاحب سے اُدھار مانگ لیتا تو اُس شخص کی دیوار کے سایہ میں کھڑے نہ ہوتے تھے۔ اس حدیث کی وجہ سے جس میں ارشاد ہے:

کل قرض جر نفعا فهو ربا. ''جو بھی قرض کوئی نفع کھینچ کر لائے وہ سود ہے۔''

کہا جاتا ہے کہ امام حمزہ جو قراء سبعہ میں سے ہیں۔ اور جن کی منقبت میں شاطبی رحمہ اللہ نے فرمایا:

وحمزة ماذا کاه من متورع
اماما صبورا للقران مرتلا

''حمزہ ایک بہت پاکیزہ اور پرہیزگار انسان تھا' امام تھا' صابر تھا۔ اور قرآن کو ترتیل کے ساتھ پڑھنے والا تھا۔''

وہ قرآن سنانے پر اُجرت نہیں لیتے تھے۔ کیونکہ قرآن پر اُجرت لینے کے بارے میں وعید جس حدیث میں وارد ہوئی اُس حدیث کی بناء پر اُن کا یہی مذہب تھا۔ یا کمال تقویٰ کی وجہ سے اس طرح کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک شاگرد نے گرمی کے دن

پانی پیش کیا' تو انہوں نے پانی نہیں لیا۔
کہا جاتا ہے وہ کہ ایک مرتبہ کنوئیں میں گر گئے' جو شخص بھی ان کو کنوئیں سے نکالنے کیلئے کنوئیں کے پاس آتا تو پوچھتے کہ کیا تم نے مجھ سے پڑھا ہے؟ جب وہ کہتا کہ جی ہاں تو کنوئیں سے باہر آنے کیلئے اُس سے مدد نہیں لیتے تھے۔ کوفہ والے سارے ان کے شاگرد تھے چنانچہ سارے عاجز آ گئے۔ پھر ان کو ایک اعرابی ملا اس کو لے کر آئے۔ اُس نے امام حمزہ کو نکالا لیکن اُس نے امام حمزہ کو پہلے یقین دہانی کروائی کہ نہ تو خود براہ راست ان سے پڑھا ہے اور نہ ان کے کسی شاگرد سے پڑھا ہے۔
قولہ: **ولقد سمعته يقول** طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مفعول کی ضمیر انس رضی اللہ عنہ کی طرف اور فاعل کی ضمیر انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے کی طرف راجع ہے۔ ابن ملک اور دوسرے شراح نے بھی انہی کی اتباع کی ہے۔
ای قال راوی الحدیث عن انس: سمعت انسا" یعنی حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ میں نے انس رضی اللہ عنہ سے سنا:
"**قوله: ما أمسى عند آل محمد صاع ولا صاع**" تخصیص کے بعد تعمیم ہے مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے رات کو صبح کیلئے نہیں رکھا۔
قوله: وان عنده لتسع نسوة: "ان" ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے اور یہ جملہ حالیہ ہے۔ اور بعض روایات میں ہے:" **وان عنده يومئذ لتسع نسوة**" یہ جملہ راوی کا کلام ہے۔ راوی نے حدیث منقطع کر دی اور اپنی طرف سے یہ جملہ ذکر کیا۔ جنہوں نے یہ تاویل کی ہے کہ اس کلام میں التفات ہے تو یہ تاویل غیر معتبر ہے۔ اختلاف تو اس کے ماقبل میں ہے۔ کیونکہ بعض کہتے ہیں کہ زیادہ دُرست یہ ہے کہ مفعول کی ضمیر نبی علیہ السلام کی طرف راجع ہے اور فاعل کی انس رضی اللہ عنہ کی طرف راجع ہے۔ جب کہ شیخ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے۔ اس پر احمد کی روایت "**قال ولقد سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم الخ**" دلالت کرتی ہے۔ اور اس کی تائید "**ما امسى عند آل محمد**" کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔ اسلئے کہ اگر یہ راوی کا کلام ہوتا تو مناسب تھا۔ کہ یوں کہتے: "**عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم**" واللہ تعالیٰ اعلم

۵۲۴۰ : وَعَنْ عُمَرَ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا هُوَ مُضْطَجِعٌ عَلٰى رُمَالِ حَصِيْرٍ لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ فِرَاشٌ وَقَدْ اَثَّرَ الرِّمَالُ بِجَنْبِهِ مُتَّكِئًا عَلٰى وِسَادَةٍ مِنْ اَدَمٍ حَشْوُهَا لِيْفٌ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اُدْعُ اللّٰهَ فَلْيُوَسِّعْ عَلٰى اُمَّتِكَ فَإِنَّ فَارِسَ وَالرُّوْمَ قَدْ وُسِّعَ عَلَيْهِمْ وَهُمْ لَايَعْبُدُوْنَ اللّٰهَ فَقَالَ اَوَفِيْ هٰذَا اَنْتَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ اُولٰئِكَ قَوْمٌ عُجِّلَتْ لَهُمْ طَيِّبَاتُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِيْ رِوَايَةٍ اَمَا تَرْضٰى اَنْ تَكُوْنَ لَهُمُ الدُّنْيَا وَلَنَا الْاٰخِرَةُ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦٥٧/٨ حدیث رقم ٤٩١٣ ومسلم فی صحیحه ١١٠٥/٢ حدیث رقم (٣٠-١٤٧٩) وابن ماجه فی السنن ١٣٩٠/٢ حدیث رقم ٤١٥٣ واحمد فی المسند ١٤٠/٣

ترجمہ: "حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (ایک روز) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کے پتوں کی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر اور چٹائی کے درمیان کچھ بھی حائل نہ تھا جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلوئے مبارک پر چٹائی نے نشان بنا ڈالے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر مبارک کے نیچے جو تکیہ رکھا

ہوا تھا وہ چمڑے کا تھا جس کا بھراؤ کھجور کی چھال تھی' میں نے (سرور دو عالم کو اس حالت میں دیکھ کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ وہ آپ ﷺ کی امت کو مالی وسعت اور خوش حالی فرما دے؟ فارس اور روم کے لوگوں کو کس قدر وسعت و خوشحالی عطا کی گئی ہے حالانکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی نہیں کرتے! حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ابن خطاب یہ تم کیا کہہ رہے ہو' کیا تم ابھی تک اسی جگہ ہو (جہاں سے تم شروع میں چلے تھے اور اتنی عمر بیت جانے کے بعد بھی تمہارا فہم و فراست اور نگاہ بصیرت اس کی حقیقت کا ادراک نہ کر سکی خبر دار یہ اہل فارس و روم اور تمام کفار) وہ لوگ ہیں کہ انہیں تمام لذتیں اور نعمتیں بس ان کی دنیاوی زندگی ہی میں دے دی گئی ہیں (جب کہ ہمیشہ کی زندگی یعنی آخرت میں ان کو فقر و افلاس' ذلت و خواری اور خسران و نقصان کے سوا کچھ نہیں ملے گا)'' ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ''کیا تم اس پر رضامند و مطمئن نہیں ہو کہ ان (اہل فارس و روم اور دیگر کفار) کو دنیا ملے (جو بالآخر ختم ہونے والی ہے) اور ہمیں آخرت ملے (جس کی نعمتیں اور تمام تر راحت و آرام حقیقی اور دائمی ہے)''۔ (متفق علیہ)

تشریح: قوله: دخلت علی رسول الله ﷺ فاذا هو مضطجع علی رمال حصير باضافت کے ساتھ ہے اور اضافت بیانیہ ہے ای علی رمال من حصير۔ شارح فرماتے ہیں کہ ''رمال'' ''را'' کے کسرہ کے ساتھ اور ضمہ کے ساتھ دونوں طرح درست ہے' رمیل کی جمع ہے اور رمیل ''مرمول'' کے معنی میں ہے۔ اس کو واحد کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ''خاتم فضة'' میں ہے اور اس حدیث میں ''حصیر'' سے مراد کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی چٹائی ہے۔ (انتہی) بعض فرماتے ہیں ''الرمال ماینسج عودا عودا'' اور بظاہر ''را'' کا ضمہ زیادہ مشہور ہے۔ اسی وجہ سے صاحب قاموس نے اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے فرمایا کہ ''رمال الحصير'' غراب کے وزن پر ''مرمول'' کے معنی میں ہے۔ اور نہایہ میں لکھا ہے ''الرمال'' اُس چیز کو کہتے جس کو بُنا جائے۔

زمخشری فرماتے ہیں اس کی نظیر ہے ''حطام'' اور ''زکام'' حُطام کا معنی ہے ''مایحطم'' اور زکام کا معنی ہے: ''مایزکم'' صاحب کشاف کے علاوہ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ ''رمال'' رمل کی جمع ہے اور ''مرمول'' کے معنی میں ہے جس طرح کہ ''خلق اللہ'' مخلوق اللہ کے معنی میں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کی چارپائی پر ایک چٹائی تھی جو کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی تھی۔ اور چارپائی پر اس چٹائی کے علاوہ کوئی نرم چیز نہ تھی۔ طیبی رحمہ اللہ نے اس طرح ذکر کیا ہے۔ لیکن ''رمال الحصير'' سے یہ مراد لینا کہ ''چارپائی کی رسیاں کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی تھیں'' فقیر کی شان سے بعید ہے۔ بلکہ بظاہر مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کا بستر ایک چٹائی تھی جو کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی تھی۔

قوله: ليس بينه وبينه فراش ......:

یعنی حضور اقدس ﷺ کے اور چٹائی کے درمیان (بستر) نہ روئی کا اور نہ ریشم کا تھا۔

لیف: قاموس میں ہے۔ ''لیف'' کسرہ کے ساتھ معنی ہے۔

''ولیوسع'': ''سین'' مشددہ مکسورہ اور ''عین'' کے سکون کے ساتھ۔

کیونکہ یہ لوگ آپ جیسی مشقتوں کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس لئے بسا اوقات آپ کے دین کی طرف

مائل ہونے سے متنفر ہوتے ہیں۔''

گویا کہ عمر بن خطابؓ جو ہمیشہ حق بات کرتے تھے اور جن کی رائے کتاب اللہ کے موافق ہوتی تھی۔ نے یہ اس ارشاد باری سے اخذ کیا:

﴿وَلَوْلَا أَنْ يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً لَجَعَلْنَا لِمَنْ يَكْفُرُ بِالرَّحْمَٰنِ لِبُيُوتِهِمْ سُقُفًا مِنْ فِضَّةٍ﴾

[الزخرف۔۳۳۔الآیۃ]

''اور اگر یہ بات (متوقع) نہ ہوتی کہ تمام آدمی ایک ہی طریقہ کے ہو جاویں گے تو جو لوگ خدا کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کے لئے ان کے گھروں کی چھتیں اور (زینے) ہم چاندی کی کر دیتے۔''

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار پر دنیا کو مکمل طور پر کشادہ نہیں کیا' اور مؤمنین پر دنیا کو مکمل طور پر تنگ نہیں کیا۔ اگرچہ کفار اور مؤمنین کے درمیان دنیا و آخرت کی تقسیم کے اعتبار سے عدل کا مقتضیٰ وہ تھا۔ جیسا کہ کفار اور مؤمنین کے درمیان تقسیم کو حدیث نبوی: ''الدنیا سجن المؤمن وجنة الکافر'' میں بیان فرمایا۔ لہٰذا حکمت بالغہ ہی مؤمنین کو کفار کے راستہ کی طرف مائل ہونے سے روکتی ہے' اور یہ حالت عام مخلوق کے اعتبار سے ایک درمیانی حالت ہے' ورنہ خاص مخلوق یعنی انبیاء اور اولیاء کے اعتبار سے اُونچا مرتبہ یہ ہے کہ دنیا کے بارے میں کامل زہد کرے۔ اور دنیا کا وہ کم سے کم ساز و سامان جس کا تصور کیا جا سکتا ہو پر قناعت کرے تاکہ آخرت میں کامل طور پر نعمتوں سے لطف اندوز ہوں۔

قولہ: فقال اوفی ھذا انت یا ابن الخطاب:

استفہام انکاری ہے' اس کے بعد ''واؤ'' مفتوح ہے اور معطوف علیہ مقدر ہے۔ ای اتقول **ھذا الکلام وانت الی الآن فی ھذا المقام ولم یحصل لك الترقی الی فھم المرام؟** (یعنی کیا تم یہ بات کرتے ہو اور ابھی تک اسی مقام میں ہو اور مقصد پہچاننے کے مقام تک ترقی نہیں کی۔)

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ہمزہ استفہام کو اس لئے مقدم کیا کہ یہ صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے' اور واؤ کو ماقبل اور مابعد کلام کے ربط کیلئے ذکر کیا گیا۔

یا ابن الخطاب! حضرت عمرؓ کو ''ابن الخطاب'' کے لفظ سے مخاطب کیا اور ''عمر'' کے لفظ کو ترک کیا' یہ سمجھانے کیلئے کہ دنیا کی چیزوں سے لذت حاصل کرنا جاہل اور آخرت سے اندھے شخص کی خصلت ہے۔ گویا کہ یوں کہا اے فلاں کے بیٹے جو دنیا کی آسائشوں میں گرفتار ہے اور آخرت کی نعمتوں سے غافل ہے۔

قولہ: اولئك قوم عجلت لھم طیباتھم فی الحیاۃ الدنیا: یعنی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کفار پر اپنے خطاب سے اس طرح عیب لگائیں گے: ﴿وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ﴾ [الاحقاف۔۲۰] ''اور جس روز کفار آگ کے سامنے لائے جائیں گے کہ تم اپنی لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے اور ان کو خوب برت چکے ہو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی اس وجہ سے

کہ تم دُنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ تم نافرمانیاں کیا کرتے تھے۔"

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ "فلیوسع" جواب امر ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ ای (ادع اللہ فلیوسع' اور لام تاکید کیلئے ہے۔ جس روایت میں مجزوم ہے تو امر غائب کی بناء پر منصوب ہے۔ گویا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام سے اس اُمت کیلئے وسعت کی دُعا کی درخواست کی اللہ تعالیٰ سے دُعا کی قبولیت طلب کی اور حق تو یہ تھا کہ یوں فرماتے: ادع اللہ لیوسع علیك (یعنی اللہ سے دعا کریں کہ آپ پر وسعت ہو جائے) لیکن اُمت کیلئے دُعا کی درخواست حضور علیہ السلام کی تعظیم کی وجہ سے کی اور حضور علیہ السلام کی عظمت شان اور شان نبوت کے مناسب نہیں سمجھا کہ بذات خود اس گھٹیا دنیا کو اپنے لئے طلب کریں' اس کے باوجود حضور علیہ السلام نے اس طرح شدید انکار فرمایا۔

اوفی ھذا: ہمزہ کا مدخول محذوف ہے۔ ای اتطلب ھذا وفی ھذا أنت وکیف یلیق بمثلك ان یطلب من اللہ التوسعة فی الدنیا؟ (یعنی کیا تم یہ طلب کر رہے ہو' اور اس میں پڑے ہوئے ہو' تمہارے جیسے شخص کیلئے کیسے مناسب ہے کہ اللہ سے دنیا کی وسعت طلب کرے۔)

قولہ: وفی روایة اما ترضی ان تکون لھم الدنیا ولنا الآخرة یعنی انہیں خصوصی وسعت ملے اور ہمیں خاص مقام ملے۔

تخریج: ابن ماجہ نے آخری روایت کو نقل کیا ہے۔

۵۲۴۱ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ لَقَدْ رَاَیْتُ سَبْعِیْنَ مِنْ اَصْحَابِ الصُّفَّةِ مَامِنْهُمْ رَجُلٌ عَلَیْهِ رِدَاءٌ اِمَّا اِزَارٌ وَاِمَّا كِسَاءٌ قَدْ رَبَطُوْا فِیْ اَعْنَاقِهِمْ فَمِنْهَا مَایَبْلُغُ نِصْفَ السَّاقَیْنِ وَمِنْهَا مَا یَبْلُغُ الْكَعْبَیْنِ فَیَجْمَعُهٗ بِیَدِهٖ كَرَاهِیَةَ اَنْ تُرٰی عَوْرَتُهٗ۔ (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۳۶/۱ حدیث رقم ۴۴۲

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اصحاب صفہ میں سے ستر اشخاص کو دیکھا جن میں سے کوئی فرد ایسا نہیں تھا کہ اس کے پاس کوئی چادر ہو (جس کو کاندھے پر ڈال لے یا اوڑھ لے) یعنی ان حضرات کو صرف ایک ہی کپڑا میسر ہوتا تھا اور وہ کپڑا (بھی) یا تو تہبند ہوتا یا کملی ہوتی' جس کو وہ اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے (اور اس کے ذریعہ اپنے جسم و ستر کو ڈھانکتے تھے) ان تہبند اور کملیوں میں سے کچھ ایسی تھیں جو صرف آدھی پنڈلیوں تک آتی تھیں اور بعض ایسی تھیں جو دونوں ٹخنوں تک پہنچ جاتی تھیں چنانچہ (سجدہ میں جاتے وقت یا گھٹنے اٹھا کر بیٹھتے وقت) اس خوف سے کہ کہیں ان کا ستر نہ کھل جائے وہ اپنے اس تہبند یا کملی کو ہاتھ سے پکڑے رہتے تھے"۔ (بخاری)

تشریح: قولہ: لقدر أتیت سبعین من اصحاب الصفة:

من اصحاب الصفة اور ایک نسخہ میں "من اهل الصفة" کے الفاظ ہیں۔

یہ چار سو (۴۰۰) مہاجرین تھے جو علم قرآن حاصل کرنے کیلئے صفہ پر رہتے تھے اور ہر وقت سرکش قوم کے ساتھ جہاد میں نکلنے کیلئے تیار رہتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ ان کے نگران تھے ان کے حالات معلوم کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ مسجد نبوی کے آخری

حصے میں ایک چبوترہ پر رہتے تھے۔ان کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ [البقرۃ۔ ۲۷۳]

"(صدقات) اصل حق ان حاجتمندوں کا ہے جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ میں (اور اسی وجہ سے) وہ لوگ کہیں ملک میں چلنے پھرنے کا (عادۃ) امکان نہیں رکھتے' اور ناواقف ان کو تونگر خیال کرتا ہے اُن کے سوال سے بچنے کے سبب سے' (البتہ) تم ان کو ان کے طرز سے پہچان سکتے ہو۔ (کہ فقرو فاقہ سے چہرہ پر اثر ضرور آجاتی ہے۔) وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے۔"

یعنی بالکل نہیں مانگتے بلکہ توکل کرنے والے تھے۔اور دنیا میں زندہ رہنے اور آخرت کیلئے بطور توشہ زمین پر گری پڑی کھجور اُٹھا کھالیتے تھے۔اور کپڑوں کا حال وہ تھا جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اگلے جملہ میں بیان فرمایا ہے:

قولہ: مامنهم رجل علیه رداء

نہایہ میں لکھا ہے کہ "رداء" اُس کپڑے یا اُس دھاری دار چادر کو کہتے ہیں۔جس کو انسان اپنے کپڑوں کے اُوپر اپنے کندھے پر رکھتا ہے۔

سید جمال الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صاحب نہایہ کی یہ بات کہ کپڑوں کے اُوپر رکھتا ہے لغت کے مذہب کے خلاف ہے۔بلکہ "رداء" اُس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے بدن کے اُوپر والے حصہ کو ڈھانپا جاتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ اس کی تائید (اما ازار......) سے ہوتی ہے کہ ایک ازار ہوتا تھا جس سے ستر چھپائے تھے یا ایک ایسا کپڑا (کساء) ہوتا تھا جو پورے بدن پر لیتے تھے۔

قولہ: قدر بطوا فی اعناقهم: حاصل یہ کہ اُن کے پاس ایسا کپڑا نہیں ہوتا تھا کہ دوسرے کپڑوں کے اُوپر پہن کر بطور چادر استعمال کرتے بلکہ یا تو صرف لنگی ہوتی تھی یا صرف چادر ہوتی تھی۔

اور حدیث میں "قد ربطوا فی اعناقهم" فرمایا" "قد ربطه فی عنقه" نہیں فرمایا (یعنی مفرد ضمیر کی بجائے جمع کی ضمیر ذکر کی) یہ اس بات کی طرف اشارہ کرنے کیلئے کہ تمام صحابہؓ کی حالت اسی طرح تھی۔لفظ "رجل" کو نکرہ ذکر کرنے اور نفی کے استغراق سے بھی یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔(منهم: "من" زائدہ ذکر کر کے مزید مبالغہ پیدا کیا گیا۔قولہ: (فمنها ما یبلغ اصف السا قین ومنها ما یبلغ الکعبین: ضمیر کی تانیث باوجود یکہ یہ ضمیر "کساء" اور "رداء" کی طرف لوٹتی ہے۔جمع یعنی اکسیة اور "ازر" کے اعتبار سے ہے۔یا صرف "اکسیة" کی طرف راجع ہے۔کیونکہ یہ لفظ ضمیر کے قریب مذکور ہے اور دوسرے کو اس پر قیاس کیا جائے گا۔اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ﴾ [البقرۃ: ۴۵]: "(اور اگر تم کو جب مال وہ جاہ کے غلبہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہو تو) مدد لو صبر اور نماز سے اور بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے۔مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے۔اُن پر کچھ دشوار نہیں ہے۔"

اور دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾

[التوبۃ:۳۴] ''اور (غایت حرص سے) جو لوگ سونا چاندی جمع کر کر رکھتے ہیں۔ اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے''۔

کیونکہ مفرد جمع پر دلالت کرتا ہے خصوصاً جب مفرد سے جنس مراد ہو کیونکہ جنس کو کبھی تانیث کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں' اس لئے کہ جماعت افراد پر دلالت کرتا ہے' جس طرح کہ کبھی لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مفرد کا معاملہ کیا جاتا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''کساء'' اور ''ازار'' کی جمع (اکسیة) اور ''ازر'' کا اعتبار کرتے ہوئے اور پہننے والوں کے جمع ہونے کا لحاظ رکھتے ہوئے مؤنث کی ضمیر ذکر کی ہے۔ اور ''بیدہ'' میں ضمیر کو مفرد ذکر کرنا ''رجل مذکور'' کی تاویل کے اعتبار سے ہے۔

۵۲۴۲ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا نَظَرَ اَحَدُكُمْ اِلٰى مَنْ فُضِّلَ عَلَيْهِ فِي الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْيَنْظُرْ اِلٰى مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْهُ (متفق عليه وفي رواية لمسلم) قَالَ انْظُرُوْا اِلٰى مَنْ هُوَ اَسْفَلُ مِنْكُمْ وَلَا تَنْظُرُوْا اِلٰى مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ فَهُوَ اَجْدَرُ اَنْ لَّا تَزْدَرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ. (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۱۱/۳۲۲ حديث رقم ٦٤٩٠ ومسلم في صحيحه ٤/۲۲۷٥ حديث رقم (۸-۲۹٦۳) والترمذي في السنن ٤/٥٧٤ حديث رقم ۲٥۱۳ وابن ماجه ۲/۱۳۸۷ حديث رقم ٤۱٤۲ واحمد في المسند ۲/۳۱٤۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے جو شخص کسی ایسے آدمی کو دیکھے جو اس سے زیادہ مالدار اور اس سے زیادہ اچھی شکل وصورت کا ہو (اور اس کو دیکھ کر اپنی حالت پر غم وحسرت ہو' خدا کا شکر ادا کرنے میں سستی وکوتاہی واقع ہو اور اس شخص کے بارے میں رشک وحسد کے جذبات پیدا ہونے لگیں) تو اس کو چاہئے کہ وہ اس شخص پر نظر ڈالے جو اس سے کمتر درجہ کا ہے (اسے دیکھ کر اپنے رب کے بے شمار نعمتوں پر شکر گزاری کی توفیق ہو اور اپنی حالت پر راضی رہے)۔'' (بخاری ومسلم) اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تم اس شخص کو دیکھو (یعنی اس کے حالات کا جائزہ لو) جو تم سے کمتر درجہ اس شخص کی طرف نہ دیکھو جو تم سے برتر درجہ کا ہے پس ایسا کرنا تمہارے لئے نہایت مناسب ہے تاکہ تم اس انعام وکرم کو جو خدا نے تم پر فرمایا ہے حقیر نہ جانو''۔

تشریح: **فضل علیه**: مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے اور باب تفعیل سے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی کسی ایسے شخص کو دیکھ لے جو زیادہ اثر ورسوخ والا ہو اور اُسکے پاس زیادہ مال، لباس اور جمال ہو اور یہ معلوم نہ ہو کہ آخرت میں اس شخص کیلئے وبال ہے۔

اسفل: لام کا مفتوح اور مضموم ہونا دونوں درست ہے۔ تو اس شخص کی طرف دیکھو جو دنیا میں اس سے کم درجہ والا ہو۔ کم مال اور کم اسباب والا ہو۔ اور آخرت میں اس کے لئے بلند درجات ہوں گے۔ حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ اکثر لوگوں کی حالت اعتدال کی ہے۔ چاہے یہ اعتدال اضافی ہو یا عارضی ہو۔ چنانچہ انسان اپنے دونوں جانبوں کے اعتبار سے اچھی حالت میں ہوتا ہے۔

حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ شخص جس کو مثلاً یا بالفرض تمام انسانوں پر ہر طرح سے فضیلت دی گئی ہو اُس

کو اپنے سے کم درجہ والے لوگوں کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ تاکہ خود پسندی، غرور۔ فخر اور تکبر پیدا نہ ہو۔ بلکہ ایسے شخص پر واجب ہے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں پر شکر کرنے کا حق ادا کرے۔ اور وہ شخص جو اتنا فقیر ہو کہ اُس سے نیچے کوئی کم درجے کا فقیر نہ ہو اُس کو چاہیے کہ اپنے رب کا اس بات پر شکر ادا کرے کہ اللہ نے دُنیا دے کر آزمائش میں نہیں ڈالا۔ جبکہ دنیا کی مالداری مختصر موت کیلئے ہے۔ اس کی مشقتیں زیادہ ہیں یہ جلد فنا ہونے والی ہے اور اس میں شریک خسیس ہیں۔

اسی وجہ سے جب شبلی رحمہ اللہ دنیاداروں میں سے کسی کو دیکھتے تو فرماتے: اے اللہ! میں تجھ سے دنیا و آخرت میں معافی اور عافیت مانگتا ہوں۔

حکایت: اسی کے مناسب ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ایک فقیر ایک واعظ ولی کی مجلس میں کھڑا ہو گیا اور شکایت کی کہ میں نے اتنے عرصے تک نہ کسی کے سامنے اور نہ کسی سے چھپ کر کچھ کھایا پیا ہے۔ شیخ نے کہا: اے اللہ کے دُشمن! تم جھوٹ بولتے ہو۔ کیونکہ اللہ کی طرف سے شدید بھوک کی حالت اُنہی لوگوں پر آتی ہے جو اللہ کے خاص منتخب نبی اور ولی ہوتے ہیں۔ اگر تم اللہ کے ولی ہوتے تو بھوک کی شکایت نہ کرتے اور مخلوق سے اپنی مراد کو چھپا کر رکھتے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب بندہ اپنے دین کو خلل اور زوال سے محفوظ کر لیتا ہے تو جاہ و مال کے نقصان کی پرواہ نہیں کرتا اور نہ موجودہ اور آئندہ آنے والی کسی مشقت کی پرواہ کرتا ہے۔

حکایت: جیسا کہ نقل کیا گیا ہے کہ امام غزالی کے ایک ساتھی کو کسی نے مارا اور پھر قید کر لیا تو اُس ساتھی نے فریاد کی جس پر امام غزالی نے فرمایا کہ شکر کر اللہ کی آزمائش اس سے بڑی بھی ہوتی ہے۔ اس کے بعد اُس شخص کو جیل سے نکال کر کنوئیں میں پھینکا گیا۔ چنانچہ دوبارہ اُس نے امام غزالی کے سامنے فریاد کی۔ امام غزالی نے پہلے کی طرح جواب دیا۔ پھر ایک دن ایک یہودی کو زنجیروں میں باندھ کر اس کے ساتھ کنوئیں میں ڈالا گیا۔ اُس یہودی کو پیچش کی بیماری تھی جس کی وجہ سے بار بار اُس تنگ و تاریک مقام میں پاخانہ کرتا تھا۔ ان کا وہ ساتھی تعفن سے نہایت پریشان ہو گیا۔ اس سے جب امام غزالیؒ سے تکالیف کی شکایت کی اس پر بھی امام غزالیؒ نے صبر و شکر کی تلقین کی تو اُس شخص نے بے صبری میں جواب دیا کہ اس عذاب سے زیادہ آزمائش اور کیا ہوگی۔ امام غزالی نے فرمایا کہ اس سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ (خدانخواستہ) تیری گردن میں کفر و شرک کا طوق پڑ جائے اور سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ۔

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ ”اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو کج نہ کیجئے۔ بعد اس کہ آپ ہم کو ہدایت کر چکے ہیں اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت (خاصہ) عطا فرمائیے بلاشبہ آپ بڑے عطا فرمانے والے ہیں۔“

تخریج: اس حدیث امام احمد نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ **قوله: وفی روایة لمسلم قال : الظروا۔۔۔الخ:** امام احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی ان سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔

یعنی یہ دیکھنا جس کا نفی اور اثبات کے ساتھ ذکر ہوا ہے زیادہ بہتر اور زیادہ حقدار ہے اس بات کی کہ تم لوگ اللہ کی اُن ...ں کو حقیر نہ جانو جو اللہ نے دنیا میں تم کو دی ہیں ~~کیونکہ اس~~ کو دیکھنے سے تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں دی ہیں

وہ تم سے کم رتبہ والوں کی نعمتوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ یا یہ کہ اللہ نے تم کو بہت زیادہ نعمتیں دی ہیں اور وہ اس طرح کہ اللہ نے تمہارے لئے فقر اور مصائب کا انتخاب فرما کر تم کو اپنے اولیاء میں سے بنایا اور انبیاء کے ساتھ مشابہت رکھنے والا بنایا اور حاکموں کے ظلم اور نالائق مالداروں کی ظلمت سے خلاصی عطا فرمائی۔

الفصل الثانی:

۵۲۴۳ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَدْخُلُ الْفُقَرَاءُ الْجَنَّةَ قَبْلَ الْاَغْنِیَاءِ بِخَمْسِ مِائَةِ عَامٍ نِصْفِ یَوْمٍ. (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤٩٩/٤ حدیث رقم ٢٣٥٤ وابن ماجه فی ١٣٨٠/٢ حدیث رقم ٤١٢٢ واحمد فی المسند ٣٤٣/٢

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: فقراء جنت میں اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے داخل ہوں گے جو کہ آدھا دن ہے''۔ (ترمذی)

تشریح: '' **الفقراء** '' سے مراد صابرین ہیں اور بعض فرماتے ہیں کہ اگر چہ وہ شاکی ہوں۔

نصف: مجرور ہے۔ اس بناء پر کہ ''**خمس مائة عام**'' سے بدل ہے یا صفت فارقہ ہے یا عطف بیان ہے چونکہ آخرت کے ایک دن کی مقدار دنیا کے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**وان یوما عندربك كالف سنة مما تعدون**﴾ [الحج۔ ٤٧] ''اور آپ کے رب کے پاس کا ایک دن (یعنی قیامت کا دن امتداد میں یا اشتداد میں) برابر ایک ہزار سال کے ہے۔ تم لوگوں کے شمار کے موافق''

چنانچہ اس دن کا نصف پانچ سو سال کے برابر ہوگا۔

اور دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿**فی یوم كان مقداره خمسین الف سنة**﴾ [المعارج۔٤] ''ایسے دن میں ہوگا جس کی مقدار (دنیا کے) پچاس ہزار سال کے برابر) ہے۔

گذشتہ نص کے عموم سے خاص کیا گیا ہے۔ یا اس بات پر محمول ہے کہ کفار کیلئے اس دن کو لمبا کر دیا جائے گا' جس طرح کہ نیکوکاروں کیلئے اس دن کو سمیٹ دیا جائے گا یہاں تک کہ نیکوکاروں کیلئے ایک گھڑی کے بقدر معلوم ہوگا۔ یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی اس پر دلالت کرتا ہے: ﴿**فاذا نقر فی الناقور فذالك یومئذ یوم عسیر علی الكفرین غیر یسیر**﴾

[المدثر۔٨۔٩۔١٠]

ترجمہ: ''پھر جس وقت صور پھونکا جاوے گا۔ سو وہ (وقت) یعنی وہ دن کافروں پر ایک سخت دن ہوگا جس میں ذرا آسانی نہ ہوگی''۔

اشرف فرماتے ہیں کہ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس حدیث اور گذشتہ حدیث جس میں ''اربعین خریفا'' (چالیس برس) کا ذکر ہے کے درمیان تطبیق کیسے ہوگی؟

تو اُسکا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ پہلی حدیث میں اغنیاء سے مراد مالدار مہاجرین ہوں۔ یعنی فقراء مہاجرین چالیس برس

پہلے جنت میں داخل ہونگے۔ اور دوسری حدیث میں وہ اغنیاء مراد ہوں جو مہاجرین نہیں ہیں۔ چنانچہ دونوں حدیثوں میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ (انتھی)

یہ جواب اُس وقت مکمل ہوگا جب فقراء سے خاص فقراء مراد لیے جائیں اور اغنیاء سے عام اغنیاء مراد لیے جائیں۔ چنانچہ مہاجرین کے علاوہ دوسرے فقراء کا حکم معلوم نہ ہوگا۔ لہٰذا حدیث کو ایسے معنیٰ پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے جس سے عام فقراء کا حکم معلوم ہو جائے۔ اور یہ اس طرح ہوگا کہ یوں کہا جائے کہ ہر عدد سے مراد کثرت بتانا ہے' کوئی معین مقدار بتانا مقصود نہیں ہے۔ ایک مرتبہ کثرت کو "اربعین خریفا" سے تعبیر کیا' اور دوسری مرتبہ کثرت کو "خمسمائة عام" سے تعبیر کیا کلام دونوں کا حاصل ایک ہے۔

یا پہلی مرتبہ وحی کے ذریعے سے چالیس کی خبر دی گئی' پھر جب حضور اقدس ﷺ کی برکت سے فقراء پر اللہ کا فضل بڑھ گیا تو پانچ سو سال کی خبر دی گئی۔

یا چالیس برس کم سے کم مدت کی طرف' اور پانچ سو سال زیادہ سے زیادہ مدت کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس پر وہ قول دلالت کرتا ہے۔ جس کو طبرانی نے مسلمہ بن مخلد سے نقل کیا ہے:

''مہاجرین جنت کی طرف دوسرے لوگوں سے چالیس برس آگے چلے گئے۔ پھر دوسرا گروہ سو سال آگے چلا گیا''۔

مطلب یہ ہے کہ تیسرا گروہ دو سو سال آگے جائے گا' اسی طرح بڑھتا جائے گا' گویا کہ وہ پانچ گروہوں میں محصور ہیں۔

یا احادیث میں اختلاف اس وجہ سے ہے کہ شکر کرنے، اللہ کے فیصلوں پر راضی رہنے اور صبر کرنے میں فقراء کی حالت مختلف ہیں۔ یہی زیادہ ظاہر اور اُس قول کے موافق ہے جو جامع الاصول میں ہے کہ دونوں حدیثوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ چالیس والی حدیث میں بے رغبت فقیر کا رغبت والے غنی سے آگے بڑھنا مراد ہے۔ لہٰذا حریص فقیر زاہد فقیر کے پچیس مراتب میں سے دو درجے رکھتا ہے اور یہی پانچ سو سے چالیس کی نسبت ہے۔ اور یہ خیال نہ کیا جانے کہ یہ مقدار اور اس جیسی اور مقداریں حضور علیہ السلام کی زبان پر اتفاق سے جاری ہوئی ہیں' بلکہ ان میں ایک راز ہے جو حضور علیہ السلام کو معلوم ہے۔ اور یہ ایک نسبت ہے۔ جس کا احاطہ حضور علیہ السلام کے علم نے کیا ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام اپنی طرف سے کوئی بات ارشاد نہیں فرماتے بلکہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ابن حبان نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ منذریؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے راویوں کو صحیح میں قابل استدلال سمجھا گیا ہے۔ ابن ماجہ نے اس حدیث کو "موسیٰ بن عبیدة عن عبد اللہ بن دینار عن عبد اللہ بن عمر" کی سند سے کچھ زیادتی کے ساتھ نقل کیا ہے۔

۵۲۴۴ : وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَاَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ فَقَالَتْ عَائِشَةُ لِمَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنَّهُمْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ قَبْلَ اَغْنِيَاءِ هِمْ بِاَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا يَا عَائِشَةُ لَا تَرُدِّي الْمِسْكِيْنَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ يَا عَائِشَةُ اَحِبِّى الْمَسَاكِيْنَ

وَقَرِّبِيهِمْ فَإِنَّ اللّٰهَ يُقَرِّبُكِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ. (رواه الترمذی والبیهقی فی شعب الایمان)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٩٩ حديث رقم ٢٣٥٢

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اللہ ﷺ نے یہ دعا فرمائی ''اے اللہ! مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھنا، مسکینی ہی کی حالت میں مجھے موت دینا اور مسکینوں ہی کی جماعت میں میرا حشر فرمانا''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور کو یہ دعا مانگتے ہوئے سنا تو عرض کرنے لگیں کہ یا رسول اللہ! آپ ﷺ ایسی دعا کیوں فرماتے ہیں؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اس لئے کہ مساکین (اپنے دوسرے فضائل وخصوصیات اور حسن اخلاق وکردار کی وجہ سے آخرت کی سعادتوں اور نعمتوں سے تو بہرہ ور ہوں ہی گے لیکن اس سے قطع نظر ان کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ) صاحب ثروت جنتیوں سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہو جائیں گے! اے عائشہ رضی اللہ عنہا کسی مسکین کو اپنے دروازہ سے ناامید واپس نہ لوٹانا (بلکہ ہر حالت میں اس کے ساتھ احسان اور رحم کا معاملہ کرنا اگرچہ اس کو دینے کے لئے تمہارے پاس محض کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ دیکھو عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے دل میں مسکینوں کی محبت رکھو اور ان کو اپنی (مجلسوں اور محفلوں کی) قربت سے نوازو (یعنی ان کو حقیر وکمتر خیال کر کے اپنے پاس آنے سے منع نہ کرو) اگر تم ایسا کرو گی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمہیں اپنی قربت سے نوازے گا (کیونکہ ان لوگوں سے کی جانے والی محبت ورحم دلی درحقیقت حق تعالیٰ شانہ کی محبت وقربت کا ذریعہ ہے)۔ (ترمذی، بیہقی)

تشریح: **قوله: اللهم احيني مسكينا:**

حضور اقدس ﷺ نے ''فقیراً'' نہیں فرمایا تاکہ حضور علیہ السلام کے محتاج اور حقیر ہونے کا وہم نہ ہو، اور حضور علیہ السلام کی اُس دُعا کے خلاف نہ ہو جس میں فرمایا کہ ''اے اللہ! مجھے میری نگاہ میں چھوٹا بنا اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بنا۔''

لفظ مسکین ''مسكنة'' سے ماخوذ ہے اور ''مسكنة'' کا معنی ہے بہت زیادہ تواضع کرنا اگرچہ انسان کو ذلت اُٹھانی پڑے۔ یا سکون اور سکینہ سے ماخوذ ہے۔ اور ''سکون'' اور ''سکینہ'' کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر رَاضی ہو کر اللہ کے احکام کے سامنے وقار اور اطمینان کے ساتھ رہنا۔

بعض نے حضور علیہ السلام کی دُعا کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ''اے اللہ! مجھے تواضع کرنے والا بنا اور متکبر اور جبر کرنے والا نہ بنا۔

اس دعا میں اُمت کو فقراء کی فضیلت بتائی گئی ہے تاکہ لوگ فقراء سے محبت کریں، ان کے پاس بیٹھیں اور ان کی برکت حاصل کرے۔ نیز اس دُعا میں فقراء کیلئے تسلی ہے اور اُنکے بلند درجات پر تنبیہ ہے۔

یہ بھی دُرست ہے کہ اس دعا کا مطلب یہ ہو کہ اے اللہ! میری روزی بقدر ضرورت رکھ، اور مجھے زیادہ مال کے ساتھ مشغول نہ کر، کیونکہ مال کی کثرت مقربین کے حق میں دنیا وآخرت کے وبال کا درجہ رکھتی ہے۔

قوله: وأمتني مسكينا امتنی: حاکم کی روایت میں ''توفنی'' کا لفظ ہے۔

یہ اس بات پر دلالت ہے کہ حضور علیہ السلام آخری عمر میں بھی مسکنت کی حالت میں تھے۔

قوله: واحشرني في زمرة المساكين:

یعنی مساکین کے گروہ اور جماعت میں میرا حشر فرما اس میں مبالغہ کا ہونا مخفی نہیں ہے۔اسلئے کہ اگر حضور علیہ السلام یوں فرماتے کہ ''ان فقراء کا حشر میری جماعت میں کردے'' تو بھی یہ فقراء کیلئے فضیلت اور بلند درجہ کی بات تھی۔اسی کی مانند وہ حدیث ہے کہ جس میں ارشاد فرمایا کہ ''عابد پر عالم کی فضیلت اس طرح ہے جیسا کہ میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ پر ہے''۔اس موقع پر حضور علیہ السلام نے یوں نہیں فرمایا کہ ''جیسا کہ میری فضیلت تم میں سے کسی بلند مرتبہ شخص پر ہے۔''

ایک مرتبہ ایک مسلمان بادشاہ فقراء اور صلحاء کی ایک جماعت کے پاس سے گزرا تو اُنہوں نے نہ بادشاہ کی طرف کوئی توجہ دی اور نہ بادشاہ کی طرف آگے بڑھے۔تو بادشاہ نے پوچھا تم کون ہو؟ اُنہوں نے جواب میں کہا: ''ہم وہ لوگ ہیں جن کو ترک دنیا سے محبت ہے اور ترک آخرت سے عداوت ہے''۔چنانچہ بادشاہ نے چشم پوشی کی اور آگے بڑھتے ہوئے کہا۔''میں نہ تو تم سے محبت رکھنے کی قدرت رکھتا ہوں اور نہ تم سے عداوت رکھنے کی مجھ میں طاقت ہے۔''

قولہ: فقالت عائشه رضي الله عنها

یعنی آپ نے اس طرح کی دُعا کیوں مانگی؟ اغنیاء کو چھوڑ کر فقراء اور مساکین کے ساتھ مرنے اور جینے کو کیوں اختیار کیا۔

انهم يد خلون الجنة : مستانفہ ہے جو جملہ تعلیلیہ کے معنی میں ہے۔

قبل اغنيائهم باربعين خريفا: قبلیت سے یا تو قبلیت زمانی مراد ہے (یعنی چالیس برس پہلے جنت میں داخل ہونگے ۔) یا اس سے قبلیت مکانی مراد ہے (یعنی فقراء کا مکان چالیس برس کی مسافت کے بقدر بلند ہوگا۔) یا قبلیت مکانت مراد ہے۔(یعنی فقراء کا رُتبہ چالیس برس کی مسافت کے بقدر اُونچا ہوگا۔)

باربعين خريفا: صرف ''چالیس خریف'' کی مقدار پر اکتفاء اسلئے کیا کہ جنت کی طرف مسابقت کی مدت کے بارے میں یہ کم سے کم مقدار ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے جیسا کہ اطاعت میں نیکی کی مضاعفت کی کم سے کم مقدار دس گنا ہے۔

قولہ: يا عائشة لا تردي المسكين:

یعنی مسکین کو نامراد رخصت نہ کر بلکہ جب کوئی مسکین آئے تو بھی چشم پوشی کر' اور جب واپس ہو تو بھی چشم پوشی کر' اور مسکین کے ساتھ احسان کر چاہے قلیل مقدار میں ہو چاہے کثیر مقدار میں ہو۔

قولہ: ولو بشق تمرة:

یعنی آدھی کھجور سے یا کھجور کے ایک ٹکڑے سے یا مسکین کو اس طرح اچھے اسلوب کے ساتھ رخصت کرو کہ تم بڑے اجر کی مستحق ہو جاؤ۔اسی وجہ سے جب کوئی مسکین آتا اور ان کے ہاتھ میں انگور کا ایک دانہ ہی بچا ہوا ہوتا وہ اس کو عنایت فرمادیتیں۔کہ مسکین ناراض بھی ہوتا۔مگر آپ یہ آیت تلاوت فرماتیں: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال: ۷ ـ ۸] ''سو جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا۔وہ اس کو دیکھ لے اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا، وہ اس کو دیکھ لے گا''۔

۵۲۴۵ : وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اِلٰی قَوْلِهٖ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ۔

اخرجه ابن ماجه ۱۳۸۱/۲ حديث رقم ۴۱۲۶

ترجمہ: "ابن ماجہ نے اس روایت کو حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے صرف زمرۃ المساکین تک نقل فرمایا ہے (یعنی ان کی روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا سوال و جواب اور حدیث کے دیگر جملے نہیں ہیں۔

تشریح: وابن ماجه عن ابی سعید الی قوله زمرة المساکین: ورویا: اور ایک نسخہ میں "رواہ" کے الفاظ ہیں۔

میرکؒ نے منذریؒ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ اس حدیث کو حاکم نے ان سے یعنی ابو سعیدؓ سے نقل کیا ہے۔ اور اس میں یہ زیادت نقل کی ہے:

"سب سے بڑا بد بخت وہ شخص ہے جس پر دنیا کا فقر اور آخرت کا عذاب جمع ہو جائے۔"

اور فرمایا کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔

ابو الشیخ اور بیہقی نے اس حدیث کو عطاء بن ابی رباح سے اس طرح نقل کیا کہ عطاء ابن ابی رباح نے ابو سعیدؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

"اے لوگو! تنگدستی تم لوگوں کو کہیں حرام طلب کرنے پر مجبور نہ کر دے۔ کیونکہ میں نے حضور علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا ہے: اے اللہ مجھے فقر کی حالت میں موت عطا کر' مالداری کی حالت میں مجھے موت نہ دے۔ اور مجھے قیامت کے دن مساکین کے ساتھ اُٹھا کیونکہ بڑا بد بخت ہے وہ شخص جو فقیر بھی رہے اور آخرت میں عذاب کا بھی مستحق ہو جائے۔"

ابو الشیخ فرماتے ہیں کہ ابو زرعہ کے علاوہ دوسروں نے سلیمان بن عبد الرحمٰن سے ان الفاظ کی زیادتی بھی نقل کی ہے:

"اور مجھے قیامت کے دن اغنیاء کی جماعت میں نہ اُٹھا۔"

میں کہتا ہوں کہ اگر اس حدیث کے علاوہ کوئی اور دلیل نہ بھی ہو تو یہ حدیث اس بات پر ایک واضح اور روشن دلیل ہے کہ صابر فقیر شاکر غنی سے افضل ہے۔ اور جہاں تک بات ہے اس حدیث کی:

"الفقر فخری وبه افتخر" فقر میرا فخر ہے اسی پر میں فخر کرتا ہوں۔"

تو یہ حدیث باطل ہے' اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ حفاظ حدیث علامہ عسقلانی وغیرہ نے اس کی صراحت کی ہے۔

اور یہ حدیث "کاد الفقر ان یکون کفرا" بہت زیادہ ضعیف ہے۔ اور اگر صحیح فرض کی جائے تو بھی اس سے مراد وہ قلبی فقر ہے جس کی وجہ سے انسان جزع فزع کرتا ہے اور اللہ کے فیصلوں پر راضی نہ رہنے اور زمین و آسمان کے رب کی تقسیم پر اعتراض کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لئے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ "کثرت اسباب کا نام غنی نہیں ہے بلکہ دل کی بے نیازی کا نام غنیٰ ہے۔"

مروی ہے:

"دلہن کے رخسار پر باریک بالوں سے پیدا شدہ حسن سے بڑھ کر زینت بخش ہے اور ایک روایت ہے کہ فقر لوگوں کے ہاں تو باعث ننگ ہے لیکن روزِ قیامت اللہ کے ہاں زینت ہوگا۔ اس کو طبرانی نے شداد بن اوس سے نقل کیا ہے۔

اور نقل کیا گیا ہے: "فقر امانت ہے، جو اس کو چھپائے تو عبادت ہے' اور اگر اس کو ظاہر کرے تو تحقیق اس نے اپنے

مسلمانوں بھائیوں کی تقلید کی۔'' اس حدیث کو ابن عسا کرنے عمر سے روایت کیا ہے

۵۲۴۶ : وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ابْغُوْنِیْ فِیْ ضُعَفَائِكُمْ فَاِنَّمَا تُرْزَقُوْنَ اَوْ تُنْصَرُوْنَ بِضُعَفَاءِ کُمْ. (رواه ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۷۳/۳ حدیث رقم ۲۵۹۴ والترمذی فی السنن ۱۷۹/٤ حدیث رقم ۱۷۰۲ والنسائی فی السنن ٤٥/٦ حدیث رقم ۳۱۷۹ واحمد فی المسند ۱۹۸/٥

ترجمہ: ''حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم لوگ مجھے اپنے کمزور لوگوں میں تلاش کیا کرو کیونکہ تمہیں رزق کا دیا جانا یا یہ فرمایا کہ تمہیں اپنے دشمن کے مقابلہ پر مدد کا حاصل ہونا انہی لوگوں کی برکت سے ہوتا ہے جو تم میں کمزور ہیں''۔ (ابوداؤد)

تشریح: ابغونی: ہمزہ قطعی مفتوحہ کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں ہمزہ وصلی مکسورہ کے ساتھ ہے۔

یعنی فقراء کے ساتھ احسان کر کے

فانما ترزقون برزق حسی یا رزق معنوی مراد ہے۔

ظاہری اور باطنی دشمنوں کے خلاف اور ''او'' نوع بتانے کیلئے ہے۔ ''واؤ'' والی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ''او'' راوی کی طرف سے شک بتانے کیلئے ہو۔

ان کے وجود کی برکت سے اور ان کے احسان کی برکت سے اسلئے کہ ان ہی میں اقطاب و اوتاد ہوتے ہیں۔ انہی سے عباد و بلاد کا نظام قائم ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں یعنی اطلبوا الی حفظ حقوقهم وجبر قلوبهم کیونکہ میں صورۃً ان کے ساتھ ہوتا ہوں۔ بعض اوقات میں اور میرا دل ان کے ساتھ ہر وقت رہتا ہے۔ جس نے ان کا اکرام کیا اُس نے میرا اکرام کیا اور جس نے ان کو تکلیف دی۔ اُس نے مجھے تکلیف دی۔ (انتھی) اس کی تائید اس حدیث قدسی سے ہوتی ہے: ''من عادی لی ولیا فقد بارزنی بالحرب''۔

''جس نے میرے کسی ولی سے عداوت کی اُس نے میرے سامنے اعلان جنگ کیا''

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ (ابغونی) ہمزہ وصلی اور ہمزہ قطعی دونوں کے ساتھ پڑھنا درست ہے۔ عرب ''یبغی یبغی بغیا'' کو طَلَبَ (طلب کیا) کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اس ارشاد نبوی میں اغنیاء کے ساتھ میل جول رکھنے سے نہی ہے۔ اور حضور علیہ السلام کی طرف سے اُمت کیلئے تعلیم ہے۔ اس کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں ارشاد فرمایا کہ ''مردوں کے ساتھ بیٹھنے سے پرہیز کرو۔ پوچھا گیا کہ مردوں سے کون مراد ہیں؟ فرمایا: مالدار لوگ۔

مختصر نہایہ میں لکھا ہے کہ ابغنی جب ہمزہ وصلی کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے: اطلبه لی (میرے لئے تلاش کرو) اور جب ہمزہ قطعی کے ساتھ ہو تو معنی ہے: اعنی علی الطلب (تلاش کرنے میں میری اعانت کرو) اور قاموس میں لکھا ہے: بغیتہ طلبته میں نے تلاش کیا) کے معنی میں ہے ~~ابغیته~~ الشی کے معنی ہیں: طلبہ لہٗ اُس کیلئے تلاش کیا جیسا کہ بغاہ ایاہ

ہے'یہ' دماة' کے وزن پر ہے۔یااس کا معنی ہے: **أعانه على طلبه** (تلاش کرنے میں اُسکی اعانت کی)

تخریج: ترمذی اورنسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے صحیح ہے۔(نقلہ میرک عن تصحیح)

اور جامع میں یہ الفاظ ہیں:''ابغوني الضعفاء فانما ترزقون وتنصرون بضعفائكم''

اس روایت کو احمد، اصحاب کتب ثلثہ، حاکم اور ابن حبان نے نقل کیا ہے۔

۵۲۴۷ : وَعَنْ اُمَيَّةَ اَنَّ خَالِدَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اُسَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ كَانَ يَسْتَفْتِحُ بِصَعَالِيْكِ الْمُهَاجِرِيْنَ. (رواه في شرح السنة)

اخرجه البغوي في شرح السنة ١٤/ ٢٦٤ حديث رقم ٤٠٦٢

ترجمہ:'' حضرت امیہ بن خالد بن عبداللہ بن اسید رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ (جب اللہ تعالیٰ سے کفار کے مقابلہ فتح مانگنے کی ضرورت ہوتی) تو فقراء مہاجرین کی برکت کے ذریعہ فتح حاصل ہونے کے لئے درخواست کرتے''۔

راویٔ حدیث:

امیہ بن عبداللہ۔یہ''امیہ'' ہیں''عبداللہ ابن خالد بن اسید مکی'' کے بیٹے ہیں۔انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے اور ان سے زہری وغیرہ نے۔ثقہ تھے۔والی خراسان تھے اور ۸۰ھ میں انتقال کیا۔''امیہ'' تصغیر کے ساتھ ہے''امیہ'' میں ہمزہ مفتوح اور سین مہملہ مکسور ہے۔میرک نے التصحیح سے نقل کیا ہے کہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں امیہ بن خالد رسول ﷺ سے حدیث نقل کرتے ہیں۔(اور پھر یہ حدیث نقل کرنے کے بعد ابن عبدالبر فرماتے ہیں) میرے نزدیک ان کی صحابیت ثابت نہیں ہے۔لہٰذا یہ حدیث مرسل ہے۔

امیہ بن خالد نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں اور پھر یہ حدیث ذکر کی ہے اور فرمایا کہ میرے نزدیک اُمیہ بن خالد کا صحابی ہونا دُرست نہیں ہے۔اور حدیث مرسل ہے۔میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں کہ مرسل تابعی جمہور کے نزدیک حجت ہے۔تو اُس شخص کی مرسل روایت کا اعتبار کیوں نہ ہو جن کے صحابی ہونے میں اختلاف ہو۔

عرضِ مرتب:

ملاعلی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مؤلف نے امیہ بن خالد کا نام ذکر نہیں فرمایا۔اھ۔مگر ہمارے نسخہ میں ان کا نام اور حالات موجود ہیں نیز مرقات کے دونوں (فوقانی وتحتانی) متون میں امیہ کی ولدیت خالد بن عبداللہ ہے جبکہ''الاکمال'' میں عبد اللہ بن خالد ہے۔واللہ اعلم بالصواب۔

تشریح: قوله: وعن أمية بن خالد بن عبد الله بن اسيد' عن النبي صلى الله عليه وسلم:''امیہ'' تصغیر کے ساتھ'اور''اسید''میں'پہلے فتحہ اور پھر کسرہ ہے۔مؤلف نے''الاسماء'' میں ان کا اسم گرامی ذکر نہیں کیا ہے اور میرکؒ نے التصحیح

سے نقل کیا ہے کہ ابن عبدا کبر فرماتے ہیں۔

انه کان یستفتح یعنی کفار کے مقابلہ میں اللہ سے فتح اور مدد طلب کرتے تھے۔

بصعالیك المهاجرین یعنی فقراء کے ذریعہ سے اور اُنکی دُعا کی برکت سے نہایہ میں لکھا ہے: **ای یستنصر بهم** اور اسی سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [**ان تستفتحوا فقد جاء کم الفتح**][الانفال۔۱۹]

ابن الملک فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ یوں دعا مانگتے: اے اللہ! اپنے مہاجرین فقراء بندوں کے طفیل دُشمن کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔ اس میں فقراء کی عظمت بیان کی گئی ہے اور ان کی دُعا اور ان سے برکت حاصل کرنے کا شوق دلایا گیا ہے۔

میں (ملا علی قاری) کہا ہوں "مہاجر" کی قید لگانے کی وجہ شاید یہ ہے کہ مہاجرین فقراء تھے اجنبی تھے۔ مظلوم تھے محنتی اور مجاہد تھے۔ چنانچہ عام مسلمانوں اور مالدار مسلمانوں کی بنسبت ان کی دُعاؤں کی تاثیر کی زیادہ اُمید ہوتی تھی۔

"**صعالیك**" "**صعلوك**" کی جمع ہے اور "**صعلوك**" "**عصفور**" کے وزن پر ہے۔ قاموس میں "صعلوک" کا معنی "فقیر" لکھا ہے۔

علامہ بغوی نے اس حدیث کو مطلق ذکر کیا اور اس حدیث کے مرسل ہونے کو بیان نہیں کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ علامہ بغوی راوی کے صحابی ہونے کے قائل ہیں اور سند حدیث کے متصل ہونے کے قائل ہیں۔ اس روایت کے معنی کو تقویت ملتی ہے اس حدیث سے جو ما قبل گزری ہے: "**انما تنصرون بضعفائكم**"۔

پھر یہ کہ اس حدیث کو میں نے جامع میں دیکھا تو اس میں لکھا تھا کہ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ اور طبرانی نے امیہ بن عبداللہ سے نقل کیا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں: "**کان صلی الله علیه وسلم یستفتح ویستنصر بصعالیك المسلمین**"۔

۵۲۴۸ : **وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَغْبِطَنَّ فَاجِرًا بِنِعْمَةٍ فَاِنَّكَ لَاتَدْرِیْ مَاهُوَلَاقٍ بَعْدَ مَوْتِهٖ اِنَّ لَهٗ عِنْدَ اللّٰهِ قَاتِلاً لَایَمُوْتُ یَعْنِی النَّارَ** (رواه فی شرح السنة)

اخرجه البغوی فی شرح السنة ٤/ ٢٩٤ حدیث رقم ٤١٠٣۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کسی فاجر (یعنی فاسق یا کافر) کو دنیاوی نعمتوں "یعنی مال و دولت اور شہرت سے بہرہ ور دیکھ کر اس پر رشک نہ کرو کیونکہ تمہیں معلوم نہیں کہ مرنے کے بعد (حشر یا قبر میں) اس کو کیسے کیسے حالات کا سامنا کرنا ہے (یعنی وہ یہاں تو یقیناً دنیاوی نعمتوں سے مالا مال دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے برعکس آخرت میں مختلف انواع کی سختیوں اور عذاب کا سامنا کرے گا) اور (سن لو!) فاجر کے لئے خدا کے یہاں ایک ایسا قاتل ہے جس کو موت اور فنا نہیں آتی" اور اس قاتل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد "آگ" ہے۔"

(شرح السنۃ)

تشریح: **لاتغبطن فاجرا بنعمة**: **لاتغبطن**: باء کے کسرہ اور نون تاکید کی تشدید کے ساتھ

بنعمة : وہ نعمتیں جو اُس کے پاس ہے۔ مثلاً لمبی عمر یا زیادہ اولاد یا زیادہ مال یا عہدہ اس طرح کہ تم اس نعمت کے زوال کی چاہت رکھو یا اس جیسی نعمت اپنے لئے طلب کرو۔

قوله: فانك لاتدري ماهو...... عندالله قاتلا لا يموت اس کو ہلاک کرنے والا۔ یا ایسا دردناک عذاب جو قتل کرڈالتا ہے۔

قوله: يعني النار طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ابو ہریرہؓ سے نقل کرنے والے عبداللہ بن مریم کی تفسیر ہے۔ اسی طرح شرح السنہ میں ہے۔ انتہی۔

جزری فرماتے ہیں کہ بعض کے نزدیک یہ لفظ **"قائلاً"** ہے جس کا ہمزہ مکسورہ ہے اور یہ **"قيلولة"** سے ماخوذ ہے اور بعض کے نزدیک ''قاتلاً'' تاء کے ساتھ ہے۔ یعنی آگ اس کو قتل کرے گی۔

تخریج: جامع میں ہے کہ بیہقی نے اس حدیث کو ''شعب'' میں ان سے نقل کیا ہے اور اُس کے الفاظ یوں ہیں:
''لا تغبطن فاجرا بنعمة ان له عندالله قاتلا لايموت''۔

۵۲۴۹ : عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَسَنَتُهٗ وَاِذَا فَارَقَ الدُّنْيَا فَارَقَ السِّجْنَ وَالسَّنَةَ. (رواه في شرح السنة)

احمد في المسند ۱۹۷/۲

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ دنیا! مؤمن کے لئے قید خانہ اور قحط ہے جب وہ مؤمن دنیا سے کوچ کرتا ہے تو (گویا) قید خانہ اور قحط سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے''۔ (شرح السنۃ)

تشریح: قوله: الدنيا سجن المؤمن وسنته:

یعنی اُن نعمتوں اور ثواب کی نسبت سے عذاب اور قید ہے جو نعمتیں اور ثواب اللہ نے آخرت میں تیار کر رکھا ہے۔

سنته: سین اور نون کے فتحہ کے ساتھ۔ قحط اور زندگی کی تنگی۔ اسی وجہ سے نقل کیا گیا ہے کہ مؤمن تنگی بیماری اور ذلت سے خالی نہیں رہتا' اور کبھی یہ تمام چیزیں مؤمن میں جمع ہو جاتی ہیں۔

طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لفظ ''السنة'' اُن اسماء میں ہے' جن کو زیادہ تر قحط کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔

ابن عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب تک دنیا میں رہو نا گوار اُمور کو عجیب نہ سمجھو بلکہ اس کے بالمقابل اگر کچھ ہو تو اُس کو عجیب سمجھو۔

قوله: واذا فارق الدنيا فارق السجن والسنة دونوں کو ذکر کرنے کی وجہ شاید اُس وھم کو زائل کرنا ہے جو بعض اوقات ہوتا ہے کہ قید خانہ میں بھی بعض اوقات کشادگی ہوتی ہے جیسا کہ کبھی کبھار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس وھم کو ''والسنة'' کے لفظ سے زائل کر دیا۔ چنانچہ اس کی زیادتی تتمہ اور تکمیل کیلئے ہے اور گذشتہ حدیث صحیح میں مطلق رکھا گیا اکثر احوال پر اعتماد کرتے ہوئے۔ اگرچہ قید خانہ میں ضرور مکان کی تنگی' رزق کی تاخیر اور دل کی پریشانی ہوتی ہے باوجود یہ کہ خدمت کرنے والے بھی ہوں۔

تخریج: ابن مبارک اور طبرانی نے بھی ان سے اس روایت کی تخریج کی ہے۔ امام میرک فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو حاکم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ مگر اس کی سند میں عبداللہ بن ایوب مغافری ہے۔ (انتہی) اس حدیث کا کچھ ٹکڑا اور معانی کا بیان آغاز باب میں گزر چکا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

امام حافظ ابوالقاسم وراق فرماتے ہیں اگر اعتراض کیا جائے کہ حدیث کا معنی اس طرح کیسے ہوسکتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مؤمن خوشحال زندگی گزارتا ہے اور کافر پریشانی اور تنگدستی کی زندگی گزارتا ہے؟ تو اس کا جواب دو طرح سے ہے:

اول یہ کہ دنیا کافر کیلئے اُس عذاب کے مقابلہ میں جنت کی طرح ہے جو عذاب اللہ نے اُسکے لئے آخرت میں تیار کر دیا ہے اور یہی دنیا مؤمن کیلئے اُس ثواب اور نعمتوں کے مقابلہ میں قید خانہ کی طرح ہے جو ثواب اور نعمتیں اللہ نے اس کے لئے آخرت میں تیار کر رکھی ہیں۔ چنانچہ کافر دنیا میں قیام پسند کرتا ہے اور دنیا سے جدائی اس کو ناگوار ہے اور مؤمن اس دنیا سے نکلنے کا مشتاق ہوتا ہے اور اس کی آفات سے اس طرح خلاصی کی طلب ہوتی ہے جس طرح قیدی کو قید خانہ سے نکلنے کی طلب ہوتی ہے۔

دوم یہ کہ یہ اُس مؤمن کی صفت ہے جو کامل ایمان والا ہو جس نے اپنے نفس کو دنیا کی لذتوں اور خواہشات سے دُور رکھا ہو تو یہ دنیا سختی اور تنگی کی وجہ سے بمنزلہ قید خانہ کے ہو جاتی ہے۔ اور کافر اپنے نفس کو چھوڑے رکھتا ہے اور دنیا کی لذتوں اور خواہشات کی طلب میں اپنے نفس کو خوش رکھتا ہے۔ چنانچہ دنیا وسعت اور خوشی کی وجہ سے اس کے لئے بمنزلہ جنت کے ہے۔

۵۲۵۰ : عَنْ قَتَادَةَ بْنَ النُّعْمَانِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا حَمَاهُ الدُّنْيَا كَمَا يَظَلُّ اَحَدُكُمْ يَحْمِيْ سَقِيْمَهُ الْمَآءَ. (رواه احمد والترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴/۳۳۴ حدیث رقم ۲۰۳۶ واحمد فی المسند ۴۲۷۵

ترجمہ: "حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جب حق تعالیٰ شانہٗ کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو اس کو دنیا سے ایسے بچائے رکھتا ہے، جس طرح کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے مریض کو پانی سے پرہیز کراتا ہے"۔ (احمد ترمذی)

راویٔ حدیث:

قتادہ بن النعمان۔ یہ قتادہ ہیں۔ نعمان کے بیٹے ہیں۔ انصار میں سے ہیں۔ بیعت عقبہ اور غزوۂ بدر اور اس کے بعد تمام غزوات میں حاضر رہے۔ صاحب فضل صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ ان سے ان کے اخیافی (ماں شریک) بھائی ابوسعید خدری اور ان کے بیٹے عمر نے روایت کی۔ ۲۳ھ میں بعمر ۶۵ سال انتقال فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

تشریح: یعنی اس کو دنیا کے مال و مرتبہ اور ہر اُس چیز سے محفوظ رکھتے ہیں جو اس کے دین کیلئے نقصان دہ ہو اور آخرت میں نقصان کا ذریعہ ہو۔

اشرف فرماتے ہیں کہ اللہ اس شخص کو دنیا سے روک دیتے ہیں اور دنیا کی زینت میں ملوث ہونے سے بچالیتا ہے تاکہ دنیا کی بیماری سے اس کا دل بیمار نہ ہو۔

یظل ظاء کے فتحہ کے ساتھ ظل زید صائما بمعنی "صار زید صائما" سے ماخوذ ہے چنانچہ معنی تم اپنے مریض کو بچاتے ہو۔ خصوصاً جب استسقاء کی بیماری ہو یا ضعف معدہ کی بیماری ہو یا اور کوئی ایسی بیماری ہو جس کے لئے مضر ہو۔ کہ پانی پینے سے بیماری بڑھ نہ جائے۔ اور ایسے موقع پر مریض کے مطالبہ پر بھی پانی نہیں دیا جاتا باوجود یہ کہ گھر

والے اس سے محبت کرتے ہیں' اور پانی تقریباً تمام اشیاء میں سستی چیز ہے جس میں بخل کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً اُس مریض کی بنسبت جس پر ہر شخص مہربان ہو۔ حاصل یہ کہ حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ شخص جو اپنے اہل و اقارب کے ہاں محبوب ہوتا ہے اُس کو ہر اُس چیز سے روکا جاتا ہے جو فی الحال اُسکے لئے مضر ہو۔

تخریج: جامع کے الفاظ یوں ہیں: "اذا احب الله عبدا حماه الدنیا کما یحمی احدکم سقیمه الماء"

اس حدیث کو امام ترمذی، حاکم اور بیہقی نے شعب میں نقل کیا ہے۔ اور بیہقی کی ایک روایت میں حضرت حذیفہؓ سے یہ الفاظ منقول ہیں: "ان الله یحمی عبده المؤمن کما یحمی الراعی الشفیق غنمه من مراتع الهلکة"

اور یہ معنی قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ: ﴿انت ارحم الراحمین﴾ [الاعراف۔۱۵۱، الانبیاء۔۸۳] "اور سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے" سے ماخوذ ہے۔

۵۲۵۱ : وَعَنْ مَحْمُودِ بْنِ لَبِيْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اثْنَتَانِ يَكْرَهُهُمَا ابْنُ اٰدَمَ يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَالْمَوْتُ خَيْرٌ لِّلْمُؤْمِنِ مِنَ الْفِتْنَةِ وَيَكْرَهُ قِلَّةَ الْمَالِ وَقِلَّةُ الْمَالِ اَقَلُّ لِلْحِسَابِ. (رواه احمد)

اخرجه الحمد فی المسند ۴۲۷/۵۔

ترجمہ: "حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "دو چیزیں ایسی ہیں جن کو ابن آدم طبعاً ناپسند خیال کرتا ہے (اگرچہ درحقیقت وہ دونوں چیزیں بہت اچھی ہیں) چنانچہ ابن ادم ایک تو موت کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ مؤمن کے لئے موت فتنہ سے بہتر ہے' دوسرے مال و دولت کم ہونے کو ناپسند کرتا ہے' حالانکہ مال کا کم ہونا حساب کی کمی کا باعث ہے"۔ (احمد)

تشریح: یکرھهما :

قوله یکره الموت والموت خیر لمؤمن من الفتنة:

ابن الملک فرماتے ہیں کہ وہ فتنہ جس سے موت بہتر ہے' شرک میں مبتلا ہونا ہے۔ یا وہ فتنہ جس سے انسان تنگ دل ہو جائے اور اس کی زبان پر ایسے کلمات جاری ہوں۔ جو نامناسب ہوں اور ان کا اعتقاد ہو جانا جائز نہ ہو۔

امام راغب فرماتے ہیں علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کبھی فتنہ دینی امور کا ہوتا ہے۔ مثلاً مرتد ہو جانا یا دوسرے کو معاصی پر مجبور کرنا۔ اسی کی طرف ارشارہ ہے حضور علیہ السلام کے اس ارشاد گرامی میں: "اذا اردت فتنة فی قوم فتوفنی غیر مفتون" اے اللہ! جب تو کسی قوم میں کسی فتنہ کا ارادہ کرے تو مجھے فتنہ سے محفوظ کر کے موت دے۔)

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ ابونعیم نے "حلیہ" میں ابوعبداللہ صنابحی سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ "دنیا فتنہ کی طرف بلاتی ہے اور شیطان برائی کی طرف بُلاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات ان دونوں مصیبتوں کے ساتھ رہنے سے بہتر ہے۔

تخریج: اسی طرح سعید بن منصور نے اپنی سُنن میں صحیح سند کے ساتھ محمد بن لبید سے نقل کیا ہے۔

امام بیہقی نے شعب الایمان میں زرعہ بن عبداللہ سے مرسلاً نقل کیا ہے:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: انسان زندہ رہنے کو پسند کرتا ہے حالانکہ موت اس کے لئے بہتر ہے۔ اور انسان کثرت مال

پسند کرتا ہے حالانکہ کم مال کی صورت میں حساب کم سے کم ہوگا۔"

حاکم نے مستدرک میں' طبرانی نے کبیر میں' ابن مبارک نے زہد میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں عبداللہ بن عمرو سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مؤمن کا تحفہ موت ہے۔"

مروزی نے "جنائز" میں' ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور طبرانی نے ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے:

"قال ذهب صفو الدنيا فلم يبق منها الا لكدر' فالموت تحفة لكل مسلم"۔

چنانچہ موت ہر مسلمان کیلئے تحفہ ہے۔"

امام مروزی اور ابن ابی الدنیا نے اور امام بیہقی نے "الشعب" میں ابن مسعود سے نقل کیا ہے:

وہ فرماتے ہیں کہ "یہ دو ناگوار چیزیں یعنی فقر اور موت اچھی چیزیں ہیں۔"

امام احمد نے زہد میں اور ابن ابی الدنیا نے ابن مسعود سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

"اللہ کی ملاقات کے علاوہ مؤمن کیلئے کوئی راحت نہیں ہے۔"

ابن ابی الدنیا نے جعفر احمر سے نقل کیا ہے:

"جس شخص کیلئے موت میں کوئی خیر نہیں ہے تو اُسکے لئے زندگی میں بھی کوئی خیر نہیں ہے۔"

میں (ملاعلی قاری) کہتا ہوں کہ اسی طرح جس کے لئے زندگی میں کوئی خیر نہیں اُس کی موت میں کوئی خیر نہیں ہے۔

ابن ابی شیبہ نے مصنف میں' عبدالرزاق نے اپنی تفسیر میں، حاکم نے مستدرک میں' اور طبرانی اور مروزی نے جنائز میں ابن مسعود سے نقل کیا ہے:

وہ فرماتے ہیں جو بھی کوئی نیک یا فاجر ہو اُسکے لئے موت اُسکی زندگی سے بہتر ہے۔ اگر انسان نیک ہو تو اللہ کا ارشاد ہے: ﴿وماعند الله خير للابرار﴾ [آل عمران:۱۹۸] اور اگر انسان فاجر ہو تو اللہ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ [آل عمران:۱۷۸] "اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں وہ یہ خیال ہرگز نہ کریں کہ ہمارا ان کو مہلت دینا ان کے لئے بہتر ہے۔ ہم ان کو صرف اسلئے مہلت دیتے رہے ہیں تاکہ جرم میں ان کو اور ترقی ہوجائے اور ان کو توہین آمیز سزا ہوگی"۔

۵۲۵۲ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّيْ اُحِبُّكَ فَقَالَ انْظُرْ مَا تَقُوْلُ فَقَالَ وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاُحِبُّكَ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ قَالَ اِنْ كُنْتَ صَادِقًا فَاَعِدَّ لِلْفَقْرِ تِجْفَافًا لَلْفَقْرُ اَسْرَعُ اِلٰى مَنْ يُّحِبُّنِيْ مِنَ السَّيْلِ اِلٰى مُنْتَهَاهُ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٩٨ حديث رقم ٢٣٥٠

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے (بہت شدید) محبت کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ (سن کر) ارشاد فرمایا کہ غور کرلو کہ کیا کہہ رہے

ہو؟ (یعنی اچھی طرح سوچ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو' کیونکہ بڑی عظیم الشان بات کا تم دعویٰ کر رہے ہو' ایسا نہ ہو کہ بعد میں اپنی بات پر پورا نہ اتر سکو) اس شخص نے عرض کیا کہ خدا کی قسم' میں یقیناً آپ ﷺ سے محبت رکھتا ہوں اور تین بار یہی جملہ ادا کیا' حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم (اپنے پاس دعوے میں) سچے ہو تو پھر فقر کے لئے آہنی جھول تیار کرلو کیونکہ جو شخص مجھ سے محبت رکھتا ہے اس کو فقر و افلاس' اس سیل رواں سے بھی زیادہ جلد پہنچتا ہے جو اپنے منتہا کی طرف جاتا ہے''۔ اس حدیث کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: قوله:فقال :والله انی لاحبك ثلاث مرات:

ثلاث مرات: ''قال'' فعل کیلئے ظرف ہے۔ ابہت زیادہ محبت مراد ہے ورنہ تو ہر مؤمن کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہوتی ہے۔

اور جامع کے الفاظ یوں ہیں ''ان کنت تحبنی''۔

قوله:ان کنت صادقا فاعد للفقر تجفا فا:(لفقر): یعنی میری محبت کے دعویٰ میں سچے ہو اور مشقت برداشت کرنے کے دعویٰ میں سچے ہو۔

تجفافا ''تاء'' کے کسرہ اور جیم کے سکون کے ساتھ۔ زرہ اور ڈھال مُغرب میں لکھا ہے کہ ''تجفاف'' اُس چیز کو کہتے ہیں جو جنگ کے دوران گھوڑے پر رکھتے ہیں گویا کہ زرہ کو کہتے ہیں۔ ''تجفاف'' تفعال کے وزن پر ہے۔ اور ''جف'' سے ماخوذ ہے کیونکہ اس میں بھی سختی اور خشکی کا معنی موجود ہے۔ (انتہیٰ) اس کی تاء زائد ہے جیسا کہ نہایہ میں اس کی تصریح ہے۔

قاموس میں ہے کہ تجفاف ''تاء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اُس آلہ کو کہتے ہیں جس کو جنگ کے دوران انسان اپنی حفاظت کیلئے خود پہنتا ہے اور گھوڑے کی حفاظت کیلئے گھوڑے کو پہناتا ہے۔

حدیث کا معنی یہ ہے کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو اور اپنی بات میں پکے ہو تو ایسا آلہ تیار کرو جو آزمائش کے وقت تجھے فائدہ دے۔ کیونکہ آزمائش اور میری محبت خلوت اور جلوت میں ایک دوسرے کو لازم ہیں۔ خلاصہ یہ کہ صبر کیلئے تیار ہو جاؤ' خصوصاً فقر پر صبر کرنے کیلئے' تاکہ تم اپنے یقین کی قوت سے اپنے دین سے ان چیزوں کو دور کر سکو' اس چیز کا جو دین کے منافی ہے۔ یعنی جزع فزع' قناعت کی کمی اور اللہ کی تقسیم پر ناراضگی۔ ''تجفاف'' کنایہ ہے صبر سے' کیونکہ صبر فقر پر پردہ ڈال کر اس کو چھپا دیتا ہے۔ جیسا کہ ''تجفاف'' بدن کو نقصان والی چیز سے چھپا کر بچاتا ہے۔

قوله:للفقر اسرع الی من الخ:لفقر: لام مفتوحہ کے ساتھ ہے' یہ لام ابتدا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے اس کی طرف ضرور فقر تیزی کے ساتھ پہنچے گا اور ضرور اُس پر آزمائش اور مصائب آئیں گے کیونکہ لوگوں میں سب سے زیادہ آزمائش انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں اس کے بعد ان پر جو انبیاء کرام سے زیادہ مماثلت رکھے۔ اس طرح بقدر مماثلت ترتیب کے ساتھ آزمائش آتی ہے۔ خصوصاً سید الانبیاء ﷺ پر کہ آپ علیہ السلام پر انبیاء میں سے زیادہ آزمائش آئی۔ اور آپ علیہ السلام کے متبعین پر اُنکی محبت کے اعتبار سے آزمائش آئیگی اور کوئی انسان جب کسی سے محبت رکھتا ہے اُسی کے ساتھ خوشگواریوں اور ناگواریوں میں رہتا ہے۔

اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ فقر ایک بڑی آزمائش ہے کیونکہ یہ تمام مشقتوں اور مصیبتوں پر مشتمل ہے۔ لیکن فقر دنیا میں کڑواہٹ کے باوجود آخرت میں اللہ کی مہربانیوں اور عطاء کی صورت میں حلاوت کا ذریعہ ہے۔

تخریج: احمد نے بھی نقل کیا ہے۔

۵۲۵۳ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَقَدْ اُخِفْتُ فِی اللّٰہِ وَمَا یُخَافُ اَحَدٌ وَلَقَدْ اُوْذِیْتُ فِی اللّٰہِ وَمَا یُؤْذٰی اَحَدٌ وَلَقَدْ اَتَتْ عَلَیَّ ثَلٰثُوْنَ مِنْ بَیْنِ لَیْلَۃٍ وَیَوْمٍ وَمَالِیْ وَلِبِلَالٍ طَعَامٌ یَاکُلُہٗ ذُوْکَبِدٍ اِلَّا شَیْءٌ یُوَارِیْہِ اِبْطُ بِلَالٍ (رواہ الترمذی وقال معنی ھذا الحدیث حین خرج النبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) ھَارِبًا مِنْ مَکَّۃَ وَمَعَہٗ بِلَالٌ اِنَّمَا کَانَ مَعَ بِلَالٍ مِنَ الطَّعَامِ مَا یَحْمِلُ تَحْتَ اِبْطِہٖ.

اخرجہ الترمذی فی السنن ۵۵٦/٤ حدیث رقم ۲٤۷۲ وابن ماجہ فی السنن ۵٤/۱ حدیث رقم ۱۵۱ واحمد فی المسند ۱۲۰/۳۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "خدا (کے دین کو پھیلانے اور اس کی وحدانیت اور اپنی رسالت کی دعوت دینے بلانے) کی راہ میں جس قدر مجھ کو خوف و ہراس میں مبتلا کیا گیا اس قدر کسی اور کو خوفزدہ نہیں کیا گیا اور خدا (کے دین) کی راہ میں جتنی ایذاء رسانیوں سے میں دوچار ہوا ہوں اتنی ایذا رسانیوں سے کوئی اور دوچار نہیں ہوا ہے (یعنی ابتدا میں تن تنہا میں نے دعوت اسلام کو پیش کیا اور اس کے مقابلے میں پیش آنے والی تمام تکالیف والام وخوف و ہراس کو برداشت کرنے والا واحد میں ہی تھا) بلاشبہ مجھ پر مسلسل تیس دن اور تیس راتیں ایسی بھی گزری ہیں جن میں میرے اور بلال رضی اللہ عنہ کے لئے کھانے پینے کا ایسا کوئی سامان نہیں تھا جس کو کوئی جگر والا (یعنی حیوان) کھا سکتا ہے (یعنی ان دنوں میں ہم دونوں کے پاس کھانے کی ان چیزوں میں سے بھی کچھ نہ تھا جس کو جانور ہی کھا سکیں چہ جا ئیکہ انسانوں کے کھانے کے لائق کوئی چیز ہوتی) ماسوا اس نہایت معمولی سی چیز کے جس کو بلال رضی اللہ عنہ کی بغل چھپا لیتی تھی (اور ظاہر ہے کہ جس چیز کو انسان اپنی بغل میں دبا لے اس کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے خصوصاً اس صورت میں جب کہ باہر سے یہ نظر بھی نہ آئے کہ بغل میں کیا چیز ہے")۔ ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا کہ اس حدیث میں رسول اقدس ﷺ نے جو صورت بیان فرمائی ہے اس کا تعلق اس وقت سے ہے جب سرور دو عالم ﷺ مکہ سے نکلنے پر مجبور ہو گئے تھے اور اس وقت آپ ﷺ کے ہمراہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ تھے نیز حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے پاس کھانے کی اشیاء میں سے محض اتنا تھا جسے کو وہ اپنی بغل میں دبائے رہتے تھے"۔

تشریح: قولہ: لقد اخفت فی اللّٰہ۔۔۔وما یؤذی احد :اخفت:"اخافۃ" سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ دونوں جملوں میں جملہ حالیہ کے ساتھ مقید کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ ان دونوں حالتوں میں تخویف اور ایذاء شاق گزرتی ہے۔ کیونکہ مصیبت اگر عام ہو تو سہل ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اپنی حالت کی حکایت ہے شکایت نہیں ہے بلکہ اظہار نعمت اور مشقت پر صبر کی توفیق کا بیان ہے۔ اور اُمت کیلئے تسلی ہے تا کہ وہ پریشانی زائل ہو جائے جو ان کو لاحق ہوتی ہے۔ یعنی میں دین کی ابتدائی

محنت میں تنہا تھا اور ملعون کفار نے مجھے اس جد وجہد میں دھمکیاں دی اور اُس وقت سوائے میرے مولیٰ اور رفیق اعلیٰ (اللہ کی ذات) کے کوئی نہیں تھا جو میری معاونت کرتا۔اس کے بعد اپنے قول "علی ثلثون من بین لیلة ویوم" سے یہ بیان فرمایا کہ اس کے باوجود حضور علیہ السلام کے پاس توشہ اور اسباب بہت کم تھے۔

قولہ: ولقد اتت علی --- شئی یواریہ ابط بلال: علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ شمول کی تاکید ہے۔یعنی متواتر تیس دن اور راتیں گزریں میں سے کچھ بھی کم نہیں۔"کاف" کے فتحہ اور "باء" کے کسرہ کے ساتھ' قاموس میں لکھا ہے کہ فتحہ اور کسرہ کے ساتھ "کتف" کے وزن پر ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔یعنی ہمارے پاس نہ تو ایسی کوئی چیز ہوتی تھی۔جس کو جانور کھاتے ہیں اور نہ انسانوں کے کھانے کی کوئی چیز ہوتی تھی۔

الاشئی: تنوین برائے تقلیل ہے۔

ابط: ہمزہ کے کسرہ اور "باء" کے سکون کے ساتھ "با" کو مکسور بھی پڑھا جاتا ہے۔صحاح میں لکھا ہے کہ "الابط" باء کے سکون کے ساتھ اس کا معنی ہے وہ جگہ جو بازو کے نیچے ہوتی ہے۔قاموس میں لکھا ہے کہ "الابط" کا معنی ہے وہ جگہ جو مونڈھے کے نیچے ہوتی ہے۔اور "با" کو مکسور پڑھا جاتا ہے۔اور کبھی اس کو مونث پڑھا جاتا ہے۔مطلب یہ کہ بلال اُس وقت میرا ساتھی تھا۔اور ہمارے پاس صرف اتنا تھوڑا سا کھانا ہوتا تھا جس کو بلال رضی اللہ عنہ اپنی بغل میں رکھتے تھے' اور کوئی برتن نہیں ہوتا تھا' جس میں رکھتے۔

تخریج: جامع میں "لقد اوذیت" کے الفاظ مقدم ذکر کیے گئے ہیں۔اس حدیث کو امام احمد، امام ترمذی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے ان (یعنی انس رضی اللہ عنہ) سے نقل کیا ہے۔

قولہ: وقال: ومعنی هذا الحدیث الخ وقال: ایک نسخہ میں "قال" (بغیر واؤ کے) ہے۔یعنی مخلوق کو چھوڑ کر جب اللہ کی طرف جب جا رہے تھے۔جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:﴿ففروا الی اللہ﴾ [الذاریات: ٥٠] "تو تم اللہ ہی کی طرف دوڑو"

نقل کیا گیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکل کر "عبد یالیل" کے پاس طائف چلے گئے تاکہ وہ آپ علیہ السلام کو مکہ کے کفار کی اذیت سے بچائے اور آپ پیغام نبوت کا فریضہ ادا کر سکیں۔چنانچہ اُس نے بچوں کو حضور علیہ السلام کے پیچھے لگا دیا جنہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھروں سے اتنا مارا کہ آپ علیہ السلام کے قدم مبارک خون سے لہولہان ہو گئے۔بعض نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

مواھب لدنیہ میں لکھا ہے کہ حضور علیہ السلام طائف اس وجہ سے گئے کہ ابو طالب کی وفات کے بعد کفار مکہ نے حضور علیہ السلام کو کھلم کھلا "اذیتیں" دینا شروع کر دی تھیں۔اور آپ علیہ السلام کا طائف جانا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے تین ماہ بعد ہوا جبکہ نبوت کا دسواں سال تھا اور شوال کے کچھ دن باقی تھے۔آپ علیہ السلام کے ساتھ زید بن حارثہ تھے۔آپ علیہ السلام طائف میں ایک ماہ تک ٹھہرے رہے۔وہاں بنو ثقیف کے سرداروں کو اللہ کی طرف دعوت دی لیکن انہوں نے دعوت کو قبول نہیں کیا۔اور حضور علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنے بے وقوف لڑکوں اور غلاموں کو اُبھارا جنہوں نے آپ علیہ السلام کو گالیاں

دی۔ موسیٰ بن عقبہ فرماتے ہیں کہ اُن لڑکوں نے حضور کی ایڑیوں اور پنڈلیوں پر اس قدر پتھر مارے کہ آپ علیہ السلام کے جوتے خون سے رنگین ہو گئے۔

دوسرے مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب پتھر لگنے سے حضور علیہ السلام کو چوٹ لگتی اور درد ہوتا تو حضور علیہ السلام بیٹھ جاتے' وہ شریر لڑکے حضور علیہ السلام کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیتے اور جب حضور علیہ السلام چلتے تو وہ شریر لڑکے پتھر مارتے اور مذاق اُڑاتے' زید بن حارثہ حضور علیہ السلام کو پتھروں سے بچانے کی کوشش کرتے یہاں تک کہ زید بن حارثہ کے سر میں کئی زخم آئے۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ ایک دن میں نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا کہ کیا اُحد سے زیادہ کوئی سخت دن آپ پر گزرا ہے؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہاری قوم کی طرف سے مجھے بہت تکلیفیں پہنچی ہیں مگر سب سے زیادہ تکلیف تمہاری قوم کی طرف سے مجھے یوم عقبہ میں پہنچی جب میں ''عبد یالیل بن عبد کلال'' کے پاس اپنی حفاظت کی غرض سے گیا۔ اُس نے میری بات رد کی تو میں بہت زیادہ غمزدہ ہو کر واپس لوٹا۔ مجھے ''قرن الثعالب'' مقام پر افاقہ ملا۔ میں نے سر اُوپر اُٹھایا تو ایک بادل مجھ پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ میں نے بادل میں جبریل علیہ السلام کو دیکھا جو مجھے پکار رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اللہ نے آپ کی قوم کے وہ جوابات سنے جو انہوں نے آپ کی بات کے مقابلہ میں کہے' اور آپ کی طرف پہاڑوں پر مقرر فرشتہ بھیج دیا ہے تاکہ آپ فرشتہ کو جو حکم دیں۔ وہ پورا کر دے۔ پھر پہاڑوں پر مقرر فرشتہ نے مجھے سلام کیا اور کہا: اے محمد! اللہ نے آپ کی قوم کی بات سنی ہے اور میں پہاڑوں پر مقرر فرشتہ ہوں۔ اللہ نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے تاکہ میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں۔ اگر آپ چاہیں تو میں دونوں جانب کے پہاڑوں کو ان کے اُوپر گرا کر ان کو کچل دوں۔

قاموس میں ہے کہ یہ پہاڑ مکہ کے دو پہاڑ جبل ابوقبیس اور جبل احمر تھے۔ یا منیٰ کے دو پہاڑ تھے۔ حضور علیہ السلام نے جواب دیا کہ نہیں بلکہ مجھے اللہ سے اُمید ہے کہ اللہ ان کی نسلوں میں سے ایسے افراد پیدا کرے گا جو صرف اللہ کی عبادت کریں گے اور اللہ کے ساتھ شرک نہیں کریں گے۔

''عبد یالیل'' ''یا'' کے بعد الف' پھر لام مکسورہ' پھر ''یا'' ساکنہ اور پھر لام ہے

ابن عبد کلال: کاف مضموم اور لام مخفف ہے۔

عبد یالیل طائف کے قبیلہ بنوثقیف کے سرداروں میں سے ایک سردار تھا۔ ''قرن الثعالب'' نجد والوں کیلئے میقات ہے اور اس کا دوسرا نام ''قرن المنازل'' ہے۔

طبرانی نے ''کتاب الدعاء'' میں عبداللہ بن جعفر سے نقل کیا ہے کہ جب ابوطالب کا انتقال ہوا تو حضور علیہ السلام طائف چلے گئے اور طائف والوں کو اسلام کی دعوت دی۔ لیکن اُنہوں نے اسلام کی دعوت قبول نہیں کی۔ چنانچہ حضور علیہ السلام ایک درخت کے سایہ میں تشریف لائے اور دو رکعت نماز پڑھ کر یہ دُعا فرمائی: اے اللہ! تجھ ہی سے شکایت کرتا ہوں اپنی کمزوری اور بے کسی کی اور لوگوں میں ذلت کی۔ اے ارحم الراحمین! تو ہی ضعفاء کا رب ہے اور تو ہی میرا پروردگار ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے۔ کسی اجنبی دُشمن کے جو مجھے دیکھ کر منہ چڑاتا ہے یا کسی قریبی دوست کے جس کو تو نے میرے کام کا ذمہ دار بنایا ہے۔

اے اللہ! اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی کی بھی پرواہ نہیں تیری حفاظت مجھے کافی ہے۔ میں تیرے چہرے کے اُس نور کے طفیل جس سے تمام اندھیرے روشن ہو گئے اور جس سے دُنیا اور آخرت کے سارے کام درست ہو جاتے ہیں۔ اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ پر تیرا غصہ ہو یا تو مجھ سے ناراض ہو تیری ناراضگی کا اُس وقت تک دور کرنا ضروری ہے جب تک تو راضی نہ ہو۔ نہ تیرے سوا کوئی طاقت ہے نہ قوت۔

قوله: ومعه بلال:

یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ زید بن حارثہؓ حضور علیہ السلام کے ساتھ تھے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ آپ علیہ السلام طائف کی طرف ایک سے زائد بار تشریف لے گئے ہوں۔ لیکن حدیث کے الفاظ "**ومعه بلال**" سے یہ معلوم ہوا کہ یہ مکہ سے مدینہ ہجرت کا سفر نہیں تھا کیونکہ اُس وقت بلالؓ آپ علیہ السلام کے ساتھ نہیں تھے۔

قوله: انما كان مع بلال من الطعام ما يحمل تحت ابطه: یہ اس طعام کی قلت وخفت سے کنایہ ہے۔

۵۲۵۴ : **وَعَنْ اَبِیْ طَلْحَةَ قَالَ شَكَوْنَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْجُوْعَ فَرَفَعْنَا عَنْ بُطُوْنِنَا عَنْ حَجَرٍ حَجَرٍ فَرَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَطْنِهٖ عَنْ حَجَرَيْنِ .**

(رواه الترمذي وقال هذا حديث)

اخرجه الترمذي في السنن ٤/٥٠٦ حديث رقم ٢٣٧١۔

ترجمہ: "حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بھوک کی شکایت کی اور اپنے پیٹ پر ایک ایک پتھر بندھا ہوا دکھایا (یعنی ہم میں سے ہر شخص نے بھوک کی شدت سے بے تاب ہو کر اپنے پیٹ پر ایک ایک پتھر باندھ رکھا تھا جس کو ہم نے اپنا پیٹ کھول کر حضور ﷺ کو دکھایا) تب محبوب کبریا ﷺ نے (ہماری تسلی اور تشفی کے لئے) اپنا بطن مبارک کھول کر دو پتھر دکھائے"۔ ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے"۔

تشریح: قوله: بشكونا الى رسول الله ﷺ **الجوع** اور ایک نسخہ میں "**الى النبى**" کے الفاظ ہیں۔

قوله: فرفع رسول الله ﷺ عن بطنه عن حجرين) طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں پہلا لفظ "عن "رفعنا" کے متعلق ہے اور "رفعنا" کشف کے معنی کو متضمن ہے۔ اور دوسرا "عن" مصدر محذوف کی صفت ہے۔ اى "**كشفنا عن بطوننا كشفا صادرا عن حجر**" اور یہ بھی جائز ہے کہ "حجر" کی تنکیر کو نوع پر محمول کیا جائے۔ یعنی ایسا پتھر جو ہمارے پیٹوں پر بندھا ہوا تھا۔ اس صورت میں بدل ہوگا۔ عموماً جب بھوک بڑھ جاتی ہے اور پیٹ خالی ہو تو پیٹ پر پتھر باندھا جاتا ہے تا کہ کمر سیدھی اور مضبوط ہو جائے۔ (انتہی)

مقام کی وضاحت یہ ہے کہ جب دو حروف جر ایک ہی مرتبہ میں عامل کے معنی میں ہوں تو انکا تعلق درست نہیں۔ اور دوسرے حرف جر کا تعلق پہلے حرف جر کی تقیید کے بعد درست ہے۔ جیسا کہ اپنی جگہ پر اس بات کی تحقیق ہو چکی ہے۔ چنانچہ حرف جر کا مصدر محذوف کیلئے صفت بننا ظاہر ہے۔ اس میں کوئی غبار نہیں۔ اور جار کے اعادہ کے ساتھ بدل اشتمال بنانا باوجود یہ کہ بدل اشتمال میں مبدل منہ کی ضمیر کا ہونا ضروری ہے۔ اس بات پر مبنی ہے کہ حجر سے مراد ایک نوع ہو۔ اور تقدیر یہ ہو: "عن حجر

مشدود علیہا"۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ کے کلام سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ بدل کا قول انکا قول ہے' حالانکہ امام میرک نے زین العرب سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ بدل اشتمال ہے۔ جس طرح کہ کوئی کہے:"زید کشف عن وجهه عن حسن خارق" ۔

پھر بعض شارحین فرماتے ہیں کہ پیٹ پر پتھر باندھنے کا فائدہ یہ ہے کہ خالی انتڑیوں میں نفخ نہیں ہوتا اور بذات خود انتڑیوں کو باندھنے سے کمر کو مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ پیٹ پر پتھر اسلئے باندھا جاتا ہے تاکہ پیٹ ڈھیلا نہ پڑھے' پھر اس کی وجہ سے انتڑیاں نیچے کی طرف نہ سرک جائیں اور حرکت مشکل نہ ہو جائے۔ انسان جب پیٹ پر پتھر باندھتا ہے تو پیٹ اور کمر سخت ہو جاتے ہیں اور حرکت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور جب بھوک زیادہ بڑھ جائے تو پتھر باندھتے ہیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کو سب سے زیادہ بھوک ہوتی تھی اور سب سے زیادہ مشقت اُٹھاتے تھے اسلئے اپنے پیٹ پر دو پتھر باندھتے تھے۔

مظہر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس طرح کرنا زیادہ مجاہدہ کرنے والوں کی عادت ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ عرب کی یا مدینہ والوں کی عادت ہے۔

صاحب الازہار فرماتے ہیں کہ پیٹ پر پتھر باندھنے کے بارے میں کئی اقوال ہیں۔ جب زیادہ بھوک لگتی تھی تو اُن میں سے ایک پتھر اُٹھا کر پیٹ پر باندھتے تھے۔ اللہ نے ان پتھروں میں ٹھنڈک پیدا کی تھی۔ جب باندھتے تھے تو بھوک اور گرمی سے سکون حاصل ہوتا تھا۔

بعض شارحین فرماتے ہیں کہ جب کسی کو صبر کرنے کا کہنا ہو تو عرب کہتے ہیں:"اربط علی قلبك حجرا" (اپنے دل پر پتھر باندھ لے) گویا کہ نبی علیہ السلام نے اپنی اُمت کو اپنے قول سے بھی صبر کرنے کا حکم دیا اور اپنے حال سے بھی۔ واللہ اعلم

تخریج: شمائل میں امام ترمذی نے تصریح کی ہے: "**هذا حديث غريب من حديث ابي طلحة لانعرفه الامن هذا الوجه اه**"۔ یہ حدیث ابوطلحہ کی سند کے ساتھ غریب ہے۔ یہ حدیث صرف اسی سند کے ساتھ معروف ہے۔ انتہی۔ چنانچہ اس حدیث کا غریب ہونا ابوطلحہ کی سند سے ہے نہ کہ باقی اسناد سے' جبکہ امام میرک فرماتے ہیں اس کے راوی ثقہ ہیں۔

۵۲۵۵ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّهُ اَصَابَهُمْ جُوْعٌ فَاَعْطَاهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَمْرَةً تَمْرَةً

(رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٥٧/٤ حديث رقم ٢٤٧٤ واخرجه ابن ماجه ١٣٩٢/٢ حديث رقم ٤١٥٧۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک بار) فقراء صحابہ شدید بھوک سے دوچار ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان (میں سے ہر ایک) کو ایک کھجور عطا فرمائی"۔ (ترمذی)

تشریح: یعنی کھجور کی تھوڑی مقدار اس طرح دی کہ حضور اکرم ﷺ نے کھجوریں تقسیم کیں تو ہر ایک صحابی کو ایک ایک کھجور ملی۔ اسلئے کہ اصحاب صفہ کی تعداد چار سو بلکہ اس بھی زیادہ تھی۔ بسا اوقات ان کھجوروں میں ایسی برکت آجاتی کہ بھوک کی مشقت ختم ہو جاتی اور ایک کھجور کے دانے سے موجب بیا ہو جاتی جو ہر عطا سے بڑھ کر ہوتی۔

۵۲۵۶ : وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَصْلَتَانِ مَنْ كَانَتَا فِيْهِ كَتَبَهُ اللّٰهُ شَاكِرًا صَابِرًا مَنْ نَظَرَ فِيْ دِيْنِهٖ اِلٰى مَنْ هُوَ فَوْقَهٗ فَاقْتَدٰى بِهٖ وَنَظَرَ فِيْ دُنْيَاهُ اِلٰى مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ فَحَمِدَ اللّٰهَ عَلٰى مَا فَضَّلَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ كَتَبَهُ اللّٰهُ شَاكِرًا صَابِرًا وَمَنْ نَظَرَ فِيْ دُنْيَاهُ اِلٰى مَنْ هُوَ فَوْقَهٗ فَاَسِفَ عَلٰى مَا فَاتَهٗ مِنْهُ لَمْ يَكْتُبْهُ اللّٰهُ شَاكِرًا وَلَا صَابِرًا (رواه الترمذی وذكر حديث ابی سعيد اَبْشِرُوْا يَا مَعْشَرَ صَعَالِيْكِ الْمُهَاجِرِيْنَ فِیْ بَابِ بَعْدَ فَضَائِلِ الْقُرْاٰنِ۔

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۷۴/۴ حديث رقم ۲۵۱۲ وابن ماجه فی السنن ۱۳۸۷/۲ حديث رقم ۴۱۴۲

ترجمہ: ”حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”دو صفات ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں موجود ہوتی ہیں اس کو اللہ تعالیٰ شاکر و صابر قرار دیتا ہے ایک یہ کہ جب وہ شخص اپنے دینی معاملہ (یعنی اچھے اعمال وغیرہ) میں ایسے شخص پر نگاہ رکھے جو (اتباع شریعت واتباع سنت ذوقِ طاعت و عبادت علم وعمل واخلاص کے لحاظ سے) اس سے برتر ہو پھر اس کی پیروی بھی کرے (یعنی اس میں دینی برتری و فضیلت سے اس طرح استفادہ کرے کہ خود بھی علم وعمل کی راہ پر چلے' طاعات وعبادات کی ریاضت اور معاصی سے پرہیز پر استقامت اختیار کرے اور جو روحانی کمالات پہلے فوت ہو چکے ہیں ان پر رنجیدہ ہو) اور دوسرے یہ کہ جب اپنی دنیا کے معاملہ میں اس آدمی کو دیکھے جو (مال ودولت اور عزت وحشمت کے لحاظ سے) اس سے کم تر ہو تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرے اور اس کا شکر ادا کرے اس بات پر کہ اس نے اس کو اس آدمی پر فوقیت وفضیلت عطا فرمائی ہے پس اللہ تعالیٰ اس شخص کو ”صابر و شاکر“ قرار دیتا ہے (یعنی شاکر تو اس لئے کہ اس نے دنیاوی لحاظ سے اپنے سے کمتر کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور ”صابر“ اس لئے کہ اس نے دینی معاملہ میں سے اپنے سے برتر شخص کو دیکھ کر اس سے رہنمائی اور فیضان حاصل کیا) اور جو شخص ایسا ہو کہ جب وہ کسی ایسے شخص کو دیکھے جو اس کے دینی معاملہ کے اعتبار سے اس سے کمتر درجہ کا ہو (تو اس کے بارے میں سوچ کر خود پسندی اور غرور ونخوت میں پڑ جائے) اور جب کسی ایسے آدمی کو دیکھے جو اس کی دنیا (مال وجاہ اور منصب) کے اعتبار سے اس سے برتر ہو تو (اس کے بارے میں رشک وحسد اور حرص وخواہش میں مبتلا ہو جائے) اور اس چیز (یعنی جاہ ومال) پر رنجیدہ ہو جایا کرے جس سے وہ محروم ہے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ نہ ”شاکر“ قرار دیتا ہے اور نہ ”صابر“۔ (ترمذی) حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت اَبْشِرُوْا يَا مَعْشَرَ صَعَالِيْكِ الْمُهَاجِرِيْنَ...... اس باب میں نقل کی جا چکی ہے جو فضائل قرآن کے باب کے بعد ہے۔

تشریح: قوله:وعن عمرو بن شعب عن ابيه عن جده: یعنی ابن عمرو کے جدامجد سے جیسا کہ جامع میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔

قوله:قال خصلتا ن من كانتا فيه كتبه الله صابرا شاكرا: یعنی کامل مؤمن اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ان فی ذالك لايات لكل صبار شكور﴾ [ابراهیم۔۵لقمان۔۳۱'سبأ۔۱۹'الشوری] ”بے شک اس میں نشانیاں ہیں۔ ہر صابر لکھا جاتا ہے اور شاکر کیلئے اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ”ایمان کے دو حصے ہیں: آدھا ایمان صبر ہے اور آدھا ایمان شکر ہے۔ صبر برائیوں سے ہے اور شکر اطاعت پر ہے۔ اور جامع میں یہ زیادتی بھی منقول ہے کہ ”جس میں یہ دو خصلتیں نہ ہوں اللہ

کے ہاں صابر اور شاکر نہیں لکھا جاتا"۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ "من نظر" جملہ مستانفہ ہو اور اُس صابر اور شاکر کا بیان ہو جس کے یہ مذکورہ دونوں خصلتیں ہوں۔ اُن میں سے ایک خصلت یہی ہے۔ اور دوسری خصلت کو اگلے جملہ: ونظر فی دنیاہ الی من هو دونه الخ۔ میں بیان کیا گیا ہے۔

قوله: فحمدالله علی مافضله الله علیه: اور جامع کی روایت میں "فحمدالله علی ما فضله به" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس میں لف ونشر مشوش (اجمال اور تفصیل میں ترتیب نہیں) ہے۔ اور چونکہ مفہوم کا اعتبار کبھی کیا جاتا ہے اور کبھی اعتبار نہیں کیا جاتا ہے جبکہ منطوق کا اعتبار اقوی بھی ہے۔ اسلئے جوبات ضمنی طور پر معلوم ہو رہی تھی اُس کو صراحت کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

ومن نظر فی دینه الی الخ فأسف: سین کے کسرہ کے ساتھ۔

ما فاته منه یعنی مال اور دوسری اشیاء کی عدم موجودگی کی صورت میں جو مال وغیرہ فوت ہو جائے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اتاکم﴾ [الحدید: ۲۳] "تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج نہ کرو اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے، اس پر اتراؤ نہیں"۔

حضور اکرم ﷺ سے نقل کیا گیا ہے کہ جو شخص دُنیا کے فوت ہونے پر غمگین ہو جائے ایک ہزار (۱۰۰۰) سال کی مسافت کے بقدر جہنم کے قریب ہو جاتا ہے۔ اور جو آخرت کے فوت ہو جانے پر غمگین ہو وہ ایک ہزار سال کی مسافت کے بقدر جنت کے قریب ہو جاتا ہے۔"

قوله: لم یکتبه الله شاکرا ولا صابرا۔

چونکہ اس میں کوئی خصلت ہی نہیں پائی جاتی' بلکہ ان صفات کی ضد یعنی دل اور زبان سے کفرانِ نعمت اور جزع فزع صادر ہوا ہے۔

قوله: وذکر حدیث ابی سعید:

ایک طویل حدیث کے ضمن میں جس کا ابتدائی حصہ باب القراءۃ سے مناسبت رکھتا ہے۔

قوله: ابشروا یاصعالیك المهاجرین: یعنی قیامت کے دن مکمل کامیاب ہو۔ کہ تم مالدار لوگوں سے آدھا دن قبل جنت میں داخل ہو گے اور اس دن کی مقدار پانچ سو (۵۰۰) سال ہو گی۔

ابوداؤد نے اس کو کتاب فضائل القرآن کے بعد بغیر کسی باب' کسی عنوان کے نقل کیا ہے۔

الفصل الثالث:

۵۲۵۷: عَنْ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْحُبُلِیِّ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو وَسَاَلَهٗ رَجُلٌ قَالَ اَلَسْنَا مِنْ فُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِیْنَ فَقَالَ لَهٗ عَبْدُ اللّٰهِ اَلَكَ امْرَاَةٌ تَاوِیْ اِلَیْهَا قَالَ نَعَمْ قَالَ اَلَكَ مَسْكَنٌ تَسْكُنُهٗ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاَنْتَ مِنَ الْاَغْنِیَاءِ قَالَ فَاِنَّ لِیْ خَادِمًا قَالَ فَاَنْتَ مِنَ الْمُلُوْكِ قَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ وَجَآءَ ثَلٰثَةُ

نَفَرٍ اِلٰى عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو وَّاَنَا عِنْدَهٗ فَقَالُوْا يَا اَبَا مُحَمَّدٍ اِنَّا وَاللّٰهِ مَانَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ لَا نَفَقَةٍ وَّلَا دَابَّةٍ وَّلَا مَتَاعٍ فَقَالَ مَاشِئْتُمْ اِنْ شِئْتُمْ رَجَعْتُمْ اِلَيْنَا فَاَعْطَيْنٰكُم ثم مَايَسَّرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاِنْ شِئْتُمْ ذَكَرْنَا اَمْرَكُمْ لِلسُّلْطَانِ وَاِنْ شِئْتُمْ صَبَرْتُمْ فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ فُقَرَآءَ الْمُهَاجِرِيْنَ يَسْبِقُوْنَ الْاَغْنِيَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِلَى الْجَنَّةِ بِاَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا قَالُوْا فَاِنَّا نَصْبِرُ لَانَسْاَلُ شَيْئًا. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ٢٢٨٥/٤ حديث رقم (٣٧-٢٩٧٩)

ترجمہ: ”حضرت ابوعبدالرحمٰن جبلیؒ (جن کا اسم گرامی عبداللہ بن زید مصری ہے اور ثقہ تابعین میں شمار ہوتے ہیں کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کو فرماتے ہوئے سنا' جب کہ ایک شخص نے ان سے سوال کیا اور کہا کہ کیا ہمارا شمار (ان) فقراء مہاجرین میں نہیں ہے؟ (انہیں یہ خوشخبری سنائی گئی ہے کہ ان کا جنت میں داخلہ اہل ثروت سے بہت پہلے ہوگا؟) حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما نے (یہ سن کر) اس شخص سے دریافت فرمایا کہ کیا تم بیوی والے ہو جس کے پاس سے تم قرار اور سکون و راحت پاتے ہو؟ اس شخص نے جواب دیا کہ ہاں! پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما نے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارے پاس گھر ہے جس میں تم رہائش اختیار کرو؟ اس شخص نے کہا کہ ہاں مکان بھی ہے! حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تو پھر تم دولت مندوں میں سے ہو (یعنی تم ان مہاجرین کی حیثیت کے آدمی ہو غربت و افلاس کا شکار نہ ہوئے تھے کیونکہ جن مہاجرین کو فقراء شمار کیا جاتا ہے ان کے پاس تو یہ دونوں نعمتیں نہ تھیں یا ان سے کسی ایک سے محرومی تھی۔) اس شخص نے (یہ سن کر کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما نے بیوی اور مکان کی موجودگی میں گویا دولت مند قرار دیا ہے تو) کہا کہ میرے پاس تو ایک خادم بھی ہے (یعنی غلام یا لونڈی) حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا تب تو تم بادشاہوں میں سے ہو (یعنی اس صورت میں تمہیں رؤساء اور بادشاہوں میں شمار ہونا چاہئے' تمہیں فقیر و مفلس کہنا کسی طرح درست نہ ہوگا“۔) حضرت عبدالرحمٰنؒ (راوی) نے یہ بھی بیان فرمایا کہ (ایک روز) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے پاس تین آدمی آئے' اس وقت میں بھی ان کی خدمت میں حاضر تھا' ان تینوں نے کہا: ”ابومحمد! بخدا ہم کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے' نہ تو خرچ کرنے کی (کہ حج وغیرہ کر سکیں) نہ کسی جانور کی (کہ جہاد میں شریک ہو جائیں) اور نہ کسی دوسرے ساز و سامان کی (کہ جس کو بیچ کر کے اپنی ضروریات پوری کر سکیں) حضرت عبداللہ نے (ان لوگوں کی گفتگو کو سنا اور) فرمایا کہ تمہارا مطالبہ کیا ہے؟ اگر تمہاری (یہ) خواہش ہے کہ (میں تمہیں اپنے پاس سے کچھ دے کر تم سے تعاون کروں) تو تم لوگ دوبارہ کسی وقت آنا پھر میں تمہیں وہ چیز دوں گا جس کا حق تعالیٰ شانہٗ تمہاری خاطر انتظام کر دے گا (اس لئے کہ فی الحال تمہاری مراد کے لئے میرے پاس کچھ بھی موجود نہیں ہے) اور اگر تمہاری (یہ) خواہش ہے کہ میں تمہاری حالت کا بادشاہ (امیر معاویہ رضی اللہ عنہ) سے تذکرہ کروں (تمہیں اپنی عطاء سے فارغ البال کر دیں تو ایسا بھی کر دوں گا) اور اگر تم چاہو کہ (کاملین مقربین کے رتبہ کے طالب ہو) تو صبر کرو (یعنی اپنی اسی حالت فقر و افلاس پر استقامت اختیار کرو) کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ فقراء مہاجرین قیامت کے دن جنت میں دولت مندوں سے چالیس سال پہلے جائیں گے“۔ ان تینوں نے (یہ حدیث سنی تو) کہنے لگے کہ ”بے شک ہم صبر ا

ستقامت ہی کا دامن تھامتے ہیں' اب (ہم آپ سے) کچھ نہیں مانگتے (یا یہ کہ اب آئندہ ہم کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے"۔
(مسلم)

تشریح: و سالہ (قد کی تقدیر کے ساتھ ہے)۔

قال ألسنا من فقراء المهاجرين: یہ جملہ مستانفہ بیانیہ ہے۔

قال: الك مسكن؟: کاف کے فتحہ کے ساتھ ہے اور کاف کو مکسور بھی پڑھا جاتا ہے۔

قوله: فأنت من الاغنياء: یعنی مالدار مہاجرین میں سے ہو کیوں کہ فقراء مہاجرین کے پاس نہ بیویاں تھیں اور نہ کوئی رہائش گاہ یا اگر کسی کے پاس ان دو میں سے ایک چیز ہوتی تو دوسری چیز نہ ہوتی۔

قوله: قال: فأنت من الملوك: شاید انھوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد س کلام کا اقتباس کیا ﴿و جعلكم ملوكا﴾ [المائدہ۔ ۲۰] جیسا کہ عبدالرزاق' عبد بن حمید اور ابن جریر نے ابن عباسؓ سے و جعلکم ملوکا کی تفسیر میں نقل کرتے ہوئے فرمایا: بیوی اور خادم۔ اور ابن جریر نے ابن عباسؓ سے مزید یہ بھی نقل فرمایا کہ جب بنی اسرائیل میں کسی کے پاس بیوی، خادم اور گھر ہوتا اُس کو مَلِک کہتے تھے۔

قوله: "قال عبدالرحمن" مشکوٰۃ کے تمام موجودہ نسخوں میں اسی طرح لکھا ہوا ہے۔ لیکن دُرست "ابوعبدالرحمن" ہے۔ جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ محدث سید جمال الدین فرماتے ہیں کہ مشکوٰۃ کے اُن اکثر نسخوں میں جن کو ہم نے دیکھا اور یہ ظاہر طور پر غلطی ہے اور دُرست ابوعبدالرحمن ہے' یہی حدیث کے راوی ہے۔ جیسا کہ مسلم میں مذکور ہے

" ثلاثة نفر" اضافت کے ساتھ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿تسعة رهط﴾ میں ہے۔

اور اس جملہ کا گذشتہ جملہ: "وسائله رجل" پر عطف ہے۔ (یعنی حال یہ تھا کہ تین فقراء آئے۔)

لانقدر على شيئى لانفقة: واضح تعمیم ہے۔

و لا دابة: کہ اُس پر بیٹھ کر جہاد کریں یا حج کیلئے جائیں۔

و لا متاع: یعنی کوئی زائد ساز وسامان جس کو بیچ کر اُسکی قیمت گھر کے خرچ اور سواری میں صرف کریں۔

فقال لهم ماشئتم: "ما" استفہامیہ ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ "ما" موصولہ ہو' "هو" مبتدا ہو اور خبر محذوف ہو۔ (یعنی وہ مسائل جو تمہیں درپیش ہیں اور تم لوگ اُن کا حل چاہتے ہو تو ہم اُنکا انتظام کرینگے۔)

۵۲۵۸: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ بَيْنَا قَاعِدٌ فِي الْمَسْجِدِ وَحَلْقَةٌ مِنْ فُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ قُعُوْدٌ اِذْ دَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَعَدَ اِلَيْهِمْ فَقُمْتُ اِلَيْهِمْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُبَشَّرْ فُقَرَآءَ الْمُهَاجِرِيْنَ بِمَايَسُرُّ وُجُوْهَهُمْ فَاِنَّهُمْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ قَبْلَ الْاَغْنِيَآءِ بِاَرْبَعِيْنَ عَامًا قَالَ فَلَقَدْ رَأَيْتُ اَلْوَانَهُمْ اَسْفَرَتْ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو حَتّٰى تَمَنَّيْتُ اَنْ اَكُوْنَ مَعَهُمْ اَوْمِنْهُمْ۔

(رواه الدارمي)

اخرجه الدارمي في السنن ٤٣٧/٢ حديث رقم ٢٨٤٤

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم لوگ مسجد (نبوی ﷺ) میں بیٹھے ہوئے تھے اور فقراء مہاجرین بھی حلقہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے کہ اچانک نبی اکرم ﷺ تشریف لے آئے اور فقراء کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر (حضور ﷺ کی اتباع میں) فقراء کے قریب پہنچ کر ان کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا (تاکہ جناب رسالتماب ﷺ کے ان تمام ملفوظات کو سماعت کر سکوں جو آپ ان سے ارشاد فرمائیں) چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''چاہیئے کہ فقراء مہاجرین کو اس بات کی خوشخبری سنائی جائے جو انہیں شاداں و فرحاں کر دے' پس (وہ خوشخبری یہ ہے کہ) فقراء مہاجرین جنت میں اہل ثروت سے چالیس سال پہلے داخل ہوں گے''۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم میں نے دیکھا کہ (اس خوشخبری کو سننے کے بعد) فقراء (کے چہروں) کا رنگ تاباں و روشن ہو گیا۔ پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ (یہ بشارت سن کر اور فقراء مسرت اور شادمانی دیکھ کر) میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ (کاش) میں بھی ان کے ساتھ ہوتا (یعنی اس دنیا میں بھی غربت و ناداری کا سامنا کرتا اور اس جماعت فقراء میں شمار ہوتا) یا یہ کہ ان میں سے ہوتا (یعنی آخرت میں اسی طبقہ فقراء میں شمار ہو کر میں حشر ہوتا)۔'' (دارمی)

تشریح: **قوله: قال بينما أنا قعود ۔۔۔۔ فعدد: قال بينا:** ایک نسخہ میں ''بينما'' ہے۔

حلقة: ''حاء'' کے فتحہ اور ''لام'' کے سکون کے ساتھ' لام کو مفتوح بھی پڑھا جاتا ہے۔ ایسی جماعت جو حلقہ کی صورت میں ہو اور انکے دل اس حلقہ سے متعلق ہوں۔

قعود: ''ذوو قعود'' کے معنی میں ہے (یعنی بیٹھنے والے)

قاموس میں لکھا ہے ''حلقة الباب والقوم'' اس کا لام کبھی مفتوح پڑھا جاتا ہے اور کبھی مکسور پڑھا جاتا ہے۔ یا کلام عرب میں ''حلقة'' حا اور لام کی) حرکت کے ساتھ صرف ''حالق'' کی جمع آتی ہے' یا یہ ضعیف لغت ہے۔ اور اس کی جمع ''حلق'' (حا اور لام کی) حرکت کے ساتھ ہے۔ یا ''بدر'' کے وزن پر ہے۔

قوله: اذ دخل النبی ﷺ فقعد اليهم: یعنی فقراء کی طرف متوجہ ہو کر تشریف فرما ہوئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداة والعشیّ يريدون وجهه﴾ [الکھف۔۲۸] ''اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کیلئے کرتے ہیں۔''

قوله: فقال النبی ﷺ ليبشر فقراء المهاجرين بما يسر وجوههم:

يبشر: ''تبشير'' مصدر سے امر مجہول کا صیغہ ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ ''بشارة'' مصدر سے ہو۔ اس سے مراد خبر ہے یا دعا مراد ہے۔

وجوههم: منصوب ہے اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہوگی ''بما يسر وجوههم'' جس سے ان کے چہروں پر خوشی کا اثر ظاہر ہو۔

فلقد لام جواب قسم کیلئے ہے۔ ای ''فو الله لقد''.

اسفرت: ''اسفار'' سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے ''رنگ کا چمکنا'' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وجوه يومئذ مسفرة﴾ [عبس۔۳۸] ''بہت سے چہرے روز روشن خنداں ہونگے''۔

اور دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے ﴿والصبح اذا اسفر﴾ [المدثر۔۳۴] ''اور قسم ہے صبح کی جب وہ روشن ہو جائے''

اور حدیث میں وارد ہوا ہے: ''اسفروا بالفجر فانه أعظم لاجر'' (فجر کی نماز روشنی ظاہر ہونے کے وقت میں پڑھو کیونکہ اس کا اجر زیادہ ہے۔

حتی تمنیت: ''اسفرت'' کے متعلق ہے۔

''او'' نوع بیان کیلئے ہے یا شک کیلئے ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ مجھے یہ تمنا ہوئی کہ میں بھی فقراء مہاجرین میں سے ہو جاؤں۔

تخریج: اس حدیث کو ابو نعیم نے حلیہ میں ابو سعیدؓ سے یوں نقل کیا ہے ہیں:

''چاہیے کہ فقراء مہاجرین کو قیامت کے دن کی کامیابی کی خوشخبری سنا دی جائے۔ اور یہ لوگ مالداروں سے پانچ سو (۵۰۰) سال قبل داخل ہو کر خوشیاں منائیں گے جبکہ یہ لوگ (مالدار) حساب و کتاب میں مشغول ہونگے۔

۵۲۵۹ : وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ اَمَرَنِیْ خَلِیْلِی بِسَبْعٍ اَمَرَنِیْ بِحُبِّ الْمَسَاکِیْنِ وَالدُّنُوِّ مِنْهُمْ وَاَمَرَنِیْ اَنْ اَنْظُرَ اِلٰی مَنْ هُوَ دُوْنِیْ وَلَا اَنْظُرَ اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقِیْ وَاَمَرَنِیْ اَصِلَ الرَّحِمَ وَاِنْ اَدْبَرَتْ وَاَمَرَنِیْ اَنْ لَا اَسْئَلَ اَحَدًا شَیْئًا وَاَمَرَنِیْ اَنْ اَقُوْلَ بِالْحَقِّ وَاِنْ کَانَ مُرًّا وَاَمَرَنِیْ اَنْ لَا اَخَافَ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ وَاَمَرَنِیْ اَنْ اُکْثِرَ مِنْ قَوْلِ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ فَاِنَّهُنَّ مِنْ کَنْزٍ تَحْتَ الْعَرْشِ ۔ (رواه احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۵/۱۵۹

ترجمہ: ''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرے خلیل (جناب رسالتمآب ﷺ) نے مجھے سات کاموں کو کرنے کا حکم فرمایا' چنانچہ آپ ﷺ نے ایک حکم تو یہ فرمایا کہ میں فقراء و مساکین سے کو دوست رکھوں اور ان سے قربت رکھوں۔ دوسرا حکم یہ کہ میں اس شخص کی طرف دیکھوں جو (دنیاوی لحاظ سے) مجھ سے کمتر درجہ کا ہے اور اس شخص کی طرف نہ دیکھوں جو (جاہ و حشمت اور مال و منصب) میں مجھ سے بالاتر ہے' تیسرا حکم یہ دیا کہ میں قرابت داروں سے رشتہ کو برقرار رکھوں اگرچہ کوئی (قرابت دار) ناتے داری کو منقطع کرے' چوتھا حکم یہ دیا کہ میں کسی شخص سے کسی چیز کا سوال نہ کروں' پانچواں حکم یہ دیا کہ میں (ہر حالت میں) حق بات کہوں اگرچہ وہ (سننے والے) کڑوی اور ناخوش کرنے والی معلوم ہو' چھٹا حکم یہ دیا کہ میں اللہ کے دین کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ گھبراؤں اور ساتواں حکم یہ ارشاد فرمایا کہ میں کثرت کے ساتھ لا حول ولا قوۃ الا باللہ کا ورد کرتا ہوں۔ پس یہ ساتوں باتیں اور عادتیں اس خزانہ کی ہیں جو عرش الٰہی کے نیچے ہے''۔ (احمد)

تشریح: قوله: امرنی بحب المساکین والدنو منهم:

یعنی فقراء کی حالت کے قریب ہونے یا اُنکے انجام کے قریب ہونے کا حکم دیا۔

قوله: وأمرنی أن أصل الرحم وان ادبرت: مراد اہل قرابت ہیں۔ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔ ''صلہ رحمی'' کرو اگرچہ سلام کے ذریعے سے ہی ہو۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں معنی یہ ہے اگرچہ رشتہ داری ٹوٹ جائے جیسا کہ

حدیث میں وارد ہوا ہے۔ صل من قطعك "اُس شخص سے رشتہ جوڑ جو رشتہ توڑے"۔ اور "ادبار" کا اسناد "الرحم" کی طرف مجازا کیا ہے۔ اسلئے کہ "ادبار" صاحب قرابت کا فعل ہے۔

قوله: وأمرني أن لاأسئل أحد شيئاً: احمد رحمہ اللہ کی یہ دعا مانگا کرتے تھے: اللهم كما صنت وجهي عن سجود غيرك فصن وجهي عن سألة غيرك۔ اے اللہ! جس طرح تُو نے اپنے سوا کسی کے سامنے سجدہ کرنے سے میرے چہرہ کی حفاظت کی ہے اسی طرح اپنے سوا کسی سے سوال کرنے سے بھی میرے چہرہ کی حفاظت کر۔

ممکن ہے کہ "احدا" اپنے عموم پر قائم ہو۔ اس بات کی بنا پر جو ایک صاحب کمال سے منقول ہے کہ "اے میرے معبود! میری حالت کا تجھے علم ہونا ہی میرے دعا مانگنے کی طرف سے کافی ہے۔ اور تیرا کرم ہی میرے سوال کرنے کی طرف سے کافی ہے"۔ یہ ایک بہت بڑا مقام ہے جو خلیل اللہ علیہ السلام کی حالت سے ماخوذ ہے جس وقت جبرائیل علیہ السلام نے اُن سے کہا تھا "کیا آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے؟"۔ تو خلیل اللہ (ابراہیم) علیہ السلام نے فرمایا کہ "مجھے تیری مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پھر جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ اپنے رب سے دُعا کریں۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا۔ کہ اللہ کا میری حالت پر خبردار ہونا ہی میرے سوال کی طرف سے کافی ہے۔" اور یہی اللہ تعالیٰ کے اُس ارشاد کا معنی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے صحابہ کی حکایت کی ہے: ﴿حسبنا الله ونعم الوكيل﴾[آل عمران: ۱۷۳] ہم کو حق تعالیٰ کافی ہے اور وہی سب کام کرنے کیلئے اچھا ہے۔ ابن عطاء اللہ کے "حکم" (یعنی ان کی فرمودہ حکمت کی باتوں) میں ہے کہ بسا اوقات صاحب معرفت اللہ کی مشیت پر اکتفاء کرتا ہے اس وجہ سے اس کو اللہ کے سامنے اپنی حاجت رکھنے سے حیاء آتی ہے۔ تو مخلوق کے سامنے اپنی حاجت رکھنے سے حیاء کیوں نہ آئیگی۔"

قوله: وامرني ان لا أخاف في الله لومة لائم:

قوله: وأمرني أن أكثر من قول: لاحول ولا قوة الا بالله: اطاعت کیلئے، مصیبت پہنچنے کے وقت اللہ کی مدد حاصل کرنے اور مُصیبت کو دفع کرنے کیلئے مدد حاصل کرنے کے واسطے خصوصاً عجب، غرور اور تکبر کے خلاف اللہ کی مدد حاصل کرنے کے واسطے یہ کلمات پڑھوں۔

قوله: فانهن من كنز تحت العرش:

یعنی اُس معنوی خزانہ سے جو رحمن کے عرش تلے ہے۔ اور اُس تک رسائی صرف اللہ کی قوت اور توفیق سے ہی ہو سکتی ہے۔ یا کہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ کیونکہ اللہ کا عرش جنت کی چھت ہے۔

اور اُن لوگوں کی بات درستگی سے دُور ہے جو کہتے ہیں کہ یہ سات خصلتیں عرش کے نیچے ایک خزانہ ہے۔ اسلئے کہ اس بات کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ حدیث متعدد سندوں کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔

صحاح ستہ میں اس حدیث کو ابو موسیٰ اشعریؓ سے نقل کیا گیا ہے۔ احمد اور بزار نے ابو ہریرہؓ سے، طبرانی نے حضرت معاذؓ سے، نسائی نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور ابوذرؓ سے بھی مرفوعاً نقل کیا ہے: "لا حول ولا قوة الا بالله" پڑھا کرو۔ کیونکہ یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔

علماء نے اس کے مختلف معانی بیان کیے ہیں۔

اول: بعض فرماتے ہیں کہ اس کلمہ کو "جنت کا خزانہ" اسلئے کہا گیا کہ خزانہ کی طرح لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ ہے اور نفیس ہے۔

دوم: اس وجہ سے کہ جنت کے ذخائر میں سے ہے۔

سوم: جنت سے حاصل شدہ نفیس اُمور میں سے ہے۔

چہارم: امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کلمہ کے پڑھنے سے ایسا نفیس ثواب ملتا ہے جو اس کے لئے جنت میں ذخیرہ کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ (انتہی)

اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کلمہ چنانچہ جو اس کلمہ کے معنی کو سمجھ کر اس کے پڑھنے پر مداومت کرے گا تو ایک ایسے بڑے خزانے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جو دوسرے کئی ایسے خزانوں پر مشتمل ہوگا۔ جن کی حقیقت اور منتہیٰ معلوم نہ ہوگی۔

بزار نے ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ میں حضور اقدس ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے یہ کلمہ پڑھا تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا۔ کیا تجھے یہ معلوم ہے کہ اس کی تفسیر کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اللہ کا رسول ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: "**لا حول عن المعصية الا بعصمة الله ولا قوة على طاعة الله الا بعون الله**" (گناہ سے بچنا صرف اللہ تعالیٰ کے بچانے سے ممکن ہے اور نیکی کی قوت اللہ ہی کی مدد سے ہی ممکن ہے۔)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کلمہ میں اپنے احوال کو اللہ کے سپرد کرنے اور مکمل فرمانبرداری کرنے کا اقرار ہے۔ اور اس بات کا اقرار ہے کہ بندہ کسی چیز کا بھی مالک نہیں اور اللہ کے ارادے کے بغیر نہ کسی شر سے بچنے کا حیلہ انسان کے پاس ہے۔ اور نہ کسی خیر کے حاصل کرنے کا حیلہ اس کے پاس ہے۔ (انتہی) چنانچہ اس کلمہ کے پڑھنے والے کے پاس ایک شاندار ملک اور عظیم خزانہ ہے بشرطیکہ اپنے دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہو اور تمام مخلوق کے اعتبار سے اپنے رب کی قدرت کا مشاہدہ کر رہا ہو۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿**ولمن خاف مقام ربه جنتان**﴾ [الرحمن: ٤٦] (اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا رہتا ہو اس کیلئے دو باغ ہونگے۔)

کے بارے میں ایک صاحب معرفت نے درست فرمایا کہ "ایک جنت دُنیا میں اور دوسری جنت آخرت میں۔"

صوفیاء میں سے ایک صاحب رابعہ عدویہ کے قول "**استغفارنا يحتاج الى استغفار كثير**" (ہمارا استغفار کرنا بھی بہت زیادہ استغفار کا محتاج ہے۔) کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان کی مراد یہ ہے کہ ہمارا گناہوں سے عذر خواہی کرنا خود بہت سے گناہ لئے ہوئے ہے۔ وجود اصلی فعل حقیقی اور اقتدار استقلالی کے دعووں سے بھی بڑا ہے حالانکہ آپ ﷺ نے "لاحول ولاقوۃ" میں ماسوی اللہ کی نفی کی طرف ارشاد کیا ہے۔

٥٢٦٠ : وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْجِبُهُ مِنَ الدُّنْيَا ثَلٰثَةٌ اَلطَّعَامُ وَالنِّسَاءُ وَالطِّيْبُ فَاَصَابَ اثْنَتَيْنِ وَلَمْ يُصِبْ وَاحِدًا اَصَابَ النِّسَاءَ وَالطِّيْبَ وَلَمْ يُصِبِ الطَّعَامَ.

(رواہ احمد)

اخرجه احمد في المسند ٦/ ٧٢۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ دنیا کی چیزوں میں سے تین چیزیں رسول اکرم ﷺ کی نظر میں موغوب تھیں ایک تو کھانا (کہ جس کے ذریعہ جسمانی توانائی برقرار رکھ کر اصل مقدر زندگی الٰہی پر معاونت حاصل کی جا سکے) دوسرے عورتیں (کہ جن کے ذریعے نفس کو غلط خیالات سے سلامت رکھا جا سکے) اور تیسرے خوشبو (کہ جو دل و دماغ کو نشاط و فرحت بخشے چنانچہ حکماء کا قول ہے کہ عقل وفراست کا مخزن دماغ ہی ہے) چنانچہ ان تینوں اشیاء میں سے دو چیزیں تو حضور ﷺ کو (وافر) حاصل ہوئیں اور ایک چیز (زیادہ) نہ مل سکی یعنی ایک تو عورتیں آپ ﷺ کو (زیادہ) ملیں (بایں طور کہ آپ ﷺ نے نو شادیاں فرمائیں) اور دوسرے (خارجی طور پر) خوشبو آپ ﷺ کو (بہت) ملی (حالانکہ آپ ﷺ کا پسینہ مبارک وہی مشک وعنبر سے بھی زیادہ خوشبودار تھا) لیکن تیسری چیز کھانا آپ ﷺ کو (زیادہ) نہیں ملا"۔ (احمد)

تشریح: من الدنيا ثلثة (یعنی تین چیزیں) جیسا کہ ایک روایت میں "ثلثة اشياء" کے الفاظ ہیں۔

ولم يصب الطعام: مطلق نفی مبالغہ کیلئے ہے کیونکہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی وفات تک مسلسل دو دن تک جَو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔ اور اس حدیث کی شرح میں علامہ طیبی رحمہ اللہ نے جو بات فرمائی ہے وہ کمزور ہے کہ حضور کو خوشبو اور عورتیں جس طرح زیادہ مہیا ہوئیں اس طرح کھانا زیادہ میسر نہ ہوا۔ کیونکہ اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ حضور اکرام ﷺ کو کھانا تو زیادہ میسر آیا مگر عورتوں اور خوشبو کی بنسبت کم تھا۔

اسنادی حیثیت: علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے "شفاء" کی احادیث کی تخریج میں فرمایا کہ "اس کی اسناد تو صحیح ہے مگر اس میں ایک راوی ہے جس کا نام معلوم نہیں ہے۔

۵۲۶۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُبِّبَ اِلَيَّ الطِّيْبُ وَالنِّسَآءُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ (رواه احمد والنسائي وزاد ابن الجوزي بعد قوله حُبِّبَ اِلَيَّ) **مِنَ الدُّنْيَا.**

احمد بن حنبل، المسند۔

اخرجه النسائي في السنن ٦١/٧ حديث رقم ٣٩٣٩ واحمد في المسند ١٢٨/٣

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "خوشبو اور عورتیں مجھے محبوب کر دی گئی ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک (یعنی قلبی نشاط و سکون) نماز میں رکھ دیا گیا ہے"۔ (احمد، نسائی) اور ابن جوزی نے اس ارشاد میں حُبِّبَ اِلَيَّ کے بعد مِنَ الدُّنْيَا کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں۔

تشریح: حبب الي: ایک روایت میں (ان الفاظ کے بعد) "من دُنيا كم" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

قوله: وجعلت قرة عيني في الصلوة: اسی طرح مشکوۃ کے نسخوں میں "جعلت" آیا ہے۔ گویا کہ یہ لفظ علامہ طیبی رحمہ اللہ کی اصل میں موجود نہیں ہے جیسا کہ ایک روایت میں آیا بھی ہے۔ یا اُن کی طرف سے غفلت ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ "الفاظ حدیث "قرة عيني في الصلوة" جملہ اسمیہ ہے اور اس کا جملہ فعلیہ پر عطف اسلئے کیا گیا ہے کہ "ثبات" پر دلالت کرتا ہے۔ دوسرے جملے میں دوام ہے اور پہلے جملے میں تجدد ہے۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ یہ بات محل نظر ہے اسلئے کہ تجدد کا قوا فعل مضارع میں ہوتا ہے اور جہاں تک ماضی کا

بات ہے تو ماضی ثبات کیلئے آتا ہے۔ یہاں تک کہ جب مضارع کو ماضی سے تعبیر کیا جائے تو اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس طرح تحقق کیلئے کیا' گویا کہ یہ فعل ہو گیا۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فعل مجہول کو اسلئے ذکر کیا تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ یہ حضور علیہ السلام کی فطرت اور طبیعت نہیں تھی بلکہ انسانوں کیلئے بطور رحمت آپ علیہ السلام اس محبت پر مجبور تھے۔ بخلاف نماز کے کہ نماز حضور علیہ السلام کیلئے بذاتہ محبوب تھی۔ اسی وجہ سے حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ارحنا یا بلال

یعنی اذان کے ذریعہ اس کے ماسوا سے ہمیں غافل کر دو۔ استراحت تو نماز میں ہے۔ اپنی اذان کے ذریعہ ہمیں نماز سے راحت بخشو۔

تخریج: اس حدیث حاکم نے مستدرک میں' بیہقی نے ''شعب'' میں اور جامع میں نقل کیا ہے۔ ابن الربیع نے امام سخاوی کی ''مختصر المقاصد'' میں ذکر کیا ہے کہ اس حدیث کو طبرانی نے کبیر میں اور نسائی نے سنن نسائی میں انہی الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے اور حاکم نے مستدرک میں جعلت کے بغیر ذکر کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے' مسلم کی شرط کے موافق ہے۔ اور اس حدیث میں لفظ (ثلاث) کی جو زیادتی مشہور ہے اس کے بارے میں علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ یہ لفظ مجھے (الاحیاء) میں دو جگہوں کے علاوہ کہیں نہیں ملا۔ اور کشاف میں سورۃ آل عمران کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ لفظ اس حدیث کی مختلف روایات میں کافی تفتیش کے بعد بھی مجھے نہیں ملا۔ اور اسی بات کی علامہ زرکشی نے تصریح کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ لفظ (ثلاث) اس حدیث میں وارد نہیں ہوا ہے' اور اس کی زیادتی معنی کو فاسد کر دیتا ہے کیونکہ نماز دنیاوی اُمور میں سے نہیں ہے۔

من الدنیا ''زاد'' کا مفعول بہ ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

حافظ سیوطی رحمہ اللہ نے فتاوٰی حدیثیہ میں ایک سوال ذکر کیا ہے' وہ یہ ہے۔ کہ ارشاد نبوی ''**حبب الی من دنیا کم النساء و الطیب و جعلت قرۃ عینی فی الصلوۃ**'' میں حضور علیہ السلام نے نساء کا ذکر مقدم کیوں کیا اور نماز کا ذکر مؤخر کیوں کیا؟

جواب یہ ہے کہ چونکہ حدیث ذکر کرنے سے مقصود دنیا کا وہ ساز و سامان بتانا ہے جو حضور علیہ السلام کو ملا تھا۔ اسلئے ابتداً اسی کو ذکر فرمایا جیسا کہ حدیث میں ارشاد نبوی ہے کہ ''ہمیں تمہاری اس دنیا سے صرف عورتیں ملی''۔ اور حدیث نبوی ''دنیا تھوڑی دیر کا ساز و سامان ہے اور دنیاوی ساز و سامان میں سے بہترین چیز نیک بیوی ہے۔'' کی رُو سے آپ علیہ السلام کی محبوب چیز یعنی عورت چونکہ افضل چیز ہے اسلئے مناسب تھا کہ اسی کے ساتھ دینی امور میں سے افضل امر یعنی نماز کا ذکر کیا جائے' کیونکہ نماز ایمان کے بعد عبادات میں سے افضل عبادت ہے۔ حدیث شریف میں دنیاوی امور میں سے افضل یعنی صالح عورت اور دینی امور میں سے افضل یعنی نماز کو جمع کر کے ذکر کرنا بلاغت کا اسلوب ہے۔ اور اس میں ایک چیز کو اس کی نظیر کے ساتھ یکجا ذکر کیا گیا ہے۔ اور دنیاوی چیز کی بہ نسبت دینی چیز (نماز) کو زیادہ بلیغ عبارت کے ساتھ بیان کیا۔ کیونکہ دنیاوی چیز کے بارے میں صرف محبوب ہونا ارشاد فرمایا جبکہ دینی امر (نماز) کے بارے میں فرمایا میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ اسلئے کہ ''آنکھوں کی ٹھنڈک'' سے محبت کی انتہائی زیادتی سمجھ میں آئی ہے۔ جو کسی سے مخفی نہیں ہے انتہیٰ۔

خوشبو کو ذکر نہ کرنیکی وجہ شاید یہ ہو کہ خوشبو وجود اور عدم کے اعتبار سے نساء کے تابع ہے۔ جیسا کہ دو روایتوں میں مذکور

ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک حدیث میں مذکور لفظ ''صلوٰۃ'' سے مراد معروف عبادت ہے۔ جبکہ بعض شراح حدیث فرماتے ہیں کہ لفظ ''صلوٰۃ'' سے مراد حضور علیہ السلام پر درود بھیجنا ہے۔

۵۲۶۲ : وَعَنْ مُعَاذِبْنِ جَبَلٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا بَعَثَ بِهِ اِلَى الْيَمَنِ قَالَ اِيَّاكَ وَالتَّنَعُّمَ فَاِنَّ عِبَادَ اللّٰهِ لَيْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِيْنَ ـ

رواہ احمد

اخرجه احمد فی المسند ۲٤۳/۵۔

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب انہیں رسول اکرم ﷺ نے (قاضی بنا کر) یمن کی جانب روانہ فرمایا تو ان کو یہ نصیحت بھی فرمائی کہ ''اپنے آپ کو راحت طلبی اور زیادہ نازنعمت کی زندگی سے بچانا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بندگانِ خاص آرام و آسائش کی زندگی گزارنے والے نہیں ہوتے''۔ (احمد)

تشریح: قال ایاك والتنعم...... تنعم کا معنی یہ ہے کہ خواہش کی حرص اور نعمت کی بڑھوتری کی کوشش میں تکلف کرے اور خواہش پوری کرنے میں مبالغہ کرے۔ تنعم تو، کفار فجار اور جہلاء کے ساتھ خاص ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ذرھم یاکلوا ویتمتعوا و یلھھم الامل فسوف یعلمون﴾ [الحجر۔۳]

ترجمہ: ''آپ ان کو ان کے حال پر رہنے دیجئے کہ وہ کھالیں اور چین اڑالیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو بھی حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے۔''

نیز ارشاد باری ہے: ﴿یا کلون کما تاکل الانعام والنار مثوی لھم﴾ [محمد۔۱۲] ''اور اس طرح کھاتے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں، اور جہنم ان لوگوں کا ٹھکانہ ہے۔''

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: [انھم کانوا قبل ذالك مترفین][الواقعة ۔۴۵] ''وہ لوگ اس کے قبل بڑی خوشحالی میں رہتے تھے۔''

تخریج: اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

۵۲۶۳ : وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ رَضِيَ مِنَ اللّٰهِ بِالْيَسِيْرِ مِنَ الرِّزْقِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ بِالْقَلِيْلِ مِنَ الْعَمَلِ ـ

رواہ البیھقی فی شعب الایمان ۱۳۹/٤ حدیث رقم ٤۵۸۵

''حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص تھوڑے سے رزق سے اللہ پر راضی ہو جاتا ہے (یعنی اپنی ضروریات زندگی میں تھوڑے مال پر قناعت کرتا ہے) تو حق تعالیٰ اس کے (عبادت واطاعت میں) تھوڑے سے عمل پر راضی ہو جاتا ہے''۔

رضی اللہ منہ اور ایک نسخہ میں ''عنہ'' ہے۔

بالقلیل اور ایک نسخہ میں ''بالیسیر'' ہے۔

ابن عساکر نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے:

من رضی عن اللہ رضی اللہ عنہ: جو اللہ سے راضی ہو۔ اللہ اُس سے راضی ہو جاتے ہیں۔ ملاعلی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بندہ کی رضا مقدم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ﴾ [المائدۃ:۱۹،التوبۃ:۱۰۰،المجادلۃ:۲۲،البینۃ:۸] ”اللہ تعالیٰ ان سے خوش رہیگا اور وہ اللہ سے خوش رہیں گے“۔ میں اس بات کی طرف ارشارہ ہے کہ بندہ کی رضا موخر ہے۔ چنانچہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں تحقیقی بات یہ ہے کہ بندہ کی رضاء اللہ کی دو رضاؤں کے درمیان گھری ہوئی ہے ایک اللہ کی رضاء ازلی ہے جس سے علم اوّلی کا تعلق ہے۔ اور دوسری اللہ کی رضاء ابدی ہے جو بندے کے عمل سے متعلق ہے۔ اور اسی پر اُخروی جزاء مرتب ہوئی ہے۔ اور درحقیقت بندے کی رضاء اللہ کی پہلی رضاء کا اثر و نتیجہ ہے۔ یعنی احسان وانعام اسی طرح تشریح ہو گی اس ارشاد باری کی: یحبھم ویحبونہ [المائدۃ:۵۴] اور ﴿قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ﴾ [آل عمران ـ ۳۱] ”آپ فرما دیجئے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تم لوگ میرا اتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے“۔

۵۲۶۴ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ جَاعَ اَوِاحْتَاجَ فَكَتَمَهُ النَّاسُ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اَنْ يَّرْزُقَهُ رِزْقَ سَنَةٍ مِنْ حَلَالٍ ۔ (رواھما البیھقی فی شعب الایمان)

اخرجه البیھقی فی شعب الایمان ۷/۲۱۵ حدیث رقم ۱۰۰۵٤

ترجمہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص بھوک سے دوچار ہوا یا (کسی چیز کا) ضرورت مند ہوا اور اپنی اس بھوک و احتاجگی کو لوگوں سے مخفی رکھے (یعنی غیر اللہ کے سامنے نہ تو دست سوال دراز کرے اور نہ ہی اپنی مجبوری اور لاچاری ظاہر کرے بلکہ راہ استغناء کا راہی بن جائے) تو اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے (جو کہ بہرحال برحق ہے) کہ وہ اس شخص کو حلال ذریعہ سے ایک سال کا رزق پہنچائے گا“۔ (ان دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے“۔

تشریح: ”او“ حتاج: ”او نوع“ بیان کرنے کیلئے ہے۔

فکتمہ الناس: بعض فرماتے ہیں کہ عبارت کی تقدیر ”من الناس“ ہے۔ چنانچہ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ”کتم“ تاء کی تخفیف کے ساتھ منقول ہے اور ایک مفعول بہ کی طرف متعدی ہے۔ اور ”الناس“ کا نصب عامل جار کو حذف کرنے کے بدلے میں ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ تاء کی تشدید کے ساتھ مروی ہو اس وقت دو مفعول بہ کی طرف متعدی ہوگا۔ جیسا کہ قاموس میں ہے: ”کتم کتما و کتمانا و کتمه ایاہ“

بھوک سے مراد اتنی بھوک ہے جس کے ساتھ صبر کا تصور ہو۔ اس طرح کی بھوک میں اپنی حالت کو پوشیدہ رکھنا دُرست ہے۔ ورنہ علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک کی وجہ سے مرجائے اور نہ سوال کرے اور نہ کچھ کھائے اگر چہ مرادار ہی کیوں نہ ہو تو گنہگار مرے گا۔

۵۲۶۵ : وَعَنْ عِمْرَانَ ابْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

عَبْدَهُ الْمُؤْمِنَ الْفَقِيْرَ الْمُتَعَفِّفَ اَبَا الْعِيَالِ (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۲/ ۱۳۸۰ حديث رقم ۴۱۲۱۔

ترجمہ: ''حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس مسلمان کو دوست رکھتا ہے جو نادار و پاکدامن اور صاحب عیال ہو''۔ (ابن ماجہ)

تشریح: ابالعیال مطلب یہ ہے کہ جو اہل و عیال والا، فقر والا اور پریشان حال ہونے کے باوجود سوال کرنے سے بچتا ہے، وہ کامل مؤمن ہے۔ اسی وجہ سے اللہ جل جلالہ اُس سے محبت کرتے ہیں۔

۵۲۶۶ : وَعَنْ زَيْدِ ابْنِ اَسْلَمَ قَالَ اسْتَسْقٰى يَوْمًا عُمَرُ فَجِيْءَ بِمَآءٍ قَدْ شِيْبَ بِعَسَلٍ فَقَالَ اِنَّهٗ لَطَيِّبٌ لٰكِنِّيْ اَسْمَعُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ نَعٰى عَلٰى قَوْمٍ شَهَوَاتِهِمْ فَقَالَ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَاَخَافُ اَنْ تَكُوْنَ حَسَنَاتُنَا عُجِّلَتْ لَنَا فَلَمْ يَشْرَبْهُ۔

رواه رزين

ترجمہ: ''حضرت زید بن اسلمؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ ایک روز امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پینے کے لئے پانی طلب کیا تو ان کی خدمت میں جو پانی پیش کیا گیا اس میں شہد ملایا گیا تھا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (اس پانی کو دیکھ کر اور جانتے ہوئے کہ اس میں شہد ملایا گیا ہے ارشاد فرمایا: ''بلا شبہ یہ پانی پاک وحلال اور نہایت عمدہ ہے لیکن (میں اس کو نہیں پیوں گا' کیونکہ) میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں (قرآن سے) سنتا اور جانتا ہوں کہ اس نے ایک قوم کو خواہشات نفس کی پیروی پر معیوب قرار دیا اور (بطور سرزنش و تنبیہ) فرمایا: کہ تم نے اس دنیاوی زندگی میں اپنی نعمتیں اور راحتیں حاصل کر لیں اور ان سے خوب نفع حاصل کر لیا (اب آخرت میں تمہارا کچھ نصیب نہ رہا)''۔ لہٰذا میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ہماری) نیکیاں بھی ایسی نہ ہوں جن کا اجر و ثواب (دنیاوی نعمتوں اور راحتوں کی شکل میں) جلد ہی دنیا میں ہمیں دے دیا جائے (اور پھر آخرت میں محرومی کا سامنا کرنا پڑے) چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شہد ملا ہوا وہ پانی نوش نہ فرمایا''۔ (رزین)

تشریح: **قولہ :استسقی یومًا عمر ...... انه لطیب :قد شیب:** شین کے کسرہ کے ساتھ۔

لطیب: طبیعت کو بھی اچھا لگتا ہے۔ شرعاً بھی اچھا ہے اور نفع کے اعتبار سے بھی اچھا ہے۔

لکنی اسمع الله عزوجل : علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مقدر عبارت سے مستدرک ہے۔ ای ''**انه لطیب اشتهیه لکنی اعرض عنه لانی سمعت**'' یہ شہد والا پانی اچھا ہے اور میرا دل اس کو چاہتا ہے لیکن میں سے اعراض کرتا ہوں کیونکہ میں نے اللہ تعالیٰ کو فرماتے ہوئے سنا (**اذ هبتم**) استفہام انکاری کے ہمزہ مقدرہ کے ساتھ اور ہمزہ ایک قراءت میں موجود بھی ہے۔ دنیا کی گھٹیا زندگی میں نفس خواہشات کی اتباع میں اور آخرت کے گھر کیلئے بطور ذخیرہ کوئی چیز نہیں چھوڑی۔

محبلت بنا : طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جو نیک کام ہم کرتے تھے اُنکا ثواب آخرت سے پہلے دنیا میں پورا پورا مل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا﴾

[الاسراء: ۱۸] ''جو شخص دنیا کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا میں جتنا چاہیں گے جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دیدیں گے۔ پھر ہم اُس کیلئے جہنم تجویز کریں گے۔ وہ اُس میں بدحال راندہ ہو کر داخل ہوگا۔''

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دونوں آیتیں اگرچہ کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہیں مگر اعتبار لفظ کے عموم کا ہے نہ کہ سبب کی خصوصیت کا۔

۵۲۶۷ : وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَا شَبِعْنَا مِنْ تَمْرٍ حَتّٰى فَتَحْنَا خَيْبَرَ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه حديث رقم ۴۲۴۳

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم (صحابہؓ) کھجوروں سے کبھی سیر نہ ہو سکے یہاں تک کہ ہم فاتح خیبر بن گئے''۔ (بخاری)

تشریح: وعن ابن عمر قال ما شبعنا......:

اس ''ہم'' سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھر والے یا صحابہ کرام کی جماعت بشمول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہے اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔

بَابُ الْاَمَلِ وَالْحِرْصِ

آرزو اور حرص کا بیان

جوہریؒ فرماتے ہیں کہ "أمل" کا معنی ہے رجاء (امید رکھنا)۔

امام راغب فرماتے ہیں کہ حرص کا معنی ہے ارادہ میں خواہش کی زیادتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ان تحرص علی ھداھم﴾ [النحل: ۳۷] "ان کے راہ راست پر آنے کی اگر آپ کو تمنا ہو" یعنی اگر آپ کو ان کی ہدایت کی بہت زیادہ خواہش ہے۔

قاموس میں ہے کہ بدترین حرص یہ ہے کہ تم اپنا حصہ بھی حاصل کر کے دوسرے کے حصہ میں بھی طمع رکھو۔ (انتہی)

یہاں پر اَمَل سے مراد ہے موت کی تیاری اور توشہ آخرت سے غافل ہو کر دنیاوی امور کی اُمیدوں کا طویل ہونا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ذرھم یاکلوا ویتمتعوا ویلھھم الامل﴾ [الحجر-۳] "آپ ان کو ان کے حال پر رہنے دیں کہ وہ کھالیں اور چین اڑالیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں۔"

علماء کا اجماع ہے کہ علم وعمل حاصل کرنے میں اُمیدوں کا دراز ہونا محمود ہے۔ جیسا کہ رسول ﷺ کا ارشاد ہے: طوبی لمن طال عمرہ "اُس شخص کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ جس کی عمر لمبی ہو اور عمل اچھا ہو"۔ نیز آپ علیہ السلام نے فرمایا: لو عشت الی قابل لأصومن التاسع۔ اگر میں اگلے سال تک زندہ رہا تو (محرم کی) نویں تاریخ کو ضرور روزہ رکھوں گا"۔ اور اسی طرح مال جمع کرنے، عہدہ حاصل کرنے کی آرزو رکھنا بُری بات ہے۔ ورنہ کفار کے ساتھ جہاد کرنے اور علوم حاصل کرنے اور اعمال بڑھانے کی آرزو رکھنا مستحسن ہے۔ علماء کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی نزاع نہیں ہے۔

اہل یقین محققین کی تحقیق کے مطابق اَمَل کی حقیقت وہ ہے۔ جو امام غزالی نے "منہاج العابدین" میں ذکر کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

اکثر علماء کے نزدیک امل سے مراد ہے بعد میں آنے والے وقت تک زندہ رہنے کا ارادہ کرنا ہے اور آرزوؤں کو مختصر رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ وقت تک زندہ رہنے کے ارادے کا فیصلہ نہ کرے۔ اس طرح کہ بات کرنے میں بعد تک زندہ رہنے کو اللہ تعالیٰ کے علم اور مشیت کے ساتھ مقید کرے۔ اس وقت اگر کوئی اپنی زندگی اس طرح بیان کرے یہ میں اگلی سانس تک یا اگلی گھڑی تک یا اگلے دن تک زندہ رہوں گا۔ اور یہ بات یقین اور اعتماد کے ساتھ کہے تو یہ شخص آمل (آرزو رکھنے والا) ہوگا۔ اور

یہ معصیت ہے۔ کیونکہ ایک غیبی امر کا یقین اور فیصلہ ہے۔ اور اگر یہ بات اللہ کی مشیت اور علم کے ساتھ مقید کر کے کہے تو یہ شخص "آمِل" (آرزو رکھنے والا) نہیں کہلائے گا۔

عنوان میں "اَمَل" اور "حرص" دونوں کو اسلئے ذکر کیا کہ امکان میں یہ دونوں ایک دوسرے کو لازم ہیں۔ اور "اَمَل" کو اس لئے مقدم کیا کہ یہ عمل کو مؤخر کرنے اور نامناسب امور کی حرص کا باعث ہے۔

الفصل الاوّل :

۵۲۶۸ : عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ خَطَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا مُرَبَّعًا وَخَطَّ خَطًّا فِي الْوَسَطِ خَارِجًا مِنْهُ وَخَطَّ خُطَطًا صِغَارًا اِلٰى هٰذَا الَّذِيْ فِي الْوَسَطِ مِنْ جَانِبِهِ الَّذِيْ هُوَفِي الْوَسَطِ فَقَالَ هٰذَا الْاِنْسَانُ وَهٰذَا اَجَلُهٗ مُحِيْطٌ بِهٖ وَهٰذَا الَّذِيْ هُوَخَارِجٌ اَمَلُهٗ وَهٰذِهِ الْخُطَطُ الصِّغَارُ الْاَعْرَاضُ فَاِنْ اَخْطَاهُ هٰذَا نَهَسَهٗ هٰذَا وَاِنْ اَخْطَاهُ هٰذَا نَهَسَهٗ هٰذَا۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۲۳۵/۱۱حدیث رقم ٦٤١٧ والترمذی فی السنن ٥٤٨/٤ حدیث رقم ٢٤٥٤وابن ماجه فی السنن ١٤١٥/٢ حدیث رقم ٤٢٣١ والدارمی فی السنن ٣٩٣/٢ حدیث رقم ٢٧٢٩ واحمد فی المسند ٣٨٥/١

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک روز) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری تعلیم کے لئے چار خط کھینچ کر ایک مربع بنایا' پھر اس مربع کے درمیان ایک اور خط کھینچا جو اس چوکور سے باہر نکلنے والا تھا' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درمیانی خط کے اس حصہ کی طرف جو (مربع کے) خطوں کے درمیان تھا چھوٹے چھوٹے کئی خطوط کھینچے اور پھر فرمایا" (اس خاکہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو! درمیانی خط کا یہ حصہ جو کہ مربع کے خطوں کے درمیان ہے گویا انسان ہے اور یہ خط (کہ جس نے چاروں طرف سے مربع بنا رکھا ہے) اس انسان کی موت ہے (یعنی مربع کے چاروں خطوط گویا اس کی موت کا وقت اور اس کی عمر کی آخری حد ہے جس نے چاروں طرف سے اس کو گھیر رکھا ہے) اور درمیانی خط کا وہ حصہ کہ جو مربع سے باہر نکلا ہوا ہے یہ گویا انسان کی (وہ) آرزو اور خواہش ہے (جس وہ اپنی موت آنے سے پہلے پہلے حاصل کر لینے کا گمان رکھتا ہے حالانکہ وہ ایک بے بنیاد خیال میں مبتلا ہے کیونکہ کیونکہ موت اس کی تمام امیدوں اور تمناؤں کی تکمیل سے زیادہ قریب ہے) اور درمیانی خط کے اندرونی حصے پر جو یہ چھوٹی چھوٹی لکیریں ہیں وہ پیش آنے والے حوادث (یعنی آفات ومصائب جیسے غربت وناداری اور فقر و بیماری اور مفلوک الحالی وغیرہ) ہیں (کہ جو انسان پر ہر طرف سے مسلط رہتے ہیں اور اگر وہ عوارض اپنا کام کر جاتے ہیں تو وہ ہلاک ہو جاتا ہے) پس اگر وہ (انسان) کسی ایک عارضہ یا حادثہ سے بچ جاتا ہے تو دوسرا حادثہ وعارضہ حملہ کر دیتا ہے اگر اس حادثہ وعارضہ سے بھی بچ نکلتا ہے تو پھر تیسرا گھیر لیتا ہے' جن کا وہ یکے بعد دیگرے سامنا کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ موت آ کر اس خاتمہ کر دیتی ہے"۔ (بخاری)

تشریح: خطاً مربعاً: ظاہر یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے اپنے دست مبارک سے زمین پر خط کھینچا۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خط سے مراد شکل اور نقشہ ہے۔

خط :ای خطا، جیسا کہ ایک صحیح نسخہ میں مذکور ہے

خطا: اس کی صفت محذوف ہے)ای خطا آخر۔خارجاً منه: (حال ہے۔)ای حال کون الخط خار جامن احد طرفي المربع۔

خط خططا: خا کے ضمہ کے ساتھ ' ئے معجمہ اور اکثر کے نزدیک پہلی طا کے ضمہ کے ساتھ جمع ہے۔اور طاء کا فتحہ بھی جائز ہے۔"خطط" بمعنی "خطوط" ہے۔(لکیریں)

صغارا صغیرۃ کی جمع ہے۔

الی هذا: جار مجرور کا متعلق محذوف ہے۔) ای متوجهة ومائلة ومنتهية الى هذا الخط (یعنی وہ چھوٹی لکیریں اُس اور اِس خط سے مل رہی تھیں۔)

الذی في ...... في الوسط): یعنی مربع کے درمیان اس درمیانی خط کے دونوں طرف سے اور مفرد سے مراد جنس ہے۔

فقال هذا الانسان: اشارہ درمیانی خط کی طرف ہے۔(کذا قال شارح)اور بظاہر "هذا" سے مراد مربع شکل کا مرکز ہے۔اگر چہ ظاہری خط میں اُسکے لئے کوئی مُستقل صورت نہیں ہے۔یا "هذا" سے مراد پوری شکل اور صورت ہے۔جو لکیروں سے معلوم ہو رہی ہے۔اور ذہن میں محفوظ ہے۔کیونکہ انسان مع اُسکی اُمیدوں اور عوارض (مصائب حادثات) کے جو موت تک رہتی ہیں "هذا" کا مشار الیہ ہے۔چنانچہ حاصل یہ ہے۔کہ یہ لکیروں سے بننے والی پوری شکل انسان ہے۔

اجله انسان کی مقررہ وقت اور زندگی کی موت ہے۔تمام اطراف سے اس طرح کہ انسان کیلئے اس سے نکلنا اور بھاگنا ممکن نہیں ہے۔

وهذه الخطط: یہ چھوٹے خطوط۔

الصغار الاعراض یعنی آفات، حادثات اور مصائب ہیں جیسے بیماری بھوک اور پیاس اور دوسری مشکلات جو انسان کو پیش آتی ہیں۔اور "اعراض" عرض (را کے فتحہ کے ساتھ) کی جمع ہے۔

نهسه: سین مہملہ کے ساتھ اور بعض کا کہنا ہے کہ شین کے ساتھ ہے۔

مصیبت کے پیش آنے کو "نهس" سے تعبیر کیا زہریلی چیز کا کاٹنا۔دُنیاوی مصائب کی مضرت میں مبالغہ کیلئے یہ تعبر اختیار کی ہے۔

وان اخطاه هذا: وہ دوسری مصیبت۔

نهسه هذا ایک اور مصیبت اسی طرح موت کے آنے اور اُمیدوں کے پورا نہ ہونے تک ہوتا رہتا ہے۔ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔چنانچہ (هذا الانسان) سے درمیانی نقطہ کی طرف اشارہ ہے۔اور (هذا الذی هو خارج امله) سے علیحدہ کھینچے گئے مستطیل خط کی طرف اشارہ ہے۔(هذا) سے خطوط کی طرف اشارہ ہے۔اور اس نقشہ کو مثال کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔یہ مراد نہیں ہے۔کہ وہ عوارض اس متعین تعداد میں منحصر ہیں۔اس کی تائید بعد میں مذکور انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ "اذ جاء ة الا قرب" سے ہوتی ہے اور اس بات میں تو کوئی شک نہیں۔کہ وہ خط جو احاطہ کر رہا ہے۔اُس خط کی بنسبت

زیادہ قریب ہے۔ جو خط باہر کی طرف نکل رہا ہے۔ انتہی۔

زیادہ مناسب ہے۔ کہ خطوط کی تعداد سات قرار دی جائے۔ کیونکہ سات کا عدد حضور علیہ السلام عموماً ذکر کیا کرتے تھے۔ اور اُس عدد (ستر) کا عُشر (دسواں) ہے۔ جس کے ذریعے کثرت کو بیان کیا جاتا تھا۔ نیز انسان کے سات اعضاء اور یقین کے مراتب میں سات مراحل ہوتے ہیں۔ اور سات زمینوں کا احاطہ کیے ہوئے۔ سات آسمانوں کے دوران پر سات ایام گزرتے ہیں۔

جان لو اس بات کو کہ شیخ نے جس درمیانی نقطہ کی طرف ارشار کیا ہے۔ وہ نبوی نقشہ سے معلوم نہیں ہو رہا۔ اسی وجہ سے شراح حدیث میں سے ایک شارح کے علاوہ کسی نے اس کا نقشہ نہیں بتایا مثلاً طیبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ کہ مشہور مذکور نقشہ کے علاوہ میں نے دوسرا نقشہ دیکھا جو یہ ہے۔ یہی ہیئت بعض شراح کی تشریح کے مطابق ہے اور زیادہ ظاہر نقشہ یہی ہے۔؟؟

۵۲۶۹ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ خَطَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خُطُوْطاً فَقَالَ ھٰذَا الْاَمَلُ وَھٰذَا اَجَلُہٗ فَبَیْنَمَا ھُوَ کَذٰلِکَ اِذَا جَآءَ ہُ الْخَطُّ الْاَقْرَبُ. (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/۲۳۶ حدیث رقم ۶٤۱۸ وابن ماجه فی السنن ۲/۱٤۱٤ حدیث رقم ٤۲۳۱۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ نے کئی خطوط کھینچے (جیسا کہ گذشتہ حدیث میں گزرا کہ آپ ﷺ نے چار خط کھینچ کر ایک چوکور بنایا اور اس مربع کے درمیان ایک اور خط کھینچا جو مربع سے باہر نکلا ہوا تھا) پھر فرمایا کہ درمیانی خط کا یہ حصہ (جو مربع سے باہر نکلا ہوا ہے) انسان کی آرزو ہے اور یہ خط (جس نے چاروں طرف سے اس درمیانی خط کو گھیرا ہوا ہے) اس (انسان) کی موت ہے' پس انسان اسی حال میں (یعنی امیدوں اور تمناؤں کے پورا ہونے کی جستجو میں) رہتا ہے کہ اچانک موت کا خط اس پر حملہ آور ہوتا ہے جو اس شخص کے نسبت امیدوں اور آرزوؤں کی تکمیل کے) زیادہ قریب ہے''۔ (بخاری)

تشریح: خطوطا گذشتہ مذکور نقشہ کی طرح مختلف خطوط کھینچے۔

فقال هذا: اشارہ لکیر کی طرف تھا جو مربع کی ایک جانب سے باہر نکلی ہوئی تھی۔

الامل :انسان کی اُمید۔

هذااجله فبينما هو كذالك مشارالیہ وہ مربع خط تھا جس نے احاطہ کیا ہوا تھا۔

یعنی ان ساعات کے دوران۔

اذجاءه الخط الاقرب :اور یہی اس کی موت ہے۔ جو تمام اطراف سے انسان کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور مربع سے باہر نکلنے والا خط چوک جاتا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ (بينما هو كذالك) کا معنی ہے کہ انسان اپنے دُور کی اُمید کو طلب کر رہا ہوتا ہے۔ وہ آفات اس کو گھیر لیتی ہیں۔ جو زیادہ قریب ہیں۔ جو اس کو اس موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہیں' جس نے اس کا احاطہ کیا ہوتا

ہے۔ یہ تاویل گذشتہ حدیث کے معنی پر محمول ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے۔ کہ دوسری فصل میں آنے والی ابوسعیدؓ کی حدیث پر محمول کیا جائے۔ وہ حدیث ہے: ان النبی ﷺ غرز عمودًا بین یدیه" [الحدیث]

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو مذکورہ بالا معنی پر محمول کرنا واضح خطا ہے۔ چونکہ دونوں روایات کے الفاظ بالکل صریح ہیں کہ ایک روایت میں لکڑیاں اور دوسری روایت میں خط کھینچنا منقول ہے۔

۵۲۷۰ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَهْرَمُ ابْنُ اٰدَمَ يَشِبُّ مِنْهُ اثْنَانِ الْحِرْصُ عَلَى الْمَالِ وَالْحِرْصُ عَلَى الْعُمُرِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۳۹/۱۱ حدیث رقم ٦٤٢٠ومسلم فی صحیحه ۷۲٤/۲ حدیث رقم (۱۱٤-۱۰٤٦) والترمذی فی السنن ٤۹۳/٤ حدیث رقم ۲۳۳۸وابن ماجه فی السنن ۱٤۱٥/۲ حدیث رقم ٤۲۳۳۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "انسان (خود تو) بوڑھا ہو جاتا ہے مگر اس (کے اخلاق) میں دو چیزیں جوان (قوی) ہو جاتی ہیں ایک تو مال (جمع کرنے) کی شدید لالچ (اور اس کو خیرات نہ کرنا) اور دوسرے درازیٔ عمر کی آرزو"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: یهرم راء کے فتحہ کے ساتھ جیسا کہ ایک روایت میں "یشیب" کا لفظ ہے۔

یشب: شین معجمہ کے کسرہ اور باء مؤدت کی تشدید کے ساتھ ہے۔

شب شبابا امام بیہقی کی "تاج" اور قاموس میں لکھا ہے کہ هرم باب سمع سے ہے اور اس کا معنی ہے بوڑھا ہو جانا اور باب ضرب سے ہے۔

والحرص علی العمر: یعنی اپنی اُمیدوں کو دراز کر کے، عمل میں ٹال مٹول کر کے اور اپنی موت کو دُور تصور کر کے امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "یشب" استعارہ ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ بوڑھے کا دل (دنیا کی) محبت میں کامل ہوتا ہے اور اتنا قوی ہوتا ہے جتنا کہ جوانی میں نوجوان کا دل قوی ہوتا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ بھی دُرست ہے کہ (کلام) مطابقت اور مشاکلت کے باب سے ہو۔ "یهرم" کا معنی ہے: یشیب۔

تخریج: امام میرک فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ امام مسلم کے ہیں۔ اور امام بخاری نے " یکبر ابن آدم" کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ باقی الفاظ دونوں کتابوں میں ایک ہی طرح ہیں۔ نیز امام ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ (انتہی)

چنانچہ مصنف کے قول "متفق علیہ" کا معنی یہ ہے کہ اس حدیث کے معنی کو نقل کرنے پر امام بخاریؒ اور امام مسلم متفق ہیں، تمام الفاظ متفق علیہ میں ہیں۔ یہ بات تو امام میرک کے قول پر مبنی ہے۔ ورنہ جامع میں بھی "یهرم ابن آدم ویبقی فیه اثنان الحرص والامل" کے الفاظ ہیں۔ اس کو امام احمد، امام مسلم، امام بخاری اور نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ "یکبر" کا لفظ بخاری کا ہے۔ اور صحیحین میں متعدد روایات ہیں جیسا کہ "مقاصد" میں سخاوی کا کلام اس

بات پر دلالت کرتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حدیث ''یھرم ابن ادم ویبقی فیه اثنان الحرص والامل'' متفق علیہ ہے۔ اور ایک روایت میں ''یشیب ابن آدم ویشب فیه'' کے الفاظ ہیں۔

۵۲۷۱ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَزَالُ قَلْبُ الْکَبِیْرِ شَآبًّا فِیْ اثْنَیْنِ فِیْ حُبِّ الدُّنْیَا وَطُوْلِ الْاَمَلِ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/ ۲۳۸ حدیث رقم ۶۴۲۰

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بوڑھے کا دل ہمیشہ دو باتوں میں جوان (قوی) رہتا ہے ایک تو دنیا کی محبت میں اور دوسرے درازی عمر کی شدید تمنا میں'' کیونکہ دنیا سے دل لگی کے باعث موت ناگوار لگتی ہے۔ اور آرزوئے درازئ عمر اعمال صالحہ میں تاخیر کا سبب بن جاتی ہے''۔
(بخاری و مسلم)

۵۲۷۲ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَعْذَرَ اللّٰهُ اِلٰی اَمْرِءٍ اَخَّرَ اَجَلَهٗ حَتّٰی بَلَّغَه سِتِّیْنَ سَنَةً. (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/ ۲۸ حدیث رقم ۶۴۱۹

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کا عذر ختم کر دیا جس کی موت کو ساٹھ سال کی عمر تک مؤخر کر دیا۔''

تشریح: اعذر الله: بعض شارحین کے نزدیک ہمزہ سلب کیلئے ہے: ای ازال الله العذر منهیا۔ (یعنی اللہ نے موقع دے کر اُسکا عذر دور کر دیا۔)

اخر اجله: اور ایک روایت میں ''عمرہ'' کا لفظ ہے۔

حتی بلغه: لام کی تشدید کے ساتھ ہے اور ایک روایت میں ''حتی بلغ'' کے الفاظ ہیں۔

مراد یہ ہے کہ اپنے گناہوں سے توبہ نہیں کی اور اپنے غلطیوں کی اصلاح نہیں کی اور اُسکی بھلائی برائیوں پر غالب نہیں ہوئی۔ چنانچہ اللہ نے اس شخص کیلئے عبادت چھوڑنے زندگی ضائع کرنے کا کوئی عذر نہیں چھوڑا حاصل یہ کہ جس کی عمر ساٹھ برس تک پہنچی اور بعض شراح کے نزدیک چالیس برس تک پہنچی اور اس کی بھلائی اس کی برائیوں پر غالب نہیں ہوئیں۔ تو موت اس شخص کیلئے بہتر ہے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اُسکا عذر اس تک پہنچا دیا۔ اب اس کے پاس کوئی عذر نہ رہا۔ عرب کہتے ہیں ''اعذر الرجل الی فلان ای بلغ به اقصی العذر، اس قبیل سے عرب کا یہ قول ہے اعذر من انذر، ای اتی بالعذر واظهره اور یہ کلام مجازی ہے۔ چونکہ عذر اللہ کی طرف نہیں بلکہ بندوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ حقیقی معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کیلئے کوئی ایسا عذر نہیں چھوڑا کہ جس سے وہ تمسک کر سکے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ نے اس شخص کا عذر مکمل طور پر ختم کر دیا۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سزا دینے اور آزمائش میں مبتلا کرنے میں اپنا عذر قائم کیا۔

مختصر النہایہ میں ہے عذر کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی کیونکہ ساری زندگی آزاد چھوڑا اور بطور عبرت اس کو سزا نہیں دی۔

تخریج: اسی طرح امام احمد، عبد بن حمید، نسائی، بزار، ابن جریر، ابن ابی حاتم، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی نے ان سے روایت کیا ہے۔ عبد بن حمید طبرانی رویانی اور رامہر مزی نے امثال میں نقل کیا ہے۔

حاکم اور ابن مردویہ نے سہل بن سعد سے نقل کیا ہے: **قال قال رسول الله ﷺ: اذا بلغ العبد ستين سنة فقد اعذر الله اليه في العمر۔**

رسول ﷺ نے فرمایا: جب بندہ ساٹھ برس کی عمر تک پہنچ جاتا ہے تو اللہ نے اُس شخص کیلئے زندگی میں عذر زائل کر دیا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اولم نعمر کم مايتذكر فيه من تذكر﴾ [فاطر۔۳۷] ترجمہ: ''کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی کہ جس کو سمجھنا ہو سمجھ سکتا''۔

اس حدیث کو عبدالرزاق، فریابی، سعید بن منصور، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، ابوشیخ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔ اور ابن مردویہ نے ابن عباسؓ سے اس کی تفسیر کے بارے میں نقل کیا ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا ساٹھ برس مراد ہے۔

ابن جریر نے حضرت علیؓ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے قال: **العمر الذى اعذرهم الله منه ستون سنة۔** فرمایا کہ وہ عمر جس میں اللہ نے انسان کے عذر کو زائل کر دیا ہے ساٹھ برس ہے۔

عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے حسن سے آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ چالیس برس مراد ہیں۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ﴿وقد جاء كم النذير﴾ [فاطر۔۳۷] ''اور تحقیق تمہارے پاس ڈرانے والا بھی پہنچا تھا''۔ تو اس کے بارے میں ابن ابی حاتم، عبد بن حمید اور ابن المنذر نے عکرمہؓ سے نقل کیا ہے کہ ''نذیر'' سے مراد بڑھاپا ہے۔ اسی طرح ابن مردویہ اور بیہقی نے سنن میں ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد بڑھاپا ہے۔

۵۲۷۳ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْ كَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰى ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ. (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۲۵۳/۱۱ حديث رقم ٦٤٣٦ ومسلم في صحيحه ۷۲۵/۲ حديث رقم (۱۱۸-۱۰٤۹) اخرجه الترمذي ٦٦٨/٥ حديث رقم ۳۸۹۸ وابن ماجه في السنن ۱٤۱٥/۲ حديث رقم ٤۲۳٤ والدارمي في السنن ٤۱۰/۲ حديث رقم ۲۷۷۸ واحمد في المسند ۱۲۲/۳

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر (بالفرض والتقدیر) کسی انسان کے پاس (خزانوں سے بھرپور) دو وادیاں ہوں تب بھی یقیناً تیسری وادی کی تلاش میں رہے گا (یعنی انسان کی حرص وطمع کی درازی کا یہ عالم ہے کہ کسی بھی مقام پر پہنچ کر سیر نہیں ہو سکتا اور انسان کے پیٹ کو مٹی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی (یعنی جب تک وہ قبر میں جا کر نہیں لیٹ جاتا اس وقت تک اس کی حرص وطمع کا خاتمہ نہیں

ہوتا۔ تاہم یہ بات اکثر لوگوں کے اعتبار سے فرمائی ہے۔ ورنہ ایسے بندگانِ خدا بھی ہیں جن میں حرص وطمع کے ہونے کا سوال تو کجا' بقدرِ ضرورت مال واسباب کی بھی پرواہ نہیں کرتے) اور حق تعالیٰ شانہٗ جس بندہ کی توبہ چاہتا ہے قبول فرمالیتا ہے"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: لو كان لابن آدم واديان من مال لا بتغى ثالثا:

ایک روایت میں ہے: "من ذهب" کے الفاظ ہیں۔

یعنی ایک اور وادی جس میں ان دونوں سے زیادہ ذخیرہ ہو اسی طرح زیادہ سے زیادہ کی طلب ہوتی۔ جیسا کہ اس کی طرف اشارہ فرمایا۔

ولا يملا جوف ابن آدم الا التراب:

چنانچہ اس میں ایک بڑی تنبیہ اس بات پر ہے کہ بخل جو کہ انسان میں حرص پیدا کر دیتا ہے۔ انسان کی فطرت میں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے بارے میں قرآن کریم میں اس حدیث اور قول سے زیادہ بلیغ عبارت میں فرمایا:

﴿قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا﴾

[الاسراء - ۱۰۰]

"آپ فرما دیجئے کہ اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مختار ہوتے تو بھی تم خرچ کرنے کے اندیشہ سے ضرور ہاتھ روک لیتے اور آدمی ہے بڑا تنگدل"۔

یہ دلالت کرتا ہے کہ انسان کی حرص اور فقر کا خوف جو کہ بخل کرنے حتیٰ کہ اپنی ذات کیلئے بھی بخل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اُس پرندے کے خوف سے زیادہ ہے۔ جو کہ سمندر کے ساحل پر پیاس سے مرجاتا ہے۔ (پانی نہیں پیتا) کہ پانی ختم نہ ہو جائے اور اُس کیڑے کے خوف سے بھی زیادہ جس کی خوارک مٹی ہے اور وہ بھوک سے مرجاتا ہے۔ (مٹی نہیں کھاتا) کہ کہیں مٹی ختم نہ ہو جائے اسلئے کہ یہ پانی اور مٹی رب الارباب کی رحمت کے خزانوں کے مقابلہ میں اس طرح ہے۔ جیسا کہ بادل کے مقابلہ میں ایک قطرہ۔

قوله: ويتوب الله على من تاب:

یعنی گناہوں سے بچاؤ کی طلب کے ساتھ رجوع کرے یا اللہ دنیا کی محبت اور اللہ تعالیٰ سے غفلت سے توبہ کرنے والے کو توبہ کی توفیق دے۔ کر اور آخرت کے مصائب سے نجات دے کر اُس شخص پر فضل وکرم کرتا ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ انسان ہمیشہ دُنیا کی حرص کرتا ہے یہاں تک کہ مرجاتا ہے۔ اور اُس کا پیٹ قبر کی مٹی سے بھر جاتا ہے۔ اس حدیث میں دُنیا کی حرص انسانوں کے اکثر افراد کے اعتبار سے بتائی گئی ہے اس کی تائید "ويتوب الله على من تاب" سے ہوتی ہے۔ یہ قول پہلے والے قول سے متعلق ہے اور مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ انسان کے بُرے فعل حرص اور دوسرے نامناسب افعال سے توبہ کرنے کو قبول فرماتے ہیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ~~مطلب یہ ہے کہ~~ تمام انسانوں کو مال کی محبت کی فطرت پر پیدا کیا گیا ہے۔ اور ان کی

فطرت میں ہے کہ مال کو طلب کرنے کی کوشش کریں اور مال سے سیر نہ ہوں۔ سوائے اُن لوگوں کے جن کو اللہ نے (مال کی محبت سے) محفوظ رکھا اور اُنکو اپنے آپ سے یہ فطرت زائل کرنیکی توفیق دی۔ اور ایسے لوگ بہت کم ہیں اس بات کی جگہ "ویتوب اللہ علی من تاب) فرمایا اس بات کی طرف اشارہ کرنے کیلئے کہ انسان کے اندر پیدا کی گئی یہ طبیعت مذموم ہے۔ اور گناہ کے قائم مقام ہے۔ اور اس کا ازالہ ممکن ہے۔ مگر اللہ کی توفیق سے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿ومن یوق شح نفسه فأولئك هم المفلحون﴾ [الحشر۔۹] (اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں)۔ اللہ تعالیٰ نے شح اور حرص کی نسبت نفس کی طرف اس بات پر دلالت کرنے کیلئے کہ انسان کی طبیعت وفطرت میں بخل وحرص رکھا گیا ہے۔ اور اس حرص کو زائل کرنا۔ اللہ نے (یوق) سے بیان فرمایا۔ اور اس پر (فاولئك هم المفلحون) کو مرتب کیا۔

اس مقام پر ایک باریک نکتہ ہے۔ کیونکہ ابن آدم کو ذکر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ انسان مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی طبیعت میں سختی اور خشکی ہے اور اس کا ازالہ اس طرح ممکن ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنی توفیق کے بادلوں سے بارش برسائے اور اس کی وجہ سے پاکیزہ خصلتیں اور پسندیدہ اخلاق پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿والبلد الطیب یخرج نباته باذن ربه والذی خبث لا یخرج الا نکدا﴾ [الاعراف:۵۸] "اور جو ستھری سرزمین ہوتی ہے اس کی پیداوار تو خدا کے حکم سے خوب نکلتی ہے۔ اور جو خراب ہے اس کی پیداوار (اگر نکلی بھی) تو بہت کم نکلتی ہے۔"

چنانچہ جس کو توفیق نہ ملی اور اللہ نے اُس کو اور اُسکی حرص کو اپنے حال پر چھوڑا تو اُسمیں صرف حرص اور مال کی خواہش ہی بڑھتی چلی جائیگی۔ ارشاد نبوی "لا یملأ جوف ابن آدم" موضع رکوز جبلت میں واقع ہیں۔ اس فطرت کے مرکوز (مضبوط) ہونے کا بیان ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک عام اور وسیع تر حکم متعلق کیا گیا ہے۔ گویا کہ یوں کہا گیا۔ اور جس شخص کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ مٹی سے ہی سیر ہوگا۔ اور "یتوب اللہ علی من تاب" میں اس طبیعت سے واپس لوٹنے کا بیان ہے۔ یعنی کہ اس طبیعت کا زائل ہو جانا بہت مشکل ہے۔ مگر جس کیلئے اللہ آسان کردے۔ اُسکے لئے آسان ہے۔ چنانچہ حقیقت یہی ہے۔ کہ یہ بشر کا کلام نہیں۔ بلکہ تقدیر اور قوتوں کے خالق اللہ کا کلام ہے۔

امام ترمذی کے حوالے سے ابی بن کعب کی روایت ہم تک پہنچی ہے کہ رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے۔ کہ میں تجھے قرآن سناؤں چنانچہ حضور علیہ السلام نے [لم یکن الذین کفروا] [البینة:۱] تلاوت فرمائی اور اس میں یہ بھی پڑھا:"ان الدین عند اللہ الحنیفیة المسلمیة لا الیهودیة ولا النصرانیة ولاالمجوسیة ومن یعمل خیرا فلن یکفر"۔ "اللہ کے ہاں مقبول دین اسلام ہے۔ جس میں ایک اللہ کی طرف یکسوئی اور فرمانبرداری ہے۔ اور یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں ہے۔ جو نیک عمل کرے گا اُسکی نیکی کی ناقدری نہیں کی جائیگی)۔ اس کے بعد حضور علیہ السلام نے فرمایا:لوان لابن آدم وادیا من مال لایبتغی الیه ثانیا'ولو ان له ثانیالابتغی الیه ثالثا'ولایملأ جوف ابن آدم الا التراب'ویتوب اللہ علی من تاب (انتھی) اگر ابن آدم کے پاس مال ودولت سے بھری ہوئی۔ ایک وادی ہوتی تو دوسری وادی کو طلب کرتا اور دو وادیاں ہوتیں تو تیسری وادی کی تلاش میں رہتا۔ اور آدمی کے پیٹ کو مٹی کے علاوہ اور کوئی

چیز نہیں بھرتی اور اللہ تعالیٰ اُس شخص کی توبہ کو قبول فرماتا ہے جو توبہ کرتا ہے۔

امام میرک رحمۃ اللہ تصحیح سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حدیث "لو کان لا بن آدم وادیان..... الخ" کو امام بخاری نے انہی الفاظ کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی سند سے نقل کیا ہے۔ اور اس کے ہم معنی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی سند سے نقل کی ہے۔ اور مسلم نے انہی الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے۔ اور امام ترمذی نے بھی اس کی ہم معنی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے نقل کی ہے اور ایک حدیث سے ثابت ہے۔ کہ یہ قرآن تھا۔ پھر اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی۔ اس بات کو امام احمد اور دوسروں نے نقل کیا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے۔ کہ نہ معلوم یہ بات آسمان سے نازل ہوئی تھی۔ یا رسول فرماتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں۔ کہ ہم اس کو قرآن کا حصہ سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ (الھاکم التکاثر) نازل ہوئی۔ اس بات کو امام بخاری نے نقل کیا ہے، انتہیٰ۔

جامع میں الفاظ اس طرح ہیں: "لو کان لابن آدم واد من مال لابتغی الیه ثانیا ولو کان له وادیان لابتعی لهما ثالثا، ولا یملأ جوف ابن آدم الا التراب، ویتوب الله علی من تاب".

اس کو امام احمد، شیخین اور امام ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، اور امام احمد اور شیخین نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے، اور امام بخاری نے ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے اور نسائی نے ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے اور امام احمد نے ابی واقد سے، امام بخاری نے اپنی تاریخ میں، اور بزار نے بریدۃ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

امام احمد اور ابن حبان نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

"لو کان لابن آدم واد من نخل لتمنی مثله ثم تمنی مثله حتی یتمنی اودیة ولا یملا جوف ابن آدم الا التراب".

۵۲۷۴: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَعْضِ جَسَدِيْ فَقَالَ كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْعَابِرُ سَبِيْلٍ وَعُدَّ نَفْسَكَ مِنْ اَهْلِ الْقُبُوْرِ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۳۳/۱۱ حدیث رقم ۶۴۱۶ والترمذی فی السنن ۴۹۰/۴ حدیث رقم ۲۳۳۳ وابن ماجه ۱۳۷۸/۲ حدیث رقم ۴۱۱۴ واحمد فی المسند ۲۴/۲

ترجمہ: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ (ایک روز) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے جسم کے کسی حصہ (یعنی دونوں مونڈھوں) کو پکڑ کر ارشاد فرمایا" تم دنیا میں یوں گزر بسر کرو گویا کہ تم مسافر ہو یا راہ گیر ہو اور تم خود کو قبروں والوں میں سے شمار کیا کرو۔ (بخاری)

تشریح: قوله: أخذ رسول الله ﷺ ببعض جسدی:

جیسا کہ ایک روایت "بمنکبی" میں کا لفظ وارد ہے۔ ان کا شانہ پکڑ کر یہ بات ارشاد فرمانے میں یہ نکتہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنے قریب کر دیا۔ اور اُن کی طرف متوجہ ہوگئے تا کہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ وہ بات جو حضور علیہ السلام

فرمارہے ہیں۔ اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ یہ اللہ کی پسندیدہ حالت اللہ کی توفیق سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

قولہ: کن فی الدنیا کانك غریب:

یعنی لوگوں کے درمیان کیونکہ تمہاری ان کے ساتھ موانست نہ رہے گی اور اُنکے ساتھ بیٹھنا کم ہوگا۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کی طرف مائل نہ ہو اور اس کو اپنا وطن اور ٹھکانہ نہ سمجھ اور دنیا کی صرف اتنی چیزوں سے تعلق رکھو۔ جتنی چیزوں سے مسافر اجنبی شہر میں تعلق رکھتا ہے۔ انتہیٰ۔

یہ اسلئے کہ دنیا ایک گزرگاہ ہے' ایک پُل ہے۔ جس پر گزرنا ہے۔ چنانچہ مؤمن کیلئے مناسب ہے کہ عبادت اور طاعت میں مشغول رہے۔ اور ہر آن ہر گھڑی اس دنیا سے کوچ کرنے کا انتظار کرے اور ظلم اور حرام کے ارتکاب پر ہیز کر کے سفرِ آخرت کے اسباب کو اختیار کرے حقیقی وطن کا شوق رکھے۔ اور دنیا کے سفر میں اتنی اشیاء پر قناعت کرے۔ جس سے ضرورت پوری ہو اور عزت نفس باقی رہے۔ اور اپنے اس سفر میں آنے والی مصائب کا مقابلہ کرے۔ اور بے فائدہ لمبی اُمیدوں اور زیادہ حرص میں مشغول نہ ہو۔

قولہ: اوعابر سبیل: او: تنویع کیلئے ہے۔ یا بل کے معنی میں ہے' جو ترقی کیلئے آتا ہے۔ اور معنی یہ ہے۔ کہ بلکہ اس طرح رہو جیسے راہ چلتا مسافر کہ وہ چلتے ہوئے راستہ طے کرتا ہے۔ اگرچہ ساتھیوں کے بغیر ہو اور اس تعبیر میں غریب کے لفظ کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے۔ کیونکہ اجنبی مسافر تو پھر بھی دوسرے علاقے میں کچھ آرام کر لیتا ہے۔ اور ایک وقت تک ٹھہر کر ستا لیتا ہے۔ کتنی خوش نصیب ہے۔ وہ جماعت جس نے اپنے مولیٰ کی ملاقات کے شوق میں دنیا کو ترک کر دیا۔ اور آخرت کی طرف مکمل متوجہ ہو گئے ہیں۔ اور لوگوں سے منقطع ہو گئے ہیں۔ کیونکہ لوگوں کے ساتھ دل لگانا انسان کی (اعمال کے اعتبار سے) ناداری کی علامت ہے۔ اور یہ لوگ دنیا کے ساز وسامان اور لباس سے خالی ہو چکے ہیں۔ بلکہ ننگے پیر، ننگے بدن اور چھلے سر ہو چکے ہیں۔ حالانکہ یہی لوگ عقلمند، سمجھدار ہیں۔ ان کی فضیلت حد اور اندازے سے بڑھ گئی ہے۔

ان لله عبادا فطنا ○ طلقوا الدنیا وخافوا الفتنا

اللہ کے کچھ بندے بڑے سمجھدار ہیں۔

جنہوں نے دنیا کو چھوڑ دیا۔ اور دنیا کے فتنوں سے ڈر گئے۔

نظروا فیها فلما عرفوا

انها لیست لحی وطنا

اُنہوں نے دنیا میں غور کیا۔ پس جب وہ سمجھ گئے کہ یہ دنیا کسی زندہ کیلئے ٹھکانہ نہیں ہے۔

جعلوها لجة واتخذوا

صالح الاعمال فیها سفنا

اُنہوں نے دنیا کو ایک سمندر سمجھا اور نیک اعمال کو اپنے لئے کشتیاں بنالیا۔

قولہ: وعد نفسك في أهل القبور:

عد: عین کے ضمہ اور دال مشدد کے فتحہ کے ساتھ (جار مجرور کا متعلق محذوف ہے۔) ای "عدها كا ئنة أو

ساکنۃ فیھم" اور ایک صحیح شدہ نسخہ میں "من اھل القبور" کے الفاظ ہیں یعنی تو اپنے آپ کو اُن میں سے ایک فرد شمار کر۔ چنانچہ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف: "موتوا قبل ان تموتوا" موت سے پہلے مر جاؤ' اور اپنا حساب کر و اس سے پہلے کہ تمہارا حساب کیا جائے۔

قولہ: رواہ البخاری: امام میرک فرماتے ہیں یہ بات محل نظر ہے۔ اسلئے کہ مذکور الفاظ جامع ترمذی کے ہیں' امام بخاری نے ابن عمرؓ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: "اخذ رسول اللہ ﷺ بمنکبی فقال: کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل" بخاری میں "عدنفسک فی اھل القبور" کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ یہ الفاظ ترمذی اور بیہقی میں ہیں۔ واللہ تعالٰی اعلم وحکم۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ جامع میں ہے: کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل، اس کو بخاری نے ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔ امام احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے "عد نفسک من اھل القبور" کی زیادت نقل کی ہے۔

امام نووی نے اربعین میں یہ اضافہ نقل کیا ہے: وکان ابن عمر رضی اللہ تعالٰی عنھما یقول: اذا أمسیت فلا تنتظر الصباح' واذا صحبت تنتظر المساء وخذ من صحتك لمرضك وخذ من حیاتك لموتك۔ کہ ابن عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ جب تجھ پر شام آجائے تو صبح کا انتظار نہ کر اور جب صبح ہو جائے تو شام کا انتظار نہ کر اور اپنی صحت کے زمانہ سے اپنی بیماری کے زمانہ کیلئے (اعمال کا) حصہ حاصل کر اور زندگی سے موت (کے بعد) کیلئے (اعمال کا) توشہ حاصل کر۔ امام غزالی نے اپنی اربعین میں یہ زیادت نقل کی ہے: فانك یا عبد اللہ لا تدری ما اسمك غدا" کہ "اے اللہ کے بندے! تجھے یہ نہیں معلوم کہ کل کو تیرا نام کیا ہوگا' اور حدیث کے شروع کے حصہ کو مرفوعاً یوں نقل کیا ہے: قال رسول اللہ ﷺ لعبد اللہ بن عمر: اذا أصحبت ...... واللہ تعالٰی اعلم

الفصل الثانی:

۵۲۷۵: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ مَرَّ بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَا وَاُمِّی نَطِّیْنُ شَیْئًا فَقَالَ مَا هٰذَا یَا عَبْدَ اللّٰهِ قُلْتُ شَیْءٌ نُصْلِحُهٗ قَالَ الْاَمْرُ اَسْرَعُ مِنْ ذٰلِكَ (رواہ احمد والترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

اخرجہ ابوداؤد فی السنن ۴۰۱/۵ حدیث رقم ۵۲۳۶ والترمذی فی السنن ۴۹۱/۴ حدیث رقم ۲۳۳۵ وابن ماجہ فی السنن ۱۳۹۳/۲ حدیث رقم ۴۱۶۰ واحمد فی المسند ۱۶۱/۲۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ (ایک روز) میں اور میری والدہ گارے سے کسی چیز کو (یعنی اپنے مکان کی دیواروں یا چھت کو) مٹی کا لیپ کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ہمارے پاس سے ہوگیا' آپ ﷺ نے (ہمیں اس حالت میں دیکھ کر) دریافت فرمایا کہ عبداللہ یہ کیا ہے (یعنی لیپ پوت کیوں کر رہے ہو؟) میں نے عرض کیا کہ اس چیز (یعنی دیواروں یا چھت) کی درستی و مرمت کر رہے ہیں (یا اس کو مضبوط کرنا مقصود ہے) حضور ﷺ نے فرمایا: "امر یعنی موت اس سے بھی زیادہ جلد آجانے والی ہے۔ اس حدیث کو احمدؒ و ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث غریب ہے"۔

تشریح: عبداللہ بن عمرو: ''عمرو واؤ کے ساتھ ہے

تطین: یائے مکسورہ کی تشدید کے ساتھ۔

فقال ماھذا یعنی گارا کیوں استعمال کر رہے ہو۔

قولہ: قال: الامر اسرع من ذالك یعنی امر (موت) اس مکان کی خرابی کی مرمت اور درستگی سے زیادہ جلدی آنے والی ہے۔ سوچا ہیے کہ موت کے بعد والی زندگی کی درستگی کی جائے اور پہلی قوموں کی تعمیرات سے عبرت حاصل کیجائے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اپنے مکان کی مرمت کرنا اشد ضرورت کے تحت نہیں تھا۔ بلکہ عمارت کی مزید مضبوطی کے خیال سے یا آرائش کے خیال سے مرمت کرتے تھے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ہمارا دنیا میں راہ چلتے مسافر کی طرح رہنا اور اُس سوار کی طرح رہنا جو ایک درخت کے سایہ میں ستانے کیلئے تھوڑی دیر ٹھہرے۔ تعمیر میں مشغول ہونے کی بنسبت زیادہ بہتر ہے۔ شارح رحمہ اللہ فرماتے ہیں معنی یہ ہے کہ موت اس مکان کے خراب ہونے سے زیادہ قریب ہے۔ یعنی تم اپنے مکان کی مرمت اسلئے کر رہے ہو۔ کہ کہیں یہ مکان تیرے مرنے سے پہلے گر نہ جائے۔ جبکہ ہو سکتا ہے۔ کہ تم ہی مکان کے گر جانے سے پہلے موت کے نیچے میں آ جاؤ۔ چنانچہ اعمال کی دُرستگی اس مکان کی درستگی سے زیادہ اہم ہے۔

قولہ: رواہ احمد، والترمذی وقال ھذا حدیث غریب:

امام میرکؒ منذریؒ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو کی حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور ابن حبان اور ابن ماجہ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ اور سید جمال الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ مجھے جامع ترمذی میں نہیں ملی۔ لیکن ان کے الفاظ کے ساتھ مل گئی ہے: **قال: مر علینا رسول اللہ ﷺ ونحن تعالج خصاً لنا قال ماھذا قلنا قدر وھی فنحن نصلح' فقال ماأری الأمر الا أعجل من ذلك ۔وقال: ھذا حدیث صحیح حسن۔** عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں۔ کہ ایک دن حضور علیہ السلام ہمارے پاس سے گزرے جبکہ ہم اپنے جھونپڑے کی مرمت کر رہے تھے۔ فرمایا: یہ کیا؟ ہم نے عرض کیا کہ یہ کمزور ہو گیا ہے۔ فرمایا میں موت کو اس سے زیادہ جلدی آنے والا سمجھتا ہوں۔ امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث صحیح حسن ہے۔

۵۲۷۶: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ كَانَ يُهْرِيْقُ الْمَآءَ فَيَتَيَمَّمُ بِالتُّرَابِ فَاَقُوْلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ الْمَآءَ مِنْكَ قَرِيْبٌ يَقُوْلُ مَايُدْرِيْنِىْ لَعَلِّىْ لَااَبْلُغُهٗ. (رواہ فی شرح السنۃ وابن الجوزی فی کتاب الوفآء)

اخرجہ البغوی فی شرح السنۃ ۲۳۲/۱۴ حدیث رقم ۴۰۳۱ واحمد فی المسند ۲۸۸/۱

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ (کبھی یوں بھی ہوتا کہ) رسول اللہ ﷺ حاجت سے فراغت کے بعد (اور وضو کرنے سے قبل) مٹی سے تیمم کر لیتے' میں (یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ دیکھ کر) درخواست کرتا کہ یا رسول اللہ ﷺ! پانی تو آپ ﷺ کے بہت نزدیک ہے؟ (یعنی جب پانی آپ ﷺ کی قدرت اور پہنچ سے اتنا دور نہیں ہے کہ وضو نہ کیا جا سکے تو پھر تیمم کیوں فرما رہے ہیں؟) حضور ﷺ (میری اس بات کے جواب میں) فرماتے مجھے یقینی

علم نہیں ہے (کہ میں اس تک پہنچنے تک زندہ رہ سکوں گا یا نہیں لہٰذا ممکن ہے کہ) شاید میں اس تک نہ پہنچ سکوں" اس روایت کو بغوی نے شرح السنۃ میں اور ابن جوزی نے کتاب الوفاء میں نقل کیا ہے"۔

تشریح: الماء: پیشاب سے کنایہ ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ بعض اوقات جب حضور علیہ السلام پیشاب کرتے تو فیتیمم بالتراب، جو چیز مٹی کے قائم مقام ہو۔ اسلئے کہ یہ بات ثابت ہے۔ کہ آپ علیہ السلام نے تیمم کیلئے صرف دیوار پر ہاتھ رکھنے پر اکتفا کیا۔ جبکہ دیوار پر غبار نہیں تھا۔

یقول: جملہ مستانفہ ہے

ما یدرینی: ما استفہام کیلئے ہے۔

میں پانی تک پہنچ نہ سکوں کیونکہ موت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ موت کے وقت باطنی اور ظاہری دونوں طرح پاک رہوں۔ اور اشرف کی بات صحت سے کتنی دور اور ضعف کے کتنی قریب ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو ایسے معنی پر محمول کیا ہے جو اس باب اور الفاظ سے مناسبت نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے۔ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وقت سے پہلے پانی استعمال کرتے تھے۔ جب پانی ختم ہو جاتا۔ تو تیمم کرتے۔ واللہ اعلم۔

قولہ: رواہ البغوی فی شرح السنۃ وابن الجوزی فی کتاب الوفا: "الوفاء" علامہ ابن جوزی کی کتاب ہے۔ میرے خیال کے مطابق کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کے بیان میں ہے۔

۵۲۷۷: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هٰذَا ابْنُ اٰدَمَ وَهٰذَا اَجَلُهٗ وَوَضَعَ يَدَهٗ عِنْدَ قَفَاهُ ثُمَّ بَسَطَ فَقَالَ وَثَمَّ اَمَلُهٗ. (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤٩١/٤ حدیث رقم ٢٣٣٤ ابن ماجه فی السنن ١٤١٤/٢ حدیث رقم ٤٢٣٢ واحمد فی المسند ٢٥٧/٣۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "یہ تو ابن آدم (انسان) ہے اور یہ اس کی موت ہے یہ فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ اپنی گدی کے قریب رکھا (یعنی پہلے تو ایک جگہ اشارہ کر کے بتایا کہ یہ انسان ہے اور پھر اس جگہ سے کچھ پیچھے کی طرف ہاتھ ہٹا کر بتایا کہ یہ اس کی موت ہے) اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کو دراز فرمایا اور دور اشارہ کر کے) فرمایا کہ اس جگہ انسان کی آرزو ہے (یعنی انسان کی موت اس کی تمناؤں کی تکمیل سے بہت زیادہ اس کے قریب ہے)"۔

تشریح: قولہ: هذا ابن آدم هذا اجلة بظاہر آپ علیہ السلام نے معنوی وجود کی طرف ظاہری (حسی) اشارہ فرمایا اس کی وضاحت یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنے سامنے زمین کے حصے میں یا ہوا میں لمبائی اور چوڑائی میں اپنے دست مبارک سے اشارہ کیا۔ اور فرمایا یہ انسان ہے۔ پھر اپنے ہاتھ مبارک کو پیچھے ہٹایا۔ اور جس جگہ پہلے اشارہ فرمایا تھا۔ اُسکے قریب ہی ہاتھ رکھ اشارہ کیا اور فرمایا یہ انسان کی موت ہے۔

قولہ: ووضع یدہ عند قفاہ الخ: اور یہ بات (یہ انسان ہے۔ اور یہ اُسکی موت ہے) کرتے ہوئے ہاتھ کی اُنگلیاں

کھول کر ہاتھ پھیلایا تا کہ اپنی ہتھیلی اور اُنگلیوں سے اشارہ فرمائیں یا یہ مطلب ہے کہ جہاں آپ نے پہلے موت کی طرف اشارہ کیا تھا اُس جگہ سے ہاتھ کو آگے تک لمبا کر لیا۔

ثم: ثاء کے فتحہ اور میم کی تشدید کے ساتھ اختصاص اور اہتمام کیلئے۔ان عبارات اور اعتبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اشارے جن کو بشارتوں سے تائید حاصل ہے اور قولی و فعلی حرکات و سکنات سے مؤکد ہیں۔اور گزشتہ تصورات کے مطابق ہیں۔ یہ ایک معنوی اشارے ہیں۔ جو انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرتے ہیں۔اور یہ بیان کرتے ہیں۔ کہ انسان کی موت اس کی آرزوؤں سے زیادہ قریب ہے۔اور انسان کے آرزو انسان کی موت سے زیادہ دُور ہے۔ کسی نے کیا ہی خوب کہا ہے:

كل امرى مصبح في اهله
والموت ادنى من شراك نعله

ہر شخص اپنے گھر والوں کے ساتھ صبح کا وقت گزارتا ہے۔ جبکہ موت جوتے کے تسمہ سے اس کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔

اس مقام میں مقصود کی اتنی ہی وضاحت مجھے سمجھ آئی ہے۔علامہ طیبی رحمہ اللہ دوسرے تمام شراح کی بنسبت علیحدہ بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''وضع یدہ'' میں واؤ حالیہ ہے اور ''وھذا اجلہ'' میں واؤ مطلق جمع کیلئے ہے۔ چنانچہ مشارالیہ بھی مرکب ہوگا۔ چنانچہ پیچھے ہاتھ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ انسان کہ موت جس کے پیچھے پیچھے رہتی ہے وہ مشارالیہ ہے۔ اور ہاتھ پھیلانے سے مراد آگے کی طرف ہاتھ پھیلانا ہے۔[انتہیٰ الکلام]۔

۵۱۷۸: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ غَرَزَعُوْدًا بَیْنَ یَدَیْہِ وَاٰخَرَ اِلٰی جَنْبِہٖ وَاٰخَرَ اَبْعَدَ فَقَالَ اَتَدْرُوْنَ مَاھٰذَا قَالُوْا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ ھٰذَا الْاِنْسَانُ وَھٰذَا الْاَجَلُ اُرَاہُ قَالَ وَھٰذَا الْاَمَلُ فَیَتَعَاطَی الْاَمَلَ فَلَحِقَہُ الْاَجَلُ دُوْنَ الْاَمَلِ. (رواہ فی شرح السنۃ)

اخرجه البغوى فى شرح السنة ٢٨٦/١٤ حديث رقم ٤٠٩٣ وابن ماجه ١٤١٤/٢ حديث رقم ٤٢٣٢ واحمد في المسند ١٨/٣۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اپنے سامنے ایک لکڑی (زمین میں) نصب فرمائی اور ایک دوسری لکڑی کے پہلو میں گاڑ دی' پھر ایک اور لکڑی (دونوں لکڑیوں سے یا دوسری لکڑی سے) کافی دور جگہ پر گاڑ دی اور پھر دریافت فرمایا: ''تمہیں معلوم ہے کہ یہ کیا ہے؟ (یعنی ان لکڑیوں سے کیا مراد ہے اور یہ کس چیز کی مثالیں ہیں؟) صحابہؓ نے عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں؟ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ''(سنو!) یہ (پہلی لکڑی (گویا) انسان ہے' یہ (دوسری لکڑی) گویا) اس انسان کی موت ہے) جو انسان کے اتنے ہی نزدیک ہے جتنا کہ یہ دوسری لکڑی پہلی لکڑی کے قریب ہے۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے کہ اس کے بعد حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے یہ فرمایا: ''اور یہ (تیسری) لکڑی کہ جسے کافی فاصلے پر نصب کیا گیا ہے گویا) اس (انسان) کی آرزو ہے (جو اس سے بہت دور ہے) پس انسان اپنی تمنا اور آرزو کی تکمیل کی فکر میں لگا رہتا ہے (اور اپنا وقت اس سعی میں صرف کرتا رہتا ہے کہ موت سے پہلے آرزو کو پورا کرلے مگر ہوتا یہ ہے) کہ اس کی موت' اس کی آرزو کے پورا ہونے سے پہلے ہی اس پر حملہ آور ہو جاتی ہے''۔ (شرح السنۃ)

تشریح: قولہ: ان النبی ﷺ غرز ۔۔۔۔قالوا :اللہ ورسولہ اعلم:

ان النبی: اور ایک صحیح نسخہ میں "ان رسول اللہ" کے الفاظ ہیں۔

أراہ: ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ یعنی راوی کہتے ہیں میرا گمان ہے۔

"فلحقہ الاجل: اس مضمون کو مضارع کی بجائے ماضی سے تعبیر کیا اس حالت کے وقوع کے تحقق میں مبالغہ کیلئے۔

دون الامل: یعنی آرزو حاصل کرنے اور اپنے اُس کام کو پورا کرنے سے پہلے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "دون الامل" "لحقہ" کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔ یعنی یہ انسان اپنے مقصود کی اُمید سے تجاوز کر جاتا ہے۔ اُمیہ کہتا ہے:

یا نفس مالك من دون اللہ من واقی،

"اے نفس اللہ کے سوا کوئی اور تجھے بچانے والا نہیں ہے۔"

۵۲۷۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عُمْرُ اُمَّتِیْ مِنْ سِتِّیْنَ سَنَةً اِلٰی سَبْعِیْنَ.

(رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

اخرجہ الترمذی فی السنن ۴/ ۴۸۹ حدیث رقم ۲۳۳۱۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میری امت (کے افراد) کی عمر ساٹھ سال سے ستر سال تک ہے"۔ اس روایت کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے"۔

تشریح: بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری اُمت کے آخری عمر کی ابتدا ساٹھ سے ہوگی۔ اور انتہاء ستر برس پر ہوگی۔ اور بہت کم افراد ایسے ہونگے جن کی عمر ستر سال سے تجاوز کرے۔ اور یہ بات اکثریت کے اعتبار سے ہے۔ کیونکہ حال اس پر شاید ہے۔ اسلئے کہ بعض لوگ ایسے ہیں۔ جن کی عمر ساٹھ برس تک نہیں پہنچتی اور بعض ایسے ہیں۔ کہ جن کی عمر ستر سال سے تجاوز کر جاتی ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے یہ بات ذکر کی ہے۔

اس میں یہ بات محل نظر ہے کہ یہ بات تو اچھی طرح واضح ہے۔ کہ زیادہ سے زیادہ عمر کا ستر برس ہونا اکثریت کے اعتبار سے ہے۔ لیکن اُمت کی آخری عمر کا ساٹھ برس تک پہنچنا۔ بہت زیادہ عجیب بات ہے۔ اور مشاہدہ کے مخالف ہے۔ چنانچہ بظاہر مطلب یہ ہے۔ کہ ساٹھ اور ستر برس کے درمیان کی عمر وہ بہترین، متوسط اور معتدل عمر ہے۔ جس میں اس اُمت کے اکثر افراد وفات پاتے ہیں۔ اور اس عمر میں فوت ہونے والوں میں سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام، بڑے خلفاء مثلاً ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم اور دوسرے وہ علماء اور اولیاء شامل ہیں جن کا احاطہ دشوار اور اُن کی عدد معلوم کرنا مشکل ہے۔

۵۲۸۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَعْمَارُ اُمَّتِیْ مَابَیْنَ السِّتِّیْنَ اِلَی السَّبْعِیْنَ وَاَقَلُّهُمْ مَنْ یَّجُوْزُ ذٰلِكَ. (رواہ الترمذی وابن ماجۃ وذکر حدیث عبد اللہ ابن الشخیر فی باب عیادۃ والمریض)

أخرجہ الترمذی فی السنن ۵/ ۵۱۷ حدیث رقم ۳۵۵۰ وابن ماجہ ۲/ ۱۴۱۵ حدیث رقم ۴۲۳۶

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میری اُمت کے زیادہ تر افراد کی

عمریں ساٹھ اور ستر سال کے درمیان ہوں گی اور میری اُمت میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگی جو اس (ستر سال) سے تجاوز کر جائیں (اور ان کی عمر سو یا سو سال سے بھی زائد ہو) (ترمذی' ابن ماجہ) اور حضرت عبداللہ بن شخیرؓ کی روایت باب عیادۃ المریض میں مذکور ہے۔

تشریح: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ حضرات رحمہم اللہ میں زیادہ عمر والے جو ہمارے علم میں ہیں' اُن میں سے حضرت انس بن مالکؓ ہے۔ جو ایک سو تین برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ اور اسماء بنت ابی بکر ہیں جنہوں نے سو سال کی عمر پائی اور اس عمر میں بھی نہ تو اُن کا کوئی دانت گرا یا ٹوٹا اور نہ ہی عقل وحواس میں اختلال پیدا ہوا۔ اور ان دونوں حضرات سے حسان بن ثابتؓ کی عمر زیادہ تھی جن کی وفات ایک سو بیس سال کی عمر میں ہوئی۔ ابتدائی ساٹھ برس کفر میں گزارے اور پھر ساٹھ برس ایمان واسلام کی حالت میں گزارے اور ان سے بھی زیادہ عمر سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی تھی۔

بعض فرماتے ہیں کہ ان کی وفات ڈھائی سو سال کی عمر میں ہوئی۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ ان کی عمر ساڑھے تین سو سال تھی۔ لیکن پہلا قول صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے وفات کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے اسلام کی حالت میں اپنی زندگی کا تھوڑا سا حصہ گزارا ہے۔ اسلئے کہ مؤلف نے یہ فرمایا ہے۔ کہ ان کا انتقال مدائن میں (شاید) ایک سو پینتیس سال میں ہوا۔ ہماری اپنے بزرگ زکریا رحمہ اللہ سے ملاقات ہوئی ہے۔ اور اُن کا درس سنا ہے جبکہ اُن کی عمر ایک سو بیس برس تھی۔

تخریج: اس حدیث کو ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔

ابن ربیع فرماتے ہیں کہ ابن حبان اور حاکم نے اس روایت کی تصحیح کرتے ہوئے فرمایا یہ حدیث صحیح ہے اور مسلمؒ کی شرط پر ہے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث "حسن: غریب" ہے۔

امام احمد اور امام ترمذی نے مرفوعاً نقل کیا ہے "معترك المنايا ما بين الستين الى السبعين" (انتہی)۔ لیکن الجامع میں اس حدیث کو حکیم ترمذیؒ کی طرف منسوب کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

قوله: وذكر حديث عبد الله بن الشخير في باب عيادة المريض:

شین کے کسرہ اور خاء مشددہ کے ساتھ' ماقبل میں "شخیر" کو الف لام کے بغیر ضبط کیا گیا ہے۔

اس حدیث کو دوسری فصل کے آخر میں ذکر کیا ہے اور وہ روایت یہ ہے: قال قال رسول الله ﷺ: مثل ابن آدم اى صوروالى جنبه تسع وتسعون منية 'اى مهلكة۔ان اخطئته المنا يا وقع في الهرم حتى يموت ۔ (انتہی) اس روایت کی مناسبت گذشتہ فصل کی بنسبت اس فصل سے زیادہ ہے"۔

الفصل الثالث:

۵۲۸۱ : وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَوَّلُ صَلَاحِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الْيَقِيْنُ وَالزُّهْدُ وَاَوَّلُ فَسَادِهَا الْبُخْلُ وَالْاَمَلُ ۔ (رواه البيهقي في شعب الايمان)

رواه البيهقي في شعب الايمان ۴۲۷/۷ حديث رقم ۱۰۸۴۴۔

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس امت کی پہلی نیکی (آخرۃ کا) یقین کرنا اور دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنا ہے اور اس امت کا پہلا فساد بخل اور دنیاوی زندگی کی درازی کی آرزو کرنا ہے''۔ (بیہقی)

تشریح: البخل با کے ضمہ اور خا کے سکون کے ساتھ اور با اور خاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ بھی ہے۔ اور یہ زیادہ مناسب ہے۔ تاکہ ''والامل'' کے ہم وزن ہو جائے۔

اَمل کا معنی ہے موت اور قیامت کے جلدی آنے سے غفلت میں رہنا اور بخل دُنیا کی محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور حسن بصریؒ کے قول کا مطلب اس حدیث کے قریب قریب ہے۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔ کہ انسان کے دین کی مضبوطی طمع سے بچنا ہے۔ اور دین کا فساد طمع ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یقین سے مراد یہ ہے۔ کہ یہ اعتقاد رکھے کہ رزق پہنچانے والا اور رزق کا ضامن و متکفل اللہ ہی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وما من دابة في الارض الا على الله رزقها﴾۔ چنانچہ جس شخص کو یہ یقین حاصل ہو گیا اور دنیا سے بے رغبتی رکھے۔ تو نہ لمبی اُمید اور آرزو رکھے گا۔ اور نہ بخل کریگا۔ کیونکہ بخیل مال اسلئے خرچ نہیں کرتا۔ کہ لمبی آرزوئیں ہوتی ہیں۔ اور اللہ کی رزاقیت کا یقین نہیں ہوتا۔

امام اصمعیؒ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں۔ کہ میں نے ایک دیہاتی شخص کے سامنے سورہ الذاریات پڑھنی شروع کی۔ جب میں اس آیت پر پہنچا: ﴿وفي السماء رزقكم وما توعدون﴾ [الذاریات۔۲۲] ترجمہ: اور تمہارا رزق اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے سب آسمان میں ہے''۔ تو اس دیہاتی نے کہا بس کافی ہے۔ اور پھر وہ اپنی اُونٹنی کی طرف بڑھا اپنی اُونٹنی کو ذبح کیا۔ اور گوشت کاٹ کر تمام آنے جانے والوں میں تقسیم کیا۔ اس کے بعد اپنی تلوار اور کمان کی طرف بڑھا اور ان کو توڑ ڈالا اور چلا گیا۔ بیت اللہ کے طواف کے دوران اُس شخص سے ملا۔ اس کا بدن بالکل سوکھ گیا تھا اور رنگ زرد ہو گیا تھا۔ اُس نے مجھ کو دیکھ کر سلام کیا اور کہنے لگا کہ وہی سورت پھر پڑھئے۔ چنانچہ میں سورت پڑھتے ہوئے جب اُسی آیت پر پہنچا تو اُس نے ایک چیخ ماری اور کہا: قد وجدنا ماو عدنا ربنا حقا، اس کے بعد مجھ سے کہا کہ کیا اس کے علاوہ سورت پڑھ کر سناؤ گے۔ اس پر میں نے: [فورب السماء والارض انه لحق] [الذاریات۔۲۳] ''تو قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی کہ وہ برحق ہے''۔ تلاوت کی تو اس نے یہ آیت سن کر پھر چیخ ماری اور کہنے لگا۔ اے اللہ پاک ہے۔ وہ کون بد بخت ہے جس نے اللہ تعالیٰ جیسی جلیل ذات کو اتنا غصہ دلایا کہ اللہ کو قسم کھانا پڑی جس نے اللہ کے وعدوں پر یقین نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ کو قسم اُٹھا کر یقین دلانا پڑا۔ یہ جملے تین مرتبہ بولے۔ اور اس کے ساتھ ہی روح پرواز کر گئی۔

۵۲۸۳ : وَعَنْ سُفْيَانِ الثَّوْرِيِّ قَالَ لَيْسَ الزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا بِلُبْسِ الْغَلِيْظِ وَالْخَشِنِ وَاَكْلِ الْجَشِبِ اِنَّمَا الزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا قِصَرُ الْاَمَلِ ۔ (رواه في شرح السنة)

اخرجه البغوي في شرح السنة ۲۸٦/۱٤

ترجمہ: ''حضرت سفیان ثوریؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''دنیا سے بے رغبتی اس کا نام نہیں ہے کہ موٹے

جھوٹے اور سخت کپڑے اوڑھ لئے جائیں اور روکھا سوکھا اور بدمزہ کھانا کھالیا جائے بلکہ دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنا درحقیقت آرزوؤں اور امیدوں کی کمی کا نام ہے"۔ (شرح السنۃ)

تشریح: الغلیظ کاٹتے میں۔

الخشن: خاء کے فتحہ اور شین کے کسرہ کے ساتھ

الجشب: جیم کے فتحہ اور شین کے کسرہ کے ساتھ یعنی موٹا اور بدمزہ کھانا، بعض کا کہنا ہے کہ "جشب" کا معنی ہے بغیر سالن کی روٹی۔

قوله:انما الزهدفي الدنيا قصر الامل:

قصر: قاف کے کسرہ اور صاد کے فتحہ کے ساتھ' اور ایک نسخہ میں قاف کے ضمہ اور صاد کے سکون کے ساتھ ہے۔ یعنی اُمیدوں کو کم کرنا اور علم وعمل اور توبہ کی طرف متوجہ ہو کر موت کی تیاری کرنا۔ حاصل یہ کہ حقیقی زُھد دل کی اُس حالت کا نام ہے۔ جس میں دل دُنیا سے بیزار ہو جائے۔ اور آخرت کی طرف مکمل طور پر متوجہ اور راغب ہو جائے۔ اور زُھد کا مدار اس بات پر نہیں ہے۔ کہ انسان کا بدن دنیاوی چیزوں سے نفع اُٹھاتا ہے۔ یا نہیں کیونکہ حقیقت کے اعتبار سے زُھد کے معاملہ میں یہ دونوں باتیں برابر ہیں۔ اگر چہ لباس کا پھٹا پرانا ہونا اور کھانے کی بدمزگی اور کمی سلوک وطریقت کی راہ میں بندے کی استقامت کو تقویت دیتی ہے۔ حاصل یہ کہ دل میں دُنیا کی محبت کا ہونا۔ انسان کیلئے انتہائی مہلک ہے۔ اور صرف انسانی بدن پر دنیاوی جائز نعمتوں کا ہونا۔ انسان کیلئے کوئی مُضر نہیں۔ دل کی مثال کشتی کی سی ہے۔ اگر پانی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو تشبیہ دی ہے: ﴿انما مثل الحياة الدنيا كماء انزلناه من السماء﴾ [یونس۔۲٤] "پس دنیوی زندگی کی حالت تو ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا۔"

کشتی کے اندر آجائے تو کشتی کو اس میں بیٹھے ہوئے سواروں سمیت ڈبو دیتا ہے۔ اور اگر یہی پانی کشتی کے باہر کشتی کے اردگرد رہتا ہے تو کشتی کو رواں رکھتا ہے اور منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی لئے حضور علیہ السلام نے فرمایا: **نعم المال الصالح للرجل الصالح۔** کہ بہت اچھی چیز ہے۔ وہ حلال مال جو نیک شخص کے پاس ہو (جائز امور میں خرچ کرتا ہو) اسی وجہ سے صوفیاء کی ایک جماعت اسی طرح کا لباس پہنا کرتے تھے۔ جیسا کہ عام طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اور بعض تو بڑے امیروں والا لباس پہنا کرتے تھے۔ تاکہ اُن کے باطنی احوال اور اللہ کے ہاں کی محبوبیت کا لوگوں کو علم نہ ہو جائے۔ پیوند والے کپڑے پہننا تو مخلوق کے سامنے خالق کی طرف سے شکایت ہے۔ اور بزبان حال سوال ہے۔ اور بے جا طمع کرنا ہے۔ اور ریاء اور سُمعہ میں مبتلا ہونا ہے۔

دیلمی نے ابوسعید خدری سے مسند فردوس میں مرفوعاً نقل کیا ہے: **ليس البر في حسن اللباس والزي ولكن البر السكينة والوقار** کہ اچھا اور سادہ لباس پہننا نیکی نہیں بلکہ نیکی تو سکینہ اور وقار کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے اسباب کی تعداد مخلوق کی سانسوں کے بقدر ہے اور اصل مدار اخلاص اور بے جا تعلقات اور امورِ دینیہ میں رکاوٹ بننے والے کاموں سے خلاصی ہے۔

۵۲۸۳ : وَعَنْ زَيْدِ ابْنِ الْحُسَيْنِ قَالَ سَمِعْتُ مَالِكًا وَسُئِلَ اَىُّ شَىْءٍ اَلزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا قَالَ طِيْبُ الْكَسْبِ وَقِصَرُ الْاَمَلِ ۔ (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

رواه البيهقي في شعب الايمان ٤٠٦٢/٧ حديث رقم ١٠٧٧٩

ترجمہ: ''حضرت زید بن حصین (جو حضرت امام مالکؒ کے رفقاء اور مصاحبین میں سے تھے) کہتے ہیں میں نے حضرت امام مالکؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا جب کہ ان سے سوال کیا گیا کہ دنیا سے زہد اختیار کرنے کی حقیقت کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ''حلال کمائی اور آرزوؤں کی کمی کا نام زہد ہے''۔ (بیہقی)

تشریح: **وعن زيد بن حصين:** مؤلف نے اسماء میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے چونکہ یہ امام مالک کے رواۃ میں سے ہیں امام مالکؒ ان کے استاد تھے اور یہ دونوں نہ صحابہ میں سے ہیں اور نہ تابعین میں سے ہیں۔ **قوله: وسئل اى شئى الزهد في الدنيا:** (یہ جملہ حالیہ ہے۔) **اى والحال انه سئل ۔**

قوله: قال طيب الكسب وقصر الامل: یعنی کھانے پینے کی وہ چیزیں جو حلال اور پاکیزہ ہوں۔ اور ان کو استعمال کرنے سے علم نافع اور عمل صالح حاصل ہو۔ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے فرمایا: [**كلوا من الطيبات واعملوا صالحا**] [المؤمنون: ۵۱] ''نفیس چیزیں کھاؤ اور نیک کام (یعنی عبادت) کرو''۔ نیز ارشاد فرمایا: [**يايها الذين امنوا كلوا من طيبات مارزقنكم واشكروا الله ان كنتم اياه تعبدون**] [البقرة: ۷۲] ''اے ایمان والو جو (شرع کی رو سے) پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ (برتو) اور حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو اگر تم انہی کی عبادت کرتے ہو''

قوله: وقصر الامل: موت کے آنے کے خوف سے عمل میں زیادتی کرے۔ جبکہ موت کی یاد انسان کو دنیا سے بے رغبتی دلاتی ہے۔ اور آخرت کی رغبت دلاتی ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر اس موقع پر کوئی یہ سوال کرے کہ زہد سے حلال کمائی کا کیا تعلق ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے اس قول کے ذریعے اس خیال کی تردید کی ہے کہ ''زہد'' محض اس چیز کا نام ہے کہ دُنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے پھٹا پرانا کپڑا پہنا جائے اور بدمزہ کھانا کھایا جائے۔ یعنی زہد کی حقیقت وہ نہیں جس کا تمہیں گمان ہے۔ بلکہ زُہد کی حقیقت یہ ہے۔ کہ تم حلال کھانا کھاؤ۔ حلال لباس پہنو اور بقدر ضرورت روزی پر قناعت کرو۔ اور اُمیدوں کو مختصر کرو۔ جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: **الزهادة في الدنيا لسيت بتحريم الحلال ولا باضاعة المال ولكن الزهادة في الدنيا بان لاتكون بما في يديك أوثق بما في أبدى الناس**۔ (انتھی)۔ دُنیا سے زہد اختیار کرنا اس بات کا نام نہیں ہے۔ کہ حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے دو اور اپنے مال و اسباب کو ضائع کر دو۔ بلکہ زُہد در حقیقت اس چیز کا نام ہے۔ کہ جو چیز تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اس پر اس چیز سے زیادہ اعتماد نہ کرو۔ جو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس حدیث کا بقیہ حصہ جس کو امام ترمذی اور ابن ماجہ نے ابوذرؓ سے نقل کیا ہے اور جامع میں موجود وہ یہ ہے: **وأن تكون في ثواب المصيبة إذا أنت أصبت بها أرغب منك فيها لو أنها ابقيت لك** ۔ اور جب تم پر کوئی مصیبت آئے، تو اس کے ثواب کے شوق سے اُس مصیبت کے باقی رہنے کی تجھے رغبت ہو۔ یہ حدیث اس کتاب کے آخری ابواب میں آئیگی۔

اسی طرح کی بات امام حنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ کے بارے میں منقول ہے کہ جب اُن سے پوچھا گیا کہ آپ نے تصوف کے بارے میں کوئی تصنیف کیوں نہیں کی۔ تو فرمایا کہ میں نے تصوف کے بارے میں کتاب لکھی ہے۔ تو پوچھا گیا کہ کونسی کتاب لکھی ہے؟ فرمایا کہ میں نے ''کتاب البیع'' لکھی ہے۔ اور جو بیع کی جائز اور ناجائز صورتوں کو نہیں جانتا وہ حرام کھائے گا اور جو حرام کھائے گا اُسکی اصلاح کبھی نہیں ہوسکتی۔

بَابُ اِسْتِحْبَابِ الْمَالِ وَالْعُمْرِ لِلطَّاعَةِ

خدا کی طاعت وعبادت کیلئے مال اور عمر سے محبت رکھنے کا بیان

یعنی اللہ کی اطاعت اور عبادت میں مال و جان خرچ کرنے کے جذبہ سے مال اور لمبی عمر کو طلب کرنے کے جواز کا بیان

الفصل الاول:

۵۲۸۴ : عَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ الْخَفِيَّ (رواه مسلم وذكر حديث ابن عمر) لَاحَسَدَ اِلَّا فِيْ اثْنَيْنِ فِيْ بَابِ فَضَائِلِ الْقُرْآنِ۔

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٢٧٧/٤ حديث رقم (١١-٢٩٦٥) واحمد في المسند ١٧٧/١۔البخاري في صحيحه ٧٧/١ حديث رقم ٦٤٤٦ ومسلم في ٦٢٦/٢ حديث رقم ١٠٥١

''حضرت سعد (بن ابی وقاص) رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یقیناً اللہ تعالیٰ پرہیزگار، مالدار اور چھپے چھپائے شخص کو محبوب رکھتا ہے''۔ (مسلم) اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت لَاحَسَدَ اِلَّا فِیْ اثْنَیْنِ فضائل کے باب میں نقل کی جا چکی ہے''۔

''المتقی'': وہ شخص ہے جو منکرات سے بچتا ہے۔ یا وہ شخص جو لہو ولعب میں مال خرچ نہیں کرتا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جو حرام اور سے بچتا ہے اور مباحات وخواہشات سے گریز کرتا ہے۔

الغنی: امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غنی سے مراد وہ شخص ہے۔ جو دل کا غنی ہو۔ اور یہی (دل کا غنی) اللہ کو محبوب ہے۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کامل غنی دل کا غنی ہے۔

قاضی رحمہ اللہ نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ کہ اس مقام میں غنی سے مراد مالدار شخص ہے۔ ملا علی قاریؒ کے نزدیک یہ دوسری رائے ہی اس باب کے مناسب ہے۔ اور یہ بات دل کے غنی ہونے کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ غنا کے باب میں وہی شخص کامل اور اصل ہے جو ظاہری مال و دولت کے ساتھ دل کا غنا بھی رکھتا ہو۔ جس کے ذریعے ہاتھ کا وہ غنا بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ جو دُنیا وآخرت میں مراتب اور درجات کی بلندی کا باعث بنتا ہے۔ حاصل یہ کہ مراد اس مقام پر شکر گزار مالدار ہے۔

اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے۔ کہ شکر گزار مالدار صبر کرنے والے فقیر سے افضل ہے۔ لیکن یہ قول اُس

قول کے خلاف ہے جو زیادہ قابل اعتماد ہے۔ اور اُسکا بیان اور دلائل پہلے ذکر کئے جا چکے ہیں۔

"الخفی" بخائے معجمہ کے ساتھ۔ یعنی وہ گوشہ نشین جو تنہائی اور یکسوئی حاصل کر کے اپنے رب کی عبادت اور اپنے ضروریات ہی میں مشغول رہے۔ یا خفی سے مراد وہ شخص ہے۔ جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کی غرض سے اپنے نیک کاموں اور اپنے مال کو خرچ کرنے میں اس طرح رازداری اور پوشیدگی اختیار کرے۔ کہ کسی کو اس کا علم نہ ہو۔ اس صورت میں لفظ "خفی" کا اطلاق نادار اور فقیر شخص پر بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے۔ کہ اس طرح چھپا کر صدقہ کرے۔ کہ دائیں ہاتھ سے جو مال خرچ کر رہا ہے۔ بائیں ہاتھ کو اُسکا علم نہ ہو یہی مطلب زیادہ ظاہر ہے۔ اس لفظ کو حا (بغیر نقطہ والی) کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے۔ یعنی مہربان اور نرم مزاج شخص۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "خفی" سے مراد وہ شخص ہے۔ جو رشتہ داروں سے رشتہ جوڑے رکھے اور رشتہ داروں اور ناداروں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے۔ زیادہ درست پہلا معنی ہے۔ یہ حدیث اُن لوگوں کیلئے دلیل ہے۔ جو یہ کہتے ہیں۔ کہ لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا ان کے ساتھ میل جول رکھنے سے افضل ہے۔ لیکن جو حضرات لوگوں کے ساتھ میل جول کو لوگوں سے کنارہ کشی کرنے سے افضل سمجھتے ہیں۔ انہوں نے یہ تاویل کی ہے کہ لوگوں سے کنارہ کشی کی فضیلت اُس وقت ہے۔ جب فتنوں کا زور ہو یا یہ کہ کنارہ کشی اختیار کرنا اُن لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنے سے بہتر ہے۔ جن کے ساتھ میل جول رکھنے سے دین و آخرت کے معاملات پر بُرا اثر پڑتا ہو۔

ابن الملک فرماتے ہیں۔ کہ خفی سے وہ شخص مراد ہے۔ جو لوگوں سے چُھپ کر نوافل میں مشغول رہے تا کہ ریاء کاری سے محفوظ ہو۔ بعض حضرات فرماتے ہیں۔ کہ "خفی" سے وہ شخص مراد ہے۔ جو لوگوں پر جبر و ظلم نہ کرے اور مال کے ذریعے فخر و تکبر نہ کرے۔ بلکہ تواضع اور انکساری کے ساتھ رہے۔ بعض حضرات کے نزدیک "خفی" سے مراد وہ شخص ہے۔ جو بازاروں میں زیادہ نہ گھومے پھرے۔

قولہ: رواہ مسلم:

امام مسلمؒ نے اس حدیث کو عامر بن سعد بن ابی وقاص کی سند سے روایت کیا ہے یہ بات جزری نے ذکر کی ہے جامع میں ہے۔ کہ اس حدیث کو امام احمد اور امام مسلم نے سعد بن ابی وقاص سے نقل کیا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مصابیح کے ایک نسخہ میں لفظ "تقی" کے بعد لفظ "نقی" (نون کے ساتھ) بھی مذکور ہے۔ لیکن صحیح مسلم اور اس کی شرح میں یہ لفظ ملا اور نہ ہی حمیدی اور جامع الاصول میں ملا۔

قولہ: وذکر حدیث ابن عمر لاحسد الا فی اثنین فی باب فضائل القران: درست "فی کتاب فضائل القرآن" ہے۔

چونکہ یہ حدیث ایسے دو معانی پر مشتمل ہے جو مذکورہ افراد کے اعتبار سے دونوں بابوں کے مناسب ہے اور اُن میں سے پہلا فضیلت قرآن سے متعلق ہے۔ تو اولاً تاکید کے ساتھ اسی کے ساتھ خاص کر کے ذکر کیا اور دوسرا تو بر سبیل ذکر اور مکرر کے طور پر ہی ہے۔

الفصل الثانی:

۵۲۸۵ : عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ اَنَّ رَجُلاً قَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ النَّاسِ خَیْرٌ قَالَ مَنْ طَالَ عُمُرُہٗ وَحَسُنَ عَمَلُہٗ قَالَ فَاَیُّ النَّاسِ شَرٌّ قَالَ مَنْ طَالَ عُمُرُہٗ وَسَآءَ عَمَلُہٗ۔

(رواہ احمد والترمذی والدارمی)

اخرجه الدارمي في السنن ٣٩٨/٢ حديث رقم ٢٧٤٢ والترمذي في السنن ٤٨٩/٤ حديث رقم ٢٣٣١ واحمد في المسند ٤٠/٥

ترجمہ: ''حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے سوال کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! کون سا شخص بہترین ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ شخص جس کی عمر زیادہ ہو اور اس کا عمل اچھا ہو''۔ پھر اس شخص نے دریافت کیا ''کون سا شخص بدترین ہے؟'' حضور ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا: ''وہ شخص جس کی عمر زیادہ ہو اور اس کا عمل برا ہو''۔

(احمد' ترمذی' دارمی)

تشریح: قولہ :عن ابی بکرۃ ان رجلا قال......

عن ابی بکرۃ: تاء کے ساتھ ہے۔

قولہ: من طال عمرہ: فصیح لغت کے مطابق لفظ ''عمر'' عین اور میم کے ضمہ کے ساتھ ہے' اور اسی لغت کے موافق قرآن میں وارد ہوا ہے۔ اور عوام میں تخفیفاً عین کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ مشہور ہے۔ اور عین کا فتحہ اور میم کا سکون بھی اس میں ایک لغت ہے۔ اللہ کا یہ ارشاد اسی لغت میں وارد ہوا ہے: ﴿لعمرك انهم لفي سكرتهم يعمهون﴾ [الحجر۔۷۲] اور قاموس میں ہے کہ ''العمر'' عین کے فتحہ' عین کے ضمہ' اور دونوں کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ جس کا معنی ہے زندگی

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ وقت انسان کیلئے اس طرح ہے جس طرح تاجر راس المال ہے۔ اسلئے انسان کو چاہیے کہ ایسے کاموں میں وقت صرف کرے۔ جہاں زیادہ نفع حاصل ہو۔ اور جتنا راس المال زیادہ ہوتا ہے۔ اتنا ہی نفع بھی زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جو شخص اوقات کے نیک اعمال میں خرچ کرے گا کامیاب و کامران ہوگا۔ اور جو شخص اپنے اس راس المال کو ضائع کرے گا۔ بہت بڑا نقصان اُٹھائے گا۔ انتہی۔

اس کے علاوہ انسان کی وہ دو قسمیں ہیں۔ جو برابر ہیں نہ تو بہت زیادہ بہتر ہے۔ اور نہ بہت زیادہ بدتر ہے۔ اور اُن میں سے ایک وہ قسم کہ جن کی عمر کم ہو اور نیک عمل کرے۔ دوسری وہ کہ جن کی عمر کم اور برا عمل کرے۔

قولہ: رواہ احمد والترمذی: ایک نسخہ میں ہے فرمایا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تخریج: طبرانی نے اس حدیث کو صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اور حاکم اور بیہقی نے ان سے روایت کیا ہے۔ اور طبرانی اور ابونعیم نے حلیہ میں عبداللہ بن بسر سے مرفوعاً نقل کیا ہے: طوبی لمن طال عمرہ وحسن عملہ۔

خوش قسمتی ہے اُس شخص کی جس کی عمر لمبی ہو اور عمل اچھا ہو۔

اور حاکم نے حضرت جابرؓ سے مرفوعاً نقل کیا ~~ہے خیرکم~~ اطولکم اعمارا واحسنکم اعمالا کہ تم میں سے سب سے

بہتر وہ شخص ہے۔ جس کی عمر طویل ہو اور عمل اچھا ہو۔

۵۲۸۶ : وَعَنْ عُبَيْدِ ابْنِ خَالِدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آخَى بَيْنَ رَجُلَيْنِ فَقُتِلَ اَحَدُهُمَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتَ الاٰخَرُ بَعْدَهٗ بِجُمْعَةٍ اَوْنَحْوِهَا فَصَلُّوْا عَلَيْهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا قُلْتُمْ قَالُوْا دَعَوْنَا اللّٰهَ اَنْ يَّغْفِرَلَهٗ وَيَرْحَمَهٗ وَيُلْحِقَهٗ بِصَاحِبِهٖ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَيْنَ صَلٰوتُهٗ بَعْدَ صَلٰوتِهٖ وَعَمَلُهٗ بَعْدَ عَمَلِهٖ اَوْقَالَ صِيَامُهٗ بَعْدَ صِيَامِهٖ لَمَا بَيْنَهُمَا اَبْعَدُ مِمَّا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ (رواہ ابوداود والنسائی)

اخرجه ابوداؤد في السنن ۳۵/۳ حديث رقم ۲۵۲٤ والنسائي في السنن ۷٤/٤ حديث رقم ۱۹۸۵ وابن ماجه في السنن ۱۲۹٤/۲ حديث رقم ۳۹۲۵ واحمد في المسند ۵۰۰/۳۔

ترجمہ: ''حضرت عبید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے دو شخصوں کے درمیان بھائی چارہ قائم کرادیا تھا (یعنی ان دونوں کو جو صحابہؓ میں سے تھے بھائی بھائی بنا دیا تھا) ان میں سے ایک شخص خدا کی راہ میں قتل کر دیا گیا (یعنی جہاد میں شہید ہو گیا) اور اس کی شہادت کے ایک ہفتہ یا ایک ہفتہ کے قریبی عرصہ کے بعد دوسرا شخص بھی (بیمار ہو کر بستر مرگ پر) فوت ہو گیا۔ صحابہؓ نے اس شخص کی نماز جنازہ پڑھی اور (جب وہ نماز جنازہ سے فارغ ہوئے تو) حضور اقدس ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم نے مرنے والے شخص کی جو نماز جنازہ پڑھی ہے اس میں تم نے کیا پڑھا ہے اور کیا کہا ہے (یعنی تم نے نماز جنازہ میں مرحوم کے لئے کیا دعا کی ہے؟) صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی ہے کہ اس کے گناہوں کی بخشش فرما دے اس پر رحمت نازل کرے اور اس کو اس کے (شہید ہو جانے والے) ساتھی کے پاس (جنت کے اعلیٰ درجہ میں) پہنچا دے (جیسے وہ دونوں زندگی اتفاق کے ساتھ مل کر رہا کرتے تھے) نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا: ''تو پھر اس کی وہ نماز کہاں گئی جو اس نے اپنے ساتھی کی نماز کے بعد کے دنوں میں) پڑھی تھی اور اس کے ان اعمال کا ثواب کہاں گیا جو اس نے اپنے ساتھی کے اعمال کے بعد (کے دنوں میں) کئے تھے۔ یا ارشاد فرمایا کہ ''اس کے ان روزوں کا ثواب کہاں گیا جو اس نے اپنے اس ساتھی کے روزوں کے بعد (کے دنوں میں) رکھے تھے؟'' (یعنی تم نے مرحوم کے حق میں جو یہ دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے اس بھائی وساتھی کے پاس جنت میں پہنچائے جو شہید ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے گمان میں اس شخص کا درجہ و مرتبہ اپنے اس شہید بھائی کے درجہ و مرتبہ سے کم ہے۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو پھر بتاؤ کہ اس مرحوم کی وہ نمازیں وہ روزے اور وہ دوسرے اچھے اعمال اور ان کا اجر وثواب کہاں جائے گا جو اس نے اپنے بھائی کے انتقال کے بعد کے دنوں میں کئے ہیں) بلاشبہ جنت کے اندر اور قرب الٰہی میں ان دونوں لوگوں کے درمیان فرق اور دوری ہے وہ اس دوری سے بھی کہیں زیادہ ہے جو زمین وآسمان کے درمیان ہے''۔ (ابوداؤد نسائی)

تشریح: عن عبید: تصغیر کے ساتھ ہے۔

قوله: ان النبي ﷺ آخى...... بعدہ: ایک نسخہ میں ''بعد'' دال کے ضمہ کے ساتھ ہے یعنی بنی ہے۔ **اى بعد قتل أخيه** (اپنے بھائی کی شہادت کے بعد) ماقلتم: ''ما'' استفہام کیلئے ہے۔ **اى ما قلتم في حقه من الكلام۔**

يلحقه: ''الحاق'' مصدر سے ہے۔

فقال النبی ﷺ فاین: یہ شرط مقدر کا جواب ہے ای: اذا کنتم تدعون اللہ بان یلحقہ بصاحبہ زعما منکم ان مرتبتہ دون مرتبۃ اخیہ فاین صلاتہ، (یعنی اگر تم اللہ سے دُعا کر رہے ہو کہ اللہ اس شخص کو جنت میں اُس شہید کے مرتبہ تک پہنچادے۔ اور تمہارا گمان یہ ہے کہ اس شخص کا مرتبہ اُس شہید سے کم ہے۔ تو کہاں گئی وہ نمازیں جو اِس شخص نے زائد پڑھی ہیں۔)

"**وعملہ بعد عملہ**: تخصیص کے بعد تعمیم ہے۔ یا تقدیری عبارت یوں ہے" وسائر عملہ ای عمل المیت بعد انقطاع عملہ" (یعنی شہید کے تمام اعمال منقطع ہونے کے بعد اس دوسرے بھائی کے باقی تمام اعمال)

صیامہ بعد صیامہ: شاید یہ واقعہ رمضان میں ہوا ہو یا بعد میں فوت ہونے والے صاحب نفلی روزے زیادہ رکھتے تھے۔

لمابینھما...... : ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ "لام" یا قسم کیلئے بطور توطیہ ہے۔ یا ابتدائیہ ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ دوسری رائے زیادہ دُرست ہے کیونکہ موطیہ کی شرط یہ ہے کہ ان شرطیہ کے ساتھ متصل ہو۔ جیسا کہ ارشادِ باری: "لئن اشرکت" میں ہاں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لام قسم مقدر کے جواب میں ہو اور عبارت کی تقدیر" واللہ لما بینھما" ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے قرب کے اعتبار سے ان دونوں کے درمیان جو فرق ہے وہ اس فاصلہ سے بھی زیادہ ہے جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔

یعنی اس دوسرے میت کا مرتبہ بلند ہے۔ چنانچہ شہید اس بات کا زیادہ حقدار ہے۔ کہ اُسکے لئے اس دوسرے بھائی کے مرتبہ تک پہنچنے کی دعا کی جائے اور یہ اسلئے کہ یہ دوسرا بھائی بھی میدان جنگ میں شریک ہوا تھا۔ چنانچہ وہ حکماً شہادت میں اُس شہید کے شریک ہے۔ اور اطاعت وعبادت میں۔ حقیقتاً، اُسکو مزید برتری حاصل ہوگئی۔ ورنہ تو یہ بات واضح ہے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کیلئے اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہوئے شہادت سے بڑھ کر کوئی ثواب کا عمل نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ زمانہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اور دین کے مددگاروں کی کمی تھی۔

اشکال: علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ بغیر شہادت کے عمل کی کثرت شہادت کے ساتھ عمل پر کیوں زیادہ فضیلت حاصل ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کو وحی کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ دوسرے صاحب کا عمل بغیر شہادت کے اخلاص اور خشوع کی زیادتی کی وجہ سے شہید کی شہادت اور عمل کے مساوی ہو گیا پھر شہید کی شہادت کے بعد دوسرے صاحب نے جو اعمال کیے اُنکی وجہ سے شہید سے آگے بڑھ گیا۔ اور بہت سے شہید ایسے ہیں جن کو کوئی مقام حاصل نہیں ہوتا۔ اگرچہ عمل میں مخلص ہوں۔ انتہیٰ۔

یہ بات محل نظر ہے۔ کیونکہ حدیث میں شہید کے اخلاص کی کمی کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ صحابہ پر ایسا گمان کرنا درست نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اگر فضیلت کی علت یہ ہوتی تو نبی علیہ السلام اس کو بیان کرتے۔ اور صدیق کے بارے میں تو کوئی کلام نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو عمل کی زیادہ توفیق دیتے ہیں۔ جبکہ یہ دوسرے صاحب حکماً شہید بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے کئی مقامات میں صدیقین کا مرتبہ شہداء سے مقدم کیا ہے۔

اسنادی حیثیت: اس حدیث کے راوی صحیح کے راوی ہیں سوائے عبداللہ بن ربیعہ سلمی کے جو نقل کرتے ہیں عبید بن خالد سے نسائی فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن ربیعہ صحابی ہیں اور صحابی نہ ہونے کی صورت میں تابعی ہیں اور کسی نے ان کو ضعیف نہیں کہا۔ اور جہاں تک بات ہے عبید بن خالد کی وہ ابوعبداللہ السلمی البھز ی ہیں۔ یہ وہ صحابی ہیں اور کوفہ میں رہتے تھے ان سے عبداللہ بن ربیعہ، تمیم بن سلمہ اور سعید بن عبیدہ روایات کرتے ہیں۔ (نقلہ میرک عن تصحیح) اور تقریب میں ہے کہ عبداللہ بن ربیعہ بن فرقد السلمی کا ذکر صحابہ میں کیا گیا ہے۔ ابوحاتم نے اس کا انکار کیا ہے اور ابن حبان نے اس کی توثیق کی ہے (انتھی) اور اس میں مزید تفصیل آگے آئیگی۔

۵۲۸۷ : وَعَنْ اَبِیْ كَبْشَةَ الْاَنْمَارِيِّ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ ثَلٰثٌ اُقْسِمُ عَلَيْهِنَّ وَاُحَدِّثُكُمْ حَدِيْثًا فَاحْفَظُوْهُ فَاَمَّا الَّذِىْ اُقْسِمُ عَلَيْهِنَّ فَاِنَّهٗ مَانَقَصَ مَالُ عَبْدٍ مِنْ صَدَقَةٍ وَلَا ظُلِمَ عَبْدٌ مُظْلِمَةً صَبَرَعَلَيْهَا اِلَّازَادَهُ اللّٰهُ بِهَا عِزًّا وَلَافَتَحَ عَبْدٌ بَابَ مَسْئَلَةٍ اِلَّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ بَابَ فَقْرٍ وَاَمَّا الَّذِىْ اُحَدِّثُكُمْ فَاحْفَظُوْهُ فَقَالَ اِنَّمَا الدُّنْيَا لِاَرْبَعَةِ نَفَرٍ عَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالًا وَّعِلْمًا فَهُوَ يَتَّقِىْ فِيْهِ رَبَّهٗ يَصِلُ رَحِمَهٗ وَيَعْمَلُ لِلّٰهِ فِيْهِ بِحَقِّهٖ فَهٰذَا بِاَفْضَلِ الْمَنَازِلِ وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ عِلْمًا وَّلَمْ يَرْزُقْهُ مَالًا فَهُوَ صَادِقُ النِّيَّةِ يَقُوْلُ لَوْاَنَّ لِىْ مَالًا لَعَمِلْتُ بِعَمَلِ فُلَانٍ فَاَجْرُهُمَا سَوَاءٌ وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالًا وَلَمْ يَرْزُقْهُ عِلْمًا فَهُوَ يَتَخَبَّطُ فِىْ مَالِهٖ بِغَيْرِ عِلْمٍ لَايَتَّقِىْ فِيْهِ رَبَّهٗ وَلَايَصِلُ فِيْهِ رَحِمَهٗ وَلَا يَعْمَلُ فِيْهِ بِحَقٍّ فَهٰذَا بِاَخْبَثِ الْمَنَازِلِ وَعَبْدٍ لَّمْ يَرْزُقْهُ اللّٰهُ مَالًا وَّلَا عِلْمًا فَهُوَ يَقُوْلُ لَوْاَنَّ لِىْ مَالًا لَعَمِلْتُ فِيْهِ بِعَمَلِ فُلَانٍ فَهُوَ نِيَّتُهٗ وَوِزْرُهُمَا سَوَآءٌ (رواه الترمذی وقال هذا حديث صحيح)

اخرجه الترمذي في السنن ٤٨٧/٤ حديث رقم ٢٣٢٥ واخرجه ابن ماجه ١٤١٣/٢ حديث رقم ٤٢٢٨ واحمد في المسند ٢٣١/٤

ترجمہ: "حضرت ابوکبشہ انماری سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: "تین خصلتیں ایسی ہیں جن کی حقانیت وصداقت پر میں قسم کھا سکتا ہوں اور میں تم سے ایک بات بیان کرتا ہوں (یعنی اپنی حدیث) اس کو محفوظ رکھنا (یعنی اپنے عمل میں لانا) پس وہ تین باتیں جن کے حق اور سچ پر میں قسم کھا سکتا ہوں، یہ ہیں کہ انسان کا مال اللہ کے راستے میں صرف کرنے (یعنی خیرات کی وجہ سے گھٹتا نہیں (یعنی کسی شخص کا اپنے مال کو حق تعالیٰ شانہ کی خوشنودی کے حصول کی خاطر بظاہر تو اپنے مال کو کم کرنا اور ہے مگر درحقیقت اس کو کوئی نقصان اور خسارہ نہیں ہوتا کیونکہ اس کا صدقہ وخیرات کرنا دنیاوی طور پر بھی اس کے مال واسباب میں خیر وبرکت کا موجب ہے اور آخرت میں بھی جزائے عظیم کے حصول کا موجب ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیز کثرت وزیادتی کے حکم میں ہوگی نہ کہ نقصان کے حکم میں) اور جس بندہ پر ظلم کیا جائے اور وہ بندہ اس ظلم وزیادتی پر صبر کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کے باعث اس کی عزت میں اور اضافہ فرما دیتا ہے اور رہی اس حدیث کی بات جس کو میں نے تم سے بیان کرنے کا وعدہ کیا تھا تو اب میں وہ حدیث سناتا ہوں (دھیان سے سنو اور) اس کو یاد رکھو، اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دنیا بس چار آدمیوں کے لئے

ہے (یعنی یہ دنیا اپنے مال کی قلت وکثرت اور اپنے خیر اور شر کے اعتبار سے چار طرح کے لوگوں میں منحصر ہے) ایک تو وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے دولت وثروت سے بھی نوازا ہو اور علم کی دولت سے بھی مالا مال کیا ہو (ایسا علم کہ جس کے ذریعہ وہ اپنے مال کو صحیح مصارف میں لگانے کے طریقہ سے بخوبی واقف ہو اور) پس وہ اپنے مال ودولت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہے (یعنی اس کو حرام وغیر مناسب جگہوں میں خرچ نہیں کرتا) اس کے ذریعہ اپنے اقرباء واعزہ کے ساتھ احسان کا معاملہ کرتا ہے اور اس مال وزر میں سے اس کے حق کے مطابق اللہ تعالیٰ کے لئے عمل کرتا ہے۔ دوسرا وہ بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم تو عطا کیا لیکن اس کو مال عنایت نہیں فرمایا پس وہ شخص صاحب علم ہونے کی وجہ سے صدق نیت رکھتا ہے (مال ودولت کے ملنے کی تمنا رکھتے ہوئے) خواہش ظاہر کرتا ہے کہ اگر میرے پاس دولت تو میں اس کے تئیں اچھے عمل کرتا جیسا کہ وہ فلاں بندہ اپنے مال وزر کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے چنانچہ ان دونوں لوگوں کا ثواب برابر ہے تیسرا وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال ودولت سے نوازا لیکن علم سے محروم رکھا پس وہ بندہ بے علم ہونے کی وجہ سے اپنے مال کے بارے میں گمراہی بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے وہ (اپنی بدعملی کے سبب) اس مال ودولت کے متعلق اپنے رب سے نہیں ڈرتا ہے (یعنی ذرائع آمدن سے اجتناب واحتیاط نہیں کرتا جو حرام وناجائز اور مشتبہ ہوتے ہیں اور نہ ایسے امور میں اپنا مال خرچ کرنے سے پرہیز کرتا ہے جو غیر شرعی ہیں) اور علم وتربیت کی کمی رحمدلی اور ہمدردی کے جذبہ کی کمی اور دھنیا کی محبت کے غلبہ اور مریص اور بخیل ہونے کے سبب) اپنے اعزہ واقرباء کے ساتھ مالی ہمدردی نہیں کرتا ہے اور اپنے مال سے متعلقہ حقوق کی تعمیل بھی نہیں کرتا اور چوتھا بندہ وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے نہ تو مال عنایت فرمایا ہو اور نہ علم کی دولت سے نوازا (یعنی ایسا علم جس کے ذریعہ وہ اس بات کا امتیاز کر سکے کہ کیا میرے لئے بہتر ہے اور کیا بدتر ہے) پس وہ شخص کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ودولت ہوتی تو میں بھی اس کو فلاں آدمی کی طرح (برے امور میں) لگاتا' چنانچہ یہ بندہ بری نیت رکھنے والا ہے) اور اس کا گناہ اس (تیسرے آدمی) کے گناہ کے مساوی ہے یعنی وہ تیسرا شخص اگر چہ اپنا مال برے کاموں میں خرچ کرنے کی وجہ سے گنہگار ہوتا ہے اور یہ (چوتھا) شخص صاحب مال نہ ہونے کے باعث برے کاموں میں صرف تو نہیں کرتا لیکن چونکہ برے کاموں میں خرچ کرنے کا عزم رکھتا ہے اس سبب سے اس کو بھی وہی گناہ ملتا ہے جو برے کاموں میں حقیقتاً لگانے والے کو ملتا ہے''۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے یہ کہ حدیث صحیح ہے''۔

تشریح: قولہ: یقولہ ثلاث اقسم علیھن واحدثکم حدیثا فا حفظوہ: احدثکم کا عطف معنی کے اعتبار سے "ثلاث" پر ہے گویا کہ یوں فرمایا: اخبر کم بثلاث أؤ کدھن بالقسم علیھن واحد ثکم، (میں تم لوگوں کو تین خصلتوں کی خبر دیتا ہوں اور ان کو قسم کھا کر مؤکد کرتا ہوں اور تمہیں بیان کر دیتا ہوں)۔

حدیثا: ''فاحفظوہ'': کی ضمیر منصوب کا مرجع ''حدیثا'' ہے یا اگلی پچھلی تمام کی طرف ہے۔

فانہ: یہ ضمیر شان ہے۔

مال کی برکت صدقہ دینے کی وجہ سے کیونکہ اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت میں مقدار اور کیفیت کے اعتبار سے خیر وبرکت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وما انفقتم من شیئ فھو یخلفہ ﴾

ترجمہ: ''اور جو چیز تم خرچ کرو گے سو وہ اس کا عوض دے گا''۔

قولہ: ولا ظلم عبد۔۔۔ زادہ اللہ بھا عزا:

ظلم: مجہول کے صیغہ کے ساتھ۔

مظلمۃ: ہم کے فتحہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے۔ وہ چیز جس کو ظالم ظلماً لے اس طرح لکھا ہے۔ اور قاموس میں لکھا ہے۔ کہ "المظلمۃ" جبکہ لام کے کسرہ کے ساتھ ہو کا معنی ہے۔ کہ آدمی جو چیز ظلماً لے اور بظاہر اس مقام میں مصدر ہے۔ اور مفعول کے معنی میں ہے اس کی صفت ہے۔

قولہ: ولا فتح عند باب ۔۔۔باب فقر:

اس شخص کی مثال اس گدھے کی سی ہے۔ جس کی دُم نہ ہو اور وہ چارہ کی تلاش گھوم پھر کر کسی کے باغ میں داخل ہو تو باغ میں کسان اُسکے کان بھی کاٹ دے۔ نیز اس شخص کو ایسے کتے کے ساتھ بھی تشبیہ دی گئی ہے۔ جس کے منہ میں کوئی ہڈی ہو اور وہ کسی چھوٹی نہر کے پاس سے گزر رہا ہو تو نیچے پانی میں کوئی دوسری اچھی ہڈی نظر آئے۔ اور پانی میں پڑی ہوئی ہڈی کیلئے جب منہ کھولے تو وہ ہڈی بھی پانی میں گر کر ضائع ہو جائے۔ جو پہلے سے منہ میں تھی۔ چنانچہ حرص ایک نحوست ہے۔ جس کی وجہ سے حریص آدمی محروم ہوتا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں" فاما الذی اقسم علیھن" میں الذی کو مذکور موعود کے اعتبار سے جمع کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا گیا اور ارشاد باری ﴿مثلھم کمثل الذی استوقد﴾ [البقرۃ۔۱۷] کی تفسیر اسی طرح کی گئی ہے۔ یعنی الذی، کو "الفوج" (مجموعے اور گروہ) کے اعتبار سے مفرد کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ مصابیح" اما اللاتی اقسم علیھن" کے الفاظ ہیں اور وہ تو ظاہر ہیں، اس مقام میں قسم اُٹھانا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اگلی بات کی عظمت کے پیش نظر اس کی تاکید مقصود ہے۔ کیونکہ مدعیٰ کبھی تو قسم کو ذکر کرنے سے ثابت ہوتا ہے۔ اور کبھی قسم کے کسی لفظ سے ثابت ہوتا ہے۔ انتہی۔

زیادہ بہتر یہ ہے کہ تقدیر عبارت یہ تسلیم کی جائے" فاما قولی الذی اقسم فیہ علی الخصال الثلاث واذکد فانہ....."۔

قولہ: واماالذی..... انما الدنیا لأربعۃ نفر:

یہ تفسیر اور بیان ہے بلکہ قال تاکید کیلئے جملہ معترضہ ہے۔ اور تقدیر یہ ہے: فانما الدنیا، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ جامع میں لفظ" قال" نہیں ہے بلکہ اس میں صرف" انماالدنیا"، کے الفاظ ہیں

قولہ: عبد رزقہ اللہ مالا وعلما..... فھذا: عبد جر کے ساتھ اور مرفوع پڑھنا بھی منقول ہے۔

"رزقہ اللہ مالا وعلما" میں اشارہ ہے۔ کہ علم بھی اللہ کی طرف سے عطا کردہ ایک نعمت ہے۔ اور اللہ ہی علم اور مال عطا کرتا ہے۔ اور اُسی کی توفیق سے کمال کے دروازے کھلتے ہیں۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ "ان علما لا یقال بہ ککنز لا ینفق منہ" "جس علم کا بیان نہ ہو وہ اس خزانے کی طرح ہے جسے خرچ نہ کیا جائے" چنانچہ علماء اگرچہ فقیر ہوں ارشاد باری ﴿ومما رزقنا ھم ینفقون﴾ [البقرۃ] "اور جو کچھ دیا ہے ہم نے ان کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں" میں داخل ہیں اور اس میں اشارہ ہے۔ اس بات کی طرف کہ مال سے مراد وہ مال جو ضرورت کی مقدار سے زائد ہو۔

ویعمل لله فیه بحقه: یعنی علم کا حق ادا کرے۔ یعنی علم انسان سے حقوق اللہ اور حقوق العباد پر عمل پیرا ہونے کا جو تقاضہ کرے۔ اُس کو پورا کر یا اس مقام میں لف ونشر مرتب ہے۔ اور اس کی تائید جامع کے الفاظ سے ہوتی ہے۔ جامع کے الفاظ ہیں۔" ویعلم الله فیه حقا" "اپنے علم کے موافق اللہ کو ٹھیک ٹھیک پہچانے" اور "فیه" اور بحقه، میں دونوں ضمیروں کو مال اور علم میں سے ہر ایک کی طرف لوٹانا درست ہے۔ اور ضمیر کو مذکور کیا اعتبار سے مفرد کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا۔ ابن الملک فرماتے ہیں یعنی" بحق المال" ، اور مطلب یہ ہے۔ کہ جو مالی حقوق ہیں مثلاً زکوٰۃ نکالنا، مالی کفارات ادا کرنا، صدقہ وخیرات کرنا، اور مہمانوں کو کھانا کھلانا وہ ادا کرے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ، بحقه، کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹے اور اسوقت مطلب یہ ہوگا۔ کہ اللہ کا حق جو کہ مال میں واجب ہو چکا ہے۔ ادا کرے۔

قوله: وعبد رزقه الله علما ...... صادق النية: یعنی اُسکا ظاہر اُسکے باطن کے موافق ہے۔

فاجرهما سواء: یہ جملہ مستانفہ ہے۔ یا حال ہے۔

قوله: وعبد رزقه الله مالا ۔۔۔ فهذا بأخبث المنازل:

قوله: وعبد لم یرزقه الله مالا ولا علما ۔۔۔ فهو نیته یعنی نیت کی وجہ سے مغضوب ہے اور باطن کے ارادہ کی وجہ سے اس کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔ یا" فية" کا جملہ بطور مبالغہ کے ہے۔ جیسا کہ "رجل عدل" میں ہے گویا کہ اس کی ذات بعینہٖ نیت ہے۔ ایک نسخہ میں" فهو بنيته" کے الفاظ ہیں۔ اسی طرح جامع میں ہے۔ یعنی اس کو اپنی نیت کے موافق بدلہ دیا جائے گا۔ اور جب بظاہر یہ گناہ صرف نیت کی وجہ سے ہے۔ اُس عمل کا گناہ نہیں ہے۔ جو کہ نیت اور فعل دونوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسلئے سخت وعید اور شدید دھمکی دی گئی۔

قوله: ووزرهما سواء: اور جامع میں "فوزرهما سواء" کے الفاظ ہیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ" فهو نیته" مبتدا اور خبر ہے۔ یعنی اس شخص کی نیت بُری اور غلط ہے۔ اور اس مطلب پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ پہلے جملہ میں اس کے مقابلہ میں" فهو صادق النية" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ اور حدیث کے الفاظ" یقول لوان لی مالا" : ارشاد نبوی" صادق النية" کی تفسیر ہے۔ اور قول رسول ﷺ" یقول لوان لی مالا" اس کے مقابلہ میں ہے۔ اور قول رسول ﷺ فاجرهما سواء، قول رسول ووزرهما سواء، کے مقابلہ میں ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس حدیث رسول کے منافی نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے اُن خیالات اور وساوس سے درگذر کر دیا جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں جب تک کہ ان وساوس پر عمل نہ کرے۔ اس لئے کہ اس حدیث میں زبان سے ایسی بات کر کے عمل کر لیا ہے۔ اور اللہ کی طرف سے جن خیالات سے درگزر کیا گیا ہے وہ خیالات ہیں۔ جو صرف دل میں پیدا ہوں، انتہی۔

زیادہ قابل اعتماد وہی معنی ہے جو محققین فرماتے ہیں، کہ یہ اللہ کی طرف سے درگذر اُس وقت ہوتا ہے۔ جبکہ انسان کا نفس گناہ پر مکمل آمادہ نہ ہوا اور دل میں گناہ کرنے کا ارادہ پختہ نہ ہو۔ اگر گناہ کا عزم کیا اور ارادے نے دل میں جگہ پکڑ لی تو گناہ لکھ دیا جاتا ہے۔ گو نہ وہ گناہ کا کام کرے۔ اور نہ گناہ کی کوئی بات کہے اور یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔

قوله: قال :هذا حديث صحيح:

منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو کبشہ کی حدیث کو امام احمد اور امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔ اور یہ الفاظ انہی کے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابن ماجہ نے بھی اس معنی کی حدیث نقل کی ہے۔ (ذکرہ میرک) اور جامع میں ہے کہ اسی طرح امام احمد نے اس حدیث کو اپنی مسند میں ذکر کیا۔ اور ابن ابی الدنیا نے ''ذم الغضب'' میں عبدالرحمن بن عوف سے اس حدیث کے صرف شروع والے حصے کو نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

ثلاث اقسم عليهن ما نقص مال قط من صدقة فتصدقوا ولا عفا رجل مظلمة ظلمها الا زاده الله تعالى جل جلاله بها عزا فاعفوا يزيدكم الله عزا' ولا فتح رجل باب مسألة يسال الناس الا فتح الله عليه باب فقر'' ۔

یہ اس بات پر دلالت ہے کہ پہلی حدیث دو حدیثوں سے مرکب ہے' راوی نے دونوں حدیثوں کو جمع کر کے ایک حدیث بنا دیا ہے۔'' **ثلاث اقسم عليهن** '' '' **باب فقر** '' **ثم قال** '' **احد ثكم حديثا فاحفظوه 'انما الدنيا'** ' ور جو تفسیرات تا ویلات کی محتاج ہیں تو یہ بعض راویوں کی طرف سے تصرفات ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۵۲۸۸ : وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اِذَا اَرَادَ بِعَبْدٍ خَيْرًا اِسْتَعْمَلَهٗ فَقِيْلَ وَكَيْفَ يَسْتَعْمِلُهٗ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ يُوَفِّقُهٗ لِعَمَلٍ صَالِحٍ قَبْلَ الْمَوْتِ (رواه الترمذي)

اخرجه الترمذي في السنن ٣٩٢/٤ حديث رقم ٢١٤٢ واحمد في المسند ١٠٦/٣

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حق تعالیٰ شانہ جب بندہ کی بھلائی (یعنی اس کے حسن انجام) کا ارادہ فرمالیتے ہیں تو اس سے اعمال خیر کرواتے ہیں۔'' پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ اس سے بھلائی کے کام اللہ کس طرح کرواتے ہیں؟ فرمایا ''اس کو موت سے پہلے اچھے عمل کی توفیق عنایت فرما دیتے ہیں''۔

(ترمذی)

تشریح: عمل کے اطلاق کے وقت یہی فرد اکمل ہے۔ حالانکہ ہمیشہ عمل کی توفیق اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ یہاں تک کہ توبہ اور عبادت کی حالت میں موت آ جاتی ہے۔ اور اس وجہ سے اس کو حسن انجام کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔

جامع میں '' **ثم يقبضه عليه** '' کی زیادتی ہے۔

تخریج و اسنادی حیثیت: امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ حاکم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے شیخین کی شرط پر ہے۔ منذری نے اس کو ذکر کیا ہے اور جامع میں ہے کہ امام احمد، ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ اور طبرانی نے اس حدیث کو ابوامامہؓ سے بایں نقل کیا ہے: '' **اذا اراد الله بعبد خيرا طهره قبل الموت قالوا وماطهر العبد؟ قال: عمل صالح يلهمه اياه حتى يقبضه عليه** ۔

''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اُس کو موت سے پہلے پاک کر دیتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ بندے کی پاکی کیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ نیک عمل جس کا ارادہ اللہ تعالیٰ انسان کے دل میں پیدا کر دیتا ہے۔

یہاں تک کہ اسی حالت پر اللہ تعالیٰ اُس کو اُٹھالیتا ہے۔"

اس حدیث کو امام احمد اور طبرانی نے ابوعتبہؓ سے نقل کیا ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں:

اذا اراد الله بعبد خيرا عسله۔ عین اور سین کے فتحہ کے ساتھ۔ قالوا: وماعسله؟ (اسی ضبط مذکور کے ساتھ)

قال: يفتح له عملا صالحا قبل موته ثم يقضبه عليه۔

اس حدیث کو امام احمد اور حاکم نے عمرو بن حمق۔ حا کے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ۔ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے

" اذا اراد الله بعبد خيرا استعمله قيل وما استعمله قال: يفتح له عملا صالحا بين يدى موته حتى يرضى عنه من حوله،

اس حدیث کو امام احمد اور ابن حبان نے ابوسعیدؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

" ان الله اذا رضى عن العبد النى عليه بسبعة اصناف من الخير لم يعمله، واذا سخط على العبد اثنى عليه بسبعة اصناف من الشر لم يعمله" ،انتہیٰ۔

عمل کا دار و مدار دونوں جگہ نیت پر موقوف ہے۔ یا کہ ظالم کی عبادت مظلوم کو دے دی جائے گی اور مظلوم کے مظالم ظالم کے سر ڈال دیئے جائیں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۲۸۹ : وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ. (رواه الترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذي في السنن ٤/ ٥٥٠ حديث رقم ٢٤٥٩ واخرجه ابن ماجه ٢/ ١٤٥٤ حديث رقم ٤٢٦٠ واحمد في المسند ٤/ ١٢٤

ترجمہ: "حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "عقلمند و بہادر آدمی وہ ہے جو اپنے نفس کو (اللہ تعالیٰ کے حکم و فیصلہ قضاء و قدر اور اس کی رضا خوشنودی کی خاطر فرمان الٰہی کا) تابع بنا دے اور اس جزائے عظیم (اچھے) عمل کرے جو موت کے بعد حاصل ہونے والی ہے۔ نیز بزدل اور بے وقوف شخص وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کے لئے جھکا دے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے"۔ (ترمذی' ابن ماجہ)

تشریح: الکیس: کاف کے فتحہ اور یا مشددہ کے ساتھ۔ وہ شخص جو عقلمند' سمجھدار اور اپنے کاموں میں محتاط ہو۔ یعنی اپنے نفس کو ذلیل کر کے اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند اور اللہ کے فیصلوں اور اللہ کی تقدیر کے سامنے جھکنے والا بنا دیا۔ نہایہ میں ہے کہ اپنے نفس کو ذلیل کر دے اور اللہ کا غلام بنا دے۔

بعض شارحین فرماتے ہیں معنی یہ ہے اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔ اور امام نووی فرماتے ہیں۔ کہ امام ترمذی اور دوسرے علماء نے دان نفسه، کا معنی حاسبها (نفس کا محاسبہ کرے) بیان کیا ہے۔ یعنی عقلمند وہ ہے۔ جو اپنی دنیاوی زندگی میں اپنے اقوال' احوال اور اعمال کا خود محاسبہ کرے، چنانچہ اگر اس کے اقوال، احوال اور اعمال بھلائی والے ہوں تو اللہ کا شکر ادا کرے اور اقوال احوال اور اعمال بُرے ہوں تو توبہ کرے۔ اور اس سے پہلے تلافی کرے کہ اس کا آخرت میں محاسبہ ہو۔ جیسا

کہ ایک روایت میں ہے کہ اپنے نفس کا حساب کرو قبل اس کے کہ (آخرت میں) تمہارا حساب کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ولتنظر نفس ماقدمت لغد﴾ [الحشر:۱۸] :اور ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل کے واسطے اس نے کیا بھیجا''۔

قوله: والعاجز من أتبع نفسه هوا هاوتمني على الله: عقل استعمال کرنے اور عمل میں احتیاط کرنے سے عاجز حاصل یہ کہ سمجھدار مؤمن وہ ہے۔ جو قوت رکھے (اپنے نفس کو قابو کرنے کی) اور ناسمجھ مؤمن وہ ہے جو کمزور ہو (اپنے نفس کو قابو کرنے سے) اور نادان۔

''اتبع''، اتباع، مصدر سے ماخوذ ہے۔ حرام کا ارتکاب کرے اور واجبات کو ترک کرے۔

یہ کہہ کر کہ میرا رب کریم ہے بخشنے والا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ماغرك بربك الكريم﴾ [الانفطار۔۶]
''تجھ کو کس چیز نے تیرے ایسے رب کریم کے ساتھ بھول میں ڈال رکھا ہے۔''

نیز ارشاد فرمایا: ﴿نبئ عبادی انی انا الغفور الرحیم وان عذابی هو العذاب الالیم﴾

[الحجر۔۴۹۔۵۰]

آپ میرے بندوں کو اطلاع دیدیجئے کہ میں بڑا مغفرت رحمت والا بھی ہوں اور (رہا) میرا عذاب (سو وہ بھی) بہت دردناک ہے۔''

نیز ارشار باری ہے: ﴿ان رحمة الله قريب من المحسنين﴾ [الاعراف۔۵۶]
بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت نزدیک ہے نیک کام کرنے والوں سے۔''

نیز ارشاد باری ہے: ﴿ان الذين امنوا والذين هاجروا وجاهدوا فى سبيل الله اولئك يرجون رحمة الله﴾

[البقرة:۲۱۸]

''حقیقتاً جو لوگ ایمان لائے ہوں، اور جن لوگوں نے راہ خدا میں ترک وطن کیا ہو اور جہاد کیا ہو ایسے لوگ تو رحمت خداوندی کے امیدوار ہوا کرتے ہیں''۔

حضور علیہ السلام نے حدیث شریف میں بغیر اطاعت کے اُمید رکھنے کو ''تمنی'' کے لفظ سے تعبیر کر کے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اس طرح ہونا محال کے قریب ہے۔ اگر چہ بلند و بالا بادشاہ (اللہ تعالیٰ) اگر اپنی طرف سے فضل و احسان کرے تو ممکن ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''عاجز'' وہ شخص ہے جس کا نفس اُس پر غالب ہو جائے۔ اور جس بات کا نفس حکم دے یہ انسان اُس کو کرے چنانچہ یہ شخص اپنے نفس سے مغلوب بن چکا ہے۔ اور اپنے نفس کو خواہشات کا تابع بنا دیا اور جو نفس نے طلب کیا وہ نفس کو دے دیا۔ ''کیس'' (دانا) کے مقابلہ میں ''عاجز'' ذکر کیا حالانکہ ''کیس'' کا حقیقی مقابل ''سفیه'' (بے وقوف کمزور رائے والا) ہے اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ ''کیس'' (دانا) ہی قادر ہے اور ''عاجز'' (نفس سے مغلوب) ہی بے وقوف ہے۔ اور ''تمنی علی اللہ'' کا معنی ہے اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور بغیر توبہ و استغفار کے جنت کی اُمید رکھتا ہے۔

تخریج: امام احمد اور حاکم نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔

الفصل الثالث:

۵۲۹۰ : وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنَّا فِيْ مَجْلِسٍ فَطَلَعَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلٰى رَاْسِهٖ اَثَرُ مَاءٍ فَقُلْنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَرَاكَ طَيِّبَ النَّفْسِ قَالَ اَجَلْ قَالَ ثُمَّ خَاضَ الْقَوْمُ فِيْ ذِكْرِ الْغِنٰى فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا بَاْسَ بِالْغِنٰى لِمَنِ اتَّقَى اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ وَالصِّحَّةُ لِمَنِ اتَّقٰى خَيْرٌ مِنَ الْغِنٰى وَطِيْبُ النَّفْسِ مِنَ النَّعِيْمِ۔ (رواه احمد)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۷۲٤/۲ رقم ۲۱٤۱ واحمد في المسند ۳۷۲/۵

ترجمہ: "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک شخص کہتے ہیں کہ ہم لوگ ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آ کر ہمارے درمیان تشریف لائے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر اقدس پر (غسل کے سبب) پانی کی تری تھی' ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس وقت ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت مسرور وخوش دل حالت میں دیکھ رہے ہیں۔ (جس کے آثار چہرہ انور پر عیاں ہیں)" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ہاں!" راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد اہل مجلس مالداری کے ذکر میں مشغول ہو گئے (یعنی آپس میں یہ گفتگو کرنے لگے کہ مالداری و دولتمندی اچھی چیز ہے یا بری چیز) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہماری) یہ گفتگو سن کر فرمایا: "اس شخص کا دولت مند ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہو اور (جسم کی) صحت مندی' خدا تعالیٰ سے ڈرنے والے (یعنی متقی و پرہیزگار) شخص کے لئے دولت مندی سے زیادہ بہتر ہے (اگرچہ وہ صحت مندی فقر و افلاس کے ساتھ ہو) نیز شادمانی وخوش دلی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔" (احمد)

تشریح: طلع علینا رسول الله ﷺ: یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح ظاہر ہوئے جیسا کہ سورج طلوع ہوتا ہے۔

قوله: فقلنا یا رسول الله نراك طیب النفس' قال: اجل:

اجل: ہمزہ اور جیم کے فتحہ اور لام کے سکون کے ساتھ۔

فقال لاباس بالغنى لمن اتقى الله عزوجل: حضور علیہ السلام نے 'لا بأس" کے لفظ سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے کیلئے فقر افضل ہے۔

قوله: والصحة لمن اتقى خير من الغنى: یعنی مطلقاً یا مطلب یہ ہے کہ تندرستی پرہیزگار کیلئے اُس مالداری سے بہتر ہے جو آخرت میں حساب اور بُرے انجام کا باعث ہو (وطیب النفس) خوشدلی جو کہ شکر اور صبر کا تقاضہ کرتی ہے۔ اور مالداری اور فقر ایسی حالت میں برابر ہے۔

قوله: وطیب النفس من النعیم: نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جس کو جنت نعیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ایک صاحبِ معرفت اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ولمن خاف مقام ربه جنتان﴾ (اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے

ڈرتا رہتا ہو اُسکے لئے دو باغ ہیں) کے بارے میں کہتا ہے کہ ایک جنت دُنیا میں ملے گی اور دوسری آخرت میں بعض فرماتے ہیں۔ کہ یہ (خوشدلی) اُن نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم﴾ [التکاثر۔۸] ''پھر (اور بات ہو کہ) اس روز تم سب سے نعمتوں کی پوچھ ہوگی'' میں کیا گیا ہے۔ اور یہ بات ہماری مذکورہ تشریح کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ جنس نعمت کا اکمل فرد ہے۔ جس کے علاوہ کسی دوسری چیز کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہی نعمت ہے۔ کیونکہ اس کے ماسوا کو'' ماء حمیم'' اور ''عذاب الجحیم'' میں سے شمار کیا جاتا ہے۔

تخریج: اسی طرح ابن ماجہ اور حاکم نے بھی یسار بن عبد سے روایت نقل کی ہے۔ جیسا کہ جامع میں مذکور ہے۔ چنانچہ ''رجل'' کا ابہام واضح ہو گیا' اگرچہ صحابی کا مجہول ہونا حدیث کی صحت کیلئے مضر نہیں ہے کیونکہ صحابہؓ تمام کے تمام عادل ہیں۔

۵۲۹۱ : وَعَنْ سُفْيَانِ الثَّوْرِيِّ قَالَ كَانَ الْمَالُ فِيمَا مَضٰى يُكْرَهُ فَاَمَّا الْيَوْمَ فَهُوَ تُرْسُ الْمُؤْمِنِ وَقَالَ لَوْلَا هٰذِهِ الدَّنَانِيرُ لَتَمَنْدَلَ بِنَا هٰؤُلَاءِ الْمُلُوْكُ وَقَالَ مَنْ كَانَ فِيْ يَدِهِ مِنْ هٰذِهِ شَيْءٌ فَلْيُصْلِحْهُ فَاِنَّهُ زَمَانٌ اِنِ احْتَاجَ كَانَ اَوَّلُ مَنْ يُّبَذِّلُ دِيْنَهٗ وَقَالَ الْحَلَالُ لَا يَحْتَمِلُ السَّرَفَ ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

اخرجه البغوی فی شرح السنة ٤ ١ / ٢٩٠ حدیث رقم ٤٠٩٨

ترجمہ: ''حضرت سفیان ثوریؒ بیان فرماتے ہیں کہ ماضی میں (ارباب حال کے نزدیک) مال کو برا تصور کیا جاتا تھا لیکن جہاں تک موجودہ زمانہ کا تعلق ہے تو اب مال و دولت مسلمانوں کی ڈھال ہے۔ حضرت سفیانؒ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ ''اگر ہم (لوگوں کے پاس) یہ مال بصورت درھم و دینار یا روپیہ پیسہ نہ ہوتا تو یہ (آج کل کے) حکمران ہمیں ذلیل و پامال کر ڈالتے'' نیز انہوں نے فرمایا ''کسی شخص کے پاس اگر تھوڑا بہت بھی مال ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کو کارآمد بنائے (یعنی اس کو ضائع ہونے سے بچائے بلکہ تدبیر و ہنرمندی کے ساتھ اس کو کسی تجارت وغیرہ میں لگا کر بڑھانے کی کوشش کرے یا یہ کہ اس کو بہت کفایت شعاری کے ساتھ برتے تاکہ جلدی ختم نہ جائے) کیونکہ یہ وقت ایسا ہے کہ اس میں اگر کوئی محتاج و مفلس ہوگا تو (دنیا حاصل کرنے کی خاطر) اپنے دین کو بیچ ڈالنے والا سب سے پہلا شخص وہی ہوگا'' حضرت سفیان کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ''مال حلال' اسراف کا متحمل نہیں رکھتا''۔ (شرح السنۃ)

تشریح: قولہ: کان المال فیما مضی...... فھو ترس المؤمن: حاصل یہ کہ مال حلال انسان کو مشتبہات اور حرام میں مبتلا ہونے سے بچاتا ہے ظلم کرنے سے روکتا ہے اور ظالموں کی مصاحبت سے محفوظ رکھتا ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ مال کے ذریعے انسان اپنے آپ کو عوام کے سامنے ریاکاری، شہرت سے بچاتا ہے۔

قولہ: وقال: لو لا ھذہ الدنانیر لتمندل بنا ھولاء الملوك:

ہمیں اپنے میل دور کرنے کیلئے رومال بنا دیتے یہ کنایہ ہے۔ ظالم اُمراء کے مظالم اور تذلیل سے یا یہ کنایہ ہے۔ مسائل کیلئے حیلہ کر کے اُن ظالم اُمراء کی موافقت کرنے سے۔ بعض شارحین فرماتے ہیں۔ کہ تمندل، مَدل سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے ''میل کچیل''۔ ایک شخص سے کسی نے کہا کہ مال تجھے دُنیا کے قریب کر دے گا۔ اُس نے جواب میں کہا اگر مال نے مجھے دُنیا کے قریب کر دیا تو اس نے مجھے دنیا کے مصائب سے محفوظ کر دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اگر میں مال چھوڑ کر دُنیا سے چلا جاؤں یہ اور

اللہ مجھ سے اُس مال کا حساب کرے یہ میرے لئے اس سے بہتر ہے کہ میں لوگوں کا محتاج ہوں یعنی اللہ کے سامنے میری احتیاج اللہ کے غیر کے سامنے احتیاج سے بہتر ہے۔

طبرانی نے اوسط میں مقدام بن معدی کرب سے مرفوعاً نقل کیا ہے **یأ تی علی الناس زمان من لم یکن معه اصفرولا ابیض لم یتهن بالعیش۔**

امام احمدؒ نے دوسرے الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

یاتی علی الناس زمان لاینفع فیه الا الدرهم والدینار۔ "لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جس میں درہم و دینار ہی نفع دیں گے۔"

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ دراہم زخموں کیلئے مرہم ہیں۔

قوله: فانه زمان ان احتاج کان اول من یبدل دینه: یعنی دنیا کو حاصل کرنے کیلئے اور لفظ "اول" منصوب ہے۔ بعض کے نزدیک مرفوع ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ شخص وہ پہلا شخص ہوگا جو اپنی ضرورت کی اشیاء حاصل کرنے کیلئے اپنا دین گنوائے گا۔ اگر لفظ "مَن" کو "ما" پر محمول کیا جائے جیسا کہ مالکی نے قطرب سے نقل کیا ہے۔ تو زیادہ واضح ہوتا اس کی تائید کشاف کی روایت سے ہوتی ہے: کشاف کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ "**کان اول ما یاکل دینه،** چنانچہ ما، اور "اول" کان کا اسم ہے اور "**دینه**" **کان**، کی خبر ہے۔

اس کے برعکس بھی ممکن ہے بلکہ یہ زیادہ بہتر ہے۔

قوله: وقال الحلالللا بحتمل السرف: اسلئے کہ حلال مال کا وجود کم ہے۔

یعنی زیادہ مقدار میں خرچ کرنا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس قول کے دو معانی ہیں۔

ایک مطلب یہ ہے کہ حلال مال زیادہ نہیں ہوتا ہے۔ اسلئے حلال مال زیادہ خرچ کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ چاہیے کہ حلال مال کو اسراف کے ساتھ خرچ نہ کرے تا کہ کسی دوسرے کا محتاج نہ ہوا تنی۔

دونوں معانی میں اشکال ہے۔ اسلئے کہ اسراف کا معنی ہے حد سے تجاوز کرنا بایں طور کہ ضرورت سے زیادہ بے جا خرچ نہ کرے اور اس معنی میں اسراف زیادہ مال اور تھوڑے مال دونوں میں ہوسکتا ہے۔ اور اسی طرح حلال مال اور حرام مال دونوں میں ہوسکتا ہے۔ چنانچہ زیادہ اچھا مطلب یہ ہے۔ کہ حلال مال کی خاصیت یہ ہے کہ اسراف کے ساتھ خرچ نہ ہو مثلاً مٹی گارے میں بغیر ضرورت کے استعمال کر۔ اور جیسا کہ ریاکاری اور شہرت کیلئے زیادہ کھانا کھلانا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے۔ کہ خیر میں کوئی اسراف نہیں اور اسراف میں کوئی خیر نہیں۔ اور اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ طالب کو چاہیے کہ مال حلال کو طلب کرے۔ اگر چہ کم ہو اور قناعت کرے اور اسراف کے ساتھ مال خرچ نہ کرے۔ تا کہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں مالداروں کا محتاج نہ بنا دے۔

۵۲۹۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُنَادِيْ مُنَادٍ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَيْنَ اَبْنَاءُ السِّتِّيْنَ وَهُوَ الْعُمُرُ الَّذِيْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَوَلَمْ نُعَمِّرْ كُمْ مَايَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَ كُمُ النَّذِيْرُ ۔

(رواه البيهقي في شعب الايمان)

رواه البيهقي في شعب الايمان ٧/٢٦٤ حديث رقم ١٠٥٤

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''منادی کرنے والا (فرشتہ) روز قیامت (اللہ تعالیٰ کے حکم سے) یہ آواز لگائے گا کہ ساٹھ سال کی عمر والے لوگ کہاں ہیں (یعنی دنیا میں جن لوگوں نے ساٹھ سال کی عمر پائی وہ اپنی عمر کا حساب دینے کے لئے پیش ہو جائیں) اور یہ عمر ایسی عمر ہے جس کے بارے میں اللہ جل جلالہ نے یہ ارشاد فرمایا ہے: کیا ہم نے تم کو ایسی عمر عطا نہیں کی تھی جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کرتا حالانکہ تمہارے پاس آگاہ کرنے والا بھی آیا۔ اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے''۔

تشریح: قوله: اولم نعمر كم ما يتذكر فيه من تذكر وجاء كم النذير: علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''ما'' موصوفہ ہے۔ یعنی کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہیں دی تھی جس میں وہ عقل مند نصیحت حاصل کر لیتا ہے۔ جس نے نصیحت حاصل کرنی ہو۔

وجاء كم النذير: یہ جملہ حالیہ ہے یعنی ڈرانے والا یا ڈرانا اور اس سے مراد بڑھاپا ہے۔ یا قرآن ہے یا رسول ہے۔ یا موت ہے یا ڈرانے والے کی جنس مراد ہے چنانچہ ہر ایک مذکور کو شامل ہوگا۔

٥٢٩٣ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ شَدَّادٍ قَالَ اِنَّ نَفَرًا مِّنْ بَنِىْ عُذْرَةَ ثَلٰثَةً اَتَوُا النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَسْلَمُوْا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَّكْفِيْنِيْهِمْ قَالَ طَلْحَةُ اَنَا وَكَانُوْا عِنْدَهٗ فَبَعَثَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْثًا فَخَرَجَ فِيْهِ اَحَدُهُمْ فَاسْتُشْهِدَ ثُمَّ بَعَثَ بَعْثًا فَخَرَجَ فِيْهِ الْاٰخَرُ فَاسْتُشْهِدَ ثُمَّ مَاتَ الثَّالِثُ عَلٰى فِرَاشِهٖ قَالَ قَالَ طَلْحَةُ فَرَاَيْتُ هٰؤُلَاءِ الثَّلٰثَةَ فِى الْجَنَّةِ وَرَاَيْتُ الْمَيِّتَ عَلٰى فِرَاشِهٖ اَمَامَهُمْ وَالَّذِى اسْتُشْهِدَ اٰخِرًا يَلِيْهِ وَاَوَّلُهُمْ يَلِيْهِ فَدَخَلَنِىْ مِنْ ذٰلِكَ فَذَكَرْتُ لِلنَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذٰلِكَ فَقَالَ وَمَا اَنْكَرْتَ مِنْ ذٰلِكَ لَيْسَ اَحَدٌ اَفْضَلَ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ مُّؤْمِنٍ يُعَمَّرُ فِى الْاِسْلَامِ لِتَسْبِيْحِهٖ وَتَكْبِيْرِهٖ وَتَهْلِيْلِهٖ۔

احمد بن حنبل' المسند۔

اخرجه احمد في المسند ١/١٦٣

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن شداد کہتے ہیں' قبیلہ بنو عذرہ کے کچھ افراد جن کی تعداد تین تھی' نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا (اور پھر وہ لوگ راہ خدا میں ریاضت کے ارادہ سے حصول علم دین کے لئے حضور ﷺ کے پاس ٹھہر گئے چونکہ یہ لوگ مالی لحاظ سے انتہائی خستہ حالت میں تھے اس وجہ سے اپنی ضروریات زندگی کی فراہمی پر خود قادر نہ تھے لہٰذا) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کون ہے جو ان لوگوں کی کفالت کر کے مجھے بے فکر کر دے؟ حضرت طلحہؓ نے عرض کیا کہ میں اس ذمہ داری کو قبول کرتا ہوں! چنانچہ وہ تینوں حضرات طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس رہنے لگے! (کچھ دن گزرنے کے بعد) جب حضور اقدس ﷺ نے کسی طرف ایک لشکر روانہ فرمایا تو اس لشکر) کے ہمراہ ان تینوں میں سے ایک

ایک آدمی گیا اور میدانِ جنگ میں (دشمنوں سے لڑتا ہوا) شہید ہو گیا' اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ایک اور لشکر روانہ فرمایا اس کے ساتھ ان میں سے دوسرا شخص نکلا اور وہ بھی شہید ہو گیا اور پھر تیسرا شخص اپنے بستر پر انتقال کر گیا (اور یہ شخص دلی طور پر کافروں سے جنگ کے لئے پرعزم تھا لیکن اسے میدان جنگ میں شہید ہونے کا موقع نہ مل سکا) راوی کہتے ہیں کہ حضرت طلحہؓ نے بیان فرمایا کہ (ان تینوں میں سے دو کی شہادت اور ایک کی قدرتی موت کے بعد ایک دن خواب میں) میں نے ان تینوں اشخاص کو جنت میں دیکھا' جو شخص اپنے بستر پر اللہ کو پیارا ہوا تھا اس کو میں نے ان میں سے سب سے آگے دیکھا اور جو شخص بعد میں شہید ہوا تھا اس کے ساتھ تھا جب کہ پہلے شہید ہونے والا شخص اس دوسرے کے ساتھ' چنانچہ (ان تینوں کو اس طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے دیکھ کر) میرے دل میں خلش پیدا ہو گئی کیونکہ اللہ کے نزدیک اس مسلمان سے زیادہ افضل کوئی نہیں ہے' جس نے مسلمان ہونے کی حالت میں طویل عمر پائی اور اس کی وجہ سے اس کو خدا کی تسبیح و تکبیر اور تہلیل (اور دیگر تمام مالی و بدنی عبادتوں) کا زیادہ موقع ملا"۔

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن شداد۔ جلیل القدر تابعی ہیں۔ مؤلف رحمہ اللہ نے ان کا اسم گرامی ذکر نہیں کیا۔

تشریح: قوله: ان نفرا من بني عذرة۔۔۔ قال طلحه: أنا فكانوا عنده: عذرة: عین کے ضمہ اور ذال کے سکون کے ساتھ' بنوعذرہ ایک مشہور قبیلہ ہے۔

ثلاثة: نصب کے ساتھ، نفرا، سے بدل ہے یا عطف بیان ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ هم "يكفي" کیلئے مضاف کی تقدیر پر دوسرا مفعول ہے۔

قوله: فبعث النبي ﷺ بعثا۔۔۔ ثم مات الثالث على فراشه: بعث: مبعوث کے معنی میں ہے۔

فاستشهد: مجہول کے صیغہ کے ساتھ۔

قوله: قال قال طلحة فذكرت ذلك للنبي ﷺ:

امامهم: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ بظاہر، امامهما، کہنا مناسب تھا مگر" امامهم" بول کر مراد یہ ہے کہ اُن تینوں میں سے آگے۔ یا اُس مذھب کے مطابق کہا گیا، جس میں جمع کے کم سے کم افراد دو ہوتے ہیں۔

و الذي: اس کا عطف، الميت، پر ہے اور ایک نسخہ میں" فالذي" کا لفظ ہے۔

و اولهم: نصب کے ساتھ اور بعض کے نزدیک رفع کے ساتھ۔

قوله: فقال: وما انكرت من ذلك الخ من ذالك: فاعل ابن مالک کے مذہب کے مطابق محذوف ہے۔

ليس احد افضل عندالله: جملہ مستانفہ علت کو متضمن ہے۔

يعمر: میم مفتوحہ کی تشدید کے ساتھ۔

جامع میں امام احمد کی ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

" تكبيره وتحميده وتسبيحه وتهليله۔

تخریج: امام میرک فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن شداد کی حدیث کو احمد اور ابو یعلی نے نقل کیا ہے۔ اور ان کے راوی صحیح کے روای ہیں۔ اور اس کے شروع میں امام احمد کی روایت میں ارسال ہے۔ لیکن ابو یعلی نے طلحہؓ کا ذکر کر کے اس روایت کو موصول کر دیا ہے اسی طرح منذری نے ترغیب میں فرمایا ہے۔ اور گویا کہ وہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، کہ عبداللہ بن شداد صحابی نہیں ہے اگر چہ وہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ جیسا کہ عجلی نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن شداد قابل اعتماد کبار تابعین میں سے ہیں اور انکا رشمار فقہاء میں ہوتا ہے۔ اور امام احمد نے اس حدیث میں سماع کی تصریح نہیں کی بلکہ یوں فرمایا: ان نفرا الخ' اور ابو یعلی نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ اس حدیث کو انہوں نے طلحہؓ سے نقل کیا ہے۔ عبداللہ بن شداد کی اس حدیث اور عبید بن خالد کی اس حدیث جس کا ذکر دوسری فصل میں ہوا ہے کے موافق ہے وہ روایت جس کو امام احمد نے سند حسن کے ساتھ ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے قال : كان رجلان من بني قضاعة أسلما مع رسول الله ﷺ فاستشهد احدها وأخر الآخر سنة قال طلحة بن عبيد الله : فرأيت المؤخر منها أدخل الجنة قبل الشهيد فتعجبت لذلك فأصبحت فذكرت ذلك للنبي ﷺ فقال رسول الله ﷺ : أليس قدصام بعده رمضان وصلى ستة آلاف ركعة وكذا وكذا ركعة صلاة سنة۔ وہ فرماتے ہیں کہ بنو قضاعہ کے دو آدمی ایک ساتھ رسول ﷺ کے پاس آ کر اسلام لائے اُن میں سے ایک صاحب شہید ہو گئے۔ اور دوسرے صاحب کا ایک سال بعد انتقال ہوا۔ طلحہ بن عبید فرماتے ہیں، کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ اُن میں سے بعد میں فوت ہونے والا شخص شہید سے پہلے جنت میں داخل ہوا۔ مجھے اس پر تعجب ہوا' چنانچہ صبح کو میں نے یہ واقعہ حضور علیہ السلام سے ذکر کیا۔ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا اس دوسرے شخص نے شہید کے بعد ایک رمضان کے روزے نہیں رکھے تھے۔ اور چھ ہزار اور اتنی اتنی رکعت نماز نہیں پڑھی تھی۔

اس حدیث کو ابن ماجہ نے ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور بیہقی نے طلحہؓ سے اسی طرح اس سے کچھ طویل حدیث نقل کی ہے۔ اور ابن ماجہ کی روایت کے آخر میں یہ زیادت نقل کی ہے فلما بينهما أبعد مما بين السماء والأرض۔ کہ ان کے درمیان کا فرق زمین اور آسمان کے درمیان مسافت سے زیادہ ہے۔

۵۲۹۴ : وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِيْ عُمَيْرَةَ وَكَانَ مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ عَبْدًا لَوْخَرَّ عَلٰى وَجْهِهٖ مِنْ يَّوْمِ وُلِدَ اِلٰى اَنْ يَّمُوْتَ هَرِمًا فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ لَحَقَّرَهٗ فِيْ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَوَدَّ اَنَّهٗ رُدَّ اِلَى الدُّنْيَا كَيْمَا يَزْدَادَ مِنَ الْاَجْرِ وَالثَّوَابِ. (رواهما احمد)

اخرجه احمد في المسند ٤/١٨٥۔

ترجمہ: ''حضرت محمد بن ابو عمیرہ رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں' انہوں نے ارشاد فرمایا کہ ''اگر کوئی بندہ اپنی پیدائش کے دن سے لے کر بڑھاپے میں مرنے تک (اپنی زندگی کے مکمل عرصہ کے دروان) صرف خدا کی طاعت و عبادت میں سجدہ ریز رہے تو وہ بھی اس (قیامت کے) (عمل کی خیرائے عظیم دیکھ کر) اپنی اس تمام طاعت و عبادت کو بہت کم خیال کرے گا اور یہ خواہش کرے گا کہ کاش اس کو دنیا میں پھر لوٹا دیا جائے تا کہ اس کا اجر و ثواب میں اضافہ ہو سکے''۔

(ان دونوں روایتوں کو امام احمد نے نقل کیا ہے)۔

تشریح: خر: خاء کے فتحہ اور راء کی تشدید کے ساتھ۔

من یوم: میم کے فتحہ کے ساتھ مبنی ہے اور بعض نے جر اور تنوین کے ساتھ ضبط کیا ہے۔

ہرما: ہاء اور را کے فتحہ کے ساتھ بمعنی، ذاھرم، اور ایک نسخہ میں را کے کسرہ کے ساتھ ہے بمعنی "شیخا کبیرا"۔

لحقرہ: قاف کی تشدید کے ساتھ۔

یعنی عمل کے اجر کو کم سمجھے۔

تخریج: اس حدیث کو امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور اس حدیث کو طبرانی نے عقبہ بن عبداللہ سے مرفوعاً ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: "**لوان رجلا یخر علی وجهه من یوم ولد الی یوم یموت هرما فی مرضاة الله لحقره یوم القیامة**" توکل اور صبر کا بیان اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**ومن یتوکل علی الله فهو حسبه**﴾ [الطلاق۔۳] "اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس (کی اصلاح) کے لئے کافی ہے" [﴿**ان الله یحب المتوکلین**﴾ [آل عمران۔۱۵۹] "اور آپ صبر کیجئے آپ کا صبر کرنا خاص اللہ ہی کی توفیق سے ہے"۔

نیز ارشاد باری ہے: ﴿**واصبروما صبرك الا بالله**﴾[النحل۔۱۲۷] **ان الله مع الصابرین**﴾ [البقرۃ۔۱۵۳، الانفال۔۴۶] "بلاشبہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتے ہیں" اللہ تعالیٰ نے صبر اور توکل کو ایک ساتھ ذکر کیا کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کو لازم ہیں۔ اور ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔

توکل کو مقدم ذکر کیا کیونکہ اسی کے نتیجہ میں صبر حاصل ہوتا ہے۔ اور اسی سے کڑوا بھی میٹھا بن جاتا ہے۔ اور پریشانی سہل ہو جاتی ہے۔ اللہ کی مدد صبر کے ساتھ ہے اور جس نے اللہ پر توکل کیا، اللہ اُسکے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ کسی پر توکل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کو اپنا وکیل بنالیا ہے' اپنے کام کا ذمہ دار ٹھہرالیا ہے اور اُسکی قدرت کی بناء پر اس کو اپنے کاموں کی اصلاح کا متکفل سمجھ لیا ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ توکل کا معنی یہ ہے کہ اس بات کا یقین رکھے کہ اس کو وہی نفع اور نقصان پہنچے گا جو اللہ نے اس کے لئے لکھ دیا ہے۔ (انتہی)

صبر کے مراتب:

صبر کے کئی مراتب ہیں:

پہلا مرتبہ: نفس کو مناہی سے روکنا۔ دوسرا مرتبہ: خواہشات اور لہو ولعب سے بچنا۔

تیسرا مرتبہ عبادات کی ادائیگی میں مشقتیں برداشت کرنا۔

چوتھا مرتبہ: مصیبتوں اور آزمائشوں کے وقت کڑوا گھونٹ پینا اور صبر کرنا۔

صبر کی لغوی تحقیق:

نہایہ میں لکھتے ہیں: کہا جاتا ہے: توکل بالامر اس وقت کہا جاتا ہے جب بجا آوری کی ضمانت لے، اور وکلت

امری الی فلان، کا معنی ہے میں نے اپنا کام اُسکے سپرد کر دیا اور اُس کام میں اُس شخص پر اعتماد کیا' اور وکل فلان فلانا، کا معنی ہے کہ فلاں نے فلاں کو اپنے کام کیلئے کافی سمجھا اس لئے کہ اس کی کفایت پر اعتماد ہے یا بذات خود کام کرنے سے عاجز ہے۔ اور وکیل سے مراد وہ قیم ذات ہے جو بندوں کے رزق کا کفیل ہو۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ جو کام سپرد کیا گیا ہو اُس کام کے کرنے میں خود مختار ہو۔

امام راغب فرماتے ہیں کہ ''صبر'' کا معنی ہے ''نفس کو تنگی میں روکے رکھنا'' کہا جاتا ہے: ''صبرت الدابة'' کہ میں نے جانور کو بغیر چارہ کے باندھے رکھا ''صبر'' کا معنی ہے نفس کو اُس چیز پر قائم و باقی رکھنا جس کا تقاضا عقل و شرع کرے' یا نفس کو اُن چیزوں سے روکے رکھنا جس سے روکنے کا تقاضا عقل اور شریعت تقاضا کرے۔ چنانچہ لفظ ''صبر'' عام ہے۔ اور مواقع کے اختلاف کی وجہ سے اس کا نام مختلف ہوتا رہتا ہے' لہٰذا اگر کسی مصیبت کے وقت نفس کو قابو میں رکھے تو اس کو ''صبر'' کہتے ہیں، اور اس کی ضد ''جزع'' ہے' اور اگر جنگ کے دوران نفس کو قابو میں رکھے اس کو ''شجاعت'' کہتے ہیں، اور اس کی ضد ''بزدلی'' ہے۔ اور اگر کسی پریشانی میں ہو تو اس کو ''رحب الصدر'' کہتے ہیں اور اس کی ضد ''ضجر'' آتی ہے۔ اور اگر بات کرنے سے اپنے نفس کو روکے اس کو ''کتمان'' کہتے ہیں اور اس کی ضد افشاء ہے۔ اور تھوڑی سی دنیا پر نفس کو قابو میں رکھنا ''قناعت'' ہے۔ اور اس کی ضد ''شرہ'' ہے۔ (انتہیٰ)

سری سقطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ عارفین کے ہاں توکل کا معنی ہے: لانخلاع من الحول والقوة بلا نزاع (بغیر نزاع کے قوت اور طاقت سے خالی ہونا)۔

ابن مسروق فرماتے ہیں توکل کا معنی ہے احکام میں فیصلہ کرنے کیلئے اپنے آپ کو سپرد کرنا۔

جنیدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ توکل کا معنی یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے اس طرح مٹا دے۔ جیسا کہ اس کا وجود ہی نہیں اور اللہ تعالیٰ اس شخص کیلئے اس طرح ہو جائے جیسا کہ ازل سے ہے۔

صبر کی اقسام:

صبر تین قسم پر ہے:

پہلی قسم عوام کا صبر۔ عوام کا صبر یہ ہے کہ نفس کو ناگواریوں پر قابو میں رکھے۔

دوسری قسم: خواص کا صبر۔ خواص کا صبر یہ ہے کہ چیں بجبیں ہوئے بغیر کڑوے گھونٹ پی جانا۔

تیسری قسم: اخص الخواص کا صبر۔ اس قسم کا صبر یہ ہے کہ آزمائش سے لذت حاصل ہو۔ اور اسی سے مرتبہ شکر اور رضاء بالقضاء کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ اور مروی ہے: اعبد الله على الرضا فان لم تستطع فالصبر على ماتكره خير كثير: کہ اللہ کے فیصلوں پر راضی ہو کر اللہ کی عبادت کرو' اگر اتنا نہ کر سکو تو ناگواریوں پر صبر کرنا خیر کثیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فعسى ان تكرهوا شيئا ويجعل الله فيه خيرا كثيرا﴾ ''تو ممکن ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر کوئی بڑی منفعت رکھ دے۔''

۵۲۹۵ : عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِيْ سَبْعُوْنَ اَلْفًا بِغَيْرِ حِسَابٍ هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَسْتَرْقُوْنَ وَلَا يَتَطَيَّرُوْنَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (متفق علیہ)

اخرجه البخاري في صحيحه ٣٠٥/١٢ حديث رقم ٦٤٧٢ومسلم في صحيحه ١٩٨/١ حديث رقم (٣٧٢-٢١٨) واخرجه الترمذي في السنن ٥٤٠/٤ حديث رقم ٢٤٣٧ابن ماجه ١٤٣١/٢ حديث رقم ٤٢٨٦ والدارمي في السنن ٤٢٢/٢ حديث رقم ٢٨٠٧ واحمد في المسند ٤٤١/٤۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری اُمت میں سے ستر ہزار افراد بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں نہ جو منتر کراتے ہیں اور نہ شگون لیتے ہیں اور (اپنے تمام امور میں خواہ کسی چیز کو اختیار کرنا ہو خواہ چھوڑنا) صرف اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله: يدخل الجنة من امتي سبعون الفابغير حساب**: ''یعنی ان کے متبعین سے قطع نظر'' یہ اُس حدیث کے منافی نہیں جس میں وارد ہوا ہے: **ان مع كل واحد منهم سبعون الفا**۔ کہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار متبعین ہونگے۔

هم الذين لا يسترقون: یعنی جو منتر طلب نہیں کرتے مطلقاً یا مطلب یہ ہے کہ جو قرآنی کلمات اور اسماءِ الٰہی کے علاوہ کے ذریعہ منتر نہیں کرتے،

ولا يتطيرون: یعنی پرندے وغیرہ سے بدشگونی نہیں لیتے اور حیوانات ومسموعہ کلمات کو شر وخیر کی علامت نہیں سمجھتے بلکہ اس طرح کہتے ہیں جیسا کہ مروی ہے: **اللهم لاطير الا طيرك 'ولاخير' ولا إله غيرك 'اللهم لايأتي بالحسنات الاانت' ولا يذهب بالسيئات الاانت**۔ اے اللہ تیرے فیصلہ کے علاوہ کسی کا فیصلہ نہیں' تیری بھلائی کے علاوہ کوئی بھلائی نہیں ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اے اللہ! تو ہی اچھے حالات پیدا کرتا ہے اور تو ہی تکالیف ختم کرتا ہے۔

''**وعلى ربهم يتوكلون**'' جو کام کرتے ہیں، اور جو کام چھوڑتے ہیں۔ (سب میں اللہ پر توکل کرتے ہیں)۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ'' **لا يسترقون** اور **لا يتطيرون**'' دونوں جملوں کو ایک ساتھ ذکر کرنے سے استیعاب مقصود ہے۔ جیسا کہ کوئی یہ کہے: '' **لاينفع زيد ولا عمرو**'' اس کا مطلب ہوتا ہے: '' **لا ينفع انسان**'' (کوئی انسان کسی کو نفع نہیں پہنچا سکتا)۔

صاحب نہایہ فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا صفات اولیائے کاملین کی خصوصیات میں سے ہیں۔ یہ اولیاء اللہ دنیا کے اسباب اور وسائل سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ اور دنیا سے تعلق رکھنے والی کسی بھی چیز کی طرف التفات نہیں کرتے اور یہ خواص کا درجہ ہے جس تک دوسروں کی رسائی نہیں ہوتی۔ اور جہاں تک عوام کی بات ہے تو اُن کیلئے دوا حاصل کر کے علاج معالجہ کرانے میں کوئی مضائقہ نہیں اور جو شخص کسی مصیبت میں مبتلا ہونے پر اُس مصیبت پر صبر کرے۔ اور پھر دُعا کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشادگی اور راحت کا منتظر ہو۔ تو وہ شخص یقیناً اولیاء اللہ اور خواص میں سے ہے۔ اور جو شخص اس پر صبر نہ کر سکے اُسکے لئے اجازت ہے کہ دُعا و تعویذ اور دوا علاج کے ذریعے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنیکی کوشش کرے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنا سارا مال و اسباب اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کیلئے حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا۔ تو آپ علیہ السلام نے کوئی انکار نہیں کیا کیونکہ آپ ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے یقین اور صبر کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کے برعکس ایک اور شخص نے جب کبوتر کے انڈے کے برابر ہونا، حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا اور کہا کہ میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں تو حضور علیہ السلام نے اس کو قبول نہیں فرمایا بلکہ اُن صاحب کو یوں مارا کہ اگر اچھی طرح لگ جاتی تو زخمی ہو جاتا اور اس کو ڈانٹا بھی۔

حضور علیہ السلام کو غصہ اس وجہ سے نہیں آیا کہ وہ صحابی اپنا سارا مال خُدا کی راہ میں خرچ کرنے کیلئے لایا بلکہ اس وجہ سے ناراض ہوئے۔ کہ اُس صاحب نے یہ کہہ کر ''میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے'' اپنا راز اور اپنا حال ظاہر کیا نیز اس میں ریاء کاری اور شہرت کا وہم ہے۔ واللہ اعلم۔

امام نوویؒ نے مسلم کی شرح میں لکھا ہے کہ مازریؒ فرماتے ہیں، کہ بعض شارحین نے اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ دوا کے ذریعے علاج کرانا مکروہ ہے۔ لیکن اکثر علماء اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں۔ اور انہوں نے اُن احادیث سے استدلال کیا ہے۔ جن میں ادویہ کے منافع منقول ہیں، اور اس سے استدلال کیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے علاج کرایا ہے۔ اور اُن احادیث سے استدلال کیا ہے۔ کہ جن میں عائشہؓ سے حضور علیہ السلام کے کثرت علاج کے بارے میں منقول ہے۔ اور اسی طرح اُن روایات سے استدلال کیا ہے کہ جن میں دم و تعویذ سے علاج کرانا منقول ہے۔ جب دوا سے علاج کرنا ثابت ہے تو اس حدیث کو ان لوگوں پر محمول کیا جائے گا۔ جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ادویہ بذاتِ خود نفع دیتے ہیں۔ اور اس بات کو اللہ کی طرف منسوب نہیں کرتے۔

حدیث مذکور کی مذکورہ توجیہ کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں صراحت ہے کہ یہ لوگ کامل اولیاء ہیں، اور اللہ کے منتخب برگزیدہ بندے ہیں۔ چنانچہ زیادہ دُرست وہی بات ہے۔ جو صاحب نہایہ نے لکھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اہل ہدایت کے حق میں یہ بات زیادہ بہتر ہے کہ غیر عادی اسباب کو استعمال نہ کرے اگرچہ عوام کیلئے اس طرح کرنا جائز ہے۔ اور حضور علیہ السلام نے دوا کے ذریعے جو علاج کیا ہے اس فعل کو رخصت پر محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے عام اُمت کی رعایت کرتے ہوئے رخصت کو اختیار کیا ہے: [انما یوفی الصابرون أجرھم بغیر حساب] [الزمر۔ ۱۰] ''مستقل مزاج والوں کو ان کا صلہ بے شمار ہی ملے گا'' واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

۵۲۹۶ : وَعَنْهُ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ عُرِضَتْ عَلَيَّ الْاُمَمُ فَجَعَلَ يَمُرُّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَهُ الرَّجُلُ وَالنَّبِيُّ وَمَعَهُ الرَّجُلَانِ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَهُ الرَّهْطُ وَالنَّبِيُّ وَلَيْسَ مَعَهُ اَحَدٌ فَرَاَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْاُفُقَ فَرَجَوْتُ اَنْ يَكُوْنَ اُمَّتِيْ فَقِيْلَ هٰذَا مُوْسٰى فِيْ قَوْمِهٖ ثُمَّ قِيْلَ لِيْ اُنْظُرْ فَرَاَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْاُفُقَ فَقِيْلَ لِيْ اُنْظُرْ هٰكَذَا وَهٰكَذَا فَرَاَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْاُفُقَ فَقِيْلَ هٰؤُلَاءِ اُمَّتُكَ وَمَعَ هٰؤُلَاءِ سَبْعُوْنَ اَلْفًا قُدَّامَهُمْ

يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ هُمُ الَّذِيْنَ لَايَتَطَيَّرُوْنَ وَلَايَسْتَرْقُوْنَ يَكْتَوُوْنَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ فَقَامَ عُكَّاشَةُ بْنُ مِحْصَنٍ فَقَالَ اُدْعُ اللّٰهَ اَنْ يَّجْعَلَنِيْ مِنْهُمْ قَالَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ مِنْهُمْ ثُمَّ قَامَ رَجُلٌ اٰخَرُ فَقَالَ اُدْعُ اللّٰهَ اَنْ يَّجْعَلَنِيْ مِنْهُمْ قَالَ سَبَقَكَ بِهَا عُكَّاشَةُ. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤٠٥/١١ حدیث رقم ٦٥٤١ومسلم فی صحیحه ١٩٩/١ حدیث رقم (٣٧٤-٢٢٠) والترمذی فی السنن ٥٤٤/٤ حدیث رقم ٢٤٤٦

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ (حالت کشف یا خواب میں) مجھ پر امتوں کو (ان کے انبیاء کے ساتھ) پیش کیا گیا (یعنی ہر نبی کو اس کی امت کے ساتھ دکھایا گیا) پس (جب ان انبیاء نے اپنی امتوں کے ساتھ گزرنا شروع کیا تو ایک نبی گزرے ان کے ساتھ صرف ایک آدمی تھا (یعنی دنیا میں اس نبی کی) اور ایک نبی ایسے تھے کہ ان کے ساتھ دو افراد تھے ایک اور نبی گزرا تو اس کی معیت میں پوری ایک جماعت تھی اور پھر ایک نبی ایسا بھی گزرا کہ ان کے ہمراہ ایک بھی شخص نہیں تھا (یعنی دنیا میں کوئی بھی ان کا پیروکار نہ بن سکا) اس کے بعد میں نے (اپنے سامنے) ایک بہت بڑا گروہ دیکھا جو آسمان کے کناروں تک پھیلا ہوا تھا (اتنی بڑی امت دیکھ کر) مجھے امید ہوئی کہ یہ میری امت ہوگی۔ لیکن مجھے بتایا گیا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی امت کے ہمراہ ہیں (یعنی ان کے ساتھ جوان پر ایمان لائے تھے) پھر مجھ سے کہا گیا کہ ذرا آپ ﷺ (نگاہ) اٹھا کر تو دیکھئے میں نے (جو نظر اٹھائی تو اپنے سامنے) ایک بہت وسیع ہجوم کا نظارہ کیا جو آسمان کے کناروں تک پھیلا ہوا ہے (میں اتنا بڑا انبوہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا اور خدا کا شکر ادا کیا) پھر مجھ سے کہا گیا کہ (آپ ﷺ) اس انبوہ کو بس نہ سمجھئے آپ (ﷺ) اس سے کہیں زیادہ لوگوں کو دیکھیں گے) ذرا اِدھر اُدھر یعنی دائیں بائیں بھی نظر گھما کر تو دیکھئے چنانچہ میں نے (دائیں بائیں) نگاہ پھیر کر) دیکھا تو (دونوں جانب) بے پناہ ہجوم تھا جو آسمان کے کناروں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بعد (مجھے) کہا گیا کہ (آپ ﷺ) کے سامنے اور دائیں بائیں آسمان کے کناروں تک جو انسانوں کا ایک بحر بیکراں دکھائی دے رہا ہے) یہ سب آپ (ﷺ) کی امت کے لوگ ہیں اور ان کے ساتھ (یعنی منجملہ ان لوگوں کے یا ان کے علاوہ مزید) ان کے آگے ستر ہزار لوگ ایسے ہیں جو جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو نہ بدشگون نہیں لیتے ہیں نہ منتر پڑھواتے ہیں اور نہ اپنے جسم کو دغواتے ہیں اور اپنے پروردگار پر پورا بھروسہ کرتے ہیں۔ یہ سن کر ایک صحابی عکاشہ بن محصن کھڑے ہوئے اور درخواست کی کہ (یا رسول اللہ ﷺ) اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ وہ مجھے انہی لوگوں میں شامل فرما دے (جو خدا پر مکمل اعتماد کرتے ہیں اور بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے) حضور ﷺ نے دعا فرمائی ''الٰہی عکاشہ'' کو ان لوگوں میں شامل فرما دے'' پھر ایک اور شخص کھڑا ہوا اور اس نے بھی عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا فرما دیجئے کہ وہ مجھے ان لوگوں میں شامل فرما دے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اس دعا کے سلسلہ میں عکاشہ تجھ سے سبقت لے گئے''۔

تشریح: قوله: فقال عرضت علی الامم...... ولیس معه احد:

فجعل یمر النبی لام تعریف جنس کیلئے ہے اور لام جنس وہ ہے جس کے مدخول کی حقیقت ہر ایک کو معلوم ہو۔ چنانچہ لام جنس کا مدخول بمنزلہ نکرہ کے ہوتا ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہے کہ جس وقت اُمتوں کو مجھ پر پیش کیا گیا تو اُن کے نبی ان میں موجود تھے

اور یہاں نبی سے مراد رسول ہیں جو تبلیغ احکام کا مامور ہے اور، رجولیت، (مرد ہونے) کی قید واقعی اور اکثری ہے یا مثالی قضیہ ہے اور اس سے مراد وحدت، تثنیہ اور جمع ہے۔

قوله:فرأيت سوادا كثيرا ـــــ هذا موسى فى قومه:

قوله:ثم قيل لى انظر يدخلون الجنة بغير حساب: گویا کہ حضور علیہ السلام نے اس وقت اپنا سر مبارک جھکا دیا تھا۔اور حیاء کی وجہ سے اس اُمتوں کے گروہ سے اعراض کیا۔اس لئے آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ آپ دیکھے آپ کو افراد کی جماعت نظر آئیگی۔اس منظر کو دیکھ کرو۔

سبعون الفاقدامهم: اور ایمیں اُمت کیلئے بہت بڑی منقبت ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کی اُمت کے یہ ستر ہزار افراد اُن کے علاوہ ہیں۔اور یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ منجملہ اُن کے ستر ہزار افراد ایسے بھی ہیں۔اس دوسرے معنی کی مائید بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے جس کے الفاظ ہیں:" **هذه امتك ويدخل الجنة من هؤلاء سبعون الفا**"

هم الذين لا يتطيرون الخ: جملہ استینافیہ ہے۔

قوله: ولايكتوون: سوائے بقدر ضرورت کے کیونکہ بعض صحابہ نے داغ لگوائے ہیں ان میں سے سعد بن ابی وقاص بھی ہے۔جو کہ عشرہ مبشرہ میں سے ہے۔یا معنی یہ کہ مطلقاً یہ لوگ داغ نہیں لگواتے کیونکہ اللہ کے تقدیر وقضاء پر راضی ہوتے ہیں، اور (مصیبت کے دفع کرنے کی بجائے) اس سے ایک خاص لذت محسوس کرتے ہیں، اوران کو اس بات کا مکمل یقین ہے۔کہ فائدہ اور نقصان پہنچانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اور حقیقت میں اللہ کے سوا کوئی مؤثر نہیں۔گویا مرتبہ مشہور پر فائز ہوتے ہیں۔اوران کی نظر میں ان کا وجود اور عدم برابر ہے اور انہیں نفسانی خواہشات کے اعتبار سے فنا کا مقام حاصل ہوتا ہے اور اپنے نفوس کی نگرانی کر کے اللہ کے حقوق کی ادائیگی کرتے ہیں۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:[**وعلى ربهم يتوكلون**] اپنے پرودگار پر توکل کرتے ہیں۔"

قوله:فقام عكاشة بن محصن فقال ادع الله يجعلنى منهم:

عكاشه: عین کے ضمہ کے ساتھ اور کاف کی تشدید یا تخفیف کے ساتھ جیسا کہ قاموس اور مغنی میں ہے۔

حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ نے کتنا اچھا اور قیمتی سوال کیا اور حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ کا یہ سوال اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت عکاشہؓ ایک کامل شخصیت تھے اور عقلمندی کے بلند مرتبہ تک پہنچ چکے تھے۔اس لئے کہ انہیں یہ بات معلوم ہوئی کہ اس حال اور مقام تک پہنچے کا واحد راستہ یہی ہے۔**قوله: ثم قام رجل آخر** ......کہ حضور علیہ السلام اللہ سے دُعا کریئے۔اور دُعا وسیلہ بن جائے (عکاشہؓ) اُن کے اعمال جیسے اعمال کا ارادہ کر چکے تھے بلکہ اُن کے اوصاف جیسے اوصاف کے ساتھ متصف تھے، اور دوسرے شخص نے کسی عمل اور صفت کا اہتمام اور قصد کیے۔بغیر صرف تمنا کی اور کسی ایمانی صفت کے ساتھ متصف ہوئے، بغیر صرف تقلید کرتے ہوئے دُعا طلب کی۔

اس واقعہ میں عکاشہؓ کی سبقت کو واضح کیا گیا۔جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے:" **ان الصبر عند الصدمة الاولى**"

(اصل صبر تو پہلے صدمہ کے وقت ہوتا ہے) اور شاید دوسرے شخص کیلئے دُعا اس وجہ سے نہیں کی کہ اس طرح اس بات کا دروازہ کھل جائے گا۔ کہ صرف دُعا پر اکتفاء کریں گے۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ دوسرے شخص کیلئے اس وجہ سے دُعا نہیں مانگی کہ حضور علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے اُس مجلس میں صرف ایک ہی شخص کے حق میں دُعا کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔

حضور علیہ السلام کے اس ارشاد گرامی میں اس بات کی ترغیب ہے کہ نیک بزرگانِ دین سے دعاؤں کی درخواست کی طرف سبقت اور جلدی کرنی چاہئے کیونکہ تاخیر میں آفات ہیں۔ بعض شارحین نے لکھا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے دوسرے شخص کیلئے دعا اسلئے نہیں کی کہ یہ دوسرا شخص دراصل منافق تھا۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے حُسن اخلاق کی وجہ سے ایک مجمل جواب دیا اور صراحۃً یہ نہیں فرمایا کہ تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو۔ انتہیٰ۔

بعض نے یہ جواب بھی دیا ہے۔ کہ وحی کے ذریعے حضور علیہ السلام کو صرف عکاشہؓ کے حق میں دُعا کی اجازت دی گئی تھی اور یہ اجازت اُس دوسرے شخص کے حق میں نہیں تھی۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ کہ بعض شراح حدیث کے نزدیک دوسرا شخص اپنی باطنی حیثیت کے اعتبار سے اس منزلت کا مستحق نہیں تھا اور اس مرتبہ کے لوگوں کی صفات کے ساتھ متصف نہیں تھا۔ بخلاف عکاشہ کے علامہ طیبی کی شرح میں لکھا ہے۔ کہ شیخ فرماتے ہیں کہ خطیب بغدادی نے اپنی کتاب "الاسماء المبهمة" میں لکھا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص سعدؓ بن عبادہ ہیں اگر یہ بات دُرست ہو تو اُن لوگوں کی بات باطل ہو جائیگی جو یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص منافق تھا۔

۵۲۹۷ : وَعَنْ صُهَيْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ لَهٗ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّآءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهٗ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهٗ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٢٩٥/٤ حديث رقم (٦٤-٢٩٩٩) واخرجه الدارمي في ٤٠٩/٢ حديث رقم ٢٧٧٧ واحمد في المسند ١٧٧/١

ترجمہ: "حضرت صہیب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مومن کا معاملہ اور شان بھی انوکھی ہے کہ اس کی ہر حالت اس کے لئے خیر و بھلائی کا باعث ہے اور ایسا معاملہ صرف مؤمن کے ساتھ مخصوص ہے کوئی اور اس کے وصف میں شریک نہیں ہے اگر اس کو (رزق و فراخی و وسعت راحت، چین، صحت و تندرستی، نعمت و لذت اور طاعت و عبادت کی توفیق کی صورت میں) خوشی ملتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کرتا ہے، بس یہ شکر اس کے لئے باعث خیر و بھلائی بن جاتا ہے اور اگر اس کو (فقر و افلاس، مرض و تکلیف، رنج و الم اور آفات و حادثات کی صورت میں) مصیبت آ پہنچتی ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے۔ پس یہ صبر بھی اس کے لئے باعث خیر و بھلائی میں جاتا ہے"۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: عجبا لأ مر المؤمن ان أمره كله له خير:

ان امره كله بنصب کے ساتھ اور رفع بھی جائز ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری: [قل ان الامر كله لله] [آل عمران-۱۵۴] دونوں اعراب کے ساتھ پڑھا گیا ہے یعنی ان کے تمام امور انجام کے اعتبار سے اس کے لئے بہتر ہے۔ اگرچہ بعض امور ظاہری

طور پر فی الحال بُرے اور ناگوار ہیں۔ظرف (جار اور مجرور) کو اہتمام کی وجہ سے مقدم کیا گیا۔

ولیس ذلك لأ حدالا للمؤ من:

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ضمیر کی بجائے اسم ظاہر کو ذکر کیا تا کہ علیت پر دلالت کرے۔انتھی، ملا علی قاری فرماتے ہین، کہ اس میں اشکال ہے کیونکہ علیّت پر دلالت کرنے میں اسم ظاہر اور اسم مضمر دونوں برابر ہیں، شاید اس طرح کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ صراحتاً دلالت ہو جائے کیونکہ (ضمیر کے ذریعے) اشارہ کرنے سے اسم ظاہر ذکر کرنے میں تاکید ہے۔ اس کے بعد مزید وضاحت کیلئے حضور علیہ السلام نے اچھی بات فرما

قوله: ان اصابته سراء شكر فكان خير اله...... :اسی وجہ سے بعض عارفین کی یہ بات واضح ہوگئی جو یہ کہتے ہیں کہ مطلقاً صابر فقیر کے شاکر غنی سے افضل ہونے کا قول درست نہیں ہے۔حالت تفویض وتسلیم اولی ہے اور وقت کے مقتضی کے مطابق بجا آوری اختلاف احوال اور تفاوت حال کے اعتبار سے اعلیٰ ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**و الله يعلم و انتم لا تعلمون**﴾ [البقرۃ:٢١٦] ''اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم (پوراپورا) نہیں جانتے۔''

نیز ارشاد باری ہے: ﴿**ان ربك يبسط الرزق لمن يشاء ويقدر انه كان بعباده خبيرا بصيرا**﴾ [الاسراء:۳۰] ''بلاشبہ تیرا رب جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور وہی تنگی کر دیتا ہے۔بے شک وہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے دیکھتا ہے''۔

حدیث قدسی میں ہے: **ان من عبادی من لايصلحه الا الفقر 'فلوأ غنيته لفسد حاله 'و ان من عبادی من ليلصلحه الا الغنى 'فلوأ فقر ته لضاع حاله** ۔میرے بندوں میں سے بعض بندے ایسے ہیں، جن کی اصلاح صرف فقر سے ہوتی اگر میں ان کو مال دے دوں تو ان کی حالت بگڑ جائیگی۔اور اسی طرح میرے بندوں میں سے بعض ایسے ہیں، جن کی اصلاح صرف مالداری سے ہوتی ہے۔اگر میں ان کو فقیر بنادوں تو ان کی حالت بگڑ جائے۔

اسی وجہ سے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ فقر اور مالداری دو سواریاں ہیں مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ کسی پر بھی سوار ہو جاؤں۔

اسی بناء پر اس میں بھی اختلاف ہوا ہے۔کہ اللہ کی عبادت کیلئے عمر کی درازی طلب کرنا افضل ہے یا فتنہ کے خوف سے موت طلب کرنا افضل ہے۔اسی طرح اللہ کی عبادت کیلئے عمر کا طول طلب کرنا افضل ہے یا اللہ کی ملاقات کے شوق سے موت طلب کرنا افضل ہے لہٰذا قابل اعتماد قول یہی ہے۔کہ احوال و افراد کے اختلاف سے حکم کا اختلاف ہوتا ہے۔جیسا کہ حضور علیہ السلام نے اپنی دُعا میں ارشادہ کیا **اللهم أحيني ما كانت الحياة خيرا لي وتوفني اذا كانت الوفاة خيرا لي' واجعل الحياة زيادة لي في كل خير'واجعل الموت راحة لي من كل شي**''اے اللہ! مجھے اُس وقت تک زندہ رکھ جب تک زندہ رہنا میرے حق میں بہتر ہو اور جس وقت مرنا میرے حق میں بہتر ہو تو مجھے موت دیدو اور زندگی کو میرے لئے ہر خیر کی زیادتی کا ذریعہ بنا اور موت کو میرے لئے ہر شر سے چھٹکارے کا ذریعہ بنا۔''

اور یہ صرف کامل مؤمن کی شان ہے کہ ہر حالت میں (فراخی وتنگی میں) اس کے لئے بھلائی اور خیر ہے۔اسلئے کہ انسان اگر کامل مؤمن نہ ہو تو اگر اس کو فراخی اور وسعت حاصل ہو تو اکڑتا ہے اور ہٹ دھرمی کرتا ہے۔اور اگر تنگی اور فقر آجائے تو جزع

فزع کرتا ہے۔ بخلاف مؤمن کامل کے اس کی حالت ایسے ہوتی ہے جیسا کہ ایک صاحب کمال کہتا ہے:

اذا کان شکر نعمة الله نعمة

علی له فی مثلها یجب الشکر

جب اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرنا بھی مجھ پر ایک نعمت ہے تو اس کا شکر بھی واجب ہے۔

فکیف بلوغ الشکر الا بفضله

وان طالت الایام واتسع العمر

انسان صرف اللہ کے فضل سے ہی شکر کے حق تک پہنچ سکتا ہے اگر زمانہ طویل ہو اور عمر لمبی ہو جائے تو پھر کیسے ہو۔

اذامس بالنعماء عم سرورها

وان مس بالضراء اعقبه الاجر

اگر انسان کو اللہ کسی نعمت سے نوازے تو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اگر آزمائش میں مبتلا کر دے تو اس پر اللہ اجر دیتا ہے۔

تخریج: اسی طرح امام احمد نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ اور امام احمد اور ابن حبان نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: **عجبت للمؤمن ان الله تعالٰی لم یقض له قضاء الا کان خیرا له۔**

''مجھے مؤمن بہت اچھا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے جو بھی فیصلہ کرتا ہے تو اس میں اس کے لئے خیر ہے۔''

طیالسی اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت سعدؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: **عجبت للمسلم اذا اصابته مصیبته احتسب وصبر 'واذا أصابه خیر حمد الله وشکر 'ان المسلم یؤجر فی کل شیئی حتی فی اللقمة یرفعها الی فیه۔**

مجھے مسلمان پر تعجب ہے جب اس کو مصیبت پہنچتی ہے اور اس پر صبر کرتا ہے (صبر کا اجر ملتا ہے) اور جب اس کو کوئی بھلائی ملتی ہے اور اس پر اللہ کا شکر کرے (شکر کا اجر ملتا ہے) اور مسلمان کو ہر حالت میں اجر ملتا ہے۔ یہاں تک کہ جو لقمہ منہ تک اُٹھاتا ہے، (اس پر بھی اجر ملتا ہے)

۵۲۹۸ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ وَاَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ وَفِیْ کُلٍّ خَیْرٌ اِحْرِصْ عَلٰی مَا یَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجِزْ وَاِنْ اَصَابَكَ شَیْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ اَنِّیْ فَعَلْتُ کَانَ کَذَا وَکَذَا وَلٰکِنْ قُلْ قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَاشَآءَ فَعَلَ فَاِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّیْطَانِ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۰۵۲/۴ حدیث رقم (۳۴-۲۶۶۴) وابن ماجه فی ۱۳۹۵/۲ حدیث رقم (۳۴-۲۶۶۴) واخرجه احمد فی المسند ۳۷۰/۲

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قوی مؤمن'' (ضعیف مؤمن سے) بہتر اور خدا کے نزدیک زیادہ محبوب ہے اور ہر مسلمان (خواہ وہ قوی ہو یا ضعیف) اپنے اندر نیکی و بھلائی رکھتا ہے۔ (یعنی

کوئی مسلمان نیک صفات سے مکمل خالی نہیں ہوتا بلکہ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہوتی ہے کیونکہ تمام نیکیوں اور بھلائیوں کا بنیادی منبع اور مادی ایمان ہےاور بنیادی ایمان ہر مسلمان میں ہوتا ہے) جو چیز تمہیں (دین اخروی کے اعتبار سے) نفع والی ہو اس کی حرص پیدا کرو، خدا تعالیٰ سے (نیک عمل کرنے کی) مدد و توفیق مانگا کرو اور اس (طلب مدد و توفیق سے عاجز اور ست نہ ہو (کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہیں اطاعت اور عبادت کی توفیق بخشنے پر پورے طور پر قادر ہے بشرطیکہ تم اس کی استعانت پر سیدھی طرح قائم رہو۔ اور بعض حضرات نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ تم اس چیز پر عمل کرنے سے عاجز نہ رہو جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔)۔ نیز اگر تمہیں (دین و دنیا) کی کوئی مصیبت تکلیف پہنچے تو یوں نہ کہو ''اگر میں اس طرح کرتا تو ایسا ہوتا (بلکہ زبان قال یا زبان حال سے) یہی کہو کہ ''اللہ تعالیٰ نے یہی مقدر کیا تھا''۔ لہٰذا جو کچھ بھی پیش آیا ہے قضاء و قدر الٰہی کے عین مطابق ہی پیش آیا ہے) اور اللہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے''۔ اور یہ اس لئے کہ ''اگر'' اور ''کاش'' کا لفظ شیطانی عمل دخل کا دروازہ کھول دیتا ہے (اور دل میں یہ غلط وسوسہ اور خیال جاگزین ہو جاتا ہے کہ ہر کام کا انجام ہماری ہی تدبیر سے نکلتا ہے تقدیر الٰہی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔'' (مسلم)

تشریح: قوله: المؤمن القوی خیر و احب ---- وفی کل خیر:

''القوی'' سے مراد ہے جو زیادہ سے زیادہ عبادت کرنے پر قادر ہو۔

غیر و أحب:

''الضعیف'' سے مراد ہے وہ شخص جو زیادہ سے زیادہ عبادت کرنے سے عاجز ہو۔

بعض شارحین فرماتے ہیں، کہ ''مؤمن قوی'' سے مراد وہ شخص ہے جو لوگوں کے ساتھ اختلاط پر صبر کرنے والا ہو اور لوگوں کی اذیتوں کو برداشت کرنے والا ہو اور لوگوں کو خیر کی باتیں سکھانے اور سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرنے والا ہو۔ اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے۔ جس کو امام احمد نے ابن عمرؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: **المؤمن الذی یخالط الناس ویصبر علی اذاهم افضل من المؤمن الذی لایخالط الناس ولا یصبر علی اذاهم۔**

''وہ مؤمن جو لوگوں کے ساتھ اختلاط کرے اور لوگوں کی اذیتوں پر صبر کرے یہ بہتر ہے۔ اُس مؤمن سے جو نہ لوگوں کے ساتھ اختلاط رکھے اور نہ لوگوں کی اذیتوں پر صبر کرے۔''

بعض شارحین فرماتے ہیں، کہ ''مؤمن قوی'' سے مراد وہ شخص ہے جو ایمان میں قوی ہو اور یقین میں پختہ ہو اس طرح کہ اسباب پر اس کی نظر نہ ہو اور مسبّب الاسباب پر نظر ہو اور ''مؤمن ضعیف'' اس کے برخلاف ہے۔ جو ایمان کے ادنیٰ مرتبہ پر ہو۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ قوت سے مراد ''آخرت کے امور میں نفس کا عزم'' ہے چنانچہ اس عزم والا جہاد اور غزوات میں زیادہ اقدام کرتا ہے۔ اور علم کو طلب کرنے کیلئے زیادہ تر گھر سے نکلتا ہے۔ اور امر بالمعروف اور نھی عن المنکر میں زیادہ پختہ ارادہ رکھتا ہے۔ اور ان تمام اُمور میں آنے والی اذیتوں پر صبر کرتا ہے اور ارشادِ نبوی '' **فی کل خیر** '' کا مطلب یہ ہے کہ قوی مؤمن اور ضعیف مؤمن دونوں میں خیر ہے۔ کیونکہ صفت ایمان میں دونوں مشترک ہیں، نیز مؤمن ضعیف ایمان کے ساتھ کچھ اعمال صالحہ بھی کرتا ہی ہے۔

قوله: احرص علی ماینفعك واستعن بالله ولا تعجز:

احرص اء کے کسرہ کے ساتھ اور اسی سے ارشاد باری ہے: ﴿ان تحرص علی هداهم﴾ [النحل:۳۷] "ان کے راہِ راست پر آنے کی اگر آپ کو تمنا ہے" اور ایک نسخہ میں "راء" کے فتحہ کے ساتھ۔ قاموس میں ہے۔ "حرص" ضرب سے بھی ہے سمع سے بھی اور معنی یہ ہے کہ حرص کرو۔

واستعن باللہ: اپنے کاموں میں کیونکہ اللہ کی توفیق سے ہی بندہ گناہ سے بچتا ہے اور نیکی کا کام کرتا ہے۔

ولا تعجز: جیم کے کسرہ کے ساتھ اور اسی مادہ سے ارشاد باری ہے: [اعجزت] [المائدۃ:۳۱] اور ایک نسخہ میں "جیم" کے فتحہ کے ساتھ چنانچہ قاموس میں ہے۔ عجز، ضرب، سے بھی ہے اور سمع، سے بھی مطلب یہ ہے کہ حرص کرنے اور اللہ سے مدد طلب کرنے سے عاجز نہ بن کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے۔ کہ تمہیں اپنی عبادت کی قوت دے، جب تم استقامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے رہو۔

بعض شارحین نے یہ معنی بیان کیا ہے، کہ تجھے جس عمل کا حکم دیا جاتا ہے اس عمل سے عاجز نہ بن اور صرف اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے پر اکتفا کر کے عمل نہ چھوڑو کیونکہ کامل ایمان یہ ہے کہ بندہ عمل بھی کریا ور اللہ تعالیٰ سے مدد بھی طلب کرتا رہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ کہ اس مقام پر لف ونشر مرتب ہے چنانچہ" احرص علی ماینفعك ولا تترك الجهد" قوی کا بیان ہے اور" لا تعجز" ضعیف کا بیان ہے۔

قوله: وان اصابك شيئي فلاتقل: لو۔۔۔وما شاء فعل: کیونکہ ایسی بات درست نہیں ہے اور کوئی فائدہ بھی نہیں دیتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قل لن يصيبنا الا ما كتب الله لنا﴾ [التوبۃ:۵۱] "کہہ دو کہ ہمیں صرف وہی پہنچے گا جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے۔"

اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے ما اصابك لم یکن لیخطئك وما أخطاك لم یکن لیصبك ۔ کہ جو مصیبت تمہیں پہنچے اس مصیبت نے تم سے چوکنا نہیں تھا۔ اور جو مصیبت تجھ سے چوک جائے اس نے تجھے پہنچنا نہیں تھا"۔ نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لكيلاتاسوا على مافاتكم﴾ [الحدید:۲۳] "تا کہ جو چیز تم سے جاتی ہے تم اس پہ رنج نہ کرو۔"

"قدر" دال کی تشدید کے ساتھ یعنی یہ کہہ دو کہ اللہ نے اس طرح مقدر کیا تھا، اور دال کی تخفیف بھی جائز ہے۔ یعنی اس طرح اللہ کے فیصلہ کا مقتضی ہے اور اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ہے۔

یعنی اللہ نے جس کے کرنے کا (فعل) کیونکہ اللہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اس کو کر گزرتا ہے اور اللہ کے فیصلہ کو کوئی رد نہیں کرسکتا اور نہ اللہ کے فیصلہ کو مؤخر کرسکتا ہے۔

قوله: فان لو تفتح عمل الشيطان:

یعنی کلمہ شرط یا لفظ "ان"۔

علامہ شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ لفظ، لم، لو" اور لیت" مصابیح کے بعض شارحین فرماتے ہیں کہ لفظ، لو، اور اس کے معنی کا اعتقاد رکھنا بندے کو "تقدر" کی ~~تکذیب تک~~ پہنچاتا ہے یا اللہ کے فیصلوں پر ناراضگی تک پہنچاتا ہے: اس لئے کہ تقدر: جب

ایسے کام کی صورت میں ظاہر ہو جائے جو بندے کو نا گوار گزرے تو بندہ کہتا ہے۔ اگر میں اس طرح کرتا تو اس طرح نہ ہوتا حالانکہ علم الٰہی میں یہ بات مقرر اور طے ہو چکی ہے۔ کہ اس شخص نے ایسا ہی کرنا ہے اور وہی ہوگا جو ہو گیا اور حضور علیہ السلام نے '' ولکن قدر اللہ وماشاء فعل'' فرما کر ایسی بات کی طرف اشارہ کیا اور لفظ، لو، تمام احوال اور تمام صورتوں میں مکروہ نہیں ہے۔ بلکہ لفظ ''لو'' کی ممانعت ایسی بات کے متعلق ہے جس میں تقدیر الٰہی کے ساتھ معارضہ ہو اور کسی دنیاوی امر کے فوت ہونے پر افسوس کا اظہار ہو ورنہ تو قرآن میں بھی اس طرح وارد ہوا ہے:[لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیھم القتل] [آل عمران - ۱۵۴] اور اسی طرح حدیث میں بھی وارد ہوا ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا'' لو انی استقبلت من امری ما استدبرت'' (اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا جو بعد میں معلوم ہوا) اسلئے کہ اس سے تقدیر الٰہی کا معارضہ مقصود نہیں ہے۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ'' فان لو تفتح'' کا معنی یہ ہے کہ اگر یہ معاملہ میرے پاس ہوتا، اور میں اس کام کے کرنے اور نہ کرنے میں آزاد ہوتا، یوں یوں ہو جاتا اور اس میں فوت شدہ امر پر افسوس ہے اور تقدیر الٰہی کا معارضہ ہے۔ اور اس بات پر دلالت ہے کہ جس کام کو میں اپنے اختیار سے اپنی رائے کے مطابق کرتا ہوں یہ بہتر ہے۔ اس کام سے جو تقدیر الٰہی سے مجھے ملا اسلئے کہ ''لو'' زمانہ ماضی میں کسی ایک امر کے انتفاء سے دوسرے امر کے انتفاء پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے حضور علیہ السلام نے اس کو مکروہ بتایا اور اُن امور میں سے بتایا جو شیطان کا دروازہ کھولتے ہیں، اور حضور علیہ السلام کا فسخ حج کے سلسلہ میں یہ ارشاد گرامی'' ولو انی استقبلت من امری ما استدبرت'' اس قبیل سے نہیں ہے۔ بلکہ اس بات سے حضور علیہ السلام کا مقصود صحابہ کے دلوں کو خوش و مطمئن کرنا اور صحابہ کو عمرہ کے اعمال کے بعد احرام کھولنے کی ترغیب دینا تھا۔

امام نووی نے مسلم کی شرح میں لکھا ہے کہ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لفظ، لو کی ممانعت اس شخص کے واسطے ہے جو اس بات پر پختہ اعتقاد رکھتے ہوئے ایسی بات کرے۔ اور جہاں تک حضرت ابوبکر صدیق کے قول'' لو ان احدھم رفع راسہ لرآنا'' کا تعلق ہے تو اس میں کوئی دلیل نہیں اسلئے کہ ابوبکر صدیقؓ نے امر مستقبل کی خبر دی ہے۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کا قول'' لو کنت راجما بغیر بینۃ لرجمت ھذا'' اور اس جیسے اور اقوال میں تقدیر الٰہی کے ساتھ کوئی معارضہ اور اعتراض نہیں ہے اسلئے اس میں کوئی کراہت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں تو اُن امور کے بارے میں اعتقاد کی خبر دی ہے۔ جن امور میں اگر مانع نہ ہوتو وہ کر لیتے تھے۔ اور اُن امور کے بارے میں خبر دی ہے۔ جو قدرت میں ہے اور گذشتہ امور تو ان پر انسان کو قدرت نہیں ہوتی۔

'' فان لو تفتح عمل الشیطان'' کا معنی یہ ہے کہ شیطان انسان کے دل میں تقدیر الٰہی کا معارضہ القاء کرتا ہے۔ اور اس کا وسوسہ ڈالتا ہے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ'' لو'' کا استعمال ماضی کے امور کے بارے میں بھی وارد ہوا ہے۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:''لو استقبلت من امری ما استدبرت لم اسق الھدی'' چنانچہ بظاہر لفظ'' لو'' کی ممانعت اُن امور سے متعلق ہے جن میں کوئی فائدہ نہ ہو لہٰذا یہ نہی تنزیہی ہے نہی تحریمی نہیں ہے۔ اور جو شخص اللہ کی اطاعت وعبادت کے فوت ہو جانے پر اظہار افسوس کیلئے لفظ'' لو'' کہے یا اپنی معذوری بیان کرنے کی غرض سے کہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور احادیث میں جو یہ لفظ منقول ہوا ہے۔ تو اُس کو اسی صورت پر محمول کیا گیا ہے۔

میں کہتا ہوں اللہ کی اطاعت کے فوت ہو جانے پر افسوس کرنے پر ثواب ملتا ہے۔ چنانچہ اس کو مستحب امور میں شمار کیا جاتا چاہیے۔ امام رازیؒ نے اپنی کتاب مشیخت میں ابوعمرو سے نقل کیا ہے۔ کہ جس شخص نے اپنی کسی دنیاوی چیز کے فوت ہو جانے پر افسوس کیا۔ وہ ایک ہزار سال کی مسافت کے بقدر دوزخ کے قریب ہو جاتا ہے۔ اور جس شخص نے اپنے کسی دینی عمل کے ضائع ہونے پر افسوس کیا تو وہ ایک ہزار سال کی مسافت کے بقدر جنت کے قریب ہو جاتا ہے۔ اس کو علامہ سیوطی نے جامع میں ذکر کیا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو جزری نے "الحصن" میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

"من وقع له مالا يختاره فلا يقل لو انى فعلت كذا وكذا لكان كذا وكذا، ولكن ليقل بقدر الله وماشاء فعل"

اس کو مسلم، نسائی، ابن ماجہ اور ابن السنی نے نقل کیا ہے۔ لیکن نسائی اور ابن السنی نے "بقدر الله" کی بجائے "قدر الله" نقل کیا ہے۔ اور اس لفظ کو بصیغہ فعل تشدید اور تخفیف کے ساتھ بھی نقل کیا گیا۔ اور مصدر مرفوع کے ساتھ مضاف ہونے کی صورت میں بھی نقل کیا گیا ہے۔ اسی طرح نسائی اور ابن السنی نے "فعل" کی بجائے "صنع" کا لفظ نقل کیا ہے۔ اور ابوداؤد، نسائی اور ابن السنی نے عوف بن مالک اشجعی سے مرفوعاً نقل کیا ہے: من غلبه امر فليقل : حسبى الله ونعم الوكيل۔ جس کو کوئی بات پریشان کر دے۔ تو اُس کو چاہیے" حسبى الله ونعم الوكيل" کہے۔

۵۲۹۹ : عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَوْ اَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ تَغْدُوْا خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا۔

(رواه الترمذى وابن ماجة)

اخرجه الترمذى فى السنن ٤/٤٩٥ حديث رقم ٢٣٤٤ وابن ماجه ٢/١٣٩٤ حديث رقم ٤١٦٤ واحمد فى المسند ١/٣٠۔

ترجمہ: "حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: "حقیقت یہ ہے کہ اگر تم خدا تعالیٰ پر یوں توکل واعتماد کرو جیسا کہ بھروسہ کرنے کا حق ہے تو یقیناً وہ تمہیں اسی طرح روزی دے گا جس طرح کہ پرندوں کو رزاق عنایت کرتا ہے۔ وہ (پرندے) صبح کو بھوک کی حالت میں نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہونے کی حالت میں (اپنے گھونسلوں میں) لوٹ آتے ہیں"۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: تتوكلون: جامع کی ایک روایت میں ایک تاء کے بغیر نقل کیا گیا ہے۔

بایں طور کہ اس بات کا یقین ہو جائے۔ کہ اللہ کے سوا کوئی بھی کسی چیز کو وجود میں نہیں لاسکتا اور ہر موجود خواہ وہ مخلوق ہو یا رزق، کسی چیز کا ملنا ہو یا کسی چیز سے محروم ہونا، نفع ہو یا نقصان، فقر ہو یا مالداری بیماری ہو یا صحت، موت ہو یا زندگی غرضیکہ جس چیز پر موجود کا اطلاق ہو سکتا ہو۔ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ پھر رزق کے طلب کرنے میں حلال راستہ اختیار کرے۔ جس کے لئے پرندہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ کہ پرندے صبح کے وقت خالی پیٹ کے ساتھ رزق کی تلاش میں نکلتے ہیں، اور رات کو

جب واپس لوٹتے ہیں، تو اُنکے پیٹ بھر چکے ہوتے ہیں۔

اگر چہ تم اسباب معیشت کو ترک کر دو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑے طاقتور اور ہمت والے شخص کو بھی رزق دیتا ہے۔ اور ایک عام مزدور کو بھی اور اتنے کمزور کو بھی رزق دیتا ہے۔ جس پر قوی اور تندرست آدمی کو تعجب ہوتا ہے۔

یرزق: معروف کے صیغہ کے ساتھ

خماصا: خاء کے کسرہ کے ساتھ" خمیص " کی جمع ہے۔

تروح: دن کے آخر میں لوٹتے ہیں۔

بطانا: "باء" کے کسرہ کے ساتھ" بطین" کی جمع ہے اس کا معنی ہے بڑے پیٹ والا اور اس سے مراد ہے، سیر ہو کر اور "تغدو" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مناسب طریقے سے معاش کیلئے کوشش کرنا اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور بھروسہ کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وكاين من دابة لا تحمل رزقها الله يرزقها واياكم﴾ [العنکبوت۔٦٠] (اور بہت سے جانور ایسے ہیں جو اپنی غذا اُٹھا کر نہیں رکھتے اللہ ہی ان کو اور تمہیں بھی روزی پہنچاتا ہے) حاصل یہ کہ حدیث میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ کسب وعمل رزق دینے والا نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی رازق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ حدیث کا مقصد یہ نہیں کہ انسان کو روزی کمانے سے روکا جائے۔ کیونکہ توکل کا تعلق دل سے ہے۔ لہٰذا اعضاء ظاہری کی حرکت توکل کے منافی نہیں ہے۔ گو بعض اوقات اللہ تعالیٰ اعضاء و جوارح کی حرکت کے بغیر بھی رزق پہنچا دیتا ہے۔ بلکہ توکل کی برکت سے اللہ تعالیٰ کسی اور کو استعمال کر کے اس کا رزق پہنچا دیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے عموم سے معلوم ہوتا ہے: ﴿وما من دابة على الارض الا على الله رزقها﴾ [ھود:٦] "اور کوئی جانداروں سے زمین پہ چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو"۔

کہا جاتا ہے کہ جب کوّے کے بچے انڈے سے باہر آتے ہیں، تو سفید رنگ کے ہوتے ہیں، اور کوّا ان بچوں کو دیکھتا ہے۔ تو وہ اسے بہت بُرے لگتے ہیں، چنانچہ ان بچوں کو چھوڑ کر کوّا چلا جاتا ہے۔ اور وہ تنہا پڑے رہ جاتے ہیں، تب اللہ تعالیٰ ان کے پاس مکھی اور چیونٹیاں بھیجتا ہے۔ جن کو وہ بچے چن چن کر کھاتے ہیں، اور پرورش پاتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں، تو ان کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اور سیاہ ہو جاتے ہیں، پھر جب کوّا ان کے پاس آتا ہے۔ اور ان کو سیاہ رنگ کا دیکھتا ہے۔ تو ان کو اپنے ساتھ لے کر ان کی نگرانی اور پرورش شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ بغیر سعی و کوشش کے بھی رزق پہنچاتا ہے۔ اس سلسلے کی کافی حکایات بیان کی جاتی ہیں، اور کئی روایات مشہور ہیں۔ یہ واقعہ تو بہت ہی عجیب وغریب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے روح قبض کرنے والے فرشتے عزرائیل سے پوچھا کہ کیا کسی کی روح نکالتے وقت تجھے رحم بھی آیا ہے۔ عزرائیل نے کہا کہ ہاں اے میرے پروردگار اُس وقت مجھے رحم آیا کہ جب ایک کشتی ٹوٹ گئی تھی۔ اور اس کے لوگ پانی میں غرق ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ لوگ ڈوبنے سے بچ گئے تھے۔ اور کشتی کے تختوں پر تیر رہے تھے۔ ایک عورت ایک تختے پر بیٹھی ہوئی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اس وقت تیرا حکم ہوا کہ اُس عورت کی روح قبض کر لی جائے۔ چنانچہ اُس وقت مجھے اُس بچے پر رحم آیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے اُس تختے کو ایک جزیرے کے کنارے لگا دیا اور میں نے ایک شیرنی کو اس بچے کے پاس بھیج دیا جس نے اُس بچے کو دودھ پلا کر پرورش کی جب وہ کچھ بڑا ہو گیا تو میں جنات متعین کر دے تا کہ وہ اس بچے کو

آدمیوں کی بول چال سکھادے۔ یہاں تک کہ وہ ایک مضبوط نوجوان بن گیا۔ پھر یہ نوجوان آبادی تک پہنچ گیا۔ اور امارت ملی اور سلطنت کے مرتبہ تک پہنچ گیا۔ اور تمام روئے زمین کا حکمران بن گیا۔ پھر اس نے الوہیت کا دعویٰ کیا اور بندگی اور اللہ کے حقوق کو بھول گیا اور اس کا نام شداد تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ چنانچہ وہ رحیم و کریم ذات جو اپنے دشمنوں کو کھلاتا ہے۔ وہ اپنے محبوب بندوں کو کیسے بھولے گا۔

شیخ ابوحامد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ توکل کا معنی یہ ہے۔ کہ اعضاء وجوارح سے محنت کو ترک کرے اور اپنے دل سے تدبیر سوچنا چھوڑ دے۔ اور زمین پر اس طرح پڑا رہے۔ جیسے کہ کوئی کیڑا زمین پر پڑا رہے یا کوئی گوشت جو قصاب کے تختہ پر پڑا ہو اور یہ جاہلانہ گمان ہے اور شریعت میں اس طرح کرنا حرام ہے۔ حالانکہ شریعت نے متوکل کی ثناء بیان کی ہے۔ اور شریعت کی طرف سے ممنوعہ اُمور کے ذریعے سے اس طرح دین کے بلند مقام کو کیسے حاصل کیا جاسکتا۔ بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے۔ کہ جب بندہ اپنے مقاصد کی تحصیل کی خاطر حرکت وسعی کرتا ہے۔ تو اس وقت توکل کی تاثیر ظاہر ہوتی ہے۔ اور امام ابوالقاسم قشیری فرماتے ہیں، کہ توکل کا محل دل ہے۔ اور معاش کیلئے حرکت وکوشش ظاہری اعضاء سے ہوتی ہے اسلئے توکل حصول معاش کیلئے محنت کرنے کے منافی نہیں ہے۔ جبکہ یہ بات معلوم ہو کہ رزق اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اگر کوئی کام مشکل ہو تو اللہ کے مشکل بنانے سے مشکل ہے۔ اور اگر آسان ہے تو اللہ کے آسان بنانے سے آسان ہے۔"

تخریج: اسی طرح احمد اور حاکم نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔

۵۳۰۰ : وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّهَا النَّاسُ لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ اِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ اِلَّا قَدْ اَمَرْتُكُمْ بِهِ وَلَيْسَ شَيْءٌ يُقَرِّبُكُمْ مِنَ النَّارِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ اِلَّا قَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ وَاِنَّ الرُّوْحَ الْاَمِيْنَ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَاِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رُوْعِيْ اَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا اَلَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّكُمُ اسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ اَنْ تَطْلُبُوْهُ بِمَا عَاصِي اللّٰهُ فَاِنَّهٗ لَا يُدْرَكُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ اِلَّا بِطَاعَتِهٖ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَذْكُرْ وَاِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ ـ

رواه البيهقي في شعب الايمان ٢٩٩/٧ حديث رقم ١٠٣٧٦ والبغوي في شرح السنة ٣٠٣/١٤ حديث ٤١١١

"حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگو! کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو تم کو جنت کے قریب کردے اور دوزخ کی آگ سے دور کردے مگر وہی چیز ہے جس (کو اختیار کرنے) کا حکم میں نے تمہیں دیا ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو تم کو دوزخ کی آگ کا قریبی بنادے اور جنت سے دور کردے ماسوا اس چیز کے جس سے میں نے تمہیں روکا ہے اور روح الامین۔ یا ایک اور روایت کے مطابق روح القدس (یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام) نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے (یعنی میرے پاس وحی خفی لائے ہیں) کہ بلاشبہ کوئی شخص اس وقت تک فوت نہیں ہوتا جب تک کہ اپنا رزق پورا نہیں کر لیتا، دیکھو! خدا کی نافرمانی سے بچتے اور ڈرتے رہو اور ذریعہ معاش کے حصول کی کوشش و

محنت میں نیک روی اور اعتدال اختیار کرو(تا کہ تمہارا رزق تم تک پہنچ جائے نیز کہیں ایسا نہ ہو کہ رزق پہنچنے میں تاخیر تمہیں اس بات پر برانگیختہ یا آمادہ کر دے کہ تم خدا تعالیٰ کی معصیت کے ذریعہ رزق حاصل کرنے کی جستجو کرنے لگو' حقیقت یہ ہے کہ جو چیز خدا کے پاس ہے اس کو اس کی طاعت وخوشنودی ہی کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنہ میں اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے لیکن بیہقیؒ نے وَاِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ کے الفاظ نقل نہیں کئے ہیں''۔

قوله:ايها الناس ! ليس من ----الاقد نهيتكم عنه:

من شي: من ،زائدہ برائے مبالغہ ہے۔

يقربكم: راء کی تشدید کے ساتھ۔

يقربكم الى الجنة ويباعد كم من النار: دونوں فعلوں میں نسبت مجازی ہے۔

الا قد امرتكم به: یعنی اس مذکور کا یا ان میں سے ہر ایک کی طرف راجح ہے۔

وليس شيء: اُصول کی اس عبارت میں'' من'' نہیں ہے۔

قوله:الاقد امرتكم به 'الا قد نهيتكم عنه: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ تمام مفید اُمور اور برائی سے بچانے والے امور کے علوم قرآن وسنت میں موجود ہیں،اور قرآن وحدیث کے علاوہ میں مشغول ہونا اپنی عمر ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

قوله:وان الروح الامين ---حتى تستكمل رزقها:

وان الروح لأمين 'وراایک نسخہ میں''روح الامین'' کا لفظ ہے۔مراد جرائیل علیہ السلام ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے﴿نزل به الروح الامين﴾ ترجمہ:''اس کو امانتدار فرشتہ لے کر آیا ہے۔''

القدس: قاف اور دال کے ضمہ کے ساتھ یا قاف کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ۔جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿وايدناه بروح القدس﴾ [البقرۃ۔۸۷] یعنی وہ روح جس کو نامناسب اخلاق سے پاک کیا گیا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں،یہ کلمہ'' حاتم الجود'' یا'' رجل صدق'' کی طرح ہے یعنی اس میں صفت کی طرف موصوف کی اضافت ہے۔اس طرح اختصاص میں مبالغہ کیلئے کیا جاتا ہے۔چنانچہ صفت کی صورت میں'' القدس'' کی طرف نسبت کی گئی ہے۔اور اضافت کی صورت میں اس کے برعکس ہے۔جیسا کہ مال زید۔

نفث في روعي: را کے ضمہ کے ساتھ'''' النفث بالفم'' سے ماخوذ ہے۔اور یہ پھونک مارنے کے مشابہ ہوتا ہے۔اور ''تفل'' (تھوکنے) کی ہیت سے کچھ کم ہوتا ہے۔اسلئے کہ ''تفل'' میں ہوا کے ساتھ کچھ تھوک بھی ہوتا ہے۔اور'' الروع'' میں صرف ہوا نکلتی ہے۔اسی طرح نہایہ میں منقول ہے۔مطلب یہ ہے کہ مجھے وحی خفی کے ذریعے بتا دیا۔

ان نفسا: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ اور کسرہ بھی جائز ہے۔اسلئے کہ''ایحاء'' قول کے معنی میں ہے اور مطلب یہ ہے۔کہ کوئی ذی روح ذات یعنی زندہ مخلوق۔

یعنی وہ رزق جو اس کے لئے مقرر ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اس بات کی طرف اشارہ ہے:﴿الله الذى خلقكم ثم رزقكم ثم يميتكم﴾ ''اللہ ہی وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔پھر تم کو رزق دیا پھر تم کو موت دے گا''۔

الا: تنبیہ کیلئے ہے۔یعنی غور سے سنو۔

فاتقو الله: کیونکہ تمہیں تقویٰ اور بلند درجات تک پہنچنے کیلئے محنت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اجملوا: ''اجمال'' سے ہے یعنی اچھی طرح کوشش کرو لیکن رزق کو حاصل کرنے میں اس کی طلب میں زیادہ مبالغہ نہ کرو۔ کیونکہ تم لوگوں کو رزق طلب کرنے کا مکلف نہیں بنایا گیا۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ما ارید منهم من رزق وما أريد ان يطعمون ان الله هو الرزاق ذو القوة المتين﴾ [الذاریات ۔ ۵۸]

''اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کیا کریں''۔

نیز ارشاد باری ہے:﴿وامر اهلك بالصلوة واصطبر عليها لا نسألك رزقا نحن نرزقك والعاقبة للتقوى﴾

[طٰہٰ ۔ ۱۳۲]

''اور اپنے متعلقین کو بھی نماز کا حکم کرتے رہیےاور خود بھی اس کے پابند رہیے ہم آپ سے معاش نہیں چاہتے معاش تو آپ کو ہم دینگے اور بہتر انجام تو پرہیز گاری ہی کا ہے۔''

چنانچہ امر اباحت کیلئے ہے۔یا معنی یہ ہے کہ حلال طلب کرو۔چنانچہ امر وجوب کیلئے ہے۔اوراس کی تائید آئندہ قول سے ہوتی ہے۔میم کے کسرہ کے ساتھ۔

بمعاصي الله: حرام راستوں میں سے کسی حرام راستہ سے معصیت کا ارتکاب کر کے مثلاً چوری غصب ،خیانت ،اپنی عبادت دیانت اور سید ہونا ظاہر کر کے یا حق سے زائد مال بیت المال سے لے کر وغیرہ۔

فانه: ضمیر شان ہے

لا يدرك ما عند الله: یعنی حلال رزق یا جنت کا اچھا انجام ۔

ارشادِ گرامی کا حاصل یہ ہے کہ وبال ومصیبت کے راستے سے مال حاصل نہ کرے۔

علامہ طیبی رحمہ فرماتے ہیں کہ'' فاجملوا'' کا معنی یہ ہے کہ مال اچھے طریقے سے کماؤ اور اچھے طریقے سے کمانے کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کے احکام کے مطابق مال کمائے۔اور، استبطاء ''ابطاء'' کے معنی میں ہےاور سین مبالغہ کیلئے ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد ﴿ومن كان غنيا فليستعفف﴾ [النساء: ٦] ''اور جو شخص مستغنیٰ ہوتو وہ اپنے آپ کو بالکل بچائے'' استعف، عف کے معنی میں ہے۔

اس میں اس بات پر تنبیہ ہے۔کہ رزق مقدر ہے اور اللہ کی طرف سے تقسیم کیا گیا ہے۔ہر بندہ تک اپنے مقدر رزق کا پہنچنا ضروری ہے۔لیکن جب بندہ شروع طریقے سے رزق حاصل کرنے کیلئے کوشش کرے۔تو مال حلال ہونے کے ساتھ مستر ہو جاتا ہےاور جب غیر شروع طریقے سے رزق کو طلب کرے۔تو مال حرام ہو جاتا ہے۔

اور'' ما عند الله'' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مال چاہے حلال ہو چاہے حرام اللہ کی طرف سے ہےاور'' ان تطلبوه بمعاصي الله'' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو رزق اللہ کے خزانوں میں ہے اُس کو جب نافرمانی کے ساتھ طلب کیا جائے۔تو یہ بات قابل مذمت ہے۔اور حرام کہلاتا ہےاور اس میں اہلسنّت والجماعت کیلئے ایک واضح دلیل ہے کہ

حلال اور حرام دونوں کو رزق کہا جاتا ہے۔ اور دونوں اللہ کی طرف سے ہے۔ بخلاف معتزلہ کے۔

قوله: رواه فی شرح السنة۔۔۔۔لم یذکروا ان روح القدس:

چنانچہ "روح القدس" والی روایت بغوی کی روایات میں ہے یا کسی اور کی روایات میں ہے۔

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں، کہ اس حدیث کو ابن ابی الدنیا نے "قناعة" میں اور حاکم نیروایت کیا ہے۔ حاکم نے تصحیح بھی کی ہے۔ حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے: قال رسول الله ﷺ: یا ایها الناس اتقوا الله واجملوا الله، واجملوا فی الطب فان نفسالن تموت حتی تستوفی رزقها وان ابطأعنها فاتقوا الله واجملوا فی الطب خذوا ما حل ودعوا ماحرم۔

رسول ﷺ نے فرمایا: "اے لوگوں اللہ سے ڈرو اور رزق تلاش کرنے میں صحیح طریقہ اختیار کرو۔ کیونکہ کسی بھی نفس کو اس وقت تک موت نہیں آئیگی جب تک اپنا رزق مکمل طور پر حاصل نہ کریا گرچہ کچھ تاخیر سے ہو چنانچہ اللہ سے ڈرو اور رزق تلاش کرنے میں صحیح طریقہ اختیار کرو۔ جو حلال ہو وہ لو اور جو حرام ہو اس کو چھوڑ دو۔

اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور یہ الفاظ ان کے اور حاکم کے ہیں، اور حاکم فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ مسلم کی شرط پر ہے۔

ابونعیم نے حلیہ میں ابوامامہؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: ان روح القدس نفث فی روعی أن نفسا لن تموت حتی تستکمل أجلها وتستوعب رزقها فاجملوا فی الطلب ولا یحملن احد کم استبطاء الرزق ان یطلبه بمعصیة الله، فان الله تعالی لا ینال ماعنده الا بطاعته۔

روح القدس، نے مجھے وحی خفی کے ذریعے بتایا کہ کسی نفس کو بھی اُس وقت تک موت نہیں آئیگی جب تک اپنی موت پوری نہ کرلے اور جب تک اپنا رزق پورا کا پورا حاصل نہ کرلے چنانچہ رزق طلب کرنے میں صحیح طریقہ اختیار کرو۔ اور رزق پہنچنے میں تاخیر تم میں سے کسی کو اس بات پر نہ مجبور کرے کہ اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب کرکے رزق حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ کیونکہ جو چیز اللہ کے پاس ہے۔ اس کو اللہ کی اطاعت ہی کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۵۳۰۱ : وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الزَّهَادَةُ فِی الدُّنْیَا لَیْسَتْ بِتَحْرِیْمِ الْحَلَالِ وَلَا بِاِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰکِنْ الزَّهَادَةُ فِی الدُّنْیَا اَنْ لَّاتَکُوْنَ بِمَا فِیْ یَدَیْكَ اَوْثَقَ بِمَافِیْ یَدِیَ اللّٰهِ وَاَنْ تَکُوْنَ فِیْ ثَوَابِ الْمُصِیْبَةِ اِذَا اَنْتَ اُصِبْتَ بِهَا اَرْغَبَ فِیْهَا لَوْ اَنَّهَا بَقِیَتْ لَكَ (رواه الترمذی وابن ماجة وقال الترمذی هذا حدیث غریب وعمرو بن واقدالراوی منکر الحدیث)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤٩٣/٤ حدیث رقم ٢٣٤٠ وابن ماجه ١٣٧٣ حدیث رقم ٤١٠٠۔

ترجمہ: "حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنے کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ حلال چیزوں کو حرام قرار دے دیا جائے اور مال واسباب کو ضائع کر دیا جائے بلکہ دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنا یہ ہے کہ (یعنی اس دنیا کے تئیں مکمل ومعتبر زہد یہ) کہ مال، ودولت اور دیگر دنیاوی اسباب میں

سے) جو کچھ تمہارے ہاتھوں میں ہے اس پر اس چیز سے زیادہ وثوق و بھروسہ نہ کرو جو اللہ تعالیٰ کی خدمت میں ہے) نیز زہد (کی حقیقت میں) یہ بات بھی داخل ہے کہ تم جس وقت کسی مصیبت و آفت سے دو چار ہو تو حصول جزائے عظیم کی خاطر اس مصیبت کے تم پر باقی رہنے میں زیادہ رغبت رکھو''۔ (ترمذی' ابن ماجہ) اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس حدیث کے ایک راوی عمرو بن واقد منکر الحدیث ہیں''۔

تشریح: **قاله: الزهادة في الدنيا ليست بتحريم المال ولا إضاعة المال:**

الزهادة: زا کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

جیسا کہ بعض جاہل لوگ کرتے ہیں، کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں، کہ یہی کمال ہے اس لئے گوشت، حلوا اور پھل کھانے، نئے کپڑے پہننے اور شادی وغیرہ سے گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کا ارشاد ہے ﴿**یایها الذین امنو لا تحرموا طیبات ما احل الله لکم ولا تعتدوا ان الله لا یحب المعتدین**﴾ [المائدہ:۸۷] ''اے ایمان والو اللہ تعالیٰ نے جو پاک ولذیذ چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں اُنہیں حرام مت کرو اور حدود سے آگے مت نکلو بے شک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔''

نیز یہ بات ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ حالانکہ ایمانی حالت میں آپ ﷺ سے زیادہ کوئی کامل شخص نہیں ہے۔

ولا اضاعة المال: یعنی اُس مال کو ضائع کرے اور اس کو بے جا استعمال کر کے بایں طور کہ سمندر میں پھینک دے یا مالدار اور غریب میں تمیز کیے۔ بغیر لوگوں میں تقسیم کر دے۔ حاصل یہ کہ اپنے ہاتھوں کو اموال ظاہرہ سے خالی کرنے اور ظاہری زہد کا کوئی اعتبار نہیں جبکہ بعد میں فی الحال معیشت کیلئے محتاج ہو کر دل مخلوق کی طرف متوجہ ہو جائے۔ بلکہ زُھد کا اصل مدار تو یہ ہے۔ دل میں ربانی جذبہ ہو اور دُنیا کی بے رغبتی ہو اسی لئے گذشتہ بات سے استدراک کرتے ہوئے فرمایا۔

قوله: ولکن الزهادة ان لاتکون ---- في یدی الله:

لکن: نون کی تشدید اور تخفیف دونوں درست ہیں۔

یعنی اموال بیز اور کسب مال کی تدبیریں

''اوثق'' زیادہ قابل اعتماد و بھروسہ

بما في یدی الله: تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ یعنی اللہ کے ظاہری اور باطنی خزانوں میں اس میں ایک گونہ مشاکلت ہے۔ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا اصل اعتماد اور بھروسہ اللہ تعالیٰ کے اُس وعدہ پر ہونا چاہیے جو اس نے تمہیں رزق دینے اور ایسی جگہ سے تم تک اپنی نعمتیں پہنچانے کے بارے میں کیا ہے۔ جس جگہ کا تم گمان بھی نہیں کر سکتے اور تمہارے پاس جو جاہ و مال، زمین و جائیداد اور صنعتی کاروبار اور بالفرض علم کیمیا اور علم سیمیا ہے اس سے زیادہ قیمتی اور دیرپا چیزیں تم حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ جو کچھ تمہارے پاس ہے۔ یہ ضائع بھی ہو جاتا ہے اور فانی بھی ہے۔ جبکہ جو کچھ اللہ کے خزانوں میں ہے وہ حقیقی اور پائیدار ہے۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿**ما عند کم ینفد وما عند الله باق**﴾ ''اور جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور

جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ دائم رہے گا''۔

قوله: وان تكون في ثواب۔۔۔۔ ابقيت لك:

وان تكون: اس کا عطف'' ان لا تكون'' پر ہے۔مطلب یہ ہے کہ دنیا کے بارے میں زہد یہ ہے کہ تم دُنیا کے آرام و آسائش کی طرف مائل نہ ہو اور دنیاوی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی طرف متوجہ نہ ہو۔ بلکہ تم دُنیا کی نعمتوں اور لذتوں میں آفات اور مصیبتوں کا یقین رکھو۔ تاکہ تمہارا دل دنیا کی لذتوں کی طرف مائل نہ ہو۔ اور تمہارا نفس دنیاوی چیزوں سے کوئی اُنس نہ رکھے۔

اصبت: مجہول کے صیغہ کے ساتھ دیا جائے۔ اس مقام میں'' لم تصب'' کی جگہ'' ابقيت'' بولا گیا۔ اور، لو، کا جواب وہ ہے۔ جس پر اس کا ماقبل دلالت کر رہا ہے۔ حاصل یہ کہ ثواب کے شوق کی وجہ سے اس مصیبت کی طرف تمہاری رغبت عدم مصیبت کی رغبت سے زیادہ ہونی چاہیے۔ اور کسی شخص میں ان دو صفات کا ہونا اس بات پر واضح دلیل ہے۔ کہ یہ دنیا سے بے رغبت ہے۔ اور آخرت کی طرف متوجہ ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ'' لو انها ابقيت لك'' ارغب کے فاعل سے حال ہے اور ''لو'' کا جواب محذوف ہے۔ اور'' اذا'' ظرف ہے۔ معنوی اعتبار سے تقدیری عبارت یوں ہے:'' ان تكون في حال المصيبة وقت اصابتها ارغب من نفسك في المصيبة حال كونك غير مصاب بها'' چونکہ اگر یہ تمہیں پہنچی تو ثواب ملے گا اور اگر نہیں پہنچی تو ثواب نہیں ملے گا۔

قوله: قال الترمذي هذا غريب......: میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں زیادہ سے زیادہ یہ حدیث الفاظ کے اعتبار سے ضعیف ہے لیکن معنی کے اعتبار سے صحیح ہے۔ اور اس جیسی حدیث کو تمام اقوال کے مطابق فضائل اعمال میں معتبر سمجھا جاتا ہے۔ اور من جملہ ان اعمال کے دنیا کی بے رغبتی اور آخرت کی رغبت ہے۔

۵۳۰۲ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُنْتُ خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ يَاغُلَامُ اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ وَاِذَا سَاَلْتَ فَاسْئَلِ اللّٰهَ وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَاعْلَمْ اِنَّ الْاُمَّةَ لَوِاجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ وَلَوِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى اَنْ يَضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجُفَّتِ الصُّحُفُ. (رواه احمد والترمذي)

اخرجه الترمذي في السنن ٤/٥٧٥ حديث رقم ٢٥١٦ واحمد في المسند ١/٢٩٣

ترجمہ:'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ ایک روز (دوران سفر) میں رسول اللہ ﷺ کی سواری پر آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا کہ آپ ﷺ نے (مجھے مخاطب کر کے) ارشاد فرمایا: اے لڑکے! اللہ تعالیٰ کو (اس کے امر اور نواہی کی پابندی کر کے) یاد رکھو (ایسا کر لینے سے) اللہ تعالیٰ تمہارا خیال رکھے گا (بایں معنی کہ حق تعالیٰ شانہ تمہیں دنیا میں بھی ہر طرح کے مصائب و آفات سے سلامتی دے گا اور اخروی طور پر بھی ہر عذاب و عتاب سے بچائے گا)۔ اللہ تعالیٰ کے

حق کا خیال رکھو گے تو تم اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے پاؤ گے (یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی کو ہر لحہ یاد رکھو گے' اس کے نظام قدرت میں غور وفکر کرو گے اور ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہو گے تو تم اس کی رحمت کے بحر بیکراں کو اور اس کے انعامات کو اپنے سامنے پاؤ گے) جب تم سوال کا ارادہ کرو تو صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے دست سوال بڑھایا کرو' جب تمہیں (دنیا وآخرت کے کسی بھی معاملہ میں) مدد طلب کرنی ہو تو صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگا کرو اور یہ یقین رکھو کہ اگر تمام مخلوق (کہ خواہ عوام ہوں یا خواص' انبیاء ہوں یا اولیاء اور ائمہ دین ہوں یا سلاطین دنیا) کسی معاملہ میں تمہیں نفع پہنچانے پر متفق ہو جائیں (یعنی اگر بفرض محال یہ ساری مخلوق اس بات پر جمع ہو جائیں کہ وہ سب مل کر تمہیں کسی دُنیاوی یا اُخروی معاملہ میں کوئی نفع پہنچا دے) تو ہرگز تمہیں فائدہ نہیں پہنچا سکے گی' سوائے اتنی مقدار نفع کے جو خدا تعالیٰ تمہارے لئے فیصلہ فرما چکا ہے اور اگر دنیا کے تمام لوگ متفق ہو کر تمہیں کسی طرح کا کوئی نقصان وضرر پہنچانے پر کمربستہ ہو جائیں تو وہ ہرگز تمہیں کوئی نقصان وضرر نہیں پہنچا سکیں گے علاوہ صرف اس چیز کے جس کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا ہے' قلم اٹھا کر رکھ دیئے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو سکے''۔ (احمد' ترمذی)

تشریح: قولہ: کنت خلف رسول اللہ ﷺ یوما فقال: یا غلام: اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بات راوی کو اچھی طرح یاد ہے اور اُس قول کے الفاظ مستحضر ہیں اور اُن الفاظ کا یقین ہے۔ یہ حدیث اُن احادیث میں سے ہے۔ جن کو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خود حضور علیہ السلام سے سنا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اکثر روایات کسی واسطہ سے مروی ہیں' لیکن وہ واسطہ معتبر ہے۔ کیونکہ یہ صحابہ کی مراسیل میں سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما حضور علیہ السلام کے زمانہ میں بہت چھوٹے تھے۔

بعض شارحین فرماتے ہیں' کہ پہلے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میں حضور علیہ السلام کے پیچھے چل رہا تھا۔ لیکن ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں' کہ یہ مطلب دُرست نہیں ہے۔ کیونکہ واحدی نے ''وسیط'' میں ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ کہ کسریٰ نے حضور علیہ السلام کو ایک خچر ہدیہ میں بھیج دیا تھا۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے بالوں کی ایک رسّی میں باندھ کر اس پر سوار ہوئے اور مجھے اپنے پیچھے بٹھا دیا۔ اور جب ہم ایک میل تک چلے تو حضور علیہ السلام نے متوجہ ہو کر کہا:

فقال یا غلام: غلام مرفوع ہے معتمد اُصول اور متعدد نسخوں میں اسی طرح ہے۔ اور بظاہر میم مکسور ہے کیونکہ اس کی اصل (یا غلامی) تھی یا کا فتحہ اور کسرہ دونوں درست ہے۔ پھر جب ''یا'' کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا۔ تو ''یا'' کے ماقبل کسرہ پر اکتفاء کیا گیا لیکن کبھی ضمہ بھی دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح (ضمہ دینا) اُس اسم میں جائز ہے۔ جس کا غالب استعمال ''یا'' کی طرف اضافت کے ساتھ ہو کیونکہ ایسی صورت میں مراد معلوم ہوتی ہے اور اسی سے ''رب احکم'' کی شاذ قراءت بھی ہے جبکہ ''رب'' میں ''با'' کو مضموم پڑھا جائے علاوہ ازیں ''با'' کا ''ضمہ کاف کے ضمہ کی مشاکلت کی وجہ سے ہے جیسا کہ'' وان احکم'' میں اس بات کی تحقیق ہو چکی ہے۔ کیونکہ'' ان احکم'' کو سات قراءتوں میں سے دو قراءتوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

''یا غلام'' میں ایک دوسری لغت ہے اور وہ یہ کہ یا کو الف سے بدل دیا جاتا ہے۔ نیز ایک شاذ قراۃ یہ بھی ہے کہ ''یا غلام'' پڑھا جائے یعنی الف کے بجائے فتحہ پر اکتفاء کیا جائے۔ پھر زیادہ ظاہر یہی ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے سکون کے ساتھ وقف کر کے پڑھا ہے۔ اور اس پر اعراب ظاہر نہیں کیا جیسا کہ اس طرح کے مقام میں متعارف ہے۔

غلام سے مراد چھوٹا بچہ ہے۔ مملوک مراد نہیں ہے۔ قاموس میں ہے کہ الغلام کا معنی ہے نوجوان اور الکھل اس کی ضد ہے یا "غلام" کا لفظ انسان کیلئے پیدائش سے لے کر جوانی تک بولا جاتا ہے۔

اور نداء سے مقصود یہ ہے کہ ابن عباسؓ مستحضر ہو جائے۔ اور اس بات کی طرف متوجہ ہو جائے۔ جو بات حضور علیہ السلام بیان کرنے والے ہیں، اور اربعین میں مزید یہ الفاظ بھی منقول ہے۔ " انی اعلمك كلمات " یعنی ایسی باتیں جو مصائب دفع کرنے کے واسطے اور منافع حاصل کرنے کے واسطے مفید ہیں۔

قولہ: احفظ الله يحفظك الله تجده تجاهك: تجاهك: " تاء " کے ضمہ کے ساتھ جس کا معنی ہے اپنے سامنے مطلب یہ ہے کہ تم اپنے نگاہ معرفت سے اللہ کو اپنے سامنے اس طرح پاؤ گے۔ کہ گویا وہ تمہارے سامنے موجود ہے اور مقام احسان اور کمال ایمان کے ساتھ تم اس کا مشاہدہ کرو گے۔ اور بالکل اس طرح محسوس کرو گے جیسے تم خدا کو دیکھ رہے ہو۔ اس طرح کہ اللہ کے سوا ہر چیز تمہاری نظر کے سامنے سے بالکل فنا ہو جائے گی۔ اور اس طرح تمہیں مراقبہ کی کیفیت بھی حاصل ہو جائیگی ۔ اور مقام مشاہدہ بھی نصیب ہوگا۔

بعض شارحین نے یہ مطلب بیان کیا ہے۔ کہ جب تم اللہ کی اطاعت کو محفوظ رکھو گے۔ تو اللہ تعالیٰ کو اپنا مددگار پاؤ گے۔ اور جس طرف بھی متوجہ ہو گے اللہ تعالیٰ تمہارے تمام امور میں تمہاری مدد کرے گا۔ اور جن کاموں کا ارادہ کرو گے اللہ تعالیٰ وہ اُمور آسان کر دے گا۔

بعض شارحین یہ مطلب بیان کرتے ہیں، کہ تم اللہ کی رحمت اور مہربانی کو اپنے قریب دیکھو گے کہ تمام حالات میں اللہ کی رحمت اور مہربانی تمہارے ساتھ ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ تمہیں تمام تکالیف سے محفوظ کرینگے اور مختلف قسم کے کرامات اور انعامات سے نوازیں گے۔ چنانچہ اس ارشاد باری میں اشارہ ہے: ﴿ونحن اقرب اليه من حبل الوريد﴾ [ق:١٦] "اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ" اور ایک عارف باللہ نے اشارہ کیا ہے۔ اس بات کی طرف کہ عالم کے جتنے ذرات ہیں انوار الٰہی ان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اور ان پر غالب ہیں یہاں تک کہ انوار الٰہی ہر ذرے کے اس بھی زیادہ قریب ہیں، جتنا کہ اُس ذرے کے وجود اُس ذرے کے قریب ہے۔ اور صرف اللہ تعالیٰ اپنے علم اور ایجاد کی صفت کے ساتھ نہیں بلکہ ایک معنی کے ساتھ

اذا ما تلاشيت في نوره
يقول لي ادع فاني قريب

" جب میں اس کے نور میں معدوم مضمحل ہو جاتا ہوں تو وہ مجھ سے کہتا ہے کہ مجھے پکارو! میں قریب ہوں۔"

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، یعنی اللہ کے حقوق کی رعایت کرو اور اللہ کی رضا حاصل کرنیکی کوشش کرو اُس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔ یعنی اپنے سامنے اور بالمقابل اور "تا" واؤ کی بدلہ میں ہے۔ جیسا کہ "تقاة اور تخمة" میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے حقوق کی حفاظت کر یہاں تک کہ اللہ تجھے دنیا اور آخرت کی تکالیف سے محفوظ رکھے۔

قولہ: واذا سالت فاسال الله، واذا استعنت فاستعن بالله:

و اذا سألت: یعنی سوال کا ارادہ کرو۔

فاسال الله: یعنی ہمزہ کو باقی رکھ کر اور ہمزہ کو نقل کرنا بھی جائز ہے۔

کیونکہ عطایا کے خزائن اُسکے پاس ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے پاس ہی انعامات اور فتوحات کی چابیاں ہیں، اور ہر نعمت اور ہر دنیوی یا دینی مصیبت، اللہ کے رحمت سے بندے تک پہنچتی ہے۔ یا دور ہوتی ہے بغیر کسی غرض اور علت کے کیونکہ اللہ تعالیٰ مطلق جواد ہے۔ اور ایسا غنی ہے جو کسی کا محتاج نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمان کو صرف اُسی کی رحمت کی اُمید رکھنی چاہیے، اور صرف اُسی کے عذاب سے ڈرنا چاہیے اور بڑے اہم امور میں اُسی کو جائے پناہ بنایا جائے اور تمام امور میں اسی پر اعتماد کیا جائے اور اُسکے ماسوا سے کوئی سوال نہ کیا جائے اسلئے کہ اللہ غیر نہ عطا کرنے پر قادر ہے۔ اور نہ کوئی چیز روکنے پر قادر ہے۔ نہ کسی مصیبت کے دفع کرنے پر قادر ہے۔ اور نہ کوئی منفعت دینے پر قادر ہے۔ کیونکہ اللہ کا ماسوا نہ اپنے کسی نفع ونقصان کا مالک ہیں، اور نہ موت وحیات کا اور نہ قیامت کے دن اُٹھانے کا اور چاہیے۔ کہ انسان کسی حال میں بھی اللہ سے سوال کرنا نہ چھوڑے نہ بزبان حال اور نہ بزبان قال کیونکہ حدیث میں ہے۔ جو اللہ سے سوال نہ کرے۔ اللہ ناراض ہوتا ہے کیونکہ سوال کرنا اپنی انکساری کا اظہار ہے۔

الله يغضب ان تركت سؤاله
وبني آدم حين يسأل يغضب

''اللہ ناراض ہوتا ہے اگر تم اس سے مانگنا چھوڑ دو اور بنی آدم سے اگر مانگا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں۔''

فاستعن بالله: کیونکہ اللہ ہی مدد طلب کیے جانے کے قابل ہے اور ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اللہ ہی پر بھروسہ ہے۔ **قوله واعلم ان الامة لو اجتمعت على۔۔۔۔ قد كتبه الله عليك۔** اس میں حضور علیہ السلام نے اپنے آئندہ کلام کی طرف توجہ بڑھانے اور کلام سے استفادہ کر کے اللہ کا تقرب حاصل کرنیکی ترغیب دی ہے۔

الا...... لك) یعنی جو تیرے لئے مقدر کر دیا گیا اور تقدیر کی کتاب میں محفوظ کر دیا گیا اور اس کے لکھنے سے فراغت ہو گئی ہے۔ اور اللہ کی طرف سے اجازت مل گئی ہے۔

لو اجتمعوا: اربعین میں ''لو اجتمعوا'' کی بجائے ''وان اجتمعوا'' کے الفاظ ہیں۔ بعض محققین شراح فرماتے ہیں کہ گذشتہ مقام میں لفظ ''لو'' ''ان'' کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ﴿لو تركوا من خلفهم﴾ [النساء: ۹] ''لو'' استقبال پر دلالت کرتا ہے۔ اور عدول میں نکتہ یہ ہے۔ کہ تمام اُمت کا امداد پر مجتمع ہونا محال ہے۔ بخلاف تکلیف دینے پر اتفاق کے کہ یہ ممکن ہے۔ اور اسی وجہ سے کسی نے شاعر نے کہا ہے:

الظلم من شيم النفوس فان تجد
ذاعفة فلعلة لا يظلم

یہ قول اُس بات سے غفلت کی بنا پر ہے جو عقائد میں طے ہے کہ نفع اور نقصان پہنچانے پر اُمت کا متفق ہونا اللہ کے ارادے کے بغیر محال ہے۔ چنانچہ اگر روایت میں یہ لفظ اختلاف کے ساتھ منقول ہے۔ تو یہ تفنن کے باب سے ہے۔ اور پہلے جملہ میں لفظ ''لو'' کو اختیار کرنا اولیٰ ہے کیونکہ ''لو'' فرضیت اور محالیت پر زیادہ اچھی طرح دلالت کرتا ہے۔ اور دوسرے جملہ

میں ''ان'' اپنے اصل پر باقی ہے۔ جبکہ جملہ معطوف علیہا سے حکم مستفاد ہو رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر نفع اور نقصان کے بارے میں اللہ کو واحد لا شریک لہ مانو، کیونکہ اللہ ہی نقصان پہنچانے والا ہے۔ اور اللہ ہی نفع پہنچانے والا ہے۔ وہی دینے والا ہے اور وہی روکنے والا ہے۔

الٰہیات کی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم میں اس شخص کو ضرور بہ ضرور اپنی رحمت سے قطع کرتا ہوں جو میرے علاوہ کسی اور سے اپنی اُمیدیں وابستہ کرے۔ اور اُس شخص کو لوگوں کی نظر میں ذلت کا لباس پہنا دیتا ہوں۔ اور اپنے قرب سے محروم کرتا ہوں اور اپنے وصال سے دور کر دیتا ہوں۔ اور حیران و پریشان کر کے تفکرات میں پھنسا دیتا ہوں جو مشکلات اور پریشانیوں کے وقت میرے علاوہ کسی اور سے اُمیدیں وابستہ کرے۔ جبکہ پریشانیاں میرے ہاتھ میں ہیں۔ اور حی اور قیوم ہوں۔ اور یہ شخص پریشانی کے عالم میں دوسروں کے دروازوں کو کھٹکھٹاتا پھرتا ہے۔ جب کہ تمام دروازوں کی کنجیاں میرے ہاتھ میں ہیں۔ اور دوسروں کے دروازے بند ہیں۔ جبکہ میرا دروازہ ہر اُس شخص کیلئے کھلا ہے۔ جو میری طرف آئے اور مجھ سے دُعا مانگے نفع کے مقام میں ''لام'' ذکر کیا کیونکہ ''لام'' (جارہ) ملک کا فائدہ دیتا ہے۔ اور اس کا حقیقی معنی ہے۔ ''مفید اختصاص'' اور ''وان اساتم فلها'' ''اور اگر (پھر) تم برے کام کرو گے تو بھی اپنی ہی لیے'' میں ''لام'' کا استعمال ضرر کی صورت میں مجازاً ہوا ہے۔ جیسا کہ جمہور کے نزدیک مشہور ہے۔

قوله: رفعت الاقلام و جفت الصحف:

یعنی قیامت تک جو مخلوقات کے فیصلے اس میں تھے اُسی پر صحیفے خشک ہو گئے۔ لہٰذا اس کے بعد کسی چیز کے لکھنے یا تبدیل کرنے کیلئے دوبارہ صحیفوں پر قلم نہیں رکھا جائے گا۔

حاصل یہ کہ جو کچھ مقدر ہے۔ وہ سب کچھ لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا۔ اور اس لکھائی سے فراغت کے بعد اب کچھ مزید نہیں لکھا جائے گا۔ چنانچہ ہر شخص کی تقدیر کے پہلے سے لکھے جانے کو قلم اُٹھا کر رکھ دینے اور صحیفوں کے خشک ہو جانے سے تعبیر کر دیا۔ اس میں تشبیہ ہے کہ جس طرح کاتب کتاب کو مکمل لکھ لینے کے بعد قلم رکھ دیتا ہے۔ اور کتاب کو بند کر دیتا ہے۔ اسی طرح تقدیر کی کتابت میں ہوا اور کتاب کی ابتدا میں یہ حدیث گزر چکی ہے: **ان اول ماخلق الله القلم فقال: اكتب قال: وما كتب؟ قال: اكتب القدر. فكتب ما كان هو كائن الى الأبد.** کہ اللہ نے سب سے پہلے جس چیز کو پیدا کیا وہ قلم تھا۔ پھر قلم سے فرمایا کہ لکھو قلم نے عرض کیا کیا لکھوں؟ اللہ نے فرمایا تقدیر لکھو چنانچہ قلم نے وہ سب کچھ لکھا جو وقوع پذیر ہو چکا ہے۔ اور جو قیامت تک واقع ہوگا۔ اور حدیث ''**جف القلم على علم الله**'' کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ازل میں قلم کو بتایا اور جس کا حکم دیا وہ نہ تبدیل ہوگا۔ اور نہ متغیر ہوگا۔ اور قلم کے خشک ہو جانے سے یہی مراد ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ اشکال نہ کیا جائے کہ یہ روایت ارشاد باری ﴿**يمحو الله مايشاء ويثبت**﴾ [الرعد: ۳۹] خدا تعالیٰ جس حکم کو چاہیں موقوف کر دیتے ہیں اور جس حکم کو چاہیں قائم رکھے جیسا کے منافی ہے۔ کیونکہ، **محو** (مٹانا) اور اثبات، (باقی رکھنا) بھی در حقیقت انہی چیزوں میں سے ہے۔ جو مقدر ہو چکی ہے۔ اور جن کو لکھنے کے بعد صحیفے خشک ہو گئے کیونکہ قضاء کی دو قسمیں ہیں۔ مبرم اور معلق علاوہ ازیں محو اور اثبات کا تعلق لوحِ محفوظ سے ہے۔ اور اللہ کے علم کے اعتبار سے اس میں نہ کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔

اور نہ کوئی تغیر ہوگا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وعنده ام الكتاب﴾ [الرعد۔۳۹]

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں۔ کہ اللہ کے پاس دو کتابیں ہیں ایک تو لوحِ محفوظ ہے کہ اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا اور دوسری کتاب وہ ہے۔ جس میں فرشتے بندوں کے اعمال لکھتے ہیں اور محو اور اثبات کا تعلق اسی کتاب سے ہے۔ سو یہ تقدیر کا تذکرہ حدیث میں ہے۔ (رواہ احمد والترمذی) اور ترمذی فرماتے ہیں۔ کہ یہ حدیث حسن ہے اور صحیح ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح فرمایا ہے۔ اور ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ ترمذی کے علاوہ دوسروں کی روایت میں احفظ الله تجده امامك کے علاوہ "تعرف الى الله" الفاظ ہیں۔ "تعرف" را کی تشدید کے ساتھ یعنی اللہ کے احکام کی حفاظت کر کے اللہ کا محبوب بن جا۔ یہ معنی امام نووی نے ذکر کیا ہے۔ کیونکہ اللہ کی معرفت اللہ کی محبت کا سبب ہے۔

"یعرفك في الشدة" "را" کی تخفیف کے ساتھ یعنی اللہ سختی اور تنگی میں انعام کریں گے۔

واعلم ان ماخطاك" یعنی جو نعمت، راحت اور تنگی و پریشانی تم سے چھوٹ جائے "خطا" کا اصل معنی ہے۔ مقصود سے ہٹ جانا۔ اُس نعمت، راحت اور تنگی و پریشانی نے تجھے ملنا نہیں تھا۔ یعنی اُس کا ملنا محال تھا۔ اور اس میں کئی طریقوں سے مبالغہ ہے کیونکہ نفی میں تاکید پیدا کرنے کیلئے خبر پر لام تاکید یہ داخل کر لیا گیا۔ اور خبر میں نفی کی سرایت کیلئے نفی کو مسلط کیا گیا۔ "وما اصابك لم يكن ليخطئك" اس میں توکل اور اللہ ﷻ کے قضاء پر رضاء کی ترغیب ہے۔ اور انسان سے قوت و طاقت کی نفی کرنے کی ترغیب ہے۔ کیونکہ جو کچھ بھی پیش آتا ہے۔ مثلاً نیک بختی، بدبختی، تنگی، کشادگی، بھلائی، بُرائی، نفع نقصان موت زندگی ان کا فیصلہ اور تقدیر زمین و آسمان کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل ہو چکا ہے۔ جو کچھ ہوگا اُس کو تقدیر کے قلم نے لکھ دیا ہے چنانچہ حرکت اور سکون دونوں برابر ہیں۔ لہٰذا "[قل كل من عند الله] (النساء:۷۸) "آپ فرما دیجئے کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے" کہہ کر ہر راحت کے وقت شکر اور ہر مصیبت کے وقت صبر کرنا واجب ہے۔ اور یاد رکھنا چاہیے کہ دُشمن کے خلاف اللہ کی مدد مصائب اور آزمائشوں پر صبر کرنے کے ساتھ ہے۔ اور "فرج" یعنی غموں سے خلاصی "کرب" یعنی برداشت کے ساتھ ہے۔ اسی لئے وارد ہوا ہے۔ "اشتدی ازمة تنفرجی" اور "اپنے نفس کی لگام کھینچ کر رکھو" وسعت ملے گی۔ [ان مع العسر یسرا] [الشرح:۹] "بے شک موجود مشکلات کے ساتھ آسانی ہونے والی ہے"۔

شارح فرماتے ہیں کہ یہ آیت قرآن میں مکرر وارد ہوئی ہے تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ جب بھی کوئی تنگی آئیگی اس کے ساتھ دو کشادگیاں ہونگیں اور یہ بات ایک مشہور قاعدہ پر بنی ہے کہ جب نکرہ دوبارہ ذکر کیا جائے۔ تو اُس سے مراد پہلے نکرہ کے علاوہ دوسری شے ہوگی۔ اور اگر معرفہ کو دوبارہ ذکر کیا جائے۔ تو اُس سے وہی مراد ہوگا جو پہلے معرفہ سے مراد ہوتا ہے۔ لیکن یہ قاعدہ اکثر یہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قل اللهم مالك الملك تؤتی الملك﴾ [آل عمران:۲۶] (اے محمد) آپ اللہ تعالیٰ سے یوں کہیے کہ اے اللہ مالک تمام ملک کے آپ ملک جس کو چاہیں دے دیتے ہیں" اس آیت میں پہلا لام استغراق کیلئے ہے۔ دوسرا لام جنس کیلئے ہے اور جنس ماقبل کے ایک فرد سے مستفاد ہوگا۔

پھر بعض شارحین فرماتے ہیں کہ مع بعد کے معنی میں ہے۔ اور یہ حقیقی معنی سے بعید ہے۔ الفاظ میں مبالغہ مراد ہے۔ اسلئے کہ عبارت سے یہ مقصود ہے کہ عُسر (تنگی) اور یُسر (کشادگی) میں سے ایک دوسرے کے بعد فوراً پایا جائے گا۔ اور ایک دوسرے

کے ساتھ اس طرح متصل رہے گا۔ جیسا کہ دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ اور الفاظ سے یہ اس معنی کا قصد کر کے مبالغۃً اسلئے مراد ہے۔ کہ اچھی طرح تسلی اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی معلوم ہوگئی۔ کہ مشقت اللہ کی طرف سے انعام سے خالی نہیں ہے۔ بلکہ مشقت بعینہٖ اللہ کی طرف سے انعام ہے ﴿وفي ذالكم بلاء من ربكم عظيم وما يلقاها الا ذوحظ عظيم﴾ [فصلت۔ ۳۵]

قطب ربانی، غوث صمدانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنی کتاب ''فتوح الغیب'' میں فرماتے ہیں

''ہر مؤمن کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس حدیث کو اپنے دل کا آئینہ اپنا شعار، اپنا سرمایہ اور اپنی گفتگو بنا لے اور اپنی تمام حرکات وسکنات میں اس کے مطابق عمل کرے تاکہ دنیا و آخرت میں سالم رہے اور دنیا و آخرت میں اللہ کی رحمت کے سبب عزت سے نواز جائے۔

تخریج: اس حدیث کو احمد اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رزین کی روایت میں ''تجاهك'' کے بعد 'تعرف الى الله في الرخاء يعرفك في الشدة' کی زیادتی منقول ہے۔ اور آخر میں یوں ہے:

''فان استطعت ان تعمل لله بالرضا في اليقين فافعل فان لم تستطع فان في الصبر على ماتكره خيرا كثيرا' واعلم ان النصر مع الصبر والفرج مع الكرب وان مع العسر يسر ولن يغلب عسر يسرين'' اور اس طویل حدیث جیسی حدیث مسند احمد بن حنبل میں موجود ہے۔

نہایہ میں ہے کہ ''تعرف الى الله'' کا معنی یہ ہے کہ: ''اجعل تعرفك بطاعتك والعمل فيما أولاك من نعمته، فانه يجازيك عند الشدة والحاجة في الدنيا والآخرة'' اور ''لن يغلب عسر يسرين'' دوسرے العسر میں تعریف عہد کیلئے ہے۔ اور ''یسرا'' میں تنکیر نوعیت کیلئے ہے۔ اسلئے ''العسر'' ایک ہوا اور ''یسر'' دو ہوئے۔ اور وہ مشقتیں اور تھکاوٹ ہیں جو صحابہ کو پیش آئی تھی۔ اور ''یسر'' سے مراد فتوحات، دشمن کے خلاف مدد ہے۔ اور آخرت میں اچھا انجام اور محبوب دوستوں کی ملاقات ہے۔

۵۳۰۳: وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ سَعَادَةِ ابْنِ اٰدَمَ رِضَاهُ بِمَا قَضَى اللّٰهُ لَهٗ وَمِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ تَرْكُهٗ اِسْتِخَارَةَ اللّٰهِ وَمِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ سَخَطُهٗ بِمَا قَضَى اللّٰهُ لَهٗ۔

(رواه احمد والترمذی وقال هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذي في السنن ٣٩٦/٤ حديث رقم ٢١٥١ واحمد في المسند ١٦٨/١

ترجمہ: ''حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ابن آدم (انسان) کی سعادمندی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جو کچھ مقدر فرمایا ہے وہ اس رضامندر ہے اور ابن آدم کی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے خیر وبھلائی کو مانگنا چھوڑ دے۔ نیز ابن آدم کی بدنصیبی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ اس کے لئے مقدر فرمایا ہے وہ اس سے ناخوش وناراض ہو۔ اس روایت کو احمد و ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: قوله: ومن اسخارة ابن آدم تركه استخارة الله:

یعنی خیر طلب کرنا کیونکہ انسان کیلئے جو چیز بہتر ہوتی ہے اللہ اُس کیلئے اُس کو مقدر کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے ایک عارف باللہ کہتا ہے۔ کہ خود اپنے لئے کسی چیز کو پسند نہ کیا کرو اور اگر کچھ پسند کرنا ہی ہے تو عدم اختیار کو پسند کرو۔ اگر چہ اپنے لئے کسی کام کو منتخب کرنا ضروری ہی کیوں نہ ہو"وربك يخلق مايشاء ويختار" (اور آپ کا رب جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور پسند کرتا ہے)۔ نیز ارشاد باری ہے: ﴿وما كان لمؤمن ولا مؤمنة اذاقضى الله ورسوله امرا ان يكون لهم الخيرة من امرهم﴾ [الاحزاب۔۳٦] "اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیدیں کہ ان کو ان کے اُس کام میں کوئی اختیار ہو۔"

قوله: ومن شقاوة من آدم سخطه قضى الله له:

اللہ کے فیصلہ و تقدیر پر راضی ہونا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا بڑا دروازہ ہے۔ اور یہ اہل سلوک کے منازل میں سے ایک منزل ہے۔ اور "مقام افخم" کے نام سے موسوم ہے۔ استخارہ کے ذکر کو مقدم کیا کیونکہ استخارہ اللہ کی تقدیر پر راضی ہونے کا سبب ہے۔ اور اسلئے کہ استخارہ فیصلے کے متحقق ہونے سے پہلے ہوتا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ اللہ کی تقدیر و قسمت پر راضی ہونا یعنی ناراضگی کا اظہار نہ کرنا انسان کی سعادت کی علامت ہے۔ اور اس کو انسان کی سعادت کی علامت دو وجہوں سے قرار دیا گیا۔ پہلی وجہ ہے کہ عبادت کیلئے فارغ ہونا کیونکہ انسان جب اللہ کے فیصلوں پر راضی نہیں ہوتا وہ ہمیشہ غمگین رہتا ہے۔ اور واقعات کے رونما ہونے سے اُسکا دل مشغول رہتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اسی طرح کیوں ہوا اور اس طرح کیوں نہیں ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ کی تقدیر پر ناراض ہونے سے اللہ کا غضب نازل نہ ہو۔ اور بندے کا اللہ کی تقدیر پر ناراض ہونا یہ ہے۔ کہ وہ چیزیں یاد کریں اور بہتر سمجھے جنکا اللہ نے اس کے لئے فیصلہ نہیں کیا اور خدا نے جس چیز کو مقدر کیا ہے۔ وہ اس چیز سے بہتر اور اولیٰ جس کا اچھا یا بُرا ہونا یقینی نہیں ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ دو ہم مفہوم متقابل جملوں کے درمیان "ومن شقاوه ابن آدم تركه استخارة الله" کو کیسے ذکر کیا گیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اُس شخص کا وہم دور ہو جائے جو استخارہ چھوڑ دے اور اپنے معاملہ کو کلیتاً سپرد کرے۔ انتہیٰ۔

اس جواب میں اشکال ہے۔ کیونکہ استخارہ اور تفویض کا انجام تو ایک ہے۔ اسی طرح آئندہ روایت میں دونوں جملوں میں صرف استخارہ پر اکتفاء کیا گیا۔ پھر اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مطلق تسلیم استخارہ سے اولیٰ ہے۔ کیونکہ استخارہ بھی ایک گونہ مطالبہ اور چاہت کا اظہار ہے۔ اور اس امر کے بارے میں منازعہ ہے جو متحقق ہو چکا اور استخارہ کی حقیقت یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ سے تمام امور میں بھلائی طلب کی جائے۔ بلکہ یہ اعتقاد رکھے کہ انسان اپنی خیر اور شر میں امتیاز نہیں کر سکتا جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرة۔۲۱٦]

"یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں باعث خرابی ہو اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔"

پھر اس سے ترقی یہ ہے کہ انسان کا یقین ہو کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس میں خیر ہے چنانچہ مروی ہے: **الخير بيديك والشر ليس اليك،** خیر تیرے ہاتھوں میں اور شر تیری طرف منسوب نہیں ہے۔ پھر مستحب یہ ہے کہ دینی یا دنیاوی اہم معاملات میں مشورہ کرنے کے بعد استخارہ کی دُعا مانگی جائے۔ اور کم از کم استخارہ یہ ہے کہ یوں کہے" **اللهم خرلی واخترلی ولا تكلنی الی اختياری**" اور زیادہ کامل دُعاء استخارہ کی صورت یہ ہے کہ دو رکعت نفل پڑھے پھر اس کے بعد وہ مشہور دُعا پڑھے جو احادیث میں موجود ہے اور کتاب الصلاۃ میں ہم نے ذکر کر دی ہے۔

قوله: وقال هذا حديث غريب : امام ترمذیؒ کا مکمل کلام یوں ہے: یہ حدیث محمد بن حمید کی سند سے ہی معروف ہے اور محمد بن حمید محدثین کے نزدیک قوی نہیں ہے۔ اور حاکم نے اس کو اپنی صحیح میں نقل کیا ہے اور اس میں یہ زیادتی بھی ہے:

"**من سعادة ابن آدم كثرة استخارته الله، ومن شقاوته تركه استخارة الله**" اس حدیث کو حاکم اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں کہ دونوں حدیثیں سعد ابن ابی وقاص سے مروی ہیں اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے الفاظ ہیں:

"**من سعادة ابن آدم كثرة استخارته الله ورضاه بما قضى الله له، ومن شقاوة ابن آدم تركه استخاره الله وسخطه بما قضى الله له**" جامع میں اس حدیث کو سعد کی سند سے امام ترمذی اور حاکم کی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن اُسکے الفاظ یہ ہیں "**من سعادة ابن آدم استخارته الله ومن سعادة ابن آدم رضاه بما قضى الله، ومن شقاوة ابن آدم تركه استخارة الله ومن شقاوة ابن آدم سخطه بما قضى الله**" اس سے اور اس کے ماقبل کے الفاظ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مشکاۃ کے الفاظ میں بہت اختصار ہے جو مخل ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

طبرانی نے اوسط میں حضرت انسؓ سے مرفوعاً یوں اس روایت نقل کیا ہے:

ماخاب من استخار، ولاندم من استشار ولا عال من اقتصد:

"وہ شخص نامراد نہیں ہو سکتا جو استخارہ کرے اور وہ شخص نادم اور پشیمان نہیں ہو سکتا جو مشورہ کرے، اور وہ شخص محتاج نہیں بن سکتا جو میانہ روی اختیار کرے۔

بعض حکماء فرماتے ہیں کہ جس شخص کو چار چیزیں حاصل ہو گئیں وہ چار چیزوں سے محروم نہیں ہو سکتا:

1. جس شخص کو شکر گزاری کا مرتبہ حاصل ہوا وہ نعمتوں میں زیادتی سے محروم نہیں رہے گا۔
2. جس شخص کو توبہ کی توفیق نصیب ہوئی وہ قبولیت سے محروم نہیں رہے گا۔
3. جس شخص نے استخارہ کا راستہ اختیار کیا وہ بھلائی سے محروم نہیں رہے گا۔
4. جس شخص نے مشورہ حاصل کیا وہ صحیح بات تک پہنچنے سے محروم نہیں رہے گا۔

الفصل الثالث:

۵۳۰۴ : عَنْ جَابِرٍ اَنَّهُ غَزَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قِبَلَ نَجْدٍ فَلَمَّا قَفَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَفَلَ مَعَهُ فَاَدْرَكَتْهُمُ الْقَائِلَةُ فِيْ وَادٍ كَثِيْرِ الْعِضَاهِ فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَفَرَّقَ النَّاسُ يَسْتَظِلُّوْنَ بِالشَّجَرِ فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحْتَ سَمُرَةٍ فَعَلَّقَ بِهَا سَيْفَهُ وَنِمْنَا نَوْمَةً فَاِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْعُوْنَا وَاِذَا عِنْدَهُ اَعْرَابِيٌّ فَقَالَ اِنَّ هٰذَا اخْتَرَطَ عَلَيَّ سَيْفِيْ وَاَنَا نَائِمٌ فَاسْتَيْقَظْتُ وَهُوَ فِيْ يَدِهِ صَلْتًا قَالَ مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّيْ فَقُلْتُ اَللّٰهُ ثَلٰثًا وَلَمْ يُعَاقِبْهُ وَجَلَسَ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۹۶/۶ حديث رقم ۲۹۱۰ ومسلم في صحيحه ۱۷۸۷/۴ حديث رقم (۱۴-۸۴۳) واحمد في المسند ۳۶۵/۳۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ اس غزوہ میں شریک تھے جو نجد کی جانب ہوا تھا اور جب رسول اللہ ﷺ جہاد سے فارغ ہو کر واپس تشریف لائے تو جابر رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہی واپس ہوئے پس (کسی دن) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دوپہر کے وقت ایک گھنی جھاڑیوں والے جنگل میں پہنچے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قیلولہ نے آ لیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے (صحابہؓ کے ہمراہ) وہاں پڑاؤ ڈال لیا اور تمام لوگ درختوں کے سایہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے (یعنی ہر شخص ایک ایک درخت کے نیچے چلا گیا اور اس کے سایہ میں کچھ دیر استراحت کی غرض سے لیٹ گیا) رسول اللہ ﷺ بھی کیکر کے ایک بڑے درخت کے نیچے فروکش ہو گئے اور اپنی تلوار کو اس درخت کے ساتھ لٹکا دیا (حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ) ہم لوگ کچھ نیند لینے کی غرض سے سو گئے تھے کہ اچانک ہم نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں بلا رہے ہیں چنانچہ ہم لوگ (اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر) آپ ﷺ کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ لیٹے ہوئے ہیں اور وہیں آپ ﷺ کے پاس ایک دیہاتی کافر موجود ہے۔ آنحضرت ﷺ نے (ہمارے جمع ہونے پر) ارشاد فرمایا کہ یہ دیہاتی اس وقت جب کہ میں سو رہا تھا مجھ پر میری تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا اور جب میں بیدار ہوا میں نے دیکھا کہ میری ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ میں نے فوراً جواب دیا کہ میرا اللہ مجھے بچائے گا۔ اور میں نے یہ بات تین مرتبہ کہی۔ اور (راوی کا بیان ہے کہ حضور ﷺ نے) اس دیہاتی کی کوشش کو سرزنش نہیں فرمائی پھر آپ ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **على جابر انه غزا مع النبي:** اور ایک نسخہ میں (''النبی'' کی بجائے) ''رسول اللہ'' کا لفظ ہے۔

قبل: قاف کے کسرہ اور با کے فتحہ کے ساتھ

''نجد'': اور نہایہ میں ہے کہ ''نجد'' بلند ٹیلہ کو کہتے ہیں۔ یہ حجاز کے قریب ایک خاص علاقہ کا نام ہے۔

قفل: قافلہ کو ''قافلہ'' کہا جاتا ہے اگرچہ وہ جا رہا ہو لوٹنے کی نیک فالی لیتے ہوئے۔

العضاہ: عین کے کسرہ کے ساتھ۔ کانٹے ~~دار درخت~~ کہا جاتا ہے۔

سمرة: سین کے فتحہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ ایک کانٹے دار (ببول کا) درخت ہے۔"عضاہ" سے بڑے درخت کو "سمرة" کہا جاتا ہے۔

نمنا: نون اول کے کسرہ کے ساتھ۔

واذا: ایک نسخہ میں" فاذا"۔

وانا نائم: حال ہے۔ صلتا: صاد کے فتحہ کے ساتھ اور ضمہ بھی پڑھا گیا ہے۔ جوہری فرماتے ہیں کہ "صلت" صاد کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور قاموس میں ہے کہ" صلت" کا معنی ہے وہ تلوار جس کو صیقل کیا گیا ہو اور صاد کو ضمہ دیا جاتا ہے۔ اور نہایہ میں ہے کہ" الصلت" کا معنی ننگی تلوار ہے۔

قوله: قال: من يمنعك منى: فعل اپنے حقیقی معنی پر قائم ہے اور مضاف مقدر ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ اس کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اى من يحميك منى۔ تجھے مجھ سے کون بچائی گا۔" اساس البلاغہ" میں لکھا ہے: ومن المجاز"فلان يمنع الجار" اى يحميه من ان يضام۔

فقلت الله: حقیقت یہی ہے کہ اللہ مجھے بچائے گا۔ یا اُس حفاظت کا اعتبار کرتے ہوئے فرمایا جس حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام سے وعدہ کیا ہے: [والله يعصمك من الناس] [المائدة۔٦٧] (اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا)۔

قوله: فلقت: الله 'ثلاثا ولم يعاقبه وجلس: یعنی تین مرتبہ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ سے مدد طلب کرتے وقت تین مرتبہ اللہ کا نام لینا مستحب ہے۔

وجلس: یعنی نبی ﷺ بیٹھ گئے جبکہ پہلے بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے پھر یہ بھی احتمال ہے کہ یہ سارا معاملہ صحابہ کو بلانے سے پہلے ہوا ہو اور بعد میں بلایا ہو تا کہ خلاف عادت معاملہ کی خبر دے دیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ صحابہ کو بلانے کے بعد یہ سارا معاملہ ہوا ہو۔ اور حضور علیہ السلام نے صحابہ کو بلایا ہو تا کہ اُنکو معجزہ دکھائیں۔ اور پہلی بات زیادہ ظاہر ہے۔

۵۳۰۵ : وَ فِيْ رِوَايَةِ اَبِيْ بَكْرِ الْاِسْمَاعِيْلِيِّ فِيْ صَحِيْحِهٖ فَقَالَ مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّي قَالَ اللّٰهُ فَسَقَطَ السَّيْفُ مِنْ يَدِهٖ فَاَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّيْفَ فَقَالَ مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّي فَقَالَ كُنْ خَيْرًا اٰخِذٍ فَقَالَ تَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ لَا وَلٰكِنِّيْ اُعَاهِدُكَ عَلٰى اَنْ لَّا اُقَاتِلَكَ وَلَا اَكُوْنُ مَعَ قَوْمٍ يُقَاتِلُوْنَكَ فَخَلّٰى سَبِيْلَهٗ فَاَتٰى اَصْحَابَهٗ فَقَالَ جِئْتُكُمْ مِنْ عِنْدِ خَيْرِ النَّاسِ هٰكَذَا فِيْ كِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ وَفِي الرِّيَاضِ۔

اخرجه البخاري في صحيحه ٩٧/٦ حديث رقم ٢٩١٣ واخرجه مسلم في ١٧٨٧/٤ حديث رقم (١٤-٨٤٣) واحمد في المسند ٣٩٠/٣

ترجمہ: "اس روایت میں کہ جس کو ابوبکر اسماعیلی نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے یہ الفاظ ہیں کہ اس دیہاتی نے (آنحضرت ﷺ پر تلوار سونت کر) پوچھا کہ اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ تو حضور ﷺ نے جواباً فرمایا:" اللہ"۔ (۔

ننگے ہی) دیہاتی کے ہاتھ سے تلوار گر گئی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار کو پکڑ لیا اور فرمایا کہ (اگر میں تمہیں قتل کرنا چاہوں تو بتاؤ کہ) اب تمہیں کون مجھ سے بچا سکے گا؟ دیہاتی نے جواب دیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو بھلائی کے ساتھ پکڑنے والے ہیں (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سے تو مجھے یہ توقع ہے کہ میرے لئے انتقامی کارروائی نہیں فرمائیں گے اور آپ ازراہ لطف وکرم مجھے معاف عنایت فرمائیں گے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اچھا اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں اور بلاشبہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ (گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے یہ فرمایا کہ اگر تمہیں میرے اوپر اتنا زیادہ اعتماد ہے تو پھر یقیناً یہ بات بھی اچھی طرح سمجھتے ہو کہ میری دعوت اسلام بالکل برحق اور مبنی برصداقت ہے اس صورت میں تو تمہیں چاہئے کہ کلمہ پڑھ لو اور مسلمان ہو جاؤ) دیہاتی نے جواباً کہا کہ نہیں اسلام تو نہیں قبول کر سکتا مگر جانے دے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عہد ضرور کرتا ہوں کہ نہ میں خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قتال کروں گا اور نہ ہی آپ کے مقابلے میں لڑنے والوں کا ساتھ دوں گا۔ بہرحال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دیہاتی کو جانے دے دیا اور جب وہ دیہاتی اپنے رفقاء میں آیا تو کہنے لگا کہ میں تمہارے درمیان ایک ایسے شخص کے پاس سے ہو کر آیا ہوں جو سب سے بہتر شخص ہے۔ بخاری و مسلم کی مذکورہ بالا روایت اسی تین کے ساتھ کتاب حمیدی اور امام محی الدین کی تصنیف "ریاض الصالحین" میں بھی منقول ہے"۔

تشریح: قوله: كن خير آخذ: اى آخذ السيف۔ یعنی "قدرت کے باوجود معاف فرما دیجئے جملہ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: اى بالجنايات عفو مراد ہے۔ (انتہی)۔ چنانچہ "اخذ" مؤاخذہ کے معنی میں ہے۔

فقال: تشهد: حرف استفہام محذوف ہے اى اتشهد

قال لا: (فعل محذوف ہے۔) اى لا اشهد۔

۵۳۰۶ : وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنِّىْ لَاَعْلَمُ اٰيَةً لَوْ اَخَذَ النَّاسُ بِهَا لَكَفَتْهُمْ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ. (رواه احمد وابن ماجة والدارمى)

اخرجه ابن ماجه فى السنن ۲/۱۴۱۱ حديث رقم ۴۲۲۰ والدارمى فى السنن ۲/۳۰۹ حديث رقم ۲۷۲۵ واحمد فى المسند ۱/۲۴۸

ترجمہ: "حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "یقیناً میں ایک ایسی آیت جانتا ہوں کہ اگر لوگ (محض) اسی آیت پر عمل پیرا ہو جائیں تو ان کے حق میں وہی ایک آیت کافی ہو جائے۔ وہ آیت یہ ہے: وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الاية) یعنی جو شخص اللہ سے ڈرنے لگ جائے تو اللہ اس کے لئے دنیا اور آخرت کے غموں سے) نجات کا راستہ پیدا فرما دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے (بغیر تکلیف ومشقت اٹھائے اور بغیر غم وفکر کے) عزق عطا فرماتا جہاں سے ملنے کا خیال بھی نہیں ہوتا"۔ (ابن ماجہ، داری)

تشریح: اس آیت کا اگلا حصہ یوں ہے: ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَىْءٍ قَدْرًا﴾ [الطلاق: ۳] "اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہے اللہ تعالیٰ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے اللہ تعالیٰ نے ہر شئے کا ایک انداز مقرر کر رکھا ہے"۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں ~~ایک آیت~~ مراد ہے۔ اور [ومن يتق الله۔۔۔۔من حيث لا يحتسب] تک

اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ تمام وہ دنیاوی اور اُخروی امور جن کا انسان کو خوف وخطرہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے اُن تمام کی کفایت کرتا ہے۔ اور ومن یتوکل......" میں اشارہ ہے کہ اللہ انسان کے اُن تمام اُمور کی کفایت کرتا ہے جن کو انسان تلاش کرتا ہے چاہے دیناوی اُمور ہوں چاہے اُخروی اُمور ہوں۔ اور وبالغ امرہ کا مطلب ہے کہ وہ اپنے حکم کو نافذ کر کے رہتا ہے۔ اس حدیث میں اللہ پر توکل کے ضروری ہونے اور تمام امور کو اللہ کے سپرد کرنے کا بیان ہے۔ اسلئے کہ جب انسان کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ رزق اور اس جیسی ہر چیز تقدیر الٰہی اور توفیق الٰہی سے ہی تعلق رکھتی ہے تو قدر وقضا کے آگے سر تسلیم خم کرنے اور توکل کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہتا۔ کسی نے کہا ہے۔

اذا المرء امسلی حلیف التقی
فلم یخش من طارق حلہ
الم تسمع اللہ سبحانہ
ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجًا

۵۳۰۷: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اَقْرَاَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ اَنَا الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنِ.

(رواہ ابو داؤد والترمذی وقال ھذا حدیث حسن صحیح)

اخرجہ الترمذی فی السنن ۱۷۶/۵ حدیث رقم ۲۹۴۰۔

ترجمہ: "حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو یہ آیت سکھائی اِنِّیْ اَنَا الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنِ یعنی (اے انسان یاد رکھ کہ) بلاشبہ میں ہی رزق عطا کرنے والا ہوں (اور) غالب طاقت والا ہوں"۔ (ابوداؤد، ترمذی) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے"۔

تشریح: قولہ: اقرأنی رسول اللہ ﷺ: یعنی مجھے قراءت کرنے پر اُبھارا (ذکرہ الطیبی) اور زیادہ ظاہر معنی یہ ہے کہ مجھے یہ آیت سکھائی "انی انا الرزاق" یعنی اس کی قراءت اسی طرح سکھائی۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ ایک شاذ قراءت ہے جو حضور علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ اور مشہور قراءت یہ ہے [ان اللہ ھو الرزاق][الذاریات۔۵۸]۔ (انتہی) مطلب یہ ہے کہ [انی انا الرزاق] ایک قطعی قراءت تھی اور معنی کے اعتبار سے متواتر تھی۔ رسول ﷺ نے یہ آیت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو سکھائی تھی لیکن پھر یہ قراءت منسوخ ہو گئی یا ابن مسعود کے بعد شاذ ہو گئی۔

ذو القوۃ المتین: "غالب طاقت والا" اللہ تعالیٰ کے "قوۃ" اور "متانۃ" کے ساتھ موصوف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بے پناہ قدرت والا ہے اس کی قدرت ہر چیز پر ہے۔ "ذو القوۃ" خبر ثانی ہے۔ اور اس میں کئی وجوہ سے مبالغہ ہے۔ اول یہ کہ جملہ کے شروع میں "ان" ہے دوم یہ کہ متبدا اور خبر کے درمیان ضمیر فصل لائی گئی ہے جو مفید اختصاص ہے۔ سوم یہ کہ خبر پر لام جنس لایا گیا اور پھر تتمیم کے لئے "ذو القوۃ" کے بعد "متین" کو ذکر کیا گیا۔ اسلئے واجب ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد کیا جائے اور اپنے امور صرف اُسی کے سپرد کیے جائیں۔

۵۳۰۸: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ اَخَوَانِ عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَکَانَ اَحَدُھُمَا

یَاْتِیْ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالْاٰخَرُ یَحْتَرِفُ فَشَکَا الْمُحْتَرِفُ اَخَاہُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَعَلَّکَ تُرْزَقُ بِہٖ ۔ (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث صحیح غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤٩٦/٤ حدیث رقم ٢٣٤٥

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں دو بھائی تھے جن میں سے ایک تو نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں رہا کرتا تھا' اس کا زیادہ وقت رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہ کر علم ومعرفت کے حصول اور عبادت واطاعت اور دینی خدمات کی مشغولیت میں صرف ہوا کرتا تھا) جب کہ دوسرا بھائی کوئی کام کرتا تھا (یعنی حصولِ معاش کے لئے کسی ہنر و پیشہ کے ذریعہ کمائی کرتا تھا اور دونوں بھائی ایک ساتھ کھاتے پیتے تھے) چنانچہ کمانے والے بھائی نے حضور ﷺ سے اپنے دوسرے بھائی کی شکایت کی (یعنی میرا بھائی نہ تو میرے کام کاج میں ہاتھ بٹاتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی ذاتی پیشہ ہے اور اس طرح اس کے کھانے پینے کا خرچ مجھے ہی برداشت کرنا پڑتا ہے) حضور ﷺ نے (اس کی یہ شکایت سن کر) ارشاد فرمایا: ''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ تمہیں اسی کی برکت سے رزق دیا جا رہا ہو''۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح غریب ہے''۔

تشریح: فشکا المحترف اخاہ النبی: ''منصوب بنزع الخافض ہے۔ ای :الی النبی ﷺ۔

ترزق به: مجہول کے صیغہ کے ساتھ

مجھے اُمید ہے یا مجھے اس بات کا خوف ہے کہ تجھے اس کی برکت سے رزق ملتا ہے۔ صنعت وحرفت کی وجہ سے روزی ملتی ہے چنانچہ اس پر اپنی صنعت وحرفت کا احسان نہ جتلا۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان کا دنیاوی مشاغل کو چھوڑنا جائز ہے' اور یہ زاد عقبی کی خاطر علم وعمل میں مشغول ہونا اور تجردگی زندگی بسر کرنا جائز ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''لعلك'' میں موجود معنی کا رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہونا بھی ممکن ہے۔ اس صورت میں یقین وتوبیخ کا معنی دے گا۔ جیسا کہ اس روایت میں وارد ہوا ہے: ''فھل ترزقون الا بضعفائکم''

اور یہ بھی ممکن ہے کہ مخاطب کی طرف راجع ہونا' کہ مخاطب کیلئے غور وفکر کا باعث بنے اور خود عدل وانصاف سے کام لے۔

تخریج: اس حدیث کو امام حاکم نے بھی نقل کیا ہے۔

۵۳۰۹ : وَعَنْ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ قَلْبَ ابْنِ اٰدَمَ بِکُلِّ وَادٍ شُعْبَۃٌ فَمَنِ اتَّبَعَ قَلْبَہُ الشُّعَبَ کُلَّھَا لَمْ یُبَالِ اللّٰہُ بِاَیِّ وَادٍ اَھْلَکَہٗ وَمَنْ تَوَکَّلَ عَلَی اللّٰہِ کَفَاہُ الشُّعَبَ ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

اخرجه ابن ماجه ١٣٩٥ حدیث رقم ٤١٦٦۔

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ انسان کے دل کے لئے ہر وادی میں ایک گوشہ اور ایک حصہ ہے پس جس شخص نے اپنے دل کو ان حصوں اور گوشوں پیچھے لگائے رکھا

(یعنی اس نے اپنے دل کو ان تفکرات اور غموں میں مشغول ومنہمک رکھا اور پراگندہ خاطری کا شکار ہوا) تو اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں کہ اس کو کس جنگل میں ہلاک کرے (یعنی جب انسان اللہ تعالیٰ کو حقیقی ذمہ دار ہے یہ اعتماد نہیں کرتا بلکہ ساری توجہ اپنی ذاتی تدبیر وسعی اور تگ ودو میں مشغول رکھتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی ایسے شخص کی کوئی پرواہ نہیں فرماتے جہاں چاہے ہلاک ہو جائے کسی بھی مشغولیت میں دنیا سے چلا جائے) اور جس شخص نے اللہ پر اعتماد وبھروسہ کیا (اور اپنے تمام کاموں کو اسی کے حوالہ کر دیا) تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام امور کی بہتری کے لئے کافی ہو جاتا ہے"۔

تشریح: قولہ: ان قلب ابن آدم بکل واد شعبۃ: یعنی انسان کے دل میں ایک شاخ اور ٹکڑا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے دل کا ایک گوشہ (معیشت کی طرف) متوجہ ہوتا ہے۔ کیونکہ دل ایک ہے اور اس میں تفکرات وغموم متعدد ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ماجعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ﴾ "کسی شخص کے پیٹ (یعنی جسم) میں دو دل نہیں رکھے"۔ نہایہ میں ہے "الشعبۃ" ہر چیز کے ایک حصہ اور ٹکڑے کو کہا جاتا ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ کہ یہاں کچھ مقدر ماننا ضروری ہے۔ (ای) "فی کل واد لہ شعبۃ"

قولہ: فمن اتبع قلبہ الشعب۔۔۔اھلکہ:

اتبع اتباع سے ماخوذ ہے۔ یعنی جو شخص غموں کی وادیوں میں اپنے دل کو تفکرات کی گھاٹیوں کا تابع بنائے گا۔

قولہ: ومن توکل علی اللہ کفاہ الشعب: یعنی اللہ اس شخص کی مختلف متفرق ضروریات کیلئے کافی ہو جاتا ہے۔ اسی کے ہم معنی حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد ہے: من جعل الھموم ھما واحدا ھم الدین کفاہ اللہ ھم الدنیا والآخرۃ

۵۳۱۰ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ رَبُّکُمْ عَزَّوَجَلَّ لَوْاَنَّ عَبِیْدِیْ اَطَاعُوْنِیْ لَاَسْقَیْتُهُمُ الْمَطَرَ بِاللَّیْلِ وَاَطْلَعْتُ عَلَیْهِمُ الشَّمْسَ بِالنَّهَارِ وَلَمْ اُسْمِعْهُمْ صَوْتَ الرَّعْدِ.

(رواہ احمد)

اخرجہ احمد فی المسند ۲/۳۵۹

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہارا پروردگار جس کی شان بزرگی اور برتری ہے ارشاد فرماتا ہے کہ اگر میرے بندے میری بعداری کرنے لگیں (یعنی میرے امر ونہی کے مطابق چلیں) تو یقیناً میں کو رات کے وقت تو بارش سے سیرابی عطا کروں (تاکہ وہ سکون کی نیند سوئیں) اور دن کے وقت ان پر دھوپ کی چادر پھیلاؤں (تاکہ وہ اپنے کام وکاج میں مشغول رہ سکیں) ان کو بادل گرجنے کی آواز نہ سناؤں"۔ (احمد)

تشریح: اطلعت: باب افعال سے ہے اس کا معنی ہے ظاہر کرنا

لم اسمعھم: اور جامع کی روایت میں "لما اسمعتھم" کے الفاظ ہیں۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ بات "تتمیم" کے باب سے ہے کیونکہ جب بادل کے ساتھ گرج بھی ہو تو اس میں خوف کا شائبہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿ھو الذی یریکم البرق خوفا وطمعا﴾ [الرعد: ۱۲] "وہ ایسا ہے کہ تم کو بجلی دکھلاتا ہے جس سے ڈر بھی ہوتا ہے اور امید بھی ہوتی ہے۔" چنانچہ اس کی نفی فرمادی تاکہ وہ رحمت محضہ بن جائے۔

تخریج: اس طرح اس حدیث کو امام حاکم نے بھی نقل کیا ہے۔

۵۳۱۱ : وَعَنْهُ قَالَ دَخَلَ رَجُلٌ عَلٰی اَهْلِهٖ فَلَمَّا رَاٰی مَابِهِمْ مِنَ الْحَاجَةِ خَرَجَ اِلَی الْبَرِيَّةِ فَلَمَّا رَاَتِ امْرَاَتُهٗ قَامَتْ اِلَی الرَّحٰی فَوَضَعَتْهَا وَاِلَی التَّنُّوْرِ فَسَجَرَتْهُ ثُمَّ قَالَتْ اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا فَنَظَرَتْ فَاِذَا الْجَفْنَةُ قَدِ امْتَلَاَتْ قَالَ وَذَهَبَتْ اِلَی التَّنُّوْرِ فَوَجَدَتْهُ مُمْتَلِئًا قَالَ فَرَجَعَ الزَّوْجُ قَالَ اَصَبْتُمْ بَعْدِیْ شَيْئًا قَالَتِ امْرَاَتُهٗ نَعَمْ مِنْ رَبِّنَا وَقَامَ اِلَی الرَّحٰی فَذُكِرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَمَا اِنَّهٗ لَوْ لَمْ يَرْفَعْهَا لَمْ تَزَلْ تَدُوْرُ اِلٰی يَوْمِ الْقِيٰمَةِ. (رواه احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۲/ ۵۱۳

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک شخص گھر میں (داخل ہوا) تو اس نے گھر والوں فقرو افلاس کو محسوس کیا' وہ (یہ دیکھ کر اپنے رب کے سامنے عرض ومناجات کرنے اور اس کی بارگاہ میں یکسوئی کے ساتھ اپنی حاجات کی درخواست کرنے کی غرض سے جنگل کی طرف چلا گیا' ادھر جب اس کی اھلیہ نے یہ دیکھا (کہ شوہر خود مجبور ہے اور وہ شرم کے باعث گھر سے باہر چلا گیا ہے) تو وہ اٹھی اور چکی کے پاس گئی' چکی کو اس نے اپنے سامنے رکھا (یا اس نے چکی کے اوپر والے پاٹ کو نیچے والے پاٹ پر رکھ دیا اور یا یہ معنی ہیں کہ اس نے اس چکی کو صاف کیا اور درست کر کے رکھ دیا اور اسے امید یہ تھی کہ شوہر باہر سے آئے گا تو کچھ لے کر آئے گا اس کو پیس کر روٹی پکا لوں گی) پھر وہ تنور کے پاس گئی اور اس کو گرم کیا' اس کے بعد یوں عطا کرنے لگی۔ الٰہی! ہمیں رزق عنایت فرما دے''۔ پھر جو اس نے نظر اٹھائی تو کیا دیکھتی ہے کہ چکی کا پاٹ آٹے سے بھرا ہوا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد جب وہ آٹا (گوندھ کر) تنور کے پاس گئی روٹیاں لگانے کی غرض سے۔ تو تنور کو روٹیوں سے بھرا ہوا پایا (یعنی خدا کی قدرت نے یہ کرشمہ دکھایا کہ خود بخود اس آٹے کی روٹیاں بن کر تنور میں جا لگیں یا یہ کہ آٹا تو اپنی جگہ چکی کے پاٹ میں رہا اور تنور میں غیب سے روٹیاں نمودار ہو گئیں) راوی کہتے ہیں کہ کچھ دیر بعد جب خاوند (رب العزت کی بارگاہ میں التجاء ومناجات سے فارغ ہو کر) گھر آیا تو بیوی سے دریافت کیا کہ کیا میرے جانے کے بعد تمہیں (کہیں سے) کچھ (غلہ وغیرہ) مل گیا تھا (کہ تم نے یہ روٹیاں بنا لی؟ بیوی نے جواب دیا کہ ہاں! یہ ہمیں ہمارے پروردگار حقیقی کی جانب سے ملا ہے (یعنی عمومی معمول کے مطابق کسی انسان کے ذریعہ سے نہیں پہنچا۔ بلکہ یہ رزق محض غیب سے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے) شوہر کہ یہ جان کر بہت حیرت ہوئی اور وہ) اٹھ کر چکی کے پاس گیا (اور چکی کو اٹھایا تا کہ اس کا کرشمہ دیکھے) پھر جب اس واقعہ کا ذکر نبی کریم ﷺ کے سامنے کیا گیا تو آپ ﷺ نے (پورا قصہ سن کر) فرمایا ''جان لو' بلا شبہ کہ اگر وہ شخص اس چکی کو اٹھا نہ لیتا تو وہ چکی مسلسل روز قیامت تک گردش میں رہتی اور اس سے آٹا نکلتا رہتا''۔ (احمد)

تشریح: ''البریۃ'' البر کی طرف منسوب ہے۔

فسجرتہ: جیم کی تشدید اور تخفیف کے ساتھ۔

اس میں اشارہ ہے کہ بندہ حال کے مقتضی کے مطابق جتنا ممکن ہو رزق حلال کی تلاش کرے پھر اپنے مقصود کو حاصل کرنے کیلئے بادشاہ بلند وبالا سے دُعا کرے مثلاً اس جیسے الفاظ سے دعا کرے۔ اللھم ارزقنا۔

قاموس میں ہے: ''الجعفة'' القصعة کے معنی میں ہے۔خلاصۃ اللغۃ میں ہے کہ "قصعة کبیرة" کو کہتے ہیں۔''الجفنة'' سے مراد وہ برتن ہے جس کو چکی کے نیچے رکھتے ہیں تا کہ آٹا اس میں جمع ہوتا رہے۔

وذهبت: اور ایک صحیح نسخہ میں ''فذهبت'' ہے۔

قال اصبتم: یہ جملہ مستانفہ ہے۔

اصبتم: تم نے کھالیا یا کچھ حاصل کرلیا۔

قالت امراته نعم: ای: اصبنا۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے ''اللهم ارزقنا'' کا عجیب وغریب معنی بیان کیا ہے۔فرماتے ہیں اس عورت نے دُعا کی کہ اسکے شوہر کو کچھ غلہ مل جائے تا کہ اُسکو پیس کر گوندھ لیا جائے اور روٹیاں بنائی جائیں۔اس کیلئے اس نے اسباب تیار کیے۔(انتہی)

فذکر: مجہول کے صیغہ کے ساتھ اور ایک صحیح نسخہ میں ''فذکر'' ہے۔

فقال: اما: تخفیف کے ساتھ تنبیہ کیلئے ہے۔

انه: ضمیر شان ہے۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہو بلکہ انسان کا رزق اس کو اس کی موت سے۔اسلئے کہ انسان کو موت پورا ہونے کے بعد ہی آتی ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿الله الذی خلقکم ثم رزقکم ثم یمیتکم ثم یحییکم﴾ [الروم: ٤٠]

''اللہ ہی وہ ہے جسے نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو رزق دیا پھر تم کو موت دیتا ہے پھر تم کو جلائے گا''۔

تخریج وتوضیح: امام میرک منذری سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی صحیح میں اور بزار نے نقل کیا ہے اور طبرانی نے اس وجید سند کے ساتھ نقل کیا' مگر اس میں یہ زیادتی ہے: ان الرزق لیطلب زلعبد اکثر مما یطلبه أ جله۔

''رزق بندے کو اس سے زیادہ تلاش کرتا ہے جتنا کہ موت انسان کو تلاش کرتی ہے۔''

۵۳۱۲ : وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الرِّزْقَ لَیَطْلُبُ الْعَبْدَ کَمَا یَطْلُبُهٗ اَجَلُهٗ۔

ابو نعیم فی حلیة الاولیاء ٦/٨٦

''حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: 'بلاشبہ رزق بندے کی اس طرح تلاش میں رہتا ہے جس طرح انسان کو اس کی موت ڈھونڈتی ہے'۔اس روایت کو ابونعیم نے کتاب حلیہ میں روایت کیا ہے''۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں اس حدیث کو ابن عدی نے ''الکامل'' میں نقل کیا ہے۔اور میں نے جو معنی پہلے بیان کیا ہے اس کی تائید اس سے ہوتی ہے اور ابونعیم نے حلیہ حضرت جابرؓ سے میں یہ مرفوع روایت نقل کی ہے:

''لو ان ابن آدم هرب من رزقه کما یهرب من الموت لأدرکه رزقه کما یدرکه الموت''

''اگر انسان اپنے رزق سے بھی اس طرح بھاگے جس طرح وہ اپنی موت سے بھاگتا ہے تو یقیناً اس کا رزق بھی اس کو اسی

طرح پالے گا جس طرح کہ اس کی موت اس کو پالیتی ہے۔''

۵۳۱۳ : وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَاَنِّي اَنْظُرُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يُحْكِي نَبِيًّا مِنَ الْاَنْبِيَاءِ ضَرَبَهُ قَوْمُهُ فَاَدْمَوْهُ وَهُوَ يَمْسَحُ الدَّمَ عَنْ وَجْهِهٖ وَيَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ. (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٥١٤/٦ حديث رقم ٣٤٧٧ وابن ماجه في السنن ١٣٣٥/٢ حديث رقم ٤٠٢٥ واحمد في المسند ٤٤١/١۔

ترجمہ: ''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کرتے ہیں کہ ''گویا میں اب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے نبی کے واقعہ کا تذکرہ فرما رہے ہیں (اور اس کی صورت ہمیں بتا رہے ہیں) جنہیں ان کی قوم نے مارا اور لہولہان کر دیا لیکن وہ نبی (بجائے اس کے کہ قوم کے بارے میں عداوت میں مبتلا ہوئے یا ان کے بارے میں انتقامی جذبات رکھتے اور ان کے لئے بددعا فرماتے' صبر وتحمل کا دامن پکڑے ہوئے) اپنے چہرے سے خون صاف کر رہے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے۔ اے اللہ میری قوم کو بخش دے یہ لوگ میری حقیقت سے آگاہی نہیں رکھتے ہیں''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: اس معاملہ کے متحضر ہونے اور اس قصہ کے مستقظ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

يحكي نبيا (جملہ حالیہ ہے)۔ای حال کو نه يحكي حال نبي۔ اس حال میں کہ حضور علیہ السلام ایک نبی کی حکایت بیان کر رہے تھے ''ضربه قومه'' قد، کی تقدیر کے ساتھ حال ہے۔اور بعض نے ''قد'' کے بغیر بھی حال کو جائز قرار دیا ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں ''نبیا'' منصوب علی شريطة التفسير (تفسیر کی شرط پر منصوب) ہے اور ''ضربه قومه'' اس کا قرینہ ہے۔ یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کی حکایت ہے۔اور یہ بھی جائز ہے کہ ''مضاف'' مقدر مانا جائے۔ای يحكي حال نبي من الانبياء۔یعنی حضور علیہ السلام انبیاء میں سے ایک نبی کی حالت بیان کر رہے تھے۔ اور اس طرح یہ حضور علیہ السلام کے الفاظ کا معنی ہوگا۔اور اس وقت یہ بھی درست ہے کہ ''ضربه'' ''نبی'' کی صفت واقع ہو اور یہ بھی درست ہے کہ جملہ مستانفہ ہو گویا کہ سوال کرنے والے نے سوال کیا کہ اُن کا قصہ کیا تھا۔ جواب میں فرمایا: ضربه قومه (ان کی قوم نے ان کو مارا)۔

وهو يمسح الدم عن وجهه: اس خوف سے کہ کہیں یہ خون منہ میں یا آنکھ میں چلا نہ جائے۔

قوله اللهم اغفر لقومي: یعنی میری قوم کا یہ فعل بد معاف فرما دیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ میری اس قوم کو ان کے اس برے فعل کی وجہ سے دنیا میں عذاب نہ دے اور ان کو جڑ سے ختم نہ کر۔ ورنہ تو یہ بات معلوم ہی ہے کہ کفار کیلئے مغفرت مانگنا بایں معنی کہ ان کا شرک اور کفر معاف کر دیا جائے باجماع امت ناجائز ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ مغفرت کنایہ ہو اس توبہ سے جو مغفرت کا موجب بن جائے۔اگلے جملہ میں طرف اشارہ کیا۔

قوله: فانهم لا يعلمون: یہ نبی کا کمال صبر اور حسن اخلاق ہے کہ قوم گناہ کما رہی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہی کی طرف سے اللہ کے دربار میں عذر بیان کر رہے ہیں' کہ ان لوگوں نے جو کچھ بھی کیا محض اس وجہ سے کیا کہ اللہ اور اس کے رسول سے ناواقف ہیں۔اس میں اس اشارہ ہے کہ جہالت میں گناہ کرنا علم کے ساتھ گناہ کی بنسبت ہلکا ہوتا ہے۔اسی وجہ سے وارد ہوا ہے:

''ويل للجاهل مرة وويل للعالم سبع مرات'' (جاہل کیلئے ایک مرتبہ ہلاکت ہے اور عالم کیلئے سات مرتبہ ہلاکت ہے۔)

بَابُ الرِّيَاءِ وَالسُّمْعَةِ

ریاوسمعہ کا بیان

''مغرب'' میں لکھا ہے: کہا جاتا ہے''فعل ذالك سمعة'' کا معنی ہے اس شخص نے وہ کام لوگوں کو دکھانے کیلئے کیا اور'' ،انتہی۔ تحقیقی بات یہ ہے کہ''ریاء'' روية سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کام اس لئے کرے تا کہ لوگ اس کو دیکھیں اور صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کیا جائے' یا کوئی بات اس لئے کہی جائے تا کہ لوگ سن لیں کے دیکھ لینے کو کافی نہ سمجھے اور ''السمعة'' سین کے ضمہ کے ساتھ''سمع'' سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کام اسلئے اور صرف اللہ جل شانہٗ کے سن لینے پر اکتفاء نہ کرے۔

ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کی جگہ پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اور کبھی تاکید کیلئے دونوں کو ایک ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔

یا دونوں کو اسلئے ایک ساتھ استعمال کیا جاتا ہے کہ دونوں کا اپنا اصل معنی تفصیلی طور پر مقصود ہوتا ہے۔

ان دونوں کی ضد اخلاص ہے۔ یعنی نجات کی غرض سے عمل کو خالص اللہ کیلئے کرنا۔

لفظ''ریاء'' میں صحیح روایت یہی ہے کہ ہمزہ کے ساتھ پڑھا جائے اور قراءت سبعہ میں بھی اسی طرح ہے۔ اور ہمزہ کو یاء سے بدل دینا بھی جائز ہے۔ اور بعض قراء نے اس طرح پڑھا ہے۔ اور عوام کی زبان پر اسی طرح مشہور ہے۔

الفصل الاول:

۵۳۱۴ : عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَايَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ١٩٨٧/٤ حديث رقم (٣٤-٢٥٦٤)وابن ماجه ١٣٨٨/٢ حديث رقم ٤١٤٣ واحمد في المسند ٢٨٥/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:'' یقیناً اللہ تعالیٰ نہ تمہاری صورتوں کو دیکھتا ہے اور نہ ہی تمہارے مالوں کو دیکھتا ہے (یعنی اس کی نظر قبولیت و اعتبار میں تمہاری صورتیں اللہ تمہارے اموال معتبر نہیں ہیں' کیونکہ اس کے نزدیک نہ تو صورت کی اچھائی یا برائی کا کوئی مقام ہے اور نہ مال ومتاع کی کمی وبیشی کی کوئی حیثیت واہمیت ہے) بلکہ وہ تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے (یعنی اس کے ہاں تو بس اس چیز کو دیکھا

جاتا ہے کہ تمہارے دل میں یقین وصدق اور اخلاص وغیرہ ہے یا نفاق اور ریا وسمعہ وغیرہ اسی طرح اس کی بارگاہ میں اعمال کی اچھائی برائی کو دیکھا جاتا ہے اچھے اعمال صاحب عمل کو جزائے عظیم کا لائق بناتے ہیں جب کہ برے اعمال لائق سزا و عتاب بنا ڈالتے ہیں''۔ (مسلم)

تشریح: ولکن: اور جامع میں ''لکن انما'' کے الفاظ ہیں۔

نہایہ میں ہے کہ اس حدیث میں نظر سے مراد اللہ کی عنایت، رحمت اور مہربانی ہے۔ اسلیئے کہ کسی موجود چیز کی طرف دیکھنا محبت کی دلیل ہے۔ اور نظر ہٹانا بغض، کراہت اور امور فانیہ کی طرف میلان کی دلیل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ مخلوق کی مشابہت سے پاک ہے۔ اسلیئے اللہ کی نظر اُس چیز پر ہے جو اصل ہے اور وہ انسان کا دل اور عمل ہے اور نظر اجسام ومعانی دونوں کی طرف ہے۔ جو نظر آنکھوں سے ہوتی ہے وہ اجسام پر پڑتی ہے۔ اور جو بصیرت سے ہوتی ہے وہ معانی پر پڑتی ہے۔ (طیبی) اور نظر سے رحمت ومہربانی کے معنی مراد لینا' سو اس کا بعد مخفی نہیں' خصوصاً جانب نفی میں یہ بات قابل غور ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ سے اس کی نفی متصور نہیں واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۳۱۵ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنَا اَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ مَنْ عَمِلَ عَمَلاً اَشْرَكَ فِيْهِ مَعِيَ غَيْرِيْ تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ فَاَنَامِنْهُ بَرِيْءٌ هُوَ لِلَّذِيْ عَمِلَهُ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ٢٢٨٩/٤ حديث رقم (٤٦-٢٩٨٥)وابن ماجه فى السنن ١٤٠٥/٢ حديث رقم ٤٢٠٢ واحمد فى المسند ٣٠١/٢

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں تمام شرکاء کے مقابلے میں شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں' چنانچہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص (میری طاعت و عبادت کے طور پر) کوئی ایسا کام انجام دے کہ جس میں وہ میرے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک کرے تو میں اس شخص کو اس کے شرک سمیت ٹھکرا دیتا ہوں اور ایک (دوسری) روایت میں تَرَكْتُهُ وَ شِرْكَهُ کی بجائے) یہ الفاظ ہیں فَاَنَامِنْهُ بَرِيْءٌ هُوَ لِلَّذِيْ عَمِلَهُ یعنی (جو شخص میری عبادت واطاعت میں کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے) تو میں اس سے بری ہوں۔ وہ شخص یا اس کا وہ عمل محض اسی کی خاطر ہے جس کے لئے اس نے وہ عمل کیا ہے''۔ (مسلم)

تشریح: اغنى الشركاء عن الشرك یعنی بالفرض اگر کوئی مستغنی اور بے نیاز ہو اور وہ یہ دعویٰ کرے کہ یہ سارے شریک ہیں تو میں ان سب سے میں سب سے زیادہ بے نیاز ہوں۔

یعنی میں صرف اسی عمل کو قبول کرتا ہوں جو میری وجہ سے کیا ہوا اور مجھے راضی کرنے کیلیئے کیا گیا۔ چنانچہ اسم مصدر ''الشرك'' اسم مفعول کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور جو تشریح میں نے پہلے ذکر کی اس کی تائید آئندہ جملہ مستانفہ سے ہوتی ہے۔

قوله: من عمل عملا اشرك فيه غيري تركته وشركه:

لہٰذا عبادت میں مثلاً جنت اور اس کے توابع کی نیت کرنا مضر نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مرضی میں داخل ہیں۔ اگر چہ عبادت کا اکمل مقام یہ ہے کہ اللہ کی عبادت جنت کے شوق یا جہنم کے خوف سے نہ کی جائے۔ کیونکہ بعض عارفین نے اس یعنی (جنت یا جہنم کی وجہ سے عبادت) کو کفر قرار دیا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں تحقیق یہ ہے کہ اگر انسان اللہ کی عبادت اس حیثیت سے کرے کہ اگر جنت اور جہنم نہ ہوتو وہ اللہ کی عبادت نہ کرتا تو وہ شخص کافر ہو جائے گا۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ عبادت کا مستحق لذاتہ ہے۔ اسی وجہ سے صہیبؓ کی تعریف کی گئی: "نعم العبد صهيب لو لم يخف الله ما عصاه"۔

"تر كته و شر كه": "من" کی خبر ہے اور واؤ "مع" کے معنی میں ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنی رحمت کی نگاہ سے گرا دیتا ہوں اور اس کا وہ عمل جس میں شرک کیا گیا تھا' کو قبولیت کے درجہ سے گرا دیتا ہوں۔

وفي رواية فانا منه برئ: بعض نے ضمیر مجرور کا مرجع "ذالك العمل" بتلایا ہے۔ لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس کا مرجع "عامل" ہے۔ ای من عامل ذلك العمل تاکہ آئندہ قول میں تکرار نہ ہو۔

قوله: هو للذى عمله: یعنی وہ عمل اسی مقصد کیلئے ہے جس کا اس عمل میں ریاء وسمعہ کا قصد کیا گیا تھا۔ یہ جملہ ماقبل کی تاکید ہے۔ اور ایک شارح فرماتے ہیں: ای "هو لفاعله" یعنی تر كت ذلك العمل و فاعله..... اور مطلب یہ ہے کہ میں نے اس عمل اور اس کے فاعل کو چھوڑ دیا اس کو قبول نہیں کرتا اور نہ اس عمل کے کرنے والے کو اس عمل کا اچھا بدلہ دیتا ہوں' اسلئے کہ اس نے یہ عمل میرے لئے نہیں کیا۔ (انتہیٰ)

اس معنی پر اشکال یہ ہے کہ اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس وقت اس شخص کا یہ عمل مباح ہے۔ جبکہ شرک کے ساتھ عمل کرنا بالاجماع حرام ہے اور اس طرح عمل کرنے پر عمل کرنے والے کو سزا ملے گی۔ (فتامل)

اب ہم دوسرے شراح کا کلام ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ، "اغنى" اسم تفضیل ہے۔ جو "غنى به عنه غنية" سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی ہے استغنى به عنه، اور اس کی اضافت یا تو مطلق زیادتی بیان کرنے کیلئے ہے۔ ای: "انا غنى من بين الشر كاء" یا مضاف الیہ کی بنسبت زیادتی بیان کرنے کیلئے ہے۔ "انا اكثر الشر كاء استغناء عن الشرك" (میں شرکاء میں شرک سے سب سے زیادہ مستغنی ہوں) اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کا استغناء تمام جہات سے ہے اور تمام اوقات میں ہے۔

اس ذکر کردہ دوسری توجیہ کا محل نظر ہونا مخفی نہیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسم تفضیل صرف زیادت کیلئے ہے۔ اور ایک جماعت کے قول کے مطابق اضافت بیان کیلئے ہے۔

لیکن اس پر یہ اشکال ہے کہ اضافت کا بیان کیلئے ہونا مزید بیان کا محتاج ہے۔ گویا کہ انہوں نے یہ معنی مراد لیا ہے انا غنى مما بينهم دونهم، اور پھر فرمایا کہ "تر كته" کی ضمیر منصوب کا مرجع عمل بھی ہو سکتا ہے اور شرک سے مراد "شریک" ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں مشارکت وغیرہ سے بے نیاز ہوں لہٰذا جو عمل میرے اور میرے علاوہ کسی اور کیلئے کیا جائے گا میں اس کو قبول نہیں کرتا بلکہ اُس کو اس غیر کے ساتھ چھوڑ دیتا ہوں۔ اور اس پر دوسری فصل

کی پہلی حدیث دلالت کر رہی ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ ضمیر عامل کی طرف لوٹے اور شرک سے مراد شرکت ہو اور "ھو" ضمیر پہلی صورت میں "العمل" کی طرف عائد ہے اور دوسری صورت میں عامل کی طرف راجع ہے۔ (یعنی عمل کنندہ کے لئے وہی ہے جو اس نے قصد کیا تھا) اور "منه" کی ضمیر کا بھی یہی حال ہے۔

اور میں کہتا ہوں کہ اس کا یہ معنی بھی ممکن ہے کہ میں ان تمام سے زیادہ بے نیاز ہوں جن پر لفظ شریک کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے: [احسن الخالقین] [الصافات: ۱۲۵] "جو سب سے بڑھ کر بنانے والا ہے" کیونکہ دنیا میں بہت سارے مالدار شرکاء ایسے ہوتے ہیں جب ان کا کوئی حق فقراء کے ساتھ بنتا ہو تو ان فقراء کے ساتھ مسامحت والا معاملہ کرتے ہیں۔ اور اپنا وہ حق ان کو دے دیتے ہیں۔ یا اس کو ھبہ کر دیتے ہیں ان میں سے زیادہ فقیر ہو جب کمزور شرکاء کا یہ حال ہے تو اس ذات کا کیا حال ہوگا جس کا کوئی شریک ہی نہیں ہے اور عظمت اور کبریائی والا ہے۔

حجۃ الاسلام فرماتے ہیں کہ ریاء کے درجات کی چار اقسام ہیں:

پہلی قسم غلیظ ترین قسم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان کا مقصود حصول ثواب بالکل نہ ہو۔ جیسا کہ وہ شخص جو اگر لوگوں کے درمیان ہو۔ تو نماز پڑھتا ہے۔ لیکن اگر تنہا ہوتا تو نماز نہ پڑھتا بلکہ بسا اوقات لوگوں کے ساتھ بغیر پاکی کے نماز پڑھتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے خالص ریاء کاری کا قصد کیا ہے اور اللہ کا قہر و غضب نازل ہونے کا مستحق ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ عبادت میں ثواب کا قصد و ارادہ بھی ہو مگر اتنا ضعیف قصد ہو کہ اگر تنہائی میں ہوتا تو یہ عبادت نہ کرتا اور عبادت کا یہ ارادہ اس کو اس عمل پر نہ ابھارتا۔ اور اگر بالفرض ثواب نہ بھی ہوتا تو ریاء کاری کا جذبہ اس کو اس عمل پر ابھارتا۔ چنانچہ اس عبادت میں ثواب کا ارادہ اس سے اللہ کے عذاب و غضب کی نفی نہیں کرتا۔

تیسری قسم یہ ہے کہ ثواب و ریاء کا ارادہ برابر ہو بایں حیثیت کہ اگر بالفرض وہ عمل ان دونوں چیزوں میں سے کسی بھی ایک چیز سے خالی ہوتا تو عمل پر کوئی دوسرا اس کو نہ ابھارتا' بلکہ جب دونوں چیزیں جمع ہو گئیں تو عمل کی رغبت پیدا ہوئی) اور احادیث کا ظاہر اس بات پر دال ہے کہ یہ برابر سرا برنہیں چھوٹے گا۔

چوتھی قسم یہ ہے کہ لوگوں کا اس کے عمل پر مطلع ہو جانا اس انسان کے نشاط کا باعث بنے اور عمل میں زیادہ کوشش کرنے کا باعث بنے' لیکن اگر لوگ مطلع نہ بھی ہوتے تو عبادت ترک نہ کرتا' اس شخص کا مقصود اگر صرف ریاکاری ہوتا تو اس عمل پر اقدام نہ کرتا۔

پس ہمارا گمان یہ ہے کہ یہ کیفیت عمل کے اصل ثواب کو ضائع نہیں کرے گی۔ حقیقی علم تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ لیکن اجر و ثواب میں کمی آئیگی یا بقدر قصد ریاکاری سزا دی جائیگی اور ثواب کے ارادہ کے بقدر ثواب دیا جائے گا۔ اور حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد مبارک "انا غنی الشرکاء" اس صورت پر محمول ہے جس صورت میں دونوں قصد برابر ہوں یا ریاکاری کا ارادہ غالب ہو۔

تخریج: اسی طرح ابن ماجہ نے بھی پہلی روایت کو نقل کیا ہے۔

۵۳۱۶: وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهِ وَمَنْ يُرَائِي

يُرَائِي اللّٰهُ بِهِ ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۳۵/۱۱ حدیث رقم ۶۴۹۹ ومسلم فی صحیحه ۲۲۸۹/۴ حدیث رقم (۴۸-۲۹۸۷) والترمذی فی السنن ۵۱۰/۴ حدیث رقم ۲۳۸۱ وابن ماجه فی السنن ۱۴۰۷/۲ حدیث رقم ۴۲۰۷ واحمد فی المسند ۴۰/۳۔

ترجمه: ''حضرت جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص لوگوں کو سنانے اور شہرت حاصل کرنے کی خاطر کوئی عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ (روز قیامت) اس کا حال لوگوں کو سنائے گا ذلیل ورسوا کرے گا نیز جو شخص لوگوں کو دکھانے کے لئے کوئی عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے (لوگوں کو) دکھلا دے گا (کہ یہ شخص ریاکار تھے) (یعنی روز قیامت اس سے کہا جائے گا کہ اپنے عمل کا بدلہ بھی اسی سے مانگو جس کی خاطر تم نے وہ عمل کیا تھا''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قال النبی: اور ایک نسخہ میں ''رسول اللہ'' کے الفاظ ہیں۔

سمع: میم کی تشدید کے ساتھ۔

سمع الله به: یہ بھی میم کی تشدید کے ساتھ ہے اور علامہ طیبی نے امام نووی سے جو یہ نقل کیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ''جو شخص ریاکاری کرنے کیلئے اپنا عمل لوگوں کے سامنے ظاہر کرے گا'' تو یہ معنی ریاء وسمعہ کے معانی میں تفصیل وتمیز کے اس مقام کے مناسب نہیں ہے۔

قوله: ومن یرائی یرائی الله به: یا کو دونوں فعلوں میں باقی رکھنا اس بنا پر ہے کہ مَن موصولہ مبتدا ہے اور معنی یہ ہے کہ جو شخص اسلئے عمل کرے کہ دنیا میں لوگ اس کو دیکھ لیں تو اللہ اس کو اس طرح بدلہ دے گا کہ اس کی ریاء کو لوگوں کے سامنے ظاہر کر دے گا۔ دونوں جملوں کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ''مسمع'' ہونا لوگوں کو سنا دے گا اور اس کا ریاکار ہونا لوگوں کو دکھا دے گا۔

مسلم کی شرح میں لکھا ہے ''من یرائی'' کا معنی یہ ہے کہ جو شخص اپنا نیک عمل لوگوں پر ظاہر کرے تاکہ لوگوں کے ہاں اس کی قدر ومنزلت ہو حالانکہ وہ اس طرح نہیں ہے۔ اور: ''یرائی الله به'' کا معنی یہ ہے کہ اللہ اس کے باطنی معاملات کو مخلوق کے سامنے ظاہر کر دے گا۔

اس پر اشکال یہ ہے کہ حالانکہ وہ اس طرح نہیں ہے'' کی قید لگانا بظاہر درست نہیں ہے۔ بلکہ یہ اپنے اطلاق پر ہے چاہے اس طرح ہو یا اس طرح نہ ہو۔

پھر (شرح مسلم میں) فرمایا کہ بعض کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص لوگوں کے عیوب سنے اور ان عیوب کو لوگوں کو سامنے ظاہر کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے عیوب ظاہر کر دے گا۔

بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو ناگوار فیصلے سنائے گا۔

اور بعض نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اس عمل کا ثواب دکھائے گا لیکن دے گا نہیں' تاکہ یہ افسوس و

حسرت کا باعث ہو۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ جو شخص اس لئے عمل کرے کہ لوگ اس کو جان لیں تو اللہ تعالیٰ یہ عمل لوگوں کو سنا دے گا اور اس کے اس عمل کا بدلہ یہی ہوگا۔

شیخ ابو حامدؒ فرماتے ہیں کہ "ریاء" "رویۃ" "سے" اور "سمعۃ" "سماع" سے مشتق ہے۔ اور ریاء کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی خصال محمودہ لوگوں کو دکھا کر لوگوں کی نگاہوں میں قدر و منزلت طلب کرے۔ چنانچہ "مرائی" (دکھلاوا کرنے والا) یہ "عابد" ہے اور "مراء ی لہ" (جن کو دکھلایا جائے) وہ لوگ ہیں۔ اور "مراءی بہ" (وہ چیز جو دکھلائی جائے) خصال حمیدہ ہیں۔ اور "ریاء" ان اچھے عادات کو ظاہر کرنے کا قصد کرنے کو کہتے ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو مسلم اور احمد نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے اور اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"من سمع سمع اللہ بہ ومن راء ی راء ی اللہ بہ"۔

۵۳۱۷: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قِیْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَرَاَیْتَ الرَّجُلَ یَعْمَلُ الْعَمَلَ مِنَ الْخَیْرِ وَیَحْمِدُہُ النَّاسُ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ وَیُحِبُّہُ النَّاسُ عَلَیْہِ قَالَ تِلْکَ عَاجِلُ بُشْرَی الْمُؤْمِنِ. (رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۲۰۳۴/۴ حدیث رقم (۱۶۶-۲۶۴۲) وابن ماجہ ۱۴۱۲/۲ حدیث رقم ۴۲۲۵ واحمد فی المسند ۱۵۶/۵۔

ترجمہ: "حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اس شخص کے بارے میں بتلایئے جو کوئی عمل خیر کرتا ہے اور اس کی وجہ سے لوگ اس کی تعریف وتوصیف کرتے ہیں اور ایک روایت میں (اس جملہ کے بعد) یہ بھی ہے کہ اور اس عمل کی وجہ سے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں! (ایسے شخص کا کیا حکم ہے اس کا اجر وثواب برقرار رہتا ہے یا کالعدم ہو جاتا ہے) حضور ﷺ نے (یہ سوال سن کر) ارشاد فرمایا کہ "لوگوں کا اس شخص کی تعریف وتوصیف کرنا اور اس کو محبوب رکھنا درحقیقت اس کے حق میں مؤمن کے ذریعہ پیشگی خوشخبری ملنے والی ہے"۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: الرجل یعمل العمل: مبتدا اور خبر ہیں (اور جملہ) محلا منصوب ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "ای اخبرنا بحال الرجل" چنانچہ "الرجل" منصوب بنزع الخافض ہے۔ اور عمل سے مراد جنس عمل ہے۔ اور "من الخیر" اس کا بیان ہے۔

اور یہ بات معلوم ہی ہے کہ ریاء کی وجہ سے عمل میں کوئی خیر نہیں ہوتی پس اس کا عمل خالص ہوگا۔

قولہ: ویحمدہ الناس علیہ وفی روایۃ ویحبہ الناس علیہ: اس عمل پر لوگ اس کی تعریف بیان کرتے ہیں (یعنی علیہ میں ضمیر ذالک العمل کی طرف لوٹتی ہے) یا اس بھلائی کی وجہ سے اس کی تعظیم بیان کرتے ہیں۔

قولہ: قال تلک عاجل بشری المؤمن:

یعنی وہ تعریف یا محبت یا خصلت یا ثواب اس کی نقد بشارت ہے۔ اور اُدھار بشارت قیامت کے دن تک باقی رہے گی۔

اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ اس کو لوگوں کی تعریف اور محبت اچھی لگے یا نہ لگے دونوں برابر ہیں۔ دوسری بات اولیٰ ہے اور پہلی بات زیادہ ظاہر ہے۔ اور اگلی فصل میں ابو ہریرہؓ کی [redacted] جس کی تصریح آئیگی۔

مظہر رحمہ اللہ فرماتے ہیں یعنی مجھے اس شخص کا حال بتا دیں جو کوئی نیک عمل اللہ کیلئے کرے مخلوق کیلئے نہ کرے اور مخلوق اس کی تعریف کرے تو کیا اس کا ثواب باطل ہو جائے گا؟ جو حضور علیہ السلام نے فرمایا: تلك عاجل بشری المؤمن یعنی یہ شخص اپنے اس عمل میں دکھلاوا کرنے والا نہیں ہے بلکہ اس عمل کے بدلہ میں اللہ اس کو دو ثواب دنیا میں عطا فرماتے ہیں' ایک دنیا میں ہے کہ لوگ اس کی اچھائی بیان کرتے ہیں' اور دوسرا آخرت میں ہے جو اللہ نے اس کے لئے تیار کر رکھا ہے۔

۵۳۱۸ : عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ بْنِ اَبِیْ فُضَالَةَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا جَمَعَ اللّٰهُ النَّاسَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ لِیَوْمٍ لَا رَیْبَ فِیْهِ نَادٰی مُنَادٍمَّنْ کَانَ اَشْرَكَ فِیْ عَمَلٍ عَمِلَهٗ لِلّٰهِ اَحَدًا فَلْیَطْلُبْ ثَوَابَهٗ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ اَغْنَی الشُّرَکَاءِ عَنِ الشِّرْكِ. (رواه احمد)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۹٤/۵ حدیث رقم ۳۱۵٤ واحمد فی المسند ٤٦٦/۳۔

ترجمہ: ''حضرت ابو سعید بن ابو فضالہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب خدا تعالیٰ قیامت کے اس دن میں جس کے وقوع میں کوئی شبہ نہیں ہے' لوگوں کو (حساب اور جزا و سزا کے لئے) جمع فرمائے گا تو ایک منادی فرشتہ یہ اعلان کرے گا کہ جس شخص نے اللہ کے لئے کیے ہوئے عمل میں کسی اور کو شریک بنایا تھا۔ تو وہ اپنے اس عمل کا بدلہ بھی اسی غیر اللہ سے طلب کرے جس کو اس نے شریک ٹھہرایا تھا کیونکہ خدا تعالیٰ شرک سے تو تمام شرکاء (یعنی جن کو لوگ شریک ٹھہراتے ہیں) سے زیادہ بے نیاز ہے''۔ (احمد)

راوی حدیث:

ابو سعید بن ابی فضالہ ۔ یہ ابو سعید بن ابی فضالہ حارثی انصاری ہیں۔ ان کی کنیت ہی ان کا نام ہے۔ اہل مدینہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی حدیث ''حمید بن جعفر'' سے مروی ہے جو اپنے باپ سے اور وہ زیاد بن مینا سے روایت کرتے ہیں۔ ''مینا'' میم کے کسرہ اور دو نقطوں والی یاء کے سکون کے ساتھ ہے پھر نون ہے مد کے ساتھ بھی ہے اور بلا مد کے بھی۔

تشریح: ''فضالہ'' فاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسند احمد استیعاب اور جامع الاصول میں ''ابو سعد'' کو عین کے سکون کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ اور مصابیح کے نسخوں میں ''ابو سعید'' عین کے بعد ''یا'' کے ساتھ ہے۔ (انتہیٰ) جزری فرماتے ہیں یہ تصحیف ہے۔ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان کی کنیت ہی انکا نام ہے۔ یہ حارثی و انصاری ہیں۔ ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے۔

قوله: اذا جمع الله الناس یوم القیامة لیوم لا ریب فیه: طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں لام جمع کے متعلق ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایسے دن میں جمع فرمائے گا جس دن کا آنا ضروری ہے اور اس کے واقع ہونے میں کوئی شک نہیں ہے' تاکہ ہر نفس کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے۔ اور ''یوم القیامة'' اس کے لئے بطور تمہید ہے' اور یہ بھی درست ہے کہ ''جمع'' کیلئے ظرف ہو جیسا کہ استیعاب میں اس طرح کی حدیث ان الفاظ کے ساتھ ہے: ''اذا کان یوم القیامة جمع الله الاولین والآخرین لیوم لا ریب فیه......''۔

اس بناء پر ''لیوم'' اسم ظاہر اسم مضمر کی جگہ واقع ہوا ہے: ای ''جمع الله الخلق یوم القیامة لیجز یهم فیه''۔

قوله: نادی احدا......: ''احدا'' اشرك فعل کا مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ احدا غیر الله (اللہ کے سوا کسی

اور کو) اس معنی کا مراد ہونا ہر اگلے جملہ قرینہ ہے۔

"من عنده" یا "من عند ذالك الاحد" سے عدول کر کے "من عند غیر الله" کے الفاظ کو ذکر کرنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ ان میں ایسا ابہام اور ایہام ہے جس سے اس مقام کے مقصود سمجھنے میں خلل واقع ہوگا۔

قوله: فان الله اغنی الشرکاء عن الشرك: پہلی حدیث کے معنی کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔

تخریج: ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ اور اس کی سند کے راوی سوائے زیاد بن مینا کے مسلم کے راوی ہیں۔ اور زیاد بن مینا کی علماء نے توثیق کی ہے۔ اور اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور بیہقی نے بھی ذکر کیا ہے۔ (ذکرہ میرک)

۵۳۱۹ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَمَّعَ النَّاسَ بِعَمَلِهٖ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ اَسَامِعَ خَلْقِهٖ وَحَقَّرَهٗ وَصَغَّرَهٗ. (رواه البیهقی فی شعب الایمان)

رواه البیهقی فی شعب الایمان ۳۳۱/۵ حدیث رقم ۶۸۲۱ واحمد فی المسند ۱۶۲/۲

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جو شخص اپنے عمل کی لوگوں کے درمیان تشہیر کرائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے اس "ریا کارانہ عمل کو اپنی مخلوق کے کانوں تک پہنچا دے گا۔ نیز (قیامت کے دن) اس کو ذلیل کرے گا اور (دنیا و آخرت میں) رسوائی سے دوچار کرے گا"۔ اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے"۔

تشریح: وعن عبد الله بن عمرو: "عمرو" واؤ کے ساتھ۔

سمع الناس: میم کی تشدید کے ساتھ یعنی اپنا عمل لوگوں کو دکھائے یعنی اس سے مطلوب تو یہ تھا کہ اس عمل کو مخلوق کی نگاہوں سے مخفی رکھتا لیکن اس نے یہ عمل ان کے سامنے ظاہر کر دیا گویا کہ اس نے لوگوں کو (اپنے عمل کی طرف) پکارا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ عمل لوگوں کے کانوں تک پہنچا دے گا اور آخرت میں لوگوں کے درمیان مشہور کر دے گا۔

یا مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ اس عمل کے بدلہ میں اس شخص کا باطن (اندر کے جذبات) لوگوں کے سامنے ظاہر کر دے گا۔ اور اس کے باطن کی وہ خباثت لوگوں کے کانوں میں ڈال دے گا جس خباثت پر اس کا عمل مشتمل تھا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ "به" کی ضمیر موصول کی طرف راجع ہو۔

شرح السنہ میں ہے کہ کہا جاتا ہے "سمعت بالرجل تسمیعًا" اذا اشهراته۔ (میں نے اس کو مشہور کر دیا)۔

"اسامع" اسمع، کی جمع ہے۔ کہا جاتا ہے: سمع و کی جمع، اسمع، و اسامع جمع الجمع ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مخلوق کے کانوں کو بات سنا دیں گے۔

اس کا حاصل یہ کہ "اسامع" سمع کا مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ مخلوق کے کانوں تک یہ بات پہنچا دے گا کہ یہ شخص ریا کار اور دکھلاوا کرنے والا تھا۔ اور اس بات کو لوگوں کے درمیان مشہور کر دے گا۔ اسامع، اسمع کی جمع ہے۔ اور "اسمع سمع" کی جمع ہے۔ اور "سمع" ~~سماع کے معنی~~ میں ہے۔

''سامع خلقه'' کو رفع کے ساتھ میں نقل کیا گیا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ لفظ جلالہ کی صفت ہے: سمع الله الذی هو سامع خلقه۔ یعنی کہ وہ اللہ جو سنانے والا ہے مخلوق کو سنائے گا۔ یعنی اللہ اس کو رسوا کرے گا۔ صاحب فائق اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر یہ نصب کے ساتھ منقول ہو تو معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ یہ عمل مخلوق میں سے اس شخص کو سنائے گا جس کو سنائی دیتا ہے۔

حقره و صغره: دونوں لفظ مشدد ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو حقیر اور ذلیل بنا دیگا ''صغار'' بمعنی ''ذل'' سے ماخوذ ہے۔ اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو چیونٹی کی طرح چھوٹا کر دے جیسا کہ متکبرین کے حق میں وارد ہوا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

قوله: رواه البيهقي: اور ایک صحیح نسخہ میں یوں ہے: ''رواه احمد والبيهقي في شعب الايمان'' امام میرکؒ، فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو کی حدیث کو طبرانی نے کئی سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے، ان میں سے ایک صحیح ہے۔ اور بیہقی نے بھی نقل کیا ہے۔ (کذا قاله المنذری)

۵۳۲۰: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَانَتْ نِيَّتُهُ طَلَبَ الْاٰخِرَةِ جَعَلَ اللّٰهُ غِنَاهُ فِي قَلْبِهِ وَجَمَعَ لَهُ شَمْلَهُ وَاَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ وَمَنْ كَانَتْ نِيَّتُهُ طَلَبَ الدُّنْيَا جَعَلَ اللّٰهُ الْفَقْرَ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَشَتَّتَ عَلَيْهِ اَمْرَهُ وَلَا يَاْتِيْهِ مِنْهَا اِلَّا مَا كُتِبَ لَهُ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٥٤/٤ حديث رقم ٢٤٦٥ وابن ماجه ١٣٧٥/٢ حديث رقم ٤١٠٥ واحمد فی المسند ١٨٣/٥۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کی نیت صرف آخرت کی جستجو ہو تو خدا تعالیٰ اس کے دل میں غنا کو پیدا کر دیتا ہے اور اس کے لئے اس کے منتشر امور کو جمع کر دیتا ہے نیز اس کے پاس دنیا ذلیل ہو کر آتی ہے (یعنی اس کی نظر میں اس کی کوئی حیثیت کوئی مقام اور وقعت نہیں ہوتی)۔ (یعنی کسی بھی علمی یا عملی کار خیر کو اختیار کرنے کے سلسلے میں جس شخص کی نیت اور اصل مقصد محض رضائے حق تعالیٰ اور ثواب آخرت کی جستجو ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو قدر کفایت پر قناعت اور صبر کی توفیق دے کر اور زیادہ طلبی کی محنت و مشقت کے کشت و رنج سے بچا کر غنائے قلبی کی دولت سے نواز دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس بات سے بے نیاز اور مستغنی ہو جاتا ہے کہ ریا کاری کے ذریعہ لوگوں سے مال و جاہ اور عزت و منفعت حاصل کر کے آخرت کا نقصان و خسران مول لے۔ نیز اللہ تعالیٰ حصولِ معاش اور ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کی خاطر میں ان کی پریشانیوں' الجھنوں اور ذہنی انتشار و تفکرات کو سمیٹ کر خاطر جمعی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ بایں طور کہ اس کو ایسی جگہوں اور حصول معاش کے ایسے ایسے ذرائع اور اسباب پیدا فرما دیتا ہے جن کا اس کو خیال و گمان بھی نہیں ہوتا اور اس کے معاملات کو اس طرح درست فرما دیتا ہے کہ اس کا وہم و گمان بھی اس کو نہیں ہوتا اور پھر ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کی نظر میں دنیا اور دنیا بھر کی نعمت ولذائذ کوئی اوقات نہیں رکھتیں' وہ دنیا سے دامن بچاتا ہے لیکن اس کے قدموں تلے بچھتی چلی جاتی ہے' اس کی ضروریاتِ زندگی اور معیشت کے وہ اسباب جو

اس کے لئے مقدر ہیں بغیر کسی محنت ومشقت کے بغیر کسی سعی وکوشش کے اور بغیر کسی ذلت وخواری کے اس کو حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ اور جس شخص کا ارادہ اور مقصد اصلی دنیا کی طلب ہو (یعنی جس شخص پر دنیا اس حد تک غالب ہو جائے کہ وہ نیک اعمال کو بھی حصول دنیا کا ذریعہ بنانے لگے) تو اللہ تعالیٰ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے فقر اور افلاس کو ظاہر فرما دیتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی رسوا کن چیز سے دوچار کر دیتا ہے اور وہ اپنے فقر و افلاس اور محتاجگی کو نظر آنے والی چیز کی طرح اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے) اور اس کو ہر معاملہ میں پراگندہ خاطر اور ذہنی انتشار و تفکرات کا شکار بنا دیتا ہے نیز دنیا بھی اس کو صرف اتنی ہی ملتی ہے جس قدر خدا نے اس کیلئے مقدر کر رکھا ہے (ترمذی)

تشریح: قوله: من كانت نيته طلب الآخرة--- وهي راغمة: یعنی علمی اور عملی سرگرمی میں مقصود اصلی اپنے مولیٰ کی رضا۔

جعل الله غناه في قلبه: یعنی اللہ تعالیٰ بقدر ضرورت اور بقدر کفایت روزی پر اس کو قناعت والا بنا دے گا تاکہ زائد اسباب کی تلاش میں وہ نہ تھکے۔

وجمع له شمله: یعنی اس کے منتشر امور کو جمع فرما دیں گے۔ بایں طور کہ ایسی جگہ سے جہاں سے اس کا گمان نہ ہو اسباب معیشت کا بندوبست کر کے اس کو دل جمعی نصیب فرما دے گا۔

واتته الدنيا وهي راغمة: جتنی اس کے لئے مقدر ہے اور اس کی قسمت میں ہے۔ ذلیل حقیر اور تابع ہو کر اس کی طلب میں زیادہ سعی کی ضرورت نہیں پڑتی اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: "العلم يعطى ولو يبطى"۔

قوله: ومن كانت نيته طلب الدنيا ---الا ما كتب له:

شتت: پہلی تا کی تشدید کے ساتھ بمعنی "فرق"

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہا جاتا ہے "جمع الله شمله" یعنی اللہ اس کے متفرق امور کو سمیٹ دے اور "فرق الله شمله" کا معنی ہے کہ اللہ نے اس کے مجتمع امور کو متفرق کر دیا چنانچہ لفظ "شمل" اضداد میں سے ہے۔ اور حدیث تقابل و مطابقت کے باب سے ہے۔ چنانچہ "جعل الله غناه في قلبه" یہ جملہ "جعل الله الفقر بين عينيه" کے مقابلہ میں ہے اور "جمع له شمله" یہ جملہ "وشتت عليه امره" کے مقابلہ میں اور "اتته الدنيا وهي راغمة" یہ جملہ "لا ياتيه منها الا ما كتب له" کے مقابلہ میں ہے۔ اسلئے "اتته الدنيا" کا معنی یہ ہوگا کہ وہ دنیا جو اس کے لئے مقدر ہے اس کے پاس ذلیل ہو کر آئیگی اور دوسرے جملہ "لا ياتيه منها الا" کا معنی یہ ہوگا کہ وہ دنیا جو اس کے لئے مقدر ہے اس کے پاس اس حال میں آئیگی کہ یہ شخص ذلیل وخوار ہوگا۔

۵۳۲۱ : وَرَوَاهُ اَحْمَدُ وَالدَّارِمِيُّ عَنْ اَبَانَ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ۔

احمد في المسند ۱۸۳/۵۔

ترجمہ: "اور احمدؒ اور دارمیؒ نے اس روایت کو ابانؒ سے اور انہوں نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے"۔

تشریح: قوله: وروا احمد والدارمي عن ابان:

"ابان" ہمزہ کے فتحہ اور با کی تشدید کے ساتھ اس کو منصرف بھی پڑھا جاتا ہے اور غیر منصرف بھی یہ عثمان ابن عفان کے صاحبزادے ہیں' تابعی ہیں۔ اپنے والد ماجد اور دوسرے کئی صحابہ سے احادیث کا سماع کیا ہے۔

امام میرک فرماتے ہیں کہ بزار اور طبرانی نے ایک ہم معنی روایت نقل کی ہے۔ اور ابن حبان نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔

۵۳۲۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَیْنَ اَنَا فِی بَیْتِی فِی مُصَلَّایَ اِذَا دَخَلَ عَلَیَّ رَجُلٌ فَاَعْجَبَنِی الْحَالُ الَّتِیْ رَاٰنِیْ عَلَیْهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَحِمَكَ اللّٰهُ یَا اَبَا هُرَیْرَةَ لَكَ اَجْرَانِ اَجْرُ السِّرِّ وَاَجْرُ الْعَلَانِیَةِ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥١٢/٤ حدیث رقم ٢٣٨٤ وابن ماجه ١٤١٢/٢ حدیث رقم ٤٢٢٦

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (ایک روز) میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! میں اپنے گھر میں اپنے مصلے پر (نماز پڑھ رہا) تھا کہ اس وقت اچانک ایک شخص میرے پاس داخل ہوا' مجھے اپنے نماز پڑھنے کی اس حالت پر خوشی ہوئی جس پر اس نے مجھے دیکھا ہے (تو کیا اس وقت میرا خوش ہونا بھی ریا میں شمار ہوگا یا نہیں ہوگا؟) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! تم پر اللہ رحم فرمائے' تمہارے لئے دوہرا اجر ہے ایک تو پوشیدہ کرنے کا اور دوسرا ظاہر ہو جانے کا"۔ امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے"۔

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کا ابتدائی جملہ اخبار ہے لیکن استخبار کے معنی میں ہے۔ یعنی یارسول اللہ کیا آپ ریاء کا حکم لگائیں گے یا نہیں؟ اور حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی "رحمك الله یا ابا هریرة" بھی اسی کے مطابق ہے۔

قوله: لك اجران: اجر السر واجر العلانیه:

یعنی تیرے اخلاص کی وجہ سے' تیری اقتداء کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ تجھ سے عبادت ظاہر ہوئی اور تجھے اپنی عبادت سے خوشی ہوئی۔ بعض نے یہ معنی بتایا ہے کہ ابو ہریرہ کو اس بات سے خوشی اس بناء پر ہوئی کہ یہ شخص جو مجھے نماز پڑھتا ہوا دیکھے گا تو یہ بھی اس طرح رات نماز پڑھے گا۔ اور مجھے اس کے اس عمل کے مثل اجر ملے گا۔ اور یہی اس حدیث کا مفہوم ہے جس کو شرح السنہ میں نقل کیا گیا ہے: "من سن سنة حسنة كان له اجرها واجرمن عمل بها"۔

زیادہ ظاہر یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کا خوش ہونا اصل طبیعت کی بناء پر تھا جو شریعت کے مطابق تھی۔ وہ یہ ہے کہ ہر انسان کی یہ چاہت ہوتی ہے کہ جب کوئی اس کو دیکھے تو اچھی حالت میں دیکھے' اور ہر انسان اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ کوئی اس کو بُری حالت میں دیکھے' قطع نظر اس سے کہ یہ عمل ریا اور سمعہ کے ارادہ اور امید سے ہو۔ لہٰذا یہ حضور علیہ السلام کے اس ارشاد کے عین مطابق ہے جس کو طبرانی نے ابو موسیٰؓ سے نقل کیا ہے: "من سرته حسنة وساء ته سیة فهو مؤمن" جس کو نیکی کرنے سے خوشی ہو اور برائی کرنے سے رنج ہو وہ مؤمن ہے نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ﴾ [یونس: ۵۸] "آپ کہہ دیجئے! کہ پس

لوگوں کو خدا کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہئے وہ اس سے بدرجہا بہتر ہے، جس کو جمع کر رہے ہیں۔"
پس مؤمن اعمال صالحہ کی توفیق سے اس طرح خوش ہوتا ہے جس طرح کہ غیر مؤمن کثرتِ اموال سے خوش ہوتا ہے۔
واللہ اعلم بالاحوال۔

تخریج: امام میرک جزری سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو صاحب مصابیح نے شرح السنہ میں اسی سیاق کے ساتھ سعد بن بشر عن اعمش عن ابی ہریرہؓ نقل کیا ہے۔ اور پھر فرمایا کہ امام ابوعیسیٰ ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔ اور یہ کلام بظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ امام ترمذی نے اس حدیث کو اسی طرح نقل کیا ہے اور ترمذی میں جو حدیث دوسرے الفاظ کے ساتھ منقول ہے اس کے بارے میں امام ترمذیؒ یوں فرماتے ہیں: **حدثنا محمد بن المثنی حدثنا ابو سنان الشیبانی عن حبیب بن ابی ثابت عن ابی صالح عن ابی هریرة قال: قال رجل: یارسول اللّٰہ! الرجل یعمل العمل فیسره فاذا اطلع علیه أعجبه ذلك فقال رسول الله ﷺ له اجران: أجر السر وأجر العلانیة۔"** [الحدیث]

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔ اور اعمش اور دوسروں نے **حبیب عن ابی صالح عن النبی ﷺ** کی سند سے اس حدیث کو مرسلاً نقل کیا ہے۔ امام ترمذیؒ کی بات پوری ہوگئی واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۳۲۳ : **وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْرُجُ فِي اٰخِرِ الزَّمَانِ رِجَالٌ يَخْتِلُوْنَ الدُّنْيَا بِالدِّيْنِ يَلْبَسُوْنَ لِلنَّاسِ جُلُوْدَ الضَّانِ مِنَ اللِّيْنِ اَلْسِنَتُهُمْ اَحْلٰى مِنَ السُّكَّرِ وَقُلُوْبُهُمْ قُلُوْبُ الذِّئَابِ يَقُوْلُ اللّٰهُ اَبِيْ يَغْتَرُّوْنَ اَمْ عَلَيَّ يَجْتَرِءُوْنَ فَبِيْ حَلَفْتُ لَاَ بْعَثَنَّ عَلٰى اُولٰئِكَ مِنْهُمْ فِتْنَةً تَدَعُ الْحَلِيْمَ فِيْهِمْ حَيْرَانَ.** (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٢٢ حدیث رقم ٢٤٠٤

ترجمہ: " حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: " (میں تمہیں بتاتا ہوں) آخری زمانے میں میں ایسے لوگ بھی ظاہر ہوں گے جو دین کے بدلے میں دنیا کو طلب کریں گے (یعنی دینی و اخروی اعمال کے ذریعہ دنیا کمائیں گے) (اور) لوگوں (پر اثر ڈالنے) کے لئے بکری کی کھال کا لباس پہنیں گے (تاکہ لوگ انہیں عابد و زاہد دنیاوی نعمتوں سے بے نیاز اور طالب آخرۃ سمجھ کر ان کی طرف مائل ہوں اور ان کے مرید و معتقد ہوں) ان کی زبانیں تو شکر سے زیادہ مٹھاس والی ہوں گی لیکن ان کے دل بھیڑیوں کے دلوں کی مانند ہوں گے (یعنی اپنے کلام و گفتگو میں اور اپنے ظاہری معاملہ کے لحاظ سے تو نہایت با اخلاق نیک خو لطاف و کرم نرمی اور شائستگی کے اوصاف سے متصف ہوں گے اور دین و مذہب کے حقیقی درمند اور مسلم معاشرے کے حقیقی غم خوار معلوم ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہوگی کہ اپنے ذاتی اغراض و منافع کے لئے دوستی و دشمنی کرنے اور اہل تقویٰ اور دین و ملت کے حقیقی خدمتگاروں کو نقصان و تکلیف پہنچانے اور دیگر حیوانی خصلتوں میں ان کے دل بھیڑیے کے دل کی طرح سخت اور شقی ہوں گے) اللہ تعالیٰ (ایسے لوگوں کو متنبہ فرمانے کے لئے) ارشاد فرماتا ہے۔ کیا یہ لوگ میری طرف سے مہلت مل جانے اور میرے ڈھیل دے دینے کی وجہ سے مغرور ہو گئے

ہیں اور دھوکے میں مبتلا ہیں (یعنی کیا یہ ان کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ میں ان کا معین و مددگار ہوں اور اس دنیا میں انہیں جو کامرانیاں اور کامیابیاں نصیب ہیں وہ مرحوم ومغفور ہونے کی وجہ سے ہیں؟ کیا یہ لوگ اس بات کا علم نہیں رکھتے کہ ہم ایسے لوگوں کو اسی طرح ڈھیل دیا کرتے ہیں؟ یا اس جگہ "اغترا" سے مراد اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرنا اور اپنے افعال بد سے توبہ نہ کرنا ہے اس صورت میں "یجترؤن" کی مراد یہ ہوگی کہ یہ لوگ میرے غضب اور میرے عذاب سے نہیں ڈرتے اور کیا یہ اتنے جرات مند ہوگئے کہ اعمال صالح کے ذریعہ اور دین کے نام پر لوگوں کو دھوکا دے کر گویا میری مخالفت پر کمر بستہ ہیں؟) پس میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں یقیناً ان لوگوں پر انہی میں سے کسی فتنہ ومصیبت کو بھیجوں گا (یعنی انہی لوگوں میں سے ایسے سلاطین وحکمران اور ایسے افراد وگروہ متعین کردوں گا جو ان کو آفات ومصائب اور مختلف طرح کے نقصان اور تکالیف سے دوچار کر ڈالیں گے) اور وہ فتنہ وبلا بڑے سے بڑے دانشور وعقلمند آدمی کو بھی (اس مصیبت وآفت کو ٹالنے ان پر آشوب حالات سے "گلو خلاصی پانے اور اس کے بارے میں کسی مناسب وموزوں اقدام وکارروائی کرنے سے" عاجز وحیران کر ڈالے گا"۔ (ترمذی)

تشریح: قولہ: یخرج فی آخر الزمان رجال ---قلوب الذئاب: یختلون: خا کے سکون اور تاء کے کسرہ کے ساتھ۔ یعنی اخروی اعمال کے ذریعہ یا دین کے بدلہ میں دنیالیں گے اور دنیا کو دین کے مقابلہ میں ترجیح دینگے۔ زیادہ واضح معنی یہ ہے کہ یہ لوگ دینی اعمال کے ذریعہ دنیا والوں کو دھوکہ دینگے "یختلون" ماخوذ ہے" ختله اذا خدعه" (دھوکہ دیا) سے اور مطلب یہ ہے کہ دنیا کو طلب کرنے کیلئے امور دینیہ کا لبادہ اوڑھ کر اور اپنی وضع قطع کے ذریعے لوگوں کو دھوکہ دیں گے جیسا کہ اس کا کلام اس پر دلالت کرتا ہے۔

الضان: ہمزہ کے سکون کے ساتھ اور ہمزہ کو کبھی الف سے بدل دیا جاتا ہے۔

"جلود" سے مراد چمڑا ہے۔ یا اس کے بال مراد ہیں اور یہی زیادہ واضح ہے۔ چنانچہ مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ صوف کا لباس پہنیں گے تاکہ لوگ انہیں زاہد عابد، دنیا کو ترک کرنے والے اور آخرت کے طلبگار سمجھیں۔

من اللین ("من" تعلیہ ہے) ای من اجل اظهار التلین...... ۔ یعنی لوگوں کے ساتھ نرمی، مہربانی، عاجزی اور ہمدردی ظاہر کرنیکی وجہ درحقیقت اس سے لوگوں کے سامنے تملق اور تواضع دکھانا چاہتے ہونگے تاکہ لوگ ان کے احوال کے معتقد ہوکر ان کے مرید بن جائیں۔

الذئاب": ہمزہ کے ساتھ اور اس کو بدل بھی دیا جاتا ہے۔

یعنی دنیا اور جاہ کی شدید محبت' اہل تقوی کے ساتھ بے پناہ بغض عداوت' بہیمانہ صفات وحیوانی شہوات ونفسانی خواہشات کی وجہ سے ان کے دل بھیڑیے کے دل سے زیادہ سخت ہونگے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ﴾

[البقرة:٢٠٤]

"اور کوئی آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے خوب معلوم ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر بتاتا ہے اپنے مافی الضمیر پر، حالانکہ وہ (آپ کی) مخالفت میں (نہایت) شدید ہے"۔

قولہ:یقول اللہ ابی یغترون ام...... :یعنی میری طرف سے مہلت دیئے جانے کی وجہ سے
''اغترار'' سے مراد ہے اللہ سے خوف نہ کرنا اور اپنے فعل قبیح سے توبہ نہ کرنا۔یعنی کیا یہ لوگ میری ناراضگی اور میرے عقاب سے نہیں ڈرتے؟

''یجترؤن'' ''جراءۃ'' سے ماخوذ ہے' از باب افتعال ہے' اسی لئے بعض فرماتے ہیں''الاجتراء'' کا معنی ہے انبساط۔(بے تکلف ہو جانا)اور تشجیع قوی دِل بنانا' جرات دلانا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں''ام'' منقطعہ ہے پہلے اللہ کی مہلت کی وجہ سے دھوکہ دینے کا انکار کیا پھر اس سے اضراب کرتے ہوئے ان کے اس فعل کا انکار کیا جو اس سے زیادہ ظالمانہ تھا اور وہ ہے ان کا اللہ کی مخالف پر جرات کرنا۔

فبی: یہاں بھی مضاف محذوف ہے) ای فبذاتی و صفاتی۔یعنی میں اپنی ذات اور اپنی صفات کی قسم کھاتا ہوں۔

لابعثن:''البعث'' سے ماخوذ ہے۔یعنی میں ان پر مسلط کردونگا یا فیصلہ کردونگا۔

اولئك:ان مذکورہ صفات سے متصف افراد۔

''الحلیم'' مصابیح کے بعض نسخوں میں''حلیم''(لام کے ساتھ) کی بجائے''حکیم''(کاف کے ساتھ) ہے۔حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔

''حیران'' یعنی اس حال میں کہ فتنوں میں متحیر ہوگا اس کو دفع کرنیکی قدرت رکھے گا اور نہ ان سے خلاصی حاصل کر سکے گا۔نہ اس میں ٹھہر کر اور نہ اس سے بھاگ سکے گا۔

اشرفؒ فرماتے ہیں کہ''منھم''میں''من'' کا بیانیہ بمعنیٰ''الذین'' ہونا بھی درست ہے اور اشارہ رجال کی طرف ہوگا اور اس کی تقدیر اس طرح ہوگی''علی اولئك الذین یختلون الدنیا بالدین'' اور''فتنۃ'' کے متعلق کرنا بھی درست ہے ای''لا بعثن علی الرجال الذین یختلون الدنیا بالدین فتنۃ ناشئۃ منھم''

۵۳۲۴ : وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى قَالَ لَقَدْ خَلَقْتُ خَلْقًا اَلْسِنَتُهُمْ اَحْلٰى مِنَ السُّكَّرِ وَقُلُوْبُهُمْ اَمَرُّ مِنَ الصَّبْرِ فَبِيْ حَلَفْتُ لَاُتِيْحَنَّهُمْ فِتْنَةً تَدَعُ الْحَلِيْمَ فِيْهِمْ حَيْرَانَ فَبِيْ يَغْتَرُّوْنَ اَمْ عَلَيَّ يَجْتَرِؤُوْنَ (رواہ الترمذی وقال هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذي في السنن ٢٢/٤ ٥ حديث رقم ٢٤٠٤۔

ترجمہ:''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی اکرم ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے ایک ایسی مخلوق کو پیدا کیا ہے جس کی زبان چینی سے زیادہ مٹھاس والی ہے اور جس کے دل ایلوے (ایک تلخ پھل) سے زیادہ کڑوے ہیں۔پس میں اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں یقیناً ان کو ایسے مصائب و مسائل میں مبتلا کروں گا جو بڑے سے بڑے دانشور عقلمند آدمی کو بھی حیران و عاجز بنا چھوڑیں گے' تو کیا وہ لوگ مجھے سے دھوکہ بازی کرتے ہیں' یا میرے مقابلے میں جرأت و دلیری دکھاتے ہیں؟ ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: السنتهم احلی من السکر: یعنی ان پر وعظ ذکر صبر اور شکر کا اثر ظاہر ہے۔

وقلوبهم امر من الصبر: اکثر نسخوں میں "الصبر" باء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور بعض نسخوں میں باء کے سکون کے ساتھ ہے۔اور قاموس میں ہے "الصبر" "کتف" کی طرح ہے۔اور اس کی باء کو صرف ضرورت شعری کی وجہ سے ساکن پڑھا جاتا ہے۔"صبر" ایک کڑوے درخت کے شیرہ کو کہتے ہیں۔عوام کی زبانوں پر یہ لفظ صاد کے کسرہ اور باء کے سکون کے ساتھ مشہور ہے۔اور شاید یہ ضبط اس بناء پر ہو کہ 'الکتف"

لا تیحنهم: "الاتاحة" سے ماخوذ ہے۔بمعنی تقدیر کہا جاتا ہے: "اتاح الله لفلان کذا" کا ای ہے "قدره و انزله به"۔ چنانچہ یہ فعل حذف وایصال کے باب سے ہے اور معنی یہ ہوگا: "لا تیحن لهم"۔

یغترون: استفہام مقدر ہے۔

۵۳۲۵ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِکُلِّ شَیْءٍ شِرَّةً وَلِکُلِّ شِرَّةٍ فَتْرَةً فَاِنْ صَاحِبُهَا سَدَّدَ وَقَارَبَ فَارْجُوْهُ وَاِنْ اُشِیْرَ اِلَیْهِ بِالْاَصَابِعِ فَلَا تَعُدُّوْهُ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٤٨/٤ حدیث رقم ٢٤٥٣ وابن ماجه ١٤٠٥/٢ حدیث رقم ٤٢٠١ واحمد فی المسند ١٥٨/٢۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ہر چیز کے لئے نشاط ورغبت اور زیادتی ہے اور پھر ہر حرص وزیادتی کے لئے سستی اور ضعف ہے۔پس اگر عمل کی رغبت رکھنے والے نے کام کو درست انداز سے کیا اور وہ اعتدال کے قریب قریب رہا (یعنی وہ افراط وتفریط سے بچا رہا) تو اس کے بارے میں توقع رکھو (کہ وہ اپنی منزل مقصود کو پہنچ جائے گا) اور اگر اس کی جانب انگلیوں سے اشارہ کیا گیا (یعنی اس نے طاعت وعبادت اور اوراد ووظائف کے مشغل ومصروفیت اور دنیاوی نعمتوں ولذتوں سے اجتناب میں اس لئے مبالغہ کو اختیار کیا کہ لوگوں میں اس کے زہد وعبادت کی شہرت ہو جائے اور وہ ہو بھی گئی) تو تم اس کو (عابدین وزہاد اور صلحاء میں) شمار نہ کرو (کیونکہ اصل میں اس کا شمار ریاکار لوگوں میں ہوتا ہے)"۔(ترمذی)

تشریح: قال: قال النبی: ایک نسخہ میں "النبی" کی بجائے "رسول الله" کا لفظ ہے۔

شرة: شین کے کسرہ اور راء کی تشدید کے ساتھ۔اس کا معنی ہے کسی چیز کی حرص اور شوق ورغبت۔

قوله: ولکل شرة فترة: فاء کے فتحہ اور تاء کے سکون کے ساتھ، ایک نسخہ میں یہ مرفوع ہے اور مطلب یہ ہے کہ عابد شروع میں عبادت میں بہت مبالغہ کے ساتھ کرتا ہے اور ہر وہ شخص جو کسی کام میں مبالغہ کرتا ہے وہ تھک جاتا ہے اس کی تیزی ختم جاتی ہے، اگرچہ کچھ زمانہ بعد ہو۔

قوله: فان صاحبها سدد وقارب فارجوه: "صاحبها" فاعل ہے، فعل محذوف ہے، جس پر مابعد فعل "سدد" دلالت کر رہا ہے: یعنی میانہ روی اور استقامت کا ارادہ کرتا ہے یا مطلب یہ ہے کہ اس فعل کی مداومت پر اس کام میں اعتدال سے کام لیا لیکن یہ عبادت اور اطاعت اس سے منقطع نہیں ہوتی۔

تو یہ شخص کامیاب لوگوں میں سے ہے کیونکہ جو شخص میانہ روی کا راستہ اختیار کرتا ہے وہ اس عمل پر مداومت کر سکتا ہے لیکن یہ بات قطعیت کے ساتھ مت کہو اس لئے کہ حقیقت حال اللہ ہی خوب جانتا ہے۔

قولہ وان اشیر الیہ بالا صابع فلا تعدوہ: یعنی اس کو کچھ نہ سمجھو اور اس کو نیک خیال مت کرو کیونکہ یہ ریاء کار ہے اس لئے کہ اس نے اپنے اوقات فترت بھی عبادت میں لگا دیئے اور یہ وہیں متصور ہو سکتا ہے جہاں ریاء اور سمعہ ہو، نیز جب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تو بسا اوقات عبادت میں اضافہ کر دیتا ہے، اور عجب وغرور کا شکار ہو جاتا ہے اور ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جاتا ہے الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضل سے نواز دے اور اس کو مخلصین میں سے بنا دے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ انسان ابتداءً کسی کام میں بہت زیادہ حرص اور انتہائی تیزی کے ساتھ لگتا ہے لیکن پھر اُس تیزی اور زیادتی کے بعد کمزوری اور سستی آتی ہے' چنانچہ اگر انسان میانہ روی سے چلے اور افراط وتفریط سے اجتناب کرے اور سیدھے راستے پر چلے تو اُس شخص کے کامیاب وکامل ہونے کی امید رکھو، اور اگر افراط کے ساتھ چلے یہاں تک لوگ اس کی طرف اشارے کرنے لگیں تو اس شخص کی طرف التفات نہ کرو اور اس پر اعتماد نہ کرو، کیونکہ بسا اوقات ایسا شخص ہلاک ہو جاتا ہے، لیکن اس بات پر جزم مت کرو کہ یہ شخص یقیناً خسارہ پانے والوں میں سے ہے اور اس کو بالیقین ہلاک ہونے والوں میں سے شمار نہ کرو، لیکن اس سے اس طرح امید نہ رکھو جس طرح معتدل مزاج شخص سے رکھتے ہو، اس لئے کہ کبھی اللہ تعالیٰ انسان کو افراط اور شہرت کی حالت میں بھی بچا لیتا ہے، جیسا کہ کبھی تفریط کرنے والے اور عبادت میں کوتاہی کرنے والے کو معاف کر دیتا ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس تاویل کی تائید اگلی حدیث سے اور اس میں موجود استثناء سے ہوتی ہے' اور تیسری قسم کا ذکر اس کے واضح ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا۔

تخریج: اس حدیث کو بیہقی نے ابن عمرؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

"ان لکل شئ شرۃ ولکل شرۃ فترۃ فمن کانت فترتہ الی سنتی فقد اھتدیٰ' ومن کانت فترتہ الی غیر ذالک فقد ھلک"۔

۵۳۲۶ : وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بِحَسْبِ امْرِيءٍ مِنَ الشَّرِّ اَنْ يُّشَارَ اِلَيْهِ بِالْاَصَابِعِ فِيْ دِيْنٍ اَوْ دُنْيَا اِلَّامَنْ عَصَمَهُ اللّٰهُ (رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

رواہ البیھقی فی شعب الایمان ۳۶۷/۵ حدیث رقم ۶۹۷۸

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "انسان کی برائی کے لئے اتنا کافی ہے کہ دینی یا دنیوی اعتبار سے اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جائے۔ سوائے اس شخص کے جس کی خدا تعالیٰ خود حفاظت فرمائے"۔ (بیہقی)

تشریح: بحسب امری: "با" زائدہ ہے۔ ای یکفیہ یعنی اس شخص کیلئے کافی ہے۔ کیونکہ جو شخص کسی خصلت وخوبی میں مشہور ہو جائے تو وہ باطنی آفات سے بہت کم ہی بچ پاتا ہے مثلاً کبر، عجب، ریاکاری، سمعہ اور دیگر اخلاق رذیلہ۔

الا من عصمہ اللہ: یعنی اللہ تعالیٰ مقام تقویٰ میں اس کی حفاظت کرے۔

منقول ہے کہ حسن بصریؒ سے ایک شخص نے کہا کہ (آپ مشہور ہوگئے ہیں اس لئے) لوگ آپ کی طرف انگلیوں سے اشارے کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں حسن بصریؒ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کے ارشادِ گرامی کی مراد یہ نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام کے ارشادِ گرامی کا تعلق تو اُس شخص سے ہے جو دین کے اعتبار سے بدعتی اور دنیا کے اعتبار سے فاسق ہو۔ (انتھی)

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی طرف سے اشارے بدعت دغرابت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی اُس کثرت کی وجہ سے بھی ہوتے ہیں جو عادت کی حد سے زائد ہوں چنانچہ (عادت کی حد سے) تجاوز کرنے کی وجہ سے اشارے ہونے لگتے ہیں چنانچہ بعض اوقات یہ حد سے تجاوز کرنا' ریاء کاری' سمعہ اور عزت واحترام کیلئے لوگوں سے طمع کرنے کا ذریعہ بنتا ہے اور کبھی اللہ اس شخص کو اپنے غیر کی طرف نظر کرنے سے بچاتا ہے، اس لئے وہ کسی اور کی طرف التفات نہیں کرتا اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی نہ تو شر دفع کرنے پر قادر ہے، اور نہ خیر پہنچانے پر قادر ہے۔ اور لوگوں کی مدحت و مذمت کا کوئی اعتبار نہیں نہ تو عبارت اور نہ اشاروں میں کیونکہ مخلوق نے نہ تو کسی دعویٰ کو آسان کیا ہے اور نہ کسی معنیٰ کو مشکل ... ہے، چنانچہ یہی وہ حالت ہے جس میں انسان کامل خوشخبری ہے۔ لیکن یہاں بڑے بڑے بہادروں کے بھی پاؤں پھسل جاتے ہیں، اور بڑے پہاڑ جیسے سمجھ والوں کی عقل ہل جاتی ہے۔ جیسا کہ منقول ہے: لايؤمن أحد كم حتى يكون الخلق عنده كالأباعر۔

''تم میں سے کوئی کامل ایمان والا اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک تمام مخلوق اس کی نظر میں مینگنیوں کی طرح نہ ہو جائے۔''

اس مقام کی وضاحت علامہ طیبیؒ نے حسین عبارت اور مزین اشارہ کے ساتھ کی ہے وہ فرماتے ہیں، کہ سرداری اور لوگوں کے دلوں میں جاہ کی محبت اس میں علماء، اللہ کے نیک بندے اور آخرت کی طلب میں چلتے ہوئے غیر معمولی کوشش اور محنت والے زاہد لوگ بھی مبتلا ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں نے جب اپنے نفسوں کو مغلوب کر دیا' ان کو شہوات سے روکا' مشتبہات سے بچایا' ان کو مغلوب کر کے مختلف قسم کی عبادات پر آمادہ کیا، تو ان کے نفوس اعضاء وجوارح سے ظاہر ہونے والے معاصی میں طمع اور اُمید سے عاجز ہوگئے اس لئے ان کے نفوس نے اپنے علم وعمل کو ظاہر کر کے اور اپنی بھلائی کو آشکارا کر کے استراحت و آرام کا مطالبہ کیا' اور مجاہدہ کی مشقت سے خلاصی پا کر مخلوق کے ہاں قبولیت کی لذت حاصل کی' اور اپنے اعمال پر صرف خالق کے مطلع ہونے پر قناعت نہیں کی، لوگوں کی تعریف پر خوش ہوئے' صرف خالق کی تعریف پر قناعت نہیں کی لوگوں کی تعریفیں ان کو معلوم ہونے لگیں اور لوگ جب ان کی زیارت کیلئے آتے ہیں، اور اس کی خدمت اور اکرام کرتے ہیں، اور محافل میں ان کو اونچی جگہ دیتے ہیں، تو نفس کو ان ساری باتوں میں انتہائی لذت ملتی ہے جبکہ وہ شخص سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی اللہ اور اس کی عبادت کیلئے گزر رہی ہے، حالانکہ اس کی زندگی ان پوشیدہ شہوات میں گزرتی ہے جن کو دیکھنے سے انسانوں کی آنکھیں اندھی ہیں، سوائے اُن عقول کے جو پرکھنے والی ہیں، حالانکہ اس شخص کا نام منافقین کے ساتھ لکھا جا چکا ہوتا ہے' اور وہ یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں اللہ کے ہاں مقربین میں سے ہوں، یہ نفس کا ایسا دھوکہ ہے جس سے صرف مخلص صدیق ہی محفوظ رہ پاتے ہیں، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے:

''آخر ما يخرج من رؤوس الصديقين حب الرياسة''

''صدیقین کے سروں سے جو چیز آخر میں نکلتی ہے وہ حبِ جاہ ہے''۔

اس لئے اللہ کے ہاں محمود وہ شخص ہے جو گمنام ہو، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے دین کی نشر و اشاعت کی وجہ سے شہرت دے، اور اس کو یہ شہرت مقصود نہ ہو، جیسا کہ انبیاء، رُسل، خلفاء راشدین، علماء محققین اور سلف صالحین۔ والحمد للہ رب العالمین

یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مرفوعاً منقول ہے، جیسا کہ جامع میں لکھا ہے۔

الفصل الثالث:

٥٣٢٧ : عَنْ اَبِیْ تَمِیْمَةَ قَالَ شَهِدْتُّ صَفْوَانَ وَاَصْحَابَهٗ وَجُنْدُبٌ یُوْصِیْهِمْ فَقَالُوْا هَلْ سَمِعْتَ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ شَاقَّ شَقَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالُوْا اَوْصِنَا فَقَالَ اِنَّ اَوَّلَ مَا يُنْتِنُ مِنَ الْاِنْسَانِ بَطْنُهٗ فَمَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ لَّا يَاْكُلَ اِلَّا طَيِّبًا فَلْيَفْعَلْ وَمَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ لَّا يَحُوْلَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ مِلْءُ كَفٍّ مِنْ دَمٍ اَهْرَاقَهٗ فَلْيَفْعَلْ ۔ (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ١٢٨/١٣ حدیث رقم ٧١٥٢

ترجمہ: ''حضرت ابی تمیمہؒ (تابعی) نے بیان فرمایا کہ ایک روز میں حضرت صفوان اور ان کے ساتھیوں کی ہم نشینی میں اس وقت موجود تھا کہ جب (مشہور اور جلیل القدر صحابیؓ) حضرت جندب رضی اللہ عنہ (بن عبداللہ بن سفیان بجلی) حضرت صفوان اور ان کے رفقاء کو (اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ اور عبادت واطاعت کے جذبہ حقیقی کے ساتھ سرشار ہو کر ریاضت وعبادت میں افراط تفریط سے بچتے ہوئے راہ مستقیم اختیار کرنے کی) تاکیدی نصیحت فرما رہے تھے۔ پھر حضرت صفوان اور ان کے ساتھیوں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ سنا ہے؟ حضرت جندب رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان فرمائی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''جو شخص سنائے گا (یعنی لوگوں کو سنانے اور شہرت حاصل کرنے کی خاطر جو شخص نیک عمل کرے گا) تو اللہ تعالیٰ روز قیامت اس کو رسوا کرے گا اور جو شخص مشقت ڈالے گا (یعنی اپنی ہمت وطاقت سے بڑھ کر کوئی کام کرنے کی صورت میں اپنے آپ کو مشقت سے دوچار کرے گا۔ یا کسی دوسرے شخص مثلاً اپنے غلام یا ملازم وغیرہ پر اس کی ہمت وطاقت سے بڑھ کر کوئی کام لازم کر دے یا ناقابل برداشت ذمہ داری عائد کر دے) تو خدا تعالیٰ اس کو روز قیامت مشقت میں مبتلا کرے گا۔'' (یہ سن کر) انہوں نے (یعنی صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ سے یا حضرت صفوان اور ان کے ساتھیوں نے حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے عرض کیا) کہ آپ ہمیں (کچھ اور) نصیحت فرمایئے تو (حضور ﷺ نے یا حضرت جندب رضی اللہ عنہ نے) ارشاد فرمایا: انسان کی جو چیز سب سے پہلے گندی اور بدبودار ہوتی ہے وہ اس کا پیٹ ہے (یعنی جو چیز انسان کو سب سے پہلے بڑھ کر نافرمانی پر آمادہ کرنے والی ہے سب سے پہلے دوزخ کی آگ کا مستوجب بناتی ہے اور آخرت میں سب سے پہلے دوزخ میں جانے اور عذاب بھگتنے کا سبب بننے والی ہے وہ اس کا پیٹ ہے)۔ پس جو شخص اس بات پر قادر ہو کہ اس چیز کے علاوہ اور کچھ نہ کھائے جو حلال وجائز ہے تو ایسے بس یوں ہی کرنا چاہیے اور جو شخص اس بات پر قادر ہو کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک مٹھی بھر بھی ایسا خون مائل نہ ہو جس کو ناحق بہایا ہو تو بے شک اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے (کہ کسی کا ایک چھوٹا سا ناحق خون بہانے سے اجتناب

کرے)''۔(بخاری)

راویٔ حدیث:

ابوتمیمۃ۔ یہ ابوتمیمہ طریف بن بصری ہیں۔ان کی اصل عرب کے خطہ یمن سے ہے۔ان کے چچا نے ان کو بیچ دیا تھا اور یہ تابعی ہیں۔متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔اوران سے قتادہ وغیرہ نے روایت کی ہے ۹۵ھ میں انتقال ہوا۔

عرض مرتب:

طریف کی ولدیت ملا علی قاری نے مجالد جہمی ذکر کی ہے۔صاحب''الاکمال'' نے خالد جہمی ذکر کی ہے اور الاکمال کے محشی کا کہنا ہے کہ''الخلاصہ''اور''التقریب'' کے مطابق''خالد جہمی''اور یہ ثقہ روای ہیں۔اھ

تشریح: قوله:قال :شهدت صفوان:

بظاہر صفوان بن سلیم الزہری مراد ہیں، جو حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف کے آزاد کردہ غلام تھے اور اہل مدینہ میں سے جلیل القدر تابعی تھے۔ اُنس بن مالک اور تابعین کی ایک جماعت سے روایات نقل کی ہیں۔اللہ تعالیٰ کے نیک اور منتخب بندوں میں سے تھے۔کہا جاتا ہے، کہ انہوں نے چالیس برس تک اپنا پہلو زمین پر نہیں رکھا۔اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سجدوں کی کثرت کے باعث ان کی پیشانی میں گڑھا پڑ گیا تھا اور امراء وسلاطین کے ہدایا کو قبول نہیں کرتے تھے۔ان کے مناقب وفضائل بہت ہیں۔ ابن عیینہ نے ان سے روایات نقل کی ہیں، یہ بات مؤلف نے ذکر کی ہے۔اور بظاہر ان کے اصحاب سے مراد علم وعمل میں ان کے ساتھی ہیں۔

قوله:وجندب يوصيهم:يوصيهم: تخفیف اور تشدید دونوں کے ساتھ درست ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مجاہدہ پر استقامت'یا عبادت میں زیادتی، یا عبادت میں اعتدال کی'یا ریاء وسمعہ اور شہرت کے جذبہ سے اجتناب کرنے کی، نصیحت فرمارہے تھے۔لیکن زیادہ صحیح آخری دو احتمال ہیں، جیسا کہ سوال وجواب اس پر دلالت کررہے ہیں۔

قوله:فقالوا اهل سمعت من رسول الله ﷺ شيئاً:یعنی احادیث۔پس ہمیں حدیث بیان کریں اور ہمیں ان سے مستفید کریں۔اس لئے کہ حضور علیہ السلام کا کلام زیادہ مؤثر اور دلوں کو زیادہ نرم کرنے والا ہے۔

شاق:باب مفاعلہ سے ہے جب مغالبہ کے معنی میں نہ ہوتو مبالغہ کیلئے ہوتا ہے،

مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ کا مکلّف بنا کر اپنے آپ کو مشقت میں ڈالے گا،

یا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی اور پر زیادہ بوجھ ڈال کر اس کو مشقت میں ڈالے گا، اور اسی سے ارشاد نبوی ہے:''لو لا ان أشق على امتي لأمرتهم بالسواك عند كل صلاةٍ''.علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس کو مطلق رکھا، تاکہ عموم حاصل ہو۔

شق الله:ایک صحیح نسخہ میں''شاق الله''کا لفظ ہے۔

يشتن:یا کے ضمہ کے ساتھ۔

یعنی دنیا میں کیونکہ پیٹ ہی گندگی کی جگہ ہے یا قبر میں پیٹ پھٹ کر خراب ہوگا۔

جتنا ہو سکے یا معنی یہ ہے کہ اس کو کھالے، کیونکہ جس کو یہ معلوم ہوگیا کہ کھائی ہوئی چیز کا انجام وہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے، تو اس کیلئے ضروری ہے، کہ نفس کی لذات کو حرام طریقے سے حاصل نہ کرے، بلکہ حلال مال پر اکتفاء کرے، اگرچہ تھوڑا سا مال ہی کیوں نہ ہو۔ ابن ادھم نے شعر کہا ہے:

وما هی الا جوعة قد سددتها

وکل طعام بین جنبی واحد

علامہ طیبیؒ نے تکلف کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ پیٹ کا بدبودار اور خراب ہونا اس کو آگ کے چھونے سے کنایہ ہے۔ اور اس تاویل کی ضرورت اس لئے پیش آئی تاکہ اگلے جملہ "فمن استطاع ان لا یأکل الا طیباً" ای حلالا کے مطابق ہو جائے، اور اس کی نظیر یہ ارشاد باری ہے: ﴿ان الذین یأکلون أموال الیتٰمی ظلماً انما یأکلون فی بطونهم ناراً......﴾ [النساء: ۱۰] "بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال بلا استحقاق کھاتے (برتتے) ہیں اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں۔"

اور اس بات پر کوئی دلالت نہیں کہ پہلی چیز جس کو آگ چھوئے گی وہ پیٹ ہے۔

قوله: ومن استطاع ان لا یحول بینه وبین الجنة...... :یعنی کامیاب لوگوں کے ساتھ دخول اولی ہو۔

اهراقه: "ها" کے فتحہ کے ساتھ اور سکون کے ساتھ بھی درست ہے۔

"ایک چلو بھر" سے تقلیل مراد ہے جو اشارہ ہے کہ تھوڑا سا ناجائز خون بہانا جنت میں جانے سے مانع ہے، تو زیادہ خون بہانے کا کیا حال ہوگا۔ کہا گیا ہے کہ اس میں اُس شخص کو بیوقوف ٹھہرایا گیا، جو یہ کہتا ہے کہ انسان سے جنت کا فوت ہو جانا اس حقیر اور گھٹیا چیز کی وجہ سے ہے۔

امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اپنی کتاب "شرح الصدور فی احوال القبور" میں "باب نتن المیت وبلاءِ جسده الا الانبیاء ومن الحق بهم" کے تحت ذکر کیا ہے۔ بخاری نے جندب بجلی کی حدیث اس طرح نقل کی ہے: "ول ما ینتن من الانسان بطنه" انتہی۔ اور ان کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مکمل حدیث مرفوع ہے۔ واللہ اعلم۔

۵۳۲۸ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّهٗ خَرَجَ یَوْمًا اِلٰی مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدَ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ قَاعِدًا عِنْدَ قَبْرِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَبْکِیْ قَالَ مَا یُبْکِیْكَ قَالَ یُبْکِیْنِیْ شَیْءٌ سَمِعْتُهٗ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ یَسِیْرَ الرِّیَاءِ شِرْكٌ وَمَنْ عَادٰی لِلّٰهِ وَلِیًّا فَقَدْ بَارَزَ اللّٰهَ بِالْمُحَارَبَةِ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْاَبْرَارَ الْاَتْقِیَاءَ الْاَخْفِیَاءَ الَّذِیْنَ اِذَا غَابُوْا لَمْ یُتَفَقَّدُوْا وَاِنْ حَضَرُوْا لَمْ یُدْعَوْا وَلَمْ یُقَرَّبُوْا قُلُوْبُهُمْ مَصَابِیْحُ الْهُدٰی یَخْرُجُوْنَ مِنْ کُلِّ غَبْرَآءَ مُظْلِمَةٍ۔

(رواه ابن ماجة والبیهقی فی شعب الایمان)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۱۳۲۰/۲ حدیث رقم ۳۹۸۹ والبیهقی فی شعب الایمان ۳۲۸/۵ حدیث رقم ۶۸۱۲

[illegible]

ترجمہ: ''امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ ایک روز رسول اللہ ﷺ کی مسجد (یعنی مسجد نبوی) میں تشریف لائے تو انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کے پاس بیٹھ کر روتا ہوا پایا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ آپ کو کیا چیز رُلا رہی ہے؟ (کیا حضور ﷺ کی مفارقت کا غم ہے یا کسی آفت و مصیبت کے پیش آ جانے کے باعث رو رہے ہو اور یا ان کے سوا کوئی اور وجہ ہے جو آپ کو رونے پر مجبور کر رہی ہے؟) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''مجھے ایسی بات رلا رہی جسے میں حضور اکرم ﷺ سے سنا تھا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''یقیناً معمولیسا ریا بھی شرک ہے''۔ (نیز آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ) جس شخص نے خدا کے دوست سے عداوت رکھی (یعنی اولیاء اللہ کو اپنے کسی قول و فعل کے ساتھ ناحق ستایا پریشان کیا یا ان کو غصہ دلایا) تو وہ گویا اللہ تعالیٰ سے جنگ کتنے کے لئے میدان جنگ میں اتر آیا (اور ظاہر ہے کہ جس شخص نے خدا کے ساتھ مقابلہ آرائی کی اس کا ذلیل و رسوا ہونا اور ہلاک و برباد ہونا یقینی ہے) یقیناً اللہ تعالیٰ نیکوکاروں' اھل تقویٰ اور ایسے مخفی حالت والے لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جن کی ظاہری حالت تو اتنی خستہ اور عام نگاہوں میں اس قدر نا قابل توجہ ہوتی ہے کہ) جب وہ نظروں سے غائب ہوں تو ان کی تلاش و جستجو نہ کی جائے اور جب موجود ہوں تو انہیں (کسی دعوت و مجلس میں) دعوت نہ دی جائے اور اگر وہ بلائے بھی جائیں تو قریب نہ کئے جائیں''۔ (لیکن باطنی و روحانی طور پر ان کا مقام بہت بلند ہوتا ہے چنانچہ ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں (جن کے نور سے راہ راست پائی جاتی ہے) اور یہ لوگ ہر تاریک زمین سے نکل کر آتے ہیں (اس روایت کو ابن ماجہ نے اور شعب الایمان میں بیہقیؒ نے نقل کیا ہے''۔

تشریح: **قولہ: ان یسیرا الریاء شرك**: بڑا شرک ہے یا شرک کی ایک قسم ہے۔ یعنی یہ بہت زیادہ مخفی ہے اس لئے کہ یہ تو کالی رات میں کالی چٹان پر چلنے والی کالی چیونٹی سے بھی باریک ہے۔ اور قوی تقویٰ والے بھی بہت کم افراد ایسے ہیں، جو اس سے محفوظ ہیں، تو ضعفاء کا کیا حال ہوگا؟ یہ رونے کے اسباب میں سے ایک سبب تھا، دوسرا سبب اولیاء اللہ کو ایذاء پہنچانا ہے، جبکہ اکثر اولیاء پوشیدہ ہوتے ہیں، جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے: ''**اولیائی تحت قبائی لا یعرفهم غیری**''

''میرے اولیاء میری چادر تلے ہیں، میرے علاوہ کوئی اُن کو نہیں پہچانتا۔''

اور انسان سے اپنے بھائیوں اور ساتھیوں کے ساتھ زبان کی ایسی بے تکلفی ہو ہی جاتی ہے جو باعث عصیان ہوتی ہے، اور گویا کہ اگلے جملہ سے یہی معنی مراد ہے۔

اور مخالفت کو محاربہ سے تعبیر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بہت بڑی جرأت و جنایت ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ لفظ ''للہ'' کو ''عادی'' کے متعلق کرنا درست نہیں ہے، بلکہ یہ ''ولیا'' کے متعلق ہے یا ''ولیًا'' کی صفت تھی مقدم کیا تو حال بن گیا۔

قولہ: ان اللہ یحب الابرار ...... :

''ابرار'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو نیک اعمال کرتے ہیں یعنی اللہ کی اطاعت کرتے ہیں، اور مخلوق کے ساتھ احسان کرتے ہیں۔ بعض عارفین فرماتے ہیں' کہ دین کا مدار اللہ کے حکم کی تعظیم اور اللہ کی مخلوق پر شفقت کرنے پر ہے۔

الا تقیاء: جو شرک جلی' شرک خفی، لہو و لعب اور ممنوع امور سے بچتے ہیں۔

الأخفياء: یعنی عام مخلوق کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں' اور ان کے ساتھ اختلاط اور معاشرت سے پوشیدہ ہیں۔

الذين اذا غابوا: زیادہ گمنامی کی وجہ سے۔

لم يتفقدوا: مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ قاموس میں ہے، **"تفقد" طلبه عند غيبته** "غائب ہونے کے بعد تلاش کرنا" اور اسی سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**وتفقد الطير**﴾ [النمل : ۲۰]

لم يدعوا: مجہول کے صیغہ کے ساتھ۔

لم يقربوا: مجہول کے صیغہ کے ساتھ بھی ہے۔

یعنی عام لوگ ان کو اپنے قریب نہیں بلاتے اور ان کی قدر قرب اور مقدار مرتبہ سے نا آشنا ہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "ان الله" سے جملہ مستانفہ ہے "ولی" کی حقیقت کا بیان ہے، اور اولیاء اللہ کے تین احوال ذکر کئے ہیں جب وہ سفر میں ہوتے ہیں تو لوگ ان کو تلاش نہیں کرتے اور جب وہ حاضر ہوتے ہیں تو دعوت طعام کیلئے ان کو نہیں بلایا جاتا، اور اگر وہ مجلس میں حاضر ہو جائیں تو ان کو قریب جگہ نہیں دی جاتی بلکہ جوتیوں کی جگہ میں چھوڑ دیا جاتا ہے، اور تفصیل ہے اس روایت کی: "**رب أشعث اغبر لا يعبأ به لو أقسم على الله لأبره**"

"بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو پراگندہ بال اور غبار آلود ہوتے ہیں، اور ان کو وقعت نہیں دی جاتی، اگر وہ اللہ پر (اعتماد کر کے) قسم اٹھالیں، تو اللہ یقیناً ان کی قسم کو پورا کر دے۔"

قوله: قلوبهم مصابيح الهدىٰ:

یعنی ہدایت کے رہبر ہیں، اور راہ عنایت کے ہادی ہیں، پس پردہ رعایت کے مستحق ہیں، بلکہ ضروری ہے، کہ اُن سے حفاظت طلب کی جائے۔

قوله: يخرجون من كل غبراء مظلمة:

یعنی ہر مشکل مسئلہ کی ذمہ داری سے اور دردناک مصیبت سے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ یہ کنایہ ہے اس بات سے کہ ان کی رہائش گاہیں حقیر درجہ کی ہیں' اور تاریک وغبار آلود ہیں، کیونکہ ان کے پاس وہ اشیاء نہیں، جن سے وہ اپنی رہائش گاہوں کو روشن کر سکیں اور صاف رکھ سکیں۔

اربعین کے شروع میں ایک حدیث منقول ہے' جس کو امام بخاریؒ نے ابو ہریرۃؓ سے نقل کیا ہے، کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: "**من عادىٰ لي وليًا فقد آذنته بالحرب**"۔

اس کے شارح میں اس شخص کو بتا دیتا ہوں کہ اس نے مجھ سے دشمنی کی ہے یا یہ کہ میں تجھ سے مقابلہ کروں گا، تجھے مغلوب کرونگا اور تجھ سے بدلہ اور انتقام لوں گا۔ اور ایک روایت میں ہے: **انی لأغضب اوليائي كما يغضب الليث للجرو اى لولده**۔ "مجھے اپنے ولی کی وجہ سے اتنا غصہ آتا ہے، کہ جتنا غصہ کہ شیر کو اپنے بچے کی وجہ سے آتا ہے۔"

اور دوسری روایت میں ہے: **انه ينتقم بعدوه** اللہ تعالیٰ اس کے دشمن سے انتقام لیتا ہے۔

"ولی" کی تحقیق لفظ "ولی" اپنی ترکیب ~~کے اعتبار~~ سے "قرب" پر دلالت کرتا ہے، گویا کہ "ولی" اللہ کے "قریب" ہوتا

ہے، کیونکہ اللہ کا ولی اللہ کی معرفت جلال و جمال اور کمالِ مشاہدہ کے نور میں مستغرق ہوتا ہے۔

''ولی'' کی تعریف میں علماء کا اختلاف ہے۔

متکلمین فرماتے ہیں کہ ''ولی'' وہ شخص ہے جو دلیل پر مبنی صحیح عقیدہ کا حامل ہو۔ اور اعمال شرعیہ کا پابند ہو۔ کی تائید بعض اکابر کے اس قول سے ہوتی ہے، کہ اگر علماء اولیاء نہیں، تو پھر اللہ کا کوئی ولی نہیں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں ''ولی'' وہ شخص ہے جس کو بعض غیبی امور کا کشف ہوا ہو، اور لوگوں کی اصلاح پر مأمور نہ ہو۔

ان دونوں باتوں میں اشکال ہے، اس لئے کہ اکثر اولیاء خصوصاً سلف صالحین کی کوئی کرامت ظاہر نہیں ہوئی، اور نہ کسی چیز کا کشف ہوا۔ بخلاف بعض متاخرین کے (کہ ان سے کرامت کا ظہور ہوا اور کشف بھی ہوا ہے)۔

اس کی وجہ بعض حضرات یہ بتاتے ہیں، کہ پہلے لوگوں کے دل قوی تھے، اور متاخرین کا دین کمزور ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے علماء عاملین ہی اولیاء ہوتے ہیں، اور یہ بات یقینی ہے کہ علماء عاملین اپنی ذات میں کامل ہوتے ہیں دوسروں کو کامل کرتے ہیں، چنانچہ یہی لوگ نیکیوں کا حکم کرتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں، اللہ کی حدود کا خیال رکھتے ہیں، جیسا کہ حدیث کے ان الفاظ: ''**قلوبهم مصابيح الهدى**'' میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

خوشخبری ہو اس شخص کیلئے جو ان کی اقتداء کرے اور ان کے نور سے روشنی حاصل کرے اور ان سے رہنمائی حاصل کرے۔

معنوی اعتبار سے اس کے زیادہ قریب بات وہ ہے جو امام قشیریؒ نے ذکر کی ہے، کہ ''ولی'' فعیل بمعنی مفعول ہے۔ کہ ''ولی'' وہ شخص ہے کہ جس کی مسلسل حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہو، یا ''**فعیل**'' بمعنی فاعل ہے۔ کہ ''ولی'' وہ شخص ہے جو اللہ کی اطاعت وعبادت ذمہ داری کے ساتھ کرے، اور مسلسل کرے بایں طور کہ معصیت کے ذریعے خلل نہ آئے۔ یہ دونوں وصف ولایت کیلئے شرط ہیں، (انتہی)۔

اس سے معلوم ہوا کہ ''او'' تنویع کیلئے ہے، اور پہلے (جملے) میں اشارہ ہے اس مجذوب سالک کی طرف جس کو 'مراد' (مرشد) سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور دوسرے (جملے) میں اشارہ ہے اس مجذوب سالک کی طرف جس کو 'مرید' (مسترشد) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں ان دونوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

﴿**الله يجتبى اليه من يشاء ويهدى اليه من ينيب**﴾ [الشوریٰ:۱۳] ''اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے اور جو شخص رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دیتا ہے''۔

اس کی تحقیق یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ ''ولی'' وہ ہے جس کے معاملہ کی اللہ تعالیٰ بذات خود ذمہ داری لے، چنانچہ اس شخص کا اپنا کوئی تصرف باقی نہ رہے، چونکہ اس کا اپنا نہ وجود ہے، نہ ذات، نہ کوئی فعل نہ کوئی وصف۔ بلکہ یہ ''فانی'' ایک باقی ذات کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ نہلانے والے کے سامنے میت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اس کی شکل اور نام کو مٹا ڈالتا ہے۔ اسکی ذات اور اس کے اثر کو مٹا دیتا ہے، اس کو ایک وقت تک زندہ و باقی رکھتا ہے۔ پھر اپنی ملاقات کیلئے بلاتا ہے۔

۵۳۲۹ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا صَلّٰى فِي الْعَلَانِيَةِ فَاَحْسَنَ وَصَلّٰى فِي السِّرِّ فَاَحْسَنَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى هٰذَا عَبْدِیْ حَقًّا (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۲/ ۱٤۰۵ حديث رقم ٤۲۰۰

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انسان جب علی الاعلان (سب کے سامنے) نماز پڑھے اور بہترین انداز سے پڑھے (یعنی نماز کی تمام شرائط و واجبات سنن اور مستحبات کا لحاظ رکھ کر پڑھتا ہے اور اسی طرح دیگر عبادات و طاعات بھی پورے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کرتا ہے) اور جب مخفی طور پر (یعنی تنہائی میں) پڑھے (تو اس وقت بھی اسی خوبی کے ساتھ پڑھا کرے (جس اچھے طریقے کے ساتھ علی الاعلان پڑھا کرتا ہے) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا یہ بندہ صدق و راستی کا حامل ہے (یعنی مخلص ہے اور اس کی طاعت و عبادت ریا کاری سے پاک ہے''۔ (ابن ماجہ)

تشریح: فاحسن: یعنی خالق کے دیکھنے پر اکتفاء کر کے اپنے عمل میں حسن پیدا کرے۔

قال الله هذا عبدی: میرا یہ مخلص بندہ سچا ہے، اور اس بات سے خالی ہے کہ اس کا علانیہ طور پر عمل کرنا، نفاق کی وجہ سے ہے، اور حضور علیہ السلام نے سنن و نوافل گھر میں پڑھنے کی جو ترغیب دی ہے ممکن ہے اس میں یہی راز ہو۔

۵۳۳۰ : وَعَنْ مُعَاذِ ابْنِ جَبَلٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَكُوْنُ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ اَقْوَامٌ اِخْوَانُ الْعَلَانِيَةِ اَعْدَاءُ السَّرِيْرَةِ فَقِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ يَكُوْنُ ذٰلِكَ قَالَ بِرَغْبَةِ بَعْضِهِمْ اِلٰى بَعْضٍ وَرَهْبَةِ بَعْضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ۔

اخرجه احمد في المسند ۵/ ۲۳۵

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دور آخر میں ایسے لوگ اور جماعتیں بھی وجود میں آئیں گی جو بظاہر دوستی رکھنے والی ہونگی باطنی طور پر دشمن ثابت ہوں گے''۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ایسا کس طرح اور کس سبب سے ہو جائے گا؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس بناء پر ہوگا کہ ان میں سے بعض، بعض سے غرض و لالچ رکھیں گیا اور بعض، بعض سے خوف زدہ ہوں گے''۔

تشریح: قوله: يكون في آخر الزمان اقوام أخوان العلانية أعداء السريرة:

یعنی ظاہر میں تو دوست ہوں گے اور باطن میں دشمن ہوں گے۔ ان دونوں اوصاف کو ذکر کرنا کرنا یا یہ بغیر عطف کے ذکر خبر ثانی ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ دونوں جگہ ''فی'' مقدر ہے۔ جوہری فرماتے ہیں کہ ''سر'' پوشیدہ راز کو کہتے ہیں اور ''سریرۃ'' کا معنی بھی یہی ہے۔ حاصل یہ کہ محبت و بغض اللہ کے لئے نہیں رکھیں گے، بلکہ ان کے امور فاسد اغراض اور مقاصد کا سر پر مبنی ہونگے، چنانچہ اغراض کیلئے کبھی تو ایک گروہ سے رغبت رکھیں گے اور اُن کے ساتھ دوستی ظاہر کریں گے، اور کبھی اس گروہ سے مختلف وجوہات کی بناء پر نفرت کریں گے، اور اُن کے سامنے عداوت ظاہر کرینگے۔ اور خلاصہ یہ کہ مخلوق کی محبت و عداوت کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ ان کی محبت و عداوت اپنی اغراض و خواہشات کی بناء پر ہوتی ہے۔

۵۳۳۱ : وَعَنْ شَدَّادِ ابْنِ اَوْسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ صَلّٰى يُرَائِي فَقَدْ اَشْرَكَ . (رواهما احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۱۲۶/٤۔

ترجمہ: ''حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے' جو شخص ریا کاری کی غرض سے نماز پڑھے' اس نے درحقیقت شرک کا ارتکاب کیا' جس شخص نے دکھلانے کو روزہ رکھا اس نے شرک کیا اور جس شخص نے دکھلانے کو صدقہ خیرات کیا وہ شرک کا مرتکب ہوا''۔ دونوں روایتوں کو احمدؒ نے نقل کیا ہے''۔

تشریح: ومن صام یرائی فقد اشرك:

اس سے معلوم ہوا کہ روزہ رکھنے میں بھی ریاء کاری کو دخل ہے، بخلاف بعض حضرات کے جو روزہ سے ریاء کی نفی کرتے ہیں، اور وجہ یہ بتاتے ہیں، کہ روزہ کا مدار نیت پر ہے اور اس میں ریاء داخل نہیں ہوتا۔ اور نیت ٹھیک نہ ہونے کی صورت میں کھانا پینا چھوڑ دینے کا کوئی اعتبار نہیں۔ چونکہ ہم کہتے ہیں کہ محض ریاء تو روزہ رکھنے میں متصور نہیں ہوسکتا لیکن کبھی ریاء بطور اشتراک ہوسکتا ہے، بایں طور کہ روزہ رکھنے میں اللہ کو راضی کرنے کی نیت بھی کرے اور شہرت کی بھی یا کوئی اور غرض بھی مقصود ہو، چاہے دونوں مقصد برابر درجہ میں ہوں یا دونوں متقابل ہوں، جیسا کہ ماقبل میں حجۃ الاسلام کے کلام میں اس بات کی تفصیل گزر چکی ہے۔

۵۳۳۲ : وَعَنْهُ اَنَّـهٗ بَكٰى فَقِيْلَ لَهٗ مَا يُبْكِيْكَ قَالَ شَيْءٌ سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فَذَكَرْتُهٗ فَاَبْكَانِيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَتَخَوَّفُ عَلٰى اُمَّتِى الشِّرْكَ وَالشَّهْوَةَ وَالْخَفِيَّةَ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَتُشْرِكُ اُمَّتُكَ مِنْ بَعْدِكَ قَالَ نَعَمْ اَمَا اِنَّهُمْ لَايَعْبُدُوْنَ شَمْسًا وَلَاقَمَرًا وَلَاحَجَرًا وَلَا وَثَنًا وَلٰكِنْ يُرَاؤُوْنَ بِاَعْمَالِهِمْ وَالشَّهْوَةُ الْخَفِيَّةُ اَنْ يُّصْبِحَ اَحَدُهُمْ صَائِمًا فَتَعْرِضُ لَهٗ شَهْوَةٌ مِنْ شَهْوَاتِهٖ فَيَتْرُكُ صَوْمَهٗ. (رواه احمد والبیهقی فی شعب الایمان)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۱٤٠٦/۲ حدیث رقم ٤۲٠۵ واحمد فی المسند ۱۲٦/٤ والبیهقی فی شعب الایمان ۳۳۳/۵ حدیث رقم ٦۸۳٠

ترجمہ: ''حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ (ایک موقع پر) وہ رونے لگے' ان سے پوچھا گیا کہ چیز آپ کو رلا رہی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے اس بات نے رلا دیا ہے جسے میں نے حضور اقدس ﷺ سے سنا تھا' اس وقت مجھے وہ بات یاد آ گئی تو اس نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا ہے اور وہ بات یہ ہے کہ میں نے آپ ﷺ کو یہ بات ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے میں اپنی اُمت پر شرک (یعنی شرک خفی) اور چھپی خواہشات کا اندیشہ رکھتا ہوں''۔ حضرت شداد کا بیان ہے کہ میں نے یہ سن کر) عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ ﷺ کی امت آپ ﷺ کے بعد شرک کرنے لگ جائے گی؟ آپ ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا: ہاں! یاد رکھو' میری امت کے لوگ سورج اور چاند اور پتھر کی پرستش نہیں کریں گے اور (علی الاعلان) بتوں کی پوجا نہیں کریں گے (یعنی وہ شرک جلی میں تو نہیں مبتلا ہوں گے) لیکن لوگوں کو دکھلانے کے لئے نیک کام کریں گے (یعنی شرک خفی میں وہ مبتلا ہوں گے) اور چھپی خواہش کی حقیقت یہ ہے کہ (مثلاً) تم میں سے کوئی شخص روزہ کی حالت میں صبح کرے اور پھر اس پر نفسانی خواہشات میں سے کوئی خواہش غالب

آ جائے (جیسے کھانے کی خواہش کا غلبہ ہو جائے یا جنسی خواہش جاگ اٹھے) اور وہ (اس خواہش کے غلبہ سے مرغوب ہو کر کھانا کھا کر یا ہم بستری کر کے) اپنا روزہ توڑ ڈالے (جب کہ شرعی طور پر قابل اعتبار کسی ضرورت وحالت کے پیش آنے کے بغیر روزہ توڑنا حرام ہے)"۔ (احمد، بیہقی)

تشریح: سمعت من رسول الله: یہاں "من" اپنے اصل معنی میں مستعمل ہے۔

یقول: ای حال کو نه قائلا اس میں یک گونہ تاکید ہے۔

فابکانی: یعنی وہ بات میرے غم اور میرے رونے کا سبب بن گئی اس میں ایک قسم کا اجمال ہے اس لئے اس کی تفصیل از سرنو بیان فرمائی۔

أتخوف: امام راغب فرماتے ہیں کہ "خوف" کا معنی ہے "کسی مظنون یا معلوم علامت کی بناء پر نا گوار امر کا متوقع ہونا" اور "تخوف" کا معنی ہے انسان سے خوف وخطرہ کا ظاہر ہونا، (انتہیٰ)۔ اور بظاہر یہ "تا" مبالغہ کیلئے ہے، اور معنی یہ ہے کہ مجھے بہت زیادہ خوف ہے۔

الشرك: خفی شرک مراد ہے۔ اور ہماری اس تقدیر کی صحت پر یہ روایت دال "**اخوف ما اخاف علی امتی الاشراك**" کہ مجھے اُمت پر سب سے زیادہ جس چیز کا خوف ہے وہ اللہ کے ساتھ شرک کا ہے۔

شہوت خفیہ کا ادراک صرف اُن لوگوں کو ہوتا ہے، جو اللہ کی رضا کیلئے مجاہدے اور ریاضتیں کرتے ہیں، اور نفس کی مخالفت کرتے ہیں۔

تشرك: بصغة: مذکر ومؤنث دونوں طرح درست ہے۔

أما: تخفیف کے ساتھ تنبیہ کیلئے ہے اس بناء پر کہ شرک جلی مراد نہیں ہے۔

لا حجر اولا وثنا: یعنی نہ بُت وغیرہ کی، یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے۔

ولکن یراؤون بأعمالهم): یعنی لوگوں کو دکھلانے کے لئے ایک کام کریں گے۔ حالانکہ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿فمن كان يرجو لقاء ربه فليعمل عملاً صالحاً ولا يشرك بعبادة ربه أحدًا﴾ [الكهف: ۱۱۰] "سو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے تو نیک کام کرتا رہے، اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔"

فتعرض: راء کے کسرہ کے ساتھ، مرفوع ومنصوب دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

شهوة من شهواته: زیادہ ظاہر یہ ہے کہ شہوت خفیہ سے مراد ایک خاص نفسانی خواہش ہے، جو دوسری خواہشات کی بنسبت نادر الوقوع ہو، اور ہر وقت پیدا نہ ہوتی ہو اور اس کی طرف بالطبع میلان ہو اور انسان شریعت کی مخالفت کا لحاظ نہ رکھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لا تبطلوا أعمالكم﴾ [محمد: ۳۳] ترجمہ: "اور اپنے اعمال کو برباد مت کرو۔"

اور نفل شروع کرنے سے: مہ میں لازم ہو جاتے ہیں، اس لئے نفل کو شروع کرنے کے بعد پورا کرنا ضروری ہے۔

قوله: فیترك صومه: حالانکہ کسی ضرورت ~~مجبوری~~ کے یہ حرام ہے

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، یعنی جب انسان اللہ کی عبادتوں میں سے کسی عبادت میں مشغول ہو اور نفسانی خواہشات میں سے کوئی خواہش اس کو پیش آ جائے تو خواہش کو اللہ کے حق پر ترجیح دے کر اپنے نفس کی خواہش کا اتباع کرتا ہے، اور اسی وجہ سے ہلاکت و تباہی تک پہنچا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فأما من طغى و آثر الحياة الدنيا فان الجحيم هي المأوىٰ و أما من خاف مقام ربه و نهى النفس عن الهوىٰ فان الجنة هي المأوىٰ﴾

[النازعات۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱]

''تو جس شخص نے سرکشی کی ہوگی اور دنیوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی سو دوزخ اُن کا ٹھکانہ ہوگا، اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا، اور نفس کو خواہش سے روکا ہوگا، سو جنت اُس کا ٹھکانہ ہوگی۔'' (انتہی)

اس پر اشکال ہے اور وہ یہ کہ آیت میں ''ھویٰ'' سے مراد ظاہری شہوت ہے، جو محرمات ممنوعہ امور میں سے ہو، پھر (علامہ طیبیؒ) فرماتے ہیں، کہ اس کو ''خفی شہوت'' اس لئے کہا گیا کہ اس کی ہلاکت مخفی ہے، یا شرک سے مشاکلت کی بناء پر اس طرح کہا، اس لئے کہ اس سے مراد شرک خفی ہے، جیسا کہ اگلی حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے۔ (انتہی)۔

اس میں محل نظرات یہ ہے کہ مشاکلت کی وجہ بطور مقابلہ کے نہ مطلقاً ظاہر ہے نہ مقیداً ظاہر ہے۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں، کہ اس حدیث کو حاکم نے نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے، اور جامع میں ہے ''الشهوة الخفية و الرياء شرك۔ شہوت خفیہ اور ریاء شرک ہیں۔ اس کو طبرانی نے شداد سے اور ابن ماجہ نے ان سے نقل کیا ہے، اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

''ان اخوف ما أخاف على امتي الا شراك بالله' اما اني لست اقول يعبدون شمسا ولا قمرا ولا وثنا ولكن اعمالاً لغير الله وشهوة خفية''۔

''مجھ کو سب سے زیادہ خوف اللہ کے ساتھ شرک کرنے کا ہے (کہ وہ اللہ کے ساتھ شریک کریں گے) میں یہ نہیں کہتا کہ وہ سورج، چاند یا بت کو پوجیں گے بلکہ خوف ایسے اعمال سے ہے جو غیر اللہ کے لئے ہوں گے اور شہوت خفیہ سے ہوں گے۔''

۵۳۳۳ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَتَذَاكَرُ الْمَسِیْحَ الدَّجَّالَ فَقَالَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِمَا هُوَ اَخْوَفُ عَلَیْكُمْ عِنْدِیْ مِنَ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ فَقُلْنَا بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الشِّرْكُ الْخَفِیُّ اَنْ یَّقُوْمَ الرَّجُلُ فَیُصَلِّیْ فَیَزِیْدُ صَلَاتَهٗ لِمَایَرٰی مِنْ نَظَرِ رَجُلٍ (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۲/۱۴۰۶ حديث رقم ۴۲۰۴

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) ہم لوگ باہم میں مسیح دجال کے فتنوں اور اس کے ابتلاء کا تذکرہ کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آ کر ہمارے درمیان تشریف فرما ہو گئے اور (پھر ہماری باہمی گفتگو سن کر) فرمانے لگے کہ کیا میں تمہیں اس چیز کے متعلق آگاہ نہ کروں جو میرے نزدیک (یعنی میری شریعت اور میرے طریق کے مطابق) تمہارے حق میں مسیح دجال کے فتنہ سے بھی زیادہ خطرناک ہے (اور تمہارے لئے اس کے بارے میں ہوشیار بنا

اور اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے) ہم نے عرض کیا جی ہاں! یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کے بارے میں آپ ہماری راہنمائی فرمائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ چیز شرک خفی ہے (اور شرک خفی اس چیز کو کہتے ہیں کہ مثلاً) ایک آدمی نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور نماز ادا کرتا ہے اور اس نماز کے تمام ارکان یا بعض ارکان) میں (کیفیت یا کمیت کے اعتبار سے) غلو اور زیادتی کرنے لگتا ہے محض اس وجہ سے کوئی شخص اس کو نماز پڑھتے دیکھ رہا ہے"۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے مطلع ہونے کو کافی نہ سمجھے۔ (ابن ماجہ)

تشریح: وعن ابی سعید: الخدری، جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے۔

الا اخبر کم: ای الا اعلمکم۔ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ "الا" تنبیہ نہیں بلکہ "لا" نافیہ ہے، اور اس پر ہمزہ استفہام داخل ہوا ہے، اور پر قرینہ یہ ہے کہ سائلین کے جواب میں "بلٰی" ارشاد فرمایا ہے۔

قولہ: الا اخبر کم بما ھو اخوف علیکم عندی من المسیح الدجال: اس لئے کہ وہ عام بھی ہے اور مخفی بھی ہے۔

عن اس لئے کہ دجال کا وقت خاص ہے اور اس کا فتنہ ظاہر ہے اس لئے تم لوگوں پر (مخفی اور خوفناک چیز یعنی شرک خفی) کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

الشرك الخفي أن يقوم: ماقبل سے بدل ہے، یا تقدیری عبارت یوں ہے: "هو أن يقوم".

فیصلی: رفع ونصب دونوں درست ہیں۔

فیزید: کو بھی دونوں طرح پڑھا جاتا ہے۔

۵۳۳۴ : وَعَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِيْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمُ الشِّرْكُ الْاَصْغَرُ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الشِّرْكُ الْاَصْغَرُ قَالَ الرِّيَاءُ (رواه احمد وازاد البيهقى فى شعب الايمان يَقُوْلُ اللّٰهُ لَهُمْ يَوْمَ يُجَازِى الْعِبَادَ بِاَعْمَالِهِمْ اِذْهَبُوْا اِلَى الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُرَاءُوْنَ فِي الدُّنْيَا فَانْظُرُوْا هَلْ تَجِدُوْنَ عِنْدَهُمْ جَزَآءً اَوْ خَيْرًا۔

رواه البيهقي في شعب الايمان ٣٣٣/٥ حديث رقم ٦٨٣١۔

ترجمہ: "حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "(مسلمانو) بہت زیادہ خطرناک چیز کہ جس کے متعلق میں تمہیں خوف دلاتا ہوں شرک اصغر (چھوٹے درجہ کا شرک) ہے"۔ صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اور شرک اصغر سے کیا مراد ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب فرمایا وہ ریا کاری ہے" اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں یہ اضافی الفاظ نقل کئے ہیں کہ خدا تعالیٰ جس روز بندوں کو ان کے اعمال کی جزاء دے گا۔ (یعنی قیامت کے دن) ریا کاروں سے فرمائے گا کہ تم ان لوگوں کے پاس چلے جاؤ جن کو دکھلانے کے لئے تم عمل کرتے تھے پھر دیکھو کہ تم ان کے پاس جزاء یا بھلائی پاتے ہو؟"

تشریح: قولہ: وما أن النبی ... سئل الشرك الاصغر؟:

یہ دلیل ہے کہ شرک اصغر کی تعبیر پہلی بار اس حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

قال: الریاء: یعنی ریاء و سُمعہ کی جنس، چاہے ظاہر ہو چاہے مخفی ہو۔

یجازی: معروف کا صیغہ ہے اور "العباد"، منصوب ہے۔ اور ایک نسخہ میں " بجازی بصیغة" مجہول اور "العباد" رفع کے ساتھ منقول ہے۔ اگر عمل اچھا ہوگا تو بدلہ اچھا ہوگا' اور اگر عمل برا ہوگا تو بدلہ برا ہوگا۔

الی الذین کنتم تراؤون): یعنی عبادت کو اچھے طریقے سے ادا کرنے میں، یا اس کی اصل کی تم لوگ ان کی نظروں کی رعایت رکھتے تھے۔

قولہ: فانظرو ھل تجدون عند ھم جزاء ر خیرا؟: واؤ "او" کے معنی میں ہے، جیسا کہ ایک نسخہ میں "او" ہے، یا عطف تفسیری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

تخریج: حافظ منذریؒ فرماتے ہیں، کہ محمود بن لبید کی اس حدیث کو احمدؒ نے جید سند کے ساتھ نقل کیا ہے، اور ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے زہد وغیرہ میں نقل کیا ہے۔

۵۳۳۵ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَوْاَنَّ رَجُلاً عَمِلَ عَمَلاً فِیْ صَخْرَۃٍ لَا بَابَ لَھَا وَلَا کُوَّۃَ خَرَجَ عَمَلُہٗ اِلَی النَّاسِ کَائِنًا مَا کَانَ۔

رواہ البیھقی فی شعب الایمان ۵/۳۰۹ حدیث رقم ۶۹۴۰۔

ترجمہ: "حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی شخص کسی ایسے بڑے پتھر کے اندر بھی کوئی نیک کام کرے کہ جس میں نہ تو کوئی دروازہ ہو اور نہ کوئی طاق (کھڑکی یا روشن دان) ہو تو اس کا وہ عمل خواہ کیسا ہی ہو لوگوں پر عیاں ہو کر رہے گا"۔

تشریح: فی صخرة: یعنی بالفرض ایک سخت چٹان کے اندر یا پہاڑ کے کسی غار میں۔

لا کوة: کاف کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ضمہ بھی جائز ہے، اور واؤ کی تشدید کے ساتھ، روشندان کو کہتے ہیں۔ کہ کاف کے فتحہ کے ساتھ اُس سوراخ کو کہتے ہیں جو دیوار کے آر پار نہ ہو یعنی جو (ایک طرف سے بند ہو) اور اگر کاف کا ضمہ ہو، تو اُس سوراخ کو کہتے ہیں جو آر پار ہو (یعنی جو دونوں طرف سے کھلا سوراخ ہو)۔ پس اول (معنی مراد لینا) اولیٰ ہے اس لئے کہ مبالغہ میں یہ اعلیٰ ہے۔

"کائنا"، حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے: ای حال کون ذلك العمل: یعنی اس حال میں کہ وہ عمل خواہ یعنی قول و فعل کسی طرح کا بھی ہو، چاہے اچھا ہو یا بُرا ہو۔ اور ایک نسخہ میں ہے "من کان" ہے۔ چنانچہ تقدیر یہ ہوگی "کائناً ذالك العامل من کان" او کائنا صاحب العمل من کان یعنی چاہے اُس عمل کے ظاہر ہونے کا ارادہ کیا ہو چاہے نہ کیا ہو' کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿واللہ مخرج ما کنتم تکتمون﴾ [البقرۃ: ۷۲] "اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا منظور تھا جس کو تم مخفی رکھنا چاہتے تھے۔"

۵۳۳۶ : وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَتْ لَهُ سَرِيْرَةٌ صَالِحَةٌ اَوْ سَيِّئَةٌ اَظْهَرَ اللّٰهُ مِنْهَا رِدَاءً يُعْرَفُ بِهِ ۔

رواه البيهقي في شعب الايمان ٣٥٩/٥ حديث رقم ٦٩٤٢۔

''حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص کے اندر کوئی نیک یا بد عادت یا خصلت پوشیدہ ہوتی ہے تو حق تعالیٰ شانہ اس عادت وخصلت کو نمایاں کر دینے والی کوئی ایسی چیز پیدا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے اس شخص کی اس عادت وخصلت کے ساتھ شناخت کر لی جاتی ہے''۔

من كانت :مؤنث کے صیغہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں ''من كان'' ہے۔

اس کے ذریعے دوسروں سے ممتاز ہوگا جیسا کہ چادر کی وجہ سے شخص کا سردار قوم ہونا اور مددگار قوم ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔

۵۳۳۷ : وَعَنْ عُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا اَخَافُ عَلٰى هٰذِهِ الْاُمَّةِ كُلَّ مُنَافِقٍ يَتَكَلَّمُ بِالْحِكْمَةِ وَيَعْمَلُ بِالْجَوْرِ ۔ (رواه البيهقي الاحاديث الثلثة في شعب الايمان)

رواه البيهقي في شعب الايمان ٢٨٤/٢ حديث رقم ١٧٧٧

ترجمہ:''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں اس اُمت (یعنی امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں جس چیز کا اندیشہ رکھتا ہوں وہ ہر منافق (یعنی ریا کار یا فاسق) کا شر ہے جو گفتگو تو علم وحکم اور موعظت ونصیحت کی کرتا ہے لیکن عمل ظلم وناانصافی پر مبنی کرتا ہے''۔ ان تینوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: هذه الامة اُمت اجابت مراد ہے۔

كل: نصب کے ساتھ ہے۔ معنوی اعتبار سے عبارت یوں ہے: ما أخاف عليهم الاشر كل منافق. اور منافق سے مراد ریاء کار یا فاسق ہے۔

ويعمل بالجور: ظلم اور برائی کرتا ہے، اور استقامت کے راستے سے عدول کرتا ہے، اور علامہ طیبیؒ نے مستبعد کلام کیا ہے) وہ فرماتے ہیں: ''كل منافق'' کا مجرور ہونا اس بناء پر کہ ''هذهِ الأمة'' سے بدل ہو بھی درست ہے، چونکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ تقدیر عبارت یوں ہے: ''ما أخاف الا على كل منافق''. اور اس کے حاصل معنی کا فساد مخفی نہیں ہے، چاہے اس کو بدل الکل بنایا جائے یا بدل البعض، کیونکہ ''مبدل منه'' کا نظر انداز ہونا لازم آئے گا، اور ''بدل'' مہتم بالشان ہو جائے گا۔ مزید کہ ''اخاف عليهم من النفاق'' سے استدراک کا فائدہ حاصل نہ ہوگا، کیونکہ یہ معنی نفس الامر میں بالاتفاق صحیح ہے۔ (تو استدراک چہ معنی دارد)۔

۵۳۳۸ : وَعَنِ الْمُهَاجِرِبْنِ حَبِيْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنِّي لَسْتُ كُلَّ كَلَامِ الْحَكِيْمِ اَتَقَبَّلُ وَلٰكِنِّي اَتَقَبَّلُ هَمَّهُ وَهَوَاهُ فَاِنْ كَانَ هَمُّهُ وَهَوَاهُ فِي طَاعَتِي جَعَلْتُ صَمْتَهُ حَمْدًا لِّيْ وَوَقَارًا وَّاِنْ لَّمْ يَتَكَلَّمْ ۔ (رواه الدارمي)

اخرجه الدارمي في السنن ۹۱/۱ حديث رقم ۲۵۲۔

ترجمہ: ''حضرت مہاجر بن حبیب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں عقلمند کی تمام گفتگو کو نہیں لیتا (یعنی دانا و عقلمند صاحب علم و صاحب انسان کی ہر بات کو قبول کرنا میرا شیوہ اور دستور نہیں ہے) بلکہ میں اس کے نیت ارادہ اور محبت کو قبول کرتا ہوں (یعنی یہ غور کرتا ہوں کہ اس نے جو بات کہی ہے اس کے کہنے کا مقصد وارادہ کیا ہے) پس اگر اس کی خواہش میری طاعت وفرمانبرداری کی ہوتی ہے تو میں اس کی خاموشی کو (بھی) اپنی مدح وثنا اور اس کے حلم ووقار کے مرادف قرار دیتا ہوں اگر چہ وہ کوئی کلام نہ کرے۔ (دارمی)

تشریح: قوله: انی لست کل کلام الحکیم اتقبل:

لیس کی خبر''اتقبل'' کا مفعول مقدم ہے۔ا

اسلئے کہ میں اقوال اور زبان کی حرکت کو نہیں دیکھتا، بلکہ احوال اور دِل کے ارادہ کو دیکھتا ہوں اور یہی معنی ہے اگلے جملہ کا۔

قوله: ولکنی اتقبل همه وهواه: یعنی اس کی نیت اگر چہ ارادہ کے مراتب میں سے پہلے مرتبہ کی ہو۔

یعنی آخر میں جو پختہ ارادہ ہوتا ہے، اس لئے کہ مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے، یہاں تک کہ طول امل پر بھی اجر ملتا ہے اگر چہ موت کے بعد ہو۔

قوله: فان کان همه وهواه في طاعتي...... :اور اس کا مفہوم (یعنی مفہوم مخالف) یہ ہے کہ اگر اس کا ارادہ وقصد میری معصیت یعنی مخالفت میں ہو میں اس کے کلام کو گناہ قرار دیتا ہوں، اگر چہ وہ (میری) تعریف کرے اور علم وذکر ظاہر کرے۔

بَابُ الْبُكَاءِ وَالْخَوْفِ

رونے اور خوفزدہ ہونے کا بیان

''بکاء'' اور ''خوف'' دونوں کو ایک باب میں اس لئے جمع کیا کہ عموماً دونوں ایک دوسرے کو لازم ہوتے ہیں۔ اور ''بکاء'' (رونا) کو مقدم کیا، اگرچہ اس کا سبب خوف ہے، اس لئے کہ پہلے رونا ظاہر ہوتا ہے یا خوف سے تعمیم مراد ہے، چنانچہ ''بکاء'' کے بعد ''خوف'' کا ذکر بمنزلہ تعمیم کے ہوگا۔

البکاء قصر کے ساتھ، اس کا معنی ہے ''غم کے ساتھ آنسو کا نکلنا'' اور مد کے ساتھ اس کا معنی ہے آنسو کا نکلنا اس طرح کہ آواز بھی ساتھ بلند ہو۔ (کذا قیل) اور مد کے ساتھ زیادہ مشہور ہے اور بظاہر اس سے مراد عام معنی ہے، چنانچہ ایک معنی سے ''تجرید'' زیادہ بہتر ہے۔

الفصل الاول:

۵۳۳۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ اَبُو الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا وَلَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۱۹/۱۱ حدیث رقم ٦٤٨٥ ومسلم فی صحیحه ٦١٨/٢ حدیث رقم (١-١٠٩) والترمذی فی السنن ٤٨١/٤ حدیث رقم ٢٣١٣ وابن ماجه ١٤٠٢/٢ حدیث رقم ٤١٩١ والدارمی فی السنن ٣٩٦/٢ حدیث رقم ٢٧٣٥ ومالك فی الموطأ ١٨٦/١ حدیث رقم ١ من کتاب الصلاة واحمد فی المسند ٢٥٧/٢

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ سیدنا ابوالقاسم (محمد) صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم اس چیز سے آگاہ ہو جاؤ جس کو میں جانتا ہوں تو یقیناً تم زیادہ رونے اور کم ہنسنے لگو''۔ (بخاری)

تشریح: ما أعلم: یعنی نافرمانوں کے لئے اللہ کی سزا اور قیامت کے دن نافرمانوں کے ساتھ سخت مناقشہ اور باطنی احوال کا انکشاف اور نیتوں کی برائی۔

لبکیتم: جواب قسم ہے اور ''لو'' کے جواب کا قائم مقام ہے۔

كثيرا (یہ مفعول مطلق کی صفت ہے یا مفعول فیہ کی صفت ہے)اى بكاء اكثرا أو زمانا كثيرا۔ یعنی: بہت زیادہ روتے یا طویل زمانے تک روتے، یعنی اللہ کی خشیت کو امید پر ترجیح دیتے ہوئے اللہ کی خشیت سے یا بُرے خاتمہ کے خوف سے۔

یہ حدیث اقتباس ہے اس ارشاد باری تعالیٰ سے:﴿فليضحكوا قليلاً وليبكوا كثيرًا﴾ [التوبة۔۸۲] ''سو تھوڑے دنوں دنیا میں ہنس لیں، اور بہت دنوں آخرت میں روتے رہیں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں، کہ یہ حدیث ان رازوں میں سے ایک راز ہے جو اللہ نے حضور علیہ السلام کے قلب مبارک میں محفوظ فرمائے تھے، اور اس راز کو افشاء کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ ایسی مبارک ہستیوں کے سینے رازوں کے خزانے ہوتے ہیں، بلکہ حضور علیہ السلام نے یہ اس لئے فرمایا کہ صحابہ میں رونے کی صفت پیدا ہو، کیونکہ جب دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے زندہ ہوتا ہے، تو اس زندہ دل کے درخت کا ثمرہ یہ ہوتا ہے، کہ انسان روتا ہے، اور یہ رونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ انسان اللہ کی عظمت، ہیبت اور جلال سے متاثر ہے، اور زیادہ ہنسنا ان صفات سے دل کے خالی ہونے کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا درحقیقت حضور علیہ السلام نے انسانوں کو زندہ دل طلب کرنے کی ترغیب دی ہے، اور غافل دل سے پناہ مانگنے کی ترغیب دی ہے۔

تخریج: ترمذی اور نسائی نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے، (ذکرہ میرکؒ) ہے۔ اور جامع میں ہے کہ اس حدیث کو احمد، شیخین، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت انسؓ سے نقل کی ہے۔ اور حاکمؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کی ہے۔ اور ضیاء نے اُبو ذرؓ سے نقل کیا ہے اور اس میں یہ زیادتی بھی ہے:''ولما ساغ لكم الطعام والشراب''.

اس حدیث کو طبرانی، حاکم اور بیہقی نے حضرت اُبو درداءؓ سے نقل کیا ہے اور اُسکے الفاظ یہ ہیں:''لو تعلمون ما اعلم لبكيتم كثيرا ولضحكتم قليلا ولخرجتم الى الصعدات تجأرون الى الله لا تدرون تنجون اولا تنجون''.

اور دوسری فصل میں یہ حدیث تفصیل کے ساتھ ذکر کی جائے گی۔

نقل کیا گیا ہے کہ ایک منادی آسمان سے نداء کرتا ہے:''کاش! یہ مخلوق پیدا نہ ہوتی اور اگر پیدا ہوتی تو کاش کہ انہیں معلوم ہوتا کس مقصد کیلئے ان کو پیدا کیا گیا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق کے بارے میں منقول ہے کہ عذاب کے خوف سے فرمایا کرتے تھے کہ کاش! میں گھاس ہوتا، جس کو جانور کھا جاتا۔

حضرت عمر کے بارے میں منقول ہے، کہ انہوں نے ایک شخص کو یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا:

﴿هل أتى على الانسان حين من الدهر لم يكن شيئًا مذكورًا﴾ [الانسان۔۱] :''بے شک انسان پر زمانہ میں ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے، جس میں وہ کوئی چیز قابل تذکرہ نہ تھا۔''

یہ سن کر فرمانے لگے کہ کاش! کہ معاملہ اس وقت ختم ہو جاتا، بلکہ ایک روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:ليت رب محمد لم يخلق محمدًا ''کاش! محمد کا ربّ، محمد کو پیدا ہی نہ کرتا''۔

فضیلؒ کے بارے میں منقول ہے کہ مجھے کسی مقرب فرشتہ، کسی مقرب نبی اور کسی نیک بندے پر رشک نہیں آتا، کیا انہوں

نے قیامت کے دن کا سامنا نہیں کرنا؟ مجھے اس پر رشک آتا ہے، جو پیدا ہی نہیں ہوا۔"

۵۳۴۰ : وَعَنْ اُمِّ عَلَاءِ الْاَنْصَارِيَّةِ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ لَا اَدْرِیْ وَاَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ مَا يُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۲/۴۱۰ حدیث رقم ۷۰۱۸۔

ترجمہ: "حضرت ام العلاء انصاریہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا: باوجودیکہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں لیکن اللہ کی قسم یہ نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا"۔ (بخاری)

تشریح: **واللہ لا ادری:** اور ایک نسخہ میں "**واللہ لا ادری**" تکرار کے ساتھ آیا ہے۔

وانا رسول اللہ: جملہ حالیہ ہے۔

ما یفعل بی ولا بکم: "**لا ادری**" کا مفعول ہے، اور "**لا**" کو مزید تاکید کیلئے داخل کیا گیا ہے، تاکہ نفی ہر ایک فریق کو علیحدہ شامل ہو جائے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں کئی توجیہات ہیں، ایک توجیہ یہ ہے کہ یہ بات حضور علیہ السلام نے اس وقت فرمائی تھی، جس وقت حضرت عثمان بن مظعونؓ کی فوتگی پر ایک عورت نے یہ کہا تھا "تجھے جنت مبارک ہو"۔ اس لئے حضور علیہ السلام نے ڈانٹتے ہوئے یہ بات ارشاد فرمائی تھی۔ اس عورت نے غیبی واقعہ کا حکم لگا کر بے ادبی کی اور اس کی نظیر حضور علیہ السلام کا حضرت عائشہؓ سے یہ ارشاد فرمانا ہے، جس وقت عائشہؓ نے یہ کہا **طوبی لهذا عصفور من عصافیر الجنة** خوشخبری ہو اس کیلئے جنت کے پرندوں میں سے ایک پرندہ ہے۔

میں کہتا ہوں یہ بات مخفی نہیں کہ یہ اس حدیث کے وارد ہونے کا سبب اور اس حدیث کے ورود کا زمانہ ہے اس حدیث کے معنی پر وارد ہونے والے اشکال کو زائل کرنے میں اس کا کوئی دخل نہیں۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہ قول اس ارشاد باری سے منسوخ ہے: ﴿**لیغفر لك اللہ ما تقدم من ذنبك وما تأخر**﴾ [الفتح ۔۲] "تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرما دیں۔" جیسا کہ ابن عباسؓ نے اس ارشاد باری: [**وما ادری مایفعل بی ولا بك**] [الاحقاف :۹] کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

اگر میں کہتا ہوں' یہ محل اشکال ہے' وہ یوں کہ ناسخ کی تاخیر صحیح طور پر ثابت ہو بھی جائے تو نسخ احکام میں ہوتا ہے، اخبار میں نہیں ہوتا۔ جیسا کہ یہ بات اصول میں موجود ہے۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ تفصیلی احوال کی نفی ہو، اجمالی احوال کی نفی نہ ہو۔

یہی احتمال صحیح ہے۔

رکھنا چوتھی توجیہ یہ ہے کہ سبب ورود سے قطع نظر یہ حکم دنیاوی امور کے ساتھ خاص ہے۔ اھ میں کہتا ہوں یہ توجیہ ماقبل کے تحت داخل ہے۔ اور حکم کو عام رکھنا زیادہ مناسب ہے۔

آپ ﷺ کیلئے دنیوی امور سے ~~مراد بھوک پیاس~~، سیرابی، شکم سیری، مرض، صحت، فقر اور غنی ہیں، اور یہی حال امت

کا ہے۔

بعض نے یہ مطلب ذکر کیا ہے کہ ''کیا مجھے میرے وطن سے نکال دیا جائے گا، یا شہید کر دیا جائے گا؟ جیسا کہ پہلے انبیاء کے ساتھ ہوا، اور کیا تم لوگ پتھر مار مار کر ہلاک کر دیئے جاؤ گے، یا زمین میں دھنسا دیا جائے گا؟ حاصل یہ کہ حضور علیہ السلام کا مقصود اپنی ذات سے علم غیب کی نفی کرنا تھا، کہ مجھے پوشیدہ باتوں کا علم نہیں ہے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ اس حدیث کو اور اس کے ہم معنی دیگر احادیث کو اس معنی پر محمول کرنا جائز نہیں ہے، کہ حضور علیہ السلام اپنی عاقبت کے بارے میں متردد تھے، اور اللہ کے ہاں موجود اپنے بہترین ٹھکانہ اور انعام کا یقین نہیں تھا، کیونکہ حضور علیہ السلام سے ایسی صحیح احادیث منقول ہیں جس سے یہ عذر منقطع ہو جاتا ہے اور اس معنی پر کس طرح محمول کیا جا سکتا ہے جبکہ حضور علیہ السلام نے ہی اللہ کی طرف سے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے مقام محمود کا وعدہ کیا ہے، اور یہ اعلان کیا ہے کہ اللہ کے ہاں ساری مخلوق میں مکرم آپ ﷺ ہیں، اور سب سے پہلے قیامت کے دن آپ ﷺ ہی سفارش کرینگے، اور آپ ﷺ کی سفارش پہلے قبول کی جائے گی وغیرہ وغیرہ۔

۵۳۴۱ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُرِضَتْ عَلَيَّ النَّارُ فَرَاَيْتُ فِيْهَا امْرَاَةً مِنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ تُعَذَّبُ فِيْ هِرَّةٍ لَهَا رَبَطَتْهَا فَلَمْ تُطْعِمْهَا وَلَمْ تَدَعْهَا تَاْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْاَرْضِ حَتّٰى مَاتَتْ جُوْعًا وَرَاَيْتُ عَمْرَو ابْنَ عَامِرِ الْخُزَاعِيَّ يَجُرُّ قُصْبَهُ فِي النَّارِ وَكَانَ اَوَّلَ مَنْ سَيَّبَ السَّوَائِبَ (رواه مسلم)

اخرجه البخاري في صحيحه ٥١٥/٦ حديث رقم ٣٤٨٢ ومسلم في صحيحه ٦٢٢/٢ حديث رقم (٩-٩٠٤) والنسائي ١٣٧/٣ حديث رقم ١٤٨٢ واحمد في المسند ٣٣٥/٣۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (معراج کی رات میں یا اور کسی موقعہ پر حالت خواب یا بیداری ہی میں) میرے سامنے جہنم کی آگ (دکھانے کے لئے) پیش کی گئی تو میں نے اس میں بنی اسرائیل کی ایک خاتون کو (جلتے ہوئے) دیکھا (جس کا شمار بنی اسرائیل کے مومنین میں ہوتا تھا) اس کو ایک بلی کی وجہ سے مبتلائے عذاب کیا جا رہا تھا جس کو اس نے باندھ رکھا تھا نہ تو خود اس کو کچھ کھلایا پلایا کرتی تھی اور نہ اس کو کھول کر چھوڑتی تھی کہ وہ (چل کر) حشرات الارض (یعنی چوہوں وغیرہ) میں سے کچھ کھالے اور بالآخر وہ بلی بھوک سے دوچار ہو ہو کر مر گئی۔ نیز میں نے دوزخ میں عمرو بن عامر خزاعی کو بھی دیکھا جو اپنی انتڑیوں کو دوزخ کی آگ میں گھسیٹ رہا تھا یہ وہ سب سے پہلا شخص تھا جس نے (بتوں کے نام) اونٹنی چھوڑنے کی رسم ایجاد کی تھی''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: عرضت علي النار--- حتى ماتت جوعا:

تعذب في هرة: (''في'' تعلیلیہ ہے۔) اي في شأن هرة و لأجلها اور ایک صحیح نسخہ میں ''في هرة لها'' کے الفاظ ہیں۔

ربطتها: جملہ مستانفہ مبینہ ہے۔

تاکل: رفع کے ساتھ ہے اور یہ جملہ حال ہے۔

خشاش: خاء کے فتحہ کے ساتھ اور خاء کو مکسور و مضموم بھی پڑھا جاتا ہے۔ چنانچہ قاموس میں لکھا ہے "الخشاش" تینوں حرکات کے ساتھ، اس کا معنی ہے زمین کے کیڑے مکوڑے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں، کہ یہ لفظ "خاء معجمہ" کے فتحہ کسرہ اور ضمہ تینوں کے ساتھ درست ہے۔ لیکن فتحہ زیادہ واضح ہے۔ نہایہ میں ہے کہ اس کو بغیر نقطہ والی حاء کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے، جس کا معنی ہے خشک پودے۔ یہ ان کا صرف وہم ہے۔

قوله: ورأيت عمرو بن الخزاعي يجر قصبه في النار:

الخزاعی: خائے معجمہ کے ضمہ کے ساتھ ایک مشہور قبیلہ ہے، بنو خزاعہ کی طرف منسوب ہے۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے مکہ میں بتوں کی عبادت شروع کی اور بتوں کا تقرب حاصل کرنے کیلئے نذر کی اونٹنی آزاد کیلئے چھوڑنے کی رسم پر مکہ والوں کو آمادہ کیا۔ ایک رسم تھی کہ اونٹنی کو کھلا چھوڑ دیتے تھے، اور وہ اونٹنی جہاں چاہتی، وہاں چرتی اور اس کو نہ کسی حوض سے روکا جاتا تھا، اور نہ کسی چارہ سے اور نہ کوئی اس پر سواری کرتا اور نہ کوئی اس پر سامان لادتا، اور اسی طرح غلاموں سائبہ بناتے تھے، کہ غلاموں کو آزاد کر کے چھوڑ دیتے تھے اس کا ولاء اس کے آزاد کرنے والے کو نہ ملتا تھا اس غلام کو سائبہ کہتے تھے۔

قصبۃ: "قاف" کے ضمہ کے ساتھ اور "صاد" کے سکون کے ساتھ

شاید حضور علیہ السلام پر جہنم کے تمام احوال یعنی آنتوں کو کھینچنا وغیرہ منکشف ہو گئے ہوں، کیونکہ اس شخص نے اپنی طرف سے ایک بدعت جاری کی۔ جس کے ذریعے اپنی مجرم قوم کو بت پرستی کے جرم کی طرف کھینچ کر لے گیا۔

قوله: وكان اول من سيب السوائب:

" سوائب" سائبہ کی جمع ہے۔ سائبہ اُس اونٹنی کو کہا جاتا تھا جس کو کوئی شخص آزاد چھوڑ دیتا تھا جو بیماری سے تندرست ہو جاتا، یا جو سفر سے واپس آتا، تو کہتا کہ میری اونٹنی سائبہ ہے، چنانچہ اس کو نہ تو کسی چراگاہ سے روکا جاتا، نہ کسی حوض سے پانی پینے سے روکا جاتا' نہ کسی چارہ کھانے سے روکا جاتا' نہ اُس پر سامان اٹھایا جاتا' نہ اس پر سواری کی جاتی' نہ اس کا دودھ دوہا جاتا۔ وہ یہ سب کچھ اپنے بتوں کا تقرب حاصل کرنے کیلئے کرتے تھے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ سائبہ اُس اونٹنی کو کہا جاتا تھا جو مسلسل دس (۱۰) مادہ بچے جنتی تھی۔

قوله: رواه مسلم:

یعنی ایک طویل حدیث میں جو صلاۃ الکسوف کے ذکر کو بھی متضمن ہے جابرؓ سے نقل کیا ہے۔ اور حدیث "ہرۃ" کو ابن عمرؓ اور ابو ہریرۃؓ سے، امام مسلم اور امام بخاری دونوں نے نقل کیا ہے۔ اور اس میں عمرو بن عامر کا ذکر نہیں ہے لیکن عمرو کے واقعہ کو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے دونوں نے نقل کیا ہے (اسی طرح میرکؒ نے تصحیح سے نقل کیا ہے۔)

جامع میں ہے: "رأيت عمرو بن عامر الخزاعي يجر قصبه في النار' وكان اول من سيب السوائب بحر البحائر يعني اذا نتجت الناقة [illegible] بحروا اذنها اي شقوها وخلوا سبيلها فلا تركب ولا

تحلب''

۵۳۴۲ : وَعَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَيْهَا يَوْمًا فَزِعًا يَقُوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ مِثْلُ هٰذِهٖ وَحَلَّقَ بِاِصْبَعَيْهِ الْاِبْهَامِ وَالَّتِيْ تَلِيْهَا قَالَتْ زَيْنَبُ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفَنَهْلِكُ وَفِيْنَا الصَّالِحُوْنَ قَالَ نَعَمْ اِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۸۱/٦ حدیث رقم ۳۳٤٦ ومسلم فی صحیحه ۲۲۰۸/٤ حدیث رقم (۲۸۸/۲) والترمذی فی السنن ٤۱٦/٤ حدیث رقم ۲۱۸۷ وابن ماجه ۱۳۰۵/۲ حدیث رقم ۳۹۵۳ و الحاکم فی الموطأ ۹۹۱/۲ حدیث رقم ۲۲ من کتاب الکلام واحمد فی المسند ۳۹۰/۲

ترجمہ: ''حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں ایسے حال میں تشریف لائے کہ جیسے بہت گھبراہٹ طاری ہو۔ پھر ارشاد فرمانے لگے: ''اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں (یعنی جو لائق عبادت ہو)۔ افسوس صد افسوس عرب کے اس شر وفتنہ پر' جو اپنی ہلاکت آفرینی کے ساتھ نزدیک آ چکا ہے۔ آج یاجوج ماجوج کی دیوار میں اتنا سا سوراخ ہو چکا ہے۔ یہ کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیوں یعنی انگوٹھے اور اس کے ساتھ والی انگلی یعنی انگشت شہادت سے حلقہ بنایا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ میں نے عرض کیا ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم اس صورت میں بھی ہلاک کر دیئے جائیں گے جب کہ ہمارے درمیان صالح و پاکباز لوگ موجود ہوں گے؟ (کیا ہمارے درمیان خدا کے ایسے لوگوں کے وجود بابرکت کے باعث فتنوں کے پھیلنے اور بلاء آفات کے نزول کا سدباب نہیں ہو سکے گا؟) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں! تمہارے درمیان علماء اور بزرگان دین کی موجودگی کے باوجود تم ہلاکت وتباہی سے دوچار ہو گے جب کہ فسق وفجور کی کثرت ہوگی (یعنی جب معاشرہ میں طرح طرح کی برائیاں جنم لیں گی اور ہر طرف فسق و فجور کا دور دورہ ہوگا تو ان برائیوں اور فسق وفجور کے سبب نازل ہونے والے فتنہ وآلام اور آفات کو صلحاء) اور بزرگوں کی موجودگی اور ان کی برکت بھی نہیں روک سکے گی''۔ (بخاری ومسلم)

راوی حدیث:

زینب بنت جحش۔ یہ زینب ... کی بیٹی امہات المؤمنین میں سے ہیں۔ ان کی والدہ کا نام ''امیہ'' ہے جو ''عبدالمطلب'' کی بیٹی ہیں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی ہیں۔ زید بن حارثہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ تھے۔ ان کی بیوی تھیں پھر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ان کو طلاق دے دی تھی۔ اس کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۵ ھ میں ان سے نکاح کر لیا تھا۔ یہ زینب تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلے انتقال کرنے والی ہیں۔ ان کا پہلا نام ''برہ'' تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام ''زینب'' رکھا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کی شان میں فرماتی ہیں ''کوئی عورت ان (زینب رضی اللہ عنہا) سے بہتر دین میں نہیں ہے یہ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والی ہیں اور سب سے زیادہ سچ بولنے والی ہیں' سب سے زیادہ پاس قرابت رکھنے والی ہیں' سب سے زیادہ صدقات دینے والی ہیں اور ان تمام کاموں میں جن میں اللہ کا قرب حاصل کرنے

کے لیے جان کام آسکتی ہے سب سے زیادہ جان لڑانے والی ہیں ۲۰ھ میں مدینہ میں وفات پائی اور بعض نے کہا ہے کہ ۲۱ھ میں وفات پائی۔ عمر تریپن (۵۳) سال کی پائی۔ حضرت عائشہ اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہما وغیرہ ان سے روایت حدیث کرتی ہیں۔

تشریح: فزاعًا: فاکے فتحہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ۔ بمعنی خائف

قاموس میں ہے کہ "الویل" کا معنی ہے "برائی کا آنا"۔ یہ کلمہ افسوس کیلئے استعمال کیا جاتا ہے، انتہی۔ عرب کا ذکر بطور خاص اس لئے فرمایا کہ اس وقت سب سے زیادہ عرب لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

یا جوج ماجوج :الف اور ہمزہ کے ساتھ دونوں کو غیر منصرف بھی پڑھا جاتا ہے۔

"ردم" دیوار ہے۔ اس میں اسم اور مصدر دونوں برابر ہیں، اور یہ وہی دیوار ہے جس کو ذوالقرنین نے تعمیر کیا تھا۔

مثل: "فتح" کے لئے نائب فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے اور اشارہ اس حلقہ کی طرف ہے جس کا ذکر اگلے جملہ (وحلق باصبعیه) میں ہے۔

حلق: لام کی تشدید کے ساتھ۔ حلقہ بنانا

"الابهام": "حلق" کا مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے یا "أعني" مقدر ہے۔ "اصبعين" تفسیر ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور دونوں "بدل" ہونے کی وجہ سے مجرور پڑھنا بھی جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تک اس دیوار میں سوراخ ہو گیا۔ اور جب یہ سوراخ وسیع ہو جائے گا، تو یاجوج ماجوج نکل آئیں گے، اور یاجوج وماجوج کا نکلنا دجال کے نکلنے کے بعد ہوگا، جیسا کہ آرہا ہے۔ اور یاجوج ماجوج انسانوں کی دو مختلف جنسیں ہیں۔ ترک قبیلہ سے ہیں، اور کافر ہیں۔

فنهلك: اهلاك، مصدر سے ماخوذ ہے اور بصیغہ مجہول ہے اور ایک صحیح نسخہ میں نون کے فتحہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

وفينا الصالحون: جملہ حالیہ ہے ای أنعذب فنهلك نحن معشر الأمة 'والحال أن بعضنا مؤمنون وفينا الطيبون الطاهرون اور یہ بھی ممکن ہے کہ بر تقدیر استغناء یا اکتفاء کے باب سے ہو "وفينا الصالحون ومنا القاسطون"۔

الخبث: "خا" اور "با" کے فتحہ کے ساتھ' فسق وفجور اور شرک وکفر۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی "زنا" بتایا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ جب آگ کسی جگہ میں لگتی ہے اور اچھی طرح بڑھ جاتی ہے تو خشک وتر دونوں کو جلا کر رکھ دیتی ہے، اور پاک وناپاک پر غالب آتی ہے۔ اور مومن ومنافق' موافق ومخالف کسی میں فرق نہیں کرتی، اور عنقریب آئے گا: ان الله اذا انزل بقوم عذابا أصاب العذاب من كان فيهم ثم بعثوا على أعمالهم۔ اور ایک صحیح نسخہ میں "خبث" خاء کے ضمہ اور باء کے سکون کے ساتھ ہے' جس کا معنی ہے فواحش' فسوق یا دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔

تخریج: اس حدیث کو ابوداؤد اور حاکم نے ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے اور الفاظ یہ ہیں:

"ویل للعرب من شر قد اقترب قد افلح من كف يده"۔

۵۳۴۳ : وَعَنْ اَبِیْ عَامِرٍ اَوْ اَبِیْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَيَكُوْنَنَّ مِنْ اُمَّتِیْ اَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّوْنَ الْخَزَّ وَالْحَرِيْرَ وَالْخَمْرَ وَالْمَعَازِفَ وَلَيَنْزِلَنَّ اَقْوَامٌ اِلٰى

جَنْبِ عَلَمٍ يَرُوْحُ عَلَيْهِمْ بِسَارِحَةٍ لَهُمْ يَاتِيْهِمْ رَجُلٌ لِحَاجَةٍ فَيَقُوْلُوْنَ ارْجِعْ اِلَيْنَا غَدًا فَيُبَيِّتُهُمُ اللّٰهُ وَيَضَعُ الْعَلَمَ وَيَمْسَخُ اٰخَرِيْنَ قِرَدَةً وَخَنَازِيْرَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (رواه البخاری وَفِىْ بَعْضِ نُسَخِ الْمَصَابِيْحِ الْحِرِ بِالْحَاءِ وَالرَّاءِ الْمُهْمَلَتَيْنِ وَهُوَ تَصْحِيْفٌ وَاِنَّمَا هُوَ بِالْخَاءِ وَالزَّاءِ الْمُعْجَمَتَيْنِ نَصَّ عَلَيْهِ الْحُمَيْدِىُّ وَابْنُ الْاَثِيْرِ فِىْ هٰذَا الْحَدِيْثِ وَفِىْ كِتَابِ الْحُمَيْدِىِّ عَنِ الْبُخَارِىِّ وَكَذَا فِىْ شَرْحِهِ الْخِطَابِىُّ تَرُوْحُ عَلَيْهِمْ سَارِحَةٌ لَهُمْ يَاتِيْهِمْ لِحَاجَةٍ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی ۱۰/۵۱ حدیث رقم ۵۵۹۰ وابوداؤد فی السنن ۳۱۹/٤ حدیث رقم ٤٠٣٩

ترجمہ: ''حضرت ابو عامر رضی اللہ عنہ یا حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے (یعنی ابو عامر رضی اللہ عنہ یا ابو مالک رضی اللہ عنہ نے) بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: میری امت میں کچھ ایسے لوگ اور طبقے بھی جنم لیں گے جو ریشمی کپڑے کو اور شراب کو اور باجوں کو حلال جائز سمجھا کریں گے اور ان میں سے کچھ لوگ بلند پہاڑ کے پہلو میں قیام کریں گے'' یعنی وہ ایسی جگہوں پر رہائش اختیار کریں گے جو بلند و ممتاز اور نمایاں ہوں گے اور ان کی یہ ممتاز و نمایاں حیثیت دیکھ کر فقیر و مفلس لوگ اپنی ضروریات و حاجات لے کر ان کے پاس آیا کریں گے) رات کو ان کے جانور (جو چرنے کے لئے گئے ہوں گے) سیر ہو کر لوٹا کریں گے اور ان جانوروں کا چرانے والا ان کو دودھ سے بھرا ہوا لے کر آئے گا لیکن جب کوئی شخص (محتاج) اپنی حاجت لے کر ان کے پاس آئے گا (اور یہ آرزو ظاہر کرے کہ ان مویشوں کے دودھ کا کچھ حصہ ضرورت و حاجت پورا کرنے کے لئے اس کو دیدیا جائے) تو وہ اس کو یہ کہہ کر ٹال دیں گے کہ کل ہمارے پاس آنا اور پھر راتوں رات اللہ تعالیٰ ان پر اپنا عذاب اس طرح نازل کرے گا کہ ان میں سے بعض پر تو پہاڑ کی چوٹی الٹ دے گا (تاکہ وہ اس کے نیچے دب کر تباہ و ہلاک ہو جائیں اور ان کا نام و نشان تک بھی مٹ جائے اور باقی لوگوں کی صورتیں مسخ کر کے بندر اور سور بنا دے گا جو قیامت تک اسی شکل و صورت میں رہیں گے یا یہ کہ اس طرح کے بدکار لوگوں پر جو بھی عذاب نازل ہوگا وہ قیامت تک ان پر مسلط رہے گا''۔ (بخاری) اور مصابیح کے بعض نسخوں میں ''الخز'' کے بجائے ح اور را کے ساتھ ''الحر'' ہے اور ح کے زیر اور را کے جزم کے ساتھ ''الحر'' کے معنی عورت کی شرمگاہ کے ہیں اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ زنا و بدکاری کے قائل ہو جائیں گے۔ لیکن درحقیقت کہ اس لفظ کا حا اور را کے ساتھ یعنی ''الحر'' نقل ہونا درست نہیں ہے بلکہ یہ کتابت کی غلطی ہے جو کاتب سے واقع ہوگئی ہے اصل میں یہ لفظ ''خز'' (یعنی خ اور ز کے ساتھ) ہی ہے۔ حمیدی اور ابن اثیر نے اس حدیث کے سلسلہ میں اس لفظ کی تصریح کی ہے۔ نیز حمیدی کی کتاب میں امام بخاری کی جو یہ روایت منقول ہے اور اسی طرح خطابی نے شرح بخاری میں جو روایت نقل کی ہے ان دونوں میں (يَرُوْحُ عَلَيْهِمْ بِسَارِحَةٍ) کے بجائے یوں ہے تَرُوْحُ عَلَيْهِمْ سَارِحَةٌ لَهُمْ يَاتِيْهِمْ لِحَاجَةٍ

راوی حدیث:

أبی عامر: یہ ابو موسیٰ اشعری کے چچا ہیں۔ ان کا نام عبید بن وہب تھا۔

أبی مالك الاشعری: ان کو الاشجعی بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے نام میں اختلاف ہے، اور بخاری نے ان کی حدیث شک

کے ساتھ نقل کر کے فرمایا: "عن أبی مالك الاشعری أو أبی عامر".

تشریح: قوله: لیکونن من امتی اقوام یستعلون الخز۔۔۔ والمازف:

من امتی: بخاری کے نسخوں میں اسی طرح ہے اور مصابیح کے نسخوں میں "فی امتی" کے الفاظ ہیں۔

الخز: "خاء" کے فتحہ اور "زاء" کے شد کے ساتھ گھٹیا ریشم۔

والحریر: تعمیم کے بعد تخصیص ہے۔ یا "خز" کے استعمال سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر بیٹھ کر سواری نہ کی جائے یا زمین پر نہ بچھایا جائے۔ اس لئے کہ یہ اسراف ہے اور اسراف مکروہ ہے۔ اس کپڑے کو پہننے کی ممانعت کا سبب یہ ہے کہ یہ کپڑا ریشم اور اون سے بُنا جاتا تھا، اگر کپڑے کا بانا ریشم کا ہو اور تانا کسی اور چیز کا ہو تو جنگ کے علاوہ اس کا پہننا ممنوع ہے، بخلاف عکس کے کیونکہ ایسا کپڑا تو روئی کا ہے جس کا پہننا مشروع ہے۔

المعازف: میم کے فتحہ کے ساتھ۔ گانے بجانے کے آلات لہو مثلاً طنبور، عود اور بانسری وغیرہ

اور مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ ان محرمات کو حلال سمجھیں گے۔ اس پر وہ کچھ باطل اور لغو دلیلیں دیتے ہیں۔

جن میں سے کچھ یہ ہیں: [1] ہمارے بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ ریشمی کپڑا پہننا (مردوں کیلئے) حرام ہے بشرطیکہ بدن سے لگا ہوا ہو اگر کسی اور کپڑے کے اوپر پہنا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اھ۔ یہ قید بغیر کسی دلیل نقلی و عقلی کے ہے۔ نیز حضور علیہ السلام کا فرمان مطلق ہے: من لبس الحریر فی الدنیا لم یلبسه فی الآخرة۔

"جس نے دنیا میں ریشم کا کپڑا پہنا آخرت میں اس کے پہننے سے محروم کر دیا جائے گا"

اور بہت سارے امراء و عوام ایسے ہیں کہ جب ان سے کہا جائے کہ ریشمی کپڑا پہننا حرام ہے، تو جواب میں کہتے ہیں، کہ اگر حرام ہوتا تو قاضی اور بڑے علماء اس کو نہ پہنتے۔ اس طرح یہ لوگ حرام کو حلال سمجھنے کے مرتکب ہوتے ہیں، اسی طرح بعض علماء کا آلاتِ لہو و لعب سے تعلق ہے جس کا بیان بہت لمبا ہے۔

میں اس کی تفصیل سے احتراز کرتا ہوں کیونکہ اس کی وضاحت کیلئے ایک الگ مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ اور اس حدیث کی تائید اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے ہوتی ہے۔:

﴿ومن الناس من یشتری لهو الحدیث لیضل عن سبیل الله بغیر علم﴾ [لقمان-٦] "اور لوگوں میں سے ایک آدمی ایسا ہے جو اُن باتوں کا خریدار بنتا ہے جو غافل کرنے والی ہیں، تا کہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے بوجھے گمراہ کرے"۔

ابن ابی الدنیا، لہو و لعب کی مذمت میں حضرت انسؓ سے حدیث مرفوع نقل کرتے ہیں: لیکونن فی هذه الأمة خسف وقذف ومسخ وذلك اذا شربوا الخمور واتخذوا القینات وضربوا بالمعازف۔

"اس امت میں زمین میں دھنسائے جانے، پتھر برسائے جانے اور شکلیں مسخ ہونے کے واقعات رونما ہونے والے ہیں اور یہ اُس وقت ہوگا جب شراب کو کھلے عام پئیں گے اور آلات لهو بجائیں گے یعنی جب ان امور کو حلال سمجھ کر ایسا کریں گے۔

قوله: ولینزلن اقوام۔۔۔ بسارحة لهم یعنی انہی میں سے۔ جیسا کہ اُن لوگوں کے عذاب کا مستحق ہونے سے ظاہر

بسارحة زائدہ ہے۔کہا گیا ہے کہ صحیح الفاظ یہ ہیں: "یروح علیهم رجل بسارحة"۔(ذکرہ الطیبی)

زیادہ ... یہ ہے کہ اس کو فعل لازم کے قائم مقام کیا گیا ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: "یقع السیر علیهم بسیر ماشیة"۔اس میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات نفسانیہ اور طبائع حیوانیہ پر چلنے میں جانوروں کے تابع ہونگے، اور ... ت قرآنیہ اور احادیث (سے روگردانی کرنے) کی وجہ سے علماء کی متابعت کو چھوڑیں گے۔اسی وجہ سے اولاً تو اس مصیبت میں مبتلا ہونگے۔اور انتہا اپنے کئے دھرے کو جائز سمجھیں گے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ زیادہ واضح یہ ہے کہ "یروح" کا فاعل ضمیر ہے جو سیاق سے مفہوم ہو رہی ہے ای "یاتیهم راعیهم کل حین مسارحة الخ" یعنی ہر وقت ان کے چرواہے ان کے مویشیوں کو لائیں گے جو دن کو چرتے رہے ہوں گے اور ان مویشیوں کے دودھ اور اون سے فائدہ اٹھائیں گے۔

قوله یأتیهم رجل لحاجة۔۔۔ویضع العلم۔کسی ضروری حاجت کیلئے ورنہ تو یہ لوگ دوسرے لوگوں سے دور بھاگتے ہونگے۔یا اس لئے آئے گا تا کہ مؤمنین میں سے کسی سے کچھ انس حاصل کرے۔

فیقولون بہانہ کرتے ہوئے یا بخل کی وجہ سے یا حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے۔

ارجع الینا غداً تا کہ تیری ضرورت پوری کریں یا تیرا مطالبہ پورا کریں۔اور وہ یہ بات ان شاء اللہ کہے بغیر کہیں گے۔

فیبیتهم "یاء" کی تشدید کے ساتھ رات کے وقت کیونکہ رات کی ہلاکت زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔

یعنی بعض کے اوپر پہاڑ جیسا کہ اگلا جملہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔

قوله ویمسخ آخرین قردة وخنازیر ای یحول صور بعضهم الی صورة القردة والخنازیر۔(یعنی ... کی شکلیں بندروں اور خنزیروں کی شکلوں جیسی ہو جائیں گی) چنانچہ یہ (قردة وخنازیر) عامل جار کو حذف کر کے فعل کو براہ راست متعدی کرنے کی وجہ سے منصوب ہیں۔قاموس میں ہے: مسخه منعه کی طرح ہے، اور اس کا معنی ہے: حول صورته الی اخری۔(یعنی اس کی صورت کو دوسری صورت کی طرف پھیر دیا)۔اور ممکن ہے کہ مراد یہ ہو کہ نوجوان بندر بن جائیں گے اور ... خنزیر بن جائیں گے، کیونکہ بڑوں کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں، اور نوجوانوں کا معاملہ (نسبتاً) خفیف ہے، کیونکہ بندر میں ایک گونہ پہچان باقی رہتی ہے اور جنس انسانی کے ساتھ کچھ مشابہت بھی باقی رہتی ہے۔

"الی یوم القیامة" میں اشارہ ہے کہ ان کا یہ مسخ موت تک برقرار رہے گا، اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو مر گیا اس پر قیامت آ گئی، اور ممکن ہے کہ ان کا حشر بھی انہی صورتوں کے ساتھ ہو۔

تخریج ابوداؤد نے بھی اسی طرح نقل کی ہے۔اور طبرانی نے ابوامامہؓ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے:

"لیبیتن اقوام من امتی علی أکل ولهو و لعب ثم لیصبحن قردة وخنازیر"۔

... بلسورہ کے ساتھ۔والراء: رائے مخففہ کے ساتھ۔

... مشددہ کے ساتھ۔الزای: مشددہ کے ساتھ۔ابن الاثیر: صاحب جامع الاصول مراد ہیں۔

قوله:تروح عليهم سارحة لهم يأتيهم لحاجة:

عليهم"تروح ": بعض کا کہنا ہے کہ یہ صیغۂ تانیث ہے اور بصیغۂ تذکیر بھی درست ہے، بلکہ تذکیر کے ساتھ زیادہ واضح ہے۔

سارحة: "باء" جارہ کے بغیر ہے۔

يأتيهم لحاجة: فاعل کے حذف کے ساتھ اور تقدیر یوں ہے: "يأتيهم الآتي" اور "يأتيهم المحتاج" اور "يأتيهم الرجال" جیسا کہ سیاق سے معلوم ہو رہا ہے، اور اسماعیلی کی روایت میں اس طرح ہے: "يأتيهم طالب حاجة" جیسا کہ عسقلانیؒ نے ذکر کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

یہاں شراح حدیث نے عمدہ ابحاث اور لطیف جوابات ذکر کیے ہیں، ان میں سے ایک قول علامہ تورپشتی رحمہ اللہ کا ہے، کہ الحر "راء" کی تخفیف کے ساتھ اس کا معنی ہے۔ "فرج" اور کتاب المصابیح میں اس لفظ کے ضبط میں تصحیف ہوئی ہے۔ اسی طرح اصحاب حدیث میں سے بعض راویوں نے تصحیف کی ہے اور اس لفظ کو "الخز" خاء اور زاء کے ساتھ گمان کیا ہے حالانکہ "خز" تو حرام ہی نہیں ہے، جس کو حلال سمجھا جائے۔

اور میں نے ایک صاحب کو دیکھا جو علم حدیث اور حفظ حدیث میں معروف تھے، انہوں نے بھی "خاء" اور "زاء" کے ساتھ ضبط کیا ہے، اور یہ ہے یا اُن لوگوں کی روایت کی اتباع کا نتیجہ ہے جن کو (روایت و درایت کے اعتبار سے) اس کا علم نہ تھا۔

اور اُن عمدہ مباحث میں سے ایک بحث علامہ تورپشتی رحمہ اللہ نے "تروح عليهم بسارحته" پر کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "تروح" کا ساقط کر دیا گیا، اس لئے اُن لوگوں کو معنی میں التباس ہوا جنہیں علم نہیں ہے۔

درست تو (ضبط) یہ ہے يروح عليهم رجل بسارحة لهم۔ مسلم نے اس روایت کو اپنی کتاب میں اس طرح نقل کیا ہے اور سہو مؤلف سے ہوا ہے اس لئے کہ ہم نے سارے نسخے اسی طرح دیکھے ہیں۔ اور اُن میں سے ایک یہ کہ "يضع العلم" کے بعد "عليهم" کا لفظ ساقط ہے۔

اس کی تائید اُس بات سے ہوتی ہے جس کو مصابیح کے شراح میں سے صاحب المفاتیح نے ذکر کی ہے کہ "الحر" حائے مہملہ مکسورہ اور راء مہملہ مخففہ کے ساتھ ہے اور اس کی اصل "الحرح" ہے آخری "حاء" کو حذف کر دیا گیا، اور اس کی جمع احراج آتی ہے اور "الحر" کا معنی ہے "فرج" (شرمگاہ) یعنی آخری زمانہ میں ایسے گروہ ہونگے جو زنا کرینگے اور یہ عقیدہ رکھیں گے کہ جب مرد و زن راضی ہوں تو تمام انواع کے استمتاع جائز ہیں، اور کہیں گے کہ عورت باغ کی طرح ہے جیسا کہ باغ والے کیلئے جائز ہے کہ اپنے باغ کا پھل جس کو چاہے دے دے، اسی طرح شوہر کیلئے درست ہے اپنی بیوی جس کے لئے چاہے مباح کر دے اور جن کا یہ عقیدہ ہے وہ تحریف کرنے والے اور ملحد ہیں۔

اور جہاں تک بات ہے ریشمی کپڑا پہننے کی تو مردوں کیلئے حرام ہے، جو اس کو حلال سمجھے گا وہ کافر ہوگا۔

اس حدیث میں مصابیح کے نسخوں میں دو جگہ اختلاف ہے

ایک لفظ "الحر" کے بارے میں کہ یہ لفظ ~~بعض نسخوں میں~~ خاء اور زاء کے ساتھ ہے اور درست وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا

ہے کیونکہ سنن ابی داؤد میں حاء مہملہ اور راء کے ساتھ ہے۔ دوسرا موضع اختلاف "یروح علیھم رجل بسارحته لھم" کے الفاظ ہیں۔ چنانچہ بعض نسخوں میں اسی طرح ہیں اور بعض نسخوں میں یروح علیھم کے الفاظ ہیں یعنی "رجل" کے بغیر ہیں۔ اور "الرجل" کا لفظ ابوداؤد میں مذکور ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آخری زمانے میں فتنوں کا نزول ہوگا اور صورتوں کا مسخ ہوگا، چنانچہ مؤمن کو گناہوں سے اجتناب کرنا چاہئے تا کہ عذاب اور مسخ صور میں مبتلا نہ ہو۔

علامہ طیبیؒ شارح کی پہلی بات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ان کی پہلی بات کہ "تصحیف ہوئی ہے" تو اس کا جواب وہ ہے جو حمیدی نے بین الصحیحین "یستحلون الخز" کے بعد ذکر کیا ہے کہ الخز بالخاء والزاء المعجمتین ہے۔

میں کہتا ہوں خصم کا معارضہ جواب بننے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

فرماتے ہیں، کہ وہ روایت جس کو ابو اسحاق حربی نے "باب الحاء والراء" میں ذکر کیا ہے اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں وہ دوسری حدیث ہے جو ابی ثعلبہؓ کے واسطے سے حضور علیہ السلام سے منقول ہے:

اول دینکم نبوۃ ورحمة، ثم ملك ورحمة وخیرة، ثم ملك عض یستحل فیه الحر والحریر.

اس سے مراد حرام شرمگاہ کو حلال سمجھنا ہے، اور یہ اُس حدیث کے موافق نہیں جس کی تخریج بخاری نے کی ہے اور اس طرح ابوداؤد نے سنن میں کتاب اللباس کے تحت "باب الخز ولباسه" میں نقل کی ہے۔

ہم نے یہ بات محض اس لئے ذکر کی ہے کہ بعض لوگ اس کے متعلق وہم میں مبتلا ہیں، اس لئے ہم نے بیان کر دیا۔ اور ابو ثعلبہ کی حدیث صحیح کی شرط پر نہیں ہے۔ ابو اسحاق کا کلام مکمل ہو گیا۔

اور اس کے قریب قریب صاحب نہایہ نے "باب الحاء والراء المھملتین" میں ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں اس کا دوسری حدیث ہونا مسلّم ہے، لیکن یہ تو مختلف فیہ کی تائید کرتی ہے، بلکہ معنی مقصود میں نص ہے۔ اور جب اس کی صحت ثابت ہے تو اس کا صحیحین کی شرط پر نہ ہونا کوئی مضر نہیں ہے۔ اصل تو دو حدیثوں کا موافق ہونا ہے، اس لئے کہ ایک حدیث دوسری حدیث کی تفسیر کرتی ہے، خصوصاً "خز" زاء کے ساتھ یہ تو محرمات میں سے ہے ہی نہیں چہ جائیکہ اس کو حلال سمجھنا کفریات میں سے ہو۔ پھر میں نے جامع صغیر میں دیکھا کہ ابن عساکر نے حضرت علیؓ سے مرفوع روایت نقل کی ہے:

"اوشك امتی ان تستحل فروج النساء والحریر"

"عنقریب میری امت عورتوں کی شرمگاہوں اور ریشمی کپڑے کو حلال سمجھے گی"

اور ان کا یہ فرمانا کہ "خز" کا استعمال حرام تو ہے ہی نہیں ہے، چہ جائیکہ کو حلال سمجھا جائے۔ اس کا جواب وہ ہے جس کو ابن الاثیر نے نہایہ میں حضرت علیؓ کی حدیث: "انه نھی عن رکوب الخز والجلوس علیه" کے ضمن میں ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ "خز" معروف پہلے زمانہ میں اُس کپڑے کو کہا جاتا تھا جو اُون اور ریشم سے بُنا جاتا تھا، وہ مباح ہے۔ صحابہ اور تابعین نے یہ کپڑا پہنا ہے، چنانچہ اُس پر نہی اس لئے وارد ہوئی کہ اس میں عجمیوں اور عیش پرستوں کے ساتھ مشابہت ہے۔

اور اگر "خز" سے دوسری قسم کا کپڑا مراد ہو جو آج کل کے زمانے میں معروف ہے، تو وہ حرام ہے۔ اس لئے کہ آج کل کا

معروف ''خز'' مکمل طور پر ریشم سے بنا ہوا ہوتا ہے۔ دوسری حدیث کو اسی پر محمول کیا جائے گا۔ اور اس حدیث کا معنی یہ ہوا کہ وہ لوگ ''خز'' اور ''حریر'' کو حلال سمجھیں گے۔ ابن اثیر کا کلام مکمل ہو گیا۔

اس پر ایک اشکال ہے اور وہ یہ کہ ''خز'' پر سواری کرنے اور بستر بنانے کا مکروہ ہونا جبکہ ''حریر'' کا حکم بھی یہی ہے، اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ اس کو مباح سمجھنا کفر ہو اور موجب عذاب ہو خصوصاً جبکہ ''خز'' لغوی اور اصطلاحی طور پر حضور علیہ السلام کے زمانہ میں مباح تھا، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس پر محمول کیا جائے؟ اور بعض لوگوں کے نزدیک جو یہ متعارف ہے کہ ''خز'' کو خالص ریشمی کپڑے پر محمول کیا جائے، خصوصاً جبکہ صراحۃً لفظ حریر کے ساتھ تکرار ہے اور اصل معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان تغایر ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر یہ اشکال ہو کہ ''حریر'' کا عطف ''خز'' پر کیسے درست ہوگا جبکہ شئے اول (خز) مکروہ ہے اور شئے ثانی (حریر) حرام ہے پہلے معنی کے مطابق اور دوسرے معنی کے مطابق ایک چیز کا عطف اپنی ذات پر (عطف الشي علي نفسه) لازم آئے گا۔ نیز وہ کیسے حرام ہے جبکہ اُس وقت یہ اصطلاح نہیں تھی؟

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ اس معاملہ میں شدت اور سختی پیدا کرنے کیلئے تغلیب کو اختیار کیا۔ میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں: **التغليب تغلب وعن ظاهره تقلب.**

(طیبیؒ) فرماتے ہیں دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ یہ عطف بیان ہے اور تیسری بات کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک غیبی حالت کے بارے میں خبر دی گئی جو کہ حضور علیہ السلام کا معجزہ ہے۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ عطف بیان ہونا مسلم ہے بشرطیکہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں خز کا اطلاق حریر پر ہوتا ہو اور اس کو معجزہ قرار دینا، بایں طور کہ اس زمانہ میں خز کا اطلاق حریر پر ہوگا تو یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے۔

(علامہ طیبیؒ) فرماتے ہیں کہ (علامہ تورپشتی ؒ) کا تیسرا قول کہ ''یروح'' کا فاعل ساقط ہوا ہے اس لئے معنی میں التباس ہو گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے معنی میں التباس پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کو بخاری نے نقل کیا ہے جیسا کہ مصابیح میں ہے لیکن حمیدی، خطابی اور صاحب جامع الاصول نے ذکر کیا ہے کہ ''**تروح عليهم سارحة**'' تاء کے ساتھ ہے اور ''سارحة'' فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ یوں کہا جائے کہ ''باء'' زائدہ ہے، کیونکہ فاعل پر ''باء'' زائدہ آجاتی ہے جیسا کہ امرأ القیس کے شعر سے استدلال کیا گیا ہے:

ألا هل أتاها والحوادث جمة
بأن امرأ القيس بن نملك بيقرا

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ اُس نسخہ کے مطابق التباس واقع ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، علاوہ ازیں فاعل پر ''باء'' زائدہ کا داخل ہونا ''کفی'' فعل کے ساتھ مختص ہے۔ اور یہ شعر معنی میں صریح نہیں ہے بلکہ زیادہ واضح یہ ہے کہ فاعل محذوف ہے جیسا کہ بعض نے فاعل کے حذف کو جائز قرار دیا ہے۔

فرمایا: اور جہاں تک بات ہے مسلم کی ~~طرف نسبت~~ کی کہ امام مسلمؒ نے اپنی کتاب میں اسی طرح نقل کیا ہے تو یہ سہو ہے، اس

لئے کہ میں نے امام مسلمؒ کی کتاب میں یہ حدیث نہیں دیکھی اور اس طرح کیسے ہوسکتا ہے جبکہ حمیدی نے اس حدیث کو امام بخاری کی منفرد احادیث میں ذکر کیا ہے۔اور جامع الاصول والے نے اس حدیث کو بخاری اور ابوداؤد سے نقل کیا ہے

میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں کہ حافظ غیر حافظ پر حجت ہے اور مثبت نافی پر مقدم ہے۔ اور شیخ ایک محقق وثقہ ہستی ہیں، خصوصاً دلائل ذکر کرتے ہیں۔

(علامہ طیبیؒ) فرماتے ہیں کہ شیخ (تورپشتی رحمہ اللہ) کا چوتھا قول کہ "علیھم" محذوف ہوا ہے، حالانکہ اصول میں مجھے یہ کلمہ نہیں ملا۔ میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں کہ مدعی (خصم کی دلیل سے زیادہ) قوی دلیل سے ثابت ہے، حالانکہ بعض نسخوں میں اس کا موجود ہونا ثابت کیا ہے، اور اس کی نسبت مسلم کی طرف کی ہے اور اس کی سند مسلّم ہے۔

پھر (علامہ طیبیؒ نے) لکھا ہے کہ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ بعض لوگوں کا پہاڑوں کی طرف جا کر وہاں ٹھہرنا، اور شام کے وقت مویشیوں کا اُن کے پاس واپس آنا اور فقراء اور حاجت مند کو ٹال کر اور ٹرخا کر خالی ہاتھ واپس کر دینا اتنے دردناک عذاب اور اتنے عبرتناک غیر معمولی عذاب کیلئے کیونکر سبب بنا؟

میں کہتا ہو (تو اُس کا جواب یہ ہے) کہ انہوں نے جب بخل ومنع میں مبالغہ کیا تو اُن پر عذاب بھیجنے میں بھی مبالغہ کیا گیا۔ اور اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ لفظ "الجبل" کی بجائے لفظ "العلم" کو اختیار کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ جگہ سرسبز وشاداب ہوگی، اور ضرورت مند لوگ اس کی طرف قصد کرینگے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ یہ لوگ مالدار ہونگے اور حاجت مند لوگوں کیلئے جائے پناہ ہونگے خصوصیت مکان اس معنی پر دال ہے اور "تروح علیھم سارحتھم" کے الفاظ جو اور "علی" جو کہ استعلاء پر دلالت کرتا ہے، خصوصیت زمان پر دال ہیں کہ ان کا مال اُس وقت بہت وافر مقدار میں ہوگا اور ان کے پاس آکر مانگنے والوں وضرورت بہت زیادہ ہوگی۔ کیونکہ یہ لوگ اس زمانہ کے محتاج ترین لوگ ہونگے۔ اور "ارجع الینا غدًا" میں جھوٹ، وعدہ خلافی اور سائل کا مذاق اڑانے کا رواج ہے، اس لئے یہ لوگ اس دردناک عذاب اور عبرتناک سزا کے مستحق ہوجائیں گے۔

میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں کہ ان سب کے باوجود مسخ جیسے سخت عذاب کا استحقاق ثابت نہیں ہوتا کیونکہ مسخ تو اہل کفر کے علاوہ میں نہیں پایا جاتا۔ پس درست وہی ہے جو ہم نے ماقبل میں تحریر کردیا ہے۔

(علامہ طیبیؒ) فرماتے ہیں کہ ہم نے جو یہ بات کی ہے کہ لفظ "العلم" شہرت اور لوگوں کا مرجع ہونے پر دلالت کرتا ہے، اس لئے کہ خنساءؓ نے اپنے بھائی کی مدح میں کہا ہے: "کانه علم فی رأسه نارٌ"

"گویا کہ میرا بھائی ایک ایسا پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر آگ جل رہی ہو۔

اس قول کے ذریعے حضرت خنساءؓ نے یہ بتایا کہ میرا بھائی ایک مشہور ومعروف شخصیت تھی کمزوروں اور فقراء کیلئے جائے پناہ تھا، اور مجبور لوگوں کیلئے ٹھکانہ تھا۔ کیونکہ مویشیوں کا رات کو واپس آنا ان کے نہایت مالدار ہونے کی دلیل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ولکم فیھا جمال حین تریحون وحین تسرحون﴾ [النحل۔٦] "اور اُن کی وجہ سے تمہاری رونق بھی ہے جبکہ شام کے وقت لاتے ہو اور جبکہ صبح کے وقت چھوڑ دیتے ہو"۔

صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ اگر کوئی اعتراض کرے کہ حین تریحون کو "حین تسرحون" پر مقدم کیوں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ "اراحة" (شام کے وقت آنا) میں جمال زیادہ ظاہر ہے اس لئے کہ اس وقت اونٹنی بھرے پیٹ اور دودھ سے لبریز تھنوں کے ساتھ باڑہ کی طرف لوٹتی ہے۔

علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس امت میں بھی کسی وقت مسخ (شکل کا بگڑ جانا) ہوگا، اور اسی طرح خسف بھی ہوگا جیسا کہ یہ دونوں پچھلی اُمتوں میں ہوئے ہیں۔ برخلاف بعض کے قول کے، کہ اس اُمت میں مسخ وخسف نہیں ہوگا، اور مذکورہ مسخ سے مراد دلوں کا مسخ ہے۔

میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں کہ احادیث میں جو مسخ وخسف کی نفی وارد ہوئی ہے وہ اس اُمت کے پہلے زمانہ پر محمول ہے چنانچہ حکم عام ہے، لیکن اس حدیث کی وجہ سے آخری زمانہ کی تخصیص ہے یا یہ کہ وہ احادیث تمام امت کے مجموعی پر خسف ومسخ پر محمول ہیں، اور جو مسخ وخسف ثابت ہے وہ بعض کیلئے ہے۔ واللہ اعلم۔

۵۳۴۴ : وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ عَذَاباً اَصَابَ الْعَذَابُ مَنْ كَانَ فِيْهِمْ ثُمَّ بُعِثُوْا عَلَى اَعْمَالِهِمْ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٦/١٣ حديث رقم ٧١٠٨ ومسلم فی صحيحه ٢٢٠٦/٤ حديث رقم (٨٤-٢٨٧٩) واخرجه احمد فی المسند ٤٠/٢۔

ترجمہ: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب کو نازل کرتا ہے تو وہ عذاب ان تمام افراد کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے جو اس قوم میں ہوتے ہیں اور پھر (آخرت میں) لوگوں کو ان کے اعمال کی حیثیت سے اٹھایا جائے گا"۔ (بخاری ومسلم) یعنی نیک کو اس کے عمل کے ساتھ اور فاسق کو اپنے عمل کے ساتھ۔

تشریح: مظہر فرماتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی قوم کے بعض افراد نافرمانی کرتے ہیں، تو قوم کے تمام افراد پر عذاب نازل ہوگا، اور اس مصیبت میں گنہگار اور بے گناہ برابر کے مبتلا ہونگے، لیکن قیامت کے دن اپنے اعمال کے موافق ہر ایک کو بدلہ دیا جائے گا۔ اگر اچھا عمل کیا ہوگا تو اچھا بدلہ ملے گا، اور اگر برا عمل کیا ہوگا تو برا بدلہ ملے گا۔

قوله: متفق عليه:

یہ اس سند "عبد اللّٰه بن عمر بن الخطابؓ عن ابيه" سے متفق علیہ ہے۔ ذکرہ میرک) چنانچہ مؤلف کو چاہئے تھا کہ حدیث کا اسناد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف فرماتے۔

۵۳۴۵ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُبْعَثُ كُلُّ عَبْدٍ عَلٰى مَامَاتَ عَلَيْهِ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ٢٢٦٦/٤ حديث رقم (٨٣-٢٨٧٨) واحمد فی المسند ٣٣١/٣

ترجمہ: "حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قیامت کے دن ہر شخص کو اسی

حال پر اٹھایا جائے گا جس پر اس کا انتقال ہوا ہوگا۔

تشریح: اس حدیث کو ابن ماجہ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور امام احمدؒ نے ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً یوں نقل کیا ہے:

یبعث الناس علی نیاتھم۔

''لوگوں کو قیامت کے دن ان کی نیتوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا''۔

۵۳۴۶ : عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَارَاَيْتُ مِثْلَ النَّارِ نَامَ هَارِبُهَا وَلَا مِثْلَ الْجَنَّةِ نَامَ طَالِبُهَا (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٦١٦ حدیث رقم ٢٦٠١۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (شدت وسختی) اور ہولناکی کے اعتبار سے) میں نے آتش جہنم کی مانند ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی جس سے بھاگنے والا غافل سوتا رہے طلبگار غافل رہے اور (عیش وراحت اور فرحت وسرور کے اعتبار سے) میں نے جنت کی مانند ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی جس کا طلب گار غافل سوتا رہے''۔ (ترمذی)

تشریح: **قوله: مارأیت مثل النار نام هاربها:** اس میں تعجب کا معنی ہے۔ اور ''رأیت'' بمعنی ''علمت'' ہے۔

نام هاربها: دوسرا مفعول ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ "رأیت" ابصرت (میں نے نہیں دیکھا) کے معنی میں ہو۔ اس صورت میں جملہ صفت ہوگا یا حال ہوگا۔ یعنی اس سے غافل ہوا ہو حالانکہ جہنم کے عذاب سے بھاگنے والے کیلئے ضروری ہے کہ فجار کے عمل سے بھاگے۔

قوله: ولا مثل الجنة نام طالبها: حالانکہ اس کو چاہیے کہ امتثال امر کی بھرپور کوشش کرے تاکہ مقصود کو حاصل کر سکے۔

تخریج: اس حدیث کو امام طبرانی نے اوسط میں حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔

۵۳۴۷ : وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ اَرٰی مَالَا تَرَوْنَ وَاَسْمَعُ مَالَا تَسْمَعُوْنَ اَطَّتِ السَّمَآءُ وَحُقَّ لَهَا اَنْ تَئِطَّ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ مَافِيْهَا مَوْضِعُ اَرْبَعَةِ اَصَابِعَ اِلَّا وَمَلَكٌ وَاضِعٌ جَبْهَتَهٗ سَاجِدًا لِلّٰهِ وَاللّٰهِ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا وَمَا تَلَذَّذْتُمْ بِالنِّسَاءِ عَلَى الْفُرُشَاتِ وَلَخَرَجْتُمْ اِلَى الصُّعُدَاتِ تَجْاَرُوْنَ اِلَى اللّٰهِ قَالَ اَبُوْذَرٍّ يٰلَيْتَنِیْ كُنْتُ شَجَرَةً تُعْضَدُ. (رواه احمد والترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٨٢ حدیث رقم ٢٣١٣ وابن ماجه فی السنن ٢/١٤٠٢ حدیث رقم ٤١٩٠ واحمد فی المسند ٥/١٧٣

ترجمہ: ''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم نہیں دیکھتے اور جو کچھ میں سنتا ہوں تم نہیں سنتے (یعنی قرب قیامت کی نشانیاں قدرت کی کرشمہ سازیوں کی مظاہر اور اللہ تعالیٰ کی صفات قہریہ وجلالیہ جس طرح میرے سامنے ہیں اور خدائی مدد سے ان سے آگاہی رکھتا ہوں اس طرح نہ تمہارے سامنے

ہیں اور نہ تم انہیں دیکھتے ہو نیز احوال آخرت کے اسرار و اخبار قیامت کی ہولناکیوں اور احوال دوزخ کو جس طرح میں سنتا ہوں، تم نہیں سنتے) آسمان میں سے آواز نکلتی ہے اور اس میں سے آواز کا نکلنا بالکل حق اور صحیح ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میری جان ہے آسمان میں چار انگشت کے برابر بھی ایسی جگہ نہیں جہاں فرشتے اللہ کے حضور اپنی پیشانی کو جھکائے ہوئے نہ پڑے ہوں۔ اللہ کی قسم اگر تم اس خبر سے آگاہ ہو جاؤ جس کی میں خبر رکھتا ہوں تو یقیناً تم بہت کم ہنسو اور زیادہ رونے لگو اور بستروں پر اپنی بیویوں سے لذت حاصل کرنا ترک کر دو اور یقیناً تم اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتے ہوئے جنگلات کی جانب نکل پڑو (جیسا کہ رنج اٹھانے والوں اور غموں سے تنگ آ جانے والوں کا شیوہ ہوتا ہے کہ وہ گھروں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور صحرا صحرا، جنگل جنگل گھومتے پھرتے ہیں تا کہ زمین کا بوجھ کم ہو اور دل کچھ ٹھکانے لگے)۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے (یہ حدیث نقل کرنے کے بعد بطور حسرت یہ) تمنا کی کہ کاش! میں درخت ہوتا جس کو کاٹ دیا جاتا!'' (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: قولہ: انی اری مالا ترون وأسمع ما لا تسمعون: اگلے جملہ میں حضور علیہ السلام نے اپنا سماع بیان فرمایا:

قولہ: وو جوبھا أن تئط ــــ ساجد للہ:

أطت السماء: ''طاء'' کی تشدید کے ساتھ ہے، ''أطیط'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے کجاوے کی آواز اور ''أطیط الأبل'' کا معنی ہے اونٹ کی آوازیں۔ نہایہ میں اسی طرح مذکور ہے۔

حق: مجہول کے صیغہ کے ساتھ۔

حضور علیہ السلام نے اگلے جملہ میں اس کا سبب بیان کیا اور اس کا سبب وہ تھا جو حضور علیہ السلام نے بکثرت دیکھا تھا۔

والذی ...... فیھا): یعنی جنس آسمان میں نہیں ہے۔

موضع : رفع کے ساتھ ہے کیونکہ یہ فاعل ہے اُس ظرف کا جس نے حرف نفی پر اعتماد کیا ہوا ہے اور الا کے بعد مذکور اسم اس سے حال ہے۔

یعنی تابعداری میں مشغول رہتے ہیں، تا کہ اس جملہ کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہو سکے کہ بعض فرشتے قیام کی حالت میں ہیں، اور بعض فرشتے رکوع کی حالت میں ہیں، اور بعض فرشتے سجدہ کی حالت میں ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وما منا الا له مقام معلوم ﴾ [الصافات۔ ۱۶۴] ''اور ہم میں سے ہر ایک کا ایک معین درجہ ہے''

یا اکثر ملائکہ کے اعتبار سے بطور خصوص سجدہ کا ذکر کیا یا یہ سجدہ والی حالت کسی ایک آسمان کے ساتھ مختص ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

واضح رہے کہ لفظ ''اربعة'' جامع ترمذی اور ابن ماجہ میں بغیر ''ھا'' کے ہے اور شرح السنہ اور مصابیح کے بعض نسخوں میں ''ھاء'' کے ساتھ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ ''اصبع'' مذکر و مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یعنی آسمان میں موجود فرشتوں نے آسمان کو بوجھل کردیا ہے جس کی وجہ سے آسمان سے آوازیں نکلتی ہیں، اور یہ ایک مثال ہے اور فرشتوں کی کثرت کا بیان ہے اگرچہ آسمان میں یہ آوازیں نہ بھی ہوں اور اس کلام سے اللہ تعالیٰ کی عظمت بتانا مقصود ہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ ایسی کیا مجبوری ہے کہ حضور علیہ السلام کے کلام کو حقیقت سے مجاز کی طرف پھیر دیا جائے جبکہ یہ حقیقی معنی عقلاً اور نقلاً درست ہے۔ حالانکہ حضور علیہ السلام نے صراحۃً فرمایا ہے: "**واسمع ما لا تسمعون**". نیز یہ بھی احتمال ہے کہ آسمان کا آوازیں نکالنا (چرچرانا) **تسبیح تحمید تقدیس** اور **تمجید** کی وجہ سے ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**وان من شئ الا يسبح بحمده**﴾ [الاسراء: ٤٤] "اور کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان نہ کرتی ہو"۔

خصوصاً جبکہ آسمان تسبیح کرنے والے عبادت گزار فرشتوں کی عبادت گاہ اور رکوع و سجود کرنے والے فرشتوں کا ٹھکانہ ہے۔

قوله: والله لو ـــ تجارون الى الله:

الفرشاة: فا اور راء کے ضمہ کے ساتھ "فرش" کی جمع ہے، پس "**فرشات**" جمع الجمع ہے اس کو مبالغہ کیلئے ذکر کیا گیا ہے۔

الصعدات: صاد اور عین کے ضمہ کے ساتھ۔ جمع کے صیغہ کو مبالغہ کیلئے اختیار کیا گیا۔ **صعدات**، **صعد** کی جمع ہے، اور **صعد** جمع ہے "**صعید**" کی، جیسا کہ "**طرقات**" جمع ہے "**طرق**" کی اور "**طرق**" جمع ہے "**طریق**" کی۔ اور "**صعید**" کا معنی ہے "**طریق**" (راستہ) اصل میں "**الصعید**" مٹی کو کہا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تم راستوں، جنگلوں، صحراؤں اور لوگوں کی گزرگاہوں کی طرف نکل جاتے جیسا کہ غمگین آدمی کرتا ہے۔

زیادہ ظاہر یہ ہے کہ "**الصعید**" کا معنی ہے سطح زمین۔

بعض کا کہنا ہے کہ "**صعید**" کا معنی ہے مٹی۔ اور یہاں اس کا یہ معنی مراد نہیں ہے۔

شیخ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ اس کا معنی ہے کہ "تم اپنے گھروں سے پہاڑوں کی طرف اللہ کے سامنے گریہ وزاری کرتے ہوئے نکل پڑتے۔ اور غمزدہ آدمی کی حالت یہ ہوتی ہے کہ گھر اُس کو تنگ لگتا ہے اور اپنی تکلیف کو ہلکا کرنے کیلئے خالی فضاء کی طرف نکلتا ہے۔

"**تجارون الى الله**"، یعنی دعا مانگتے، اللہ کے سامنے گڑگڑاتے تاکہ تم لوگوں سے یہ مصیبت دور کردے۔

تعضد: مجہول کے صیغہ کے ساتھ یعنی کاٹ دیا جاتا، اور جڑ سے ختم کردیا جاتا۔

اور یہ کیفیت اللہ کے عذاب سے کمال خوف کی بدولت پیدا ہوئی۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "**یا لیتنی**" حضرت ابوذرؓ کا قول ہے ابوذرؓ کا کہنا ہے کہ بلکہ حدیث میں ادراج کیا ہے اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ بعض لوگوں نے اس کو ابوذرؓ کا قول قرار دیا ہے۔ حالانکہ وہ (حضرات) جانتے ہیں کہ اس جملہ کا ابوذرؓ کا کلام ہونا زیادہ مناسب ہے۔ چونکہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کو اللہ جل شانہ کی معرفت حد درجہ حاصل تھی، لہٰذا اس حال کی تمنا ایک ادنی تمنا ہے، علاوہ ازیں اس تمنا کا پورا ہونا بھی ممکن نہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جامع ترمذی اور جامع الاصول میں اس طرح ہے:

تجأرون الی اللہ لو ددت انی شجرۃ تعضد"۔اور ایک روایت میں ہے:"ان أبا ذر قال:لو ددت انی شجرۃ تعضد"۔اور ایک روایت میں ہے:ان ابا ذر قال:لو ددت انی شجرۃ تعضد اور ابوذرؓ سے موقوفاً منقول ہے۔اور سُنن ابن ماجہ میں اس طرح ہے جس طرح متن میں اور مصابیح کے نسخوں میں ہے:"قال ابو ذرؓ:یا لیتنی"الخ۔اور اس میں بحث کی گنجائش ہے۔

۵۳۴۸ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ خَافَ اَدْلَجَ وَمَنْ اَدْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِیَةٌ اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ الْجَنَّةُ (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٤٦ حدیث رقم ٢٤٥٠

ترجمہ:"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص (اس بات کا) اندیشہ رکھتا ہے کہ (اس کا دشمن رات کے آخری وقت میں دھاوا بولنے والا ہے) تو وہ رات کے پہلے ہی پہر میں اپنے بچاؤ کے راستے پر چل پڑتا ہے (تاکہ دشمن کی غارت گری سے اپنے آپ کو بچا سکے) اور جو شخص رات کے پہلے حصے میں بھاگنا شروع کر دیتا ہے وہ منزل تک پہنچ جاتا ہے'خبردار! خدا کا مال بہت گراں قیمت ہے (جو نہایت اونچی قیمت چکائے بغیر پایا نہیں جا سکتا اور وہ اونچی قیمت اس کی راہ میں جان و مال کی قربانی ہے) اور یاد رکھنا! خدا کا مال جنت ہے"۔(ترمذی)

تشریح: **قولہ**:من خاف ادلج بلغ المنزل :یعنی جو شخص رات کے آخری حصے میں دشمن کے حملہ سے ڈرتا ہے وہ رات کے پہلے حصہ میں چلتا ہے اور جو شخص اپنی کسی محبوب چیز کے فوت ہونے سے ڈرتا ہے اُس محبوب چیز کو تلاش کرنے میں رات کی بیداری برداشت کرتا ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ یہ ایک مثال ہے،جس کے ذریعے آپ ﷺ نے مالک آخرت کی حالت کو بیان فرمایا ہے،اس لئے کہ شیطان اس کے راستہ پر ہے،اور نفس اور اس کی باطل آرزوئیں شیطان کی مددگار ہیں،اگر وہ بیدار و چوکنا ہو کر راہِ آخرت پر چلے گا،اور اپنے عمل میں اخلاص پیدا کرے گا،تو شیطان'اس کے مکر اور اس کے مددگاروں کے حملہ سے مامون ہو جائے گا۔

قولہ:الاان سلعۃ اللہ الغالیۃ:

الا:تخفیف کے ساتھ تنبیہ کیلئے ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی طرف رہنمائی فرمائی ہے کہ راہِ آخرت پر چلنا نہایت دشوار ہے اور وہاں کی نعمتوں کو حاصل کرنا بہت مشکل ہے'ادنیٰ سعی سے حاصل نہیں ہو سکتی'"اللہ تعالیٰ کا ساز و سامان" سے مراد جنت کی نعمتیں ہیں جن کو "الحسنیٰ وزیادۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

غالیۃ:"غین" کے ساتھ یعنی بلند مرتبہ والی۔

مطلب یہ ہے کہ جنت کی قیمت وہ اعمال باقیہ ہیں،جن کی طرف ارشاد باری:﴿والباقیات الصلاحات خیر عند ربك ثوابا وخیر املاً﴾ [الکھف:۴۶] "اور جو اعمال صالحہ باقی رہنے والے وہ آپ کے ربّ کے نزدیک ثواب

کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہیں۔" میں اشارہ کیا گیا ہے اور انہی کی طرف اشارہ ہے اس ارشاد باری تعالیٰ میں: ﴿ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم بأن لھم الجنة﴾ [التوبة: ۱۱۱] بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے، کہ اُن کو جنت ملے گی۔"

تخریج: اور اسی طرح حاکم نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

۵۳۴۹ : وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَقُوْلُ اللّٰہُ جَلَّ ذِکْرُہٗ اَخْرِجُوْا مِنَ النَّارِ مَنْ ذَکَرَنِیْ یَوْمًا اَوْخَافَنِیْ فِیْ مَقَامٍ (رواہ الترمذی والبیہقی فی کتاب البعث والنشور)

اخرجه الترمذی فی السنن ٦١٣/٤ حدیث رقم ٢٥٩٤

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "(روز قیامت) اللہ کہ جس کا ذکر بہت معظم ہے (جہنم پر مقرر فرشتوں کو مخاطب کر کے) فرمائے گا کہ ہر اس شخص کو دوزخ سے نکال لو جس نے ایک دن بھی (یعنی کسی ایک وقت بھی) مجھے یاد رکھا تھا' یا کسی موقع پر میری خشیت اس پر طاری ہوئی۔" (ترمذی اور بیہقی نے اس حدیث کو کتاب البعث والنشور میں روایت کیا ہے)

تشریح: قوله: یقول اللہ جل ذکرہ:

یعنی جس کا ذکر عظمت والا ہے اور اس کو یاد کرنے والا عظیم المرتبہ انسان ہے' اور اس لفظ "جل ذکرہ" کا ذکر کیا ہی حسن رکھتا ہے۔ اس لئے کہ یہ اللہ کو زندگی بھر یاد رکھنے اور ہر حال اور ہر مقام پر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کیلئے توطئہ ہے۔

قوله: اخرجوا من النار من ذکرنی یومًا ......:

او خافنی فی مقام: یعنی کسی معصیت کے حوالے سے کسی بھی جگہ میں' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿واما من خاف مقام ربه ونھی النفس عن الھوی فان الجنة ھی المأوی﴾ [النزعت: ۴۰-۴۱] "اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو خواہش سے روکا ہوگا، سو جنت اُس کا ٹھکانہ ہوگا۔"

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ذکر سے مراد اخلاص ہے، یعنی اخلاصِ نیت اور صدقِ دل کے ساتھ اللہ کو ذات وصفات میں یکتا تسلیم کرنا' ورنہ تو تمام کفار اللہ کو زبان سے یاد کرتے ہیں، لیکن دل سے یاد نہیں کرتے اور اس پر حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد گرامی دلیل ہے، من قال لا الہ الا اللہ خالصا من قلبه دخل الجنة:

"جو شخص اپنے دل کے خلوص سے لا الہ الا اللہ پڑھے وہ جنت میں داخل ہوگا"۔

اور "خوف" سے مراد ہے اپنے اعضاء وجوارح کو گناہوں سے باز رکھنا اور ان کو اللہ کی اطاعت وعبادت میں مشغول رکھنا، ورنہ تو یہ حدیث نفس اور حرکت ہے جو "خوف" کہلانے کا مستحق نہیں، اور یہ وسوسہ کسی ہولناکی کا سبب دیکھ کر پیدا ہوتا ہے' اور جب اُس سبب کا احساس ختم ہو جاتا ہے تو دل پھر غفلت والی کیفیت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

فضیلؒ فرماتے ہیں، کہ اگر تم سے پوچھا جائے کہ کیا تم اللہ سے ڈرتے ہو؟ تو جواب میں خاموش رہو، اس لئے کہ اگر تم نے جواب میں کہا نہیں، تو یہ کفر ہے، اور اگر تم نے کہا ہاں' تو یہ جھوٹ ہے۔ حضرت فضیلؒ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ

اصل خوف تو یہ ہے کہ اعضاء وجوارح اللہ کی نافرمانی سے باز رہیں۔

۵۳۵۰: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَهُمُ الَّذِيْنَ يَشْرَبُوْنَ الْخَمْرَ وَيَسْرِقُوْنَ قَالَ لَا يَا بِنْتَ الصِّدِّيْقِ وَلٰكِنَّهُمُ الَّذِيْنَ يَصُوْمُوْنَ وَيُصَلُّوْنَ وَيَتَصَدَّقُوْنَ وَهُمْ يَخَافُوْنَ اَنْ لَّا يُقْبَلَ مِنْهُمْ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٣٠٦/٥ حديث رقم ٣١٧٥ وابن ماجه فی السنن ١٤٠٤/٢ حديث رقم ٤١٩٨ واحمد فی المسند ١٥٩/٦

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے بارے کے متعلق دریافت کیا: وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ (وہ لوگ کہ جو دیتے ہیں اور جو کچھ کر دیتے ہیں یعنی ازقسم زکوٰۃ و صدقات ان کی حالت یہ ہے کہ ان کے دل لرزاں وترساں ہیں (یعنی ان پر خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے مسلمان بہن بھائیوں سے ایثار و ہمدردی کرنے کے باوجود وہ لوگ ہمہ وقت خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں کہ نجانے ہمارے ان اعمال کو شرف قبولیت بھی حاصل ہے یا یہ سب خدانہ کرے وبال ہی بنے گا۔ اسی آیت کے بارے میں آنحضرت ﷺ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ پوچھا تھا) کہ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں (کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنا گنہگاروں ہی کا کام ہے) حضور ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا: "صدیق کی بیٹی! نہیں' یہ وہ لوگ نہیں ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں' نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں لیکن اس سب کے باوجود وہ خائف رہتے ہیں کہ ان کے اعمال کو (شاید شرائط قبولیت کے پورا نہ ہونے کے باعث) قبول نہ کیا جائے (اس کی دلیل آیت کے آخری الفاظ ہیں) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خیر کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں (بایں طور کہ طاعات وعبادات کی طرف ان کی رغبت بہت زیادہ ہوتی ہے اور وہ سبقت کر کے ان چیزوں کو حاصل کرتے ہیں)۔" (ترمذی' ابن ماجہ)

تشریح: قوله: والذين يؤتون ماآتوا وقلوبهم وجلة:

ما آتوا: اس کو "ما أتوا" قصر کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

اس آیت کا بقیہ حصہ یہ ہے: [أنهم الى ربهم راجعون] کیونکہ ان کا مرجع اللہ ہے: ﴿اولئك الذين يسارعون فى الخيرات﴾ یعنی اطاعت وعبادت کا بہت زیادہ شوق رکھتے ہیں، اس لئے اطاعت وعبادت کی طرف آگے بڑھتے ہیں، [وهم لها سابقون] [المؤمنون: ٦١] یعنی عبادات کیلئے ایک دوسرے سے بڑھنے کا عمل کرتے ہیں۔

یا مطلب یہ ہے کہ عبادت یا ثواب کو حاصل کرنے یا جنت کی طرف دوسروں سے آگے بڑھتے ہیں۔

قوله: اهم الذين يشربون الخمر ويسرقون؟

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ مصابیح کے نسخوں میں اسی طرح ہے۔ اور یہی قراءت مشہورہ ہے اور معنی یہ ہے: يعطون ما

أعطوا۔ اور عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ سوال کرنا کہ "اھم الذین یشربون الخمر ویسرقون" سے مطابقت نہیں رکھتا'۔ اور رسول اللہ ﷺ کی قراءت "یأتون ما أتوا" بغیر مد کے ہے جس کا معنی ہے یعفلون ما فعلوا وہ لوگ کرتے ہیں، جو کچھ کرتے ہیں، اور عائشہ رضی اللہ عنہا کا سوال اس قراءت کے مطابق ہے۔ تفسیر زجاج اور تفسیر کشاف میں اسی طرح ہے۔

میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں کہ دونوں قراءتوں کا حاصل ایک ہی ہے، یفعلون ما فعلوہ من الطاعة۔ وہ معنی مراد نہیں جو معنی حضرت عائشہؓ سمجھی تھیں، کہ وہ لوگ مراد ہیں جو معصیت کرتے ہیں' اور نہ خیر وشر دونوں کو شامل ہونے والا عام معنی مراد ہے' کیونکہ اللہ کا ارشاد: [أُولَئك یسارعون فی الخیرات] اس کے مطابق نہیں ہے۔

قولہ: یا بنت الصدیق: اور ایک نسخہ میں "یا ابنة الصدیق" کے الفاظ ہیں۔

اس نداء میں حضرت عائشہؓ اور ان کے والد ماجد حضرت ابوبکرؓ کی بہت بڑی منقبت اظہار ہے، گویا کہ حضور علیہ السلام نے یوں فرمایا: "نہیں! بات اس طرح نہیں ہے جبکہ تم صادقہ ہو"۔ احباب کے ساتھ حسن آداب کے متعارف طریقہ کے مطابق ہے۔

قولہ: ولکنھم الذین یصومون ویصلون یتصدقون:

یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿والذین یؤتون ما آتوا﴾ کی تفسیر ہے۔ دونوں قراءتوں کے مطابق۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان دونوں میں ہر ایک قراءت کے موافق الفاظ میں یک گونہ تغلیب ہے۔ لہٰذا مشہور قراءت کا ظاہر مالی عبادت سے متعلق ہے جیسا کہ شاذ قراءت بدنی عبادت سے متعلق ہے۔

علاوہ ازیں مشہور قراءت کی تفسیر میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے: یعطون من انفسھم ماعطوا من الطاعات۔ اس طرح یہ آیت دونوں طرح کی عبادتوں کو شامل ہو جائے گی۔

قولہ: وھم یخافون ان لایقبل منھم:

یعنی یہ مطلب نہیں کہ وہ لوگ اپنے کیے ہوئے اعمال سے ڈر رہے ہونگے۔ اور دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿أُولَئك الذین یسارعون فی الخیرات﴾ چونکہ یہ درست نہیں ہے کہ اس کو شراب پینے، مال چوری کرنے اور دوسرے گناہوں پر محمول کیا جائے۔

۵۳۵۱: وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا ذَهَبَ ثُلُثُ اللَّيْلِ قَامَ فَقَالَ يَآيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا اللّٰهَ اذْكُرُوا اللّٰهَ جَآءَتِ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ جَآءَ الْمَوْتُ بِمَا فِيْهِ. (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵٤۹/٤ حدیث رقم ۲٤۵۷ واحمد فی المسند ۱۳٦/۵

ترجمہ: "حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جب رات کے دو تہائی حصے گزر جاتے تو حضور اقدس ﷺ (تہجد کی نماز کے لئے) اٹھتے اور فرماتے: "لوگو! اللہ کو (اس کی وحدانیت ذات اور اس کی تمام صفات کے ساتھ) یاد کرو' اللہ کو (یعنی اس کے عذاب وثواب کو) یاد کرو (تاکہ اس حالت پر قائم ہو سکو جس میں اللہ تعالیٰ سے خوف اور امید دونوں جمع ہوں اور ان لوگوں میں تمہارا شمار ہو جائے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ

رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا) زلزلہ عنقریب آنے والا ہے (یعنی پہلا صور پھونکا ہی جانے والا ہے جس کے ساتھ ہی سب مر جائیں گے) اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی آ رہا ہے جو بعد میں آنے والا ہے (یعنی پہلے صور کے بعد دوسرا صور بھی بس پھونکا ہی جانے والا ہے جس کی آواز سن کر سب دوبارہ زندہ ہو جائیں گے اور اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کر حشر کے میدان میں اکٹھے ہو جائیں گے۔ غرض یہ کہ ان الفاظ سے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود آخرت کی یاد دلانا اور قیامت کے بارے میں فکر پیدا کرنا ہے تا کہ یہ چیز طاعات و عبادات اور ذکر اللہ میں انہماک پیدا کرنے کا باعث ہو موت اپنے سے وابستہ تمام احوال کے ساتھ عنقریب آنے والی ہے' (مقصود ان لفظوں سے غفلت سے بیدار کر کے انسان کو ہوشیار کرنا ہے کہ 'تمہاری موت تمہارے سر پر تیار کھڑی ہے لہٰذا ان سب احوال سے مقابلہ کرنے کی تیاری کرو جو اس سے پہلے اور بعد میں واقع ہونے والے ہیں'۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: يا ايها الناس اذكرو الله: "الناس" سے مراد حضور علیہ السلام کے وہ صحابہ ہیں جو اللہ کے ذکر سے غافل سو رہے تھے۔ حضور علیہ السلام ان کو نیند سے بیدار کرتے تھے تا کہ اللہ کے ذکر اور تہجد میں مشغول ہو جائیں، اور یہ دلیل ہے کہ مؤذنین کو یاد دہانی کرانا درست ہے اور یہ کہ انہیں رات کے دو تہائی حصہ گزرنے سے پہلے نہیں اٹھنا چاہئے۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ رات کے اخیر تہائی حصہ میں عبادت کرنا ایک مؤکد مستحب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[**تتجافى جنوبهم عن المضاجع يدعون ربهم خوفا وطمعا**] [السجدة۔١٦]

اُن کے پہلو خوابگاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں، اس طور پر کہ وہ لوگ اپنے رب کو امید سے اور خوف سے پکارتے ہیں۔

اور ایک نسخہ میں "**اذكروا الله**" کے الفاظ تین بار مذکور ہیں

یعنی اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو۔

قوله: جاء ت الراجفة:

اس جملہ میں اس ارشاد باری تعالیٰ: ﴿**يوم ترجف الراجفة**﴾ [النازعات۔٦] کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس کے وقوع کے تحقق پر دلالت کرنے کیلئے ماضی کے صیغہ سے تعبیر کیا، گویا کہ وہ قیامت کا زلزلہ آ چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے زلزلہ کا وقوع قریب آ چکا ہے، چنانچہ اس کے لئے تیاری کرو، کیونکہ اس کا معاملہ بڑا سخت ہے۔

"**الراجفة**" سے مراد زمین اور پہاڑ کے وہ ساکن اجسام ہیں جن کی حرکت اس وقت تیز ہو جائے گی۔ اس لئے کہ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے: ﴿**يوم ترجف الارض والجبال**﴾ [المزمل: ١٤] "جس روز کہ زمین اور پہاڑ ہلنے لگیں گے" یا مجازاً وہ واقعہ مراد ہے، جس میں یہ اجرام حرکت کرنے لگیں گے۔ اور اس جگہ یہ معنی حدیث کے زیادہ مناسب ہے اور یہی "**نفخه اولى**" ہے۔

قوله: تتبعها الرادفة: "رادفه" سے مراد آسمان کا پھٹ جانا اور ستاروں کا بکھر جانا ہے۔ یا نفخہ ثانیہ مراد ہے۔ اور دوسرا نفخہ وہ ہے جس میں مخلوق کو زندہ کیا جائے گا یہ جملہ موضع حال میں ہے یا جملہ مستأنفہ ہے زلزلہ کے بعد والے احوال کا بیان ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "**الراجفة**" سے مراد پہلی بار صور پھونکنا ہے، جس سے تمام مخلوق مر جائے گی، اور "**الراجفة**" بجلی

چمکنے کے وقت گرج کی آواز کی طرح ایک بلند آواز کہ جس میں تردد واضطراب ہوتا ہے۔ اور "الرادفة" سے مراد دوسری بار صور پھونکنا ہے، جو کہ پہلی بار صور پھونکنے کے بعد پھونکا جائے گا۔ حضور علیہ السلام نے صحابہ کو قیامت کے قریب ہونے سے ڈرایا تا کہ قیامت کیلئے تیاری کرنے سے غافل نہ رہیں۔

قوله: جاء الموت بما فيه جاء الموت بما فيه:

یعنی وہ تکالیف اور سختیاں جو حالت نزع، قبر اور قبر کے بعد کے منازل میں پیش آئیں گی۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جو مر گیا اس کی قیامت قائم ہوگئی۔ اور یہ قیامت صغریٰ ہے جو قیامت کبریٰ پر دال ہے۔

ممکن ہے کہ پہلے جملے میں ہماری عبرت کیلئے پہلے لوگوں کی حالت کو بیان کیا گیا ہو، جن کو موت وہلاکت کا واقعہ پیش آیا ہے۔ چنانچہ مروی ہے: "كفى بالموت واعظاً" موت انسان کی نصیحت کیلئے کافی ہے۔ اور دوسرے جملے میں موجود لوگوں پر موت کے قریب ہونے کی طرف اشارہ ہو اور تکرار کو ایسے نئے معنی پر محمول کرنا جو کہ درست بھی ہے اور اس کی بنیاد تابید (ہمیشگی) پر ہے اس سے بہتر ہے کہ تاکید پر محمول کیا جائے۔

تخریج: منذریؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت کو احمد، ترمذی اور حاکم نے نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

۵۳۵۲ : وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدٍ قَالَ خَرَجَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِصَلٰوةٍ فَرَاَى النَّاسَ كَاَنَّهُمْ يَكْتَشِرُوْنَ قَالَ اَمَا اِنَّكُمْ لَوْ اَكْثَرْتُمْ ذِكْرَهَاذِمِ اللَّذَّاتِ لَشَغَلَكُمْ عَمَّا اَرٰى اَلْمَوْتَ فَاَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتِ فَاِنَّهُ لَمْ يَاْتِ عَلَى الْقَبْرِ يَوْمٌ اِلَّا تَكَلَّمَ فَيَقُوْلُ اَنَا بَيْتُ الْغُرْبَةِ وَاَنَا بَيْتُ الْوَحْدَةِ وَاَنَا بَيْتُ التُّرَابِ وَاَنَا بَيْتُ الدُّوْدِ وَاِذَا دُفِنَ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ قَالَ لَهُ الْقَبْرُ مَرْحَبًا وَاَهْلًا اَمَا اِنْ كُنْتَ لَاَحَبَّ مَنْ يَمْشِىْ عَلٰى ظَهْرِىْ اِلَىَّ فَاِذَا وُلِّيْتُكَ الْيَوْمَ وَصِرْتَ اِلَىَّ فَسَتَرٰى صَنِيْعِىْ بِكَ قَالَ فَيَتَّسِعُ لَهُ مُدَّ بَصَرِهِ وَيُفْتَحُ لَهُ بَابٌ اِلَى الْجَنَّةِ وَاِذَا دُفِنَ الْعَبْدُ الْفَاجِرُ اَوِ الْكَافِرُ قَالَ لَهُ الْقَبْرُ لَا مَرْحَبًا لَهُ وَلَا اَهْلًا اِمَا اِنْ كُنْتَ لَاَبْغَضَ مَنْ يَمْشِىْ عَلٰى ظَهْرِىْ اِلَىَّ فَاِذْ وُلِّيْتُكَ الْيَوْمَ وَصِرْتَ اِلَىَّ فَسَتَرٰى صَنِيْعِىْ بِكَ قَالَ فَيَلْتَئِمُ عَلَيْهِ حَتّٰى تَخْتَلِفَ اَضْلَاعُهُ قَالَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاَصَابِعِهِ فَاَدْخَلَ بَعْضَهَا فِىْ جَوْفِ بَعْضٍ قَالَ يُقَيَّضُ لَهُ سَبْعُوْنَ تِنِّيْنًا لَوْاَنَّ وَاحِدًا مِنْهَا نَفَخَ فِى الْاَرْضِ مَا اَنْبَتَتْ شَيْئًا مَا بَقِيَتِ الدُّنْيَا فَيَنْهَسْنَهُ وَيَخْدِشْنَهُ حَتّٰى يُفْضٰى بِهِ اِلَى الْحِسَابِ قَالَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ اَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ

(رواه الترمذي)

اخرجه الترمذي في السنن ٥٥١/٤ حديث رقم ٢٤٦٠ والنسائي في السنن ٤/٤ حديث رقم ١٨٢٤ وابن ماجه في السنن ١٤٢٢/٢ حديث رقم ٤٢٥٨

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے (مسجد میں) تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ گویا لوگ (آپس میں کسی بات پر) ہنس رہے ہیں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کو یوں ہنستے ہوئے دیکھ کر) فرمایا: ''جان لو! (تم کس غفلت کا شکار ہو کر یوں بے فکری کے ساتھ ہنسنے میں محو ہو) اس بات میں کوئی شبہ نہیں اگر تم لذتوں کو مٹا دینے والی چیز کا کثرت سے تذکرہ کرتے رہو تو وہ تم کو اس چیز سے باز رکھے جو مجھے دکھائی دے رہی ہے اور وہ (یعنی لذتوں کو فنا کر دینے والی شے) موت ہے پس تم لذتوں کو فنا کر دینے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو! حقیقت یہ ہے کہ قبر پر ایسا کوئی دن (یعنی ایسا کوئی وقت اور زمانہ نہیں گزرتا جس میں وہ (زبان قال یا زبان حال سے) یہ نہ کہتی ہو کہ ''میں غربت کا گھر ہوں''، ''میں تنہائی کا گھر ہوں''، ''میں خاک کا گھر ہوں'' (یعنی میں اس مٹی کا گھر وندہ ہوں جو ہر جاندار کی اصل اور بنیاد ہے پس جس کی اصل اور جس کا مرجع مٹی ہو اس کے شایان شان یہی ہے کہ وہ مسکنت و عجز وانکساری کی زندگی گزارے) اور ''میں کیڑوں مکوڑوں کا گھر ہوں'' (پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) جب کسی مؤمن بندے کو دفن کیا جاتا ہے تو قبر اس سے کہتی ہے کہ خوش آمدید! تمہاری آمد اچھی کشادہ' آرام کی جگہ اور اپنے ہی گھر میں ہوئی ہے' جان لو! کہ تم میرے نزدیک ان لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب تھے جو مجھ پر چلتے ہیں' پس آج جب کہ تم پر حاکم و قادر بنا گئی ہوں اور تم میرے سامنے مجبور و مقہور ہوئے ہو تو تم عنقریب میرے اس نیک سلوک کا نظارہ کرو گے۔ جو میں تمہارے ساتھ کرنے والی ہوں (یعنی میں تمہارے لئے وسیع و فراخ ہو جاؤں گی)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے بعد وہ قبر اس بندے کے کشادہ و فراخ ہو جاتی ہے اور وہ کشادگی و فراخی اس کو اپنی تا حد نگاہ دکھائی دیتی ہے اور پھر اس کے لئے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے (جس میں وہ جنت میں اپنے مقام اصلی کا نظارہ کرتا رہتا ہے' اسی دروازہ سے گزر کر اس تک ٹھنڈی اور مشکبار ہوائیں آتی ہیں اور جنت کے محلات' حوریں' نہریں' میوے اور درخت اور دوسری روح افزاء نعمتوں کا نظارہ اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتا ہے) اور جب کوئی فاسق یا کافر شخص دفن کیا جاتا ہے تو (جس طرح کوئی شخص اپنے یہاں آئے ہوئے ناآشنا وغیرہ عزیز اور بن بلائے مہمان کے ساتھ بے رخی اور بے مروتی کا سلوک کرتا ہے تو اسی طرح قبر (بھی اس کافر یا فاسق کو جھڑکتی ہے اور کہتی ہے کہ) نہ تو تیرا آنا مبارک اور نہ تو اچھی کشادہ راحت و چین کی جگہ اور اپنے مکان میں آیا ہے! یاد رکھ! کہ تو میرے نزدیک ان لوگوں میں سب سے مبغوض تھا جو مجھ پر چلتے ہیں۔ پس آج جب کہ مجھے تم پر حاکم و قادر بنا دیا گیا ہے اور تو میرا مجبور و مقہور ہوا ہے تو جلد ہی دیکھ لے گا کہ میں تیرے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' اور پھر قبر اس کو دباتی ہے یہاں تک کہ اس کی پسلیاں ادھر کی ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں''۔ ابوسعید رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان پسلیوں کی کیفیت سمجھانے کی خاطر) اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کیا (اور بتایا کہ اس طرح قبر کے تنگ ہو جانے کی وجہ اس کافر کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں) اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''اس کافر پر ستر اژدھے مسلط کر دیے جاتے ہیں (اور وہ ایسے اژدھے ہوتے ہیں کہ) اگر ان میں سے کوئی ایک اژدہا بھی زمین پر پھونک مار دے تو وہ زمین رہتی دنیا تک کچھ بھی اگانے کے قابل نہ رہے' وہ اژدھے اس کافر کو کاٹتے اور نوچتے ہیں۔ (اور یہ عمل اس وقت تک مسلسل جاری رہے گا جب تک کہ اس بندہ کو (روز قیامت) حساب کے لئے نہ لے جایا جائے'' حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ''اس میں کوئی شک نہیں کہ قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا

ہے"۔(ترمذی)

تشریح: قولہ:خرج النبی ﷺ لصلاۃ فرأی الناس کانھم یکتشرون:(مضاف محذوف ہے۔)ای لاداء الصلاۃ اور مقام کے مقتضی سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نماز جنازہ تھی کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام جب جنازہ دیکھتے تو آپ پر غم و پریشانی کے اثرات ظاہر ہو جاتے تھے اور باتیں کرنا کم کر دیتے تھے۔

یکتشرون :ی یضحکون:(ہنس رہے تھے)۔"الکشر" سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے دانتوں کا ظاہر ہو جانا اور شاید تاء مبالغہ کیلئے ہو۔اور قاموس میں ہے: کشر عن اسنانه ابدی۔ کا معنی ہے ہنسی کی حالت میں دانتوں کا ظاہر ہو جانا، انتہی۔ چنانچہ اس سے یہ معنی اخذ ہو رہا ہے کہ لوگ خوب ہنس رہے تھے اور بہت زیادہ باتیں بھی کر رہے تھے۔

شیخ توریشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "یکتشرون" کا معنی ہے یضحکون (ہنس رہے تھے) اور لغت میں مشہور "الکسر" ہے۔

قولہ:قال :اما انکم لو اکثر تم۔۔۔ عما أری الموت:

أما: تخفیف کے ساتھ، غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کے لئے یہ کلمہ استعمال فرمایا' کہ غفلت کی وجہ سے زیادہ ہنسی اور آپس کی باتیں ہو رہی تھیں۔

هادِم اللذات: سید صاحب اصل میں اور دوسرے اکثر معتمد نسخوں میں "دال مہملہ" کے ساتھ ہے اور بعض معتمد نسخوں میں "ذال معجمہ" کے ساتھ ہے۔اور علامہ سیوطیؒ نے ترمذی کے حاشیہ میں اسی پر اکتفاء کیا ہے۔

قاموس میں "ھذم" (نقطہ کے ساتھ) کا معنی "قطع کیا اور جلدی سے کھالیا" لکھا ہے۔اور "ھدم" (بغیر نقطہ کے) کا معنی لکھا ہے "عمارت گرانا"۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم لوگ لذتوں کو توڑنے والی چیز (موت) کو بکثرت یاد کرو۔

الموت: مجرور ہے "ھاذم اللذات" کی تفسیر ہے۔ یا اس سے بدل ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔اور "اعنی" فعل محذوف کی بناء پر منصوب ہونا بھی درست ہے اور "ھو الموت" کی تقدیر پر مرفوع ہونا بھی درست ہے۔

قولہ:فاکثروا ذکر ھادم اللذات:

جو لذتیں مالداروں کے پاس موجود ہیں اور فقراء مساکین سے مفقود ہیں اور ان کو مطلوب ہیں۔ یہ فقراء و اغنیاء دونوں کیلئے ایک مؤثر نصیحت ہے، اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ موت غافل دل کو زندہ رکھتی ہے حالانکہ نیند خود موت کے مشابہ ہے۔

ہمارے شیخ عارف باللہ مولانا نورالدین علی متقی نے ایک تھیلی بنا کر اپنے پاس رکھی ہوئی تھی جس پر لفظ موت لکھا ہوا تھا، اور جب کوئی مرید آتا تو مرید کی گردن میں لٹکا دیتے تھے تاکہ یہ بات یاد رہے کہ موت قریب ہے دُور نہیں ہے، تاکہ اپنی امیدوں کو مختصر کریں اور عمل کی کثرت کریں۔

ایک بادشاہ نے اپنے ارکان سلطنت میں سے کسی ایک کو اس بات پر مامور کر رکھا تھا کہ وہ ہر وقت ان کے پیچھے کھڑا رہے اور "الموت، الموت" کہتا رہے تاکہ غفلت کی بیماری کا علاج ہوتا رہے۔

اگلے کلام میں حضور علیہ السلام نے موت کو اکثر اوقات یاد رکھنے اور اس کے اسباب کی حکمت بتائی۔

قولہ: فانه لم يأت على القبر۔۔۔۔ وانا بيت الدود:

فانه: ضمیر شان ہے۔

لم يأت على القبر يوم: کوئی وقت اور زمانہ۔

الا تكلم: بزبان قال یا بزبان حال، اور ایک روایت میں ("الاتکلم" کے بعد) "فیه" (ای فی ذالك اليوم) کی زیادتی ہے۔

وأنا بيت الوحدة: چنانچہ توحید اور ایک واحد وقہار ذات کا استحضار ہی فائدہ دیگا۔

أنا بيت التراب: یعنی ہر زندہ مخلوق کی اصل ہوں۔ چنانچہ جس شخص نے مٹی میں لوٹنا ہے اس کو چاہئے کہ وہ مسکین وخاک نشین ہوکر رہے تاکہ مٹی سے اس کی مناسبت فوت نہ ہو۔

وأنا بيت الدود: لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ کھانے پینے کی لذیذ چیزوں کو استعمال کرنے کی کوشش کرو، کیونکہ ان کا انجام فنا ہے اور اس جگہ نیک عمل کے علاوہ کوئی چیز کارآمد نہیں ہوسکتی۔ کہ قبر عمل کا صندوق ہے۔

کہا گیا ہے کہ جسم کے سڑنے سے کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں، اور اعضاء کو کھاتے ہیں، پھر وہ کیڑے ایک دوسرے کو کھانا شروع کردیتے ہیں، یہاں تک کہ آخر میں ایک کیڑا رہ جاتا ہے، پھر وہ کیڑا بھی بھوک کی وجہ سے مرجاتا ہے۔ انبیاء کرام، شہداء، اولیاء اور علماء اس سے مستثنیٰ ہیں، حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: ان الله حرم على الارض أن تاكل اجساد الانبياء۔ کہ "اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کرام کے اجسام کو کھانا حرام کردیا ہے"۔ اور اللہ تعالیٰ نے شہداء کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا بل احياء عند ربهم يرزقون﴾ [آل عمران: ١٦٩] "اور اے مخاطب! جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے ان کو مردہ مت خیال کرو، بلکہ وہ تو زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے مقرب ہیں، ان کو رزق ملتا ہے"۔

اور باعمل علماء جن کو اولیاء اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے، ان (کے قلم) کی روشنائی شہداء کے خون سے افضل ہے۔

قوله: واذا دفن العبد المؤمن ۔۔۔۔يفتح له باب الى الجنة:

له القبر: یا جو قبر کے قائم مقام ہو۔

مرحبًا: ای أيت مكانا واسعا یعنی تم آرام کیلئے ایک کشادہ جگہ میں آئے ہو۔

وأهلا. اى وحضرت اهلا: تم اپنے لوگوں کے پاس آگئے ہو جو تجھ سے محبت کریں گے۔

أما: میم کی تخفیف کے ساتھ تنبیہ کیلئے ہے۔

ان كنت: ای "انه كنت" چنانچہ" ان "مخففه از مثقله ہے،

لاحب: "لام" فارقه ہے" ان" مخففه از مثقله، اور" ان" نافیہ کے درمیان فرق کے لئے ہے۔

لأحب: اسم تفضیل ہے مبنی للمفعول ہے بمعنی ای 'أفضل"

إلي: "أحب" کے متعلق ہے۔

فاذ: ذال کے سکون کے ساتھ ہے اور علامہ طیبیؒ کا یہ فرمانا کہ "اذ" میں تعلیل کا معنی ہے، بعید از مرام ہے۔ اس لئے کہ صحیح بات یہ ہے کہ اذ محض ظرف ہے وعلت اور سبب تو انسان کا مومن ہونا ہے، ای حین

ولیتك "التولیة" سے ماخوذ ہے اور مجہول کا صیغہ ہے یا "الولایة" مصدر سے مأخوذ ہے اور معروف کا صیغہ ہے: ای صرت قادرا حاکما علیك یعنی میں تم پر حاکم وقادر ہوگئی ہوں۔

الیوم: "اب" مراد موت اور تدفین کے بعد کا وقت ہے۔

فستری: بمعنی بصارت وعلم ہر دو کا احتمال ہے۔ (تو دیکھے گا یا مطلب یہ ہے کہ تو جان لے گا۔)

صنیعی بك: تیرے لئے کشادہ ہو کر تیرے ساتھ احسان کا سلوک۔

قال: یعنی حضور علیہ السلام نے کہا: "قال" کا اعادہ کلام طویل ہونے کی وجہ سے کیا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ کہیں کوئی یہ وہم نہ کرے کہ اس کے بعد والا کلمہ راوی کا ہے، اور راوی نے اگلی بات مزید وضاحت اور تفسیر کیلئے کی ہے۔

فیتبع: قبر کشادہ ہو جاتی ہے۔، اور ایک دوسری روایت میں "فیوسع" کا لفظ ہے۔

مد بصرہ: یعنی ہر طرف سے۔ یا تو حقیقۃ اس طرح ہوتا ہے یا بطور کشف کے یا مجازاً حسی اور معنوی تنگی کا نہ ہونا مراد ہے اور یہ کنایہ ہے کہ اس کی قبر روشن کر دی جاتی ہے۔ اور جنت کا مقام اس کو دکھا دیا جاتا ہے اور اس دروازے سے اس تک جنت کی ٹھنڈی ہوا اور خوشبوئیں آتی رہتی ہیں، اور جنت کے محلات، حوروں، درختوں اور پھلوں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی رہتی ہیں۔

قولہ: واذا دفن العبد الفاجر۔۔۔ فادخل بعضھا فی جوف بعض:

یعنی فاسق' اس سے کامل ترین فرد یعنی کافر مراد ہے۔ اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں اس سے پہلے "العبد المؤمن" مذکور ہے۔ اور دوسرا قرینہ قبر کے یہ الفاظ ہیں: **کنت لابعض من فمشی علی ظھری الی** اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿**أفمن كان مؤمنا كمن كان فاسقا**﴾ [السجدة:١٨] "تو جو شخص مومن ہو کیا وہ اس شخص جیسا ہو جائے گا جو بے حکم ہو۔"

او الکافر: یہ راوی کی طرف سے شک ہے، نوع بتانے کے واسطے نہیں ہے۔ جبکہ قرآن وسنت کا اسلوب بیان یہ ہے کہ دنیا وآخرت کے احوال مومن وکافر کے اعتبار سے ان دو فریقوں کے بارے میں حکم ذکر کیا جاتا ہے۔ اور فاسق مومن کے بارے میں سکوت اختیار کیا جاتا ہے، تاکہ پردہ پوشی ہو جائے' اور یہ مومن رجاء خوف کے درمیان رہے اس سے دو مرتبوں (کفار اور مؤمنین کے درمیان) کوئی تیسرا مرتبہ ثابت کرنا مقصود نہیں ہے، جیسا کہ معتزلہ کو وہم ہوا ہے۔

حتی یختلف اضلاعه: پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں، اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "حتی تلتقی وتختلف اضلاعه"۔

فادخل بعضھافی جوف بعض: اس میں قبر کی تنگی کی طرف اشارہ ہے اور اس بات کی طرف کہ پسلیوں کا اک

دوسرے میں گھس جانا ایک حقیقی امر ہے اس سے احوال قبر کی تنگی مراد نہیں ہے اور لفظ "اختلاف" سے معلوم ہو رہا ہے کہ قبر کو خوب تنگ کیا جاتا ہے، جیسا کہ بعض کم فہم لوگوں نے سمجھا ہے، حتی کہ انہوں نے عذاب قبر کو روحانی عذاب قرار دیا ہے۔ جسمانی عذاب کے قائل نہیں ہیں۔ صحیح بات یہی ہے کہ آخرت کا عذاب اور راحت روح اور جسم دونوں سے متعلق ہے۔

قوله: ويقيض له سبعون تنينا۔۔ يفضي الى الحساب:

يقيض: یائے مفتوحہ کی تشدید کے ساتھ

له: یعنی خاص اسی کے لئے ہوتے ہیں، ورنہ "**عليه**" کا لفظ ہوتا۔

تنينا: تاء کے کسرہ اور پہلی نون مکسورہ کی تشدید کے ساتھ بہت بڑا سانپ جس کو فارسی میں "اژدہا" اور عربی میں "**افعٰی**" کہا جاتا ہے۔

ستر کے عدد سے متعین عدد بھی مراد ہوسکتا ہے اور کثرتِ مقدار بھی مراد ہوسکتی ہے۔

دوسری توجیہ کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جس کو "احیاء" میں ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ قرآن کی آیت: ﴿**فان له معيشة ضنكا**﴾ [طٰہ۔۱۲۴] "تو اس کے لئے تنگی کا جینا ہے" کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اُس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ قبر میں کافر کے عذاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے، قبر میں کافر پر ننانوے اژدہے مسلط کئے جاتے ہیں۔ پھر حضور علیہ السلام نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ اژدھا کیسا ہوگا؟ پھر فرمایا کہ ننانوے اژدہے ہوتے ہیں، ہر ایک اژدہا کے ننانوے سر ہوتے ہیں، وہ اژدہے قیامت تک اس کو ڈستے رہتے گے نوچتے رہیں گے، اور اس کے جسم میں پھکار مارتے رہیں گے، انتہیٰ۔

نفخ: نقطہ والی خاء کے ساتھ یعنی سانس لے۔ زمین یعنی کوئی سبزہ نہیں اُگائے گی، یا ذرا سا اُگانا بھی نہیں کرے گی۔

فينهسنه: ھا کے فتحہ اور سین کے سکون کے ساتھ، اس کو ڈستے رہتے ہیں۔ قاموس میں لکھا ہے کہ "**نهس**"، از باب **منع** **فرح** ہے اور "**نهس اللحم**" کا معنی ہے گوشت نوچنا

يخدشه: دال کے کسرہ کے ساتھ،

حتى يفضي: "یاء" کے ضمہ، "فا" کے سکون اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ

به). اس کافر کو

وہاں عذاب دیا جاتا ہے۔

یہ حدیث دلیل ہے کہ کافر کا محاسبہ کیا جائے گا، اس کے برعکس دوسرے بعض کو وہم ہوا ہے کہ کافر بغیر حساب وکتاب کے جہنم میں داخل ہوگا، الا یہ کہ یوں کہا جائے کہ حساب سے مراد جزاء ہے اور ارشاد باری: ﴿**ومن خفت موازينه**﴾ [المؤمنین ۱۰۳ الاعراف۔۹] "اور جس شخص کا پلہ ہلکا ہوگا" جیسی صریح آیات حساب پر دلالت کرتی ہیں، ہاں ممکن ہے کہ بعض سرکش نافرمان بغیر حساب وکتاب کے جہنم میں داخل کردیے جائیں، جیسا کہ بعض بہت ہی صابر و متوکل مومن بغیر حساب کے جنت میں

داخل ہونگے، جیسا کہ پہلے یہ بات گزر گئی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

قولہ: قال: وقال رسول اللہ ﷺ انما القبر الخ:

وقال رسول اللہ..... مسلم): اس موقع پر یا کسی دوسرے موقع پر۔

انما القبر..... من حفر النار: مفرد کے صیغہ کے ساتھ لفظ "الجنة" کے ساتھ مناسبت ہے۔ اور ایک نسخہ میں صیغہ جمع "نیران" مروی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ الجنة سے مراد "الجنان" ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "من حفر النار" کے الفاظ جامع ترمذی، جامع الاصول اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں ہیں اور مصابیح کے بعض نسخوں میں جمع کا صیغہ "النیران" ہے۔

قولہ: رواہ الترمذی: علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں، اور امام ترمذی نے اس کو حسن قرار دیا ہے۔

طبرانی نے اوسط میں ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے قال: **خرجنا مع رسول اللہ ﷺ فی جنازة فجلس الی قبر فقال: ما یأتی علی هذا القبر من یوم الا وهو ینادی بصوت طلق ذلق: یا ابن آدم کیف نسیتنی الم تعلم أنی بیت الوحدة وبیت الغربة وبیت الوحشة وبیت الدود وبیت الضیق الا من وسعنی الله علیه ثم قال رسول الله ﷺ: القبر روضة** ۔ اور ایک نسخہ میں 'اما **روضة من ریاض الجنة أو حفر من حفر النار** وہ فرماتے ہیں کہ ہم حضور علیہ السلام کے ساتھ ایک جنازہ میں شریک ہوئے حضور علیہ السلام ایک قبر کے پاس تشریف فرما ہوئے اور فرمایا کہ اس قبر پر کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس میں یہ قبر اونچی آواز سے یہ نہ کہتی ہو کہ اے ابن آدم تو مجھے کیسے بھلا بیٹھا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں تنہائی کا گھر ہوں اور میں اجنبیت کا گھر ہوں، اور میں وحشت اور کیڑوں کا گھر ہوں اور میں ایک تنگ گھر ہوں، ہاں جس شخص کیلئے اللہ مجھے وسیع کر دے اس کے لئے وسیع گھر ہوں۔ پھر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ قبر باغ ہے' اور ایک نسخہ ہے کہ "قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں: **من اکثر من ذکر القبر وجده روضة من ریاض الجنة 'ومن غفل عن ذکره وجده حفرة من حفر النار**۔

"جو قبر کو اکثر اوقات یاد کرتا رہے گا وہ اس کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغیچہ پائے گا، اور جو قبر کے ذکر سے غافل ہوگا وہ اس کو جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا پائے گا۔"

۵۳۵۳ : وَعَنْ اَبِیْ جُحَیْفَةَ قَالَ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَدْ شِبْتَ قَالَ شَیَّبَتْنِیْ سُوْرَةُ هُوْدٍ وَاَخَوَاتُهَا. (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۷۵/۵ حدیث رقم ۳۲۹۷

ترجمہ: "حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ جب صحابہؓ نے یہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ تو بوڑھے ہوگئے' یعنی عمر کی زیادتی سے قبل ہی آپ پر بڑھاپے کے اثرات نمایاں ہونے لگے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "سورۂ ہود اور اس کی مثل سورتوں نے (کہ جن میں قیامت اور اس کے احوال کا تذکرہ ہے) مجھ کو بوڑھا کر دیا ہے"۔ (ترمذی)

تشریح: **وعن ابی جحیفہ:** جیم کے ضمہ، حاء کے فتحہ اور فاء کے ساتھ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت حضور علیہ السلام کا انتقال ہوا تو یہ بلوغ کو نہیں پہنچے تھے، لیکن حضور علیہ السلام سے احادیث سُن کر نقل کیں۔ کوفہ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان سے ان کے بیٹے عون نے اور تابعین کی ایک جماعت نے احادیث نقل کی ہیں۔

قولہ: یا رسول اللّٰہ! قد شبت:

بعض نے یہ معنی لکھا ہے کہ آپ بوڑھے ہو گئے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ حضور علیہ السلام کے سر مبارک میں بہت زیادہ سفید بال ظاہر ہو گئے تھے کیونکہ امام ترمذیؒ نے حضرت انسؓ کی سند سے نقل کیا ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں: **ماعددت فی رأس رسول اللہ ﷺ ولحیة الاأربع عشرة شعرة بیضا۔**

خلاصہ یہ ہے کہ نے حضور علیہ السلام کے سر اور داڑھی میں سفید بال شمار کیے تو صرف چودہ (۱۴) بال سفید تھے۔

قولہ: قال شیبتنی سورة ھود واخواتھا:

"ھود" کو غیر منصرف نقل کیا گیا ہے اور ایک نسخہ میں منصرف بھی ضبط کیا گیا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اگر "ھود" سورت کا نام ہو تو غیر منصرف ہے ورنہ منصرف ہے چنانچہ اس صورت میں مضاف مقدر ہوگا۔ میں (ملا علی قاریؒ کہتا ہوں) کہ جب "ھود" غیر منصرف پڑھا جائے گا تو "جور" کی طرح ہے اور جب منصرف پڑھا جائے گا تو اس کی تقدیر "سورة ھود" ہوگی۔ اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ایک صحیح نسخہ میں "سورة ھود" کے الفاظ ہیں۔

شیخ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کی خوفناکی اور گذشتہ امتوں کے ساتھ پیش آنے والے حوادث کا مجھے اتنا زیادہ غم وفکر ہے کہ اپنی امت پر خوف سے بڑھاپے کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی میں بوڑھا ہو گیا۔

شرح السنہ میں کسی صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ وہ فرماتے ہیں، میں نے خواب میں حضور علیہ السلام کی زیارت کی تو میں نے عرض کیا کہ آپ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: "مجھے سورۂ ھود نے بوڑھا کر دیا"۔ تو اس سورت کی کونسی آیت مراد ہے؟ اس کے جواب میں آپؐ نے ارشاد فرمایا: [**فاستقم کما امرت**"][ھود: ۱۱۲] "تو آپ جس طرح کہ آپ کو حکم ہوا ہے (راہِ دین پر) مستقیم رہیے"۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیدھے راستے پر اس طرح سیدھا چلنا کہ عقائد اور ظاہری و باطنی اعمال میں افراط وتفریط میں سے کسی طرف بھی جھکاؤ نہ ہو یہ بہت مشکل ہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ استقامت ہزار کرامتوں سے بہتر ہے کیونکہ استقامت پُل صراط سے زیادہ مشکل ہے حالانکہ پُل صراط بال سے زیادہ باریک ہے، ایلوا سے زیادہ کڑوا ہے تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ موسم گرما کی شدید ترین گرمی سے زیادہ گرم ہے، لیکن حدیث کو آیت پر محمول کرنا خلاف ظاہر ہے۔ اس لئے کہ "ھود جیسی سورتوں" کی تفسیر ان سورتوں سے کی گئی ہے جو آئندہ مذکور ہیں اور ان میں استقامت کا ذکر نہیں ہے۔ اس لئے یہ کہا جائے کہ قیامت اور اس کی ہولناکی اور جہنم اور اس کی ہولناکی کو ذکر کرنے سے مقصود استقامت حاصل کرنا ہے تاکہ ندامت اور ملامت سے خلاصی حاصل ہو جائے، تو گویا کہ استقامت کا ذکر تمام سورتوں میں موجود ہے۔

یا یہ کہا جائے کہ حضور علیہ السلام نے خواب دیکھنے والے کو اس کے مقام کے مناسب جواب دیا اور اُس سے جو چیز مطلوب تھی اُس پر اُبھارنے کی مناسبت سے اس طرح جواب دیا لہٰذا یہ حکیمانہ اسلوب کے باب سے ہے۔ واللہ اعلم۔

تخریج: اس حدیث کو طبرانی نے عقبہ بن عامر اور ابو جحیفہ سے بھی نقل کیا ہے اور ابن مردویہ نے ابو بکر سے "قبل المشیب" "بڑھاپے سے پہلے" کے الفاظ کی زیادتی کے ساتھ نقل کیا ہے۔

۵۳۵۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ شِبْتَ قَالَ شَيَّبَتْنِيْ هُوْدٌ وَالْوَاقِعَةُ وَالْمُرْسَلٰتُ وَعَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ وَاِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ.

(رواه الترمذی و ذكر حديث ابی هريرة لا يلج النار فی كتاب الجهاد)

اخرجه الترمذی ٣٧٥/٥ حديث رقم ٣٢٩٧

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ تو (بہت جلد) بوڑھے ہو گئے؟ جناب رسالت مآب ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں! سورۂ ہود، سورۂ واقعہ، سورۂ مرسلات، عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت (اور ان کی مثل دیگر سورتوں) نے (کہ جن میں قیامت اور اس کے احوال کا تذکرہ ہے) مجھ کو (عمر کی زیادتی سے پہلے ہی) بوڑھا کر ڈالا ہے"۔ (ترمذی) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت لا یلج النار ...... کو کتاب الجہاد میں نقل کیا جا چکا ہے۔

تشریح: والمرسلات: رفع کے ساتھ منقول ہے، اور اعراب حکائی کی بناء پر کسرہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔

اس حدیث کو امام حاکم نے نقل کیا ہے، امام حاکمؒ نے اس حدیث کو ابو بکرؓ سے بھی نقل کیا ہے اور ابن مردویہ نے اس حدیث کو سعدؓ سے اور سعید بن منصور نے اپنی سنن میں حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔

ابن مردویہ نے اس کو عمرانؓ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: "**شيبتنی هود واخواتها من المفصل**"۔

ابن مردویہ نے حضرت انسؓ سے ایک روایت میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

"**شيبتنی سورة هود واخواتها الواقعة والقارعة والحاقة واذا الشمس كورت وسأل سائل**"

قول: وذكر حديث ابی هريرة يلج النار:

۵۳۵۵: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنَّكُمْ لَتَعْمَلُوْنَ اَعْمَالاً هِيَ اَدَقُّ فِيْ اَعْيُنِكُمْ مِنَ الشَّعْرِ كُنَّا نَعُدُّهَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمُوْبِقَاتِ يَعْنِي الْمُهْلِكَاتِ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٣٢٩/١١ حديث رقم ٦٤٩٢ والدارمی فی السنن ٤٠٧/٢ حديث رقم ٢٧٦٨ واحمد فی المسند ٧٠/٦۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ نے (اپنے دور کے اہل اسلام کو مخاطب کر کے) ارشاد فرمایا" تم ایسے کام کرتے ہو جو تمہاری نظر میں بال سے بھی زیادہ باریک ہیں (یعنی نہایت معمولی ہیں) لیکن ہم ان اعمال کو رسول اللہ ﷺ کے زمانے

میں موبقات یعنی ہلاک کرنے والے کاموں میں شمار کیا کرتے تھے"۔ (بخاری)

تشریح: یعنی جو حقیقت میں بہت بڑے ہیں، اور تم ان کو چھوٹا سمجھتے ہو۔ یہی معنی ہے اگلے جملہ کا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ اس سے مراد کسی عمل میں غور کرنا اور باریک نگاہ سے دیکھنا ہے اور مطلب یہ ہے کہ تم اعمال کرتے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ تم اچھے اعمال کر رہے ہو حالانکہ حقیقت میں اس طرح نہیں ہے۔

الموبقات: "باء" کے کسرہ کے ساتھ، بمعنی "مھلکات"۔ اور اسی باب سے یہ ارشاد باری: ﴿و جعلنا بینھم موبقا﴾ [الکھف:۵۲] "اور ہم ان کے درمیان میں ایک آڑ کر دیں گے" بھی ہے۔ اس آیت میں موبقا، میم کے فتحہ کے ساتھ ہے اس کا معنی ہے "مھلکا"۔

۵۳۵۶: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا عَائِشَةُ اِيَّاكِ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ فَاِنَّ لَهَا مِنَ اللّٰهِ طَالِبًا. (رواہ ابن ماجة والدارمی والبیھقی فی شعب الایمان)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۱۴۱۷/۲ حدیث رقم ۴۲۴۳ والدارمی فی السنن ۳۹۲/۲ حدیث رقم ۲۷۲۶ واحمد فی المسند ۴۰۲/۱۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "عائشہؓ! تم اپنے آپ کو ان گناہوں سے بھی بچائے رکھا کرو جن کو نہایت معمولی اور حقیر سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان گناہوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے (عذاب کا) ایک مطالبہ کرنے والا بھی ہے"۔ (ابن ماجہ، بیہقی)

تشریح: قولہ: یا عائشة! ایاك محقرات الذنوب:

بطور خاص چھوٹے گناہوں کا ذکر اس لئے کیا کہ بسا اوقات انسان چھوٹے گناہوں کو اہمیت نہیں دیتا بایں طور کہ توبہ کے ذریعہ اس کا تدارک کرتا ہے اور نہ اس سے خوف کرتا ہے، اور اس بات سے غفلت کرتا ہے کہ بار بار کرنے سے چھوٹا گناہ بھی چھوٹا نہیں رہتا (بلکہ بڑا ہو جاتا ہے۔ نیز یہ کہ اللہ کی عظمت اور کبریائی کی بنسبت ہر چھوٹا گناہ بھی بڑا گناہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ویغفر ما دون ذالك لمن یشاء﴾ [النساء:۴۸] "اور اس کے سوائے اور جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دیں گے" سے مفہوم ہوتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿ان تجتنبوا کبائر ما تنھون منه نکفر عنکم سیئاتکم﴾ [النساء:۳۱] "جن کاموں سے تم کو منع کیا جاتا ہے ان میں جو بھاری بھاری کام ہیں اگر ان سے بچتے رہو تو ہم تمہاری خفیف برائیاں تم سے دور فرما دیں گے" کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارے چھوٹے گناہوں کو تمہاری ان عبادات کے ذریعے دھو ڈالیں گے جو گناہوں کو مٹا دیتی ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ تم بڑے گناہوں سے اجتناب کرو، محض کبیرہ گناہوں سے بچنا شرط نہیں ہے جیسا کہ معتزلہ کا مذہب ہے، واللہ تعالیٰ اعلم

قولہ: فان لھا من اللہ طالبا:

یعنی ایک نوع کا عذاب ہے جو اس کے پیچھے آتا ہے گویا کہ وہ عذاب اس کو طلب کرتا ہے اور اس (عذاب) کو لوٹانے والا کوئی نہیں ہے، لہٰذا تنوین تعظیم کیلئے ہے ای طالبا عظیما (ایک بہت بڑا طالب)۔ اس لئے اُس سے غافل ہونا مناسب نہیں ہے بلکہ اس سے ڈرنا چاہئے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ "من اللہ طالبا" باب تجرید سے ہے جیسا کہ قائل کا یہ قول ہے:

ع "وفی الرحمن للضعفاء کاف"

میں (ملا علی قاری ﷫) کہتا ہوں کہ بظاہر قائل کے اس قول کا معنی یہ ہے: "وفی رحمة الرحمن للضعفاء کفایة" کیونکہ اسم فاعل کبھی کبھار مصدر کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ اپنے پیغام میں مذکور ہے۔

تخریج: اس حدیث کو احمد، طبرانی، بیہقی اور ضیاء نے سہل بن سعد سے مرفوعاً نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"ایاکم ومحقرات الذنوب فانما مثل محقرات الذنوب کمثل قوم نزلوا بطن واد فجاء ذا بعود وجاء ذا بعود حتی حملوا ما أنضجوا به خبزهم، وان محقرات الذنوب متی یؤخذ بها صاحبها تهلکه"

"اپنے آپ کو صغیرہ گناہوں سے بچاؤ کیونکہ صغیرہ گناہوں کی مثال اس قوم جیسی ہے جو کسی وادی میں ٹھہرے ہوئے ہوں اُن میں سے ایک شخص ایک لکڑی لے کر آئے، دوسرا شخص دوسری لکڑی لے کر آئے، یہاں تک کہ اتنی آگ جلالیں جس سے اپنی روٹی پکالیں، اور صغیرہ گناہوں کے مرتکب کو جب اس کے ان گناہوں کی وجہ سے پکڑا جاتا ہے تو یہ گناہ اس کو ہلاک کر دیتے ہیں"۔

توضیح و تخریج: امام احمد اور امام طبرانی نے اس جیسی حدیث ابن مسعودؓ سے نقل کی ہے۔

۵۳۵۷: وَعَنْ اَبِیْ بُرْدَةَ بْنِ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ لِیْ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ هَلْ تَدْرِیْ مَاقَالَ اَبِیْ لِاَبِیْكَ قَالَ قُلْتُ لَا قَالَ فَاِنَّ اَبِیْ قَالَ لِاَبِیْكَ یَا اَبَا مُوْسٰی هَلْ یَسُرُّكَ اَنَّ اِسْلَامَنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهِجْرَتَنَا مَعَهٗ وَجِهَادَنَا مَعَهٗ وَعَمَلَنَا كُلَّهٗ مَعَهٗ بَرَدَلَنَا وَاَنَّ كُلَّ عَمَلٍ عَمِلْنَا بَعْدَهٗ نَجَوْنَا مِنْهُ كَفَافًا رَأْسًا بِرَاْسٍ فَقَالَ اَبُوْكَ لِاَبِیْ لَاوَاللّٰهِ قَدْ جَاهَدْنَا بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَصَلَّیْنَا وَصُمْنَا وَعَمِلْنَا خَیْرًا كَثِیْرًا وَاَسْلَمَ عَلٰی اَیْدِیْنَا بَشَرٌ كَثِیْرٌ وَّاِنَّا لَنَرْجُوْا ذَاكَ قَالَ اَبِیْ لٰكِنِّیْ اَنَا وَالَّذِیْ نَفْسُ عُمَرَ بِیَدِهٖ لَوَدِدْتُ اَنَّ ذٰلِكَ بَرَدَ لَنَا وَاَنَّ كُلَّ شَیْءٍ عَمِلْنَا بَعْدَهٗ نَجَوْنَا مِنْهُ كَفَافًا رَأْسًا بِرَاْسٍ فَقُلْتُ اِنَّ اَبَاكَ وَاللّٰهِ كَانَ خَیْرًا مِنْ اَبِیْ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۷/۲۵٤ حدیث رقم ۳۹۱۵

ترجمہ: "حضرت ابو بردہؒ بن ابی موسیٰ اشعری (جن کا شمار بلند پایہ تابعین میں ہوتا ہے) نے بیان فرمایا کہ (ایک روز)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مجھ سے پوچھنے لگے کہ تمہیں خبر ہے' میرے والد (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) نے تمہارے والد (حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ) سے کیا کہا تھا؟ حضرت ابو بردہؓ کہتے ہیں کہ میں نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میرے والد نے تمہارے والد سے کہا تھا کہ ابوموسیٰ کیا یہ بات تمہیں خوش کرتی ہے کہ ہمارا وہ اسلام جو رسول اللہ ﷺ کی ہمراہی میں تھا (یعنی آپ ﷺ کی بعثت کے باعث حاصل ہوا تھا) ہماری وہ ہجرت جو آپ ﷺ کے ساتھ تھی' ہمارا وہ جہاد جو آپ ﷺ کے ساتھ تھا اور ہمارے وہ سب اعمال (یعنی نماز' روزے' زکوٰۃ' حج اور اسی طرح دیگر عبادات و اعمال) جو آپ ﷺ کے ساتھ تھے' وہ سب ہمارے لئے ثابت و برقرار رہیں اور ہم نے جو اعمال رسول اللہ ﷺ کے بعد کئے ہیں ہم ان میں برابر برابر ہی رہ جائیں (یعنی نہ ثواب نہ گناہ ہو تو ہماری نجات کے لئے کافی ہو جائیں۔ تمہارے والد نے (یہ سن کر) میرے والد سے کہا کہ نہیں' اللہ کی قسم ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے بعد جہاد کیا ہے' نمازیں ادا کی ہیں' روزے رکھے ہیں اور دوسرے بہت سے نیک اعمال (جیسے صدقہ و خیرات وغیرہ) کئے ہیں اور بہت سی انسانیت نے ہمارے ہاتھوں پر بعیت اسلام کر کے شرف اسلام حاصل کیا ہے اور بلاشبہ ہم (مذکورہ چیزوں کا) اجر و ثواب پانے کی توقع رکھتے ہیں جو ہمارے پہلے اعمال کے ثواب میں اضافہ ہی کریں گے) میرے والد (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ (تمہاری بات درست ہے) لیکن قسم اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں عمر کی جان ہے۔ میں اس بات کی خواہش رکھتا ہوں کہ ہم نے جو اعمال رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کئے ہیں وہ ثابت و قائم رہیں اور جو اعمال ہم نے آپ ﷺ کے بعد کئے ہیں ان سے برابر سرابر نجات پا جائیں۔ (حضرت ابو بردہؓ کا بیان ہے کہ یہ سن کر) میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ بلاشبہ تمہارے والد' اللہ کی قسم میرے والد سے بہتر تھے''۔ (بخاری)

تشریح: قال...... لأبيك: یعنی غلبہ خوف کے معاملہ میں' باب کا عنوان' خوف کا ذکر ہے۔

قال: ابو بردہؓ نے فرمایا یا مطلب یہ ہے کہ راوی نے ابو بردہؓ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا۔

يا أبا موسیٰ: ابوموسیٰؓ کی عظمت اظہار کے پیش نظر ان کو کنیت سے پکارا۔

قوله: هل يسرك ان اسلامنا۔۔۔برد لنا:

نہایہ میں لکھا ہے کہ حدیث میں وارد ہوا ہے: ''الصوم في الشتاء الغنيمة الباردة'' یعنی موسم سرما میں روزہ ایسی غنیمت ہے جس میں نہ کوئی تھکاوٹ ہے اور نہ کوئی مشقت۔ اور ہر محبوب چیز عربوں کے ہاں ''بارد'' کہلاتی ہے۔

اور بعض نے حدیث بالا کا معنی یہ لکھا ہے کہ موسم سرما میں روزہ رکھنا ایک ایسی غنیمت ہے جو ثابت اور برقرار ہے۔ یہ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: ''برد لنا علی فلان حق'' کا ثبت۔ (انتهى كلامه)

''برد لنا'' ان اسلامنا کی خبر ہے اور یہ جملہ'' هل يسرك '' کا فاعل ہے۔

قوله: وان كل عمل ه بعده ۔۔۔رأسا برأس:

''وأن کل عمل اس کا عطف ان اسلامنا پر ہے۔

رأسا برأس: یہ بدل ہے یا بیان ہے''نجونا'' کے فاعل سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ ای متساوبین مطلب یہ کہ ہم برابر سرابر رہیں' نہ توان اعمال کا ہمیں کوئی نفع پہنچے اور نہ نقصان، بایں طور کہ نہ ثواب کا باعث بنیں اور نہ عذاب کا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''کفافاً''ضمیر مجرور سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے:ای: ''نجونا منه في حالة کونه لا يفصل علينا شئ منه''یا فاعل سے حال ہے۔ای''مکفوفاً عنا شره''(اس حال میں کہ ان اعمال کی برائی ہم سے روک دی جائے۔)

قوله:فقال ابوك لابی......وانا النرجو ذلك۔

وأنا لنرجوا ذاك:اور ایک نسخہ میں(''ذاك'' کی بجائے)'' ذالك '' کا لفظ ہے۔یعنی مذکورہ امور کا ثواب گذشتہ امور یعنی اسلام، ہجرت اور دوسرے اعمال کے ثواب سے زائد ہے۔

قوله:قال ابی :ولکنی أنا۔۔۔رأسا برأس:لکنی أنا:أنا کو تاکید کیلئے ذکر کیا گیا ہے۔

ذالك:حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ہم نے جو اعمال کئے ہیں ثابت رہیں' باطل نہ ہوجائیں' اور حضور علیہ السلام کی ذات اقدس کی برکت وفضیلت کے طفیل وہ اعمال ناقص نہ رہیں۔

نجونامنه کفافا رأسا برأس):اس کی وجہ۔واللہ اعلم بالصواب یہ ہے کہ'' تابع'' صحت وفساد، اعتقاد واخلاص اور علم وعمل میں اپنے متبوع کے مطابق ہوتا ہے، جیسا کہ مقتدی کی نماز امام کی نماز کے صحیح ہونے سے صحیح ہوتی ہے اور امام کی نماز کے فساد سے مقتدی کی نماز فاسد ہوجاتی ہے۔اور حضور علیہ السلام کی صحبت میں کئے ہوئے اعمال کے صحیح اور کامل ہونے میں تو کوئی شک نہیں۔البتہ حضور علیہ السلام کے بعد جو عبادات ہوئی ہیں، اُن میں نیتیں متغیر ہوگئیں اور حالات بگڑ گئے۔جیسا کہ حضور علیہ السلام کے دنیا سے رخصت ہونے کے وقت صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس بات کا اقرار خود ان کے الفاظ میں ملتا ہے، صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ کی قبر اطہر پر مٹی ڈالنے کے بعد اپنے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے اور حضور علیہ السلام کو سپرد خاک کرنے میں مشغول تھے کہ ہم نے اپنے دلوں میں تغیر محسوس کیا یعنی حضور علیہ السلام کے آفتاب وجود اور ماہتاب سخاوت کے غروب ہونے سے جو اندھیرا پیدا ہوا اس کی وجہ سے اپنے دلوں میں تغیر محسوس کیا۔چنانچہ بڑی غنیمت یہ ہے کہ نیک اعمال اور برے اعمال دونوں برابر برابر رہیں اور ہمیں خلاصی مل جائے۔اور یہ بات تو اُن لوگوں سے منقول ہے جو جلیل القدر صحابہ تھے اور عظیم خلفاء تھے۔تو ان کے بعد والوں کی عبادات جو کہ عموماً غرور، عجب، ریاء کاری اور دوسرے اسباب معاصی سے بھری ہوئی ہیں، کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے اور اس کا کیا ٹھکانہ ہے سوائے اس کے کہ اپنی رحمت وعنایت سے نوازے اور ان گناہ گاروں کو ان نیک بندوں کے طفیل معاف کرکے ان کے ساتھ حشر کردے۔بلکہ بعض عارفین نے یہاں تک کہا ہے کہ وہ معصیت جو بندے میں احساس ندامت و

ذلت وشرمندگی پیدا کرے اُس طاعت سے بہتر ہے جو بندے میں عجب اور تکبر وغرور پیدا کردے۔

فقلت ان اباك والله...... من ابی: یعنی حضرت عمرؓ ابوموسیٰؓ سے ہر چیز میں بہتر تھے۔ اور یہ بات اسی طرح ہی ہے کیونکہ سرداروں کا کلام کلاموں کا سردار ہوا کرتا ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ حضرت عمرؓ کی زبان کو اللہ نے درست کلام گو بنایا تھا اور عمرؓ ''فاروق'' ہیں جو ہر مسئلہ میں حق وباطل کے درمیان فرق کرنے والے ہیں' اور جن کی رائے نزول وحی کے موافق ہوتی ہے' جن کی بات حضور علیہ السلام کی حدیث: ''انا اعلمکم بالله واخشاکم له'' کے مطابق ہوتی تھی اور اللہ کا ارشاد ہے: ﴿انما یخشی الله من عباده العلماء﴾ [فاطر:۲۸] ''اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں''۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ ''لو ددت'' جواب قسم ہو اور جملہ قسمیہ تاویل کے بعد'' لکنی '' کی خبر ہو۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث کوفیوں کی دلیل ہے۔ مغنی میں لکھا ہے کہ ''لکن'' کی خبر پر لام داخل نہیں ہوتا بخلاف کوفیوں کے کہ انہوں نے ''ولکننی من حبها لعمید'' سے استدلال کیا ہے۔ یہاں لام زائد ہے' یا اصل یہ تھی'' لکن أننی '' پھر تخفیف کیلئے ہمزہ حذف کردیا گیا اور'' لکن '' کے نون کو بھی حذف کردیا گیا کیونکہ ساکنین جمع ہوگئے۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ اس جواب میں وہ تکلّفات بعیدہ اور تعسفات مزیدہ (بے جا باتیں) ہیں جن، کی نہ تو اللہ کی طرف سے کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی عقلی دلیل وحجت ہے۔ لہٰذا درست یہی ہے کہ یہ لام تاکید کیلئے ہے جیسا کہ ''لکن' کے اخوات میں جائز قرار دیا گیا ہے صحیح قیاس کے مطابق ہے خصوصاً جبکہ فصحاء عرب میں اوحدی کی زبان سے ایسی صحیح سند کے ساتھ منقول ہے جو اصح الاسانید ہے۔

رواه البخاری: پھر یہ ایک بہت زیادہ عجیب وغریب بات ہے کہ اگر اصمعی اور اس جیسے دوسروں کی سند سے نقل کیا جائے کہ ایک عربی جو اپنے ٹخنوں پر پیشاب کرتا ہے اور اس نے اس کے مثل نثر ونظم میں کلام کیا ہے تو نحوی اس بات کو صحیح قول پر محمول کرتے ہیں، اور اس کو قاعدہ اور اساس مؤید بنا دیتے ہیں، اسی لئے کسی نے سچ کہا ہے کہ نحویوں صرفیوں کے دلائل مکڑی کے جالے ہیں، کبھی یہ دلائل باقی رہتے ہیں، اور کبھی فوت ہوجاتے ہیں۔

۵۳۵۸ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَنِیْ رَبِّیْ بِتِسْعٍ خَشْیَةِ اللّٰهِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ وَکَلِمَةِ الْعَدْلِ فِی الْغَضَبِ وَالرِّضَا وَالْقَصْدِ فِی الْفَقْرِ وَالْغِنَاءِ وَاَنْ اَصِلَ مَنْ قَطَعَنِیْ وَاُعْطِیَ مَنْ حَرَمَنِیْ وَاَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَنِیْ وَاَنْ یَکُوْنَ صَمْتِیْ فِکْرًا وَنُطْقِیْ ذِکْرًا وَنَظَرِیْ عِبْرَةً وَآمُرَ بِالْعُرْفِ وَقِیْلَ بِالْمَعْرُوْفِ ۔

رواه رزین

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (میرے رب نے مجھ کو نو چیزوں کا حکم فرمایا ہے' ایک تو یہ کہ ظاہر و پوشیدہ ہر حالت میں اللہ سے ڈرتے رہنا (یعنی دل بھی خوف خداوندی سے لبریز ہو اور جس وقت نافرمانی کے ارتکاب سے بچے ~~[illegible]~~ اعضاء جسم پر بھی خوف خداوندی کا اثر دکھائی دے' یا یہ کہ خلوت وجلوت

ہر حالت میں وہی کام کرنا چاہئے جو خوف خداوندی کا مظہر ہو) دوسری بات یہ کہ غصہ کی حالت ہو یا خوشی کی بہر حال حق بات کہی جائے۔ تیسری بات یہ کہ فقر وغربت اور ثروت و مالداری دونوں حالتوں میں میانہ روی کو اپنایا جائے (یعنی خواہ فقر وغربت کی حالت ہو یا ثروت و مالداری کی بہر صورت راہ اعتدال پر قائم رہا جائے)۔ چوتھی بات یہ کہ جو شخص مجھ سے تعلق منقطع کرے میں اس سے رشتہ وناتہ برقرار رکھوں (یعنی مجھے ایک حکم یہ بھی دیا گیا ہے کہ اگر میرا کوئی عزیز ورشتہ دار مجھ سے بدسلوکی کرے اور قرابت داری کا علاقہ توڑ ڈالے تو میں اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کروں یہ بات آنحضرت ﷺ کے وصف حلم و بردباری اور کمال تواضع و مروت کی آئینہ دار ہے) پانچویں بات یہ کہ میں ایسے انسان کو (بھی) اپنی عطاء و بخشش اور جود وسخاوت سے نوازوں جو مجھے (اپنے لین دین سے) محروم رکھے' چھٹی بات یہ کہ جو شخص میرے ساتھ ظلم وجود کا معاملہ کرے میں (بدلہ لینے کی استطاعت رکھنے کے باوجود)۔ اس کو معاف کردوں۔ ساتویں بات یہ کہ میری خاموشی عبادت کا ذریعہ ہو (یعنی جب میں چپ رہوں اور کسی کے ساتھ بات چیت یا زبان کے ذریعے تبلیغ میں مشغول نہ ہوں تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات' اس کی قدرت کے مظاہر اور اس کے کلام کے معانی ومطالب میں غور وفکر کرنے میں مستغرق ومنہمک رہوں' آٹھویں یہ کہ میرا بولنا ذکر (کا آئینہ دار) ہو (یعنی جب میری زبان جاری ہو اور میں گفتگو کروں تو اللہ کی بات کروں خواہ اس کا تعلق تسبیح وتحمید اور تکبیر وتہلیل سے ہو یا تلاوت کلام اللہ اور اس کے بندوں کو تعلیم وتلقین اور تذکیر ونصیحت سے) اور نویں بات یہ کہ میری نگاہ عبرت حاصل کرنے والی ہو (یعنی جب میں اللہ تعالیٰ کی کسی بھی خلقت کی طرف نظر اٹھاؤں تو میرا وہ دیکھنا عبرت حاصل کرنے کے لئے اور توجہ وہوشیاری کے ساتھ ہو' نہ کہ بے وقوفی وغفلت کے ساتھ' نیز میرے پروردگار نے مجھے یہ بھی حکم دیا ہے کہ میں اللہ کے بندوں کو خیر کی تعلیم اور تلقین کرتا رہوں) اور ایک دوسری روایت میں "بالمعروف" کا لفظ ہے"۔

(رزین)

تشریح قولہ: امرنی ربی بتسع ...... والعلانیة:

خشیة: جر کے ساتھ ہے اور رفع بھی جائز ہے۔

وكلمة العدل في الغضب و الرضا:

"الرضا" الف مقصورہ کے ساتھ ہے۔

یا دوسرے اور یہ بہت زیادہ حلم اور کمال تواضع کا مظہر ہے۔

وأعطي من حرمني. اور یہی کمال شرافت وسخاوت ہے۔

واعفو عمن ظلمني: یعنی انتقام لینے پر قادر ہونے کے باوجود۔ یہ صبر وشکر اور اللہ کے بندوں کے ساتھ رحمت واحسان کا نتیجہ ہے۔

وان يكون صمتي فكرا: یعنی اللہ کے اسماء وصفات میں اور اللہ کی قدرت کی کرشمہ سازیوں اور کلام اللہ کے معانی

ہیں۔

ونطقي ذكرا: یعنی تسبیح وتحمید، تقدس وتمجید تکبیر، توحید قرآن تلاوت اور اللہ کے بندوں کو وعظ ونصیحت۔

ونظري عبرة: یعنی دنیا کے اطراف، مخلوقات میں، میں غور کرنا۔

وآمر بالعرف وقيل بالمعروف:

یعنی بعض نے "عرف" عین کے ضمہ اور راء کے سکون کے ساتھ کی بجائے "المعروف" نقل کیا ہے۔ اور حدیث میں "آمر بالعرف" کو ذکر کیا، مگر "انھی عن المنکر" کو ذکر نہیں کیا۔ ایسا کرنا از باب اکتفاء ہے یا وجہ یہ ہے کہ "العرف معروف معروف شرعی کو شامل ہے جو ارتکاب واجتناب ہر دو کو شامل ہے"۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ شروع میں نو باتوں کا ذکر کیا لیکن تفصیل میں دس/۱۰ باتوں کو ذکر کیا' اس کی وجہ یہ ہے کہ دسویں بات یعنی "امر بالمعروف" پچھلی نو/۹ باتوں کی تفصیل کے بعد ان کا اجمالی ذکر ہے اس لئے کہ "المعروف" کا لفظ ہر اُس عمل کو شامل ہے جو بھلائی کا ہے چاہے اللہ کی عبادت ہو جس سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ چاہے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک ہو' اور ہر اُس اچھے عمل کو شامل ہے جس کو شریعت نے پسندیدہ قرار دیا ہو' اور ہر اس برے عمل کو شامل ہے جس کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے۔ گویا کہ یوں کہا گیا: "مجھے میرے رب نے حکم دیا کہ ان صفات کے ساتھ متصف ہو جاؤں اور دوسروں کو ان صفات کے ساتھ متصف ہونے کا کہوں" چنانچہ یہاں ہر واؤ حرف عطف کے ذریعے مفرد کا عطف مفرد پر ہے، اور "وآمرَ بالمعروف" میں جو واؤ ہے اس کے ذریعے معنی کے اعتبار سے' باعتبار لفظ مجموعہ کا مجموعہ پر عطف ہے۔ تفرقة بين الواوين کی مثال یہ آیت کریمہ ہے: ﴿وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ﴾ [فاطر ۱۹، ۲۰، ۲۱]

"اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں اور نہ تاریکی اور روشنی اور نہ چھاؤں اور دھوپ"۔

۵۳۵۹ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ يَخْرُجُ مِنْ عَيْنَيْهِ دُمُوْعٌ وَاِنْ كَانَ مِثْلَ رَاسِ الذُّبَابِ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ثُمَّ يُصِيْبُ شَيْئًا مِنْ حُرِّ وَجْهِهٖ اِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ۔

اخرجه ابن ماجه في السنن ٢/ ١٤٠٤ حديث رقم ٤١٩٧

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ہر وہ مؤمن شخص جس کی آنکھوں سے (خدا کے خوف سے) آنسو نکلیں خواہ وہ آنسو مکھی کے سر کے برابر (یعنی بہت معمولی مقدار میں) کیوں نہ ہوں اور پھر وہ آنسو بہہ کر اس کے چہرے پر آ جائیں تو خدا تعالیٰ اس پر جہنم کی آگ کو حرام فرما دیتے ہیں"۔ (ابن ماجہ)

تشریح: دموع: آنسو کے کم از کم تین قطرے۔

يصيب: رفع کے ساتھ ہے اور بعض نے نصب کے ساتھ کہا ہے۔

حر: حاء کے ضمہ اور راء کی تشدید کے ساتھ بمعنی خالص۔ قاموس میں ہے ["حر الوجه" ماأقبل عليك وبد الك منه۔

حرمه الله على النار: مفعول کی ضمیر اُس مومن بندہ کی طرف راجع ہے جس کی پہلے صفت بیان کی گئی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ "حر الوجه" کی طرف راجع ہو اور اس صورت میں اُس بندہ کو جہنم پر حرام کر دینے سے کنایہ ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

تخریج: جامع کے الفاظ یہ ہیں: "ما من عبدٍ مومن يخرج من عينيه من الدموع مثل رأس الذباب من خشية الله فيصيب حر وجهه فتمسه النار ابدا" اس کو ابن ماجہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

بَابُ تَغَيُّرِ النَّاسِ

لوگوں کے تغیر وتبدل کا بیان

یعنی زمانے کے بدلنے سے لوگوں کا بدلنا جیسا کہ اس باب کی اکثر احادیث کے مضمون سے یہ سمجھ میں آرہا ہے۔اس باب کی احادیث کے موافق ہے یا لوگوں کے تغیر سے مراد لوگوں کے حالات اور مراتب ومنازل کا مختلف ہونا ہے جو ان لوگوں کے زمانوں کے تغیر کو بھی شامل ہے۔پہلی فصل کی پہلی حدیث کا ظاہری مطلب اسی کے مطابق ہے۔

۵۳۶۰ : عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا النَّاسُ كَالْاِبِلِ الْمِائَةِ لَاتَكَادُ تَجِدُ فِيْهَا رَاحِلَةً۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۳۳/۱۱ حدیث رقم ٦٤٩٨ومسلم فی صحیحه ١٩٧٣/٤ حدیث رقم (٢٣٢-٢٥٤٧) والترمذی فی السنن ١٤١/٥ حدیث رقم ٣٨٧٢وابن ماجه ١٣٢١/٢ حدیث رقم ٣٩٩٠ واحمد فی المسند ٧٠/٢۔

ترجمہ:''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''آدمی اوصاف کے اختلاف اور حالات کے تغیر کے اعتبار سے ان سو اونٹوں کے کی طرح ہے جن میں سے تم سواری کے لائق کسی ایک کو پا سکو''۔(بخاری ومسلم)

تشریح:قوله:انما الناس كالابل المائة:

كالابل المائة: طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ دونوں جگہ الف لام جنس کیلئے ہے۔اور علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ ایک صحیح روایت میں ''کابل مائة'' کے الفاظ بغیر الف لام کے منقول ہیں۔

قوله:لاتكاد تجد فيها راحلة:

ان سو(۱۰۰)اونٹوں میں کوئی ایسا نوجوان توانا اور تندرست اونٹ جو سواری کے قابل ہو۔اسی طرح سو آدمیوں میں سے تجھے کوئی ایسا آدمی نہیں ملے گا،جو صحبت اور مودت ومحبت کے قابل ہو جو اپنے ساتھی سے تعاون کرے اور اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے۔مصابیح کے پہلے شارح اور ان کے متبعین دوسرے شراح کے کلام کا خلاصہ یہی ہے۔

خطابیؒ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ دین کے احکام میں تمام لوگ برابر درجے پر ہیں،کسی شریف کو کسی کمزور پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی بلند مرتبے والے شخص کو کسی کم مرتبے والے شخص پر،جیسا کہ سو اونٹوں میں کوئی اونٹ سواری کیلئے خاص نہیں

ہوتا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ پہلے قول کے مطابق "لا تجد فیها راحلة" ابل کے لئے صفت ہے اور تشبیہ مرکب تمثیلی ہے۔ اور دوسرے قول کے مطابق "لا تجد فیها راحلة" وجہ تشبیہ ہے اور "ابل" کے ساتھ انسان کی مناسبت کا بیان ہے۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ پہلے قول کے معنی کا واضح ہونا مخفی نہیں ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ لوگوں میں ایسے شخص کا ملنا مشکل ہوگا جو اعمال کے اعتبار سے پسندیدہ در جہدہ ہو، ہم نیشنی کے لائق ہو، سہل الانقیاد (آسانی سے تابع ہونے والی) ہو۔ جیسا کہ بہت سارے اونٹوں میں سے ایک اونٹ نہیں ملتا جو سواری کیلئے موزوں ہو اور اُس پر بوجھ لاد کر اُس پر سفر کیا جا سکتا ہو۔ چنانچہ سو (۱۰۰) کے عدد کا ذکر کثرت کے لئے ہے۔ اس سے تحدید کا ذکر مراد نہیں ہے۔ کیونکہ مخلص عالم باعمل کا وجود کیمیاء کے قبیل سے ہے، عنقاء کی طرح ہے۔ اسی وجہ سے ایک عارف باللہ کہتا ہے:

أتمنى على الزمان محالاً
ان ترى مقلتاى طلعة حر

"میں اس زمانے سے ایک محال چیز کی تمنا کر رہا ہوں کہ میری نگاہیں کوئی مخلص مسلمان دیکھیں۔"

دوسرا کہتا ہے:

واذا صفا لك من زمانك واحد
فهو المراد واين ذاك الواحد

"اگر تجھے اپنے زمانے میں کوئی ایک مخلص بندہ ملے تو اسی کو لازم پکڑو لیکن وہ ایک بندہ کہاں ہے۔"

بعض ارباب حال کہا کرتے تھے کہ یہ زمانہ قحط الرجال کا ہے۔ سہل تستریؒ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک دن مسجد سے باہر تشریف لائے تو مسجد کے اندر اور باہر بہت زیادہ آدمیوں کو دیکھا تو فرمایا کہ لا الہ الا اللہ پڑھنے والے تو بہت زیادہ ہیں، مگر اخلاص والے ان میں سے بہت کم ہیں اس مفہوم کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی کئی آیات میں بیان فرمایا، چنانچہ ایک جگہ ارشاد باری ہے:

﴿وقليلٌ من عبادى الشكور﴾ [سبا:۱۳] "اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوتے ہیں"۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿الا الذين آمنوا وعملوا الصٰلحٰت وقليلٌ ما هم﴾ [ص:۲٤]

"مگر ہاں جو لوگ ایمان رکھتے ہیں، اور نیک کام کرتے ہیں، اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں۔"

اور مقربین سابقین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ثلةٌ من الاولين وقليلٌ من الآخرين﴾

[الواقعة۔۱۲۔۱٤]

"اُن کا ایک بڑا گروہ تو اگلے لوگوں میں سے ہوگا اور تھوڑے پچھلے لوگوں میں سے ہونگے۔"

تخریج: اس کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے، اور یہ بخاری کے الفاظ ہیں، (امام میرکؒ نے تصحیح سے نقل کیا ہے) اور جامع میں یہ الفاظ ہیں: "انما الناس كابلٍ مائة"۔ "ابل مائة" نکرہ ہے۔ اس حدیث کو امام احمد، شیخین، ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا

ہے۔

۵۳۶۱ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَکُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰی لَوْدَخَلُوْا جُحْرَضَبٍّ تَبِعْتُمُوْھُمْ قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْیَھُوْدُ وَالنَّصَارٰی قَالَ فَمَنْ. (متفق علیہ)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ٤٩٥/٦ حدیث رقم ٣٤٥٦ومسلم فی صحیحہ ٢٠٥٤/٤ حدیث رقم (٢٦٦٩/٦) واحمد فی المسند ٥١١/٢

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ (آئندہ ادوار میں) تم بالشت' بالشت کے برابر اور ہاتھ ہاتھ کے برابر ان لوگوں کے طور وطریقوں کی پیروی اور موافقت کرو گے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ گوہ یعنی سوسمار کے بل میں داخل ہوئے ہوں گے (جو بہت تنگ اور برا ہوتا ہے) تو تم اس میں بھی ان کی متابعت وموافقت کرو گے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ وہ لوگ کہ جو پہلے گزر چکے ہیں اور جن کے طور طریقوں کو ہم اپنائیں گے کیا وہ یہود ونصاریٰ ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں تو اور کون ہیں؟ یعنی تم سے پہلے گزر جانے والے جن لوگوں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے ان سے یہود ونصاریٰ مراد ہیں''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قولہ: لتتبعن سنن من قبلکم شبرا بشبر وذراعًا بذراع:

لتتبعن: دوسری تاء کی تشدید اور عین کے ضمہ کے ساتھ۔

سنن: سین کے ضمہ کے ساتھ' سنۃ کی جمع ہے اور لغت میں ''سنت'' طریقے کو کہتے ہیں چاہے طریقہ حسنہ ہو چاہے سیئہ لیکن یہاں اس لفظ سے اُن خواہش پرستوں اور اہل بدعت کا طور وطریقہ مراد ہے جنہوں نے اپنے انبیاء کے بعد اپنی نفسانی خواہشات کیلئے بدعات کو شروع کیا اور انبیاء کے لائے ہوئے دین کو متغیر کر دیا اور ان کی لائی ہوئی کتاب میں تحریف کر ڈالی جیسا کہ یہی حالات بنی اسرائیل پر آئے تھے۔

اور بعض نسخوں میں ''سنن'' ''سین'' کے فتحہ کے ساتھ منقول ہے چنانچہ ''مقدمہ'' میں لکھا ہے ای: طریقھم (اُن کا راستہ۔)

شبرًا بشبر: ''یدًا بیدٍ'' کی طرح حال ہے اور اسی طرح ''ذراعاً بذراع'' بھی حال ہے۔ یعنی قریب ہے کہ تم ان کی طرح افعال اعمال کرو گے بالکل برابر سرابر۔

قولہ: حتی لو دخلو جحر ضب تبعتموھم:

جحر ضب: بلوں میں سے تنگ ترین اور بدنما ترین بل ہوتا ہے۔

اور اس میں حکمت یہ تھی کہ حضور علیہ السلام کو چونکہ آخری امت میں خوش اخلاقی کے اتمام کیلئے مبعوث کیا گیا اس لئے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس امت کے کامل افراد اُن تمام اوصاف حمیدہ کے ساتھ متصف ہوں جو گذشتہ امتوں کے ادیان میں تھے اور اسی کے لوازم میں سے ہے کہ اس امت کے ناقص افراد کامل درجے کی کوتاہی کرنے والے ہوں اور گذشتہ امتوں میں جو بُرے

اخلاق تھے اُن تمام برے اخلاق میں مبتلا ہوں۔

اس کی نظیر ایک بزرگ کی یہ بات ہے کہ میں نے اولیاء اللہ کے بارے میں جتنے مجاہدات اور ریاضتیں سنی تھیں وہ سارے مجاہدات اور ریاضتیں اپنائیں اور برداشت کی تو تمام اقسام کی کرامات عطاء کی گئیں۔ اور اس سے مناسبت رکھتی ہے وہ بات جو محققین نے ذکر کی ہے کہ "انسان کے حق میں توقف (یعنی کہ وہ ایک جگہ پر کھڑا ہو جائے' آگے ترقی نہ کرے اور اسی پر اکتفاء کرے) نہیں ہے' اگر انسان ترقی نہ کرے تو تنزل کا شکار ہو جائے گا۔ اور اسی طرح بنی آدم کی ایک نوع ایسی ہے جو "فرشتہ صفت روح اور حیوانی صفت روح) کا مرکب ہے' پس اگر وہ بلندی کی طرف بڑھتا ہے تو مرتبہ میں مقرب فرشتوں سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے، اور اگر پستی کی طرف مائل ہوتا ہے تو چوپایوں سے نیچے مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا:
﴿اُولٰئک کالأنعام بل هم اضل﴾ [الاعرف:۱۹] "یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ یہ لوگ زیادہ بے راہ ہیں"۔

اور یہاں قضاء کا دروازہ کھلتا ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لا یسأل عما یفعل﴾ [النبیاء۔۲۳] ترجمہ: "وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا اور اوروں سے باز پرس کی جا سکتی ہے۔"

قوله: قیل یا رسول الله: الیهود و النصاری؟ قال: فمن؟

الیهود النصاری: نصب کے ساتھ ہے، تقدیری عبارت اس طرح ہے: "اتعنی بمن نتبعهم الیهود و النصاریٰ؟" یا اس طرح ہے: "اتعنی بمن قبلنا الیهود و النصاریٰ؟" (کیا آپ گذشتہ لوگوں سے یہود و نصاریٰ مراد لے رہے ہیں؟)

"قال فمن": ای ان لم أردهم فمن سواهم

(حضور علیہ السلام نے فرمایا اگر وہ مراد نہ لوں تو پھر کون ہے؟) مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب سے عموماً یہی مراد ہوتے ہیں، اور یہی مشہور ہیں اور ان کے علاوہ دوسروں کا نام و نشان مٹ چکا ہے، چنانچہ "من قبلکم" مطلق بولا جائے تو یہی مراد ہوتے ہیں، ۔شارحؒ فرماتے ہیں، کہ "من' استفہامیہ ہے: ای فمن یکون غیر هم (یعنی تو ان کے علاوہ اور کون ہیں؟) یعنی تمہارے متبوع یہی لوگ ہیں، کوئی اور نہیں ہیں۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ لفظ "الیهود" کو جر کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے، ای "هل نتبع سنة الیهود؟" اور رفع کے ساتھ بھی منقول ہے اس بناء پر کہ مبتدا کی خبر بنے گا اور حرف استفہام مقدر ہوگا۔ ای هل من قبلنا هم الیهود؟ انتہیٰ۔ بعض نے اس کی تقدیر یوں بیان کی ہے "المتبوعون هم الیهود و النصاریٰ ام غیرهم؟"۔

تخریج: اس حدیث کو حاکم نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے اور الفاظ یوں ہیں:

"لترکبن سنن من قبلکم شبرا بشبرٍ وذراعاً بذراعٍ حتی لو ان احدهم دخل جحر ضب لدخلتم وحتی لو ان احدهم جامع امراته بالطریق لفعلتموه"۔

۵۳۶۲ : وَعَنْ مِرْدَاسٍ الْاَسْلَمِيِّ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْهَبُوْنَ الصَّالِحُوْنَ

الْاَوَّلُ فَا لْاَوَّلُ وَيَبْقٰى حُفَالَةٌ كَحُفَالَةِ الشَّعِيْرِ اَوِ التَّمْرِ لَا يُبَالِيْهِمُ اللّٰهُ بَالَةً (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۲۵۱/۱۱ حديث رقم ۶۴۳۴۔

ترجمہ: ''حضرت مرداس اسلمی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نیکوکار وصالح لوگ یکے بعد دیگرے اس دنیا سے کوچ کرتے ہیں اور بے کار و بدکار لوگ جو کے بھوسہ یا کھجور کے کچرا کی مانند باقی رہ جائیں گے جن کی اللہ تعالیٰ کوئی پرواہ نہیں کریں گے (یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے لوگوں کی کوئی حیثیت و مقام نہیں اور ان کے وجود کا کوئی اعتبار نہیں)''۔ (بخاری)

راویٔ حدیث:

مرداس بن مالک۔ یہ ''مرداس'' ہیں ''مالک'' کے بیٹے ہیں۔ اور اسلمی ہیں۔ یہ اصحاب شجرہ میں سے تھے۔ اہل کوفہ میں ان کا شمار ہے۔ ان سے قیس بن ابی حازم نے صرف ایک حدیث روایت کی ہے۔ اس حدیث کے علاوہ ان کی کوئی حدیث نہیں ہے۔

تشریح: قوله: قال النبی یذهب الصالحون الأول فالأول):

قال النبیؐ: ایک صحیح نسخہ میں ''رسول اللہ'' کے الفاظ مذکور ہیں۔

''الاول'': رفع کے ساتھ ''صالحون'' سے بدل ہے اور نصب کے ساتھ حال ہے۔

قوله: وتبقى حفالة كحفالة الشعير اولتمر: حفالة: حاء کے ضمہ کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں فاء کی بجائے تاء کے ساتھ ہے اور دونوں کا معنی ہے ردی اور بے کار چیز، اور تنکیر تحقیر کیلئے ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، فاء تعقیب کیلئے ہے چنانچہ عبارت میں تقدیر ضروری ہے ای ''الأول منهم فالأول من الباقين منهم'' اسی طرح ہوتا رہے گا، یہاں تک کہ یہ سلسلہ ردی لوگوں تک پہنچ جائے گا، اور یہ کلام ایسا ہی ہے جیسا کہ ''الأفضل فالأفضل'' ہے۔ قاضی فرماتے ہیں، ''الحفالة'' کا معنی ہے کسی چیز سے بچا ہوا ردی فضلہ اور ''الحثالة'' کا بھی یہی معنی ہے

قوله: لا يباليهم الله بالة: نہ تو اللہ کے ہاں ان کی کوئی قدر و منزلت ہوگی اور نہ اللہ ان کا کوئی وزن قائم کرے گا۔

بالة: مبالاةً کے معنی میں ہے گویا کہ ''مبالاة'' سے میم اور الف کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں حروف زائد ہیں جیسا کہ بعض کا کہنا ہے کہ ''لبيك'' کا لفظ ''ألب المكان'' سے ماخوذ ہے۔

بالة کی اصل ''بالية'' ہے جیسا کہ ''عافاه الله عافية'' ہے چنانچہ تخفیف کیلئے یاء کو حذف کیا گیا ہے۔ جب کسی چیز کو زیادہ نہ سمجھا جائے کہا جاتا ہے: ما باليته و ما باليت به و ما باليت منه ای لم اکترث به (یہ اس وقت کہا جاتا ہے) بھی کہا جاتا ہے۔ جب کسی چیز کو زیادہ نہ سمجھا جائے اور بعض نے ''بالةً'' کا معنی حالةً بیان کیا ہے ای ''لا يبالي الله حالة من احواله'' (اللہ اس کے کسی حال کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا)۔ اور اسی سے ''بال'' بمعنی ''حال'' آتا ہے۔

تخریج: اسی طرح امام احمد نے بھی نقل کیا ہے۔

۵۳۶۳: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا مَشَتْ اُمَّتِي الْمُطَيْطَاءَ وَخَدَمَتْهُمْ اَبْنَاءُ الْمُلُوْكِ اَبْنَاءُ فَارِسٍ وَالرُّوْمِ سَلَّطَ اللّٰهُ شِرَارَهَا عَلٰى خِيَارِهَا۔

(رواه الترمذي وقال هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذي في السنن ٤/٤٥٦ حديث رقم ٢٢٦١

ترجمہ: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب میری امت کے افراد فخر و تکبر کی چال چلنے لگیں گے اور بادشاہوں کے بیٹے یعنی روم و فارس کے شہزادے اُن کے ملازم و نوکر بن جائیں گے (جس کی صورت یہ ہوگی۔ فارس و روم کے علاقوں اور شہروں کا فاتح مسلمانوں کو بنا تا جائے گا اور یہ سب ملک مسلمانوں کے قبضہ میں آجائیں گے اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ ان علاقوں اور شہروں کے نہ صرف عام آدمی بلکہ بادشاہ و شہزادے بھی قیدی بنائے جائیں گے اور مسلمان ان سب کو بطور غلام اپنی نوکری چاکری پر لگالیں گے ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ اُمت کے بدترین کو بہترین پر یعنی ظالموں کو مظلوموں پر) مسلط کر دے گا۔ امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے"۔

تشریح: **المطیطیا**: میم کے ضمہ، پہلی طاء مہملہ کے فتحہ اور دوسری طاء کے کسرہ کے ساتھ ممدود و مقصور دونوں طرح، اس کا معنی ہے التمطی، یعنی دونوں ہاتھ پھیلا کر اتراتے ہوئے چلنا۔ اس لفظ کو دوسری یاء کے بغیر بھی پڑھا گیا ہے، اور جامع میں یہی لفظ ہے۔ اس کا نصب مفعول مطلق ہونے کی بناء پر ہے۔ ای "اذا مشت امتی مشی تبختر"، بعض نے کہا ہے کہ یہ حال ہے: ای اذا اصاروا فی نفوسهم متکبرین وعلی غیر هم متجبرین (یعنی جب یہ لوگ اپنی ذات سے تکبر کرنے والے بن جائیں اور دوسروں پر جبر کرنے لگیں۔)

خدمتهم: اور جامع میں "خدمها" کا لفظ ہے، ماقبل اور مابعد کے ساتھ یہی لفظ (ضبط) مناسبت رکھتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان کی خدمت کریں گے اور ان کی تابعداری کریں گے۔

ابناء فارس والروم: ماقبل سے بدل ہے اور اس کا بیان ہے۔

سلط اللہ شرارها: اور جامع میں "مسلط شرارها" کے الفاظ ہیں۔ اس کا مطلب ہے امت کے ظالم لوگوں کو امت کے مظلوم لوگوں پر مسلط کر دے گا۔

شراح حدیث نے لکھا ہے کہ یہ حدیث حضور علیہ السلام کی نبوت کے دلائل میں سے ایک بڑی دلیل ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام نے ایسے احوال کی خبر دی جو اُس وقت موجود نہ تھے اور آئندہ واقع ہونے والے تھے اور بعد میں ہوا بھی آپ علیہ السلام کی خبر کے مطابق کیونکہ مسلمانوں نے جب فارس و روم کے علاقے فتح کئے اور ان کے اموال اور اشیاء زیب و زینت کو قبضہ میں لے لیا وہاں کے لوگوں کو قیدی بنا لیا اور اُن سے خدمت لینا شروع کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر اُن لوگوں کو مسلط کر دیا جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا پھر بنو امیہ کو بنو ہاشم پر مسلط کر دیا اور اُن کے ساتھ وہ کچھ کیا جو انہوں نے کرنا تھا۔

تخریج: اور اسی طرح ابن حبان نے بھی نقل کیا ہے۔ (میرک)

۵۳۶۴: وَعَنْ حُذَيْفَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَقْتُلُوْا اِمَامَكُمْ وَاتَجْتَلِدُوْا بِاَسْيَافِكُمْ وَيَرِثُ دُنْيَاكُمْ شِرَارُكُمْ. (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذي في ٤٠٧/٤ حديث رقم ٢١٧٠ وابن ماجه في السنن ١٣٤٢/٢ حديث رقم ٤٠٤٣ واحمد في المسند ٣٨٩/٥۔

ترجمہ: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم (مسلمان) اپنے (خلیفہ یا سلطان وحکمران) کو قتل کرنے لگ جاؤ گے' جب تم اپنی تلواروں سے آپس ہی میں ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو گے اور یہاں تک کہ تمہاری دنیا کے وارث و والی بدترین لوگ بن جائیں گے تو اس وقت قیامت کا قیام یقیناً ہو جائے گا''۔ (ترمذی)

۵۳۶۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَكُوْنَ اَسْعَدَ النَّاسِ بِالدُّنْيَا لُكَعُ بْنُ لُكَعَ. (رواہ الترمذی والبیہقی وفی دلائل النبوۃ)

اخرجه الترمذي في السنن ٤٢٧/٤ حديث رقم ٢٢٠٩ واحمد في المسند ٣٨٩/٥

ترجمہ: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک دنیاوی امور میں سب سے زیادہ سعادت والا (یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ مال والا' سب سے زیادہ بہترین عیش والا' سب سے اعلیٰ منصب والا اور سب سے زیادہ اثر ورسوخ والا) گھٹیا نسب اور کمزور حسب والا نہ ہو جائے۔ (یعنی جب دنیا میں غیر ثابت النسل' بدسیرت اور بدکار لوگ سب سے زیادہ حکومت واقتدار اور مال ودولت کے والی وارث ہو جائیں گے تو سمجھو کہ عنقریب قیامت آ جائے گی) اس روایت کو ترمذی نے اور کتاب دلائل النبوۃ میں بیہقی نے نقل کیا ہے''۔

تشریح: اسعد: منصوب اور مرفوع دونوں طرح درست ہے۔

لکع بن لکع: لام کے ضمہ اور کاف کے فتحہ کے ساتھ یہ غیر منصرف ہے۔ اس سے مراد ہے لئیم بن لئیم، یعنی گھٹیا نسب اور کمزور حسب والا۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس سے وہ شخص مراد ہے جس کی کوئی اصل معلوم نہ ہو اور نہ ہی لوگ اس کی تعریف کرتے ہوں۔

''ابن'' کا ہمزہ اس لئے حذف کیا گیا کہ ان دونوں لفظوں کو کمینہ اور گھٹیا شخصوں کے علم کے قائم مقام کر دیا گیا۔

ابن الملک'' فرماتے ہیں، کہ بعض نسخوں میں لفظ اسعد، منصوب ہے اس وجہ سے کہ ''یکون'' کی خبر ہے اور بعض نسخوں میں مرفوع ہے اس وجہ سے کہ ضمیر' ضمیر شان ہے، اور اس کے بعد والا جملہ اس مذکور ضمیر کی تفسیر ہے، انتہیٰ۔

یہ درست نہیں ہے کہ ''أسعد'' اسم ہو، اور ''لکع'' خبر ہونے کی بناء پر منصوب ہو کیونکہ اس سے معنی فاسد ہو جاتا ہے جیسا کہ واضح ہے' چنانچہ بعض نسخوں میں'' لکع'' کو نصب کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اس سے دھوکہ میں نہ پڑیں۔ کیونکہ یہ روایت و درایت کے خلاف ہے' اور ایک شارح نے ''اسعد'' کے نصب پر ہی اکتفاء کیا ہے اور کہا ہے کہ ''لکع'' مرفوع ہے'' یکون'' کا اسم ہے۔

لفظ "لکع" کی تحقیق:

"لکع" کا معنی ہے "احمق"۔ اور بعض نے "لکع" کا معنی غلام بیان کیا ہے' یہ "اللکع" سے معدول ہے۔ "لکع الوسخ علیه لکعا" کا معنی ہے اس کا معنی ہے "کمینہ شخص" اور "لکاع" کا معنی ہے کمینی عورت۔ پھر اس لفظ کو احمق اور غلام کیلئے استعمال کیا جانے لگا کیونکہ اس لفظ میں "ذلت" کا معنی ہے اور گدھے کے بچے کیلئے استعمال کیا کیونکہ اس میں "خفت" ہے اور "بچے" کیلئے استعمال کیا گیا کیونکہ اس میں "ضعف" ہے اور اس ذلیل شخص کو بھی "لکع" کہا جاتا ہے جو غلاموں کی طرح ہو اور اس حدیث میں "لکع" سے مراد وہ شخص ہے جس کی کوئی اصل معلوم نہ ہو اور نہ لوگ اس کی تعریف کریں، انتہی۔

اس تحقیق سے حضور علیہ السلام کے اُس ارشادِ گرامی کا معنی واضح ہو گیا جو آپ نے حسن بن علی عنھما کے بارے میں فرمایا: "اء ثم لکع"۔

حاصل یہ ہے کہ مقصود کے مناسب معنی اور مقام کے مقتضی کے مطابق لفظ "لکع" سے جسم اور قدر و منزلت کے اعتبار سے چھوٹا مراد لیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے چھوٹے بچے کو "لکع" کہا جاتا ہے (لفظ لکع کو متصرف پڑھیں گے) اور اس لفظ کا اطلاق غلام، کمینہ اور احمق پر اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ قدر و منزلت کے اعتبار سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب یہ بات معلوم ہو گئی تو لفظ لکع سے یہ تمام معانی یعنی چھوٹا، حقیر، غلام، احمق اور کمینہ مراد لیے جا سکتے ہیں۔

بعض شراح فرماتے ہیں کہ یہ لفظ معدول نہیں ہے' یہ "صرد" اور "نغر" کی مانند ہے اس لئے اس کو تنوین کے ساتھ پڑھنا صحیح ہے کیونکہ معدول نہیں ہے' اور قاموس میں لکھا ہے کہ "الکع" "صرد" کی مانند ہے اس کا معنی ہے کمینہ شخص، غلام، احمق اور وہ شخص جو نہ اپنی بات میں غور کرے اور نہ دوسروں کی بات سنے، بچہ، گدھی یا گھوڑی کا بچہ اور میلا کچیلا' اور نداء کے وقت کہا جاتا ہے: یا لکع یہ جب معرفہ ہو تو غیر منصرف پڑھا جاتا ہے کیونکہ "اللکع" سے معدول ہے، انتہیٰ۔ اور اس سے تائید ہوتی ہے اس بات کی کہ لفظ "لکع" یہاں منصرف ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، یہ لفظ عدل اور صفت کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

تخریج: اسی طرح احمد اور ضیاء نے بھی نقل کیا ہے۔ امام احمد، ابو داوٗد، ابن ماجہ اور ابن حبان نے حضرت انسؓ سے مرفوع روایت نقل کی ہے: لاتقوم الساعة حتى تباهى الناس في المساجد۔

"قیامت اُس وقت تک نہ آئے گی جب تک کہ لوگ مساجد میں باہم فخر نہ کریں۔"

اور ابو نعیم نے حلیہ میں ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے: لا تقوم الساعة حتى يكون الزهده رواية والورع تصنعا۔

"اُس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک کہ "زہد" روایت اور "ورع" تصنع نہ ہو جائے گا۔"

اور احمد اور مسلم نے ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے: لا تقوم الساعة الاعلى شرار الناس۔

"قیامت شریر لوگوں پر ہی آئے گی۔"

ابو یعلیٰ موصلی اور حاکم نے ابو سعیدؓ سے نقل کیا ہے: لا تقوم الساعة حتى لايحج البيت۔

"قیامت اُس وقت تک نہیں آئے گی جب تک بیت اللہ کا حج نہ چھوڑ دیا جائے۔"

سجزی نے ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے: لا تقوم الساعة حتی یرفع الذکر والقرآن۔

''اُس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک ستر کذاب نکل نہ آئے۔''

طبرانی نے ابن عمروؓ سے نقل کیا ہے: لاتقوم الساعة حتی یخرج سبعون کذابا۔

امام احمد، مسلم اور ترمذی نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے: لا تقوم الساعة لایقال فی الأض الله الله۔

''اُس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک زمین پر اللہ اللہ کا کہنے والا موجود ہو۔''

اور عنقریب "باب الملاحم" کے شروع میں ابوہریرہؓ کی حدیث آئے گی جس میں قیامت کی تیرہ (۱۳) علامات ذکر کی گئی ہیں۔ وہاں ان شاء اللہ تفصیلی کلام ہوگا۔

۵۳۲۶: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ كَعْبِ الْقُرَظِيِّ قَالَ حَدَّثَنِيْ مَنْ سَمِعَ عَلِيَّ بْنَ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ اِنَّا لَجُلُوْسٌ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ فَاطَّلَعَ عَلَيْنَا مُصْعَبُ ابْنُ عُمَيْرٍ مَا عَلَيْهِ اِلَّا بُرْدَةٌ لَهٗ مَرْقُوْعَةٌ بِفَرْوٍ فَلَمَّا رَاٰهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَكٰى لِلَّذِيْ كَانَ فِيْهِ مِنَ النِّعْمَةِ وَالَّذِيْ هُوَ فِيْهِ الْيَوْمَ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ بِكُمْ اِذَا غَدَا اَحَدُكُمْ فِيْ حُلَّةٍ وَرَاحَ فِيْ حُلَّةٍ وَوُضِعَتْ بَيْنَ يَدَيْهِ صَحْفَةٌ وَرُفِعَتْ اُخْرٰى وَسَتَرْتُمْ بُيُوْتَكُمْ كَمَا تُسْتَرُ الْكَعْبَةُ فَقَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مِنَّا الْيَوْمَ نَتَفَرَّغُ لِلْعِبَادَةِ وَنُكْفَى الْمُؤْنَةَ قَالَ لَا اَنْتُمُ الْيَوْمَ خَيْرٌ مِّنْكُمْ يَوْمَئِذٍ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٥٨/٤ حديث رقم ٢٤٧٦

ترجمہ: ''حضرت محمد بن کعب قرظیؒ سے مروی ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ مجھ سے اس شخص نے یہ حدیث بیان کی جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خود اس کو سنا کیا تھا (چنانچہ اس شخص نے بیان کیا) کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ایک روز ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ مسجد میں (یعنی مسجد نبوی میں یا مسجد قبا میں) بیٹھے ہوئے تھے کہ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بھی ہمارے پاس اس وقت ان کے جسم پر محض ایک ہی چادر تھی اور اس میں بھی چمڑے کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیکھا تو رو پڑے کہ ایک وہ دور تھا جب مصعب رضی اللہ عنہ کس قدر خوشحال اور عیش و راحت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور آج کیسی خستہ حالت ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے (اظہار تعجب وحسرت کے طور پر) فرمایا اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی جب کہ تم میں کوئی شخص دن کے پہلے وقت دوسرے وقت کو ایک جوڑا پہن کر نکلے گا اور پھر دوسرے وقت دوسرا جوڑا پہن کر نکلے گا' اس کے سامنے کھانے کا ایک پلیٹ کو رکھا جائے گا اور دوسری کو اٹھایا جائے گا اور تم اپنے گھروں پر اس طرح پردہ ڈالو گے جس طرح کعبہ پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ بعض صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ ہم اس دن (جب کہ خوشحالی وترفہ کی نعمت سے بہرہ مند ہوں گے) آج کی نسبت (جب کہ ہم فقر وافلاس سے دو چار ہیں) بہترین حال میں ہوں گے۔ کیونکہ اس وقت ہم عبادت کے لئے (اپنی معاشی تنگ ودو کی پریشانیوں اور الجھنوں

اور حصولِ رزق کے فکر سے) آزاد و فارغ ہو جائیں گے اور ہمیں محنت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی (یعنی جب اس وقت ہمیں معاشی و اقتصادی طور پر خوش حالی حاصل ہوگی اور نوکر چاکر ہمارے سارے کام کاج کریں گے تو ہم ذہنی و جسمانی طور پر پوری طرح بے فکر و آزاد ہوں گے لہٰذا اس وقت عبادت کا انہماک اور خدمات دینیہ کی مشغولیت آسان ہو جائے گی) حضور ﷺ نے (یہ سن کر) ارشاد فرمایا "(ایسا نہیں ہے کہ اس وقت تم بہتر ہو گے) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم اس دن کی بہ نسبت اس وقت زیادہ اچھی حالت میں ہو"۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: قال: حدثني من سمع علي بن ابي طالب: حضرت علیؓ سے سننے والے کا نام ذکر نہیں کیا گیا لیکن (وہ تابعی ہوگا اور تابعی کی جہالت کو نظر انداز کیا جاتا ہے، جبکہ یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت علیؓ سے سننے والا بھی کوئی اور صحابی ہو۔

قوله: انا لجلوس ـــــ مرفوعة بفرو:

فاطلع: "طاء" کی تشدید کے ساتھ۔

مصعب: میم کے ضمہ اور عین کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور "عمیر" اسم مصغر ہے۔

بردة : سیاہ و سفید رنگ کی چادر۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں، کہ مصعب بن عمیرؓ قریشی تھے، حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضری کیلئے مکہ سے ہجرت کی۔ اپنے اموال اور دنیا کی نعمتیں مکہ میں چھوڑ آئے۔ مسجد قبا میں رہنے والے صحابہ میں سے ایک جلیل القدر صحابی تھے۔

مؤلف فرماتے ہیں، کہ یہ "عبدری" ہیں بڑے جلیل القدر اور صاحب فضیلت تھے یہ اُن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے پہلے پہل حبشہ کی طرف ہجرت کی، پھر جنگ بدر میں شریک ہوئے، اور حضور علیہ السلام نے ان کو بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد مدینہ بھیج دیا تھا، تا کہ مدینہ والوں کو قرآن سکھائے، اور دوسرے دینی احکام سکھائے۔ یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ہجرت سے پہلے مدینہ میں جمعہ کی نماز قائم کی۔ مصعب بن عمیرؓ زمانہ جاہلیت میں بہت زیادہ نعمتوں اور راحتوں میں تھے نرم وقیمتی لباس زیب تن کرتے تھے، جب مشرف باسلام ہوئے تو دنیا کو بالکل ترک کر دیا، بعض حضرات فرماتے ہیں، کہ حضور علیہ السلام نے ان کو بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد بھیج دیا تھا، وہاں مدینہ جا کر انصار کی مجلسوں میں جا کر اُن کو اسلام کی دعوت دیتے تھے، ایک یا دو بندے اسلام قبول کر لیتے۔ یہاں تک کہ اسلام پھیل گیا، پھر حضور علیہ السلام کو خط لکھ کر مسلمانوں کو جمع کرنے کی اجازت طلب کی، حضور علیہ السلام نے مسلمانوں کو جمع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی، پھر ان ستر (۷۰) مسلمانوں کو ساتھ لے کر حضور علیہ السلام کے پاس تشریف لے آئے جو عقبہ ثانیہ میں شریک ہوئے اور مکہ میں تھوڑے عرصہ کیلئے قیام کیا۔ انہی کے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿رجالٌ صدقوا ما عاهدوا الله عليه﴾ [الاحزاب:۲۳] "ان (مؤمنین) میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اُس میں سچے اترے" اور آپ کا اسلام لانا حضور ﷺ کا دار ارقم میں داخل ہونے کے بعد ہے۔

قوله: فلما رآه رسول الله ﷺ بكى ـــــ ...

اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر رو پڑنا ان کے اوپر رحم وشفقت کی بنا پر تھا، کیونکہ حضور علیہ السلام نے ان کو فقر وفاقہ کی حالت میں دیکھا خصوصاً جبکہ اس سے پہلے وہ اپنی قوم میں صاحب عزت تھے، لوگ ان کی عزت کیا کرتے تھے، اور نعمتوں میں تھے لیکن یہ بات حضرت عمر کے اُس واقعہ کے منافی معلوم ہوتی ہے، جو حضور علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا تھا کہ جب حضرت عمر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُس وقت حضور علیہ السلام چار پائی چٹائی بچھا کر لیٹے ہوئے تھے، اور چٹائی پر کوئی اور کپڑا وغیرہ بچھا ہوا نہ تھا اس وجہ سے آپ کے جسم مبارک پر چٹائی کے نشانات پڑ گئے تھے، اس صورت حال کو دیکھ کر عمرؓ رو پڑے اور قیصر وکسریٰ کی عیش وعشرت کا تذکرہ کیا۔ اس پر حضور علیہ السلام نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ کیا تم ابھی تک سوچ کے اس مقام پر ہو؟ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ ان بادشاہان دینا کو صرف دنیا ہی کی نعمتیں ملیں اور ہمیں آخرت کی نعمتیں اور سعادتیں ملیں؟

اسلئے بہتر یہ ہے کہ حضرت مصعبؓ کو دیکھ کر حضور علیہ السلام کے رونے کو خوشی کی وجہ سے رونے پر محمول کیا جائے، کہ اپنی امت کے افراد کو دنیا سے زہد اختیار کر کے آخرت کی طرف متوجہ دیکھ کر مارے خوشی کے آپ رو پڑے، یا حضور علیہ السلام کے رونے کو غم وحسرت کے رونے پر محمول کیا جائے کہ یہ رونا اس بات پر تھا کہ مصعبؓ کے پاس ضروریات زندگی کی وہ چیزیں بھی نہیں تھیں جو اللہ کی اطاعت میں مساعد ومددگار ہو، یعنی ضرورت کے بقدر لباس اور دوسرے اسباب معیشت اور اس تاویل کی تائید حضور علیہ السلام کے ان الفاظ سے ہوتی ہے جن کو راوی نے آگے نقل کیا ہے۔

قوله: كيف بكم ..... كما تستر الكعبة:

حلة: حاء کے ضمہ اور لام کی تشدید کے ساتھ، "حلۃ" سے مراد ہے جوڑا یا چادر اور لنگی مراد ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ معنی یہ ہے کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے پاس اتنا مال آجائے گا کہ تم میں سے ہر ایک غایت تنعم کے سبب صبح کے وقت ایک جوڑا پہنے گا، شام کو دوسرا جوڑا پہنے گا؟

وضعت بين يديه صحفة ورفعت اخرىٰ: جیسا کہ رومیوں میں سے متکبرین کی عادت تھی اور یہ کنایہ ہے مختلف قسم کے کھانوں سے جن کو عیش پرست عجمیوں کے سامنے بڑے بڑے پیالوں میں رکھا جاتا تھا۔

وسترتم بيوتكم: "باء" کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔ اور مطلب یہ ہے گھروں کی دیواروں کو عمدہ کپڑوں سے مزین کرو گے۔

"كما تستر الكعبة: اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ دیواروں پر کپڑے لٹکانا یہ کعبہ کی خصوصیات میں سے ہے تاکہ دوسرے جگہوں سے امتیازی شان حاصل ہو۔

فقالوا يا رسول الله...... :صحابہ کرامؓ نے اس جملہ مستأنفہ (جس میں تعلیل کا معنی پایا جاتا ہے) کے ذریعے بہتر ہونے کا سبب بیان کیا ہے۔

ونكفى: مجہول کا صیغہ متکلم ~~[illegible]~~ مطلق جمع کیلئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ معاش کے اسباب مہیا ہونگے، روزی کی

ضرورت پوری ہوگی اور عبادت کے لئے یعنی علوم شرعیہ کی تحصیل، اور مالی و بدنی نیک اعمال کیلئے فارغ ہونگے۔

قال: ایک نسخہ میں "فقال" ہے۔

قال: لا انتم اليوم خير منكم يومئذٍ: تم اس دن کی بہ نسبت آج کے دن زیادہ بہتر ہو اس لئے کہ وہ فقیر کہ جس کو بقدر ضرورت روزی ملے مالدار سے بہتر ہے۔ چونکہ مالدار دنیا کمانے میں مشغول ہوتا ہے اور مال کی تحصیل میں زیادہ مشغولیت کی وجہ سے اُس فقیر کی طرح عبادت نہیں کرسکتا جس کے پاس بقدر ضرورت روزی موجود ہو، لہٰذا یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ صابر فقیر شاکر غنی سے افضل ہے کیونکہ مالداری کا' صحابہ کی نسبت سے جبکہ صحابہ عمل میں مضبوط تھے یہ حال ہے تو دوسرے لوگوں کا کیا حال ہوگا، جو کہ عمل میں کمزور ہیں۔ اس کی تائید اُس مرفوع حدیث سے ہوتی ہے جس کو دیلمی نے فردوس میں ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے: "ما زويت الدنيا عن احد الا كانت خيرة له"

جس شخص سے بھی دنیا روک لی گئی اس میں اُس کیلئے بہتری ہے۔

میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں کہ "عن أحدٍ" اپنے عموم پر ہے' کیونکہ جہنم میں فقیر کافر کا عذاب مالدار کافر کے عذاب سے ہلکا ہوگا' چنانچہ جب فقر کافر کیلئے آخرت میں مفید ہے تو صابر مومن کیلئے جنت میں مفید کیسے نہ ہوگا؟

۵۳۶۷ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ اَلصَّابِرُ فِيْهِمْ عَلٰى دِيْنِهٖ كَالْقَابِضِ عَلَى الْجَمْرِ - (رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب اسناده)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٥٦ حديث رقم ٢٢٦٠ واحمد فی المسند ٢/٣٩٠ راجع الحديث رقم (٥١٤٤)

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لوگوں پر ایک دور ایسا بھی آئے گا کہ اس وقت لوگوں کے درمیان اپنے دین پر ثابت قدم رہنے والا (یعنی دنیا سے اپنا دامن بچا کر احکام دینیہ کی اتباع کرنے والا طرح) اس شخص کی طرح ہوگا جس نے اپنی مٹھی میں انگارہ پکڑ رکھا ہو۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث از روئے سند غریب ہے"۔

تشریح: قوله: يأتي على الناس زمان الصابر......:

الجمر: "جمرة" کی جمع ہے' اس کا معنی ہے آگ کا انگارہ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ (الصابر فيهم على دينه......) "زمانٌ" کی صفت ہے اور موصوف کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے: ای "الصابر فيه" لیکن یہ محل اشکال ہے چونکہ لوٹنے والی ضمیر تو "فيهم" کے لفظ میں مذکور ہے جیسا کہ پہلے اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔

مزید علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں (حدیث کا) کہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح آگ کے انگارے مٹھی میں پکڑ کر بندہ اس کی تکلیف پر صبر نہیں کرسکتا کیونکہ اس سے ہاتھ جل جاتے ہیں، اسی طرح اُس وقت دیندار شخص اپنے دین پر ثابت قدمی کے ساتھ عمل پیرا نہیں رہ سکے گا، کیونکہ عاصیوں اور معاصی کا غلبہ ہوگا' فسق و فجور عام ہوگا اور لوگوں کا ایمان کمزور ہوگا، (انتہیٰ)۔

بظاہر حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح بغیر شدید صبر اور انتہائی تکلیف برداشت کرنے کے ہاتھ میں انگاروں کو پکڑے

رکھنا ممکن نہیں ہے، اسی طرح اُس زمانہ میں صبر عظیم اور مشقت کے بغیر اپنے دین اور نورِ ایمان کی حفاظت ممکن نہیں ہوگی۔

اور یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ مشبہ بہ اقوی ہوتا ہے چنانچہ اس سے مراد مبالغہ ہے پس یہ بات اس کے منافی نہیں ہے کہ مٹھی میں انگارے کو پکڑنا تو کسی کے بھی بس کی بات نہیں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فما اصبرهم على النار﴾ [البقرة:١٧٥] ''سو دوزخ کیلئے کیسے باہمت ہیں۔''

ہاں کبھی ہاتھ میں انگاروں کو پکڑا بھی جاتا ہے جب کہ اس سے بڑی مصیبت مثلاً قتل کرنے، جلانے اور ڈبونے وغیرہ کی دھمکی دی جائے، اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قل نار جهنم اشد حرًا﴾ [التوبة-٨١] ''آپ کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ (اس سے بھی) زیادہ گرم ہے''۔

امام شاطبیؒ نے اس معنی کی طرف اپنے زمانہ میں اشارہ کیا تھا چنانچہ فرماتے ہیں:

وهذا زمان الصبر من لك بالتي
كقبض على جمر فتنجو من البلا

جعبریؒ فرماتے ہیں کہ یہ صبر کا زمانہ ہے اس لئے کہ نیکی ''منکر'' ہو چکی ہے اور برائی ''معروف'' بن چکی ہے نیتیں خراب ہو گئیں اور خیانتیں ظاہر ہو گئیں۔ حق پرست کو تکلیف دی جاتی ہے اور باطل پرست کا اکرام کیا جاتا ہے۔

ابو ثعلبہ خشنی نے حضور علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: **ائتمروا بالمعروف وتناهوا عن المنكر حتى اذا رأيت شحا مطاعا وهوى متبعاو دنيا مؤثرة واعجاب كل برأيه فعليك خاصة نفسك ودع العوام فان وراء كم اياما' الصبر فيهن مثل القبض على الجمر' للعامل فيهن اجر خمسين رجلا يعملون مثل عملكم۔** (انتہی)

''نیکی کا حکم کرو اور برائی سے منع کرو اُس وقت تک جب تم دیکھو کہ لوگ اپنی حرص کی اطاعت کرنے لگیں ہیں اور خواہش نفسانی کی اتباع کرنے لگیں اور دنیا کو ترجیح دینے لگیں ہیں اور ہر شخص اپنی ہی رائے پر اکڑنے لگا ہے اُس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی ذات کی حفاظت کرو، کیونکہ تمہارے بعد ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ جس میں صبر کرنا مٹھی میں انگارے پکڑنے کی طرح مشکل ہوگا اور اُن لوگوں میں سے نیک عمل کرنے والے کو تمہاری طرح کے اعمال کرنے والے پچاس شخصوں کے برابر ثواب ملے گا''

توضیح: امام میرکؒ تصحیح سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ حدیث امام ترمذیؒ کی ثلاثیات میں سے ہے اور اس کی سند میں عمر بن شاکر ہے جو صرف ترمذیؒ کے شیخ ہیں اور ابن حبان نے ان کو ثقہ راویوں میں ذکر کیا ہے، انتہی۔

ابن عساکر نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے: **يأتي على الناس زمان يكون المؤمن فيه أذل من شاته۔**

''لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں مومن اپنی بکری سے زیادہ ذلیل ہوگا۔

٥٣٦٨: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ اُمَرَآءُكُمْ خِيَارُكُمْ وَاَغْنِيَآءُكُمْ سُمَحَائَكُمْ وَاُمُوْرُكُمْ شُوْرٰى بَيْنَكُمْ فَظَهْرُ الْاَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ بَطْنِهَا وَاِذَا كَانَ

اُمَرَاءُ كُمْ شِرَارُكُمْ وَاَغْنِيَاءُ كُمْ بُخَلَاءُ كُمْ وَاُمُوْرُكُمْ اِلٰى نِسَاءِ كُمْ فَبَطْنُ الْاَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا. (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذي في السنن ٤/٤٥٩ حديث رقم ٢٢٦٦۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تمہارے حکمران وقائدین وہ لوگ ہوں جو تم میں سے سب سے زیادہ بہتر لوگ ہیں' تمہارے مالدار مند لوگ سخی ہوں اور تمہارے معاملات باہمی مشوروں سے طے ہوتے ہوں گے (یعنی مسلمان ایک مرکز پر متحد و متفق ہوں اور اپنے تمام معاملات وامور ایک رائے ہو کر انجام پائیں) تو پھر تمہارے لئے زمین کا بیرونی حصہ بہتر ہے اور تمہارے حکمران وقائدین ایسے لوگ ہوں جو تم میں سے بر ترین ہوں (یعنی فاسق وفاجر اور ظالم لوگ ہیں) تمہارے دولت مند لوگ بخیل ہوں اور تمہارے معاملات کی باگ ڈور عورتوں کے ہاتھ میں ہو تو اس وقت زمین کا پیٹ تمہارے لئے زمین کی پشت سے بہتر ہوگا (یعنی ایسے دور میں مر جانا زندہ رہنے سے بہتر ہوگا)۔اس روایت کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: کان: اور جامع میں ''اذا کانت'' کے الفاظ ہیں۔

قولہ: اذا کان امراء کم خیاکم وامورکم شوری بینکم: ''سمحاء'' سمح کی جمع ہے گویا کہ ''سمحاء' سمیح کی جمع ہے اور سمیح، سمح کے معنی میں ہے۔اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: [وامرھم شوری بینھم] [الشوری: ۳۸] ''اور ان کا ہر کام (جس میں باتعین بعض نہ ہو) آپس کے مشورے سے ہوتا ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے فرمایا:

﴿وشاورھم فی الامر﴾[آل عمران: ۱۵۹] ''اور اُن سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے''

مطلب یہ ہے کہ جب تک تم اپنے معاملات میں مشورہ کرتے رہو گے۔الخ

عورتوں کے سپرد ہو جائیں حالانکہ عورتوں کی عقل اور دین دونوں ناقص ہیں' حالانکہ عورتوں کے بارے میں یوں مروی ہے: ''شاور واھن وخالفوھن'' (عورتوں سے مشورہ کرلو لیکن کروان کی رائے کے خلاف)۔اور وہ مرد بھی عورتوں ہی کے حکم میں ہیں جن کی حالت ان جیسی ہو یعنی جن مردوں پر حب جاہ اور حب مال کا غلبہ ہو اور دین وآخرت کو نقصان پہنچانے والے امور کو نہ جانتے ہوں۔

قولہ: فبطن الارض خیر لکم ظھرھا: جس کی بھلائی اور خیر اس کی شرارت پر غالب نہ ہو تو موت اس کے لئے بہتر ہے۔

۵۳۶۹ : وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْشِكُ الْاُمَمُ اَنْ تَدَاعٰى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْاَكَلَةُ اِلٰى قَصْعَتِهَا فَقَالَ قَائِلٌ وَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ قَالَ بَلْ اَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ وَلَيَنْزِعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ وَلَيَقْذِفَنَّ فِيْ قُلُوْبِكُمُ الْوَهْنَ قَالَ

قَائِلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْوَهْنُ قَالَ حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ ۔ (رواه ابوداؤد والبيهقى فى دلائل النبوت)

اخرجه ابوداؤد فى السنن ٤٨٣/٤ حديث رقم ٤٢٩٧، واحمد فى المسند ٢٧٨/٥۔

ترجمہ: "اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "عنقریب ایسا دور آنے والا ہے جب (کفر وضلالت کے حاملین) لوگوں کا گروہ آپس میں ایک دوسرے کو تمہارے مقابلہ پر (اور تمہاری شان کو شوکت کو ختم کرنے کے لئے) جیسا کہ کھانے کے دستر خوان پر مجتمع افراد آپس میں ایک دوسرے کو کھانے کے برتن کی طرف دعوت دیتے ہیں یعنی جس طرح کچھ لوگ جمع ہو کر کھانے کی محفل میں دستر خوان پر بیٹھتے ہیں تو وہ آپس میں ایک دوسرے کی طرف کھانے کے برتن سرکاتے رہتے ہیں اور اس میں جو چیز ہوتی ہے اس کو کھانے پر آمادہ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ سب بلا تکلف اور بغیر کسی رکاوٹ کے ان برتنوں میں سے جو کچھ چاہتے ہیں اٹھا کر کھا لیتے ہیں۔ اسی طرح کفر وضلالت کے حامل لوگ تمہارے مقابلے پر متحد ہو کر آپس میں ایک دوسرے کو برانگیختہ کریں گے بھڑکائیں گے اور بالآخر وہ تمہیں تباہ و برباد کر ڈالیں۔ تمہاری جائیدادوں تمہارے مال ومتاع اور معاشی ذرائع کو نقصان پہنچائیں گے گویا (یہ پیشین گوئی ہے تم مسلمان ان دشمنان دین کے سامنے چارۂ تر کی ہو جاؤ گے جس کا جی چاہے گا تمہیں نگل لے گا۔ کسی صحابیؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ (ان کا ہمارے خلاف جمع ہونا اور ہم پر غالب آ جانا) کیا اس وجہ سے ہوگا کہ اس دور میں ہماری تعداد کم رہ جائے گی؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا نہیں ایسا اس سبب سے نہیں ہوگا کہ تم کم تعداد میں ہو گے بلکہ اس وقت تمہاری تعداد تو زیادہ ہوگی لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے اس جھاگ کی سی ہوگی جو دریا یا نالوں کے کناروں پر پائے جاتے ہیں (یعنی تمہارے اندر طاقت وقوت اور شجاعت اور اولوالعزمی) بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہاری ہیبت اور تمہارا رعب ختم کر ڈالے گا اور تمہارے دلوں میں ضعف وسستی پیدا کر دے گا۔ کسی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! وھن (کمزوری و ضعف) سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "دنیا کی رغبت ومحبت اور موت سے بے رغبتی اور نفرت" (یعنی جب زندگی تمہارے لئے عزیز اور موت تمہارے لئے ناپسندیدہ ہو جائے گی تو تم دشمن کا مقابلہ کرنے اور شجاعت کے جوہر دکھانے کے قابل نہ رہ سکو گے) اس روایت کو ابوداؤد نے اور بیہقیؒ نے کتاب دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے"۔

تشریح: وعن ثوبان: یہ حضور علیہ السلام کے آزاد کردہ غلام تھے۔

تداعٰی: ایک تاء کو حذف کیا گیا ہے۔ یہ اصل میں "تتداعٰی" تھا۔

ایک دوسرے کو بلائیں گے تاکہ تم سے لڑیں اور تمہاری شان وشوکت کو مٹا کر تم سے وہ ملک ومال چھین لیں جو تمہاری ملکیت میں ہیں۔

الاکلة: "مد" کے ساتھ ہے اور "الفئة" یا "الجماعة" یا اس جیسے کسی اور لفظ کیلئے صفت ہے۔ ابوداؤد کی کتاب سے اس طرح نقل کیا گیا ہے، اور یہ حدیث ابوداؤد کے مفردات میں سے ہے۔ (ذکرہ الطیبی) اگر یہ لفظ ہمزہ اور کاف کے فتحہ کے ساتھ "الأکلة" مروی ہو جو آکل کی جمع ہے تو اس کی کوئی معقول توجیہ ہو سکتی ہے اور معنی یہ ہوگا" جیسا کہ کھانے والے ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔

یعنی کھانے کے برتن کی طرف جس سے لوگ بغیر کسی رکاوٹ کے کھانا کھاتے ہوں اور اس برتن کے پاس اکٹھے ہو کر سہولت کے ساتھ کھانا کھاتے ہوں، اسی طرح تمہارے پاس جو کچھ ہوگا وہ لوگ اس کو بغیر کسی تکلیف بغیر کسی نقصان اور بغیر کسی ضرر برداشت کئے تم سے چھین لیں گے۔

من قلة: محذوف مبتدا کی خبر ہے اور "نحن یومئذ" مبتدا خبر ہیں، اور ماقبل کیلئے صفت ہیں۔ معنوی اعتبار سے تقدیری عبارت یوں ہے :أذالك التداعي لأجل قلة نحن عليها يومئذ قول میں استدراک کا یہی معنی ہے۔

قوله: قال بل انتم یومئذ کثیر۔۔۔ کغثاء السیل:

غثاء: غین کے ضمہ اور الف ممدود کے ساتھ ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ تشدید کے ساتھ بھی درست ہے، اور اس کا معنی ہے وہ جھاگ اور کوڑا کرکٹ جو پانی کے اوپر ہوتا ہے اور ان لوگوں کو اس جھاگ کے ساتھ تشبیہ اس بات میں دی گئی ہے کہ ان کے اندر جرأت و شجاعت کم ہوگی، اور مرتبہ گھٹیا ہوگا ان کی عقلیں کمزور ہونگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ تم لوگ اُس وقت بکھرے ہوئے ہوؤ گے تمہاری حالت کمزور ہوگی اور انجام یہ ہو گا کہ تم منتشر اور متفرق ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد عطف بیان کے ذریعے اس کا سبب بیان فرمایا۔

قوله: ولنشر عن الله من صدور......:

لیقذفن: یا کے فتحہ کے ساتھ۔

الوھن: ضعف و سستی۔ گویا کہ "الوھن" سے مراد ضعف پیدا کرنے کے اسباب ہیں، اسی وجہ سے آئندہ قول میں "الوھن" کی تفسیر دنیا کی محبت اور موت سے بیزاری سے کی ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سوال "ضعف" کی نوعیت کے بارے میں تھا یا سائل کی مراد یہ تھی کہ یہ ضعف کس وجہ سے ہوگا؟

قوله: حب الدنیا و کراھیة الموت:

یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کو لازم ہیں، گویا کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی چیز ہیں۔ اور اللہ سے عافیت کا سوال کرتے ہیں اور یقیناً آج مسلمان اس میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ یہاں جو کچھ ذکر ہوا (لگتا ہے کہ) اس سے ہم ہی مراد ہیں۔

الفصل الثالث:

چار برائیوں کا خطرناک انجام

۵۳۷۰ : عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَاظَهَرَ الْغُلُوْلُ فِيْ قَوْمٍ اِلاَّ اَلْقَى اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ وَلَا فَشَا الزِّنَا فِيْ قَوْمٍ اِلاَّ كَثُرَفِيْهِمُ الْمَوْتُ وَلَا نَقَصَ قَوْمٌ الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِلاَّ قُطِعَ عَنْهُمُ الرِّزْقُ وَلَا

حَكَمَ قَوْمٌ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا فَشَا فِيْهِمُ الدَّمُ وَلَا خَتَرَ قَوْمٌ بِالْعَهْدِ اِلَّا سُلِّطَ عَلَيْهِمُ الْعَدُوُّ ۔ (رواہ مالک)

اخرجه مالك في الموطأ ٢/ ٤١٠٠ حديث رقم ٢٦ من كتاب الجهاد ۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب کسی قوم میں خیانت آ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں رعب کو ڈال دیتے ہیں اور جب کسی قوم میں زنا پھیل جاتا ہے تو ان میں موت کی کثرت ہو جاتی ہے اور جو قوم ماپ تول میں کمی کرتی ہے اللہ تعالیٰ ان سے رزق کو منقطع کر دیتے ہیں اور جس قوم میں ناحق فیصلے ہوتے ہیں ان میں خون ریزی پھیل جاتی ہے اور جو قوم عہد کو توڑتی ہے تو ان پر دشمن کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔ (موطا مالک)

تشریح: الغلول: ''غین'' مضموم ہے جس کا معنی ہے مال غنیمت میں خیانت کرنا۔

الرعب: ''عین'' کے سکون اور ضمہ دونوں کے ساتھ درست ہے۔ یعنی دشمن کا خوف۔

ختر: ''خاء'' اور ''تاء'' کے فتحہ کے ساتھ اور اسی سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وما يجحد بآياتنا الا كل ختار] [لقمان ۔۳۲] ﴿ان الله لا يحب كل ختار﴾؟

اس کا معنی غدر کرنے کے ہے۔

غلبہ کی امید سے دھوکہ دے کر وعدہ خلافی کرے۔

نَقَصَ قَوْمٌ: ناپ تول میں ضیافت۔ وَلَا خَتَرَ: دھوکہ دینا۔ دو فریقوں کا ایک دوسرے کو فریب دینا۔ قاموس میں اس کا معنی غدر، فریب لکھا ہے۔

سلط: مجہول کے صیغہ کے ساتھ۔ امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا کے ''باب ما جاء في الغلول'' میں ذکر کیا ہے۔

بَابُ فِیْ ذِکْرِ الْاِنْذَارِ وَالتَّحْذِیْرِ

ڈرانے اور نصیحت کرنے کا بیان

عرضِ مرتب:

مشکوٰۃ کے صحیح نسخوں میں تو فقط لفظ باب ہی مذکور ہے ترجمۃ الباب کوئی مذکور نہیں ہے مگر ابن الملک کہتے ہیں کہ باب انذار والتحذیر سے متعلق ہے گویا اس میں ایسی روایات لائیں گے جو انذار اور تحذیر سے متعلق ہوں۔

الفصل الاول:

۵۳۷۱ : عَنْ عَیَاضِ بْنِ حِمَارٍ الْمُجَاشِعِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ذَاتَ یَوْمٍ فِیْ خُطْبَتِهٖ اَلَا اِنَّ رَبِّیْ اَمَرَنِیْ اَنْ اُعَلِّمَکُمْ مَاجَهِلْتُمْ مِمَّا عَلَّمَنِیْ یَوْمِیْ هٰذَا کُلُّ مَالٍ نَحَلْتُهٗ عَبْدًا حَلَالٌ وَاِنِّیْ خَلَقْتُ عِبَادِیْ حُنَفَاءَ کُلَّهُمْ وَاِنَّهُمْ اَتَتْهُمُ الشَّیٰطِیْنُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِیْنِهِمْ وَحَرَّمَتْ عَلَیْهِمْ مَا اَحْلَلْتُ لَهُمْ وَاَمَرَتْهُمْ اَنْ یُّشْرِکُوْابِیْ مَالَمْ اُنْزِلْ بِهٖ سُلْطَانًا وَاِنَّ اللّٰهَ نَظَرَ اِلٰی اَهْلِ الْاَرْضِ فَمَقَتَهُمْ عَرَبَهُمْ وَعَجَمَهُمْ اِلَّا بَقَایَامِنْ اَهْلِ الْکِتَابِ وَقَالَ اِنَّمَا بَعَثْتُكَ لِاَبْتَلِیَكَ وَاَبْتَلِیَ بِكَ وَاَنْزَلْتُ عَلَیْكَ کِتَابًا لَا یَغْسِلُهُ الْمَاءُ وَتَقْرَؤُهٗ نَائِمًا وَیَقْظَانَ وَاِنَّ اللّٰهَ اَمَرَنِیْ اَنْ اُحْرِقَ قُرَیْشًا فَقُلْتُ اِذًا یَثْلَغُوْا رَاْسِیْ فَیَدَعُوْهُ خُبْزَةً قَالَ اسْتَخْرِجْهُمْ کَمَا اَخْرَجُوْكَ وَاغْزُهُمْ نُغْزِكَ وَاَنْفِقْ فَسَنُنْفِقْ عَلَیْكَ وَابْعَثْ جَیْشًا نَبْعَثْ خَمْسَةً مِثْلَهٗ وَقَاتِلْ بِمَنْ اَطَاعَكَ مَنْ عَصَاكَ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢١٩٧ حديث رقم ٦٣/٢٨٦٥ ـ وأحمد في المسند ٤/٢٦٦ـ

ترجمہ: "حضرت عیاض بن حمار مجاشعی رضی اللہ عنہ نقل فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے اپنے (جمعہ وغیرہ) کے خطبہ میں (یا کسی وعظ کے دوران) ارشاد فرمایا۔ (لوگو) سن لو! میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اس سے جو اس نے مجھے آج سکھلایا ہے ان باتوں کی تعلیم دیدوں جو تم نہیں جانتے۔ (اس کے بعد آپ ﷺ نے ان باتوں کے متعلق گفتگو کا آغاز یوں فرمایا کہ) اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ جو مال میں نے اپنے کسی بندے کو عطا کیا ہے وہ حلال ہے

یعنی کسی شخص کو جو مال واسباب جائز ذرائع سے حاصل ہوا ہے۔ وہ اس کے لئے سراسر حلال ہے' کسی شخص کو اسے حرام قرار دینے کی اہلیت نہیں ہے جیسا کہ دور جاہلیت میں قاعدہ تھا کہ لوگ بعض صورتوں میں اونٹوں کو بغیر سبب حرمت کے اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے' اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ میں نے تو اپنے سب بندوں کو باطل کے خلاف' حق کی طرف مائل پیدا کیا۔ لیکن یہ شیاطین تھے' جو ان (بندوں) کے پاس آنے لگے اور ان کو ان کے دین سے دور کر کے گمراہ کرنے لگے اور ان پر ان چیزوں کو حرام کرنے لگے جن کو میں نے ان کے لئے حلال کیا تھا (یعنی شیاطین نے ان لوگوں کو اس طرح دین سے دور کر دیا کہ وہ انہوں نے اپنے اوپر حلال چیزوں کو حرام کر لیا اور ان ہی شیاطین نے ان کو حکم دیا (یعنی ان کے دل میں یہ گمراہ کن وسوسہ ڈالا) کہ وہ اس چیز کو میرے ساتھ شریک کریں جس کے غالب ہونے کی میں نے کوئی سند نہیں نازل کی (یعنی جو لوگ بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور خدا کی بندگی میں بھی دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ ان کے پاس ان کے اس فعل کی کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔ یہ صرف شیاطین کے گمراہ کرنے کا اثر ہے کہ وہ لوگ ایسے سنگین جرم وظلم میں مبتلا ہیں اور یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اھل زمین پر نظر ڈالی (اور ان کو کفر وشرک پر متفق اور ضلالت وگمراہی میں مستغرق پایا چنانچہ اللہ نے ان تمام لوگوں کو اپنا مبغوض وناپسندیدہ قرار دے دیا خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی (یعنی جب دنیا کے تمام لوگ کفر وشرک کی گمراہیوں کا شکار ہوگئے اور خاتم الانبیاء کی بعثت تک سب کے سب گمراہی پر متفق ومجتمع تھے کہ قوم موسیٰ علیہ السلام تو عیسیٰ کی نبوت کی منکر بن گئی اور عزیر رضی اللہ عنہ کی پوجا کرنے لگی۔ عیسیٰ علیہ السلام کی قوم تین معبودوں کی قائل اور اس مشرکانہ عقیدے کی حامل ہوگئی کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں وغیرہ وغیرہ تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کو اپنا نہایت ناپسندیدہ بندہ قرار دے دیا) علاوہ اہل کتاب کے اس طبقہ کے (جو مشرک نہیں ہوا بلکہ موسیٰ علیہ السلام وعیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہوئے اصل دین پر قائم وثابت قدم رہا' اس جماعت کے لوگوں نے نہ تو اپنی آسمانی کتابوں میں تغیر وتبدل کا اور نہ اپنے دین کے احکام میں اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق کوئی تبدیلی کی یہاں تک کہ جب حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی تو ان کی دعوت پر لبیک کہہ کر حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو مبغوض قرار نہیں دیا) اور خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے آپ ﷺ کو (اے محمد ﷺ) اپنا رسول بنا کر دنیا میں اس لئے مبعوث کیا ہے تا کہ میں کی بھی آزمائش لوں (کہ آپ ﷺ اپنی قوم کی ایذا رسانی پر کس قدر دامن صبر کر تھامے رکھتے ہیں) اور آپ ﷺ کے ساتھ آپ کی قوم کی بھی آزمائش کروں (کہ آیا وہ لوگ آپ کے پیغام کو سچا جان کر شرف ایمان حاصل کرتے ہیں یا جھٹلا کفر اختیار کرتے ہیں) اور میں نے آپ ﷺ پر ایک ایسی کتاب نازل کی جس کو پانی دھو اور مٹا نہیں سکتا (یعنی عام طور پر کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب کو پانی سے دھویا جائے تو مٹ جاتی ہے لیکن قرآن کریم ایسی کتاب نہیں ہے کہ اس کو کوئی پانی دھو اور مٹا دے بلکہ وہ تغیر وتبدل سے محفوظ اور ناقابل تحریف وتسیخ ہے۔ بایں کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خدا تعالیٰ نے خود لی ہے لہٰذا قیامت تک کے لئے دلوں میں محفوظ کر دیا گیا ہے اور اس کے احکام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی وجاری رکھا گیا ہے) آپ اس کتاب کو سوتے جاگتے (ہر وقت) پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے مجھ کو یہ حکم دیا ہے کہ میں قریش کو جلا ڈالوں (یعنی اہل قریش میں سے جو لوگ کفر کو چھوڑنے اور ایمان کو قبول کرنے کو تیار نہیں ان کو اس طرح نیست ونابود کر ڈالوں کہ ان کا نام ونشان تک باقی نہ رہے)'' میں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار قریش تو میرا سر کچل ڈالیں گے اور کچل کر روٹی کی مانند (چوڑا) کر ڈالیں

گے (یعنی مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کی تعداد بھی زیادہ ہے اور طاقت بھی زیادہ ہیں' میں ان سے کس طرح نمٹ سکوں گا اور کیسے ان پر غالب آ سکوں گا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ان کو جلاوطن کر دو جس طرح کہ انہوں نے آپ ﷺ کو وطن بدر کیا تھا اور ان کے ساتھ جہاد کرو' ہم آپ کے جہاد کے سامان کا انتظام کریں گے (یعنی آپ اور آپ کے رفقاء کو ایسی غیبی امداد فراہم کریں گے کہ اہل اسلام کی مٹھی بھر جماعت بھی ان کے لشکر جرار پر غالب آ جائے گی) آپ اپنے اہل لشکر پر مال و اسباب صرف کیجئے۔ اگر آپ کے پاس مال و اسباب نہیں ہوگا تو ہم عطا کریں گے اور اس کا انتظام کریں گے۔ آپ ان کے مقابل میں اپنا لشکر روانہ کیجئے ہم دشمن کے لشکر سے پانچ گنا زیادہ طاقت کے ساتھ آپ کی مدد کریں گے (چنانچہ جب بدر کی جنگ ہوئی اور مسلمان صرف تین سو تیرہ کی تعداد میں کفر کے ایک ہزار کے لشکر کے مقابلہ میں نبرد آزما ہوئے تو احادیث سے ثابت ہے کہ پانچ ہزار فرشتوں کا لشکر مسلمانوں کی مدد کے لئے آیا) اور جو لوگ آپ کی دعوت کو قبول کرنے والے اور آپ کے اطاعت گزار ہیں ان کو اپنے ہمراہ لے کر ان کے خلاف جنگ کیجئے جنہوں نے آپ کی نافرمانی اور سرکش و کافر ہیں''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: قال ذات یوم فی خطبة۔۔۔۔ حنفاءَ کلهم:

ألا: لام کی تخفیف کے ساتھ تنبیہ کیلئے ہے۔

مما علمنی: احتمال ہے کہ ''من'' ''ما'' کا بیان ہو

اور یہ بھی احتمال ہے کہ ''من'' تبعیضیہ ہو' ماقبل سے منقطع ہو اور مابعد کیلئے خبر ہو اور جملہ مستانفہ ہو۔ ای ''من جملة ما علمنی''

یومی هذا: یعنی بطور خاص اس دن اللہ تعالیٰ نے میری طرف جو وحی بھیجی ہے اس کے سبب سے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا مقولہ ہے۔ جیسا کہ اگلا کلام اس پر دلالت کر رہا ہے۔

حنفاء: حق کو قبول کرنے کی استعداد والے ہیں اور باطل سے اعراض کر کے حق کی طرف مائل ہونے والے ہیں۔

کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: ''کل مولودٍ یولد علی الفطرة''

''ہر بچے کو فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے''۔ اور فطرت سے مراد توحید مطلق ہے' اور یہی مفہوم ہے اس ارشاد باری کا:

﴿فطرة الله التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق الله﴾ [الروم: ۳۰] ''اللہ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا' سے بدلنا نہ چاہیے''

یعنی اللہ کی مخلوقات کو یہودیت' نصرانیت اور مجوسیت اور ان جیسی چیزوں میں تبدیل نہ کرو' نیز ارشاد باری ہے:

﴿ذالك الدین القیم﴾ [التوبة۔ ۳۶' یوسف۔ ۴۰' الروم۔ ۳۰] ''پس سیدھا دین یہی ہے''۔ یعنی یہی سیدھا راستہ ہے چنانچہ اس سیدھے راستے سے ٹیڑھے راستے کی طرف مائل نہ ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وان هذا صراطی مستقیماً فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیله﴾ [الانعام: ۱۵۳] ''اور یہ کہ دین میرا راستہ ہے' جو کہ مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ [راہیں] تم کو اس کی [اللہ کی] راہ سے جدا

کر دیں گی۔"

یعنی اللہ کے اُس حقیقی راستے سے جو اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور اللہ کے ہاں مقبول ہے اُس شخص کیلئے جس پر اللہ تعالیٰ احسان کرنا چاہتا ہے۔ اور اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وعلی اللہ قصد السبیل ومنها جائر﴾[النحل ۔۹] ''اور سیدھا راستہ اللہ تک پہنچتا ہے اور بعضے رستے ٹیڑھے بھی ہیں''۔

نیز ارشاد باری ہے: ﴿لو شاء لهدا کم اجمعین﴾ ''اگر خدا چاہتا تو تم سب کو مقصود تک پہنچا دیتا''

اس کے بعد حضور علیہ السلام نے لوگوں کے گمراہ ہونے اور سیدھے راستے سے بھٹکنے کا سبب بیان فرمایا۔

قوله: وانهم اتتهم الشياطين۔۔۔۔ ما احللت لهم: یعنی میرے یہ بندے جن کے اندر قبولیت حق کی استعداد ہے

"فاجتالتهم" اجتال سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے ''لے جانا اور ہانکنا'' اور بعض کا کہنا ہے کہ افتعال کا یہ لفظ فعل پر ابھارنے کا معنی دیتا ہے جیسا کہ "اختطب زید عمروا" کا معنی ہے زید نے عمرو کو خطبہ دینے پر ابھارا، چنانچہ مطلب یہ ہوا کہ شیاطین ان کو دین سے بھٹکنے اور اعراض کرنے پر ابھارتے ہیں۔

مثلاً بحیرہ، سائبہ وغیرہ اور قاضی نے اس کی توضیح یوں فرمائی ہے کہ "کل مال نحلته" اُس بات کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سکھلائی اور جس کی اس دن وحی بھیجی اور معنی یہ ہے کہ میں نے اپنے بندے کو جو مال دیا وہ اُس کیلئے حلال ہے کوئی اس کو اس شخص پر حرام نہیں کر سکتا۔

کوئی یہ اعتراض نہ کرے کہ اس کلام کا مقتضی یہ ہے کہ مال حرام رزق نہ ہو اس لئے کہ جو بھی رزق اللہ تعالیٰ نے بندے کی طرف بھیج دیا ہے وہ اللہ کی عطاء ہے اور جو بھی اللہ کی عطا ہو وہ حلال ہے، چنانچہ ہر وہ رزق جو اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہے وہ حلال ہے اور اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ جو چیز بھی حلال نہیں ہے وہ رزق نہیں اس لئے کہ اس کا جواب یہ ہے کہ "رزق" اعطاء سے عام ہے کیونکہ "اعطاء" تملیک کے معنی کو متضمن ہے۔

اسی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہہ دے ''ان اعطیتنی الفا فأنت طالق''. اور عورت نے شوہر کو ہزار روپے دے دے، تو عورت کو طلاق بائنہ واقع ہو جائے گی اور ہزار روپے شوہر کی ملک میں آ جائیں گے، جبکہ رزق کا حکم اس طرح نہیں ہے۔

قوله: وأمرتهم ان يشركوا بي ما۔۔۔۔ بقايا من أهل الكتاب: ایسی شرکت یا ایسی چیز۔

"لم أنزل به سلطاناً": دلیل کا نام سلطان اس لئے رکھا گیا کہ دل پر غلبہ پا کر اس کا تسلط قائم ہو جاتا ہے جس وقت کہ دوسرے خیالات کا ہجوم ہو اور معنی یہ ہے کہ وہ چیز شریک ٹھہراتے ہیں جس کے شریک ہونے پر نہ کوئی عقلی دلیل ہوتی ہے اور نہ کوئی نقلی دلیل، کیونکہ اگر کوئی بھی دلیل ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو بیان کرتا، بلکہ معاملہ تو اس کے خلاف ہے اس لئے کہ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿وقضی ربك ان لا تعبدوا الا ایاہ﴾[الاسراء ـ ۲۳]

ترجمہ: ''اور تیرے رب نے حکم کر دیا ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت مت کرو''۔

اور قرآن پاک اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے بطلان پر دلائل سے بھرا ہوا ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں، کہ ''ما'' یشرکوا کا مفعول ہے اور اس سے بُت اور اللہ کے ماسوا تمام وہ اشیاء جن کو معبود بنایا گیا، مراد ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ شیاطین ان لوگوں کو اللہ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرانے کا حکم دیتے ہیں، جن کی عبادت کا اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم نہیں دیا، اور اُن معبودانِ باطلہ کی عبادت کے مستحق ہونے پر اللہ نے کوئی دلیل قائم نہیں کی۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ ''ما لم انزل به سلطانا'' کا معنی یہ ہے کہ نہ تو دلیل کو اتارا گیا ہے اور نہ کوئی شریک ہے اور اس کلام کا اسلوب وہی ہے جو کہ ''علی لاحب لا یهتدی بمناره'' کا ہے جس کا معنی ہے نہ تو کوئی راستے کا نشان موجود ہے اور نہ اُس سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے، اسی طرح ''ولا یری الضب بها ینجحر'' جس کا معنی ہے نہ تو کوئی گوہ ہے اور نہ کوئی سوراخ ہے جس میں وہ داخل ہو، اس سے مقصود اصل اور فرع دونوں کی نفی کرنا ہوتی ہے یعنی نہ تو قید ہے اور نہ مقید ہے۔

بعض نے حدیث کے اس جملہ کو تحکم پر محمول کیا ہے اس لئے کہ اللہ کے مقابلہ میں اس بات کی دلیل پیش کرنا ممکن ہی نہیں ہے کہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرانے پر دلالت کرے۔

عربهم وعجمهم: ضمیر سے بدل ہے اور عجم سے غیر عرب مراد ہیں، اور معنی یہ ہے کہ جب سارے لوگ بُرے اعمال، غلط عقیدے کے حامل ہو گئے اور حضور علیہ السلام کی بعثت سے پہلے شرک پر سارے لوگ متفق ہو گئے، اور کفر میں ڈوب گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے تو عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے سے انکار کر دیا، اور عزیر علیہ السلام کی پوجا کرنے لگے، اور اور اس عقیدے کو اپنا لیا کہ عزیرؑ اللہ کا بیٹا ہے۔ اور عیسیٰؑ کی قوم تین خداؤں کی قائل ہو گئی اور اس غلط عقیدے کی حامل ہو گئی کہ عیسیٰؑ خدا کے بیٹے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اپنا مبغوض اور ناپسندیدہ قرار دیا۔

الا بقایا من اهل الکتاب: یعنی سوائے یہود اور نصاریٰ کے بعض افراد کے جو کہ شرک سے بری تھے، اسی طرح بعض شارحین نے بیان کیا ہے۔ زیادہ اوہ یہ ہے کہ ان سے عیسیٰؑ کی قوم کی وہ جماعت مراد ہے جو عیسیٰؑ کی اتباع میں زندگی گزارتے رہے، یہاں تک کہ حضور علیہ السلام جب دنیا میں مبعوث ہوئے تو آپؐ پر ایمان لائے۔

قوله: وقال انما بعثتك ـــــ تقرؤه نائما ویقظان:

لا یغسله الماء): یعنی ہم نے قرآن کو کتابوں کے حوالہ کرنے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ مؤمنین کے سینوں میں اس کتاب کو محفوظ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿بل هو آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم﴾[العنکبوت: ۴۹] ''بلکہ یہ کتاب خود بہت سی واضح دلیلیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم عطا ہوا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون﴾[الحجر: ۹] ''ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم اس کے محافظ ہیں''۔

دھوئے جانے سے مراد منسوخ ہونا ہے، اور پانی کو بطور مثال کے ذکر کیا گیا، معنی یہ ہے کہ نہ اس کے بعد کوئی ایسی کتاب نازل ہوگی جو قرآن مجید کو منسوخ کر دے، اور نہ اس سے پہلے ایسی کوئی کتاب نازل ہوئی ہے جو اس کو باطل کر دے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**لا يأتيه الباطل من بين يديه و لا من خلفه تنزيل من حكم حميد**﴾ [فصلت: ٤٢] ''جس میں غیر حقیقی بات نہ اُس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے''۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، اس کا معنی ہے کہ ایسی کتاب جو دلوں میں محفوظ ہے۔ اور اس کے اوراق دھوڈالنے سے یہ کتاب مضمحل نہیں ہوگی۔

یا معنی یہ ہے کہ ایسی کتاب ہمیشہ کیلئے رہے گی اور لوگوں میں متداول رہے گی جب تک زمین وآسمان کا نظام قائم ہو نہ تو منسوخ ہوگی اور نہ مکمل طور پر بھولے گی۔ اور قرآن کے احکام کے ابطال، اس کی قراءت کے متروک ہونے اور اس سے کلیۃً اعراض کو بطور استعارہ اوراق قرآن کو پانی سے دھوئے جانے سے تعبیر کیا گیا۔

یا معنی یہ ہے کہ ایسی کتاب جس کی آیات واضح ہی، اور معجزات ظاہر ہیں، نہ تو کسی ظالم کا ظلم اس کو باطل کر سکتا ہے اور نہ کسی مناظر کے شکوک وشبہات پیدا کرنے سے بے اثر کیا جا سکتا ہے، اس طرح معنوی طور پر قرآن کے ابطال کو صوری طور پر ابطال کے ساتھ تشبیہ دے کر بیان کیا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں، کہ حدیث کا یہ جملہ قرآن کریم کے معانی اور فوائد کی کثرت سے کنایہ ہے جیسا کہ عرب (کثرتِ مال کو بیان کرنے کیلئے) کہتے ہیں: "**مال فلان لا يفنيه الماء او النار**" (ملان کا مال اتنا زیادہ ہے کہ نہ پانی اس کو ختم کر سکتا ہے اور نہ آگ)۔

یقظان: قاف کے سکون کے ساتھ، معنی یہ ہے کہ آپ کو ایسا ملکہ حاصل ہوگیا ہے کہ قرآن ہر وقت آپ کے ذہن میں مستحضر رہتا ہے اور اکثر حالات میں آپ کا پاک نفس اس کی طرف متوجہ رہتا ہے لہٰذا آپ نہ تو اس سے جاگنے کی حالت میں غافل رہتے ہیں، اور نہ سونے کی حالت میں۔ جب کوئی شخص کسی کام میں قدرت ومہارت رکھتا ہو اُس کے بارے میں کہا جاتا ہے: "**يفعله بالماء**" (وہ اس کام کو مہارت کے ساتھ کرتا ہے)۔ اسی طرح علامہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن تو اُس وقت بھی آپ کے قلب میں ہوتا ہے جس وقت آپ سورہے ہوتے ہیں۔ لیکن ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، کہ حضور علیہ السلام کے قلب مبارک کی نسبت سے اس تاویل کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ حضور علیہ السلام کی آنکھیں تو سوتی تھیں، مگر دل پر غفلت طاری نہیں ہوتی تھی، حالانکہ عام انسانوں میں بھی بہت سارے چھوٹے اور بڑے بندوں کو دیکھا گیا ہے کہ سورہے ہوتے ہیں، مگر ان کی زبان سے تلاوت ہو رہی ہوتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایک شخص کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ وہ اپنے شیخ ومرشد کے ساتھ ہر روز سحر کے وقت قرآن کی دس آیتوں کا دور کیا کرتا تھا، جب شیخ کی وفات ہوگئی تو وہ شخص اپنی عادت کے مطابق سحر کے وقت اُٹھا اور شیخ کی قبر پر گیا اور وہاں دس آیتوں کی تلاوت کی، تلاوت سے فارغ ہو کر خاموش ہی ہوا تھا کہ اچانک قبر کے اندر سے شیخ کی

آواز سنی، کہ انہوں نے دس آیتوں کی تلاوت کی اور خاموش ہوگیا، پھر اس شخص نے اس طرح قبر پہ جا کر قرآن کے دور کو معمول بنالیا اور یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا ایک دن اُس نے یہ واقعہ اپنے کسی دوست سے بھی بیان کر دیا، اسی دن سے قبر کے اندر سے شیخ کی تلاوت کی آواز کا آنا بند ہوگیا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ سعید بن مسیّب کے ساتھ بھی پیش آیا کہ جس وقت یزید کے فتنہ کے زمانہ میں مدینہ منورہ کے اندر جبکہ مسجد میں سعیدؒ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا تو انہوں نے حضور علیہ السلام کے قبر اطہر سے آذان کی آواز سنی اور دوسرے لوگ کہتے تھے کہ یہ شخص مجنون ہو چکا ہے۔

قولہ: وان اللہ امرنی ...... :

خبزۃ: یعنی میرا سر کچل کر گول شکل سے روٹی کی طرح چپٹی شکل میں کر دیں گے۔

کما اخرجوك: جیسا کہ انہوں نے آپ کو نکال دیا تھا اور یہ ان کے فعل کا پورا بدلہ ہوگا اگر چہ کفار کا حضور علیہ السلام کو مکہ سے نکال دینے اور حضور علیہ السلام کا کفار قریش کو مکہ سے نکال دینے میں بڑا واضح فرق ہے کیونکہ کفار قریش کا حضور علیہ السلام کو نکال دینا ناحق تھا اور حضور علیہ السلام کا ان کفار کو نکال دینا حق کی وجہ سے تھا۔

اغزھم: ان کے ساتھ جہاد کرو۔ واؤ مطلق جمع کیلئے ہے کیونکہ قتال ملک بدر (جلاوطن) پر مقدم ہے۔

نغزك: نون کے ضمہ کے ساتھ "اغزیتہ" کا مضارع ہے اور اس کا معنی ہے جہاد کیلئے سامان کا انتظام کرنا اور تیاری کرنا۔

انفق: آپ کے بس میں جتنی کوشش ممکن ہے وہ کر لیں۔

سننفق علیك: ہم اس کا بدل آپ کو دنیا و آخرت میں دے دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ﴾ [سبا: ۳۹] "اور جو چیز تم خرچ کرو گے سو وہ اس کا عوض دے گا اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے"۔

اس میں وعدہ اور تسلی دونوں ہیں۔

نبعث خمسۃ مثلہ: "مثلہ" نصب کے ساتھ، معنی یہ ہے کہ ان کی تعداد کے پانچ گنا تعداد میں فرشتے ان کی مدد کیلئے بھیج دوں گا، جیسا کہ جنگ بدر میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿بَلَىٰ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ﴾ [آل عمران: ۱۲۵] "اگر تم مستقل رہو گے اور متقی رہو گے اور وہ لوگ تم پر ایک دم سے آن پہنچیں گے تو تمہارا رب تمہاری امداد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو ایک خاص وضع بنائے ہوں گے"۔

واضح رہے کہ بدر کے دن مشرکین کی تعداد ایک ہزار تھی اور مسلمانوں کی تعداد تین سو تھی۔

۵۳۷۲ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ وَاَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ فَصَعِدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ الصَّفَا فَجَعَلَ يُنَادِيْ يَابَنِيْ فِهْرٍيَا بَنِيْ عَدِيٍّ لِبُطُوْنِ قُرَيْشٍ حَتَّى اجْتَمَعُوْا فَقَالَ اَرَأَيْتَكُمْ لَوْاَخْبَرْتُكُمْ اَنَّ خَيْلًا بِالْوَادِيْ تُرِيْدُ اَنْ تُغِيْرَ عَلَيْكُمْ اَكُنْتُمْ مُصَدِّقِيَّ قَالُوْا نَعَمْ مَاجَرَّبْنَا عَلَيْكَ اِلَّا صِدْقاً قَالَ فَاِنِّيْ نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ فَقَالَ اَبُوْلَهَبٍ تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا فَنَزَلَتْ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (متفق عليه وفي رواية) وَنَادٰى يَا بَنِيْ عَبْدِ مَنَافٍ اِنَّمَا مَثَلِيْ وَمَثَلُكُمْ كَمَثَلِ رَجُلٍ رَاٰى الْعَدُوَّ فَانْطَلَقَ يَرْبَأُ اَهْلَهٗ فَخَشِيَ اَنْ يَسْبِقُوْهُ فَجَعَلَ يَهْتِفُ يَاصَبَاحَاهُ.

اخرجه البخاري في صحيحه حديث رقم ٤٧٧٠ ومسلم في صحيحه ١٩٣/١ حديث رقم (٣٥٥-٢٠٨) والترمذي في السنن ٤٢٠/٥ حديث رقم ٣٣٦٣ والدارمي في ٣٩٥/٢ حديث رقم ٢٧٣٢ واحمد في المسند ٣٠٧/١۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (یعنی اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے) تو آپ کوہ صفا پر (جو بیت اللہ کے نزدیک ہے) تشریف لے گئے اور وہاں سے آواز دینے لگے اے بنوعدی! اے بنوفہر! یعنی قریش کے تمام قبائل کو (نام لے لے کر) پکارنا شروع فرمایا حتی کہ وہ (قریش کی تمام شاخوں کے) لوگ جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تم لوگ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں تمہیں اس بات کی اطلاع دوں کہ جنگل میں ایک لشکر نے پڑاؤ ڈالا ہے اور تمہیں تباہ و غارت کر دینے کا ارادہ کیے ہوئے ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے ان سب نے (یک زبان ہو کر) کہا۔ بے شک! کیونکہ ہماری آزمودہ بات یہ ہے کہ تم نے جب بھی کوئی بات کہی ہے سچ کہی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اگر تم میری سچائی کے معترف ہو تو سنو کہ) بلاشبہ خدا کی طرف سے تمہیں اس کے سخت ترین عذاب کے اترنے سے پہلے ڈرانے والا بنا کر مامور ہوا ہوں (یعنی میں خدا کے رسول کی حیثیت سے تمہیں دعوت اسلام پیش کرتا ہوں' اس کو قبول کرو' اگر تم اس دعوت کو قبول نہیں کرو گے اور مجھ پر ایمان نہیں لاؤ گے تو پھر میں تمہیں پیشگی اطلاع دیتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے سخت ترین عذاب کو بھگتنے کے لئے تیار ہو جاؤ)۔ ابولہب (جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا اور جس کا نام عبدالعزیٰ تھا یہ سن کر آگ بگولا ہو کر) بولا۔ سارے دن تیری تباہی ہو' کیا اسی لئے تو نے ہمیں اکٹھا کیا تھا (کہ ہم اتنی خراب گفتگو سننے آئے ہیں؟) اس پر اس سورۃ مبارک کا نزول ہوا تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ یعنی ابو لہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ تباہ ہو جائے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی و گستاخی کے باعث تباہ و برباد ہو گیا (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (قریش کو اکھٹا کر کے پکار کر فرمایا) اے بنی عبد مناف! میری اور تمہاری حالت کی مثال اس شخص کی مانند ہے جس نے دشمن کا لشکر (اپنی قوم پر حملہ آور ہونے کے لئے آتے ہوئے) دیکھا تو وہ اپنی قوم کو (اس دشمن کے قتل و غارت گری سے) محفوظ رکھنے کے لئے چلا (تا کہ کسی بلند جگہ پر چڑھ کر اونچی پکار کے ذریعہ اپنی قوم کو دشمن کے خطرہ سے کر دے) لیکن اس اندیشہ سے کہ کہیں دشمن کا لشکر اس سے پہلے ہی اس کی قوم تک رسائی نہ حاصل کر لے' اس نے وہیں سے چلا چلا کر یہ کہنا شروع کر دیا“۔

تشریح: صعد: عین کے کسرہ کے ساتھ

یہ ”لما“ کا جواب ہے' اور بعض نسخوں ~~میں~~ کے ساتھ ”فصعد“ منقول ہے مگر اس کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔

صفا: مکہ میں ایک معروف پہاڑ ہے یہ شعائر اللہ میں سے ہے۔

فجعل: افعال شروع کے معنی میں ہے۔

فهر: فاء کے کسرہ اور ھاء کے سکون کے ساتھ۔ بنی فہر قریش کا ایک قبیلہ ہے جیسا کہ قاموس میں لکھا ہے۔

بني عدی: یہ بھی قریش کا ایک قبیلہ ہے۔ قاموس میں اسی طرح لکھا ہوا ہے۔

لبطون قریش: اس میں ایک اشکال ہے اور وہ یہ ہے کہ "بطن" قبیلے کی شاخ یعنی بطن قبیلہ یا فخذ سے نیچے کا درجہ ہوتا ہے اور عمارہ سے اوپر کا درجہ ہوتا ہے، اور لفظ "القبله" تو بالائی درجے یعنی "قبائل" کا واحد ہے جس سے نسبت کی شاخیں نکلتی ہیں، اور اسی معنی میں لفظ قبائل العرب مستعمل ہوتا ہے جس کا واحد قبیلہ ہے، اور قبلہ ایک ہی دادا کی اولاد کو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح قاموس میں لکھا ہے۔ حاصل یہ کہ قبیلہ بمنزلہ جنس کے ہے اور بطن بمنزلہ نوع کے اور فخذ بمنزلہ فصل کے ہے، اور بعض اوقات ایک لفظ کو دوسرے کے معنی میں استعمال کر دیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "لبطون" میں لام بیان کیلئے ہے جیسا کہ ارشاد باری میں ﴿لمن اراد ان يتم الرضاعة﴾ "جو شیر خوارگی کی تکمیل کرنا چاہے"۔ [البقرۃ۔ ۲۳۳]

گویا کہ سائل نے سوال کیا کہ نبی علیہ السلام نے کس کو پکارا، جواب دیا گیا "لبطون قریش"۔

قوله: حتی اجتمعوا فقال۔۔۔ أکنتم مصدقی:

حتی اجتمعوا: جب تمام قبائل اور شاخوں کے لوگ۔

ارایتکم: تاء کے فتحہ کے ساتھ اور اس لفظ میں ہمزہ کو باقی رکھنا، ہمزہ کی تسہیل ہمزہ کو بدل لینا اور ہمزہ کو حذف کرنا سارے امور جائز ہیں اور معنی یہ ہے کہ مجھے بتاؤ اور اس کی تحقیق کو علامہ طیبیؒ نے اس طرح ذکر کیا کہ ضمیر مرفوع متصل عام خطاب کیلئے ہے اور دوسری ضمیر کا محل اعراب نہیں ہے اور یہ دوسری ضمیر پہلی ضمیر کا بیان ہے کیونکہ پہلی ضمیر بمنزلہ جنس کے ہے جو تمام مخاطبین کو شامل ہے، جس میں تذکیر، تانیث، افراد اور جمع سب برابر ہیں، جب ان میں سے کسی ایک کو بیان کرنے کا ارادہ کیا گیا تو ضمیر سے بیان کیا گیا اور حدیث میں پہلی ضمیر کی مراد بیان کرنے کیلئے دوسری ضمیر جمع کی ذکر کی گئی، انتہی۔

گویا کہ حضور علیہ السلام نے یوں فرمایا کہ "ارأیتم فان رأیتم فاعلمونی" (کیا تمہیں یقین ہے اگر تمہیں یقین ہے تو مجھے بتاؤ)۔ شارحؒ فرماتے ہیں، کہ وادی مکہ کے قریب ایک معروف جگہ ہے اور گویا کہ وادی سے مکہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک وادی مراد ہے۔ جو "وادی فاطمہ" کے نام سے مشہور ہے۔

"تغیر" "الاغارۃ" مصدر سے مشتق ہے، اور "اغارۃ" کا معنی ہے "رات کو غفلت کے وقت حملہ کرنا"۔ اور حدیث میں لفظ "خیلاً" سے بطور مجاز "اصحاب الخیل" (گھوڑوں والے) مراد ہیں، جیسا کہ ارشاد باری "واسئل القریة" میں "القریة" سے اهل القریة مراد ہے۔

قوله: قالو انعم ما جربنا علیك الا صدقا:

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ "جرب" فعل القاء کے معنی کو متضمن ہے اور اس کو "علی" کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے، گویا کہ معنی کلام کا یہ ہے کہ "ما القينا عليك قوة مجربين لك فيه هل تكذب فيه ام لا ما سمعنا منك الا صدقاً". (ہم نے جب بھی یہ تجربہ کرنے کیلئے کہ آپ سچ بولتے ہیں یا جھوٹ بولتے ہیں کسی بات کو آپ کے سامنے رکھا تو آپ سے ہم نے صرف سچ ہی سنا)۔

قولہ: قال فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید: یعنی ایک بہت بڑے عذاب اور سخت پکڑ کے آنے سے پہلے۔ معنی یہ ہے کہ اگر تم لوگ مجھ پر ایمان نہیں لاؤ گے، تم پر بڑا سخت عذاب نازل ہوگا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ "بین یدیه" "نذیر" کے لئے ظرف لغو ہے اور اس کا معنی ہے آگے، کیونکہ جو بھی چیز کسی کے آگے ہوتی ہے اس کے دونوں اطراف یعنی دائیں اور بائیں کے درمیان برابر ہوتی ہے۔ اس جملہ میں تمثیل ہے حضور علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے کو قوم کے اُس ڈرانے والے شخص کے ساتھ تشبیہ دی جو دشمن کے لشکر کے آنے سے پہلے آکر اپنی قوم کو خبردار کر دے اور ڈرائے۔

قولہ: فقال ابو لهب تبالك: یہ شخص اپنی اس کنیت سے معروف ہے۔ اور اس کا نام عبدالعزیٰ ہے۔ یہ عبدالمطلب بن ہاشم کا بیٹا اور حضور علیہ السلام کا چچا تھا۔

یعنی تیرے لئے ہلاکت اور تباہی ہو، اور قاضی نے لکھا ہے کہ اس کا نصب عامل مضمر کی وجہ سے ہے یا تو مفعول مطلق ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور معنی یہ ہے تبّ تباً یا کسی اور فعل مضمر کی وجہ سے یعنی الزمك الله هلاكا وخسراناً والزم بهلاك (اللہ تجھے لازمی طور پر ہلاک وتباہ کر دے)

سائر اليوم: تورپشتی ؒ فرماتے ہیں، کہ جنہوں نے سائر سے بقیہ کا معنی مراد لیا ہے وہ درست نہیں ہے کیونکہ یہ لفظ السیر سے ماخوذ ہے السور: سے ماخوذ نہیں ہے۔ اور عربی کا محاورہ ہے اسائر اليوم وقد زال الظهر (کیا دن میں اب بھی کچھ باقی ہے جبکہ ظہر کا وقت گزر چکا) اور یہ محاورہ اُس وقت بولا جاتا جب کسی ضروری کام سے مایوسی ہو جائے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: اس میں اشکال ہے کیونکہ صاحب نہایہ فرماتے ہیں، کہ لفظ "السائر" مہموز ہے اور اس کا معنی ہے باقی اور لوگ اس کو جمیع (تمام) کے معنی میں استعمال کرتے ہیں جو کہ درست نہیں ہے، اور یہ لفظ احادیث میں تکرار کے ساتھ مذکور ہے اور تمام جگہوں میں اس کا معنی ہے "کسی چیز کا باقی ماندہ" اور اساس البلاغہ کا کلام صاحب نہایہ کی بات کے درست ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ انہوں نے اس لفظ کو سین اور ہمزہ کے باب میں ذکر کر کے فرمایا ہے کہ "ساٴر الشارب في الاناء سوارا وسورة:: کا معنی ہے" پینے والے نے برتن میں کچھ باقی چھوڑا"۔ اور ضرب المثل بھی ہے "اسائر اليوم وقد زال الظهر" (کیا دن میں کچھ باقی بھی رہتا ہے جبکہ ظہر کا وقت گزر چکا)، انتہی۔ اس بناء پر "سائر اليوم" سے "بقیہ آنے والے ایام" مراد ہیں۔

اور قاموس میں ہے کہ السؤر کا معنی ہے بقیہ اور بچا ہوا اور "اساٴر اور ساٴر" بروزن منع کا معنی ہے "اُس نے کچھ باقی

چھوڑا"۔ اور اس سے فاعل "سائر" آتا ہے حالانکہ قیاس کے مطابق منتسر ہونا چاہئے تھا اور ایسا کرنا جائز ہے، اور سائر کا معنی ہوگا، باقی "تمام"۔ اس کا معنی نہیں ہوگا جیسا کہ کئی جماعتوں کا وہم ہے یا یہ کہ بعض اوقات تمام کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے اور اسی معنی میں "احوص "شاعر کا شعر بھی ہے:

فجلتها لنا لبابة لما

وفد القوم سائر الحراس

یدا ابی لھب: ھاء کے فتحہ کے ساتھ اور اس کو ساکن بھی پڑھا جاتا ہے یعنی "ابولہب کی ذات" جیسا کہ: [لا تلقوا بأیدیکم] [البقرۃ:۱۹۵] "اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو" میں أیدی سے انفس مراد ہیں، یعنی "لا تلقوا بانفسکم" اور باء اس میں زائد ہے اور بعض نے دونوں ہاتھوں سے ابولہب کی دنیا اور آخرت دونوں مراد لیا ہے۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں، کہ بطور خاص ہاتھوں کا ذکر اس لئے کیا کہ جب ابولہب نے کہا "الھذا جمعتنا؟" تو اُس وقت پتھر اٹھایا تا کہ آپ کو پتھر مارے، اس پر یہ آیت اُتری۔

اس کو کنیت (ابولہب) سے ذکر کیا گیا، حالانکہ کنیت بطور اعزاز واکرام بولا جاتا ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شخص اپنی کنیت سے مشہور تھا۔

یا وجہ یہ ہے کہ اس کا نام عبدالعزیٰ تھا اور ابولہب اس نام کو برا محسوس کرتا تھا۔

یا وجہ یہ ہے کہ چونکہ ابولہب جہنمی ہے اس لئے اس کی یہ کنیت اس کی اُس حالت کے زیادہ موافق ہے اگر چہ اس کی یہ کنیت زیادہ حسن وجمال کی وجہ سے رکھی گئی تھی۔

اس لفظ کو "ابی لھب" کی بجائے "ابو لھب" بھی پڑھا گیا ہے، جیسا کہ علی بن ابوطالب کہا جاتا ہے، اور یہ ایک لغت ہے کہ اسماء ستہ مکبرہ میں واؤ پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے جیسا کہ بعض اہل لغت نے اس لفظ میں الف پر اکتفاء کی ہے اور "ان أباھا وأبا أباھا" پڑھا ہے۔

وتب: یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے مزید تاکید کیلئے۔

ماضی سے تعبیر اس لئے کیا گیا کہ اس کا وقوع متحقق ہے۔ یا پہلا جملہ بطور بددُعا کے ہے، اور دوسرا جملہ بطور خبر کے ہے۔

تخریج: امام میرک فرماتے ہیں: کہ یہ روایت امام مسلم کی مفرد روایات میں سے ہے۔

قولہ: وفی روایۃ: نادی: یا بنی عبد مناف۔۔۔ الخ

قاموس میں لکھا ہے کہ عبد مناف، ھاشم اور عبد شمس اور مطلب کا بھائی تھا، اور مناف، ایک بُت تھا۔

یربأ: یاء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور باء کے بعد ہمزہ ہے دشمن سے حفاظت کرتا ہے۔

اس شخص کو خوف ہوتا ہے کہ یہ دشمن اس کی قوم کے پاس جلدی پہنچ جائیں گے اور قبل اس کے کہ اس کی قوم دشمن کا مقابلہ

کرنے کیلئے آگے بڑھے دشمن اس کے قوم کی طرف پہنچ جائیں گے۔

فجعل: افعال شروع کے معنی میں ہے۔

یھتف: تاء کے کسرہ کے ساتھ یعنی پہاڑی پر چڑھ کر چیخنا اور چلانا اور بسا اوقات ہاتھ میں کپڑا لے کر یا کوئی لکڑی لے کر لہراتا ہے تاکہ اچھی طرح سب کو اطلاع ہو جائے اور اسی معنی میں عربی میں "النذیر العریان" استعمال ہوتا ہے، یا تو کہ یہ کنایہ ہے اسباب سے ہاتھوں کے خالی ہونے سے یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دشمن نے اس کو پکڑا اس سے کپڑے چھین لئے اور یہ شخص دشمن سے بھاگ کر آ رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت ہر شخص اس کی بات کی تصدیق کرتا ہے۔

یا صباحاہ: ھاء کے سکون کے ساتھ اور عام طور پر دشمن چونکہ صبح کے وقت حملہ آور ہو کر غارت گری کرتا ہے، اس لئے خاص اس لفظ کو بولا جاتا ہے اگرچہ دشمن کا حملہ شام کے وقت ہی کیوں نہ ہو۔ واللہ اعلم۔ یہ کلمہ کسی خطرناک چیز سے ڈرانے کیلئے بولا جاتا ہے۔

کلام کا معنی یہ ہے کہ اے لوگو! دشمن کے آنے سے پہلے آگے بڑھو اور اپنے آپ کو بچاؤ، گویا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ کے عذاب کے آنے سے پہلے ایمان لا کر اپنے آپ کو عذاب الٰہی سے بچاؤ۔

۵۳۷۳ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ دَعَا النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُرَيْشًا فَاجْتَمَعُوْا فَعَمَّ وَخَصَّ فَقَالَ يَا بَنِیْ كَعْبِ بْنِ لُؤَيٍّ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَابَنِیْ مُرَّةَ بْنِ كَعْبٍ اَنْقِذُوا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَابَنِیْ عَبْدِ شَمْسٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَابَنِیْ عَبْدِ مَنَافٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَابَنِیْ هَاشِمٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ وَيَا فَاطِمَةُ اَنْقِذِیْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ فَاِنِّیْ لَا اَمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا غَيْرَ اَنَّ لَكُمْ رَحِمًا سَاَبُلُّهَا بِبَلَالِهَا (رواہ مسلم وفی المتفق علیه) قَالَ يَامَعْشَرَ قُرَيْشٍ اشْتَرُوْا اَنْفُسَكُمْ لَا اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا يَا بَنِیْ عَبْدِ مَنَافٍ لَا اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا يَاعَبَّاسُ بْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ لَا اُغْنِی عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَيَا صَفِيَّةُ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا اُغْنِیْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَيَا فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ سَلِيْنِیْ مَاشِئْتِ مِنْ مَالِیْ لَا اُغْنِیْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵/۳۸۲ حدیث رقم ۲۷۵۳ ومسلم فی صحیحه ۱/۱۹۲ حدیث رقم (۳۴۸۔۲۰۴) والترمذی فی السنن ۵/۳۱٦ حدیث رقم ۳۱۸۵ والنسائی ٦/۲٤۹ حدیث رقم ۳٦٤٤ واحمد فی المسند ۲/۳۳۳

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی کہ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ

الْاَقْرَبِیْنَ (اپنے قریب کے کنبہ والوں کوڈرائیے) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے لوگوں کو (آواز دے کر) مدعو کیا جب وہ سب جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمومیت کے ساتھ بھی مخاطب فرمایا اور خصوصیت کے ساتھ بھی۔ (یعنی ان کو ان کے دور کے جداعلیٰ کے ناموں کے ذریعہ بھی خطاب فرمایا خاص خاص لوگوں سے مخصوص خطاب بھی ہو جائے) چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو (اس طرح) مخاطب فرمایا: اے کعب بن لوی کی اولاد! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ (یعنی ایمان قبول کرو اور نیک عمل کرو تا کہ دوزخ کی آگ سے چھٹکارا پا سکو) اے مرہ بن کعب کی اولاد! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے عبدشمس کی اولاد! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے عبدمناف کی اولاد! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے ہاشم کی اولاد! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے عبدالمطلب کی اولاد اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ اور اے (میری جان پدر) فاطمہ! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچا کیونکہ تمہارے حق میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے از قسم عذاب کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا (یعنی میں تم میں سے کسی کو بھی اللہ کے عذاب بچانے کی اہلیت نہیں رکھتا) البتہ مجھ پر تمہاری قرابت کا حق ہے جس کو میں اس کی تری کے ساتھ تر کرتا رہوں گا (یعنی میرے اور تمہارے درمیان جو رشتہ داری ہے اور اس کا جو حق میرے ذمہ ہے۔ وہ بس اتنا ہی ہے کہ میں اس دنیا کے معاملات میں تمہاری نگہداشت کروں، تمہارے ساتھ حسن سلوک کروں اور اگر تم فقر و افلاس کی تپش محسوس کرو تو میں صلہ رحمی اور حسن سلوک و احسان کے چھینٹوں سے اس تپش کو بجھانے کے لئے سعی کروں) اس روایت کو مسلمؒ نے نقل کیا ہے اور جس روایت کو بخاری و مسلم دونوں نے نقل کیا ہے اس میں یہ الفاظ ہیں کہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے قریش کی جماعت اپنے آپ کو خرید لو (یعنی ایمان قبول کر کے اللہ تعالیٰ کی اتباع و فرمانبرداری کا راستہ اپنا کر کفر کو چھوڑ دو اور اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ) میں تمہارے خدا کے عذاب کے بارے میں کچھ بھی کام نہیں آ سکتا۔ اے عبدمناف کی اولاد میں تم سے (بھی) خدا کے عذاب کو دور کرنے کے بارے میں کچھ بھی کام نہیں آ سکتا۔ اے (میرے چچا) عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ میں آپ سے (بھی) خدا کے عذاب کو دور کرنے کے بارے میں کچھ بھی کام نہیں آ سکتا اور اے اللہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی صفیہ میں آپ سے بھی) خدا کے عذاب کو دور کرنے کے بارے میں کچھ نہیں کر سکتا اور اے میری لخت جگر فاطمہ بنت محمد! میرے مال کے متعلق مجھ سے جس چیز کا چاہے مطالبہ کرے (میں دوں گا) لیکن خدا کے کسی عذاب سے میں تجھ کو (بھی) نہیں بچا سکتا"۔

تشریح: **یا بنی کعب بن لؤی**: لوم کے ضمہ اور ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ اور کبھی تو واؤ سے بدل دیا جاتا ہے آخر میں یا مشددہ ہے اور لؤی: غالب بن فہر کا بیٹا تھا۔

انقذوا: ہمزہ کے فتحہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ۔

یا بنی مرۃ بن کعب: میم کے ضمہ اور راء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ قاموس میں ہے کہ مرہ بن کعب قریش کی ایک شاخ کے جداعلیٰ کا نام ہے۔

قولہ: یا فاطمۃ انقذی نفسک من النار:

حضور علیہ السلام نے قبائل قریش کو ڈرانے کے سلسلے میں آخر میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ذکر کیا کیونکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنی قوم کا خلاصہ ہے، اس کے بعد آئندہ جملے میں آپ ﷺ نے عمومی طور پر اس بات سے براءت کا اظہار فرمایا کہ آپ ﷺ بغیر ایمان اور عمل صالح کے کسی کو عذاب سے خلاصی نہیں دلوا سکتا۔

قوله :فاني لا املك لكم من الله: یعنی عوام اور خواص سب کے سب کیلئے۔ اللہ کے عذاب سے۔ نہ کچھ ملکیت ہے نہ کچھ قدرت اور نہ کچھ دفاع کر سکتا ہوں اور نہ کچھ منفعت دے سکتا ہوں معنی یہ ہے کہ میں اللہ کے عذاب سے تم میں سے کسی کا کچھ بھی دفاع نہیں کر سکتا اگر اللہ تمہیں عذاب دینے کا ارادہ کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد سے اقتباس لیا گیا ہے: ﴿**قل فمن يملك لكم من الله شيئا ان اراد بكم ضرا او اراد بكم نفعا**﴾ [الفتح۔۱۱] ''آپ کہہ دیجئے کہ سو وہ کون ہے جو خدا کے سامنے تمہارے لئے کسی چیز کا اختیار رکھتا ہو اگر اللہ تم کو کوئی نقصان یا کوئی نفع پہنچانا چاہے۔''

بلکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**قل لا املك لنفسي نفعا ولا ضرا الا ما شاء الله**﴾ [الاعراف:۱۸۸] ''آپ کہہ دیجئے کہ میں خود اپنی ذات خاص کیلئے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا، مگر اتنا ہی جتنا خدا تعالیٰ نے چاہا ہو۔''

اور یہ تو حد کا ایک بے مثال اقرار و اظہار ہے حالانکہ آپ ﷺ ایمان والوں کیلئے شفاعت کر کے ایمان والوں کو فائدہ پہنچائیں گے اس لئے کہ آپ ﷺ جب شفاعت کریں گے تو آپ ﷺ کی شفاعت قبول ہوگی لیکن آپ ﷺ کی شفاعت پر اعتماد کر کے بیکار نہ بیٹھیں، نیز آخرت کیلئے محنت و مشقت برداشت کرنے اور آخرت کیلئے زیادہ سے زیادہ توشہ حاصل کرنے کی ترغیب کیلئے ایسا کیا، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے اور یہی معنی ہے آپ ﷺ کے ارشاد گرامی **غير ان لكم رحما** ...... کا۔

باء کے ضمہ اور لام کی تشدید کے ساتھ

بلالها: باء کے کسرہ کے ساتھ ہے نیز باء کو فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے

یعنی قرابت داروں کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کر کے اس جملے کا حاصل یہ ہے کہ میں اپنے اقارب کے ساتھ اچھا سلوک کر کے اور ان سے ظلم اور نقصان کا دفاع کر کے وغیرہ وغیرہ ان کے ساتھ اپنی قرابت داری کو قائم رکھوں گا۔

نہایہ میں لکھا ہے کہ ''بلال'' اصل میں ''بلل'' کی جمع ہے جس کے معنی تری کے ہیں، اور اہل عرب اس قسم کے موقعہ پر تری کا اطلاق احسان اور حسن سلوک کے معنی میں کرنے پر کرتے ہیں، جب کہ لفظ یبسؔ (خشکی) کا اطلاق قطع تعلق اور بدسلوکی کرتے ہیں، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے اجزاء تری کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں اور منسلک ہو جاتے ہیں، جبکہ خشکی کا پیدا ہو جانا ان اجزاء کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتا ہے تو انہوں نے بطور استعارہ تری کو وصل یعنی جوڑنے اور ملانے کے معنی میں اور خشکی کو منقطع کرنے اور توڑنے کے معنی میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔

کلام کا معنی یہ ہوا کہ میں دنیا میں تمہارے ساتھ صلہ رحمی کروں گا، لیکن آخرت میں اللہ کے عذاب سے تمہیں نہیں بچا سکتا۔

وفي المتفق عليه: یہ بعض صحیح نسخوں میں موجود ہے۔

یا معشر قریش اشتروا انفسکم: یعنی ایمان لا کر اور کفر چھوڑ کر اس دین کی اطاعت کرو جس کو میں لے کر آیا ہوں اور جس سے منع کروں اس سے رُک جاؤ، اور اپنے آپ کو جہنم سے آزاد کرو، اور چھڑاؤ۔

یا بنی عبد مناف 'یاعباس بن عبد المطلب: دونوں منصوب ہیں، اور ایک نسخہ میں "عباس" مرفوع ہے۔

ویا صفیة: واؤ عاطفہ کے ساتھ ہے جبکہ اس سے پہلے والے الفاظ نداء میں واؤ عاطفہ نہیں ہے بلکہ بطور تعداد کے مذکور ہیں، اور لفظ "صفیة" مرفوع ہے۔

عمة رسول اللہ: منصوب ہے۔

یا فاطمة بنت محمد سلینی ماشئت ما لی: اسی طرح نسخوں میں "ما" موصولہ ہے۔ علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ میرا خیال ہے کہ "عما لی" میں "مالی" سے مال معروف مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ امور ہیں جن کا آپؐ کے پاس اختیار تھا اور آپؐ کا حکم اُن کے بارے میں نافذ ہوتا تھا۔ کیونکہ آپؐ کے پاس مال معروف نہیں تھا، خصوصاً مکہ میں تو بالکل فقر کا زمانہ تھا اور اس بات کا احتمال ہے کہ بعض ایسے راوی جن کو تحقیق نہیں تھی انہوں نے من اور "ما" میں فصل کیا اور دونوں کلمے جدا کر کے لکھ دیے، انتہیٰ۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی آیت: ﴿ووجدك عائلا فأغنى﴾ [الضحی: ۸] "اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نادار پایا سو مالدار بنایا" سے اس جواب پر اشکال وارد ہوتا ہے۔ کیونکہ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ فاغنی سے مراد یہ ہے کہ خدیجہؓ کے مال سے تجھے مالدار کر دیا۔ نیز اگر کسی سخی اور فیاض کے پاس فی الحال مال موجود نہ ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آئندہ کسی وقت میں بھی اس کے پاس مال نہیں ہوگا چنانچہ اس مذکورہ وعدہ کو اُس زمانہ مستقبل کی مالداری پر محمول کیا جائے گا، اور جب تک حدیث کے معنی کی صحت ممکن ہو تو روایات میں غلطی کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

۵۳۷۴: عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُمَّتِیْ ھٰذِہٖ اُمَّۃٌ مَرْحُوْمَۃٌ لَیْسَ عَلَیْھَا عَذَابٌ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابُھَا فِی الدُّنْیَا الْفِتَنُ وَالزَّلَازِلُ وَالْقَتْلُ۔ (رواہ ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٤٦٨/٤ حدیث رقم ٤٢٧٨ وابن ماجه ١٤٣٤/٢ حدیث رقم ٢٤٩٢ واحمد فی المسند ٤١٠/٤

ترجمہ: "حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "میری یہ امت امت مرحومہ ہے۔ اس اُمت پر آخرت میں (شدید) عذاب نہیں ہوگا اور دنیا میں اس کا عذاب' فتنوں زلزلوں اور ناحق خون ریزی کی صورت میں ہے"۔ (ابوداؤد)

تشریح: قولہ: امتی ھذہ امة مرحومة: امت اجابت جو ذہنوں میں موجود ہے اور معنی کے اعتبار سے متعین ہے گویا کہ حسی طور پر مذکور ہے۔

اور آپؐ کا نام ہی نبی الرحمة ہے۔ اور یہ امت بہترین امت ہے۔

قولہ: لیس علیھا عذابفی الآخرۃ: بلکہ اکثر اس امت کا عذاب اس طرح ہوتا ہے کہ ان پر دنیا طرح طرح کے مصائب بیماریاں اور مشقتیں آتی ہیں، جو دنیا ہی میں ان کے اعمال کی سزا ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد باری میں یہ ثابت ہے: ﴿من یعمل سوءً یجز بہ﴾ [النساء۔۱۲۳]

ترجمہ: ''جو شخص کوئی برا کام کرے گا وہ اس کے عوض سزا پائے گا۔''

اور اس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔ اور اس معنی کی تائید آپ کے آئندہ قول سے ہوتی ہے۔

قولہ: عذابھا فی الدنیا الفتن والز لازل والقتل: بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صرف ان مسلمانوں کے حق میں ہے جو کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہیں کرتے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے امت کی ایک مخصوص جماعت یعنی صحابہ کی طرف اشارہ ہو۔

یا حضور علیہ السلام کے اس ارشاد گرامی میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کی قید مقدر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ان اللہ لا یغفر ان یشرك بہ ویغفر ما دون ذالك لمن یشاء﴾ [النساء۔۴۸]

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہو گا وہ گناہ بخش دینگے۔''

مظہرؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث نہایت پیچیدہ ہے کیونکہ اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی امت کے کسی بھی فرد کو آخرت میں عذاب نہیں ہو گا، خواہ کبیرہ کا مرتکب ہو خواہ صغیرہ کا، حالانکہ احادیث سے مرتکب کبیرہ کو عذاب دیا جانا ثابت ہے، اس لئے اس کے بارے میں اللہ کی رہنمائی بغیر تو کچھ نہیں کیا جا سکتا، سوائے اس کے یہ تاویل کی جائے کہ اس مقام پر امت سے مراد وہ شخص ہے جو حضور علیہ السلام کی اس طرح اتباع کرے جیسا کہ اس کا حق ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی تعمیل کرے اور ممنوعہ امور سے اجتناب کرے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ یہ حدیث امتِ محمدیہ کی مدح وتعریف کے بارے میں وارد ہوئی ہے اور اس میں اس بات کا بیان ہے کہ اس امت پر باقی امتوں کی بنسبت اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام اور مہربانی ہے، اور اگر اس امت کے کسی شخص کو کوئی مصیبت پہنچے، حتی کہ ایک کانٹا بھی چبھ جائے تو اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ بات دوسری امتوں کیلئے نہیں ہے۔ اور اس کی تائید حدیث کے لفظ ''ھذہ'' اور لفظ ''مرحومۃ'' سے ہوتی ہے کیونکہ یہ الفاظ اللہ کی رحمت ومہربانی کے اعتبار سے اس امت کے امتیاز پر دلالت کرتے ہیں، اور کلام کے مفہوم کا قول کرنا اس مقام میں متروک ہے، اور یہی رحمت الٰہی ہے جس کی طرف ارشاد باری: ﴿ورحمتی وسعت کل شیء فسأکتبھا للذین یتقون ـــ الذین یتبعون الرسول النبی الامی﴾ [الاعراف۔۱۵۶۔۱۵۷] انتہی۔

لیکن یہ بات پوشیدہ نہیں ہونی چاہئے کہ یہ سارے اقوال اشکال کو دور نہیں کر سکتے کیونکہ تمام ارباب الحال کے نزدیک اس

بات میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت زیادہ ہے کلام تو اس میں ہے کہ یہ حدیث بظاہر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس امت کے کسی فرد کو بھی عذاب نہیں دیا جائے گا، جبکہ متواتر احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں، کہ اس امت میں کبائر کے مرتکب لوگوں کی ایک جماعت جہنم میں ڈال کر ان کو عذاب دیا جائے گا، پھر سزاء بھگت کر جہنم سے نکل آئیں گے، یا تو آپؐ کی شفاعت پر یا غفار ذات کے معاف کرنے کے بعد اور یہی اس حدیث سے مفہوم ہے، جو اس کے الفاظ اور معانی سے ماخوذ ہے اور یہ بات اُس طرح متعارف مفہوم نہیں ہے جس کے معتبر ہونے میں اختلاف ہے تا کہ یہ بات کہنا درست ہو کہ اس مفہوم کو ترک کیا گیا ہے، کیونکہ مظہرؒ کے کلام میں مفہوم سے مراد عبارت سے معلوم ہونے والا معنی ہے۔

اس کے بعد علامہ طیبیؒ کا یہ کہنا کہ یہ خصوصیت یعنی مصیبت کی وجہ سے گناہوں کا معاف ہو جانا دوسری امت کیلئے نہیں تھی۔ یہ بات دلیل کی محتاج ہے جس سے یہ ثابت ہو اور آپؐ کے قول عذابها فی الدنیا...... سے جو مفہوم حاصل ہوتا ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں، اس لئے کہ یہ قول اس قید کے ساتھ مقید کرنے کے قابل ہے کہ دنیا کے مصائب سے اس امت کو زیادہ تر گناہوں کی سزا ملے گی۔

تخریج: حاکم نے اس طرح اپنی مستدرک میں اس کو نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ذہبیؒ نے اس کو برقرار رکھا ہے امام میرکؒ نے یہ بات ذکر کی ہے۔

جامع میں اس روایت کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے: "**امتی هذه امة مرحومة ليس عليها عذاب انما عذابها فی الدنيا الفتن والزلازل والقتل والبلايا**"۔

اس روایت کو ابوداؤد، طبرانی، حاکم اور بیہقی نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

حاکم نے اس حدیث کو الکنیٰ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

"**امتی امة مرحومة مغفور لها متاب عليها**"

"**متاب عليها**" کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرے گا اور ان کو گناہوں پر اصرار کرنے نہیں دیگا۔ چنانچہ اس میں دلیل ہے اس بات پر کہ ان سے مراد اس امت کے خواص ہیں۔

۵۳۷۵ : وَعَنْ اَبِیْ عُبَیْدَةَ وَمُعَاذَ بْنِ جَبَلٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ هٰذَا الْاَمْرَ بَدَءَ نُبُوَّةً وَّرَحْمَةً ثُمَّ يَكُوْنُ خِلَافَةً وَّرَحْمَةً ثُمَّ مَلَكًا عَضُوْضًا ثُمَّ كَائِنٌ جَبَرِيَّةً وَّعُتُوًّا وَّفَسَادًا فِی الْاَرْضِ يَسْتَحِلُّوْنَ الْحَرِيْرَ وَالْفُرُوْجَ وَالْخُمُوْرَ يُرْزَقُوْنَ عَلٰی ذٰلِكَ وَيُنْصَرُوْنَ حَتّٰی يَلْقَوُا اللّٰهَ.

(رواه البيهقی فی شعب الايمان)

اخرجه الدارمی فی السنن ۲/۱۵۵ حديث رقم ۲۱۰۰ والبيهقی فی شعب الإيمان ۵/۱٦ حديث رقم ٦١٦

ترجمہ: "حضرت عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس امر (یعنی دین اسلام) نبوت و رحمت کے ساتھ ہوا ہے پھر اس کا جو دور آئے گا وہ

خلافت و رحمت کا دور ہوگا' پھر اس کا جو زمانہ آئے گا وہ کاٹ کھانے والی بادشاہی کا دور ہوگا (ظالمانہ بادشاہت ہوگا اور پھر اس کا جو دور آئے گا وہ ظلم وستم، تکبر وسرکشی اور زمین پر فتنہ اور خانہ جنگی کا دور ہوگا۔ اس وقت لوگ ریشمی کپڑوں کو حلال (قرار دے کر استعمال) کریں گے عورتوں کی شرمگاہوں کو اور شراب (کی تمام انواع واقسام) کو حلال قرار دیں گے۔ لیکن ایسی حالت میں بھی ان کو رزق دیا جائے گا اور ان کی امداد و نصرت کی جائے گی یہاں تک وہ اللہ تعالیٰ سے جاملیں گے۔ اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے"۔

تشریح: قولہ: هذا الامر بدأ۔۔۔۔ خلافۃ ورحمۃ: جس چیز کے ساتھ حضور علیہ السلام کو بھیجا گیا ہے یعنی لوگوں کی دین ودنیا کی اصلاح اور اس سے مراد اسلام اور اسلام کے احکام ہے۔

بدأ: الف کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں ہمزہ کے ساتھ ہے۔

نبوۃ ورحمۃ: یا تو تمیز ہونے کی بناء پر منصوب ہے یا حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی نبوت والا زمانہ تھا اور حضور علیہ السلام کی طرف سے امت مرحومہ پر کامل رحمت والا زمانہ تھا۔

تیس (۳۰) برس تک آپؐ کے جانشین اور متبعین کی کامل ولایت اور نگرانی میں امت پر شفقت کا زمانہ تھا۔ زمانہ خلافت کے تیس (۳۰) برس میں سے خلفاء راشدین کے بعد چھ ماہ کا زمانہ کم تھا جس کو امام حسنؓ نے اپنی خلافت کے ذریعے پورا کیا چنانچہ خلافت میں حضرت معاویہؓ کا کوئی حصہ نہیں ہے اگرچہ بعض حضرات کا اس میں اختلاف ہے۔

قولہ: ثم ملکا عضوضا۔۔۔ وفسادا فی الارض ثم ملکا عضوضا: عض، کا معنی دانت سے کاٹنا اور عضوض، عین کے فتحہ کے ساتھ جو کہ فعولٌ کے وزن پر ہے اسی سے ماخوذ ہے اور مبالغہ کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی رعایا پر ظلم کریں گے اور ان کو دانتوں سے کاٹیں گے۔ اس لفظ "عضوض" کو عین کے ضمہ کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے اس صورت میں "عض" (عین کے کسرہ کے ساتھ کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے خبیث شریر۔

یعنی حکمران لوگوں پر ظلم کریں گے اور ان کو ناحق تکالیف پہنچائیں گے، اور یہ حکم غالب کے اعتبار سے ہے کیونکہ نادر کا اعتبار نہیں ہوگا، چنانچہ کوئی شک نہیں ہے اس میں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ عادل بادشاہ تھے، یہاں تک کہ اُن کا نام عمر ثانی رکھا گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے واقعات اور فیصلے مشہور ہیں، اور ان کے مناقب کتابوں میں لکھے گئے ہیں۔

ثم کائن: وہ معاملہ ہوگا یا یہ معاملہ ہوگا۔

جبریۃ: جیم اور باء کے فتحہ کے ساتھ منصوب ہے۔ یعنی قہر و تکبر۔

وعتوا: عین اور تاء کے ضمہ اور واؤ کی تشدید کے ساتھ یعنی تکبر۔

وفسادًا فی الارض): اور شاید یہ کلام میں عدول کی وجہ استمرار اور دوام ہو۔

جیسا کہ اس زمانے میں اس کا مشاہدہ ہے کہ پہلے تو ظالموں نے امامت کے شروط کی رعایت کیے بغیر تسلط اور قبضہ کر کے خلافت کو چھین لیا۔

دوسرا یہ کہ انہوں نے عوام پر ظلم وزیادتی کی اوران کو مختلف قسم کی مصیبتوں میں ڈالا، اوران کی عزت کو لوٹا اور غیر مستحقین کو عہدے دیدیئے۔

تیسرا یہ کہ باعمل علماء اور اولیاء اللہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، اس طرح اس زمانے کے اکثر بادشاہوں نے کفار کے ساتھ جہاد کو ترک کر دیا اور ملک چھیننے اور فساد پھیلانے کی غرض سے مسلمانوں سے لڑنا شروع کر دیا۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ ہمارے زمانے کا بادشاہ عادل ہے وہ کافر ہے۔

اور یہ کتنی قبیح بات ہے کہ ہمارے زمانے میں ازبک کے بعض سرداروں نے اہل اسلام کے اُس عظیم ملک پر حملہ کرنے اور قتل عام کا حکم دیا جس میں بڑے بڑے مشائخ کرام ہیں، اور عظیم مرتبہ والے سادات ہیں، اور علماء، ضعفاء، بچے اور عورتیں ہیں، اور مریض اور آندھے ہیں۔ اور ایک ہی خاندان کے اہل وعیال ہیں حالانکہ اس مذکور ملک والے ایک ہی مذہب اسلام اور ایک ہی مسلکِ حنفیت سے تعلق رکھتے ہیں، اور اہلسنت والجماعت میں شامل ہیں، اور یہ سلطنت کے مدعی یہ سمجھتے تھے کہ یہ علم وشریعت کے حامی ہیں، حالانکہ علمانے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ اگر مسلمان کفار کے کسی قلعہ کو فتح کریں جس میں ہزاروں اہل حرب پائے جائیں لیکن ان ہزاروں میں کوئی ایک مجہول الحال ذمی ہو تو محض اس ذمی کی وجہ سے وہاں قلعہ میں قتل عام کرانا ہرگز درست نہیں ہوگا۔ اللہ ہی کی توفیق سے بندہ گناہ سے بچتا ہے اور اللہ ہی کی توفیق سے نیکی کرتا ہے، اور اللہ جو چاہے وہ ہوتا ہے، اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اور اللہ کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کر لیا ہے، اور فساد تو اب وبحر میں ظاہر ہو چکا ہے، یہاں تک حرمین شریفین میں بھی وہ فتنے اور فسادات ہوئے جو نہ تو ذکر کرنے کے قابل ہیں، اور نہ اُن کا تصور کیا جا سکتا۔ اور اللہ ہی اپنے دین اور اپنے نبی کا مددگار ہے، اور آنے والا ہر سال بلکہ ہر دن اور بلکہ ہر لحہ پہلے کی بنسبت بد سے بدتر ہی گزر رہا ہے، اور یہاں تک کہ یہ سلسلہ برقرار رہے گا، اور وہ وقت آئے گا، جب زمین پر کوئی بندہ بھی اللہ کا نام لینے والا نہ رہے گا، اور اس کی تائید آئندہ قول سے ہوتی ہے۔

قوله: يستحلون الحرير والفروج۔۔۔۔حتى يلقوا الله:

يرزقون: اور ایک نسخہ میں ''ويرزقون'' ہے۔

على ذالك: یعنی باوجود اس کے کہ حرام کو حلال سمجھا اور دوسرے مذکورہ قبائح کا ارتکاب کیا۔

وينصرون: ان کے اعمال ومقاصد پر اور یہ ایک حکمت کے تحت کی وجہ سے ہوگا، جس کا بڑے کامل حضرات بھی ادراک نہیں کر سکتے۔

حتى يلقوا الله: یہ اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے:

﴿ولا تحسبن الله غافلا عما يعمل الظالمون انما يؤخرهم ليوم تشخص فيه الابصار﴾ [ابراھیم۔ ۴۲]:

''اور جو کچھ یہ ظالم لوگ کر رہے ہیں، اس سے خدا تعالیٰ کو بے خبر مت سمجھے ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے جس میں

ان لوگوں کی نگاہیں پھٹی رہ جاویں گی۔"

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، بہتر تو یہ تھا کہ بیہقی اس روایت کو اپنی کتاب "دلائل النبوۃ" میں نقل کرتے۔

۵۳۷۷ : وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اَوَّلَ مَايُكْفَأُقَالَ زَيْدُبْنُ يَحْيَ الرَّاوِيْ يَعْنِي الْاِسْلَامُ كَمَا يُكْفَأُ الْاِنَاءُ يَعْنِي الْخَمْرُ قِيْلَ فَكَيْفَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَقَدْ بَيَّنَ اللّٰهُ فِيْهَا مَابَيَّنَ قَالَ يَسْمُوْنَهَا بِغَيْرِ اسْمِهَا فَيَسْتَحِلُّوْنَهَا (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۱۵۵/۲ حدیث رقم ۲۱۰۰۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: کہ سب سے پہلے جس کام کو ایسے الٹا دیا جائے گا۔ حدیث کے راوی حضرت زید بن یحییٰؒ نے وضاحت کی کہ یعنی اسلام میں (سب سے پہلے جس کام کو اوندھا کر دیا جائے گا) جیسے برتن الٹا کر دیا جاتا ہے وہ شراب ہوگی۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! ایسا کیونکہ ہو جائے گا حالانکہ شراب کے متعلق اللہ کے وہ احکام بیان ہو چکے ہیں جو سب پر عیاں ہو بھی چکے ہیں؟ یعنی جب شراب کی حرمت نازل ہو چکی ہے اور نہایت سختی کے ساتھ مسلمانوں کو اس چیز سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس حرمت اجتناب کا یہ حکم اتنا واضح، اتنا عام اور اس قدر تاکید کے ساتھ ہے کہ سب مسلمان اس سے واقف و آگاہ ہو گئے ہیں تو پھر ایسا کس طرح ہوگا کہ اس کا حکم بدل دیا جائے گا اور وہ مسلمانوں کو اسلام کی مخالفت کی راہ پر لے جائے گی؟ حضور ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا: "لوگ حیلے اور بہانے تراش کر اس کو پینے لگ جائیں اور راہ اس طرح ہموار کریں گے کہ اس کا نام بدل ڈالیں گے اور اس کو حلال قرار دے لیں گے"۔ (دارمی)

تشریح: قوله: ان اول مایکفاء: یکفا: مہموز اللام ہے اور مجہول کا صیغہ ہے اور کفات الاناء سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے "خالی کرنے کیلئے برتن کو اُلٹ دینا، اوندھا کر دینا"

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ حضور علیہ السلام شراب کے بارے میں ارشاد فرما رہے تھے تو اپنے ارشاد گرامی کے دوران ہی فرمانے لگے: ان اول ما...... چنانچہ خبر محذوف ہے اور وہ خبر محذوف "الخمر" ہے، لیکن اس بات کو اس قول سے مناسبت نہیں ہے، جس کو مؤلف نے بعد میں نقل کیا ہے۔ (مراد اگلا جملہ ہے)

قوله: قال زید بن یحیٰی الراوی: یعنی الاسلام:

کیونکہ بظاہر ان کی مراد خبر مقدر ہے اور معنی یہ ہے کہ سب سے پہلی چیز جس میں تغیر آئے گا وہ اسلام ہوگی اور اسلام ظاہری انقیاد ہے جو نیکی کرنے اور گناہوں سے بچنے سے متعلق ہے، اور اس کی تائید ارشاد گرامی سے ہوتی ہے۔

قوله: کما یکفا الاناء یعنی الخمر: یعنی برتن میں جو چیز ہے اسی وجہ سے راوی فرماتے ہیں۔ کہ حضور علیہ السلام نے الاناء سے (الخمر) مراد لیا ہے یا تو بطور مجاز حذف کے اس طرح ہے، اور "الاناء" سے "مظروف الاناء" مراد ہے، یا محل بول کر حال مراد ہے جیسا کہ ارشاد باری: ﴿واسئل القریة﴾ [یوسف۔۸۲] میں اس کی تحقیق ہو چکی ہے۔

لیکن آئندہ قول کی وجہ سے اشکال ہوتا ہے۔

قوله: قيل فيكف يا رسول الله: یعنی شراب کیسے پئیں گے؟۔ اشکال کا جواب اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ معنی یوں بیان کیا جائے کہ حلال وحرام کے واضح ہونے اور اسلام کے احکام کے بدل جانے کی صورت میں کیا حال ہوگا۔

قوله: يسمونها بغير اسمها فيستحلونها:

حقیقۃً چنانچہ وہ کافر ہو جائیں گے۔ یا (کھلم کھلا پی کر) یہ ظاہر کریں گے کہ یہ ایک حلال چیز پی رہے ہیں، اور اس طرح یہ فاسق اور مکار ہو جائیں گے۔ اسی وجہ سے بعض شراح نے لکھا ہے کہ یہ لوگ اس طرح کریں گے کہ نبیذ جو کہ حلال ہے اس کو چھپ کر پئیں گے اور اس کو بہانہ بنا کر حرام کو حلال سمجھیں گے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، کہ یہ آخری تشریح مجھے اس مقام میں درست اور راجح معلوم ہوتی ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ان کی خبر محذوف ہے اور وہ "**الخمر**" ہے اور "**كما يكفا**" میں کاف مصدر محذوف کی صفت ہے اور تقدیر یہ ہے: "**ان اول ما يكفا من الاسلام اكفاءً مثل اكفاء ما في الاناء**"، انتہیٰ۔

علامہ طیبیؒ کی اس بات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر "**من الاسلام**" ہے اور مِنْ تبعیضیہ ہے اور کلام سے ساقط ہے اور تقدیر ہے: "**من احكامه**"۔

قاضیؒ فرماتے ہیں کہ **یکفا** کا معنی **یقلب** (الٹا دینا) اور **یمال** (جھکانا) اور **کفات القدر** کا معنی ہے برتن کو خالی کرنے کیلئے اوندھا کر دیا۔ اور اس مقام پر اس سے مراد "پینا" ہے کیونکہ پینے والا جب پیتا ہے تو برتن کو جھکاتا ہے۔

اور راوی کا "**الاسلام**" کہنے سے "**في الاسلام**" کہنا مراد ہے لیکن "**في**" کلام سے ساقط ہو گیا۔ اور معنی یہ ہے کہ اسلام میں سب سے پہلی حرام چیز جس کو اس طرح پیا جائے گا، اور اس کے پینے کی جرأت کی جائے گی جیسا کہ پانی کو پیا جاتا ہے اور اس کے پینے کی جرأت کی جاتی ہے وہ شراب ہوگی، اور اس کو حلال قرار دینے کیلئے اس طرح تاویل کریں گے کہ اس کا نام بدل دیں گے اور دوسرا نام دے دینگے مثلاً نبیذ اور مثلث کہیں گے، انتہیٰ۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ نبیذ اور مثلث حلال ہیں، اور کسی چیز کا نام بدلنے سے اس کی حقیقت نہیں بدلتی، جیسا کہ حبشی کا کافور نام رکھ دیا جائے چنانچہ موجودہ زمانے کے قہوہ کی حرمت پر بعض لوگوں کا یہ استدلال درست نہیں ہے کہ قہوہ شراب کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور اس کو شراب پینے والوں کی ہیئت پر پیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ یہ صرف قہوہ کی خصوصیت نہیں ہے کیونکہ دودھ، پانی اور عرق گلاب کو بھی تو اسی طرح پیا جاتا ہے، علاوہ ازیں حرمین شریفین اور دوسری جگہوں میں جس طرح پینا متعارف ہے وہ فساق کے شراب پینے کی ہیئت پر نہیں ہے۔ اور اس سے مشابہت اور شبہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور قہوہ کے مباح ہونے کے دلائل میں سے ایک دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ صریح ارشاد ہے: ﴿**هو الذي خلق لكم ما في الارض جميعًا**﴾

اور یہ کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے جب تک اس کے خلاف (حرمت) پر قرآن، سنت اور اجماع یا قیاس صحیح سے کوئی دلیل موجود نہ ہو۔

تخریج: احمد اور ضیاء نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے حدیث مرفوع نقل کی ہے:

"لتستحلن طائفة من امتی الخمر باسم يسمونها اياه"۔

"میری امت کا ایک گروہ شراب کو دوسرا نام دے کر حلال سمجھے گا"

الفصل الثالث:

۵۳۷۸ : عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ تَكُوْنُ مَلَكًا عَاضًا فَيَكُوْنُ مَاشَآءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ تَكُوْنُ مَلَكًا عَاضًا فَتَكُوْنُ مَاشَآءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ يَكُوْنُ مَلَكًا جَبَرِيَّةً فَيَكُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ ثُمَّ سَكَتَ قَالَ حَبِيْبٌ فَلَمَّا قَامَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ كَتَبْتُ اِلَيْهِ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اُذَكِّرُهٗ اِيَّاهُ وَقُلْتُ اَرْجُوْا اَنْ تَكُوْنَ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بَعْدَ الْمُلْكِ الْعَاضِّ وَالْجَبَرِيَّةِ فَسُرَّبِهٖ وَاَعْجَبَهٗ يَعْنِيْ عُمَرُ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيْزِ۔

رواه احمد والبيهقی فی دلائل النبوة

اخرجه احمد فی المسند ۲۷۳/۴۔

ترجمہ: "حضرت نعمان بن بشیر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہارے درمیان وجود نبوت اور نور نبوت کی بقاء اس وقت تک رہے گی جب تک اس کا باقی رکھنا اللہ کی چاہت ہوگی پھر اللہ تعالیٰ (نبی کو اپنے پاس بلا لینے کے ذریعہ) نبوت کو اٹھا لے گا اس کے بعد راہ نبوت کی پیروی پر خلافت قائم ہوگی اور وہ اس وقت تک قائم رہے گی جب تک اس کی بقاء کو اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ (یعنی تیس برس تک) پھر خدا تعالیٰ خلافت کو بھی ختم کر دے گا اس کے بعد کاٹ کھانے والی بادشاہت کا دور آ جائے گا۔ وہ بادشاہت تب تک قائم رہے گی جب تک اللہ عزوجل چاہے گا اس کے بعد اس دنیا سے رخصت کر دے گا اس کے بعد جبر وتیت والی بادشاہت کی حکومت قائم ہوگی اور وہ اس وقت تک باقی رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ پھر خدا تعالیٰ اس بادشاہت کو بھی ختم فرما دے گا اس کے بعد پھر راہ فرما دے گا (یعنی عدل وانصاف کو پورے طور پر جاری کرنے والی) خلافت کا قیام ہوگا اور اس

''خلافت'' سے مراد سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی علیہ السلام کا دور ہے) اتنا فرما کر آپ خاموش ہو گئے''۔ حضرت حبیب بن سالم نے کہا کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ مقرر ہوئے تو میں نے اس حدیث کے مضمون کی یاد دہانی کی غرض سے یہ حدیث لکھ کر ان کے پاس بھیجی اور اپنے اس احساس کا اظہار کیا کہ میں توقع رکھتا ہوں کہ آپ وہی امیر المؤمنین ہیں جن کا تذکرہ اس حدیث میں کاٹ کھانے والی بادشاہت اور قہر و تکبر اور زور زبردستی والی بادشاہت کے بعد ملتا ہے۔ وہ یعنی عمر بن عبدالعزیزؒ اس بات سے بہت خوش ہوئے اور اس تشریح نے ان کو بہت خوش کیا۔ اس روایت کو امام احمد نے (اپنی مسند میں) اور بیہقیؒ نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: تکون النبوۃ: ''النبوۃ'' مرفوع ہے اس بناء پر کہ ''تکون'' تامّہ ہے، اور ''توجد'' یا ''تقع'' کے معنی میں ہے۔

قولہ: ثم تکون خلافۃ: خلافۃ، مرفوع ہے، اور بعض صحیح نسخوں میں نصب کے ساتھ منقول ہے اس بناء پر کہ ''تکون'' ناقصہ ہے اگلے کلام ''ثم تکون ملکا'' کے مناسب بھی یہی ہے۔

اور مطلب یہ ہے کہ نبوت خلافت سے بدل جائے گی یا امارت یا حکومت خلافت سے بدل جائے گی۔

قولہ: قال حبیب:

مؤلف فرماتے ہیں یہ حضرت حبیب بن سالم ہیں، جو نعمان بن بشیر کے آزاد کردہ غلام اور کاتب تھے۔ انہوں نے نعمان بن بشیر اور محمد بن منتشر وغیرہ حضرات سے احادیث نقل کی ہیں۔

قولہ: کتبت الیہ بھذا الحدیث ......:

''اذکرہ'' کاف کی تشدید کے ساتھ ہے ''تذکیر'' سے مشتق ہے، وعظ و یاد دہانی کے معنی میں مستعمل ہے۔

قولہ: وقلت ارجو أن تکون ـــــ: تکون کا فاعل یا تو ''انت'' ضمیر ہے یا (یہ غائب کا صیغہ ہے، اس صورت میں) ضمیر ''خلیفۃ'' کی طرف راجع ہے۔

اور ایک نسخہ میں (واحد مذکر) غائب کا صیغہ ہے۔ یعنی حدیث میں جس خلیفہ کی پیشینگوئی کی گئی تھی ان سے مراد امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''امیر المؤمنین، یکون کی خبر ہے اور ''بعد الملک العاض و الجبریۃ'' خبر کیلئے ظرف ہے۔ ''الحاکم العادل'' کی تاویل میں ہوگا جیسا کہ ارشاد باری: ﴿وھو اللہ فی السموٰت﴾ [الانعام: ۳] میں لفظ ''اللہ'' کو ''معبودٌ'' کی تاویل میں لیا گیا ہے۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ بعض نسخوں میں ''یکون'' مذکر کے صیغہ کے ساتھ ہے اور ''امیر المؤمنین'' مرفوع ہے چنانچہ بعد الملک جو کہ ظرف ہے ''یکون'' کے لئے خبر ہوگا۔

فسر: سین کے ضمہ اور راء کی تشدید کے ساتھ۔

تخریج: جامع میں ہے: **یکون امراء یقولون ولا یرد علیهم یتهافتون فی النار یتبع بعضهم بعضا۔**

''ایسے حکمران آئیں گے جو بات کریں گے لیکن لوگ ان کی باتوں کا جواب نہیں دے سکیں گے، وہ ایک دوسرے کے پیچھے لگاتار جہنم میں گریں گے۔''

اِس کو طبرانی رحمہ اللہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور ابن عساکر رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے:

یکون لاصحابی زلة یغفرها الله تعالٰی لسابقتهم معی۔

''میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے چوک اور خطاء ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان کی اس خطا اور چوک کو معاف کریں گے کیونکہ (اُنہیں) میرا قرب حاصل ہے۔''

❀ ❀ ❀